اسلام کا جماعتی نظام

ایک فکر انگیز مقالہ : صفحہ ۱۹

ماہنامہ میثاق لاہور

Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of :

WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS,

HEAD OFFICE :

709, 7TH FLOOR, QAMAR HOUSE,

M.A. JINNAH ROAD, KARACHI (PAKISTAN)

2 - K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE

TELEPHONE : 870512 880731

جلد ۳۳ شمارہ ۱ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ مطابق جنوری ۱۹۸۴ء

مشمولات

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی
فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

Date ... 23-7-84

قارئین متوجہ ہوں!

- ادارہ میثاق نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جنوری ۱۹۸۴ء سے میثاق کے صفحات کی تعداد میں سولہ صفحات کا اضافہ کر دیا جائے یعنی اب سے میثاق کے کم سے کم چھیانوے صفحات ہوا کریں گے۔ مگر قیمت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا گیا۔
- ادارہ نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ آئندہ سے زرِ تعاون صرف منی آرڈر یا کیش کی شکل میں وصول کیا جائے گا۔ لیکن جو خریدار حضرات چیک روانہ کرنا چاہیں وہ چالیس روپے کا چیک روانہ فرمائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چیک کیش کروانے میں دس یا بارہ روپے صرف ہو جاتے ہیں۔ جو بلاشبہ ادارے پر اضافی بوجھ ہے۔ توقع ہے کہ قارئین اسے اپنے لئے بار متصور نہیں کریں گے۔ بیرونی ممالک سے ڈرافٹ حسبِ سابق قابلِ قبول ہوں گے۔
- ماہنامہ میثاق کا سالانہ زرِ تعاون اندرونِ ملک -/۳۰ روپے ہے جبکہ دوسرے ممالک کے لئے زرِ تعاون حسبِ ذیل ہے:

کینیڈا -/۱۵۰ روپے یا ۱۵ کینیڈین ڈالر

امریکہ، افریقہ، مغربی جرمنی، نائیجیریا -/۱۵۰ روپے یا ۱۲ امریکن ڈالر

انگلینڈ، ناروے، متحدہ عرب امارات -/۱۰۰ روپے

سعودی عرب، ابوظہبی، مصر، ایران -/۶۰ روپے

انڈیا -/۸۰ روپے

- پاکستان کے دیگر شہر جہاں تنظیم کی ذیلی شاخیں قائم ہیں وہاں میثاق درج ذیل پتوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

★ پشاور: دفتر تنظیم اسلامی۔ نثار بلڈنگ پل پختہ نزد چوک یادگار، پشاور۔

★ ملتان: عبدالغنی صاحب، ملتان پولٹری کارنر۔ بالمقابل فاطمہ جناح ہسپتال، ملتان۔ فون ۷۵۸۹۱

★ کوئٹہ: دفتر تنظیم اسلامی جناح روڈ کوئٹہ اور قاری افتخار احمد صاحب خطیب جامع مسجد بلوچی مسجد روڈ کوئٹہ۔ فون ۷۲۹۹

★ کراچی: داؤد منزل۔ نزد آرام باغ۔ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون ۲۱۲۷۰۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

الحمد للہ کہ زیرِ نظر شمارے کے ذریعے میثاق کی تینتیسویں جلد کا آغاز ہو رہا ہے۔ قارئین کے لئے یہ امر یقیناً باعثِ مسرت ہوگا کہ اس موقع پر ہم نے میثاق کے صفحات بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پچھلے ماہ تک صورتِ حال یہ تھی کہ عموماً میثاق ۸۰ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ تاہم بعض اوقات صفحات کی تعداد اس سے متجاوز ہو جاتی تھی۔ آئندہ کے لئے طے پایا ہے کہ ان شاء اللہ صفحات کی تعداد ۹۶ سے کم تو نہ ہوگی البتہ فوری اور وقتی ضرورت کے پیشِ نظر اس میں اضافے کا امکان موجود رہے گا۔ زیرِ نظر شمارہ جو ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے ہمارے لئے "علی ما نقول وکیل" کا کردار ادا کر رہا ہے۔ قارئین کے لئے یہ امر مزید باعثِ اطمینان ہوگا کہ زرِ تعاون حسبِ سابق رہے گا اور اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

اس شمارے میں "اسلام کا جماعتی نظام" کے عنوان سے مولانا الطاف الرحمٰن صاحب بنوی کا ایک گراں قدر اور فکر انگیز مضمون شامل ہے۔ مولانا موصوف نے یہ مضمون محاضراتِ قرآنی منعقدہ اکتوبر ۸۲ء میں بصورت مقالہ پیش فرمایا تھا ـــــــ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں ہم اسلام کا جماعتی نظام اور نظمِ جماعت کی اہمیت جیسے اہم مسئلوں پر بحیثیت مجموعی کچھ سوچنے کی ضرورت کے احساس سے بھی بیگانہ ہو چکے ہیں۔ اور صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے نہ صرف دینی اضمحلال اور اسلام کی بحیثیت دین مغلوبیت کو ایک تلخ حقیقت سمجھ کر تسلیم کر لیا ہے بلکہ اب ہم اس حقیقت سے ایسے صرفِ نظر کئے ہوئے ہیں گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ افسوس اسی بات کا ہے کہ کہ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا! اور بحیثیت ملت حقائق سے چشم پوشی کے مآل سے پوری امت دوچار ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے نہیں کرتی مگر ملت کے گناہوں کو معاف

ہم یہ بات بھول چکے ہیں کہ اسلام 'دین' ہے محض مذہب نہیں۔ اور بحیثیتِ امتِ محمدیہ جو ہمارا ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ اس پیغام رسالت کو ہر فردِ نوعِ بشر تک پہنچائیں دہیں یہ اہم فریضہ بھی ہم پر عائد

ہوتا ہے کہ ہم اس دین کو غالب و نافذ کریں۔ ہم سورۂ مائدہ کی اس عظیم آیت کو بیان کرنے میں تو بہت فخر محسوس کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ "آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور تمہارے لئے میں نے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا" لیکن دین کی اقامت اور سربلندی کے ذیل میں ذمہ داری کا کسی درجے میں بھی احساس ہمیں حاصل نہیں۔ حالانکہ اللہ نے ہم پر یہ احسانِ عظیم فرمایا ہی اس لئے تھا کہ دین کو قائم اور نافذ کیا جائے (اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ)۔ مسلمان اگر کسی ایسے خطے میں آباد ہوں جہاں اللہ کا دین مغلوب ہو اور اسؐ کی شریعت غالب و نافذ نہ ہو تو بحیثیت مسلمان ان کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ غلط نظام کو بدلنے کی کوشش کریں اور اقامتِ دین کے لئے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں ــــ اگر دین فی الواقع نام ہے سُنّتِ محمدیؐ اور سنّتِ خلفائے راشدینؓ کا تو پھر اس معاملے میں دو رائیں ممکن نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی زندگیوں کا تو مشن ہی یہ تھا کہ اللہ کے پیغام کو پھیلائیں اور اس کے دین کو غالب و نافذ کریں۔ ان کے سامنے بطورِ ہدف یہ آیت مبارکہ تھی کہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ. مقامِ غور ہے کہ اگر اقامتِ دین اور اس کے لئے نظمِ جماعت امّت کا فرضِ منصبی نہیں ہے تو دورِ خلافتِ راشدہ میں صحابہ کرامؓ نے غلبۂ دین کے لئے جان و مال کی جو قربانیاں دیں اور جہاد و قتال کا جو ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، ان سب کے لئے کوئی جواز موجود نہیں! حالانکہ صحیح بات یہی ہے کہ ؏ بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست۔ دین تو وہی ہے جو حضورؐ اور اور صحابہؓ کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے۔ دین کو فی الحقیقت سمجھا ہی انہوں نے تھا۔ تبھی انہیں تاقیامِ قیامت امّت کے لئے حجّت کا درجہ حاصل ہے۔

اسلام کا جماعتی نظام کے موضوع پر یہ اہم مقالہ یقیناً فکر کی ان کہنہ راہوں کو اَز سرِ نَو کھولنے کا باعث ہوگا جن پر استدادِ زمانہ اور غیروں کی غلامی کے اثرات نے گرد کی دبیز تہیں جما دی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تہیں اس قدر دبیز اور گہری ہیں کہ اب یہ تمام باتیں ہمیں اجنبی اور نامانوس دکھائی دیتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ

بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ۔!

مطالعہ قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب کا حصہ ثانی

مباحثِ ایمان

قرآن مجید کے فلسفہ و حکمت کی اساسِ کامل

سورۃ فاتحہ

(۱)

السلام علیکم - نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

اما بعد:

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ؕ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ۠

آمین ۝ صدق اللّٰہ العظیم

"کل شکر اور کل ثناء کا سزاوارِ حقیقی اللہ ہے جو پوری کائنات کا مالک اور پروردگار ہے - بہت رحم فرمانے والا اور نہایت مہربان ہے - جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے - اے رب!

ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے ۔ (اے رب!) ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی ۔ راہ ان کی جن پر تیرا انعام ہوا جو نہ تو مغضوب ہوئے کہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور جو نہ گمراہ ہوتے ۔" آمین یارب العلمین ۔

حاضرین کرام اور ناظرین گرامی!

آج کی نشست میں اس سورہ مبارکہ کے بارے میں مجھے پہلے تو تمہیدی باتیں عرض کرنی ہوں گی ۔ میں چاہوں گا کہ آپ ان کو گن کر اچھی طرح ذہن نشین کرلیں اور یاد رکھنے کی کوشش کریں ۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی مکمل سورت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ۔ اس سے قبل متفرق آیات نازل ہوئیں ۔ مثلاً وہ پانچ آیات جو سورۃ العلق کے ابتدا میں شامل ہیں ۔ وہ سب سے پہلی وحی ہے ۔ اس پر تقریباً اجماع ہے ۔ اکثر متقدمین کے نزدیک دوسری وحی وہ سات آیات ہیں جو سورہ "ن" (جس کا دوسرا نام سورۃ القلم بھی ہے) کے آغاز میں ہیں ۔ پھر سات آیات جو سورہ المزمل کے شروع میں ہیں، تیسری وحی ہے ۔ پھر سات ہی آیات جو سورہ المدثر کے آغاز میں ہیں، وہ چوتھی وحی ہے ۔۔ اور پانچویں وحی جو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی وہ یہ سورۃ فاتحہ ہے جو مکمل سورت ہے ۔ پھر یہ حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ بھی سات ہی آیات پر مشتمل ہے ۔

دوسری بات اس سورہ مبارکہ کی عظمت سے متعلق ہے ۔ اس ضمن میں ایک تو خود اللہ تعالےٰ کا اپنا فرمان ہے ۔ چنانچہ چودھویں پارے میں سورۃ الحجر میں یہ آیت وارد ہوئی ہے : وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ہ (آیت ۸۷) "(اے نبی)" اور تحقیق ہم نے آپ کو عطا فرمائی ہیں سات دہرائی جانے والیاں" یعنی وہ سات آیات جو بار بار پڑھی جاتی ہیں ۔ نماز کی ہر رکعت میں ان کا اعادہ ہوتا ہے ۔۔ "ہم نے آپ کو قرآن عظیم عطا فرمایا" ۔ اس آیت کے بارے میں مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ " سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ " سے مراد

سورۃ فاتحہ کی سات آیات ہیں اور اس آیت میں "اَلْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ" بھی سورۃ فاتحہ ہی کو کہا گیا ہے - گویا اس سورہ مبارکہ کی عظمت یہ ہے کہ اس طرح یہ خود اپنی جگہ ایک مکمل قرآن ہے اور نہ صرف قرآن بلکہ قرآنِ عظیم ہے ---
سورۃ الحجر کا یہ مقام جس میں یہ آیتِ مبارکہ وارد ہوتی ہے، وہ ہے جہاں اللہ تعالےٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین فرماتے ہیں تو ساتھ ہی اپنا یہ احسان اور فضل بھی جتلاتے ہیں کہ اے نبیؐ ہم نے آپؐ کو اتنی بڑی نعمت عطا فرمائی ہے کہ جس سے بڑی نعمت کسی اور نبی کو نہیں دی گئی اور وہ نعمت ہے - سورۃ فاتحہ ---

اس سورہ مبارکہ کی عظمت کے بارے میں میں چاہوں گا کہ ایک حدیث بھی آپ کو سنا دوں - صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کے بارے میں نبی اکرمؐ نے فرمایا : اَقْرَأُهُمْ قُرَّائُنَا اُبَیُّ اُبْنُ کَعْب "" صحابہ میں قرآن کے سب سے بڑے قاری ابی ابن کعبؓ ہیں "--- انؓ سے خود نبی اکرمؐ نے سوال کیا کہ "اے اُبیؓ! کیا میں تمہیں وہ سورت تلقین کردوں جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی، نہ انجیل میں اور نہ ہی قرآن مجید میں ؟"--- جواب میں حضرت ابی ابن کعبؓ نے سراپا اشتیاق بن کر عرض کیا "حضورؐ ضرور فرمائیے"- اس پر حضورؐ نے دوسرا سوال کیا :" تم نماز میں کیا پڑھتے ہو؟" حضرت ابیؓ نے جواب میں سورہ فاتحہ کی تلاوت شروع کر دی --- تو اس موقع پر نبی اکرمؐ نے فرمایا "یہی ہے وہ سورت جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی، نہ انجیل میں اور نہ ہی قرآن میں اس کی کوئی اور مثل ونظیر موجود ہے "--- (اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

تیسری بات اس سورۃ مبارکہ کے ناموں سے متعلق ہے اسکا سب سے زیادہ مشہور و معروف اور عام نام ہے - "الفاتحہ" فَتَحَ یَفْتَحُ کے معنی ہیں "کسی چیز کو کھولنا" - لہذا الفاتحہ کے معنی ہوئے "قرآن مجید کی افتتاحی سورت The opening surah of The Quran" یہ نام تو گویا اس اعتبار سے ہے کہ یہ مصحف کی پہلی سورت ہے - باقی عربوں کا یہ خاص مزاج ہے کہ جس چیز سے انہیں

خاص محبت ہوتی ہے تو وہ اس کے نام کثرت سے رکھتے ہیں چنانچہ اس سورہ مبارکہ کے بھی آپ کو بے شمار نام ملیں گے۔ اس کی عظمت کے اعتبار سے اول اس کی جامعیت کے اعتبار سے اسے "اُمّ القرآن اور اساس القرآن" بھی کہا گیا۔ یہ سورہ گویا قرآن مجید کے لئے اساس اور بنیاد اور جڑ کے مرتبہ اور مقام کی حامل سورہ ہے۔ اس کو "الکافیہ" کا نام بھی دیا گیا۔ یعنی یہ کفایت کرنے والی سورہ ہے۔ اسے "الشافیہ" کے نام سے بھی موسوم کیا گیا۔ یعنی اس میں شفاء ہے۔ اس کے اور بھی نام ہیں، میں چند نہایت مشہور ناموں کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں۔

چوتھی بات اس سورۂ مبارکہ کے اسلوب سے متعلق ہے۔ اس کا انداز دعائیہ ہے۔ اگرچہ کلام الٰہی ہے لیکن اسلوب سکھانے کا نہیں ہے بلکہ تلقین کا ہے یعنی اللہ تعالےٰ سے ہم کلام ہونا چاہو تو اس طور سے ہو۔ اس اسلوب میں انسان کی فطرت سلیمہ کی ترجمانی ہے جو اللہ تعالےٰ نے اس سورت کے جامع الفاظ کی شکل میں فرمائی۔ گویا یہ سورہ مبارکہ ترانۂ شکر و سپاس اور حمد و ثنا بھی ہے۔ اس میں اس تعالیٰ کی ربوبیت کا ملہ اور اس کے مالکِ ارض و سما ہونے کا اقرار بھی ہے۔ اس تعالیٰ کے رحمان و رحیم ہونے کا یقین بھی ہے اور اس تعالیٰ کے جزا و سزا کے دن کا مالک و مختارِ کل، نیز اس کے عادل و منصف اور حاکم مطلق ہونے کا ایقان بھی ہے۔ اس میں صرف اسی کی بندگی اور پرستش اور صرف اسی سے مدد و اعانت طلب کرنے کا قول و قرار اور عہد و میثاق بھی ہے۔ مزید براں اس میں اسی سے صراط مستقیم پر گامزن کرنے اور منزل تک پہنچانے کی توفیق طلبی بھی ہے گویا اس میں اُن لوگوں کی راہ پر اس تعالیٰ سے چلانے کی دعا بھی ہے۔ جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ بلکہ جو منعم علیہم ہیں۔ یعنی جو اللہ تبارک و تعالےٰ کے محبوب اور انعام یافتہ بندے ہیں۔ گویا کہ اس سورہ مبارکہ کو اس طرح قرآن مجید کے لئے ایک دیباچہ بنا دیا گیا۔ قرآن حکیم سے اس کا تعلق یہ ہوا کہ یہ ہے انسان کی فطرت کی پکار اور اس کا جواب وہ ہے جو قرآن آگے پیش کر رہا ہے۔ انسان کی فطرت میں جب ہدایت کی طلب ہے۔ وہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ اس

طلب اور دعا تے ہدایت کا جواب ہے وہ کتاب جو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ۔ الٓمّٓ o ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ o "الٓمّٓ، یہ کتاب الٰہی ہے ۔ اس میں کوئی شک وشبہ کی بات نہیں ہے' یہ خداترس لوگوں کے لئے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے"۔ اس طرح یہ سورۃ مبارکہ ایک طرف فلسفہ وحکمت کے اعتبار سے فطرتِ انسانی کی ترجمانی پر مشتمل ہے، دوسری طرف قرآن مجید کے ساتھ اس کا ربط وتعلق تقریباً وہی ہے جو کسی کتاب کے مقدمہ یا دیباچہ کا اصل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے ۔ گویا سورہ فاتحہ ایک دعا ہے جس میں تہلیل وتحمید اور قول وقرار کے ساتھ صراطِ مستقیم کی ہدایت طلبی ہے اور اس دعا کا جواب پورے قرآن مجید میں موجود ہے ۔

پانچویں بات بہت عام ہے ۔ آپ تمام لوگوں کے علم میں یقیناً یہ بات ہوگی کہ یہ سورہ مبارکہ ہماری نماز کا جزو لاینفک ہے ۔ نماز کی ہر رکعت میں اس کی تلاوت کی جاتی ہے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے جو متفق علیہ ہے یعنی جس کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے اپنی اپنی جامع صحیح میں روایت کیا ہے کہ لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتٰبِ "اس شخص کی کوئی نماز نہیں جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی"۔ ایک اور حدیث قدسی ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں اور امام مسلمؒ اسے اپنی صحیح میں لائے ہیں ۔ طویل حدیث ہے ۔ جس پر ان شاء اللہ آگے گفتگو ہوگی ۔ اس حدیث کی رو سے خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَسَمْتُ الصَّلٰوةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ "میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے مابین دو برابر برابر نصف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے" جیساکہ عرض کر چکا ہوں کہ اس حدیث کا ذکر بعد میں بھی آئے گا اس موقع پر اس ٹکڑے پر اکتفا کیجئے ۔ اس کے بعد اس حدیث میں سورہ فاتحہ کی تفصیل آئی ہے ۔ پس معلوم ہوا کہ الصلاۃ ۔ اصل نماز یہی سورہ فاتحہ ہے ۔ اس معاملہ میں کسی بھی فقہی مسلک میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورہ فاتحہ ہماری نماز کا جزو لاینفک ہے ۔ البتہ اس معاملہ میں جو اختلاف ہے اُسے چھٹی بات کے طور پر ذہن نشین کر لیجئے ۔ یہ بات بھی یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ ہمارے یہاں بعض بڑے جلیل القدر

ائمۂ دین اور فقہائے کرام رحمہم اللہ اجمعین کے مابین بعض مسائل میں کچھ اختلافات قدیم سے چلے آرہے ہیں - ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص امام کے پیچھے باجماعت نماز پڑھ رہا ہو تو اس صورت میں اُسے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیئے یا نہیں - ! ایک رائے یہ ہے کہ یہ سورت تو ہر شکل میں پڑھنی ہے۔ ہر رکعت میں پڑھنی ہے - امام کو بھی پڑھنی ہے، مقتدی کو بھی پڑھنی ہے - جہری رکعات میں بھی پڑھنی ہے اور سرّی رکعات میں بھی - ایک رائے اس کے بالکل برعکس ہے وہ یہ کہ جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو امام تو لازماً سورہ فاتحہ پڑھے - لیکن مقتدی قطعی نہیں پڑھیں نہ جہری رکعات میں نہ سرّی رکعات میں - امام ہی کی قرأت مقتدیوں کی طرف سے سورہ فاتحہ کی قرأت ہو جائے گی - جیسے ایک وفد کسی دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ تو اس وفد کا جو قائد یا ترجمان (Leader or spokesman) ہوتا ہے - وہ جو بات کرتا ہے، وہ سب کی طرف سے شمار ہوتی ہے - ایک بین بین کی رائے بھی ہے - وہ یہ کہ اگر جہری رکعت ہے تو امام بلند آواز سے سورہ فاتحہ کی قرأت کرے گا اور مقتدی سنیں گے اور اگر سرّی رکعت ہے تو امام بھی خاموشی سے قرأت کریگا اور مقتدی بھی اس کے پیچھے خاموشی سے پڑھیں گے - ان آراء کے حاملین کے پاس اپنے اپنے مسلک و موقف کے لئے نہایت مضبوط و مبسوط دلائل موجود ہیں - اس معاملہ میں جو بات میں اپنے ناظرین سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان معاملات کے لئے ہمیں اپنے سینے کو کشادہ رکھنا چاہیئے - یہ اختلافات خلوص پر مبنی ہیں - سب صحیح بات تک ہی پہنچنا چاہتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا کہ سب کے پاس اپنے موقف کے لئے دلائل موجود ہیں - یہ فروعی اختلافات ہیں - دین کی اصل روح سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے - ہر رائے افضل و مفضول اور راجح و مرجوح کے اصول پر مبنی ہوتی ہے اور ہر رائے میں خطائے اجتہادی کا یکساں احتمال ہے جس کے متعلق اہل سنت کا مجمع علیہ موقف یہ ہے کہ مبنی بر خلوص مخطی اجتہاد بھی اللہ کے یہاں موجب اجر ہوگا اور اگر اجتہاد مصیب ہے تو اس پر دُہرا اجر ملے گا۔

اب میں خصوصی طور پر جو بات آپ حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورہ فاتحہ ہماری نماز کا جزو لاینفک ہے۔ جب مسلمان انفرادی طور پہ نماز پڑھ رہا ہو تو اُسے لازماً ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھنی ہوگی۔ البتہ جب جماعت میں شامل ہو تو ایک رائے یہ ہے کہ اس کی طرف سے بھی سورۃ فاتحہ کی امام قرأت کر رہا ہے۔ اس اعتبار سے گویا اُس کی طرف سے بھی قرأت ہوگئی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ مقتدی کو ہر رکعت میں یہ سورہ پڑھنی ہوگی ایک درمیانی رائے یہ ہے کہ مقتدی جہری رکعت میں خاموش رہے گا البتہ سرّی رکعت میں پڑھے گا۔

ساتویں بات اس سورہ مبارکہ کی آیات کی تعداد کے بارے میں ہے۔ یہ چیز متفق علیہ ہے کہ اس سورت کی آیات کی تعداد سات ہے۔ جیسا کہ میں نے سورۃ الحجر کی آیات کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ تمام فقہی مسالک کے نزدیک سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ کی مصداق یہ سورہ مبارکہ ہے لہٰذا آیات کی تعداد سات ہونے میں تو اختلاف ممکن نہیں۔ البتہ اس میں ایک اختلاف یہ ہے کہ بعض علمائے کرام آیت بسم اللہ کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں گویا ان کے نزدیک سورۂ فاتحہ شروع ہوتی ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے بعض حضرات علماء بسم اللہ کو سورہ فاتحہ کا جزو نہیں مانتے انکے نزدیک وہ بالکل علیحدہ ایک مستقل افتتاحی آیت ہے۔ جو سورہ برائت (توبہ) کے علاوہ ہر سورۃ کے آغاز میں لکھی جاتی ہے لیکن اس سورہ کا جزو نہیں ہوتی۔ یہ رائے رکھنے والوں کے نزدیک سورہ فاتحہ شروع ہوتی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ——— ——— کے کلماتِ مبارکہ سے ۔ لیکن پھر بھی دونوں کے نزدیک آیات کی تعداد سات ہی ہے۔ جو لوگ آیت بسم اللہ کو اس سورہ میں شامل کرتے ہیں وہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کو ایک آیت مانتے ہیں۔ اس طرح آیات کی تعداد سات ہی رہے گی ۔ جو حضرات اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے اس سورہ مبارکہ کا آغاز تسلیم کرتے ہیں وہ آخری حصے کو دو آیات پر مشتمل مانتے ہیں۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ

اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ - ایک آیت اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ٥ علٰحدہ دوسری آیت۔ اس طرح بھی آیات کی تعداد سات ہی رہتی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ علماء اور قراء کے مابین خلوص سے بھی اختلاف رائے ہوتا ہے جس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے۔ اگرچہ وزنی رائے وہ ہی معلوم ہوتی ہے جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ہے کہ اس سورہ مبارکہ میں بسم اللہ شامل نہیں ہے اور اس کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی پشت پر وہ حدیث قدسی ہے جس کا میں قدرے تفصیل کے ساتھ آگے ذکر کروں گا اور جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قَسَمْتُ الصَّلٰوةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ - اس کے بعد اس تقسیم کا ذکر ہے پھر بات آگے بڑھتی ہے۔ تو اس میں آیت بسم اللہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ براہ راست الحمد للہ سے بات آگے بڑھتی ہے کہ جب بندہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - تو اللہ جواب میں فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے میری حمد کی" اِذَا قَالَ الْعَبْدُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ قَالَ اللّٰهُ حَمِدَنِيْ عَبْدِيْ — تو آیت بسم اللہ کا ذکر یہاں موجود نہیں ہے۔

آٹھویں بات یہ ہے کہ اس سورہ مبارکہ کے تین حصے ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ آیات سات ہیں۔ لیکن نحوی اعتبار سے گرامر کے اصولوں کے لحاظ سے ان سات آیات سے مکمل جملے تین بنتے ہیں۔ پہلی تین آیات اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ٥ —— گرامر کی رو سے یہ ایک ہی جملہ ہے اور نحوی اعتبار سے یہ جملہ اسمیہ خبریہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے اس کی صفات رحمانی و رحیمی اور عدل و قسط کا بیان

۱؎ مصحف میں عام طور پر یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے بعد آیت کی اختتامی علامت نہیں ہوتی بلکہ وہاں لا لکھا ہوتا ہے۔ یہ دراصل اسی اختلاف کے باعث ہے۔ (مرتب)

ہے - پھر چوتھی آیت جو اس سورہ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے یہ خود ایک مکمل جملہ ہے بلکہ اس کے مزید تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک آیت میں دو مکمل جملے موجود ہیں - بہرحال یہ ہے جملہ فعلیہ خبریہ --- اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہ اے رب ہمارے! ہم صرف تیری ہی بندگی اور پرستش کرتے ہیں اور کریں گے - اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے -" یہ رب اور بندے کے مابین ایک قول و قرار اور ایک معاہدہ و میثاق ہے - یہ مسلّم بات ہے کہ معاہدے میں دو فریق منسلک ہوتے ہیں لہذا یہ جملہ فعلیہ خبریہ درحقیقت اللہ اور بندے کے درمیان عہد و پیمان ہے - تیسرا حصہ جو تین آیات پر مشتمل ہے - اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ لا غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ہ "اے رب ہمارے! ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش، ان لوگوں کی راہ کہ جن پر تو نے انعام فرمایا جو نہ مغضوب ہوتے اور نہ گمراہ" یہ بھی ایک ہی جملہ بنتا ہے اور نحو کے اعتبار سے یہ جملہ انشائیہ ہے - یہ ایک دعا ہے - ایک بندہ اس میں اپنے رب سے جس کی وہ تہلیل و تحمید کر چکا - جس کی ربوبیت، رحمانیت، رحیمی اور عدالت کا وہ مقر ہو چکا جس سے وہ عبادت و استعانت کا عہد استوار کر چکا، اب اسی رب سے وہ اپنی فطرت کی پکار اور پیاس کی سیرابی کے لئے "صراط مستقیم" یعنی زندگی بسر کرنے کیلئے معتدل و متوازن طرز زندگی اور راہ عمل کا طلب گار اور مستدعی ہے -

اس موقع پر میں چاہوں گا کہ نویں اور آخری بات کہنے سے قبل آپ کو وہ حدیث قدسی ترجمہ کے ساتھ سنا دوں جس کا ذکر پہلے دوبار ہو چکا ہے - جو امام مسلم رح نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے - میں حدیث اور ترجمہ ساتھ ساتھ بیان کرتا جاؤں گا - توجہ سے سماعت کی درخواست ہے - حدیث شروع ہوتی ہے کہ : عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى - "حضرت ابوہریرہ رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" قَسَمْتُ الصَّلٰوةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ - میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا

ہے " فَنِصْفُهَا لِیْ وَ نِصْفُهَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ " اس کا نصف حصہ میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے ہے۔ اور میرے بندے کو وہ عطا کیا گیا جو اس نے طلب کیا۔" جب بندہ کہتا ہے " اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ " ۔ قَالَ اللّٰہُ حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ ۔" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی، میرا شکر ادا کیا۔" اور جب وہ کہتا ہے " اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ " قَالَ اللّٰہُ اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف و ثنا کی " اور جب وہ کہتا ہے " مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ " اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ ۔" میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی"۔ یہ پہلا حصہ کل کا کل اللہ کے لئے ہے۔ جب بندہ دوسرا جملہ، دوسرا حصہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ادا کرتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : ھٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ ۔" یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے مابین مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو بخشا جو اس نے مانگا " یہ حصہ ایک معاہدہ ہے ۔ قول و قرار ہے ۔ اس میں بندے نے کچھ طلب بھی کیا ہے ۔ مدد چاہی ہے ۔ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۔ میں نے اپنے بندے کو دیا جو اس نے مجھ سے مانگا ۔ اب آخری حصہ رہ گیا یعنی جب بندہ کہتا ہے : اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۔ تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : ھٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ ۔" یہ میرے بندے کیلئے ہے، یہ اس کا حصہ ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے طلب کیا وہ میں نے اسے بخشا " اس حدیث کی رو سے سورہ فاتحہ کے تین حصے بن جائیں گے ۔ اگر ان تین حصوں کو تقسیم کریں گے تو نصفین آدھا حصہ اللہ کے لئے ہے اور آدھا حصہ بندے کے لئے ہے اور درمیانی و مرکزی آیت : اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ بندے کے اللہ سے ایک قول و قرار اور ایک عہد و معاہدہ سے متعلق ہے چنانچہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : ھٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ ۔" یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک

ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ بخشا جو اس نے طلب کیا۔"

اس سورہ مبارکہ کے بارے میں نویں جو آخری بات مجھے عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ اس سورہ مبارکہ کے اختتام پر "آمین" کہنا مسنون ہے۔ آمین کے معنی یہ ہیں کہ "اے اللہ ایسا ہی ہو"۔ جیسا کہ اس سورۃ مبارکہ کے اسلوب کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کا اسلوب دُعائیہ ہے لہٰذا اب دُعا کے اختتام پر "آمین" کہہ کر گویا بندہ پھر بارگاہ الٰہی میں عرض کرتا ہے کہ "اے پروردگار! میں نے یہ استدعا اور یہ عرضداشت تیرے حضور پیش کی ہے۔ تو اسے شرفِ قبول عطا فرما۔ اے پروردگار ایسا ہی ہو۔"

یہ وہ باتیں ہیں جو اس عظیم ترین سورہ کے بارے میں، میں نے تمہیداً عرض کی ہیں۔ اب اس ضمن میں کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے فرمایا ہے کہ اس سورہ میں شفاء ہے تو یہ شفاء کس معنی میں ہے۔! آیا یہ جسمانی شفاء ہے یا رُوحانی۔؟

جواب: بہت اچھا سوال ہے۔ قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ شفاء بھی قرار دیتا ہے چنانچہ سورہ یونس کی آیت ۵۷ میں فرمایا گیا: يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ "اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے، اور شفاء بھی دلوں کے امراض کے لئے اور رہنمائی اور رحمت ان کے لئے جو اس پر ایمان لے آئیں۔" سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸۲ میں فرمایا گیا: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۙ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ۝ "اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے اور ظالموں (یعنی شرک کرنے والوں) کے لئے تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے۔" یہاں جس شفاء کا تذکرہ ہے اس کے متعلق جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ ذہنی و فکری شفاء ہے۔ انسان کی سوچ کو درست اور صحیح کرنے والی کتاب کتابِ الٰہی ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی جان لیجئے کہ انسان

کے ذہن اور جسم میں بہت گہرا ربط ہے۔ ذہن و فکر مریض ہوں تو جسم پر بھی اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ آج کل کے دور میں امراضِ ذہنی اور نفسیاتی امراض کا زیادہ چرچہ ہے۔ لہذا اگر فکر صحیح ہوگا، سوچ درست ہوگی تو لازماً انسان کو اس کے ذریعہ جسمانی تندرستی بھی حاصل ہوگی۔ اس پہلو سے پورا قرآن مجید بھی شفاء ہے اور یہ سورہ مبارکہ بھی — پھر چونکہ سورہ فاتحہ پورے قرآن حکیم کا خلاصہ ہے۔ یہ اُم القرآن اور اساس القرآن ہے لہذا اس کا نام "الشافیۃ" بھی ہے۔ اس میں یقیناً مومنین کیلئے ذہنی و قلبی شفاء موجود ہے۔ مزید براں یہ کلام اللہ ہے لہذا اس پر کامل و اکمل یقین رکھنے والوں کے لئے اس کی تاثیر میں جسمانی طور پر بھی شفاء ہونا مستبعد نہیں ہے۔ اس سورہ کا جسمانی شفاء ہونے کے لحاظ سے بھی حدیث میں ذکر ملتا ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! سورہ فاتحہ کو اُمّ القرآن جو کہا جاتا ہے تو کیا واقعی اس سورت میں قرآن کے تمام علوم اور معلومات کا نچوڑ آگیا ہے؟

جواب: اصل میں تمام علوم یا تمام معلومات کا نچوڑ تو نہیں کہیں گے لیکن جیسا کہ سورہ لقمان کے دوسرے درس میں بیان کیا گیا تھا کہ قرآن حکیم کی ایک اپنی حکمت ہے، اس کا ایک اپنا جدا فلسفہ ہے۔ حکمتِ قرآنی کا لب لباب اور نچوڑ یقیناً سورہ فاتحہ ہے۔ قرآن حکیم کا جو اپنا فلسفہ اور طرز استدلال ہے اس کا جوہر، اس کا خلاصہ اور اس کا حاصل بھی یہ سورہ مبارکہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہر فلسفے اور نظریے میں اس کی جو اصل فکری اساس ہوتی ہے، اسی کو بنیادی اہمیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے دین اور قرآن حکیم کی جو فکری اساس اور اس کی جو حکمت اور فلسفہ ہے جس پر ساری عمارت تعمیر ہوتی ہے تو اس اعتبار و لحاظ سے یقیناً سورہ فاتحہ اُمّ القرآن اور اساس القرآن ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ ہر نماز کی ادائیگی کے لئے جزو لاینفک ہے تو آیا آمین کہنا بھی جزو لاینفک ہے یا نہیں؟ پھر اسکو اونچی آواز سے کہا جاتے یا نیچی آواز سے؟

جواب: آپ نے اچھا کیا کہ یہ سوال پوچھ لیا چونکہ اس کا تعلق عملی مسائل سے ہے۔ آمین کہنے پر سب کا اتفاق ہے۔ سب کے نزدیک آمین کہنا ضروری ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اونچی آواز سے کہی جائے یا پست آواز سے۔ دل میں کہی جائے یا زبان سے ادا کی جائے۔ تو یہ سب آراء رکھنے والوں کے پاس دلائل موجود ہیں۔ یہ بھی ایک فروعی اختلاف ہے اس میں جو متفقہ بات ہے وہ ہی ہماری رہنمائی کے لئے کفایت کرتی ہے کہ سب کے نزدیک آمین کہنا ضروری ہے۔

حضرات! آج کی اس مختصر نشست میں وہ عظیم و بابرکت سورت جو ہماری نماز کا جزو لازم ولاینفک ہے اور جو ہر مسلمان کو لازماً یاد ہونی چاہیے، اس کا ترجمہ اور اس کے بارے میں چند تمہیدی و بنیادی باتیں ہم نے سمجھی ہیں۔ اللہ تعالےٰ اس کو اس بات کے لئے ذریعہ بنائے کہ ہماری نمازوں میں جان، خشوع و خضوع اور حضوری قلب پیدا ہو جائے اور ہم جب اپنی نمازوں میں سورہ فاتحہ کی قرأت کریں تو اس کے مفہوم کو سمجھ کر ذہنی و قلبی وابستگی کے ساتھ اس سورہ مبارکہ کے الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کریں اور دل کی گہرائیوں سے اس کے آرزومند ہوں کہ اس سورہ کے ذریعہ جس صراط مستقیم کی رہنمائی کی استدعا کی جاتی ہے ـــ وہ راہ ہمیں حاصل ہو جائے اور اس پر چلنے کی توفیق کی بھی بارگاہ ربانی سے ہمیں ارزانی ہو۔ آمین یا رب العلمین۔

اَب ان شاء اللہ العزیز ہم آئندہ نشستوں میں ان تین اجزا کا جو میں نے آج بیان کئے ہیں علٰحدہ علٰحدہ بطریق تذکّر و تدبّر مطالعہ کریں گے۔۔۔۔۔"

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

بقیہ: شرک اور اقسامِ شرک

(آیت ۲۶) جس کے لئے وہ کوئی سفارش سننا چاہے اور اس کو پسند کرے

سورۃ النباء میں عدالتِ اُخروی کا نقشہ اور شفاعت کا ذکر اس طرح فرمایا:

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَٰئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا

اس (شدنی) دن جس روز روح (جبرائیلؑ) اور دوسرے ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ کوئی نہ بولے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور جو درست اور صحیح بات کہے۔ (آیت ۳۸)

اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ شفاعتِ مطلقہ کا عقیدہ، باطل عقیدہ ہے، مشرکانہ عقیدہ ہے۔ چونکہ اس طرح بندے کا اعتماد اللہ کے بجائے مخلوق میں سے کسی بندے پر جم جاتا ہے، وہ عمل سے غافل ہو جاتا ہے۔ پھر اس طرح دو مشیتیں اور دو قدرتیں تسلیم کرنا لازم آتی ہیں جو شرک فی الصفات ہے۔

شفاعت کے بارے میں قرآن مجید جو تصور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں میں سے، ان کے اعزاز و اکرام کے اظہار کے لئے جس کو چاہے گا اور جس کے لئے چاہے گا، شفاعت کی اجازت دے گا۔ یعنی اصل مشیت و رضا اللہ تعالیٰ کی ہوگی اور شفاعت کرنے والا خدا سے ڈرتے ہوئے وہی بات کہے گا جو حق ہوگی، اور ان ہی کے حق میں شفاعت کرے گا جن کے حق میں شفاعت کا قبول کرنا اللہ کی مشیت میں شامل ہوگا۔ یہ ہے توحید۔ اس سے ہٹ کر جو کچھ نظریہ ہے وہ اللہ کی قدرت اور اللہ کی مشیت میں شرک ہے۔

(باقی آئندہ)

اِسلام کا جماعتی نظام

یہ مقالہ انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام امسال منعقدہ محاضراتِ قرآنی کے خصوصی پروگرام میں پڑھا گیا۔

از قلم: مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

یہ وسیع و عریض کائنات اور اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز ایک خاص ترکیب و تالیف کے طفیل قائم ہے۔ آج سے پہلے بہت سی چیزوں کو بسیط سمجھا جاتا تھا اور ان کو مرکب اشیاء کا بنیادی میٹریل قرار دیا جاتا تھا لیکن مسلسل تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ نہ صرف یہ کہ وہ خود بسائط نہیں بلکہ مرکبات ہیں بلکہ ان کے اجزاء اور اجزاء الاجزاء بھی مرکبات ہیں تا آنکہ مادہ کا وہ ذرہ بے مقدار جس کو جوہر اور ایٹم کہا جاتا ہے وہ بھی ترکیب و تالیف کا مرہون منت ہے اور یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ خود ترکیب فرع ہے اجتماع کا، یعنی اولاً کسی چیز کے منتشر اجزاء یکجا اور مجتمع ہو جاتے ہیں اور پھر ایک خاص ہیئت میں جڑ کر ایک دوسرے سے تعلق پیدا کر دیتے ہیں جس سے ایک کل وجود میں آجاتا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ واجب الوجود کے سوا ممکنات کا کوئی فرد نہ صرف یہ کہ اجتماع سے خالی نہیں بلکہ اجتماع ہی کے بل پر موجود ہوا ہے۔

اس سلسلے میں اگرچہ قدیم و جدید طبیعیات کی وہ بحثیں کچھ تردد پیدا کر سکتی ہیں جو کئی ممکن چیزوں کی بساطت کا بھی تاثر دیتی ہیں لیکن قرآنی ارشاد "وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ" نے کائنات کی وسعتوں اور نزاکتوں پر جس انداز سے متنبہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی علمی و فکری اور سائنسی و تجرباتی کاوشوں کے باوجود جس طرح سے انسان اس کائنات کے اجزائے ترکیبی کا احاطہ نہیں کر سکا ہے اور نہ ہی کر سکتا ہے جس کا اس فن کے محققین کو برملا اعتراف ہے اسی طرح سے وہ اس کے اجزائے تحلیلیہ کے کامل ادراک سے بھی عاجز و درماندہ ہے اور اس سمت میں اس نے جن جن چیزوں کو بسائط قرار دے کر تخلیق و تکوین کا نکتۂ آغاز سمجھا ہے آج نہیں تو کل انہیں چیزوں کی ترکیب و تالیف ظاہر ہو کر اس کو اسی طرح جھٹلا دے گی جس طرح اس سے پہلے بہت سے مراحل پر جھٹلایا گیا ہے۔

بہرحال فی الجملہ اتنی بات تو ثابت ہو گئی کہ ہر مخلوق شئے میں وجود و اجتماع دو ایسی ہی متلازم حقیقتیں ہیں جیسے انسان میں حیوان اور ناطق کہ اگرچہ مفہوماً تو دونوں باہم متغائر ہیں لیکن مصداقاً بالکلیہ متساوی اور مترادف ہیں، گو منطق و فلسفہ کی رو سے اس تشبیہ میں یہ خامی ضرور موجود ہے کہ حیوان اور ناطق تو ماہیت انسانیہ کے اجزائے واقعیہ ہیں اور وجود و اجتماع میں سے وجود تو اگرچہ ایک امر واقعی ہے مگر ذات الحادث میں داخل نہیں بلکہ زائد علی الذات ہے اور اجتماع تو محض ایک نسبت اور انتزاع ہے تاہم سرسری تفہیم میں ان فروق کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

وجود ایک ارتقاء پذیر حقیقت ہے لہٰذا وہ ترقی کی جانب اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ لیکن جوں جوں وہ ترقی کرتا جاتا ہے اس کی ضروریات کا دائرہ بھی پھیلتا جاتا ہے تا آنکہ جب ترقی کرتے کرتے جمادات و نباتات سے گزر کر حیوانیت کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس میں اپنا شعور اور احساسِ ذات پیدا ہو جاتا ہے تو اس کی نوعی ضروریات بھی اس انداز سے بدل جاتی ہیں جس سے خود بخود اس کی اپنی اندرونی تکوینی اجتماع کے علاوہ ایک اور خارجی اختیاری اجتماع کا تصور پیدا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں تناسل اور تربیت و تحفظ نسل کی ضرورت سے کم سے کم نر و مادہ کے ایک جوڑے کا اجتماع تشکیل پاجاتا ہے تاہم اسی حیوانی درجے میں بعض حیوانی انواع کے بے شمار افراد پر مشتمل بہت بڑے بڑے اجتماعات کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں جو حیرت انگیز حد تک مربوط و منظم ہوتی ہیں۔

وجود کے اس درجے میں گو شعور و ادراک کی وجہ سے اختیار و ارادے کا نمود ہوتا ہے جس کی وجہ سے ردّ و قبول اور اخذ و ترک کی پوری پوری آزادی میسر ہوتی ہے لیکن اس کی ضروریات محدود اور دائرہ کار بہت تنگ ہوتا ہے اور وہ تھوڑی سی انفرادی یا اجتماعی حرکت سے اپنی آرزوئیں پوری کر کے مطمئن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کا اختیار و ارادہ جسمانی قوتوں کے استعمال کے چند لگے بندھے ضابطوں ہی میں بروئے کار آتا ہے، اسی تنگی و کمزوری کی بدولت ان کے اجتماعی اعمال کو بھی اکثر و بیشتر فطرت سے تعبیر کیا جاتا ہے جو اختیار کے بجائے اضطرار کی ترجمانی کرتا ہے۔

اس کے بعد وجود انسانیت کی سرزمین میں قدم رکھتا ہے جہاں اس میں شعور کے ساتھ عقل کا نور بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کی بدولت اس کا مطمح نظر محسوس و مشاہد گرد و پیش

سے ماوراء تک پھیل جاتا ہے۔ اس کے اندر ہمہ گیری کے تقاضے ابھر آتے ہیں جن کو پورا کرنے کیلئے اس کی انفرادی جد وجہد قطعاً ناکافی ہوتی ہے چنانچہ ایک ایسے جماعتی نظام کی نیو رکھتا ہے جو تحصیل مقاصد میں معاون ومددگار ثابت ہو۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات بخوبی معلوم ہوئی کہ وجود کی ترقی کے ساتھ ساتھ اجتماع میں بھی ترقی ہوتی رہی تا آنکہ جب وجود نے انسان کی شکل اختیار کی تو اجتماع نے اولاً تہذیب وتمدن اور ثانیاً ریاست وحکومت کا روپ دھار لیا جس میں تہذیب وتمدن سے نسبتاً بڑھ کر اختیار وارادے کی کارفرمائی ہوتی ہے کیونکہ تہذیب وتمدن میں انسان دوسروں کی دیکھا دیکھی غیر محسوس انداز سے ماحول کا اثر قبول کرتا ہے جبکہ ریاست وحکومت میں وہ پورے فہم وفراست کے ساتھ کسی شخص یا دستور کی اطاعت کرنے لگتا ہے۔

وجود واجتماع کے آغاز وارتقاء کی اس بحث کے ساتھ ساتھ یہ عقلی مسلمہ بھی پیش نظر رہے کہ کسی بھی چیز کا وجود اس کے لوازم ذات کے وجود کو مستلزم ہوتا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز موجود ہے تو گویا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو جو چیزیں اس کی ذات کے ساتھ لازم ہیں وہ سب موجود ہیں۔ ہم ابھی تک جس سیاق وسباق میں اجتماع کا ذکر کرتے رہے ہیں، اس سے آپ نے معلوم کر لیا ہوگا کہ ہماری مراد وہ اجزائے مجتمعہ ہیں جن کے کل پر کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور اسی نتیجے کے حصول کے لئے یہ اجتماعی ہیئت تشکیل پائی ہو ظاہر ہے کہ اس قسم کا اجتماع امارت اور سمع وطاعت کے بغیر ممکن نہیں گویا یہ دو چیزیں اجتماع کے لوازم ذات میں سے ہیں، اب اس عقلی مسئلے کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی اجتماع کے ہر درجے میں اس کے یہ دونوں لوازم اسی درجے کے مناسب حال موجود ہیں کہ نہیں۔

ہمارے موجودہ علم نے جوہر (ATOM) کو تمام بے جان کائنات اور امیبا (AMOEBA) کو تمام جاندار مخلوقات کا سب سے نچلا درجہ قرار دیا ہے وجود کے ان ابتدائی مظاہر کا داخلی اجتماع امارت اور سمع وطاعت کا جو خوبصورت نمونہ پیش کرتا ہے معززین حاضرین اس سے بے خبر یقیناً نہیں ہوں گے دونوں جگہوں میں نیوکلس (NUCLEUS) یعنی مرکز امیر کی حیثیت سے بقیہ اجزاء کو کنٹرول کرتا ہے اور اجزاء اسی کنٹرول کے دائرے میں متعلقہ فرائض انجام دیتے ہیں لیکن یہ اجتماعات سراسر تکوینی ہیں لہٰذا اس کے لوازم یعنی امارت

اور سمع و اطاعت بھی تکوینی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی قسم کی بدامنی اور بغاوت کا کوئی اندیشہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں پولیس اور فوج کے شعبے نابود ہوتے ہیں۔

اس کے بعد وجود کے شعوری انواع میں جب شعوری اجتماعات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو امارت اور سمع و طاعت میں بھی درجہ بدرجہ شعور اور اختیار و ارادے کا نمود ہونے لگتا ہے چنانچہ شہد کی مکھیوں کے اجتماع میں امارت یعسوب کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور سمع و طاعت کا جذبہ کارکن مکھیوں کو ناقابل یقین حد تک مستعد اور فعّال بنا دیتا ہے۔ حیوانیات سے خصوصی شغف رکھنے والوں کا بیان ہے کہ ان حیوانی جمعیتوں میں تقسیم کار اور کام چوری و سرتابی کی صورت میں سزا و سرزنش کا بہت محکم و مفصّل نظام بھی پایا جاتا ہے۔

وجود کے انسانی درجے میں جماعتی نظام اور اس کے لوازم کا پایا جانا اظہر من الشمس ہے لہٰذا اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، امکانی وجود کا ارتقائی تسلسل انسانیت پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد اس کے مَلَکی مراتب کا نمبر آتا ہے جس میں جمعیت اور اس کے لوازم کا تفصیلی طور پر سمجھنا موقوف ہے وجود کے برتحتانی سطح کا اس کے فوقانی سطح سے ربط و تعلق کے فہم پر، طوالت اور فنی مصطلحات سے سامعین کے اکتا جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس سلسلے میں علمائے ظاہر و باطن کی تحقیقات کو ضرور پیش کرتا لیکن جبکہ یہ اندیشہ موجود ہے تو قرآن و حدیث کے فقط ایک ایک اشارے پر اکتفا کیا جاتا ہے، سورۃ قدر کی آیت نمبر ۴ "تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا" میں ملائکۂ رحمت کے نزول کے سلسلۂ بیان میں روح القدس یعنی جبریل امین کا جس اہتمام شان کے ساتھ ذکر فرمایا گیا وہ اس عظیم حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ روح القدس اس لامحدود جہاں کا مرکز ہے جو اس کے تمام اطراف و اکناف کو اپنے ساتھ مربوط رکھتا ہے۔ اس کے بعد فرشتوں کی شعبہ جاتی جمعیتوں کا حال اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس میں کراماً کاتبین کے بارے میں صراحت ہے کہ ان میں دائیں کندھے والا امیر اور بائیں کندھے والا مامور ہوتا ہے اور سمع و طاعت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جب تک امیر کی اجازت نہ ہو بائیں کندھے والا کسی گناہ کو ریکارڈ نہیں کرتا۔

اب تک کی معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ "الصمد" (بے نیاز) فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ممکنات سب کے سب محتاج ہیں چنانچہ بے شمار داخلی اور خارجی تراکیب ان کے اس احتیاجات کو باذن اللہ پوری کرتی ہیں گویا جماعتی نظام ممکنات کی فطرت ہے

جس کو " لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ " کے بموجب بدلا نہیں جا سکتا۔

انسانوں کے لئے خدا تعالیٰ کا پسندیدہ طریقہ اسلام کہلاتا ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات اسی طریقہ کے رہبر و رہنما ہیں ان سب نے انسانی فطرت کو بدلنے کی کوشش ہرگز نہیں کی کہ اس کا بدلنا تو اس کے پیدا کرنے والے خالق نے خود ہی ناممکن بنایا اور بتلایا ہے ہاں اس کو صحیح راستے پر ڈالنے کی محنت میں اپنی عمریں ضرور صرف کیں جماعتی نظام دوسری ممکنات کی طرح انسانیت کی بھی فطرت تھی جس کو وہ اپنے نفسانی مقاصد کے لئے بہت غلط انداز سے استعمال کرتی رہی، انبیاء صلوات اللہ علیہم اجمعین نے اس فطرت کو قائم رکھتے ہوئے اس کے مقاصد اور ہیئت سازی کی اصلاح پر توجہ فرمائی۔ چنانچہ ہر پیغمبر نے زمان و مکان کے اپنے اپنے دائرہ بعثت میں حاکمیت انسانیہ کی بجائے حاکمیت الٰہیہ کو اس کا مقصد وحید ٹھہرایا اور اس کی تصویر و تشکیل میں بھی انہیں احوال و ظروف کے مطابق تبدیلیاں کیں جن میں وہ کام کرنے پر مامور تھے۔ اس سلسلے میں خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کے انبیاء میں فقط حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید کی یہ قطعی شہادت موجود ہے کہ آپ نے حضرت طالوت کو مستحق امارت قرار دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ " وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ یعنی جماعتی نظام میں امارت کا استحقاق قوت و بصیرت پر ہے اور یہ دونوں چیزیں حضرت طالوت میں موجود تھیں۔

انتخاب امیر کے سلسلے میں اس مختصر سے ارشاد میں اتنی جامعیت ہے کہ اس کے بعد اگر آسمانی ہدایت اس ضمن میں بالکل خاموش بھی ہو جاتی تو کوئی حرج واقع نہ ہوتا۔ لیکن خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیلی اور اتمامی شان نے جہاں مسلمانوں کے جماعتی نظام کے مقصد میں مزید عظمت و شوکت پیدا کر دی اور " لِیُظْهِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ " کا اعلان کر کے بتلا دیا کہ اب جماعتی نظام کا مقصد فقط ایک محدود آبادی میں نہیں بلکہ پوری انسانی دنیا میں اظہار اور غلبہ دین ہے وہاں اس کی ہیئت سازی اور تشکیل بالخصوص آمر و مامور کے فرائض و حقوق اس قدر وضاحت و تفصیل سے بیان فرمائے کہ اس مسئلے کا کوئی گوشہ بھی مخفی باقی نہ رہا۔ نمونہ کے طور پر نبی علیہ السلام کی چند احادیث اور شیخین یعنی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے ابتدائی خطبوں کا ترجمہ

پیش کرتا ہوں۔

(۱) نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے قیامت کے دن سب سے زیادہ بلند مرتبہ وہ امام ہے جو عادل اور نرمی کرنے والا ہو اور بدترین وہ ہے جو ظالم اور سختی کرنے والا ہو۔

(۲) نبی علیہ السلام جب کسی کو امیر بنا کر کہیں بھیجتے تو ان ارشادات کے ساتھ روانہ فرماتے، "لوگوں کو خوشخبری سنایا کرو اور ان کو متنفر نہ کرو اور ہر معاملے میں یسر و سہولت سے کام لو۔ لوگوں کو مشقت میں نہ ڈالو۔"

(۳) سمع و طاعت ہر مسلمان مرد پر لازم ہے اس کی پسندیدہ باتوں میں بھی اور غیر پسندیدہ باتوں میں بھی جب تک کہ اس کو گناہ کا حکم نہ دیا جائے اور جب گناہ کا حکم دیا جائے تو کوئی سمع و طاعت لازم نہیں خلیفہ ہونے کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلا خطبہ دیا تو فرمایا:

"لوگو! مجھے تمہاری حکومت کا کام سپرد کیا گیا ہے حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں میرے نزدیک ضعیف آدمی تم میں سب سے زیادہ قوی ہے جب تک کہ اس کا حق اسے نہ دلوا دوں اور قوی آدمی تم میں سب سے زیادہ ضعیف ہے جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کر لوں۔ لوگو! میری حیثیت تمہارے ایک معمولی فرد سے زیادہ نہیں اگر تم مجھے سیدھی راہ چلتے دیکھو تو میری پیروی کرو اور اگر دیکھو کہ ٹیڑھا ہو گیا ہوں تو مجھے سیدھا کرو۔"

اور حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے ابتدائی خطبے میں فرمایا:۔

"تمہارے مال سے میرا تعلق وہی ہے جو یتیم کے مال سے اس کے ولی کا ہوتا ہے اگر میں خوشحال ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر تنگ دست ہوں گا تو جو میرا جائز حق الخدمت ہو گا وہ لے لوں گا میرے اوپر تمہارے کچھ حقوق ہیں اور تم ان کا مجھ سے مطالبہ کر سکتے ہو مجھ پر فرض ہے کہ تم سے خراج کی مد میں اور جو مال میں سے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں فئے میں عطا فرمایا کوئی ٹیکس بیجا وصول نہ کروں اور تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ جو کچھ میرے ہاتھ میں آئے وہ جائز مصرف کے سوا کسی اور صورت سے نہ نکلے۔"

معزز سامعین! اللہ تعالیٰ کو بندگی واطاعت کا وہ انداز سب سے پیارا اور محبوب ہے جو سب سے زیادہ شعوری اور اختیاری ہو یہی وجہ ہے کہ انسانی طاعت پر جنت اور اس کی بے حد و حساب نعمتوں کے وہ وعدے ہیں جو کسی مخلوق کی طاعت پر نہیں۔

اسی حقیقت کے پیش نظر اسلام نے ہر عبادت کے آغاز میں کوئی نہ کوئی ایسا طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ جس کے ذریعے سے انسانی شعور کو آخری حد تک بیدار کیا جا سکے اور وہ محض عادت کے طور پر نہیں بلکہ انتہائی گہرے احساس کے ساتھ اس عبادت کی بجا آوری کر سکے۔ چنانچہ نماز سے پہلے وضو، استقبال القبلہ اور تکبیر تحریمہ دوسرے بے شمار مصالح کے ساتھ ساتھ یہ مصلحت بھی پوری کرتے ہیں، حج میں احرام باندھنا جو کہ غیر معمولی لباس پہننے، وضو یا غسل کرنے، دو رکعت نماز پڑھنے اور زبانی نیت پر مشتمل ہے بھی تقریباً تقریباً اسی ضرورت کے تحت میں آتا ہے وعلیٰ ہذا القیاس جماعت مؤمنین کی تشکیل جس کی غرض وغایت اللہ تعالیٰ کے دین کا اظہار اور غلبہ ہے بلا شبہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ چنانچہ اسلام نے اس میں شرکت کے لئے بیعت کا وہ طریقہ مقرر فرمایا جو منتشر خیالات کو یکجا اور بکھرے ہوئے ذہن کو یکسو کر کے جماعتی زندگی کے مقصد کا احساس تازہ کرا دے اور بندگی رب کے جذبات و داعیات کو خوب جھنجھوڑ دے۔

احادیث اور اس کی روشنی میں لکھی گئی سیر و تاریخ کی تمام کتابوں سے ثابت ہے کہ نبوت کی تیرہ سالہ مکی زندگی اسلام کی اپنی نشو و نما کی زندگی تھی وہ خود ایک نرم و نازک کونپل کی صورت میں وادیٔ غیر ذی زرع کی سنگلاخ سرزمین کو شق کر کے نمودار ہوا تھا۔ ہر طرف اس کے روندے جانے کے اسباب بکھرے پڑے تھے اور وہ بہت دور دور سے اپنی غذا کھینچ کھینچ کر "اَخْرَجَ شَطْئَہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ" کے مراحل طے کر رہا تھا، بالفاظ دیگر مکی دور میں انسانی آبادی کے صالح افراد کی وہ جمعیت اکٹھی کی جا رہی تھی جس کو ضروری تربیت کے بعد اقامتِ دین کی جد و جہد میں استعمال کیا جائے۔ اس کے برخلاف مدنی دور اظہار وغلبہ دین کے اصل کام کا فعلی اور عملی میدان تھا۔ اسی فرق کی بنیاد پر قرآن حکیم کے نزول کی ترتیب یہ رہی کہ مکی دور میں تو اساسی اصول یا نماز جیسی وہ فروع نازل ہوئیں جن کا زیادہ تر تعلق جماعتی ارتباط کے استحکام سے تھا اور مدنی دور میں اقامتِ دین کی لازمی ضرورت جہاد فی سبیل اللہ اور زکوٰۃ روزہ ایسے احکام نازل ہوئے جو مجاہدے کے راستے

میں آنے والی مشکلات پر قابو پانے میں ممد و مددگار ہوں، مکّی اور مدنی زندگی کے اس امتیاز کے بعد میں آپ کو ایک اور امتیاز کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ مکّی زندگی میں جس نے بھی مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہونا چاہا کلمہ پڑھ کر کسی مزید اہتمام کے بغیر شامل ہوا لیکن مدنی زندگی کی تمہید پڑی عقبہ کی بیعتِ اولیٰ اور ثانیہ سے "سیر" کی تمام کتابوں میں مکّی زندگی کے کسی ملاقات کے واقعہ کو بیعت سے یاد نہیں کیا گیا ہے۔ یہ لفظ شہ سرخیوں کے ساتھ عنوان بنا ہے۔ اہلِ مدینہ کی پہلی اور دوسری ملاقات کا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی مکّی جماعت میں شمولیت کا رواج بیعت کے انداز پر نہ تھا۔ یہ مدنی جماعت میں شمولیت کی خصوصیت تھی۔

سامعین! اب مکّی اور مدنی زندگیوں کے ان دو امتیازات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر غور فرمائیں، کہیں اس میں یہ لطیف اشارہ تو نہیں کہ خود مسلمان بننے کے لئے تو بیعت کی ضرورت نہیں لیکن اقامتِ دین کی جدوجہد میں شرکت کے لئے اس سے مخلص نہیں۔ اگر ایسا ہے تو ثابت ہوا کہ نہ صرف یہ کہ بیعت کا نظام عقلی طور پر جماعتی فطرت سے ہم آہنگ ہے بلکہ اس کی پشت پر ایک بہت فکر انگیز نقل بھی موجود ہے۔

نبی علیہ السلام کے بعد مسلمانوں کی یک جماعتی زندگی خلافت کی صورت میں ڈھل گئی اس کے مقاصد واضح تھے۔ اور اقامتِ دین کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ لہٰذا چاروں خلفاء کی خلافت بھی بیعت کے طریقۂ کار پر منعقد ہوئی اس کے بعد اقامت یا اظہار و غلبۂ دین کا تصور مضمحل ہونے لگا اور اب تو صدیاں ہوئیں یہ حال ہو گیا ہے کہ اسلام کے نام پر حکومتیں بنتی ہیں لیکن قرار دادِ مقاصد میں اظہار و غلبۂ دین کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہوتا اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ عیّار و مکّار دشمنوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اکثر مسلمان بھی یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ فی الواقع اسلام اس معنی میں اپنا اظہار و غلبہ چاہتا ہے کہ دنیا کی ساری حاکمیتوں کو مٹا کر اپنی حاکمیت کا سکّہ جاری کرے۔ حالانکہ نبی علیہ السلام نے الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ کے صاف و صریح الفاظ سے "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" کا مورد و مصداق متعین فرمایا ہے۔

نبی علیہ السلام ہی کے زمانے میں بیعت کا ایک اور رُخ بھی سامنے آیا۔ ۶ ہجر

میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کم وبیش چودہ سو صحابہ کو لے کر مکہ کو روانہ ہوئے تو حدیبیہ کے مقام پر ٹھہرے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اہلِ مکہ کی طرف اپنی آمد اور طواف و زیارت کے ارادے کی بابت بات چیت کرنے کے لئے بھیجا۔ کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں میں یہ افواہ پھیلی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس موقعہ پر نبی علیہ السلام نے تمام مسلمانوں سے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اس بات پر بیعت لی کہ اگر حضرت عثمانؓ کو واقعتاً شہید کیا گیا ہو تو اہلِ مکہ سے اس کا انتقام لیں گے۔ شہادتِ عثمانؓ کی خبر تو غلط ثابت ہوئی لیکن بیعت کے بارے میں یہ ایک اور بات ثابت ہوئی کہ اقامتِ دین کے کل فرض کے علاوہ اگر کہیں نئے عہد و میثاق کی ضرورت محسوس ہو تو اس کے اجزاء کے لئے بھی بیعت لینی مشروع ہے اس عمل کے علاوہ نبی علیہ السلام کا ایک قولی ارشاد بھی اس معنی میں موجود ہے جس میں اعمالِ خیر پر بیعت کا ذکر موجود ہے:

عن ابی عثمان قال اخبرنی مجاشع بن مسعود السلمی قال جئت باخی ابی معبد الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد الفتح فقلت یا رسول اللہ بایعہ علی الہجرۃ قال مضت الہجرۃ باھلھا قلت فبای شئی تبایعہ قال علی الاسلام والجہاد والخیر۔

ابو عثمان نقل کرتے ہیں کہ مجاشع بن مسعود کہتے ہیں کہ میں اپنے بھائی ابو معبد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فتح مکہ کے بعد لے گیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ان سے ہجرت پر بیعت لے لیجئے۔ آپؐ نے فرمایا ہجرت تو مہاجرین پر ختم ہو چکی۔ میں نے عرض کیا پھر کس چیز پر آپؐ بیعت لیں گے؟ آپؐ نے فرمایا اسلام پر، جہاد پر، اور نیک اعمال پر۔

(شرح نووی)

علامہ نووی اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہجرتِ ممدوحہ جو فضیلت و مزیتِ ظاہرہ کا سبب آپؐ کے اصحاب کے لئے تھی وہ فتح مکہ سے پہلے تھی لیکن فتح کے بعد ختم ہو گئی کیونکہ مقصد حاصل ہو گیا، البتہ دوسری باتوں یعنی امورِ خیر، جہاد اور اسلام پر بیعت لی جا سکتی ہے اور یہ چیزیں بجائے خود بہت بڑی اہمیت اور خصوصیت کی حامل ہیں نبی علیہ السلام کے اسی قول و فعل کی بنیاد پر امت کے اندر کئی قسم کی بیعتیں مروج ہو گئیں جن میں صوفیاء کی بیعتِ ارشاد کو بہت شہرت حاصل ہوئی چونکہ ان جزوی بیعتوں کی اصل

سنت میں موجود تھی لہٰذا سلف و خلف میں سے کسی نے اس پر نکیر نہیں فرمایا۔

امارت اور بیعت کے بارے میں ایک بحث یہ بھی کی جاتی ہے کہ کیا جماعت کا امیر جماعت کا افضل ترین شخص ہونا ضروری ہے یا اس کے ہوتے ہوئے کسی مفضول کو بھی امیر بنایا جاسکتا ہے اس سلسلے میں ہماری اسلامی روایات سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ فضیلتِ کُلی تو بالکلیہ شرط نہیں البتہ زیرِ بحث جماعت کی غرض و غایت اور مناسب طبقہ کا علم و تجربہ ضروری ہے اور اس میں امتیاز و تخصص ترجیحی شرط قرار دیا جاسکتا ہے تاہم ترجیح کے اس امتیاز و تخصص کے بغیر دوسری بنیادیں بھی ہوسکتی ہیں جن پر خود نبی علیہ السّلام اور صحابہؓ و تابعین اور تبع تابعین کے زمانے کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔

جماعت اور اس کے لوازم کا مسئلہ صرف علمی اور نظری مسئلہ نہیں بلکہ مسلمانوں کی زندگی کا اہم ترین عملی مسئلہ ہے۔ چنانچہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مندرجہ ذیل سوالوں کا دوٹوک جواب تلاش کرنا بے حد ضروری ہے۔

(۱) جبکہ یہ معلوم ہے کہ اسلامی جماعت اظہار اور غلبۂ دین کی جدوجہد کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے تو کیا آج دنیا میں ٹھیک انہی خطوط پر مسلمانوں کی کوئی جماعت موجود ہے۔

(۲) اگر ہے تو ایک ہے یا متعدد۔

(۳) اگر ایک ہے تو وہ کونسی جماعت ہے اور اس کے ساتھ دنیا کے تمام مسلمانوں کے انسلاک کی کیا شکل ہے۔

(۴) اگر متعدد ہیں تو کون کونسی اور کیا اس تعدّد کی اسلام میں گنجائش بھی ہے۔

(۵) اور اگر سرے سے ایسی کوئی جماعت موجود نہیں تو کیا پوری ملّت نبی علیہ السّلام ارشاد کی روشنی میں جاہلیت کی موت مر رہی ہے۔

(۶) جاہلیت کی اس موت سے بچنے کی کوئی تدبیر ہے کہ نہیں۔

(۷) اگر ہے تو کونسی۔

(۸) اگر نہیں ہے تو "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" کی کیا تفسیر ہے۔

حضرات یہ وہ سوالات ہیں جن کا دوٹوک جواب فراہم کرنا علمائے امّت کی سب سے اوّلین اور اہم ترین ذمّہ داری ہے کہ اس کے بغیر صحیح ملّی زندگی ایک خوابِ پریشان جس کا خارج میں کوئی وجود ممکن نہیں۔

جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ پوری ملت کا مسئلہ ہے، جس پر فیصلہ کن گفتگو تو ان علمائے ملت کا مقام ہے جن کو رب تعالیٰ نے ظاہر و باطن کا تابیق علم عطا فرمایا ہو تاہم "چھوٹا منہ بڑی بات" کا مصداق بنتے ہوئے ہم اس کا ایک سرسری تجزیہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

کسی کتاب میں نظر سے گزرا ہے کہ اسرائیل کے پارلیمنٹ ہاؤس کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔

"اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں"

یہ نقل صحیح ہے یا نہیں کہنا یہ ہے کہ بلاشبہ اساسی مقصد کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ حکومت کے ایوانوں سے لے کر تمام ذیلی مراکز بلکہ ان صادق الحال لوگوں کے مکانوں سے بھی کسی نہ کسی انداز سے جھلکتا ہے جو اس مقصد کے ساتھ خالص مخلصانہ یا اس پر مستزاد ذمہ دارانہ تعلق بھی رکھتے ہوں، مطلب یہ ہے کہ اساسی مقصد کو تو پوری قوت اور ہر ممکن طریقے سے نمایاں کیا جاتا ہے کیا آج کی انسانی دنیا میں ایسی کوئی حکومت ہے جس نے ڈنکے کی چوٹ " لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ " کو اپنی حکومت کا نصب العین قرار دیا ہو اور اسی کے مطابق ابتدائی سہی اپنے عملی پروگراموں کو مرتب کیا ہو۔ ہماری محدود معلومات میں تو نہ صرف یہ کہ ایسی حکومت نہیں بلکہ تمام قابل ذکر اسلامی ممالک نے اقوام متحدہ کا رکن بن کر اس مقصد سے مجموعی طور پر دستبرداری ظاہر کی ہے کیونکہ اس کے منشور کی سب سے اہم دفعہ یہی ہے کہ حریت اور آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے جس کو کسی صورت میں بھی چھینا نہیں جا سکتا، معلوم ہوا کہ موجودہ اسلامی حکومتیں اس اسلامی جماعت کی ضرورت کو پورا نہیں کرتیں جس کے لئے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے۔ یہ حکومتیں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی الگ الگ انتظامی یونٹیں کہلائی جا سکتی ہیں جنہیں جو اسلام کا سب سے زیادہ وفادار ہے اس نے اپنے دستور میں یہ دفعہ شامل کر لی ہے کہ "قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائیگا" لیکن ان کے اپنے عمل کے مطابق اس جملے کی یہ صحیح تفسیر یا تاویل کی جا سکے گی کہ غلبۂ دین کے مقصد اعلیٰ سے برأت کے علاوہ قرآن و حدیث سے کوئی انحراف نہیں کیا جائے گا اور یا پھر اس کا مفہوم یہ بنے گا کہ قرآن و حدیث کے نہیں بلکہ اپنے تجویز کردہ مقاصد کی تکمیل کے سلسلے میں قرآن و حدیث سے روشنی حاصل کی جائے گی۔

بہر حال حکومتوں کی سطح پر یہ بات واضح ہے کہ دین محمد علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی مطلوبہ جماعت موجود نہیں۔

اس کے بعد دنیا کی ان جماعتوں کا نمبر آتا ہے جو حکومتوں کے اندر اسلام کے نام پر بنتی ہیں۔ ان جماعتوں کے بارے میں تحقیقی بات کہنا بہت مشکل ہے اس لئے بھی کہ ان کے فرائض محدود ہوتے ہیں پھر مقامی حکومتوں کی زد میں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی پوری بات پہنچا نہیں سکتیں، اس کے اندر ہم یہ کلیہ مقرر کر سکتے ہیں کہ جو جو جماعتیں اظہار اور غلبۂ دین کے مقصد کے تحت کام کر رہی ہیں اور ان کے عمومی حالات بالخصوص قیادتیں ان کے دعوے کی واضح تکذیب نہیں کرتیں تو وہاں کے گرد و پیش کے مسلمان اس میں جڑ کر جماعتی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں، یہاں ہمارے مرتب کردہ سوالنامے کا چوتھا سوال سامنے آتا ہے کہ کیا اس تعدد کی اسلام میں گنجائش بھی ہے۔ اس کا ایک ہی جواب ممکن ہے کہ موجودہ دنیا اور مسلمانوں کی وسیع آبادی میں یہ ممکن ہی نہیں کہ ابتداہی سے ایک ہی جماعت کی صورت بن جائے ہاں صحیح بنیادوں پر کام کرنے والی یہ جماعتیں بالآخر ایک صورت میں ڈھل جائیں گی اور حالات و قرائن کچھ اس طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ یہ صورت ظہورِ مہدی اور نزولِ مسیح کی صورت میں نمودار ہوگی۔

حضرات! آپ نے یہ جان لیا ہوگا کہ ملی زندگی کی ضرورت اور اس کی عملی صورت کا جو مہتم بالشان مسئلہ میں نے آپ کے سامنے رکھا تھا ہماری رائے میں اس کا واحد حل یہی ہے جو آپ کے سامنے آگیا یعنی ہر جگہ کے مسلمان مصدقہ اسلامی تنظیم میں شامل ہو جائیں یا ایسی ہی تنظیم بنالیں اور پھر مقامی حکومت کے جائز انتظامی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے اس کے حلقے کو بڑھائیں اور اگر حالات نے سازگاری کی اور اتنی قوت مجتمع ہوئی کہ یقینی طور پر مقامی حکومت بنائی جا سکے تو دریغ ہرگز نہیں ہونا چاہیئے کہ حکومت کے اصل حقدار وہ صالحین ہی ہیں جو خدا کی زمین پر خدا کا دین غالب کرنے کی محنت کر رہے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ مقامی جماعت مقامی حکومت حاصل کرنے کی قوت کیسے جمع کرے کیا مروجہ جمہوریت کا وہ یورپی انتخابی طریقہ جس میں حق و باطل کی بجائے محض کثرت و قلت پر حکومتیں ملتی اور ٹوٹتی ہیں یا احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے قوت کا استعمال بھی ممکن ہے۔ یہی ہمارے اس مقالے کا سب سے زیادہ نازک ترین مقام ہے۔ اس سلسلے میں

ہماری ابتدائی رائے یہ ہے کہ اسلام قلت و کثرت کی تفریق پر کبھی فیصلہ نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے
کہ بالادستی حق کا پیدائشی حق ہے اور اپنا حق حاصل کرنے کے لئے قوت کے استعمال میں
کوئی قباحت نہیں۔

اس پر یہ اشکال وارد کیا جا سکتا ہے کہ یہ تو نام نہاد اسلامی حکومت کے خلاف خروج
ہے جو باجماع امت ناجائز ہے۔ نام نہاد اس لئے کہ یہ بات آپ کے سامنے آچکی ہے۔
کہ فی الواقع اسلامی حکومت جو اس کے مقاصد کو ٹھیک ٹھیک پورا کر رہی ہو۔
عنقا ہے جس کا تصور تو ہے لیکن خارج میں کوئی وجود نہیں رکھتا اور دوسرے
اس لئے بھی کہا کہ اس اجماع کی تفصیلات میں یہ قید لگاتے ہیں کہ جب تک کفر بواح
کی مرتکب نہ ہو جس کا مفہوم مخالف یہ نکلتا ہے کہ فسق و فجور کی تو آخری حدود کو چھو رہی
ہو اور ظاہر ہے کہ ایسی حکومت کو حقیقی اسلامی حکومت کہنا بدترین جھوٹ ہوگا۔

بہر حال تو مخالفت اجماع کا الزام سامنے آتا ہے مشہور حنفی المسلک عالم ملا علی قاری
جو فقہ و حدیث میں یکساں طور پر مستند مانے جاتے ہیں، اس اجماع کا ذکر کر کے اس اجماع
ہی پر دو اشکال وارد کرتا ہے۔

(۱) یزید کی خلافت یا حکومت کے خلاف حضرت حسینؓ نے کیسے خروج کیا۔
(۲) آخری زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ہمارے اسلامی عقیدے کا جزو لاینفک
ہے بے شمار اسلامی سلاطین کے ہوتے ہوئے وہ تمام مسلمانوں کو اپنی امارت
پر کیسے جمع کرے گا۔

علامہ نے پہلے سوال کا جواب تو یہ دیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا خروج اس اجماع سے
پہلے تھا لیکن دوسرے اشکال کا کوئی جواب نہیں دیا ہے۔

اس کا کوئی جواب فراہم کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے
سلسلہ میں مولانا نے جو اشکال وارد کیا ہے اس کی ذرا توضیح کر دوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اہل اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ نزول فرمائیں
گے اور اپنے دین عیسوی کی نہیں بلکہ دین محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی فرمائیں
گے اس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اتنا اضافہ اور بھی فرمایا ہے کہ وہ دین محمدی
علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے چار عملی طریقوں میں سے بھی حنفیت پر کاربند رہیں گے تو

ان حقائق کے ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام دوسرے مسلمان حکمرانوں کے باوجود ا
امارت پر لوگوں کو کیسے جمع کریں گے۔
سوال کی اس تفصیل کے بعد ہم اپنا جواب سامعین کے سامنے رکھتے ہیں۔ اگر صحیح
ہے فمن اللہ اور اگر خطا ہے فمنّی۔
اجماع امت کی تین قسمیں ہیں قولی، فعلی اور سکوتی۔ ان میں سے اوّل الذکر دو قسموں
کا جامع عنوان ہے "عزیمت" اور تیسری قسم کو "رخصت" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے
اجماع کی تیسری قسم میں امام شافعی کا اختلاف ہے۔ وہ اس کو اجماع تسلیم نہیں کرتے
کیونکہ کسی ایک کی بات پر دوسروں کے خاموش ہونے کا لازمی طور پر یہ معنیٰ نہیں نکلتا کہ ا
کی رائے بھی یہی ہے بلکہ اس خاموشی کے دوسرے وجوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ تاہم احناف ا
کے قائل ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس قسم کا اجماع پہلی قسم کی طرح قطعی ہرگز نہیں۔ اب
پر یہ بات مخفی نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد منعقد ہونے والا اجماع سکوتی ہو
ہو سکتا ہے کہ عالم اسلام کے پھیل جانے کی وجہ سے اور خود حاکم وقت کے خلاف خروج
بیشمار رکاوٹوں کی بدولت اس میں پہلی صورت کے اجماع کے تمام شرائط کا پایا جانا بہت
مستبعد ہے۔
اب اجماع سکوتی بھی کئی طرح کا ہو سکتا ہے مثلاً انقطاع اجتہاد پر اجماع ہے لیکن
اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اب اس کے شروط کا پایا جانا تقریباً ناممکن ہے لیکن سب
معلوم ہے کہ زمانۂ قریب ہی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے وہ مقام پیدا کیا کہ سب کے نز
اجتہاد کے مجاز ٹھہرے۔ چنانچہ انہوں نے کسی ایک مسلک کی کلّی پابندی کی بجائے اصو
فروع میں ایک مختلط انداز اختیار کیا۔ ٹھیک اسی طرح سے حرمتِ خروج کے ا
میں بھی یہ دلیل بیان کی گئی ہے کہ اس کا آخری نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ تو اگر
بھی اس بات کے یقینی اسباب پیدا ہو جائیں کہ صحیح اسلامی حکومت قائم کی جا سکتی ہے
قوت کا استعمال کیوں حرام اور ناجائز ہو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے حق میں یہ یقینی فضا
لہٰذا وہ مسلمانوں کی سب سے مرکزی جماعت کی تشکیل فرما لیں گے۔ اسی انداز پر اگر کہ
مقامی جماعت مقامی حکومت کو یقینی طور پر لے سکے تو کسی اجماع کے خلاف لازم نہ آئیگا

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

—۳—

شرک اور اقسامِ شرک

شرک فی الصفات (۲)

ڈاکٹر اسرار احمد

قدرت و مشیّت

صفاتِ الٰہی کے ذیل میں مَیں اب دو اہم صفات یعنی قدرت اور مشیّت کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ قرآن مجید جس توحید باری تعالیٰ کی دعوت دیتا ہے اس کا اہم ترین اقتضا یہ ہے کہ اس بات کو قلبی یقین کے ساتھ تسلیم کیا جائے کہ اُس کی قدرت اور مشیّت اس کی ذاتی اور مطلق (ABSOLUTE) ہیں جن پر کوئی تحدید نہیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ط اور ـــــ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ط ـــــ کا یہی مفہوم ہے

انسان میں جو بھی قدرت یا طاقت اور قوتِ ارادی و عمل نظر آتی ہے، وہ اس کی ذاتی نہیں بلکہ بالکلیہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے اور ابتلاء و آزمائش اور امتحان کی غرض چند حدود و قیود کے ساتھ اُس کو دی گئی ہے۔

اسی بات کو حضورؐ کو اور آپؐ کے واسطے سے اُمّت کو تعلیم دینے کے لیے سورۂ کہف میں فرمایا کہ:

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ط اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (آیت ۲۳، ۲۴)	اور (اے نبی!) کبھی یہ نہ کہنا کہ مَیں یہ کام کل ضرور کروں گا مگر اس (استثناء) کے ساتھ کہ اگر اللہ چاہے۔

سورۃ الدہر میں فرمایا:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ	اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک

اللّٰہُ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ہ (آیت ۳۰)

اللہ نہ چاہے۔ بے شک اللہ بڑا علیم ہے!

سُورۃ التکویر میں فرمایا:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہ (آیت ۲۹)

اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے جو سارے جہانوں کا ربّ (مالک و مختار) ہے۔

ان ہی ہدایات کے نتیجے میں حضورؐ نے اُمّت کو تعلیم دی کہ جب بھی کسی کام کی انجام دہی کا وعدہ اور ارادہ کرو تو اِنْ شاء اللہ ضرور کہا کرو۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ و کاملہ اور اس کائنات میں صرف اُسی کی ذاتِ برتر کی مشیّت کی کارفرمائی کا قرآنِ حکیم میں مختلف اسالیب کے ساتھ بار بار ذکر آیا ہے جن میں سے چند کا حوالہ مَیں اپنی اس گفتگو میں متعدد بار دے چکا ہوں اور چند آیات مَیں نے ابھی پیش کی ہیں۔ ان تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدرت و مشیّت پر کامل ایمان و ایقان عقیدۂ توحید کے اثبات میں اور شرک کے ابطال میں بنیادی اور اساسی معتقدات میں شامل ہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ فرما کر واضح کر دیا کہ مخلوقات میں سے چاہے وہ انبیاء و رُسُل ہوں، چاہے وہ ملائکۂ مقرّبین ہوں، چاہے وہ اولیاء اللہ اور صلحاء و اتقیا ہوں، چاہے وہ اجرامِ فلکی ہوں، گردشِ لیل و نہار ہو، وہ جنّات و شیاطین ہوں۔ الغرض ماسوا میں سے کسی میں نہ نفع پہنچانے کی کوئی ذاتی طاقت ہے نہ خیر پہنچانے کی۔ نہ ضرر پہنچانے کی ذاتی قدرت ہے نہ ضرر سے بچانے اور محفوظ رکھنے کی، نہ کچھ دینے کی اہلیّت ہے نہ کچھ چھیننے کی۔ اللہ کے سوا کوئی حاجت روا نہیں کوئی دست گیر نہیں، کوئی مولا نہیں، کوئی حامی و ناصر نہیں۔ صرف وہی ذات ہے جو نعم المولیٰ و نعم النّصیر ہے اور اسی کی ذات فَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کی شان کی حامل ہے اور مطلق نافع و ضار بھی اُسی کی ذاتِ گرامی ہے ــــــــــ اگر مخلوق میں سے کوئی ایسی استعداد حاصل ہوگی تو وہ اذنِ ربّ اور مشیّتِ الٰہی کے تابع ہوگی، اور اسی حد تک ہوگی جس حد تک اللہ کی مشیّت چاہے گی اور وہ خالص عطائی ہوگی۔

نبی اکرمؐ کی مزید وضاحت: احادیث شریفہ میں مذکور ہے کہ ایک موقع پر نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا :
"میرے بچے مَیں تم کو چند باتیں بتاتا ہوں اُن کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو!" ان میں یہ بات بھی تھی کہ "اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ دُنیا کے سب لوگ مل کر بھی چاہیں کہ تم کو کوئی نفع پہنچائیں تو نہیں پہنچا سکتے، مگر اتنا ہی جتنا اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے پہلے سے طے کر دیا ہے۔ اور اگر سب لوگ مل کر بھی چاہیں کہ تم کو کوئی ضرر اور نقصان پہنچائیں تو نہیں پہنچا سکتے، مگر صرف اتنا جتنا اللہ کی طرف سے تمھارے لیے پہلے سے مقدر ہو چکا ہو۔" (اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

حاصل کلام یہ ہے کہ اذنِ ربّ اور مشیّتِ ربّ سے آزاد ہو کر کسی میں کوئی طاقت نہیں کہ وہ کسی کو کوئی نفع و ضرر پہنچا سکے۔ کسی کی حاجت روائی کر سکے، کسی کی دست گیری کر سکے۔ یہ صرف اور صرف اللہ ہی کی ذاتِ بے ہمتا ہے جو کہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ اور یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ کی شان کی حامل ہے ـــــ ہماری بے چارگی کا عالم تو یہ ہے جن کا مَیں دو آیات کے حوالے سے ابھی ذکر کر چکا ہوں کہ : وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ۔ اس کے مطلب اور مفہوم کا ایک درجہ تو وہ ہے جو ترجمہ میں اختیار کیا گیا کہ : "تمھارے چاہے کچھ نہیں ہو گا جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔" اور اگر اس کا یہ مفہوم لیا جائے کہ : "تمھارا چاہنا بھی اللہ کے چاہنے پر منحصر ہے!" تو اس کی بھی گنجائش موجود ہے اس کی نفی نہیں کی جا سکتی یعنی "چاہت" کا پیدا ہونا بھی اللہ کی مشیّت پر موقوف و منحصر ہے۔ پس قدرت، قوت، مشیّت ان الفاظ کی حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے اور اگر یہ فرق و امتیاز قائم رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح اُس کی صفات بھی مطلق اور غیر محدود و لامتناہی ہیں تو یہ توحید ہے۔ لیکن اگر اس میں التباس ہو گیا اور کسی درجہ میں بھی ان صفات کو غیر اللہ کے لیے مان لیا گیا تو یہ شرک فی القدرت، شرک فی القوت اور شرک فی المشیّت ہو جائے گا۔

شفاعت مطلقہ یا باطلہ | اللہ تعالیٰ کی ان صفاتِ قدرت و مشیّت میں التباس کے باعث ہمارے عالم نما جہلا اور بے علم واعظین و شعراء میں شفاعتِ مطلقہ اور شفاعتِ باطلہ کا تصوّر پیدا ہوا۔ جس کی مسلسل نشر و اشاعت نے ہمارے دین سے ناواقف عوام و خواص کو ایک بہت ہی بڑی گمراہی و ضلالت میں مبتلا کر کے اُن کو دینی فرائض کی انجام دہی

سے غافل، اسلامی اخلاقیات سے عاری اور معصیت کا عادی و خوگر بنا دیا ہے اور ان کو ایسے اعمال و افعال میں مبتلا کر دیا ہے جو اسلام کی دعوتِ توحید، عبادتِ ربّ، اور خلوص و اخلاص کے حقیقی مفہوم اور نجاتِ اُخروی کی ناگزیر شرائط کی بالکل ضد ہیں بلکہ اگر میں یہ عرض کروں کہ عقیدے سے لے کر عمل تک یہ تمام چیزیں مشرکانہ ہی نہیں بغاوت و طغیان ہیں تو بے جا اور غلط نہ ہوگا۔

مجھے احساس ہے کہ میں نے بات بڑی تلخ کہی ہے لیکن اصلاحِ حال کے لیے صحیح تشخیص اور صحیح علاج ضروری ہوتا ہے اور بسا اوقات اس علاج کے لیے تلخ، کڑوی اور کسیلی ادویہ کا دیا جانا بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ شرک فی الصفات کے ذیل میں، میں نے جو تین نکات، تین اُصول، اور تین فارمولے آپ کے سامنے رکھے تھے۔ ان پر میری معروضات کو جانچئے اور پرکھتے چلے جائیے۔ اگر میری بات ان کے مطابق ہو اور آپ کے دل کو لگے تو پھر ان کو تسلیم کیجئے اور اس کی ہرگز پرواہ نہ کیجئے کہ کون سے عقائد ہمیں آباء و اجداد سے وراثتاً منتقل ہوئے ہیں اور ان کی پشت پر عوام و خواص کی کتنی عظیم اکثریت کی تائید موجود ہے۔ غلط بہر حال غلط ہے چاہے اس پر عمل کرنے والے لاتعداد و بے شمار ہوں۔ میں ابتدا ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ: "علمِ توحید کے حصول کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ شرک اور اُس کی جُملہ اقسام کی معرفت حاصل ہو جائے اور انسان یہ جان لے کہ شرک کن کن صورتوں میں حملہ آور ہوتا ہے اور کیسے کیسے بھیس بدل کر آتا ہے، کن کن راستوں سے توحید کی پونجی پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ چنانچہ شرک کے مکمل فہم کے حصول کے بعد ہی مسلمان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ اپنی حقیقی اور بیش بہا متاعِ ایمان کی حفاظت کر سکے۔ لہٰذا شرک اور اقسامِ شرک کی گفتگو تشنہ رہ جائے گی، اگر اس غلط عقیدے سے تعرّض نہ کیا جائے جو شفاعتِ مطلقہ بلکہ صحیح مفہوم کے مطابق شفاعتِ باطلہ کی صورت میں ہمارے معاشرے کی عظیم اکثریت میں موجود ہے جو رُوح اور عمل دونوں اعتبارات سے خالص مشرکانہ عقیدہ ہے۔

یہ عقیدہ کیا ہے؟ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ کچھ برگزیدہ ہستیاں ایسی بھی ہیں جو خدا کے فیصلے کو بدلوا سکتی ہیں۔ خدا کے عدل و انصاف کے آڑے آسکتی ہیں۔ دربارِ خداوندی میں ان کا کوئی ایسا ذاتی مرتبہ، مقام یا منصب بھی

ہے کہ وہ اس کے بل پر مشیتِ الٰہی اور اس کے فیصلوں کے بدلوانے میں اپنا زور، اثر اور رسوخ استعمال کر سکتی ہیں یہ یقیناً خالص مشرکانہ تصوّر ہے۔ پھر خدا کی قدرت اور مشیتِ مطلق کہاں رہی؟ اس تصوّر کے نتیجے میں تو مطلق قدرت و مشیت اس کو حاصل ہو گئی جس کے لیے خدا کے فیصلوں کو بدلوانے کا اختیار تسلیم کر لیا گیا۔ اس طور پر تو خدا کی قدرت و مشیت ہی نہیں بلکہ اس کی صفتِ عدل بھی مطلق نہ رہی بلکہ وہ بھی مقیّد ہو گئی اور نعوذ باللہ اس طرح تو اللہ عزّ و جلّ پر بھی اس کو فوقیت حاصل ہو گئی جس نے اللہ کے فیصلے میں روک لگا دی اور اس کو بدلوا دیا۔ اس اعتبار سے اس عقیدے نے اللہ تعالیٰ کو اس کے مقامِ رفیع سے گرا کر اُس کے سنگھاسن پر اُسے براجمان کر دیا کہ جس کے لیے اللہ کے فیصلوں کو بدلوانے کا اختیار مان لیا گیا۔ اسی تصوّر، اسی نظریہ، اور اسی عقیدے ہی کا دوسرا نام شرک ہے، جیسا کہ میں بالکل آغاز میں وضاحت کر چکا ہوں ——— یہاں میں اس بات کی بھی تصریح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں اس شفاعت کا مقر اور قائل ہوں جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اور صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیثِ صحیحہ میں دی ہے۔ میں جس شفاعت کی نفی کر رہا ہوں وہ شفاعتِ مطلقہ اور شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ ہے۔

قرآنِ حکیم سے شواہد | قرآنِ حکیم میں جس شفاعتِ باطلہ کی نفی کی گئی ہے اس سے متعلق میں چند آیات پیش کرتا ہوں، پہلے اُن کو سُن لیجیے۔ بعدہٗ میں وہ چند آیات پیش کروں گا جن میں اذنِ ربّ کے ساتھ شفاعت اور اُس کے چند شرائط و لوازم کا ذکر ہے پھر میں اِن کی تشریح میں کچھ عرض کروں گا۔ شفاعتِ مطلقہ کی نفی کو سمجھنے کے لیے ان آیات پر تدبّر کیجیے۔ سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ○ (آیت ۴۸)	اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی۔ نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائیگا اور نہ ہی اُن کی کوئی مدد کی جائے گی۔

اسی سورۂ مبارکہ میں بنی اسرائیل کو ایک دوسرے اسلوب سے متنبّہ کیا گیا: ـــ

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ٥ (آیت ۱۲۳)

اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ قبول ہوگا اور نہ اس کو کوئی شفاعت نفع پہنچائے گی اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔

پھر اسی سورۂ بقرہ میں اہلِ ایمان کو خبردار کیا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ٥ (آیت ۲۵۴)

اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو۔ اُس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش ہی نفع پہنچائے گی۔ اور جو لوگ انکار کرنے والے ہیں اپنے اوپر اصلی ظلم ڈھانے والے وہی ہیں۔

سورۃ الزمر میں فرمایا:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ٥ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ٥ (آیت ۴۳-۴۴)

کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہہ دیجئے کیا وہ شفاعت کریں گے۔ جن کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں! کہہ دیجئے کہ شفاعت تو کُل کی کُل اللہ کے لیے ہے اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی تو اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے پھر اُسی کی طرف لوٹائے جانے والے ہو!

متذکرہ آیات میں جس شفاعت کی اتنی شدّ و مدّ اور اتنے مؤثر انداز میں نفی کی گئی ہے کہ یہاں تک فرما دیا کہ: قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ تو اس کی اصل غایت یہ ہے کہ مومنین صادقین چوکس اور چوکنے رہیں اور اُس غلط فہمی اور مغالطے میں مبتلا نہ ہوں کہ جس طرح دنیا میں دُنیوی لحاظ سے کوئی مقتدر اور بااثر شخصیت کسی مجرم کی سفارش کرکے اُسے سزا سے بچا لیتا ہے اور اس طرح بااثر اور مقتدر لوگوں کے ساتھ تعلق رکھنے

ے لوگ قانون کی گرفت سے بے پرواہ ہو کر جرائم میں جری اور دلیر ہو جاتے ہیں، اُسی طرح
نت اُخروی میں چند مقتدر اور اللہ کی محبوب ہستیاں محض ان سے نام کی نسبت رکھنے
بہ سے ان کی سفارش کر کے ان کو خدا کے عذاب اور گناہوں کی پاداش سے بچا لیں
علمی تجزیہ کیجئے تو بالکل واضح ہو جائے گا کہ یہ نظریہ اپنی اصل اور اپنی روح کے
تبار سے سراسر مشرکانہ نظریہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بظاہر تو کرسیٔ اقتدار پر
میاں ہی براجمان ہیں۔ لیکن ان سے بالاتر ہستی کوئی اور بھی موجود ہے جو اُن کے
سل میں آڑے آسکتی ہے، اُن کے فیصلے بدلوا سکتی ہے اور مجرمین کو اپنے کرتوتوں
سزا اور عقوبت سے بچا سکتی ہے۔ اس طرح تو گویا نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ خدائے
ار کی قہاریت وجبروت اور اس کی عدالت کی کامل نفی ہو گئی اور اُسے بھی پارلیمانی طرز
حکومت کے آئینی صدر کی حیثیت دے دی گئی کہ دستوری طور پر وہ ملک کا حقیقی
سربراہ ہوتا ہے اور کوئی قانون اس کی منظوری کے بغیر نافذ العمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن
وہ اپنی مرضی میں آزاد نہیں، وہ پارلیمانی کابینہ اور بالخصوص وزیرِ اعظم کی مرضی کا تابع
ہوتا ہے۔ فیصلے وہ کرتے ہیں اور SHOW BOY کی طرح نفاذ صدر کے حکم سے عمل
میں آتا ہے۔ یا خدا کو دنیا کے ان بادشاہوں پر قیاس کر لیا گیا جو اپنے مقرّبین و مصاحبین کی
سفارشات قبول کرنے پر اپنی بادشاہت کو بچانے کیلئے خود کو مجبورِ محض پاتے ہیں۔

التباس اور غلط فہمی کے اسباب | شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے اور اس نے قیامت
ے انسان کو بھٹکانے کی مہلت مانگی جو اس کو بارگاہِ خداوندی سے مل چکی ہے۔ وہ انسان
کو مختلف مغالطوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انسان اسکے دام ہم رنگِ زمیں
میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ان مغالطوں میں ایک مغالطہ شفاعتِ باطلہ کا بھی ہے۔

یہود | یہود کو اُس نے اِس غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ چونکہ ہم اللہ کے جلیل القدر انبیاء
کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہم پر اس دنیا میں بہت سے اکرام و انعام کی بارش کی ہے
لہٰذا ہم اُس کے چہیتے ہوئے اور ہم تو بخشے بخشائے ہیں۔ اس لئے وہ دعویٰ کیا کرتے تھے
کہ: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ط (ہم تو بیٹوں کے مانند اللہ کے چہیتے ہیں) اور
وہ اِس پندار میں گرفتار تھے کہ: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ط
(اور انہوں نے کہا کہ آگ ہم کو ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن!)

نصاریٰ | عیسائیوں کو شیطان نے اس مغالطے میں مبتلا کیا کہ انسان پیدائشی طور پر

حضرت آدمؑ کے اُس گناہ کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے جو انہوں نے جنّت میں اُس درخت کا پھل کھا کر نافرمانی کی صورت میں کیا تھا۔ جس کو کھانے سے منع کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بصورت انسان بھیجا اور اس کو اس گناہ کے کفارے کے طور پر صلیب پر چڑھوا دیا۔ بس اب جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مان کر اس پر ایمان لائیں گے وہ آسمانی بادشاہت میں داخل کئے جائیں گے۔ اس حیاتِ دُنیوی کا کوئی کبیرہ صغیرہ گناہ اُن کی نجات میں آڑے نہیں آئے گا۔ پھر وہ بھی اسی مغالطے میں مبتلا تھے کہ ہم بھی اللہ کو بیٹوں کے مانند عزیز ہیں۔ چنانچہ سورۂ مائدہ کی جس آیت کے ایک ٹکڑے کا میں یہود کے ذکر میں حوالہ دے چکا ہوں وہ یوں ہے کہ : وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ط گویا یہ دونوں گروہ اپنے اپنے انبیاء کو اپنے لئے شفیع کل سمجھتے تھے ۔۔۔۔!!

بنی اسمٰعیل | اہلِ عرب جو زیادہ تر حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی نسل پر مشتمل تھے خدا کے منکر نہیں تھے۔ بلکہ وہ خدا کی بنیادی صفات کو بھی مانتے تھے۔ وہ اس کائنات کا خالق خدا ہی کو تسلیم کرتے تھے۔ رزق دینے والا، زندگی اور موت دینے والا اُسی کو سمجھتے تھے، اس کی شہادت خود قرآن نے دی ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ کچھ ایسی باتیں بھی مانتے اور کچھ ایسے کام بھی کرتے تھے جن سے خدا کی صفات اور ان کے مقتضیات سے انکار لازم آتا تھا، جو کفر ہے یا خدا کی صفات اور اس کے حقوق میں دوسروں کی شرکت لازم آتی تھی جو شرک ہے۔ قرآن مجید میں اُن کے باطل نظریات پر مختلف انداز میں تنقید کی گئی ہے۔ ان کے مشرکانہ عقیدوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ جن معبودانِ باطل کی وہ پرستش کرتے تھے۔ جن کے سامنے وہ مراسم عبودیّت بجا لاتے تھے تو وہ ان کو اللہ کے ہاں اپنے لیے سفارشی اور شفیع سمجھتے تھے ۔۔۔۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہمارے یہ معبود اللہ کے ہاں ہماری سفارش کر کے ہماری بگڑی بنا سکتے ہیں۔ اس باطل عقیدے کا سورۃ الزمر میں ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے :

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط (آیت ۳)	اور جنھوں نے اللہ کے سوا مددگار ٹھیرا لئے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کو محض اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے قریب کر دیں۔

اُمّتِ مُسلمہ | بڑے دُکھ کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے صدیوں کے علمی، فکری،

عملی اور سیاسی انحطاط اور دوسرے مذاہب کے ذہنی و فکری غلبے اور دین (بالخصوص قرآن مجید اور حدیث شریف) سے لاعلمی اور عدمِ واقفیت کے سبب سے مسلمانوں کی عظیم اکثریت بھی اس مغالطہ اور "خوش فہمی" اور ناعاقبت اندیشی میں مبتلا ہوگئی کہ جب ہم اُمّتِ مسلمہ اور دامنِ محمّدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسلام سے وابستہ ہیں تو حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم ہماری لازماً شفاعت فرمائیں گے، اور ہم نارِ جہنّم کے عذاب سے بچا لیے جائیں گے۔ اس طرح اس باطل عقیدے کی وجہ سے ہماری یہود و نصاریٰ سے ایک مماثلت و مشابہت پیدا ہوگئی اور ہماری عظیم اکثریت اسی باطل نظریے اور عقیدے کی وجہ سے فرائضِ دینی سے غافل، اعمالِ صالحہ اور اسلامی اخلاق سے عاری اور معاملات میں خالص دنیا پرستی، ہوا پرستی اور مال و منال کی اندھی محبّت میں گرفتار ہوگئی ـــــ قانونی طور پر سب مسلمان لیکن عملی طور پر ان میں وہ سب اقسام انتہائی گھناؤنی شکل میں موجود، جو کفّار و فجّار اور مشرکین میں پائی جاتی ہیں ـــ اُن کے نزدیک دین ایک DOGMA سے زیادہ کوئی مقام نہیں رکھتا، مسلمانوں کے گھر پیدا ہوجانا ہی اُن کے نزدیک شفاعتِ محمّدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام اور نجاتِ اُخروی کے لیے کافی ہے۔ چاہے عقیدے اور عمل کے لحاظ سے یہ کتنی ہی مشرکانہ اور مبتدعانہ زندگی بسر کر رہے ہوں۔ یہ قول و عمل کا تضاد اور یہ کفرانِ نعمت نتیجہ ہے اس عقیدے کا جس کو میں نے شفاعتِ مطلقہ اور شفاعتِ باطلہ سے تعبیر کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ قدرت و مشیّت اور عدل میں قطعاً شرک ہے۔

رہی باقی امّت، تو اُس میں بھی اکثر کا حال یہ ہے کہ اُن کا مبلغِ علم بس چند فقہی مسائل تک محدود ہے اور وہ اگرچہ فرائض کی پابندی بھی کرتے ہیں لیکن معاملات، اخلاقیات اور اُن کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے بہت سے بلکہ بے شمار گوشے دین کی گرفت سے بالکل آزاد ہیں۔ دراصل اس تل کی اوٹ میں بھی اسی شفاعتِ باطلہ کا پہاڑ اوجھل ہے!

بہت ہی قلیل تعداد ہوگی، اُن خوش بختوں اور سعید لوگوں کی کہ جن کے متعلق حضورؐ نے فرمایا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ "میری اُمّت میں تا قیامِ قیامت ایک ایسا گروہ موجود رہے گا جو حق پر قائم رہے گا اور حق کا داعی ہوگا" (او کما قال صلّی اللہ علیہ وسلّم!)

اغیار کی طنز و تعریض | واقعی جس صورتِ حال کا میں نے بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس کو دیکھ کر ہی تو عہدِ حاضر کے عظیم مغربی مفکر آنجہانی جارج برنارڈ شا نے کہا

تھا کہ "میں جب قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانی مسائل کے حل کے لیے دنیا میں اِس سے بہتر کوئی کتاب نہیں اور جب مسلمان قوم کو دیکھتا ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ اس سے زیادہ پست اخلاق اور ذلیل و خوار قوم اور کوئی نہیں"۔

نبی اکرمؐ کا عمل | نسل اور دین کے قانونی تعلق کی بنیاد پر شفاعت و نجات کے غلط نظریہ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اسالیب سے تردید فرمائی ہے۔ ان تعلیمات میں خصوصیت کے ساتھ وہ خطبہ ہمارے لئے مشعلِ راہ بن سکتا ہے جو حضورؐ نے اپنے اہلِ خاندان کو جمع کر کے ارشاد فرمایا تھا۔ رشتہ داری کے لحاظ سے جو لوگ قریب ترین تعلق کے حامل ہو سکتے ہیں، اُن میں سے دو کو بطور نمائندہ نام بنام مخاطب کر کے فرمایا کہ:

یَا فَاطِمَۃُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم) انقذی نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ لَا اَمْلِكُ لَكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا یَا صَفِيَّۃُ عَمَّۃَ رَسُوْلِ اللّٰهِ انقذی نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ لَا اَمْلِكُ لَكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ط	اے فاطمہ! محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لختِ جگر، اپنے آپ کو اللہ کی آگ سے بچانے کی فکر کرو اِس لیے کہ میں اللہ کے ہاں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اور اے صفیہ!! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پھوپھی اپنے آپ کو اللہ کی آگ سے بچانے کی فکر کرو کیونکہ میں اللہ کے ہاں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لرزا دینے والا ہے۔ غور کیجئے کہ جب نبی اکرمؐ اپنی نورِ چشم اور اپنی پھوپھی رضی اللہ عنہما کو اللہ کی پکڑ سے بچانے کے لیے مجبوری اور معذرت فرما رہے ہیں تو ہما شما کس شمار و قطار میں آئیں گے!!

شفاعت اور نصوصِ قرآنی | قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر واضح طور پر عدالتِ اُخروی میں عدل و انصاف کے لئے قواعد و ضوابط بیان فرما دیئے گئے ہیں۔

اِن میں سے پہلا ضابطہ تو کھلے کھلے کفّار اور مشرکین کے لیے مقرر ہے، جن میں سے چند کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں جو بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے بیان فرمایا گیا تھا۔ اب چند اور سُن لیجئے۔ سُورۃ الشعراء میں فرمایا کہ جب "غَاوِیْن" (راہِ حق سے بھٹکے ہوئے یعنی مشرکین و کفار) کے لیے جہنم کھول دی جائے گی اور وہ اُس میں اُوندھے منہ جھونکے جائیں گے تو وہ اپنے ان لیڈروں اور معبودانِ باطل سے، جن کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے، باہم جھگڑا کرتے ہوئے کہیں گے۔

تَاللّٰہِ اِنْ کُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّیْکُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ ۝ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ ۝ (آیت ۹۷ تا ۱۰۱)

خدا کی قسم! ہم تو کھلی گمراہی میں تھے جب کہ ہم تم کو خداوندِ عالم کا ہمسر ٹھہراتے رہے اور ہم کو تو بس مجرموں نے گمراہ کیا، تو اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ دلی دوست!

سورۃ المدّثر میں فرمایا: فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (آیت ۴۸):-
ں (آخرت میں) شفاعت کرنے والوں کی کوئی شفاعت اُن (مشرکین و کفار) کو کوئی ہ نہیں دے گی!)

سورۂ اعراف میں مشرکین و کفار کا وہ قول نقل ہوا ہے جو وہ آخرت میں انتہائی حسرت و ے ساتھ اور پشیمانی کے طور پر کہیں گے کہ: فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ ں کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہماری سفارش کریں؟)

پوری نوعِ انسانی کے لیے جن میں مشرک، کافر، منافق، مومن سب ہی شامل ۔ عدالتِ اُخروی میں عدل و انصاف کے لیے اللّٰہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں جو ضابطے بیان ے ہیں اُن میں سے بھی چند کا ذکر مفید مطلب ہوگا۔

سورۂ بقرہ میں آیت ۱۴۱ میں اس ضابطے کو ان الفاظ میں بیان فرمایا: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ج ("یعنی سابقہ امتیں جو گزر چکیں" اُن کو ملے گا جو کچھ انہوں نے یا اور تم کو ملے گا جو کچھ تم نے کمایا!) اِسی سورۂ مبارکہ میں آخری آیت ۲۸۶ کا آغاز لفاظ سے فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط: (اللّٰہ کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر ایک ے گا اور بھرے گا جو کرے گا!)

آخرت میں کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، اور نفسی نفسی کا عالم طاری ہوگا۔ کسی کا اٹھانے والا کوئی نہیں ہوگا — یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے بیان ہوا ۔ چنانچہ سورۃ النجم میں فرمایا:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ

اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اُس نے سعی کی ہے۔ اور یہ کہ اُس کی

نُرٰی ۝ ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی (آیات ۳۹ تا ۴۱) سعی عنقریب دیکھی جائے گی۔ پھر اُس کی پوری جزا اُسے دیدی جائے گی۔

یہ مضمون کہ : لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۝ صیغوں کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ قرآن مجید میں بار بار آیا ہے۔ سورۃ الانعام میں بھی، سورۂ بنی اسرائیل، سورۃ الفاطر اور سورۃ الزمر میں بھی۔

شفاعتِ حقّہ | جیسا کہ مَیں پہلے عرض کر چکا کہ شفاعتِ حقّہ کا قرآن مجید میں ذکر موجود ہے اور شفاعتِ حقّہ کا عقیدہ و نظریہ عین حق بلکہ جُزوِ ایمان ہے۔ لیکن یہ شفاعت چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے، جس کا میں قدرے تفصیل سے آگے ذکر کروں گا۔ اس سے قبل میں چاہتا ہوں کہ حکمتِ شفاعت کی کچھ وضاحت کر دوں۔

اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشّہادۃ ہے، وہ علّامُ الغیوب ہے، وہ علیم ہے اور علیم بھی کیسا علیم، کہ مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ اور وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کی شان کا حامل۔ اُس کی عدالتِ اُخروی میں حضرت آدمؑ سے لے کر تا قیامِ قیامت جتنے بھی انسان پیدا کئے گئے تھے۔ وہ سب کے سب حساب و کتاب کے لیے اپنے اپنے اعمال ناموں کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ اللہ عزّ وجلّ اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر جانتے ہیں کہ کون کیا کما کر لایا ہے۔ کون سزا کا مستوجب اور کون جزا کا استحقاق رکھتا ہے اور کون ہے جو رعایت اور رحم و کرم کا مستحق ہے۔ وہ چاہیں تو اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر باغیوں کو، طاغیوں کو، سرکشوں کو، نافرمانوں کو، کافروں اور مشرکوں کو نارِ جہنّم میں جھونکنے اور فرماں برداروں کو نیکوکاروں کو، مومنین صادقین و قانتین کو جنّت کے باغات میں داخل ہونے کا حکم صادر فرما دیں اور جو رعایت کے مستحق ہیں ان کو چاہیں تو اپنی شانِ رحیمی اور شانِ غفاریّت کے طفیل بخش دیں اور چاہیں تو اپنی شانِ قہاریّت اور شانِ غیوریّت کا مظاہرہ فرمائیں اور اُن کو بھی سزا کا سزاوار ٹھہرا دیں۔ چاہیں تو سب کو بلا حساب و کتاب معاف فرما دیں اور سب کو خلودِ جنّت سے سرفراز فرمائیں اور چاہیں تو سب کو نارِ جہنّم کا ایندھن بنانے کا فیصلہ صادر فرما دیں۔ چونکہ اُن کی تو شان ہی یہ ہے کہ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ اختیارِ مطلق کی جس پر کوئی تحدید نہ ہو۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ کی اطلاقی شان کا مقتضیٰ یہی ہے THE ABSOLUTE SOVEREIGNTY اسی طرزِ عمل کا نام ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ ــــــ

نّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ ط اور فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ط سے یہی اطلاقی و مطلقہ شان
د ہے۔ وہ ربّ العٰلمین ہے، وہ مالک الملک ہے، وہ اَلۡعَزِیۡزُ الۡجَبَّارُ الۡمُتَکَبِّرُ ہے۔
اپنے بندوں، اپنے غلاموں اور اپنی مخلوق کے ساتھ جو چاہے معاملہ کرے۔ یہی بات
جو آخرت میں حضرت عیسٰی علیہ السّلام بارگاہِ خداوندی میں عرض کریں گے: اِنۡ
تُعَذِّبۡہُمۡ فَاِنَّہُمۡ عِبَادُکَ ۚ وَ اِنۡ تَغۡفِرۡ لَہُمۡ فَاِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ط
سورۂ مائدہ آیت ۱۱۸) لیکن جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ اس آیتِ کریمہ میں اس کی صفت
عزیز کے ساتھ ساتھ صفتِ الحکیم بھی بیان ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر العزیز
یم کی صفات ساتھ ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ یعنی وہ جہاں العزیز (زبردست و غالب)
وہاں وہ الحکیم بھی ہے اور اُس کی حکمت ہی کے مقتضیات میں یہ بات بھی شامل ہے
وہ اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر فیصلے صادر فرمانے کے بجائے ہر انسان کے اعمال و افعال
ں اور ارادوں کا محاسبہ فرمائے، اس پر شہادتیں گزارے، اس کو صفائی کا پورا
قعہ عنایت فرمائے، ان پر قطع عذر فرمائے۔ وہ العادل، المنصف، الرؤف، الرّحیم
ہے۔ لہٰذا ان صفات کا آخرت میں بھرپور ظہور ہوگا۔ عدل و انصاف اس کی شانِ رأفت کر
یت کے لوازم میں سے ہیں۔ اس کے لیے بطورِ دلیل سُورۂ قلم کی یہ آیات کافی ہیں۔

اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ؕ مَا لَکُمۡ ٝ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ۚ (آیت ۳۵-۳۶)

کیا ہم فرماں برداروں کا حال (انجام کار کے لحاظ سے) مجرموں جیسا کر دیں گے؟ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسے (ناروا) حکم لگاتے ہو؟

فاعت حقّہ کے شرائط و لوازم | شفاعت دراصل ایک اعزاز و اکرام ہے
س سے وہ اپنے اُن محبوب بندوں کو سرفراز فرمائے گا جو منعم علیہم کے زمرے میں
مل ہوں گے۔ یعنی انبیاء، صدّیقین، شہداء اور صالحین —— اور اس طائفہ کے
خیل و سردار ہیں شافعِ محشر جناب محمدؐ مصطفیٰ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ اللّٰہ کے ان محبوب
باد الرّحمٰن کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ جس کے حق میں جی چاہے سفارش کریں گے،
وہ کتنا ہی بڑا مجرم کیوں نہ ہو۔ تو یہ عقیدہ اور نظریہ نہ صرف ان عباد الرّحمٰن کا سُوءِ
ب ہے بلکہ اُن کی شان میں گستاخی ہے۔ لہٰذا ایسی بے سر و پا سفارش کا احکم الحاکمین

کی عدالت میں پیش کرنے کا عقیدہ و تصور سراسر ضلالت و گمراہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی
شفاعت رد کردی جائے گی اور یہ استمداد اِن عباد الرحمٰن کی سبکی بلکہ اہانت کا باعث
ہوگا۔ جبکہ میں نے عرض کیا کہ شفاعت تو دراصل اعزاز و اکرام ہے، مقامِ شرف و عزت
ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں شفاعت کا ذکر فرمایا ہے وہاں باِذن
اللہ اور لِمَنِ ارْتَضٰی کی شرط لگادی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علمِ کامل اور علمِ قدیم میں جو لوگ رعایت کے مستحق ہیں اور جن کو اللہ
تبارک و تعالیٰ معاف فرمانے کا فیصلہ پہلے ہی فرما چکا ہے ان فیصلوں کے اعلان
(DECLARATION AND ANNOUNCEMENT)
قبل اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ نیکوکار، محبوب بندوں (انبیاء، صدیقین، شہداء
صالحین) کو شفاعت کی اجازت دیں گے اور وہ شفاعت قبول کی جائے گی۔ نیز نبی
صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شفاعتِ کبریٰ سے سرفراز فرمایا جائے گا کہ جو لوگ اپنی بداعمالیوں
کی وجہ سے جہنم میں سزا بھگت رہے ہیں، اُن میں جن لوگوں کے دل میں ذرّہ برابر بھی
ایمان ہے ان کو شافعِ محشر ﷺ کی شفاعت پر جہنم سے نجات ملے گی اور پھر جہنم ہمیشہ
کے لیے بند کردی جائے گی جیسا کہ خبر دی صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے لیکن
دیکھئے کہ جہنم وہ جگہ ہے جس کے لیے سورۃ الفرقان میں فرمایا کہ: اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا
وَّ مُقَامًا ط جہنم مستقل جائے قرار اور عارضی قیام دونوں اعتبارات سے بہت بری
ہے۔ اَللّٰهُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ ط

اس مقدمے کے ساتھ سب سے پہلے تو اس شفاعت کا ذکر سنئے جو آیت الکرسی
میں وارد ہوئی ہے، جس آیت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تمام آیات کا
سرتاج قرار دیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ و عظیمہ کے درمیان میں شفاعت کا ذکر
میں فرمایا:

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط	جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب
مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ	اُسی کا ہے (جو اللہ الحی القیوم ہے) کون
اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ	اُس کے حضور اُس کی اجازت کے بغیر
اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ج	شفاعت (سفارش) کرسکے؟

(آیت ۲۵۵) جو کچھ اُن کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔

اس آیت میں جو استثنائی اِلّا آیا ہے وہ قیامت کا اِلّا ہے کہ اس استثناء نے توحید اور ایمان اور اعمالِ صالح و حسنات کو شرک و کفر اور بدعملی و سیئات سے بالکل ممیز کردیا اور اس خام خیالی کی تردید کردی کہ اللہ کی عدالت میں کوئی بھی اپنے مقام و مرتبہ، اپنی حیثیت، اپنی قوت، اپنی وجاہت اور اپنی مشیت (ارادے)، کسی بھی اعتبار سے اس پوزیشن میں نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو بدلوا سکے۔ اس مضمون و مفہوم کو سورۃ الانبیاء میں یوں بیان فرمایا:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُونَ ٥ (آیت ۲۸)

وہ (اللہ) ان کے آگے اور ان کے پیچھے جو کچھ ہے، سب سے باخبر ہے اور شفاعت نہیں کریں گے مگر اُس (اللہ) سے ڈرتے ہوئے صرف اُس کے لیے جس کے لیے وہ (اللہ) پسند فرمائے!

اس آیت کے سیاق میں اہلِ کتاب اور بنی اسمٰعیل کے شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ (اے نبی! صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سے پہلے بھی جو رسول آئے اُن کی طرف یہی وحی کی جاتی رہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس صرف میری ہی بندگی کرو ـــــ اہلِ کتاب اور مشرکینِ مکہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن کی اولاد ہے انہوں نے غلط کے رسولوں اور نبیوں کو اللہ کی اولاد قرار دے دیا ہے۔ اللہ ان باتوں سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ بلکہ سارے انبیاء و رسل خدا کے مقرب بندے ہیں۔ وہ اُس کی عدالت میں بات میں پہل نہیں کرتے، وہ بس اُس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ٥ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ٥ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ٥ (آیات ۲۵، ۲۶، ۲۷)

اس کے بعد وہ اٹھائیسویں آیت ہے جس میں شفاعت کا یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ شفاعت صرف اُس کی اجازت اور مرضی سے ہوگی اور اُن ہی کے حق میں ہوگی

حق میں وہ شفاعت قبول فرمانے کا پہلے ہی فیصلہ فرما چکا ہوگا۔

شفاعت کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے علمِ کامل کا ذکر ——!!

آیت الکرسی اور سورۂ انبیاء میں شفاعت کے ذکر کے بعد اور پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے علمِ کامل کا جو ذکر فرمایا کہ : یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ۔ تو اُس کی حکمت بھی سمجھ لیجئے۔ خدا کا علم کامل ہے اور ہر غلطی سے مُنزّہ ہے۔ اُسی کی جناب میں کسی کو ازخود سفارش کیلئے زبان کھولنے کی جسارت کا مطلب تو یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ اس شخص کے بارے میں خدا کو پوری آگاہی نہیں ہے اور وہ اپنی سفارش سے اُسی کی معلومات میں اضافہ یا اُس کی معلومات کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ وہ ماضی و مستقبل کے پورے حالات سے باخبر ہے۔ وہ اللطیف الخبیر ہے۔ چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں بھی اس بات کو واضح کیا کہ علمِ الٰہی کی وسعتوں کا کیا ٹھکانا ماسوا کا علم محض عطائی ہی نہیں بلکہ محدود بھی ہے۔

یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ۝
(طٰہٰ آیات ۱۰۹-۱۱۰)

اس (قیامت کے) دن کسی کو کسی کی شفاعت کچھ نفع نہ پہنچائے گی۔ مگر جس کے لیے خدائے رحمٰن اجازت دے اور اُس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے، وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے پیچھے اور ان کے آگے ہے اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

شفاعت کے لیے اذن اور رضائے باری تعالیٰ کی شرائط سے متعلق میں چاہتا ہوں چند آیات مزید پیش کردوں تاکہ مسئلہ مزید واضح ہو جائے۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ط
(سورہ سباء (آیت ۲۳))

اور اللہ کی عدالت میں کوئی شفاعت بھی نفع نہیں پہنچا سکتی۔ سوائے اُس شخص کے حق میں جس کیلئے اللہ نے شفاعت کی اجازت دی ہو۔

سورۂ نجم کی آیت کا پہلے بھی حوالہ دے چکا ہوں، ایک بار پھر اُس کو سن لیجئے، فرمایا:

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَرْضٰى

اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں ان کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آسکتی۔ جب تک کہ اللہ کسی ایسے شخص کے حق میں اجازت نہ دے

(بقیہ صد ۱۸ پر)

بدِ مکرر

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک تحریر

جو 'میثاق' بابت ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی :

مولانا ابوالکلام آزاد — جمعیت علماء ہند

اور

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ

'میثاق' بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۷۴ء کے 'تذکرہ و تبصرہ' کے صفحات میں جو ایک
تحریر راقم الحروف کے قلم سے شائع ہوئی تھی اُس میں اس "ہمہ جہتی احیائی عمل" کے جائزے
سلسلے میں جو اس وقت پورے عالمِ اسلام میں جاری ہے، قومی تحریکوں کے ذریعے حصول
دی اور علمائے کرام کے دفاعی رول کے ذکر کے بعد عرض کیا گیا تھا:

"اس 'ہمہ جہتی احیائی عمل' کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور
ہیں برسرِ کار ہیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احیائی
کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے! مختلف مسلمان ممالک میں ایسی
تیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں لیکن — ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح
مبہم" اور "ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدّھم" کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک
تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے۔

ان جماعتوں میں سے اگرچہ ایک دَور میں جوش اور جذبے کی شدّت اور اثر و نفوذ کی
سے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' توجہات اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی لیکن واقعہ

یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برصغیر ہند و پاک ہی کو حاصل ہے۔

برصغیر میں اس تحریک احیائے دین کے مؤسّسِ اوّلین اور داعی اوّل کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو حاصل ہے جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعے "حکومت الٰہیہ" کے قیام اور اس کے لئے ایک "حزب اللہ" کی تاسیس کی پُرزور دعوت پیش کی مولانا کے مخصوص طرز نگارش اور انداز خطابت نے خصوصاً تحریک خلافت کے دوران ان کی شہرت کو برصغیر کے طول و عرض میں پھیلا یا اور ان کی دعوت نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ لیکن اس کے بعد خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس سبب سے انہوں نے اس عظیم مشن کو خیرباد کہہ کر انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمال مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کر دی۔

مولانا کی زندگی کے اس عظیم انقلاب کے ممکن اسباب میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ ع "اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی!" مولانا بلاشبہ عبقری تھے اور عبقری انسان زیادہ عملی نہیں ہوا کرتے۔ اس کا کچھ سراغ ان کے اس جملے میں بھی ملتا ہے کہ "ہم بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب ہیں۔" اور ایک خیال جو زیادہ قرین قیاس ہے یہ بھی ہے کہ مولانا کی حیثیت ایک سکہ بند اور مسلّم عالم دین کی نہ تھی اور اس وقت تک مسلمانان ہند پر علماء کی گرفت بہت مضبوط تھی لہٰذا مولانا کو گویا راستہ بند نظر آیا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے ذریعے ہم تک پہنچی اور جس کا حاصل یہ ہے کہ دس سال کے عرصے میں[1] اپنے پیش نظر مقصد کے لئے تمہیدی مراحل کی تکمیل کے بعد اپریل ۱۹۲۲ء میں مولانا نے دہلی میں منعقدہ جمعیت علمائے ہند کی کانفرنس میں مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مولانا احمد سعید مرحوم کے تعاون سے اگلا قدم اٹھانے کی سکیم بنائی۔ چنانچہ پہلے خود انہوں نے تقریر کی اور اپنے جوش خطابت سے حاضرین کے جذبہ عمل کو ابھارا ہی نہیں للکارا۔ اور پھر مولانا احمد سعید صاحب نے تقریر کی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی رحلت کے بعد سے مسلمانان ہند کی قیادت کی مسند خالی ہے۔ اور اب جو مرحلہ

---

[1] "الہلال" کا اجراء ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا!

ں ہے اُس میں "شیخ الہند" سے بھی بڑھ کر "امام الہند" کی ضرورت ہے۔ اب غور کر و اور
ے لئے کسی موزوں شخص کو تلاش کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کرو اور جدوجہد کا آغاز کر دو۔
للہ تعالےٰ کو کچھ اور ہی مطلوب تھا۔ چنانچہ علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری اٹھے
ں نے براہ راست مولانا آزاد کو خطاب کر کے ان الفاظ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا کہ
ر قدرِ خود بشناس!" جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پوری تقریر میں کیا کچھ ہو
ہر حال اس سے دل شکستہ اور دل برداشتہ ہو کر مولانا اس کام ہی سے دست کش
ے اور اس کے فوراً بعد ہی انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی!"
اس پر ہمیں محترم احمد حسین کمال صاحب کا درج ذیل مکتوب ملا، جس کا آغاز تو نہایت

ڈاکٹر کمال صاحب سے غائبانہ تعارف تو راقم الحروف کو کچھ پہلے سے بھی حاصل تھا۔ لیکن بالمشافہ ملاقات ان
ء ۶۹ ء میں ہوئی جبکہ پاکستان کی سیاسی فضا میں بڑی گرما گرمی تھی اور دائیں اور بائیں بازو کے
ن کچھ کاغذی اور کچھ ہوائی جنگ بڑے زور شور کے ساتھ جاری تھی۔ جس میں دوسرے بہت سے
متقابلین "کے شانہ بشانہ جماعتِ اسلامی اور جمعیت علما اسلام کے مابین بھی معرکہ آرائی
ہی تھی ــــ موصوف اس زمانے میں جمعیت کے ہفت روزہ آرگن "ترجمان اسلام" کے مدیر تھے ـــــ
لباً جمعیت کے پالیسی بنانے والے حلقوں میں بھی خاصے دخیل تھے۔ بہر حال ان سے مل کر اندازہ
ہ مذہب سے تو ان کا تعلق کچھ واجبی اور رواجی سا ہی ہے البتہ وہ ایک منجھے ہوئے سیاسی کارکن
یشتہ سوشلسٹ ورکر ہیں۔ بعد ازاں وہ کراچی منتقل ہو گئے اور "جمعیت اکادیمی" کے نام سے کچھ کتابیں بھی
ہنے شائع کیں جن میں سے ایک مولانا آزاد مرحوم کی سیاسی بصیرت سے متعلق بھی تھی۔ راقم کا
ہ تھا کہ یہ اکادمی جمعیت علماء اسلام ہی کا کوئی ذیلی ادارہ ہے لیکن پچھلے دنوں کراچی جانا ہوا تو بڑی
ں وجستجو سے راقم کورنگی کراچی میں ڈاکٹر صاحب کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ اگرچہ ملاقات کا شرف
ل نہ ہو سکا تاہم یہ معلوم کر کے کچھ حیرت بھی ہوئی اور کسی قدر دکھ بھی ہوا کہ نہ صرف وہ خود بلکہ ان کے
بلاں بھی روسی سفارت خانے کے کسی ذیلی ادارے میں ملازم ہیں ـــ اگرچہ ساتھ ہی یہ خیال
آیا کہ "ــہ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!" اُمید ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہماری اس
ت کوئی گلہ بُرا نہ منائیں گے!

مشفقانہ ہے لیکن اختتام اُسی قدر متحدیانہ (CHALLENGING) ہے:۔

"مکرم و محترم، ڈاکٹر اسرار احمدؒ صاحب، سلام ورحمۃ

آپ کا مؤقر ماہنامہ "میثاق" گاہے بگاہے موصول ہوتا رہتا ہے۔ میں اس کے لئے آپ کا نہایت ممنون ہوں۔

میں ہمیشہ آپکے مضامین بغور پڑھتا ہوں اور آپکے دینی جذبہ کی تعریف کیئے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں۔

تاہم آپکے افکار اور آپ کا طریق تنظیم، ابتدائی دور کی، جماعت اسلامی، اور مودودی صاحب کے انداز کا سا ہے اور اس کے نتائج و مراحل کے بارے میں بہت سے اندیشے سامنے آجاتے ہیں۔

لیکن فی الحال میرا ارادہ اس سلسلے میں کسی تبصرہ اور تنقید کا نہیں ہے۔ بلکہ اس عریضہ کا مقصد آپ کی توجہ، آپکی ایک حالیہ تحریر کی طرف مبذول کرانا ہے۔ جو ماہنامہ "میثاق" نومبر ۱۹۷۸ء میں "تذکرہ و تبصرہ" کے زیر عنوان شائع ہوئی ہے۔

آپکے اس طویل مقالہ کے بہت سے مقامات ایسے ہیں جو قابل گفتگو ہیں۔ لیکن یہاں میں صرف ایک مقام کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ جو "میثاق" کے اس پرچہ کے صفحہ ۳۹ پر ہے اور حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ سے متعلق ہے۔

آپ نے محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے حوالہ سے جو واقعہ جمعیۃ علماء اسلام کے اجلاس منعقدہ، دہلی، اپریل ۱۹۲۲ء کے بارے میں لکھا ہے میں اس کے بارے میں، عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ آپ ایک تاریخی واقعہ کی تصحیح فرمالیں۔

جمعیۃ علماء ہند ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی۔

پہلا اجلاس، امرتسر میں ہوا، اور پہلے صدر مولانا عبدالباری فرنگی محلی منتخب ہوئے۔

دوسرا اجلاس ۱۹۲۰ء میں دہلی میں ہوا، اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اس کے صدر تھے۔

تیسرا، اجلاس ۱۹۲۱ء میں لاہور میں منعقد ہوا، مولانا ابوالکلام آزاد اسکے صدر تھے۔

اس سال اپریل میں مولانا آزاد گرفتار کر لیے گئے۔
قولِ فیصل کے نام سے ان کا مشہور تاریخی بیان اس گرفتاری کے بعد ہی علی پور کلکتہ کی جیل میں عدالت کے سامنے دیا گیا تھا۔
چنانچہ ۱۹۲۲ء میں، مولانا جیل میں تھے، دوسرے یہ کہ ۱۹۲۲ء کے جمعیتہ علماء اسلام کا اجلاس، دہلی میں نہیں، گیا، صوبہ بہار میں منعقد ہوا تھا۔ اور مولانا آزاد کی گرفتاری پر، احتجاج کا ریزولیشن پاس کیا گیا تھا۔ نیز مولانا کو مبارک باد کا تار بھی بھیجا گیا تھا۔
اس اجلاس کی صدارت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی نے کی اور اس سال کے جمعیتہ علماء اسلام کے صدر بھی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہی تھے۔ اس تفصیل سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مولانا آزادؒ اور مولانا معین الدین اجمیری سے منسوب "میثاق" میں ذکر کردہ اس واقعہ کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔
مجھے عرض کرنا پڑتا ہے کہ، مولانا آزاد کے معاملہ میں بعض حلقوں کے احساس کمتری نے بہت سے، خانہ ساز جھوٹ تراشے ہیں، یہ بھی منجملہ ان کے ایک ہے۔
۱۹۲۲ء میں نہ تو جمعیتہ علماء اسلام کا اجلاس دہلی میں ہوا، نہ مولانا اس سال قید فرنگ سے آزاد تھے
پھر بھلا اس سارے افسانہ کی کیا حقیقت ہے۔ پتہ نہیں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب تک یہ روایت کن صاحب نے پہنچائی۔
کانگریس میں حضرت مولانا آزاد کی شمولیت کسی ردعمل کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان کے دینی اور سیاسی پروگرام کا ایک جز تھی۔ اس موضوع پر میں تفصیل سے روشنی ڈال سکتا ہوں۔ مگر ابھی صرف اتنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔
اگر آپ کی حق پسندی اجازت دے تو "میثاق" کی آئندہ اشاعت میں، ان سطور کو شائع فرما دیجئے۔
بہرحال میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ والسلام کمالی

اس خط کی وصولی پر راقم نے سب سے پہلے تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ مضمون میں جو روایت سے ساتھ راوی کا نام بھی درج کر دیا گیا تھا۔ اور وہ بفضلہ تعالیٰ ابھی بقید حیات ہیں پھر جب پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب سفر کراچی سے واپس آئے تو معاملہ ان کے سامنے رکھ دیا لیکن انہوں نے صرف یہ مزید وضاحت کر کے کہ مجھے یہ واقعہ مولانا عبدالحامد بدایونی مرحوم کے برادر بزرگ مولانا عبدالماجد بدایونی نے سنایا تھا اور وہ اس اجتماع میں بنفس نفیس موجود تھے کہ کر جان چھڑالی کہ "ہو سکتا ہے کہ سن کے بارے میں میری یادداشت نے غلطی کی ہو، بہر حال میرے پاس ان باتوں کی تحقیق و تفتیش کے لئے وقت نہیں ہے!"

چشتی صاحب تو یہ کہہ کر فارغ ہو گئے لیکن ظاہر ہے کہ ہمارے لئے یہ معاملہ اتنا غیر اہم نہ تھا۔ چنانچہ غور شروع ہوا کہ اس سلسلے میں کس سے رجوع کیا جائے۔ اولاً ذہن مولانا سید حامد میاں صاحب کی جانب منتقل ہوا کہ وہ مولانا محمد میاں صاحب کے فرزند ارجمند اور جمعیت علماء ہند کی اہم شخصیتوں میں سے ہیں۔ چنانچہ ان سے رجوع کیا گیا لیکن معلوم ہوا کہ وہ اس پورے معاملے سے بالکل بے خبر ہیں۔

اچانک ذہن جماعت اسلامی کے بزرگ رکن اور مشہور صحافی ملک نصر اللہ خاں عزیز کی طرف منتقل ہوا۔ موصوف کے بارے میں کبھی یہ بات سننے میں آئی تھی کہ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی[1]۔ موصوف اب بہت ضعیف بھی ہیں اور بالکل گوشہ گیر بھی، ان سے ان کے فرزند اکبر ملک ظفر اللہ خان صاحب کی وساطت سے رابطہ قائم کیا جن سے راقم کو اسلامی جمعیت طلبہ کے زمانے سے نیاز حاصل ہے، تو کچھ امید افزا صورت نظر آئی۔ چنانچہ ان کی خدمت میں باقاعدہ حاضری دے کر معلومات حاصل کیں۔

---

[1] ملک صاحب نے نہ صرف اس کی توثیق فرمائی بلکہ یہ بھی بتایا کہ ۱۹۱۳ء میں وہ گونڈہ جیل میں مولانا آزاد کے ساتھ ہی نظر بند تھے۔ اور وہیں "ترجمان القرآن" کی جلد اوّل کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں اشتراک عمل طے پایا تھا۔ ملک صاحب نے مزید بتایا کہ بعد میں جب جماعت اسلامی قائم ہوئی اور ملک صاحب اس میں شامل ہو گئے تو ڈاکٹر نذیر احمد الہ آبادی نے مولانا ابوالکلام آزاد کو جماعت کا لٹریچر پہنچایا اور ملک صاحب نے بھی اس سلسلے میں ان سے بات کی تو انہوں نے فرمایا: "کام تو درست ہے۔ لیکن میں مودودی صاحب کی صلاحیت اور استعداد سے واقف نہیں ہوں۔ مزید برآں اگر میں جماعت میں شامل ہوں تو ظاہر ہے کہ پھر یہ وگرام

ـ صاحب نے فرمایا:

"۱۹۲۱ء میں جمعیت علماء ہند کا جو اجلاس بریڈلا ہال لاہور میں ہوا تھا[1] اس موقع پہ یہ خبر گرم تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند مان کر بیعت کی جائے گی۔ لیکن بعد میں کچھ نہ ہوا ـ اور معلوم ہوا کہ اندرونِ خانہ دیوبندی علماء میں سے مولانا شبیر احمد عثمانی اور غیر دیوبندی علماء میں سے مولانا معین الدین اجمیری نے شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی تھی!"

مزید برآں، ملک صاحب نے اس کی بھی توثیق فرمائی کہ مولانا عبدالماجد بدایونی بھی اس اجلاس میں موجود تھے!

اس سے اصولی طور پر تو چشتی صاحب کی روایت کی تصدیق ہوگئی تاہم ابھی مزید تحقیق خیال تحت الشعور میں موجود تھا کہ ایک خاص ضرورت سے کراچی میں مولانا منتخب الحق در ... کی خدمت میں حاضری کا موقع ہوا تو اچانک ذہن ادھر منتقل ہوا کہ مولانا موصوف کو ...لانا معین الدین اجمیریؒ کے تلمیذِ رشید کی حیثیت حاصل ہے چنانچہ اُن سے بھی معاملہ زیر بحث کے متعلق استفسار کر دیا گیا ـ جواباً مولانا نے باقاعدہ املا کرایا کہ:

"... مولانا معین الدین اجمیری نے بغیر تاریخ اور سن کے ذکر کے تذکرہ فرمایا کہ کسی ... کو امام الہند ماننے کی تجویز زیر غور تھی۔ اس کے لئے پہلے سے خط و کتابت بھی چل رہی تھی، بعد ازاں جامع مسجد دہلی میں ایک جلسہ ہوا جس میں تمام علماء ہند جمع ہوئے اور اس موضوع پر نہایت زوردار تقریریں ہوئیں اور سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا مولانا آزاد کی تقریر گویا حرفِ آخر کا درجہ رکھتی تھی جس سے تمام حاضرین مسحور سے ہوگئے اور یہ آوازیں بھی بلند

---

[1] جمیعۃ علماء ہند کے اس اجلاس کا ذکر ڈاکٹر شیر بہادر پنّی کی ایک حالیہ تالیف افاداتِ مہر، میں دو طرح آیا ہے: (دیکھئے چوکھٹہ بر صفحہ ...)

[2] مولانا کراچی یونیورسٹی میں ڈین آف دی فیکلٹی آف تھیالوجی ہیں راقم کو ۶۴-۱۹۶۳ء میں ایم اے اسلامیات کی تعلیم کے سلسلے میں مولانا سے شرف تلمذ حاصل ہوا تھا۔ ان کی خدمت میں مذکورہ حاضری دوسری سالانہ قرآن کانفرنس کے سلسلے میں ہوئی تھی!

ہوئیں کہ ہاتھ بڑھائیے ہم آپکے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں! اس پر میں نے صدر جلسہ سے صر
پانچ منٹ کچھ کہنے کے لئے مانگے جو بہت مشکل سے اس شرط کے ساتھ ملے کہ پچھتا منٹ
کسی صورت نہ ہونے پائے۔ میں نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ علماء کے اس موقرا جتماع
تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے اور صرف اشارہ کافی ہے۔ میں جملہ علماء کی توجہ
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس تقریر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو آپؓ نے حج
واپسی پر اس قسم کا چرچا سن کر کی تھی کہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اگر حضرت عمرؓ کا انتقال
تو ہم فوراً اور دفعتہً فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کرلیں گے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالر
ابن عوف کو حکم دیا کہ لوگوں کو جمع کریں اور پھر فرمایا کہ "فَلْتَةٌ بیعتہم" امت
حق میں کبھی مفید نہیں ہوگی۔ اگر لوگ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت سے استدلال کریں گے تو بہت
بڑی غلطی کا ارتکاب کریں گے اس لئے کہ حضرت ابو بکر واحد شخصیت ہیں جن کے لئے اس
قسم کی بیعت خالی از مضرت تھی۔ ان رضؓ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ایسا موجود نہیں ہے!۔
میرے اس توجہ دلانے پر جلسے کا رنگ ایک دم تبدیل ہوگیا۔ میری تائید میں مولانا انور
صاحب نے ایک نہایت غامض اور دقیق تقریر فرمائی اور مولوی شبیر احمد عثمانی نے بھی میر
تائید کی اگرچہ اس سے پہلے وہ اصل تجویز کی تائید میں تقریر کرچکے تھے!"

مزید برآں مولانا منتخب الحق صاحب قادری نے یہ بھی فرمایا کہ "جہاں تک مجھے یا
پڑتا ہے مولانا نے اس اجلاس کی صدارت کے ضمن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب
کا ذکر فرمایا تھا!" —— اور یہ بھی فرمایا کہ "میں نے اس موضوع پر ایک خط کی نقل نصیر میاںؔ
پاس دیکھی ہے جو مولانا نے عبدالباری فرنگی محلی کے نام تحریر فرمایا تھا!"

گویا راقم کے سمندِ شوق کو ایک اور ایڑ لگ گئی، چنانچہ کشاں کشاں حکیم نصیر الدین صاحب
کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ان سے متذکرہ بالا خط کی فوٹو سٹیٹ کاپی حاصل کی جس کی عبا

---

[۱] حکیم نصیر الدین صاحب مالک نظامی دواخانہ، صدر کراچی فرزند مولانا حکیم نظام الدین مرحوم برا
خورد مولانا معین الدین اجمیریؒ۔

[۲] یعنی کسی ہنگامی اور جذباتی فضا میں دفعتہً اور اچانک کسی کے ہاتھ پر بیعت کرلینا۔

ج ذیل ہے:

"از دارالخیر، اجمیر

۲؍ستمبر ۲۱ء

مرجع انام حضرت مولانا صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

والا نامہ نے عزت بخشی، سابق والا نامہ چونکہ جواب طلب نہ تھا اس وجہ سے تاریخ مقررۂ آنمخدوم کو ذہن میں رکھ کر عریضہ حاضر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ ۵ محرم الحرام کے بعد حاضر خدمت ہو کر آنمخدوم کی ہمرکابی میں پنجاب روانہ ہو جاؤنگا۔ یہی ارادہ اب بھی ہے۔ اطلاعاً عرض کیا گیا — لیکن دہلی کے جلسۂ جمعیۃ العلماء کی شرکت نے اس سفر میں ایک جدید مانع پیش کر دیا کیونکہ اس کی تجویز کے مطابق ۱۷، ۱۸ ستمبر کو جلسۂ منتظمہ قرار پایا ہے۔ اس میں ضبطیٔ فتویٰ و مسئلۂ امامت پیش ہوگا جس کی طرف جناب مولوی ابوالکلام صاحب کو بیحد رجحان ہے۔ چونکہ ان کو اس مسئلہ سے زیادہ دلچسپی ہے اس وجہ سے خالی الذہن علماء ان کی تقریر سے متأثر ہوئے اگر منجانب فقیر اس کے التواء کے متعلق مختصر و جامع تقریر نہ ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ حاضرین علماء اسی وقت اس مسئلہ کو طے کر دیتے۔ اس وجہ سے علماء دہلی کا یہ خیال ہے کہ فقیر خصوصیت کے ساتھ اس جلسہ میں شریک ہو۔ اِدھر جناب مولوی شوکت علی صاحب نزاعِ رنگون کے متعلق زور دے رہے ہیں کہ فقیر جلد سے جلد وہاں پہنچکر ان نزاعات کا تصفیہ کرائے جن کی وجہ سے وہاں کی کمیٹی خلافت کا وجود خطرہ میں ہے۔ اب میں حیران ہوں کہ کہاں جاؤں اور کس سفر کو پہلے اختیار کروں۔ اس کے متعلق امروز و فردا میں آنمخدوم کی خدمت میں عریضہ حاضر کرنے والا تھا کہ دفعتہً والا نامہ نے شرف بخشا مناسب معلوم ہوا کہ اس کے جواب میں عرض حال کر دیا جائے۔ جو آنمخدوم کی رائے ہوگی اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے بالکل تیار ہوں۔ فقط

فقیر معین الدین کان اللہ لہٗ"

مندرجہ بالا شواہد اور قرائن کی بنا پر نفس مسئلہ تو بالکل طے ہوگیا یعنی مولانا ابوالکلام آزاد کے لئے امام الہند کے خطاب اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی تجویز اور پھر اس کے ناکام رہ جانے میں مولانا معین الدین اجمیری کا خصوصی حصّہ تو بلا شائبہ ریب وشک ثابت ہوگیا۔ البتہ مختلف روایتوں کی جمع وتطبیق اور کچھ دوسرے قرائن وشواہد کی روشنی میں جو صورت سامنے آتی ہے وہ غالباً کچھ یوں ہے:۔

۱۔ یہ مسئلہ سب سے پہلے جمعیت العلماء ہند کے اُس دوسرے اجلاس میں زیر بحث آیا جو دہلی میں ۷ تا ۹، ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ (مطابق نومبر ۱۹۲۰ء) حضرت شیخ الہندؒ کے زیر صدارت منعقد ہوا اور جس کے تقریباً دس ہی دِن کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اور اُسی موقع کی روداد ہے جو مولانا معین الدین اجمیریؒ نے مولانا منتخب الحق صاحب کو سنائی اور انہوں نے راقم کو املا کرائی۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی ذات زیر بحث نہیں آئی تھی بلکہ صرف اِس اصولی اعتراض پر کہ ایسے اہم معاملے پر فیصلہ اچانک نہیں کر لیا جانا چاہئے تجویز زیر غور پر فیصلہ ملتوی کیا گیا تھا تاکہ مزید مشورہ بھی ہوسکے اور سوچ بچار بھی!

۲۔ فطری طور پر اس کے بعد یہ معاملہ بحث وتمحیص اور خط وکتابت کا موضوع بنا رہا ہوگا تاآنکہ جمعیّت کا وہ تیسرا اجلاس سر پر آپہنچا جو لاہور میں نومبر ۱۹۲۱ء میں منعقد ہوا۔ چنانچہ بعض دوسرے امور کے علاوہ خاص اس مسئلے پر بھی حتمی فیصلہ کر لینے کے لئے مجلس منتظمہ کا وہ اجتماع ۱۷ یا ۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو دہلی میں منعقد ہونا طے پایا جس کا ذکر مولانا معین الدین اجمیریؒ نے اپنے مکتوب بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ محرّرہ ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء میں کیا ہے ——— اغلباً یہی وہ اجلاس ہے جس میں وہ واقعہ پیش آیا جس کی روداد مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم کی وساطت سے مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی کو اور ان سے راقم کو پہنچی۔ اور درج 'میثاق' ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہی وہ موقع تھا جہاں 'امام الہند' کے عظیم ورفیع منصب کے لئے جس شخص کا نام تجویز کیا جا رہا تھا اس کی ذات لامحالہ زیر بحث آتی اور اس سلسلے میں جو کچھ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں مولانا معین الدین اجمیری نے کہا ہوگا اس کا کسی قدر اندازہ ان کے اُس ایک جملے ہی سے بخوبی ہوجاتا ہے:

لہ بالاخط میں موجود ہے یعنی "اس میں ضبطیٔ فتویٰ اور مسئلہ امامت پیش ہوگا جس کی
رف جناب مولوی ابوالکلام صاحب کو بے حد رجحان ہے" اور یہ بات بالکل قرین قیاس
ہے کہ بحث کی گرما گرمی میں مولانا معین الدین اجمیری نے مولانا ابوالکلام آزاد کو براہ راست
نطاب کر کے کہا ہو کہ "ایاز قدر خود بشناس! - کہاں تم اور کہاں یہ رفیع و عالی منصب!
ا ایسے نوعمر (مولانا آزاد مرحوم کی عمر اس وقت کل ۳۲ برس تھی!) کو تو اکابر علماء کی موجودگی
یں زبان کھولنا بھی مناسب نہیں! رہا تمہارا علم و فضل تو اس کا بھانڈا ابھی پھوٹا جاتا ہے
ر امنطق کی فلاں کتاب کی عبارت تو پڑھ کر سنا دو!" ـــــ چنانچہ لگ بھگ اسی مفہوم
پر مشتمل تھے وہ کلمات جو چشتی صاحب نے نقل فرمائے تھے اور راقم نے جان بوجھ کر حذف
کر دیئے تھے ـــــ اور صرف "ایاز قدر خود بشناس!" کے الفاظ سے کلام کے رُخ
کی جانب اشارہ کرنے پر اکتفا مناسب سمجھا تھا!

۴ ۔ اس کے دو سوا دو ماہ بعد ہوا بریڈلا ہال لاہور میں جمعیت کا وہ تیسرا اجلاس
جس کا ذکر ع "دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا!" کے سے انداز میں فرمایا ہے ملک
نصر اللہ خاں عزیز صاحب نے، اور جس کی صدارت کے لئے منتظمین نے پیشگی مولانا ابوالکلام
آزاد کا نام اِس امید میں طے کر دیا ہو گا کہ مجلس منتظمہ میں یہ تجویز بہر حال منظور ہو ہی جائے گی۔
تو جیسے امام الہند مان کر اس کے ہاتھ پر عمومی بیعت کرنی ہے کیوں نہ یہ اجلاس اسی کی
صدارت میں ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ مجلس منتظمہ کے اجتماع میں تجویز پاس ہونے سے
رہ گئی۔ چنانچہ لاہور کا اجلاس خانہ پری کے لئے ہوا تو سہی لیکن کچھ یونہی پھیکے سے انداز میں!
ی وجہ ہے کہ خود مولانا آزاد اس میں اُکھڑے سے رہے جس کا تذکرہ ہے، ڈاکٹر شیر بہادر
الہ پنی کی بیان کردہ روداد میں! ـــــ اور بالکل مطابقِ قرائن ہے یہ بات کہ یہی
اُکھڑاہٹ، تھی جس کے نتیجے کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جمعیت العلماء کا
یٹ فارم ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا اور ع "کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے" کے مصداق
پنی جولانیٔ طبع کے لئے انڈین نیشنل کانگرس کا وسیع و عریض میدان منتخب کر لیا!!
اب اگر تو ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب ان تفاصیل سے بے خبر ہیں اور اسی بنا پر

انہوں نے اس روایت کی تردید کی ہے تو پھر بھی غنیمت ہے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ جانتے بوجھتے انہوں نے محض تاریخ اور سن کی ایک معمولی سی غلطی سے فائدہ اٹھا کر اسقدر متحدیانہ انداز میں حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے تو بہت ہی ہلکی رائے ان کے بارے میں قائم کرنی ہوگی۔ گویا ؎

اِنْ کُنْتَ لَا تَدْرِیْ فَھٰذَا مُصِیْبَۃٌ
وَاِنْ کُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِیْبَۃُ اَعْظَمُ

ہماری خواہش بہرحال یہ ہے کہ صورتِ حال پہلی ہی ہو ——— نہ کہ دوسری !

۲

مسئلہ متذکرہ بالا پر تحقیق و تفتیش کے دوران راقم الحروف پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے بعض ایسے پہلو منکشف ہوئے جن کی جانب پہلے توجہ نہ ہوئی تھی۔ جہاں تک ان کے علم و فضل، تقویٰ و تدیّن، خلوص و للّٰہیت۔ پھر صبر و استقلال، ہمّت و عزیمت، اور مجاہدہ و مصابرت گویا علم اور عمل کی جامعیّت کا تعلق ہے اس کا تو کسی قدر اندازہ پہلے بھی تھا لیکن وسعتِ نگاہ اور بالغ نظری کے ساتھ ساتھ وسعتِ قلب اور عالی ظرفی کا جو امتزاج اُن کی ذات میں پایا جاتا تھا اس کی جانب پہلے توجہ نہ ہوئی تھی۔

مولانا ۱۳۳۳ھ میں ہندوستان سے عازمِ حجاز ہوئے تھے۔ جہاں سے گرفتار ہوکر تقریباً تین سال اور سات ماہ حالتِ اسیری میں رہے ——— اور رہائی ملنے پر ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء کو واپس بمبئی پہنچے۔ اس کے بعد ان کی زندگی نے کل چھ ماہ کے لگ بھگ وفا کی۔ اور ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے! پھر اس مختصر مدّت کے دوران میں ضعیفی اور عام نقاہت پر مستزاد مرض و علالت کا بھی مسلسل ساتھ رہا۔ بایں ہمہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہ دین و مذہب اور ملّت و امّت کے مسائل سے فارغ الذّہن ہوسکے نہ ملک و وطن کے معاملات سے! اور اس مختصر مدّت میں جو چند کام انہوں نے کئے یا کرنے

ں کوشش کی ان پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ موجود الوقت صورتِ
ل کا بالکل صحیح تجزیہ کر چکے تھے بلکہ ان کی نگاہیں مستقبل کے حالات و واقعات کا بھی
ایت دور تک مشاہدہ کر رہی تھیں ۔ مزید برآں ان کی عالی ظرفی اور وسیع القلبی کے تو وہ
اہد سامنے آتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے کہ ع

"ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی !"

اور اس پس منظر میں، ہمیں معاف فرمایا جائے اگر ہم اپنے آپ کو اپنے اس احساس
ے اظہار پر مجبور پائیں، کہ اُن کے جانشینوں میں سے مختلف حضرات ان کی ہمہ گیر شخصیت
ے مختلف پہلوؤں کے وارث تو ضرور بنے لیکن کوئی بھی ان کی جامعیت کا وارث نہ
ن سکا۔ گویا ؎

"نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے ۔۔۔ وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی !"

ر صورتِ حال بالکل اس شعر کے مصداق ہو گئی کہ ؎

"اڑائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری !"

خصوصاً وہ حضرات جو سیاست، یا جہادِ حریت، یا تحریکِ استخلاصِ وطن کے
یدان میں ان کے جانشین بنے انہوں نے تو اپنے گرد تقلیدِ جامد کا لبادہ اس قدر کس کر لپیٹا
ہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو گئی لیکن انہوں نے اپنے موقف میں ترمیم کی کوئی ضرورت محسوس
ی۔ حالانکہ اس کے بالکل برعکس کیفیت نظر آتی ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت میں:
مثلاً علمی و تعلیمی اور تہذیبی و تمدنی اعتبار سے ملتِ اسلامیہ ہند کے بحرِ محیط میں جو
دو رَوئیں علی گڑھ اور دیوبند کی صورت میں بالکل مخالف سمت میں بہہ نکلی تھیں
ر ان سے جسدِ ملی کے پارہ پارہ ہونے کا جو شدید خطرہ موجود تھا اس کا بالکل بروقت
ور صحیح اندازہ مولانا نے فرمالیا، حالانکہ وہ خود ان میں سے ایک کشتی میں بالفعل سوار تھے اور اس اعتبار سے بالکل خلاف
ے نہ ہوتا اگر خود ان میں یک رخا پن پیدا ہو جاتا یا کم از کم فریقِ ثانی کے لئے کوئی نرم
شہ دل میں موجود نہ رہتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس چھ ماہ سے بھی کم مدت میں انہوں نے

ایک بار تو علی گڑھ کا دورہ کیا اور وہاں ان کی عالی ظرفی اور وسعتِ قلب کا یہ مظاہرہ سامنے آیا کہ انہوں نے برملا فرمایا کہ:

"میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر الٰہی کی روشنی جھلک رہی ہے۔۔ ۔۔ اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا" [1]

اور دوسرے جدید اور قدیم کے امتزاج کی سعی ــــ اور علی گڑھ اور دیوبند کے مابین ایک درمیانی راہ پیدا کرنے کے لئے مسلم نیشنل یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جو بعد میں "جامعہ ملیہ" کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ پیش نظر مقصد کے اعتبار سے یہ تجربہ بھی ناکام رہا!

دوسری طرف تحریک استخلاصِ وطن کے ضمن میں ہندو مسلم اشتراک عمل کے نظری طور پر قائل اور اس پر بالفعل عامل ہونے کے باوجود مولانا کی نگاہِ حقیقت بین نے ہندوؤں کے طرزِ عمل کا بالکل صحیح مشاہدہ کر لیا اور ان کی نگاہِ دور رس سے ان کے آئندہ عزائم چھپے نہ رہ سکے چنانچہ جمعیتہ العلماء کے دوسرے اجلاس میں جو خطبۂ صدارت انتقال سے چند روز قبل آپ نے ارشاد فرمایا اس میں یہ واضح انتباہ موجود ہے کہ:

ہاں، یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشین کر لیجیے۔ اور وہ حدود یہی ہیں۔ کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑنے۔ جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں۔ کہ صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات

---

[1] خود نوشت سوانح حیات مولانا حسین احمد مدنیؒ بحوالہ بیس بڑے مسلمان صفحہ ۲۸۸

میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری گذارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے۔ کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیشنوں کی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور ان کو ہندو و مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیئے۔[۱]

بنا بریں ——— یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اگر مولاناؒ کی زندگی وفا کرتی تو بعد ہندوؤں کی جانب سے جس تنگ نظری اور کم ظرفی ہی نہیں منتقمانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہوا اس کے پیش نظر مولانا یقیناً اپنے طریق کار پر نظر ثانی فرماتے اور کیا عجب کہ مسلمانان ہند کی جداگانہ قومی و ملی تشخص کے سب سے بڑے علمبردار اور اس کے تحفظ کے لئے عملی سعی و جہد کے "قائد اعظم" وہی ہوتے!

تیسری طرف اس واقعے کو ذہن میں لائیے جس کے راوی ہیں مولانا مفتی محمد شفیع ——— کہ اسارت مالٹا سے رہائی اور مراجعت ہند کے بعد ایک روز دارالعلوم دیوبند میں اکابر علماء کے ایک اجتماع میں حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ ہم نے تو اپنی اسیری کے زمانہ میں دو سبق حاصل کئے ہیں — اور جب علماء کرام، جن میں مولانا حسین احمد مدنیؒ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسے اکابر موجود تھے، ہمہ تن متوجہ ہو کر دیکھیں اس "استاذ العلماء" نے اس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں کونسے دو سبق سیکھے ہیں تو حضرتؒ نے فرمایا:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی

---

[۱] بیس بڑے مسلمان۔ صفحہ ۲۹۱

اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔
ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے
میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن
کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی میں
قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس
کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی
جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔
(ماخوذ از وحدت اُمت، تالیف مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ، شائع کردہ مکتبہ المنبر لائلپور)
پھر اس اعتراف و اظہار ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ایک عام درس قرآن کی نشست کا
کا باقاعدہ بنفسِ نفیس اجراء فرما دیا۔ گویا اب احیائے دین اور تجدید ملت کے لئے کام
جس اساس اور نہج پر ہونا چاہیئے اس کی جانب رہنمائی فرما دی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے
کہ مولانا ہرگز لکیر کے فقیر نہ تھے بلکہ آخری عمر میں بھی مسلسل غور و فکر کی عادت برقرار تھی اور
بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو سمجھ کر اس کے مطابق نقشۂ کار میں ضروری تبدیلی کرنے
کی اہمیت ان پر پوری طرح واضح تھی اور اُمت کے زوال و انحطاط کے اسباب پر ایک
ماہر معالج کے سے انداز میں تشخیص و تجویز پر ہمیشہ نظرِ ثانی کرتے رہنا آپؒ کی عادتِ ثانیہ تھی!
حضرت شیخ الہندؒ کی وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کا سب سے بڑا مظہر مولانا آزاد کے
معاملے میں انؒ کا طرزِ عمل ہے! بڑے لوگوں کی بڑائی کا ایک اہم پہلو چھوٹوں کی بڑائی
کا اقرار اور ان کی ابھرتی ہوئی شخصیتوں کو خواہ مخواہ اپنے لئے ایک چیلنج سمجھ کر انہیں
دبانے کی فکر کرنے کی بجائے ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی صورت میں سامنے آتا
ہے۔ اور اس پہلو سے واقعہ یہ ہے کہ عظمت کا کوہ ہمالیہ معلوم ہوتے ہیں حضرت شیخ الہندؒ
۱۹۱۲ء میں جب مولانا آزاد مرحوم نے "الہلال" نکالنا شروع کیا تو اس وقت
ان کی عمر کل چوبیسواں سال تھا! جبکہ حضرت شیخ الہندؒ ساٹھ سے متجاوز ہو چکے تھے۔
اور جب ۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد کو "امام الہند" ماننے کی تجویز زیرِ غور تھی اس وقت وہ

عمل بتیس برس کے تھے جبکہ حضرت شیخ الہندؒ ستر کے قریب پہنچ چکے تھے، گویا عمر میں دن اُدھر سے زیادہ کا فرق و تفاوت تھا! —— پھر کہاں جملہ علمائے ہند[1] کا بے تاج شاہ، انگریزی سامراج کے خلاف ڈٹ جانے والوں کا سرخیل، دیوبند[2] ایسی عظیم درسگاہ مادر مدارس، اور مولانا انور شاہ کاشمیریؒ مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ مفتی کفایت اللہ ریؒ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی ایسے اکابر علماء کا اُستاذ، اور ہاں: ایک نوخیز نوجوان —— جس کی زبان میں تاثیر قلم میں زور اور وہ اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک!" کے مصداق جہاد کا جذبہ اور جوش تو بے شک موجود تھا لیکن نہ جبّہ و عمامہ نہ عبا و قبا، نہ کہیں کے مفتی نہ شیخ الحدیث، حتیٰ کہ نہ کہیں کی سندِ فراغت نہ دستارِ فضیلت، ایک قرآن کا عاشق ہونے سے کیا ہوتا ہے، نہ کسی حدیث کی کتاب پر حاشیہ کا مصنّف، نہ فقہ کی باریکیوں کا مسلّم نکتہ دان، ——
لیکن ہم اُس اُستاذ العلماء کا یہ قول ان کے شاگردوں کے حلقے میں معروف ہے کہ "اس نوجوان (ابوالکلام آزاد) نے ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلادیا!" اللہ اکبر! ہے کوئی حد اس وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کی! فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ ۝
مزید غور فرمایئے ہندوستان تقلید کا گڑھ ہے یہاں اسلام کے معنی ہی حنفیت کے ہیں اور تقلید کے دائرے سے باہر قدم نکالنے کے معنی گویا اسلام سے نکل جانے کے ہیں۔ اور بقول مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ "وہ علمی کام" کا مطلب یہاں صرف یہ رہا

---

[1] واضح رہے کہ اس وقت تک دیوبندی اور بریلوی کی تقسیم عمل میں نہ آئی تھی اور جمعیت علماء ہند جملہ علمائے ہند کا مشترک پلیٹ فارم تھی!

[2] اس اعتبار سے مولانا کے مقام اور مرتبے کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مالٹا سے واپسی پر جس روز انہوں نے بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا اس روز ان کی خدمت میں حاضر ہونے والوں میں نمایاں نام مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی کے ہیں!

ہے کہ مسلکِ حنفی کی فوقیت دوسرے مسلکوں پر ثابت کی جائے [1] ——
اور خود حضرت شیخ الہندؒ پکے حنفی تھے چنانچہ بیس بڑے مسلمان کے مرتب کے الفاظ میں خو
ان کا حال یہ تھا کہ:

"مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے۔ لیکن جب امام ابو حنیفہؒ کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح، چہرہ پر بشاشت، تقریر میں روانی، لہجہ میں جوش پیدا ہو جاتا۔ دلیل پر دلیل، شاہد پر شاہد، قرینہ پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے، تقریر رکتی ہی نہ تھی اور اس خوبی سے مذہبِ امام اعظمؒ کو ترجیح دیتے تھے کہ سلیم الطبع اور منصف مزاج لوگ لوٹ لوٹ جاتے تھے ..." صفحہ ۲۴

دوسری طرف ابوالکلام آزاد حنفیت سے حد درجہ بعید تقلید سے کوسوں دُور ایک آزاد خیال انسان، جس کی اصل عقیدت تھی امام ابن تیمیہؒ سے ——— بایں ہمہ مولانا ان کے جوہر قابل کے قائل بھی ہیں اور انہیں "امام الہند" مان لینے کی تجویز کے پُرزور مؤید بھی ——— پھر غور کیجئے کہ ہے کوئی حد اس عالی ظرفی اور وسعتِ قلبی کی اور ہے اس کی کوئی دوسری مثال اس دور میں! ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ ○

کاش کہ علمائے کرام ہماری ان گذارشات پر سیخ پا نہ ہوں بلکہ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ؏ "وہ کیا گردوں تھا توجس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!"

واضح رہے کہ جمعیت علماء ہند ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی تھی اور اگرچہ اس کے قیام کے وقت حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان سے باہر تھے تاہم چونکہ اس کے مؤسس اصلی مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ تھے جو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد بھی تھے اور نہایت معتمد رفیق کار بھی۔ لہذا اس کی پشت پر۔ اصل کار فرما ذہن حضرت شیخ الہندؒ ہی کا تھا۔

---

[1] مولانا انور شاہؒ کے اس قول۔ کے راوی بھی مولانا مفتی محمد شفیع ہی ہیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ آخری عمر میں مولانا پر شدید حسرت طاری ہو گئی تھی کہ پوری زندگی کس بے کار مشغلے میں بسر کر دی!

دوسری طرف اگرچہ اس میں چند ایک اہلحدیث عالم بھی شامل تھے۔ جیسے مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحتاہم اس پہ اصل غلبہ "حنفیت" ہی کا تھا خواہ اس کا دیوبندی یڈیشن ہو خواہ غیر دیوبندی جیسے فرنگی محلی خیر آبادی، بدایونی اور بریلوی ان حالات میں مولانا ابوالکلام آزاد ایسے آزاد منش شخص کے 'امام الہند' قرار دیئے جانے کی کسی تجویز کے زیر غور آنے کا سوال ہی ہرگز پیدا نہ ہو سکتا اگر اس کی پشت پر حضرت شیخ الہند کی پُرزور تائید ہی نہیں تحریک نہ ہوتی۔ اور ان کی وفات کے بعد بھی جسقدر رشد ومدّ کے ساتھ اس تجویز کے لئے کام کیا مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا احمد سعیدؒ نے اس کا بھی کوئی امکان نہیں تھا اگر یہ ان کے استاذ اور شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش نہ ہوتی۔

—— رہا یہ مسئلہ کہ اس تجویز کے ناکام رہنے کا اصل سبب کیا تھا تو اگرچہ بظاہر احوال یہ نظر آتا ہے کہ حنفیت کی شدت یا روایتی اور مدرسی علم کا ادّعا آڑے آگیا لیکن اصل سبب وہی ہے کہ "مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ" حضرت شیخ الہندؒ کا خلوص و اخلاص اپنی جگہ پر لیکن علم و حکمت الٰہی سب سے اوپر ہے فَاِنَّكَ تَعْلَمُ وَلَا نَعْلَمُ وَتَقْدِرُ وَلَا نَقْدِرُ! اور وہی بہتر جانتا ہے کہ کہ آیا احیائے اسلام کی اس براہ راست جدّوجہد کے لئے ابھی ماحول ہی سازگار نہ تھا بقولِ شاعر

> ابھی نہ چھیڑ محبت کے راگ اے مطرب!
> ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں!

یا جیسے کہ بعد کے حالات و واقعات سے ثابت ہوا۔ اس عظیم مقصد کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ہی موزوں نہ تھی گویا:-

> نہ مصطفٰے نہ رضا شاہ میں نمود اس کی!
> کہ رُوحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

بہر حال ہمارے لئے اصل قابلِ توجہ مسئلہ یہ ہے کہ ابوالکلام کی دعوت کا وہ عنصر کونسا تھا جس نے استاذ الاساتذہ اور شیخ الشیوخ مولانا محمود حسنؒ دیوبندی ایسے

عظیم شخصیت کو مسحور کر دیا تھا۔ اس کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام کی دعوت بنیادی طور پر دو امور کی جانب تھی ایک[1] : قرآن ۔ اور دوسرے : جہاد

پہلے نکتے کی وضاحت کے لئے کفایت کرے گا حسب ذیل اقتباس جو ماخوذ ہے ”البلاغ“ کے پہلے شمارے سے جو شائع ہوا تھا ۱۲ / نومبر ۱۹۱۵ء کو :-

”اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علتِ اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو۔ تو اس کو بتلایا جا سکتا ہے کہ علماء حق و مرشدین صادقین کا فقدان اور علماء سوء و مفسدین دجالین کی کثرت ــــ رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۔

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے ؟ تو اس کو امام مالک کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیئے کہ ”لَا يَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا“ یعنی اُمتِ مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی، تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں۔“

اور دوسرے نکتے کے لئے کفایت کرے گی یہ حقیقت کہ جب مولانا آزاد نے توجہ دلائی اُس حدیث نبوی کی جانب کہ ”اِنِّیْ اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ اللّٰهُ اَمَرَنِیْ بِهِنَّ: اَلْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ!“ تو ایک خوشگوار حیرت کا احساس ہوا اہل علم کے حلقے میں کہ ”بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ“ کے علاوہ بھی کوئی پانچ چیزیں تھیں جن کا حکم دیا تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ــــ اور جبکہ وہ پانچ ارکان ہیں قانونی اسلام کے ــــ وہاں یہ پانچ ارکان ہیں حقیقی ایمان کے!!

[1] واضح رہے کہ لگ بھگ یہی زمانہ ہے حضرت شیخ الہندؒ کے ہندوستان سے عازم حجاز ہونے کا جہاں سے واپسی پر آپ نے وہ جملے ارشاد فرمائے جو اس سے پہلے نقل ہو چکے ہیں ۔

یہ دوسری بات ہے کہ آج ساٹھ سال گذر جانے کے بعد بھی یہ دونوں نکات اتنے ہی
ریب ہیں جتنے اس وقت تھے اور روائتی مدرسی علم اور فقہی و قانونی تصورات کے غلبے
ے تحت حقیقی اسلام بالکل اسی طرح اجنبی اور غریب ہے جس طرح اپنے آغاز کے وقت
تھا۔ کس قدر صحیح فرمایا تھا جناب صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ "بَدَأَ
الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَ سَیَعُوْدُ کَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ ـــــــ!
آج انہی غرباء کو پکارنے کی ایک نئی کوشش کا آغاز ہو رہا ہے تنظیم اسلامی کے قیام کی
صورت میں:۔ فَهَلْ مِنْ مُسْتَمِعٍ وَهَلْ مِنْ مُجِیْبٍ!
اس موضوع پر مفصل گفتگو انشاء اللہ آئندہ ماہ ہوگی ـــــــ!

، مولانا ابوالکلام آزاد نے احیائے اسلام کے لئے جس جماعت کے قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا
بل کہیں کہ بالفعل قائم کر بھی دی تھی اس کا نام عام طور پر "حزب اللہ" معروف ہے لیکن عجیب
ن اتفاق ہے کہ "افادات مہر" میں اس کا ذکر "اسلامی تنظیم" کے عنوان سے ہوا ہے چنانچہ
.لانا غلام رسول مہر مرحوم رقمطراز ہیں: "ہمارے مولانا (مولانا ابوالکلام آزاد) ۱۹۱۹ء میں
ظربندی سے رہا ہوئے تو آپ کو یاد ہوگا کہ اسلامی تنظیم کی ایک تحریک شروع ہوئی تھی جس میں
ولاناؒ کو امام بنا کر کام کرنا مقصود تھا۔ اس سلسلے میں ایک لاکھ روپے کی رقم مولانا محمد علی اور
ولانا عبدالقادر قصوریؒ ہی نے فراہم کی تھی لیکن ہمارے مولاناؒ جلد دوبارہ گرفتار ہوگئے
ور وہ تحریک بھی رہ گئی۔ روپیہ بھی گیا، کچھ نہ بنا" ـــــــ واضح رہے کہ مولانا آزاد کے جملہ
حبین و معتقدین نے اس پورے معاملے کو اس طرح گول مول رکھنا مناسب سمجھا ہے۔ چنانچہ
ہیں بھی اس موضوع پر مفصل گفتگو نہیں کی گئی۔ اور محترم پروفیسر چشتی صاحب والی روایت
اتفاقاً درج "میثاق" نہ ہو جاتی تو غالباً اب بھی اس مسئلے کی تحقیق و تفتیش کا موقع پیدا نہ ہوتا۔
بہر حال اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ میں ہر کام کے لئے ایک وقت معین ہے جس سے نہ ایک منٹ
مؤخر ہو سکتا ہے نہ مقدم!

جمعیتِ علماءِ ہند کے اجلاس لاہور

نومبر ۱۹۲۱ء

کا ذکر، افاداتِ مہر، تالیف ڈاکٹر شیر بہادر پنی میں

(۱) ایک ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی کی زبانی جو ایک نوجوان طالب علم کی حیثیت سے بطور سامع شریک تھے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد ادائے جمعیۃ علماءِ ہند کی صدارت | جب آپ تشریف لائے اور مسندِ صدارت سنبھالی تو فرمایا کہ ابتدائی کارروائی تحریری خطبۂ صدارت کے پڑھنے سے کی جائے گی۔ کسی شخص کو اپنا لکھا ہوا خطبہ پڑھنے کے لئے دیا۔ خطبہ کے تھوڑی دیر تک پڑھے جانے کے بعد لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہوئی۔ لوگ تو ان کی تقریر کے پیاسے تھے۔ جب یہ ہل چل زیادہ ہوئی تو آپ غصہ میں اٹھے۔ تحریری خطبہ قاری کے ہاتھ سے لے لیا اور فرمایا" جو یہ سننا نہیں چاہتے وہ جا سکتے ہیں۔ جب چار پانچ منٹ تک ایک متنفس بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا اور ہال میں سخت سناٹا چھا گیا تو خطبہ پھر پڑھوانا شروع کرا دیا۔ جب یہ ختم ہوا تو اٹھے اور فرمایا" عزیزانِ من! میں اس لب ولہجہ کا عادی نہیں، لہٰذا معافی چاہتا ہوں" اس کے بعد تقریر شروع کی۔"

(۲) اور دوسرے مولانا غلام رسول مہر کے قلم سے وہ لکھتے ہیں: "آپ نے کئی مجالس کا ذکر فرمایا۔ بریڈلا ہال والی مجلس (جلسہ جمعیۃ علماءِ ہند) اس روز منعقد ہوئی تھی جو میری اخبار نویسی کا پہلا دن تھا۔ نومبر ۱۹۲۱ء کی کوئی تاریخ تھی، میں اس جلسے میں اوّل سے آخر تک رہا۔ مولانا نے کھدر کی دستار نہایت عمدگی سے باندھ رکھی تھی۔"

مولانا مودودی مرحوم اور مسئلہ بیعت

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جو 'اسلامی تنظیم' ——— "حزب اللہ" کے نام سے قائم کی تھی اس کے بارے میں یہ تو یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ وہ کب ختم ہوئی اور آیا اسے کسی مرحلے پر باضابطہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا بھی گیا یا نہیں ——— البتہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی قائم کردہ "جماعتِ اسلامی" کی حیثیت اسی کے بروز یا ظہورِ ثانی کی ہے ———

مولانا آزاد کی 'حزب اللہ' کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ اس کی اساس 'بیعت' پر تھی جبکہ 'جماعتِ اسلامی' ایک دستوری تنظیم ہے جس میں کم از کم نظری طور پر معاملات کی اصل باگ ڈور اس کے ارکان کے ہاتھوں میں ہے ——— اس ضمن میں ایک دلچسپ سوالیہ نشان مولانا مودودی مرحوم کے ایک خط سے سامنے آیا ہے جو انہوں نے مارچ ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد (دکن) کے مولانا محمد یونس صاحب کے نام تحریر کیا تھا۔ (جو ان کی مرتب کردہ کتاب "یادوں کے خطوط" میں شامل ہے جو اسی سال 'اسلامی مکتبہ۔ حیدرآباد دکن' نے شائع کی ہے) اس خط سے مولانا کا جو ذہن سامنے آتا ہے وہ تو یہ ہے کہ "نبی اکرمؐ جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بارِ امت پر چھوڑ گئے ہیں ......" اس کے لئے جو بھی جماعت یا تنظیم قائم ہو اس کی اساس 'بیعت' پر ہونی چاہیئے ——— اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اسی سال (۱۹۴۱ء) کے اواخر میں جب انہوں نے "جماعتِ اسلامی" قائم کی تو اس کی تشکیل کے موقع پر 'بیعت' کے لفظ تک سے کیوں اجتناب کیا گیا!

مولانا مودودی کے خط کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے ——— (ادارہ)

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اصطلاح میں بیعت سے مراد اطاعت اور پیروی کا اقرار ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

۱ ۔ وہ بیعت جو کسی خاص موقع پر کسی خاص معاملہ کے لئے ہو۔ جیسے بیعت الرضوان تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ سن کر حضورؐ نے اہلِ مکہ سے جنگ کا ارادہ فرمایا اور اس وقت صحابہ کرامؓ سے اس امر پر بیعت کی کہ وہ پیش آمدہ مہم میں آپؐ کے ساتھ جانفروشی کریں گے ۔

۲ ۔ دوسری وہ بیعت جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق و روحانیت کی نیت سے ایک مرشد و معلم اس شخص سے لیتا ہے جو اس کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے آئے۔ یہ وہ بیعت ہے جو بالعموم ہر شخص کو کرنی پڑتی تھی جو نبیؐ کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا۔ آپؐ اس سے اقرار کراتے تھے کہ شرک، زنا، چوری وغیرہ سے پرہیز کرے گا اور جو احکام خداوند تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پہنچائیں گے ان کی اطاعت کرے گا۔ اس بیعت کے لینے کا حق یا تو نبیؐ کو پہنچتا ہے یا اس شخص کو جو نبیؐ کے طریقہ پر ہو۔ یعنی طریقۂ نبویؐ کا صحیح علم بھی رکھتا ہو۔ اس پر خود بھی عامل ہو اور بیعت لینے سے اصلاح و ارشاد کے سوا قطعاً دوسری نیت نہ رکھتا ہو ۔

۳ ۔ تیسری بیعت وہ ہے جو جماعتِ اسلامی کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور رسولؐ کا مطیع ہے اس وقت تک جماعتِ اسلامی کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے

من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ

اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان میں بیعت سے مراد تیسری بیعت ہے۔ کیونکہ اس پر جماعتِ اسلامی کی زندگی اور اس کے نظم کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبیؐ جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بار امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے ۔

(قسط)

قرآن کا عجیب ہونا

محمد اقبال واحد

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی عجیب کہ اس کے نزدیک معیارِ فضیلت بس ایک
اور وہ تقویٰ ہے۔ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ۔ جس
تیجہ میں خداشناسی ہے خداطلبی ہے خداترسی ہے خداخوفی ہے۔ بندگیٔ
ہے شہادتِ حق ہے اور یہ نہیں ہے تو کوئی مال و منال کوئی جاہ کوئی اقتدار
حسب کوئی نسب کوئی علم کوئی بلند و بالا ڈگریاں کوئی وطنیت کوئی
بت کسی نبی کا امّی ہونا نہ ہونا سرے سے درخورِ اعتنا نہیں ہے۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی عجیب کہ ایک طرف وہ عظمت کردار کی وہ مثالیں
کرتی ہے کہ جو پوری انسانیت ازازل تا ابد بے مثل ہیں بے نظیر ہیں۔ اپنی
آپ ہیں۔ مثلاً نوح علیہ السّلام اور لوط علیہ السّلام کا اپنی بیویوں کی ایذا رسانی
برکرنا۔ یوسف علیہ السّلام کا چاہ کنعان میں مصر کے بازار میں بکاؤ مال ہونے پر امرأۃ العزیز
ہوت رانی کے مقابلے میں صبر سے کام لینا۔ بے گناہ زندانی ہونے کی صورت میں
ر و تحمل اور جب اس وقت کی دنیا کی متمدن ترین مملکت مصر کے سربراہ ہوتے ہیں
ن بھائیوں کو جنہوں نے ان پر بے پناہ ظلم ڈھائے تھے بلا توقف معاف کر دیتے
معاف ہی نہیں کرتے الٹا احسان و مروّت سے کام لیتے ہیں۔ اور جب یونس
السّلام کے لئے مچھلی کا پیٹ قید خانہ بنا دیا جاتا ہے تو وہ خالق کا شکوہ نہیں کرتے
کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ کہتے ہیں۔ اور جب یحییٰ علیہ السّلام اور زکریا علیہ السّلام
قتل کر دیا جاتا ہے۔ تو اُف تک نہیں کرتے۔ ابراہیم علیہ السّلام کے باپ بیٹے کو
یشہ کے لئے جلاوطن کر دیتے ہیں تو وہ احتجاج تو کیا بلکہ دعائے مغفرت کا وعدہ
تے ہیں۔ یعقوب علیہ السّلام کو اپنے بیٹوں کے ہاتھوں سالہا سال جس ابتلا سے
سطہ پیش آتا ہے تو فصبرٌ جمیل کہہ کر خدا کی مدد طلب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں
تے۔ اسماعیل علیہ السّلام اپنے باپ سے یہ تک نہیں پوچھتے کہ آپ کا خواب وحی

ہے یا آپ کا اپنا حکم ہے پورے استقلال کے ساتھ اپنے باپ کے حکم پر لبیک
کہتے ہوئے اپنی گردن چھری تلے رکھ دیتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام فراعنہ کے جبر و
استبداد کا نشانہ بنتے ہیں۔ وطن سے جلاوطن ہوتے ہیں۔ اپنی امت کے ہاتھوں
ذہنی اذیتیں برداشت کرتے ہیں لیکن کلمۂ شکایت زبان پہ نہیں لاتے۔
عیسیٰ علیہ السلام کو یہودی اپنے زعم میں تختہ دار پہ لا کھڑا کرتے ہیں اور وہ کھڑے
ہو جاتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال معاندین حق گالیوں سے
پھبتیوں سے طعنوں سے بہتان تراشیوں سے یہاں تک کہ شعب ابی طالب میں محصور
کر دیتے ہیں۔ حالت نماز میں پشت مبارک پہ مردہ اونٹ کی اوجھڑی لا ڈالتے ہیں
طائف کے بازار میں غنڈوں شریروں اور بدمعاشوں سے پتھروں کی بارش برسوا دیتے
ہیں۔ وطن سے جلاوطن کرتے ہیں۔ آپؐ کے رفقاء پہ عرصہ حیات تنگ کر دیتے ہیں
جینا حرام کر دیتے ہیں۔ لیکن وہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب رب العالمین
جب ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے وطن میں داخل ہوتے ہیں جہاں سے آپؐ
کو نکالا گیا تھا تو ان دشمنوں نے جنہوں نے اپنی دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہیں
رکھی تھی، کے حق میں معافیٔ عام کا اعلان کر دیتے ہیں ـــــ دوسری طرف ان کرداروں
کو بھی سامنے لاتی ہے جو انسانی بدکرداری کے اعتبار سے بدترین کردار کے لوگ
ہیں محض اس لئے کہ مستقبل کے لوگ ان بدکرداروں کے کردار اور کردار کے
نتیجہ میں کیفر کردار سے عبرت حاصل کریں۔ افراد میں سے فرعون نمرود ہامان قارون
ابی لہب کو پیش کرتی ہے تو اقوام میں سے قوم صالح قوم لوط قوم شعیب بنی اسرائیل
کی تباہیوں کی داستانوں کو بیان کرتی ہے کہ وہ انکار حق کی پاداش میں صفحۂ ہستی
سے اس طرح مٹیں کہ دنیا کی کوئی آنکھ ان کی ہلاکت پہ رونے والی نہیں تھی۔
اور جب وہ اہل ایمان اور منکرین ایمان کا تقابل کرتی ہے تو اہل ایمان کے
فضائل خصائل و مناقب بیان کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتی۔ اگر صالحین
کے درجات کا تعین کرتی ہے تو منکرین کے درجات کو بھی متعین کرتی ہے۔
اہل ایمان کو بشارت دیتی ہے تو اہل کفر کو انذار دیتی ہے اور جب اہل ایمان کو اہل
یقین کو مجاہدین فی سبیل اللہ کو انفاق کی ترغیب دیتی ہے۔ تو اسے قرض حسنہ

سے تعبیر کرتی ہے، جو خالق دوجہاں، وہ خالق جو کائنات کے تمام تر ذخائر کا مالک ہے، کے ذمہ واجب الادا قرض قرار دیتی ہے اور جب اہل ایمان اپنی جان کی بازی لگا کر باطل کا مقابلہ اس کے لاؤ لشکر کے مقابلہ میں بے سروسامانی کی حالت میں اقامتِ دین اقامتِ حق کے جذبے کے ساتھ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہ کہہ کر میدانِ کارزار میں اترتے ہیں تو وہ ذات جو کائنات کی ہر شے کی ناصر ہے، اسے اپنی نصرت قرار دیتی ہے۔ اور پھر اس نصرت خداوندی کی وہ قدر افزائی کرتی ہے کہ ان کو ایسی حیات جاودانی عطا کرتی ہے جس میں موت کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ گویا جن کی حیات کے تسلسل کو موت نہیں توڑ سکتی وہ دنیا کی زندگی میں بھی زندہ ہیں اور برزخ میں بھی زندہ ہیں اور عالم حشر میں بھی زندہ ہیں اور عالم جنّت میں بھی زندہ ہیں ــــــ!!

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی عجیب کہ اس نے ہر انسان کے اندر نیکی اور بدی حق اور باطل خیر و شرّ خوب و زشت انکار و اقرار کو الہام کر دیا ہے۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا کہ وہ نیکی کو نیکی اور بدی کو بدی سمجھنے پر مجبور ہے کہ یہ اس کا داعیہ فطری ہے۔ داعیہ وجدانی ہے۔ جس طرح بھوک اور پیاس جذبہ جنسی اس کا داعیہ فطری اور وجدانی ہے جب تک وہ ان داعیات معلوماتِ مادی کا انکار نہ کر دے۔ جو اس کے بس سے باہر ہے وہ اس داعیہ کا بھی انکار نہیں کر سکتا جو اس کی سوچ کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی عجیب کہ انسان کو جبر و قوّت سے اس انقلاب قلوب و اذہان تک نہیں لاتی حالانکہ اگر اس کا خالق ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا وہ انسانی عقل کو اپیل کرتی ہے کہ وہ سوچے کہ اس کا مقصد تخلیق کیا ہے اور اس مقصد تخلیق کو اس نے کسی معمّہ کی شکل میں انسان کے سامنے نہیں رکھا ہے۔ پوری وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ کے الفاظ میں یعنی عبادت رب اور عبادت کے اور شہادتِ حق اور شہادتِ حق کے بعد اقامت حق نہ وہ عبادت رب کو محدود معانی میں لیتی ہے نہ شہادت علی النّاس کو محدود معانی میں نہ اقامت حق کو محدود معانی میں، جب وہ ایک مومن

جیسے عبادتِ رب کا تقاضا کرتی ہے تو پوری زندگی کے عام گوشوں شعبوں اور حصص میں اس کے نفاذ کو متعین کرتی ہے۔ اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً اور جب وہ شہادت علی الناس کا مطالبہ کرتی ہے تو محض کسی خاص ماحول اور معاشرہ تک نہیں پوری نوع انسانی کے بالمقابل لازم قرار دیتی ہے کہ اپنے قول و عمل سے اپنے فکر و کردار سے اس دین کے شاہد بنو جس دین کو تم نے اپنی زندگی میں دین جان کر اپنایا ہے اور جب وہ اقامت حق کا مطالبہ کرتی ہے تو پورا خطۂ ارضی اس کی زد میں ہوتا ہے۔ وہ فرض قرار دیتی ہے خدا کی زمین پر خدا کی سروری خدا کی جہانبانی خدا کی حاکمیت کے سوا ہر نوع کی حاکمیت باطل محض ہے۔ جس باطل محض کو پا در ہوا کر کے تمہیں دین خدا وندی کو قائم کرنا ہے۔ اور اگر اس میں تم نے کسی جان و مال کی قربانی کسی وقت و اوقات کی قربانی سے دریغ کیا تو تم اپنے دعوائے ایمان میں کاذب ہو گئے۔ تو پھر جان لینا کہ تمہارا مقام دنیا و آخرت میں صدیقین کے درمیان نہیں ہو گا ـــــ مکذبین کے درمیان ہو گا۔ خواہ تمہارے نام عبداللہ اور عبدالسلام ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی نادر کہ خسران زیان ناکامی کامیابی بلندی پستی عزت ذلت کے جو پیمانے اور معیارات اہل دنیا کے نزدیک ہیں وہ ہوں گے اس کے اپنے پیمانے اور معیارات ہیں۔ اور وہ اہل دنیا کے پیمانوں اور معیارات سے قطعی اوپر سے لے کر نیچے تک اور نیچے سے لے کر اوپر تک مختلف ہیں۔ دنیا کی کامیابی تکاثر مال ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک اصل کامیابی انفاق مال ہے۔ اہل دنیا کے نزدیک جو خسران ہے وہ اتلاف جان و مال ہے۔ جب کہ اللہ کے نزدیک اصل خسران عدم یقین و ایمان ہے۔ اہل دنیا کے نزدیک ناکامی کسی دنیاوی مقصد میں ناکام ہو جانے کا نام ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک ناکامی یہ ہے کہ ایک اہل ایمان کی جماعت بھی موجود ہو۔ اہل دین اور اہل حق زندہ اور پائندہ ہوں لیکن خدا کی زمین پر بسنے والے انسان نظامِ عدل و قسط سے محروم ہوں۔ اہل دنیا کے نزدیک معیار عزت و اکرام کچھ بھی ہو جبکہ اس کے نزدیک جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا معیارِ اکرام ہو تقویٰ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اہل دنیا کے نزدیک جو قوت ہے وہ تیغ و تفنگ کی قوت ہے۔ عددی و افرادی قوت ہے جب کہ اس کے نزدیک اصل قوت ایمان و یقین کی قوت ہے۔ اہل دنیا

کے نزدیک ذلت بے کسی بے بسی لاچاری کا جو تصور ہے وہ قلتِ مال و منال ہے۔ عدم جاہ و اقتدار ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک فقدان عرفانِ خداوندی ہے۔ اہل دنیا کے نزدیک وقعت وہ ہے جو دنیا میں ایک شخص کو حاصل ہے خواہ وہ چور ہے ڈاکو ہے۔ طالع آزما حکمران ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک اصل وقعت جو ہے وہ وہ ہے جو آخرت میں اہل ایمان و یقین کو حسن کردار کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی ہے

یہ کتاب کہتی ہے کہ اس کائنات کا دوام و قیام اور اس کائنات کی ہر شے کی بنیاد و اساس توحید خداوندی یعنی حاکمیت خداوندی پر قائم و دائم ہے۔ یہ نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے۔ انسانوں کی فلاح و بقا نجات و صلاح کا بحیثیت عمومی اور بحیثیت مجموعی جس شے پر انحصار ہے، دوام ہے قیام ہے قرار ہے استقرار ہے وہ توحید ہے اور جب کبھی بھی ایک انسان نے یا بہت سے انسانوں نے توحید یعنی حاکمیت خداوندی سے راہ گریز و فرار اختیار کی ہے تو آخرت کا معاملہ تو بعد میں دیکھا جائے گا دنیا میں ہی وہ فرد افراد تباہی و بربادی زیاں و خسران سے دوچار ہو کر رہے ہیں۔ اس کتاب کے نزدیک محض حق تعالیٰ کی مالکیت کو تسلیم کر لینا کوئی کارنامہ نہیں ہے وہ تو کوئی تسلیم کرے نہ کرے اپنے زور و بل پر قائم ہے کہ اس کی حاکمیت بھی تکوینی لحاظ سے اس کی ضرورت مند نہیں ہے کہ کوئی اسے تسلیم کرے۔ تو وہ قائم ہو۔ وہ از خود بالخود ذی روح سے لے کر غیر ذی روح تک کائنات کی ہر شے پر بالقوہ قائم ہے۔ البتہ حاکمیت کا ایک گوشہ جو اختیاری ہے اور جس کا تعلق انسان کی قوتِ اختیار و تمیز سے ہے اس کے بارے میں جس حاکمیت کا نام اس کی زبان میں توحید خداوندی ہے وہ تسلیم کرانا اور تسلیم کرانے کے بعد زندگی کے تمام گوشوں میں انفرادی گوشوں سے لے کر اجتماعی گوشوں تک قائم کرانا چاہتی ہے۔ قائم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور یہی ہے وہ بات جسے قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرماتے ہوئے خالق کائنات نے کہی ہے کہ آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنے نفس کو اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔ آپ ایسے شخص کی ذمہ داری کس طرح سے لے سکتے ہیں۔ گویا اگر کوئی شخص اپنے نفس کی مرضیات کی تابعداری کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کی حاکمیت الوہیت کو خدا کی حاکمیت اور الوہیت کے بالمقابل لا کھڑا کرتا ہے۔ کوئی سماج کوئی سوسائٹی کوئی معاشرہ کوئی جماعت کوئی قوم کوئی ملت جب یہ رویہ اختیار کرتی ہے کہ اپنی زندگی کے معاملات میں

وہ رویہ اپناتی ہے جو اس کی اپنی مرضی کے مطابق ہے تو گویا وہ خدا کی حاکمیت اور الوہیت کو چیلنج کرتی ہے اور اگر کوئی شاہی کوئی بادشاہی کسی ملک کی کوئی صدارت کوئی وزارت کوئی قانون ساز کوئی ایوان پارلیمان اپنے اہل وطن کے لئے اپنی مرضی سے یا جمہور کی مرضی سے جسے مغربی پارلیمانی جمہوریت کہتے ہیں، کے ذریعہ قوانین نافذ کرتی ہے جو قرآن اور سنّت سے متغائر یا متصادم ہوتے ہیں تو وہ بڑے پیمانے پر قوم اور ملک کے پیمانے پر خالق کائنات کی حاکمیت ساورنٹی یا الوہیت کا انکار کرتی ہے تو جان لینا چاہیئے کہ قرآن کے نزدیک اس کتاب کے نزدیک یہ تمام صورتیں شرک ہیں جس میں سے ایک ایک صورت کے نوع شرک ہونے میں اہل علم کے درمیان دو رائیں نہیں ہیں۔

یہ کتاب نہ انفرادی ملکیت کی قائل ہے نہ اجتماعی ملکیّت کی۔ اس کا تصوّر ملکیت اپنا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو جو جو نعمتیں اس ارضی و فانی زندگی میں حاصل ہیں وہ منجانب پروردگار ہیں اور وہ ایک وقت موقت تک کے لئے ان نعمتوں کا امین ہے جس میں سے ہر نعمت کے بارے میں اسے نعمت دہندہ کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔

یہ کتاب جس موضوع کی حامل ہے یعنی انسان سازی اس کا موضوع ہے اس کی تمام تعلیم اس موضوع کے گرداگرد گھومتی ہے اور اس موضوع پر وہ اپنے تمام حسن کلام کو اسلوب کلام کو تراکیب کلام کو استدلال کلام کو نظم کلام کو علم کلام کو استعمال میں لاتی ہے۔ اس موضوع کے سوا اسے کسی اور موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تکوین سے استدلال کرتی ہے تو اس کے لئے۔ شان نزول سے استدلال کرتی ہے تو اس کے لئے شان ترتیب سے استدلال کرتی ہے تو اس کے لئے کردار اہل ایمان و اہل کفر سے استدلال کرتی ہے پھر وہ اپنے اظہار —— میں ایک لفظ تک ایسا استعمال نہیں کرتی جس کو سمجھنا عام انسانی عقل کے لئے دشوار ہو۔ اس کتاب نے خالق کا جو تصور پیش کیا ہے کثیر التعداد اسماءِ حسنٰی کے ذریعہ غیر الہامی کتب تو کجا کوئی الہامی کتاب تک پیش نہیں کر سکتی یعنی وہ ذات عالی جو اس کائنات کی خالق ہے۔ چارہ ساز ہے چارہ گر ہے اپنی ذات وصفات میں واحد و احد ہے۔ بے مثل و بے مثال ہے بے نظیر و لاجواب ہے۔ یکتا و یگانہ ہے۔ الحیّ والقیوم ہے۔ القادر والمقتدر ہے۔

الرحمان الرحیم ہے۔ غفور غفار ہے۔ صبور و شکور ہے۔ علیم و خبیر ہے۔ سمیع و بصیر ہے۔ نافع و ضار ہے محیی و ممیت ہے۔ واجد ہے ماجد ہے۔ قابض و باسط ہے۔ مصوّر و باری ہے۔ عظیم و علیم ہے۔ علی و کبیر ہے۔ کریم و حکیم ہے۔ قوی و متین ہے۔ اول و آخر ہے۔ ظاہر و باطن ہے۔ مقدّم و مؤخّر ہے۔ نور علی نور ہے۔ کل یوم ھو فی شان ہے۔ ان اللہ علیٰ کل شئی قدیر ہے۔ ان اللہ بکل شئی علیم ہے ان اللہ علیٰ کل شئی شہید ہے۔ اس کی صفات لامحدود اس کا علم ناپیدا کنار اس کی وسعتیں حدود فراموش۔ اس کی قوتیں بے پناہ اس کی طاقتیں بے اندازہ وہ ہر لحاظ سے ماوراء الوراء ثم ماوراء الوراء

اس کتاب نے نبوّت و رسالت کا جو تصوّر پیش کیا ہے وہ پرانے تصوّرات حلول و اوتار سے مختلف ہے کہ وہ خالق کائنات کے فرستادے ہیں۔ پیغام بر پیامبر ہیں۔ شاہد ہیں مشہود ہیں سراج منیر ہیں۔ ہادی اور راہ نما ہیں۔ قائد و پیشوا ہیں۔ ان کی زندگیاں اور سیرتیں نوع انسانی کے لئے نمونہ ہیں۔ اسوہ حسنہ ہیں۔ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔ وہ بشر ہیں اور بشریت کے تمام تقاضوں سے متصف ہیں لیکن پوری نوع بشری کے لئے ہدایت کا روشن چراغ ہیں جس کی روشنی سے جہانِ معنوی چکاچوند ہے۔ اس کتاب نے آخرت کے بارے میں جو تصوّر پیش کیا ہے وہ قدیم تصوّرات آواگون اور تناسخ سے قطعی مختلف ہے کہ ایک دن قیامت کا ہے اور قیامت کا دن روزِ قیامت ہے۔ روزِ احتساب ہے۔ روزِ بازپرس روزِ جواب دہی ہے۔ جس میں ایک ایک فرد ایک ایک قوم کو اپنی—— حیاتِ دنیاوی کی کارگزاری کے ساتھ دورِ احتساب سے گذرنا ہے۔ جس کے نتیجہ میں حیاتِ جاودانی ہے۔ جنّت کی صورت میں بھی اور جہنّم کی صورت میں بھی۔ جہاں نہ کوئی سعی ہے نہ کوئی سفارش ہے نہ کوئی بدلہ ہے نہ کوئی ہدیہ ہے۔ نہ کوئی شفاعت ہے الاّ باذن اللہ۔

ایک بات جو اوپر عرض کرنے والی تھی وہ رہ گئی ہے اب عرض کئے دیتا ہوں۔ اس کتاب نے اگر رعایت اسباب کا حکم دیا ہے اور یہ اس لئے کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے تو خارق اسباب امور کو بھی مظہر کیا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ انسان اسباب کا نہ ہو کر رہ جائے۔ شرک فی الاسباب سے نجات حاصل کرے۔ اس کائنات میں جو

فیکٹر ہے جو اصل کارکردگی ہے وہ مشیت کو ہے۔ اسباب تو محض درجۂ حجاب میں ہیں محض ایمان بالغیب کے لئے ہیں۔

میں اس مقالے کو ختم کرنے سے پہلے دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو وہی ہے جو ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کتاب کے نزدیک دین یعنی نظامِ زندگی دین خداوندی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نہ دین الملک نہ دین جمہوریت نہ دین سوشلزم نہ دین سرمایہ داری نہ دین ملوکیت نہ دین نفس نہ دین ابلیس اگر کسی کو جینا ہے تو سوچ سمجھ کر اس دین کے زیر سایہ جئے اور اگر کسی کو مرنا ہے تو سوچ سمجھ کر مرے کہ اس دین سے انحراف کے کیا نتائج ہوں گے۔

اور آخری بات اس کتاب کا معجز نما ہونا۔ جو پورے طور سے ذہن میں مستحضر نہیں ہے۔ عرصہ ہوا کہ پڑھی تھی جو اغلب یہ تھی کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے جو الفاظ ہیں وہ ۱۹ ہیں، قرآن کی کسی بھی سورت کے اعداد کو اگر ۱۹ سے ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب انیس ہوگا۔ یہ ایک مصری مہندس کی تحقیق ہے۔ کلام الٰہی کی حقانیت محض اس پر منحصر نہیں ہے تاہم یہ تحقیق خوب ہے۔ اس تحقیق کا جو مفاد ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب میں ایک حرف ایک لفظ کی کمی بیشی کرنے کی ہر کوشش لاحاصل ہوگی۔

آخر میں تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس مقالے کے راقم کی زندگی میں چار عدد انیس کو صدر درجہ کی اہمیت حاصل ہے۔ یعنی میری تاریخ پیدائش ۱۹ دسمبر ۱۹۱۹ ہے۔ یہ تین "انیس" ہوئے اور چوتھا انیس یہ ہے کہ اس عاجز کو مرکز تنظیم اسلامی کی طرف سے فیصل آباد شہر کا جب ناظم مقرر کیا گیا ہے تو اس روز بھی ۱۹ تاریخ تھی اکتوبر کی اور کیا بعید ہے کہ جس روز اس عاجز کی موت واقع ہو وہ دن بھی کسی مہینہ کی انیس تاریخ کا دن ہو۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

رفتارِ کار

امیر تنظیمِ اسلامی کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں

فیصل آباد

یوں تو فیصل آباد میں پہلے بھی ڈاکٹر صاحب کے پروگرام ہوتے رہے تھے لیکن
تنظیم میں شمولیت کے لحاظ سے کام شروع نہ ہو سکا تھا۔ ماہِ ستمبر میں فیصل آباد سے محترم محمد اقبال واحد صاحب نے
تنظیم میں شمولیت اختیار کی اور اپنے عزم اور انتھک جدوجہد کے ذریعہ ۱۲ر افراد کو تنظیم میں شامل کر لیا۔
(محترم محمد اقبال واحد صاحب پہلے جماعت اسلامی ضلع گجرات کے امیر رہ چکے ہیں) ان کی درخواست پر امیر محترم
فیصل آباد تشریف لے گئے اور پیپلز کالونی کی جامع مسجد رحمانیہ میں ۲۰ر نومبر ۱۹۸۳ء کو بعد نماز عشاء خطاب فرمایا تقریباً
۲ گھنٹے تک "ہماری دینی ذمہ داریاں اور ان کے لوازمات — قرآن حکیم اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں"
کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ اختتام پر حاضرین کو دعوت دی گئی کہ اگر کوئی سوال یا اشکال ہو تو صبح ۹ بجے اسی مسجد میں تشریف
لائیں تاکہ باہم افہام و تفہیم ہو سکے۔ ۲۱ر نومبر ۱۹۸۳ء کو تقریباً ۵۰ افراد تشریف لائے اور کوئی ۱½ گھنٹے تک نشست منعقد ہوئی
اس کے بعد ان حضرات کو جو تنظیم میں شمولیت اختیار کر چکے تھے یا جو اب شامل ہونا چاہتے تھے، دعوت دی گئی کہ وہ جناب
محمد اقبال واحد صاحب کے مکان واقع 3/437 پیپلز کالونی ۱ پر تشریف لے چلیں تاکہ بیعت لی جاسکے۔ چنانچہ مزید نو حضرات
نے محترم ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور تقریباً ۱۱½ بجے یہ محفل دعائے مغفرت و استقامت پر اختتام پذیر ہوئی۔ اس سفر میں
جناب محمد سعید اسعد صاحب۔ جناب محمد احمد صاحب کے علاوہ راقم الحروف بھی موجود تھا۔ اسی سفر کے دوران ہمارے ایک
رفیق جناب راجہ محمد اصغر صاحب جو پہلے لاہور میں دعوتی تنظیم میں تھے، ان سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے بھی ان خطابات میں شمولیت
اختیار کی — قیام و طعام کا انتظام جناب احسان الٰہی ملک صاحب رفیق تنظیم اسلامی کے ہاں رہا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کی جزائے
خیر عطا فرمائے۔ ہم مشکور ہیں جناب شمس الرحمان افغانی خطیب مسجد رحمانیہ کے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ بہترین انتظام فرمایا۔
بلکہ خود بھی خطاب میں موجود رہے۔

نظام آباد / وزیر آباد (۲۳ر نومبر ۸۳ء بروز بدھ)

محمد سعید کھوکھر صاحب اپنے ایک عزیز کے ہمراہ تشریف
لائے تاکہ امیر محترم کو نظام آباد ساتھ لے جا سکیں جہاں پر
انہوں نے دعوتی خطاب کا انتظام کیا ہوا تھا۔ راقم الحروف اور جناب شمس الحق صاحب بھی ساتھ ہو لئے۔ جناب کھوکھر صاحب
نے اپنے ہاں معززین شہر کو کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ اس لئے ہم مغرب سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ اور عشاء تک مختلف حضرات
ملاقات کے لئے تشریف لائے اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ بعد نماز عشاء نظام آباد کی مسجد مبارک اہلحدیث
میں امیر محترم نے قرآن مجید اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں واضح فرمایا کہ انسان کو کن فرائض کے بارے میں یاد
دہانی کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کیا طریقہ اختیار فرمایا اور بحیثیت مسلمان ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں —
تقریباً ۲ گھنٹے کے خطاب کے بعد حاضرین کو دعوت دی گئی کہ اگر اس بارے میں مزید وضاحت مطلوب ہو تو جناب محمد سعید
کھوکھر صاحب کے مکان پر تشریف لائیں کیونکہ صبح کو واپس لاہور آنا ضروری تھا۔ کچھ حضرات تشریف لائے اور تقریباً

ایک گھنٹے تک گفتگو جاری رہی۔ راقم الحروف کو چونکہ صبح راولپنڈی اور ایبٹ آباد جانا تھا اسی لئے اسی وقت واپس آنا پڑا لیکن امیر محترم نے وہاں بھی قیام فرمایا۔

صبح پانچ افراد نے بیعت کی جن میں جناب محمد سعید کھوکھر صاحب کی اہلیہ بھی شامل ہیں۔ جناب محمد سعید کھوکھر صاحب جس طرح سے اپنی بیماریوں کے علی الرغم محنت کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے لئے باعث رہنمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور ہمیں بھی ایمان و صحت سے نوازے رکھے۔ ہم خطیب جامع مسجد اہلحدیث نظام پورہ اور منتظمین کے بھی مشکور ہیں جنہوں نے بڑے جذبے سے اس کام میں تعاون فرمایا۔ مرتب: رحمت اللہ بشر نائب امیر برائے پنجاب و سرحد

امیر تنظیم پنج پیر (صوابی) میں

محترم امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نومبر کی ۱۲ تا ۱۵ تاریخ تک سہ روزہ دورہ پر پشاور تشریف لائے تھے۔ راستے میں امیر محترم مشہور عالم دین جناب مولانا محمد طاہر صاحب سے ملاقات کے لئے ان کے ہاں تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ مولانا محمد طاہر صاحب موضع پنج پیر کے رہنے والے ہیں جو کہ جہانگیرہ سے تقریباً ۱۸ میل دور صوابی کے راستے پر ہے

امیر محترم کی یہ ملاقات جناب مولانا محمد طاہر صاحب سے بہت مختصر رہی اور کسی مفصل ملاقات اور گفتگو کے لئے مستقبل قریب میں کسی مناسب وقت پر ملنے کا وعدہ کیا گیا۔

امیر محترم اپنے اسی وعدے کو نبھانے کے لئے ۴ دسمبر کی صبح تقریباً ساڑھے پانچ بجے خیبر میل کے ذریعے جہانگیرہ ریلوے سٹیشن پہنچے وہاں امیر محترم کو خوش آمدید کہنے کے لئے تنظیم کے ایک رفیق محمد سلیمان صاحب موجود تھے۔ امیر محترم ان کے ہمراہ کار میں جہانگیرہ سے پنج پیر کے لئے روانہ ہوئے۔ فجر کی نماز تک امیر محترم موضع پنج پیر پہنچ چکے تھے اور وہاں کی جامع مسجد میں لوگوں کے اصرار پر نماز فجر پڑھائی۔

بعد از نماز فجر آپ محمد سلیمان صاحب کے ہمراہ ریٹائرڈ کرنل شارس خان کے ہاں تشریف لے گئے۔ ناشتے کا انتظام وہیں تھا۔ ناشتے کے بعد امیر محترم آرام کی غرض سے لیٹ گئے اور دس بجے تک آرام فرمایا۔

تقریباً ساڑھے دس بجے امیر محترم مولانا محمد طاہر صاحب سے ملاقات کے لئے ان کی قیام گاہ پر تشریف لائے۔ مولانا محمد طاہر صاحب نے بڑے تپاک سے امیر محترم کو خوش آمدید کہا اور چونکہ حجرے کے صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی چنانچہ تمام اصحاب وہیں صحن میں چارپائیوں اور کرسیوں پر بیٹھے رہے۔

امیر محترم کی مولانا محمد طاہر صاحب کے حجرے میں آمد سے تھوڑی دیر پہلے پشاور کے تین رفقاء جناب صلاح الدین صاحب، خورشید انجم صاحب اور راجہ سردار احمد صاحب مولانا محمد طاہر صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ چکے تھے۔

مولانا محمد طاہر صاحب ایک جید عالم دین اور مفکر ہیں۔ آپ نے دیوبند سے ۱۹۳۴ء میں فاضل کا امتحان پاس کیا اور پھر ۱۹۳۸ء میں مکۃ مکرمہ میں ایک سال تک مولانا عبید اللہ سندھی سے درس کا فیض حاصل کیا اور پھر چند مدارس میں پڑھانے کے بعد مستقل طور پر اپنے گاؤں تشریف لے آئے اور ایک مدرسہ قائم کیا۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ شرک اور بدعت کے خلاف جہاد ہے۔ جس کی وجہ سے ارد گرد کے ماحول سے خصوصاً اور دور دراز سے عموماً بہت سی مشرکانہ بدعات کا خاتمہ ہو گیا۔ آپ جماعت توحید والسنۃ کے مرکزی صدر بھی ہیں۔ اس جماعت کا مقصد عوام میں توحید و سنت رسول ﷺ کا احیاء ہے۔

امیر محترم اور مولانا محمد طاہر صاحب کی گفتگو کا آغاز مولانا سندھی ؒ کے حوالے سے ہوا اور مولانا محمد طاہر

صاحب نے مولانا سندھی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑے دلچسپ انداز میں گفتگو فرمائی۔ آہستہ آہستہ گفتگو کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور امام ابن تیمیہؒ اور امام غزالیؒ سے لے کر شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ تک کی شخصیات اور ان کا علم و عمل زیر بحث رہا۔ جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور ان کا پیغام جہاد و سلسلہ بیعت بھی موضوع گفتگو رہے اور اسی مناسبت سے تحریک مجاہدین کے مختلف پہلوؤں پر بھی دونوں اہل علم حضرات کے درمیان کافی دلچسپ بات چیت ہوئی اور آخر میں ملکی حالات اور اسلامی تحریکوں کا انتہائی محققانہ جائزہ لیا گیا۔ اور احیاء اسلام کے لئے کی گئی کوششوں اور مستقبل میں ان کوششوں کے اثرات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ اس نشست کے دوران تقریباً ساڑھے گیارہ بجے راولپنڈی کے امیر جناب عبدالصمد صاحب بھی تشریف لے آئے۔

اسی دوران مولانا طاہر احمد صاحب نے امیر محترم کو اپنی چند تصانیف بطور تحفہ پیش کیں۔ مولانا صاحب کی یہ تمام تصانیف عربی زبان میں ہیں۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے یہ نشست اختتام کو پہنچی اور کھانے کا دور شروع ہوا۔

محمد سلیمان صاحب نے انتہائی پر تکلف کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا اور دس بارہ مہمان کھانے میں شریک ہوئے۔ کھانے کے بعد نماز ظہر مولانا محمد طاہر صاحب کی امامت میں ادا کی گئی۔ بعد از نماز امیر محترم نے کچھ دیر کے لئے آرام کیا اور سوا تین بجے کے قریب نیند سے بیدار ہوئے اور نماز کی تیاری فرمائی۔ اس وقفہ کے دوران باقی رفقاء اور مہمان مختلف امور پر گفتگو کرتے رہے۔

عصر کی نماز کے بعد مولانا محمد طاہر صاحب نے امیر محترم کو اپنے ذاتی کتب خانے کی سیر کروائی۔ جہاں پر کافی نادر، نایاب اور قیمتی کتب دیکھنے میں آئیں۔ بعد میں امیر محترم نے مولانا طاہر صاحب کو چند کتب تحفۃً پیش کیں۔

ان تمام امور کی انجام دہی کے بعد تمام اصحاب پھر صحن میں تشریف فرما ہو گئے اور وہیں پر چائے وغیرہ پی اور مختلف علمی امور پر بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔

مغرب کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے ہی امیر محترم رفقاء اور چند دوسرے اصحاب کے ہمراہ جامع مسجد کی جانب روانہ ہوئے۔ کیونکہ مغرب کی نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب کا درس تھا۔ جس کے لئے ارد گرد کے تمام دیہات میں متعدد بار اعلانات کروائے جا چکے تھے۔ اس لئے امیر محترم کے جامع مسجد پہنچنے سے قبل ہی مسجد میں کافی لوگ جمع ہو چکے تھے انہوں نے امیر محترم کا بڑا پرتپاک استقبال کیا اور امیر محترم کو مسجد میں لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد مغرب کی اذان ہو گئی اور تمام لوگوں نے امیر محترم کی اقتداء میں نماز ادا کی۔

نماز کے بعد تھوڑی دیر تک انتظار کیا گیا اور تقریباً ساڑھے پانچ بجے امیر محترم نے درس کا آغاز کیا۔ درس کا موضوع "توحید و سنت کا عملی پہلو" تھا۔ اس موضوع پر امیر محترم نے تقریباً پونے دو گھنٹے تک انتہائی مدلل و مؤثر اور فصیح و بلیغ خطاب فرمایا۔ جسے لوگوں نے توجہ، احترام اور ذوق و شوق سے سنا مقامی لوگوں کی ایک بڑی تعداد مسجد میں موجود تھی اور دور دراز کے دیہات سے بھی کافی لوگ درس میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔

درس کے بعد عشاء کی نماز ادا کی گئی اور بعد از نماز سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں کافی لوگوں نے متعدد امور کے بارے میں سوالات کئے جن کے انتہائی مدلل اور تسلی بخش جواب دیئے گئے۔ انہی میں ایک صاحب شیر اعظم خان جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کی تقریباً تمام تصانیف کا بغور مطالعہ کیا ہوا ہے۔ انہوں

نے ایک لمبے چوڑے کاغذ پر بیس سوالات لکھے ہوئے تھے جن میں سے چند کے جوابات امیرِ محترم نے اسی وقت دیئے اور بقیہ جوابات کے لئے انہیں دوسرے دن صبح آٹھ بجے کا وقت دیا اور اس طرح یہ سلسلہ سوال وجواب اختتام کو پہنچا اور امیرِ محترم واپس مولانا طاہر صاحب کے حجرے میں تشریف لے گئے۔

درس کے دوران تنظیمِ اسلامی کے رفقاء نے مسجد کے اندر ہی مکتبہ لگایا جس میں لوگوں نے بہت دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اچھی خاصی کافی تعداد میں کتب خریدیں۔

مولانا طاہر صاحب نے رات کے کھانے کا انتہائی پُر تکلف اور پُر اہتمام انتظام کر رکھا تھا۔ کھانے کے دوران امیرِ محترم سے ملنے کے لئے دو اصحاب تشریف لائے جو چودہ میل دور کے ایک گاؤں کالو خان سے آئے تھے۔ کھانے کے بعد امیرِ محترم نے ان اصحاب کے ساتھ مختلف امور پر گفتگو فرمائی اور ان کے رخصت ہونے کے بعد امیرِ محترم آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔

صبح ناشتے کے دوران بھی مختلف علمی موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ یہ نشست کافی دیر تک جاری رہی پھر مولانا صاحب وہاں سے تشریف لے گئے کیونکہ مختلف لوگ امیرِ محترم سے ملاقات کی غرض سے اور سوال و جواب کیلئے آنے شروع ہو گئے۔

صبح کی اس نشست میں پنج پیر کے ایک عالم جناب مولانا محمد غفور صاحب بھی امیرِ محترم سے ملاقات کیلئے تشریف لائے۔ مولانا موصوف بھی مدرسۂ دیوبند سے فارغ التحصیل ہیں اور آپ وہیں جامع مسجد میں درسِ قرآن دیتے ہیں۔ مولانا موصوف نے تنظیمی امور میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور "عہد نامہ" اور دوسری اہم کتب حاصل کیں۔ یہاں پر مدرسے کے ایک طالب علم جو کہ خود بھی مختلف مدارس میں درس دیتے رہتے ہیں، انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی اور تنظیم میں شمولیت کی خواہش کا اظہار کیا اور کچھ عرصہ بعد "قرآن اکیڈمی لاہور" آنے کا وعدہ کیا۔

یہ نشست تقریباً ساڑھے نو بجے تک جاری رہی اور تقریباً پندرہ بیس اصحاب نے امیرِ محترم سے ملاقات کی۔ اور مختلف سوالات کئے جن کے تسلی بخش جوابات دیئے گئے۔

ساڑھے نو بجے کے قریب مولانا صاحب تشریف لائے اور چونکہ کار بھی آچکی تھی۔ لہٰذا تیاری کر کے امیرِ محترم باقی تمام رفقاء کے ہمراہ وہاں سے روانہ ہوئے جبکہ مولانا طاہر صاحب امیرِ محترم کو گاڑی تک چھوڑنے کے لئے تشریف لائے اور بھی بہت سے اصحاب امیرِ محترم کے ساتھ کار تک آئے اور انہیں بڑے تپاک سے رخصت کیا۔

واپسی میں رفقاء اور امیرِ محترم پنج پیر سے زیدہ کے راستے جہانگیرہ آئے۔ جہاں پر پشاور سے آئے ہوئے رفقاء گاڑی سے اتر گئے اور امیرِ محترم جناب عبدالصمد صاحب کے ہمراہ راولپنڈی بذریعہ کار روانہ ہو گئے۔ اور اس طرح یہ پروگرام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کامیابی سے اختتام کو پہنچا۔

ملتان

اس مرتبہ امیرِ تنظیم کا دورۂ ملتان بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ نہ صرف یہ کہ ربیع الاول کے مہینے میں سیرت النبیؐ پر پہلی تقاریر تھیں بلکہ رفقاء کی تربیت اور مقامی علماء سے تعارف بھی تھا۔

۶ دسمبر ۱۹۸۱ء کو عصر کے وقت جب امیرِ تنظیم کا ہوائی جہاز ایئرپورٹ پر رکا تو (ریٹائرڈ) کرنل حیدر تریں صاحب، امیرِ ملتان استقبال کے لئے موجود تھے۔ مصافحہ و معانقہ کے بعد جب امیرِ موصوف ۲۵۔ آفیسرز کالونی پہنچے جہاں ان کے قیام کا

بندوبست تھا تو رفقاء وہاں موجود تھے۔ ان سے مصافحہ کے بعد امیر تنظیم نے عصر کی نماز پڑھائی اور آرام کرنے اپنے کمرے میں چلے گئے کیونکہ پچھلے دو دن سے آپ مسلسل سفر میں تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد چائے کی ایک پیالی پی اور خانگڑھ کے لئے تیاری کی۔ روانگی سے چند منٹ پہلے محمد احمد صاحب مکتبہ لے کر تشریف لے آئے۔ انہیں بھی ساتھ لیا اور دو کاروں پر یہ مختصر قافلہ روانہ ہوا۔ محمد احمد صاحب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ وقت پر پہنچے ورنہ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ جلسہ کہاں ہونا ہے۔ خان گڑھ ایک چھوٹا سا شہر ہے جو کہ ملتان سے ۲۷ میل کے فاصلے پہ ہے اور نوابزادہ نصراللہ خان کی رہائش گاہ وہیں ہے۔

امیر تنظیم کی تقریر کا اہتمام وہاں کی جامع مسجد فاروقیہ میں کیا گیا تھا جو کہ بہت وسیع اور کشادہ تھی۔ ادائیگی نماز کے بعد تقریباً آٹھ بجے تقریر شروع ہوئی۔ امیر موصوف نے رسالت مآبؐ بحیثیت ختم نبوت اور ختم رسالت پر روشنی ڈالی اور فرق واضح کیا۔ مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور سب لوگوں نے اس مدلل تقریر کو بہت غور سے سنا۔ تقریر کے بعد مقامی لوگوں نے کھانے کا انتظام مسجد کے مہمان خانے میں کیا ہوا تھا جسے سب نے سیر ہو کر کھایا۔ تقریباً گیارہ بجے ہماری روانگی ہوئی اور بارہ بجے ہم ملتان واپس گھر پہنچے۔

۷ دسمبر: صبح نو بجے وہاڑی کے چند رفقاء بمع اپنے امیر کے بھی آگئے اور تربیتی پروگرام میں شامل ہو گئے۔ صبح دس بجے ناشتے سے فارغ ہو کر تربیت کی نشست ہوئی جس میں امیر موصوف نے سورۂ مائدہ کی آیات نمبر ۵۴-۵۵-۵۶ پر درس دیا اور واضح کیا کہ حزب اللہ میں ایک کارکن کے کیا اوصاف ہونے چاہئیں۔ اس موقعہ پر تنظیم کے رفقاء کے علاوہ برادرم عبدالماجد خان کے والد بزرگوار اور ان کی فیکٹری کے ایک ساتھی جناب ظفر خان صاحب اور ان کے دو بیٹے بھی موجود تھے۔ دل کرتا تھا کہ امیر موصوف روزانہ درس دیتے رہیں تاکہ ہمارے ایمان کی شمع ہمیشہ روشن رہے۔ درسِ سورۂ مائدہ کے بعد کچھ سوال و جواب ہوئے جس میں ظفر خان صاحب کے چھوٹے بیٹے نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے بھائی کو دین کی خدمت کرنے کی استطاعت عطا فرمائے اور اقامتِ دین کو سمجھنے اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی توفیق بخشے (آمین)۔ ابھی گفت و شنید جاری تھی کہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کی سٹوڈنٹس یونین کے صدر اور ان کے دو ساتھی آن پہنچے۔ ان کی کوشش تھی کہ یونیورسٹی میں سیرت النبیؐ کے موضوع پر امیر موصوف خطاب فرمائیں۔ امیر موصوف طلباء کے معاملے میں دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں لیکن یہ جان کر حیرت ہوئی کہ صدر صاحب جو کہ اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن تھے اور ناظم بھی رہ چکے تھے کی داڑھی نمدارد تھی۔ اور ان کے ایک ساتھی جو کہ جمعیت کے رفیق تھے سنّتِ رسولؐ پر کاربند تھے۔ امیر موصوف نے ان سے کہا کہ ان کے زمانے میں ایسا ناممکن تھا کہ ایک رکن ہو اور اس کی وضع قطع سنّت رسولؐ کے مطابق نہ ہو۔ بہرحال امیر موصوف نے اپنے پروگرام کو جمعہ ۹ دسمبر تک طول دے دیا۔ صدر صاحب بھی خوش ہو کر اٹھے اور ہمیں بھی دلی مسرت ہوئی کہ کچھ لمحے اور ان کی صحبت میں گزریں گے۔ راقم نے فوراً جا کر امیر موصوف کی ٹکٹ جمعہ کی صبح کی پرواز پر بک کرالی۔ دوپہر کا کھانا سب نے مل کر ترین صاحب کے گھر میں کھایا۔ اس کے بعد تمام رفقاء شام کے جلسے کی تیاری میں لگ گئے۔ اس موقعہ پر اگر میں جناب شفیع صاحب، یونس صاحب، عبدالغنی صاحب، عبدالرحمان خان صاحب، ماجد خان صاحب اور رفیق اقبال صاحب کی کاوشوں اور محنتوں کا ذکر نہ کروں تو زیادتی ہوگی جنہوں نے اپنی انتھک جدوجہد سے پوسٹر لگائے۔ ہینڈ بل تقسیم کرائے۔ اخبارات میں خبریں چھپوائیں۔ کتابت کروائی اور جلسہ گاہ کو بینرز سے آراستہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائے۔ شام کی تقریر کا سماں دیکھنے کے لائق تھا۔ ایک بہت بڑا پنڈال تھا جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کرسیاں پُر ہو گئیں تو فرش پر چادریں بچھا دی گئیں۔ لوگوں کا جوش اور جذبہ قابلِ دید تھا جو کہ اتنی سردی

فرش پر بیٹھ کر نہایت صبر وتحمل سے امیر تنظیم کی ولولہ انگیز تقریر سنتے رہے۔ تقریر سے قبل ترین صاحب نے تلاوت کی اور [illegible] پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور تنظیم اسلامی کے متعلق تعارفی کلمات کہے اور قرآن مجید کو پڑھنے، سمجھنے سمجھانے اور اس پر عمل کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ امیر موصوف نے انقلاب محمدیؐ کے چھ مراحل کو قرآن کی روشنی سے واضح کیا اور ہمارے دینی فرائض کو اسوۂ حسنہ کی روشنی میں بیان کیا۔ لوگوں کا بیان تھا کہ سیرت النبیؐ کے موضوع پر اتنی مدلّل اور علمی تقریر کبھی نہیں سنی۔ واللہ اعلم!

تقریر کے بعد ایک صاحب جو فوج سے منسلک ہیں، نے امیر موصوف کے ہاتھ پر جہاد فی سبیل اللہ کی بیعت کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس پر کاربند رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

۸ دسمبر: صبح ۹ سے گیارہ بجے کا وقت سوال و جواب کے لئے مخصوص تھا جس میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ امیر موصوف نے نہایت صبر وتحمل سے لوگوں کو جوابات دیئے اور مفید مشورے بھی۔ ابھی سوالات باقی تھے مگر وقت کی کمی اور دوسرے پروگرام میں شرکت کے لئے یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا۔ گیارہ سے ایک بجے تک ملتان کے علماء کے ساتھ امیر موصوف کی نجی ملاقات تھی۔ اس میں شرکت کرنے والے علماء گرامی یہ ہیں:

مولانا محمد شریف صاحب خلیفہ مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ مولانا ابو معاویہ ضیاء صاحب مدرس مدرسہ عبیدیہ
مولانا عبدالرحیم صاحب مدرس مدرسہ نعمانیہ۔ صاحبزادہ حافظ عبدالخیر فاضل مدرس مدرسہ عبیدیہ
صاحبزادہ قدوسی، خطیب جامع مسجد عباد الرحمٰن۔ مولانا عطاء اللہ صاحب فاضل خیر المدارس
صاحبزادہ خلیل صاحب مدرس مدرسہ عبیدیہ

مصافحہ و معانقہ کے بعد ملکی صورتحال اور دینی مسائل زیر بحث آئے۔ تمام علماء کرام امیر موصوف کی دینی خدمات کے معترف اور تعاون کے خواہش مند تھے۔ ہم تہہ دل سے ان کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں میں سے وقت نکالا اور ملاقات کی۔ کچھ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک جھنڈے تلے جمع کر دے اور اقامتِ دین کے عظیم فرض کو نبھانے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

میں سمجھتا ہوں کہ امیر موصوف کا یہ اقدام ان کے خلوص نیت کا مظہر ہے کہ دین کی بنیادی باتوں پر اور اختلافی مسائل کو پس پشت ڈال کر ہم متحد ہو سکیں۔ امیر ملتان ترین صاحب نے تمام موجود احباب کے لئے ظہرانے کا اہتمام کیا ہوا تھا اور اس موقع پر ان کی مہمان نوازی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ جنہوں نے اپنے گھربار کو تنظیمی اور دعوتی کاموں کے لئے وقف کیا ہوا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم واپڈا کالونی کی مسجد پہنچے۔ جہاں پر امیر موصوف نے سیرت النبیؐ پر اپنے مخصوص انداز میں تقریر فرمائی۔ تقریر کے بعد کچھ وقت ملا کہ ہم اپنی کمریں سیدھی کر سکیں۔

مغرب کی نماز کے بعد چائے کا دور چلا اور عشاء کے بعد دو کاروں پر مشتمل قافلہ یونیورسٹی روانہ ہوا۔ ابوبکر ہال طلباء سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ آس پاس کھڑے تھے۔ کافی تعداد میں لوگ پچھلے برآمدے میں بھی کھڑے تھے۔ امیر موصوف کو کھڑے ہو کر تقریر کرنا تھی۔ انہوں نے انقلاب محمدیؐ کے ایک ایک پہلو کو اجاگر کیا۔ انقلاب محمدیؐ کا سرخ انقلاب اور فرانسیسی انقلاب سے موازنہ کیا اور پورے دھڑلے کے ساتھ بیان کیا کہ ہمیں انقلاب لانے کے لئے اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لئے نہ صرف یہ کہ حضورؐ کے طریقے پر عمل کرنا ہوگا بلکہ ہدایت نامہ (قرآن پاک) کو ہتھیار بنا کر اپنے سینوں میں اتارنا ہوگا۔ تقریر کے اختتام پر تالیوں کی گونج اس بات کی مظہر تھی کہ نہ صرف انہوں نے بات کو سمجھا ہے بلکہ اسے سراہا بھی ہے۔

اس کے بعد مختصر سے وقت میں سوال و جواب کا سلسلہ ہوا اور یوں یہ مفید دورہ اختتام کو پہنچا۔

۹ دسمبر: امیر محترم کا جہاز سوا نو بجے روانہ ہونا تھا لیکن دھند کی وجہ سے ۱۱½ بجے روانہ ہوا۔ ہمیں موقعہ ملا کہ ان کی صحبت سے مستفید ہوں۔ اسی اثنا میں یونیورسٹی کے طالب علم اور راقم کے ہمسایہ جناب تحسین ملک نے امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبر و استقامت عطا فرمائے۔ آمین۔

۱۱½ بجے راقم امیر محترم کو ائیرپورٹ پر الوداع کہنے گیا۔ امیر محترم بڑی شفقت سے بغل گیر ہوئے اور لاؤنج کی جانب بڑھے۔

مرتب: ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی

عن انسؓ عن النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم

قال

لا یؤمن احدکم حتی یحبّ لاخیہ ما یحبّ لنفسہ

(رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

عطیہ: حاجی محمد سلیم

حاجی شیخ نور الدین اینڈ سنز لمیٹڈ (Exporters)

نمبر ۳۰۱، نسڈا بازار، لاہور ۳۰۶۴۶۸ / ۳۰۵۴۶۱

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے

بڑے فوائد بھی ہیں۔

THE ORIGINAL

PEPSI

MIRINDA

پاکستانی خواتین کے ایک مقبول اور کثیر الاشاعت ماہنامہ

میں شائع شدہ
ڈاکٹر اسرار احمد
کا انٹرویو

اوائل ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن پاکستان کے اجلاس منعقدہ خالقدینا ہال کراچی میں خطاب کی دعوت دی گئی تھی۔ اجلاس کے اختتام پر ایسوسی ایشن کے صدر جناب ڈاکٹر مبین اختر صاحب ڈاکٹر صاحب کو اپنے کلینک واقع نارتھ ناظم آباد لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ وہاں ایسوسی ایشن کے مندوبین ہوں گے، ان سے گفتگو ہوگی، لیکن اس کے برعکس وہاں ماہنامہ 'آنچل' کراچی کی مدیرہ اور ایک اور خاتون منتظر تھیں اور اچانک یہ راز کھلا کہ یہاں انٹرویو کا اہتمام ہے۔ اجلاس کے موقع پر ڈاکٹر صاحب کو مدیرۂ 'آنچل' کی جانب سے انٹرویو کی فرمائش پر مشتمل رقعہ تو ملا تھا لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے لئے اس طور سے فوری 'سازش' ہو جائے گی۔ بہرحال وہاں کچھ گفتگو ہوئی ——— اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کے ذہن سے یہ واقعہ بالکل محو ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اچانک ستمبر ۸۲ء میں ڈاکٹر صاحب کراچی گئے تو ایک صاحب نے نہایت تحسین آمیز انداز میں اس انٹرویو کا ذکر کیا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فوراً تو بالکل انکار کر دیا کہ میں نے خواتین کے کسی جریدے کو انٹرویو نہیں دیا۔ پھر اچانک انہیں وہ واقعہ یاد آگیا تو خیال ہوا کہ پرچہ حاصل کر کے دیکھا جائے کہ کیا کچھ چھاپ دیا گیا ہے ——— بلکہ اس پر حیرت بھی ہوئی کہ 'آنچل' والوں نے یہ کیا کیا کہ انٹرویو جولائی کی اشاعت میں چھپ گیا لیکن ہمیں خبر تک نہیں دی ——— بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے تو پانچ پرچے بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ ارسال کر دیئے تھے لیکن غالباً محکمہ ڈاک کے کارکنوں کو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پسند آگئے ——— بہرحال انہوں نے دوبارہ پرچہ عنایت کیا تو یہ انٹرویو سامنے آیا جسے قارئین 'میثاق' کی دلچسپی کیلئے شائع کیا جا رہا ہے۔

(جمیل الرحمٰن)

فاطمہ زہرا جبین

دل موہ لینے والا مسحور کن انداز بیان، تقدس مآب چہرہ، دانش مندانہ پُروقار پیشانی، بردباری اور آہستہ آہستہ آدمی سے سچائی منوانے کی صلاحیت... یہ ہیں وہ اوصاف جو ٹی. وی پروگرام "الہدیٰ" کو دیکھتے ہوئے میرے ساتھ لاکھوں لوگوں نے محسوس کئے ہوں گے.

پاکستان بہترین عالم دین حضرات کا گہوارہ ہے اور ہم بے حساب علماء کرام کے ذریعے آفاقی علم حاصل کرتے ہیں لیکن انداز بیاں کی انفرادیت اور آواز کی گھن گرج کے ساتھ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ہے 'تقویٰ'... جس کی مثال فی زمانہ مشکل ہی سے ملے گی... میں نے سوچا، اس شخص کے تقوے کی مثال کیسے دوں جو آج کے ترقی پسند

دور میں انحطاط پیغمبری کے اتباع پر منحصر ہے. جب کہ لوگوں کا خیال ہے کہ اس جدید سائنسی دور میں چودہ سو سال پیچھے سفر کرنا ممکن نہیں... اتباعِ رسولؐ مشکل ہے. لوگ انہیں جو چاہیں کہیں جو چاہیں سمجھیں. میں اپنے طور پر یہ سمجھنے میں برحق ہوں کہ تقویٰ اختیار کرنا ہی وہ عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا ضامن ہے. متقی اللہ کی نظروں میں محبوب ہوتا ہے. اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو پسند کرتا ہے، جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے راہِ نجات پر گامزن ہوئے.

ایک کوالیفائڈ ایلوپیتھک ڈاکٹر کا اس قدر تقویٰ کا پابند ہونا میرے لئے واقعی نہ صرف حیرت کا باعث تھا بلکہ مسرت کا بھی... کہ منشائے ایزدی کا کامل اتباع کس قدر مشکل امر ہے.

وقت بدلا ہوا ہے. اقدار بدل چکی ہیں. رسم و رواج تبدیل ہو گئے ہیں. بڑے بڑے جید علماء اور راہبرانِ دین، اسلامی شعار کو اختیار کرتے ہوئے وقت کی رفتار کو بہرحال ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے چلن کو حسبِ حال ڈھال لیتے ہیں. تاہم ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام کے موقف کو اسی حال میں جاری رکھنے پر مصر ہیں، جس طرح قرآن حکیم کے ذریعے آنحضورؐ نے نافذ کیا. وہ دین میں کسی بھی پیوندکاری کے روادار نہیں. ان کا موقف یہ ہے کہ دین اسلام اتنا مکمل اور فطری دین ہے کہ تاقیامت اس میں تبدیلی کی ضرورت نہیں. تمام انسانی ضرورتیں وہ خود پوری کرتا ہے پھر کس تبدیلی کی گنجائش ہے. اس دین کو... اختیار کرنے میں کیا قباحت ہے؟

محترم ڈاکٹر اسرار احمد، عورتوں کو تو کیا، مردوں کو بھی انٹرویو نہیں دیتے. عجیب مایوس کن اور حوصلہ شکن صورتِ حال تھی اور میں نے اس صورتِ حال کو اپنی آرزو میں ڈھالنے کا تہیہ کر لیا تھا.

مدیرۂ آنچل سے گفتگو کے ایک طویل مرحلے سے گزرنے کے بعد میں نے واقعی اس چیلنج کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا.

ایک تقریب میں بطورِ خاص شرکت کرنے کے لئے، میں خالقدینا ہال میں صبح نو بجے سے موجود تھی. میں اپنی کوتاہی سے کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی. معلوم ہوا کہ بعد نمازِ مغرب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب قبلہ کی تشریف آوری متوقع ہے.

بہت سوچ بچار کے بعد، میں نے ایک خط اُن کے نام تحریر کیا جس کا متن حسبِ ذیل ہے اور قارئین کی خدمت میں پیش ہے.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم.

محترم ڈاکٹر صاحب قبلہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ

میں خواتین کے رسالے ماہنامہ آنچل کی طرف سے آپ کا انٹرویو لینا چاہتی ہوں. رسالہ اگرچہ تفریحی ادب کا سرچشمہ ہے، تاہم دینی مسائل پر انتہائی مستند خدمات کی انجام دہی میں کسی قسم کے تساہل سے کام نہیں لیتا. مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے انٹرویو دینے سے انکار نہیں کریں گے کیونکہ لازمی امر ہے کہ اسلام کے اسکالروں کے انٹرویو شانِ جہاد کے ساتھ، دین کو بہتر طریقے پر قارئین کے آگے پیش کرے. لیکن میں چاہتی ہوں کہ لوگ، آپ جیسے لوگوں سے واقف ہو سکیں. دین کی رہنمائی کے لئے مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں.

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خواتین دین کے سلسلے میں راہبری کی جستجو میں حاضرِ خدمت ہوا کرتی تھیں تو دھتکاری نہ جاتی تھیں. قوم کی لاکھوں بیٹیاں آپ کے علم کی برکتوں سے مستفیض ہونا چاہتی ہیں... کیا آپ، انہیں مایوس کر دیں گے؟

کمترین فاطمہ زہرا جبین
نمائندہ ماہنامہ آنچل. کراچی

ڈاکٹر اسرار احمد نے میرا خط، اسٹیج ہی پر کھول لیا. اُن کے لبوں پر ایک پُرنور سی مسکراہٹ رینگ گئی... اور میں، امید و بیم کے درمیان ہچکولے کھاتی کشتی کی مانند، اُن کی طرف دیکھتی رہی. پروگرام کے اختتام کے بعد جب انہوں نے میری طرف توجہ فرمائی تو میں نے مرعوب ہوتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا.

• انٹرویو سے مجھے انکار نہیں لیکن صبح آٹھ بجے، مجھے واپس بھی جانا ہے." انہوں نے پُراخلاق انداز میں معذرت چاہی.

میں نے ایس. اے خان اور ڈاکٹر سید مبین اختر کی طرف دیکھا. ڈاکٹر مبین اختر نے بروقت، میری اخلاقی مدد کرتے ہوئے کہا.

"ہم، دی. آئی. پی ہاؤس چلتے ہیں. آپ وہیں انٹرویو کر لیں."

ڈاکٹر صاحب کی مقدس شخصیت کی جو دھاک دل پر بیٹھ چکی تھی، اُس نے اب اعتماد کی شکل اختیار کر لی تھی.

رات گہرائی میں اتر رہی تھی. ڈاکٹر صاحب کچھ سفر، کچھ عمر اور کچھ شفقتِ خطابت کے باعث تھکے تھکے سے نظر آ رہے تھے. تاہم اُن کی روشن آنکھوں کی طرف دیکھ کر انسان مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا.

میں، انٹرویو حاصل ہونے کی مسرت اور طمانیت سے کچھ نفسیاتی طور پر متاثر و مرعوب ہو کر سوال کرنے لگی.

• آپ موجودہ دور میں نفاذِ اسلام کے منصوبے اور اس پر عمل درآمد سے مطمئن ہیں؟"

• قطعاً نہیں." وہ اعتراف کے معاملے میں بے باک اور مکمل طور پر راست گو تھے.

"کیوں... کوئی وجہ، کوئی خامی؟"

• نفاذِ اسلام کی رفتار اس قدر مدھم اور خطوط اس قدر موہوم ہیں کہ اگر واقعی اس کی برکات، معاشرے پر اثر پذیر ہو چکی ہیں تو. اُز.

کا واضح اور مکمل ظہور نہیں پایا جاتا۔ اسی وجہ سے لوگوں میں مایوسی اور کچھ بددلی پائی جاتی ہے۔ موجودہ حکومت، نفاذِ اسلام کے معاملے میں انتہائی سست روی سے کام کر رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ دین کے نفاذ کے سلسلے میں بھی انہوں نے اپنی ترجیحات رکھی ہیں اور یہ ترجیحات دین سے ہرگز ہرگز مطابقت نہیں رکھتیں۔ مثلاً یہ کہ جنسی جرائم کی جو سزا وہ دیتے ہیں اُن میں احکام دین اور قرآن کے مطابق ستر اور حجاب کے جو احکام ہیں، اُن پر قطعی عمل نہیں ہوتا۔ بتدریج ہی سہی، نافذ تو کریں۔ دین کے احکامات پر مکمل طور پر عمل درآمد خواہ وہ تدریجی ... طریق کار ہو یا انقلابی عمل کے ذریعے، دینِ مبین کی آفاقی حیثیت کے نفوذ کا واحد ذریعہ ہے ... اور اب جب کہ عمل درآمد ہی نہیں ہو رہا ہے بلکہ وقت کا بڑا حصہ صرف دستاویزی تیاریوں وغیرہ میں صرف ہو رہا ہے تو امر لازم ہے کہ اس رفتار سے سفر کی منزلوں کا یقین انتہائی مایوس کن ہوگا۔"

• "کیا آپ کے خیال میں دین کو مکمل طور پر یک لخت نافذ کرنا چاہیئے؟"

"جی ہاں۔ یک لخت اور آناً فاناً ... کیونکہ اسلام کو نافذ کرنے کے لئے 'جزو' کے فلسفے سے 'کل' کا فلسفہ زیادہ موثر اور مستحکم ہے۔ اور انقلاب ہی وہ لفظ ہے جو اس کے عمل کو بیان کر سکتا ہے۔ یعنی انقلابی خصوصیت کے حامل لوگ، انقلابی جماعت بنائیں ... اور انقلاب کی راہ ہموار کر کے غیر اسلامی شعائر کو یک لخت منسوخ کریں۔ یہ وہ لوگ ہوں جو بنیادی طور پر تربیت شدہ ہوں۔ جنہوں نے اسلام کی خاطر قربانیاں دے کر اپنے آپ کو ثابت کیا ہو۔ جب تک محنت شاقہ سے ایسے لوگ فراہم نہ ہوں گے جو دین کی آفاقی حیثیت پر ناقابل شکست اعتماد رکھتے ہوں اور اس کے نفاذ میں کسی مزاحمت کی پرواہ نہ کرتے ہوں۔ ایک انقلابی جماعت کا وجود میں آنا کیا معنی خیز نہیں؟"

• "نفاذِ اسلام کے لئے کیا اسلام کو زمانے اور وقت کے ارتقائی مدارج کا تابع رکھنا بہتر ہے یا زمانے کو اسلام کے اتباع سے ... مشروط رکھنا ہوگا؟"

• "اصل میں تو ہمیں زمانے کو دین کے تابع کرنا ہے۔ دین کو وقت کے پیمانے میں اُتارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ دین ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کی تمام تر مادّی اور روحانی افادیت کی کما حقہ معنویت کے ساتھ نافذ کیا گیا ہے۔ ارتقاء دراصل کائنات کے علم کے حصول اور حصول کے ذریعے زندگی کے معیار اور حصولِ آگہی کے معیار کا بتدریج اضافہ ہے۔ اس اضافے کے لئے لباس، طرزِ معاشرت ... طرزِ بود و باش، عقیدے یا یقین میں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی البتہ ایک عنصر اجتہاد کا ہے۔ وہ چونکہ دین کے اندر ہے، دین سے باہر نہیں ہے۔ لہٰذا میں اس کو یوں نہیں کہوں گا کہ ہم نے زمانے کے مطابق دین کو کیا ہے بلکہ دین تو اپنی جگہ پر صدیوں سے قائم ہے۔ ہمیں اس کو نافذ کرنا ہے، حاکم بنانا ہے۔"

• "ڈاکٹر صاحب! بسا اوقات لوگ آپ کو انتہا پسند قرار دیتے ہیں۔ کیا آپ واقعی انتہا پسند ہیں؟"

"دراصل مجھے یہ اندازہ ہی نہ تھا کہ لوگ مجھے انتہا پسند سمجھتے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ وہ کس انداز میں مجھے انتہا پسند قرار دیتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں خود کو FUNDAMENTALIST کہلائے جانے پر اعتراض نہ کروں گا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے جو FUNDAMENTALS ہیں، اُن پر میں کبھی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ میں دین کو مکمل سمجھتا ہوں۔ اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ دین کو وقت کے لحاظ سے تبدیل کئے بغیر بھی انسان ارتقاء کے اعلیٰ ترین مدارج طے کر سکتا ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ لوگ ... مجھے انتہا پسند سمجھتے ہوں کیونکہ میں دین پر تصرف کرنے میں ایسا کوئی سودا کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے انتہا پسند کن معنوں میں کہا جاتا ہے، اس کا مجھے کوئی جواز ہی نظر نہیں آتا۔"

• "اگر آدمی اپنی ذات کی حد تک مضبوط کردار کا حامل ہو تو انتہا پسند ہو جاتا ہے۔ تاہم کیا مذہب کے سلسلے میں تمام معاشرے کو انتہا پسند بنایا جا سکتا ہے۔ یعنی کسی بھی چیز کا نفاذ جس پر طبیعت مکمل طور پر تربیت یافتہ نہ ہو؟"

"دراصل اسلام کا نفاذ ہی میری زندگی کا واحد مقصد ہے۔ اس کے لئے جدوجہد اہم ترین عنصر ہے۔ جدوجہد کے ذریعے ہی لوگوں کو قائل کر کے آمادہ کرنا ہوگا۔ اس کے بعد اُن کے تعاون سے ایک جماعت تشکیل کرنی ہوگی۔ جب لوگ قائل ہو جائیں گے تو کوئی امر انہیں اپنے اندر زبردست انقلاب پیدا کرنے سے نہیں روک سکے گا لیکن یہ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ آج میرے ہاتھ میں اختیار دے دیا جائے تو میں اسلام کو نافذ کر دوں۔ واقعتہً جب تک ہم انقلابی عمل سے نہ گزریں گے، اسلام کی تنفیذ یا اسلام کا غلبہ ممکنات میں سے نہیں۔"

• "تو کیا یہی وجہ ہے کہ ہم ہنوز اسلام کے نفاذ کے راستے تلاش کر رہے ہیں تاکہ مستقبل کے کسی دور میں تدریجی بنیادوں پر نافذ کیا جا سکے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں ..." مختصر سا جواب تھا۔

کافی عرصے سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خواتین کے سلسلے میں موقف پر خبریں چھپ رہی تھیں۔ اگرچہ کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے کسی انٹرویو میں کہا تھا کہ "میں کسی تنازعے کے لئے نہیں ہوں۔" تاہم اُن کی ذات و شخصیت متنازعہ تھی ... یا پھر لفظ تنازعہ کو ایک نیا موضوع مل گیا۔ خواہ مطلب کچھ بھی ہو۔ چونکہ مجھے ان موضوعات کے موضوع پر تشفی کے لئے معلومات درکار تھیں لہٰذا میں نے پوچھا۔

"دینی لحاظ سے خواتین کی تربیت کن خطوط پر ہونی چاہیئے... کہ عورت احساس حق تلفی اور محرومی کے بغیر اعتماد کے ساتھ معاشرے کا ایک فعال حصہ مقرر ہو جائے اور پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورت جس عقیدے کے درمیان پل کر جوان ہوتی ہے، دم آخر تک اسی پر پختگی سے قائم رہتی ہے۔ اس سلسلے میں عورت سے تبلیغ کی ابتداء کے بارے میں بحث فرمائیے۔"

"تبلیغ کے بارے میں مرد اور عورت یکساں ہیں۔ یعنی جب بھی کسی معاشرے میں کسی بھی خیال کے تحت تبلیغ کی ابتدا ہوتی ہے تو وہ خواتین اور مردوں پر یکساں انداز میں اثر انداز ہوتی ہے۔ یکساں انداز ہی میں اسے قبول کیا جاتا ہے لیکن عورت کو بہترین تربیت اور بہترین کارکردگی کی مراعات ملنا چاہئیں کیونکہ اگلی نسل اُس کی گود میں پلتی ہے لیکن انقلاب کی ابتدا میں سب سے بڑا کردار مردوں کا ہوتا ہے۔ تاہم ہر دو صورتوں میں کسی بھی اہمیت کا تعین بہ آسانی نہیں کر سکتے کیونکہ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر اہم اور مضبوط ستونوں کی سی کیفیت رکھتے ہیں۔ البتہ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کی جسمانی اور نفسیاتی ساخت میں فرق کا تعین کر دیا ہے۔ اس تعین کی مقرر کردہ حد میں ذہنی، روحانی اور اخلاقی حصار کے ساتھ انہیں تعلیم و تربیت کے مکمل مواقع فراہم ہونا چاہئیں۔ غلط تعلیم کے ذریعے ایک بڑا انحطاط وجود میں آتا ہے۔ جو اپنی تباہ کاریوں کے ذریعے ہماری بہترین صلاحیتوں کو مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا موجودہ نظام تعلیم یکسر غیر مؤثر... اور بے معنی ہے؟"

"ہاں، اکثر و بیشتر۔ میرے خیال میں لڑکوں کے لئے ادب، فلسفہ، سائیکلوجی، ایسے علوم ہیں جن سے بہترین نسلوں کو وجود میں لانا ممکن ہے۔ ایسے علوم جن سے ان کے اندر شعور پیدا ہو۔ جن سے تربیت اولاد کی صلاحیت میں اضافہ ہو۔ انسانی نفسیات کا فہم ہو، امور خانہ داری کی مکمل تربیت کا مظاہرہ ہو۔ میڈیکل لائن میں خواتین کے ذریعے پردے میں خواتین کے عوارض کے علاج کی مکمل ترین سہولتوں کا اہتمام ہو تاکہ عورتوں کا علاج معالجہ عورتیں ہی کر سکیں۔ سوائے اس کے کہ بہت ہی پیچیدہ معاملہ ہو تو مردوں کے پاس جائے۔ ورنہ اس سلسلے میں مردوں کی حوصلہ شکنی ہونا چاہیئے۔"

"درس و تدریس کے شعبے میں بھی خواتین کا حق ہو سکتا ہے؟"

"جی ہاں، بے شک... کیونکہ خواتین کا خواتین کے لئے علیحدہ شعبۂ تعلیم قائم کرنا اور ضروری ہے تاکہ پردے کی عظمتوں کے ساتھ علم، مثالی معراجِ کمال سے خواتین میں منتقل ہو جائے۔"

"کیا عورت اتالیق کی حیثیت سے مرد سے بہتر کام کر سکتی ہے؟ اور پرائمری اسکول تک صرف عورتوں کو استاد مقرر کیا جا سکتا ہے؟"

"جی ہاں، لڑکے ہوں یا لڑکیاں TENDER AGE میں ماں کی شفقتوں کی طرف رغبت رکھتے ہیں، اس ہی نفسیاتی ضرورت کے سبب اگر خواتین پرائمری اسکول تک جہاں بچے تقریباً دس گیارہ برس کی عمر میں ہوتے ہیں... خواتین اساتذہ اپنی محبتوں سے بطریق احسن اس سے بہتر نتائج برآمد کر سکتی ہیں۔ اس اسکول کے بعد لڑکوں کے لئے مرد اور لڑکیوں کے لئے صرف خواتین اساتذہ کے شعبوں کا منتقل کر دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس طرح دین... کی پابندی کے ساتھ معیاری کردار بھی حاصل ہو سکتا ہے۔"

"ملازمتوں کے شعبے علیحدہ کرنے کے بعد خواتین کو زیادہ فعال کردار دینا ناانصافی تو نہیں؟"

"موجودہ دور، تقابل کا دور ہے۔ نوع انسانی کا تناسب زیادہ سے زیادہ ہو رہا ہے۔ ویسے تو اصولی طور پر کفالت کی ذمے داری مرد کی ہے لیکن ناگزیر وجوہات کی بنا پر مرد اس ذمے داری کو نبھانے سے معذور ہے اور اگر ملکی معیشت میں بھی ضرورت ہو تو ہم اپنی پیداوار میں خواتین سے مدد لیں کیونکہ اس وقت دنیا ایک معاشی مقابلے میں بری طرح مبتلا ہے تو اس صورت میں اسلام کے دائرے میں رہتے ہوئے متبادل صورت حال... فراہم کرنا ہو گی۔"

"یعنی...؟" میں نے پوچھا۔

"یعنی محلّہ در محلّہ، کاٹن انڈسٹریز سے خام مال گھروں پر پہنچایا جائے۔ جہاں عورتیں کام کریں اور شام کو فوری ادائیگی کے بعد... مال واپس لیا جائے۔ اس قسم کا باقاعدہ نظام مربوط طریقے سے ذرا سی جہد سے قائم ہو سکتا ہے۔ ایسے انڈسٹریل یونٹ بنائے جائیں جن میں عورتیں کام کریں اور عورتیں ہی کام لیں۔ خواتین کی جسمانی ساخت اور مصروفیات کے لحاظ سے SHORT SHIFT بنیاد پر انہیں ملازم رکھا جائے۔ یہ شفٹ چار گھنٹے کی ہو... اور یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے جب رجائیت پسند قیادت نہیں بلکہ مذہبی قیادت برسر اقتدار آئے، جس کا اپنا ایک مکمل نظریہ ہو کہ ہر حالت میں دین کی پابندی کرنا ہے۔ اس کے ساتھ چلنا ہے تو یہ سارے کام بہ احسن و خوبی انجام پا سکیں گے لیکن جب ان چیزوں کو صرف ظاہری نگاہ سے پرکھا جائے گا تو یہ سب کام پہاڑ معلوم ہوں گے۔"

ڈاکٹر صاحب نے مزید کہا۔

"اسلام کے معاشرتی نظام میں عورت کا اصل مقام اُس کا گھر اور نسلوں کی پرورش و پرداخت ہے۔ عام حالات میں ایک عورت اوّل تا آخر ایک خاندار عزت مآب بیوی، ماں، بہن اور بیٹی ہے... تاہم بوقت ضرورت اسے زندگی کی ہر جہد میں مسابقت کا حق حاصل ہے مگر حدود کے ساتھ۔"

"صحافی اور دانشور حضرات تجسس میں ہیں کہ آپ عورت کو کس طرح رکھنے پر یقین رکھتے ہیں؟ کیا کبھی آپ نے اُن سے دریافت کیا کہ وہ اپنی خواتین کو کس طریقے پر رکھتے ہیں؟"

"میرا اُن حضرات سے براہ راست کبھی رابطہ نہیں رہا۔ روزنامہ

جنگ میں ارشاد احمد حقانی کام کرتے ہیں۔ وہ میرے پاس آئے تو میں یہ نہیں سمجھا کہ وہ میرے پاس انٹرویو کی غرض سے آئے ہیں۔ وہ ہمارے پرانے ہم جماعتوں میں سے ہیں۔ جب انہوں نے مجھ سے وقت مانگا تو میں سمجھا کہ پرانی ملاقات کی تجدید کے لئے یا پھر ایسی ہی کسی ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ تاہم مجھے اعتراف ہے کہ وہ صحافی کی حیثیت سے مجھ سے انٹرویو لے گئے۔ کچھ سوالات آخر میں سرعت سے یکے بعد دیگرے ہو گئے۔ اس میں بعض باتیں خالص تصوراتی طرز کی تھیں جیسے آج آپ کے ہاتھ میں طاقت آجائے تو آپ کیا کریں گے؟ تو میں نے کہا، سب کو پنشن پر بھیج دوں۔ خاص طور پر خواتین کو۔ ظاہری بات ہے، پنشن پر بھیج رہا ہوں، ڈس مس تو نہیں کر رہا ہوں۔ پنشن مل جائے اور کیا چاہیئے، گھر بیٹھیں۔ بہرحال مجھے اس بات کا اندازہ نہیں کیونکہ میرا صحافیوں سے زیادہ تعلق نہیں کہ وہ کیا سوچتے ہیں؟ ان کے گھریلو حالات کیسے ہیں؟"

"ایک کثیرالاشاعت روزنامے میں عورت کے مقام کے عنوان سے کچھ مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ایک صاحب نے لکھا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا، عورت جو کہے، اس کے خلاف کرو۔ اس میں بڑی برکت ہے! جب کہ ہمارے نبی کریمؐ اگر عورت کے بارے میں ایسی رائے رکھتے... تو بی بی عائشہ صدیقہؓ سے مشاورت کا جواز باقی نہ رہتا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی بات ہو بھی... اور چونکہ یہ مضامین میرے مطالعے سے نہیں گزرے، لہٰذا میں اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

"آپ اور بہت سے حضرات خواتین کے لباس کے بارے میں خاصے متفکر پائے جاتے ہیں اور یہ درست بھی ہے۔ تاہم آپ نے کبھی مردوں کی چست پتلونوں کو دیکھا ہے جو ٹی شرٹ، جرسی اور بنیانیں پر پہنی ہوتی ہیں۔ کیا عریانی اور برہنگی دورِ جدید کی تمام بہنیں تو نہیں؟"

ڈاکٹر صاحب نے میرے سوال کو تحمل سے سنا اور فرمایا۔

"ستر پوشی ہر دو اصناف پر لازم ہے تاکہ معاشرہ، پاکیزہ حیثیت کو برقرار رکھ سکے۔ آپ کی بات صحیح ہے۔ ساتر لباس مرد کا بھی ہونا... چاہیئے۔ مرد کے لئے ستر کی حد، ناف سے اوپر سے کر گھٹنوں کے نیچے تک ہے لیکن عورت کے لئے سوائے چہرے کی ٹکیہ، ہاتھ اور پاؤں کے علاوہ تمام اعضا کا پوشیدہ رکھنا شرعاً فرض ہے۔ مرد اور عورت میں نفسیاتی اعتبار سے ایک فرق ہے۔ جسمانی لحاظ سے عورت کے لئے مرد میں کشش ہے اور مرد کے لئے عورت میں... لیکن نفسیاتی فرق یہ ہے کہ مرد قوی تر ہے اور اقدام اور ضلالت میں فزوں تر، اس میں آگے بڑھنے کا حوصلہ ہے۔ عورت میں نفسیاتی طور پر گریز ہے، فطری گریز ہے اور یہی اس کی نسوانیت کا اصل زیور ہے۔ لہٰذا عورت مرد کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود فطری طور پر اقدام حصول میں اتنی شدید نہیں جتنا کہ مرد ہے۔ اس اعتبار سے عورتوں کا مردوں کو دیکھنا اتنا اشتعال انگیز نہیں ہے جتنا مردوں کا عورتوں کو دیکھنا۔ ورنہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مرد بھی پردہ کریں۔ نہ عورتیں مردوں کو دیکھیں نہ مرد، عورتوں کو... لیکن یہ بات نہیں ہے۔ صرف عورت کو پردے کا پابند کیا گیا ہے، جسم کا بیشتر حصہ چھپانا لازمی قرار دیا گیا ہے لیکن مرد کے لئے اس قدر پابندی نہیں... مثلاً مرد کا ستر، ناف کے اوپر سے کر گھٹنے کے نیچے تک ہے۔ اگر جسم کا حصہ ڈھکا ہوا ہے تو غنیمت ہے۔ اگر اس نے قمیص نہیں پہنی ہے تو اس پر لازم بھی نہیں۔ تاہم عورت کا پورا جسم ستر ہے۔ سوائے چہرے کے اور ہاتھ، پیر کے لیکن آج کل مرد جو چست لباس پہنتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔ خاص طور پر نیکر۔ کھیلوں میں شارٹس کا استعمال، تیراکی کا لباس، شریعت کے سراسر خلاف ہے۔ مرد کو ناف سے اوپر اور گھٹنے سے نیچے تک جسم کو کپڑے سے پوشیدہ رکھنا ضروری اور شرعی ہے۔"

"مذہب معاشرے میں کیا کردار ادا کرتا ہے؟"

"آپ کا انٹرویو ہنوز ختم نہیں ہوا؟" ڈاکٹر صاحب نے پہلو بدلا۔

"دیکھئے، محترم ڈاکٹر صاحب! سوال کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قاری، آپ کے علم کے ایک ایک لفظ کو وضاحت کے ساتھ سن لیں، سمجھ لیں اور توفیق ہو تو عمل بھی کریں، اس لئے گستاخی معاف۔"

وہ شفقت سے بولے۔

"معاشرے میں مذہب وہی کردار ادا کرتا ہے جو ایک فرد کی زندگی میں مذہب اخلاق کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس سے بڑی اور کیا بات ہوگی کہ معاشرہ نفس حیوان کی بربریت سے صرف اور صرف دین کی وجہ سے پاک ہوگا۔ انسان، انسان کا حق، اس کے طلب کرنے سے پہلے ادا کر دے گا۔ یہ ایک بہت عظیم تربیت کی بات ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں عجلت کا تصور، کردار کے اعلیٰ ترین تصور کی ضمانت ہوگا۔ اور یہ ضمانت صرف دین کا احیا ہی دے سکتا ہے۔ مذہب معاشرے میں رہنے والوں اور معاشرے کو جزا اور سزا کا تصور دیتا ہے۔ خود احتسابی کا قانون دیتا ہے جس سے انسان خود اپنے طرزِ عمل پر ناقدانہ احتساب قائم کرتا ہے۔ مذہب کے جو اثرات انفرادی طور پر فرد پر مرتب ہوتے ہیں، وہی اجتماعی طور پر... معاشرے پر ہوں گے۔ ہمارا جو مذہب ہے، وہ مذہب نہیں دین ہے۔ بلکہ دین کے بارے میں میں کہوں گا کہ THIS IS A WAY OF LIFE, RATHER A SYSTEM OF LIFE.

جس میں اس کا معاشی، سیاسی و سماجی ایک مکمل نظام پنہاں ہے۔ ان کے درمیان عدل و انصاف، اعتدال و توازن ہے جو انسان کی بنیادی ضرورت ہے کہ ہر انسان ہر طرح کی اونچ نیچ، ہر طرح کی افراط و تفریط سے بچ کر رہے۔ انسان کو دین کی صورت میں جو متوازی نظام ملا ہے۔ وہ درحقیقت اسلام کا نوعِ انسانی پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔"

"جہاد کے بارے میں فرمائیے؟"

"جہاد کے تین حصے ہیں۔ ایک اپنے نفس حیوان کی بربریت کے خلاف جہاد۔ یعنی اپنے نفس کو ممکنہ حد تک برائیوں سے پاک کرنے کا عمل۔ جب تک انسان خود شر و برائی اور حرام خوری سے نہ

بچے گا، وہ کوئی جہاد نہ کرے گا۔ یہ وہ MOST FUNDAMENTEL جہاد ہے جہاں انسان اپنی ذات سے آگاہ ہوتے ہوئے شرفِ آدمیت کے حصول کے لیے حیوانی محرکات کو قابو کرتا ہوا نفسِ حیوان کو مکمل طور پر زیر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

دوسرا جہاد ہے معاشرے میں توہمات یا باطل نظریات متصادم اور متضاد مکاتبِ فکر میں اصلاحِ حال و احوال، تہذیب و تمدن اور ثقافت کی ترویج میں نقائص کو قطع کرنا یعنی اسلامی معاشرے کو عین اسلام کے مطابق رواج دینے کے لئے ہر فرد کا انفرادی جہاد ایک اجتماعی کیفیت کے ساتھ ایک اعلیٰ ترین بے مثال قوم کی صورت میں وجود پاتا ہے۔ تیسرا جہاد وہ ہے جو ان اقوام کے ساتھ ہے جو اس عظیم المرتب منصوبے کو خاک میں ملا کر اپنے عقائد کی برتری کے ذریعے اپنے اقتدار کے ذریعے نوعِ آدم کو اپنا تابع بنانے کی کوشش کی یعنی حق کا باطل کے ساتھ مقابلہ۔ یہ آخری اسٹیج ہے جس میں جان کی بازی بھی لگتی ہے۔"

"علماء کی سطح سے صرف تقریریں ہی جہاد ہیں۔ ایسے بے عمل عالموں سے ہم کن تاریخی فتوحات کی اُمید رکھ سکتے ہیں؟" میں نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا لیکن اُنہوں نے اپنے مخصوص ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

"ہمیں دوسروں سے بہت سی اُمیدیں وابستہ نہیں رکھنا چاہیں بلکہ خود بڑھ کر عمل کرنا چاہیئے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہی غنیمت ہے۔ ایسے ماحول میں بہت کچھ حاصل ہونا امرِ محال ہے۔ تاہم ایک حق شرر فشانی اس خس و خاشاک میں رہ گئی ہے۔ اس میں علماء کا بہت بڑا CONTRIBUTION ہے۔ انہوں نے مسجدیں آباد رکھی ہوئی ہیں، اذانیں ہیں، نمازیں ہیں، مجمعے ہیں، خطبے ہیں، یہ سب کیا ہے؟ معاشرہ ان کا مثبت حصہ ہے۔ پھر میں ایک سوال کرتا ہوں کہ ہم سب لوگ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ سارا کام وہی کریں۔ ہمیں بھی تو خود بحیثیت مسلمان کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ اپنے اعمال و کوتاہی کی اللہ تعالیٰ کے سامنے وہی جواب دیں گے اور اسلام میں یہ کام صرف علماء کا نہیں بلکہ ہر مسلمان کا فرض ہے۔ بچے کو بہترین اسلامی لٹریچر پڑھایا جائے۔ بہترین اسلامی تربیت دی جائے اور بہترین شخصیت کے ساتھ پیش کیا جائے اور ہر گھر میں یہی جذبہ پروان چڑھے تو کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ موجودہ منافقت کا دور ہٹے اور اسلام جلد از جلد اپنی تمام افادیت کے ساتھ نافذ ہو جائے۔"

میں نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا تو وہ بولے۔

"جی ہاں۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ جہاد کی ابتدا تو خود انسان کے اپنے نفس سے ہوتی ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! بلاسود بینکاری کے سلسلے میں کیا ہم پوری طرح اسلام پر کاربند ہیں؟"

"دراصل، میں اس نظام کو ہنوز اسنادی نہیں کر سکا ہوں جو کہ نافذ کیا گیا ہے۔" ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جواب دیا۔ "جہاں تک ہماری معلومات حاصل کرنے کی بات ہے تو اس بارے میں یہی معلوم ہوا ہے کہ حکومت 'بلاسود بینکاری' کا سارا روپیہ صرف اجناس کی خریداری پر صرف کر رہی ہے۔ اس میں مارکر سسٹم بھی استعمال ہو رہا ہے۔ تاہم ایک بات میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ نظام اپنی روح کے اعتبار سے سودی ہی ہے۔"

"جی ہاں، بلاسود بینکاری نظام ہنوز متنازعہ مسئلہ ہے لیکن شریعت اس بارے میں کیا کہتی ہے؟"

"شریعت تو سود کو حرام قرار دیتی ہے۔" ڈاکٹر صاحب کی آواز کھلا جہاد تھی، لہجہ تلوار کی سان تھا... اور سوال یہ تھا کہ شب بطل میں 'جہاد' کی یہ للکار کہاں تک پہنچے گی؟

انہوں نے کہا۔ "سوال یہ ہے کہ کوئی شخص جو اس سسٹم آف بینکنگ پر شعور رکھتا ہو وہی اس کی صحیح تشریح کر سکتا ہے۔ البتہ میرے نزدیک ایک آدمی، حکومت کی اس یقین دہانی پر کہ یہ سودی نہیں اس میں روپیہ جمع کرائے گا اور اُسے کچھ نہ معلوم ہو گا۔ انشاء اللہ! وہ گنہگار نہ ہوگا۔ اس کے گناہ کا پورا وزن حکومت کے کریڈٹ کارڈ میں درج ہوگا۔"

"مگر اس کو معلوم ہو جائے تو؟" ڈاکٹر مبین اختر ماہرِ نفسیات نے سوال کیا۔

"تو وہ گنہگار ہوگا۔" ڈاکٹر اسرار احمد نے مختصراً جواب دیا۔

"جو لوگ بینکنگ نظام میں اپنے فرائض ملازمین کی حیثیت سے انجام دیتے ہیں، ان کے مشاہروں کے بارے میں متضاد رائے پائی جاتی ہیں۔ آپ کیا کہیں گے؟"

"غیر سودی کھاتہ تو اب کھلا ہے۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔ "پہلے تو یہ نظام سو فی صد سود پر تھا۔ تب بھی لوگ ملازمت کر رہے تھے۔ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے تاجر ایسے ہیں جا وقد ڈرافٹ پر بزنس نہیں کرتے۔ کتنے کاروباری لوگ ایسے ہیں جو سود نہیں لیتے۔ معاشرے میں تو حرام خوری رچ بس گئی ہے۔ کسی بھی ملک میں، جبکہ اس میں اپنا ایک ادارہ بھی ہو اور اس ادارے کا ایک DETERMINATION بھی ہو تو وہ ملکی نظام اختیار کرتا ہے۔ دُنیا اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر لیتی ہے۔ دُنیا ہمارے ساتھ بزنس کرتی ہے تو اپنی غرض سے کرتی ہے۔ صرف ہمارے فائدے کے لئے نہیں کرتی۔ کوئی ملک ہمیں سود دیتا ہے تو اپنے مفاد کے لئے دیتا ہے... مگر جب ہم اپنا ایک مکمل نظامِ معیشت ترتیب دے لیں گے تو دُنیا صرف اپنی غرض کے لئے ہمارے ساتھ مذکورہ نظام کے تحت ہو گی تو کوئی دقت نہ رہے گی اور پھر جب ہماری تجارت کا رابطہ سودی معیشت پر چلنے والے ممالک سے رہے گا تو لامحالہ سود آہستہ آہستہ ہماری رگوں میں گردش کناں ہو جائے گا۔ آخر کمیونسٹ ممالک بھی تو ہیں جہاں سودی نظام نہیں تو وہاں سے بھی تو تجارت ہوتی ہے۔ اُنہوں نے غیر محسوس طریقے پر اسلامی تصور اپنا لیا جبکہ ہمارا نظام اس سے

جاری ہے۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟"

"حصار، مشرقی پنجاب، جو اب ہریانہ میں ہے۔ وہیں میری پیدائش ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔" عجیب تقدس اور سادگی سے انہوں نے کہا۔ "۱۹۴۷ء میں میٹرک وہیں سے کیا۔ تقسیم کے بعد ہجرت کر کے ہم مغربی پنجاب یعنی پاکستانی پنجاب میں آ گئے۔ لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۱ء گورنمنٹ میڈیکل کالج لاہور سے ایف۔ ایس سی کیا۔ ایم۔ بی بی۔ ایس کے لئے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور منتخب کیا اور وہاں سے ۱۹۵۴ء میں فارغ التحصیل ہوا۔ ہائی اسکول لائف کے دوران میں، میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ممبر تھا۔ دین سے غیر معمولی رغبت فطرت ثانیہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں سرگرم کارکن تھا۔ اپنے ضلعے کی آرگنائزیشن کا جنرل سیکریٹری تھا۔ کالج لائف میں میرا رابطہ فوری طور پر جماعت اسلامی کی جمعیت طلبہ سے ہوا۔ میری تعلیمی زندگی کے سات سال جمعیت طلبہ کے ساتھ تھے۔ اس کے بعد میں نے جماعت اسلامی کی رکنیت اختیار کر لی تقریباً ڈھائی سال تک میں جماعت کا رکن رہا۔ ۱۹۵۶ء میں میں نے اپنا ایک مضمون لکھا جس میں مجھے جماعت کی پالیسی کے ساتھ اختلاف تھا۔ اس کی وجوہات عملی اور انتخابی سیاست میں جماعت کی غیر معمولی ... مصروفیات تھیں، جس کی وجہ سے میرے خیال میں بنیادی کام میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔ مولانا مودودی صاحب کا خیال یہ تھا کہ اس پالیسی میں کوئی ترمیم نہیں ہونی چاہیئے۔ اس وقت پارٹی میں بڑے بھاری اور سمجھ دار لوگ شامل تھے۔ مثلاً مولانا اصلاحی صاحب۔ انجام کار، ہم لوگ جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ جماعت سے علیحدگی تھی، تحریک سے علیحدگی ہرگز نہ تھی۔ میری عمر اس وقت چھبیس برس تھی۔ میں جوان تھا اور انتظار میں تھا کہ بزرگ لوگ شاید تنظیم کی شکل اختیار کریں تو ان کے ساتھ ہم بھی منزلوں کا رخت سفر باندھیں لیکن کچھ اسباب کی بنا پر اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی تو پھر ۱۹۶۶ء کی ابتدا میں جب میں تینتیس برس کا تھا تو حوصلے مضبوط اور پختہ ہو چکے تھے ... اور میں نے تہیہ کر لیا کہ مجھے خود کام کرنا چاہیئے تو پھر میں دوبارہ لاہور شفٹ ہوا ... کیونکہ میں M.B.B.S کر کے ساہیوال آ گیا تھا، جہاں میرے والدین تھے۔ لاہور منتقل ہو کر میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں نے قرآن مجید کے درس کے ذریعے بنیادی باتیں مثلاً دین اور دینی فرائض کے تصور پر کام کیا۔ تقریباً چھ برس تک تن تنہا کسی تنظیم کے بغیر میں لگاتار خلوص کے ساتھ کام کرتا رہا۔ میں نے اصلاحی صاحب کے ساتھ 'میثاق' جاری کیا جو میرے اپنے اشاعتی ادارے 'دارالاشاعت اسلامیہ' سے شائع ہوتا تھا جو بعد میں بند ہو گیا تھا۔ میری تنہا کوششیں تھیں کہ میثاق دوبارہ جاری ہوا۔ ۱۹۷۲ء میں میں نے انجمن خدام القرآن قائم کی۔ میں اس کا بانی اور تاحیات صدر ہوں پھر ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم کی۔ یہی میری مختصر سی سرگزشت ہے۔"

ڈاکٹر صاحب خاموش ہوئے تو میں نے کہا۔

"آپ نے تنہا رہ کر بڑے حوصلے سے کام کیا ہوگا؟"

"جی ہاں، مجھے تنہا ہی بہت حوصلے اور فلک آسا امیدوں کے ساتھ اس عظیم مقصد کی خاطر، منصوبوں پر عمل درآمد کے لئے تیار ہونا پڑا۔"

"آپ نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے بعد کتنے عرصے پریکٹس کی؟"

"سولہ سال ..."

"تو اب آپ پریکٹس نہیں کر رہے؟"

"۱۹۷۱ء سے میں نے یہ پریکٹس بند کر دی ہے۔"

"اسلام، ڈاکٹری اور نفسیات میں کوئی مطابقت؟"

"انسان اپنے مادی جسم کے اندر ایک طویل سلسلہ ہے ... نفسیاتی طور پر .. جذباتی کیفیات کا سرچشمہ ہے دماغ۔ جب یہ نفسیاتی اور جذباتی کیفیات جسم پر حاوی ہونے لگتی ہیں تو مینٹل پیتھالوجی کو جنم دیتی ہیں۔ یعنی فرسٹریشن، اضطراری کیفیت، خواہشات کی بہتات وغیرہ اور ان ذہنی ABNORMALITIES کے اثرات انسان کے نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان نفسیاتی کیفیات کو اعتدال میں رکھنے کے لئے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو ہم INTERNAL PEACE کہتے ہیں۔ یہ کیفیت انسان کی تمام جسمانی اور روحانی حیثیتوں کو مربوط رکھتے ہوئے اجتماعی طور پر ایک اور ہمہ گیر وصف کو جنم دیتی ہے جو SOCIAL PEACE ہے یعنی:-

"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں۔ کسی کو کوئی گزند نہ پہنچے اور یہ دونوں چیزیں درحقیقت ہمیں سب سے زیادہ اسلام سے ملتی ہیں۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ دوائیوں کو کم کر کے، اسلامی تعلیمات کے ذریعے مریض کا نفسیاتی طور پر علاج کیا جائے؟"

"ہاں، یہ ممکن ہے، عین ممکن ... اس میں معالج کی قوت ارادی اور روحانی سطح کا معیار ہونا بھی ازحد ضروری ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

میں مزید سوال کرنا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے شفقت سے کہا۔

"بھئی، پرچہ ختم ہوا تو آپ زبانی سوالات پر اتر آئیں ... میرے خیال میں آپ کے سوالات کا سلسلہ ہنوز ختم نہیں ہوا۔"

"جی ہاں، میں اس برکت سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں۔ بحیثیت ڈاکٹر، دینی خدمات کیونکر انجام دی جا سکتی ہیں ...؟ کیونکہ آپ نے تو پریکٹس چھوڑ دی جب کہ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔"

"آپ اس مسئلے کو کچھ اس طرح سمجھئے کہ حضورؐ تاجر تھے لیکن آپ نے دین کے لئے مکمل طور پر تجارت چھوڑ دی۔ ایک بڑے مقصد یعنی ملک و ملت کی راہبری کے لئے ایک چھوٹے مقصد کو اتباع رسولؐ میں ترک کرنا ہوتا ہے تاکہ یکسوئی کے ساتھ تمام تر توجہ سے منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ یعنی قومی سطح پر لیڈر بننا ہے تو اسے اپنا کام ترک کرنا ہوگا۔

میرے مقاصد بھی کچھ یہی تھے اور مقاصد کے حصول کے لئے مجھے یکسوئی درکار تھی اور میں نے بھی اپنی ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک بڑے مقصد کے لئے چھوٹے مقصد کو ترک کر دیا۔ میں اس ضمن میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تاجر تھے اور تبلیغ بھی کرتے تھے۔۔۔ دین کی خدمات کے سبب ان کا کاروبار آہستہ آہستہ سمٹتا چلا گیا۔۔۔ پھر میرا واقعہ بھی خاصا توجہ طلب ہے۔ جب میں جمعیت طلباء کے لئے پنجاب اور لاہور کا ناظم تھا تو فروری میں اجلاس ہوا۔ مودودی صاحب۔۔۔ اور مولانا اصلاحی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ میری وہ تقریر "ہم اور ہمارا کام" آج تک جمعیت میں چلتی ہے۔ مولانا مودودی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ علمِ دین کے کام میں بھی آگے رہیں اور تعلیم میں بھی آگے بڑھیں۔۔۔ میں نے اسی رات گیارہ بجے مولانا مودودی صاحب کو پکڑ لیا۔ میں نے کہا۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں پرائمری سے اسکالرشپ لیتا آیا ہوں۔ چوتھی، آٹھویں، دسویں پھر ایف۔ ایس۔ سی میں فرسٹ پوزیشن لی اور اسکالرشپ یونیورسٹی میں، میں نے فرسٹ پوزیشن لی۔ فرسٹ ائیر میڈیکل کالج میں فرسٹ آیا اور میرے پاس سیکنڈ ائیر میں دو اسکالرشپ تھے۔ یعنی ایف۔ ایس۔ سی کا بھی اور فرسٹ ائیر میڈیکل کا بھی۔۔۔ لیکن میں دونوں جگہوں پر بیک وقت کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔۔۔ تو مولانا صاحب نے کہا۔۔۔ ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا خود یہی حال ہے، جب سے تحریک عوامی دور میں داخل ہوئی ہے، میرا لکھنا، پڑھنا اور مطالعے کا کام تقریباً رُک گیا ہے اور میں اپنے سابقہ مطالعے پر بسر کر رہا ہوں"۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ کام پوری تندہی سے انجام نہیں دیئے جا سکتے اور پھر۔۔۔"

وہ ایک لمحے کو رُکے۔

"کسی مقصد کے حصول کے لئے لازمی بات ہے کہ پوری طاقت، حوصلوں اور علم کو ہر طرف پھیلانے کے بجائے، سمیٹ کر ایک نقطے پر مرکوز کر دینا چاہئے۔ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار نہیں ہوا جا سکتا۔ اسی وجہ سے میں نے پریکٹس چھوڑ دی۔"

"کتنے بچے ہیں، آپ کے؟"

"چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں۔"

"کسی نے میڈیکل کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ ایک لڑکے نے ایم بی بی۔ ایس کیا ہے۔ دوسرے نے ایم اے فلاسفی کیا۔ دونوں ہماری قرآن اکیڈمی میں کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کو ہم نے شام کا کلینک کھول دیا ہے جس کا نام انجمن کلینک رکھا گیا ہے۔"

"بیٹیوں میں سے کسی نے میڈیکل کیا ہے؟"

"نہیں، بیٹیوں کو میں نے اسکول بھیجا ہی نہیں۔ انہیں گھر ہی پر ایف۔ اے تک تعلیم دلوائی ہے۔ شریعت کی حدود کے عین مطابق علم بھی دیا اور پردہ بھی۔۔۔ پھر شادیاں کر دیں۔"

"عید الفطر کے لئے آپ کا پیغام؟"

"اگرچہ کہ میں ذہنی طور پر اس انٹرویو کے لئے تیار نہ تھا۔ تاہم آپ نے انٹرویو لے ہی لیا ہے تو پھر پیغام بھی لکھ لیجئے۔"

"عید درحقیقت ایک شکریہ ہے رمضان کے روزوں کا، جو ہم ادا کرتے ہیں اور عید اصل میں اُن ہی لوگوں کے لئے ہے جو رمضان میں روزے رکھیں اور راتوں کو قرآن مجید کی تلاوت سے آباد رکھیں۔ جنہوں نے اس روحانی موسم بہار سے صحیح طور پر استفادہ کیا ہو، وہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں لیکن افسوس کہ ہم نے اس کو ایک فیسٹیول بنا لیا ہے۔

ہونا تو یہ چاہئے کہ عید کا جو اسلامی تصور ہے، وہ بگڑنے نہ پائے۔ عید کی سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو واقعتہً نفس کی غلامی سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لئے ایک ماہ کی مشقت کرتے ہیں، اُن کا اللہ تعالیٰ کے سامنے شکرانے کی یہ دو رکعتیں ادا کرنا بھی معنی خیز عمل ہے۔ اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ورنہ تو یہ ہے کہ ہم نے اسے ایک تہوار کی سی صورت دے دی ہے۔"

"گزشتہ دنوں، عید پر سویوں کے بارے میں، آپ کے بیان پر بڑی گرما گرم بحث رہی۔ کیا سویاں کھانا شرعاً غلط ہے؟"

"شرعاً غلط تو میں نے کبھی نہیں کہا۔ میں نے تو یہ کہا ہے کہ بعض چیزیں روایت کے طور پر ہمارے درمیان اس قدر مستحکم ہو گئی ہیں کہ ہم اُن سے ذرا سا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہلتے۔ حالانکہ ان کا کوئی ثبوت سنت میں نہیں ہے۔۔۔ اور بعض چیزیں جن کی تاکید کی گئی ہے، وہ ہمارے ذہنوں سے اُتر گئی ہیں۔ مثلاً عید کی نماز کو جاتے اور آتے ہوئے تکبیر پڑھنا بھول جاتے ہیں اور واپسی کے وقت راستہ تبدیل کر کے آنے کی سنتِ نبویؐ کا خیال نہیں کرتے۔۔۔ لیکن یہ کہ ہر عید پر کچھ چیزیں لازمی سی اہمیت حاصل کر لیتی ہیں اور یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔

جب اصل سنت ترک کی جائے گی تو اس کی جگہ کوئی اور رسم لے لی۔ اس اعتبار سے تو سویاں گویا لازم ہو گئی ہیں۔ حالانکہ مسنون صرف اتنا ہے کہ اس عید پر کوئی میٹھی شے صبح کے وقت کھاتے ہیں۔ یعنی یہ فرض ہے کہ کوئی میٹھی چیز کھا کر آدمی، عید الفطر کی نماز کے لئے جائے۔ عید الضحیٰ میں روزے کی حالت میں جاتے ہیں اور واپس آ کر قربانی کے گوشت سے روزہ کھولتے ہیں۔ یہ عید تو اب عید الفطر کے بجائے سویوں والی عید بن کر رہ گئی ہے۔ اسی طرح سنت میں عید پر بغلگیر ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔۔۔ لیکن یہ یوں لازم ہو گیا ہے، جیسے اس کے بغیر عید ادھوری رہ جائے گی۔"

ڈاکٹر اسرار احمد تھکان سی محسوس کر رہے تھے اور ہم بھی جو کچھ حاصل کر چکے تھے، وہ کافی تھا۔ ہم نے اُن کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔۔۔ کیونکہ صبح آٹھ بجے، ڈاکٹر صاحب کراچی سے واپس جا رہے تھے۔ ☆

پاکستان کی
قومی بندرگاہ....
... پوری لگن کے ساتھ
قومی تجارت کے فروغ کے لیے
اپنی کوشش تیز سے تیز تر
کر رہی ہے۔
کراچی پورٹ ٹرسٹ
تجارت اور معیشت کی خدمت میں
کراچی پورٹ
پاکستان کی قومی بندرگاہ
Paragon

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 33 | JANUARY 1984 | No. 1

وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

توحیدِ عملی اور فریضۂ اقامتِ دین

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک حالیہ خطاب

ماہنامہ میثاق لاہور

مطبوعہ

مدیرِ مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۳۳ | شمارہ ۲ | جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ مطابق فروری ۱۹۸۴ء

مشمولات

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی

فون : ۸۵۲۶۱۱

سب آفس : ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۲۷۰۹

قارئین متوجہ ہوں!

- گذشتہ ماہ واضح اعلان کے باوجود بعض حضرات نے سالانہ زرِ معاونت کے لیے تیس روپیہ کا چیک ارسال کیا ہے گذارش ہے کہ آئندہ تیس روپے کا صرف ڈرافٹ یا پے آرڈر قبول کیا جائے گا اور اس رقم کا چیک معذرت کے ساتھ واپس کر دیا جائے گا۔
- ادارہ نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ آئندہ سے زرِ تعاون صرف منی آرڈر یا کیش کی شکل میں وصول کیا جائے گا۔ لیکن جو خریدار حضرات چیک روانہ کرنا چاہیں وہ چالیس روپے کا چیک روانہ فرمائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چیک کیش کروانے میں دس یا بارہ روپے صرف ہو جاتے ہیں۔ جو بلاشبہ ادارے پر اضافی بوجھ ہے۔ توقع ہے کہ قارئین اسے اپنے لئے بار متصور نہیں کریں گے۔ بیرونی ممالک سے ڈرافٹ حسبِ سابق قابلِ قبول ہوں گے۔
- ماہنامہ میثاق کا سالانہ زرِ تعاون اندرونِ ملک -/۳۰ روپے ہے جبکہ دوسرے ممالک کے لئے زرِ تعاون حسبِ ذیل ہے:

  کینیڈا -/۱۵۰ روپے یا ۱۵ کینیڈین ڈالر

  امریکہ، افریقہ، مغربی جرمنی، نائیجیریا -/۱۵۰ روپے یا ۱۲ امریکن ڈالر

  انگلینڈ، ناروے، متحدہ عرب امارات -/۱۰۰ روپے

  سعودی عرب، ابوظہبی، مصر، ایران -/۶۰ روپے

  انڈیا -/۸۰ روپے
- پاکستان کے دیگر شہر جہاں تنظیم کی ذیلی شاخیں قائم ہیں وہاں میثاق درج ذیل پتوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

★ پشاور: دفتر تنظیم اسلامی۔ نثار بلڈنگ پل پختہ نزد چوک یادگار، پشاور

★ ملتان: عبدالغنی صاحب ملتان پولٹری کارنر۔ بالمقابل فاطمہ جناح ہسپتال، ملتان۔ فون ۷۵۸۹۱

★ کوئٹہ: دفتر تنظیم اسلامی جناح روڈ کوئٹہ اور مدنی افتخار احمد صاحب خطیب مسجد بلوچی مسجد روڈ کوئٹہ۔ فون ۷۷۲۹۹

★ کراچی: داؤد منزل۔ نزد آرام باغ۔ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون ۲۱۴۷۰۹

★ راولپنڈی: یزی لینڈ اسکول ۱-۵-۱۴۰۔ راولپنڈی سٹلائٹ ٹاؤن فون ۴۳۷۳۶

جمیل الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

صد شکر و احسان اللہ تبارک و تعالیٰ کا کہ ہم فروری ۱۹۸۴ء مطابق جمادی الاوّل ۱۴۰۴ھ کے 'میثاق' کا شمارہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ اس شمارے کے یوں تو تمام ہی مضامین قابلِ مطالعہ ہیں لیکن فضلِ الٰہی سے یہ عجیب اتفاق ہوا ہے کہ اس میں سورۂ فاتحہ کی ابتدائی تین آیات کی مختصر سی تشریح سلسلۂ تقاریر الہدیٰ میں آگئی ہے جس میں توحیدِ باری تعالیٰ کا مثبت انداز میں بیان ہے۔ توحید کی ضد شرک کی بحث محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے "شرک اور اقسامِ شرک" کے موضوع کے خطاب کی مسلسل قسط میں آگئی ہے۔ توحید کا التزام' اس کا عمل سے ربط اور فریضہ اقامتِ دین سے تعلق نیز اجتناب شرک کے مباحث محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس حالیہ خطاب میں آگئے ہیں جو دسمبر ۸۳ء میں کراچی میں کیا گیا تھا۔ تنگیٔ داماں کے باعث اس خطاب کی صرف پہلی قسط اس شمارے میں شامل ہو سکی ہے۔ ان شاء اللہ اس کی دوسری قسط آئندہ شمارے میں پیش ہوگی بعدہٗ سورۂ شوریٰ کے بعض مقامات کا ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ کا وہ درس قسط وار شائع ہوگا یہ خطاب جس کی تمہید ہے۔ سورۂ شوریٰ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک فریضۂ اقامتِ دین کے موضوع پر ذروۂ سنام کا مقام رکھتی ہے۔ موصوف اس مکمل سورہ کا اور بالخصوص آیات ۱۳ تا ۱۷ کا متعدد بار درس دے چکے ہیں جن میں سے اکثر کو سننے کی اس عاجز کو سعادت نصیب ہوئی ہے۔ اس عاجز کی یہ رائے ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا حالیہ درس بالکل نئے اسلوب اور نئے استدلال سے دیا گیا ہے اور اس میں بڑے شرح و بسط کے ساتھ توحیدِ عملی کے مراحل و مدارج بیان فرمائے گئے ہیں۔ قرآن حکیم کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ:

ولا یشبع منہ العلماء و لا یخلق عن کثرۃ الرّد ولا تنقضی عجائبہٗ۔	"علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہو سکیں گے نہ کثرت و تکرار تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائب۔

(یعنی نئے نئے علوم و معارف) کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا۔

اللہ کے جو بندے قرآن حکیم میں غوطہ زن ہوتے ہیں، اس میں تدبر و تفکر کرتے ہیں وہ اس میں سے حکمت، دانائی اور رشد و ہدایت کے نئے نئے دُرِ شہوار نکال کر لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر قرآن فہمی کی مزید ارزانی فرماتا ہے۔ یہ سلسلہ چودہ سو صدیوں سے چل رہا ہے اور ان شاء اللہ تا قیامِ قیامت چلتا رہے گا۔

قرآنِ حکیم کے معارف اور اس کی حکمتوں کا عرفان و علم جب ہی نافع ہوگا جب اس کی ہدایت کو ہم اپنی عملی زندگی میں اختیار کر لیں۔ قرآن مجید تذکیر، نصیحت، موعظت کے لئے بھی دنیا کی آسان اور مؤثر ترین کتاب ہے۔ اللہ عزّ وجلّ نے خود سورۃ القمر میں اپنی کتابِ مبین کے اس وصف کو چار مرتبہ یہ فرما کر واضح کیا:

وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

"ہم نے یاد دہانی کے لئے قرآن کو آسان بنا دیا ہے۔ تو ہے کوئی اس ذکر سے فائدہ اٹھانے والا"!

قرآن حکیم کا اعجاز و ایجاز اور اس کی بلاغت و فصاحت، اس کا اصل سبق، اس کی حقیقی تعلیم معلوم کرنا ہو تو ان تمام کی جامع ترین سورت سورۃ العصر ہے۔ جس میں ابدی خسران سے بچنے کے اور اخروی نجات کے چار لوازم، چار ناگزیر شرائط، چار نشاناتِ راہ نہایت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں:

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

"زمانہ کی قسم ہے یعنی یہ تیزی سے گزرنے والا وقت گواہ ہے کہ کل نوعِ انسانی خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، جنہوں نے اچھے عمل کئے اور باہم ایک دوسرے کو حق کی نصیحت وصیت کی اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی تاکید و تلقین کی۔"

اس سورتِ مبارکہ کی عظمت اور جامعیت کا اتنا گہرا اثر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے قبول کیا کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:

لو تدبر الناس ھذہ السورۃ لوسعتھم۔

"اگر لوگ اس سورت (سورۂ والعصر) پر غور کریں تو وہ اسی میں پوری رہنمائی اور کامل ہدایت پالیں گے"۔

امام رحمہ اللہ کا یہ قول ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ امام موصوف کا دوسرا قول محمد عبدہٗ نے پارہ عم کی تفسیر میں اس سورۂ مبارکہ کے ضمن میں یہ نقل کیا ہے:

لو لم ینزل من القرآن سواها لکفت الناس۔

"اگر قرآن مجید میں سوائے اس سورۂ مبارکہ کے اور کچھ بھی نازل نہ ہوتا تو صرف یہ سورت ہی لوگوں (کی ہدایت) کے لئے کافی ہوتی"۔

یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ اس سورۂ مبارکہ پر ہمارے رفیق جناب محمد اقبال واحد صاحب امیر تنظیم اسلامی فیصل آباد کے مضمون کی پہلی قسط بھی اسی شمارے میں شامل ہے۔

اس تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ جب تک ہم قرآن حکیم کو صحیح معنوں میں اپنا امام، قائد اور رہنما نہیں بنائیں گے اس وقت تک نہ دنیا میں باعزت زندگی سے بہرہ مند ہو سکیں گے اور نہ ہی آخرت میں اللہ کی عدالت میں سرخرو اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکیں گے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب امیر تنظیم اسلامی ۲۲ر دسمبر ۸۳ء کو دعوتی و تبلیغی دورے پر شمالی امریکہ تشریف لے گئے تھے جہاں سے ۱۹ر جنوری ۸۴ء کو مراجعت ہوئی۔ متحدہ امریکہ میں بوسٹن، شکاگو اور نیویارک میں ڈاکٹر صاحب کے خطابات اور دروس کے پروگرام ہوئے۔ موصوف کینیڈا کے مشہور شہر ٹورنٹو بھی تشریف لے گئے تھے۔ اس سفر میں ڈاکٹر صاحب کے تیسرے فرزند میاں حافظ عاطف وحید سلمہٗ ان کے ہمراہ تھے۔ ان پر راقم نے یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ اس سفر کی روداد لکھیں۔ اس قسم کے کام کا ان کو کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال رہی تو وہ اس کام کو انجام دیں گے اور ان کی محنت کا نتیجہ آئندہ ماہ قارئین کرام کے سامنے آ جائے گا۔

ان سطور کا راقم اپریل ۸۳ء کے آخری عشرہ سے چند نجی مصروفیات کے باعث "میثاق" سے وہ ربط و تعلق قائم نہیں رکھ سکا تھا جو نومبر ۷۵ء سے چلا آ رہا تھا۔ اللہ سبحانہٗ کا اس عاجز پر پھر یہ فضل ہوا ہے کہ اس تعلق کی تجدید ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت سے کامل امید ہے کہ وہ تبارک و تعالیٰ راقم کے "دعوت اسلامی کے اس نقیب کے ساتھ" اس حقیر سے تعاون کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے گا۔

فاطر السمٰوٰت والارض انت ولیّ فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلماً والحقنی بالصٰلحین۔ آمین! یا رب العٰلمین!

الہدیٰ (گیارہویں نشست)

(مباحثِ ایمان)

قرآن کے فلسفہ و حکمت کی اساسِ کامل

سورۃ فاتحہ

از: ڈاکٹر اسرار احمد

(۲)

السلام علیکم! نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین ۔ الرحمٰن الرحیم ۔ مٰلک یوم الدین ۔

حاضرینِ گرامی و ناظرینِ کرام!

گذشتہ نشست میں ہم نے پوری سورہ فاتحہ کا ترجمہ سماعت کیا تھا اور اس کے بارے میں چند تمہیدی باتیں جان لی تھیں۔ اب ہم سورہ مبارکہ کے تینوں اجزا کو ایک ایک کرکے قدرے گہرائی میں جا کر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

اس سورۂ مبارکہ کا جزوِ اوّل ان تین آیات پر مشتمل ہے، جن کی میں نے آغاز میں تلاوت کی۔ جن کا ترجمہ ہے۔

"کل شکر اور کل ثنا اللہ کی ہے۔ جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے۔ بہت رحم فرمانے والا ہے نہایت مہربان ہے۔ جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے"۔

نوٹ کیجیے کہ یہ سورہ مبارکہ قرآن مجید کی افتتاحی سورہ ہے اور اس سورۃ کا ابتدائی کلمہ ہے:
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ------ یہ کلمہ بہت عظیم ہے بہت بلند مرتبت ہے۔ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے لفظ "حمد" کو اچھی طرح جان لینا ضروری ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ صرف ایک لفظ 'تعریف' سے کر دیا جاتا ہے حالانکہ تعریف بھی عربی کا لفظ ہے اور حمد بھی عربی کا لفظ ہے اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی بھی زبان کے دو الفاظ بالکل ہم معنی نہیں ہوتے ان کے معنی و مفہوم میں لازماً کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے اگر گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو لفظ 'حمد' میں دو مفاہیم ہمیں مل جاتے ہیں۔ ایک شکر اور دوسرا ثنا۔

شکر، کے بارے میں بڑی تفصیلی گفتگو ہم سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کے سلسلہ میں کر چکے ہیں۔ جہاں شروع میں فرمایا گیا تھا:
وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ وہاں ہم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر فطرت اپنی صحت پر برقرار ہو تو اس کا تقاضا جذبۂ تشکر ہے اور اگر عقل صحیح طور پر کام کر رہی ہو تو اس کا حاصل اپنے منعم حقیقی اور اپنے اصل مربی یعنی اللہ کو پہچان لینا ہے۔ فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیحہ دونوں کے امتزاج سے جو چیز حاصل ہوتی ہے اس کا نام حکمت ہے لہٰذا حکمت کا لازمی تقاضا اللہ کا شکر ہے۔ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ وہی بات ہے جو اس سورۃ مبارکہ کے ابتدائی کلمات میں آئی کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حمد کا لفظ شکر سے زیادہ وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔ کسی کا شکر ایسی چیز پر ادا کیا جاتا ہے جس کا کوئی فائدہ ہمیں پہنچے۔ لیکن ثنا اور تعریف کی جاتی ہے، کسی بھی حسن و جمال اور کمال کو دیکھ کر خواہ اس کا کوئی فائدہ ہمیں پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ حمد کے لفظ میں یہ دونوں چیزیں جمع ہیں۔ شکر بھی اور ثنا بھی۔ لہٰذا ترجمہ میں، میں نے ان دونوں کو جمع کیا کہ 'کل شکر اور کل ثنا اللہ کی ہے'۔

ایک دوسرے پہلو سے غور کیجیے تو آپ میرے اس نتیجہ سے اتفاق کریں گے کہ یہ کلمۂ توحید ہے ہم یہ بات مانتے ہیں کہ اس کائنات میں جہاں کہیں بھی کوئی مظہرِ کمال ہے، مظہرِ حسن

ہے ۔ مظہر جمال ہے ان کے متعلق ہماری عقل صحیحہ اور فطرت سلیمہ یہ رہنمائی کرتی ہے کہ ان تمام محاسن و کمالات کا منبع و سرچشمہ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اقدس ہے ۔ لہٰذا اصل تعریف اور ثنا ان اشیاء کی نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی ہوتی ہے ۔ کلمۂ توحید کا اقتضاء یہی ہے کہ ایک موحد کے شعور یا کم از کم تحت الشعور میں یہ بات مستحضر رہے کہ کائنات کی ہر نعمت ہر خیر ہر حسن ہر جمال اور ہر کمال اس کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا ودیعت کردہ اور عطا شدہ ہے ۔ جیسے تصویر میں اگر کوئی حسن ہے تو وہ درحقیقت مصور کے کمال فن کی عکاسی ہے ۔ تصویر کا اپنا کوئی حسن نہیں نہ اس کا کوئی اپنا کمال ہے ۔ بالکل اسی طرح کسی مخلوق میں اگر کوئی حسن وکمال ہے تو وہ حسن وکمال خالق کا ہے مخلوق کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے ۔ چنانچہ اس کل سلسلۂ کون ومکان میں کوئی حسن، کوئی خیر، کوئی کمال اور کوئی خوبی اگر ہے تو اس کا منبع و سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے ۔ لہٰذا شکر کا سزاوار حقیقی اور تعریف وثنا کا اصل مستحق اللہ اور صرف اللہ ہے ۔

یہ کلمہ الحمد للہ اتنا عظیم اور اعلیٰ مرتبت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کلمہ آسمان وزمین کو اپنی برکات سے بھر دیتا ہے :-

التسبیح نصف المیزان والحمد للہ تملأہٗ اس حدیث شریف کی رو سے کلمۂ سبحان اللہ میزان کو نصف کر دیتا ہے اور جب ایک انسان الحمد للہ کہتا ہے تو یہ کلمہ نہ صرف ان کو پُر کر دیتا ہے بلکہ آسمان وزمین کے مابین جو خلاء ہے، جو فضا ہے، اس سب کو پُر کر دینے والا کلمہ یہ الحمد للہ ہے ۔ ان دونوں کلمات کی عظمت میں ایک اور حدیث شریف ہے، جس پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح بخاری کا اختتام کیا ہے اور وہ ہے۔ کلمتان حبیبتان الی الرحمان ثقیلتان فی المیزان خفیفتان علی اللسان سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہِ العظیم

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام اور احسانات کے ضمن میں انبیاء ورسل اور صالحین کے جو کلمات شکر منقول ہوتے اور اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دعاؤں کی تعلیم وتلقین فرمائی ہے ان میں سے اکثر وبیشتر میں یہی کلمۂ الحمد للہ استعمال ہوا ہے ۔ تنگیٔ وقت کے باعث دو مثالیں قرآن مجید اور دو مثالیں حدیث شریف سے پیش کرنے

پر اکتفا کرتا ہوں۔ بڑھاپے میں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰقؑ جیسے صالح فرزند عطا فرماتے جو آگے چل کر منصب نبوت پر بھی سرفراز ہوتے تو اس احسان و انعام و نعمت و کرم پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر یہ ترانہ شکر ادا ہوا کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ (سورۃ ابراہیم ۳۹)

ایک اور مثال سورہ الاعراف سے دیکھ لیجیے۔ جب مومنین صادقین کو حساب و کتاب کے بعد میں جنت میں داخلہ کا اذن الٰہی ملے گا تو ان کی زبانوں پر یہ کلمۂ شکر و سپاس اور تعریف و ثنا جاری ہوگا کہ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَ مَا کُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ـــــــــ "اور وہ کہیں گے، کل شکر اور کل تعریف اس اللہ کی ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا ہم خود ہدایت نہ پا سکتے تھے اگر اللہ ہماری رہنمائی نہ فرماتا"۔ سو کر اٹھنے کی یہ دعا رسول اللہؐ نے تعلیم فرمائی کہ: الحمد للّٰہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور۔ ــــــــــ اکل و شرب کے بعد دعا ان الفاظ سے تلقین فرمائی کہ: الحمد للّٰہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین۔

ــــــــــ آگے باری تعالیٰ کا مزید تعارف ہو رہا ہے۔ ان کی چند صفات کمال کا مزید ذکر ہو رہا ہے۔ پہلی بات سامنے آتی ہے: رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ "جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے"۔ رب کے لفظ میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔ عرب کہتے ہیں۔ رَبُّ البیت یا ربُّ الدار یا معنی اگھر کا مالک، گھر والا۔ قرآن میں رب کا لفظ مالک کے معنوں میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے: جیسے رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالاَرض معنی ہوتے آسمانوں اور زمین کا مالک"۔ سورہ قریش میں آتا ہے کہ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ "پس عبادت کرو اللہ کے اس گھر (حرم شریف) کے مالک کی"۔ پھر رب کا دوسرا مفہوم پرورش کرنا۔ ترقی اور نشوونما دینا بھی ہے۔ ایک مالک تو وہ ہوتا ہے جو اپنی ملکیت لے کر بیٹھ رہتا ہے اور ایک مالک وہ ہوتا ہے کہ اس کی ملکیت میں جو چیزیں ہیں وہ ان کا پالن ہار اور پروردگار بھی ہے۔ وہ ہر چیز کو اس کی استعدادات کے مطابق پروان چڑھاتا ہے اور ہر شے کو اس کے نقطۂ کمال تک پہنچانے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ پس اللہ ہی وہ

ذات گرامی ہے ۔ جو ہر شے کے نقطۂ عروج و کمال تک پہنچنے کے جملہ مقتضیات کو فراہم کرنے اور پہنچانے والی ہے ۔ لہذا ان دونوں مفاہیم پر مشتمل ذات ہے اللہ ۔ عالمین ۔ عالم کی جمع ہے اور عربی زبان میں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ظرف کی جمع بول کر مظروف کی جمع مراد لی جاتی ہے ۔ لہذا یہاں ربّ العٰلمین کا مفہوم ہوگا ۔ سارے جہانوں کی مخلوقات کا وہ مالک اور پروردگار ہے ۔ آقا بھی ہے اور پرورش کنندہ بھی ہے ۔

آگے اللہ تبارک تعالیٰ کا ایک اور تعارف ہوتا ہے بایں الفاظ : اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اللہ سبحانہٗ کے یہ دو بڑے عظیم نام ہیں ۔ دونوں کا مادّہ (ROOT) ہے رحمت ۔ اسی رحمت سے رحمان بنا اور اسی سے رحیم بھی ۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے ! اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے ۔ عربی زبان میں فعلان ، کے وزن پر جب کوئی صفت آتی ہے تو اس میں ایسا نقشہ سامنے آتا ہے جیسے کسی کیفیت میں جوش و خروش اور ہیجان ہو ۔ خود ہیجان بھی فعلان کے وزن پر ہے تشبیہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ جیسے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو اس میں زبردست ہل چل ہو کسی صفت کی یہ کیفیت ہو تو عربی میں اُسے اکثر فعلان کے وزن پر لایا جاتا ہے ۔ اَنَا عطشانٌ ۔ معنی و مفہوم ہوگا میں شدید پیاسا ہوں ۔ پیاس سے مرا جا رہا ہوں ۔ اَنَا جوعانٌ میں بہت بھوکا ہوں ، بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے ۔ ھُوَ غضبانٌ وہ نہایت غصہ اور طیش میں ہے' ۔ اَلبحر طغیانٌ' سمندر میں سخت طوفان اور ہیجان ہے ۔ وہ اپنی حدود سے باہر نکلنے پر آمادہ ہے ۔ ان امور کو ذہن میں رکھ کر اب لفظ رحمان کو سمجھیے کہ 'رحمان' کے کیا مفہوم اور معنی ہوں گے ۔ رحمان وہ اللہ ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہے ۔ جس کی رحمت میں انتہائی جوش و خروش ہے ۔

البتہ فعیل کے وزن پر جب کوئی صفت آتی ہے تو اس صفت میں اس کے دوام و استمرار کا مفہوم بھی شامل ہوتا ہے ۔ یعنی یہ وقتی جوش و خروش نہیں ہے بلکہ اس میں پائیداری و استواری اور مستقل مزاجی ہے ۔ گویا اللہ کی رحمت کی شان یہ ہے کہ اس میں دوام ہے ، استقرار ہے ، استمرار ہے ۔ جیسے ایک دریا ہمواری کے ساتھ مسلسل بہہ رہا ہے اس میں ہیجان نہیں ہے ۔ سمندر کی طرح اس میں لہریں نہیں اٹھ رہیں ۔ بلکہ وہ دوام و تسلسل کے ساتھ خاموشی سے بہے چلا جا رہا ہے ۔ پس اللہ تعالیٰ کی رحمت کی یہ دونوں شانیں ہیں جو اس میں بیک

وقت موجود ہیں یعنی وہ بیک وقت رحمان بھی ہے رحیم بھی ہے ۔ یہ بات ہمارے لیے سمجھنا
مشکل بھی ہے اور ناقابل تصور بھی۔ اس کو میں آپ کو ایک تشبیہ سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں
آپ اس کی تفہیم کے لیے اپنی توجہات کو مرتکز فرمائیے ۔
فرض کیجیے کہ سڑک پر کوئی حادثہ ہوگیا ہو جس میں کئی افراد ہلاک ہوگئے ہوں اور فرض کیجیے کہ
اس حادثے میں ایک ایسی عورت بھی ہلاک ہوگئی جس کی گود میں ایک دودھ پیتا بچہ بھی تھا ۔ وہ بچہ
زندہ ہے اور اپنی مردہ ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا ہے ۔ یہ کیفیت دیکھ کر کون نرم دل انسان
ایسا ہوگا کہ جس کے دل میں رقت پیدا نہ ہو ۔ جس کے دل میں رحمت کے جذبات موجزن نہ ہو
جائیں ۔ ہر رقیق القلب شخص یہ چاہے گا کہ یہ بچہ جو بے سہارا ہو گیا ہے میں اس کی کفالت اپنے
ذمہ لے لوں ۔ اس کی پرورش میں کروں ۔ لیکن وہ اگر اس جوش میں یہ ذمہ داری لے بیٹھا تو ہمارا
مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر یہ وقتی جوش بہت جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں ہی
کے بعد اُسے محسوس ہو کہ میں یہ غلطی کر بیٹھا ۔ میرے اپنے بچے ہیں ۔ میری اپنی بے شمار ذمہ داریاں ہیں ۔
اب ان پر یہ بوجھ مستزاد آ گیا ۔ گویا وقتی طور پر وہ ہیجانی کیفیت تو اس پر آئی جس کے زیر اثر اس نے اس
بے سہارا بچے کی کفالت کی ذمہ داری لے لی لیکن اس میں دوام استقرار اور استمرار نہیں ۔ لیکن
اللہ تعالیٰ کی رحمت کی یہ دونوں شانیں بیک وقت ہیں ۔ وہ بیک وقت رحمان بھی ہے اور رحیم بھی
ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے مابین حرف عطف "و" نہیں آیا ۔ بلکہ یہاں فرمایا:
اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ یعنی یہ دونوں صفات اس میں بیک وقت اپنے کمال کے ساتھ موجود
ہیں ۔

اب ذرا ایک بات پر آپ غور کیجیے کہ سورہ فاتحہ یعنی قرآن مجید کی بالکل ابتدائی سورت
کی ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ کا جو تعارف ہمارے سامنے آتا ہے ، اس تعارف میں کون
سی چیز غالب ہے ! اُسی کے لیے ہونا تمام شکر اور تمام ثنا و تعریف کا ۔ اس کی ربوبیت ۔
اسی کا پوری کائنات کا مالک اور پروردگار ہونا ۔ اس کی رحمانیت ، اس کی رحیمیت ،
یہ امور ہیں جن کے ذریعہ اللہ سبحانہٗ کا ابتدائی تعارف ہمارے سامنے آتا ہے ۔ یہاں میں چاہتا
ہوں کہ وہ اعتراض بھی آپ کو سنا دوں جو بعض مستشرقین نے قرآن مجید اور اسلام پر کیا
ہے اور اس کا جواب بھی آپ کے سامنے آجائے ۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں اللہ کے خوف

پر زیادہ زور دیا گیا ہے ـــــــــ اسی کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے ۔ اسی کو
(EMPHASIZE) کیا گیا ہے ۔ خوف، تقویٰ، آخرت کی بازپرس، اللہ کا
عذاب، اللہ کی پکڑ، اسی کی بہت تکرار ہے ۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے مذہب یعنی عیسائیت،
میں اللہ کی محبت پر زور ہے ۔ یہاں آپ نوٹ کیجئے ـــــــ قرآن مجید اللہ تبارک و تعالیٰ کا
جو ابتدائی تعارف کرا رہا ہے وہ معاذاللہ کسی خوفناک ہستی کا نہیں ہے ۔ بلکہ ایک دل آویز،
ایک شفیق، ایک رؤف، ایک ودود، ایک رحمان، ایک رحیم ہستی کا تعارف کرا رہا ہے جو
مالک و آقا، پروردگار اور پالن ہار ہے ۔ وہ تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے ۔ تمام محامد
اس کی ذاتِ اقدس میں موجود ہیں ۔ پس معلوم ہوا کہ اصل و حقیقی تعارف تو یہ ہے کہ :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ

البتہ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ سب لوگ محبت کے رمز آشنا اور قدر شناس
نہیں ہوتے ۔ اکثر لوگ پست تر ذہنی سطح کے بھی ہوتے ہیں ۔ جن کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم
نے کہا ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ایسے لوگوں کے لیے ضرورت ہے کہ ان کو خوف بھی دلایا جائے ۔ ان کے دلوں میں
بازپرس کا احساس بھی اجاگر کیا جائے، عذابِ الٰہی سے ان کو خبردار بھی کیا جائے ۔ چنانچہ
قرآن مجید میں آپ کو یہ دونوں چیزیں ملیں گی ۔

لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ نبی جب آتے ہیں ۔ بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ نبی جب تشریف
لاتے تھے چونکہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا دروازہ ہمیشہ ہمیش کے لیے بند ہو چکا ۔
تو انبیاء علیہم السلام بگڑے ہوئے ماحول میں تشریف لاتے تھے ۔ اس بگڑے ہوئے ماحول
میں محبت کے رمز آشنا اور قدر شناس تو خال خال ہی ہوتے تھے لہٰذا اس ماحول میں
لوگ تخویف اور انذار کے زیادہ مستحق ہوتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں نبی اکرمؐ
کو جو احکام ملے ہیں ان میں انذار پر زیادہ زور ہے ۔ جیسے يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ

اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہو جاؤ، کمر بستہ ہو جاؤ اور لوگوں کو خبردار کرو“ ایک جگہ فرمایا: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء ۲۱۴) اور (اے نبی) اپنے رشتہ داروں اور قریبی اعزہ کو خبردار کیجئے“ تو ابتداءً انذار کا پہلو غالب ہے لیکن اصولاً قرآن مجید جس اللہ پر ایمان کی دعوت دے رہا ہے وہ کوئی معاذ اللہ خوفناک ہستی نہیں، بلکہ محبت کرنے والی اور محبت کرنے کے لائق و قابل ہستی ہے۔ اس سے محبت کرو، اُسے چاہو، اس سے لو لگاؤ“ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ جو واقعتاً صاحبِ ایمان ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت کرتے ہیں۔ اور اس کی محبت کی یہ اساسات ہیں جو سورہ فاتحہ کی دو ابتدائی آیات میں ہمارے سامنے آئیں کہ اللہ تعالیٰ تمام محاسن و کمالات کا جامع ہے۔ منبع و سرچشمہ ہے۔ وہ کائنات کا رب ہے۔ مالک ہے پروردگار پالن ہار ہے۔ وہ الرحمان الرحیم ہے۔ اس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند بھی ہے۔ اور اس استقرار و استمرار و دوام کے ساتھ بہنے والے دریا کے مانند بھی ہے البتہ تیسری آیت میں دوسرا رخ آ رہا ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ یعنی انذار۔ فرمایا مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ٥ زندگی محض اس دنیا کی زندگی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ یہ زندگی ایک امتحان گاہ ہے۔ جس میں آزمائش ہوتی ہے کہ انسان کس طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ جیسے سورہ ملک میں فرمایا۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ”موت اور زندگی کے اس کارزار کو اللہ نے پیدا ہی اس لئے کیا ہے۔ کہ تم لوگوں کو آزمائے اور دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے“ لہٰذا اس آزمائش کا لازمی تقاضا ہے کہ جزا و سزا کا ایک دن بھی ہو۔ اور وہ دن بھی آ کر رہے گا جس دن لوگوں کو اپنے اعمال کا پورا بدلہ ملے گا۔ ہر انسان کا محاسبہ ہوگا۔ اور اُسے جواب دہی کرنی ہوگی۔ اس محاسبہ اور حساب و کتاب کے نتیجہ میں جزا یا سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔ یہ سب یَوْمِ الدِّيْن ہے۔ جس کے متعلق ہم آیت بر کے درس میں پڑھ چکے ہیں کہ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ اس بدلہ اور جزا و سزا کے دن کو یوم الدین کہئے۔ یوم الآخر کہئے۔ وہ دن بہرحال واقع ہو کر رہے گا وَاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ، جس دن سب کو اللہ تعالیٰ کے حضور ہو کر اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہے جس کے نتیجہ میں یا جنت ہوگی ہمیشہ کے لئے یا آگ ہوگی دائمی۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے ابتدائی خطبات میں سے ایک خطبہ کے آخر میں ہمیں ملتا ہے کہ: وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ
اللہ کی قسم تم سب مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو۔ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ
پھر تم یقیناً اٹھائے جاؤ گے۔ جیسے (ہر صبح) بیدار ہوتے ہو۔ ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا۔ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَاناً وَ
بِالسُّوْءِ سُوْءً۔ پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا۔ اور بیشک
یہ ہوگا۔ وَاِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَداً اَوْلَنَارٌ اَبَداً۔ اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لئے
یا آگ ہے دائمی۔

اس فیصلے اور جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار صرف اللہ ہے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ
اور اس روز اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایک جگہ قرآن مجید
میں الفاظ آئے کہ اس روز ندا ہوگی کہ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ آج کے دن بادشاہی کس
کی ہے؟ اور پھر جواب میں فرمایا جائے گا: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ آج تمام اختیار
کل بادشاہی صرف اللہ کے لئے ہے۔ جو الواحد ہے تنہا ہے اور پوری طرح مسلط سے
چھایا ہوا ہے۔ مقتدر ہے کہ جو چاہے کرے۔

یہ ہے اس سورہ مبارکہ کا پہلا حصہ جس کے بارے میں گزشتہ نشست میں
حدیث قدسی کے حوالے سے میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ان کلمات کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ ادھر
بندہ کہتا ہے:
الحمد للہ رب العلمین اور اگر دل سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ہوں تو فوراً اللہ تبارک و تعالیٰ
جواب میں ارشاد فرماتا ہے حمدنی عبدی "میرے بندے نے میرا شکر ادا
کیا۔ میری حمد کی" جب بندہ کہتا ہے: الرحمٰن الرحیم، اللہ جواب میں فرماتا ہے،
اثنیٰ علی عبدی "میرے بندے نے میری ثناء کی" جب بندہ کہتا ہے۔
مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، تو اللہ فرماتا ہے: مجدنی عبدی، "میرے بندے
نے میری بزرگی کا اظہار کیا میری عظمت بیان کی"
یہ ہے اس سورہ مبارکہ کے پہلے حصے یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْن کا حاصل - اب اس ضمن میں کوئی سوال آپ کرنا چاہیں کوئی وضاحت آپ کو مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں -

سوال : ڈاکٹر صاحب ! آپ نے فرمایا کہ الحمد کا مطلب ہے کہ تمام تعریفیں صرف اللہ کے لیے ہیں تو کیا انبیاء و رسل اور اولیاء اللہ کی تعریف کی نفی نہیں ہو جاتی ؟

جواب : جب ہم کہتے ہیں - الحمد للہ ، تو یہ اس اعتبار سے ہے کہ تمام کمالات و محاسن کا اصل منبع و سرچشمہ اللہ ہے - باقی اس نے جس شے میں کوئی حسن ، کوئی خوبی ، کوئی کمال پیدا فرمایا ہے تو اس شے کی تعریف اگر آپ یہ سمجھتے ہوئے کریں گے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کا عطا کردہ ہے تو یہ تعریف بھی حقیقت میں اللہ ہی کی تعریف ہو گی - مثلاً اگر آپ کسی پھول کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ بہت حسین اور دلکش پھول ہے تو یہ بات غلط نہیں ہو گی لیکن در پردہ درحقیقت یہ پھول کے صانع و موجد کی ہی تعریف ہو گی جیسا کہ میں نے اپنے بیان کے دوران بھی عرض کیا تھا کہ کسی اچھی تصویر کی تعریف ——— دراصل اس مصور کی تعریف ہوتی ہے - جس کے فن کا کمال تصویر کی شکل میں سامنے ہوتا ہے - ایک بندۂ مومن کے ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ جیسے ہی کسی حسین و جمیل شے کو دیکھے تو اس کی زبان سے بیساختہ نکلے سبحان اللہ - اللہ ہی وہ ذات کامل اور ہر نقص سے منزہ ہستی ہے - جس نے یہ خوبصورت چیز تخلیق فرمائی - اسی طریقہ سے اشخاص ہیں ، افراد ہیں - ان میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ نے نبی ، رسول ، ولی کا مقام عطا فرمایا ہے - یا کسی کو اعلیٰ اخلاق تقویٰ اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں تو ان کی تعریف اس کلمۂ الحمد للہ کے منافی نہیں ہے - البتہ شعور اور تحت الشعور میں یہ امر مستحضر رہے کہ تمام محاسن و کمالات کا منبع اور سرچشمہ صرف اللہ سبحانہ کی ذات ہے -

سوال : ڈاکٹر صاحب ! بخشش اور سزا کے متضاد تصور کو ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں - ؟

جواب : - یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی نقیض نہیں ہیں - اس بات کو تو ہم دنیا میں بادشاہی کے نظام سے بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں - ظاہر ہے جو لوگ بادشاہ کے وفادار اطاعت گزار اور فرمانبردار رہتے ہیں بادشاہ ان کو انعام و اکرام سے نوازتا ہے اور جو بادشاہ کے نافرمان اور باغی ہوتے ہیں - ان کو وہ سزا اور عقوبت دیتا ہے - پس اللہ جو ربّ العالمین ہے اس دنیا میں جنہوں نے اس کے اوامر و نواہی کی پابندی کی ہو گی وہ یقیناً آخرت میں مستحق جزا قرار پائیں گے اور جو طاغی و باغی ہوں گے ، جنہوں نے اللہ کی اطاعت سے اعراض

لیا ہوگا۔ روگردانی کی ہوگی وہ مستوجبِ سزا ہوں گے۔ یہ تو نہایت منطقی اور قابلِ فہم بات ہے، اس میں کوئی تضاد یا تناقض نہیں ہے۔ پھر ایک اور پہلو سے سوچئے۔ اگر کسی شخص کو اس کے جرم پر سزا دی جاتی ہے۔ تو یہ اصل میں مظلوم کی داد رسی ہے، اس کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی بخشش کی شان نہایت بلند ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کا دیا جانا اس اعتبار سے انصاف کا تقاضا ہے کہ جن لوگوں کے حقوق کسی نے دنیا میں غصب یا تلف کئے ہیں، جن پر کسی نے زیادتیاں کی ہیں۔ تو ایسے شخص کو سزا دی جانا بھی حق ہے، غور کرنے سے اس کا موقع و محل بھی آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! کہا جاتا ہے کہ اللہ ذاتی نام ہے۔ براہ کرم اس کا مفہوم بھی بیان فرمائیں؟

جواب: یہ بہت ہی عمدہ سوال ہے۔ اللہ کے لفظ کے بارے میں ہمارے یہاں اہلِ نحو کے اور آئمہ لغت کے مابین اختلافات ہیں۔ ایک رائے یہی ہے کہ یہ اسم علم ہے، اِسم ذات ہے یہ کسی اور لفظ سے نکلا ہوا یا بنا ہوا نہیں ہے۔ جیسے لاہور شہر کا نام لاہور ہے۔ اب اس کے معنی معین کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ یہ تو اصل میں ایک شہر کے لئے بطور علامت ایک نام رکھ دیا گیا ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اللہ بھی الٰہ پر الف لام داخل ہو کر بنا ہے جیسے اللہ کے دوسرے صفاتی نام بنتے ہیں۔ جیسے رحمان پر الف لام داخل ہو کر الرحمٰن بنا۔ یہ اللہ کا ایک صفاتی نام ہو گیا۔ رحیم ایک صفت ہے؛ الرحیم اللہ کا نام ہے۔ ایسے ہی "الٰہ" پر الف لام داخل ہوا اور "الالٰہ" بنا۔ اور یہی اَلاِلٰہ بدل کر "اللہ" ہو گیا۔ یعنی معبودِ حقیقی۔ اصل اور واقعی الٰہ۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے حمد کے ایک معنی اللہ کا شکر ادا کرنا بھی بیان کئے ہیں۔ اس بات پر روشنی ڈالیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر کس کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔؟

جواب: جب ہم ان شاء اللہ سورہ فاتحہ کا دوسرا حصہ پڑھیں گے تو اس میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر کس کس طرح ادا کیا جانا ایک بندہ مومن کے لئے لازم ہے۔ البتہ اس موقع پر میں یاد دلاؤں گا کہ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے مطالعہ کے دوران اس پر گفتگو ہو چکی ہے کہ شکر کی اہم ترین صورتیں یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی نوع کا شرک نہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا عملاً حق ادا کیا جائے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کے دو سب سے بڑے تقاضے ہیں۔

سوال : ڈاکٹر صاحب ! اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی جن چیزوں سے ہمارا دل خوش ہوتا ہے یا جن سے ہمیں کوئی فائدہ یا نفع پہنچتا ہے۔ تو ہم اللہ کا شکر بجالاتے ہیں اس کی حمد کرتے ہیں لیکن اگر کوئی چیز ایسی ہو جو ہمیں پسند نہ آئے۔ جو ناگوار ہو یا جن سے ہمیں ضرر پہنچے تو ایسے موقع پر ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔؟

جواب : بہت اچھا سوال ہے۔ اصل میں اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے شرِ محض تو کوئی بھی شے نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو ہر چیز میں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس کا ادراک نہ کرسکیں۔ البتہ بعض کا ہمیں ادراک ہوگیا ہے۔ جیسے ہم جانتے ہیں کہ سنکھیا زہر ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دوا بھی بن سکتا ہے لہٰذا اگر انسان کی نگاہ وسیع ہے اور اس کا فہم گہرا ہے تو اُسے ہر شے میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کا کوئی نہ کوئی پہلو نظر آجائے گا۔ اِس مسئلہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ہمیں کسی چیز سے خوشی ہوئی یا ناگواری ہوئی۔ اس سے ہمیں کوئی نفع پہنچا یا نقصان۔ اس اعتبار سے ہمارا جو طرزِ عمل ہوگا وہ یا شکر کا ہوگا۔ یا صبر کا ہوگا۔ شکر اور صبر مل کر ایک بندۂ مومن کے صحیح طرزِ عمل کی تکمیل کرتے ہیں۔ جو چیز اچھی لگی یا جس سے فائدہ اور نفع حاصل ہوا۔ اس پر شکر کیجئے۔ جس چیز سے ناگواری کا احساس ہوا یا نقصان و ضرر پہنچا تو اِس پر صبر کیجئے۔

حضرات ! اس سورہ مبارکہ کا جو پہلا حصّہ تھا۔ جو تین آیات پر مشتمل ہے۔ ہم نے اپنی امکانی حد تک آج اس مختصر وقت میں اس کے مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ کرے کہ ہمارے دلوں میں اور ہمارے ذہنوں میں واقعتاً اللہ تعالیٰ کی عظمت کا نقش اسی طرح سے قائم ہو جائے جس طور سے ان تین آیات کے مطالعہ سے ہمارے سامنے آیا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

توحید فی العلم یا توحید فی المعرفہ

اور

توحید فی العمل یا توحید فی الطلب

کا

فریضۂ اقامتِ دین

سے ربط و تعلق

سورۂ زمر، سورۂ مومن، سورۂ حٰمٓ السجدہ اور بالخصوص
سورۂ شوریٰ کے بعض مقامات کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

امیرِ تنظیمِ اسلامی

کا

خطاب اور درس

ترتیب و تسوید

شیخ جمیل الرحمٰن

محترم ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی ۷ دسمبر ۸۳ء سے ۱۹ دسمبر ۸۳ء تک خطابات، دروس قرآن حکیم اور تنظیم اسلامی کے ایک تربیتی پروگرام کے ضمن میں کراچی میں مقیم رہے ۔۔۔ اس دوران شریف آباد فیڈرل بی ایریا عقب الاعظم اسکوائر میں امیر موصوف نے ۱۲ تا ۱۵ دسمبر ۸۳ء کو بعد نماز عشاء ملاقات کی وسیع و عریض مسجد جامع الصفا میں پہلے دن ایک عمومی خطاب فرمایا اور بقیہ دو دن سورۂ شوریٰ کے بعض مقامات کا درس دیا اور اس امر کو واضح فرمایا کہ فریضہ اقامت دین، توحید فی العلم اور توحید فی العمل کا ذروۂ سنام (چوٹی) ہے ۔۔۔ اس خطاب میں یہ مضمون سورۂ زمر، سورۂ مومن، سورہ حٰمٓ السجدہ سے سورۂ شوریٰ کی طرف بتدریج آگے بڑھتا ہے ۔۔۔ فریضہ اقامت دین کے موضوع پر امیر محترم کے متعدد خطابات اور دروس ہو چکے ہیں لیکن اس عاجز کے خیال میں اس موضوع پر موصوف کا حالیہ خطاب اور درس چوٹی کا درجہ رکھتا ہے اور بالکل نئے اسلوب سے دیا گیا ہے، طرز استدلال بھی نیا ہے

لہٰذا اسے یہ عاجز کیسٹ سے منتقل کر رہا ہے۔ خطاب کی پہلی قسط معمولی حک و اضافہ اور ذیلی و ضمنی سرخیوں کے ساتھ قارئین کرام کی خدمت میں پیش ہے۔ اللہ کی توفیق و نصرت اس عاجز کے شامل حال رہی تو ان شاء اللہ العزیز یہ خطاب اور درس چار پانچ اقساط میں "میثاق" میں پیش ہوگا ۔۔۔ وبیداللہ التوفیق وعلیہ التکلان

احقر: جمیل الرحمٰن

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہِ الکریم ۔ اما بعد :

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم　　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾

(صدق اللہ العظیم)

اللّٰھم ربنا الھمنا رشدنا واعوذنا من شرور انفسنا ۔ اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہٗ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہٗ ۔ اللّٰھم وفقنا لما تحب وترضیٰ ــــ اما بعد : رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی

آمین یا ربّ العٰلمین

حضرات و خواتین! آپ کو اعلانات سے معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ آج، کل اور پرسوں تین دنوں میں سورۂ شوریٰ کے بعض منتخب مقامات کا ہم مطالعہ کریں گے۔ سورۂ شوریٰ کے متعلق اعلانات سے یہ بات بھی آپ کے سامنے آ چکی ہے کہ میرے حقیر مطالعہ کی رو سے یہ سورۂ مبارکہ اقامتِ دین کے خاص موضوع پر ایک چوٹی کا درجہ رکھتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض سورتوں کیلئے ذروۂ سنام کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی مختلف سورتیں مختلف موضوعات پر چوٹی کے مقام کی حامل ہیں۔ انگریزی میں اُسے اس موضوع کے CLIMAX یعنی نقطۂ عروج سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک اقامتِ دین کے خاص موضوع پر اس سورۂ مبارکہ کو ذروۂ سنام کا مقام حاصل ہے۔

مصحف کی ترتیب

آج میں چاہتا ہوں کہ سورۂ شوریٰ کے پیشِ نظر بعض مقامات کے درس سے قبل اس سورت کے بارے میں اور قرآن کی موجودہ ترتیب کے متعلق بعض اہم اور بنیادی باتیں آپ کے گوش گزار کر دوں جو اِن شاء اللہ العزیز قرآن حکیم کے مطالعہ اور اس میں غور و فکر اور تدبر کے لئے قرآن مجید کے ہر طالب علم اور قاری کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔

مکیات و مدنیات

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ سورہ شوریٰ مکی سورت ہے۔ آپ اس بات سے بھی واقف ہوں گے کہ قرآن مجید کا تقریباً دو تہائی حصہ مکی سورتوں پر اور بقیہ تقریباً ایک تہائی حصہ مدنی سورتوں پر مشتمل ہے ـــ ایسا نہیں ہے کہ قرآن مجید میں پہلے مکی اور بعد میں مدنی سورتیں یکجا جمع کر دی گئی ہوں ـــ پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ مکیات اور مدنیات میں جو نزولی ترتیب ہے اس کے اعتبار سے قرآن حکیم کو مرتب کیا گیا ہو ـــ یہ بات قرآن مجید کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ نزولی ترتیب اور ہے اور مصحف کی ترتیب اور ہے ـــ

ازلی و ابدی ترتیب

البتہ یہ بات جان لیجئے کہ اصل میں قرآن حکیم کی ازلی و ابدی ترتیب یہی ہے جو مصحف کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ یہی ترتیب توقیفی ہے اور قرآن مجید کی یہی ترتیب لوح محفوظ کے مطابق ہے۔ البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کا جو نزول ہوا ہے، وہ ایک دوسری ترتیب سے ہوا ہے۔ اُن خاص حالات کے مطابق ہوا ہے جو آں حضورؐ کی دعوت اور آپؐ کی جدوجہد کے دوران آپؐ کو مختلف مواقع پر مختلف مراحل میں پیش آئے۔ لہٰذا ترتیب نزولی کا تعلق خاص حالات سے اور خاص زمانے سے ہے۔ گویا خاص زمان و مکان اس نزول کے پس منظر میں ہیں لیکن جس ترتیب سے قرآن مجید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت کو عطا فرما کر دنیا سے تشریف لے گئے ہیں وہ لوح محفوظ کی ترتیب کے عین مطابق ہے اور یہ ہے ازلی و ابدی ترتیب ـــ اسی کے مطابق آنحضورؐ کی وفات سے قبل کے رمضان المبارک میں حضرت جبرئیلؑ نے آپؐ کو دوبار قرآن مجید کا دور کرایا ہے۔

قرآن مجید کا نظم

قرآن فہمی اور خاص طور پر اس میں تدبر کے لئے مصحف کی موجودہ ترتیب اس کے نظم اور سورتوں کے باہمی ربط و تعلق کو سمجھنا بڑا اہم ہے۔ چنانچہ اس پر ہر دور میں کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور اس کی سورتوں کا جو اندرونی نظام اور ان کا جو باہمی ربط و تعلق ہے اس پر برصغیر ہند و پاک کی ماضی قریب کی ایک متقی و متدین شخصیت نے نہایت عمیق تدبر و تفکر کیا ہے اور اس نظام اور باہمی ربط و تعلق کو واضح کرنے کے لئے انتہائی قابل قدر کام کیا ہے۔ یہ شخصیت تھے مولانا امام حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ جن کا انتقال ۱۹۳۰ء میں ہوا۔ مولانا مرحوم شبلی نعمانی مرحوم کے بہت قریبی عزیز تھے۔ ان دونوں کے مابین ماموں زاد اور پھوپھی زاد بھائیوں کا رشتہ تھا۔ مولانا فراہیؒ نے عربی زبان میں قرآن مجید کے چند اجزاء کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ اس کا نام ہی مولانا نے "تفسیر نظام القرآن" تجویز

کیا تھا۔ اس کا مقدمہ مولاناؒ نے "مقدمہ تفسیر نظام القرآن" کے عنوان سے تحریر کیا تھا جو نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے اور جو میرے نزدیک قرآن فہمی کے لئے بمنزلہ کلید ہے۔ بس مولانا فراہیؒ ہی اس دور کی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے قرآن کے نظام پر خصوصی طور پہ توجہات کو مرکوز کیا۔

نظام کے لحاظ سے قرآن کے گروپ

مولانا فراہیؒ کے اصولوں پر نظام قرآن کو واضح کرنے کے لئے انہیؒ ہی کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اس ضمن میں ایک رائے ظاہر کی ہے جو خاصی وزنی ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ قرآن حکیم کی جملہ سورتیں سات گروپوں میں منقسم ہیں اور ہر گروپ کی تشکیل اس طرح ہے کہ اس میں آغاز میں ایک یا ایک سے زائد مکی سورتیں ہیں اور ہر گروپ کا اختتام ہوتا ہے ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پہ ۔۔۔ اس طرح مکیات اور مدنیات مل کر ایک گروپ بن جاتا ہے ۔۔ پھر مکیات اور مدنیات پر مشتمل دوسرا گروپ مکمل ہوتا ہے۔ وقس علیٰ ذٰلك ۔۔۔ اس طرح قرآن حکیم کے جو سات گروپ بنتے ہیں ان میں سے ہر گروپ کا ایک اپنا مرکزی مضمون ہوتا ہے جسے وہ 'عمود' کہتے ہیں۔ یہ عمود کی اصطلاح شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اختیار فرمائی ہے۔ لیکن یہ کہ قرآن کے سات گروپ ہیں اور ہر گروپ کا اپنا ایک عمود یعنی مرکزی مضمون ہے تو یہ مولانا اصلاحی کی اپنی تحقیق اور تدبر کا نتیجہ ہے جو اس دور میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ مولانا اصلاحی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ہر گروپ کے مرکزی مضمون یا عمود کے دو رُخ ہیں ۔۔ جیسے ہم کہتے ہیں تصویر کے دو رخ ۔۔۔ تو ایک رُخ مکیات میں بیان ہوتا ہے اور دوسرا رُخ مدنیات میں اور اس طرح یہ دونوں رُخ مل کر اس گروپ کے عمود یا مرکزی مضمون کی تکمیل کر دیتے ہیں۔

اس طرح جو سات گروپ بنتے ہیں۔ ان میں سے پہلے گروپ میں مکّی سورت صرف ایک ہے اور وہ ہے سورۂ فاتحہ ۔۔ یہ سورت مختصر ہے اور صرف سات آیات پر مشتمل ہے، اگرچہ اپنے مضامین کی جامعیّت کے اعتبار سے اُسے 'قرآنِ عظیم' بھی کہا گیا ہے۔ گویا یہ سورہ خود اپنی جگہ ایک مکمل قرآن ہے ۔۔ اسے اُمّ القرآن بھی کہا گیا اور اساس القرآن بھی ۔۔۔ اس کو شافیہ اور کافیہ کے ناموں سے بھی موسوم کیا گیا۔ اس سورہ کے مختلف نام اس کی جامعیت وعظمت کے اظہار کے لئے رکھے گئے ہیں۔ حالانکہ حجم کے اعتبار سے وہ بہت چھوٹی سورت ہے جبکہ اس پہلے گروپ میں چار نہایت طویل مدنیات شامل ہیں یعنی سورۃ البقرہ

سے لے کر سورہ مائدہ تک ۔ قرآن مجید کے تقریباً چھ پارے ہیں جو ان چار سورتوں پر مشتمل ہیں ۔۔۔ دوسرے گروپ میں دو بڑی مکی سورتیں انعام اور اعراف اور اسی طرح دو بڑی مدنی سورتیں انفال اور توبہ شامل ہیں ۔ تیسرے گروپ میں پہلی چودہ سورتیں سورہ یونس سے سورۂ مومنون تک مکی ہیں اور آخر میں صرف ایک مدنی سورت ' سورہ نور' شامل ہے یہ بھی چھ پاروں کے لگ بھگ گروپ بنتا ہے ۔۔۔ چوتھا گروپ سورۂ فرقان سے سورہ احزاب پر ختم ہوتا ہے ۔ اس میں بھی ابتدا میں آٹھ مکی سورتیں ہیں اور آخر میں صرف ایک مدنی سورت 'سورۂ احزاب' ہے ۔۔۔ پانچواں گروپ سورۂ سبا سے شروع ہو کر سورۂ حجرات پر ختم ہوتا ہے ۔ اس میں ابتدا میں تیرہ مکی سورتیں اور اختتام پر تین مدنی سورتیں شامل ہیں ۔۔۔ پھر چھٹا گروپ سورہ قٓ سے شروع ہو کر سورہ تحریم پر ختم ہوتا ہے اس میں پہلی سات سورتیں مکی اور اس کے بعد سورۂ حدید سے لے کر سورۂ تحریم تک دس سورتیں مدنی ہیں ۔ یہ وہ واحد گروپ ہے جس میں مدنیات کی تعداد مکیات سے زیادہ ہے ۔۔۔ آگے چلئے پھر سورہ الملک سے سورہ الناس تک ساتواں گروپ ہے ۔ اس گروپ میں چند سورتیں مستثنیٰ ہیں جو مدنی ہیں باقی کل کی کل سورتیں مکیات پر مشتمل ہیں ۔

مکیات کے مرکزی مضامین و موضوعات

اب ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ مکیات کے مرکزی مضامین و موضوعات کیا ہیں ۔ ! اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ مکی سورتوں کا اصل موضوع ہے ایمان ۔۔۔ پہلے اسی کو پختہ کیا گیا ہے اس لئے کہ ایمان پر ہی اسلام کا دار و مدار ہے ۔ ایمان کی حیثیت جڑ کی ہے اور اسلام کی حیثیت درخت کی ہے ۔ اور اعمال صالحہ اسی ایمان اور اسلام کے ثمرات ہیں ۔ لہٰذا بنیادی حیثیت جڑ ہی کو حاصل ہوتی ہے جس پر درخت قائم ہوتا اور برگ و بار لاتا ہے ۔ یا یوں سمجھئے کہ جیسے ایک عمارت ہے اس کی ایک بنیاد ہے اور اس پر تعمیر ہے ۔ نظر تو عمارت آتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس عمارت کے استحکام کا سارا دار و مدار بنیاد پر ہے اور وہ زیر زمین ہے نظر نہیں آتی ۔۔۔ پس معلوم ہوا کہ اصل شے ایمان ہے ۔ یہ ایمان ہی اصل موضوع ہے ۔ تمام مکی سورتوں کا ۔۔۔

ایمان کے اہم اجزاء

البتہ ایمان کے تین اجزاء ہیں ۔ ایمان باللہ یا توحید ۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالمعاد یا ایمان بالآخرۃ ۔۔۔ ان تینوں اجزاء کی مکی سورتوں میں مختلف اسالیب سے دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تفہیم ہے ۔ میں آگے عرض کروں گا کہ ان کے اعتبارات

سے ان گروپوں میں تقسیم کیا ہے! ــــ لہٰذا مکیات کا سب سے بڑا موضوع تو ہو گیا ایمان۔

بنیادی اخلاقیات دوسرا بڑا اور اہم مضمون مکی سورتوں کا بنیادی اخلاقیات سے متعلق ہے۔ سچائی ہے، ہمدردی ہے، بھوکوں کو کھانا کھلانا ہے، یتیموں سے حسنِ سلوک ہے، حاجت مندوں کی دستگیری ہے، ماپ اور تول میں دیانت ہے، معاملات میں امانت ہے، ایفائے عہد ہے، صلہ رحمی ہے، والدین سے حسنِ سلوک ہے، زنا سے اجتناب ہے، عصمت و عفت کی حفاظت ہے، تبذیر و اسراف سے بچنا ہے، چغل خوری، بہتان تراشی، شیخی و تکبر اور تفاخر و تکاثر سے پرہیز ہے، قتل ناحق بالخصوص نومولود بچیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے پر نکیر ہے، غلاموں پر شفقت یا ان کی آزادی کی ترغیب ہے ــــ ان اخلاقیات کی تعلیم و تلقین کا بھی کثرت سے مکیات میں مختلف اسالیب سے شد و مد کے ساتھ ذکر ہے۔ مکی سورتوں میں ان چیزوں پر آپ کو زور Emphasis ملے گا ــــ لیکن مکیات میں آپ کو شریعت کے احکام نہیں ملیں گے۔ حلال و حرام کیا ہے! ان کا ذکر مدنی سورتوں میں آئے گا ــــ مکیات میں تو ایمان کی دعوت اور بنیادی اخلاقیات کی تعلیم و تلقین ملے گی۔ ان اخلاقیات کی جو مکہ والوں کے نزدیک بھی متفق علیہ تھے اور کوئی انسان بھی دنیا میں ایسا نہیں ہوگا جو یہ تسلیم نہ کرے کہ سچ بولنا اچھا ہے، جھوٹ بولنا بُرا ہے۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہوگا جو یہ نہ کہے کہ وعدہ وفا کرنا اچھائی ہے اور وعدہ خلافی بُرائی ہے۔ وقس علیٰ ھٰذا۔ تو معلوم ہوا کہ دنیا کے متفق علیہ اخلاقی اصول اور اقدار کی تعلیم و تلقین بھی ہے جو آپ کو مکی سورتوں میں ایمان کی دعوت کے ساتھ ملے گی۔

قصص الانبیاء و انباء الرسل تیسرا جو بڑا مضمون مکی سورتوں میں ہے وہ ہے انبیاء و رسل کے حالات و واقعات ــــ ان میں بھی ایک فرق ہے۔ انبیاء کرام (علیہم السلام) کے جو واقعات و حالات بیان ہوئے ہیں، وہ بنیادی اخلاقیات کے ذیل میں آئے ہیں ــ رسولوں (علیہم السلام) کے جو واقعات و حالات آئے ہیں، وہ اس کام کے لئے آئے ہیں جن کو امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "التذکیر بایّام اللہ" کا عنوان دیا ہے۔ یاد دہانی کرانا اللہ کے دنوں کے حوالے سے ــــ یعنی جن قوموں کی طرف اللہ کے رسول مبعوث ہوئے اور ان قوموں نے ان رسولوں کی دعوتِ توحید کو قبول نہیں کیا، اسے رد کر دیا تو وہ قومیں ہلاک کر دی گئیں ــــ نسیاً منسیاً کر دی گئیں، ان کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ جیسے قوم نوح ہے، قوم ثمود ہے، قوم عاد ہے ــــ، قوم لوط ہے، قوم شعیب ہے اور آلِ فرعون ہے ــــ ان چھ اقوام کا ذکر بار بار قرآن مجید میں

آیا ہے۔ جو حضرات قرآن حکیم کو پڑھنے والے ہیں ان کو معلوم ہے کہ ان چھ رسولوں کا جو ان قوموں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے یعنی حضرتِ نوحؑ، حضرتِ ہودؑ، حضرتِ صالحؑ، حضرتِ لوطؑ، حضرتِ شعیبؑ اور حضرت موسیٰ علیہم السلام۔ تو ان کا ذکر مختلف اسالیب اور مختلف سیاق و سباق میں اس اعتبار سے تکرار و اعادہ کے ساتھ مکی سورتوں میں آتا ہے کہ ان کے حالات تمہارے لئے مثال و نشانِ عبرت ہیں ان سے سبق لو کہ ان رسولوں کی قوموں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا تو وہ ہلاک کر دی گئیں ۔۔۔ اگر تم نے بھی ان ہی کا سا رویہ اختیار کیا تو تم بھی اس دنیا میں بھی عذاب الٰہی سے دوچار ہو گے اور آخرت میں بھی عذابِ دائمی تمہارا مقدر ہو گا۔

جن حضرات کو مطالعۂ قرآن سے دلچسپی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر ان کے لئے دو اصطلاحات کا فرق بھی واضح کر دوں ۔۔۔ ایک اصطلاح ہے 'قصص النبیین' ۔ نبیوں کے حالات کو قصص قرار دیا گیا ہے۔ رسولوں کے حالات کے لئے دوسری اصطلاح آتی ہے اور وہ ہے 'انباء الرسل' ۔۔۔ انبا، بڑی اہم خبر کو کہتے ہیں۔ انباء الرسل کے معنی ہوں گے 'رسولوں کی بہت اہم خبریں'۔ یعنی پوری پوری قوموں کا ہلاک کر دیا جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا جن کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے: كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا 'وہ ایسے ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں، کبھی بستے ہی نہیں تھے'۔ لَا يُرٰى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ "اب ان کے مسکن رہ گئے ہیں، کھنڈرات ہیں، ان میں بسنے والے کہیں نظر نہیں آتے"۔ کہیں فرمایا: فقطع دابر القوم الذین ظلموا ۔۔۔ "ان ظالم قوموں کی جڑ کاٹ دی گئی"۔ یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ قرآن میں "ظلم" کا لفظ عموماً شرک کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جیسے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۔۔۔ معلوم ہوا کہ یہ بڑے اہم واقعات ہیں تو ان کو قرآن کہتا ہے 'اَنْبَاءُ الرُّسُلِ' ۔۔۔ اور جن انبیاء کرام کے واقعات و حالات میں ان قوموں کی ہلاکت کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان نبیوں کے مضبوط کردار، ان کی پاکیزہ سیرت، ان کی صداقت و دیانت، ان کی امانت، ان کی عصمت، ان کی عفت اور ان کے صبر و ثبات کا ذکر ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے واقعات و حالات سورۂ یوسف میں بیان ہوئے ہیں تو ان کو قرآن کہتا ہے قصص ۔۔۔ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۔۔۔ یہ ہے سورۂ یوسف ۔۔۔ اور سورۂ ہود کے آخر میں آتا ہے کہ یہ انباء الرسل ہیں جو ہم اے نبی! آپؐ کو سنا رہے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے (اے نبیؐ) ہم آپؐ کے دل کو جما دیں اور تسلی دیں اور (اے نبیؐ) اس سورت میں آپؐ کے

جو آیا ہے اور اس میں نصیحت اور یاد دہانی ہے ایمان والوں کے لئے : وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِىْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ یعنی جن حالات سے اے نبیؐ! آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے وہی حالات سابقہ رسولوں کو بھی پیش آئے تھے لیکن بالآخر اللہ کی نصرت ان رسولوں کے شامل حال ہوئی، وہ سربلند ہوئے اور وہ قومیں جنہوں نے ان کی تکذیب کی، ان کا استہزا کیا، تمسخر کیا، ان کی دعوتِ ایمان سے اعراض کیا وہ ہلاک و برباد کر دی گئیں۔

میں نے جن تین اہم مضامین کا ذکر کیا ہے اکثر و بیشتر مکی سورتوں میں مشترک ہیں، ان کا اعادہ کر لیجئے۔ یعنی نمبر ایک : دعوتِ ایمان ـــ ایمان میں توحید، رسالت اور آخرت ـــ نمبر دو: بنیادی اخلاقیات کی تعلیم و تلقین ـــ نمبر تین : قصص النبیین، جن کا تعلق بنیادی اخلاقیات سے ہے اور انباء الرسل۔ جن کا تعلق دعوتِ ایمان سے ہے ـــ یہ ہیں مکیات کے بنیادی مضامین۔

گروپوں میں مضامین کی تقسیم

البتہ ان میں ایک اور تقسیم بھی ہے۔ میں نے مکی سورتیں کے گروپ آپ کو گنوائے تھے ان میں سے پہلے گروپ میں صرف مکی سورت، سورۂ فاتحہ ہے، وہ تو پورے قرآن کا دیباچہ اور مقدمہ ہے۔ اس کے بعد اس گروپ میں پانچ مدنی سورتیں ہیں۔ باقی رہ گئے چھ گروپ۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ دوسرے اور تیسرے گروپ کی مکی سورتوں میں زیادہ زور ایمان بالرسالت پر ہے۔ سورۂ انعام و سورۂ اعراف جو دوسرے گروپ کی مکیات ہیں ان میں اور تیسرے گروپ میں سورۂ یونس سے لے کر سورۂ مومنون تک ـــ ویسے جو تین بنیادی مضامین میں نے گنوائے ہیں وہ بھی ان مکی سورتوں میں ملیں گے لیکن ان گروپوں کی سورتوں میں خاص زور (Emphasis) رسالت پر ملے گا۔ ان کا اصل عمود اور مرکزی مضمون رسالت ہے۔ اس کے بعد چوتھے گروپ میں سورۂ فرقان سے لے کر سورۂ حٰمٓ السجدہ تک آٹھ سورتیں۔ پھر پانچویں گروپ میں سورۂ سبا سے لے کر سورۂ احقاف تک تیرہ سورتیں ہیں۔ ان اکیس سورتوں کا مرکزی مضمون یا عمود توحید ہے۔ ان میں بھی پہلے مضامین موجود ہیں لیکن اصل زور توحید پر ہے۔ آخری جو دو گروپ ہیں ان میں چھٹے گروپ میں مکیات سورۂ قٓ سے لے کر سورۂ واقعہ تک اور ساتویں گروپ یعنی سورۂ ملک سے جو مکیات کا طویل سلسلہ ہے اس میں چند سورتوں کو چھوڑ کر ان کا مرکزی مضمون یا عمود ہے آخرت ـ انذار، آگاہ کرنا، خبردار کرنا کہ یہ دنیا فانی ہے۔ اصل زندگی آخرت کی زندگی

ہے۔ جس میں اس دنیا کی زندگی کے تمام اعمال ہی کا نہیں بلکہ نیتوں اور ارادوں کا بھی حساب کتاب ہوگا۔ جواب دہی کرنی ہوگی پھر عدالتِ الٰہی سے جزا و سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔ یا جنت ہوگی ہمیشہ کے لئے یا آگ ہوگی دائمی ــــ ان ہی گروپوں میں یہ سورتیں ملتی ہیں: اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ کہیں فرمایا: اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ۝ کہیں آگاہ کیا گیا: اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ اسی طرح سے: عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِیْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝ اور هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝ ــــ تو آخری ان دو گروپوں کی مکیات میں زیادہ زور ہے انذارِ آخرت پر ــــ درمیانی دو گروپوں کا مرکزی مضمون ہے توحید ــــ اور ابتدائی دو گروپوں کی مکیات میں جس پر زیادہ زور ہے، وہ ہے رسالت ــــ

اب آگے چلئے۔ مجھے اندازہ ہے کہ جن حضرات کو قرآن مجید کی ترتیب سے تعارف نہیں ہے، ان کو یہ باتیں قدرے بھاری معلوم ہوں گی۔ لیکن میں اصل میں یہ تمہید بنا رہا ہوں اور آپ کو رفتہ رفتہ سورۂ شوریٰ کی طرف لا رہا ہوں۔ میں نے ابھی درمیانی جو اکیس سورتیں آپ کو گنوائیں۔ سورۂ فرقان سے لے کر سورۂ حٰمٓ السجدہ تک یہ ہیں آٹھ سورتیں ــــ سورۂ سبا سے لے کر سورۂ احقاف تک یہ ہیں تیرہ سورتیں ــــ ان دونوں گروپوں کی ان اکیس سورتوں کا مرکزی مضمون توحید ہے۔ اب ایک عجیب نکتہ آپ کو بتا رہا ہوں وہ یہ کہ ان اکیس سورتوں میں درمیانی سورت کونسی ہوگی! ظاہر ہے کہ گیارہویں۔ دس اِدھر دس اُدھر۔ تو گیارہویں سورت سورۂ یٰسٓ ہے جس کو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قلب القرآن قرار دیا۔ سورۂ یٰسٓ قرآن کا دل ہے۔ اس لئے کہ اصل موضوع تو توحید ہی ہے۔ ہمارا دین، دینِ توحید ہے۔ رسالت بھی اسی لئے ہے کہ توحید کی طرف دنیا کو دعوت دے۔ آخرت کا انذار بھی اسی لئے ہے کہ لوگ شرک سے باز آجائیں، اس سے کُلِّیۃً اجتناب کریں اور توحید کو اختیار کریں اور صرف اسی کا التزام کریں۔ اور سورۂ یٰسٓ میں یہ تینوں مضامین نہایت جامعیت، بلاغت اور ایجاز و اعجاز کے ساتھ آجاتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ دین کی اصل، اس کی جڑ، اس کی بنیاد ہے ہی توحید ــــ اس کی رُو سے سب سے بڑی گمراہی شرک ہے۔ شرک وہ گناہ ہے جس کے بارے میں سورۂ نساء میں دو مرتبہ فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ــــ لہٰذا یہ جو اکیس سورتیں ہیں، جو توحید کے موضوع پر نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ ویسے تو

یۃ الکرسی ہے سورۂ بقرہ میں جس کو آں حضورؐ نے قرآن کی تمام آیات کی سرتاج قرار دیا ——
خری پارے میں سورۂ اخلاص ہے جس کو نبی اکرمؐ نے ایک ثلث قرآن کے مساوی قرار دیا۔
ں کا مطلب یہ ہے کہ توحید کے موضوع پر آیتوں میں سے جامع ترین آیت، آیۃ الکرسی ہے اور
سورتوں میں سے جامع ترین سورت سورۂ اخلاص ہے۔ لیکن گروپوں کی حیثیت سے ان اکیس
سورتوں کو توحید کے موضوع پر مرکزیت حاصل ہے۔

توحید کے دو حصّے

اب میں ایک اہم بات آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ توحید
کے دو حصّے ہیں۔ یہ بات شاید کچھ حضرات کے لئے اچنبھے والی ہو
لیکن جب آپ میری گفتگو سنیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ یہ بات انوکھی معلوم نہیں ہوگی۔ اس بات
کی بنیادیں اور اس کے اجزاء آپ حضرات کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ میں ان کو ایک ترتیب سے
آپ کے تحت الشعور سے شعور کی سطح پر لانے کی کوشش کروں گا —— یہ بات کہ توحید کے دو حصّے
ہیں، میں اپنی طرف سے عرض نہیں کر رہا بلکہ یہ بات امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے
حوالے سے پیش کر رہا ہوں۔ انہوں نے یہ تقسیم کی ہے اور یہ بڑی پیاری تقسیم ہے ——

توحیدِ علمی

امام مرحومؒ کے قول کا حاصل یہ ہے کہ ایک توحید ہے علمی توحید، توحید فی المعرفۃ یا
توحید فی العقیدہ —— اللہ کو ایک جاننا، ایک ماننا، اللہ کی ذات میں کسی کو
شریک نہ ٹھہرانا۔ اللہ کی صفات میں کسی کو ساجھی قرار نہ دینا۔ کسی کو اس تعؐ کا ضد یا ند، یا ہم پلّہ،
ہمسر یا مدّ مقابل نہ بنانا۔ پس توحید فی الذات اور توحید فی الصّفات ان دونوں کو جمع کریں
گے تو یہ ہوگی علمی توحید —— معرفتِ الٰہی کی توحید۔ یہ توحید ہوگی عقیدے کی توحید —— دوسری
توحید ہے توحید عملی۔ اس کو امام ابن تیمیہؒ نے توحید فی الطلب کا جامع عنوان دیا ہے ——
وہ یہ ہے کہ انسان فی الواقع ایک ہی اللہ کا بندہ بن جائے۔ اس کی بندگی اور پرستش صرف
اللہ ہی کے لئے خالص ہو جائے جو الاحد ہے —— ایک خطبہ نبویؐ میں الفاظ آتے ہیں :
فَوَحِّدُوا اللّٰہَ فَاِنَّ التوحید راس الطاعات۔ اب یہاں 'وَحِّدُوْا' صیغہ امر ہے اور
یہ باب ہے باب تفعیل ——

باب تفعیل کا خاصّہ

توحید اسی باب تفعیل سے ہے اور تفعیل کا خاصّہ یہ ہے کہ کوئی
کام بڑی محنت سے، بڑے اہتمام سے، بڑے استقلال و
استقرار سے کیا جاتا ہے تو اس کے لئے لفظ باب تفعیل سے آتا ہے —— جیسے اعلام

کے معنی ہیں کسی کو کچھ بتا دینا اور تعلیم کے معنی ہیں کسی کو کچھ سکھانا۔ اب بتانے اور سکھانے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آپ ایک دفعہ بتا کر فارغ ہوئے۔ اب کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، اس کے پلے کچھ پڑے یا نہ پڑے۔ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ابلاغ کے معنی بھی صرف پہنچانے کے ہیں لیکن تبلیغ کے معنی ہوں گے محنت سے، اہتمام سے، دلیل سے تدریج سے کوئی بات کسی تک پہنچانا۔ اب تعلیم اور تبلیغ میں آپ کو سخت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ Hammer کرنا پڑتا ہے ایک بات کو ذہن میں اتارنا پڑے گا۔ کوئی بات ایک مرتبہ سمجھ میں نہیں آئی تو اسے بار بار سمجھانا پڑے گا۔ اس کی توضیح کرنی ہوگی، تبیین کرنی پڑے گی۔ بڑی محنت سے کسی کے ذہن میں کوئی بات آسانی اور بٹھانی ہوگی۔ یہ تعلیم ہے۔ اسی طرح محنت، لگن کے ساتھ دعوت پہنچانے سے تبلیغ کا حق ادا ہوگا۔ امید ہے کہ اس وضاحت سے اعلام اور ابلاغ اور تعلیم و تبلیغ میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے وہ آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا۔

باب تفعیل کے خاصے کے متعلق ایک مثال اور پیش کرتا ہوں۔

انزال اور تنزیل کا فرق

انزال کے معنی ہیں دفعتاً اتارنا۔ لیکن جب یہ لفظ باب تفعیل میں تنزیل بنے گا تو اس کے معنی ہوں گے تھوڑا تھوڑا کر کے ٹھہر ٹھہر کر تدریج سے اتارنا ——— پورا قرآن مجید رمضان میں لیل القدر میں دفعتاً واحدہ لوح محفوظ سے اتر کر سمائے دنیا تک آگیا — یہ ہے انزال — اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۝ اور اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ اِنَّا کُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ ۝ اب سمائے دنیا سے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نازل ہوا تو وہ بیک وقت نازل نہیں ہوا۔ بلکہ تنزیلاً نازل ہوا۔ الٓمّٓ ۝ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ اور وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِیۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ سورہ یٰسٓ میں فرمایا: تَنۡزِیۡلَ الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ ۝ سورۂ زمر شروع ہوتی ہے اسی تنزیل کے ذکر سے: تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ۝ سمائے دنیا تک قرآن کے نزول کی شان ہے شانِ انزالی اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر نزولِ قرآن کی شان ہے شانِ تنزیلی۔ تھوڑا تھوڑا ضرورت کے مطابق حالات و واقعات کی مناسبت سے قرآن کا نزول یہ تنزیلی ہے۔

توحید کیا ہے

باب تفعیل کے خاصے کو پیشِ نظر رکھ کر اب آپ لفظ توحید پر غور کیجئے۔ جس کا مطلب و مفہوم ہوگا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو ذات و صفات کے لحاظ سے ۱- ۲۷۱۰۰۱۲۹۱ آ کو اندازہ ہوگا کہ توحید اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ دائمی

اللہ کو ایک جان اور ایک مان کر استقلال و استقرار کے ساتھ اس کی پیہم اطاعت کے لئے
منت کرتے رہنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس موقع پر مجھے یہ شعر یاد آ رہا ہے کہ ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا   مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

پس توحید کے لئے بڑی محنت و مشقت کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک لکیر کھینچی
ہُی تھی۔ پالا بنا ہوا تھا اور کوئی اِدھر سے اُدھر آ گیا تو اسے توحید کی دولت مل گئی۔ اس طرح اسلام
مل سکتا ہے یعنی ایک شخص قانونی طور پر مسلمانوں میں شامل ہو جائے گا۔ لیکن یہ کہ وہ موحد بن گیا
یہ خام خیالی ہے۔ اسی لئے نبی اکرمؐ خطبے میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ : وَحِّدُوا اللّٰہَ ـــــ اللہ
کی توحید واقعتاً اختیار کرو جیسے کہ اس کا حق ہے۔

توحیدِ عملی

زندگی کے عملی میدان میں توحید اختیار کرنا توحیدِ علمی سے بھی زیادہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس توحید فی العمل کو امام ابن تیمیہؒ توحید فی الطلب کہتے ہیں۔ یہ بڑی کٹھن وادی ہے
اسے عبور کرنا بڑے عزم اور حوصلہ کا کام ہے ـــــ یہ توحید عملی درحقیقت پانچویں گروپ میں سورہ
سبا سے لے کر سورۂ احقاف تک کی تیرہ مکی سورتوں میں سے چار سورتوں کا مرکزی موضوع ہے۔
یہ چار سورتیں ہیں۔ سورۂ زُمَر۔ سورۂ مومنؔ۔ سورۂ حٰمٓ السجدہ اور سورۂ شوریٰؔ ـــــ ان چار سورتوں
میں تدریجاً توحید عملی کا مضمون سامنے آتا ہے ـــــ میں بھی اس میں یہ تدریج رکھونگا کہ میں پہلے
سورۂ زمر کی چند آیات آپ کو سناؤں گا۔ پھر سورۂ مومن کی چند آیات۔ پھر سورۂ حٰمٓ السجدہ کی
ایک آیت کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں گا۔ پھر ہم مطالعہ کریں گے سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ کا
جس کی تلاوت سے آج کی اس گفتگو کا آغاز ہوا ہے۔

توحیدِ عملی کے مدارج

پہلا درجہ: انفرادی توحید

توحیدِ عملی کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان کے انفرادی عمل میں توحید آ جائے۔ انفرادی شخصیت فی الواقع توحید کے رنگ میں رنگی جائے۔ واقعتاً انسان اللہ کا بندہ بن جائے جیسا کہ اس کا بندہ بننے کا حق ہے۔ پھر اس کی بندگی میں کسی اور
کی بندگی کا شائبہ نہ ہو۔ وہ بندگی خالص بندگی ہو اللہ کی ـــــ اللہ کے سوا کسی اور کا کہنا مانا
جا رہا ہو۔ اللہ کے حکم کے خلاف کسی اور کا حکم بجا لایا جا رہا ہو تو یہ توحید نہیں ہے۔ بغاوت اور
سرکشی ہے۔ طغیان ہے۔ لیکن اگر اللہ کے حکم کے تابع کسی کا حکم مانا جائے اس سے آزاد ہو کر
نہ مانا جائے تو یہ توحید ہے۔ اس طرح اگر انسان اپنی انفرادی زندگی میں حقیقی طور پر اللہ کا بندہ بن

جائے تو یہ ہے انفرادی توحید عمل کے اعتبار سے ــــ اسی انفرادی عملی توحید کا ایک اہم پہلو ہے "توحید فی الدعا" ــــ اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ الدعاء مخ العبادۃ ــــ "دعا ہی عبادت کا جوہر ہے" ایک موقع پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا: الدعاء ھو العبادۃ ــــ "دعا ہی اصل عبادت ہے" مطلب یہ ہے کہ انسان حاجت روائی، دستگیری اور اعانت و امداد کے لئے غیب میں سے جس کو پکارتا ہے، وہ ہی اس کا اصل معبود ہے۔ پس توحید فی العمل اور توحید فی الدعا یہ انفرادی توحید کا پہلا درجہ ہے۔

دوسرا درجہ: اجتماعی توحید اب انفرادی سطح اور انفرادی وجود سے جو توحید نکلے گی وہ لازماً متعدی ہوگی جیسا کہ میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ مثال دی ہے کہ اگر کسی جگہ آگ ہے اور اس میں حرارت ہے تو یہ حرارت آگ میں محدود نہیں رہتی بلکہ وہ ماحول میں سرایت کرتی ہے ــــ یا آپ آگ پر کوئی چیز رکھیں گے یا اس میں ڈالیں گے تو وہ چیز بھی گرم ہو جائے گی۔ اسی طرح برف میں ٹھنڈک ہے تو وہ برف تک محدود نہیں رہے گی وہ بھی ماحول میں سرایت کرے گی۔ آپ برف کو پانی میں ڈالیں گے تو برف پانی کو بھی ٹھنڈا کرے گی، یہ قانون طبعی ہے ــــ اسی مثال سے سمجھئے کہ اگر کسی فرد کے اندر توحید فی الواقع جاگزیں قائم ہو جائے اور وہ راسخ ہو، پختہ ہو، مضبوط ہو اور حقیقی ہو، دھوکے اور فریب کی نہ ہو یعنی بظاہر تو بڑے موحد ہونے کے مدعی ہوں اور بباطن یعنی دل میں صنم خانے آباد ہوں تو اس حقیقی اور خالص توحید کو لازماً ماحول میں سرایت کرنا چاہیئے ــــ

باطن کے اصنام بُرا نہ مانیئے گا۔ میں اب چند تلخ حقائق آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں ہمارے معاشرے میں کچھ لوگ ہیں جو موحد خالص ہونے کے دعویدار ہیں۔ وہ قبر پرستی اور اس نوع کے مختلف مشرکانہ و مبتدعانہ افعال کی توبڑی مذمت کرتے ہیں۔ بات بالکل صحیح ہے۔ ان کی مذمت ہونی چاہیئے، یہ کام قطعی غلط نہیں ہے۔ بلکہ مفید ہے لیکن ان میں سے اکثر حضرات کا خیال اور دھیان اس طرف نہیں جاتا کہ دولت پرستی بھی شرک ہے۔ اگر حصولِ دولت میں حلال و حرام کی تمیز ختم ہوگئی تو معلوم ہوا کہ دولت معبود ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تعس عبد الدینار وعبد الدرھم۔ "ہلاک ہو جائے دینار اور درہم کا بندہ"۔ اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہوگا کہ "ہلاک ہوگیا دینار و درہم کا بندہ"۔ غور کیجئے دینار و درہم کا بندہ کون ہے ــــ! آں حضورؐ نے لفظ کونسا استعمال فرمایا، عبد۔ اس لئے

ر جس شخص کے دل میں دولت کی محبت اتنی ہے کہ وہ اسی تگ و دو میں لگا رہتا ہے کہ دولت
ہر حال میں اس کے پاس آنی چاہیئے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ حلال سے آئے یا
حرام سے آئے۔ جائز سے آئے یا ناجائز سے آئے۔ صحیح سے آئے یا غلط سے آئے ــــ دولت
کی اس محبت کا مطلب یہ ہے کہ اس کا معبود دولت ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ ہندوؤں نے
دولت کی ایک دیوی تراشی ہوئی ہے جس کا نام انہوں نے لکشمی دیوی رکھ چھوڑا ہے۔ اس
کی وہ پوجا کس لئے کرتے ہیں؟ اس لئے کہ ان کو دولت ملے۔ درحقیقت وہ اس مورتی کے
پردے میں دولت کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم نے صرف یہ کیا ہے کہ "لکشمی دیوی" کی کوئی مورتی
ہمارے سامنے نہیں ہے۔ لیکن لکشمی دیوی کی پوجا سے ہندوؤں کا جو مقصود ہے وہی ہمارا بھی
ہو جائے گا اگر ہم حرام و حلال اور شریعت کی قیود و شرائط سے بے نیاز ہو کر دولت
کے حصول میں لگ جائیں اس طور پر یہ دولت معبود کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ دولت کے
ایسے پجاریوں اور غلاموں کے لئے ہی آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تعس عبد
الدینار وعبد الدرھم۔

اسی طریقے سے دیکھیئے۔ ایک طرف اللہ کا حکم ہوتا ہے اور دوسری طرف نفس کی چاہت
بڑی سادہ سی مثال ہے۔ صبح سویرے کا وقت ہے، آنکھ بھی کھل گئی ہے۔ اذان بھی سنی ہے۔ یہ
پکار کس کی ہے؟ مؤذن کی زبان سے ضرور نکلی ہے لیکن پکار اس کی نہیں ہے۔ پکار تو اللہ کی
ہے کہ ــــ حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح اور الصلوٰۃ خیر من النوم۔
ــــ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے جو اس بات کی تفہیم میں ممد ہو سکتا ہے۔

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی، دلِ محفل کا تڑپا بھی گئی

تو زبان بے شک مؤذن کی ہے۔ لیکن صدا تو اللہ کی ہے۔ ایک طرف اللہ کی پکار
ہے۔ دوسری طرف نفس کہتا ہے، "سوئے ــ ابھی آرام کرو" ــ یہ ہے وہ کشمکش جس سے ہم
میں سے اکثر لوگوں کا سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ہمیں معلوم نہ ہو۔ ہم میں سے
اکثر کو اس کا تجربہ ہوا ہے۔ اب اگر مستقل یہ کیفیت ہو کہ اس وقت ہم نے اللہ کی پکار پر تو اپنے
کان بند کئے اور نفس کی خواہش اور مرضی پر لبیک کہا تو ہمارا معبود کون ہوا؟ اللہ یا ہمارا نفس؟
معلوم ہوا کہ دلوں میں صنم خانہ آباد ہے۔ اسی بات سے متنبہ کیا گیا سورۂ فرقان کی آیت ۴۳

ہیں: اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ هَوٰاهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝ "اے نبی! آپ نے اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے۔ کیا آپ ایسے شخص کی نگرانی کر سکیں گے؟" غور کیجئے! یہاں لفظ اِلٰہ آیا ہے جو ہمارے کلمۂ شہادت کے جزوِ اوّل میں آتا ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ "کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے" پس معلوم ہوا کہ معبود دولت بھی بنتی ہے۔ معبود نفس بھی بنتا ہے۔ دل کے اس صنم خانے کو ختم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ پتھر کے تراشیدہ باہر کے بتوں کی نفی اور مذمت آسان ہے۔ قبر پرستی کی نفی اور مذمت بھی آسان ہے۔ اور یہ نفی و مذمت بالکل صحیح ہے۔ یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ یہ توحید کا لازمہ ہے۔ اس میں غلطی کا رائی برابر بھی کوئی شائبہ نہیں۔ لیکن دل کے اندر جو صنم خانے ہیں۔ حُبِّ مال ہے، حُبِّ جاہ ہے۔ حُبِّ اقتدار ہے۔ نفس کی مرضیات و خواہشات اور چاہتوں کی بجا آوری ہے ——— یہ تمام چیزیں توحید کی ضد ہیں۔ اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے بھی علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے کہ:

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے!
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

اندر کے اس صنم خانے کو بھی دیکھنا ہوگا۔ دل کے سنگھاسن پر براجمان ان بتوں کو بھی توڑنا ہوگا جب واقعتاً یہ ہو جائے اور ساتھ ہی باہر کے بُت بھی ختم کر دیئے جائیں تو ایسے شخص کو بجا طور پر سچا موحد کہلائے جانے کا استحقاق ہوگا۔ حقیقی موحد بننے کے لئے لازم ہوگا کہ اللہ کی محبت بھی تمام محبتوں پر غالب آ گئی ہو۔ دوسری تمام محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہو گئی ہوں۔ اللہ کی اطاعت تمام اطاعتوں سے ورا ہو گئی ہو اور دوسری تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تحت آ گئی ہوں۔ اگر اس طور سے کوئی موحد بن گیا ہو تو یہ ہو نہیں سکتا کہ ایسے موحد کے وجود سے توحید دوسروں تک نہ پہنچے۔ یہ توحید لازماً متعدّی ہوگی۔ فرد سے دوسروں تک توحید پہنچنے کا یہ معاملہ ہے دعوت و تبلیغ ——— لوگوں کو بھی توحید کی طرف بلانا اور پکارنا ——— لوگوں تک بھی توحید کی دعوت کو پہنچانا ———

اجتماعی توحید | اس طور پر جب انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف قدم بڑھے گا تو اس کا اگلا مرحلہ ہوگا پورے ماحول پر اللہ کی توحید کا سکہ رواں کر دینا ——— پورے

عاشرہ موحد بن جائے۔ پوری قوم موحد بن جائے۔ پورا ملک موحد بن جائے۔ ملک کا نظام
حد بن جائے۔ ملک کا دستور توحید کا مظہر بن جائے ــــ یہ مرحلہ سر کر لیا تو اس کا نام ہے،
مت دین ــــ

حاصل کلام | میری اس وقت تک کی گفتگو کا حاصل یہ نکلا کہ خالص انفرادی سطح پر توحید فی العبادت اور توحید فی الدعا ــ پھر اجتماعی سطح پر دعوت و تبلیغ ــــ پھر ان دونوں
حل سے اگلا قدم اقامت دین ــــ یہ ہے توحید کا بل۔ ان اصطلاحات کو آپ اچھی طرح ذہن
بین کر لیں گے تو اب میری اگلی گفتگو آپ بخوبی سمجھ سکیں گے جس کے تانے بانے اور تمہید
لے طور پر میں نے یہ باتیں آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔

میں نے آپ کو اکیس سورتیں گنوائی تھیں جن کا مرکزی مضمون و موضوع توحید ہے
ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا تھا کہ ان میں چار سورتیں۔ سورۂ زمر، سورۂ مومن، سورۂ حٰم السجدہ
ور سورۂ شوریٰ ہیں، ان میں اس عملی توحید کا تدریجاً بیان ہے جو بطور تانا بانا اور تمہید میں
آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں۔ بطور مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ان چار سورتوں کی ایک لڑی ہے۔
جس میں توحید عملی کے موتی تدریجاً پروئے ہوئے ہیں اور یہ مضمون انفرادی توحید سے عملی
توحید کی طرف تدریجاً بڑھتا چلا جاتا ہے ــــ

انفرادی توحید | سورۂ زمر میں انفرادی توحید کا بیان ہے اور اس قدر شد و مد کے ساتھ اتنی تاکید کے ساتھ اور اتنے اہتمام کے ساتھ ہے کہ میرے حقیر مطالعہ کے
بموجب پورے قرآن مجید میں اس اسلوب کے ساتھ یہ بیان اور کہیں نہیں ملے گا۔ البتہ اس
موقع پر اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ توحید کے موضوع پر جامع ترین سورت تو سورۂ
اخلاص ہی ہے جو بڑی مختصر سورت ہے۔ اس سورت کا مقام و مرتبہ یہ ہے کہ یہ توحید کا عطر
ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہے۔ اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے
اس سورۂ مبارکہ کو ثلث قرآن قرار فرمایا ہے یہ اس اعتبار سے کہ بنیادی ایمانیات تین ہیں:۔
(۱) ایمان باللہ یعنی توحید (۲) ایمان بالرسالت اور (۳) ایمان بالمعاد یا ایمان بالآخرۃ
اس میں سے توحید کا بیان اس چھوٹی سی سورت میں انتہائی جامعیت کے ساتھ آگیا ہے۔
مزید یہ کہ اس سورت کا اسلوب خبریہ و بیانیہ ہے جبکہ انشائیہ انداز اور شد و مد، انتہائی
تاکید اور نہایت ہی پُر جلال اسلوب سے توحید عملی کا تدریجاً بیان ان چار سورتوں میں ہوا ہے۔
جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

اصولی بات میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ توحید کے دو درجے ہیں۔ ایک توحید فی العلم یا توحید فی المعرفت یا توحید فی العقیدہ۔ دوسرا توحید فی العمل یا توحید فی الطلب پھر اس توحید عملی کے بھی تین مرحلے ہیں۔ پہلا توحید فی العبادت اور توحید فی الدعا۔ دوسرا اسی توحید کی بندگانِ خدا کو دعوت، اسی کی تبلیغ اور تیسرا اسی توحید پر مبنی نظامِ حیات کا قیام وقرار یعنی اقامت دین۔

توحید فی العبادہ ان میں سے توحید فی العبادہ کے متعلق جان لیجئے کہ تمام انبیاء و رسل کی دعوت کا یہ نکتۂ آغاز رہا ہے۔ اس بات کے لئے قرآن مجید کی بے شمار اور متعدد آیات پیش کی جاسکتی ہیں لیکن محدود وقت کے پیش نظر صرف چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا ــــ سورۂ نحل میں فرمایا:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ

"ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجدیا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (غیر اللہ) کی بندگی سے بچو۔"

سورۂ انبیاء میں فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝

"(اے نبیؐ) ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ لہٰذا صرف میری ہی بندگی کرو۔"

آخری پارے کی سورۂ بیّنہ میں واضح کیا گیا:

وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ

"اور ان کو حکم نہیں ہوا تھا مگر اس بات کا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے یکسو ہو کر۔"

اس آیت میں رسولوں اور ان کی امتوں کے لئے یہ ضابطہ بیان ہوا کہ سب کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ سب کے سب اللہ کی عبادت اسی کے لئے اپنی اطاعت خالص کرتے ہوئے بجا لائیں۔ یہ نہ ہو کہ بظاہر بندگی اللہ کی ہو لیکن اطاعت اللہ کے دشمنوں کی ہو رہی ہو۔ سازباز اللہ کے باغیوں سے ہو رہی ہو۔ ان کے احکام کی تعمیل بھی ہو رہی ہو، ان کے سامنے بھی سر جھکائے جا رہے ہوں اور دعویٰ اللہ کی عبادت کا ہو۔

زیہ عمل ہرگز مطلوب نہیں ہے بلکہ طرزِ عمل درکار ہے مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ والا۔ پھر آخر میں
نفاءَ کا اضافہ کیا گیا ہے یعنی یک سو ہو کر —— پچ رنگی طرزِ عمل مطلوب نہیں ہے۔ اللہ کو دو رنگی
ناپسند نہیں ہے۔ پچ رنگی تو بہت دور کی بات ہے۔ یہاں تو ایک رنگ چاہیے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَ
نْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔ انسان یک رنگ ہو جائے۔ یک سو ہو جائے وہ اپنے پورے وجود
ہری و باطنی کے ساتھ فی الواقع اللہ کا بندہ بن جائے۔ اللہ ہی کی بندگی میں ہمہ تن رنگ جائے۔

اب میں چاہوں گا کہ سورۃ بیّنہ کی اسی آیت کے مضمون کو سورۃ زمر میں آپ کو دکھاؤں تاکہ
پ کو معلوم ہو جائے کہ یہ مضمون وہاں کس شدومد اور کس تاکید کے ساتھ مختلف اسالیب سے بیان
ہوا ہے۔ اور چونکہ اس میں انفرادی سطح پر توحیدِ عملی کا بیان ہے۔ لہٰذا آپ دیکھیں گے کہ وہاں صیغہ
واحد کا آئے گا۔ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوگا لیکن اس اسلوب میں تخاطب امت سے بھی
ہے اور ان سے بھی جنہوں نے ابھی دعوت کو قبول نہیں کیا ہے۔ گویا تا قیام قیامت پوری نوعِ انسانی
اس کی مخاطب ہے۔

توحید فی العبادہ —— انفرادی عملی توحید

سورۃ زمر کا آغاز ہوتا ہے:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ —— بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ○ "اس کتاب کا نزول ہے اللہ کی طرف سے
جو العزیز (نہایت زبردست) ہے۔ جو الحکیم (بے حد و حساب حکمت والا) ہے"۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ
اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ۔ "ہم نے نازل کی ہے (اے نبیؐ) آپ کی طرف یہ کتاب یعنی قرآن مجید حق
کے ساتھ"۔ یہ فیصلہ کن کتاب ہے (اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ) اب اسی سے اقوامِ عالم کی قسمتیں طے
گی جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے جس کے راوی ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ اِنَّ اللّٰهَ
يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ اَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ (مسلم) "اللہ تعالیٰ اس کتاب کی وجہ سے
ان قوموں کو عزت و سربلندی عطا فرمائے گا جو اس کا اعتصام کریں گی اور دوسروں کو جو اس کو پس پشت
ڈال دیں گی ذلت و نکبت سے دوچار فرمائے گا"۔ یعنی قوموں کے عروج و زوال کی بنیاد یہ کتاب بنے
گی —— اب آگے وہ مضمون آ رہا ہے جس کے لئے میں نے یہ پوری تمہید باندھی: فَاعْبُدِ اللّٰهَ
مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ○ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔ یہ اسلوب اور مضمون آپ کو قرآن مجید میں

کسی اور جگہ نہیں ملے گا ۔۔۔ ان آیات کی ترجمانی یوں ہوگی کہ "(اے محمدؐ) پس بندگی کرو اللہ
کی ۔ پوجو اللہ کو ۔ پرستش کرو اللہ کی ۔ اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے اور جان لو
اللہ کے لئے تو خالص دین (اطاعت) ہے" اللہ کے لئے ملاوٹ والا دین نہیں ہے ۔ ملاوٹ والا
دین منہ پہ دے مارا جائے گا ۔ اللہ کے ہاں مقبول ہوگا دین خالص ۔ ان آیات میں دو اہم الفاظ
عبادت اور دین آگئے ۔ اب یہاں توقف کر کے پہلے مجھے عبادت کے مفہوم اور معنی کے متعلق کچھ
عرض کرنا ہوگا ۔ 'دین' کے لفظ کی تشریح و توضیح آگے بیان ہوگی ۔

دینی اصطلاح میں عبادت کا مفہوم

میں کئی مرتبہ عبادت کا مفہوم بیان کر چکا ہوں ۔ پچھلی مرتبہ جب یہاں آنا ہوا تھا تو آپ کو یاد ہوگا
کہ میں نے فرائضِ دینی کی جو تین سطحیں بیان کی تھیں تو ان میں پہلی سطح چار اصطلاحات کے حوالے
سے بیان کی تھیں: اسلام ۔ اطاعت ۔ تقویٰ اور عبادت ۔۔۔ میں نے عرض کیا تھا کہ
لفظ عبادت کے صحیح مفہوم کو مکمل کرنے کے لئے فارسی کے دو الفاظ جمع کر لیجئے تو بات پوری
طرح سمجھ میں آجائے گی ۔ وہ دو الفاظ ہیں بندگی اور پرستش ۔ محض لفظ بندگی سے قرآن مجید
کی اصطلاح عبادت کا مفہوم مکمل نہیں ہوگا اور محض پرستش سے بھی نہیں ہوگا ۔ دونوں کو جمع کریں
گے تو عبادت کا مفہوم ادا ہو جائے گا ۔ بندگی میں اصل زور ہے اطاعت کی طرف ۔ غلامی اور
محکومی بندگی کہلائے گی ۔ غلام اور محکوم تو اپنے آقا اور حاکم کا مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے ۔ اس کے
دل کی کیفیت کچھ بھی ہو ۔ دل میں وہ چاہے اپنے آقا اور حاکم کو گالیاں دے رہا ہو ۔ چاہے وہ دل
میں شدید باغیانہ جذبات رکھتا ہو ۔ لہٰذا بندگی میں دل کی کیفیت سے بحث نہیں ہوتی ۔ غلام اور محکوم کا
کام ہے اپنے آقا اور حاکم کی اطاعت ۔ تو بندگی یا اطاعت عبادت کا جزوِ اعظم ضرور ہے لیکن عبادت کی روح
پرستش ہے ۔ لفظ پرستش میں اصل زور محبت پر ہے ۔ پرستار کس کو کہتے ہیں ۔ ! وطن پرست کون ہے ۔ !
جس کے دل میں ہر چیز کی محبت سے بالاتر محبت وطن کی ہوگی وہ وطن پرست کہلائے گا ۔ زر پرست کون
ہے ۔ ؟ جس کے دل میں دولت کی محبت دوسری محبتوں پر غالب ہو جائے وہ ہے زر پرست ۔ اسی
طرح آپ کہتے ہیں شہوت پرست ، شہرت پرست ۔ ایسے لوگوں کو اپنی اس پرستش یعنی محبت کی تسکین چاہئے
چاہے وہ صحیح طریق سے ہو چاہے غلط طور پر ہو ۔ نفس پرست اسے کہا جاتا ہے جو اس کا غلام بن جائے
اور اس کی خواہش اور تقاضے کو جائز و ناجائز کی تمیز کے بغیر پورا کرنے کے لئے تگ و دو کر رہا ہو ۔
پس جو چیز بھی انسان کو انتہائی عزیز ہوگی اس کا وہ پرستار ہے ۔۔۔ لہٰذا جب بندگی اور پرستش اللہ

ہی کے لئے جمع ہو جائیں یعنی ہمہ تن، ہمہ وقت، ہمہ جہت اللہ ہی کی اطاعت اور اللہ ہی کی محبت سے انسان سرشار ہو جائے تو عبادت رب کا حق ادا ہوگا ــ بندگی کے متعلق میں نے آپ کو پچھلی مرتبہ شیخ سعدیؒ کا شعر سنایا تھا ۔

زندگی آمد برائے بندگی   زندگی بے بندگی شرمندگی

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ اس آیت کی بڑی حد تک اس شعر میں ترجمانی کی گئی ہے ــ اسی طریقہ سے قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کے بیسویں رکوع میں اللہ کی محبت والا مضمون آتا ہے۔ بہت پیارا مضمون ہے۔ اسے لوح دل پہ کندہ کر لیجئے فرمایا: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔ جو لوگ (حقیقی) صاحب ایمان ہیں، ان کی سب سے زیادہ محبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اقدس سے ہوتی ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو حقیقی ایمان سے محرومی ہے۔ پھر تو محض ایک عقیدہ ہے۔ ایک موروثی Dogma ہے ایک National Creed ہے۔ حالانکہ مطلوب یہ ہے کہ محبت اس درجہ کو پہنچ جائے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ حقیقی اہل ایمان کے لئے محبوب ترین اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہوتی ہے ۔

تو جب یہ حُب اور وہ اطاعت اللہ کے لئے مل جائیں تو یہ ہوگی اللہ کی کامل بندگی ــ اور یہی درحقیقت عبادت کی وہ تعریف ہے جو امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ نے کی ہے ۔ بلکہ حافظ ابن قیمؒ کے الفاظ اپنے استاذ سے بھی زیادہ پیارے ہیں ۔ ان کا قول ہے کہ: اَلْعِبَادَةُ تَجْمَعُ اَصْلَيْنِ غَايَةَ الْحُبِّ مَعَ غَايَةِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ ۔ عبادت دو بنیادوں کے جمع ہونے سے بنتی ہے۔ پہلی یہ کہ اللہ کے ساتھ انتہائی درجہ کی محبت ہو۔ دوسری یہ کہ انسان انتہائی درجہ میں اس ہی کے سامنے اپنے آپ کو پست کر دے اور بچھا دے، ان دونوں کے اجتماع کا نام ہے عبادت [1]

---

[1] حال ہی میں العلامہ الشیخ عبدالرحمٰن بن حسن آل الشیخؒ کی ایک تصنیف راقم کی نظر سے گزری۔ الشیخ مرحوم نے عبادت کی تعریف وتوضیح ان الفاظ میں کی ہے: والعبادة اسم يجمع كمال الحب لله ونهايته وكمال الذل لله ونهايته فالحب الخلي عن ذل والذل الخلي عن حب لا يكون عبادة وانما العبادة ما يجمع كمال الامرين: عبادت ایسا اسم ہے جس میں کمال محبت اور اس کی انتہا اور اللہ کے سامنے کمال ذلت اور اس کی انتہا پنہاں ہے۔ پس وہ محبت جس میں ذلت نہ ہو اور وہ ذلت جس میں محبت نہ ہو عبادت کہلانے کی مستحق نہیں بلکہ (باقی اگلے صفحہ پر)

خالص اطاعت مطلوب ہے

فرمایا: فَاعْبُدِ اللّٰهَ - اب دیکھئے کہ یہ بات اپنی جگہ پر مکمل ہے۔ لیکن انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بڑا جھگڑالو ہے۔ کچھ نہ کچھ منطق فطری طور پر ہر انسان کو ملی ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ سورہ کہف کی آیت نمبر ۵۴ کے آخری حصہ میں ہے کہ: وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝ "اور انسان بڑا جھگڑالو ہے" پس وہ طرح طرح سے اپنے لئے بہانے بناتا اور حیلے تراشتا ہے تو قرآن حکیم یہاں ہر نوع کے بہانے اور حیلے کا سدباب فرماتا ہے۔ حضورؐ کو مخاطب کر کے اصل دعوت تو حضورؐ کی امت اجابت دعوت کو دینی ہے۔ فَاعْبُدِ اللّٰهَ میں بات پوری آگئی تھی لیکن فرمایا: فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ "پس (اے نبی) عبادت کیجئے اللہ کی اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے"۔ میں نے یہاں 'دین' کا ترجمہ اطاعت کیا ہے۔ لفظ دین کی جب شرح بیان کروں گا، تو آپ کے سامنے یہ بات آجائے گی کہ اس لفظ میں اطاعت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ یہاں یہ جان لیجئے کہ تقریباً تمام ہی متقدمین و متاخرین قرآن مجید کے مفسرین نے یہاں دین کا مفہوم اطاعت ہی بیان کیا ہے --- یہاں اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ اللہ کے لئے اطاعت خالص ہو۔ یہ نہ ہو کہ کچھ اطاعت کسی کی اور کچھ اطاعت کسی کی۔ کچھ اللہ کی اور کچھ نفس کی۔ کچھ اللہ کی اور کچھ ایسے حاکموں کی جو اللہ کے احکام سے آزاد ہو کر کوئی حکم دے رہے ہوں۔ تو ایسی اطاعت خلوص و اخلاص کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ ملاوٹ والی اطاعت ہے۔ ملاوٹ والی کوئی شے ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہوتی تو غور کا مقام ہے کہ ملاوٹ والی اطاعت اللہ عزوجل کے لئے کیسے قابل قبول ہو گی۔ جو خالق و مالک ارض و سماوات ہے۔ جو الغنی ہے، جو الحمید ہے، جو الغیور ہے۔ اسی تاکید کے لئے فَاعْبُدِ اللّٰهَ کے فوراً بعد فرمایا: مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ "پس اللہ کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کرو"۔ --- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں نہایت جامع اور مختصر الفاظ میں ہمیں ایک فارمولا عطا فرما دیا ہے کہ ہم اس کو معاملات پر منطبق (Apply) کر سکتے ہیں --- آں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔ "مخلوق میں سے کسی کی (ایسے معاملہ میں) اطاعت نہیں ہے جس سے خالق کی نافرمانی ہوتی ہو"

(تسلسل) عبادت وہ ہے جس میں یہ دونوں چیزیں جمع ہوں" --- یہ بات پیش نظر رہے کہ عربی میں ذلت کے معنی پست ہو جانے اور بچھ جانے کے ہیں۔ (مرتب)

اللہ کا ایک حکم ہے۔ والدین اس کے خلاف کوئی حکم دیں تو اطاعت نہیں ہوگی۔ اللہ کے حکم کے خلاف کوئی حکم اساتذہ دیں، اطاعت نہیں ہوگی۔ اللہ کے حکم کے خلاف اقتدارِ وقت حکم دے، اطاعت نہیں ہوگی ــــ اس لئے کہ فرمانِ نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام ہے کہ لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ خالق ــ ہاں اللہ کے احکام کے دائرے کے اندر اندر والدین کی بھی اطاعت ہوگی، اساتذہ کی بھی اور حکام وقت کی بھی۔ تمدنی زندگی میں اطاعت کا وسیع دائرہ ہے۔ جس میں اولی الامر بھی شامل ہیں، والدین بھی، اساتذہ بھی، مرشدین بھی، بیوی کے لئے اس کا شوہر بھی۔ ان کے علاوہ بہت سے اور بھی ــــ ان سب کی مباحات میں اطاعت ہوگی ــــ اللہ کے حکم سے آزاد ہو کر اطاعت کی نہیں اور شرک لازم آیا نہیں ــــ یہ ہے ان آیاتِ کریمہ وعظیمہ کا اصل درس، حقیقی سبق، اصل دعوت اور واقعی انتباہ۔ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ٥ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ "سنتے ہو! اچھی طرح سن لو، آگاہ ہو جاؤ" ــــ قرآن مجید میں جہاں بھی "الا" آیا ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے اس کا بڑا پیارا ترجمہ کیا ہے۔ یہ آج سے تقریباً دو سو سال پہلے کا انداز ہے۔ وہ ترجمہ کرتے ہیں "سنتا ہے!" مجھے تو یہ انداز بہت اچھا لگتا ہے ــ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ "سن رکھو، آگاہ ہو جاؤ۔ اللہ ہی کیلئے ہے خالص دین یعنی مخلصانہ اطاعت" اگر کسی اور کی اطاعت اللہ کی اطاعت سے آزاد ہو کر کی گئی اسی طرح اگر اللہ کی محبت سے آزاد ہو کر کسی اور کی محبت کی آلائش شامل ہو گئی تو معاملہ تلپٹ ہو گیا، دگرگوں ہو گیا۔ اس میں ملاوٹ آگئی۔ ہاں اللہ کی محبت کے تابع اولاد سے محبت کرو کوئی حرج نہیں، وطن سے محبت کرو، کوئی حرج نہیں۔ اپنے گھر سے محبت کرو، کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہ کہ اللہ کی محبت کے برابر اپنے دل کے سنگھاسن پر کسی کی محبت کو بٹھا لیا تو یہ شرک ہے ــــ اور اگر کسی کی محبت اللہ کی محبت سے بڑھ گئی تو شرک سے بھی اوپر کا کوئی لفظ ایجاد کرنا پڑے گا۔ چونکہ ایسا لفظ ہماری لغت میں ہے نہیں ــــ برابر کا معاملہ ہو گیا تو یہ شرک ہو جائے گا ــ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ "آگاہ ہو جاؤ اللہ کے لئے تو دین خالص ہے" بے میل اطاعت۔ ملاوٹ سے پاک اطاعت ــــ یہاں ایک بات اور جان لیجئے کہ اطاعت کے ساتھ میں نے محبت کا ذکر کس بنیاد پر کیا ہے ــ! اس کی پہلی بنیاد تو لفظ عبادت ہے۔ جس کی میں تشریح کر چکا کہ اس میں تذلل کے ساتھ غایت درجہ کی دلی محبت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ دوسری بنیاد لفظ اطاعت ہے جو طوع سے بنتا ہے۔ ہم اردو میں بھی طوعاً و کرہاً بولتے ہیں۔ طوع کے معنی دل کی آمادگی کے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ دل کی آمادگی مستلزم ہے محبت کو ــ

توحید فی العبادہ کی اہمیت میں نے عرض کیا تھا کہ سورۂ زمر میں انفرادی توحید کا مضمون بڑی شدّ ومد اور بڑی شان سے آیا ہے۔ ابتدائی تین آیات کا میں قدرے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکا۔ اب چند آیات مزید پیش کرتا ہوں۔ ان کی مختصر تشریح پر اکتفا کروں گا۔ اب میں سورہ زمر کی آیات نمبر گیارہ، بارہ، تیرہ اور چودہ آپ کو سناتا ہوں۔ اپنی توجہات کو پوری طرح میری گفتگو کی طرف مرتکز کیجئے!

فرمایا: قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ۝ دیکھئے کسی اہم بات کو Emphasise کرنے کے لئے، اس پر زور دینے کے لئے، اس کو خوب اچھی طرح ذہنوں میں اتارنے کے لئے مختلف اسالیب سے اس کی تکرار اور اس کا اعادہ بھی ایک مؤثر ذریعہ بنتا ہے۔ وہی بات جو سورہ کے آغاز میں آئی تھی، اب دوہرا کر آ رہی ہے۔ وہاں اللہ تبارک و تعالیٰ نے حکم دیا تھا اور وہاں انشائیہ انداز تھا کہ: فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ۝ یہاں نبی اکرمؐ سے فرمایا جا رہا ہے کہ قُلْ اے نبیؐ کہہ دیجئے: اِنِّیْٓ اُمِرْتُ "مجھے حکم ہوا ہے" اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ۝ "کہ میں اللہ کی بندگی اور پرستش کروں اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے" وہی بات یہاں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوائی جا رہی ہے۔ کہ مجھے حکم ہے کہ میں اسی کی عبادت کروں۔ اپنی اطاعت کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ یہاں کس حکم کا ذکر ہے۔ اسی کا جو فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ کی صورت میں ابتدائے سورت میں آگیا تھا۔

اگلی آیت نمبر ۱۲ میں اسی مضمون کے مفہوم و مقصود کو مزید واضح فرما دیا: وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ "اور مجھے تو حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے فرماں بردار میں خود بنوں۔ اللہ کے احکام پر سب سے پہلے عمل پیرا میں خود ہوں۔ اللہ کی نواہی سے رک جانے والا سب سے پہلے میں خود بنوں۔ اللہ کے اوامر کو دل و جان سے بجا لانے والا سب سے پہلے میں خود بنوں"۔

آگے چلئے اور دیکھئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو معصوم ہیں کس طرح خشیتِ الٰہی اور اللہ کی نافرمانی پر خوفِ آخرت کا اظہار کرایا جا رہا ہے! فرمایا: قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ "(اے نبی!) یہ بھی کہہ دیجئے کہ اگر میں اللہ کے حکم کی نافرمانی کروں تو مجھے یوم عظیم (آخرت) کے عذاب کا خوف اور اندیشہ ہے"۔ غور کیجئے

کہ کون سے احکام کی نافرمانی سے خوف کا یہاں اظہار ہو رہا ہے — یہاں دو ہی تو حکم آئے ہیں پہلا یہ کہ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ۔ دوسرا یہ کہ اَنۡ اَكُوۡنَ اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ۔ لیکن ان دونوں احکام نے پوری زندگی کے فکر و نظر اور رویہ و عمل کا احاطہ کر لیا ہے۔ اب اگر عملی زندگی میں اس توحیدِ عملی کی ذرا سی بھی خلاف ورزی ہو جائے تو اس پر محبوبِ رب العلمین صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا جا رہا ہے: اِنِّىۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّىۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ○ اس میں دراصل اہلِ ایمان کے لئے انتہائی مؤثر انتباہ ہے۔

آگے پھر سنیے۔ فرمایا قُلِ اللّٰهَ اَعۡبُدُ مُخۡلِصًا لَّهٗ دِيۡنِىۡ ○ "اے نبی! (پھر) کہہ دیجئے کہ میں تو اللہ ہی کی بندگی اور پرستش کرتا ہوں اس کے لئے اپنے دین اور اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے":

اس آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؐ کے اس عزمِ مصمم اور ثبات و استقلال کا اعلان کرا دیا گیا کہ میری لائی ہوئی دعوتِ توحید کو کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔ میں تو ہر حال میں اللہ ہی کی مخلصانہ بندگی اور پرستش کرتا ہوں اور کروں گا اور میری اطاعت اسی کے لئے مخصوص ہے اور رہے گی۔

تاکیدِ مزید: آگے چلئے۔ اسی سورۂ مبارکہ کے ساتویں رکوع کی تین آیات نمبر ۶۴، ۶۵ اور ۶۶ سنئے۔ یہاں یہ مضمون پورے نقطۂ عروج (Climax) کو پہنچ گیا ہے۔ اس سے زیادہ تاکیدی اسلوب آپ کو کہیں نہیں ملے گا — فرمایا: قُلۡ اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ تَاۡمُرُوۡٓنِّىۡۤ اَعۡبُدُ اَيُّهَا الۡجٰهِلُوۡنَ ○ "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے کہ اے جاہلو! اے نادانو! اے حرص و ہوا کے بندو! کیا تم مجھے یہ حکم اور مشورہ دے رہے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں؟" دیکھئے وہاں جو کشمکش چل رہی تھی اور وہ کشمکش توحید اور شرک کے مابین ہی تھی۔ اس کشمکش میں نبی اکرمؐ پر دباؤ پڑ رہا ہے۔ سارے وفود جناب ابو طالب کے پاس کس لئے آتے تھے! ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ محمد سے کہہ دو (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ ہم انہیں اپنا بادشاہ بنانے کیلئے بھی تیار ہیں۔ اگر انہیں دولت درکار ہے تو اس کے انبار بھی ان کے قدموں پر لگا دیتے ہیں۔ جہاں چاہیں، جس خاندان میں چاہیں بس اشارہ کر دیں ہم آپؐ کا وہاں نکاح کرانے کے لئے بھی آمادہ ہیں۔ لیکن آپؐ اپنی اس دعوت سے باز آ جائیں — یہاں قریش کے ان بڑے بڑے سرداروں سے خطاب کیا جا رہا ہے اور خطاب بھی نہایت تیکھا اور تند

انداز میں ـــــ اَیُّھَا الْجٰھِلُوْنَ ـــــ یہ بڑا ثقیل انداز ہے جو قرآن نے براہِ راست خطاب کا اختیار کیا ہے۔ عام طور پر خطاب کا یہ انداز نہیں ہے۔ لیکن یہ موقع ہی ایسا ہے کہ انداز تخاطب دو ٹوک ہو اور اس میں سختی ہو ـــــ ویسے لفظ جاہل کے عربی میں وہ معنی نہیں ہیں جو اردو میں ہیں۔ اردو میں جاہل اَن پڑھ کو کہتے ہیں۔ عربی میں جذباتی اور خواہشات سے مغلوب کو جاہل کہتے ہیں۔ اس کے مقابلہ کا لفظ ہے حلیم۔ حلیم اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیتا ہے، غور و فکر کرتا ہے، تحمل کرتا ہے، بردباری اختیار کرتا ہے اور عقل کی رہنمائی میں کوئی فیصلہ کرتا ہے۔ اور جاہل وہ ہے جو اپنے جذبات اور خواہشات کے تابع ہو کر اقدام کرتا ہے ـــــ اسی لئے میں نے ترجمہ کیا ہے "اے حرص و ہوا کے بندو! یعنی اے خواہشات کے غلامو!" ـــــ کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ توقع رکھتے ہو اور ان کو یہ حکم اور مشورہ دینے کی جسارت کرتے ہو کہ آپؐ اللہ کے سوا کسی اور کو پوجیں یا اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی اور پرستش کریں ـــــ معاذ اللہ

توحید فی العبادہ کی تاکید کی انتہا

آگے چلئے۔ فرمایا: وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ "اور اے نبیؐ! یقیناً آپؐ کی طرف بھی وحی کی جا چکی ہے اور ان کی طرف بھی جو آپؐ سے پہلے گزر چکے ہیں اگر بالفرض آپؐ نے بھی شرک کیا تو جان لیجئے کہ لازماً آپؐ کے سارے اعمال حبط اور اکارت ہو جائیں گے اور آپؐ بھی لازماً خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے"۔ یہ بڑا چونکا دینے والا انداز ہے۔ اس کا ترجمہ کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے۔ اس میں شرک پر جس غیظ و غضب کا اظہار ہے۔ وہ اس بات سے ظاہر ہے کہ انتہائی تاکید کے دو اسلوب یہاں موجود ہیں یَحْبَطَنَّ اور تَکُوْنَنَّ سے پہلے لام تاکید اور پھر مزید تاکید کے لئے آخر میں نونِ مشدد لایا گیا ہے ـــــ میں نے ترجمہ میں یہ احتیاط کی ہے کہ لفظ 'بالفرض' کا اضافہ کر دیا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک کے ظہور کا کسی نوع کا کوئی امکان سرے سے نہیں ہے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ لیکن بات میں زور پیدا کرنے اور قرآن مجید کی دعوتِ توحید کے مخاطبینِ اوّل اور تاقیامِ قیامت آنے والی نوعِ انسانی کو شرک کی شناعت سے متنبہ کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار کیا گیا کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپؐ بھی شرک کریں، تو آپؐ کا مقام اور آپؐ کا مرتبہ، آپؐ کے محبوب رب العٰلمین ہونے کی حیثیت بھی آپؐ کو اللہ کی پکڑ سے

نہیں بچا سکے گی اور آپ کے تمام اعمال لازماً حبط اور آپ بھی لازماً زمرۂ خاسرین میں سے ہو جائیں گے ـــــ یہ ہے توحید فی العمل کا تقاضا اور اس کی اہمیت ـــــ قرآن مجید کے ایسے مقامات کے مطالعہ ہی سے شاید علامہ اقبال پر یہ شعر الہام ہوا تھا کہ ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم ــــ کہ دانم مشکلاتِ لاالٰہ را!

آگے چلئے۔ فرمایا: بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۞ "للہٰذا اے نبی! آپ بس اللہ ہی کی بندگی کیجئے اور اللہ کے شکر گزار بندوں میں سے بن جائیے" ـــــ پھر عبادت کی تاکید، اللہ کی بندگی اور پرستش کا مؤکد حکم بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ ـــــ یہ بات اچھی طرح جان لیجئے کہ یہاں عبادت سے مراد محض ارکانِ اسلام یعنی شہادتین، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج نہیں ہیں بلکہ پوری زندگی اللہ کی بندگی میں بسر کرنا مراد ہے۔ اسی رویّہ کی ایک تعبیر شکر ہے۔

خلاصۂ کلام میں نے سورۂ زمر کے تین مقامات سے تین، پھر چار اور پھر تین آیات یعنی کُل دس آیات کی قدرے تفصیل آپ کے سامنے بیان کی ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ انفرادی سطح پر عملی توحید کیا ہے! وہ ہے اللہ کا بندہ بن جانا ہمہ تن، ہمہ وقت، ہمہ جہت ـــــ اطاعت اسی کے لئے خالص ہو۔ دوسروں کی اطاعت کی جائے تو اس کی اطاعت کے تابع ہو کر کی جائے اس سے آزاد ہو کر نہ کی جائے۔ بنیادی اور حقیقی اشد ترین محبت اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہو ـــــ دوسروں سے محبت اس سے نیچی نیچی اور ورے ورے اور اس محبت کی محبت کے تابع ہو۔ سب سے اونچی محبت اللہ ہی کی ہو ـــــ انفرادی توحید کی یہ شرط لازم ہے کہ عبادت، اطاعت اور محبت اسی کے لئے خالص کر لی جائے ـــــ اگر اس میں کہیں ملاوٹ آ گئی تو وہ توحید نہیں ہے۔ یہ ملاوٹ اور یہ کھوٹ شرک کے درجے میں آئے گی۔ اور ہمارے اگلے پچھلے تمام اعمال کے حبط اور اکارت بننے کا ذریعہ بن جائے گی۔

(جاری ہے)

عَنِ الْحَارِثِ الْاَشْعَرِيِّ، قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

"اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ

بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"

(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد و جامع ترمذی)

(۴)

شرکِ اور اقسامِ شرک

شرک فی الصفات (۲)

از: ڈاکٹر اسرار احمد

سلسلے کے لئے "میثاق" نومبر، دسمبر ۸۳ء اور جنوری ۸۴ء ملاحظہ فرمائیے (جمیل الرحمٰن مرتب)

اب شرک فی الصفات کے ذیل میں ایک اہم بحث آرہی ہے۔ اس زیرِ گفتگو شرک کے دو پہلو (SHADES) ہیں۔ پہلا انتہائی قدیم اور عالمگیر نوعیت کا حامل ہے دوسرا بھی اگرچہ قدیم ہے لیکن دورِ جدید میں وہ بہت نمایاں ہے۔ البتہ اس کا حقیقی ادراک و شعور کافی مشکل ہے لیکن اس کی ہمہ گیری کا بھی یہ عالم ہے کہ خود مسلمانوں کی عظیم اکثریت بھی جو زبانی اور اعتقادی طور پر تو توحید کی قائل و مُقر ہے، غیر شعوری طور پر اس شرک میں مبتلا نظر آتی ہے آگے جا کر میں جب اس اجمال کو واضح کروں گا تو مجھے یقین ہے کہ آپ بھی خود کو میری اس رائے کی تائید پر مجبور پائیں گے۔

قدیم شرک اس شرک کی جس کو میں نے انتہائی قدیم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے بہت انواع ہیں۔ ان سب کا ذکر میرے لئے ممکن نہیں، میں اس وقت اس شرک کی چند اقسام کا اختصار کے ساتھ ذکر کروں گا۔ بقیہ انواع کے شرک دراصل ان ہی اقسام کی فروعات ہیں۔ یہ اقسام ہیں۔ مظاہر پرستی اور اصنام پرستی

مظاہر پرستی یہ دراصل شرک فی الصفات ہی ہے جس نے دنیا میں مظاہر پرستی کی شکل اختیار کی۔ مظاہر پرستی یہ ہے کہ اس کائنات

میں نفع و ضرر پہنچانے والی جو چیزیں بالفعل موجود ہیں، انسان نے ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے، شیطان نے جس فریب کے ساتھ اس ضلالت اور گمراہی میں مبتلا کر رکھا ہے، اس کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انسان نے سورج کو کیوں پوجا! اس لئے کہ اس کے مشاہدے اور تجربے میں یہ بات ہے کہ سورج میں حرارت ہے، تمازت ہے روشنی ہے۔ اس کی حرارت و تمازت سے فصلیں پکتی ہیں۔ اسی سے پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے جس سے بادل وجود میں آتے ہیں جو بارش کا سبب بنتے ہیں۔ اسی کی روشنی سے دن روشن ہوتا ہے جو انسان کی معاش اور کاروبارِ دنیا چلانے کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے پس شیطان نے انسان کو یہ بھلا دیا کہ اگر سورج دیوتا ناراض ہو جائے اور اپنی حرارت و تمازت اور روشنی کی بساط لپیٹ کر چلتا بنے تو یہ سارا نظام مختل و معطل ہو کر رہ جائے لہٰذا سورج دیوتا کو راضی رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس کی پوجا پاٹ کرنے اور اس کے آگے ڈنڈوٹ کرنے کے لئے اس کے بڑے بڑے مندر اور ہیکل تعمیر ہوئے اور اس کی پرستش شروع کر دی گئی۔ چالاک و ہوشیار لوگوں نے سورج دیوتا کے نام پر نذر و نیاز کی صورت میں دولت سمیٹنے اور انتہائی عیش و آرام سے چین کی بنسری بجانے کے لئے اس باطل عقیدے کی تائید میں خوب فلسفیانہ موشگافیاں کیں۔ چنانچہ خالص مشرکانہ سوسائٹی میں سورج کی پرستش کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بطور مثال مصر اور ہندوستان کو سامنے رکھیئے۔ اسلام سے قبل مصر میں سب سے بڑا دیوتا "رع" مانا جاتا تھا، جس کے معنی قدیم مصری زبان میں سورج کے ہیں اور مصر کے حکمران کو اسی مناسبت سے "فرعون" کہا جاتا تھا یعنی اس کو "رع" کا دنیوی اوتار تسلیم کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اس جدید عہد میں بھی سورج کی پوجا جاری ہے اور زمانہ قدیم میں سورج بنسی خاندان اسی سورج دیوتا سے اپنا رشتہ قائم کر کے خدائی حقوق (DEVINE RIGHTS) کا مدعی ہوتا تھا۔

یہ تو میں نے ایک مثال دی ہے ورنہ مظاہر پرستی کی اتنی انواع و اقسام ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ جب کوئی قوم توحید کی صراط مستقیم سے ہٹتی ہے تو نہ معلوم کتنی پگڈنڈیوں پر سرگرداں ہوتی ہے۔ کواکب پرستی، چاند پرستی، آگ پرستی، بادشاہ

عمل پرستی آج بھی ہو رہی ہے جب کہ انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نئے افق چھو رہا ہے انسانوں کی بہت بڑی تعداد اس گمراہی میں آج بھی مبتلا ہے۔

اصنام پرستی

جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا کہ جب انسان توحید کی سیدھی راہ سے ہٹتا ہے تو در بدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے چنانچہ مظاہر پرستی پر ہی اکتفا نہیں رہا بلکہ دنیا کی ہر نفع و ضرر پہنچانے والی چیز لائق پرستش قرار پائی۔ اس مشرکانہ نظام میں، انسان پرستی، گوسالہ پرستی، شجر و حجر پرستی، بحر و بر پرستی، زر پرستی، علم پرستی، چرند و پرند پرستی اور نہ جانے کتنی پرستیاں اور پرستشیں شامل ہیں۔ پستی کی حد یہ ہے کہ انسان کے اعضائے تناسل کی بھی پوجا کی گئی جو آج تک جاری ہے۔ اس مشرکانہ نظام میں نہ دیوتاؤں کا شمار ہے نہ دیویوں کا۔ پھر ان کے لئے پیکر محسوس کے طور پر اور علامت کے لئے بُت تراشے گئے، مندر اور ہیکل بنائے گئے اور پوجا پاٹ کا سمجھ میں نہ آنے والا ایک طلسم تیار کر لیا گیا — انسان کو اس قسم کی انتہائی گھٹیا ضلالت میں مبتلا رکھنے میں دو قسم کے شاطر گروہوں نے ہمیشہ بھرپور حصہ لیا ہے۔ ایک طبقہ میں پنڈت، پروہت، پادری، پوپ اور پریسٹ شامل ہیں اور دوسرے میں راجہ مہاراجہ اور بادشاہ۔ ان دونوں طبقوں کے گٹھ جوڑ پر اگر موقع ہوا تو ان شاء اللہ شرک فی الحقوق کی بحث میں قدرے تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ اس مشرکانہ مذہبی تصور میں مختلف عناصر کو جوڑ کر دیوتاؤں اور دیویوں کی ایک کونسل یا کابینہ متصور کی جاتی ہے جس میں خدا کی حیثیت مہادیو کی قرار پاتی ہے اور جس طرح ایک پارلیمانی یا صدارتی یا بادشاہی نظام میں سلطنت کے مختلف شعبے بالفعل اس شعبے کے وزیر یا مشیر کے سپرد ہوتے ہیں اور صدر یا بادشاہ محض ایک آئینی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح اس مشرکانہ نظریہ کے مطابق گویا خدائے عرش نشین یا مہادیو نے بھی زمین کا انتظام و انصرام بالکلیہ مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کے سپرد کر رکھا ہے اور اس نے اپنا تعلق صرف آسمان کے معاملات سے رکھا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر دنیوی بادشاہوں اور صدور کا تعلق اپنے اپنے محل سراؤں اور ایوانوں سے ہوتا ہے۔

اس موقع پر انتہائی دکھ اور رنج کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ گو مسلمان کھلی

اصنام پرستی سے تو محفوظ ہیں، لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ دین سے لاعلمی اور توحید کے حقیقی مقتضیات سے ناواقفیت کے باعث اور اہل ہوس وجاہ اور شاطر قسم کے لوگوں کے فریب میں آکر آج توحید کے دعویدار مسلمانوں کی عظیم اکثریت اولیا ومشائخ پرستی قبر پرستی اور نہ جانے اس نوع کی کتنی پرستشوں میں مبتلا ہے۔ حالانکہ نوعیت کے لحاظ سے اصنام پرستی اور ان پرستشوں میں صرف ظاہر کا فرق ہے۔ اپنی اصل اور روح کے اعتبار سے یہ تمام پرستیاں اور پرستشیں شرک ہیں — اس بات کا میں نے اس موقع پر اس لئے ذکر کیا کہ ہم جان لیں کہ شرک کس کس روپ اور بھیس، اور کن کن جاموں اور لباسوں میں ہمارے معاشرے میں موجود ہے اور جیسا کہ میں آغاز میں بطور تمہید عرض کر چکا کہ ہماری نگاہ اتنی تیز ہو جانی چاہیئے کہ ہم اس شعر کے مصداق شرک کو ہر صورت میں پہچان لیں کہ ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش — من اندازِ قدرت را می شناسم

قرآن حکیم کی تردید

اس نوع کے شرک کی قرآن حکیم میں مختلف اسالیب سے تردید کی گئی ہے، میں وقت کی کمی کے پیشِ نظر چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جبکہ میرا اندازہ ہے کہ قرآن مجید کا تقریباً ایک تہائی حصہ ان اقسام وانواع کے شرک کی تردید اور توحید خالص کے اثبات پر مشتمل ہے۔

مظاہر پرستی کی تردید میں فرمایا :۔

وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۚ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۷)

"اور اس کی نشانیوں میں رات اور دن، سورج اور چاند ہیں۔ نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو۔ سجدہ کرو اس خدا کو جس نے ان کو پیدا کیا ہے، اگر تم اسی کی بندگی کرتے ہو۔"

زمین وآسمان کے انتظام کے بٹوارے کے تصور کی نفی میں فرمایا۔

وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ

"وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا ہے

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (زخرف ۸۴) اور وہی علیم و حکیم ہے۔"

پوری کائنات صرف اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہے، اس حقیقت نفس الامری کے اظہار و اعلان سے سورہ الملک کا آغاز فرمایا۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ	نہایت بزرگ و برتر ہے وہ ذات
الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ	جس کے قبضۂ قدرت میں (کائنات)
شَیْءٍ قَدِیْرُ ۝ (آیت ۱)	کی حکومت و سلطنت ہے۔

زندگی کا یہ نظام اور کارخانہ جن اسباب و علل سے رواں دواں ہے، اس کا حقیقی مسبب الاسباب صرف اللہ ہے اور اس وسیع و عریض کائنات کی ہر چیز میں سلیم الفطرت اور غور و تدبر کرنے والے کے لئے وجود باری تعالیٰ اور توحید کی ایک عظیم نشانی موجود ہے اور یہ چیزیں انسان کی چاکری کے لئے تخلیق کی گئی ہیں جیسا کہ سورہ الجاثیہ میں فرمایا۔

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	"فی الحقیقت آسمانوں اور زمین
لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَ	میں ایمان لانے والوں کے لئے
فِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا یَبُثُّ	(بے شمار) نشانیاں ہیں اور تمہاری
مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ	تخلیق میں اور ان حیوانات
یُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ	(کی پیدائش) میں جن کو اللہ (زمین میں)
الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ	پھیلا رہا ہے بڑی نشانیاں ہیں ان
اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ	کے لئے جو یقین کرنے والے ہیں اور
مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ	رات اور دن کے فرق و اختلاف
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	میں اور اس رزق میں (مراد بارش)
وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ	جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا
لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝	ہے پھر اس کے ذریعہ مردہ زمین کو
(آیات ۳-۵)	جلاتا ہے اور ہواؤں کی گردش میں

بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔"

اسی سورۃ مبارکہ میں آگے فرمایا:-

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ	"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے
الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ	لئے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے
بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ	حکم سے اس میں کشتیاں چلیں
فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور
وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ	شکر گزار بنو۔ اس نے اپنے
وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ	پاس سے تمام چیزوں کو جو زمین
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ	اور آسمان میں ہیں تمہارے لئے
لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝	مسخر کر دیا ہے۔ بلاشبہ اس
(آیات ۱۲-۱۳)	عمل میں بڑی نشانیاں ہیں ان

لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔"

سورہ بقرہ میں اس مضمون کو ایک دوسرے اسلوب سے یوں بیان کیا گیا کہ

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج	"تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے، اس
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ	رحمان اور رحیم کے سوا کوئی اور
الرَّحِیْمُ ۝ اِنَّ فِیْ خَلْقِ	خدا نہیں ہے (اس حقیقت کو
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	پہنچاننے کے لئے نشانی کے طور پر
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ	عقل سے کام لینے والوں کے
وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ	لئے آسمانوں اور زمین کی تخلیق
فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ	میں، رات اور دن کے پیہم ایک
وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ	دوسرے کے پیچھے آنے میں،
السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ	ان کشتیوں میں جو انسان کے
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	نفع کی چیزیں لئے ہوئے سمندروں
وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ	اور دریاؤں میں چلتی پھرتی ہیں
وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ	بارش کے اس پانی میں جسے اللہ
الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ	اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے
وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ	ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی

تَعْقِلُوْنَ (۱۶۴-۱۶۳) بخشتا ہے اور زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور ان بادلوں میں جو آسمانوں اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں بیشمار نشانیاں ہیں جن کی بدولت انسان اللہ کی توحید کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔"

اصنام پرستی کی تردید میں ایک انتہائی بلیغ تمثیل اور نہایت موثر اسلوب سے سورہ میں فرمایا کہ :۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ط اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ط وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ط ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ط مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۷۳-۷۴)	"لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے توجہ سے سنو۔ جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ سب مل کر ایک مکھی جیسی حقیر چیز بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ مکھی ان سے ان کی نذر کردہ سامان خوراک میں سے، کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس چیز کو واپس چھین بھی نہیں سکتے۔ کیا ہی بے چارا، بے بس اور کمزور ہے طالب بھی اور مطلوب بھی! ان

لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی جیسا کہ اس کو پہچاننے کا حق ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ قوت و اختیار اور عزت والا تو اللہ ہی ہے۔"

تاثیر پرستی

مظاہر پرستی کی کوکھ سے ایک مزید مشرکانہ تصور نے جنم لیا جس میں انسان ہمیشہ سے مبتلا رہا ہے اور آج کے دور کا انسان بھی مبتلا ہے اور ٹھوکر پر ٹھوکر کھا رہا ہے۔ وہ مشرکانہ تصور یہ ہے کہ انسان اس عظیم مغالطہ میں گرفتار ہے کہ اشیاء میں جو تاثیر و خاصیت ہے، وہ اس کی ذاتی ہے سورج کی حرارت و تمازت اور روشنی اس کی ذاتی ہے۔ سورج، چاند، زمین اور

نظام شمسی کی کشش ان کی ذاتی ہیں، ہوا کی صفات اس کی ذاتی ہیں، پانی کے اندر
جو اوصاف، تاثیر اور منافع ہیں، وہ سب اس کے ذاتی ہیں۔ آگ میں جلانے اور
روشنی دینے کی خاصیت اس کی ذاتی ہے، علی ہذا القیاس — چونکہ اشیاء کی یہی
صفات، اوصاف، خاصیتیں اور تاثیریں ہی وہ چیزیں ہیں، جن کی بدولت انسان
کے وجود کا تسلسل قائم ہے۔ حیات دنیوی کا سارا کارخانہ ان ہی کی بدولت چل رہا
ہے — لہذا مذہبی مشرکانہ نقطۂ نظر نے اشیاء کی ان صفات اور تاثیرات کو ان اشیاء
کے تقدس کو ماننے ان کی تعظیم کرنے ان کی پوجا پاٹ کرنے ان کے آگے عجز و عاجزی کرنے
اور نذر نیاز پیش کرنے کے طلسم میں انسان کو مبتلا کیا اور ان مقاصد کے لئے اس سے
بڑے بڑے مندر، ہیکل اور معبد تعمیر کرائے۔ اور انسان کو، جو اشرف المخلوقات ہے،
جس کی چاکری کے لئے اللہ تعالےٰ نے یہ اسباب و وسائل اور سامان زیست تخلیق فرمایا
ہے، ان چیزوں کے سامنے اپنی پیشانی رگڑنے کی انتہائی پستی میں گرا کر اس کا مقام شرف
چھین لیا اور اس کو ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ٥ کی وعید کا سزاوار ٹھیرا دیا۔

قرآنی تردید

اس نوع کے شرک کی قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف اسالیب
سے تردید کی گئی ہے اور اس کے لئے وہ استدلال اختیار کیا گیا ہے
جو دل نشین اور فطرت سلیم کو پوری طرح مطمئن کرتا ہے۔ میں اس موقع پر صرف سورۃ
الواقعہ کی چند آیات پیش کرتا ہوں۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ٥
ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ
نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ٥ لَوْ نَشَآءُ
لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ
تَفَكَّهُوْنَ ٥ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ٥
بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ٥ اَفَرَءَيْتُمُ
الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ٥
ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ
اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ٥

(کبھی تم نے سوچا، یہ بیج جو تم بوتے
ہو، ان سے کھیتیاں تم اگاتے ہو
یا ان کو اگانے والے ہم ہیں؟ ہم
چاہیں تو ان کھیتیوں کو بھس بنا کر
رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں
بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر الٹی چٹی پڑ
گئی بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے
ہوئے ہیں۔ کبھی تم نے (آنکھیں
کھول کر) دیکھا، یہ پانی جو تم پیتے

لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۝ ۷۲

ہوا سے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اسے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟ کبھی تم نے خیال
کیا یہ آگ جو تم سلگاتے ہو اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟"

(جاری ہے)

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید: ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا
جس میں بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے
بڑے فوائد بھی ہیں۔

خسرانِ اُخروی سے بچنے کا راستہ

محمد اقبال واحد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡعَصۡرِۙ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍۙ
اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ

زمانہ (زمان غیر مسلسل اس پر) شاہد ہے - کہ انسان (بحیثیت مجموعی ہر عہد وادوار میں) خسران (زیان نقصان اور گھاٹے کا شکار رہا ہے)، مگر وہ لوگ اس (خسران زیان سے مستثنیٰ رہے ہیں، رہیں گے دنیا و آخرت میں) جو ایمان لائے عمل صالح انجام دیتے رہے - حق کی تاکید کرتے رہے - (اور مسلسل حق گوئی اور اقامت حق ان کو جن مصائب کا شکار بنایا گیا) اس میں صابر رہے - (مفہوم)

قبل اس کے کہ میں سورۃ والعصر کی تفسیر تفہیم اور مطالب عرض کروں اس سورت کی اہمیت عرض کر دینا چاہتا ہوں یہ قرآن حکیم کی وہ سورت ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے - کہ جس طرح سے ایک کوزے میں دریا بند کر دینے کا محاورہ ہے - اس سورت نے تمام مطالب قرآنی کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے - اور یہی وہ بنا تھی جس بنا پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے - کہ اگر پورے قرآن مجید میں سے تنہا یہی ایک سورت نازل ہوتی تو انسانوں کی دنیاوی و اخروی فلاح و بہبود کیلئے کافی وافی ہوتی - اور یہی بات تھی کہ جب دور سعادت میں راہ چلتے دو آدمی ملتے - تو سلام و کلام سے پہلے اس سورت کا آپس میں تبادلہ کرتے تھے - ان تمہیدی کلمات بعد سورت کے مطالب معروض ہیں -

جب کوئی آدمی غیر معمولی لیکن اہم بات کرتا ہے۔ تو اپنی بات کو یقین کی حد تک پہنچانے کے لئے اپنی بات کی صداقت کے لئے کسی عظیم اور بالاتر شئے کو اپنی بات کے ساتھ بطور قسم کے استعمال کرتا ہے۔ یعنی وہ اپنی بات کی سچائی کے لئے قادر کی ذات کو یا اُس کے کلام کو جو اہل ایمان کے نزدیک ایک طے شدہ اور مسلمہ نشانِ عظمت ہیں۔ بطور شہادت کے پیش کرتا ہے۔ یہ قسم کی حقیقت ہے۔ لیکن جب خالق کائنات اپنے کلام کی ابتدا کسی شے کی قسم سے کرتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے کہ وہ اُس شے کی عظمت کو اپنے کلام کی ابتداء میں بطور شاہد کے پیش کر رہا ہے ایسی کہ وہ خود عظمت کے اُس مقام پر ہے۔ جس سے آگے کسی عظمت کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ قرآن مجید میں باری تعالٰے نے اپنے کلام کی ابتداء میں بے شمار چیزوں کو بطور قسم کے استعمال کیا ہے۔ تو اُس سے کیا مراد ہے۔ اُس سے مراد یہ ہے۔ کہ خالق کائنات جن چیزوں کو جس شے کو بطور قسم کے اپنے کلام کی ابتدا میں لاتا ہے اُن کی حقیقت ایسے وقائع تاریخی یا واقعات تاریخی یا علامات تکوینی یا نشانات ارضی وسماوی کی ہوتی ہے۔ جو انسان کی چشم سر کے سامنے موجود ہونے کی بنا پر ایسے مضبوط استدلال کے حامل ہوتے ہیں۔ کہ اگر وہ وقائع تاریخی ہیں۔ تو انسان کی گذشتہ تاریخ کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ جن کی سچائی پر شک وشبہ کرنا اُس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اور اگر وہ مظاہر کائنات کے شواہد و نظائر ہوتے ہیں۔ تو اُن کی تکذیب کرنا معمولی عقل کے بس کا کام بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ ہر روز انہیں دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے۔ معلوم کرتا ہے۔ یہ سُورۃ والعصر جو قرآن عزیز کے تیسویں پارے میں مکی دور کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کی ابتدا زمانے کی قسم سے ہوتی ہے۔ یعنی زمانہ زمانے کی تاریخ زمانے کا اتار چڑھاؤ زمانے کا زیر و بم زمانے کی کامیابی و ناکامی زمانے کی ابتدا و انتہا آغاز و انجام نتائج و عواقب عمل اور ردعمل اس بات پر شاہد ہے۔ کہ جو بات آئندہ کہی جا رہی ہے۔ وہ ٹھیک اُسی طرح سے دُرست اور قطعی ہے۔ جس طرح سے زمانے کی تاریخ اور تاریخ کے نتائج احوال قطعی ہیں۔ جنہیں تم بھی تسلیم کرتے ہو۔ عصر کے معنی بھی زمانے کے ہیں۔ اور دہر کے معنی بھی زمانے کے ہیں۔ اور حسن اتفاق ہے کہ یہ دونوں نام قرآن مجید کی دو سورتوں کے نام ہیں۔ گو دہر اور عصر کے معنی زمانے کے ہیں۔ لیکن دونوں

ں اہل علم کے نزدیک ایک غیر معمولی درجہ کی اہمیت کا لغوی فرق موجود ہے۔ اور وہ
یہ ہے۔ کہ دہر اُس زمانے کو کہتے ہیں۔ جو زمانہ غیر مسلسل ہو۔ جیسے سکندر و دارا کا زمانہ
قیصر و کسریٰ کا زمانہ قوم صالح قوم عاد، قوم ثمود، بنی اسرائیل خلافت راشدہ عباسیوں
امویوں، عثمانیوں، ترکوں راجوں مہاراجوں مغلوں تاتاریوں کے زمانے لیکن علیحدہ علیحدہ
زمانے بر خلاف ازیں عصر اس زمانے کو کہتے ہیں۔ جو زمان مسلسل پر مشتمل ہو۔ یعنی
وہ زمانہ جو یوم الست کو شروع ہوا تھا۔ اور انسانوں کے خلود فی النار یا خلود فی الجنت
تک کے زمانے کو محیط ہے۔ گویا وہ تمام زمانے غیر مسلسل جو اوپر عرض ہوئے، اس
زمان غیر مسلسل کے نیچے ہیں۔ تو یہ زمان غیر مسلسل شاہد ہے۔ کہ اُن تمام زمانوں
میں جو انسانی تاریخ میں بٹے ہوتے ہیں۔ اُن سب کے درمیان ایک قدر مشترک ہے
(سوائے ایک زمانے کے جو عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ پر مشتمل
ہے۔) اور وہ قدر مشترک یہ ہے۔ کہ انسان بحیثیت انسان انسان بحیثیت جنس
انسان انفرادی طور پر بھی اور مجموعی طور پر بھی عمومی طور پر بھی اور خصوصی طور پر بھی ہر زمانے
زیاں خسراں آفت مصیبت پریشانی (زیان جان و مال و آبرو) کا شکار رہا ہو۔
ظاہر ہے۔ کہ تاریخ انسانی کے یہ خسران اور زیاں زلزلے قحط بیماریاں اور دیگر زمینی
و آسمانی تکوینی اور غیر تکوینی آفات تو ہو نہیں سکتیں۔ اس لئے کہ تاریخ انسانی میں
بعض خطے اور بعض حصے ایسے بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں کہ جن میں کوئی زلزلہ
نہ آیا ہو کبھی خشک سالی کے نتیجہ میں قحط نہ آیا ہو۔ وبائی امراض نہ آئے ہوں آسمان
سے ژالہ باری نہ ہوئی ہو، ہوائی اور سمندری طوفان نہ آتے ہوں۔ لفظ خسر
میں مجرد نقصان کا ذکر ہوا ہے۔ جو اس بات کی نشان دہی کرتا ہے۔ کہ یہاں کوئی
ایسا زیاں مراد ہے۔ جو ہمہ گیر عالم گیر مستقل اور دائمی ہو۔ جس سے اپنی پوری معلوم
تاریخ میں پوری نوع انسانی گذری ہو گذر رہی ہو۔ جس کے کوئی خطہ زمین کسی
خطہ زمین کے باشندے ایک ایک فرد کی حیثیت سے بھی اور ایک ایک قوم کی حیثیت
سے بھی متاثر ہونے سے رہ گئے ہوں جو اتنا نمایاں ہو کہ اُس سے نمایاں کوئی شے
نہ ہو جو اتنا ظاہر ہو کہ اُسکی ظاہریت سے انکار انسان کے بس سے باہر کی بات
ہو جو اتنا ہمہ گیر ہو کہ انسانوں کی عظیم اکثریت نے اُسے دیکھا ہو جہاں
تک میں غور کرتا ہوں مجھے پوری انسانی تاریخ میں اس نوع کا ایک ہی نقصان

نظر آتا ہے - کہ جس سے کسی زمانے کا کوئی انسان نہ بچا ہو — اور وہ ہے - انسانی جان مال اور آبرو کا استحصال - وہ ظلم و جبر زور و قوت کا استحصال جس سے تاریخ کے پس ماندہ انسانوں کا کوئی گروہ کسی زمانے میں کسی خطے میں نہیں بچ سکا بڑی مچھلیوں نے چھوٹی مچھلیوں کو نگلا ہے - انسان تاریخ کے ہر دور میں ہر عہد میں ہر زمانے میں ہر خطے میں اپنے زبردستوں زور دستوں طالع آزما حکمرانوں نوابوں جاگیر داروں تعلق داروں غنڈوں بدمعاشوں کے استحصال کا شکار رہا ہے - اور ہے - انسان وہ صید زبوں ہے - جس کے گوشت کی لذت سے جامہ آدمیت میں ملبوس آدم خوروں نے اپنے کام و دہن کی لذت کا سامان کیا ہے - جس کے مال کو جس کی آبرو کو زور و قوت کے ذریعہ ہر زمانے کے فرعونوں نمرودوں، قارونوں نے شیر مادر سمجھا ہے اور شیر مادر سمجھ کر ہضم کیا ہے - جس کی مثال جنگل کے جانوروں میں تلاش کرنا چاہیں - تو نہیں ملے گی - کیا کبھی کسی کے سننے میں آیا ہے - دیکھنے میں آیا ہے کہ جانوروں نے باقاعدہ ایک فوج ظفر موج ترتیب دیکر لاؤ لشکر تیر و تلوار توپ و تفنگ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور بم بار طیاروں کے ساتھ دوسرے کسی جنگل کے جانوروں پر حملہ کر کے اُن کے ٹھکانوں کو تہس نہس کر دیا ہو اُن کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا ہو - اُن کی ہڈیاں چبا ڈالی ہوں اور ان کا خون چوس لیا ہو ان کی ماؤں کے برہنہ جلوس نکالے ہوں - یہ "سعادت" صرف حضرت انسان کے حصہ میں آئی ہے - جو حیوان ناطق علم و عقل کا مدعی تہذیب و تمدن کا دعوی دار امن و سلامتی کا پرچارک بزعم خویش اشرف المخلوقات ہے - کہ اُس نے اپنی ہوس جوع الارضی کو پورا کرنے کے لئے اپنے دوام اقتدار کے لئے اپنے نفس کے شیطان کو خوش کرنے کے لئے اُس کو سامان عیش و عشرت بہم پہنچانے کے لئے زمین کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک کبھی احساس بالاتری کے نام پر اور کبھی رنگ و نسل کے نام پر اور کبھی اپنی نفسانی اور حیوانی خواہشات کو پورا کرنے کے نام پر اپنے سے کمزور تر ابنائے جنس کو اپنی خواہشات سفلی کے بت پر بھینٹ چڑھایا ہے - اور اس سلسلے میں ظلم کی کوئی قسم ایسی نہیں تھی - جو اُس کے دست تطاول سے بچ نکلی ہو - وہ استحصال کے لاؤ لشکر کے ساتھ تاریخ انسانی کے ہر دور میں

بلائے بے درمان کی طرح آیا - اور اپنے سے کمزور تر انسانوں کے جان و مال اور آبرو پر بھوکے کتوں کی طرح ٹوٹ پڑا - کبھی یہ استحصال سکندر و دارا کی شکل میں آیا - جنہوں نے ملک ملک پر اپنی حکمرانی کے پرچم گاڑنے کے لئے مشرق سے لیکر مغرب تک اور شمال سے لیکر جنوب تک بستیوں کی بستیاں تاخت و تاراج کر دیں - اور کبھی یہ فراعنہ کی شکل میں آیا - جو بنی اسرائیل سے جو اُن کے غلام تھے - جانوروں سے بدتر سلوک کرتے رہے - اہرام مصر کی پرشکوہ اور بلند و بالا تعمیرات میں اُنکے خون کو اینٹ گارے کی شکل میں استعمال کرتے رہے - اُن مظلوم ہمہ وقتی مزدوروں سے جبکی وہ کوئی مزدوری بھی ادا نہیں کرتے تھے - بھاری بھاری پتھر اُٹھواتے اور جب وہ فاقوں سے لاچار تھک کر چور چور ہو کر بیچ چوراہوں کے گر پڑتے - تو اُن کی ننگی پیٹھوں پر کوڑوں کی بارش برسا دیتے اُن کے رہنے کے لئے نہ در تھے نہ دیوار تھے - نہ مکان تھے نہ مسکن تھے - اور جب ان کے ہاں بچے پیدا ہوتے تو پیدا ہوتے ہی ذبح کر دیتے - بچیوں کو زندہ رہنے دیتے - تاکہ سن جوانی کو پہنچ کر وہ ان کی عشرت اور کبھی یہ استحصال نمارود کی شکل میں آیا - جو بستیوں کی بستیاں نذر آتش کر کے اپنے سینے کی آگ کو ٹھنڈا کرتے - زندہ انسانوں کی کھالیں کھنچوا لیتے - پتھر کے بتوں کے سامنے اُن کو ذبح کر دیتے - کہ یہ ان کی عبادت تھی اور کبھی یہ استحصال قیصر و کسریٰ کی شکل میں آیا - جو اپنی سواریوں کے سامنے ہٹو بچو کے لئے ستم رسیدہ انسانوں کو اپنی اظہار شان و شوکت کے لئے دوڑاتے - اور جب وہ تھک کر بیچ شاہراہوں میں گر پڑتے - تو چابکوں سے ان کی کھالیں ادھیڑ کر رکھ دیتے، اور کبھی یہ استحصال بخت نصر کے ہاتھوں آیا - کہ اُس ظالم اور ستم گر فرماں روا نے بنی اسرائیل کے عورتوں اور بچوں تک میں سے ایک کو بھی معاف نہیں کیا - پوری کی پوری قوم کو تہ تیغ اور پورے کے پورے شہر اور بستیاں ویران کر کے رکھ دیں کھیتیاں اجاڑ دیں، کھیتیاں اجاڑ دیں ثمردار درختوں کو کاٹ دیا - دریاؤں کے بند باندھ کر پورے ملک کو غرق آب کر دیا، اور یہی کچھ بنی اسرائیل نے اپنے دور حکمرانی میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ کیا - کہ زندہ انسانوں کی کھالیں کھینچ لی گئیں - ہاتھ پیر توڑ دیئے گئے - آنکھیں پھوڑ دی گئیں - ان ظالموں نے یہاں تک پرواز کی کہ خدا کے برگزیدہ اور پاک باز بندوں

اُس کے نبیوں اور رسولوں کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کیا - عیسائی حکمرانوں کے ساتھ مل کر عیسٰی علیہ السلام کو اپنے زعم میں سولی پر چڑھا دیا - یحیٰی علیہ السلام کا سر کاٹ کر ایک عیاش حکمران نے اپنی محبوبہ کے قدموں میں ڈال دیا - کسی نبی کو آرے سے چیر دیا - کسی کو دریا میں ڈبو دیا، کسی کو زندہ دیوار میں چن دیا -

یونان میں ارسطو نے حق و صداقت کا اعلان کیا جواب میں زہر کا پیالہ اُس کے منہ سے لگا دیا گیا - روم کے حکمران نیرو نے روم کو آگ لگا دی - اس حال میں کہ وہ اپنے محل کے جھروکے میں کھڑا ہوا بانسری بجا رہا تھا - ہندوستان میں مذہب کے ناخداؤں برہمنوں نے زندہ عورتوں جیتی جاگتی بیویوں کو اپنے مرتے والے شوہروں کی چتا پر رکھ کر آگ لگا دی - اور راہ چلتے اگر کسی شودر نے سوء اتفاق سے ان کے مذہبی بھجن کا کوئی بول سن لیا - تو گرم سیسہ پگھلا کر اُس کے کان میں ڈال دیا گیا - غرضیکہ انسانی تاریخ کی خون چکانی کا یہ وہ باب ہے - کہ جس کا کوئی ورق نہیں ہے - جو لہو لہو نہیں ہے - انسانی جان مال اور آبرو کا وہ سر بازار نیلام ہے - وہ برسرِ عام قتل عام ہے - کہ جس کا حیطہ دشوار ہے - یہ انسانیت کی تذلیل کی شب تیرہ و تار تھی - کہ رحمت حق موجزن ہوئی کہ وادی غیر ذی ذرع میں پہاڑوں اور صحراؤں کی خزاں رسیدہ وادیوں میں کائنات کی شب تاریک میں آفتاب صداقت نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں طلوع ہوا - کہ جن کے مبارک ہاتھوں تئیس ۲۳ سالہ شب و روز کی کاوشوں اور آپ کے رفقاء کی زہرہ گداز قربانیوں کے نتیجہ میں ایک ایسا انقلاب آیا - کہ جس نے کائنات انسانی کے شب و روز کو پلٹ کر رکھ دیا - ایمان کی بہار آئی - جس بہار نے خشک ذلو پہاڑوں اور صحراؤں کی سرزمین کو گل و گلزار میں تبدیل کر دیا - تاریخ انسانی کا یہ پہلا موڑ تھا - جس موڑ پر انسان نے اپنے آپ کو پہچانا - اپنی خودی کو پہچانا - اپنے خالق کو پہچانا حضورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک سے ایمان و یقین کی وہ شمع روشن ہوئی - جس نے سارے عالم کو منور کر دیا - جس کے نتیجہ میں ایک معاشرہ ایک ایسی سوسائٹی ایک ایسا سماج ایک ایسا نظام حیات ایک ایسی ریاست عادلہ عالم وجود میں آئی - جس نے اُس شرف انسانی کو جو صدیوں سے جباروں اور قہاروں کے پاؤں تلے روندا

جارہا تھا کہ آپ بلندیوں تک پہنچا دیا جس معاشرہ، سماج، سوسائٹی اور ریاست میں
نہ کوئی استحصال کنندہ رہا اور نہ کوئی استحصال زدہ رہا نہ کوئی مالک رہا اور نہ کوئی رعیت اور نہ کوئی آقا
رہا اور نہ کوئی مملوک رہا نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز رہا نہ کوئی جہاں پناہ رہا اور نہ کوئی بے پناہ اور
نہ کوئی شاہ جہاں رہا اور نہ کوئی بے جہاں رہا - نہ کوئی سلطان رہا اور نہ کوئی خاکوان
رہا - نہ کوئی محمود رہا اور نہ کوئی ایاز رہا - نہ کوئی برہمن رہا اور نہ کوئی اچھوت رہا -
نہ کوئی سید رہا اور نہ کوئی میراثی رہا - نہ کوئی اعلیٰ رہا اور نہ کوئی ادنیٰ رہا - نہ کوئی
تخت نشین رہا - اور نہ کوئی بوریہ نشین رہا - نہ کوئی قصر وایوان والا رہا اور نہ کوئی
جھونپڑوں والا رہا - قانون کی نگاہ میں عدل کی صف میں انصاف کے ترازو میں
شرف و منزلت کے پیمانے میں معیشت میں معاشرت میں حقوق میں فرائض
میں اکرام آدمیت میں احترام انسانیت میں سب کے سب ایک ہی خالق کے
بندے ایک ہی معبود کے عابد ایک ہی چوکھٹ کے پجاری ایک ہی رسم وراہ کے
راہی ایک ہی صف کے شاہ وگدا ایک ہی صف کے نمازی ایک ہی سطر کے غازی
عدلیہ میں انتظامیہ میں سماج میں سوسائٹی میں معاشرہ میں سب کا خون ایک تھا۔
سب کی جان ایک تھی سب کا مال ایک تھا - سب کی عزت ایک تھی سب کی آبرو
ایک تھی - کسی کو کسی پر کسی نوع کا نہ امتیاز تھا نہ اقتدار تھا نہ سروری تھی نہ جہان
بانی تھی - نہ کوئی کسی کے لئے نرم چارہ نہ نوالہ تر کسی کی ہمت نہیں تھی کسی کی جان
نہیں تھی کسی کا ایمان نہیں تھا کہ وہ کسی اپنے سے کمزور کی عزت پر جان پر مال
پر آبرو پر دست درازی کر سکے - جس طرح سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جان مال
عزت آبرو جس طرح سے امیر المومنین کے جان مال عزت آبرو محترم تھے - ٹھیک
اسی طرح سے ایک عام آدمی کے بھی تھے - چادر اور چار دیواری کہ ہر شخص کی بہو بیٹی
دوسرے کی بہو بیٹی کے مانند تھی - عدلیہ کی زد میں اگر ایک عام آدمی تھا تو امیر
المومنین بھی تھے - راتوں کو دروازے کھلے رہتے چور نہیں تھے - پردہ نشین بازاروں
میں ضروریات کے لئے جاتیں غنڈے نہیں تھے - مال ومنال موجود تھے ڈاکو نہیں
تھے - ہزاروں میل سے پیدل چل کر ایک عورت خانہ کعبہ کے حج کے لئے سفر کرتی
ہاتھوں سے سونا اچھالتی آتی راہ میں کوئی رہزن نہیں تھا - ظالم کوئی نہیں تھا مظلوم

کوئی نہیں تھا۔ ستم گر کوئی نہیں تھا ستم رساں کوئی نہیں تھا۔ عیاش کوئی نہیں تھا۔
مترف کوئی نہیں تھا۔ خدا کے ڈر کے سوا خدا کی حقیقت کے سوا خدا کی محبت واطاعت
کے سوا محاسبہ اعمال کی فکر کے سوا نہ کسی کو کسی کا ڈر تھا، نہ خوف تھا نہ حزن تھا نہ
ملال تھا۔ آزادی رائے تھی گفتار تھی آزادی ضمیر تھی آزادی تنقید تھی نہ قید خانے تھے
نہ قتل گاہیں تھیں نہ مذبح خانے تھے نہ یتیم خانے تھے نہ محتاج گھر تھے۔ نہ ہٹو بچو کا
سماں تھا نہ گارڈ آف آنر تھے نہ مارچ پاسٹ تھا۔ نہ باڈی گارڈ تھے۔ حاکمیت
ایک تھی اور وہ خدائے واحد کی تھی۔ معاشرت ایک تھی اور وہ عین دین کے مطابق
تھی معیشت ایک تھی اور وہ عین اسلام کے معاشی نظام کے مطابق تھی۔ سیاست
ایک تھی اور وہ عین قانون خداوندی کے مطابق تھی سزا ایک تھی جزا ایک تھی طرز
بود و ماند ایک تھی لباس ایک تھا طعام ایک تھا۔ کلام ایک تھا سلام ایک تھا۔
غرضیکہ سب کے سب اوپر سے لے کر نیچے تک ظاہر سے لے کر باطن تک امیر سے لیکر
غریب تک بڑے سے لے کر چھوٹے تک راعی سے لیکر رعایا تک ایک ایک فرد عابد
تھا زاہد تھا۔ متقی تھا۔ خدا ترس تھا۔ خدا خوف تھا۔ بندۂ خدا تھا۔ اور اس بندگی
میں اپنے نفس سے یکسر کسی کی بندگی کا شائبہ تک موجود نہیں تھا۔ وہ شب کے
زندہ دار دن کے شہسوار صبر جمیل کے پیکر مجاہد فی سبیل اللہ قتیل فی سبیل اللہ
یہ کس کا فیضان تھا۔ یہ اسلام کا فیضان تھا۔ یہ دین حق کا فیضان تھا۔ یہ
قرآن کی سورہ والعصر کا فیضان تھا کہ کائنات انسانی کی پوری معلوم تاریخ
میں ایک ایسا معاشرہ عالم وجود میں آیا۔ جو ہر نوع کے دنیاوی خسران سے
پاک تھا۔ ہر نوع کے اُخروی زیاں سے پاک تھا۔

لیکن وائے ناکامی کہ متاع کارواں جاتا رہا۔ کہ ابھی اس صورت حال کو
استحصال سے پاک معاشرہ کو پورے پچاس سال بھی نہیں گذرے تھے۔ کہ پھر
استحصال جو انسانی زیاں و خسران کا سبیل ہے۔ اپنے پورے جوبن کے ساتھ اپنی تمامتر
خوش آسامیوں کے ساتھ محلات و قصور کے ساتھ اور محلات و قصور کی عشرت
گاہوں کے ساتھ آموجود ہوا۔ گاڑی پٹڑی سے اتر گئی۔ یا یوں سمجھ لو۔ کہ
طالع آزما حکمرانوں دنیا ساز سیاست دانوں بندگان دراہم و دینار و ازمان

قیصر و کسریٰ نے اتار دی - خلافت کی جگہ ملوکیت نے اور امارت کی جگہ ملک عضوض نے لے لی - اور خدا پرستی گئی اور نفس پرستی آئی یا اہل دول کے دنیاوی مفادات نے نفسانی جذبات نے قرآن کو خدا کے احکام کو تعلیمات اور فرامین کو حاکمیت اور سروری کو اُسوۂ رسول کو اور اسوہ صحابہ کو طاق نسیان کی زینت بنا دیا۔ اور پھر ایک بار انسان استحصالی کے پنجۂ خون آشام میں ہر روز مرتا اور جیتا رہا۔ اُس کے جان مال عزت آبرو نام نہاد مسلمان نام کے بادشاہوں اور شہنشاہوں قیصر و کسریٰ کے وارثوں کے رحم و کرم پر ہو کر رہ گئے - جنگ جمل جنگ صفین کرب وبلا کے معرکے برپا ہوتے - اُمویوں نے عباسیوں کا خون بہایا - اور عباسیوں نے اُمویوں کی سر بریدہ لاشوں پر دسترخوان بچھا دیا - شراب پانی کی طرح بہنے لگی - لونڈیوں کی فوج در فوج چنگ و رباب کے ساتھ آموجود ہوئی - انسان کا خون اُس کا مال جان عزت آبرو ہر شے مباح قرار دے دی گئی

باقی ہے آئندہ

عَنْ اَبِیْ رُقَیَّۃَ تَمِیْمِ بْنِ اَوْسٍ الدَّارِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ
اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ:۔

"اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ"

قُلْنَا: "لِمَنْ؟" ——— قَالَ
"لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ"

——— (رواہ مسلم) ———

مترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین تو بس وفاداری اور خیر خواہی کا نام ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا: "حضور! کس کی؟" آپ نے فرمایا - "اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی اور مسلمانوں کے رہنماؤں اور عوام سب کی!"

عطیہ: حاجی محمد سلیم

حاجی شیخ نور الدین اینڈ سنز لمیٹڈ (Exporters)

۳۰۱ ، لنڈا بازار ، لاہور ۳۰۶۴۲۸ / ۳۰۵۴۶۹

عورت اور اسلامی معاشرہ

افضال احمد

قبل اس کے کہ اسلام میں عورت کے مقام اور حقوق و فرائض کو زیرِ بحث لایا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختلف انسانی تہذیبوں میں عورت کو جو رتبہ اور جو حیثیت دی گئی ہے اسے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ اسلامی قانون کی شانِ اعتدال سامنے آسکے۔ عربی کی ضرب المثل ہے تعرف الاشیاء باضدادھا، اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ پس اسلامی احکام کے ربط، ان کی حکمت اور اہمیت سمجھنے کے لیے یہ امر لازمی اور ضروری ہے کہ دیگر مذاہب اور تہذیبوں میں عورتوں کے رتبے کو واضح کیا جائے۔

عورت، تاریخ کے آئینے میں

نسلِ انسانی جن مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہی ہے، ان میں سے ایک مسئلہ معاشرے میں عورتوں کی حیثیت کا بھی ہے۔ دنیا کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان نے اس سلسلے میں افراط و تفریط کی راہ اختیار کی ہے۔ وہ کبھی دائیں جانب انتہا تک چلا گیا پھر اپنی غلطی کا احساس کر کے پلٹا اور حدِ اعتدال عبور کرتے ہوئے بائیں طرف انتہا تک پہنچ گیا۔ زندگی کی ڈور سے لٹکا ہوا انسان پنڈولم کی طرح جھولتا رہا مگر عدل و انصاف اور حقیقت و سچائی کی راہ نہ پا سکا اگر اس زمانے کو جسے وحشت اور بربریت کا دور کہا جاتا ہے، نظر انداز کر دیا جائے تب بھی بقیہ تاریخ انسانی میں عورت کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا رہا ہے اور آج کل جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ فطرت کے خلاف ہے اور اس لئے ظالمانہ ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔ اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں!

یونان | قدیم یونان میں جو علم، تہذیب اور شائستگی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، عورتوں کی حالت اخلاقی، سماجی اور قانونی ہر لحاظ سے پست تھی۔ عزت کا مقام مرد کے لئے مخصوص

تھا۔ یونانیوں کی نگاہ میں عورت ایک ادنیٰ درجے کی مخلوق تھی۔ چنانچہ یونانی خرافیات (MYTHOLOGIES) میں ہے کہ جیوپیٹر سے ایک دیوتا نے پوچھا "تو ہمیں سلسلۂ تناسل میں عورت سے بے نیاز کیوں نہیں بنا دیتا" اندر رومیکی نے لکھا ہے کہ یونانی کہتے تھے "آگ سے جل جانے اور سانپ کے ڈسنے کا علاج ممکن ہے لیکن عورت کے شر کا مداوا محال ہے۔" سقراط کہتا ہے کہ عورت سے زیادہ فتنہ اور کوئی نہیں[1]

تمدن کی ترقی اور علم کی روشنی کا یونانی معاشرے پر یہ اثر ہوا کہ عورت کا سماجی رتبہ کسی قدر بڑھ گیا رفتہ رفتہ اہل یونان پر نفس پرستی کا غلبہ بڑھنے لگا اور شرافت، اخلاق اور عصمت و عفت کا تصور مٹ گیا۔ نکاح کو ایک غیر ضروری رسم سمجھا جانے لگا اور عورت کی قدر و قیمت کا انحصار محض اس بات پر سمجھا جانے لگا کہ مرد کے لئے کہاں تک ذریعہ عیش و مسرت بن سکتی ہے۔ یونانیوں کی اخلاقی گراوٹ نے ان کے فنون لطیفہ میں بھی ظہور کیا اور سارے معاشرے میں صنفی ابتری پھیل گئی۔ آخر کار وہ مادی لحاظ سے بھی زوال پذیر ہوئے اور اس کے بعد انہیں نشاۃ ثانیہ نصیب نہ ہو سکی۔

لارڈ بیرن نے کہا ہے:[2]

"اگر تم اس بات پر غور کرو کہ قدیم یونان کی تہذیب و تمدن کے انحطاط میں کس چیز کا گہرا دخل ہے تو تمہیں یہی بات نظر آئے گی کہ وہاں عورت کو خلاف فطرت آزادی دی گئی تھی اور وہ کلیتہً گھریلو ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو گئی تھی۔ اور اس نے آزادانہ طور پر اجنبی مردوں سے میل جول شروع کر دیا تھا۔"

روم قدیم روما میں عورت کا درجہ نچلے عوامی طبقے سے بھی کم تھا۔ شوہر کو اپنی بیوی اور بچوں پر پورا اختیار ہوتا تھا حتیٰ کہ وہ چاہے تو بیوی کو قتل بھی کر سکتا تھا۔[3] رفتہ رفتہ اہل روم نے تہذیب و شائستگی کی طرف قدم رکھا اور خاندانی نظام میں کسی قدر اعتدال پیدا ہوا۔ معاشرے میں شرافت اور عفت و پاکیزگی کو اچھا سمجھا جانے لگا۔ کچھ عرصہ بعد یہ صورت حال بدل گئی اور عائلی نظام کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ رومی عورتیں معاشی لحاظ سے خود مختار اور دولت مند ہونے لگیں۔

---

[1] صحابیات از نیاز فتح پوری

[2] المرأة بین الفقه و القانون از مصطفیٰ السباعی

[3] تاریخ اخلاق یورپ از کیلی

لہٰذا طلاق کی کثرت ہو گئی۔ بدکاری اور بداخلاقی کا سیلاب آگیا۔ حتیٰ کہ رومی تہذیب برباد ہو گئی۔
کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر جے ڈی انوُن لکھتے ہیں:[1]

"دوسری صدی میلادی میں رومی سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ایسی نسل آگئی جس کا مقصدِ حیات جذبۂ جنسی کی تسکین تھا۔ اس نسل میں نہ ہمت کار تھی۔ نہ قوتِ عمل۔ نتیجۃً سلطنت رو بہ زوال ہو گئی"

ایران تمدن اور تہذیب کے معاملے میں ایران سلطنتِ روما کا برابر کا ساتھی تھا۔ مگر وہ انسانیت کے دشمنوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ جن رشتوں سے ازدواجی تعلق کو ہم حرام سمجھتے ہیں ان کی حرمت اہلِ ایران کو تسلیم نہ تھی[2]۔ پروفیسر ارتھر کرسٹن کے بقول بیٹی یا بہن سے اس قسم کا رشتہ ایران میں کوئی ناجائز فعل تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ چینی سیاح ہیوئن سیانگ کا بیان ہے کہ ایرانی قانون اور معاشرت میں ازدواجی تعلق کے لئے کسی رشتے کو بھی مستثنیٰ نہیں رکھا گیا[3]۔

تیسری صدی میں مانی نام کے فلسفی نے یہ تحریک چلائی کہ نکاح ختم کر دینا چاہئے تاکہ نسلِ انسانی منقطع ہو جائے اور اسے نور و ظلمت پر ابدی فتح حاصل ہو سکے[4]۔

پانچویں صدی میں مزدک نے اعلان کیا کہ سب انسان برابر ہیں اور ہر ایک کو دوسرے کے مال اور بیوی پر یکساں حقوق حاصل ہیں۔ عیش پرستوں نے اس دعوت پر لبیک کہا۔ بادشاہ نے بھی اس تحریک کی حوصلہ افزائی کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایران میں بدی و بے حیائی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ عام شہری اس بلائے ناگہانی کا سب سے بڑا شکار بنے۔ جو جس کے گھر میں چاہتا گھس جاتا اور مال و زن پر قبضہ کر لیتا۔ صاحبِ خانہ کچھ بھی نہ کر سکتا تھا[5]۔ اس طرح جو پراگندگی اور انتشار پھیلا ہوگا اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے

عرب سرزمینِ عرب میں عورت کا شمار بدترین مخلوقات میں کیا جاتا تھا۔ عورت کے مال کو مرد

---

[1] سیکس اینڈ کلچر از ڈاکٹر جے ڈی انوُن

[2] تاریخ طبری۔ جلد ۲

[3] ایران بعہدِ ساسانیاں

[4] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از ابوالحسن علی ندوی۔

[5] تاریخ طبری۔ جلد ۲

اپنا مال سمجھتے۔ وہ ترکہ اور میراث میں کوئی حصہ نہ پاتی۔ شوہر کے مرنے کے بعد اس کو اجازت نہ تھی کہ دوسرا نکاح کر سکے۔ دوسرے سامان اور جانوروں کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ لڑکیاں چونکہ جنگ میں حصہ نہ لے سکتی تھیں بلکہ خود ان کی حفاظت مردوں کو کرنا پڑتی تھی اس لئے بچیوں کی پیدائش موجبِ ننگ و عار سمجھی جاتی۔ قرآن کہتا ہے۔

"جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لئے رہے یا مٹی میں دبا دے۔ (نحل - ۵۸، ۵۹)

ہثیم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کا رواج عرب کے تمام قبائل میں موجود تھا۔ ایک اس پر عمل کرتا، دس چھوڑتے تھے۔ یہ سلسلہ اسلام کے ظہور تک رہا بعض شرفا اور رؤسا ایسے مواقع پر بچیوں کو خرید لیتے اور ان کی جانیں بچا لیا کرتے[1]

مولانا حالی نے دورِ جاہلیت کی عورت کے متعلق کہا ہے

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر
تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھے شوہر کے تیور
کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی!!!!
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

ہندوستان قدیم ہندوستان میں عورت کو ہمیشہ کمزور اور بے وفا سمجھا گیا۔ بچپن میں اس کو باپ کی، جوانی میں شوہر کی اور بیوگی میں اولاد کی مملوکہ بن کر رہنا پڑتا تھا۔ نکاح کے لئے اس کی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اسے شوہر کی چتا پر بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر لی بان نے لکھا ہے[2]۔

---

[1] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

[2] تمدنِ ہند

"بیواؤں کو اپنے شوہروں کی لاش کے ساتھ جلانے کا ذکر منوشاستر میں نہیں ہے۔
لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم ہندوستان میں عام ہو چلی تھی، کیونکہ یونانی مؤرخین نے اس کا
ذکر کیا ہے:

رفتہ رفتہ دوسری تہذیبوں کی طرح ہندوستان میں بھی صنفی انتشار کا دور آیا۔ مقدس
کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں نے اہم حوادث کے وقوع اور موجودات کے وجود کی توجیہہ کے
سلسلے میں شرمناک روایتیں بیان کیں۔ بے حیائی کے مظاہر ہندو دیوتاؤں کے مجسموں اور ان کی
الٰہیات میں بھی عام ہوگئے۔ یہاں تک کہ ہندو بحیثیت قوم انحطاط اور زوال کا شکار ہوگئے۔

مسیحی یورپ

جب عیسائیت نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کیا تو یورپ زوال کے
بدترین درجے تک پہنچ گیا تھا۔ مسیحی مبلغین نے شروع میں اچھی خدمات انجام
دیں اور فواحش کا انسداد کیا، مگر عیسائیت خود عورت کے متعلق کوئی اچھا خیال نہیں رکھتی تھی۔
ترتولیان جو ابتدائی زمانے کے ائمہ مسیحیت میں شمار ہوتا ہے، عورت کے متعلق مسیحی خیالات
کی یوں عکاسی کرتا ہے۔

"وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے، وہ شجرِ ممنوعہ کی طرف لے جانے والی ہے۔ خدا کے
قانون کو توڑنے والی اور خدا کی تصویر، مرد کو غارت کرنے والی ہے۔"[1]

مسیحیت نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا اور ہر قسم کے ازدواجی تعلق کو گناہ قرار دے دیا۔
اس نظریئے نے نہ صرف معاشرے اور سماج پر برا اثر ڈالا بلکہ عورت کا مرتبہ بھی پست کر دیا۔ سولہویں
اور سترہویں صدی میں جب جادو ٹونے کا خیال لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا تو اکثر اوقات الزام
عورتوں پر ہی رکھا جاتا اور وہی ظلم کا شکار ہوتی تھیں۔ الگزینڈر ششم نے ۱۴۹۴ء میں، لوئی دہم نے
۱۵۲۱ء میں اور اڈرین ششم نے ۱۵۲۲ء میں نہایت بے دردی کے ساتھ عورتوں اور ان کے بچوں
کو جادو کے الزام میں ذبح کروا دیا۔ انگلستان میں عورتوں کو سزا دینے کے لئے ایک خاص مجلس
بنائی گئی جس نے عورتوں کو سزا دینے اور ان پر ظلم کرنے کے لئے جدید قوانین مرتب کئے۔
ڈاکٹر اسپرنگ نے لکھا ہے کہ عیسائیوں نے ۹۰ لاکھ عورتوں کو زندہ جلا دیا۔[2]

---

[1] پردہ از ابوالاعلیٰ مودودی

[2] صحابیات از نیاز فتحپوری۔

مسیحی معاشرے میں عورت کو وراثت اور ملکیت کے نہایت محدود حقوق حاصل تھے۔
اس کی ہر شے کا مالک اس کا شوہر تھا۔ طلاق اور خلع کی اجازت نہ تھی۔ انتہائی شدید حالات میں
تفریق کرا دی جاتی۔ مگر نکاحِ ثانی کا حق دونوں میں سے کسی کو نہ تھا۔ ان خلافِ فطرت رواجوں اور
بے جا پابندیوں اور ظالمانہ قوانین کا اثر یہ ہوا کہ معاشرے میں بے حیائی کو فروغ حاصل ہوا حتٰی کہ
خود مذہبی پیشوا بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔

اٹھارہویں صدی میں

رفتہ رفتہ یورپ میں ذہنی بیداری کی علمی تحریک پروان چڑھی۔ ایک
طرف کائنات اور مادے پر تحقیق نے علم و فن کی دنیا میں انقلاب پیدا
کر دیا۔ پادریوں کو خدشہ لاحق ہوا کہ اگر یونانی فلسفہ غلط ثابت ہو گیا تو مذہب کا خاتمہ ہو جائے گا۔
لہٰذا انہوں نے علوم کی ترقی کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ لیکن وہ قوانین فطرت کی
پیہم دریافت اور مسلسل ہونے والی نت نئی ایجادات کے سامنے ٹک نہ سکے۔ اور مذہبی اقتدار
کا خاتمہ ہو گیا۔ یورپ ترقی کے بام عروج کی طرف گامزن ہونے لگا۔ دوسری طرف ادیبوں اور فلسفیوں
نے مسیحیت کی تنگ نظری سے چھٹکارا پانے کے لئے ایک نیا تصورِ آزادی پیش کیا۔ کہا جانے
لگا کہ فرد کو پوری خود مختاری کے ساتھ ہر وہ کام کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیئے جو اسے پسند آئے۔
اور ہر اس کام سے باز رہنے کی آزادی ہونی چاہیئے جسے وہ پسند نہ کرتا ہو۔ حکومت کا فرض فقط اتنا
ہے کہ وہ فرد کی آزادی کا تحفظ کرے۔

آزادی کے اس مبالغہ آمیز تصور کو بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی۔ خصوصاً فرانس میں
اسے فکری اور عملی حمایت ملی جس کے نتیجے میں انقلاب فرانس کا واقعہ رونما ہوا۔

صنعتی انقلاب

مغربی ممالک میں صنعتی انقلاب سے پہلے جاگیرداری نظام رائج تھا۔
اس نظام میں حالات کچھ ایسے تھے کہ مرد ہی کو عورت کے اخراجات کا
بار بھی اٹھانا پڑتا تھا۔ مگر عورت اس دور میں بھی بعض گھریلو صنعتوں میں حصہ لے کر مرد کی
مدد کرتی تھی۔ مگر صنعتی انقلاب کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی۔ صنعت اور تجارت کے
نئے مرکز قائم ہوئے جو رفتہ رفتہ بڑے شہروں میں تبدیل ہو گئے۔ دیہات سے لاکھوں افراد
شہروں میں جمع ہو گئے۔ مہنگائی بڑھنے لگی۔ ہر شخص زیادہ سے زیادہ دولت کمانے اور اپنے
عیش و آرام کو بڑھانے میں مگن ہو گیا۔ اب عورتوں اور بچوں کو بھی گھر چھوڑ کر کارخانوں کی راہ
لینی پڑی تاکہ محنت مشقت کر کے اپنا پیٹ پال سکیں۔ مردوں کی خود غرضی یہاں تک بڑھ

کہ انہوں نے اپنی قانونی بیوی تک کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ آزادیٔ نسواں کی تحریک شروع ہوئی جو دراصل دو مقاصد حاصل کرنے کے لئے تھی۔ اول: عورتیں بھی اپنا کمائیں تاکہ مردوں کو ان کا بار نہ اٹھانا پڑے۔ دوم: تجارت کی الجھنوں اور مشقت کی تکلیفوں میں مردوں کے لئے سامانِ تفریح مہیا ہو سکے۔

سماجی مصلحین نے بچوں سے کام لینے کے خلاف آواز اٹھائی۔ چنانچہ کارخانوں وغیرہ میں ملازمت کی عمر بتدریج بڑھا دی گئی۔ مگر عورت اب بھی مظلوم تھی۔ اسے ملازمت بھی کرنا تھی جس کا معاوضہ مردوں کے مقابلے میں بہت کم ملتا تھا، عیش پرستوں کا دل بھی بہلانا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ گھر کا کام بھی کرنا تھا۔ اور اگر بچے پیدا ہوں تو ان کی پرورش سے بھی وہ مستثنیٰ نہ تھی۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد

پہلی جنگ میں یورپ اور امریکہ کے لاکھوں مرد مارے گئے۔ جو لڑائی سے زندہ واپس آئے وہ یا تو عمر بھر کے لئے معذور تھے یا اعصابی تناؤ سے چھٹکارا پانے کے لئے زندگی کی رنگینیوں میں گم ہو جانا چاہتے تھے۔ یہ لوگ شادی کے جھنجھٹ میں پڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جنگِ عظیم کے بعد اخلاقی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے جو سب سے بڑا مسئلہ سامنے آیا وہ ان بے شوہر عورتوں کا تھا جن کا نہ کوئی محافظ رہا تھا نہ سر دھرا۔ دوسری طرف مزدوروں اور کارکنوں کا شدید قحط پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے عورتوں کے لئے اب کوئی موقع نہیں رہا تھا کہ وہ گھر میں بیٹھیں۔ انہیں کارخانوں اور صنعتوں میں مردوں کی جگہ لینی پڑی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو ان کے متعلقین جن میں بوڑھے، معذور اور بچے بھی تھے، بھوک سے مر جاتے۔

لیکن عورتوں کے لئے کارخانوں وغیرہ میں ملازمت مہنگی ثابت ہوئی۔ مالک صرف محنت والے ہاتھ نہیں بلکہ اپنی خواہشِ نفس کی تسکین کا ذریعہ بھی چاہتے تھے۔ خواتین کارکنوں سے ان کے دونوں مسائل حل ہو گئے۔

مردوں کی کمی کی وجہ سے ہر عورت کے لئے شادی کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ لہٰذا مغرب کی عورت اپنے جذبات و خواہشات سے مغلوب ہو کر ایک مخصوص راستے پر چل نکلی۔ اب اس کا کام محض یہ رہ گیا تھا کہ دکانوں اور کارخانوں میں مشقت کر کے

پیسہ کمائے اور اپنی خواہشات اور اپنے جذبات کی تسکین کے لئے ہر جائز و ناجائز راستہ اختیار کرے۔

عورت جب مردوں کے دوش بدوش میدانِ عمل میں نکلی تو اسے اپنے حقوق منوانے کے لئے ایک طویل جنگ لڑنا پڑی۔ مساواتِ مرد و زن کا تصور عام ہوا اور اس کا مفہوم یہ قرار پایا کہ جو کام مرد کرتے ہیں وہ عورتیں بھی کر سکتی ہیں اور انہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ پہلے تو حق رائے دہی کا مطالبہ پیش ہوا۔ اور بعد میں کاروبارِ حکومت میں مساوی شرکت کا حق مانگا گیا۔ (جاری ہے)

قاری نصیر احمد غزنوی

قسط (۶)

اظہارِ حق

قادیانیت اپنے لٹریچر کے آئینے میں

(گذشتہ سے پیوستہ)

مالی امداد

(۱) اب اس طرح پر یہ پیشگوئیاں پوری ہوئیں کہ ہزارہا کوس سے لوگ آتے ہیں اور ہزارہا روپیہ سے مدد کرتے ہیں۔

(اربعین نمبر ۲ ص ۳۵۱ - ۲۷ ستمبر ۱۹۰۰ء)

(۲) الہام ۲ پیشگوئی نمبر ۱ سے متعلق: پھر ایک دفعہ غنودگی آئی اور الہام ہوا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (کیا خدا اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہر ایک پہلو سے وہ میرا معاون و ناصر ہوا مجھے صرف اپنے دسترخوان اور روٹی کی فکر تھی مگر اب تک اس نے کئی لاکھ آدمی کو میرے دسترخوان پر روٹی کھلائی۔ ڈاک خانہ والوں کو خود پوچھ لو کہ کس قدر اس نے روپیہ بھیجا۔ میری دانست میں دس لاکھ سے کم نہیں۔ اب ایمانًا کہو یہ معجزہ ہے یا نہیں۔

(نزول المسیح ص ۴۹۵/۱۱۹ ص ۱۱۷ و ص ۱۱۸ ص ۴۹۹/۱۲۰ جولائی و اگست ۱۹۰۲ء)

(۳) ایسا اتفاق دو ہزار مرتبہ سے بھی زیادہ گزرا ہے کہ خدا تعالٰے نے میری حاجت کے وقت مجھے اپنے الہام یا کشف سے یہ خبر دی کہ عنقریب کچھ روپیہ آنے والا ہے اور بعض اوقات آنے والے روپیہ کی تعداد سے بھی خبر دے دی اور بعض اوقات یہ خبر دی کہ اس قدر فلاں تاریخ میں اور فلاں شخص کے بھیجنے سے آنے والا ہے اور ایسا ہی ظہور میں آیا۔

(تریاق القلوب ص ۱۹۹/۶۱ و ص ۲۰۰/۶۲ ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۲ء)

(۴) ۲۵ برس کے قریب مدت گزر گئی جب کہ میں نے یہ ایک پیشگوئی شائع

کی تھی کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگرچہ اب تو اکیلا ہے اور تیرے ساتھ کوئی نہیں مگر وہ وقت آئے گا کہ میں ہزاروں انسانوں کو تیری طرف رجوع دوں گا اور اگرچہ اب تجھ میں کوئی مالی طاقت نہیں مگر میں بہت سے لوگوں کے دلوں میں اپنا الہام ڈالوں گا کہ اپنے مالوں سے تیری مدد کریں۔

(قادیان کے آریہ اور ہم ص۳۱، ص۱۴، ص۴۲/۴)

(۵) قادیان میں لالہ ملاوامل نے لالہ شرمپت کے مشورہ سے اشتہار دیا جس کو قریباً دس برس گزر گئے۔ اس اشتہار میں میری نسبت یہ لکھا کہ یہ شخص محض مکار ہے فریبی ہے اور صرف دوکاندار ہے لوگ اس کا دھوکہ نہ کھادیں، مالی مدد نہ کریں ورنہ اپنا روپیہ ضائع کریں گے۔ اس اشتہار سے ان آریوں کا مدعا یہ تھا کہ تا کہ لوگ رجوع سے باز آجائیں اور مالی امداد سے منہ پھیر لیں مگر دنیا جانتی ہے کہ اس اشتہار کے زمانے میں میری جماعت ساٹھ یا ستر آدمی سے زیادہ نہ تھی[1] چنانچہ یہ امر سرکاری رجسٹروں سے بھی بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں زیادہ سے زیادہ تیس چالیس روپیہ ماہوار آمدنی تھی مگر اس اشتہار کے بعد گویا مالی امداد کا ایک دریا رواں ہو گیا۔ اور آج تک کئی لاکھ لوگ بیعت میں داخل ہوئے۔

(قادیان کے آریہ اور ہم ص۱۲، ص۱۳، ص۴۲۵/۹، ص۴۲۶/۱۰ ۲۰ فروری ۱۹۰۷ء)

(۶) براہین احمدیہ میں لاکھوں انسانوں کے رجوع اور لاکھوں روپیہ کی آمدن کے بارہ میں پیشگوئی شائع ہو چکی تھی۔۔۔ بعد کئی لاکھ آدمیوں نے میری بیعت کر لی اور کئی لاکھ روپیہ آیا اور دوسرے بے شمار تحائف ہر طرف سے آئے۔

(قادیان کے آریہ اور ہم ص۴۲۷/۱۱ ص۱۴ ص۱۵ ۲۰ فروری ۱۹۰۷ء)

(۷) مجھے اپنی حالت پر خیال کر کے اس قدر بھی امید نہ تھی کہ دس روپیہ ماہوار بھی آئیں گے مگر خدا تعالیٰ جو غریبوں کو خاک سے اٹھاتا ہے اور متکبروں کو خاک میں ملاتا

---

[1] دس سال پہلے یعنی ۲۰ فروری ۱۸۹۷ء تک کی یہ تعداد (یعنی ساٹھ ستر آدمی) ذہن میں رکھیں۔ پھر (مالی امداد) نمبر ۲، ۳ ملاحظہ فرمائیں کہ ۱۸۹۷ء میں کتنی تعداد تحریر فرمائی ہے مشہور مثل ہے "دروغ گو را حافظہ نباشد"۔ (ن ا)

ہے۔ اس نے میری ایسی دستگیری کی کہ میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ اب تک تین لاکھ روپیہ کے قریب آچکا ہے۔ (حقیقۃ الوحی ص ۲۴۱ ص ۲۱۲ ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء)

(۸) اس وقت سے آج تک دو لاکھ سے بھی زیادہ روپیہ آیا اور اس قدر ہر ایک طرف سے تحائف آئے اگر وہ سب جمع کیے جاویں تو کئی کوٹھے ان سے بھر جاتے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۴۲ ص ۲۵۳ ص ۲۴۳ ص ۲۵۴۔ ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء)

(۹) دوسری پیش گوئی یہ تھی کہ ہر طرف سے مالی امداد آئے گی۔ یہ مالی امداد اب تک پچاس ہزار روپیہ سے زیادہ آچکی ہے بلکہ میں یقین کرتا ہوں کہ ایک لاکھ کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے ڈاک خانہ جات کے رجسٹر کافی ہیں۔

(براہین احمدیہ۔ حصہ پنجم ص ۵۸ ص ۴۷ ۔ ۱۹۰۸ء)

(۱۰) اور جیسا کہ منی آرڈروں سے ثابت ہو سکتا ہے ایک لاکھ سے بھی زیادہ روپیہ آچکا ہے۔ (اسی صفحہ پر آٹھویں سطر میں فرماتے ہیں) ایک لاکھ یا کچھ زیادہ روپیہ اب تک آچکا ہے۔

(چشمۂ معرفت، دوسرا حصہ۔ ص ۴۰۶ ص ۳۷۔ ۱۵ مئی ۱۹۰۸ء (انتقال ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء)

(نوٹ) اگر سنہ کی ترتیب کے مطابق ان رقوم کا جائزہ لیں تو سب فرضی ثابت ہوتی ہیں۔ کیونکہ کہیں ابتدائے دعویٰ سے ۱۹۰۲ء تک مجموعی آمدنی دس لاکھ روپیہ تحریر فرمائی ہے، کہیں ابتدائے دعویٰ سے ۱۹۰۸ء تک مجموعی آمدنی ایک لاکھ یا کچھ زیادہ — کیا ان اقتباسات سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا کہ جس طرح جماعت کی تعداد من گھڑت اور فرضی ہے اسی طرح مالی امداد کی رقم بھی فرضی اور دروغگوئی پر مبنی ہے (ن ا)

اُمتی نبی بن گیا!

ایک شخص ساکن جموں چراغ دین نامی کی نسبت

اپنی تمام جماعت کو ایک اطلاع

اس شخص نے ہمارے سلسلہ کی تائید کا دعویٰ کر کے اور اس بات کا اظہار

کرکے کہ میں فرقہ احمدیہ سے ہوں جو بیعت کر چکا ہوں طاعون کے بارے میں
ایک دو اشتہار شائع کیے ہیں... اب جو رات اس شخص چراغدین کا ایک اور مضمون
پڑھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ مضمون بڑا خطرناک اور زہریلا اور اسلام کے لیے مضر ہے۔
اور سر سے پیر تک لغو باتوں سے بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ میں رسول
ہوں اور رسول بھی اولوالعزم۔ پس یہ کیسی رسالت ہے۔ ناپاک رسالت ہے،
جس کا چراغدین نے دعوےٰ کیا ہے۔ جائے غیرت ہے کہ ایک شخص میرا مرید کہلا کر
یہ ناپاک کلمے منہ پر لاوے کہ میں مسیح ابن مریم کی طرف سے رسول ہوں۔ پھر باوجود
ناتمام عقل اور ناتمام فہم اور ناتمام پاکیزگی کے یہ بھی کہنا کہ میں رسول اللہ ہوں۔ یہ
کس قدر خدا کے پاک سلسلہ کی ہتک عزت ہے۔ گویا رسالت اور نبوت بازیچۂ
اطفال ہے اور جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی دوسرا مامور اور
رسول نہیں تھا اور صحابہؓ ایک ہی ہادی کے پیرو تھے اسی طرح اس جگہ بھی ایک
ہی ہادی کے سب پیرو ہیں۔ کسی کو دعویٰ نہیں پہنچتا کہ وہ نعوذ باللہ رسول کہلاوے
میں تو جانتا ہوں کہ وہ ان تمام کوچوں سے محروم ہے اور نفس امارہ کی غلطی نے
اس کو خودستائی پر آمادہ کیا ہے۔ پس آج کی تاریخ سے وہ ہماری جماعت سے منقطع
ہے جب تک کہ مفصل طور پر اپنا توبہ نامہ شائع نہ کرے اور اس ناپاک رسالت
دعوے سے ہمیشہ کے لیے مستعفی نہ ہو جائے۔ ہماری جماعت کو چاہیئے کہ ایسے انسان
سے قطعاً پرہیز کریں۔

(المشتہر خاکسار مرزا غلام احمد از قادیان۔ تعداد اشاعت ۵۰۰... ۲۳ اپریل ۱۹۰۲ء) (اشتہارات)
(دافع البلاء ص۱۹، ص ۲۳۹/۲۲، ر ۲۴۱/۲۵، ص۲۱، ص۲۲، ص ۲۴۲/۲۱)

چراغدین کی نسبت میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ تھوڑی سی غنودگی ہو کر مجھ کو
خدائے عزوجل کی طرف سے یہ الہام ہوا نزل به جبیز یعنی اس پر جبیز
نازل ہوا... جبیز دراصل خشک اور بے مزہ روٹی کو کہتے ہیں... اور مرد
بخیل اور لئیم کو بھی کہتے ہیں اور اس جگہ لفظ جبیز سے مراد وہ حدیث النفس اور
اضغاث الاحلام ہیں جن کے ساتھ آسمانی روشنی نہیں اور بخل کے آثار موجود ہیں۔
اور ایسے خیالات خشک مجاہدات کا نتیجہ یا تمنا اور آرزو کے وقت القاء شیطان ہوتا ہے

اور یا خشکی اور سوداوی مواد کی وجہ سے کبھی الہامی آہنوں کے وقت ایسے خیالات کا دل پر القاء ہوتا ہے۔ (حاشیہ نمبر ۱ صفحہ ۱۴۳/۲۷ صفحہ ۱۳۳ دافع البلاء)

حاشیہ نمبر ۲

رات کو عین خسوف قمر کے وقت چراغ دین کی نسبت مجھے یہ الہام ہوا۔ انی اذیب من یریب میں فنا کر دوں گا۔ میں غارت کردوں گا۔ میں غضب نازل کردوں گا اگر اس نے شک کیا اور اس پر ایمان نہ لایا اور رسالت اور مامور ہونے کے دعوے سے توبہ نہ کی اور خدا کے انصار جو سلسلہ کے دروازے سے خدمت اور نصرت میں مشغول ہیں اور رات دن صحبت میں رہتے ہیں۔ ان سے عفو و تقصیر نہ کرائی۔ کیونکہ اس نے جماعت کے تمام مخلصوں کی توہین کی کہ اپنے نفس کو ان سب پر مقدم کر لیا حالانکہ خدا نے بار بار براہین احمدیہ میں ان کی تعریف کی اور ان کو سابقین قرار دیا اور کہا اصحاب الصفۃ وما ادراک ما اصحاب الصفۃ۔ چراغ دین کی یہ رسالت اور یہ الہام محض چیز اور اس کے لیے مہلک ہیں مگر دوسرے اصحاب جن کی توہین کرتا ہے ان پر مائدہ نازل ہو رہا ہے اور ان کو خدا کی رحمت سے بڑا حصہ ہے۔ صفحہ ۲۳ صفحہ ۲۴۴/۲۸ - دافع البلاء

نوٹ، جس طرح مرزا صاحب چراغ دین جموی کے مضمون کو زہریلا، خطرناک اور اسلام کے لیے مضر، سر سے پیر تک لغو اور باطل باتوں سے بھرا ہوا سمجھتے ہیں، ہمارے نزدیک ان کے مضامین بھی انہی تعریفات میں آتے ہیں۔ جس نظریہ سے وہ اس بات پر معترض ہیں کہ چراغ دین نے کیونکر ان کی بیعت کر کے اور ان کے فرقہ احمدیہ میں داخل ہو کر، ان کے مقابلہ میں نبوّت کا دعویٰ کر دیا، اسی نظریہ کے مطابق مرزا صاحب ہی کو کب یہ حق حاصل تھا کہ وہ خود کو مسلمان کہہ کر اور محمد رسول اللہ کا کلمہ پڑھ کر، ان کا امتی ہونے کا دعویٰ کر کے انؐ ہی کے مقابلہ میں نبوت کا دعویٰ کر بیٹھیں۔ خود انہوں نے بھی اپنے مضامین اور اپنے دعویٰ رسالت پر کیوں نہیں غور فرمایا؟ جب چراغ دین جموی کو یہ حق نہیں پہنچتا، کہ وہ ان کا مدِ مقابل بن کر آ جائے، تو مرزا صاحب کو کب یہ حق پہنچتا ہے۔ جس طرح مرزا صاحب کے خیال کے مطابق چراغ دین کے دعویٰ نبوت سے ان کی ساری امت کی توہین ہوئی ہے، اسی طرح خود ان کے دعویٰ نبوت

سے بھی پوری امتِ مسلمہ کی توہین ہوتی ہے۔ اگر یہ جرأت چراغ دین کے لیے جائے غیرت تھی تو مرزا صاحب کے لیے بھی جائے غیرت ہے۔ انہیں بھی بقول خود یہ ناپاک کلمے منہ پر نہیں لانے چاہئیں تھے۔ اگر چراغ دین نفس امارہ کی غلطی سے خود ستائی میں مبتلا ہو سکتا ہے تو مرزا صاحب کے لیے بھی اس کا امکان ہے اور ان سے بھی اس کا صدور ہو سکتا ہے۔ (ن-۱)

الہام و وحی

الہام و وحی کی تعریف ہر ایک وحی جو ہوتی ہے ایک فولادی میخ کی طرح دل میں دھنسی جاتی ہے۔۔۔ یہ اسی وحدہٗ لاشریک خدا کا کلام ہے جس کا کلام قرآن شریف ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین ص۳۳ ص۳۴)

سچا کلام سچے الہام میں ایک شوکت اور بلندی ہوتی ہے اور دل پر اس سے ایک مضبوط ٹھوکر لگتی ہے اور قوت اور رعب ناک آواز کے ساتھ دل پر نازل ہوتا ہے۔ سچا الہام اپنے ساتھ ایک لذت اور سرور کی خاصیت لاتا ہے۔ اور نامعلوم وجہ سے یقین بخشتا ہے اور ایک فولادی میخ کی طرح دل کے اندر گھس جاتا ہے اور اس کی عبارت فصیح اور غلطی سے پاک ہوتی ہے۔

(ضرورت الامام۔ ص۴۸۹ و ص۱۹)

لیکن اگر کوئی کلام یقین کے مرتبہ سے کم تر ہو تو وہ شیطانی کلام ہے نہ ربانی۔

(نزول المسیح ص۱۰۱ ج۴۸۶/۱۱)

خدا کا کلام بندہ اور خدا میں دلالہ ہے۔ (نزول المسیح ص۴۷۵/۱۹ ص۸۷)

خدا کا کلام جو میرے پر نازل ہوا ہے یا ہوتا ہے وہ میری روحانی والدہ ہے۔ جس سے میں پیدا ہوا اس نے مجھے ایک وجود بخشا جو پہلے نہ تھا۔

(نزول المسیح ص۴۶۵/۱۹ ص۸۷)

۱۹۰۲ء فروری الہام: در کلام تو چیزے است کہ شعراء را دراں دخلے نیست
كَلَامٌ اُفْصِحَتْ مِنْ لَّدُنْ رَبٍّ كَرِيْمٍ ط
(ترجمہ) تیرے کلام میں ایک چیز ہے جس میں شاعروں کو دخل نہیں ہے۔ تیرا

کلام خدا کی طرف سے فصیح کیا گیا ہے۔ (تذکرہ ص۵۹۵)

• خدا کا کلام اس قدر مجھ پر نازل ہوا ہے کہ اگر وہ تمام لکھا جائے تو بیس جزو سے کم نہیں ہوگا۔ (حقیقۃ الوحی ص۳۹۱)

(انوٹ) وحی خواہ کسی زبان کی بھی ہو، وہ ایسی بے مثل و بے نظیر ہوتی ہے، کہ کوئی انسان اس کی مثال و نظیر پیش نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ خدا کا کلام ہوتا ہے۔ میں مرزا صاحب کی ہر زبان یعنی اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور پنجابی کی وحی نقل کرتا ہوں۔ صاحبِ ذوق حضرات انہیں پڑھ کر سنجیدگی سے غور فرمائیں کیا یہ خدائی کلام ہو سکتا ہے؟ کیا زبان کے اعتبار سے مرزا صاحب کی کسی وحی میں بھی فصاحت و بلاغت یا ادبیت پائی جاتی ہے؟ یا یہ اک درجہ کا بھی کلام کہلایا جا سکتا ہے، جو ایک عالم یا ادیب پیش کرتا ہے (ن ا)

• آج پھر ۱۵ مارچ ۱۹۰۶ء کو بروز پنجشنبہ وقت صبح یہ الہام ہوا: خدا نکلنے کو ہے۔ انت منی بمنزلۃ بروزی اور تو مجھ سے ایسا ہے جیسا کہ میں ہی ظاہر ہو گیا۔ یعنی تیرا ظہور بعینہٖ میرا ظہور ہو گا۔ (تجلیات الٰہیہ ص۴۰۴/۱۲)

• خدا تعالیٰ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تیرے لیے میں زمین پر اُترا اور تیرے لیے میرا نام چمکا اور میں نے تجھے تمام دنیا میں سے چن لیا۔ (تجلیات الٰہیہ ص۳۹۵/۹)

• یعنی خدا تیرے ساتھ ہے۔ خدا وہیں کھڑا ہوتا ہے جہاں تو کھڑا ہو۔ یہ حمایت الٰہی کے لیے ایک استعارہ ہے۔ (ضمیمہ انجام آتھم ص۳۰۱/۱۲)

• تُو مجھ سے اور میں تجھ سے ہوں۔ خدا عرش سے تیری تعریف کرتا ہے۔ تو اس سے نکلا اس نے تمام دنیا سے تجھ کو چنا۔ تجھ سے بیعت کرنا ایسا ہے جیسا کہ مجھ سے۔ تیرا ہاتھ میرا ہاتھ ہے۔ تیرا بھید میرا بھید ہے۔ اے میرے احمد تو میری مُراد اور میرے ساتھ ہے۔ (کتاب البریہ ص۱۰۰/۸۲ ص۱۰۱/۸۳ ص۱۰۲/۸۴ ص۱۰۳/۸۵)

• میں نے اپنے ایک کشف میں دیکھا کہ میں خود خدا ہوں اور یقین کر لیا کہ وہی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی روح مجھ پر محیط ہو گئی اور میرے جسم پر مستولی ہو کر اپنے وجود میں مجھے پنہاں کر لیا یہاں تک کہ میرا کوئی ذرہ بھی باقی نہ رہا اور میں نے اپنے

جسم کو دیکھا تو میرے اعضاء اس کے اعضاء اور میری آنکھ اس کی آنکھ اور میرے کان اس کے کان اور میری زبان اس کی زبان بن گئی تھی۔
(کتاب البریہ ص ۸۵/۱۰۳ ص ۸۶/۱۰۴)

• اللہ تعالیٰ مجھے مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ یا قمرُ یا شمس انت منّی و انا منک۔ یعنی اے چاند اور اے سورج تُو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔ اسی طرح ایک دفعہ خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔ انت منّی بمنزلۃ اولادی انت منّی بمنزلۃ لا یعلمھا الخلق۔ یعنی تُو مجھ سے بمنزلہ اولاد کے ہے اور تجھے مجھ سے وہ نسبت ہے جس کو دنیا نہیں جانتی۔

• ایک دفعہ میں نے کشفی رنگ میں دیکھا کہ میں نے نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کیا اور پھر میں نے کہا کہ آؤ اب انسان کو پیدا کریں۔
(چشمۂ مسیحی ص ۴۴/۳۷۵ ص ۵۸ ص ۵۸ ص ۴۴/۳۷۶)

• انت منّی بمنزلۃ ولدی۔ تُو مجھ سے بمنزلہ میرے فرزند کے ہے۔
(حقیقۃ الوحی ص ۸۹/۸۹ ص ۸۶)

خدائی ورود خدا تعالیٰ نے میری وفات کی نسبت اُردو زبان میں مندرجہ ذیل کلام کے ساتھ مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔

• بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ اس دن سب پر اداسی اداسی چھا جائے گی۔ یہ ہوگا۔ یہ ہوگا۔ یہ ہوگا۔ بعد اس کے تمہارا واقعہ ہوگا۔ تمام حوادث اور عجائبات قدرت دکھلانے کے بعد تمہارا حادثہ ہوگا۔ (رسالہ الوصیت ص ۳ ص ۴/۳۰۲)

پہلی پیشگوئی ۱۸۷۴ء: ہفتہ کا روز تھا اور دوپہر کا وقت تھا کہ مجھے کچھ غنودگی ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ الہام ہوا والسّماء والطّارق۔ یہ پیشگوئی میرے والد کے متعلق ہے۔ اور وہ آج ہی غروب آفتاب کے بعد وفات پائیں گے اور یہ قول خدا تعالیٰ کی طرف سے بطور ماتم پرسی کے ہے۔ (نزول المسیح ص ۱۱۹ ص ۱۸/۴۹۴)

الہام نمبر ۲

پیشگوئی نمبر ا سے متعلق، پھر یک دفعہ غنودگی آئی اور یہ الہام ہوا اَلیس اللہ بکافٍ عبدہٗ کیا خدا اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہر ایک پہلو

سے وہ میرا ناصر و معاون ہوا۔ مجھے صرف اپنے دستر خوان اور روٹی کی فکر تھی۔
مگر اب تک اس نے کئی لاکھ آدمی کو میرے دستر خوان پر روٹی کھلائی۔ ڈاک خانہ
والوں کو خود پوچھ لو کہ کس قدر اس نے روپیہ بھیجا۔ میری دانست میں دس لاکھ
سے کم نہیں۔ اب ایمانًا کہو کہ یہ معجزہ ہے یا نہیں۔ (نزول المسیح ص ۴۹۵/۱۹ رص ۱۱۷ مع
(نزول المسیح ص ۴۹۵/۱۱۹ ص ۱۱۷ و ص ۱۱۸ ص ۴۹۶/۱۲۰)

وحی: پیشگوئی نمبر ۱۰ ۱۸۸۰-۸۲ء انا اعطیناک الکوثر یعنی ہم تجھے
بہت سے ارادت مند عطا کریں گے اور ایک کثیر جماعت تجھے دی جائے گی۔ دیکھو
اس پیشگوئی کو بیس برس گزر گئے اور اب وہ کثیر جماعت ہوئی اور نہ صرف ستر ہزار
بلکہ اب تو یہ جماعت لاکھ کے قریب ہو گئی اور ان دنوں میں ایک بھی نہ تھا طاعون
کے دنوں میں کامل ظہور ہوا۔ (نزول المسیح ص ۵۰۹/۱۳۴ ص ۱۳۱)

وحی: پیشگوئی نمبر ۱۹ ۱۸۸۰-۸۲ء۔ جس زمانہ میں براہین چھپ رہی تھی روپیہ
کی آمدن میں قدم قدم پر تنگی تھی۔ کوئی جماعت نہ تھی جس سے چندہ لیا جائے،
اس لیے مدت تک مسودہ کتاب کا معطل پڑا رہا۔ اور الہامات تسلی دیتے تھے کہ
یہ تمام کام ہو جائیں گے اور ایک جماعت بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ منجملہ ان کے بعض
انگریزی الہامات ہیں اور میں انگریزی نہیں جانتا۔ اس کوچہ سے بالکل ناواقف
ہوں۔ ایک فقرہ تک مجھے معلوم نہیں مگر خارق عادت طور پر مندرجہ ذیل الہامات
ہوئے۔

• آئی لو یُو۔ آئی ایم وِد یُو۔ آئی شل ہیلپ یُو۔ آئی کین وَیٹ آئی وِل ڈو۔
وِی کین وَیٹ وی وِل ڈو۔ گاڈ از کمنگ بائی ہز آرمی (صفحہ ۴۸۰ و ۴۸۱)
ترجمہ: میں تم سے محبت رکھتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہاری مدد
کروں گا۔ میں کر سکتا ہوں جو چاہوں گا۔ ہم کر سکتے ہیں جو چاہیں گے۔ خدا ایک
لشکر لے کر چلا آتا ہے۔ (ص ۵۱۵/۱۳۹ ص ۱۳۷ و ص ۵۱۶/۱۴۰ ص ۱۳۸ نزول المسیح)

پیشگوئی نمبر ۲۹: ۱۸۸۰-۸۲ء تاریخ ظہور پیشگوئی ۱۸۹۵-۹۷ء:
وحی: اَلْفِتْنَۃُ ھٰھُنَا فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ دیکھو براہین احمدیہ
ص ۲۴۱ اور اس وقت تیرے لیے ایک فتنہ برپا ہو گا۔ سو صبر کر جیسا کہ اولوالعزم

(نزول المسیح صفحہ ۱۴۹ صفحہ ۵۲۹/۱۵۱)
نبیوں نے صبر کیا ہے۔
الہام: ہی از ود یو تو کل اینیمی (ترجمہ) وہ دشمن کو مغلوب اور ہلاک کرنے کے
(تذکرہ صفحہ ۶۵)
لیے تمہارے ساتھ ہے۔
الہام: دی ڈیز شل کم وہن گاڈ شیل ہیلپ یو۔ گلوری بی ٹو دس لارڈ گوڈ
میکر اوف ارتھ اینڈ ہیون۔
الہام: آئی لو یو۔ آئی شل گو یو اے لارج پارٹی اوف اسلام (ترجمہ) میں تم سے
محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں ایک بڑا گروہ اسلام کا دوں گا۔ (تذکرہ صفحہ ۱۰۳)
الہام: یو مسٹ ڈو وہاٹ آئی ٹولڈ یو۔ دو آل من شڈ بی انگری بٹ گاڈ از
ود یو۔ ہی شل ہیلپ یو۔ وارڈس آف گاڈ ناٹ کین ایکس چینج۔ یو ہیو ٹو
گو امرت سر۔ ہی ہل ٹسن ان دی ضلع پشاور۔ (تذکرہ صفحہ ۱۱۱ و صفحہ ۱۱۲)
دس از مائی اینیمی (یعنی یہ میرا دشمن ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۲۶۵)
اے ورڈ اینڈ ٹو گرلز۔ (تذکرہ صفحہ ۵۹۳)
یو مسٹ ڈو وہاٹ آئی ٹولڈ یو۔ تم کو وہ کرنا چاہیے جو میں نے فرمایا ہے۔
(یہ اردو عبارت بھی "الہامی" ہے) دو آل من شڈ بی انگری بٹ گاڈ از ود یو۔ ہی
شل ہلپ یو۔ وارڈس آف گاڈ ناٹ کین ایکس چینج۔

حاشیہ: چونکہ یہ غیر زبان میں الہام ہے اور الہام الٰہی میں ایک
سرعت ہوتی ہے اس لیے ممکن ہے کہ بعض الفاظ کے ادا کرنے میں
کچھ فرق ہو۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض جگہ خدا تعالیٰ انسانی
محاورات کا پابند نہیں ہوتا یا کسی اور زمانہ کے متروکہ محاورہ کو اختیار
کرتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ بعض جگہ انسانی گرامر یعنی
صرف و نحو کے ماتحت نہیں چلتا۔ اس کی نظیریں قرآن شریف میں
بہت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ آیت ان ھذان لساحران۔
انسانی نحو کی رو سے ان ھذین چاہیے۔ (تذکرہ صفحہ ۱۱۶)
منوٹ: جرأت ملاحظہ ہو اپنے کلام کے عیب کو چھپانے کے لیے اللہ تعالیٰ
کے کلام پر اعتراض وارد کر دیا۔ (نصر احمد)
(جاری ہے)

ایں چہ بوالعجبیست؟

از عبدالرحمان خان مہمند

پاکستان اسلام کو ایک قوت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے وجود میں آیا۔ ایک غیر ملکی مستبدانہ نظام کی اعلیٰ استعماری طاقت اور ہم وطن مکارانہ شاطر کی حامل عظیم اکثریت کے مقابل ہمارے پاس اپنے تشخص کو منوانے اور تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے اندر اپنے وجود کی بقا و نشوونما کی خاطر اس کے سوا فی الحقیقت اور کوئی چارہ ہرگز نہیں تھا کہ ہم اپنے مخصوص بنیادی جُز و ترکیبی کی بنا پر اپنی الگ قومیت کا نعرہ بلند کریں! اسلام کو نظریۂ پاکستان کی شکل ملنے سے بہت پیشتر جبکہ برصغیر ہند میں مسلمان ایک Ruling Community کے طور پر نہایت واضح، متمیز اور اپنی بہترین شناخت رکھتے تھے، یہ کبھی ضرورت محسوس ہی نہیں کی گئی تھی کہ اپنے مذہب و دین کو نعرہ یا عزائمِ مستقبل کی بنیاد بنایا جائے۔ چنانچہ خاندانِ غلاماں سے لے کر مغلیہ دورِ حکومت تک کے طویل عرصہ میں معدودے چند حکمرانوں کو جزوی طور پر چھوڑ کر ہمیں کہیں بھی اسلام ایک مکمل دین کی حیثیت میں کارفرما نظر نہیں آتا! وہ تمام ادارے جو اسلام کے حوالے سے ایک دینی ریاست میں ہونا ناگزیر ہیں، اپنی روح و جسم کے اعتبار سے قریب قریب ناپید کے دائروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں اور اسلامی شعائر پر مبنی اعلیٰ و ارفع نظامِ حکومت اور مثالی صالح معاشرے کے تکوینی اجزاء "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے" کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ توارث پر مبنی شہنشاہانہ نظامِ ریاست کی بدولت اور اپنے مخصوص پس منظر و پیش منظر کی بنا پر اس طویل دور کے حکمرانوں کو یہ بصیرت حاصل ہی نہیں تھی کہ اسلام اپنی کُل کے اعتبار سے مقصدِ واحد کا حامل ہے: یعنی انسانیت کو کفر، شرک اور لادینیت کی تاریکیوں سے نکال کر علم و ایمان کی روشنی میں لانا اور پھر بندگانِ خدائے واحد و برتر کی لڑی میں اپنی بہترین ساخت پر پرونا۔ مسلمان کا انفرادی سطح پر بالعموم اور ریاستی سطح پر بالخصوص عین فرضِ منصبی ہے اور یہ جڑ ہے ایک تناور اور بارآور صالح معاشرے کے پُرشکوہ پودے کی!

اگر یہ مقصد واقعتاً پیشِ نظر ہوتا تو صدیوں پر مشتمل حکمرانی کو اپنے بہترین اسلامی و عمرانی نتائج کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے ہم ایک راست سمت میں متعیّن حاکمانہ دور سے تعبیر کر سکتے تھے اور آج کا جغرافیہ اپنی ہیئت کے ساتھ ساتھ اپنی تاریخ سے بھی یقیناً مختلف ہوتا! کرۂ ارض کے اس عظیم خشک و متصل ٹکڑے پر اگر صحیح اسلامی معاشرے کے خدوخال نمایاں ہو جاتے تو زمین کے باقی وسیع و عریض خطوں کے باسیوں کی زندگی میں بھی ایک انقلابِ عظیم کی توقع رکھی جا سکتی تھی اور آج یہ علاقہ باہم ٹکراؤ تو کجا اب تک شاید قریبی بیرونی تصادم کی لہروں سے بھی آگے کی منزلیں طے کر چکا ہوتا!

مگر جو منظر فی الواقع تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے (الّا ماشاء اللہ) اپنے فرضِ اوّلین کی طرف توجہ کرنے کی بجائے باہمی مناقشات، اکھیڑ پچھاڑ، محلاتی سازشوں اور اقتدار کے حصول یا دوامِ اقتدار کی جدوجہد ہی میں اپنی جملہ صلاحیتوں کو کھپانا کامیابی و کامرانی کی کلیدِ بے نظیر سمجھ لیا۔

زیادہ سے زیادہ توجہ اگر کسی امر پہ سنجیدگی کے ساتھ مرتکز کی تو وہ محض ہوسِ مجوعُ الاَرض ہی تھی۔ ایک ایسی فتح کی طرف قدم بڑھائے جاتے جس کے پیچھے اس سطحی طرزِ فکر کے سوا کوئی اعلیٰ تعمیری سوچ کارفرما ہی نہ ہوتی کہ عظمت کی تحصیل ریاستی حدود کی وسعت میں مضمر ہے! ایک ایسی ریاست کی توسیع جو دعوت الی اللہ کا کام بالقول اور نہ ہی بالفعل سرانجام دیتی ہو، کے لئے ہزارہا انسانوں کی قربانی اسلامی نقطۂ نظر سے محلِّ نظر ہی ٹھہرے گی۔
لیکن شخصی وجاہت اور خاندانی امارت کا نشہ کچھ ایسا تیز چڑھا کہ حقیقتِ نفس الامری مسلمان دل و دماغ سے اوجھل ہو کر رہ گئی۔ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فطری تقاضا تو یہ تھا کہ اپنے وسیع اختیارات اور بسیط علاقے پر کم و بیش مکمل تمکن کی بنا پر یہ مسلمان حکمران اسلام کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش بالضرور کرتے مگر اس کے برعکس تاریخ کے اوراق ہمیں کج فہمی کی یہ سیاہ تصویر دکھاتے ہیں کہ غیر مسلم رعایا کے ساتھ نارواداری کا سلوک روا رکھنا ہی اسلام کی بہترین خدمت سمجھ لیا گیا بلکہ ایسے دریدہ باطن حکمران بھی اپنی عظمت کے ڈھول عرصۂ دراز تک پیٹتے رہے کہ جنہوں نے شرک و کفر کو ایوانِ حکومت کے اندر لا کر سجایا اور ع چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی کے مصداق الحاد و پیوندکاری کے جرثومے اسلامی ریاست کے سربراہِ امورِ کُل نے اپنے داعیٔ حق کے مقام کو یکسر پسِ پشت ڈال کر خود اپنے ہاتھوں سے لگانے کی بے باکانہ جسارت کی۔ چونکہ ایسے گم کردہ راہ حکمرانوں کو اکثر و بیشتر مرغِ دست آموز ملاء درباری دستبرد ہر دور میں مل ہی جایا کرتے ہیں۔ لہٰذا جس کسی نے بھی راہِ راست سے ہٹ کر علیحدہ ڈفلی بجانے کی کوشش، تال ملانے والے اسے وہیں سے فوراً مل جاتے رہے اور ملّت کا کارواں دوسروں پر حجّت بننے کی بجائے خود اپنے دین کے لئے ایک مضحک صورتِ حال اور افسوسناک نتائج کا پیش خیمہ بنتا رہا!! جب جگانے والا خود ہی سو جائے اور نہ وہ کسی دوسرے کو یہ "عملِ ناپسند" کرنے کی اجازت دے تو زندگی کی حقیقی نمو کہاں سے پیدا ہوگی؟

وسیع تاریخی تناظر میں جہاں ہمیں التمش و اورنگ زیب جیسے درویش صفت حکمران نظر آتے ہیں وہاں ہم یہ بھی ساتھ ہی دیکھتے ہیں کہ محض ایک شخصیت کے اپنی ذات سے پھوٹنے والے اثرات کوئی ہمہ گیر دائمی نہیں ہوتے جبکہ وہ شخصیت اپنی مخصوص طبیعت کے اعتبار سے ایک خاص دائرہ عمل میں ہی اپنے آپ کو محدود رکھے اور اپنی حیثیتِ کُلی کے لحاظ سے حقیقی طور پر مطلوب کردار کا مظاہرہ نہ کرے یا بوجوہ نہ کر سکے! حکمران اگر ریاست کا سربرآوردہ ترین شخص ہوتا ہے تو احتساب و پرسش اور تنقید و تنقیح کے لحاظ سے بھی اس پر بڑی بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ لیکن اس برِصغیر میں ملّتِ اسلامیہ کی یہ بڑی بدقسمتی رہی کہ عمومی طور پر حکمرانانِ اسلامی اپنے ہی محدود خیالات و افکار (چاہے وہ ان کی شخصی عظمت کی نہج پر کتنے ہی مستحسن کیوں نہ ہوں) میں غلطاں و پیچاں رہے اور نہ تو اندرونی طور پر انہوں نے مستقل دل جمعی اور ایک مضبوط منصوبہ بندی کے تحت غلغلۂ اسلام بلند کرنے کے لئے کوئی پُرخلوص کوشش کی اور نہ وہ اصلاحِ مملکت و معاشرہ اور نفاذِ دین کے فریضۂ اولیٰ سے فارغ ہونے کے بعد بیرونی دائروں میں اسلام کا شمشیرِ بُرّاں ثابت ہو سکے! یہ حقیقت کس قدر تکلیف دہ ہے کہ صدیوں تک ایک انتہائی وسیع خطۂ زمین پر عظیم الشان مملکت و سطوت رکھنے کے باوجود ہمارے بزعمِ خویش "مسلم حکمران" بہترین حکمت، ماسبق تعلیم و تبلیغ، اعلیٰ امثال و آثار، قوّتِ قاہرہ کے احسن ترین استعمال اور جملہ وسائل کے صحیح تصرّف کے ذریعے اسی سرزمین

باشندوں کی ایک عظیم اکثریت کو حلقۂ بگوشِ حق نہ کر سکے جبکہ دوسری طرف تاریخ تطبیق ہمیں یہ منظر بھی دکھاتی
ہے کہ باطل ادیان و فکر کو اپنے عقیدہ و فکر میں راسخ حاکموں نے قوتِ قاہرہ اور وسائل کے استعمال محض یا استعمال
حکمت سے نہ صرف خوب پھیلایا بلکہ زیر دستوں کے ذہنوں سے پرانے یقین و ایقان اور اعتقاد و اعتماد کے نقوش
کھرچ کر رکھ دیے! جب باطل اپنے خام اور ادھورے نظریہ کے لئے اتنا مخلص ہو سکتا ہے تو کیا یہ نحوست
صرف مسلمان حکمرانوں کے مقدر میں ہی لکھی ہوئی ہے کہ وہ اپنے مبنی بر حق اعلیٰ ترین نظریات کے لئے فکر و عمل کے
میدان میں کوئی ٹھوس قدم اٹھانے سے شعوری یا لاشعوری طور پر عاجز رہ جاتے ہیں؟ مسلمان سلطنتوں کی
ساط لف و نشر کے مراحل سے گزرتی رہتی ہے۔ مگر رجعت قہقری کا عمل بھی کم و بیش ساتھ ہی ساتھ جاری رہتا ہے!
آباء کی گمبھیر اور انتہائی کوتاہ اندیشانہ غلطیوں اور لغزشوں کا خمیازہ مسلم ملت کو برصغیر ہند میں یوں بھگتنا
پڑا کہ کل کے پرشکوہ حاکم آج کے نکبت و ادبار میں ڈوبی ہوئی قوم میں تبدیل ہو گئے۔ اور چونکہ یہاں وسیع تر دینی اصلاح
کی بنیاد پر اشاعتِ دین کی کوئی وسیع کوشش پچھلے کسی سنہری دور میں علی العموم نہیں کی گئی تھی، لہٰذا اب کفر کی عظیم
اکثریت کا خوفناک عفریت اپنے پچھلے ناعاقبت اندیش فیاض و روادار حاکم کو محکوم بلکہ درحقیقت معدوم کر دینے کی
نیتِ خبیثہ کے ساتھ آگے بڑھا اور نئے انقلاب کے مابعد مہلک اثرات کے تحت اپنے منفعل اور وقت ناشناس
طرزِ عمل کے باعث ممکن ہے کہ ملتِ اسلامیہ نرم نوالہ ثابت ہوتی اور اس برِ عظیم میں عدم کی طرف بڑھنے والی گرافک
لائن (Graphic Line) کو وسیع زمانی دائروں اور تہہ در تہہ تہذیبی، معاشی اور سیاسی فصول
میں اپنی زشت خو، انتہائی تنگ نظر اور اسفل عزائم کی حامل متحارب اکثریت کے بُنے ہوئے جال میں نقطۂ منتہا
تک پہنچا دیتی، مگر قدرت کو ہی رحم آگیا اور اعمالِ بد کی پاداش میں زناٹے کا تھپڑ کھانے کے بعد ملت کی ڈوبتی ہوئی کشتی
کو ایسے ناخدائے ملت چلے گئے کہ جنہوں نے اپنی اپنی سمجھ و فہم کے اعتبار سے اپنی اپنی مخصوص حدود و قیود میں بقائے
ملت اور پھر احیائے ملت کے لئے اخلاص و جہد سے بھرپور کوششیں کرنا شروع کر دیں۔
بقا اور احیاء کا یہ دور بھی قریباً ایک صدی کا وقت کھینچ لے گیا۔ اور آخر کار طویل، پیہم اور کٹھن جد و جہد کے
نتیجے میں وہ روشن صبح طلوع ہو گئی کہ جس میں ایک نئی زندگی کا آغاز مسلمان قوم کے لئے مجموعی طور پر اور خصوصی
فوری نہج پر ایک مخصوص اور محدود گروہ ملت کے لئے ابتدائی نشو و نما کا سامان فراہم کر دیا گیا تاکہ بعد ازاں ضروری
کمر ہمت کسنے کے بعد بقیہ محکوم ملت کی رہائی عمل میں آسکے! لیکن اس روشن صبح کے افق پر واضح مقاصد کی خاطر
جھیلے گئے شدید ابتلاء اور پیش کی گئی عظیم قربانیوں کی سُرخی اتنی زیادہ گہری تھی کہ اگر صرف وہ خونچکاں منظر ہی
من حیث القوم ہم سب کے پیشِ نظر رہتا اور بالخصوص حکمران قوم اگر اسی خون خون رہگذر کے خمیر سے اٹھنے والے
داعیات کو اپنے اہداف میں تبدیل کر لیتے تو یقیناً آج کا نقشہ کچھ بہت ہی مختلف ہوتا! کیونکہ درست سمت میں متعین
طور پر اٹھتے ہوئے قدم کبھی پسپائیوں سے آشنا نہیں ہوتے اور صحیح زاویے پر کیا گیا درست کام جس کی بنیاد صحیح فلسفہ
و نظریہ ہو، کبھی ناکام نہیں ہوا کرتا مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

قائدِ اعظمؒ کو ہم اس لئے کسی طرح بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ قیام پاکستان کے بعد انہیں اتنی فرصت
و مہلت ہی نہ مل سکی کہ وہ ایک پائیدار اور حقیقی معنوں میں اسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ دورِ نو کی تشکیل کر سکیں۔
اور اگرچہ ایک سال کی مدت کوئی اتنی حقیر نہیں ہوا کرتی مگر نوزائیدہ ریاست کو درپیش شدید اندرونی و بیرونی حملے

اور ان کی انتہائی عدم صحت مطلوبہ بنیادی ڈھانچہ کھڑا کرنے میں مانع ہوگئی! بہ ایں ہمہ اس نازک وقت کی گونا گوں اور فوری نوعیت کی پیش آمدہ پریشانیوں، کلفتوں اور چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہوں نے جس طرح اپنے تن ناتواں سے بے رحمانہ کام لیا، حقیقت یہ ہے کہ ان کی پچھلی تمام بلند کرداری، اولوالعزمی اور عظیم لیڈرشپ کو ایک طرف رکھتے ہوئے بھی ان کی اپنی شخصی عظمت کے ثبوت کے لئے مجرّد طور پر صرف یہی امر پیش کیا جاسکتا ہے۔ وہ اگر صحت مند پیمانوں پر مزید دس سال بھی فعال رہ سکتے تو یہ ایک بدیہی گمان ہے کہ بات اپنی صحیح ترتیب سے طے پاجاتی اور قافلۂ ملّت کافی آگے بڑھ چکا ہوتا! لیکن اللہ رب العزّت کو اگر ان کی رحلت ہی منظور تھی۔ جب بھی اللہ و رسول صلعم کی زندہ و ابدی ہدایت، طویل تاریخی آگہی اور خود بانیٔ ریاست کے نئی تعمیر و تشکیل کے حوالے سے واشگاف عزائم و اعلانات ملّت کے اس کارواں کو آگے کی راست سمت میں بڑھانے کے لئے بہت کافی تھے!

مگر ہوا کیا؟ ——— ہوا یہ کہ "کھوٹے سکّے" نئی منڈی میں چل نہ سکے۔ کساد بازاری میں اصولوں اور اخلاقی قدروں کے بھاؤ اتنے گرے کہ ہر شخصیت کا دیا اپنے مصنوعی جامے سے باہر آگیا۔ اعلیٰ مناصب اور اقتدار کی امانتوں کے امین وقت کے تیور تو کیا پہچانتے، وہ تو سطحی معیارات سے بھی نیچے جاگرے! وسیع تاریخی تلخ حقائق کا شعور یہ احساس دلانے کے لئے کافی تھا کہ انہیں متعیّن کردہ منزل کی طرف تیز رَو ہونا پڑے گا مگر لمحاتی فوائد، عبوری عشرتیں اور عارضی نشۂ اقتدار ان سے عقل و فہم اور راست راہِ عمل اپنانے کی ساری توفیق چھین کر لے گیا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اسلام (جو بنائے قیام تھا) کو ایک مکمل نظامِ حیات کے طور اختیار کرنے کے لئے ہمہ جہتی کوشش کا آغاز فوراً ہوجاتا تاکہ اصل منزل کی جانب راستے سُکیڑے جاسکیں، لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ بلطائف الحیل لغویت کی حد تک کٹ حجتی سے کام لیا گیا۔ مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ کی تقلید کی بجائے اپنے دین سے کھلے اعراض کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔ اور کس قدر ندامت کی بات ہے کہ وہ ریاست جو خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ شہادت علی الناس کا عہد بالجزم کرکے حاصل کی گئی تھی اور جس کی تشکیل کا مقصدِ وحید دورِ جدید میں قرآن و سنّت کے برتر و برحق احکامات کو تجربے کی کسوٹی پر نکھار کر بقیہ وسیع انسانیت کے لئے اتمامِ حجت کرنا علیٰ رؤس الاشہاد قرار پایا تھا، اسی ریاست کے خود کار فرما والی موالی اسے معکوس رُخ پر لے جانے کی کوشش میں ہمہ تن اخلاص بن گئے اور اگر کسی مردِ حق نے توجہ دلائی کہ کئے گئے عہد و پیمان کے مطابق دین کی لفظاً و معناً تنفیذ کا اہتمام کرنا عنداللہ و عندالناس ایک ناگزیر تقاضا ہے تو جواباً قبلہ درست کرنے کی بجائے کٹ مُلّا کی پھبتی کس کر اس کی تضحیک اڑانے کی کوشش کی گئی اور نقضِ امن کا مجرم ٹھہرایا گیا۔ مگر فی الواقع یہ تضحیک کس کی اڑی! حقیقی استہزاء کس کا ہوا! صحیح معنوں میں اللہ و قوم کے نزدیک مجرم کون ٹھہرا؟ ——— اس کے جواب کے لئے کسی علامۂ دہر کی ضرورت نہیں ہے۔

ایسے ایسے جہلِ مرکب حکمران اس ریاستِ خداداد کو دیکھنے نصیب ہوئے جو نفاذِ اسلام کے مطالبے کو ذہنی بازی کی سان پر چڑھانا اپنی ہوشیاری کی ایک محکم دلیل سمجھا کرتے تھے اور جن کا سارا عمل زبانِ حال کی بجائے زبانِ مقال کی نوک پر ہی رہتا تھا ——— ایک کے بعد دوسرا، بزعم خود پہلے سے بڑا، یہاں بساطِ حکومت بچھاتا رہا۔ بڑا ذہین، حالات بصیرت میں بڑا تیز، خود کو ڈپلومیسی کا انتہائی ماہر سمجھنے والا اور قوم کی نبض پر ہاتھ رکھنے

ہویدا، مگر "بحیثیت مسلم حکمران" حکمرانی کی حقیقی اساس کیا ہے! یہ سمجھنے سے قاصر! چنانچہ نقضِ عہد کی پاداش میں
ریاست کا ایک بازو ٹوٹنے پر بھی کسی کو غضبِ خدا سے ڈرنے کا خیال نہیں آیا۔ کسی نے قوم کے صبر و شکیب
امتحان لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور کسی نے علیٰ قدرِ مراتب اپنے فرضِ حقیقی کی طرف راجع ہونے کی ضرورت
محسوس نہ کی! قوم اگر اصل مقاصد کے تکمیل پذیر نہ ہونے پر کڑھتی ہے تو کڑھتی رہے لیکن اعلیٰ سطح پر پرتلہ
یا بجے گا اور

ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے۔

ترانہ علی التواتر گایا جائے گا! قوم زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کر سکتی ہے تو فقط یہ کہ کبھی کبھار کسی مخلص و بظاہر
رہنما یا رہنماؤں کی پکار پر اپنے بنیادی قلبی جذبوں کی شدت کے تحت بے نظیر قربانیاں پیش کر دے۔ نقشہ بدل
جائے گا مگر نہ تو رہنما یا رہنماؤں کا خلوص سچا نکلے گا اور نہ ہی عملی طور پر موعودہ نتائج کی بہار پرانی خزاؤں پر مرہم
رکھ سکے گی۔ اور قوم کی اس "ضرورت سے زیادہ دین پسندی" کے لئے یہی تازیانہ کافی رہے گا —— ایک مسلسل
اضطراب، ایک دائمی کڑھن!

لیکن کڑھن کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور لازم نہیں کہ اگر بازاروں میں لوگ بظاہر ویسے ہی خوش و خرم نظر
آتے رہیں تو مطلب یہ لیا جائے کہ سب مطمئن ہیں۔ یہی غلطی ہمارے سابقہ حکمرانوں سے ہوتی رہی اور عموماً یہی
وہ بھول ہوتی ہے کہ جس کے نتیجے میں انقلاب کا لاوا جب زیرِ زمین پکتے پکتے یکدم ابلتا ہے تو مقابلے کی تاب
نہ پا کر حکمران حیرانی سے پوچھتا ہے کہ کیونکر ہوا! ظاہری سطح پر مزاجِ قومی کھلنڈرا اور غیر ذمہ دارانہ نظر آتا ہے مگر
حقیقت یہ ہے کہ اپنی تمام تر بداعمالیوں اور غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کے باوجود یہ قوم بنیادی طور پر اسلامی و سیاسی
شعور کے اعتبار سے زبردست نقادانہ ذہن رکھتی ہے۔ قوم بحیثیتِ مجموعی ہر بار ایک نئی امید باندھتی ہے کہ ہمارا
یہ نیا سربراہ ایک نظریاتی مسلم ریاست کے امیر کی حیثیت میں اپنی ظاہری و باطنی ذمہ داریوں کو کما حقہٗ پورا کرنے کی
سعی ضرور کرے گا لیکن پھر آہستہ آہستہ جب توقعات نومیدی کے بھنور میں پھنس جاتی ہیں تو افراد اپنے اپنے دائرۂ
عمل میں اپنی اپنی بے اعتدالیوں کو یہ جواز مہیا کر لیتے ہیں کہ جب حکمران ہی اپنے قول و فعل میں مخلص نہیں اور
اپنے فرائض سے متواتر غفلت برت رہا ہے تو ہم کیا کریں؟ ہمیں اسی رنگ میں رنگے ہوئے معاشرے میں عزت کے
ساتھ زندہ رہنا ہے اور اس کے لئے بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے مواقع دوسروں کے ساتھ اگر ہمیں بھی حاصل
ہیں تو "کفرانِ نعمت" کر کے ہم خود کو عذاب میں کیوں ڈالیں؟! اس طرح منفی سوچ کی لامتناہی لہروں کا یہ تانا بانا
الجھتا سلجھتا آگے بڑھتا ہے اور بدی و کجروی کے ایک دیے سے دوسرا دیا جلتا چلا جاتا ہے۔ اور جب ان بہت سے
جلتے ہوئے دیوں کی تاریک روشنی کم و بیش سارے آنگن کو "منور" کر دیتی ہے تو ایک نیک نیت حکمران پر بھی مایوسی
کے بادل چھا جاتے ہیں اور وہ اپنے تئیں پورے انشراحِ صدر کے ساتھ یہ عذر پیش کرتا ہے کہ من حیث المجموع
قوم میں "صراطِ مستقیم" اپنانے کا داعیہ موجود ہی نہیں۔ لہٰذا اگر ایسے ماحولِ کشاکش میں اصلاح کے زینے پر قوم کو چڑھانا
مقصود ہے تو اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ قدم بہت ہی آہستہ آہستہ آگے بڑھائے جائیں۔

چنانچہ پھر تدریج کے فلسفے پر عمل شروع ہوتا ہے۔ ایک ایسی تدریج جو صحیح تر اسلامی فہم اور انسانی فطرت
و طبائع کو مدِنظر رکھتے ہوئے راست تدریج نہیں ہوتی۔ نیک نیت حکمران خرابی کی جڑ پر کلہاڑا چلانے کی بجائے
کبھی ایک شاخ کاٹتا ہے اور کبھی دوسری طرف سے پتے جھاڑتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اتنی دیر میں پہلی شاخ دوبارہ

پھوٹنا شروع کر دیتی ہے اور جب وہ پہلی شاخ کی طرف دوبارہ جھکتا ہے تو تیسری طرف کونپلیں اگ رہی ہوتی ہیں۔ اس طرح اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہوتی ہے جو اپنی بھیڑوں کا بچاؤ سانپ کے مارنے کی بجائے ہر نئی ڈسی جانے والی بھیڑ کے الگ الگ علاج کے اصول پر رکھتا ہے۔ وہ معاملے کو صحیح طریق پہ نمٹنے سے یا تو واقف نہیں ہوتا یا پھر ایسا کرنے میں اسے خواہ مخواہ کے ادھورے خدشات پریشان کرنے لگتے ہیں۔ وہ اگرچہ صحیح معنوں میں ایک اسلامی فلاحی مملکت کی اٹھان کے ارادے باندھتا ہے مگر اس کا عمل اس کے عزم سے متعلق مریح مقتضیات کے بالکل نقیض پڑتا ہے۔ اصلاح کا بیڑا اٹھاتا ہے مگر بیچ میں ہی لنگر ڈال کر کسی دوسری سمت میں اپنی کشتی لے کر چل پڑتا ہے۔ بہترین دین پر مبنی اعلیٰ نظام کی لہلہاتی فصل کے حصول کی غرض سے بڑے اخلاص کے ساتھ بیج ڈالتا ہے مگر وہ نہ تو انتہائی گراں قیمت بیج ڈالنے سے پیشتر ضروری سطح پر زمین کی تیاری کی احتیاج محسوس کرتا ہے اور نہ ہی وہاں پہلے سے اُگے ہوئے ڈنٹھل ہٹا کر ہل چلاتا ہے۔ چنانچہ اس کا اچھائی کی طرف سارے کا سارا سفر اور نیکی کے گل و گلزار سجانے کی خاطر ساری کی ساری سعی، سعیٔ لاحاصل بن کر رہ جاتی ہے۔ جس کا سب سے مہلک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ناکامی کی اصل وجوہ پر نظر تو کم ہی لوگوں کی ہوتی ہے مگر عمومی طور پہ بیج کی افادیت ہی مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔

وہ اپنے دوام حکمرانی کی اساس مبادیاتِ دین کی تنفیذ و تکمیل کے بلند آہنگ عزائم اور دعووں پہ رکھتا ہے مگر وہ خود گاڑی کو سیدھا چلانے کی بجائے بر ایچ لائنوں پہ لئے پھرتا ہے اور اگر کوئی اس کی کوتاہی کی نشاندہی کنایتاً یا قطعیت کے ساتھ کرنے کی کوشش کرے اور انجن کی بنیادی خرابیوں اور مسافروں کو لگنے والے جھٹکوں کی وجہ انہی مبادیاتِ دین کے ضوابط کی روشنی میں بیان کرے تو وہ اکثر و بیشتر اسے درخورِ اعتناء ہی نہیں سمجھتا۔ کیونکہ "ذی فہم" اور "آدابِ خسروانہ سے واقف" "مشیرانِ کرام کی" "نظرِ عمیق" میں یہی طرزِ عمل حالات و واقعات سے مطابقت رکھتے ہوئے سودمند ہوتا ہے اور اگر کبھی وہ "مخلص حکمران" اپنے فطری اخلاص کی جبلت کے تحت صائب بات پر کان دھرتا بھی ہے تو مختلف نام نہاد خدشات اور "درباری امراء" کی طرف سے پیش کی گئی موہوم منفی نتائج کی ہولناک تصویر کشی عمل مثبت کی راہ میں پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ اور نتیجہ نکلتا ہے "وہی ڈھاک کے تین پات!" بات وہیں اٹکی رہ جاتی ہے۔ بلکہ درحقیقت وقت کے ساتھ ساتھ معکوس سفر طے کرتی ہوئی پہلے سے زیادہ مشکل عقدے پیدا کر دیتی ہے۔

(باقی آئندہ)

عن عثمان قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم

خيركم من تعلم القرآن وعلمه

عن انسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

قال

لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ

(رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جیسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

امپورٹ۔ ایکسپورٹ کا قابلِ فخر ادارہ
ربن بو انٹرنیشنل
برآمدی اشیاء
آرٹ سلک فیبرکس گارمنٹس ٭ بیڈ شیٹس
کاٹن کلاتھ ٭ کاٹن گارمنٹس ٭ احرام تولیہ ٭ تولیہ
ہینڈی کرافٹس ٭ لکڑی کا فرنیچر۔
درآمدی اشیاء
لاکھ دانہ ٭ سٹکر فلم ٭ سوچ سٹارٹر
ربڑ لیٹکس ٭ پولیسٹر ریان۔
مرکزی دفاتر
I فلور غلام رسول بلڈنگ ۶۔ شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور
ذیلی دفاتر:۔ کراچی ۔ فیصل آباد۔

THE ORIGINAL

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 33	FEBRUARY 1984	No. 2

اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین

اسرار احمد کے قلم سے

پہلا سفر سرما اور وطن میں شب

ماہنامہ میثاق لاہور

ماہنامہ لاہور

میثاق

جلد ۳۳ | شمارہ ۳ | جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ مطابق مارچ ۱۹۸۴ء

مشمولات

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون : ۸۵۲۶۱۱

سب آفس : ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

جمیل الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

الحمدللہ والمنہ 'میثاق' کا شمارہ بابت جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ مطابق مارچ ۸۶ء پیشِ خدمت ہے۔ اس شمارے میں امیرِ تنظیمِ اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے "توحیدِ عملی کا اقامتِ دین سے ربط و تعلق" کے موضوع پر خطاب کی دوسری قسط شامل ہے۔ اس طرح یہ خطاب مکمل ہو گیا ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ سے سورۂ شوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۲۱ کے درس کی اشاعت شروع ہو گی۔ یہ درس بھی دو اقساط میں شائع ہو گا۔

"الھدیٰ" کے ٹائٹل کے تحت ٹیلیویژن پر امیرِ محترم کے جو دروس ہوئے تھے اس ضمن میں سورۂ فاتحہ کے درس کی تیسری نشست کا درس اس شمارے میں شامل ہے۔ سورۂ فاتحہ کی چوتھی نشست کا درس ہمارے پاس ریکارڈ نہیں ہو سکا تھا۔ اسی طرح سورہ حٰمٓ السجدہ کے درس کی آخری نشست کا درس بھی ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ اگر قارئینِ میثاق میں سے کسی صاحب کے پاس یہ دونوں درس کیسٹ میں موجود ہوں تو ان سے درخواست ہے کہ وہ ادارہ کو مطلع فرمائیں تاکہ ان سے یہ کیسٹ مستعار منگا کر ان دروس کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا جا سکے۔ بعدہٗ یہ کیسٹ واپس کر دیئے جائیں گے۔ امید ہے کہ جن حضرات کے پاس یہ دروس موجود ہوں گے وہ جلد از جلد ہمیں مطلع کر کے تعاون فرمائیں گے۔

تنگیٔ داماں کے باعث اس شمارے میں 'شرک اور اقسامِ شرک' کی پانچویں قسط اور 'ایں چہ بوالعجبیست' کی دوسری قسط روکنی پڑی جس کے لیے ہم قارئین سے طالبِ معذرت ہیں۔ اسی وجہ سے "عرضِ احوال" میں بھی نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

شمالی امریکہ کی حالیہ دعوتی دورے کی روداد عزیزم میاں حافظ عاطف وحید تو اپنے امتحان کی تیاری کی وجہ سے نہ لکھ سکے لیکن محترم ڈاکٹر صاحب نے اس کی روداد تحریر فرما دی ہے جو اس شمارے میں ہدیۂ ناظرین ہے۔ ـــــ ـــــ ـــــ مزید برآں اس روداد کی وجہ سے "عورت اور اسلامی معاشرہ" کی قسط بھی روکنی پڑی۔

۳

السلام علیکم ۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد
فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۔
اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۔ صدق اللہ العظیم ۔

محترم حاضرین اور معزز ناظرین ۔
پچھلی نشست میں ہم نے سورۂ فاتحہ کے جزو اوّل پر جو ابتدائی تین آیات پر مشتمل ہے
کسی قدر تفصیلی گفتگو کی تھی اس سورہ مبارکہ کا جزو ثانی ایک آیت پر مشتمل ہے اور وہ ہے

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

پہلی بات یہ نوٹ کیجیے کہ اس آیت میں دو فعل استعمال ہوئے ہیں ایک نَعْبُدُ
اور دوسرا نَسْتَعِیْنُ ۔ یہ دونوں فعل مضارع ہیں آپ کے علم میں ہوگا کہ عربی اور
فارسی میں فعل کی دو حالتیں ہوتی ہیں ایک ماضی اور دوسری مضارع ۔ مضارع میں

حال اور مستقبل دونوں شامل ہوتے ہیں۔ انگریزی اور اردو کی طرح عربی و فارسی میں فعل (verb) کی تین حالتیں ماضی (Past Tense) حال (Present Tense) اور مستقبل (Future Tense) نہیں ہیں لہٰذا نَعْبُدُ کا ترجمہ یہ بھی ہوگا کہ "ہم بندگی کرتے ہیں" اور یہ بھی ہوگا کہ "ہم بندگی کرتے رہیں گے" اسی طرح نَسْتَعِيْنُ کا ترجمہ یہ بھی درست ہوگا کہ "ہم مدد مانگتے ہیں" اور یہ بھی صحیح ہوگا کہ "ہم مدد مانگیں گے"

دوسری بات یہ نوٹ کیجیے کہ اگر عرب یہ کہیں نَعْبُدُكَ تو اس کے معنی ہوں گے کہ "ہم تیری بندگی کرتے ہیں اور کریں گے۔ لیکن یہاں جو ضمیر مفعولی 'کَ' ہے اسے فعل سے پہلے لے آئیں اور 'اِیَّا' کا اضافہ کریں، جیسے اس آیت میں اِیَّاكَ نَعْبُدُ، اس میں ایک مزید مفہوم پیدا ہوگیا جس کو قواعد کی رو سے حصر کا مفہوم کہا جاتا ہے اس کو اس مثال سے سمجھا جاسکے گا کہ میں کہوں کہ "زید عالم ہے" اور دوسری طرح میں کہوں کہ "زید ہی عالم ہے" اب 'ہی' کے اضافہ سے مفہوم میں عظیم فرق واقع ہوگیا۔ جب یہ کہا جائے گا کہ زید عالم ہے، تو دوسروں کے . . عالم ہونے کی نفی نہیں ہوگی۔ دوسرے بھی عالم ہوسکتے ہیں لیکن جب یہ کہا جائے گا کہ زید ہی عالم ہے تو اس میں حصر پیدا ہوگیا۔ اور اس کا مفہوم ہوگا کہ علم صرف زید ہی کے پاس ہے دوسروں کے 'علم' کی نفی ہوگئی۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں اسی حصر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اس کا ترجمہ یوں ہوگا "ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے۔" اسی طرح اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کا حقیقی معنی اور مفہوم نیز ترجمہ ہوگا "ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے"۔ یہ تو ہوا اس آیت کا مکمل ترجمہ اور اس اسلوب میں قواعد کی رو سے جو پہلو ہیں ان کا بیان۔

تیسری بات یہ کہ اس میں جو مرکزی لفظ ہے اس پر غور کیجیے اور وہ لفظ ہے عبادت۔ جس کا ہم اقرار بھی کر رہے ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے وعدہ اور عہد کر رہے ہیں کہ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔" یہ اقرار ہے اظہار حال ہے اور ہم تیری عبادت کرتے رہیں گے" یہ ایک وعدہ، قول و قرار اور عہد و میثاق ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عبادت ہے کیا؟

چوتھی بات یہ نوٹ کیجیے کہ بدقسمتی سے اس لفظ کے بارے میں عوام الناس کے ذہنوں میں بڑا محدود تصور ہے۔ چوں کہ عام خیال یہ ہے کہ عبادات ہیں نماز، روزہ حج اور زکوٰۃ۔ اور جب بھی عبادت کا لفظ سامنے آتا ہے تو ذہن صرف ان عبادات ہی تک محدود رہ جاتا ہے اس لفظ کی جو اصل عظمت ہے اور اس کی جو اصل وسعت ہے وہ سامنے نہیں آتی۔ اس کے لیے جان لیجیے کہ اس لفظ کا مادہ (Root) ہے۔ عبد۔ عبد کہتے ہیں غلام کو۔ غلامی یعنی (Slavery) کا وہ تصور جو کبھی دنیا میں تھا جو شخص کسی کا غلام ہوتا تھا Slave ہوتا تھا۔ عبد ہوتا تھا، وہ اپنے آقا کی ملکیت ہوتا تھا۔ اس کا کام اپنے آقا کی مرضیات کو بجا لانا ہوتا تھا۔ آقا جو حکم دے غلام کا فرض ہے کہ وہ بسر و چشم اس کی تعمیل کرے۔ اس کی اپنی مرضی کوئی نہ ہو، وہ تو غلام ہے، وہ تو مملوک ہے اس کا کام تو اپنے آقا کی مرضی پر چلنا ہے اس کی پسند اور ناپسند اوّل تو ہے ہی نا۔ اور اگر ہے بھی تو وہ اسے پس پشت ڈال دے اور اپنے آقا کی پسند و ناپسند اور مرضی و ناراضی کو مقدم رکھے۔ جب ہی وہ صحیح معنوں میں غلام کہلائے گا۔ پس معلوم ہوا کہ لفظ عبد میں جو تصور ہے۔ وہ مکمل غلامی، ہمہ تن، ہمہ وقت، ہمہ جہت غلامی کا تصور ہے۔

فارسی میں اس کے لیے بہترین لفظ 'بندگی' ہے چنانچہ اس مفہوم کے لیے بندہ و آقا مستعمل ہے اسی مفہوم میں علامہ اقبال نے کہا ہے کہ تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے۔ انسانوں میں سے کوئی آقا بن جائے اور انسانوں میں سے انسان ہی کا کوئی بندہ بن جائے تو اس سے بڑی غلط بات اور کوئی نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا۔ لوگو! تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ تم سب اللہ کے بندے ہو اس اعتبار سے سب برابر ہو۔ بھائی بھائی ہو تم میں سے کوئی آقا اور غلام ہے ہی نہیں۔ حقیقی آقا اللہ ہے اور تم سب اس کے غلام ہو۔

بندگی کے اس ہمہ گیر تصور کے ساتھ اب پانچویں بات یہ نوٹ کر لیجیے کہ از روئے قرآن مجید، غایت تخلیق جن و انس یہی عبادت رب ہے قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ "میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں" یہ ہماری غایت تخلیق ہے قرآن کریم کی اس آیت کی ترجمانی بڑی خوبصورتی سے شیخ سعدیؒ نے اس شعر میں کی ہے جو آپ نے بہت سی مسجدوں میں لکھا دیکھا بھی ہوگا ؎

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی

جو شئے جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہو وہ اس مقصد کو پورا نہ کرے تو ظاہر بات ہے کہ وہ بیکار ہے اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینکے دیئے جانے کے قابل ہے۔ قلم لکھنے کیلئے ہے لکھتا نہیں تو آپ اسے پھینک دیں گے۔ لہذا جب انسانوں کی تخلیق ہوئی ہے بندگی کیلئے تو اگر وہ بندگی کی روش ہی کو تج دے چھوڑ دے۔ ترک کر دے تو معلوم ہوا کہ اس کے وجود کا اب کوئی مقصد نہیں رہا۔ بیکار ہے۔ چوں کہ ؎

زندگی آمد برائے بندگی ــــ زندگی بے بندگی شرمندگی

البتہ چھٹی اہم تر بات یہ ہے کہ عبادت رب، جس کا ہم اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے۔ یہ بہت بڑا عہد ہے اس کے کچھ تقاضے ہیں ان کو اچھی طرح سمجھ لیجیے ـــــ سب سے پہلا تقاضا ہے اطاعت۔ یہ باتیں ہم شرک فی العبادت کے ضمن میں پہلے بھی سمجھ چکے ہیں اب ان کا اعادہ ہو رہا ہے۔

اللہ کی اطاعت کا حق مطلوب ہے اگر یہ نہیں ہے تو عبادت کا حق کیسے ادا ہوگا! پھر بندگی کہاں ہوئی! یہ اطاعت جزوی نہ ہو کلی طور پر ہو کسی غلام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنے آقا کے ایک حکم کو مانے ایک کو نہ مانے۔ غلام نے اگر بات نہیں مانی تو وہ مقام بندگی سے تجاوز کر گیا اطاعت ہوگی تمام احکام کی۔ پوری زندگی میں اطاعت۔ زندگی کا کوئی گوشہ بندگی سے خارج نہیں رہے گا اسی لیے فرمایا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً "اے اہل ایمان! اطاعت میں۔ فرماں برداری میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ"

جزوی اطاعت مطلوب نہیں ہے کہ اللہ کی کچھ باتوں پر سر تسلیم خم اور کچھ باتوں کو معاذ اللہ پاؤں تلے روند دیں۔ اس پر اللہ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت

نمبر ۸۵ میں اس طرز عمل پر بڑی سخت وعید آئی ہے فرمایا: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ کیا تم ہماری کتاب، ہماری شریعت کے بعض حصّوں کو مانتے ہو، اس میں جو احکام آئے ہیں ان میں سے کچھ تو تم کو تسلیم ہیں اور کچھ حصوں کو تم نہیں مانتے، ان کو رد کر دیتے ہو، انہیں پاؤں تلے روند ڈالتے ہو تو نہیں ہے کوئی سزا اس کی جو اس کا ارتکاب کرے سوائے اس کے کہ اسے اس دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا جائے اور قیامت کے دن اسے شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے"

یہ اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کی کیفیت ہے کہ جزوی اطاعت مطلوب نہیں ہے بلکہ کلی اطاعت مطلوب ہے آیت کے آخر میں فرمایا: وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ "اور اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو" اس گمان میں نہ رہنا کہ وہ تمہارے کرتوتوں سے واقف نہیں ہے۔ وہ العلیم ہے البصیر ہے اللطیف الخبیر ہے اس سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں ہے۔

ساتویں بات یہ کہ ایک اطاعت ہوتی ہے مارے باندھے کی، زبردستی کی مجبوری کی۔ ہم انگریز کے غلام تھے اور ہم اس کی اطاعت کرنے پر مجبور تھے اس اطاعت پر بھی لفظاً عبادت کا اطلاق ہو جائے گا اور قرآن مجید میں ہوا۔ آلِ فرعون نے بنی اسرائیل کو جس طریقہ سے اپنی غلامی کے شکنجے میں کسا ہوا تھا اس کے لیے قرآن مجید میں یہی لفظ عبادت آیا ہے۔ فرعون نے بڑے طنطنہ اور غرور کے ساتھ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں کہا تھا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ۔ "ان دونوں کی قوم ہماری عابد ہے ہماری غلام قوم ہے۔" اسطرح ایک موقع پر حضرت موسیٰ نے بھی فرعون سے فرمایا تھا: اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام، اپنا محکوم اور اپنا مطیع بنالیا ہے۔ لہٰذا اس نوع کی غلامی پر بھی لفظاً تو عبادت کا اطلاق ہو جائے گا، لیکن اللہ کی جو عبادت اور اطاعت مطلوب ہے۔ وہ

مارے باندھنے کی مطالب نہیں ہے مجبوری کی درکار نہیں ہے بلکہ محبت کے ساتھ مقصود ہے اللہ کے احسانات کا شعور و ادراک کرتے ہوئے کہ اس کے جذبۂ تشکر سے قلب و ذہن سرشار ہو جائیں ان احساسات و جذبات کے ساتھ جب اللہ کی بندگی ہوگی اس کی کامل اطاعت ہوگی جب عبادت کا اصل تقاضا پورا ہوگا جس کو ہمارے ائمہ و علماء دین نے بڑی خوبصورتی سے یوں ادا فرمایا اَلْعِبَادَةُ تَجْمَعُ اَصْلَیْنِ۔ اللہ کی جو عبادت مطلوب ہے، اس میں دو بنیادیں جمع ہونی چاہییں غَایَةَ الْحُبِّ مَعَ غَایَةِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ۔" ایک طرف انتہا درجہ کی محبت ہو اللہ کی اور دوسری طرف انتہا درجہ میں اس کے سامنے ذلت و عاجزی اور پستی اختیار کی جائے اس کے سامنے ہمہ تن جھک جایا جائے، بچھ جایا جائے۔

جب یہ دونوں کیفیات محبت و تذلل جمع ہو جائیں گی تو عبادت رب، بندگی رب کے تقاضے کی تکمیل ہوگی۔ محبت الٰہی عبادت کے لیے کس قدر لازمی ہے مولانا رومؒ نے اسے اپنے زمانے میں بڑی خوبی سے ادا کیا تھا اور ہمارے دور میں علامہ اقبال نے اس کی اہمیت پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے کہ ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

محبت الٰہی عبادت کی روح ہے اگر یہ روح نہیں ہے اور صرف خالی خولی اطاعت ہے دل کی محبت کی چاشنی اس میں شامل نہیں ہے تو علامہ اقبال کے بقول معاملہ یہ ہوگا کہ ؎

شوق اگر ترا نہ ہو میری نماز کا امام۔
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

لہٰذا اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ محبت درحقیقت عبادت کی روح ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔

آٹھویں بات یہ نوٹ کیجیے کہ عبادت میں اطاعت و محبت کے بعد جو تیسری چیز مطلوب ہے وہ اخلاص ہے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کی آخری

نشست میں جو گفتگو ہوئی تھی اس میں بھی اسی موضوع پر گفتگو ہوئی تھی آج پھر اس کا اعادہ کریں ہے۔ عبادت میں تیسری جو چیز مطلوب ہے وہ ہے اخلاص۔ پورے خلوص کے ساتھ اللہ کی بندگی۔ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ اس عبادت میں کوئی ریاکاری نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ اللہ کی رضا کے سوا کوئی اور چیز مطلوب و مقصود کے درجہ میں آجائے۔ مطلوب صرف اللہ کی رضا ہو۔ مطلوب صرف اُخروی فلاح و نجات ہو۔ اگر یہ اخلاص نہیں ہے کوئی ریاکاری ہے اپنی عبادت اور اپنے زہد، اپنے تقویٰ اور اپنی ریاضت کی دھونس جمانی ہے۔ لوگوں پر اپنی نیکی کا رعب قائم کرنا ہے، اپنی شہرت مطلوب ہے دنیا میں کوئی منفعت پیش نظر ہے تو یہ خلوص سے خالی عبادت اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں ہوگی۔ شرف قبولیت حاصل کرنے کے لیے شرطِ اخلاص لازم ہے۔ اخلاص سے تہی اور ریا سے مملو عباداتِ مفروضہ کو نبی اکرمؐ نے شرک قرار دیا ہے۔

چنانچہ فرمایا: مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ۔ جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی ــ وہ شرک کرچکا اور جس نے دکھانے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کرچکا اور جس نے دکھانے کے لیے صدقہ کیا وہ شرک کرچکا۔ عربی میں جب فعل ماضی سے پہلے قَدْ آتا ہے تو اس کام کے انجام پانے میں قطعیت کا مفہوم پیدا ہوجاتا ہے اسی لیے میں نے "کرچکا" ترجمہ کیا ہے اس حدیث ــ سے آپ کو بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ خلوص و اخلاص کی دین میں کس قدر اہمیت ہے اور ریا کی اتنی شناعت ہے کہ اس کے ڈانڈے شرک سے مل جاتے ہیں۔

اب آپ غور کیجئے کہ پوری زندگی میں پورے خلوص و اخلاص قلبی شدید ترین محبت اور کامل اطاعت کے ساتھ عبادت، واقعہ یہ ہے کہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بہت مشکل کام ہے اس میں سب سے پہلے تو انسان کا اپنا نفس ہی آڑے آتا ہے مولانا رومؒ نے فرمایا

نفس ما ہم کم تر از فرعون نیست
لیک اُو را عون ما را عون نیست

فرعون کے پاس حکومت تھی لاؤ لشکر تھا اس لیے اس نے زبان سے بھی خدائی کا دعویٰ کر دیا میرا نفس بھی فرعون سے کم تر نہیں اس کے پاس لاؤ لشکر نہیں ہے اس لیے وہ خدائی کا زبانی دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ میں اللہ کا حکم نہیں جانتا، میری مرضی چلے گی اِدھر اذان کی آواز کان میں آگئی ہے اللہ کا حکم ہے کہ نماز کے لیے آؤ۔ اُدھر نفس کہہ رہا ہے سو جاؤ۔ آرام کرو۔ ہم نے کس کا حکم مانا۔ اگر نفس کی خواہش کو کچلتے ہوئے ہم نے اللہ کا حکم مانا اور ہم نماز کے لیے نکل کھڑے ہوئے تو واقعی ہم بندۂ رب ہیں۔ اگر نفس کی خواہش پر عمل کیا اور اللہ کے حکم کو پس پشت ڈال دیا تو ہم بندۂ نفس ہو گئے یہی بات سورہ فرقان میں فرمائی :

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (اے نبی) کیا آپ نے اس شخص کی حالت پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ اس بات کو علامہ اقبال نے یوں ادا کیا ؎

چوں مے گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

میں جب یہ کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے کپکپی لگ جاتی ہے اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور اس پر پورا اترنا کتنا مشکل ہے یہ ہے ربط و تعلق کہ جب بندہ کہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ۔ تو اس پر ایک لرزہ طاری ہو جائے اسے احساس اور شعور رہے کہ وہ کتنا بڑا قول و قرار کر رہا ہے۔ یہ کیفیت ہو تو اُسے آگے پناہ گاہ نظر آئے گی : اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اے اللہ میں نے یہ وعدہ اور عہد کیا ہے میں نے ارادہ اور عزم بھی کیا ہے لیکن میں محض اپنی قوت کے بل پر اس عہد سے برآ نہیں ہو سکتا۔ اس کو پورا نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ تیری مدد شامل حال نہ ہو۔ میں تیری اعانت کا محتاج ہوں۔ تیری مدد و اعانت میرے شامل حال ہو گئی تو میں اس قول و قرار اور عہد و پیمان کو پورا کر سکوں گا یہ ہے ربط و تعلق اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے فوراً بعد اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے۔ اس میں اخلاص فی الدعا اور اخلاص فی الاستعانت کا پہلو بھی آگیا ہر نوع کی حاجت روائی، مشکل کشائی کے لیے اللہ ہی سے مدد کی درخواست کی جائے، اُسی سے مدد طلب کی جائے اور یہ پہلو بھی آگیا کہ ہم عبادت کے حقیقی اور صحیح تقاضے بھی پورے

نہ کرسکیں گے جب تک کہ اے اللہ تیری مدد ہمارے شامل حال نہ ہو۔
چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فرض نماز کے بعد جن اذکار کا معمول تھا ان میں یہ بھی ہے: اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَ شُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ ۔ "پروردگار میری مدد فرما تاکہ میں تجھے یاد رکھ سکوں، تیرا شکر ادا کرسکوں اور تیری عبادت کا باحسن وجوہ حق ادا کرسکوں"
یہ ہے سورہ فاتحہ کی چوتھی آیت کا مفہوم جو اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے اب اگر اس ضمن میں کوئی سوال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال :- اگر کسی شخص کی عبادت میں اطاعت اور اخلاص نہ ہو تو اس کو کس طرح پیدا کیا جاسکتا ہے ؟

جواب :- یہ بات بڑی عجیب ہوگی کہ ایک شخص عبادت بھی کرتا ہو لیکن نہ اس میں اخلاص ہو نہ جذبہ اطاعت، جیسا کہ آپ کے سوال کا انداز ہے لیکن اگر ایسا ہو تو یہ عبادت محض ایک ڈھانچہ کہلائے گا جو روح سے خالی ہو جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی اب رہا یہ سوال کہ خلوص و اخلاص اور اطاعت کے تقاضوں کو پورا کیسے کیا جائے؟ اس کا ذریعہ ایک ہی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان پختہ اور محکم ہو۔ اللہ کا یقین، آخرت کا یقین۔ یہ یقین جتنا مضبوط ہوگا اسی مناسبت سے اخلاص کی دولت ملے گی اور اللہ کی اطاعت ہوگی۔ اللہ کی محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر بھی اور محاسبۂ اُخروی کے خوف سے بھی اخلاص بھی پیدا ہوگا اور جذبہ اطاعت بھی۔

سوال :- ڈاکٹر صاحب! ایک شخص اللہ کی محبت کی بجائے جہنم کے خوف اور جنت کی طمع سے اللہ کی عبادت کرتا ہے ایسی عبادت کے متعلق آپ کیا کہیں گے ؟

جواب :- یہ دونوں چیزیں غلط نہیں ہیں۔ ان چیزوں کو آپ محبت سے خارج نہیں کرسکتے۔ مثال کے طور پر آپ اپنے والدین سے اچھے کاموں پر تحسین اور انعام کے امیدوار ہوتے ہیں اور ان کی ناراضگی پر سزا سے خوف کھاتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کے دل والدین کی محبت سے خالی ہیں۔ ویسے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جہنم سے بچنے اور جنت کی طلب کی دعائیں تمام انبیاء ورسل نے کی ہیں۔ خود ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی بہت سی دعائیں منقول ہیں۔ جیسے اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ "اے پروردگار!

مجھے آگ سے بچا" اور اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ جَنَّۃَ الْفِرْدَوْس. اے میرے آقا! میں تجھ سے جنت الفردوس کا طلب گار ہوں" لہٰذا ان کے بارے میں ہرگز یہ تصور نہ رکھئے کہ یہ کوئی گھٹیا بات ہے. اس طلب میں اللہ کی محبت کی چاشنی آپ سے آپ شامل ہوتی ہے۔

سوال :۔ ڈاکٹر صاحب! آپ نے فرمایا ہے کہ بندگی اور غلامی صرف اللہ تعالیٰ کی کرنی چاہیئے سب مسلمانوں کو بھائی بھائی ہوجانا چاہیئے. کسی کو کسی کا غلام نہیں ہونا چاہیئے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپ کے بعد بھی غلامی رہی ہے اور اسلام میں غلامی کا تصور ہے اس کی آپ کیا توجیہہ کریں گے ؟

جواب :۔ بہت سے الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کا لفظاً ایک حالت پر اطلاق ہو جاتا ہے لیکن ان کی کیفیات بالکل مختلف ہوتی ہیں حضور کے زمانے میں اور اس کی بعد کی تاریخ میں غلامی کا لفظ تو آپ کو مل جائے گا لیکن ایک تو حضورؐ نے غلاموں کو عبد کہنے سے سختی سے منع کر دیا تھا. اس لیے کہ اس کی تو ہمارے دینی تصور میں قطعی گنجائش نہیں ہے قرآن میں بھی ایسے لوگوں کے لیے 'عبد' کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا بلکہ 'مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ' ، استعمال ہوا۔

پھر یہ کہ غلام صرف ان ہی کو بنایا جاتا تھا جو قتال فی سبیل اللہ کے نتیجے میں گرفتار ہوئے ہوں، جن کو مخالفین نہ فدیہ دے کر چھڑانے پر آمادہ ہوں نہ تبادلہ میں ۔ اور بطور احسان آزاد کرنا بھی جس کی بڑی رغبت دلائی گئی ہے مصالح دین کے مطابق نہ ہو مزید یہ کہ حضورؐ نے ان غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی اس قدر تاکید فرمائی ہے کہ جسے اپنی صلبی اولاد اور رحمی رشتوں کے ساتھ حسن سلوک کی فرمائی ہے اس طرح غلاموں کو بھائی چارے کی سطح پر لے آیا گیا کیفیت یہی تھی جس کو علامہ اقبال نے اس شعر میں بیان کیا ہے کہ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا ، اور نہ کوئی بندہ نواز

پھر دین میں غلاموں کو آزاد کرنے کو چوٹی کے نیک کاموں کی فہرست میں جگہ دی گئی۔ بہت

لغزشوں کا کفارہ غلام کی آزادی قرار دیا گیا ہے قتال فی سبیل اللہ کے نتیجہ میں قید ہونے والوں کے علاوہ کسی آزاد کو غلام بنانا ناجائز قرار دیا گیا۔ ہمارے اکثر ائمہ دین نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ اس طرح غلامی کے مستقل INSTITUTION کا سدباب کیا گیا۔

پھر دیکھیے کہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگرچہ پہلے غلام تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو اپنے پیسے سے خرید کر آزاد کیا تھا لیکن اسلام نے ان کا مقام و مرتبہ اتنا بلند کیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کہ وہ امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین تھے ان کا نام نہیں لیتے تھے جب تک سیدنا نہیں کہہ لیتے وہ ان کو ہمیشہ سیدنا بلال سے خطاب کیا کرتے تھے۔ پھر تاریخ اسلامی کا یہ نہایت روشن باب ہے کہ حدیث و فقہ کی تعلیم و تدریس میں ایسے ایسے ائمہ عظام نظر آتے ہیں جو غلاموں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور جن کے سامنے امام دارالہجرۃ امام مالک اور امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ جیسے اماموں نے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے اور اس پر اظہار فخر کیا ہے۔

حضرات! اس مختصر وقت میں سورۂ فاتحہ کی مرکزی آیت کے متعلق میں نے اپنی امکانی حد تک چند ضروری باتیں عرض کرنے کی کوشش کی ہے آخر میں ہمیں خلوص کے ساتھ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اسی معنی میں اپنا حقیقی بندہ بنا دے اور ہمیں اپنے فضل خاص سے اس کی توفیق عطا فرمائے۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ

فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ

وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے

بڑے فوائد بھی ہیں۔

توحید فی العلم یا توحید فی المعرفہ اور
توحید فی العمل یا توحید فی الطلب کا

فریضۂ اقامتِ دین

سے ربط و تعلق

ڈاکٹر اسرار احمد

کے خطاب و درس کی دوسری قسط

•

بسم اللہ اولہ و آخرہ

توحید فی الدّعاء

میں نے عرض کیا تھا کہ انفرادی سطح پر توحید فی العبادہ کے ساتھ ہی توحید فی الدّعا کا معاملہ ہے۔ یہ دونوں امور باہم گتھے ہوئے ہیں۔ میں نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی یہ حدیثیں بھی آپ کو سنائی تھیں کہ: الدعاء مخ العبادۃ اور الدعاء ھو العبادۃ ـــــ توحید فی العبادہ کے ضمن میں سورۂ زمر کے تین مقامات اور ان کی امکانی حد تک تشریح و توضیح میں آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں۔ اس سے آگے اب اگلی سورت، سورۂ مومن میں توحید فی الدّعاء کا بڑے شدّ و مد کے ساتھ ذکر ہے۔ ـــــ دعا درحقیقت انفرادی سطح کی عبادت کا ہی ایک باطنی پہلو ہے۔ جو آپ کا معبود ہے، جس کے بارے میں آپ کو خیال اور گمان ہے کہ وہی ہے حاجت روا، وہی ہے مشکل کشا ـــــ جس کے متعلق آپ کو یقین ہے کہ وہی عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے، وہی اَلسَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ہے، وہ ہر آن آپ کے ساتھ ہے، 'ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ' ـــــ ظاہر بات ہے کہ ایسی ہستی کو آپ پکاریں گے۔ اس سے استعانت و استمداد کے طالب بنیں گے۔ اس سے دعائیں کریں گے۔ اس سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے عرض و معروض کریں گے۔ پس دعا عبادت کا ایک باطنی رُخ ہے۔ اس دعا کی اہمیت کے لئے میں سورۂ مومن کی تین آیات آپ کو سناتا ہوں۔ میرے حقیر مطالعہ کے مطابق

قرآن میں چار مقامات ہیں جہاں دعا کے ساتھ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے الفاظ آئے ہیں۔ ایک سورۂ عنکبوت آیت نمبر ۶۵ میں: فَإِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ "جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں"۔ دوسرے سورۂ لقمٰن کی آیت نمبر ۳۲ میں: وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ "اور جب (سمندر میں) ایک موج ان لوگوں پر سائبان کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ ہی کو پکارتے ہیں اپنے دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے"۔ ان دو آیتوں میں سمندری سفر میں مشرکین کی اللہ سے مخلصانہ دعاء کا تذکرہ ہے۔ اس موقع پر انہیں نہ لات یاد آتا ہے نہ منات نہ ہبل۔ کسی دیوی اور دیوتا کے بجائے وہ خالص اللہ ہی کو مدد اور دستگیری کے لئے پکارتے ہیں[1]۔ لیکن میرے خیال میں سورۂ مومن کی آیت نمبر ۱۴ اور نمبر ۶۵ جس کا بیان آگے آئے گا۔ وہ مقام ہیں جہاں انشائیہ انداز اور اَمر کے صیغہ میں دعا کے ساتھ مُخْلِصِيْنَ لَهُ

---

[1] اس ضمن میں حضرت عکرمہ ابن ابوجہل رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے واقعہ کا ذکر مناسب حال ہوگا۔ وہؓ خود روایت کرتے ہیں کہ "جب مجھے علم ہوا کہ میرا نام ان مجرموں میں شامل ہے، جن کے قتل کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر حکم جاری فرما چکے تھے تو میں نے قتل کے خوف سے حبشہ منتقل ہونے کیلئے مکہ چھوڑ دیا۔ جب ساحل سے حبشہ جانے کے لئے کشتی میں سوار ہوا تو اثنائے راہ میں زبردست طوفان آگیا۔ مسافروں نے پہلے تو اپنے دیوی اور دیوتاؤں کو پکارا لیکن طوفان شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا تو ان کی زبان سے نکلا کہ اب تو صرف 'اللہ' ہی ہمیں بچا سکتا ہے۔ چنانچہ سب ہی نہایت الحاح و زاری کے ساتھ اللہ سے اس مصیبت سے نجات کی دعائیں کرنے لگے۔ دعا قبول ہوئی اور طوفان تھم گیا۔ البتہ طوفان نے کشتی کو جدہ کی بندرگاہ ہی پر واپس دھکیل دیا"۔ اس کے بعد حضرت عکرمہؓ اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ: "اس موقع پر اچانک میرے دل میں روشنی پھوٹی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت اسی توحید ہی کی تو ہے اور یہ بت انسان کے کام آنے والے نہیں یہ تو ہمارے ہاتھوں کے تراشیدہ بے چارے اور معذور ہیں"۔ آگے وہ کہتے ہیں کہ "میں نے دل میں اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر میں طوفان سے بچ گیا تو آں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لوں گا"۔ جب جدہ پر کشتی واپس آئی تو وہاں انہوں نے اپنی اہلیہ کو موجود پایا جو خود بھی مشرف باسلام ہو چکی تھیں اور حضرت عکرمہؓ کے لئے نبی اکرمؐ کی جانب سے معافی کی نوید لائی تھیں۔ حضرت عکرمہؓ کو بڑا اطمینان ہوا کہ وہ معافی کی خوشخبری سننے سے قبل ہی اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ (مرتب)

ا

الدِّیْنَ کے الفاظ آئے ہیں ـــــ اللہ کو پکارو لیکن کس طرح ـ؟ اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ یہ نہیں کہ کچھ اطاعت اللہ کی بھی ہو رہی ہے اور کچھ دوسروں کی بھی۔ لیکن پکار رہے ہیں اللہ کو۔ ایسی دعا قبول ہونے والی نہیں ہے۔ میں اس کی آگے وضاحت کروں گا۔ پہلے میں وہ آیت آپ کو سنا دوں ـــ بڑی پیاری آیت ہے۔ فرمایا: فَادْعُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ۝ "پس اللہ ہی کو پکارو" ـ لیکن کس شان سے! کس کیفیت میں!! "اپنی اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔" ظاہر بات ہے کہ اگر پورا نظام شرک پہ قائم ہو اور اس میں آپ توحید کا نظام برپا کرنا چاہیں گے تو کافروں اور مشرکوں کو سخت ناگوار ہوگا۔ وہ سب روڑے اٹکائیں گے۔ اور وہ کسی نہ کسی بہانے آپ سے تصادم مول لینے کی کوشش کریں گے۔

یہاں دعا کے لئے بھی مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ کی شرط عائد کر دی گئی ہے۔ جیسے عبادت [پر] عائد کی گئی تھی۔ خلوص و اخلاص صرف اللہ ہی کے لئے نہ ہو تو اس سے دعا کرنا، اسے پکارنا بے معنی ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث آپ کو سناتا ہوں۔ جس سے دعا کی قبولیت کی شرائط واضح طور پر سامنے [آ]تی ہیں ـــ پہلے تو حدیث سن لیجئے جس کے راوی ہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور امام مسلمؒ نے [ا]س کو اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔ میں پہلے آپ کو حدیث کا وہ حصّہ سناتا ہوں جو دعا کی شرائط سے متعلق ہے۔ اس کے بعد ترجمہ اور اس کی توضیح ساتھ ساتھ کروں گا: حدیث کا دعا سے متعلقہ حصّہ یہ ہے کہ:

ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیه الی السماء
یارب یارب و مطعمه حرام و مشربه حرام و ملبسه حرام و
غذی بالحرام فانّٰی یستجاب لذٰلك ـ

"پھر ایک شخص کا آں حضورؐ نے ذکر فرمایا کہ وہ بہت دور دراز کا سفر کرتا ہے۔ بال اور کپڑے غبار آلود ہیں۔ بڑی بوسیدگی، بے چارگی اور درماندگی اس پر طاری ہے۔ وہ شخص اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا رہا ہے" ـــ دیکھئے حالتِ سفر میں دعا کی مقبولیت کی آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خبر دی گئی ہے۔ چونکہ مسکنت ہوتی ہے۔ انسان بے یار و مددگار ہوتا ہے۔ اجنبیوں میں ہوتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ سفر کی حالت میں دعا دل سے نکلتی ہے اور جو دعا دل سے نکلے وہ اثر رکھتی ہے اور قبول ہوتی ہے اور عام طور پر گمان یہی ہے کہ یہاں نبی اکرمؐ ذکر فرما رہے ہیں کسی شخص کے سفرِ حج کا ـــ حج کے لئے دور دراز سے اور مختلف مقامات سے لوگ آتے ہیں تھکے ماندے۔ پھر واقعہ یہ ہے کہ مناسکِ حج بڑے کٹھن اور مشقّت طلب ہوتے ہیں۔ منٰی کا سفر ہے

پھر وقوفِ عرفہ ہے۔ مزدلفہ میں پڑاؤ ہے۔ پھر منٰی واپسی ہے۔ رمی جمار ہے، نحر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دسویں تاریخ کا دن بڑا سخت اور مشقت سے پُر ہوتا ہے ہر شخص تکان سے اس روز چُور چُور ہوتا ہے ۔۔۔ ان دشوار اور وقت طلب مواقع کا تصور کیجئے اور دیکھئے کہ ان حالات میں ایک شخص یَمُدُّ یَدَیْہِ اِلَی السَّمَآءِ ۔ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف دعا کے لئے اٹھاتا ہے اور کہتا ہے یارب، یارب ۔۔۔ جبلِ رحمت کا مقام سمجھ لیجئے۔ یا وقوفِ عرفہ کا نقشہ کھینچ لیجئے۔ یا مقام ابراہیم کو خیال کر لیجئے۔ یا ملتزم کا منظر تصور کی نگاہوں میں لے آئیے۔ جہاں اس سے چمٹے ہوئے لوگ گڑگڑا کر دعائیں کرتے ہیں ۔۔۔ لیکن فَاَنّٰی یستجاب لِذٰلک ۔ ایسے شخص کی دعا قبول ہو تو کیسے ہو! ومطعمہٗ حرامٌ و ملبسہ حرامٌ وَغذی بالحرام ۔ جبکہ اس کا کھایا ہوا بھی حرام کا ہے، اس کا پہنا ہوا بھی حرام کا ہے اور جس غذا سے اس کا جسم بنا ہے وہ بھی حرام کی ہے ۔۔۔ معلوم ہوا کہ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ والا معاملہ تو ہے نہیں۔ کمائی میں تو اللہ کا حکم مانتا نہیں۔ معاش میں تو حرام میں منہ مار رہا ہے اور یہاں آ رہا ہے دعائیں کرنے کے لئے۔ کیا منہ ہے اس کا کہ وہ اللہ سے کلام کرے ۔!! یہی بات ہے جو سورۃ البقرہ میں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ ہم تو تمہاری دعائیں سننے اور قبول کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن ہمارے بندو! یہ بھی تو دیکھو کہ تم ہمارے احکام کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہو ۔!! فرمایا: وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ ۝ "(اے نبی۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)) جب میرے بندے آپؐ سے میرے بارے میں پوچھیں تو ان کو بتا دیجئے کہ میں قریب ہی ہوں[1]۔ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں، وہ جہاں اور جب مجھے پکارے۔ لیکن فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ انہیں بھی چاہیئے کہ میری باتوں کو قبول کریں۔ میرا کہا مانیں۔ میرے احکام پر عمل کریں۔ میری پکار پر لبیک کہیں۔ مجھ پر ایمان رکھیں، لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ۔ تاکہ وہ راہِ راست پالیں اور کامیابی سے ہم کنار ہو جائیں: معلوم ہوا کہ یہ یک طرفہ معاملہ (One way Traffic) نہیں ہے یہ دو طرفہ معاملہ ہے۔ تم اللہ کا کہنا مانو گے، اس کے احکام پر چلو گے، اس کے مطیع بن کر رہو گے، اس پر

---

[1] اللہ تعالیٰ کی قربت اور معیت کی تفہیم کے لئے سورۂ قٓ کا یہ مقام: وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ اور سورۂ حدید کا یہ مقام: وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ۔ پیشِ نظر رہیں۔ (مرتب)

ان رکھوگے تو اللہ تمہاری دعائیں قبول کرے گا۔ تم اللہ سے محبت کروگے اللہ تم سے محبت کرے گا
یُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّونَهٗ۔ یہ شان ہوگی اہل ایمان کی ــــ تم اللہ کو یاد کرو، اللہ تمہیں یاد کرے گا ــ
فَاذْكُرُونِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ــــ حدیث میں اس کی وضاحت آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
کہ میرا بندہ اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر میرا بندہ کسی
محفل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس سے کہیں اعلیٰ محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ وہ محفل ملائکہ
مقربین ہی کی ہوسکتی ہے ــ اس محفل میں اللہ تعالیٰ اس بندے کا ذکر فرماتا ہے جو اس دنیا میں کسی
محفل میں اس کا ذکر کرتا ہے ۔ اسی طریقے سے آگے حدیث میں آتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر بندہ
میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں ۔ بندہ اگر بالشت بھر میرے قریب ہوتا
ہے تو میں ہاتھ بھر اس کے قریب ہوجاتا ہوں "ــــ قرآن کا ایک مقام مجھے اور یاد آیا ۔ فرمایا : اِنْ
تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ "تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا" اللہ کی مدد بندے
کی جانب سے کیا ہے ؟ اس کے دین کے غلبہ اور اقامت کے لئے مال اور جان کھپا دینا۔ تُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ط پس دو طرفہ معاملہ
ہوگا۔ یہی اسلوب ہے اس کا کہ : اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَ
لْيُؤْمِنُوْا بِيْ ــــ

اخلاص فی الدعا تو یہاں سورۂ مومن میں فرمایا : فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۔
پس پکارو اللہ کو دین یعنی اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے ،
وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ' چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو ــــ

اسی سورۂ مومن میں جو آیت نمبر ۶۰ آئی ہے ، وہ بھی اس موضوع پر بہت اہم ہے ۔ فرمایا:
وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ط اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ
دٰخِرِيْنَ ۝ دعا کے موضوع پر جیسا کہ میں نے عرض کیا نہایت اہم آیات میں سے ہے۔ ترجمہ ہے
" اور تمہارے رب نے یہ فرمایا ہے کہ پکارو مجھے ۔ میں تمہاری پکار سنوں گا ' تمہاری دعائیں قبول کرونگا
حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بر بنائے تکبر اور گھمنڈ میں آکر میری عبادت ' سے اباء کرتے ہیں اعراض
کرتے ہیں ، منہ موڑتے ہیں وہ جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر" اس آیت سے استدلال
کیا جائے گا کہ عبادت اور دعا ایک ہی ہیں ۔ ممکن ہے کہ اسی آیت کی تشریح و تفسیر میں نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ الدعاء هو العبادة اور الدعاء مخ العبادة ــــ دیکھیے اور خود

غور کیجئے کہ اس آیتِ کریمہ کے پہلے حصّہ میں دعا کا اور دوسرے حصّہ میں عبادت کا ذکر آیا تو آپ خود بھی کسی تامّل کے بغیر اس نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں کہ دعا اور عبادت ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں۔ اس میں کسی اشتباہ کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔

آگے چلئے اس سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۶۵ ہے جس میں یہ بات پھر آئی۔ فرمایا: هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

"وہ اللہ الحیّ ہے، ہمیش ہمیش زندہ رہنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس اسی کو پکارو دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ کُل شکر و سپاس اور تعریف و ثنا اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے"۔ دیکھئے یہاں اس آیت میں توحید کے ذکر سے آغاز ہوا اور توحید کے بیان پر ہی اس آیت کا اختتام ہوا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ شہادتین کا پہلا جزو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کلمۂ توحید ہے۔ اسی طرح جان لیجئے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ بھی کلمۂ توحید ہی ہے جو نہ صرف سورۂ فاتحہ کی (جس کو اُمّ القرآن اور اساس القرآن کے نام بھی دیئے گئے ہیں) پہلی آیت ہے بلکہ قرآن مجید کی بھی پہلی آیت ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل میں چاہوں گا کہ آپ اسی سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۶۶ اور اس کا ترجمہ بھی سن لیں۔ اس میں بھی آپ دیکھیں گے کہ عبادت کے بدل کے طور پر دعا ہی کا ذکر آیا ہے۔ فرمایا: قُلْ اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِىَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّىْ ۡ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ "اے نبیؐ! ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ مجھے تو ان ہستیوں کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو۔ (میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں) جب کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے بیّنات (کھلی کھلی نشانیاں) آ چکی ہیں۔ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العٰلمین کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں اور اس کا فرمانبردار و مطیع بندہ بن کر رہوں"۔[1]

---

[1] محترم ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب میں "توحید فی الدعاء کی اہمیت اور اس کا ہمارے دین میں مقام" کے موضوع پر اصولی باتیں آ گئی ہیں۔ تاہم اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر راقم دو آیات مزید پیش کرنا چاہتا ہے جن میں نہی کے اسلوب میں اللہ کے سوا یا اللہ کے ساتھ کسی اور سے دعا کی ممانعت کی گئی ہے۔ مخاطب نبی اکرمؐ ہیں لیکن آپؐ کی وساطت سے پوری نوعِ انسانی بالعموم اور مدعیانِ ایمان بالخصوص مخاطب ہیں۔ پہلی آیت

(باقی اگلے صفحہ پر)

آپ نے دیکھا کہ سورۂ زمر میں عبادت کا کس قدر تاکید اور شد و مد کے ساتھ بیان ہے۔ اطاعت کو اللہ ہی کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ اور اگلی سورت سورۂ مومن میں دعا کا ذکر آگیا لیکن دعا بھی اللہ ہی کے لئے اپنے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ اس طرح انفرادی سطح کے خارجی اور باطنی دونوں پہلوؤں کا احاطہ ہو گیا اب اگلی بات کی طرف آئیے

دعوت الی اللہ: دعوت توحید

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ انفرادی توحید جب فرد سے آگے بڑھے گی تو یہ کام 'توحید کی دعوت' کی شکل اختیار کرے گا۔ لوگوں کو بھی اللہ کی توحید کی طرف بلانا اور پکارنا ___ چنانچہ اسی سورۂ مومن میں اس ضمن میں آلِ فرعون کا ایک قول نقل ہوا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ آلِ فرعون میں سے ایک بااثر بڑی شخصیت حضرت موسیٰ پر ایمان لے آئی تھی۔ جو بڑے پائے کے درباری بھی تھے لیکن انہوں نے اپنے ایمان کو چھپائے رکھا تھا۔ یَکْتُمُ اِیْمَانَہٗ۔ میں شاید پہلے بھی اس کا تذکرہ کر چکا ہوں کہ مومنِ آلِ فرعون نے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا ہوا تھا تا آنکہ جب وہ مرحلہ آیا کہ فرعون نے کہا کہ اب میں موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کر کے رہوں گا۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے درباریوں میں بھی حضرت موسیٰ کے کچھ حامی (Supporters) موجود ہیں۔ اگر اسے یہ اندازہ نہ ہوتا تو اسے دربار میں حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنے کی بات رکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے دربار میں تجویز پیش کرتا ہے کہ: وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی[1] "اور فرعون نے (ایک روز اپنے درباریوں سے) کہا" مجھے چھوڑ دو۔

(تسلسل) سورۂ یونس کی ہے۔ فرمایا: وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ "اور اے نبیؐ! اللہ کو چھوڑ کر کسی ہستی کو نہ پکارو (اللہ کے سوا) کوئی چیز نہ آپ کو فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ اگر (بالفرض) آپ نے ایسا کیا تو آپ بھی ظالموں (یعنی مشرکوں) میں سے ہو جائیں گے___ دوسری آیت سورۂ شعراء کی ہے، فرمایا: فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ فَتَکُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِیْنَ ۝ "پس (اے نبیؐ) اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو۔ اور اگر (بالفرض) آپ نے ایسا کیا تو آپ بھی سزا پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔" نہی کے اسلوب میں جو تاکید ہوتی ہے اور جو زور ہوتا ہے نیز مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اور مَعَ اللّٰہِ میں جو تمیز و امتیاز اور فرق و تفاوت ہے وہ بادنیٰ تامل سمجھ میں آ سکتا ہے۔ (مرتب)

[1] سورۂ مومن آیت ۲۶ کا ابتدائی حصہ۔

اجازت دو، میں موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کئے دیتا ہوں" حالانکہ خدائی کا دعویدار ہے۔ لیکن میں عرض کیا کرتا ہوں دنیا میں بادشاہوں کا یہ حال ہوتا ہے۔ بادشاہ کیا ہے! دو ہاتھ اور دو پاؤں اس کے بھی ہیں۔ اگر اس کے منصب دار اس کا ساتھ نہ دیں، اس کے پنج ہزاری، بیس ہزاری، تیس ہزاری اس کی پشت پر نہ ہوں اس کی فوج کے بڑے بڑے جرنیل اور سپہ سالار اور دوسرے بااثر لوگ اس کے ساتھ نہ ہوں تو اکیلے بادشاہ سلامت کیا کریں گے! یہی وجہ تھی کہ جب فرعون کو اندازہ ہوگیا کہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کا اثر میرے چند درباریوں پر بھی ہو چکا ہے تو اس نے قدم اٹھانے سے پہلے ضروری سمجھا کہ اپنے درباریوں سے استصواب کر لے۔ ان کی رائے اور تائید حاصل کر لے۔ اس لئے اس نے دربار میں کہا: ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی ۔ "اب مجھے اجازت دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں"۔

مومنِ آلِ فرعون کی تقریر

اس موقع پر وہ مومنِ آلِ فرعون کھڑے ہو گئے ۔۔۔ اس سورت کا نام ہی "سورۃ المومن" ہی اس لئے ہے کہ ان مومنِ آلِ فرعون کی تقریر اس سورت میں بڑی تفصیل سے آئی ہے ۔۔۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ پورے قرآن مجید میں کسی نبی یا رسول کی اتنی طویل تقریر نہیں ہوئی ہے جتنی ان مومنِ آلِ فرعون کی ہوئی ہے ۔۔۔ گھر جا کر اس سورت بالخصوص ان مومنِ آلِ فرعون کی تقریر کا مطالعہ کیجئے گا ۔۔۔ وہ مومنِ آلِ فرعون اس موقع پر کھڑے ہو گئے۔ اس لئے کہ یہ بڑا نازک مرحلہ اور لمحہ (Critical moment) تھا کہ حضرت موسیٰؑ کے قتل کا فرعون کی تحریک و تجویز پر فیصلہ ہونے والا تھا ۔۔۔ اس وقت آلِ فرعون کے وہ مردِ مومن کھڑے ہوتے اور انہوں نے نہایت مؤثر تقریر کی جو قرآن مجید میں نقل ہوئی ہے جس کے نتیجہ میں فرعون کو جو خدائی کا دعوے دار اور مدعی تھا اپنا Resolution واپس لینا پڑا ۔۔۔ ان کی تقریر کا پورے دربار پر اتنا اثر ہوا کہ پھر فرعون کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہاتھ اٹھائے۔

مومنِ آلِ فرعون کی دعوتِ توحید

اس تقریر میں وہ مومنِ آلِ فرعون کہتے ہیں: وَیٰقَوْمِ مَا لِیْٓ اَدْعُوْکُمْ اِلَی النَّجٰوۃِ وَ تَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَی النَّارِ ؕ[1] "اے میری قوم کے لوگو! کیا معاملہ ہے غور کرو۔ میں تمہیں نجات

---

[1] آیت نمبر ۴۱

لی دعوت دے رہا ہوں، میں تمہیں اس راستہ کی طرف پکار رہا ہوں جو فوز و فلاح اور رشد و کامرانی کی طرف لے جانے والا ہے۔ اور تم مجھے آگ کی طرف بُلا رہے ہو۔ تَدْعُوْنَنِیْ لِاَکْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِکَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ اَنَا اَدْعُوْکُمْ اِلَی الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ۝[1] تم تو مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ کا انکار کر دوں اور اس کے ساتھ شرک کروں جس کا کوئی علم اور کوئی سند یا دلیل میرے پاس نہیں ہے اور میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں، بُلا رہا ہوں، پکار رہا ہوں اس ہستی کی طرف جو العزیز ہے الغفار ہے۔ ہر نوع اور ہر قسم کے اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں اور وہ بہت اور نہایت معاف فرمانے والا ہے۔

دعوتوں کا فرق

مومنِ آلِ فرعون کے ان اقوال میں یہ بات بھی واضح طور پر آگئی کہ دنیا میں دعوتیں دونوں بیک وقت موجود رہتی اور چلتی ہیں۔ توحید اور ایمان کی دعوت بھی ہے، شرک کی دعوت بھی ہے کفر کی بھی۔ قیامت تک یہ دعوتیں چلیں گی۔ جیسے علّامہ اقبال نے اس شعر میں کہا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے اَزل سے تا اِمروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!!

داعیانِ حق بھی رہیں گے اور داعیانِ باطل بھی رہیں گے اور ان میں سے بھی رہیں گے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور کہلواتے ہیں۔ کیا جلال الدین اکبر اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہتا تھا۔؟ کیا اس دور میں بھی کچھ ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جو مسلمانوں جیسے نام رکھ کر اور خود کو مسلمان کہلا کر الحاد، زندقہ، بے حجابی، بے پردگی، اباحیت اور نہ معلوم کس کس ضلالت کی طرف دعوت دینے میں نہایت منظم طریق اور بہترین تکنیک سے معروف ہیں! ایسے لوگ موجود ہیں اور یقیناً موجود ہیں۔ ان کی بڑی اکثریت ذرائع ابلاغ پر قابض ہے۔ بڑے بڑے کلیدی مناصب پر فائز ہے اور وہ ہمارے معاشرے میں اسلامی فکر اور اسلامی اقدار میں سرنگیں لگا رہے ہیں۔ اسلام کی جڑیں کھود رہے ہیں۔ ہمارے اسی معاشرے میں حدود اللہ کا تمسخر و استہزاء اور اس سے بغاوت کرنے والے موجود ہیں اور اسی کی دعوت دینے اور ترویج میں لگے ہوئے ہیں، اسی کام میں اپنی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں لگا رہے ہیں ـــــ لہٰذا دعوتیں ہمیشہ رہیں ـــــ ایک ہے توحید کی دعوت اور ایک کفر کی دعوت۔ ایک دعوت ہے ایمان و اسلام کی، ایک ہے شرک اور الحاد کی دعوت! اور ہمارے

---

[1] آیت نمبر ۴۲

معاشرے میں بھی بالفعل و بالقوۃ یہ مختلف دعوتیں موجود ہیں بلکہ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ باطل کی دعوت بہت منظم اور ہمہ گیر ہے۔ اس کے داعیان بڑے کیاد، عیّار اور چالاک ہیں۔ پھر ذرائع ابلاغ پران کی گرفت (Hold) بہت مضبوط ہے جس کے ذریعے وہ معاشرے کو Slow Poison دے رہے ہیں۔ وہ ہماری ان کمزوریوں سے خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں جو ایک طرف شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ کے ذیل میں آتی ہیں، دوسری طرف ان کا سبب ڈیڑھ دو صدیوں تک انگریزوں کا سیاسی استیلاء ہے جس کے باعث سیاسی غلبہ ختم ہو جانے کے باوجود بھی ہماری ذہنی مرعوبیت اور غلامی میں کمی ہونے کے بجائے روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چونکہ ہمارا نصاب اور نظامِ تعلیم ان ہی فکری اساسات پر مبنی ہے جو ملحدانہ اور مادہ پرستانہ ذہنیت وجود میں لاتی ہیں۔ اس کی نشوونما کرتی ہیں اور مسلمان نما ملحدوں کی معاشرے میں کثرت کا باعث بنتی ہیں۔

ایک موحد کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے؟ آگے چلیئے اور اگلی سورت، سورۃ حٰمٓ السجدہ کی آیت نمبر ۳۳ سُنیئے۔ بڑی پیاری اور مہتم بالشان آیت ہے فرمایا: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ "اس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہو گی"۔ یوں تو سب کے پاس زبانیں ہیں اور آج کل قلم ہیں اور چھاپنے کے لئے اخبارات و رسائل ہیں۔ اخبارات اور رسائل اب انڈسٹری بن چکی ہے۔ صحافت نہیں رہی۔ صحافت کا نام تو خواہ مخواہ بدنام ہو رہا ہے۔ یہ ایک کاروبار ہے۔ جس طرح ایک کاروبار اور انڈسٹری کا کام یہ ہے کہ معاشرے میں جس چیز کی طلب ہو اسے ہی وہ مہیا اور پیدا کریں گے یا پھر کسی ایسی چیز کی معاشرے میں مانگ (Demand) پیدا کریں گے جس میں ان کو غیر معمولی منفعت کا یقین ہو، چاہے وہ شے نفسانی خواہشات کو مہمیز کرنے والی کیوں نہ ہو پھر اس کو سپلائی کرنے کے لئے مسابقت کریں گے ـــــ جس کے متعلق حال ہی میں صدرِ مملکت صاحب نے فرمایا ہے کہ اخبارات میں سرخی پوڈر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے اس لئے کہ معاشرے میں طلب اسی کی ہے۔ انہیں تو اپنا پرچہ بیچنا ہے۔ پیسہ کمانا ہے۔ اس کے سوا ان کے سامنے کوئی اصول نہیں، کوئی اعلیٰ قدر نہیں، کسی ذمہ داری کا احساس نہیں۔ جو کسی نے لکھ کر بھیج دیا شائع کر دیا۔ پرچے کا پیٹ بھرنا ہے۔ قارئین کی تفریح اور دلچسپی کا سامان مہیا کرنا ہے۔ کچھ نہیں سوچنا کہ لکھنے والا کفر لکھ رہا ہے، شرک لکھ رہا ہے، فحش لکھ رہا ہے۔ اللہ

دین کا مذاق اڑا رہا ہے۔ شعائرِ دینی کا تمسخر اور اقدارِ دینی کا استہزاء کر رہا ہے۔ قرآنی آیات
راجم و مطالب میں تحریف کر رہا ہے اور احادیث کو بازیچۂ اطفال بنا رہا ہے۔ پھر اخبارات
ائل میں کثرت کے ساتھ لوگوں کی نگاہوں کو دعوتِ زنا دینے والی تصاویر شائع کی جا رہی ہیں۔
ں زیادہ سے زیادہ دیدہ زیب اور دلکش بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ دھڑلے سے
رہا ہے، اس ملک میں ہو رہا ہے جس کے قیام کا مقصد لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ بتایا گیا تھا اور جس کا
اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے ــــــ اور جس میں کوئی دن نہیں جاتا کہ یہ نوید نہ سنائی جاتی ہو کہ اس
ں میں جلد ہی اسلامی نظام آ رہا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اس دور میں بھی دعوتیں بہت سی ہیں، زبان بھی ہے قلم بھی ہے جو جس کے
میں آ رہا ہے کہہ رہا ہے اور لکھ رہا ہے۔ لیکن فرمایا: مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ
عَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف
بوت دے رہا ہو، اللہ کی طرف پکار رہا ہو لوگوں کو بلا رہا ہو اور اس کے ساتھ اس کا عمل بھی دعوت
لی مناسبت سے صالح ترین ہو ـ بالکل درست ہو۔ خلوص و اخلاص پر مبنی ہو۔ خود اس پر کاربند ہو
یہ نہ ہو کہ اوروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت والا معاملہ ہو رہا ہو۔ بلکہ نقشہ یہ ہو کہ جو بات میں کہہ
رہا ہوں، اس پر سرتاسر خود عامل بھی ہوں ــــ یہ مفہوم و مطلب ہوا ان دو باتوں کا کہ: مَنْ اَحْسَنُ
قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا ــــــ آگے تیسری بات یہ فرمائی: وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ
الْمُسْلِمِیْنَ ۝" اور کہے میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں ــــ کوئی نیا فرقہ نہ بنایا جائے۔ بلکہ کہا جائے
کہ میں بھی اللہ کے فرماں برداروں میں سے ایک ہوں ــــ میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے پیروکاروں اور اللہ کی توحید پر ایمان رکھنے والوں میں سے ایک ہوں۔ میں بھی یوم جزا و سزا کا
یقین رکھنے والوں میں سے ایک ہوں ــــ ان ہی باتوں کے اقرار ہی کا نام اسلام ہے ــــــ

اپنا علاحدہ ایک تشخص بنانا اور مسلمانوں میں ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈال دینا، اس سے بچنا
چاہئے۔ وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ انفرادی توحید سے عملی توحید کی طرف پیش رفت کے ضمن
میں دعوت الی اللہ کا مرحلہ سورۂ حٰمٓ السجدہ میں آیا۔ اب آئیے سورۂ شوریٰ کی طرف ــــ!

توحید عملی کی چوٹی: فریضۂ اقامتِ دین

میں نے آغاز میں سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ کی تلاوت کی تھی۔ اب میں اس کی کچھ تشریح

توضیح کروں گا۔ اس طرح ان شاء اللہ وہ تمہیدی باتیں اختتام کو پہنچ جائیں گی جو آج تقریر کے مدار میں آپ کے سامنے بیان کرنا میرے پیشِ نظر تھیں۔ کل اور پرسوں ان شاء اللہ ہم باقاعدہ درس کے انداز میں سورۂ شوریٰ کے بعض مقامات کا مطالعہ کریں گے ــــ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس آیت کریمہ کے مطالب و مفاہیم کو پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ سماعت فرمائیں اس لئے کہ یہ آیت کریمہ اس سورہ کی مرکزی آیت اور اس کا عمود ہے۔ تمہید عملی تھی انفرادی توحید سے کہ انسان اللہ کا بندہ بن جائے۔ اس کے لئے اپنی بندگی اور پرستش کو خالص کرتے ہوئے۔ پھر عملی توحید کی طرف پیش رفت کا پہلا مرحلہ ہے دعوت الی اللہ۔ توحید کی طرف لوگوں کو پکارنا اور بلانا۔ اس کا منتہا ہے اس امر کی جان و مال سے جدّ و جہد کہ اجتماعی زندگی اور نظام پر بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی توحید کا سکہ رواں ہو جائے۔ یہ ہے اقامتِ دین، دین کو بالفعل قائم اور نافذ کرنا۔

آیتِ مبارکہ پھر سماعت فرمائیے:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝

تشریح و توضیح

فرمایا: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ "مقرر کیا ہے تمہارے لئے دین" یہاں غور کیجئے کہ خطاب کن سے ہو رہا ہے؟ کن سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارے لئے "اَلدِّیْن" مقرر کیا ہے!! ظاہر بات ہے کہ جو مخاطب ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کے۔ وہی مخاطب ہیں اس آیتِ مبارکہ کے۔ یہاں جمع کے صیغہ میں ضمیر مخاطب "کُم" آیا ہے۔

امت کا جامع اور ہمہ گیر مفہوم

شاید آپ کے علم میں یہ ضروری بات ہو! نہ ہو تو نوٹ کر لیجئے۔ وہ یہ کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں تو اس میں ایک جزوی غلطی ہے۔ نبی اکرمؐ کی امتِ دعوت ہے پوری نوعِ انسانی۔ آپ تا قیامِ قیامت ہر مکان و زمان کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں بمطابق آیاتِ قرآنیہ: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا اور وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا

رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ؐ ـــــ لہٰذا پوری نوعِ انسانی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت ہے۔ جن لوگوں نے آں حضورؐ کی دعوت کو قبول کر لیا یا آئندہ کریں وہ امتِ اجابت میں شامل ہیں یا ہو جائیں گے۔ امتِ اجابت کے معنی ہوں گے تصدیق و تسلیم کرنے والی امت ـــــ ہمارا حال کچھ بین بین ہے۔ عملاً تو ہم نے قبول کیا ہوا نہیں ہے۔ عملاً تو ہم نام کے اور نسلی مسلمان ہیں۔ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہُ ہماری عظیم اکثریت فرائضِ دینی کی تارک اور شعائرِ دینی کی پابندی سے عاری ہے۔ نفس پرستی، زر پرستی قبر پرستی، تعزیہ پرستی اور نہ معلوم کتنی اور پرستیوں میں مبتلا ہے، زمانے کے چلن کی پرستی ہے۔ نظریاتی سطح پر ملحدانہ اور مادہ پرستانہ کئی نظریات ہمارے فہیم طبقے کے قلب و ذہن پر مستولی ہیں ـــــ ان اعتبارات کے پیشِ نظر ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر فی الواقع اور بالفعل لبیک کہا ہے! البتہ ہم دعویدار اس بات کے ضرور ہیں کہ ہم جیسے کچھ بھی ہیں بہر حال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اور آں حضورؐ کے امتی ہیں ـــــ

امتِ دعوت اور امتِ اجابت

پس امت کے لفظ کو آپ سمجھ لیجئے کہ جو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کا مخاطب ہے وہ امتِ دعوت میں سے ہے اور جو بھی اس دعوت پر لبیک کہہ کر اور اس کو قبول کر کے اس میں شامل ہو گیا وہ امتِ اجابت میں سے ہے۔ امتِ اجابت کو قرآن حکیم فرقان حمید يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا سے خطاب کرتا ہے ـــــ ان دونوں ہی سے اس آیت میں خطاب ہے ـــــ اب آئیے اس آیت کی تشریح و توضیح کی طرف:

آیت کی تفہیم و تصریح

فرمایا: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ "(لوگو!) تمہارے لئے اللہ نے وہی دین مقرر کیا ہے"۔ کونسا دین ـــــ؟ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا "جس کی اس نے وصیت کی تھی نوحؑ کو"۔ وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ "اور جو ہم نے وحی کیا ہے (اے محمدؐ) آپ کی طرف"۔ یہاں اِلَيْكَ واحد کا صیغہ ہے۔ لہٰذا مراد ہوں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى "اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو" عَلٰی نبینا وعلیھم الصلوٰۃ والسلام۔ پہلی بات تو یہ نوٹ کیجئے کہ یہاں پانچ رسولوں کا ذکر آیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور حضرات نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کا۔ اور یہی وہ پانچ رسول ہیں جن کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ اولوالعزم من الرسل ہیں۔ بعض علماء اس فہرست

میں حضرت ہودؑ اور حضرت صالح علیہما السلام کو بھی شامل کرتے ہیں لیکن اکثر علمائے سلف کی اکثریت کا رجحان ان ہی پانچ رسولوں کی طرف ہے جن کا ذکر یہاں آیا ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر حضورؐ سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ۔ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) صبر کیجئے جیسے ہمارے باہمت صاحبِ عزیمت رسول صبر کرتے رہے ہیں۔ یہاں اولوالعزم رسولوں سے یہی رسلؑ مراد ہیں۔ آیت کے اس ٹکڑے میں دوسری اہم بات یہ بیان ہوئی کہ ان سب رسولوںؑ کا دین ایک ہی ہے۔ جو دین جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، وہی دین لے کر آئے حضرت نوح علیہ السلام۔ وہی دین لے کر آئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ پس دین میں کوئی فرق نہیں۔ یہ بڑی اہم بات ہے اس کو نوٹ کیجئے۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ رسولوں کی شریعتیں مختلف رہی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ نماز کی جو شکل ہمارے یہاں ہے یہ شکل شریعتِ موسوی میں نہیں تھی۔ روزے کے جو احکام ہمارے یہاں ہیں، وہ بنی اسرائیل کے روزوں کے احکام سے مختلف ہیں۔ لہٰذا شریعتوں میں فرق رہا ہے۔ البتہ دین ایک ہی رہا۔ اس بات کو نہیں سمجھیں گے تو اَقِيمُوا الدِّينَ کا حقیقی مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس لئے اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔

جملہ انبیاء و رسل کا دین ایک ہی رہا ہے

تمام انبیاء و رسل کے مشترک دین کو واقعتاً ایک لفظ سے تعبیر کریں گے تو وہ ہوگا "دینِ توحید"۔ حضرت نوحؑ کا دور ہو، حضرت ابراہیمؑ کا دور ہو، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا دور ہو علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام اور نبی خاتم رسولِ آخر الزماں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ہو۔ ان سب کا دین ایک ہی رہا ہے اور وہ ہے دینِ توحید۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی اور رسول اسی دعوتِ توحید پر مامور ہوتے رہے ہیں۔ توحید کی دعوت ایک نقطۂ واحدہ ہے اور سب کی دعوت میں مشترک۔ اس میں کسی دور میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ توحید کیا ہے! یہ کہ انسان کو ہر معاملہ میں اللہ کا حکم ماننا ہے اس کی ہدایت پر چلنا ہے۔ یہی تاکید جنت سے حضرت آدمؑ کے ہبوطِ ارضی کے موقع پر کر دی گئی تھی۔ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ توحید کا اصل تقاضا یہ ہے کہ اس کی بھیجی ہوئی ہدایت اور

؛ اوامر و نواہی کے مطابق اس دنیا کی زندگی بسر کی جائے۔ تمام انبیاء و رسل کی دعوت کا مرکزی نقطہ یہی توحید رہا ہے ـــــ قرآن مجید میں جن انبیاء و رُسُل کا ذکر آیا ہے آپ ان سب کو پڑھ جائیے سب کی دعوت یہی ملے گی کہ : اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ـ

شریعتیں جدا رہی ہیں

البتہ شریعت کے احکام بدلتے رہے ہیں۔ اللہ کا حکم ایک وقت میں ایک ہے دوسرے وقت میں دوسرا ہے۔ حکم بدل گیا۔ توحید وہی ہے۔ اُس وقت اس حکم کی اطاعت کر لینا توحید ہے، اِس وقت اس حکم کی تعمیل کرنا توحید ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے مختلف شریعتوں کے فرق کو بیان کرنے کے بجائے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے ان شاء اللہ بات واضح طور پر سمجھ میں آجائے گی۔ آپ سب حضرات کو یقیناً معلوم ہوگا کہ ہجرت کے بعد تقریباً سولہ مہینے آں حضورؐ نے بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھی تا آنکہ حکم آگیا : فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط "پس اب پھیر دیجئے اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف ـ" بعض صحابہ کرامؓ میں ایک بے چینی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس لئے کہ ان کو خوب اندازہ تھا کہ نماز تو عِمَادُ الدِّيْن ہے۔ دین کا ستون ہے۔ رکنِ رکین ہے۔ بلکہ ایمان اور کفر میں امتیاز کرنیوالی چیز در حقیقت یہ صلوٰۃ ہے۔ اس کی دین میں اتنی اہمیت ہے۔ ان کو خیال آیا کہ اگر سولہ مہینے ہم نے غلط رُخ پر نماز پڑھی تو ہماری ان نمازوں کا کیا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اس دوران جن مسلمانوں کا انتقال ہو گیا اب ان کا کیا ہوگا۔ ! پس منظر میں یہ تشویش موجود تھی جس کے ازالے کے لئے اسی مقام پر یہ الفاظ آئے ہیں : وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ط "اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان ضائع کرنے والا نہیں ہے" فکر نہ کرو اس وقت تم نے اگر بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھی تو حکم خداوندی وہی تھا۔ اس وقت اسی اللہ کا حکم یہ ہے کہ مسجد حرام کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھو۔ تو اُس وقت توحید کا تقاضا وہ تھا اِس وقت اسی توحید کا تقاضا یہ ہے۔ حکم بدل سکتا ہے اصول نہیں بدلے گا۔ اصول یہ ہے کہ اللہ کے حکم پر چلنا ہے۔ جس وقت جو حکم ہے اسے ماننا ہوگا۔ اسی طریقے سے دوسری مثال سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں دیکھئے۔ مکی دور میں حکم ہے کہ مشرکین اگر تمہیں دہکتے انگاروں پر لٹا رہے ہیں تو جھیلو، برداشت کرو۔ ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ اس وقت اس حکم کی اطاعت کرنا اللہ کی اطاعت ہے۔ مدنی دور میں اگر حکم ہوا ہے : وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ ط "اور جنگ کرو اللہ کے

راستے میں، ان سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔" اب اس حکم پر عمل کرنا توحید ہے، اللہ کی اطاعت ہے۔ اللہ کی اطاعت وہاں وہ تھی یہاں یہ ہے۔ اللہ کی اطاعت کا اصول قائم رہے گا اگرچہ حکم بدل گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت کچھ اور تھی جس کا ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں۔ ہمارے پاس کوئی ریکارڈ ہے تو وہ شریعتِ موسوی کا ہے اور ان شریعتوں کے فرق کو عام طور پر لوگ جانتے ہیں پس شریعتیں بدلی ہیں، جدا رہی ہیں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ یہ الفاظ بھی آئے ہیں: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا " ہم نے (تم انسانوں) میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور راہِ عمل مقرر کی" سابقہ امتیں اگر ان کو دی ہوئی شریعتوں پر کاربند رہیں تو انہوں نے توحید کا تقاضا پورا کیا۔ اب جو شریعتِ محمدی ہے۔ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ وہ پچھلی تمام شریعتوں کی ناسخ ہے۔ اب اس پر چلنا توحید اور اطاعتِ الٰہی کا تقاضا ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ تورات کا ایک نسخہ لے آئے تھے اور اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔ میرا یہ گمان ہے کہ وہ کسی مسئلہ میں دلیل کے طور پر تورات کو پڑھ رہے تھے اور حضورؐ کو سنا رہے تھے۔ وہ تو پڑھنے میں لگے رہے اور انؓ کو اندازہ نہیں ہوا کہ حضورؐ کے چہرۂ مبارک پر ناراضگی کے آثار ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قریب تھے انہوں نے حضرت عمرؓ کو ٹوکا "دیکھتے نہیں ہو کہ حضورؐ کے چہرۂ مبارک کا کیا حال ہے!" حضرت عمرؓ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور ان کو حضورؐ کے چہرۂ انور پر خفگی کے آثار نظر آئے تو وہ کہتے رہے: رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا۔ تین بار انہوں نے اسی کا اعادہ کیا۔ یہاں تک کہ حضورؐ کا غصہ فرو ہوا اور پھر حضورؐ نے فرمایا "اے عمرؓ! اگر موسیٰؑ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو انؑ کو بھی میری اطاعت کے بغیر چارہ نہیں تھا" اَوْ کَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اس لئے کہ تمام سابقہ شریعتیں شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آنے کے بعد منسوخ ہو چکی ہیں ـــــ اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ انبیاء و رسلؑ کی شریعتیں مختلف رہی ہیں۔ دین ایک ہی رہا ہے اور وہ ہے دینِ توحید۔

دین اور شریعت میں ربط و تعلق

اب میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کو بھی جدید اصطلاحات سے سمجھ لیا جائے کہ دین اور شریعت میں کیا ربط و تعلق ہے۔! دیکھئے جدید سیاسیات میں دو اصطلاحات رائج ہیں۔

ایک دستور (Constitution) دوسری قانون (Law)۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ دستور (Constitution) وہ دستاویز ہے جو کسی بھی ملک کے نظام کو متعین کرتی ہے۔ اساسی دستور میں طے ہوتا ہے کہ اس ملک میں حاکمیت کس کی ہے۔ Sovereign کون ہے! اس حاکمیت کس طرح استعمال Channelise ہوگی! وہ روبعمل (Exercise) کس طور پر ہوگی۔ اس دستور کے تحت قانون سازی کا طریقہ (Process) کیا ہوگا۔! اس میں ردّ و بدل کیسے ہوگا! انتظامیہ اور عدلیہ میں باہمی ربط و تعلق کیا ہوگا۔! ایک دوسرے کے محاسبہ اور توازن Checks and Balances) کا نظام کیا ہوگا! ان بنیادی مسائل کے لئے رہنمائی دینے والی دستاویز اساسی دستور کہلائی جاتی ہے۔ ہر ملک کے دستور میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اساسی دفعات بہت پائیدار اور مضبوط ہوں۔ چونکہ بار بار ترمیم مناسب نہیں ہوتی لہٰذا تبدیلی کا طریقہ (Process) مشکل ترین رکھا جاتا ہے۔ اس دستور کے تحت حسبِ ضرورت اکثریت کی رائے سے قانون سازی ہوتی رہتی ہے اور قانون صرف ۴۹ اور ۵۱ آراء کے فرق سے ہر وقت تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔ ایک وقت میں لیجسلیٹیو اسمبلی یا پارلیمنٹ ایک قانون منظور کرتی ہے اور دوسرے وقت میں اس کو تبدیل کر دیتی ہے یا اس میں ترمیم (Amendment) کر دیتی ہے۔ وہ چھپ جاتی ہے اور وکلاء حضرات اس کی قانون کی کتب میں چیپیاں لگاتے رہتے ہیں ـــــ ان دونوں اصطلاحات سے یہ بات سمجھ لیجئے کہ دستور کی حیثیت ہے دین کی اور قانون کی حیثیت ہے شریعت کی۔

لفظ دین کا مفہوم

آگے بڑھنے سے قبل میں چاہوں گا کہ اسی موقع پر لفظ دین کے مفہوم کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ جس کی تشریح میں نے ابتدائی گفتگو میں مؤخر کی تھی۔ عربی میں دین کے لغوی معنی ہیں "بدلہ"۔ ظاہر ہے کہ بدلہ کسی کام کے نتیجہ کے طور پر ملتا ہے۔ اچھے کام کا اچھا اور بُرے کام کا بُرا بدلہ ـــــ لہٰذا لفظِ دین میں جزا و سزا کا مفہوم پیدا ہوا۔ اس مفہوم سے لفظِ دین میں قانون اور ضابطہ کا تصور شامل ہوا۔ چونکہ جزا اور سزا مستلزم ہے کسی قانون اور ضابطہ کو ـــــ اس تصور کے مقتضیات و لوازم کے طور پر اسی لفظِ دین میں ایک مقنن اور مطاع کا مفہوم داخل ہوا۔ اب بدلہ، جزا و سزا، قانون و ضابطہ اور مقنن و مطاع کے تمام مفاہیم کو جمع کیجئے تو حاصل جمع ہوگا اطاعت۔ لہٰذا ان تمام مطالب و مفاہیم اور تصورات کے اجتماع سے قرآن مجید کی اصطلاح "دین" بنی۔

دین کے معنی ہوئے ایک دستور۔ ایک پورا نظامِ حیات۔ ایک مکمل ضابطہ زندگی ہے!

میں ایک ہستی یا ادارے کو مطاع، مقنن اور حاکم مطلق تسلیم کر کے اس کی جزا کی امید اور سزا کے خوف سے اس کے عطا کردہ یا جاری و نافذ کردہ قانون اور ضابطہ کے مطابق اس ہستی یا ادارے کی کامل اطاعت کرنا ـــــ

ان تمام مفاہیم کو قرآن مجید میں ان الفاظ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام ـ بلاشبہ اللہ کا پسند کردہ نظام حیات تو اسلام یعنی مکمل تابع داری ہے یہاں دین اور اسلام کے فرق کو بھی سمجھ لیجئے۔ "الدین" کے معنی یہاں ہیں "نظامِ حیات۔ اطاعت اور الاسلام کے معنی ہوں گے تابعداری اور فرمانبرداری کرتے ہوئے زندگی بسر کرنا ۔ نظامِ حیات اور دستور کے معنی میں یہ لفظِ دین سورۂ نصر میں استعمال ہوا ۔ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ـــ غیر اللہ کے بنائے ہوئے نظامِ حیات پر بھی اسی 'دین' کی اصطلاح کا اطلاق ہوگا ۔ جیسے سورۂ یوسف میں بادشاہ کے رائج نظام کے لئے دین الملک استعمال ہوا ۔ چونکہ ملوکیت میں حاکمیت مطلقہ بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے ۔ وہ کسی تحدید کا پابند نہیں ہوتا ـــ

دستور و قانون کا تعلق

اب پھر رجوع کیجئے اس بات کی طرف کہ دستور تو اصل میں نظام کو طے کرتا ہے ۔ اور اس نظام کے تحت قانون کا عمل جاری و ساری رہتا ہے ۔ لہٰذا دستور کی حیثیت ہے دین کی اور قانون کی حیثیت ہے شریعت کی ۔ دستور طے کرتا ہے کہ حاکمیت کس کی ہے، اطاعتِ مطلقہ کس کی ہوگی ۔ قانون سازی کا آخری اختیار کس کے ہاتھ میں ہے ۔ اللہ کے دین میں حاکمیتِ مطلقہ صرف اور صرف اللہ کے لئے ہے ۔ اطاعتِ مطلقہ کی سزاوار اسی کی ذاتِ عزّوجل ہے ۔ اس کی قائم کردہ حدود کے اندر اندر رہتے ہوئے اسلامی ملک کی پارلیمان کو قانون سازی کا حق حاصل ہے ۔

جمہوریت

ہمارے دور میں سب سے زیادہ مقبول اور رو بعمل نظام جمہوریت ہے ۔ گویا آج کل سب سے زیادہ رَواں جمہوریت کا سکہ ہے ۔ ع سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ! یہاں "آتا" کو "آیا" سے بدل دیجئے تو یہ دور جمہوریت کا دور ہے ۔ یہ بھی ایک دین ہے ۔ دینِ جمہور ۔ اس کا اصل یہ ہے کہ حاکمیتِ مطلقہ عوام کی ۔ عوام کے منتخب کردہ نمائندے جو چاہیں گے قانون بنائیں گے ۔ انہیں اختیار ہے کہ شراب پر پابندی لگائیں یا اسے ھنیئاً مریئاً قرار دیں ۔ ان کو اختیار ہے کہ زنا پر کوئی سزا طے کریں یا اس کی کھلی چھوٹ دے دیں ۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ بعض مغربی ممالک میں لواطت کو نہ صرف جائز قرار دیا گیا ہے بلکہ Homosexuality کو اس طرح

قانونی تحفظ دیا گیا ہے کہ دو مرد بھی آپس میں شوہر اور بیوی کا رشتہ قائم کر سکتے ہیں۔ قانون ان سے کوئی تعرض نہیں کرے گا۔ چونکہ ان کا قانون اسے جائز رشتہ ازدواج میں منسلک قرار دیتا ہے ان پر شوہر اور بیوی کے تمام حقوق و فرائض کا اطلاق ہوگا۔ یہ ہے جمہوریت جس میں حاکمیتِ مطلقہ عوام کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے نمائندے جو چاہیں قانون بنائیں۔ ان پر کوئی تحدید نہیں ہے۔

دین اللہ

دین الملک اور دین الجمہور کے مقابلے میں دین اللہ، دین اسلام کیا ہے! وہ یہ کہ مطاعِ مطلق ہے اللہ۔ قانون سازی کا مطلقاً اختیار اللہ کو ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ "حکمرانی اور فرماں روائی کا کلیۃً اختیار صرف اللہ کے لئے ہے۔ اسی تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی بندگی کی جائے گی۔ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں ہوگی۔ اسی طرزِ عمل اور رویہ کا نام دینِ قیم ہے۔" اسلامی مملکت میں اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ تسلیم کی جائے گی۔ اور اللہ کے نازل کردہ دین و شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے حسبِ ضرورت قانون سازی ہوتی رہے گی۔ اصولِ دین سے کسی حال میں سرِمو انحراف نہیں کیا جائے گا۔

ہمارے دستور کی قراردادِ مقاصد

آج صبح میں نے اخبار میں دیکھا کہ آج مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی برسی کا دن تھا۔ میں تو برسی کا قطعی قائل نہیں ہوں لیکن اس لحاظ سے بات ذہن میں بیٹھ گئی کہ آج اخبارات نے مولانا مرحوم کی چند دوسرے اہلِ علم و دانش کے تعاون سے مرتب کردہ اس قراردادِ مقاصد کا متن بھی شائع کیا جو ۱۹۴۹ء میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی تھی۔ جو ۱۹۷۳ء کے دستور تک ہر دستور میں بطور افتتاحیہ شامل ہے۔ اس قرارداد میں یہ بات طے کی گئی تھی کہ اس سلطنت خداداد میں حاکمیت اللہ کی ہے اور عوام کے منتخب نمائندے اس کے نائب کی حیثیت سے امور و کاروبارِ حکومت چلائیں گے۔ وہ بہت اہم اور بڑا فیصلہ تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ فیصلہ دل سے کیا نہیں گیا تھا۔ یہ تو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی شخصیت، ان کی علمیت، ان کی وجاہت اور ان کا پاکستان کی تحریک میں بھرپور حصہ، پھر عوام و خواص میں ان کی عزت و احترام اور ان کا اثر و رسوخ، ان سب باتوں کا رعب اتنا تھا، پھر یہ کہ نواب لیاقت علی خان مرحوم خود بھی مولانا کے کچھ زیرِ اثر تھے لہٰذا قراردادِ مقاصد پاس ہو گئی۔ ورنہ مجھے امید ہے کہ اس مجلس میں چند لوگ ایسے ضرور ہوں گے کہ ان کو یاد ہوگا کہ قراردادِ مقاصد کے منظور ہونے کے بعد

دستور ساز اسمبلی میں کچھ نام نہاد مسلمانوں ہی نے کھڑے ہو کر یہ کہا تھا کہ اس قرارداد کے پاس ہونے پر آج ہماری گردنیں شرم کے مارے جھک گئی ہیں آج ہم مہذب دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے، اصل بات چونکہ دل سے نہیں نکلی تھی۔ اندر خاص شخصیتوں کے دباؤ تھے پھر خارج میں جماعتِ اسلامی کی برپا کردہ اسلامی دستور کی تدوین کے لئے کافی مؤثر تحریک تھی۔ جس کے نتیجہ میں اسمبلی میں خطوط، پوسٹ کارڈز اور تاروں نیز مختلف پلیٹ فارموں سے منظور شدہ مطالبوں کی قراردادوں کی نقول سے بوریوں پر بوریاں بھر گئی تھیں اور ان کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ملک نیا نیا بنا تھا۔ عوامی دباؤ کا بھی یہ نیا تجربہ تھا۔ لہٰذا برسرِ اقتدار لوگ اس عوامی تحریک سے بھی کافی مرعوب ہو گئے تھے۔ رائے عامہ کا ظہور جس قدر بڑے پیمانے پر ہوا تھا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ قراردادِ مقاصد منظور تو ہو گئی لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ کام خارجی دباؤ کے تحت ہوا تھا۔ اصل میں دل سے یہ بات نہیں نکلی تھی۔ لہٰذا وہ صفحۂ قرطاس کی زینت تو بن گئی لیکن اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جو پیش رفت ہونی چاہیئے تھی وہ نہیں ہوئی نہ اس وقت ہوئی نہ آج تک ہوئی ہے۔

ایک کثیفہ

اس ضمن میں ایک لطیفہ بلکہ کثیفہ میں آپ کو سناتا ہوں۔ ایک صاحب جو اس وقت اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل تھے اور مجھ سے بڑے تھے۔ اب بھی حیات ہیں اور اب ایک نامور سیاسی لیڈر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ لاہور میں مستقل طور پر رہتے ہیں۔ میں ان کا نام نہیں بتانا چاہتا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ لاہور کی مال روڈ پر جا رہے تھے تو ایک بڑی سی کار پاس سے گزری اور ایک بہت لمبی داڑھی والے ایک صاحب اس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے توجہ سے دیکھا کہ کون ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کیا دیکھتے ہو؟ یہ "قراردادِ مقاصد" ہے۔ میں بڑا حیران ہوا اور میں نے کہا کیا کہہ رہے ہو؟ وہ کار والے صاحب سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ "ان کو لوگ 'قراردادِ مقاصد' کہتے ہیں۔" میں نے پوچھا کیوں؟ بولے "جس طرح قرارداد مقاصد کی ہمارے ملک میں کوئی حیثیت نہیں ہے ویسے ہی ان صاحب کے کردار میں اس داڑھی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اپنے کردار کے لحاظ سے یہ نہایت بدنام شخص ہے جو ابھی کار میں گزرا ہے لیکن یہ کہ دینداری دکھانے کے لئے بڑی سی داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ جیسے قراردادِ مقاصد کی حیثیت محض ایک دکھاوے کی چیز کے سوا اور کچھ نہیں" ان کی بات صد فی صد درست ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ پینتیس سال

دگزر چکے ہیں چھتیسواں سال شروع ہو چکا ہے۔ اس عرصہ میں اس قرار داد پر جو کچھ عمل ہوا ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ لیکن فی الواقع اس قرار دادِ مقاصد پا اور اس دفعہ پر جو ہر دستور میں محض رہنما اصول (Directive Principle) کے طور پہ درج ہوتی چلی آ رہی ہے۔ کسی دستور میں بھی اسے نافذ العمل دفعہ (Operative Clause) قرار نہیں دیا گیا۔ وہ رہنما اصول یہ ہے کہ:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

"کوئی قانون سازی نہیں ہو گی جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔"

اسلامی نظام کے مقتضیات اگر قرار دادِ مقاصد اور یہ رہنما اصول Operative Clause یعنی نافذ العمل دفعہ) بن جائے اور یہ دونوں واقعی خلوص کے ساتھ صاحب اقتدار حضرات کے دلوں میں اتر جائیں۔ پھر ملک کی تمام ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کو کھلا اختیار دے دیا جائے کہ اس ملک کا رہنے والا ہر مسلمان اس دفعہ کے تحت جس قانون کو بھی چیلنج کرے کہ قرآن و سنت کے خلاف ہے تو وہ عدالتیں اس کو سنیں اور فیصلہ دیں۔ یہ دونوں چیزیں کسی ملک کے دستور اور نظام کو اسلامی دستور اور نظام بنانے کے لئے کفایت کریں گی —— باقی رہی یہ بات کہ انتخابات کا طریقہ کیا ہو! وہ جماعتی بنیاد پر ہو، متناسب نمائندگی کے اصول پر یا غیر جماعتی ہو۔ ملک کا نظام پارلیمانی ہو یا صدارتی ہو۔ وحدانی ہو یا وفاقی یا الحاقی ہو۔ یہ سارے مسائل مباحات کے دائرے کے ہیں۔ ہمارے ملک کے حالات کے اعتبار و لحاظ سے جو طریقہ مناسب نظر آئے اسے اختیار کر لیا جائے۔ اصل چیز یہ ہے کہ ملک کا نظام' توحید پر استوار اور مبنی ہو۔ نظری طور پر تسلیم کیجئے اور عمل میں اس کا مظاہرہ کیجئے کہ حاکمیت کا اختیار صرف اللہ کا ہے۔ نظری طور پر یہ بات قرار دادِ مقاصد میں موجود ہے اور عملاً اس رہنما اصول کو نافذ العمل دفعہ بنانے کی ضرورت ہے کہ:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

"قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔"

قانون سازی کا ہمیں اختیار ہے۔ لیکن یہ اختیار محدود ہے ۔ ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے اندر رہتے ہوئے اور ان کی روح کے مطابق قانون بنا سکتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام میں ردوبدل کرنے کے ہم ہرگز اور قطعی مجاز نہیں ہیں۔ نہ ان سے تجاوز کر سکتے ہیں ——

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا۔ ایک جگہ آتا ہے : تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا "یہ اللہ کی حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو" اور "یہ اللہ کی حدود ہیں ان کے قریب بھی نہ پھٹکو"[1] اس دائرے کے اندر آپ قانون بنائیے۔ اس کے لئے بھی قرآن نے ہدایت دے دی ہے : وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ۔ اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کریں۔ کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ مطلوب ہے واجب ہے کہ معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں۔

قابلِ صد افسوس بات

آپ کو معلوم ہے کہ اس دور میں شرعی عدالتیں بنی ہیں، لیکن حال کیا ہے ! ان کے بھی ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، ان کو حکم ہے کہ كُفُّوْا اَیْدِیَكُمْ "اپنے ہاتھ بندھے رکھو۔" فلاں فلاں قوانین کی طرف ہرگز نگاہ نہ اٹھانا۔ عائلی قوانین ان شرعی عدالتوں کے حیطۂ اختیار سے باہر ہیں۔ ان پر فیصلہ کرنے کی یہ عدالتیں مجاز نہیں کہ ان میں شریعت کے خلاف کون کون سی دفعات ہیں۔ ان عائلی قوانین کو صاحبِ اقتدار حضرات کا تحفظ حاصل ہے۔ چونکہ ڈر ہے کہ اگر ان میں سے خلافِ شرع دفعات حذف کر دی گئیں تو مغرب زدہ خواتین ناراض ہو جائیں گی۔ گویا ان کی ناراضگی کا اللہ کی ناراضگی سے زیادہ خوف ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ ان کی رضا اللہ کی مرضی و رضا سے زیادہ عزیز ہے۔ ان شرعی عدالتوں کو اس امر کا پابند بھی کر دیا گیا ہے کہ یہ مالی قوانین کے بارے میں بھی فیصلے دینے

---

[1] ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایک بندۂ مومن کے اختیار کی کیفیت اس گھوڑے کے مانند ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہو۔ اب جتنی لمبی رسّی ہے اسی قدر وہ اس کھونٹے کے چاروں طرف جا سکے گا، اس رسّی سے تجاوز نہیں کر سکے گا۔ یہی طرزِ عمل ایک مومن بندے کا ہونا چاہئے۔ (او کما قال)
اس سے ایک صحیح اسلامی ریاست کی حدود اختیارات کو سمجھا جا سکتا ہے ـــــ اسلامی ریاست میں اختیارات کی حد بندی کے لئے سورۃ الحجرات کی یہ آیت کریمہ رہنمائی کرتی ہے کہ : یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ "اے اہلِ ایمان! اللہ اور اس کے رسول کے آگے (یعنی ان کے احکام سے) پیش قدمی نہ کرو اور اللہ کی نافرمانی سے بچو۔ اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" اس آیت کی رو سے ایک اسلامی ریاست کو لازماً اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے تابع ہو کر کاروبارِ حکومت چلانا ہوگا۔ (مرتب)

مجاز نہیں ہیں کہ کون سے قوانین اور طور طریقے خلافِ اسلام ہیں۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ اہم ترین کام تو مالیات کا نظام ہی ہوتا ہے۔ آج کی دنیا میں سارا دار و مدار تو معاشی نظام پر ہے۔ وہ طے کرتا ہے کہ پورا نظام کن اصولوں پر چلے گا ـــ آپ کو بہ ادنیٰ تامل نظر آجائے گا کہ ہمارے پورے نظامِ معیشت کا دار و مدار حرام پر ہے۔ ہماری تمام بڑی بڑی صنعتیں اور ہماری تمام برآمدی و درآمدی تجارت سود کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ ہماری زمین یعنی کاشت کاری کا اکثر و بیشتر بندوبست جاگیرداری اور زمینداری کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ ایک ہے صنعت و تجارت کا سود اور ایک ہے زمین کا سود۔ معیشت کا کل کا کل معاملہ سود کی بنیاد پر چل رہا ہے لیکن شرعی عدالتوں کے ہاتھ باندھ دیئے گئے کہ وہ ان مسائل کے متعلق کوئی Verdict نہیں دے سکتیں۔ ہو سکتا ہے کہ چند اور بھی مسائل ہوں جو ان عدالتوں کے حیطۂ اختیار سے باہر رکھے گئے ہوں۔ بہرحال عائلی قوانین اور مالی قوانین پر یہ عدالتیں کسی غور و فیصلہ کی مجاز نہیں ہیں۔ ان امور کو اگر دین کے تابع نہیں کیا گیا تو گویا بنیادی باتوں ہی سے اعراض و گریز کیا جا رہا ہے۔ پھر اسلام آئے گا تو کیسے آئے گا۔ اگر اسلام کو فی الواقع لانا ہے تو ان سب کو بدلنا ہوگا۔

آیت کی مزید توضیح و تشریح

یہ باتیں تو جملہ ہائے معترضہ کے طور پر درمیان میں آگئیں۔ اب آئیے سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ کی طرف۔ میں نے اس آیت کی ابھی تک صرف دو باتوں کی شرح کی ہے۔ ایک تو یہ کہ ان پانچوں رسولوں کا دین ایک ہے۔ اور یہ پانچوں چوٹی کے رسول ہیں۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں۔ معلوم ہوا کہ تمام انبیاء و رسل کا دین ایک ہی رہا ہے۔ از آدم علیہ السلام تا ایں دم۔ دینِ الٰہی ایک ہے۔ یہ دین کیا ہے؟ یہ ہے فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ۔ انفرادی سطح پر اور اجتماعی سطح پر یہ بات مانو کہ اللہ ہی ہے حاکمِ مطلق۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ اسی تعالیٰ کے قانون کی تنفیذ ہو۔ جہاں اس تعالیٰ نے آزادی دے رکھی ہو وہاں تم حدود میں رہ کر قانون بنا سکتے ہو۔ یہ اسی کی دی ہوئی آزادی ہے۔ لیکن اس کی مقرر کردہ حدود سے ہرگز تجاوز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان میں ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہوگا دین کو قائم کرنا۔ یہ ہے اقامتِ دین۔ اس کو سمجھنے کے لئے اب آیتِ مبارکہ کے اگلے حصے پر آجائیے۔ اس کیلئے آیت کا متعلقہ حصہ پھر سماعت فرمائیے! شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ یہ دین اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کو قائم کرو۔ اس لئے تو نہیں

دیا گیا کہ اس کی مدح کرو۔ اس کی تعریفیں کرو۔ اس پہ کانفرنسیں کرتے رہو۔ کانفرنسیں اور محاضرات
قرآنی ہم بھی کرتے ہیں، لیکن اگر ان کانفرنسوں اور محاضرات سے مقصود ہو دین کو قائم کرنے کی جدوجہد
میں کام لینا تو ان کا انعقاد مبارک۔ اور اگر یہ چیزیں اپنی جگہ مقصود و مطلوب بن جائیں اور گفتن و
برخاستن تک معاملہ رہے تو ان کا کوئی حاصل نہیں۔ کسی پیشِ نظر عظیم کام کے لئے ہو تو یہ احسن کام
ہے چونکہ ظاہر بات ہے کہ اس کے کچھ Practical Aspects ہوں گے۔ لہٰذا اصل
مقصود ہی اس کام کا صحیح مقام متعین کرے گا۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کے طور پہ تبلیغ ہو رہی ہو تو
وہ تبلیغ اور ہو گی۔ اور اگر تبلیغ برائے تبلیغ ہو رہی ہو تو وہ تبلیغ اور ہو گی۔ ان میں زمین و آسمان کا فرق
ہو جائے گا جیسا کہ میں پچھلی مرتبہ عرض کر کے گیا تھا کہ ایک ہے خالص مذہبی طرز کی تبلیغ۔ ایک تبلیغ ہے
انقلابی تبلیغ۔ ایک تبلیغ وہ ہے جو صرف عقیدہ کو پھیلاتی ہے جیسے عیسائیت کی تبلیغ۔ وہاں نظام
ہے ہی نہیں، دین ہے ہی نہیں۔ شریعت موجود ہی نہیں ہے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام! اس کے
احکام موجود ہی نہیں ہیں۔ ان کے ہاں صرف عقیدہ ہے یا اخلاقیات کی کچھ تعلیم ہے۔ اخلاقیات
(Morality) کے بارے میں ابتدا ہی میں میں نے بتایا تھا کہ سب کے نزدیک یہ مشترک چیزیں
ہیں۔ ان کو Universal Ethics آفاقی اخلاقیات کہنا بجا ہو گا۔ شریعت ان
کے ہاں سرے سے ہے نہیں تو نظام کیا بنے گا! لہٰذا ان کی تبلیغ صرف عقیدے اور چند اخلاقی
اصولوں کی تبلیغ ہے۔ جس طریقے سے ایک بیل ہوتی ہے جو وہ زمین پہ پھیلتی ہے۔ سرے سے اوپر
اٹھتی ہی نہیں۔ وہ خربوزے کی ہو، کدو کی ہو، کسی چیز کی بھی ہو وہ زمین پر ہی رہ جائے گی۔ اوپر نہیں
اٹھے گی۔ یہی مذہبی تبلیغ کا مزاج ہے کہ وہ زمین ہی پہ پھیلتی چلی جاتی ہے۔ وہ کبھی نظام قائم نہیں کرتی
نظام کا قیام اس کے پیشِ نظر ہوتا ہی نہیں۔ لیکن انقلابی تبلیغ کسی نظام کو برپا کرنے کے لئے ہوتی
ہے۔ اس کی مثال ہمارے سامنے اشتراکی تبلیغ ہے۔ ایک اشتراکی تبلیغ کے ذریعے اپنے نظریات
کو پھیلاتا ہے۔ لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتا ہے۔ اپنا لٹریچر پھیلاتا ہے۔ غزلوں سے، نظموں سے،
افسانوں سے، ڈراموں سے اور بہت سے ذرائع سے وہ اپنے فکر کو پھیلانے کے لئے جدوجہد
کرتا رہتا ہے۔ پھر اس فکر کو قبول کرنے والوں کو منظم کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پیشِ نظر انقلاب
برپا کرنا ہے۔ اس کے پیشِ نظر ایک نظام ہے جسے وہ سمجھتا ہے کہ صحیح اور بہترین نظام ہے۔ وہ
سمجھتا ہے یا درست سمجھتا ہے اس سے قطع نظر وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ یہ وہ نظام ہے جو عدل
پہ مبنی ہے۔ وہ اس نظام کو برپا کرنے کے لئے تبلیغ کر رہا ہے۔ تو اس انقلابی تبلیغ میں ا

بس مذہبی تبلیغ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کو آپ دیکھیں گے تو اس میں دونوں تبلیغیں آپ کو نظر آئیں گی۔ اللہ کی طرف دعوت بھی ہے۔ توحید کے عقیدے کی دعوت بھی ہے اور اقامتِ دین کی جدوجہد بھی ہے۔ نظام کو بدلنے کی سعی و کوشش بھی ہے۔ چنانچہ آگے چل کر کل جب ہم اس سورۂ شوریٰ کی اگلی آیات پڑھیں گے تو ان میں ہمیں دعوتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا یہ ہدف ملے گا۔ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پس آپ اس کی دعوت دیجئے"۔ یہاں فَلِذٰلِكَ فَادْعُ نہایت غور اور توجہ چاہتا ہے۔ دعوت کس چیز کی؟ دعوت اقامتِ دین کی ۔۔۔ : اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ کی دعوت۔ دین کو بالفعل قائم کرنے کی دعوت۔ صرف عقیدے کی دعوت نہیں ہے۔ صرف اخلاقی تعلیم کی تبلیغ و تلقین نہیں ہے۔ صرف مراسمِ عبودیت کو پھیلانے کی تبلیغ نہیں ہے۔ ٹھیک ہے نماز، روزے اور دوسرے نیکی کے کاموں کی دین میں بڑی اہمیت ہے لیکن ان سب سے جو چیز مطلوب ہے وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ اللہ کی توحید کو اجتماعی نظام پر قائم کرنے کے لئے ان سے مدد حاصل کی جائے
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ "اے ایمان والو! مدد حاصل کرو (اللہ کی راہ میں مشکلات پر) صبر سے اور نماز سے" ۔ آگے جہاد فی سبیل اللہ کی جو چوٹی ہے یعنی قتال فی سبیل اللہ۔ اس کے اعلیٰ و ارفع مقام کا ذکر ان الفاظِ مبارکہ سے کر دیا گیا: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ صبر و صلوٰۃ سے مدد کس مقصد کے لئے حاصل کرنی ہے! وہ ہے اقامتِ دین کی جدوجہد ۔۔۔!!

اسی کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا: فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ "پس اے نبیؐ اسی کی دعوت دیجئے اور جس چیز کا آپ کو حکم ہوا ہے اسی پر جم جائیے اور ان (مشرکوں) کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے" یہ ہے اقامتِ دین: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ

تفرقہ کیا ہے؟

وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ لہٰذا میں اس وقت وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ کی اجمالی تشریح پر اکتفا کروں گا۔ ان شاء اللہ کل جب ہم باقاعدہ سورۂ شوریٰ کے بعض اہم مقامات کا باقاعدہ درس کی شکل میں مطالعہ کریں گے تو تفاصیل بیان ہوں گی۔ دیکھئے ایک لفظ ہے تفرقہ، تفریق اور ایک ہے اختلاف۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اختلاف بالکل نیک نیتی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اختلاف جزوی ہوتا ہے۔ اختلاف کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ

دمن دیگرم تو دیگری' - یہ تفرقہ ہو جائے گا۔ تفرقہ یہ ہے کہ ایک دوسرے سے کٹ جائیں، بٹ جائیں،
پھٹ جائیں۔ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ اختلاف تو امام ابوحنیفہ سے کیا امام شافعی
نے (رحمہما اللہ علیہما) امام ابوحنیفہؒ کے بعض فتاویٰ سے اختلاف کیا ہے۔ خود امام موصوف
کے شاگردوں نے اپنے استاذ سے۔ امام محمدؒ اور امام قاضی ابویوسفؒ نے بعض مسائل میں امام
رحمہ اللہ کی آراء سے اختلاف کیا کہ نہیں کیا۔ ! ایک امام دوسرے امام کی رائے، تعبیر اور فتویٰ
سے اختلاف کر سکتا ہے ایک شاگرد اپنے استاذ کی رائے سے اختلاف کر سکتا ہے۔ ان سب
کی نیتیں نیک ہیں، مبنی بر اخلاص ہیں۔ یہ سب دینِ الٰہی کا حکم اور اس کا منشاء معلوم کرنا چاہ رہے ہیں
قیاس اور اجتہاد کے ذریعے سے۔ لیکن چونکہ استنباط کے اصول میں کچھ اختلاف ہے۔ لہٰذا نتیجے
مختلف نکل رہے ہیں۔ پس اختلاف نیک نیتی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اختلاف کوئی بُری شے نہیں ہے
یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسی اختلاف سے دنیا کی رونقیں ہیں۔ ذوقؔ نے کہا ہے ؎

گلہائے رنگا رنگ سے ہے رونقِ چمن ۔۔۔ اے ذوقؔ زیب اس چمن کو ہے اختلاف سے

ایک گلاب کا پودا ہے، اس میں جو پھول لگتے ہیں وہ سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر ایک کا رنگ
اور انداز جدا جدا ہوتا ہے۔ اسی طرح غور کیجئے کہ ایک ہی طرح کے تمام انسان ہوتے، رنگ ایک، شکل
وصورت ایک، ناک نقشہ ایک تو کتنی اکتا دینے والی یکسانیت (Monotony) ہو جاتی۔
ایک دوسرے کو پہچاننا مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن ہو جاتا۔

تفریقِ دین ایک نوع کا شرک ہے

لیکن تفرقہ کے متعلق جان لیجئے کہ اُمت میں تفرقہ اور
دین میں تفرقہ کو شرک کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ قرآن
کہتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ
(اے نبیؐ!) جو لوگ اپنے دین کو پھاڑ دیں، ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ اس میں تفرقہ ڈال دیں اور
گروہوں میں بٹ جائیں یقیناً (اے نبیؐ!) ان سے آپؐ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" یہاں نوٹ کیجئے!
ایک ہے تفریقِ دین۔ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ۔ انہوں نے اپنے دین کو پھاڑ دیا ۔۔۔ دین کو پھاڑنا
کیا ہو گا! ۔ نظامِ اطاعت کو تقسیم کر دینا۔ ایک حصہ میں اللہ کی اطاعت ہو رہی ہے اور دوسرے
حصوں میں اطاعت ہو رہی ہے کسی اور کی۔ کہیں ہو رہی ہے شریعتِ الٰہی کی اور کہیں ہو رہی ہے
اپنے نفس کی خواہشات کی۔ کہیں زمانے کے چلن اور فیشن کی۔ کہیں برادری کے رواج کی۔ یہ دین کو
پھاڑ دیا گیا ہے۔ یہاں فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ نہایت قابلِ غور حصہ ہے۔ فَرَّقَ، یُفَرِّقُ، تَفْرِیْقًا
آتا ہے پھاڑ دینے، کاٹ دینے، ٹکڑے ٹکڑے کر دینے اور جدا جدا کر دینے کے لئے۔ دوسرا

ہے تَفَرَّقُوۡا فِی الدِّیۡنِ۔ خود دین کے معاملے میں متفق ہو جائیں۔ دین کے معاملہ میں متفرق
ونے کا تعلق ہے اقامتِ دین سے۔ مسلمان فرقوں میں منقسم ہو جائیں تو پھر دین کیسے قائم ہوگا!
ین کو قائم کرنے کے لیے تو بڑی مضبوط جدوجہد کی ضرورت ہے۔ بڑی مجتمع قوتوں کی ضرورت ہے۔
مِل کر کام کرنا اور زور لگانا ہوگا۔ آپ تصور کیجیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثار
صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محنت، جدوجہد اور ایثار و قربانی کا جس کے نتیجے میں جزیرہ نمائے
عرب میں اللہ کا دین بالفعل قائم اور نافذ ہوا جس کی مدح قرآن مجید جگہ جگہ کرتا ہے۔ سورہ فتح میں
فرمایا: هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی
الدِّیۡنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا ؕ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیۡنَ
مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ "وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ
کو بھیجا ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ اس کو پوری جنسِ دین (نظامِ اطاعت و نظامِ حیات) پر
غالب کر دیں۔ اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ
انؐ کے ساتھ ہیں وہ کفار پر نہایت سخت اور آپس میں نہایت رحیم ہیں" یہ شان نہ ہوتی تو دین
قائم نہ ہوتا۔

اقامتِ دین فرض ہے

فرمایا: اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡهِ ؕ
دین کو قائم کرو۔ اس معاملہ میں تفرقہ نہ ڈالو۔ تم سب کا مقصود و مطلوب
ایک ہو۔ تم سب کے سامنے یہی ہو کہ سب سے پہلے تو خود اللہ کا بندہ بننا ہے۔ یہ ہے انفرادی سطح پر
توحیدِ عملی۔ یہ توحید ہوگی اطاعت کو اللہ کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ پھر یہ کہ اجتماعی جدوجہد
کا آغاز ہوگا دعوت اِلَی اللہ سے اور اس کا منتہا اور مقصود ہوگا کہ پورے نظامِ اجتماعی پر، ملک پر،
پوری قومی زندگی پر اللہ کے دین کو قائم و نافذ کرنا ہے۔ یہ ہے اقامتِ دین۔ جو مرکزی مضمون ہے
سورہ شوریٰ کا۔ اس ضمن میں ان شاء اللہ تعالیٰ کل ہمارا مطالعہ آگے بڑھے گا۔ آج میں نے مکی
اور مدنی سورتوں کے بارے میں کچھ تمہیدی باتیں آپ کو بتائیں۔ وہ بھی اس لئے کہ ان چار سورتوں
زمر، مؤمن، حٰمٓ السجدہ اور شوریٰ) کے درمیان جو ربط ہے میں اس کو سامنے لانا چاہتا تھا
توحیدِ عملی کے موضوع پر ان چار سورتوں کا گروپ بہت اہم ہے۔ سورہ زمر میں انفرادی سطح پر
حیدِ عملی — اسی کا باطنی پہلو توحید فی الدعاء سورۂ مومن میں — پھر انفرادی سطح سے اجتماعی
سطح کی طرف بڑھیں گے تو دعوتِ توحید کا مرحلہ ہے — یہ ہے سورہ حٰمٓ السجدہ میں۔ اور اجتماعی
سطح پر توحیدِ عملی کا ہدف ہے اقامتِ دین جو بیان ہوا سورہ شوریٰ میں —

اللہ تعالیٰ ہمیں اس فیصلہ کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی توانائیاں ـــ اور اپنی قوتیں اس توحید عملی پر مرتکز کریں اور انفرادی سطح سے اجتماعی نظام تک اس توحید کو برپا کرنے کے لئے اپنی کمر کس لیں۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ ۝ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ـــ!

(جاری ہے)

انشاء اللہ العزیز

مرکزی انجمن خدام القرآن ۰ لاہور

کے زیرِ اہتمام

پہلی بار

محاضراتِ قرآنی

سلسلہ مطبوعہ
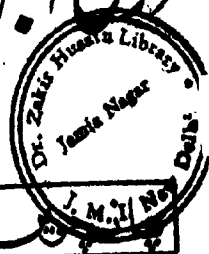
مورخہ ۲۵ مارچ تا ۲۸ مارچ ۸۴ء بمقام : جناح ہال

میں منعقد ہونگے جن میں مقامی اصحاب علم و دانش کے علاوہ ہندوستان سے بھی علماء کرام شرکت فرمائیں گے

(آخری قسط)

خسرانِ اُخروی سے بچنے کا راستہ

محمد اقبال واحد

حجاج بن یوسف نے عبدالملک کی حکومت کو آہنی بنانے کے لئے ایک لاکھ بیس ہزار تابعین کو شہید کرا دیا - امام ابوحنیفہ کو جیل میں ڈال دیا گیا - امام شافعی کو جلاوطن کر دیا گیا - امام مالک کو اتنے کوڑے مارے گئے - کہ ان کے شانے اکھڑ کر رہ گئے - امام احمد بن حنبل کو تین ملوک کے زمانے میں اتنے کوڑے مارے گئے کہ ہاتھی کو بھی مارے جاتے تو وہ بھی مر جاتا - قصہ کوتاہ اہل حق پر اہل دین پر ظلم و ستم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا - یہ اُس سرزمین میں ہوا جو اسلام کا اوّلین گہوارہ تھی - مصر شام عراق ہندوستان میں انسان پر جو گذری وہ ایک طویل استحصال کی دردناک داستان ہے - وہ اندلس جہاں مسلمانوں نے ۷۹۲ سال حکومت کی تھی - علم و ادب و تہذیب و تمدن کے چراغ اُس وقت جلائے تھے - جب یورپ جانوروں کی طرح ہاتھ سے پیالہ بنا کر پانی پیتا تھا - زوال غرناطہ کے بعد عیسائیوں نے اپنی ایک خود ساختہ تعذیب گاہ ریگوری ایشن کے ذریعہ ۳۲ ہزار مسلمانوں کو زندہ جلا دیا - اور اس سے کہیں زیادہ کو ساری عمر کے لئے اعضاء سے محروم کر کے اپاہج اور بے سہارا بنا دیا - اور بالآخر ایک ایک مسلمان مرد عورت بچے بوڑھے کو موت کے گھاٹ اتار کر ہسپانیہ سے مسلمانوں کے وجود کو نیست و نابود کر دیا - پھر اسی اثناء میں صحرائے گوبی سے وحشی تاتاری اُٹھے جن کا مقصد نہ فرماں روائی تھا نہ کشور کشائی بلکہ اُن کا ایک ہی دل پسند مشغلہ تھا - بستیوں کی بستیاں نذرِ آتش کر دی جائیں - اور انسانی کھوپڑیوں کے بلند و بالا مینار بنائے جائیں - اور بس، وہ مینار بناتے چلے گئے - بغداد جو علم و فن کا گہوارہ تھا اُسے دریا برد کر دیا - عالم اسلام کے لئے یہ ایک قیامت صغریٰ تھی - جو چنگیز اور ہلاکو کی شکل میں بلائے بے درماں بن کر آئی - ہندوستان میں اکبر دی گریٹ نے مسلمانوں کے جان و مال کو تو کچھ نہ کہا - لیکن اُن کے دین کا مثلہ کر کے رکھ دیا - اور اب آئیے دورِ جدید کی طرف جسے

دورِ علم و دانش کہا جاتا ہے۔ استحصال کا جائزہ لیں۔ جس میں خیر سے استحصال اپنی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ باوجود اس بے لہ یو این او بھی موجود ہے۔ اور دنیا بھر کے دساتیر و منشوروں میں حقوقِ انسانی کا رونا بہت زور و شور کے ساتھ رویا گیا ہے۔ لیکن عملاً کیا ہوا اور کیا ہوتا رہا ہے۔ روسی سوشلزم نے لاکھوں انسانوں کو محض اس جرم کی پاداش میں کہ وہ سوشلزم کے نظریہ کے حامی نہیں تھے۔ سائبریا کے سرد پوش جنگل یا جہنم میں دھکیل دیا۔ جنگ عظیم اوّل اور جنگ عظیم دوم جو بے مقاصد محاربے تھے۔ اُن کے ذریعہ وہ قیامت نوعِ بشری پر گذر گئی کہ پندرہ کروڑ سے زائد انسان ہلاک اور پچاس کروڑ سے زائد مجروح اور ایک ارب سے زیادہ گھر سے بے گھر وطن سے بے وطن ہو گئے۔ امریکہ جو دنیا بھر میں علم و دانش تہذیب و تمدن کا سمبل بنا پھرتا ہے۔ اُس نے جاپان کے دو شہروں ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم برسا کر انہیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا۔ ویٹ نام میں جو کچھ ہوا۔ اور اب افغانستان میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اُس سے کون بے خبر ہے۔ اسرائیل نے قبلہ اوّل کو آگ لگا دی اور لبنان میں اُس بربریت کا مظاہرہ کیا۔ کہ اگر جنگل کے جانوروں کو بھی اس کا پتہ چلے تو شرم سے سر جھکا لیں رضا شاہ پہلوی نے ایران میں ۲۰ ہزار آدمیوں کو اس وجہ سے کہ وہ اپنے ملک میں اسلامی جمہوریت چاہتے تھے اپنی شاہی کے تحفظ میں گولیوں سے بھون کر رکھ دیا۔ مصر میں جمال عبدالناصر اور انور السادات نے اخوان پر وہ مظالم ڈھائے۔ کہ زمین چیخ اٹھی اور آسمان رو دیا۔ محض اس جرم میں کہ وہ اپنے ملک میں اسلامی نظامِ حیات چاہتے تھے۔ اور پھر پاکستان میں کیا ہوا۔ ایک صاحب انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ لگاتے ہوئے روٹی کپڑا اور مکان کا جھانسہ دیتے ہوئے چور دروازے سے ایوانِ اقتدار میں داخل ہوئے وہ روٹی کپڑا اور مکان تو کیا دیتے۔ روٹی کے نام پر فاقہ کپڑے کے نام پر کفن اور مکان کے نام پر قبرستان الاٹ کرتے رہے۔ اُن کی عشرت گاہیں غریب عوام کی بہو بیٹیوں کی عصمتوں سے اور اُن کے خون سے اُن کے محلات اور قصور کے فانوس جلتے رہے۔ اور جب اُن کے خلاف ایک تحریک احتجاج اٹھی تو

نے ہم وطنوں کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا مختصر یہ کہ پوری انسانی
تاریخ میں (ماسوائے خلافتِ راشدہ اور عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بچاس
سال کے) استحصال ایک ایسا دندناتا دیو ہے - جو ہر زمانے میں انسان کے گوشت
خون ہڈیوں جان مال عزت آبرو شرف منزلت پر ناچتا نظر آتا ہے انسان نے
انسان کے استحصال کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا - راعی نے رعایا کا قوی نے
ضعیف کا طاقت ور نے کمزور کا علم نے جہل کا صنعت کار نے مزدور کا سیاست
کے لبادے میں یا مذہب کے لبادے میں کسی نے پیری فقیری کے نام پر کسی نے
حکومت و فرمان روائی کے نام پر کسی نے علم کے نام پر کسی نے عقائد کے نام پر
کسی نے ملک کے نام پر کسی نے بالاتری کے نام پر کسی نے رنگ و نسل کے نام
پر کسی نے سفید فام کے نام پر اور کسی نے سرخ فام کے نام پر وہ استحصال جان
مال اور آبرو کا کیا ہے - کہ اگر اس خون کو اکٹھا کیا جائے - جو انسانی استحصال
میں بہا ہے - تو بحر احمر کا پانی خون میں تبدیل ہو جائے - اور اموال کا جو ضیاع
ہوا ہے - ایک قارون تو کیا دس قارونوں کے خزانے ہوں تو اس کا مقابلہ نہ
کر سکیں اور عزتیں حرمتیں عصمتیں جو برباد کی گئی ہیں ہندسے ختم ہو جائیں لیکن
اُن کی تعداد دشوار ہے - میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا انسان پاگل ہو گیا تھا - یا یہ
دنیا ایک بڑا پاگل خانہ ہے - جس میں ایک دوسرے کے جان مال اور آبرو پر
درندوں کی طرح ٹوٹ پڑا ہے - نہیں ایسا نہ دیوانگی اور فرزانگی کا کوئی معاملہ
نہیں تھا - بس بات صرف اتنی تھی - کہ انسان کا دل رحمان کے ایمان سے خالی
ہو گیا اور وہ اُس ازلی میثاق کو بھول گیا - جو اس نے یوم الست اپنے پروردگار
سے کیا تھا - کہ آپ ہمارے رب ہیں اور ہم آپ کے بندے بن کر رہیں گے - برخلاف
ازیں شیطان نے خدا کو جو چیلنج دیا تھا - کہ میں تیرے بندوں کو گمراہ کر کے رہوں گا -
اس چیلنج میں اُس کا معاون بن گیا - گویا بالفاظ دگر اُس نے شیطان سے سمجھوتا
کر لیا - انبیاء علیہم السلام کے پیغام و کلام کی تکذیب کی الہامی و سماوی کتابوں
کو اُن کی تعلیمات کو کسی درجہ میں اہمیت دینے سے انکار کر دیا - دین جو امن
وسلامتی کا سر بسر نظام حیات تھا - اُس کے بالمقابل اپنے نفس کے نظام حیات

کو ترجیح دی - گویا دوسرے لفظوں میں معبودِ حقیقی کے مقام پر اپنے نفس کے الٰہ
کو لا بٹھایا - اور جو اُس نے کہا وہ کیا - آخرت اور جنت اور بعث بعد الموت کا کوئی تصور
اسکے سامنے جب آیا - تو اُس نے اس سے راہ فرار اختیار کی - دنیا کی ہی زندگی کو
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست کے مصداق اپنے لئے مدارِ حیات قرار دے لیا -
اور پھر اُس نے اپنی دنیا بنانے کے لئے ہر وہ حربہ استعمال کیا جو اس کے بس
میں تھا - جس کے نتیجہ میں پوری انسانیت پس کر رہ گئی - یہ ہے وہ خسران جسے
اس سورت کی ابتدا میں والعصر کی قسم کے ساتھ زمانے کے تاریخی وقائع کی روشنی
میں تاریخ کے فی الواقع پس منظر میں انّ الانسان لفی خسر کے الفاظ میں باری
تعالٰی نے ارشاد فرمایا ہے - لیکن یہ اُس خسران کا ایک مختصر حصہ ہے - مختصر اس
اعتبار سے کہ یہ خسران جان و مال بہرحال ایک نہ ایک دن ختم ہو جانے والا ہے - جو
انسان کو اس خاکدان ارضی میں حیات فانی میں پیش آیا ہے - خسران کا ایک دوسرا
پہلو بھی ہے - اور اب مجھے اس کے بارے میں عرض کرنا ہے - وہ انسان کی معنوی
روحانی اور بالآخر اُخروی زندگی سے تعلق رکھتا ہے - جس کے نتائج بعث بعد الموت
کے بعد اُس کے سامنے آنے والے ہیں - بشرطیکہ اُس نے اپنے رویۂ زندگی
میں کوئی تبدیلی نہ کی ، باوجود اس بات کے کہ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی
تعداد ایک ارب، اُن مسلمانوں کی تعداد جو قرآن پر اور قرآن کی سورہ والعصر پر ایمان
رکھتے ہیں، موجود ہے - لیکن کہیں بھی اسلام کا نظامِ حیات قرآن کا ایمان و
یقین حساب و احتساب کا تصور حیات اُخروی کا یقین اور اُسکی کامیابی و کامرانی
کا جذبہ موجود نہیں ہے - غیر مسلم تو غیر مسلم ہیں - مسلمان جو الٰہی نظامِ حیات
کے قیام کے اقامت کے ذمہ دار تھے ترجمان تھے، نہ ترجمان ہیں نہ ذمہ دار ہیں نہ
ان کو اپنی ذمہ داری کا شعور و احساس ہے - وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا اور
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا - بہرحال اگر نام نہاد مسلمانوں نے پوری
انسانی برادری نے اسلام کے نظامِ حیات سے اغماض کا وہی رویہ اختیار کئے رکھا
جو اُس کا وطیرہ بن چکا ہے - تو اُسے جان لینا چاہیئے - کہ اُس کی موجودہ زندگی کے
بعد جو خسران کا دور آنے والا ہے - اُس کی کوئی نسبت حصہ اول کے خسران سے

نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ فانی ایک نہ ایک روز ختم ہو جانے والا خسران اُس خسران کے بالمقابل کوئی شے نہیں ہے۔ جو مستقل اور دائمی ہے۔ جس دن اُسے اپنے خالق کے سامنے اپنے مالک کے سامنے اپنے پروردگار کے سامنے پیش ہو کر بتانا ہوگا۔ کہ اُس نے اپنی حیات ارضی میں کیا رویہ اختیار کیا تھا۔ اُس دن انسانوں سے کہا جائے گا۔ آج تم اپنا حساب خود ہی کر لو۔ آج تم اپنے حساب کے لئے آپ ہی کافی ہو۔ کہ تم کس سلوک کے سزاوار ہو۔ یہ استحصال وہ خسران ہوگا جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا استحصال نہیں کرے گا۔

انسان کا اپنا وجود انسان کا اپنا نفس انسان کی اپنی ذات ظالم بھی ہوگی اور مظلوم بھی۔ اُس کے اعمال جو اُس نے دنیاوی زندگی میں انجام دیئے ہیں ظلم کی مرئی شکل اختیار کریں گے جس کے نتیجے میں انسان کو ایک ایسے خسران سے گذرنا ہوگا۔ ایسے عذاب سے گذرنا ہوگا جو لامحدود بھی ہوگا۔ اور خالد بھی۔ یہ مطلب ہے۔ ان الانسان لفی خسر اور جس کو میں نے دو حصوں میں جو درحقیقت ایک ہی حصہ میں اور جو نتیجہ میں فقدان ایمان کا اور ترک اعمال کا بیان کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ اس خسران زیاں نقصان دنیاوی و اُخروی سے بچنے کا کیا طریقہ ہے۔ قرآن کی موجودہ سورت میں زیر بحث سورت والعصر میں باری تعالیٰ نے ایک چار نکاتی فارمولا پیش کیا ہے۔ اور وہ ہے ایمان، عمل صالح تواصی بالحق تواصی بالصبر پر مشتمل اس فارمولے کو میں مزید تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس فارمولے کے پہلے جزو ایمان کے بارے میں عرض کروں۔ ایمان کی حقیقت کو جان لینا چاہیے۔ ایمان کا تعلق نظری اور علمی موشگافیوں سے نہیں ہے۔ نہ اُس کا تعلق استدلال سے ہے۔ نہ اُس کا تعلق علم کلام سے ہے۔ نہ اُس کا تعلق حرف و زبان سے ہے۔ اس کا تعلق محض اور محض توفیق خداوندی ہے۔ بشرطیکہ طلب صادق ہو اور کوشش راست ہو۔ ایمان پانچ حصص پر مشتمل ہے ایمان باللہ ایمان بالرسالت، ایمان بالکتاب ایمان بالملائکہ، ایمان بالآخرۃ سب سے پہلے ہم ایمان باللہ کا جائزہ لیتے ہیں کہ وہ کیا ہے اُس کے تقاضے اور مقتضیات کیا ہیں اور وہ کن امور اور کن مشکلات پر مشتمل ہے۔ ایمان باللہ محض یہ نہیں ہے۔ کہ اس کائنات

کا ایک خالق ہے اور اُس کا نام اللہ تعالےٰ ہے - جو کفّار تک مانتے ہیں - قرآن اس پر شاہد ہے - وہ کہتے تھے زندگی اور موت ہوا اور بارش روزی اور رزق پناہ دہندہ متصرف فی الامور خالق کائنات کے سوا اور کوئی نہیں البتہ اسکے نیچے کچھ الٰہ اور ضرور ہیں جو عطائی طور پر خدائی قدرتوں کے حامل ہیں - جو ہمارے حاجت روا مشکل کشا شفاعت کنندہ سفارسی اور زلفیٰ ہیں - قرآن کے نزدیک ایمان باللہ کا یہ مبہم اور ناقص مفہوم بالکل نہیں ہے - وہ کہتا ہے - کہ اگر تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے - تو تسلیم کرو کہ اس کائنات کا جو خالق ہے وہی اس کا مالک بھی ہے اور اُس کی ملکیت میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے - اور جب مالکیت اُسی کی ہے تو حاکمیت بھی اُسی کی ہے اور جس طرح سے اس کی خالقیت میں مالکیت میں کوئی اُس کا ساجھی اور ساجھی نہیں ہے - ٹھیک اُسی طرح سے اُس کی حاکمیت بھی بلا شرکت غیرے ہے - جس میں کوئی ذرّہ برابر اُس کا شریک نہیں ہے - وہ ذات جو خالق و مالک کائنات ہے - قادر مطلق ہے - مختارِ مطلق ہے - حاکم علی الاطلاق ہے - جس کی حاکمیت پوری کائنات کو کائنات کی ہر شے کو محیط ہے - سروری ساورنٹی جہان بانی فرماں روائی ہر قسم سے ہر نوع سے اُسی ذات کے لئے مختص ہے - دستور اُس کا ہے - امر اس کا ہے - قانون اُس کا ہے - مرضی اُس کی ہے - مشیت اس کی ہے - اس کا امر اس کا حکم اُس کا دستور انسانی زندگی کا مکمل نظام زندگی اور ضابطۂ حیات ہے - خواہ اس کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے ہو، انفرادی زندگی میں بس اطاعت اُس کی ہے عبودیت اس کی ہے - بندگی اُس کی ہے - غلامی اُس کی ہے تابعداری اُس کی ہے - زندگی کے کسی ایک حصہ میں نہیں ایک گوشے میں نہیں ایک شعبہ میں نہیں - کلّی کی کلّی زندگی میں کلّی کی کلّی اطاعت اُسی کی ہے - اور اسی کی ہونی چاہیئے - یہ ایمان باللہ کا وہ حصّہ ہے - جو انسان کی انفرادی زندگی سے متعلق ہے کہ عبادات سے لے کر معاملات تک معاملات سے لے کر اخلاق تک معمولی کام سے لے کر بڑے سے بڑے کام تک یہاں تک کہ ماکولات مشروبات ملبوسات پسند اور ناپسند میلانات جذبات اور احساسات، تعلقات خدا سے ہوں رسول سے ہوں نبی سے ہوں بیوی بال بچوں سے ہوں ماں باپ سے ہوں اعزہ و اقارب سے ہوں معاشرے سے ہوں ابنائے جنس سے ہوں ٹھیک خدا کی مرضی

اورمشیت اور دستور و قانون کے مطابق ہونے چاہئیں - اور جب اجتماعی زندگی کا معاملہ سامنے آئے - تو وہاں بھی سیاسی اور تمدنی علمی اور تہذیبی فرمان روائی تمام تر اللہ تعالیٰ کے لئے ہے - خواہ وہ معاشرہ کی شیرازہ بندی ہو جماعت سازی ہو حکومت سازی ہو - ایوان پارلیمان ہو - ایوان صدر ہو ایوان شوریٰ ہو، علوم کی درس گاہیں ہوں معیشت کے بازار ہوں، معاشرت کے کاروبار ہوں - سیاست کے ہنگامے ہوں دفتر ہوں، دفاتر ہوں، کالج ہوں یونیورسٹیاں ہوں عدلیہ ہو انتظامیہ ہو مقننہ ہو خطابت ہو صحافت ہو کتابت ہو تحریر ہو تقریر ہو طرز رہائش ہو طرز بود و ماند ہو طرز نشست و برخواست ہو - طرز گفتگو ہو طرز کلام ہو طرز سلام ہو طرز انعام ہو - گھر ہو باہر ہو بازار ہو غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی میں حاکمیت فرمان روائی صرف اور صرف خالق کائنات کیلئے مخصوص اور معتبر ہے - جس کا کوئی شریک نہیں ہے - نہ ذات میں نہ صفات میں نہ کلام نہ تدبیر امر میں نہ حکمت میں نہ دانائی میں نہ اقتدار میں نہ جہاں بانی میں نہ مشکل کشائی میں نہ حاجت روائی میں نہ ندا میں نہ دعا میں نہ پکار میں نہ دنیا میں نہ برزخ میں نہ حشر میں نہ حساب میں نہ احتساب میں نہ جنت میں نہ دوزخ میں نہ کوئی نبی نہ کوئی رسول نہ کوئی صدیق نہ کوئی شہید نہ کوئی ولی نہ کوئی صالح نہ کوئی مومن - وہ حاکم علی الاطلاق و حاکم مطلق العنان و حاکم کائنات منجملہ شئے کائنات وہ مالک الملک وہ مالک زندگی اور موت وہ مالک جسم و جان وہ مالک زوال و کمال وہ مالک رزق و روزی وہ مالک صحت و تندرستی اس کے سوا نہ کوئی الٰہ نہ کوئی معبود نہ کوئی قابل پرستش نہ کوئی لائق اطاعت نہ کوئی وجہ وفاداری کوئی نظام کوئی قانون کوئی دستور حیات کوئی ضابطہ زندگی کوئی راہ عمل کوئی راہ گذر نہ کوئی اس کے سوا مقرر کرنے والا ہے - نہ دینے والا ہے نہ مطالبہ عمل کرنے والا ہے - کوئی اس کے سوا عبودیت و محبت کے قابل نہیں - رکوع و سجود کے لائق نہیں - دعائیں سننے والا نہیں مشکلات کو دور کرنے والا نہیں مصائب سے نجات دینے والا نہیں عزت دینے والا نہیں ذلت سے بچانے والا نہیں کمال سے آشنا کرنے والا نہیں زوال سے پناہ دینے والا نہیں روزی میں کمی بیشی کرنے والا نہیں توفیق ایمان توفیق ہدایت توفیق اطاعت دینے والا نہیں۔ آخرت میں نجات دینے والا نہیں - عفو و درگذر سے کام لینے والا نہیں اس کی جناب

ہیں اُس کی اجازت کے بلا نہ کوئی سفارشی نہ شفاعت کنندہ امر اُس کا ، نہی اُس کی معروفات اُس کے معروفات منکرات اُس کے منکرات مرضی اُس کی مرضی مشیت اُس کی مشیت ارادہ اُس کا ارادہ فیصلہ اُس کا فیصلہ وہی نافع وہی قہار وہی رحمان وہی رحیم وہی قادر وہی قدیر وہی مقتدر وہی حنان وہی منان وہی کریم وہی وہاب وہی سراسر حق و سلامتی کا السلام وہی امن کا المومن وہی وکیل وہی کفیل وہی قریب وہی مجیب وہی عظیم وہی جلیل وہی ذی الطول وہی عزیز وہی قوی وہی متین وہی علیم وہی حکیم وہی غنی وہی صمد کہ سب اُس کے محتاج وہی مستعان کہ اُس کے سوا کوئی مستعان نہیں وہی غفور وہی غفار وہی غافر کہ اُس کے سوا کوئی معاف کرنے والا نہیں درگذر سے کام لینے والا نہیں وہی باقی کہ ہر شے اُس کے سوا فانی وہی واجد وہی ماجد وہی مجید کہ اُس کے سوا کوئی عظیم نہیں جلیل نہیں بزرگ نہیں بزرگ تر نہیں بالا نہیں بالاتر نہیں نہ کمال میں نہ شرف میں نہ عزت میں نہ منزلت میں نہ جاہ میں نہ جلال میں نہ شاہی میں نہ بادشاہی میں نہ ذات میں نہ صفات میں۔ اُس کے سوا کوئی قدوس نہیں نہ قدس میں نہ پاکی میں نہ پاکیزگی میں پس اُس کے سوا نہ کسی کے لئے عبادت ہے نہ اطاعت ہے۔ نہ دعا ہے نہ پکار ہے نہ رکوع ہے نہ سجود ہے۔ نہ عزت ہے نہ محبت ہے۔ نہ نماز ہے نہ قربانی ہے۔ نہ ذکر ہے نہ فکر ہے۔ نہ شوق ہے نہ ذوق ہے بس سب کچھ اُس کے لئے ہے۔ اللہ ہو بس باقی ہوس۔

ایمان بالرسالت

ایمان بالرسالت کا مفہوم اور تقاضا یہ ہے۔ کہ اجمالی طور پر تو آدم علیہ السلام سے لیکر عیسیٰ علیہ السلام تک تمام گروہ انبیاء و رسل پر ایمان ہو کہ وہ خالق کائنات کے مامور تھے فرستادے تھے۔ نبی تھے پیغمبر تھے لیکن جہاں تک آخری نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے۔ یہ ایمان ہو کہ آپ خدا کے آخری رسول خاتم النبیین وحی خداوندی کے ترجمان خدا کے فرستادے اور نمائندے مستند اور مجاز ہیں حقیقت میں کہ آپکی ذات گرامی قیامت تک کے انسانوں کے لئے مطاع ہے۔ ایک ایسے مطاع کی جس کی اطاعت اور اتباع اطاعت و اتباع خداوندی ہے۔ جس کا ہر قول فعل عمل تقریر پوری اُمت کے لئے اُسوۂ حسنہ ہے۔ جو وہ دے وہ لے لو جس بات سے اُس نے روکا ہو اُس سے رُک

جاؤ - اُس کی زندگی کو اپنی زندگی کا زیادہ سے زیادہ نقش اول و آخر اُس کا اسوۂ
حسنہ زندگی کے تمام تر معاملات میں مشعل راہ راہ عمل زاد عمل اُس کے طعام و کلام
سے لے کر بین الاقوامی بین الانسانی معاملات تک ایک ایک جزو پر اتباع معہ
بت دنیا و آخرت میں تمہارے لئے موجب نجات موجب مغفرت موجب رضائے
خداوندی ہے اس کے سوا دین میں کوئی سند نہیں کوئی اتھارٹی نہیں کہ جس کی اطاعت بلا
چون و چرا ہو اُس کے مقابلہ میں کسی عقل کسی بحث کسی رائے کسی تلاش حکمت
یا رائے تنقید کی اجازت نہیں ہے - اُس کی ساری زندگی اس کی سیرت کان خلقہ القرآن
ہے - ایک ایک امتی کی زندگی اس کی زندگی کے مطابق ہونی چاہیے - جو اُس کا
عمل ہے - جو اُس کا فعل ہے - جو اُس کا کام ہے - جو اور جن امور میں اُس کے
فیصلے ہیں - جو اور جیسی اسکی کیفیت عبادات تھیں - کیفیت معاملات تھیں کیفیت
اخلاق تھیں - کیفیت ظاہری تھیں کیفیت باطنی تھیں - ان کا زیادہ سے زیادہ پرتو
ہر امتی میں ہر امتی کی زندگی میں ہونا چاہیئے - وہ اپنی زندگی میں جس طرح سے مرکز
ملت تھا اب بھی ہے - اور قیامت تک ہے - اعتزال جدید کا یہ نظریہ کہ وہ محض ایک
پوسٹ مین ہے ڈاکیہ ہے - جو خدا کی طرف سے ایک کتاب ہمیں لا کر دے گیا ہے -
اور اب حسبنا کتاب اللہ محض ایک بیہودہ لاطائل لچر اور ملحدانہ نظریہ ہے - جو دیوار
سے مار دینے کے لائق ہے وہ محض کوئی لیڈر نہیں تھا پیشوا نہیں تھا - وقتی قائد نہیں
تھا - ہنگامی راہ نما نہیں تھا - وہ قیامت تک کی نوع انسانی کے لئے خدا کا رسول
ہے نبی ہے پیغمبر ہے پیغامبر ہے - مطاع ہے - متبوع ہے - اس کی دعوت اُسکی
سنت اس کا دین قیامت تک کے انسانوں کے لئے دعوت ہے سنت ہے -
دین ہے -

ایمان بالکتاب

ایمان بالکتاب کا مفہوم اور تقاضا یہ ہے - کہ یہ خالق کائنات
کا آخری مستند ناقابل ترمیم و تنسیخ ایڈیشن دستور حیات
نظام زندگی کی صورت میں قرآن مجید کی شکل میں برائے اطاعت ہے - پوری زندگی
کے مسائل خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی ہوں یا وقتی ہوں ، بین الاقوامی ہوں انسانی
ہوں - بین الانسانی ہوں معاشی ہوں معاشرتی ہوں سیاسی ہوں عمرانی ہوں عبادات

سے متعلق ہوں معاملات سے متعلق ہوں عملی ہوں علمی ہوں غرضیکہ انسانی زندگی
کے کسی نوع سے بھی متعلق ہوں اُن سب میں یہ کتاب راہ نما ہے پیشوا ہے۔
حرف اول ہے حرف آخر ہے۔ معروف اس کا معروف منکر اس کا منکر حکم اس
کا حکم فرمان اس کا فرمان قانون اس کا قانون انسانی زندگی کے لئے مکمل ضابطہ
حیات طرز فکر طرز عمل کسی ایک زمانہ کے لئے نہیں کسی ایک دور کے لئے نہیں
کسی ایک گوشۂ زندگی کے لئے نہیں۔ ہر دور کے لئے ہر عہد کے لئے زندگی کے
تمامتر گوشوں شعبوں حصوں کے لئے قیامت کے لئے پوری نوع بشری کے لئے
ایک کامل مکمل جامع مانع دستور زندگی منشور زندگی منجانب خالق کائنات ہے
کوئی جنتر منتر اور تعویذ گنڈے کی کتاب نہیں کوئی بھوت پریت بھگانے کی کتاب
نہیں کوئی عدلیہ غیر عدلیہ میں قسم کھانے کی کتاب کوئی نہیں ——— بوعلی سینا
کی القانون نہیں محض تلاوت برائے حصول ثواب ایصال ثواب نہیں۔

یہ انسانی زندگی میں درجہ انقلاب کی الکتاب ہے۔ جس انقلاب کی بنیاد
اور اساس حاکمیت خداوندی پر ہے۔ وہ حاکمیت خداوندی جو تکوینی طور پر تو
پوری کائنات پر قائم ہے تشریعی طور پر قرآنی معاشرہ پہ قائم ہوتی ہے جو ایک فرد
کی زندگی کا اگر انقلاب ہے تو ایک معاشرہ کا بھی انقلاب ہے ایک ریاست کا
بھی انقلاب ہے اور بالآخر پوری دنیا کا انقلاب ہے اور یہ وہ انقلاب ہے جو
خالق انس وجان خالق کائنات کے نزدیک مطلوب و مقصود ہے۔

ایمان بالملائکہ فرشتوں یعنی ملائکہ پر ایمان کا مفہوم اور تقاضا یہ ہے۔
کہ وہ خدا کی معصوم مخلوق ذی روح ذی شعور رذی وجود ہے
جو کلام انہوں نے خدا کے حکم سے خدا کے رسولوں اور نبیوں تک پہنچایا۔ بلاکم وکاست
ہے۔ بلاکمی بیشی ہے۔ بلاکھوٹ ملاوٹ ہے۔ وہ ہمارے اعمال کے کاتبین
ہیں۔ نگران ہیں محافظ ہیں۔

ایمان بالآخرۃ ایمان بالآخرت کا مفہوم محض یہ نہیں ہے۔ کہ وہ ایک دن
قیامت کا ہے۔ حشر کا ہے۔ نشر کا ہے۔ انسانوں کے اجتماع
کا ہے۔ انسانوں کے مجمع کا ہے۔ برخلاف ازیں قلب مومن میں یہ عقیدہ ہمہ وقت

ندگی کے ہر ہر موڑ پہ گذرگاہ پر زندہ تابندہ پائندہ موجود رہنا چاہیئے - کہ وہ
ب ایک انسان ایک ایک گروہ انسانی کے یوم حساب کا دن ہے - انسانی
ندگی کے ہر چھوٹے بڑے جلی خفی نظری عملی علمی فعلی کام انجام کا یوم احتساب
ہے - جس میں ایک ایک فرد ایک ایک قوم پوری نوع انسانی کے تمام اعمال افعال
نظریات جو حیات فانی میں ظہور ہوئے ـــــ باقاعدہ ایک نظام عدلیہ ایک نظام قانونی
یک نظام شہادت ایک نظام عدل کے ساتھ زیر بحث آئیں گے - اور اُس کے
نتیجہ میں جو صورت سامنے آئے گی - وہ جنتی ہوگی یا جہنمی - وہاں کوئی حسب
ونسب کوئی خاندان وقبیلہ کسی رسول کا امتی ہونے یا نہ ہونے کوئی علم کوئی
عقل کوئی ثروت کوئی جاہ کوئی جلال کوئی کمال کوئی ہدیہ کوئی بدلہ کوئی سعی کوئی
سفارش کوئی شفاعت (اِلَّا باِذْنِ الله) کام نہیں آئے گی - جو فیصلہ ہوگا بے لاگ
ہوگا بے دریغ ہوگا - بے لچک ہوگا -

عمل صالح

عمل صالح کی مختصر تعریف یہ ہے کہ ہر وہ عمل عمل صالح ہے - جس
میں دو شرطیں موجود ہوں اگر ایک بھی نہ ہوئی تو وہ عمل صالح
نہیں ہوگا - پہلی شرط یہ ہے کہ جو کام کیا جا رہا ہے - وہ قانون خدا کے مطابق ہو
جب کہ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ محض رضائے خداوندی کے لئے ہو مثال کے
طور پر نماز ایک امر دینی ہے - لیکن اگر قانون خدا کے مطابق ادا نہیں کی گئی -
مثلاً اگر ایک نمازی یہ سمجھ لے کہ سجدہ باعث تقرب خداوندی ہے - اور
فی الواقع ہے - اور یہ سوچ کر ایک رکعت میں تین سجدے کرے - تو اس سوچ
سے اس عمل سے نماز باطل ہی نہیں ضائع ہو جائے گی - بجائے تقرب کے الٹا دوری
اور بجائے ثواب کے الٹا عذاب کا موجب ہوگی - دوسری صورت میں اگر کوئی
نماز اس لئے ادا کرتا ہے - کہ موجب شہرت موجب عزت موجب مقبولیت
عامۃ الخلائق ہو یا صحت کے لئے ایک مفید ورزش ہے - (گویا جذبہ محرکہ
رضائے خداوندی نہیں ہے) تو ایسی نماز بھی باطل ہی نہیں ضائع ہو جائے گی -
برخلاف ازیں خالص وہ کام جنہیں دنیاوی کام سمجھا جاتا ہے - مثلاً معاش و معیشت
معاشرت، سیاست انداز حکمرانی طرز بود و ماند اکل و شرب رفتار و گفتار نشست

وبرخواست سلام وکلام پوشاک ولباس علم وفن، تہذیب وتمدن کلچر وثقافت ادب وصحافت اگران تمام امور واطوار میں قانون خدا اور رضائے خداوندی کو ملحوظ رکھا جائے۔ توان میں سے ہر کام عمل صالح ہوگا۔ عبادت ہوگا موجب اجر ہوگا۔

تواصوابالحق تواصوابالحق کے معنی وصیت کرنا نصیحت کرنا تاکید کرنا ترغیب دلانا۔ زبان سے ہاتھ سے قوت تنفید سے کہ جس حق کو آدمی نے پالیا ہے۔ اپنالیا ہے۔ اُس حق کو لازم نہیں متعدی کی شکل دے۔ اُس حق کو ایک ایک فرد تک منتقل کرنے کی کوشش کرے۔ زور بیان سے لسان سے زور کلام سے اور اگر قوت موجود ہو تو زور قانون سے زورِ تنفید سے۔ اور یہ انبیاء علیہم السلام کے بعد اس امت کی ڈیوٹی ہے مشن ہے۔ جو قیامت تک جاری رہنا چاہیئے۔

تواصوابالصبر تواصوابالصبر کا مقام تواصوابالحق کے بعد کا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ جب اُس حق، جو الحق ہے۔ جو حق خداوندی ہے۔ جو حق رسالت ونبوت ہے جو حقِ اسلام ہے جو حقِ دین ہے۔ جو حقِ ہدی ہے۔ الہدیٰ ہے، کے قیام ونفاذ کے لئے جدوجہد کی جائے گی۔ اُس کے لئے مجاہدہ کیا جائے گا۔ تو باطل کی یہ عین فطرت ہے کہ وہ حق کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا کرتا۔ ایسی صورت میں مجاہدین حق پر لازم ہوگا۔ کہ وہ تبلسلہ حق تبلسلہ اقامت حق اقامت دین جو شکل جو آفت جو مصیبت پیش آئے۔ بیمار معاشرہ کی طرف سے ناجائز اقتدار کی طرف سے معاندین حق کی جانب سے اُسے پوری ثبات قدمی کے ساتھ انگیز کرتے جانا صبر کہلاتا ہے۔ اور صبر ارشاد قرآنی کے مطابق بے حساب اجر کا حامل ہے۔ اس راہ پر چلنے والوں کو پہلے دن سے سوچ لینا چاہیئے۔ کہ یہ پھولوں کی راہ نہیں کانٹوں کی راہ ہے۔ جس کے نتیجہ میں قدم قدم پر پاؤں چھلنی ہونگے۔

حرف آخر سورہ والعصر کی تابناک روشن اور روشن گر شعاعیں آج بھی مقدرِ انسانی کو منوّر کرسکتی ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح سے

بس طرح سے آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن اور قرآن کی اس سورت نے مقدر انسانی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ کہ ایک ایسا معاشرہ عالم وجود میں آیا۔ جو ہر قسم کے استحصال سے پاک معاشرہ دنیا میں جنتی معاشرہ اور آخرت میں الجنتی معاشرہ جس پر خدا کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول بارش کی طرح ہوا۔ زمین اور آسمان نے اپنے خزانے اگل دیئے۔ جنگلوں دریاؤں سمندروں جانوروں تک نے اطمینان کا سانس لیا۔ فرشتوں نے مرحبا و تہنیت کے گیت گائے۔ آج بھی اگر کوئی معاشرہ زندگی کا خواہش مند ہے (محض کھانے پینے اور جماع کرنے کا نام زندگی نہیں ہے) تو اُسے قرآن اور قرآن کی تعلیمات کو صدق دل سے اپنے کے دے چودہ سو سال پیچھے زقند لگانی پڑے گی۔ بات بہت مہنگی ہے۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ افسوس ہے۔ کہ بظاہر جو صورت نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ انسان اس کے لئے تیار ہوتا نظر نہیں آتا۔ ایمان و یقین سے تہی دست رہنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے۔ کہ مزید کئی صدیوں تک اُسے بادشاہوں شہنشاہوں قیصروں کساریٰ نوابوں تعلقہ داروں غنڈوں بدمعاشوں طالع آزما حکمرانوں کے رحم و کرم پر رہنا ہوگا۔ اور ان کے پنجۂ استحصال کے نیچے سسک سسک کر زندگی گذارنا ہوگی۔ یا کوئی وقت ایسا آجائے گا۔ کہ وہ اجتماعی خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ یا سپر پاور کے مہلک ہتھیار اُسے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیں گے۔ اُس صورت میں ظاہر ہے کہ اس کی دُنیا تو تباہ ہوگی آخرت بھی برباد ہو کر رہ جائے گی۔

عَنِ الحَارِثِ الاشعری، قَالَ، قَالَ رسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ:

"اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ

بِالجَمَاعَةِ وَالسَّمعِ وَالطَّاعَةِ وَالهِجْرَةِ وَالجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللهِ"

(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد و جامع ترمذی)

قسط (۷)

از ری نصیر احمد غزنوی

اظہارِ حق

قادیانیت

اپنے لٹریچر کے آئینے میں

(گذشتہ سے پیوستہ)

مزید الہامات

الہام واحبائک کانبیاء بنی اسرائیل (ترجمہ) اور تیرے خاص دوست بنی اسرائیل کے نبیوں کی مانند ہیں۔ (تذکرہ صفحہ ۴۰۸)

۱۸۸۲ء: ایک دفعہ فجر کے وقت الہام ہوا کہ۔ آج حاجی ارباب محمد خان کے قرابتی کا روپیہ آتا ہے۔ (تذکرہ صفحہ ۵۷)

پھر ۱۰ ستمبر ۱۸۸۳ء کو تاکیدی طور پر سہ بارہ الہام ہوا کہ بست و یک روپیہ آئے ہیں۔ (تذکرہ صفحہ ۱۱۱)

ایک دفعہ یہ الہام ہوا۔ بست و یک روپیہ آئے ہیں۔ اس میں شک نہیں۔ (تذکرہ صفحہ ۱۱۱)

الہام: ایک دفعہ کشفی طور پر الف ۲۴ یا الف ۲۶ روپیہ مجھے دکھلائے گئے۔ پھر اشعہ میں یہ الہام ہوا۔ ماجھے خان کا بیٹا شمس الدین پٹواری ضلع لاہور بھیجنے والے ہیں یعنی دس دن کے بعد روپیہ آئے گا۔ خدا کی مدد نزدیک ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۴۹)

۱۸۸۳ء سے ۳ برس قبل۔ یہ الہام ہوا۔ اگر تمام لوگ منہ پھیر لیں۔ تو میں زمین کے نیچے سے یا آسمان کے اوپر سے مدد کر سکتا ہوں۔ (تذکرہ صفحہ ۱۱۲)

۱۸۸۳ء دسمبر ۔ الہام: پریشن ۔ عمر ۔ براطوس یا پلاطوس (تذکرہ ص۱۱۵)

۱۸۸۴ء تخمیناً فروری ۔ الہام ہوا: پاکس ہو جائے گا ۔ (تذکرہ ص۱۲۰)

۱۸۸۴ء ۔ الہام ہوا: کھل جائیں گے ۔ (تذکرہ ص۱۲۱)

۱۸۸۴ء ۔ مجھ کو الہام ہوا: کچھ عرصہ کے لیے یہ روک اُٹھا دی جائے گی اور ان کو اس غم سے نجات دی جائے گی ۔ (تذکرہ ص۱۲۱)

۱۸۸۶ء ۔ یہ الہام ہوا: دشمن کا بھی خوب وار نکلا ۔ تس پر بھی وہ وار پار نکلا ۔ (تذکرہ ص۱۲۴)

۱۸۸۷ء ۔ یہ الہام ہوا: اس سفر میں تمہارا اور تمہارے رفیق کا کچھ نقصان ہوگا ۔ (رفیق کی چادر اور مرزا صاحب کا رومال گم ہو گیا تھا ۔) (تذکرہ ص۱۴۹)

۱۸۹۱ء ۔ قادیان کی نسبت مجھے یہ بھی الہام ہوا کہ: اُخْرِجَ مِنْہُ الْیَزِیْدِیُّوْنَ ۔ یعنی اس میں یزیدی لوگ پیدا کیے گئے ہیں ۔ (تذکرہ ص۱۷۶)

۱۸۹۱ء ۔ الہام ہوا کہ: میری پرستش کی جگہ میں ان کے پیالے اور ٹھوٹھیاں رکھی ہوئی ہیں اور چوہوں کی طرح میرے نبی کی حدیثوں کو کتر رہے ہیں ۔ (تذکرہ ص۱۷۷)

۲۷ دسمبر ۱۸۹۱ء ۔ الہام: ۲۸ ۔ ۲۷ ۔ ۱۴ ۔ ۲ ۔ ۲۶ ۔ ۲ ۔ ۲۸ ۔ ۱ ۔ ۲۳ ۔ ۱۵ ۔ (نوٹ) اسی طرح کے عدد پانچ سطروں میں لکھے ہوئے ہیں) (تذکرہ ص۱۹۵)

الہام ہوا: مخالفوں میں پھوٹ اور ایک شخص متنافس کی ذلت اور اہانت اور ملامت خلق ۔ (تذکرہ ص۳۰۰)

۱۸۹۸ء ۔ ۱۸ جنوری ۔ الہام: کون کہہ سکتا ہے، اے بجلی! آسمان سے مت گر ۔ (تذکرہ ص۳۱۳)

۱۸۹۹ء ۔ ۲۷ اگست ۔ مجھ کو اپنی نسبت یہ الہام ہوا: خدا نے ارادہ کیا ہے تیرا نام بڑھا دے اور آفاق میں تیرے نام کی خوب چمک دکھا دے ۔ آسمان سے کئی تخت اُترے ۔ مگر سب سے اونچا تیرا تخت بچھایا گیا ۔ دشمنوں سے ملاقات کرتے وقت ملائکہ نے تیری مدد کی ۔ (تذکرہ ص۳۲۹)

۱۹۰۰ء ۔ ۱۳ دسمبر ۔ پھر وحی ہوئی: لاہور میں ہمارے پاک ممبر موجود ہیں ان کو اطلا

دی جاوے۔ سلسلہ قبول الہامات میں سب سے کچا مولوی تھا۔ سب مولوی ننگے ہو جائیں گے اَنَا اللّٰہُ ذُوالْمَنَنِ۔ اِنِّیْ مَعَ الرَّسُوْلِ اَقُوْمُ۔[1]
(تذکرہ ص۴۰۲)

۱۹۰۱ء۔ ۲۲ر اگست۔ فرمایا۔ تقویٰ کے مضمون پر ہم کچھ شعر لکھ رہے تھے۔ اس میں ایک مصرعہ الہامی درج ہوا۔ وہ شعر یہ ہے:

ہر اک نیکی کی جڑ یہ اتقا ہے ۔ اگر یہ جڑ رہی سب کچھ رہا ہے

دوسرا مصرعہ الہامی ہے۔ (تذکرہ ص۴۰۹)

۱۹۰۲ء۔ فرمایا مجھے ایک بار الہام ہوا تھا کہ۔ خدا قادیان میں نازل ہوگا اپنے وعدے کے مطابق۔ (تذکرہ ص۴۳۱)

۱۹۰۲ء۔ ۲۷ر اکتوبر۔ الہام: نتیجہ خلاف مراد ہوا بانگلا۔ آخر کا لفظ ٹھیک یاد نہیں۔ اور یہ بھی پختہ پتہ نہیں کہ یہ الہام کس امر کے متعلق ہے۔ (تذکرہ ص۴۴۷)

۱۹۰۳ء۔ ۱۹ر مئی۔ طبیعت وحی کی طرف منتقل ہوئی اور الہام ہوا۔ مجموعۂ فتوحات۔ (تذکرہ ص۴۷۲)

۱۹۰۳ء۔ ۵ر ستمبر۔ مجھے یہ وحی الٰہی ہوئی کہ کابل سے کاٹا گیا اور سیدھا ہماری طرف آیا۔ (تذکرہ ص۴۸۴)

۱۹۰۳ء۔ ۱۲۔ الہام۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پناہ گزیں ہوئے قلعہ ہند میں۔ (تذکرہ ص۴۸۵)

۱۹۰۳ء۔ ۴ر دسمبر مطابق ۴ر رمضان جب یہ توجہ کی گئی کہ حمل والدہ محمود نکالنا بہتر ہے یا نہیں۔ تو اس وقت بوقت قریب اڑھائی بجے رات کے یہ الہام ہوا: وَاللّٰہُ مُخْرِجٌ مَّا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ۔ بَلَاءٌ وَ اَنْوَارٌ اِنِّیْ اَنَا الرَّحْمٰن ثم انی انا الرحمٰن۔ خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود۔ خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود۔ بستر عیش۔ (ترجمہ) اور اللہ تعالیٰ نکالنے والا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ آزمائش اور انوار۔ میں رحمٰن خدا ہوں۔ پھر میں کہتا ہوں کہ میں خدا ہوں۔ خوش ہو کہ انجام نیک ہوگا۔ (پہلی آیت قرآن کی ہے۔ بستر عیش کا

---

[1] میں اللہ ہوں بہت احسان کرنے والا۔ میں یقیناً اپنے رسول کی مدد کے لیے کھڑا ہوں گا

(تذکرہ ص ۴۹۹)

ترجمہ نہیں کیا گیا۔ نصیر احمد)

۱۹۰۴ء۔ ۹ اپریل۔ فرمایا کہ میں اپنی جماعت کے لیے اور پھر قادیان کے لیے دعا کر رہا تھا تو یہ الہام ہوا:

(۱) زندگی کے فیشن سے دور جا پڑے ہیں۔

(۲) فَسَحِّقْهُمْ تَسْحِيقاً۔ (ترجمہ) پس پیس ڈالا ان کو خوب پیس ڈالنا۔

(تذکرہ ص ۵۰۹)

۱۹۰۵ء۔ ۱۸ جنوری۔ صبح کے پانچ بج چکے تھے کچھ منٹ اوپر تھی۔ الہام: چونکا دینے والی خبر۔

(تذکرہ ص ۵۲۳)

۱۹۰۵ء۔ ۲۰ مارچ۔ الہام۔ شکار مرگ۔ (تذکرہ ص ۵۳۰)

۱۹۰۵ء۔ ۱۸ اپریل۔ یہ وحی نازل ہوئی۔ ہے سرِ راہ پر تمہارے وہ جو ہے مولا کریم۔ (تذکرہ ص ۵۴۰)

۱۹۰۵ء۔ ۱۰ جون کو فرمایا۔ دو تین دن ہوئے الہام ہوا تھا۔ الہام: مضر صحت۔ (تذکرہ ص ۵۵۴)

۱۹۰۵ء۔ ۱۵ جون۔ الہام۔ اس کا خوش محمد نام رکھا گیا۔ دوسرا الہام۔ ۱۶ جون اس پر آفت پڑی۔ آفت پڑی۔ (تذکرہ ص ۵۵۵)

۱۹۰۵ء۔ ۲۹ جولائی۔ فرمایا آج اللہ تعالیٰ نے میرا ایک اور نام رکھا ہے جو پہلے کبھی سنا بھی نہیں۔ تھوڑی سی غنودگی ہوا اور الہام ہوا۔ الہام: محمد مظلع۔

(تذکرہ ص ۵۵۷)

۱۹۰۵ء۔ ۲۹ اگست۔ الہام: اے عمارت مفت میں تو تھک گئی۔ (تذکرہ ص ۵۵۹)

۱۹۰۵ء۔ ۲ ستمبر۔ الہام: اس نے اچھا ہونا ہی نہیں تھا۔ (تذکرہ ص ۵۶۳)

۱۹۰۵ء۔ ۸ ستمبر۔ الہام: (۲) کفن میں لپٹا گیا (ترجمہ) جب آسمان سے فوجیں اور زہر آئیں گے۔ (تذکرہ ص ۵۶۴)

۱۹۰۵ء۔ ۱۲ اکتوبر۔ الہام: ہمارا حصہ دے دو۔ (تذکرہ ص ۵۷۴)

۱۹۰۶ء۔ ۱۱ فروری۔ الہام: (۱) کرنسی نوٹ (۲) دیکھو میرے دوستو! اخبار شائع ہو گیا۔ ۵۹۹

۱۹۰۶ء - ۸،۲۸،۲۹ اپریل - تیری خوش زندگی کا سامان ہو گیا (۲) دشمن کا بھی ایک وار نکلا۔ (تذکرہ ص ۶۱۲)

۱۹۰۶ء - ۵ مئی - الہام : یہ میری کتاب ہے اس کو کوئی ہاتھ نہ لگاوے۔ مگر وہی جو میرے خاص خدمت گار ہیں۔ اَللّٰہُ یُعْلِیْنَا وَلَا نُعْلٰی (ترجمہ اللہ تعالیٰ ہمیں اونچا کرے گا ہم نیچے نہیں کیے جائیں گے۔ (تذکرہ ص ۶۱۲، ص ۶۱۳)

۱۹۰۶ء - ۵ مئی - الہام : پھر بہار آئی، تو آئے ثلج کے آنے کے دن۔ (تذکرہ ص ۶۱۳)

۱۹۰۶ء - ۷ - ۱۰ مئی - الہام : کلیسا کی طاقت کا نسخہ (۲) کشتیاں چلتی ہیں تا ہوں کشتیاں۔ (تذکرہ ص ۶۱۵)

۱۹۰۶ء - ۱۸ مئی - الہام : زندگی کے آثار - وحی = آثار زندگی۔ (تذکرہ ص ۶۱۶)

۱۹۰۶ء - ۱۹ جون - الہام : (۱) کلمۃ العزیز (۲) کلمۃ اللہ خان (۳) وارڈ (۴) بشیر الدولہ (۵) شادی خان (۶) عالم کباب (۷) ناصر الدین (۸) فاتح الدین۔ (۹) ھٰذا یَوْمٌ مُبارک۔ (تذکرہ ص ۶۲۶، ص ۶۲۷)

۱۹۰۶ء - ۱۰ جولائی - الہام : دیکھ میں آسمان سے برساؤں گا اور زمین سے نکالوں گا پر وہ جو تیرے مخالف ہیں پکڑے جائیں گے۔ (تذکرہ ص ۶۲۷)

الہام : خدا کی فیلنگ اور خدا کی مہر نے کتنا بڑا کام کیا۔ (تذکرہ ص ۶۵۲)

۱۹۰۶ء - ۳۰ جولائی - الہام : ایک دم میں دم رخصت ہوا۔ (مرزا صاحب فرماتے ہیں یہ الہام ایک موزوں عبارت میں ہے مگر ایک لفظ درمیان میں سے بھول گیا ہے۔) (تذکرہ ص ۶۶۶)

۱۹۰۶ء - ۸ ستمبر - الہام : (۱) لوگ آئے اور دعویٰ کر بیٹھے۔ شیر خدا نے ان کو پکڑا۔ اور شیر خدا نے فتح پائی۔ (۲) امین الملک جے سنگھ بہادر۔ (تذکرہ ص ۶۶۲)

۱۹۰۶ء - ۲۴ ستمبر - الہام : (الف) موت تیراں ماہ حال کو (ب) بعد میں فرمایا کہ سرعت الہام کے سبب بعض دفعہ ٹھیک الفاظ یاد نہیں رہتے اس واسطے تیراں کا لفظ تھا یا تیئیس کا یا بائیس کا۔ (تذکرہ ص ۶۶۵)

۱۹۰۷ء - ۹ فروری - الہام : (۴) اُمید بھاری (۵) ہر ایک مکان سے خیر دعا ہے۔ (تذکرہ ص ۶۹۳)

۱۹۰۷ء - ۹ر فروری - الہام : زندگی باعلام ہوجانا پہلی زندگی سے - (تذکرہ ص۵۹۴)

۱۹۰۷ء - ۲۰ر فروری - الہام : (۲) لپیا شدہ ہجوم (۳) افسوسناک خبر آئی ہے -
(۴) بہتر ہوگا کہ اور شادی کر لیں - (تذکرہ ص۵۹۶)

۱۹۰۷ء - ۷ر مارچ - الہام : (ا) پچیس دن (یا) پچیس دن تک -
(تذکرہ ص۶۰۱)

۱۹۰۷ء - ۹ر مارچ - الہام : (ا) ہزارہا آدمی تیرے پروں کے نیچے ہیں -
(تذکرہ ص۶۰۳)

۱۹۰۷ء - ۲۸ر مارچ - الہام : میرا دشمن ہلاک ہو گیا - ہمن ؟ سد الیکھا خدا نال جا پیلا
سلطان عبدالقادر - (تذکرہ ص۶۰۹، ص۶۱۰)

۱۹۰۷ء - ۲۹ر مارچ - الہام : دولت اعلام بذریعہ الہام بہشتی کمرہ میں نزول ہوگا -
(تذکرہ ص۶۱۱)

۱۹۰۷ء - ۱۱ر اپریل - الہام : یہ دو گھر ہی مر گئے - (تذکرہ ص۶۱۶)

۱۹۰۷ء ۱۲ر جولائی - الہام : غلام احمد کی جے یعنی فتح - (تذکرہ ص۶۲۳)

۱۹۰۷ء - ۲۰ر جولائی - الہام : (۴) الیوسٹی ایشن - (تذکرہ ص۶۲۴)

۱۹۰۷ء - جولائی - الہام : ہیضہ کی آمدن ہونے والی ہے - (یہی لفظ ہیں - واللہ اعلم)

۱۹۰۷ء - ۷ر اگست - الہام : آج الہام ہوا : (تذکرہ ص۶۲۵)

۱۹۰۷ء - ۷ر اگست - الہام : آج الہام ہوا : قبول ہو گئی - ۹ دن کا بخار ٹوٹ
گیا - (تذکرہ ص۶۲۸)

۱۹۰۷ء - ۳۰ر ستمبر - الہام : (۴) ہر ایک حال میں تمہارے ساتھ میں ہوں - تیری
منشا کے مطابق - (تذکرہ ص۶۳۲)

۱۹۰۷ء - اکتوبر - الہام : آپ کے لڑکا پیدا ہوا ہے - یعنی آئندہ کسی وقت
لڑکا ---- پیدا ہوگا - (تذکرہ ص۶۳۴)

۱۹۰۷ء - ۳-۷ر دسمبر - الہام : آمدن عید مبارک بادت - عید تو ہے چاہے کرو یا
نہ کرو - (تذکرہ ص۶۴۰)

۱۹۰۷ء ۲۰ر دسمبر - الہام : واللہ! واللہ! سیدھا ہو یا رُوَلا - مطلب کج طبع

آدمی درست ہوگیا ہے۔ (تذکرہ ص۴۶)

۱۹۰۷ء۔ ۹ فروری۔ الہام: آسمان ایک مٹھی بھر رہ گیا (۲) آسمان مٹھی بھر رہ گیا۔ (تذکرہ ص۱۵)

۱۹۰۷ء۔ اپریل۔ الہام: (۲) بیمار بہت ہی چیخیں مارتا ہے (۳) ماتم کدہ۔ (۴) من ھٰذہ المرض یعنی من ھٰذہ الآفۃ فرمایا کہ اگرچہ اس میں بظاہر عبارت میں غلطی معلوم ہوتی ہے مگر خدا تعالیٰ اس صرف و نحو کا ماتحت نہیں۔ اور ایسی مثالیں قرآن شریف میں بھی موجود ہیں۔ (تذکرہ ص۵۳)

الہام: ٹیچی ٹیچی گئی۔ ص۸۰۵ یہ ہے دوائے ہمزاد (اب) حب کچلہ کونین فولاد مساوی۔ نصف سُرخ۔ الہامی ہے۔ (تذکرہ ص۹۲)

اس مسلسل مضمون میں طرزِ نگارش کا عامیہ، سوقیانہ اور غلیظ و رکیک انداز دراصل کذابِ وقت آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کا ہے اس میں آئینہ کا کوئی قصور نہیں وہ تو مرزا صاحب کے اسلوبِ تحریر کو پیش کر رہا ہے۔ تقصیر دراصل تصویر کی ہے جس کی آئینہ عکاسی کر رہا ہے (ادارہ)

عن عثمان قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ

عن انسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

قال

لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ

(رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جیسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۸۳ء تا ۱۷ جنوری ۱۹۸۴ء

اسرار احمد

اگست ۷۹ء سے امریکہ کے سالانہ سفر کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ۸۳ تک بلاناغہ جاری رہا۔ چنانچہ جون ۸۳ء تک امریکہ کے پانچ چکر لگ گئے۔ اور وہاں کے موسم کے پیشِ نظر یہ پانچوں سفر موسمِ گرما میں ہوئے۔ اواخر دسمبر ۸۳ء تا وسط جنوری ۸۴ء حالیہ سفر ایک تو اضافی تھا اور دوسرے شدید ترین سردی کے موسم میں ہوا۔ چنانچہ گذشتہ اسفار کے دوران تو 'سبز امریکہ' دیکھنے میں آیا تھا اس بار 'سفید امریکہ' کی سیر کا موقع ملا۔ اس لئے کہ ہوائی سفروں کے دوران شمالی امریکہ کے تھوڑے سے جنوبی علاقے کے سوا پورا براعظم سفید لٹھے کی ایک چادر کے مانند نظر آتا تھا جس پر یا تو شاہراہوں کی کالی لکیریں نظر آتی تھیں یا قصبات اور آبادیاں جنہوں نے اس سفید چادر پر بیل بوٹوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اس اضافی سفر کی تقریب یہ ہوئی کہ مئی ۸۳ء میں ہوسٹن کے بعض احباب بالخصوص خواجہ سعید الدین صاحب کا شدید اصرار ہوا تھا کہ ہمارے یہاں بھی آؤ۔ اس وقت میں نے یہ کہہ کر جان چھڑا لی تھی کہ اس وقت تو میں اپنے قیام امریکہ کو مزید طول نہیں دے سکتا اس لئے کہ رمضان مبارک سے پہلے پہلے میں لازماً واپس لاہور پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ البتہ اگر آپ لوگ فرمائیں گے تو سردیوں میں ایک مختصر چکر صرف جنوبی شہروں (ہوسٹن، لاس اینجلز وغیرہ) کے لئے لگا لوں گا (اس لئے کہ ان علاقوں میں سردی شدید نہیں ہوتی بلکہ موسم معتدل رہتا ہے) ——— بس اس بات کو خواجہ صاحب نے وعدہ قرار دے کر اس کے ایفاء کا مطالبہ کر دیا جس کے سامنے راقم کو ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ میرا خیال تھا کہ یہ سفر زیادہ سے زیادہ دو ہفتے کا ہو گا۔ لیکن وسط دسمبر ۸۳ء میں شکاگو سے رفیق محترم ڈاکٹر خورشید ملک صاحب پاکستان تشریف لے آئے اور انہوں نے شکاگو کے لئے بھی وعدہ لے لیا اگرچہ صرف دو دن کا۔ چنانچہ ۲۴ دسمبر کو کراچی سے روانگی کے وقت تک راقم کا مصمم ارادہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ ۱۱ جنوری تک واپس لاہور پہنچ جاؤں گا اور ۱۳ جنوری کا جمعہ لاہور ہی میں ادا کروں گا۔ لیکن ۲۴ جنوری[۱] ہی کی سہ پہر کو جب نیویارک کے جان ایف کینیڈی ائرپورٹ پر برادرم الطاف احمد صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اسلامک سنٹر آف نیویارک (جس کے وہ اس سال کے صدر بھی ہیں) کے سالانہ ڈنر کے موقع پر مہمانِ خصوصی کے فرائض سرانجام دینے کی درخواست شدید اصرار بلکہ قدرے لجاجت

---

[۱] قارئین اسے کتابت کی غلطی نہ سمجھیں۔ پاکستان اور امریکہ کے وقت کے فرق کے باعث کراچی سے نیویارک کا سفر اگرچہ ۲۴ گھنٹے سے زیادہ کا ہوتا ہے لیکن اس میں تاریخ تبدیل نہیں ہوتی اسی حقیقت کو نظرانداز کرنے کی بنا پر راقم کو (باقی اگلے صفحہ پر)

کے ساتھ پیش کر دی جس کو رد کر دینا میرے ایسے کمزور انسان کے لئے قطعاً ناممکن تھا۔ یہ ٹور ہفتہ ۴ ا جنوری کو ہونے والا تھا۔ اس طرح یہ اضافی سفر دو ہفتے سے بڑھ کر ساڑھے تین ہفتوں کو محیط ہو گیا۔

اس طرح میرا امریکہ کے سفر کے ضمن میں "رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْف" کا فلسفہ ایک تو اس اعتبار سے غلط ہو گیا کہ میرا خیال تھا کہ گرمیوں میں شمالی شہروں (شکاگو، ٹورنٹو وغیرہ) کا چکر لگ جائے اور سردیوں میں جنوبی علاقوں کا ــــ تاکہ یہ دونوں سفر مختصر رہیں ــــــ اور دوسرے اس اعتبار سے بھی توقع کے برعکس ہو گیا کہ اس سال ہوسٹن میں بھی قیامت کی سردی پڑی چنانچہ وہاں کے مستقل رہنے والے بھی شدید پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ تا بہ دیگراں چہ رسد!

۲۳، اور ۲۴، کی درمیانی شب کو ایک بجے (فنی اعتبار سے ۲۴، دسمبر کو علی الصبح) میں اور فرزند عزیز حافظ عاطف وحید سلمہ، کراچی سے روانہ ہوئے۔ اور ہمارا ڈی سی ۱۰ طیارہ قاہرہ، فرینکفرٹ اور پیرس رُکتا ہوا ۲۴، ہی کی سہ پہر کو چار بجے نیویارک پہنچ گیا۔ امیگریشن اور کسٹم وغیرہ سے بحمد اللہ جلد ہی فراغت ہو گئی۔ باہر آئے تو رفیق مکرم الطاف احمد صاحب بھی ملے اور محترم افتخار ملک صاحب کے صاحبزادے عزیزم عمران ملک بھی۔ پروگرام کے مطابق ہمیں سیدھے ہوسٹن جانا تھا۔ اور اس کے لئے ہماری سیٹیں ایسٹرن ائرویز کی پرواز میں ریزرو تھیں جو لگ بھگ ڈھائی گھنٹے بعد روانہ ہونے والی تھی۔ ایسٹرن ائرویز کا ٹرمینل تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ چنانچہ میرا خیال تھا کہ پیدل ہی وہاں تک چلے چلتے ہیں لیکن الطاف صاحب نے خبردار کیا کہ باہر قیامت کی سردی پڑ رہی ہے جسے آپ لوگ ہرگز برداشت نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک عزیز کو گاڑی لانے کے لئے بھیجا اور واقعتہً جب ہم نے لاؤنج سے باہر نکل کر گاڑی تک چند گز کا فاصلہ طے کیا تو اتنے ہی میں جان پر بن گئی اور پورا جسم شل ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس موسم کی سرد ترین شام تھی!

ہوسٹن رات کو گیارہ بجے کے لگ بھگ پہنچے تو وہاں توقع یہ تھی کہ کراچی والا موسم ہو گا۔ لیکن وہاں بھی سردی کا وہی عالم تھا۔ ائرپورٹ پر سب سے پہلے برادرم نسیم صاحب ملے (یہ جماعت اسلامی ہند کے معروف کارکنوں بلکہ رہنماؤں میں سے ہیں اور جماعت اسلامی پاکستان کے سابق امیر شیخ سلطان احمد صاحب کے برادرِ اصغر ہیں اور آج کل اسلامک سوسائٹی آف ہوسٹن میں دینی تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں) تھوڑی دیر بعد خواجہ سعید الدین صاحب بھی برادرم عبد الصمد صاحب کی معیت میں تشریف لے آئے۔ خواجہ صاحب نے ہمارے قیام کا بندوبست اپنے گھر پر کیا تھا۔ لیکن برادرم نسیم صاحب کے اصرار پر طے ہوا کہ ان کے یہاں قیام رہے گا۔ نسیم صاحب اپنی گاڑی لینے گئے اور کچھ دیر ہم نے لاؤنج کے دروازے کے قریب ان کا انتظار کیا۔ اس دوران میں جب بھی کسی کے اندر آنے یا باہر جانے کے لئے لمحے بھر کے لئے دروازہ کھلتا اور باہر کی یخ بستہ ہوا کا جھونکا اندر آتا تو جان پر بن جاتی اور پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی۔ خواجہ صاحب خود بھی کسی موسم کا لحاظ کئے بغیر اپنے معمول کے کپڑوں میں چلے آئے تھے۔ لہٰذا ان پر تو مسلسل کپکپی طاری تھی ــــــ لاؤنج سے باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھنے کے لئے جو چند گز دوبارہ طے کئے گئے

(تسلسل) اپنے پہلے سفر امریکہ میں شدید کوفت کا سامنا ہوا تھا۔ اس لئے کہ رفیق مکرم قاضی عبد القادر صاحب نے بالٹی مور جو تار میری آمد کی اطلاع کا ارسال کیا تھا اس میں میرے وہاں پہنچنے کی تاریخ ایک دن بعد کی درج کر دی تھی۔ چنانچہ میں وہاں "قبل از وقت" پہنچ گیا تھا۔

تو وہی احساس دوبارہ ہوا جو نیویارک میں ہو چکا تھا۔

یہ سفر چونکہ اصلاً ہوسٹن (ٹکساس) کے احباب ہی کی دعوت پہ ہوا تھا لہٰذا فطری طور پہ اس کے دوران طویل ترین قیام وہیں رہا۔ یعنی اتوار ۲۵ دسمبر ۸۳ء سے ۴ جنوری ۸۴ء تک پورے گیارہ دن۔

ہوسٹن میں مسلم کمیونٹی کی تنظیم بہت سائنٹفک انداز پہ ہے۔ چنانچہ وسط شہر میں ایک بڑا اسلامی مرکز ہے۔ جو "اسلامک سنٹر آف گریٹر ہوسٹن" کہلاتا ہے۔ مزید برآں پورے شہر کو چار سیکٹروں میں تقسیم کر کے ہر حصے میں ایک مسجد اور ایک مرکز کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اور ان سب کا انتظام و انصرام بھی مرکز ہی کے تحت ہے۔ ایک اور مسجد "مَسْجِدْ دَارُالسَّلَام" کے نام سے بعض احباب نے علیحدہ انتظام کے تحت بنائی ہے جس کے روح رواں بلاجم خورشید صاحب ہیں۔

۲۵ دسمبر کو اتوار تھا۔ اسلامک سنٹر میں معمول کا مطالعۂ قرآن کا پروگرام اغلباً برادرم نسیم صاحب کے ذمے تھا لیکن انہوں نے یہ ذمہ داری مجھ ہی پر ڈال دی۔ طبیعت پر اگرچہ سفر کی تکان اور اوقات کے ردّ و بدل کا بہت اثر تھا جسے جدید اصطلاح میں "JET LAG" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مزید برآں یہ پروگرام انگریزی میں ہوتا تھا جس سے میری طبیعت ویسے ہی ابا کرتی ہے۔ لیکن قہر درویش بر جانِ درویش" جیسے تیسے نسیم صاحب کے حکم کی تعمیل کی ——— وہاں سے فارغ ہو کر پاسا ڈینا کنونشن سنٹر جانا ہوا جہاں تبلیغی جماعت کا شمالی امریکہ کا اجتماع ہو رہا تھا۔ یہ اجتماع ہفتہ کے روز سے شروع ہوا تھا اور اسے پیر کی صبح تک جاری رہنا تھا اور میں نیویارک میں دم لئے بغیر سیدھا ہوسٹن اسی لئے آیا تھا کہ اس میں شرکت کا موقع مل جائے۔ وہاں لگ بھگ ایک ہزار اشخاص جمع تھے۔ اور تقاریر کا سلسلہ جاری تھا اور ماحول پہ معمول کے مطابق گہرا دینی رنگ قائم تھا۔ وہاں پاکستان کے بہت سے احباب سے ملاقات ہوئی۔ جو نہ صرف یہ کہ نہایت تپاک سے ملے۔ بلکہ انہوں نے خود حالتِ مسافرت میں ہونے کے باوجود شرمندہ کر دینے کی حد تک خاطر تواضع کی۔ جس سے اندازہ ہوا کہ طریق کار کے فرق کے اختلاف کے باوصف دین کے تمام خادموں کے قلوب میں ایک دوسرے کے لئے کتنی محبت اور خلوص ہو سکتا ہے ——— وہاں امریکہ کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگوں میں سے بہت سے مجھ سے واقف تھے اور نہایت محبت کے ساتھ مل رہے تھے لیکن میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ اکثر کو بالکل نہیں پہچان پا رہا تھا۔ اس ماحول میں جب دفعتہً لاس اینجلیز کے رفیق تنظیم عزیزم عدنان سستی ملے تو نہایت خوشی ہوئی کہ ان کا دینی جذبہ انہیں وہاں بھی لے آیا تھا۔ فلوریڈا سے آئے ہوئے بعض حضرات نے اس ملاقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے یہاں آنے کی پر زور دعوت دی۔ میں نے بہت معذرت کی لیکن ان میں سے بعض بالخصوص برادرم علی جو پہلے آغا خانی تھے اور وہاں سے تائب ہو کر اہل سنت میں شامل ہوئے ہیں اور برادرم رفیق صاحب کے محبت بھرے اصرار پہ انکار ممکن نہ رہا۔ اور دو دن کا وعدہ کرتے ہی بنی (اگرچہ میں نے بعد میں فون پر گفتگو کر کے اس وعدے کی تکمیل کو اپنی آئندہ آمد تک مؤخر کرا لیا)۔

میں نے لاہور ہی سے پیشگی ہوسٹن کے احباب کو یہ لکھ دیا تھا کہ میرے جملہ دروس و خطابات اردو میں ہوں گے۔ سوائے ایک خطاب جمعہ کے۔ لیکن وہاں اتوار ہی کے روز سے مجھ پر شدید دباؤ پڑنا شروع ہو گیا کہ چونکہ بہت سے عرب، ترک اور مقامی مسلمان بھی استفادے کے خواہشمند ہیں لہٰذا جملہ پروگرام انگریزی میں ہوں ———

بہت ردّ و قدح کے بعد یہ درمیانی بات طے پائی کہ روزانہ رات کا درسِ قرآن تو اردو میں ہو لیکن خطابِ جمعہ کے ساتھ ساتھ ہفتہ اور اتوار کے تمام پروگرام بھی انگریزی میں ہوں۔

درسِ قرآن پیر ۲۶ر دسمبر سے جمعہ ۳۰ر دسمبر تک اور پھر پیر، منگل ۲ر و ۳ر جنوری ۱۹۸۴ء کو روزانہ نمازِ عشاء کے بعد ہوا۔ جو کم و بیش دو گھنٹوں پر محیط ہوتا تھا۔ اور اس میں ان سات دنوں میں بحمداللہ پوری سورۂ شوریٰ کا درس مکمل ہوگیا۔ حاضری اس شدید موسم کے باوجود نہایت حوصلہ افزا رہی۔ تعداد سے بڑھ کر یہ امور موجبِ اطمینان تھے کہ جملہ نفری نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات پر مشتمل تھی۔ اور ایسا نہیں تھا کہ کسی روز کچھ لوگ آ گئے ہوں اور کسی روز کچھ اور ـــــ بلکہ عظیم اکثریت نہایت پابندی سے شرکت کرتی رہی۔ اور بیشتر لوگوں نے نہایت اہتمام اور انہماک کے ساتھ درس کے نوٹس تیار کئے ـــــ ایک اچھی بھلی تعداد خواتین کی بھی ہوتی تھی جو سنٹر کے وسیع و عریض ہال میں مردوں سے خاصے فاصلے پر بیٹھی ہوتی تھیں ـــــ دروس کے بعد سوال جواب کی نشست رہتی تھی اور سوالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے لوگ اسے بخوبی سمجھ رہے ہیں۔ چنانچہ سوالات کے ذریعے فی الواقع اصل بیان کے کچھ خلا پُر ہو جاتے تھے ـــــ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

سورۂ شوریٰ کے درس کے علاوہ ہوسٹن میں حسبِ ذیل پروگرام جیسی ٹوٹی پھوٹی انگریزی مجھ سے بن آئی اُس میں ہوئے:۔

۱۔ خطبۂ جمعہ، ہوسٹن کی مرکزی مسجد میں، حکمت و احکامِ جمعہ کے موضوع پر۔

۲۔ ہفتہ ۳۱ر دسمبر کو اسی جگہ "مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں" کے موضوع پر خطاب جو ڈھائی گھنٹے کو محیط تھا اور اس پر مستزاد تھا سوال جواب کا گرما گرم سیشن جس میں نہایت عمدہ اور موضوع سے متعلق سوالات ہوئے۔

۳۔ اتوار یکم جنوری ۱۹۸۴ء کو پھر اسی مقام پر بعد ظہر مطالعہ قرآن کا حسبِ معمول پروگرام اور بعد ازاں "جہاد اور اس کے لوازم" کے موضوع پر دو گھنٹے کا مفصل خطاب۔

۴۔ اسی روز مسجد دارالسلام میں مغرب اور عشاء کے مابین "اسلام میں بیعت کا تصور" کے موضوع پر خطاب اور بعد نمازِ عشاء سوال و جواب۔

۵۔ سوموار ۲ر جنوری کو نارتھ ِزون سنٹر، آدل روڈ میں "حقیقتِ ایمان" کے موضوع پر تفصیلی خطاب اور سوال و جواب۔

ہوسٹن کے گیارہ روزہ قیام کے دوران تبلیغی جماعت کے اجتماع کے علاوہ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ملائشیا کے نوجوانوں کی ایک تنظیم کے سالانہ کنونشن میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ کنونشن ایک نہایت اعلیٰ ہوٹل حیات ریجنسی کے وسیع و عریض کنونشن ہال میں منعقد ہو رہی تھی اور اس میں کم و بیش دو ہزار نوجوان شریک تھے جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد بالکل مساوی معلوم ہو رہی تھی۔ چنانچہ ہال کے ایک جانب طلبہ تھے اور دوسری جانب طالبات ـــــ اور دونوں طرف حاضری بالکل برابر نظر آ رہی تھی۔ نوجوانوں کی تقاریر کا معیار کچھ زیادہ بلند نہیں تھا۔ البتہ اس نشست کے مہمان مقرر ڈاکٹر احمد صقر کی تقریر بہت عمدہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف شکاگو میں رہتے ہیں لہٰذا میری ان سے شناسائی پرانی ہے۔ تقریر کے دوران انہوں نے مجھے سامعین میں بیٹھے دیکھا تو تقریر میں بھی میرا تذکرہ کیا اور تقریر کے خاتمے پر والہانہ انداز میں بغل گیر ہوئے ـــــ بہرحال کنونشن سے اندازہ ہوا کہ ملائشیا میں اسلامی تحریک بڑی صحت مند اور مستحکم بنیادوں پر اٹھ رہی ہے ـــــ کنونشن میں ہماری شرکت ۲۸ر دسمبر کی دوپہر کو ہوئی۔

ہوسٹن میں اس بار جن احباب سے خصوصی اور قریبی تعلق رہا ان میں سرِ فہرست تو جناب م نسیم ہیں جن کا ذکر پہلے
چکا ہے۔ ان کے ساتھ کامل ذہنی ہم آہنگی تو تھی ہی اس بار اندازہ ہوا کہ مزاجی مطابقت بھی پوری ہے۔ انہوں نے عزیزم
طف وحید سلمہ کو عمر کے نمایاں فرق کے باوجود جس طرح مانوس کیا اور بالکل دوستی کا رنگ پیدا کر لیا وہ ان کا اضافی کمال
ہے جس سے میں بالکل تہی دامن ہوں۔

دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ قرب ڈاکٹر محمد عطا اور ان کے مختصر سے خاندان سے رہا۔ ڈاکٹر صاحب کنگ ایڈورڈ
میڈیکل کالج لاہور سے مجھ سے دو سال بعد کے فارغ التحصیل ہیں۔ الحمدللہ کہ نہ صرف وہ خود بلکہ ان کی اہلیہ ان سے بھی بڑھ کر
سادگی، نیکی اور قومی و ملی سرگرمیوں میں نہایت فعال انداز میں حصہ لینے کے اعتبار سے ہوسٹن کی مسلم کمیونٹی میں بہت نمایاں ہیں
ڈاکٹر صاحب خود اور ان سے بھی بڑھ کر ان کی اہلیہ مصر تھیں کہ ہم ان کے پاس قیام کریں۔

لیکن ایک تو چونکہ یہ مسئلہ پہلے ہی طے پا چکا تھا اور دوسرے اس سبب سے کہ ان کا قیام ہوسٹن کے مضافات میں
سے ٹاؤن' میں ہے جو اسلامک سنٹر سے کم و بیش پینتالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ لہٰذا مستقل قیام تو ان کے یہاں ممکن
تھا البتہ دو دن اور چار راتوں کا قیام ان کے یہاں ہو ہی گیا۔ اوّل تو ۲۶ کی رات کو انہوں نے دعوت کا اہتمام کیا جس میں
الٰہی برادران' یعنی ڈاکٹر عارف الٰہی اور ڈاکٹر اسلم الٰہی بھی مدعو تھے۔ ان دونوں سے دو رشتے تو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے
واسطے سے ہیں یعنی ایک یہ کہ یہ دونوں بھی اس کے گریجویٹ ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ ڈاکٹر الٰہی بخش مرحوم و مغفور کے صاحبزادے
ہیں جو میرے میڈیکل کالج کے پورے عرصۂ تعلیم کے دوران پرنسپل بھی رہے اور میڈیسن کے استاذ بھی ——— مزید برآں ان
دونوں بھائیوں سے ایک خصوصی تعلق کالج کی یونین کے ایک انتخاب کے دوران رہا تھا جس میں اسلامی جمعیتِ طلبہ نے بھرپور
حصہ لیا تھا اور یہ دونوں بھائی اس میں ہمارے 'حلیف' تھے ——— پھر ۲۸ دسمبر کو دوبارہ ڈاکٹر عطا صاحب
کے یہاں قیام رہا۔ اس لئے کہ ۲۹ کو انہوں نے میرے مکمل میڈیکل معائنہ کا اہتمام کیا تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنا پورا
دن لگا دیا ——— جس کے لئے میں ان کا ذاتی طور پر ممنون ہوں۔ آخری بار ۳ کی رات کو درس وغیرہ کے پورے پروگرام
سے فارغ ہو کر میں ان کے ساتھ ان کے مکان پر مع سامان منتقل ہو گیا اور دو راتیں اور ۴ کا پورا دن ان کے یہاں
کامل آرام کیا ——— ۴ کی رات کو ڈاکٹر عارف الٰہی صاحب نے اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا جس میں ڈاکٹر اقتدار بھی شریک
تھے ——— ۵ کی صبح کو ڈاکٹر عطا ہی نے مجھے ہوائی اڈے پر شکاگو کے لئے SEE - OFF کیا !!!

ڈاکٹر عطا ہی کی وساطت سے ان کے برادرانِ نسبتی لیاقت امین اور راحت امین سے ملاقات ہوئی۔
انہوں نے بھی ایک روز کھانے پر مدعو کیا ——— اور عزیزم عاطف وحید کو شہر کی سیر کرائی ——— عزیزم عاطف وحید
کو میں نے ایک خاندان کے ساتھ غالباً یکم جنوری کو لاس اینجلز بھیج دیا تھا۔ یہ لوگ بذریعہ کار سیر کے لئے فلوریڈا گئے
تھے اور وہاں سے واپسی کے دوران ہوسٹن رک گئے تھے اور چند دروس میں شریک رہے تھے اور اب واپس
لاس اینجلز جا رہے تھے۔ وہاں سے عزیزم بھی ۵ کی شام کو براہِ راست بذریعہ ہوائی جہاز شکاگو آ گئے۔

ہوسٹن میں جن مزید احباب سے قریبی رابطہ قائم ہوا ان میں برادرم وسیم اختر صاحب' برادرم عبدالصمد صاحب'
برادرم ثاقب صاحب' جناب ابدالی صاحب' اور برادرم محمد علی سارودی صاحب کے نام قابلِ ذکر ہیں ——— ان میں
سے وسیم اختر صاحب سے میری دور کی عزیزداری بھی ہے۔ اور وہ "تحریک مجاہدینِ پاکستان بیرونِ وطن" سے
سرگرم تعلق رکھتے ہیں' ——— اور ثاقب صاحب سعودی عرب میں مقیم برنی برادران (ڈاکٹر شجاعت علی برنی اور جناب
فرحت علی برنی) کے خالہ زاد بھائی ہیں ——— یہ پاکستان واپسی کا حتمی فیصلہ کر چکے ہیں اور تنظیم میں شمولیت کا بھی۔ ان

کا ارادہ تھا کہ وہ شکاگو اور نیویارک وغیرہ بھی میرے ساتھ جائیں گے لیکن کسی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

ہوسٹن کے اس گیارہ روزہ قیام کے نتیجے میں تنظیم اسلامی کا پہلا بیج بھی پڑ گیا اور چار احباب نے تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی۔

ہوسٹن کی یہ روداد نامکمل رہے گی اگر ایک ترک بھائی کا ذکر نہ کیا جائے۔ ان کا نام عبدالحلیم ایرک ہے تعلیم پیشے کے اعتبار سے GEOLOGIST ہیں۔ وہ کینیڈا کے شہر وینکوور سے تبلیغی اجتماع میں شرکت کے لئے ہوسٹن آئے تھے لیکن پھر انہوں نے میرے دروس میں شرکت کے لئے اپنے قیام کو طول دیا ـــــــ اور پورے پروگرام میں پابندی کے ساتھ شریک رہے۔ نہایت نیک، مخلص اور دردمند مسلمان ہیں۔ انگریزی کے کتابچوں کا ایک SET انہیں ہدیہ کر دیا گیا تھا ـــــــ

شکاگو میں پانچ جنوری کی صبح کو ہوسٹن سے شکاگو پہنچا ـــ اور عزیزم عاطف اسی روز لاس اینجلز سے پہنچے میرے 'استقبال' کو ائیرپورٹ پر برادرم احمد عبدالقدیر، امیر تنظیم اسلامی شکاگو کے علاوہ متعدد رفقاء موجود تھے ـــــ عزیزم عاطف کو شام کو عزیزم عدنان علی نے 'وصول' کیا۔ ۵ رکی رات ہی کو شکاگو کے جنوبی مضافات میں ایک نئے قائم شدہ مرکز میں تقریر تھی۔ اس مرکز کے روح رواں ڈاکٹر فخری صاحب ہیں ـــــ وہاں تمام حاضری اردو سپیکنگ، خواتین و حضرات پر مشتمل تھی۔ لہٰذا اردو میں خطاب ہوا۔ شدید ترین سردی اور طوفانی کیفیت کے باوصف حاضری کافی تھی۔

۶ر کو جمعہ تھا۔ خطبہ جمعہ انگریزی میں 'ڈاؤن ٹاؤن اسلامک سنٹر' میں دیا اور شام کو جناب احمد صقر صاحب کے قائم کردہ امریکن اسلامک کالج شکاگو میں "اسلام میں جہاد کا تصور" کے موضوع پر تقریر کی۔ کالج کے وسیع و عریض آڈیٹوریم میں ڈیڑھ صد کے لگ بھگ افراد جمع تھے ـــــــ اور یہ حاضری امریکی معیار سے غیر معمولی ہے۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ بھی رہا ـــــ اور 'اکل و شرب' کا بھی۔ یہ دونوں پروگرام انگریزی میں ہوئے۔

ہفتہ ۷ر جنوری کو ایلسٹن (ELSTON) ایونیو پر واقع مسلم کمیونٹی سنٹر میں "اسلام کا جماعتی نظام" پر اردو میں مفصل تقریر ہوئی۔ یہاں بھی تقریر کے بعد سوال و جواب اور اس کے بعد 'اکل و شرب' کا سلسلہ رہا بعد ازاں انجمن خدام القرآن شکاگو کی مجلس منتظمہ کا اجلاس ہوا۔

اتوار ۸ر جنوری کو وِلاپارک میں 'اسلامک فاؤنڈیشن' کے زیر اہتمام مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں کے موضوع پر انگریزی میں مفصل خطاب ہوا۔

سوموار ۹ر جنوری کی صبح کو برادرم ڈاکٹر خورشید احمد ملک کے مکان واقع ڈاورنرز گروو پر تنظیم اسلامی شکاگو کے رفقاء کا طویل اجتماع ہوا۔ جس میں تنظیمی مسائل زیر بحث آئے۔

ڈاکٹر خورشید احمد ملک خود اوائل دسمبر میں پاکستان آئے تھے اور ان سے کراچی میں ملاقات ہوئی تھی اور وہیں انہوں نے شکاگو کے لئے دو دن کا وعدہ لے لیا تھا۔ پاکستان سے وہ انڈیا چلے گئے تھے اور وہاں سے ۵ ریا ۶ر تک ان کی شکاگو واپسی تھی لیکن انڈیا میں اپنی ایک عزیزہ کے آپریشن کی وجہ سے ان کی واپسی مؤخر ہو گئی ـــــ اور اب ان کی آمد ۱۴ر کو متوقع تھی ـــــ ان کی غیر موجودگی میں بھی ان کا گھر نہ صرف ہماری قیام گاہ بلکہ تنظیم کی جملہ سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

ہوسٹن میں برادرم ڈاکٹر عبدالفتاح، امیر تنظیم اسلامی ٹورنٹو نے فون پر ٹورنٹو آمد کی پرزور دعوت دی تھی۔ میں نے ابتداءً اپنی اس کا دعوت نہ کر سکنے کی کمزوری کے باعث انکار کر دیا تھا۔ بعد میں خیال ہوا کہ ہفتہ وار تعطیلات

کے ایام تو شکاگو میں صرف ہو جائیں گے۔ دوران ہفتہ ٹورنٹو جانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ لہٰذا برادرم احمد عبدالقدیر صاحب کے ذریعے معذرت کر دی۔ لیکن شکاگو آ کر معلوم ہوا کہ اس سے رفقائے ٹورنٹو بہت "بددل" بلکہ "دل گرفتہ" ہو گئے چنانچہ ۱۰ جنوری کو کینیڈا کے کونسلیٹ میں حاضر ہو کر ویزا حاصل کیا ـــــ اور گیارہ کی دوپہر کو برادرم احمد عبدالقدیر اور عزیزم عاطف وحید کی معیت میں ٹورنٹو جانا ہوا۔

ٹورنٹو

ٹورنٹو میں قیام صرف دو دن اور دو رات رہا۔ اور اس دوران میں تنظیم کے رفقاء ہی کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی ملاقاتیں رہیں۔ ایک رات ڈاکٹر عبدالفتاح صاحب کے مکان واقع واٹرلو میں مقامی تنظیم کے سات آٹھ رفقاء کی معیت میں بسر ہوئی۔ دوسری شب جناب صدیق جاٹ صاحب کے مکان پر بسر ہوئی اور وہاں تنظیم کے رفقاء کا بھرپور اجتماع ہوا ـــــ اور دو مزید حضرات بیعت کر کے تنظیم میں شامل ہوئے۔ بعد میں خود مجھے اندازہ ہوا کہ ٹورنٹو کی یہ مختصر ترین VISIT بھی تنظیمی اور تحریکی اعتبار سے بہت مفید ثابت ہوئی۔ یقیناً دین کے خادموں کی محض باہمی ملاقات بھی دینی اور تنظیمی دونوں اعتبارات سے بہت اہم ہے۔

نیویارک

جمعہ ۱۳ کی صبح کو ٹورنٹو سے نیویارک آنا ہوا ـــــ برادرم الطاف احمد صاحب کے مکان پر وضو وغیرہ کر کے سیدھے وال اسٹریٹ میں واقع مسجد جانا ہوا جہاں خطبہ جمعہ دیا ـــــ یہاں اخوان المسلمون کے بہت سے سرگرم کارکنوں سے ملنا ہوا۔ جن میں سے بعض تو اتنے قریب آ گئے کہ بعد کے تمام پروگراموں میں بھی اہتمام کے ساتھ شرکت کرتے رہے۔

اسی شام کو بعد نماز مغرب فلشنگ (FLUSHING) میں واقع اسلامک سنٹر میں درس قرآن ہوا۔

ہفتہ ۱۴ کی دوپہر کو سٹیٹن آئی لینڈ (STATEN ISLAND) میں واقع ڈاکٹر حامد حسین قیصر صاحب کے مکان پر نشست ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے اور ان کے یہاں اس سے قبل بھی دوبار جانا ہو چکا ہے۔ ان کے یہاں اکثر حاضری حیدر آبادی حضرات کی ہوتی ہے۔ اس بار چند پاکستانی حضرات بھی شریک تھے۔ جن سے بڑی دلچسپ گفتگو رہی۔

شام کو وہ اصل تقریب تھی جس کے لئے میرا اس بار کا قیام امریکہ ایک ہفتہ بڑھ گیا تھا۔ یعنی اسلامک سنٹر کا سالانہ ڈنر۔ اس کے لئے فلشنگ کی میونسپل کارپوریشن کا ہال حاصل کیا گیا تھا۔ جو "خواتین و حضرات" سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہاں میں نے اسی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ایک مفصل تقریر "حقیقتِ جہاد" کے موضوع پر کی اور اس میں دین اور فرائض دینی کے جامع تصور کو تمام و کمال پیش کرنے کی کوشش کی۔ الحمدللہ کہ اس ہنگامہ پرور ماحول میں تمام لوگوں نے نہایت توجہ اور سکون کے ساتھ پوری تقریر سنی ـــــ اور صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ بات کانوں سے گذر کر دل و دماغ میں اتر رہی ہے۔ فللہ الحمد!

اتوار ۱۵ جنوری کو نیویارک کے مضافات میں ایک بڑے اسلامی مرکز میں جانا ہوا۔ جہاں مفصل خطاب بھی ہوا اور دلچسپ سوال و جواب بھی۔

پھر شکاگو

۱۵ کی رات کو میں اور برادرم احمد عبدالقدیر نیویارک سے شکاگو آ گئے۔ جہاں اسی دن ڈاکٹر خورشید ملک صاحب انڈیا سے پہنچے تھے اور شکاگو کا یہ "بارِ دگر" سفر محض ان سے ملاقات کی خاطر ہوا تھا۔

۱۶ کی صبح کو ان کے مکان پر برادرم عرفان احمد خان اور مولانا عبداللہ سلیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اور شام کو انجمن خدام القرآن شکاگو کا باضابطہ اجلاس ہوا جس میں عہدیداروں کا نیا انتخاب ہوا۔ جس کے نتیجے میں برادرم محمد

فردوسی صاحب نئے صدر مقرر ہوئے۔

واپسی

۱۷ر کی صبح کو شکاگو سے نیویارک واپسی ہوئی۔ دن میں ایک مختصر سا چکر بازار کا لگایا ـــــ شام کو پی آئی اے کے ڈی سی ۱۰ طیارے سے واپسی کا سفر شروع ہوا۔ کراچی سے نیویارک جاتے ہوئے دن لمبا ہوتا چلا جاتا ہے اور ایک ہی تاریخ میں پورا سفر طے ہو جاتا ہے ـــــ واپسی میں معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔ چنانچہ تین تاریخیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یعنی ۱۷ر کی شام کو نیویارک سے روانہ ہو کر کراچی آمد ۱۹ر کو صبح چار بجے ہوئی۔ دن میں کراچی برادرم قاضی عبدالقادر صاحب کے مکان پر آرام کیا اور شام کو ساڑھے چھ بجے کراچی سے چل کر لگ بھگ آٹھ بجے لاہور پہنچ گئے۔

بِنِعْمَۃِ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ وَعَلَیْہِ رَبِّنَا تَوَکَّلْنَا۔ اٰیِبُوْنَ تَائِبُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ ـــــ!

اس بار امریکہ میں جہاں بھی جانا ہوا یہ سوال ضرور ہوا کہ آپ نے "وال سٹریٹ جرنل" دیکھا ہے؟ معلوم ہوا کہ مین ہیٹن کی مشہور زمانہ وال اسٹریٹ سے شائع ہونے والے اس روزنامے نے جو امریکہ کے سرمایہ داروں اور کاروباری لوگوں کے حلقے کا اہم ترین ترجمان ہے۔ اپنی یکم دسمبر ۸۳ء کی اشاعت میں ایک طویل مضمون اپنے اسٹاف رپورٹر پال گگوٹ کے قلم سے صفحۂ اول پر شائع کیا تھا جس میں پاکستان میں موجودہ حکومت کی 'نفاذِ اسلام' کی مساعی اور ان کے بارے میں مختلف حلقوں کی رائے کا ذکر تھا۔ اور اس میں نہایت ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ ایک تیر سے تین شکار کیے گئے تھے۔ یعنی علماء کا استہزاء، موجودہ حکومت کا تمسخر اور خود اسلام کی تضحیک۔ اس تحریر میں میرے موقف کے ساتھ ساتھ جناب جسٹس ریٹائرڈ محمد افضل چیمہ (سابق چیئرمین، اسلامی آئیڈیالوجی کونسل پاکستان)، جناب اعتزاز احسن (ایڈووکیٹ و سیاست دان) جناب اقبال جعفری (صحافی)، جناب مصلح الدین (پاکستان ٹیلیویژن) جناب انیس احمد (اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد) حنا جیلانی (ایڈووکیٹ) اور ایک بے نام احمدی (قادیانی) کی آراء دی گئی تھیں ـــــ لیکن سب سے طویل ذکر بھی میرا تھا اور سب سے زیادہ نشانۂ تضحیک بھی میری ذات کو بنایا گیا تھا۔ (قارئین میثاق کے تفنّنِ طبع کے لئے اس مضمون کے متعلقہ حصے کا فوٹو سٹیٹ اسی پرچے میں شائع کیا جا رہا ہے)

عجیب بات ہے کہ ڈیڑھ سال قبل جب میں برادرم قاضی عبدالقادر صاحب اور عزیزم عارف رشید سلمہٗ کی معیت میں لاس اینجلیز پہنچا تھا تو عین اسی دن اسی طرح کا ایک صفحہ اول کا مضمون کیلیفورنیا کے سب سے بڑے روزنامے 'لاس اینجلیز ٹائمز' میں چھپا تھا۔ اور اس سے قبل اسی قسم کا ایک مضمون کینیڈا میں ٹورنٹو کے سب سے بڑے روزنامے 'ٹورنٹو سٹار' میں چھپ چکا تھا ـــــ مجھ سے اس قسم کے مضامین کے بارے میں جب بھی استفسار ہوا کہیں تو میں نے جواب میں خاموش مسکراہٹ ہی پر اکتفا کی اور کہیں ع "بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا!" کو ڈھال بنایا ـــــ دل کی گہرائیوں میں میں نے اس پر بحمداللہ کوئی تشویش محسوس نہ کی بلکہ ایک گونہ اطمینان ہی محسوس کیا کہ اس سے ایک جانب " وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا " اور دوسری جانب بلاتشبیہ " وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ " کا عکس نظر آتا ہے ـــــ فللّٰہ الحمد والمنّۃ

استدراک، وطن میں شب و روز

امریکہ میں چوبیس روزہ قیام کے دوران معروفیات کا جو عالم رہا وہ تو تحریر بالا میں سامنے آگیا۔ اب ذرا اندرونِ ملک دعوتی دوروں اور دروس و خطابات کے طوفانی انداز کی ایک جھلک کے طور پر ۲۰ جنوری ۸۴ء (امریکہ سے واپسی ہوئی تھی) سے ۱۹ فروری ۸۴ء تک ایک ماہ کے پروگرام کا خلاصہ ملاحظہ فرما لیا جائے:

جنوری۔ جمعہ ● خطاب جمعہ مسجد دارالسلام ● درسِ قرآن اجتماعِ عمومی تنظیم اسلامی لاہور، قرآن اکیڈمی، بعد نمازِ مغرب ــــــ سورۂ جن (مکمل)

جنوری۔ ہفتہ ● لاہور تا کراچی بذریعہ پی آئی اے۔ ملاقات ڈاکٹر سید سلمان ندوی خلف الرشید مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

جنوری۔ اتوار ● تقریر سیرت النبیؐ، سندھ میڈیکل کالج۔ کراچی، دوپہر
● خطاب و سوال و جواب بر مکان کیپٹن عبد الکریم صاحب، ڈیفنس سوسائٹی، عصر تا عشاء

جنوری۔ پیر ● مولانا سید صباح الدین عبد الرحمٰن (دار المصنفین، انڈیا) اور برادرم زبیر عمر صدیقی (سعودی عرب) اور برادرم یونس علی (از مصر) سے ملاقاتیں۔

۲۶ جنوری۔ جمعرات ● اجلاس مرکزی مجلس مشاورت، تنظیم اسلامی۔

۲۷ جنوری۔ جمعہ ● خطاب مرکزی جامع مسجد، سٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ۔
● رات کو پھر اجلاس مرکزی مجلس مشاورت۔

۲ فروری۔ جمعرات ● خطبہ نکاح دخترِ نیک اختر مسٹر رشید گارڈی، بعد عصر۔
● شرکت اجتماع خصوصی، رفقائے تنظیم اسلامی لاہور (شمالی) بعد عشاء۔

۳ فروری۔ جمعہ ● خطاب جمعہ، مسجد دارالسلام۔
● درس قرآن اجتماعِ عمومی، تنظیم اسلامی لاہور، قرآن اکیڈمی، بعد نماز مغرب، سورۂ مزمل (مکمل)

۴ فروری۔ ہفتہ ● بعد مغرب، خطاب "عظمتِ قرآن" "عربی کلاس"، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری۔
● شرکت اجتماع خصوصی رفقائے تنظیم اسلامی لاہور (وسطی) بعد عشاء۔

۵ فروری۔ اتوار ● خطاب پی ڈی سی فیکٹری جہلم، عصر تا مغرب، مغرب تا عشاء۔

۶ فروری۔ پیر ● درسِ قرآن، کمیونٹی سنٹر، اسلام آباد۔ سورۂ تغابن (مکمل)، پورے تین گھنٹے۔

۷ فروری۔ منگل ● سہ پہر اجتماع رفقائے تنظیم اسلامی راولپنڈی / اسلام آباد
● بعد نماز عشاء، خطاب انجینئرنگ کالج ٹیکسلا۔
(رات کے بارہ بجے ٹیکسلا سے روانہ ہو کر پونے تین بجے کوہاٹ پہنچے۔ وہاں برادرم ڈاکٹر مطیع اللہ شاہ کے مکان پر چند گھنٹے قیام کے بعد سیدھے بنوں)۔

۸، فروری۔ بدھ ● ساڑھے گیارہ بجے سے ایک بجے دوپہر خطاب بار ایسوسی ایشن، بتول۔

● بعد ظہر، خطاب "عظمتِ قرآن" جامعہ علوم شرعیہ، "

● بعد عشاء مفصل خطاب جامع مسجد، ٹانچی بازار "

۹، فروری۔ جمعرات ● بعد فجر درسِ قرآن جامع مسجد، ٹانچی بازار "

● نو بجے روانہ ہو کر سوا تین سو میل کا سفر طے کر کے رات کو واپسی لاہور

۱۰، فروری۔ جمعہ ● خطاب جمعہ، مسجد دارالسلام ● بعد مغرب تقریر قرآن کانفرنس، مسجد شانِ اسلام، گلبرگ۔

● بعد عشاء درسِ قرآن، مسجد باغ والی شاہ عالم چوک۔

۱۱، فروری۔ ہفتہ ● تقریباً پورا دن اجتماع خصوصی رفقائے تنظیم اسلامی، لاہور۔

● بعد نماز عشاء ـــــ درس قرآن، چوک شاہ عالم مارکیٹ۔ ۱

۱۲، فروری، اتوار ● سوا گیارہ بجے سے پونے دو بجے تک خطاب نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن (NIPA)۔

● بعد نماز درس قرآن چوک شاہ عالم مارکیٹ۔

۱۳، فروری، پیر ● بعد مغرب شاہ عالم مارکیٹ کے تین روزہ درس قرآن کے ضمن میں سوال و جواب کی نشست

● بعد عشاء بارہ حضرات کی بیعت اور شمولیت تنظیم (بعد ازاں روانگی برائے رحیم یار خان بذریعہ ریل)

۱۴ فروری، منگل ● رحیم یار خاں ● گیارہ بجے خطاب بار ایسوسی ایشن اور

● بعد مغرب خطاب عام، جامع مسجد رحیم یار خاں

۱۵، فروری۔ بدھ ● نماز فجر کے فوراً بعد رحیم آباد، جہاں سردار محمد اکمل خاں لغاری، سردار محمد امین خان لغاری اور ان کے صاحبزادگان و خواہرزادگان سے تفصیلی ملاقات رہی ـــــ وہاں سے قبل از ظہر صادق آباد۔

صادق آباد ● بعد ظہر خطاب عام، جامع مسجد تحصیل والی، اور ● بعد مغرب سوال و جواب صادق کلب، صادق آباد۔

۱۶، فروری، جمعرات ● کراچی ● دوپہر کو تقریر سیرت النبیؐ، دفتر بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن۔

● بعد مغرب اجتماع خصوصی رفقائے تنظیم اسلامی، کراچی۔

۱۷، فروری۔ جمعہ ● خطاب جمعہ، جامع مسجد میمن سوسائٹی، نزد شہید ملت روڈ، کراچی

● بعد جمعہ خطبہ نکاح دختر نیک اختر ڈاکٹر نور الہٰی صاحب، (اس پورے پروگرام میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق بھی شریک رہے!)

● بعد مغرب، اسی مقام پر درس سورۂ صف

۱۸، فروری۔ ہفتہ ● ملاقات صوفی ریاض احمد صاحب (تبلیغی کالج۔ ہیپ نڈی روڈ) مولانا طاسین صاحب (مجلس علمی) اور بعض دیگر احباب و رفقاء (رات کو واپسی لاہور بذریعہ پی آئی اے)

۱۹، فروری۔ اتوار ● لاہور ● خطاب سیرت کانفرنس، اے جی آفس لاہور۔

ـــــ یہ فہرست ان اندراجات پر مبنی ہے جو میری Appointments کی ڈائری میں درج ہیں، ہو سکتا ہے کہ کوئی پروگرام درج ہونے سے رہ بھی گیا ہو۔ بہرحال میں خود جب اس پر غور کرتا ہوں تو یہ ناقابلِ یقین سا نظر آنے لگتا ہے ـــــ اور اب کہ میں بڑھاپے کی سرحد میں بھی قدم رکھ چکا ہوں اور صحت بھی اکثر خراب

ہے اتنی مشقت ظاہر ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید و توفیق کے ناقابلِ برداشت ہی نہیں ناممکن ہے،
اطمینان کے لئے یہ بات کافی ہے کہ ناگزیر بشری ضروریات کے سوا میرے اوقات کا کوئی حصہ اور میری قوا اور
احیتوں کی کوئی رمق سوائے خدمتِ قرآن اور خدمتِ اسلام کے اور کسی کام میں صرف نہیں ہوتی —— اور
یہ بھی ہرگز کوئی فخر نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ اس نے اسی خدمت کے لئے قبول
یا ہے ؎

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی   منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت!!

سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ حیاتِ دنیوی کے آخری سانس تک اس خدمت کی توفیق عطا کئے رکھے
ی درجے میں ایک نسبتِ معنوی قائم ہو جائے اس کیفیت سے جو صحابہ کرامؓ کی زبانوں سے ادا ہونے والے
شعر میں سامنے آتی ہے کہ ؎

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِهَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم اجمعین —— آمین۔

Gen. Zia led that 1977 coup, and ever since, he has had to deal with the mulavis' political demands. In Lahore on a recent Friday (the Moslem Sabbath), hundreds of the male faithful sit, cross-legged and skull-capped, under canvas awnings at the mosque of scholar Israr Ahmad. (Women and children are hidden from men in another tent.) Cross-legged himself, his gray beard touching a generous stomach, Mr. Israr bellows his message through loudspeakers: "The way to salvation is through the Koran!"

The 51-year-old Mr. Israr has more than Allah on his mind, however. Politics, for example: "Hypocrisy and duplicity are the order of the day!" he shouts, criticizing Gen. Zia's regime. And women: "Not observing *purdah* is a sin!" he roars, upholding the Koranic injunction that women cover themselves from head to toe in public.

Public-Relations Skill

His sermons are influential because in Pakistan the mosque is often the focus of public life. And modern mulavis extend that influence with astute public-relations skill of a Jerry Falwell. Outside Mr. Israr's mosque, the faithful can buy tapes of his last 300 sermons, and there are hundreds of

copies of his pamphlet, "Islamic Renaissance." Until recently Mr. Israr even impressed his orthodox views on a weekly national TV audience.

Like many mulavis these days, Mr. Israr isn't pleased with Gen. Zia's Islamization. "It is sloganism," he says in an interview. Instead, Mr. Israr wants all laws studied for their "repugnance" to Islam. For example, he wants interest purged from the banking system, and he doesn't want women to vote anymore. "We want a . . . total revolution," he says. But aren't revolutions bloody? Mr. Israr replies, "There must be bloodshed in revolutions."

قارئین متوجہ ہوں!

- ماہنامہ میثاق کا سالانہ زرِ تعاون اندرونِ ملک -/۳۰ روپے ہے جبکہ دوسرے ممالک کے لئے زرِ تعاون حسب ذیل ہے:

کینیڈا -/۱۵۰ روپے یا ۱۵ کینیڈین ڈالر

امریکہ، افریقہ، مغربی جرمنی، نائجیریا -/۱۵۰ روپے یا ۱۲ امریکن ڈالر

انگلینڈ، ناروے، متحدہ عرب امارات -/۱۰۰ روپے

سعودی عرب، ابوظہبی، مصر، ایران -/۶۰ روپے

انڈیا -/۸۰ روپے

- پاکستان کے دیگر شہر جہاں تنظیم کی ذیلی شاخیں قائم ہیں وہاں میثاق درج ذیل پتوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

★ پشاور : دفتر تنظیم اسلامی۔ نثار بلڈنگ پل پختہ نزد چوک یادگار، پشاور

★ ملتان : عبدالغنی صاحب ملتان پولٹری کارنر۔ بالمقابل فاطمہ جناح ہسپتال، ملتان۔ فون ۷۵۸۹۱

★ کوئٹہ : دفتر تنظیم اسلامی جناح روڈ کوئٹہ اور قاری افتخار احمد صاحب خطیب مسجد طوبیٰ مسجد روڈ کوئٹہ۔ فون [illegible]

★ کراچی : داؤد منزل۔ نزد آرام باغ۔ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون ۲۱۴۷۰۹

★ راولپنڈی یزی لینڈ اسکول ۱۴-E-۱ - راولپنڈی سٹلائٹ ٹاؤن فون ۴۳۷۳۶

★ گوجرانوالہ : جناب پاشا ہارون برکی، بی - ۸۱ ۵ سٹلائیٹ ٹاؤن

★ سیالکوٹ : جناب محمد منیر اقبال معرفت وحید کلینک چوک کوٹلی بہرام فون ۳۲۲۱۴

★ وہاڑی : ڈاکٹر منظور حسین منظور محمدی ہسپتال - ۱۷X - پیپلز کالونی

جمیل الرحمٰن

"اِک دیا اور بجھا....."

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے نام کے ساتھ مرحوم و مغفور کے الفاظ لکھنے پر طبیعت تاحال آمادہ نہیں ہے ___ تاہم واقعہ کا انکار ممکن نہیں!۔ تحریک پاکستان کا یہ پُرجوش کارکن اور شعلہ بیان خطیب، بانیٔ پاکستان کا قریبی رفیق اور ان کے اور مسلمان والیان ریاست کے مابین خصوصی رابطے کا ذریعہ، علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں مسلسل چودہ برس (از ۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۸ء) روزانہ پابندی کے ساتھ مودبانہ حاضری دینے والا طالب علم جس نے اُن کی تمام کتابوں کی ایسی واضح اور عام فہم شرح لکھ دی جس سے اقبال کے افکارِ عالیہ تک متوسط صلاحیت کے لوگوں کی رسائی بھی ممکن ہوگئی، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ، مذہب اور فلسفۂ مذہب، فلسفہ اور تاریخ فلسفہ، اور ادیان عالم اور ان کے تقابلی مطالعے کے ضمن میں معلومات کا بحرِ ذخار اور گنج گرانمایہ، صاحبِ طرزِ انشاء پرداز اور فنِ خطابت میں ولولہ انگیزی اور رقت آمیزی کو بیک وقت سمو دینے کی صلاحیت رکھنے والا مقرر، ___ بالآخر قضائے خداوندی سے خود تو ۳ر فروری ۱۹۸۴ء کو راہیٔ ملک بقا ہوگیا اور اُس کا جسدِ خاکی ۴ر فروری کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اناللہ و انا الیہ راجعون

تنظیم اسلامی کے داعی و امیر اور مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے موصوف کا ۱۹۶۶ء سے تادمِ آخر نہایت مشفقانہ تعلق قائم رہا۔ ادھر کچھ عرصہ سے تو انہوں نے لکھنا ترک کر دیا تھا جبتک ان کا قلم چلتا رہا "میثاق" کے ساتھ تعلق قائم رہا اور ان کے رشحاتِ قلم قارئین کی ضیافت طبع اور استفادہ علمی کا ذریعہ بنتے رہے۔ انجمن

کے تحت منعقد ہونے والی "قرآن کانفرنسوں" کی ایک نشست کے "مقررِ اعلیٰ" ہمیشہ وہی ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بارہا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے مرحوم سے بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ پایا۔

اللہ تعالیٰ اُن کی خطاؤں سے درگزر فرمائے۔ اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اللّٰھم اغفر لہٗ وارحمہٗ وادخلہ فی رحمتک وحاسبہٗ حساباً یسیراً۔ آمین یارب العالمین۔

آخری عمر میں موصوف پر فقر اور درویشی کا غلبہ ہوگیا تھا۔ غالباً یہ اُسی کا مظہر ہے کہ شیخ طریقت حضرت مولانا شاہ علاؤالدین نقشبندی مدظلہٗ اپنی علالتِ طبع کے باوجود ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لئے پہنچ گئے اور ان ہی کی امامت میں لوگوں نے نمازِ جنازہ ادا کی ــــ البتہ نمازِ جنازہ میں شرکاء کی حاضری حضرت اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر کی "تصویر" تھی جسے مرحوم اپنے بارے میں اکثر پڑھا کرتے تھے ــــ یعنی

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا
میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

عجیب معاملہ ہوا کہ حکومت پنجاب کے ایک نہایت نیک سیرت اور فرشتہ خصلت افسر شیخ احمد طارق صاحب (چیف انجینیئر، محکمہ انہار) بھی چشتی صاحب کے انتقال کے چند ہی روز قبل بظاہر ایک "معالجاتی حادثے"، لیکن بباطن قضائے الٰہی سے رحلت فرما گئے۔ گذشتہ چند سالوں سے احمد طارق صاحب کا نہایت قریبی نیازمندانہ بلکہ عقیدتمندانہ تعلق چشتی صاحب کے ساتھ تھا اور تقاریر وغیرہ کے ضمن میں چشتی صاحب کو لانے لے جانے کی ذمہ داری ان ہی کے کندھوں پر تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیخ صاحب موصوف نے ملک بقا کی جانب اپنے ممدوح اور مخدوم سے پیشقدمی اس لئے کی کہ وہاں ان کا استقبال کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ شیخ صاحب موصوف کو بھی اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور حدیث نبوی " المرأ مع من احبّ " کے مصداق عالم برزخ میں بھی انہیں چشتی صاحب کی معیت عطا فرمائے۔ آمین۔

بھارت سے ایک خط

مکتوبِ گرامی مولانا افتخار احمد فریدی از مرادآباد ہند

حضرت محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دام مجدہم السلام علیکم۔ مزاج گرامی!
بھائی عبدالکریم پاریکھ صاحب کے خط سے یہ خوشخبری معلوم ہوئی کہ وہ لاہور قرآن کانفرنس میں تشریف لے گئے تھے اور آپ سے خوب ملاقات رہی خدا مجھے بھی نصیب فرمائے "میثاق" اور "حکمتِ قرآن" سے آپکی مساعیٔ حسنہ کا حال معلوم ہو کر آپ کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں بعض ڈاک والوں کی مہربانی سے نہیں ملتے جن کا قلق رہتا ہے جنوری والا میثاق ماشاءاللہ بڑا جاندار ہے جزاکم اللہ۔ مگر اس میں قرآن کانفرنس کا کوئی حال نہیں معلوم ہو سکا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب دام مجدہم کو آئندہ سالانہ کانفرنس میں شرکت کیلئے ابھی سے خط و کتابت کرائیں۔ بھائی پاریکھ حضرت مولانا کے بہت ہی تعلق والے ہیں ان کو بھی ذریعہ بنائیں۔ خدا کرے ان کی شرکت اس سال ہو جائے ابھی تو وہ جنوبی ہند کے اسفار میں ہیں حق تعالیٰ شانہٗ نے پاریکھ صاحب کو بھی قرآن پاک کی خدمت و سعادت وہبی طور سے عطا فرمائی ہے جی چاہتا ہے اس دور کے قرآنی خدمت گذاروں کا جوڑ آپ کے ساتھ قائم ہو جائے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر اس میثاق میں خوب تفصیل سے کچھ باتیں آگئی ہیں جزاکم اللہ جی چاہا کہ اس سلسلہ کی کچھ باتیں بندہ بھی عرض کر دے حضرت کے مجدد ہونے کی بات تو آپ کی ہی زبانِ مبارک سے سنی تھی اس پر غور کیا تو واقعی یہ ساری بہار ان کی ہی لگائی ہوئی ہے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ التبلیغ بھی بچپن سے ہی قیام گنگوہ سے ہی تعلق رکھتے تھے ڈاکٹر انصاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوٹھی پر وفات کے وقت بھی مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے۔ حکیم اجمل خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ڈاکٹر انصاری رحمۃ اللہ علیہ حکیم نابینا صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ مولانا

محمد علی جوہرؒ صاحبزادہ آفتاب خاں صاحبؒ حاجی ترنگ زئیؒ پر بھی حضرت شیخ الہندؒ کا خوب اثر پڑا تھا۔ یہ سب حضرت کے فدائی تھے ۱۹۱۰ء میں دیوبند کا جلسہ ہوا جس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب شریک ہوئے اس وقت یہ بات طے ہوئی تھی کہ دیوبند کے کچھ ہونہار جدید تعلیم کے لئے علی گڑھ جایا کریں گے اور اس طرح علی گڑھ کے کچھ دیوبند کی تعلیم کے لئے آیا کرینگے۔ مالٹے سے واپسی پر بیڑیوں کے کھلنے والے انسان نے علی گڑھ یونیورسٹی کی جامع مسجد کے ایک ستون سے کمر لگا کر یہ ارشاد فرمایا کہ مدرسوں، خانقاہوں سے زیادہ تم سے اُمید لگاتا ہوں جس طرح حق تعالےٰ نے تاتاریوں کو ہدایت نصیب فرمائی تھی کیا عجب ہے انگریزوں کو بھی اس دور میں یہ شرف مل جائے اگر یہ ہوتا ہے تو یہی طبقہ اس کام کے لئے کارآمد ہوگا۔ حضرت شیخ الہند کی ایک ہی یادگار انسان آپ کے خطہ میں پایا جاتا ہے مولانا عزیز گل صاحب دام مجدہم خدا کرے حیات ہوں خطۂ مردان میں اُن سے بھی ایک دفعہ ضرور ملاقات فرمائیں۔ اگر ان تک پہنچنے کے لئے ضرورت رہبری کی ہو تو قاری سعید الرحمٰن صاحب پنڈی والے یا مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک سے کسی کو لے لیا جائے۔

آپ کو حق تعالےٰ شانہٗ نے قرآن پاک کی خدمت کے لئے قبول فرمایا ہے اس لئے عرض کر رہا ہوں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ میری زندگی بھر کا تجربہ یہ ہے کہ حق تعالےٰ کا قُرب جتنا میں نے تہجد کے وقت قرآن پاک کی تلاوت میں پایا اور کسی چیز میں نہیں پایا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اُس وقت دیکھ کر پڑھا جائے اور معنیٰ و مطلب کا دھیان نہ کرے صرف یہ کہ اللہ کے کلام کی تلاوت کر رہا ہوں۔ والسلام۔

محتاج دُعا

خادم افتخار فریدی

رفتارِ کار

چمنستانِ کراچی میں فصلِ بہار

امیرِ تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے ۱۹۸۳ء میں اختتامی دورۂ کراچی کو ایک عنوان کے تحت پیش کیا جائے تو زیادہ مناسب لگتا ہے۔ یعنی وہ عنوان ہے "چمنستانِ کراچی میں فصلِ بہار" اس طرح ماہ مبارک سے جس میں کہ یہ دورہ ہوا ایک لفظی مناسبت کے ساتھ ساتھ معنوی مناسبت بھی ہو جاتی ہے۔ چونکہ عربی لغت میں موسم بہار کو "ربیع" کہتے ہیں اس طرح ربیع الاوّل کو اگر روحانی فصلِ بہار سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ربیع الاوّل یعنی روحانی بہار کی آمد کے ساتھ ہی عالمِ اسلام میں خصوصاً اور پوری دنیا میں عموماً سرورِ عالم رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور حیاتِ مطہرہ کے ذکر کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بے شک بلا ریب و شک جمیع انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ کامل آپؐ ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔ آپؐ کی ذاتِ بابرکات ہی نے انسانوں کو ان کے مقصدِ حیات سے آگاہ کیا۔ اور آپؐ ہی ہیں جن کے نقشِ پا پر چل کر سعادت و فلاحِ دارین حاصل کی جا سکتی ہے۔ آپؐ کی محبت وجہِ نجات، آپؐ کی اطاعت وسیلۂ فلاح و فوزِ دارین اور آپؐ کے نقشِ پا کا اتباع ظفرمندی، کامیابی و کامرانی اور شوکت و حشمت کا زینہ ہے۔ مسلمانوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو زبانی طور پر ان حقیقتوں کا اعتراف نہ کرتا ہو۔ اس حقیقت سے سب آگاہ ہیں، مانتے اور جانتے ہیں۔ اپنی مجالس، مذاکرات، تحریروں اور تقاریر میں بیان بھی کرتے ہیں۔ یہ شب و روز کی سیرت کی محافل، میلاد کے جلسے و جلوس اور ذکرِ رسولؐ کی مجالس اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ مسلمانوں نے کبھی بھی ذکرِ رسولؐ میں کمی نہیں آنے دی اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس ذکرِ رسولؐ کو محض زبان تک محدود نہ رکھیں بلکہ اسے اپنی شخصیت میں جذب کریں اور ہمیں حقیقی محبت اور والہانہ محبت کے ساتھ ساتھ رسولِ کاملؐ کی اطاعت و اتباع بھی نصیب فرمائے۔ جو ہو رہا ہے وہ ہو رہا ہے لیکن ہمیں سوچنا ہوگا کہ کیا یہی کچھ کافی ہے کہ ہم جلسے کر لیں۔ جلوس نکالیں جن کا کوئی ثبوت قرونِ خیر میں نہیں ملتا۔ دھواں دھار تقاریر کر لیں، فنِ خطابت کا مظاہرہ کر لیں اور لوگوں سے داد حاصل کر لیں۔ گلیوں، بازاروں اور عمارتوں کو جھنڈیوں اور قمقموں سے سجایا جاتا رہے۔ زرِ کثیر صرف کر کے آرائش اور جلوس کا اہتمام کیا جاتا رہے۔ یہ سب آخر کس لئے؟ کیا رسولِ کاملؐ کی اس عالم میں تشریف آوری کا مقصد وحید بس یہی کچھ تھا؟ کیا آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر امت کے کاندھوں پر جو ذمہ داری ڈالی وہ یہی تھی کہ وہ محض زبانی کلامی حد تک خراجِ عقیدت و محبت وہ بھی مبتدعانہ ادا کر کے بری الذمہ قرار پائے گی۔

۱۲ دسمبر ۱۹۸۳ء بمطابق ۶ ربیع الاوّل ۱۴۰۴ھ کو پاکستان سنی کونسل کے زیرِ اہتمام خالقدینا ہال کراچی میں منعقد ہونے والی محافلِ سیرت میں بعد نمازِ مغرب امیرِ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے مراحل پر اپنا پہلا خطاب فرمایا۔ خطاب کا یہ سلسلہ ۱۳ دسمبر سے ۱۷ دسمبر یعنی پانچ ایام پر محیط تھا۔ ان ایام میں امیرِ محترم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جد و جہد کے چھ مراحل شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے اور ان مراحل کو اس انداز سے بیان فرمایا کہ اس سے ہر شخص کے قلب پر جس کو اب تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نہ زبانی محبت بلکہ عملی محبت کے اثرات فرد فرد مترتب ہوئے ہوں گے۔ (قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے ان خطابات کو ٹیپ میں محفوظ کر لیا گیا ہے جو تنظیم اسلامی کراچی کے دفتر سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

سیرتِ طیبہ کے حوالے سے امیر محترم نے پانچ ایام میں جو کچھ فرمایا اس کا ماحصل یہ ہے کہ سیرتِ مطہرہ سمجھنے کے لئے رسولِ کامل کی انقلابی جدوجہد کو ہر مسلمان اپنے سامنے رکھے تو سب سے بڑی سنت جو حضور ہمارے سامنے آئے گی وہ اللہ کے دین کا غلبہ ہے اور یہی نبی کامل کی بعثت کا نقطۂ عروج ہے جس کو قرآن میں تین مقامات پر بغیر کسی تغیر کے بیان کیا گیا ہے کہ آپ دنیا میں اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے تشریف لائے "اللہ کی ذات وہ ہے جس نے اپنے رسول کو "الھدٰی" اور "دینِ حق" (مکمل نظام زندگی) دیکر بھیجا تاکہ وہ اس دین کو تمام دنیا کے تمام باطل نظام ہائے اطاعت پر غالب کر دے۔"

رسولِ کامل نے اپنی ۲۳ سالہ مختصر حیاتِ طیبہ میں غلبۂ دین، اقامتِ دین فریضہ امر بالمعروف ونھی عن المنکر اور تمکین دین کے لئے مسلسل جہاد فرمایا۔ اور آپ کی تیار کردہ صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت کا وظیفۂ زندگی بھی اقامتِ دین رہا۔ انہوں نے دینِ حق کو غالب کرنے کے لئے رسولِ کامل کا دست و بازو بن کر جدوجہد کی۔ اس راہ میں دکھ جھیلے، سختیاں سہیں، ماریں برداشت کیں۔ اور اس راستے میں آنے والی مخالفتوں کے کانٹے اپنی پلکوں سے چنے۔ منکرین کے بچھائے ہوئے ان کانٹوں کو اپنے مقدس لہو کے قطروں سے سیراب کیا اور اللہ کی زمین پر اس کے دینِ حق کے پرچم کو بلند کر دیا "جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" اور "وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا" کی فضا قائم کر دی۔ فصلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

یہ ہیں وہ احساسات وجذبات جو رسولِ کامل سے عملی تعلق استوار کرنے کے لئے امیر محترم کے سیرت کے خطابات کے بعد راقم الحروف کی طرح ہزاروں فرزندانِ توحید کے قلوب میں جاگزیں ہوئے۔ اس کے بعد یہ بات بغیر کسی جھجک کے کہی جا سکتی ہے کہ جس عظیم المرتبت ہستی نے اپنی امت کے سامنے عملی نمونہ اور اسوۂ حسنہ پیش فرمایا ہو اس کی بارگاہ عالی میں گفتار کے چند رسمی مظاہرے خراجِ عقیدت اور محبت نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ نبی رحمتؐ سے حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم عملی مسلمان بنیں اور اپنے تن من دھن کو ہادیٔ عالمؐ کے مشن کی تکمیل کے لئے لگا دیں۔

علاوہ ازیں امیر محترم نے تین دن سورۂ شوریٰ کے کچھ منتخب مقامات کا درس بھی دیا۔ ۱۳ دسمبر سے ۱۵ دسمبر تک دروس کا یہ سلسلہ بعد نماز عشاء مسجد جامع الصفا عقب الاعظم اسکوائر میں جاری رہا۔

۱۶ دسمبر کو دہلی مرکنٹائل سوسائٹی میں امیر محترم نے اجتماعِ جمعہ سے خطاب فرمایا اور ازاں بعد اپنے ایک رفیق اقبال صاحب اور ایک دوسرے رفیق کا نکاح مسنون بھی پڑھایا۔

رفقاءِ تنظیم اسلامی کراچی کے لئے ایک تربیتی پروگرام بھی ہوا۔ یہ پروگرام ۱۷ دسمبر سے ۱۹ دسمبر تک صبح ساڑھے نو بجے سے نماز ظہر تک کے اوقات میں ہوتے رہے۔ دو دنوں میں امیر محترم نے "تنظیم اسلامی کی قرار دادِ تاسیس" اور "نبی اکرمؐ کا مقصد بعثت" نامی کتابچوں کا مطالعہ کروایا۔ تیسرے دن سوالات وجوابات کی نشست ہوئی۔ واضح رہے کہ تربیتی پروگرام بھی مسجد جامع الصفا میں منعقد ہوئے۔

۲۰ دسمبر کو دفتر تنظیم اسلامی میں بعد نماز عشاء امیر محترم کے ساتھ خصوصی نشست کا انعقاد ہوا۔ سوال وجواب کے بعد اٹھارہ افراد نے فرمانِ نبویؐ "امرکم بخمس بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ" کی تعمیل میں امیر تنظیم اسلامی کے ہاتھ پر سمع وطاعت کی بیعت کی۔ اسی نشست کے

ساتھ امیرِ محترم کی کراچی میں مصروفیات اختتام پذیر ہوئیں اور دفتر ہی سے موصوف لاہور مراجعت کے لئے تقریباً ۱۲ بجے شب ہوائی اڈے روانہ ہوئے۔

دو دن کے وقفے کے بعد ۲۲ دسمبر کو پھر امیرِ محترم سابق رئیس بلدیہ حیدر آباد مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب کی دعوت پر لاہور سے حیدر آباد تشریف لے گئے اور مولانا موصوف کے مدرسہ جامعہ سبیلا میہ واقع ٹھنڈی سڑک حیدر آباد میں سیرت النبیؐ کے حوالے سے مفصّل خطاب فرمایا۔ معاون خصوصی برائے نائب امیر صوبہ سندھ سید واحد علی رضوی صاحب بھی امیرِ محترم کی آمد پر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ رضوی صاحب کے ساتھ عجیب حادثہ پیش آیا۔ حیدر آباد جانے کے لئے اپنی موٹر سائیکل پر نائب امیر جناب ڈاکٹر تقی الدین احمد صاحب کے گھر روانہ ہوئے تاکہ ان کی معیت میں حیدر آباد جائیں۔ اپنی رہائش گاہ واقع ڈیفنس سوسائٹی سے نکلنے کے بعد بمشکل تمام آدھا میل گئے ہوں گے کہ موٹر سائیکل سلپ (SLIP) ہو گئی اور آپ گر پڑے۔ نتیجتاً بازو میں چوٹ آ گئی لیکن ایمان کی حرارت انہیں اپنے مشن سے باز نہ رکھ سکی اور وہ اسی حالت میں حیدر آباد پہنچ گئے۔ وہاں پر جا کر انہیں تکلیف کی شدت کا احساس ہوا۔ چنانچہ دوسرے دن کراچی واپسی پر جب ایکسرے ایا گیا تو معلوم ہوا کہ بازو فریکچر ہے۔ جب انسان کو اپنے مقصدِ حیات سے اس قدر لگن ہو جاتی ہے تو وہ اں واقعتاً ایسے فریکچر کا احساس نہیں ہوتا۔ اگر احساس ہوتا تو بلال حبشی رضی اللہ عنہ اپنے سینے پر منوں کا پتھر تپتی دھوپ میں لیٹ کر برداشت نہ کرتے اور احداحدٗ کی صدا ہرگز نہ لگاتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے مقصدِ حیات سے ایسی لگن نصیب فرمائے۔

۲۳ دسمبر کو امیرِ محترم دوبارہ شہر کراچی تشریف لائے۔ اور جامع مسجد ابوبکر صدیقؓ واقع ڈیفنس سوسائٹی میں اجتماعِ جمعہ سے خطاب فرمایا اور ہزاروں فرزندانِ توحید نے آپ کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا کی۔ نمازِ جمعہ کے بعد اسی مسجد میں سوالات وجوابات کی مجلس ہوئی۔ یہ علاقہ تعلیم یافتہ افراد کی آبادی ہے۔ جس میں فوج کے بڑے بڑے ریٹائرڈ آفیسرز رہائش پذیر ہیں۔ یہ محفل ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ ہر نوع کے سوال وجواب ہوئے۔ امیرِ محترم نے ہر سوال کا خندہ پیشانی سے تسلی بخش جواب دیا۔ اس مجلس میں تقریباً ڈیڑھ سو افراد شریک رہے۔ ہر ایک نے اس مجلس کی افادیت کا اعتراف کیا۔ مجلس کے اختتام پر امیرِ محترم قریب ہی کیپٹن کریم صاحب کے گھر تشریف لے گئے۔ بعدہٗ امیرِ محترم واحد علی رضوی صاحب کی عیادت کے لئے مع چند رفقاء ان کی رہائش گاہ پر تشریف لے گئے۔ اسی موقعہ پر واحد علی رضوی صاحب کے برادر آصف علی رضوی نے بیعت کی۔ ان کی اہلیہ محترمہ اور ہمشیرہ محترمہ نے بھی امیرِ محترم کے ہاتھ پر بیعت مسنونہ کی۔ واضح رہے کہ خواتین کی بیعت از روئے قرآن وسنّت ہے اور اس کا طریقہ بھی وہی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اختیار فرمایا تھا۔

حالیہ دورۂ کراچی کے موقع پر امیرِ محترم کا قیام جناب قاضی عبدالقادر صاحب کے ہاں تھا۔ قاضی صاحب شمالی ناظم آباد میں رہائش پذیر ہیں اور تنظیم اسلامی کے بیرونِ ممالک کے روابط کے سلسلے میں مصروفِ عمل ہیں۔ آپ نے گھر پر ہی دفتر بھی قائم کر رکھا ہے۔ رضوی صاحب کی عیادت کے بعد امیرِ محترم قاضی صاحب کے گھر تشریف لے گئے۔ جہاں پر مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے صاحبزادے صہیب حسن صاحب سے ملاقات طے تھی۔ اتفاق سے مولانا موصوف بھی تشریف لے آئے۔ اس طرح امیرِ محترم کا مولانا موصوف کے ساتھ تبادلۂ خیال ہوا۔ اسی شب یعنی ۲۳ دسمبر کو ہی امیرِ محترم امریکہ روانہ ہو گئے۔

امیرِ محترم دورۂ کراچی کے دوران رفقاء تنظیم اسلامی کراچی گزشتہ کی طرح سرگرمِ عمل رہے۔ پیرو گرا

حسب سابق شعبہ نشر و اشاعت کے تعاون سے عمدہ کاغذ اور بہترین ڈیزائن میں طبع کرائے گئے تھے اور شہر کے نمایاں مقامات پر چسپاں کرنے کے علاوہ انفرادی طور پر بھی لوگوں کو بذریعہ ڈاک بھیجے گئے تھے۔ حیدرآباد کے رفقاء نے بھی ان پروگراموں میں شرکت کی۔

خالقدینا ہال اور جامع الصفا میں مکتبہ بھی لگایا گیا۔ الغرض رفقاء نے بھرپور طور پر اپنی اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء

مرتب: ضمیر اختر خان، رفیق تنظیم اسلامی کراچی

کراچی کا مختصر دورہ !!

امیر محترم نے ۷ دسمبر سے ۱۹ دسمبر ۸۳ء تک کراچی میں قیام فرمایا تھا۔ اور ۱۹، ۲۰ دسمبر کی درمیانی رات کو شمالی امریکہ کے دعوتی دورے پر عازم سفر ہوئے تھے۔ جہاں سے ۱۹ جنوری ۱۹۸۴ء کو صبح مراجعت ہوئی تھی۔ ۱۹ تاریخ کو شام تک موصوف نے کراچی ہی میں آرام کیا۔ چونکہ قریباً بیس گھنٹے کے ہوائی سفر کے باعث کافی تکان ہوگئی تھی۔ اسی تاریخ کی شام کو امیر محترم لاہور تشریف لے گئے۔ سندھ میڈیکل کالج اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن نے امیر محترم سے ۲۲ جنوری ۸۴ء کی تاریخ کالج میں سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر تقریر کا وعدہ امریکہ جانے سے قبل لے رکھا تھا۔ لہٰذا موصوف ۲۲ جنوری کو دو روز کے لئے کراچی تشریف لائے۔ اس روز کالج میں اس موضوع پر تقریر کی جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے حوالے سے دعوت کے انقلابی جدوجہد کے پہلوؤں کو واضح کیا۔ اس اجتماع میں کالج کے طلبہ وطالبات کی کثیر تعداد بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوئی۔ چند پروفیسرز اور لیکچرار حضرات نے بھی شرکت کی۔ عام تاثر یہی تھا کہ تمام شرکاء نے اس نئے انداز واسلوب سے سیرت کے بیان کو کافی پسند کیا۔ اکثر شرکاء کا خیال تھا کہ سیرت کا یہ پہلو نہایت وضاحت اور مربوط طریقہ پر پہلی بار سامنے آیا ہے —— !!

اسی شام عصر سے مغرب تک ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں محترم جناب کیپٹن (ریٹائرڈ) عبدالکریم صاحب کے مکان پر امیر محترم نے ایک خصوصی نجی اجتماع کو خطاب کیا۔ جس میں چیدہ چیدہ اعلیٰ تعلیمیافتہ حضرات شریک تھے۔ اس تقریر میں بھی امیر محترم نے انقلابی اور اصلاحی یا سیاسی جدوجہد کے فرق کو واضح کرتے ہوئے سیرت مطہرہ کے انقلابی پہلو کو بیان کیا —— بعد نماز مغرب سوال وجواب کی مجلس رہی۔ جو نماز عشاء تک جاری رہی۔

۲۳ جنوری ۱۹۸۴ء کا زیادہ تر وقت ملاقاتوں میں صرف ہوا۔ جن میں امیر محترم کی ڈاکٹر سید سلمان ندوی خلف الرشید مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مدیر رسالہ ماہانہ "معارف" اعظم گڑھ یوپی (بھارت)، جناب زبیر صدیقی از مکہ مکرمہ اور بھائی یونس علی رفیق تنظیم اسلامی حال مقیم اسکندریہ (مصر) سے ملاقاتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر تین حضرات ان دنوں کراچی تشریف لائے تھے۔ ان ملاقاتوں میں مختلف دینی، ملی، ملکی، بین الاسلامی امور پر تبادلہ خیال ہوا۔

۲۴ جنوری کو صبح امیر محترم لاہور تشریف لے گئے۔ اس طرح ان دو دنوں کا مختصر دورہ اختتام پذیر ہوا۔

مرتب: قیم تنظیم اسلامی کراچی ——

گوجرانوالہ

گوجرانوالہ کو پنجاب کا ہی نہیں بلکہ پاکستان کے ایک مشہور صنعتی شہر کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے خصوصاً بجلی کے پنکھوں، کپڑا بننے کے [illegible] چھپائی اور ڈھلائی کی مشینیں بنانے میں یہ شہر کافی مشہور ہے پہلوانوں کی وجہ سے بھی اس شہر کو شہرت حاصل رہی ہے امیر تنظیم اسلامی اس سے قبل خطابات جمعہ و درس قرآن و دیگر تقاریر کے لیے وہاں تشریف لے جا چکے ہیں لیکن غالباً پچھلے دو سال سے اس کا موقع نہیں ہوا تھا۔ گوجرانوالہ کی ایک معروف سماجی شخصیت جناب چودہری عبدالباری صاحب کا امیر محترم سے شدید اصرار تھا کہ وہ ایک جمعہ کا خطاب گوجرانوالہ کے سیٹلائٹ ٹاؤن کی جامع مسجد میں فرمائیں۔ موصوف نے چودہری صاحب کی یہ دعوت قبول کر لی تھی اور امریکہ تشریف لے جانے سے قبل ہی، ۲۷ جنوری ۸۴ء کو وہاں جمعہ کو خطاب کرنے کا وعدہ فرما لیا تھا امیر محترم ۱۱ جنوری کو امریکہ سے واپس تشریف لائے تھے اور تقریباً سات جمعوں کی غیر حاضری کے بعد ۱۲ جنوری کو موصوف نے مسجد دارالسلام میں اجتماع جمعہ میں خطاب کیا تھا۔ اگلے جمعہ ۲۰ جنوری کا پھر ناغہ بھاری معلوم ہو رہا تھا لیکن ایفاء وعدہ بھی پیش نظر تھا چنانچہ امیر محترم ۲۷ جنوری کو چند رفقاء کے ساتھ بذریعہ کار گوجرانوالہ تشریف لے گئے۔

گوجرانوالہ سیٹلائٹ ٹاؤن کی جامع مسجد نہایت کشادہ اور وسیع و عریض ہے شاید یہ گوجرانوالہ شہر کی سب سے بڑی مسجد ہو۔ مسجد کے خطیب مولانا طلحہ قدوسی، مسجد کے امام جناب محمد عبداللہ صاحب نیز مسجد کی انتظامیہ اور شہر کے چند معززین نے مسجد کے صدر دروازے پر امیر محترم کا استقبال کیا چودہری عبدالباری صاحب مسجد تک رہنمائی کرنے کے لیے مقررہ وقت پر اپنی گاڑی کے ساتھ پل پر موجود تھے۔ مولانا طلحہ صاحب نے امیر محترم اور دیگر حضرات کیلئے ناشتہ کا اہتمام مسجد سے ملحق اپنے مکان پر کر رکھا تھا۔ یہ گویا نُزُل تھا جو مولانا موصوف نے بڑی ہی محبت کے ساتھ شرکاء میں پیش فرمایا۔ اس نشست میں امیر محترم اور ان کے درمیان مختلف دینی بزرگوں کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔

جامع مسجد میں خطاب کے لیے ساڑھے بارہ بجے کا وقت مقرر تھا چنانچہ وقت پر خطاب شروع ہوا۔ موضوع تھا "ہمارے ملکی، ملی اور دینی فرائض"۔ مسجد کا وسیع و عریض ہال اور قریباً اتنا ہی بڑا صحن حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ شرکاء کی تعداد چار ہزار کے لگ بھگ ہو گی وہاں کے لوگوں کا کہنا تھا کہ عیدین پر اس مسجد میں جو حاضری ہوتی ہے اس جمعہ میں شرکاء کی تعداد اس سے بھی متجاوز تھی۔ گوجرانوالہ کے علاوہ بہت سے دیگر شہروں کے لوگ امیر محترم کا خطاب سننے کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔ سب سے خوش آئند بات یہ تھی کہ شہر کے تقریباً ہر مسلک سے متعلق حضرات کی کافی تعداد موجود تھی اور یہ اجتماع اتحادِ مسالک کا ایک بہترین منظر تھا۔

امیر محترم نے خطبۂ مسنونہ اور ادعیہ ماثورہ کے بعد سورہ بلد کی آیت لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ اور حدیث شریف امرکم بخمس بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والہجرۃ والجہاد فی سبیل اللہ سے اپنی تقریر کا آغاز فرمایا اور تمہید کے طور پر

بتایا کہ اس دنیا میں انسان کو اللہ تعالیٰ نے مشقت میں پیدا کیا ہے یہ مشقت انسان کا مقدر ہے
کمیت و کیفیت میں تو فرق ہے لیکن انسان کو اس سے مفر نہیں ہے ہر انسان کو محنت و مشقت
کرنی ہوتی ہے۔ کوئی جسمانی محنت کرتا ہے تو کوئی ذہنی۔ چھٹکارا کسی کو بھی نہیں ہے
اس دنیا میں انسان پر ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ ہے جن میں تین ذمہ داریاں وہ ہیں جن کو پورا
کرنے کے داعیات اس کی جبلت میں ودیعت کیے گئے ہیں ان کے تقاضے اندر سے ابھرتے
ہیں جیسے بقائے ذات کے لیے معاشی جدوجہد بقائے نوع کے لیے شادی گھر گرہستی اور
سر چھپانے کے لیے ریں بسیرا۔

ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کسی وعظ و نصیحت اور تلقین کی ضرورت
نہیں پڑتی۔ تین ذمہ داریاں یہ ہیں جن کا تعلق اس کے شعور، ذہن اور فکر سے ہے ان کو
پورا کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ اُسے سمجھایا جائے۔ اس کے شعور، فکر اور ذہن
کو بیدار کیا جائے ان ذمہ داریوں کا تعلق ہے اس کی قوم، وطن اور دین سے۔ ہم پاکستانی
خوش قسمتی سے وہ قوم تھے کہ ہماری قومیت اسلام ہمارا وطن اسلام ہے اس لیے کہ ہم نے
پاکستان بنایا ہی تھا اس مقصد کے لیے کہ "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ" ۔ اور ہمارا دین
تو اسلام ہے ہی۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میں نے جان بوجھ کر یہاں "قوم تھے" استعمال کیا ہے ورنہ
حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں چیزیں ایک ہی ہیں اگر ہم دین کا کام کرتے یہاں فی الواقع اسلامی نظام
کا نفاذ ہوتا تو ہمارا ملک، ہمارا وطن پاکستان بھی مستحکم ہوتا اور بحیثیت قوم و ملت بھی ہم متحد
اور باہم شیر و شکر ہوتے۔ یعنی دین کے کام سے پہلے دو تقاضے بھی باحسن وجوہ پورے ہو جاتے
لیکن ہم نے اس سے اغماض برتا اور اعراض کیا اس کی ایک سزا تو اس صورت میں ہمیں مل
چکی ہے کہ علاقائی و لسانی قومیتوں نے سر اٹھایا جس کے نتیجہ میں پاکستان دولخت ہوا اور
مشرقی پاکستان ہم سے علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔ اور اب موجودہ پاکستان میں پنجاب کو چھوڑ
کر تین صوبوں میں علاقائی اور لسانی فتنے پروان چڑھ رہے ہیں جس میں سندھ کا معاملہ کافی
تشویشناک ہے۔ اگر ہم نے زبانی کلامی نہیں بلکہ خلوص و اخلاص کے ساتھ فی الواقع دین
کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کو ادا نہیں کیا تو پاکستان کا ایک باوقار، آزاد و خود
مختار ملک کے مستقبل کا مخدوش ہونا اس کا منطقی نتیجہ ہوگا۔ امیر محترم نے مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں
کو سادہ ترین انداز میں اس طرح پیش فرمایا ہے کہ جو شخص خود کو مسلمان کہتا ہے اس پر از روئے دین
تین ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

پہلی یہ کہ جب وہ خود کو مسلمان کہتا ہے ــــ تو فی الحقیقت وہ اللہ کا بندہ بنے اور
اس کے احکام پر کاربند ہو۔

دوسری یہ کہ وہ اس دین کو دوسروں تک پہنچائے۔

تیسری یہ کہ وہ اس دین کو عملاً ایک نظام حیات کی حیثیت سے قائم کرنے کی جدوجہد
سے ان ذمہ داریوں کی ادائیگی سے اگر وہ غفلت برتے گا تو وہ دنیا میں بھی بحیثیت فرد و قوم ذلت
سے دوچار ہوگا اور آخرت میں بھی خسران سے اُسے سابقہ پیش آئے گا۔
اس لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں زبانی کلامی خود کو مسلمان کہنا یا کہلوانا ہرگز کافی نہیں ہوگا چوں کہ وہ
خود مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ شرف اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا اب اگر وہ اس پر عمل پیرا نہ
ہوں تو دوہرے مجرم ہوں گے ایک نافرمانی کے دوسرے کفرانِ نعمت کے۔ ڈاکٹر صاحب نے
مزید فرمایا کہ دین کی طرف سے عائد کردہ جو ذمہ داریاں میں نے بیان کی ہیں ان کو ادا کرنے کیلئے
تین ذمہ داریاں اور ہیں جو بطور لوازم عائد ہوتی ہیں۔ وہ ہیں، تنظیم، تربیت اور جہاد۔ اس کے
بعد امیر محترم نے ان تینوں امور کو اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا۔ بعدہ امیر محترم
نے حدیث امرکم بخمس بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والہجرۃ والجہاد فی سبیل اللہ پر روشنی ڈالتے
ہوئے فرمایا کہ اسلام میں جماعتی زندگی کے بغیر زندگی بسر کرنا صحیح نہیں ہے۔ جماعت میں بھی وہ ہو
جس میں ایسا ڈسپلن ہو کہ فی المعروف امیر کے ہر حکم کی تعمیل ہو۔ سنو اور اطاعت کرو۔
جماعت کا مقصد ہو ہجرت وجہاد" پھر ہجرت کے وسیع ترین مفہوم کو بیان کرتے
ہوئے امیر محترم نے فرمایا کہ ہجرت یہ ہے کہ ہر اس فعل اور چیز کو چھوڑ دیا جائے جو اللہ کو ناپسند
ہو اس کی بلند ترین چوٹی یہ ہے کہ اگر ضرورت متقاضی ہو تو گھر بار اور وطن کو بھی چھوڑ دیا جائے اس کے
بعد امیر محترم نے جہاد کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی پہلی منزل اپنے نفس سے جہاد ہے
کہ اس کو اللہ کی اطاعت کا خوگر بنایا جائے۔ دوسری منزل یہ ہے کہ معاشرے میں جو بھی باطل
نظریات اور غلط افکار و اعمال پھیلے ہوئے ہیں ان کا مدلل ابطال کیا جائے اور اس کے لیے شمشیر
قرآنی کو بطور آلہ استعمال کیا جائے۔
تیسری منزل یہ ہے کہ اللہ کے دین کو بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے اور اس کا
نام ہے اقامتِ دین۔ اس کی بلند ترین چوٹی قتال فی سبیل اللہ ہے امیر محترم نے فرمایا کہ ان
کاموں کے لیے جو جماعت بنے اس کی تشکیل کا ایک ہی طریقہ کتاب وسنت اور تعامل سلف
سے ملتا ہے اور وہ ہے بیعت کا طریقہ:۔ اس مسئلہ پر بھی امیر محترم نے شرح وبسط کے
کے ساتھ روشنی ڈالی آخر میں امیر محترم نے فرمایا کہ میں نے تنظیم اسلامی کے نام سے انہی مقاصد کے لیے
ایک جماعت قائم کی ہے جس کو ایک انقلابی جماعت کا پیش خیمہ کہا جا سکتا ہے چوں کہ دین اگر کہیں آئے
گا تو وہ انتخابی سیاست کے ذریعہ نہیں بلکہ انقلابی عمل کے ذریعے ہی آئے گا۔
خطاب کے بعد شرکاء نے امیر محترم کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا کی۔ نماز کے بعد سوال وجواب کی
مجلس ہوئی جو ڈیڑھ گھنٹہ سے بھی زائد وقت جاری رہی اس میں تقریباً چار سو حضرات شریک رہے
امیر محترم نے ہر نوع کے سوالات کا خندہ پیشانی اور تحمل سے تشفی اور تسلی بخش جواب دیا۔ بعدہ دعا پر یہ
مجلس اختتام پذیر ہوئی۔ ہمارے رفقاء نے مسجد کے صدر دروازے کے ساتھ مکتبہ بھی لگایا تھا الحمد للہ

کہ گوجرانوالہ کے عوام نے اس میں بھی بھرپور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اور کثیر تعداد میں کتب اور کیسٹ خریدے۔ جناب چودھری عبدالباری صاحب نے دوپہر کے کھانے کا اپنے مکان پر انتظام کر رکھا تھا چنانچہ امیر محترم ان کے ساتھ تشریف لے گئے کھانے سے فارغ ہو کر امیر محترم اور لاہور سے جانے والے رفقاء نے اسی مسجد میں نماز عصر ادا کی بعدہ لاہور مراجعت ہوئی۔ فللہ الحمد والمنۃ

(مرتب) رحمت اللہ بٹر

(نائب امیر تنظیم اسلامی برائے پنجاب)

اسوۂ اخلاق

بدزبانی ذہن کا سرطان ہے

مطالعہ فطرت اور ایمان
ایک صاحبِ خیر کی فکر انگیز تحریر
شائع شدہ 'حکمتِ قرآن' مارچ، اپریل ۸۳ء
ڈاکٹر اسرار احمد
کی نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے
اور مندرجہ ذیل پتوں سے ھدیۃً طلب کی جاسکتی ہے
۱- مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶- کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور نمبر ۱۴
۲- پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۸۸ کراچی نمبر ۲

عطیہ: حاجی محمد سلیم

حاجی شیخ نور الدین اینڈ سنز لمیٹڈ (Exporters)
نمبر ۳۰۱، لنڈا بازار، لاہور ۔ ۳۰۶۴۶۸ / ۳۰۵۴۶۹

THE ORIGINAL

پاکستان کی
قومی بندرگاہ....
...پوری لگن کے ساتھ
قومی تجارت کے فروغ کے لیے
اپنی کوشش تیز سے تیز تر
کر رہی ہے۔
کراچی پورٹ ٹرسٹ
تجارت اور معیشت کی خدمت میں
کراچی پورٹ
پاکستان کی قومی بندرگاہ

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 33	MARCH 1984	No. 3

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن — لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ

ان شاء اللہ العزیز

وبفضل اللہ وعونہٖ

تنظیمِ اسلامی پاکستان

کا آٹھواں سالانہ اجتماع

۲۵ تا ۳۰ مئی ۸۴ء، قرآن اکیڈمی

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں منعقد ہوگا

(کراچی میں کوئی مناسب جگہ دستیاب نہ ہو سکنے کے باعث یہ تبدیلی کی گئی ہے)

تمام رفقائے تنظیم

ابھی سے شمولیت کے لیے رخصت وغیرہ کا
انتظام شروع کر دیں اور حتی الامکان سفر
کا بھی اجتماعی اہتمام کریں۔

المعلن

قمر سعید قریشی، قیم تنظیمِ اسلامی پاکستان

- سالانہ اجتماع میں تمام رفقاءِ تنظیمِ اسلامی کی شرکت لازمی ہے۔ اگر کوئی عذر ہو تو پیشگی معذرت ضروری ہوگی۔

- خواتین اگر بسہولت آسکیں تو مناسب ہوگا۔ پیشگی اطلاع سے انتظامات میں سہولت ہوگی۔

- مناسب یہ ہوگا کہ رفقاء ۲۵ مئی ۸۴ء نمازِ جمعہ مسجد دارالسلام میں ادا کریں۔ اور وہاں سے قرآن اکیڈمی تشریف لے آئیں۔

- سالانہ اجتماع کی پہلی نشست کا آغاز ۲۵ مئی ۸۴ نمازِ مغرب کے فوراً بعد ہوگا۔ اور رفقاء ۳۰ مئی ۸۴ بدھ بعد دوپہر واپس روانہ ہوسکیں گے۔

۵۔ اجتماع کے دوران تمام رفقاء (بشمول رفقاء لاہور) کا قرآن اکیڈمی میں رہائش پذیر ہونا لازمی ہے۔ معذرت کی صورت میں پیشگی تحریری درخواست ضروری ہوگی۔

۶۔ ضروریات کا مختصر سامان بمطابق موسم ہمراہ لانا ضروری ہے۔

۷۔ اگر کوئی رفیق کوئی تجویز پیش کرنا چاہے یا کسی مسئلہ پر اظہارِ خیال کرنا چاہے تو اسے ۳۰ اپریل تک تحریری شکل میں دفتر کو ارسال کر دے۔

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۳۳ | شمارہ ۴ | رجب المرجب ۱۴۰۴ھ مطابق اپریل ۱۹۸۴ء

مشمولات

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی
فون : ۸۵۲۶۱۱

سب آفس : ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نحمدہٗ و نصلی علٰے رسولہِ الکریم

اپریل ۸۴ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے ــــ ۲۵ مارچ سے محاضراتِ قرآنی کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ اُس کی اجمالی رپورٹ تو قارئین آئندہ ماہ کے شمارے میں ملاحظہ فرماسکیں گے۔ تاہم قارئین کے لئے یہ امر یقیناً اطمینان کا باعث ہوگا۔ کہ ان محاضرات کے مرکزی مقرر مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ بھارت سے تشریف لا چکے ہیں۔ ان محاضرات میں وہ قرآن حکیم سے متعلق مختلف موضوعات پر تین لیکچر دیں گے۔ جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

۱ - دعوتِ قرآن اور اس کا مخصوص اسلوب

۲ - تفسیر قرآن اور اس کے اہم اصول

۳ - مولانا ابوالکلام آزاد: سیرت و شخصیت ــ علمی و عملی کارنامے اور حضرت شیخ الہند کا ان سے خصوصی تعلق۔

علی گڑھ یونیورسٹی سے ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صاحب کی شرکت بھی بہت حد تک یقینی ہے ــ یہ تمام مقالے ان شاء اللہ میثاق یا حکمتِ قرآن کے صفحات میں قارئین کی نظر سے گزریں گے۔

ہمارا ملک ان دنوں جس طرح کے پریشان کن اور غیر یقینی حالات سے دوچار ہے اُن سے ہر باشعور شہری آگاہ ہے ــ اور ہر سوچنے سمجھنے والے شخص کے سامنے ایک بڑا سا سوالیہ نشان ہے کہ پاکستان کا مستقبل کیا ہوگا؟ مجھے یاد آیا کہ عنقریب لندن میں مقیم پاکستانی حضرات وہاں ایک کنونشن کا اہتمام کر رہے ہیں جس کا عنوان یہی ہے کہ What Future for Pakistan? ــ اس بار ۲۳ مارچ کو موقعہ کے مناسبِ حال والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے خطبہ جمعہ میں "اسلام اور پاکستان" کے موضوع پر تقریر کی ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں اس خطاب کے چیدہ چیدہ حصے شائع کئے جائیں گے۔

امیرِ تنظیمِ اسلامی کے شب و روز

گذشتہ شمارے میں سفرِ امریکہ کی روداد کے ساتھ بطور ضمیمہ امیرِ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہی کے قلم سے ' وطن میں شب و روز کے عنوان سے ۲۰ جنوری تا ۱۹ فروری ۸۴ء کے دعوتی دورے اور دروس و خطابات کی فہرست آگئی تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ یہ سلسلہ جاری رہے تو مفید و مناسب ہے۔ حسنِ اتفاق سے پرچے کی آخری تیاری آج ۲۰ مارچ کو ہو رہی ہے۔ اس مناسبت سے ڈاکٹر صاحب کے ۲۰ فروری تا ۱۹ مارچ تک کے ایک ماہ کے شب و روز ملاحظہ فرمائیں !!

(رفیق تنظیمِ اسلامی)

---

۲۰ تا ۲۲ فروری ● قیام لاہور

۲۳ فروری، جمعرات ● گوجرانوالہ ● ساڑھے گیارہ تا ایک بجے، تقریر سیرت النبیؐ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ ظہر تا عصر تقریر "تنظیم اسلامی کی دعوت" جامع مسجد سیٹلائٹ ٹاؤن ظہر تا عصر۔ بعد عصر دس حضرات کی تنظیم میں شمولیت کے لئے بیعت۔

۲۴ فروری، جمعہ ● لاہور ● خطبہ جمعہ مسجد دارالسلام باغ جناح

بعد مغرب تقریر مسجد باغ والی شاہ عالم چوک "ختم نبوت و تکمیل نبوت"

۲۵، ۲۶ فروری ● قیام لاہور

۲۷ فروری، سوموار ● حویلی لکھا ● عصر تا مغرب خطاب جامع مسجد بلقیسیہ

بعد عشاء تقریر "سیرت النبیؐ" زیرِ اہتمام بلدیہ حویلی

۲۸ فروری، منگل ● بعد نماز فجر درس و سوال و جواب کی ۲½ گھنٹے کی طویل نشست ـــــ ۲۲ حضرات نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی۔

۲۹ فروری، بدھ ● اکوڑہ خٹک ● ملاقات مولانا عبدالحق صاحب و مولانا سمیع الحق صاحب دارالعلوم حقانیہ

● پشاور ● بعد عصر تقریر "سیرت النبیؐ کا انقلابی پہلو" دارالعلوم مولانا راحت گل صاحب متصل یونیورسٹی

بعد عشاء تقریر "سیرت النبیؐ" جامع مسجد مہابت خان

یکم مارچ، جمعرات ● سوال و جواب مسجد مہابت خان ۱۰ تا ۱۲ بجے دن ـــــ بعد ازاں دفتر تنظیم اسلامی پشاور میں نشست جہاں ۱۲ حضرات نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی۔

۲ مارچ، جمعہ ● لاہور ● خطبہ جمعہ مسجد دارالسلام باغ جناح

بعد مغرب خطاب مسجد باغ والی "تکمیلِ رسالت اور اس کے تقاضے"

۳ مارچ، ہفتہ ● ایبٹ آباد ● تقریر بعد نماز عشاء "مسلمانوں کی دینی ذمہ داریاں"

۴ مارچ، اتوار ● صبح ایبٹ آباد میں سوال و جواب کی ایک طویل نشست

● راولپنڈی جامع مسجد میں شام کو مفصل خطاب

۵، مارچ، سوموار ● صبح اجتماع خصوصی رفقائے تنظیم اسلامی راولپنڈی / اسلام آباد

بعد مغرب درس قرآن کمیونٹی سنٹر آب پارہ اسلام آباد (سورۃ آل عمران کا آخری رکوع)

۶، مارچ، منگل ● **کوہاٹ** ● مفصل خطاب جامع مسجد حاجی بہادرؒ

۷، مارچ، بدھ ● ۱۱ بجے خطاب بار ایسوسی ایشن ــــ سہ پہر خطاب اجتماع خواتین ــــ بعد عشاء تقریر جامع مسجد کوہاٹ کینٹ

۸، مارچ، جمعرات ● صبح تفصیلی نشست سوال و جواب ــــ ۸ مردوں اور ۲ خواتین نے بیعت کی ــــ شام کو واپسی لاہور

۹، مارچ، جمعہ ● **لاہور** ● خطاب جمعہ مسجد دارالسلام ــ بعد مغرب درس قرآن، اجتماع عمومی تنظیم اسلامی لاہور (سورۃ مدثر کا نصف اول)

۱۰، مارچ، ہفتہ ● **کراچی** ● درس قرآن جامع مسجد یمین سوسائٹی بعد نماز عشاء

۱۱، مارچ، اتوار ● سوال و جواب کی نشست اور اجتماع رفقائے تنظیم اسلامی، دفتر تنظیم اسلامی میں

متعدد حضرات نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی۔

۱۲، مارچ، پیر ● **ٹنڈو جام** ● تقریر سیرت النبیؐ بعد نماز عشاء اٹامک ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

بعد فجر درس قرآن و نشست سوال و جواب (ٹنڈو جام)

۱۳، مارچ، منگل ● **ٹنڈو آدم** ● بعد عشاء تقریر سیرت النبیؐ

۱۴، مارچ، بدھ ● صبح نشست سوال و جواب، میونسپل لائبریری ٹنڈو آدم

● **حیدر آباد** ● بعد عصر اجتماع رفقائے تنظیم اسلامی۔

● **کوٹری** ● بعد عشاء تقریر سیرت النبیؐ۔

۱۵، مارچ، جمعرات ● **کراچی** ● خطاب جلسہ سیرت النبیؐ زیر اہتمام کالٹکس لمیٹڈ بعد مغرب

واپسی لاہور بذریعہ نائٹ کوچ

۱۶، مارچ، جمعہ ● **لاہور** ● خطاب جمعہ مسجد دارالسلام

● **فیصل آباد** ● بعد مغرب خطاب اجلاس پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن

۱۷، مارچ، ہفتہ ● دوپہر خطاب بار ایسوسی ایشن فیصل آباد

بعد عشاء مفصل خطاب مشتمل بر تنظیم اسلامی کی دعوت جامع فتح الدین عبداللہ پور فیصل آباد

۱۸، مارچ، اتوار ● مفصل نشست سوال و جواب جامع فتح الدین عبداللہ پور ـــــ ۱۱ حضرات نے تنظیم میں شمولیت اختیار

الھُدیٰ
(بترھویں نشست)

(مباحثِ ایمان)

قرآن کے فلسفہ و حکمت کی اساس کامل

سُورۃ فاتحہ

از : ڈاکٹر اسرار احمد

(۴)

السلام علیکم - نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم امابعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۵ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝

(آمین یارب العلمین)

"کل شکر اور کل ثنا کا سزاوار حقیقی اللہ ہے جو پوری کائنات کا مالک اور پروردگار ہے - بہت رحم فرمانے والا اور نہایت مہربان ہے - جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے - اے رب ! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرینگے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے -

اے رب ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی راہ ان کی جن پر تیرا انعام ہوا جو نہ تو مغضوب ہوئے کہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور جو نہ گمراہ ہوئے"

اے تمام جہانوں کے آقا ایسا ہی ہو)

مکرم ناظرین اور محترم سامعین!

سورۂ فاتحہ کے مطالعہ کے ضمن میں، جسے ام القرآن اور اساس القرآن بھی کہا گیا ہے اور جو ہماری نماز کی ہر رکعت کا جزو لاینفک ہے، ہم نے پہلی نشست میں چند بنیادی باتیں بطور تمہید کہی تھیں۔ جن میں یہ بھی عرض کیا تھا۔ کہ اس سورہ مبارکہ کی اگرچہ آیات سات ہیں لیکن نحوی اعتبار سے ان سات آیات سے تین مکمل جملے بنتے ہیں۔ پہلا جملہ ابتدائی تین آیات پر مشتمل ہے۔ ہم نے محدود وقت میں امکانی حد تک ان تین آیات پر مشتمل پہلے جملہ کے مفاہیم و مطالب پر دوسری نشست میں اور اس کی چوتھی آیت پر جو اس سورہ کی مرکزی آیت بھی ہے تیسری نشست میں غور کیا تھا — آج ہم اس مختصر وقت میں جو ہمارے پاس ہے۔ آخری تین آیات پر جو ایک مکمل جملہ پر مشتمل ہے غور کریں گے۔

فرمایا:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ؀ (آمین)

"(اے رب ہمارے) ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تیرا انعام ہوا۔ جو نہ تو مغضوب ہوئے کہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور جو نہ گمراہ ہوئے" (اے تمام جہانوں کے مالک! ایسا ہی ہو۔)

پہلی تین آیات کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوئی تھی کہ ایمان باللہ یا توحید اور ایمان بالآخرۃ یا معاد تک تو ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان عقل و فطرت کی رہنمائی میں از خود بھی رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ جس کے نتیجہ

ن ایک بے پناہ جذبہ عبادت و استعانت اس کے باطن میں ابھرتا ہے۔ لیکن یہاں تک صراطِ مستقیم یعنی زندگی بسر کرنے کے معتدل اور متوازن طریقہ کا معاملہ ہے وہاں انسانی عقل بالکل بے بس اور مجبور ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں بندہ سراپا احتیاج بن کر اور گھٹنے ٹیک کر ایک استدعا، ایک درخواست اپنے مالک کے حضور پیش کرتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ اے رب! ہماری رہنمائی فرما، ہمیں دکھا، ہمیں چلا اس راستہ پر جس میں کوئی کجی نہیں، کوئی ٹیڑھ نہیں، جس میں افراط و تفریط کے دھکے نہ ہوں جو ہمیں سیدھا تیری رضا تک پہنچانے والا ہو، جو ہمیں سیدھا آخرت کی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے والا ہو۔ لفظِ ہدایت عربی زبان کا ایک بڑا وسیع المفہوم لفظ ہے۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ راستہ دکھا دیا جائے، سوجھا دیا جائے۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ اس راستہ پر دل کو کھول دیا جائے، اس میں یہ بھی شامل ہے کہ انگلی پکڑ کر اس راستہ پر چلایا جائے اور اس میں یہ بھی شامل ہے کہ منزلِ مراد تک پہنچا دیا جائے ۔ یہ ہدایت کے مختلف مراحل ہیں۔ سورہ محمد میں فرمایا: وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۔ وہ لوگ جو ہدایت کے راستہ پر آتے ہیں، ہم ان کی ہدایت میں اضافہ کرتے ہیں اور انہیں ان کے حصہ کا تقویٰ عطا کرتے ہیں۔ سورۂ مریم میں فرمایا: وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ط اور اللہ ان لوگوں کی ہدایت اور راست روی میں اضافہ فرماتا ہے جو ہدایت اور راست روی کا راستہ اختیار کرتے ہیں ۔ یہ ہدایت مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہے، اس میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ اس کے تمام مدارج و مراحل مومنین صادقین کو طے کرا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی منزل مراد تک جا پہنچتے ہیں اور جنت میں داخلہ کے وقت ان کی زبانوں پر یہ ترانہ حمد جاری ہو جاتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۔ وہ سارا شکر و سپاس اور ساری تعریف و ثنا اللہ ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا۔ ہم خود راہ یاب نہ ہو سکتے تھے اگر

اللہ ہی ہماری رہنمائی نہ فرماتا تھا۔ اصلاً یہی عقل بنیاد ہے ایمان بالرسالت کی
چونکہ ہدایت الٰہی رسولوں ہی کے واسطہ سے بنی نوع انسان تک پہنچی ہے۔
اس لئے سورہ اعراف کی جو آیت ابھی میں نے آپ کو سنائی ہے اس کے آخر
میں کامیاب و بامراد مومنین کا یہ قول بھی نقل ہوا: لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ
رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۔ "ہمارے رب کے رسول واقعی حق لے کر ہی تشریف لائے تھے"۔

یہاں ایک اہم بات سمجھ لینی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ہمیں یہ مغالطہ نہیں
ہونا چاہیئے کہ وہ شخص جو بنیادی حقائق تک پہنچ چکا ہے۔ جس نے اللہ کو پہچان
لیا، اسی کی توحید کو پہچان لیا، اسی کی صفات کمال کو پہچان لیا، اسی
کی ربوبیت، رحمانیت و رحیمیت کا اعتراف کر لیا، اسی کے مالک یوم الدین ہونے
کا اقرار کر لیا۔ پھر اُسی کی بندگی اور پرستش کا عہد و پیمان کر لیا۔ اُسے گویا
معرفت الٰہی تو حاصل ہو گئی اب اُسے کون سی ہدایت مطلوب ہے، جس کے
لئے وہ دُعا کر رہا ہے کہ: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۔ پس معلوم ہونا
چاہیئے کہ ہدایت کا انسان ہر مرحلہ پر محتاج رہتا ہے۔ یہاں درحقیقت جس
احتیاج کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے وہ احتیاج یہ ہے کہ انسان اس دنیوی
زندگی کے مختلف معاملات میں جو نہایت پیچیدہ ہیں، ان مسائل میں جو باہم
گتھے ہوئے ہیں۔ ان میں اعتدال کی روش، ان میں متوازن طرزِ عمل کا محتاج
ہے۔ یہ انسان کی وہ ضرورت ہے جس کے لئے انسان ہمیشہ سے محتاج ہے
اور ہمیشہ محتاج رہے گا۔ اس لئے کہ یہ زندگی، اس کی پیچیدگیاں اس کے
گوناگوں تقاضے، اس کے مختلف مطالبے اور ان کا آپس میں تصادم۔ یہ
وہ ضرورت ہے کہ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ مجرد اپنی عقل اور
تجربے کی بنیاد پر وہ صراط مستقیم، وہ سواء السبیل، وہ متوازن اور معتدل
راستہ تلاش کر سکے کہ جس پر چل کر وہ زندگی کی سعادتوں سے پرسکون طور پر
ہمکنار ہو سکے۔ یہ ہے درحقیقت انسان کی ضرورت۔ یہ بات اچھی طرح
سمجھ لینی چاہیئے کہ جہاں تک ایمان کے بنیادی تصورات ہیں وہاں تک پہنچنے
کے لئے انسان اپنی عقل اور فطرت سے بھی رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے سورۃ لقمان کے دوسرے رکوع کے مطالعہ میں یہ بات ہمارے سامنے
آچکی ہے کہ توحید اور معاد تک انسان کی رسائی ہو جاتی ہے لیکن زندگی کی ان
پیچ در پیچ راہوں میں سیدھی راہ کی تلاش ، یہ انسان کے بس میں نہیں ہے ۔ یہاں
وہ مجبور ہے کہ گھٹنے ٹیک کر اپنے مالک سے درخواست کرے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ
الْمُسْتَقِيْمَ ۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں یہی واحد
راستہ (The only way) ہے ۔

اس بات کو چند مثالوں سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے ۔ پہلی مثال یہ ہے
کہ مرد اور عورت کے مابین صحیح توازن کے معاملہ میں تاریخ انسانی میں ہمیں
افراط و تفریط نظر آئے گی ۔ کسی معاشرے میں عورت بالکل بھیڑ بکری کی طرح
ایک مملوک کی حیثیت رکھتی ہے ، اس کی حیثیت جوتی کی نوک کے برابر بھی
نہیں ہوتی ۔ کہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عورت قلوپطرہ بن کر کسی ملک کی تقدیر
کا فیصلہ کر رہی ہے ۔ اس نے ملک کی تباہی و بربادی کا سامان فراہم کیا ہے ۔
مرد و عورت کے درمیان توازن اور عدل یہ عقلِ انسانی کے بس میں نہیں
ہے ۔ یہاں انسان اُس فاطرِ فطرت کی رہنمائی کا محتاج ہے جس نے مرد کی
تخلیق بھی کی ہے اور عورت کی بھی ۔ جو دونوں کے عواطف اور میلانات
کا جاننے والا ہے ۔ جو تہذیب و تمدن میں دونوں کے حقوق اور فرائض کا صحیح
صحیح تعین کر سکتا ہے کہ جس کی بدولت انسانی تمدن کی گاڑی دونوں پہیوں
پر ہمواری کے ساتھ سیدھی راہ پر آگے بڑھ سکے ۔

دوسری مثال فرد اور اجتماعیت کے باہمی تعلق و توازن سے متعلق
ہے ۔ اگر افراد کی انفرادی آزادی پر زیادہ emphasis ہوتا ہے ۔
ان کے حقوق پر زور دیا جاتا ہے تو پلڑا ایک جانب کو جھک جاتا ہے ۔ کہیں
ایسا ہوتا ہے کہ اجتماعیت اس طور پر مسلط ہو جاتی ہے کہ فرد اس کے نیچے
سسکنے لگتا ہے ، اس کے حقوق پامال ہو جاتے ہیں ۔ اس کو اجتماعیت
کے بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے ان کے مابین توازن قائم رکھنا واقعہ یہ ہے کہ
عقل انسانی اس کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ وہ ایسے صحیح نقطہ اعتدال کا تعین کر

سکے کہ جہاں فرد کے حقوق بھی برقرار رہیں۔ اس کی انفرادی شخصیت کے ارتقاء کے امکانات بھی موجود رہیں۔ پھر یہ کہ فرد کہیں بھی معاشرے کے لئے ایک مضر اور نقصان دہ عنصر کی حیثیت اختیار نہ کر سکے بلکہ ان دونوں کے مابین ایک مبنی بر عدل کامل توازن قائم ہو سکے۔ انسانی عقل اور تجربات ایسا نظام قائم کرنے سے یکسر قاصر ہیں۔ ان کے تجویز کردہ نظام لازماً افراط و تفریط سے دوچار ہوں گے۔

تیسری مثال۔ انڈسٹریل انقلاب (INDUSTRIAL REVOLUTION) کے بعد ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور وہ ہے سرمایہ اور محنت کے مابین صحیح توازن۔ اس میں اعتدال اور اس میں نقطہ عدل و قسط کی تلاش میں انسانیت کتنی سرگرداں ہے، وہ کیسے کیسے تجربے کر رہی ہے وہ روز روشن کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ کہیں وہ انفرادی ملکیت کی نفی کُلّی کی طرف جا رہی ہے جس سے انسان کی شخصی آزادی اور اس کی آزاد شخصیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ سرمایہ ایک بہت بڑے ڈکٹیٹر کی شکل اختیار کرتا ہے اور ایک سرمایہ دارانہ نظام معاشرے پر مسلط ہو جاتا ہے جسے فی الواقع Dictatorship of Capitalist کہنا چاہیئے۔ جس میں مزدور پس جاتا اور دب جاتا ہے۔ اس لئے ایک باعزت اور آسودہ زندگی بسر کرنا محال ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ پیچیدہ معاملات اور مسائل جن میں سے میں نے صرف تین مثالیں دی ہیں۔ واقعہ یہ ہے انسانی زندگی کے یہ مختلف تقاضے و مطالبے گوناگوں ان کے شعبے اور ان کے مابین تفاوت، ان کے مابین تصادم اور اس کو دور کرنے کے لئے توازن اور نقطہ عدل کا تعین کرنے سے انسان قاصر ہے۔ ان کے حل کے لئے جب بھی انسان سوچے گا وہ اپنے ظروف و احوال میں رہ کر سوچے گا۔ انسان جب بھی ان کا حل تلاش کرے گا وہ اپنی ذات کو علیحدہ کر کے کوئی معتدل راہ تلاش نہ کر پائے گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کی سوچ میں کہیں نہ کہیں کجی واقع ہو جائے گی۔ کسی نہ کسی طرف اس کا جھکاؤ ہو جائے گا اور صحیح، متوازن و عادلانہ نظام تجویز نہیں کر سکے گا۔

یہ صراطِ مستقیم، یہ سواء السبیل، یہ قصد السبیل، یہ سبیل السلام، قرآنِ مجید اس معتدل و متوازن راستے کو مختلف ناموں سے تعبیر کرتا ہے۔ سورہ فاتحہ میں اسے صراطِ مستقیم کہا گیا ہے۔ سیدھا راستہ۔ کہیں اسے سواء السبیل کہا گیا ہے کہیں صراط السوی، درمیان کا راستہ جیسے خطِ استوا ہے جو ہمارے کرۂ ارضی کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پس سواء السبیل وہ راستہ ہوگا جس میں کامل توازن ہو، افراط و تفریط نہ ہو، کسی ایک جانب جھکاؤ نہ ہو جائے۔ کہیں قصد السبیل سے تعبیر کیا گیا۔ ہموار راستہ جس میں اونچ نیچ نہ ہو۔ کہیں اسے سبیل السلام کہا گیا سلامتی کا راستہ جس میں امن و سکون ہو، ظلم و عدوان نہ ہو، تعدّی و استحصال نہ ہو۔

یہ ہے درحقیقت انسان کی وہ احتیاج جس کے لئے وہ گھٹنے ٹیک کر اپنے پروردگار کے سامنے استدعا کرنے پر مجبور ہے کہ: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔ اے میرے رب میں نے تجھے پہچان لیا، تیری توحید کو جان لیا، ادنیٰ درجہ میں مجھے تیری صفاتِ کمال کی معرفت بھی حاصل ہو گئی۔ میں نے یہ بھی جان لیا کہ مجھے مرنے کے بعد تیرے حضور میں حاضر ہونا ہے، میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ اُس دن اختیارِ مطلق تیرے ہاتھ میں ہوگا: يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ "وہ دن وہ ہوگا جب کسی جان کے لئے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا، اس دن کامل اختیار صرف اللہ کے ہاتھ میں ہوگا"۔ میں نے یہ ارادہ بھی کر لیا ہے کہ میں تیری ہی بندگی اور پرستش کروں گا اور اس کے لئے میں تیری اعانت اور امداد کا محتاج ہوں — لہٰذا اب میں تجھ سے دست بستہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ زندگی بسر کرنے کا وہ صراطِ مستقیم، وہ سواء السبیل، وہ سبیل السلام مجھ پر واضح فرما، مجھ پر کھول دے، مجھے اس کی ہدایت عطا فرما — اس کے لئے میرے دل کو انشراح بخش دے۔ مجھے اس پر چلنے کی توفیق دے — اس پر چلاتے ہوئے مجھے میری فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی کی آخری منزل تک پہنچا دے — یہی ایمان بالرسالت کی عقلی بنیاد ہے چونکہ ہدایتِ ربانی کو انسانوں

تک پہنچانے کے لئے رسولوں کی مقدس جماعت فائز ہوتی رہی ہے - وَ
لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ط اور اس سلسلۃ الذہب کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
خاتم النبیین آخری ہادی اور آخری کڑی ہیں -

اس کے بعد ایک قاعدہ بیان ہو رہا ہے جس سے ہم سب اچھی طرح
واقف ہیں - وہ یہ کہ جس چیز کی انسان کی نظر میں اہمیت ہوتی ہے وہ اسے
مزید کھولتا ہے، اُسے خوب واضح کرتا ہے - انسان کے دل میں جس چیز کی
محبت ہوتی ہے وہ اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے - لہٰذا اس صراطِ مستقیم
کی اہمیت کے لئے آگے اس کی وضاحت ہو رہی ہے : اِهْدِنَا الصِّرَاطَ
الْمُسْتَقِيْمَ لا صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ لا "اے رب ہمیں سیدھے
راستہ کی ہدایت عطا فرما، ان لوگوں کے راستہ کی جن پر تو نے انعام نازل
فرمایا جن پر تو نے فضل فرمایا" - یہ لوگ کون ہیں ؟ اس سورہ مبارکہ میں
اجمال ہے اختصار ہے - ظاہر بات ہے کہ یہاں ساری تفاصیل ممکن نہیں
تھیں - لیکن قرآن مجید کی تفسیر کا یہ اصول ذہن میں رکھیے کہ اَلْقُرْاٰنُ
يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا - "قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے -
اس پہلو سے اگر تلاش کیا جائے کہ 'اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ' کی تفسیر قرآن مجید میں
کہاں وارد ہوئی ! تو سورہ نساء کی یہ آیت سامنے آئے گی : وَمَنْ يُّطِعِ
اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ
النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ج وَحَسُنَ
اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ٥ " اور جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت پر کاربند ہو
جائیں، جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لیں -
پس یہ وہ لوگ ہیں جن کو معیت اور رفاقت نصیب ہوگی ان کی جن پر اللہ
کا انعام ہوا یعنی انبیاء کرام (علیہم السلام) صدیقین عظام شہداء کرام اور
صالحین اور کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آجائیں " یہ چار گروہ ہیں
مُنْعَمٌ عَلَيْهِمْ کے، یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام اور فضل ہوا - انبیاء
سب سے بلند سب سے اونچے، اعلیٰ مرتبت، ان کے بعد درجہ ہے حضراتِ صدیقین کا،

اس کے بعد تیسرے نمبر پہ آتے ہیں شہداء کرام ۔ پھر عام مومنین صالحین ہیں — اے رب ہمیں ان مُنعَم عَلَیہِم کے راستہ کی ہدایت بخش، ہمیں ان کے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرما ۔ ہمیں بالفعل ان کے راستہ پر چلا کر ان ہی کی رفاقت و معیت عطا فرمائے کہ ہم انہی کے ساتھ شامل ہو جائیں : اَلۡحِقۡنَا بِالصّٰلِحِیۡنَ ۔ ' اے پروردگار ہمیں ملحق کر دیجیو ان ہی کے ساتھ جو صالحین ہیں ۔ وہ بندے جن سے تو راضی ہوا ، جن پر تیرا انعام نازل ہوا ۔

اس مثبت انداز کے بعد ایک سلبی اور منفی انداز میں بھی وضاحت کی گئی : غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ ۔ جو نہ تو مغضوب علیہم میں شامل ہیں ، وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ؕ اور نہ ہی گم کردہ راہ ہیں اور غلط راہوں میں بھٹک رہے ہیں — درحقیقت یہ دو کیفیات ہیں جنہیں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ۔ ایک مغضوب علیہم ہے ۔ جو بہت ہی ناپسندیدہ ہے گویا جن کا ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا والا معاملہ ہے جب کوئی قوم یا امّت یا کوئی مجموعہ افراد یا کوئی انسان ہدایت کی راہ کو اپنے نفس کی شرارتوں کے باعث اور اپنی خواہشات و شہوات کا اتباع کرتے ہوئے جان بوجھ کر چھوڑ دے ۔ صداقت و ہدایت کی راہ سے جان بوجھ کر اعراض کرے اس سے مُنہ موڑے تو ان لوگوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے : مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ ۔ جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا ۔ لوگ حق کو حق اور باطل کو باطل جان کر بھی اپنے تعصبات کی وجہ سے اپنی خواہشات کی وجہ سے یا اپنے مفادات کی بنیاد پر حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کرتے ہیں تو وہ لوگ ہیں مَغضوب علیہم —

ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو مغالطوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کے معاملہ میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی نیکی کے جذبہ کے تحت وہ غلط راستہ پر چل پڑتا ہے ۔ اس گروہ میں چند لوگوں کا اچھا جذبہ غیر معتدل ہو کر کسی غلط صورت میں ڈھل جاتا ہے اس گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے ضَآلِّیۡنَ — وہ لوگ جو بھٹک گئے جو گم کردہ راہ ہیں وہ قافلہ جو اپنا صحیح راستہ بھول کر کسی دوسری جانب نکل گیا ۔ اس لفظ

ضالّ کا ایک دوسری صورت پر بھی اطلاق ہوتا ہے ۔ جو شخص تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہو اس کے اندر طلبِ ہدایت موجود ہو لیکن ابھی وہ غور و فکر کے مراحل طے کر رہا ہو اس کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی سورہ ضحیٰ میں اسی لفظ کا اطلاق کیا گیا : وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ہ " اے نبی آپ کو پایا آپ کے رب نے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں تو آپ پر ہدایت کا راستہ کھول دیا" آپ میں تلاشِ حقیقت کا جذبہ شدت کے ساتھ ابھارا تھا ۔ غارِ حرا کی خلوت گزینی اسی لئے تھی تو پروردگار کی جانب سے پردے اٹھا دیئے گئے وحی کا آغاز ہو گیا ۔

الغرض ضالین کا لفظ مغضوب علیہم کی بہ نسبت ہلکا ہے ۔ مغضوب علیہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے شرارتِ نفس کے طفیل اپنی خواہشات اور شہوات کے اتباع میں اور اپنے مفادات کے تحفظ میں حق کو جان بوجھ کر ترک کر دیا اور ضالین وہ ہیں جو یا تو کسی مغالطے میں راہِ حق سے کسی گمراہی کی طرف بھٹک گئے یا ابھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہیں مفسرین کے نزدیک مغضوب علیہم کی سب سے بڑی مثال یہود ہیں کہ جنہوں نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں، وہ کسی اندھیرے کے باعث نہیں کھائی ہیں، بلکہ اس وقت کھائی ہیں جبکہ سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا ۔ ان کے پاس اللہ کا کلام موجود، اللہ کی ہدایت موجود، اللہ کی شریعت موجود لیکن اپنی شرارتِ نفس کے باعث انہوں نے اس میں تحریفات کیں ۔ اس کے بجائے کہ اپنے آپ کو اللہ کی منشا کے مطابق ڈھال لیتے انہوں نے اللہ کے کلام اور اس کے قانون کو اپنی خواہشات کی منشا پر ڈھال لیا ۔ وہ جو علامہ اقبال نے ہمارے علماء سو کے لئے فرمایا ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

اس طرزِ عمل کی انتہا تک علمائے یہود پہنچے ہوئے تھے اور ان کے متبعین بھی مغضوب علیہم کے زمرے میں شامل ہیں ان کے متعلق قرآن آگے کہتا ہے :

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللهِ

"ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی، وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ۔"

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے حامل ہونے کے باوجود اپنی شرارتِ نفس کے باعث اس ہدایت سے روگردانی کی اور اپنی خواہشاتِ نفس کا اتباع کیا ۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت پر پیش پیش رہے ۔

سابقہ امم میں سے ضالین کی نمایاں مثال نصاریٰ ہیں یعنی متبعین حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۔ اس لئے کہ غلو میں انہوں نے حضرت مسیحؑ کا مقام بڑھایا ۔ فرطِ عقیدت میں انہیں اللہ کا بیٹا قرار دے دیا ۔ ساتھ ہی عملی طور پر بھی ان میں غلو آیا ۔ رہبانیت کی بدعت انہوں نے اختیار کی جس کے متعلق سورۃ حدید میں ارشاد ہوا : وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ـــــ

" رہبانیت کی بدعت خود انہوں نے اختیار کی ہم نے ان پر لازم نہیں کی تھی انہوں نے یہ اللہ کی رضا کے لئے کی تھی لیکن پھر وہ اس کی پابندی بھی نہ کر سکے جیسی کہ کرنی چاہیئے تھی " ۔ یہ درحقیقت ایک خلافِ فطرت نظام تھا جو انہوں نے خود اپنی مرضی سے اپنی نیکی کے جذبہ کے غلو اور اس میں غیر متوازن پابندیاں عائد کرتے ہوئے اختیار کر لیا تھا ۔ ان میں کچھ لوگ بہر حال ایسے باہمت نکلے جو ان پابندیوں کو نباہ گئے لیکن ان کی اکثریت ان پابندیوں کو نباہ نہ سکی ۔ نتیجۃً جو کچھ ہونا چاہیئے تھا وہ ہوا ۔ وہاں راہب خانوں کے تہہ خانوں میں ناجائز اولاد کے قبرستان بن گئے ۔ یہ سارا معاملہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے فطرت کے خلاف کام کیا ۔ چنانچہ مفسرین کے نزدیک سورہ فاتحہ میں مغضوب علیہم سے مراد یہود ہیں اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں ۔ ویسے اس مفہوم کو عام رکھا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں ۔ لیکن اگر اس کو ان دو نمایاں مثالوں سے سامنے رکھا جائے تو بھی بات درست ہے ۔

بہر حال یہ ہے تیسرا جزو سورہ فاتحہ کا جس میں انسان کی ایک احتیاج

[illegible] ہے - اللہ کی معرفت اس کی صفاتِ کمال کی معرفت، جزا و سزا
ن [illegible] معرفت اللہ کی بندگی و پرستش کا عہد و پیمان، اسی سے استعانت
و استمداد طلبی کا قول و اقرار یہاں تک تو عقل و فطرت کی رہنمائی میں انسان
خود بھی پہنچ جاتا ہے - لیکن جہاں وہ اللہ تعالٰے کی جس رہنمائی کا محتاج ہے
وہ یہ ہے کہ زندگی کی ان پُرپیچ وادیوں میں وہ سیدھا راستہ کونسا ہے - وہ
معتدل صراطِ مستقیم سواء السبیل کونسا ہے؟ جس پر چل کر وہ ٹھوکروں اور
افراط و تفریط کے دھکوں سے بچتا ہوا اپنی منزل مراد کو پہنچ جائے - اس
کے لئے وہ اپنے پروردگار سے دست بستہ ہو کر درخواست کرتا ہے :-
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ یہ ہے وہ حصہ جس کے
بارے میں اُس حدیث قدسی میں جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے یہ الفاظ وارد
ہوتے ہیں : هٰذَا لِعَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَاَلَ - "سورہ فاتحہ کا یہ حصہ
میرے بندے کے لئے ہے میں نے دیا اپنے بندے کو جو اس نے طلب کیا"
الطافِ خسروانہ اور انتہائی فضل و کرم کے انداز میں اللہ تعالٰے فرماتے ہیں کہ
لِعَبْدِيْ مَا سَاَلَ — واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیث قدسی اس سورہ مبارکہ
کے تجزیہ میں بھی بہت مفید ہے اور اس کی عظمت کو بھی بتمام و کمال اور
بحسن و خوبی ظاہر کر رہی ہے - یہ فطرتِ انسانی کی وہ ترجمانی ہے کہ اگر
واقعۃً کوئی شخص گہرے احساس و شعور کے ساتھ یہ الفاظ اس کے قلب
و ذہن کی گہرائیوں سے نکل رہے ہوں تو ان کی تاثیر کا عالم وہی ہے جو اس
حدیث قدسی میں وارد ہوا - اِدھر بندہ ایک ایک جملہ کہتا ہے اُدھر اللہ
کی طرف سے اس کا جواب ملتا چلا جاتا ہے بقول علامہ اقبال ؎

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
اُٹھتے ہیں حجاب آخر کرتے ہیں خطاب آخر

سورہ فاتحہ کے تیسرے اور آخری جزو کی قدرے توضیح و تشریح کے بعد
میں چاہونگا کہ وہ حدیث قدسی آپ دوبارہ سن لیں جس کا ان مجالس میں :

ذکر آیا ہے، حدیثِ قدسی یہ ہے :۔

عن ابی هریرة عن رسول الله صلی الله علیہ وسلم یقول الله تعالیٰ قسمت الصلوٰة بینی و بین عبدی نصفین فنصفها لی و نصفها لعبدی ولعبدی ما سأل اذا قال العبد الحمد لله رب العٰلمین قال الله حمدنی عبدی واذا قال الرحمٰن الرحیم قال الله اثنی علی عبدی واذا قال مٰلك یوم الدین قال مجدنی عبدی واذا قال ایاك نعبد وایاك نستعین قال هذا بینی وبین عبدی و لعبدی ما سأل فاذا قال اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین قال هذا لعبدی ولعبدی ما سأل ۔ (رواہ مسلم)

یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ سورہ فاتحہ ایک نہایت خوبصورت اور انتہائی موزوں مقدمہ اور دیباچہ ہے قرآن مجید کا ۔ صراطِ مستقیم کی ہدایت کی وہ احتیاج جس کے لئے قرآن حکیم نازل ہوا چنانچہ اس سورہ مبارکہ کے فوراً بعد آغاز ہو جاتا ہے : الٓمّٓ ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۔ یہ ہے وہ کتاب جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے ۔ یہ کسی فلسفی کے اپنے خیالات، اپنے نظریات اور اپنے تخمین و ظن پر مبنی کتاب نہیں ہے یہ کسی فلسفی کے اپنے غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہے یہ کتاب وہ ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے یہ الحق ہے ۔ سراسر حق پر مبنی ہے ۔ یہ کتاب ان لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نازل ہوتی ہے ۔ جن میں سیدھے راستہ کی طلب موجود ہے جو اپنے پروردگار سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ تعالیٰ ان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرمائے ۔ یہ ہے درحقیقت اس سورہ مبارکہ کا پورے قرآن مجید کے ساتھ تعلق اور

ہمارے منتخب نصاب میں مباحث ایمان کے ذیل میں اس سورہ مبارکہ کے مطالعہ سے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ ایمان و معرفت الٰہی کے ضمن میں فطرتِ انسانی کہاں تک پہنچ سکتی ! انسان اپنی عقل کی رہنمائی میں کہاں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے ! یہ ہے وہ بات جسے علامہ اقبال نے کہا ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی قسمت میں پر حضور نہیں

عقل آستان سے دور نہیں ہے اس کی رہنمائی میں انسان بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے وہ فطرت صحیحہ اور عقل سلیمہ کی رہنمائی میں معرفتِ ربانی بھی حاصل کر سکتا ہے ۔ معاد کا اجمالی علم بھی اُسے حاصل ہو سکتا ہے ۔ لیکن جہاں وہ محتاج ہے وہ درحقیقت وہ ہدایت و رہنمائی ہے جو اُسے اپنی زندگی کے گوناگوں اور مختلف پہلوؤں میں ہر ہر لحظہ اور ہر ہر قدم پر عمل کے لئے درکار ہے ۔ اس ہدایت کے لئے وہ وحی آسمانی کا بالکلیہ محتاج ہے اسی کے لئے اس کی فطرت پکارتی ہے استدعا کرتی ہے ۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ اس فطرت کی پکار کا جواب ہے ۔ پورا قرآن مجید ۔

اللہ تعالےٰ ہمیں بھی صراطِ مستقیم ۔ کی ہدایت اور اس پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے ۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ط

توحید فی العلم یا توحید فی المعرفہ اور
توحید فی العمل یا توحید فی الطلب کا

فریضۂ اقامتِ دین

سے ربط و تعلق

ڈاکٹر اسرار احمد

کے خطاب و درس کی تیسری قسط

•

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا

حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿١٥﴾ وَالَّذِينَ
يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِيبَ لَهُ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿١٦﴾ اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ
الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ ۗ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ﴿١٧﴾
يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ
مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ ۗ أَلَا إِنَّ الَّذِينَ يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ
لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿١٨﴾ اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَهُوَ
الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿١٩﴾ مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ ۖ
وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ
نَصِيبٍ ﴿٢٠﴾ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ
اللَّهُ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۗ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢١﴾

حضرات و خواتین! کل ہمارا زیادہ وقت بعض تمہیدی باتوں کے بیان پر صرف ہوا۔ جن میں یہ امور شامل تھے کہ مکیات و مدنیات کس ترتیب سے مصحف میں آئی ہیں اور ان کے چھ بڑے بڑے گروپ کون سے ہیں! مکیات کے مشترک مضامین و موضوعات کیا ہیں! پھر ان گروپوں کے جو بنیادی و مرکزی مضامین ہیں ان کے جو عمود ہیں ان میں کیا فرق ہے! ان میں باہمی نظم اور ربط و تعلق کیا ہے! پھر خاص طور پر چار سورتوں، سورہ زمر، سورہ مومن، سورہ حٰم السجدہ اور سورہ شوریٰ میں وہ کون سا اہم مضمون ہے جو تدریجاً ترقی کرتا ہوا سورہ شوریٰ میں اپنے عروج کو پہنچا ہے ___ علاوہ ازیں میں نے سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ کے ایک حصہ کی کچھ تشریح و توضیح بھی بیان کی تھی۔ اس ضمن میں اس افسوسناک صورت حال کا بھی ذکر کیا تھا جس سے ہم اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے فی الواقع دوچار ہیں۔

صحیح معنوں میں آج باقاعدہ درس کا آغاز ہو رہا ہے۔ آج ہم کوشش کریں گے کہ ان نو آیات کا مطالعہ مکمل کرلیں جن کی آغاز میں، میں نے تلاوت کی ہے۔ ارادہ ہمارا ہے لیکن اس کے پورے ہونے

کا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر دار و مدار ہے۔ مصحف میں آپ دیکھیں گے کہ ان نو آیات میں سے تین آیات حجم کے اعتبار سے نسبتاً بڑی بھی ہیں اور جب مطالعہ شروع ہوگا تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ مضامین کے اعتبار سے بھی ان تین آیات کی بڑی اہمیت ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں نے کل عرض کیا تھا کہ اقامتِ دین کے موضوع پر یہ قرآن مجید کا ذروۂ سنام ہے 'CLIMAX ہے' چوٹی ہے۔ اب ہم اللہ کے نام سے درس کا آغاز کرتے ہیں۔ جن حضرات کے سامنے مصحف موجود ہیں وہ متن پر اپنی نگاہوں اور ذہنوں کو مرتکز فرمائیں۔ چونکہ اتنے بڑے مجمع میں ہر شخص کے سامنے مصحف ہونا ممکن نہیں ہے لہٰذا زیرِ درس حصّہ کی فوٹوسٹیٹ جملہ حاضرین میں تقسیم کرا دی گئی ہے تاکہ Text ان کے سامنے بھی رہے۔ اس لئے کہ درس اس کے بغیر نہیں ہوتا۔ اس کے بغیر تقریر ہوتی ہے۔ وعظ ہوتا ہے۔ درس کے لئے متن کا سامنے ہونا ضروری ہے تاکہ قرآن مجید کے جو الفاظ مبارکہ ہیں' جو درحقیقت کلام اللہ ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ ہمارا ذہنی تعلق قائم ہوتا چلا جائے۔ چونکہ کسی شے کو ذہن میں مستحضر اور یاد رکھنے کے لئے الفاظ کے ساتھ ——— Mental Association بنیاد بنتی ہے۔

آغاز ہوتا ہے : شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ سے۔ میں کل یہ عرض کر چکا ہوں کہ "لَكُمْ" میں خطاب کی جو ضمیر ہے یعنی کن سے بات کی جا رہی ہے ! مخاطب کون ہیں ! تو خطاب ہے اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام سے۔ میں نے کل اس بات کی بھی وضاحت کر دی تھی کہ پوری نوعِ انسانی اُمّتِ محمد ہے۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ فرق یہ ہے کہ جو لوگ آپؐ کی تصدیق کرتے ہیں' آپ پر ایمان رکھتے ہیں' آپؐ کو اللہ کا آخری نبی و رسول مانتے ہیں۔ خود کو آپؐ کی ذاتِ اقدس سے منسوب کرتے ہیں وہ اُمّتِ اجابت ہیں اور باقی تمام انسان اُمّتِ دعوت ہیں۔ نبی اکرمؐ کی بعثت ہوئی ہے پوری نوعِ انسانی کے لئے۔ حضورؐ کی بعثت سے لے کر تا قیامِ قیامت جتنے بھی انسان اس دنیا میں آئیں گے وہ سب آپؐ کی اُمّتِ دعوت میں شامل ہیں۔ لہٰذا فرمایا : شَرَعَ لَكُمْ : اب میں بغرضِ تفہیم اس کی ترجمانی یوں کروں گا کہ " اے اُمّتِ محمد ! علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام " مِنَ الدِّيْنِ : تمہارے لئے دین میں سے یا از قسم دین یا از جنس دین یا دین کے ضمن میں۔ یہاں آگے بڑھنے سے قبل لفظ شَرَعَ کے معنی سمجھ لیجئے ! " شَرَعَ " کے معنی ہیں ' کسی چیز کو مقرر کر دینا '۔ ہمارے یہاں عام طور پر استعمال ہوتا ہے ' یہ شارعِ عام ' نہیں ہے۔ یا سڑکوں کے نام ' شارع ' کے ساتھ لکھے جانے لگے ہیں۔ جیسے ' شارعِ فیصل ' راستہ اور سڑک چلنے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے۔ اس لئے شارع کہلاتا ہے۔ تو کسی چیز کا تعین اور مقرر ہو جانا لفظِ شَرَعَ کا اصل مفہوم ہے۔

اب میں متن' ترجمہ اور مختصر تشریح ساتھ ساتھ بیان کرتا چلا جاؤں گا۔ فرمایا شَرَعَ لَكُمْ

مِّنَ الدِّيْنِ ' مقرر کیا تمہارے لئے دین میں سے ' مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ' وہی کچھ جس کی وصیت کی تھی (اللہ نے) نوح (علیہ السلام) کو اور جس کی وحی کی ہم نے (اے محمدؐ) آپؐ کی طرف '۔ یہاں خطاب میں واحد کا صیغہ آگیا۔ اِلَيْكَ ' مراد ہیں شخصاً جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى ' اور جس کی ہم نے وصیت کی تھی ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو '۔ علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام ـــ کل میں نے عرض کیا تھا کہ ان پانچ رسولوں کا ذکر یہاں آیا ہے اکثر محققین کے نزدیک یہی پانچ رسول اولوالعزم من الرسل ہیں۔ ان میں اوّلین ہیں حضرت نوح علیہ السلام اور آخری ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ درمیان میں حضرت ابراہیم پھر حضرت موسیٰ پھر حضرت عیسیٰ علیہم السلام۔ یہاں پہلے اوّل و آخر کا ذکر آگیا پھر زمانی ترتیب کے ساتھ تین رسولوں کا۔ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ' کہ قائم کرو دین کو یا قائم رکھو دین کو ' یہ دونوں ترجمے ہوں گے۔ دین قائم ہو تو اسے قائم رکھو۔ قائم نہ ہو تو اس کو قائم کرو۔

اقامتِ دین کا حکم

اَقِيْمُوْا کا لفظ اَقَامَ ' يُقِيْمُ ' اِقَامَةً (مصدر) سے فعل امر جمع مذکر مخاطب ہے باب افعال سے معنی ہوں گے کسی چیز کو کھڑا کرنا یا کھڑا رکھنا۔ تفہیم کے لئے اگر خیمہ پر قیاس کریں تو اگر خیمہ کھڑا ہے تو کھڑا رکھا جائے گا اور اگر گر گیا ہے تو اسے کھڑا کیا جائے گا ـــ کھڑا ہے اور آندھی آرہی ہے طوفان آرہا ہے۔ تو اسے کھڑا رکھنے کا اہتمام ہوگا۔ کھونٹے مضبوط ہوں۔ رسّوں کو بعض اوقات مضبوطی سے تھام کر رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں خیمہ نہ گر جائے۔ پس خیمہ کھڑا ہے تو اُسے کھڑا رکھو۔ اور اگر گر گیا ہے تو کھڑا کرو۔ تو یہ دونوں مفہوم اَقِيْمُوْا کے فعل امر میں شامل ہیں یہ دونوں مفہوم اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ تراجم میں اگر یہ لفظی فرق آپ کو نظر آئے تو اس کی وجہ سے پریشان نہ ہو جائیں کہ ترجمہ کھڑا رکھو درست ہے یا کھڑا کرو درست ہے ـــ دونوں ترجمے درست ہیں ـــ دونوں مفاہیم اَقِيْمُوا الدِّيْنَ میں موجود ہیں۔ دین کو قائم رکھو یا قائم کرو۔

قابلِ غور مقام

آیت کے اس حصہ کے آخر میں فرمایا: وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ " اور اس کے بارے میں کسی تفرقہ میں مبتلا نہ ہو جانا "۔ یہاں فِيْهِ کا لفظ بہت اہم ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھنا ہوگا۔ اس مقصد کے لئے ' لفظ دین ' کو ایک مرتبہ پھر اچھی طرح جان لیجئے کہ ' دین ' کس کو کہتے ہیں! پھر میں عرض کروں گا کہ دین میں ...

کے معانی کیا ہوں گے ! کل میں نے دین اور تفرقہ کی تشریح میں کچھ عرض کیا تھا لیکن چونکہ اس سورۂ مبارکہ کا یہ عمود اور مرکزی مضمون ہے لہٰذا ہمیں ایک بار پھر ان کو اچھی طرح سمجھنا اور ذہن نشین کرنا ضروری ہو گا۔

لفظِ دین کی مزید تشریح

عربی زبان میں دین کا لفظ بنا ہے دَانَ یَدِیْنُ سے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں بدلہ اور جزا و سزا۔ جیسے سورۂ فاتحہ میں فرمایا: مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ "بدلے یا جزا و سزا کے دن کا مالک"۔ سورۂ ماعون میں فرمایا: اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُكَذِّبُ بِالدِّیْنِ "کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جو (آخرت کے) بدلہ اور جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے"۔ سورۂ انفطار میں فرمایا: كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ "ہرگز نہیں بلکہ (تمہارے اعراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ) تم بدلہ اور جزا و سزا (کے دن) کو جھٹلاتے ہو"۔ قرآن مجید کی ان تین آیات کے حوالے سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ان میں 'دین' کے معنی بدلہ اور جزا و سزا کے ہیں۔ یہ اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے۔ اسی معنی میں لفظِ 'دَین' آتا ہے۔ جس کے معنی قرض کے ہیں۔ آپ کسی کو کوئی چیز ہبہ کر دیں تو وہ واپس نہیں لی جاتی۔ وہ ہدیہ ہے، عطیہ ہے۔ دَین کیا ہوتا ہے! آپ نے کسی کو قرض دیا۔ اب اسے آپ نے واپس لینا ہے۔ دَین اور دِین میں حروف کا فرق نہیں ہے۔ دونوں میں د، ی، ن استعمال ہوتے ہیں۔ فرق پہلے حرف د پر زبر اور زیر کا ہے۔ حروف اصلی ایک ہی ہیں۔ ہبہ، ہدیہ، عطیہ۔ آپ اسے جو بھی کہیں وہ واپس نہیں ملتا جبکہ اس کے بالمقابل دَین واپس ملتا ہے۔ لہٰذا جزا و سزا عمل کا واپس آنا ہے۔ نیکی کی ہے بدلہ ملے گا جزا کی صورت میں۔ یہ اس عمل کا Re-bound ہے۔ اس کا واپس آ جانا ہے۔ بدی کی ہے تو سزا کی شکل میں بدلہ ملے گا۔ یہ بھی اس برے عمل کا واپس آ جانا ہے۔ پس دَین کے اندر بھی یہ بنیادی مفہوم موجود ہے۔ اس لفظ کا دوسرا بنیادی مفہوم ہے اطاعت[1]۔ اس کا تعلق بھی بدلہ اور جزا و سزا سے قائم رہتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جزا و سزا کسی قانون کے تحت ہی دی جاتی ہے۔ جنگل کا قانون ہو تو دوسری بات ہے لیکن مہذب اور متمدن معاشرے میں جزا و سزا کسی قانون کو مستلزم ہے۔ قانون کے مطابق کام ہو رہا ہو تو جزا ملے۔ تحسین ملے۔ اگر اس کے خلاف کام ہو رہا ہو تو سزا اور تعزیر ملے۔ پھر اس کے ساتھ کسی ایسی ہستی کا تصور لازماً ہو گا جو قانون دینے والی ہو، جس کی اطاعت کی جائے

---

[1] مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ اور مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ کے محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے خطاب میں جو حوالجات آئے تھے، ان میں "لفظ دین" اطاعت ہی کے معنوں میں آیا ہے۔ (مرتب)

جزا ملے اور اس کی نافرمانی کیجائے تو سزا ملے ۔۔۔ لفظ دین کے یہ بنیادی مفاہیم ہیں۔ فند زمانی کا ایک مصرع ہے۔ دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوا " جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا اس کا ہم نے بھرپور بدلہ لے لیا"۔ عربی کا ایک مقولہ ہے: كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ اس کے معنی بالکل وہی ہیں جو اردو کے اس محاورے کے ہیں "جیسا کروگے ویسا بھروگے" ہندی میں اسے 'کرنی کا پھل' کہا جاتا ہے ۔۔۔ ان بنیادی مفاہیم کی توضیحات سے یہ بات ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ "دین" کے اساسی معنی ہوئے 'بدلہ' ۔۔۔ جزا و سزا کی شکل میں کسی قانون اور ضابطہ کے تحت اور کوئی ہستی جو قانون دینے والی ہو جس کی اطاعت ہو تو جزا ملے نافرمانی ہو تو سزا ملے۔

قرآنی اصطلاحات یہ بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ عربی زبان تو نزولِ قرآن حکیم سے پہلے موجود تھی۔ اسی عربیٔ مبین میں قرآن نازل ہوا۔ پس عربی ہی کے الفاظ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کے لئے چن لیا اور معتد بہ الفاظ کے مفاہیم و معانی میں وسعت دے کر اصطلاحات کی شکل عطا فرما دی۔ جیسے لفظ صلوٰۃ پہلے بھی تھا۔ زکوٰۃ پہلے بھی تھا۔ صوم پہلے بھی تھا لیکن جب ان الفاظ نے قرآنی اصطلاحات کی شکل اختیار کی تو اب ان الفاظ کو جب اصطلاحاً بولا جائے گا تو اس کے معنی و مفہوم وہی پیشِ نظر رہیں گے جو قرآن مجید میں اصطلاحات کی صورت میں شامل کئے گئے ہیں۔ اسی طرح لفظ "دین" کو قرآن مجید نے اپنی ایک اہم اصطلاح بنایا۔ اب یہ اصطلاح کیا بنی؟ وہ یہ کہ:

"کسی ہستی کو مطاعِ مطلق مان کر اس کی کامل اطاعت کے اصول پر جو نظام زندگی بنے گا وہ اس ہستی کا دین قرار پائے گا"۔

غور سے سماعت فرمایئے کہ جہاں بھی کوئی نظام ہوگا وہاں پہلے یہ طے ہوگا کہ کون ہے مطاعِ مطلق؟ اور مختارِ مطلق! کون ہے اصل قانون ساز! کون ہے حقیقی مقنن۔ یہ طے ہو جانے کے بعد اس کی اطاعت کے اصول پر پورا نظام بنے گا اور قوانین مدون ہوں گے۔ اس کے جو احکام ہوں گے ان ہی کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معاملات چلائے جائیں گے۔ اس طرح جو نظام بنے گا وہ اس ہستی کا دین ہوگا۔

دین الملک مثال دے دوں کل کی تقریر میں اجمالاً میں اس کو بیان کر چکا ہوں ۔۔۔ بادشاہی نظام کیا ہے! بادشاہ SOVEREIGN ہے۔ حاکمیت اس کی ہے اس کی زبان سے نکلا ہوا لفظ قانون ہے۔ لہٰذا اس اصول پر جو نظام بنے گا اسے کہیں گے دین الملک۔ بادشاہ کا نظام۔ یہ لفظ قرآن مجید میں سورۂ یوسف میں آیا ہے، اس موقع پر جب حضرت یوسف

علیہ السلام اپنے بھائی بن یامین کو روکنا چاہتے تھے لیکن وہاں بادشاہی قانون نافذ و رائج تھا ــــ حضرت یوسفؑ مصر کے بادشاہ نہیں تھے بعض لوگوں کو مغالطہ ہو گیا ہے۔ بلکہ اس حکومت میں بہت بڑے عہدے پر تھے۔ وزیر خوراک کہہ لیں، وزیر خزانہ کہہ لیں۔ خود حضرت یوسفؑ نے بادشاہ سے کہا تھا کہ : قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ○ (یوسفؑ نے کہا ملک کے خزانے میرے سپرد کر دو، میں انتظام کروں گا۔ بندوبست کروں گا (اس قحط کے حالات کا جو بادشاہ وقت کو ایک خواب کی صورت میں دکھایا گیا تھا۔ جس کی صحیح تعبیر حضرت یوسفؑ نے کی تھی) میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں" ؎ تو معلوم ہوا کہ آنحضرتؑ ایک بہت بڑے عہدیدار تھے۔ چیف سیکرٹری کہہ لیجئے لیکن بادشاہ تو نہیں تھے۔ بادشاہ وقت کے خواب کی تعبیر بتا کر تو آپ جیل خانے سے رہا ہوئے تھے۔ چنانچہ وہاں شاہی نظام تھا۔ اس کی رو سے بلا کسی سبب کے کسی باہر کے شخص، کسی غیر ملکی (FOREIGNER) کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا ایک خاص شکل اللہ تبارک و تعالیٰ نے پیدا فرمائی۔ چنانچہ فرمایا:

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا	"اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر فرمائی
كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ	(ان کے لئے اپنے بھائی کو روکنے کے لئے
الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ	ایک سبب پیدا فرما دیا) اُس (یوسف)
(سورہ یوسف جز آیت ۷۶)	کے لئے بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی

قانون) کے تحت اپنے بھائی کو پکڑنا ممکن نہ تھا۔ الا یہ کہ اللہ ہی نے ایسا چاہا"

قرآن کے حوالے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بادشاہی نظام کو بھی قرآن "دین کہتا ہے اور یہ کہلاتا ہے " دین الملک "

دینِ جمہوریت موجودہ دور میں جمہوریت کی جس نیلم پری کی دنیا دیوانی ہے، کل کی تقریر میں اس پر میں مفصل اظہار خیال کر چکا ہوں۔ آج پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں۔ دیکھئے دین الملک اور دین اللہ تو قرآنی اصطلاحات ہیں۔ البتہ دینِ جمہور کی اصطلاح ہمیں قرآن و حدیث میں نہیں ملتی۔ چونکہ اس وقت جمہوریت کا زمانہ نہیں تھا۔ اس کا تصور موجود نہیں تھا لہٰذا کتاب و سنت میں دین جمہور کی اصطلاح کیسے آتی۔ ! اس لئے کہ جو چیز عوام کے ذہن اور ادراک میں سرے سے ہی نہیں، جس کا چلن تو چلن تصور تک موجود نہیں ہے اس کو قرآن و حدیث میں لا کر لوگوں کے ذہن پر بوجھ نہیں ڈالا گیا ہے۔ البتہ دو انتہائیں بیان فرما دیں۔ دین الملک اور دین اللہ۔ اب اس کے درمیان آپ خود خانہ پُری کریں۔ اس قدر گفتیم باقی فکر کن کے مصداق آپ خود Fill up the

...ملاحظہ کریں۔ آپ کو اوّل و آخر بتا دیا گیا۔ درمیانی کام آپ خود کیجئے۔ نظامِ جمہوریت کے ...ں و مبادی چونکہ وہی ہیں جو دین الملک اور دین اللہ کے ہیں تو ان پر قیاس کرتے ہوئے کہا ...ئے گا کہ جمہوریت فی الواقع ایک دین ہے۔

ہوا یہ ہے کہ جب مذہب کو انسان کی زندگی کا محض ایک نجی (Private) معاملہ بنا دیا گیا اور ...یت کا دور قریباً ختم ہوا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ نظام کے لئے انسانی ذہن کوئی راہ تلاش کرے اور ...ئی اصول وضع کرے۔ لہٰذا طے کیا گیا کہ ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملک میں SOVEREIGN ...یں۔ حاکمیت جمہور کی ہے، عوام کی ہے۔ قانون سازی اور نظام کی ہیئت، اس کے اصول و مبادی طے کرنے کا اختیار بالکلیہ عوام کو حاصل ہے۔ ان کے منتخب کردہ نمائندے پارلیمان یا اسمبلی میں کثرتِ رائے سے ہر نوع کا قانون بنانے کے مجاز و مختارِ کل ہیں۔ ان کے لئے کسی آسمانی شریعت و ہدایت اور کسی اخلاقی قدر کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ ان کے نزدیک فیصلہ کن اور حتمی و قطعی بات اپنے عوام کی پسند و ناپسند ہے۔ عوام کا منتخب ایوان مجاز ہے کہ اکیاون فیصد اکثریت سے جو چاہے قانون بنائے وہ لواطت جیسے مکروہ فعل کو بھی جائز قرار دیدے، وہ چاہے تو طے کر دے کہ دو مرد بھی شوہر اور بیوی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ ان کا یہ فعل قانونی طور پر رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا قرار پائے گا۔

یہ محض خیالی و نظری بات نہیں ہے۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ یہ سب کچھ طے کر چکی ہے۔ اس کریہہ فعل کو وہاں قانونی تحفظ حاصل ہے۔ پارلیمان چاہے تو شارع عام پر، پارکوں میں، کلبوں میں، ڈراموں میں اسٹیج پر جنسی فعل اور اختلاط کو جائز قرار دے دے جیسا کہ یورپ کے اکثر ممالک اور امریکہ کی اکثر ریاستوں میں اس فحاشی پر کوئی قدغن نہیں۔ بلکہ اس شیطانی فعل کو قانون کا تحفظ حاصل ہے ــــ وہ چاہے تو شراب نوشی، قمار بازی، سٹہ، لاٹری اور اسی قبیل کے منکرات کو تفریح یا ضرورت کا مقام دے کر قانونی طور پر جائز قرار دیدے جیسا کہ دنیا کے اکثر ممالک میں عملاً یہ ہو رہا ہے۔ یہ ہے اصل جمہوریت جس میں جمہور کے نمائندوں کو قانون سازی کے لامحدود اختیارات حاصل ہیں۔ ان پر کوئی تحدید (Limitation) نہیں ہے۔ چونکہ جمہوریت میں اصل حاکمیت (Sovereignty) عوام کی ہے اور اسمبلی ان عوام کی نمائندگی کرتی ہے ــــ اسلامی جمہوریہ کی بات چھوڑ دیجئے۔ اوّل تو فی الوقت صحیح معنوں میں یہ کہیں قائم ہی نہیں۔ اگر ہو گی تو ظاہر بات ہے کہ اس میں Legislative Assembly یا پارلیمنٹ کو اس محدود دائرہ میں قانون سازی کا اختیار حاصل ہو گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے ان کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔ اس میں بھی وہ شریعت کے کسی حکم سے نہ تجاوز کر سکتے ہیں نہ اعراض ــــ اسے لامحدود (Un-Limited) اختیارات کسی ...

... مفہوم ... گ...

قسط ۵

شِرک اور اقسامِ شِرک

شرک فی الصفات (۴)

از: ڈاکٹر اسرار احمد

دَورِ حاضر کا ہمہ گیر شرک

شیطان کے اغوا اور فریب نے جب سے انسان کو شرک میں مبتلا کیا ہے اس وقت سے شرک نے ایک طرح کے وبائی اور چھوت کے مرض کی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ دورِ جدید میں جن انواع و اقسام کے شرک موجود ہیں۔ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئے نہیں ہیں بلکہ یہ وہی ہیں جو زمانۂ قدیم سے چلے آ رہے ہیں یہ مشرکانہ نظریات و عقائد زمانے کے مطابق مختلف روپ اور بھیس بدلتے رہتے ہیں۔ پرانی شراب نئی بوتلوں میں نئے لیبلوں کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اور مختلف مذاہب میں یہ مختلف (SHADES) روپ دھار لیتے ہیں۔ مثلاً اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ایک نوع کے شرک میں مبتلا ہیں تو فلسفیانہ مذاہب دوسری نوع کے۔ وہ لوگ بھی جو کسی خالق (CREATER) کو مانتے ہیں تو اُس طرح نہیں مانتے، جیسا کہ اس کو ماننے کا حق ہے بلکہ وہ اُسے محرکِ اول، اور علت العلل کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ جو اس کائنات کی تخلیق کے بعد اس سے بے تعلق ہو گیا ہے اور اب یہ کائنات قوانین طبعی (PHYSICAL LAWS) کے تحت آپ سے آپ رواں دواں ہے۔ پھر یہ کہ فکر جدید نے اشیاء اور مادّہ کی تاثیر و خاصیت (PROPERTIES) کو بالفعل اس کا ذاتی اور مستقل وصف اور اس کو حقیقی (Real) تسلیم کیا ہوا ہے۔ جسے میں دَورِ جدید کے شرک سے تعبیر کرتا ہوں۔

مادّہ پرستی

ہمارے تبلیغی بھائی کہا کرتے ہیں کہ "امرِ حاضر کی پہچان ضروری ہے"، لہٰذا میں بڑے اعتماد اور وثوق کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ

دورِ حاضر کا ہمہ گیر شرک یہی مادہ پرستی ہے جس میں غیر مسلم ہی نہیں بڑے بڑے مدعیان توحید مبتلا نظر آتے ہیں — یہ اور بات ہے کہ جدید ذہن مادّہ پرستی کے لئے پوجا پاٹ اور پرستش کے جھنجٹ سے آزاد ہے۔ لیکن دورِ جدید کے نظریے کے مطابق مادّے کو حقیقی (REAL) مان لینا اور اس کی تاثیر، اس کے خواص اور اس کی صفات واوصاف کو بالذات تسلیم کر لینا اپنی روح کے اعتبار سے خالص مشرکانہ نظریہ ہے۔ اس کا واضح مطلب تو یہ ہوا کہ انسان نے مادّے کو اُسی مقام پر جا بٹھایا ہے، جہاں خدا کو ہونا چاہیئے۔ اس کے ذہن و قلب میں جو سنگھاسن خدا کے لئے تھا اس سے یا تو خدا کو بالکل بے دخل (DE-THRONE) کر دیا گیا ہے اور وہاں بالکلیہ مادّے کو براجمان کر دیا گیا ہے۔ بلا شرکتِ غیرے۔ جو الحاد ہے۔ یا پھر یہ کہ خدا بھی ہے لیکن ساتھ ہی مادّہ (MATTER) اور اس کی تاثیر، اور خواص واوصاف (PROPERTIES) کو بھی اسی تختِ خداوندی پر براجمان سمجھ لیا گیا ہے۔ جو سراسر شرک ہے۔ بدقسمتی سے آج مسلمانوں کی عظیم تر اکثریت بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر اسی نوع کے شرک میں مبتلا ہے زبان سے ہم میں سے کوئی بھی اس نوع کے شرک کا مقر نہیں ہوگا لیکن ذہن و قلب کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے تو ہمارا بھی حال کم وبیش یہی ہوگا کہ ہم مادّے اور اس کے خواص واثرات پر اور ذرائع ووسائل پر ذہنی طور پر اسی طرح یقین وتوکّل اور اعتماد رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم کو صرف خدا پر رکھنا چاہیئے جو توحید کا تقاضا ہے۔

میں نے جو بات اس تقریر کے بالکل ابتدا میں عرض کی تھی اس کو تازہ کر لیجیئے کہ ہمارا خدا سے جو ذہنی وقلبی اور عملی تعلق (ATTITUDE) ہونا چاہیئے اگر وہ ہی تعلق کسی اور سے قائم ہو گیا تو یہی شرک ہے۔ اس موقع پر مجھے سورۂ یوسف کی وہ آیت بھی پھر یاد آئی، جس میں دراصل مدعیان ایمان وتوحید کے اسی نوع کے شرک کی طرف اشارہ بھی نکلتا ہے۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ	"اُن میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں
بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ۝	لیکن اس طرح کہ اس کے ساتھ
(آیت ۱۰۶)	دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں"

اب آئیے اس نوع کے شرک کو چند مثالوں سے سمجھنا چاہیئے۔

توکّل ہمارے دین میں لفظ "توکل" کی بڑی اہمیت ہے ۔ یہ لفظ قرآن مجید میں مختلف صیغوں میں مختلف مقامات پر کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے، جن میں مسلمانوں کے لئے ابدی ہدایت و رہنمائی دی گئی ہے جس کو شرک سے اجتناب اور توحید پر ثبات کے لئے عروۃ الوثقیٰ کا مقام حاصل ہے ۔ بات کو سمجھنے کے لئے چند آیات بطور مثال پیش کرتا ہوں ۔ سورہ ہود میں فرمایا :-

اِنِّیْ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیْ وَرَبِّکُمْ ط مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا ط اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (سورہ ھود - ۵۶)

"میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی پیشانی (چوٹی) اس کے ہاتھ میں نہ ہو ۔ بیشک میرا رب سیدھی راہ پر ہے ۔"

سورہ ہود کی آیت نمبر ۸۸ میں فرمایا

وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ ط عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ ○

"میرا تمام انحصار اللہ کی توفیق پر ہے ۔ اُسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملے میں اُسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں ۔ "

سورہ یوسف میں فرمایا :-

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَعَلَیْہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ ○ (۶۷)

"اُس کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا ۔ اُسی پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کو بھی بھروسہ کرنا ہو اُسی پر بھروسہ کرے ۔ "

سورہ شوریٰ میں فرمایا

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْہِ مِنْ شَیْءٍ فَحُکْمُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ ط ذٰلِکُمُ اللّٰہُ

"تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اُس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے ۔ وہی اللہ میرا رب ۔

رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝ (۱۰)

ہے اُسی پر میں نے توکل (بھروسہ) کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔"

سورہ توبہ میں فرمایا :-

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (۵۱)

"ان سے کہہ دو" ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہل ایمان کو اُسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔"

سورہ تغابن میں فرمایا :-

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (۱۳)

"اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔"

سورہ فرقان میں فرمایا :-

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۭ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرَا ۝ (۵۸)

"(اے نبی) اُس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں اُسکی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اُسی کا باخبر ہونا کافی ہے"

سورہ یونس میں فرمایا :-

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝ (۸۴)

"اور موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ لوگو اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اُسی پر بھروسہ کرو اگر تم مسلمان ہو۔"

سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا :-

اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝

ہوشیار میرے سوا کسی کو اپنا وکیل (کارساز) نہ بنا

سورہ المزمل میں فرمایا:۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ (آیت ۹)

"وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے اس کے سوا کوئی الٰہ (معبود اور صاحبِ اختیار) نہیں ہے لہٰذا اسی کو اپنا وکیل (کارساز) بناؤ۔"

ان آیات کے مطالعے سے بادنیٰ تامل یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ "توکل" اس رویہ اور طرزِ عمل کو کہتے ہیں جس کا مفہوم "قلبی یقین و اعتماد ہے"۔ یعنی جس ہستی اور جس شے پر بھی ہمارا یہ بھروسہ ہوگیا کہ یہ ہماری حامی، دستگیر، پشت پناہ اور کارساز ہے۔ یہ ہمارے لئے از خود باعث نفع ونقصان ہے تو گویا اس ہستی یا شے کو ہم نے اپنا وکیل بنالیا اور اللہ تعالٰے کے اس حکم کی صریح خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے کہ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا "میرے سوا کسی اور کو اپنا وکیل نہ بنایا"

"توکّل" دراصل اس رویّے اور طرزِ عمل (ATTITUDE) اور نظریہ وخیال (IDEA) کو کہتے ہیں کہ جس کا مفہوم اعتماد اور بھروسہ (FAIT) ہے۔ اگر ہم کو پانی کے بارے میں یہ یقین ہے کہ پیاس بجھانے کی صفت اس کی ذاتی صفت ہے اور دائم و قائم رہنے والی ہے اور اسی نے میری پیاس بجھائی ہے تو اس نوع کا یقین شرک فی الصفات میں شمار ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ہم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں کہ پانی کی اپنی اور ذاتی کوئی تاثیر نہیں۔ اس کی تاثیر تابع ہے اذنِ ربّ کے ـــ پانی ہرگز پیاس نہیں بجھا سکتا جب تک اذنِ باری تعالٰے نہ ہو تو یہ توحید ہے۔ ایک عارف باللہ کا قول ہے کہ " ہر لقمہ جو انسان کھاتا ہے۔ معدے میں پہنچنے سے پہلے اذن رب کا طالب ہوتا ہے کہ میں اس کھانے والے کے لئے غذا بنوں یا زہر" اسی طرح ہر چیز کی تاثیر اذنِ رب کے تابع ہوتی ہے۔ پانی پیاس نہیں بجھا سکتا، آگ نہیں جلا سکتی، غذا مفید نہیں ہوسکتی، دوا کوئی اثر نہیں کرسکتی، جب تک اذنِ رب نہ ہو۔ اس یقین واعتماد کا نام توکّل باللہ اور ایمان باللہ ہے۔ یہی توحید ہے اور اس کے خلاف ہر نظریہ باطل اور شرک ہے۔ اسی خیال کو علامہ اقبال نے یوں

نہ کیا ہے ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی — مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

مادّی اشیاء کی تاثیر پر اعتماد اور مادّی اسباب و سائل پر بالکلیہ تکیہ اور بھروسہ دراصل اپنی روح کے اعتبار سے شرک ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ مادّی اسباب و وسائل، مال و اسباب اور ذرائع موجود ہیں تو بے فکری ہے دل کو مکمل اطمینان و سکون ہے اگر وہ حاصل نہیں یا ان میں کمی ہے تو دھڑکا لگا ہوا ہے، فکر ہے، بے چینی ہے۔ رات کا آرام اور دن کا چین اڑا ہوا ہے تو یہ نقد سزا ہے جو مادّی اسباب پر توکّل کی وجہ سے ہم کو اس دنیا میں ملتی ہے۔ حالانکہ ایمان کا لازمی نتیجہ "امن" یعنی اطمینان سکون ہے۔

بمصداق آیت قرآنی۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ط	"جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے آلودہ نہیں کیا، وہی لوگ ہیں جن کے لئے امن (سکون اطمینان) ہے اور وہی راہ یاب ہیں۔"
(الانعام ۸۲)	

حدیث میں آیا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں جو لفظ "ظلم" استعمال ہوا ہے، اس کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی یہ شرح و تفسیر فرمائی ہے کہ یہاں ظلم سے مراد "شرک" ہے اور اس کی تائید میں حضورؐ نے سورہ لقمان کی آیت ۱۳ کا یہ حصّہ پیش فرمایا ہے" اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ط"

حاصل کلام یہ ہے کہ مادّی اسباب و وسائل اور مادّے کے خواص و اوصاف اور اس کی تاثیر پر اعتماد شرک فی التوکّل ہے۔ چونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذاتِ باری تعالٰے کو جو حقیقت نفس الامری میں اصل مسبب الاسباب ہے، اس کے مقام رفیع سے ہٹا کر اس کی جگہ مادّے کو براجمان کر دیا گیا۔ انسان کی یہ ذہنی و قلبی کیفیت توحید کی عین ضد، خدا سے مہجوری اور اپنی روح کے اعتبار سے شرک

ہے اور یہی دور جدید کا ہمہ گیر شرک ہے جس میں کھلے مشرک کافر ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے مدعیان توحید مبتلا نظر آتے ہیں۔ الا ما شاء اللہ۔

سورہ کہف سے استشہاد

اس بات کو مزید سمجھنے کے لئے میں آپ کے سامنے سورہ کہف کے پانچویں رکوع کی آیات ۳۲ تا ۴۴ پیش کرتا ہوں۔ جس کے ترجمہ کے بعد قدرے تشریح میں آگے بیان کروں گا۔ فرمایا:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ
جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ
مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا
بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا
زَرْعًا ۝۳۲ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ
اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ
مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا
خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝۳۳ وَّكَانَ لَهٗ
ثَمَرٌ ج فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ
هُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ
مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ
نَفَرًا ۝۳۴ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ
وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ج
قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ
هٰذِهٖٓ اَبَدًا ۝۳۵ وَّمَآ
اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً
وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ
لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا
مُنْقَلَبًا ۝۳۶ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ

اور (اے نبیؐ) ان کو دو شخصوں
کی تمثیل سناؤ۔ ان میں سے
ایک کے لئے ہم نے انگوروں
کے دو باغ بنائے، ان کو کھجوروں
کی قطار سے گھیرا اور ان کے
درمیان کھیتی کے قطعات بھی
رکھے۔ دونوں باغ خوب پھل
لائے، ان میں ذرا کمی نہیں کی
اور ان کے بیچ بیچ میں ہم نے
نہر بھی دوڑا دی اور اس کے
پھلوں کا موسم ہوا تو اس نے
اپنے ساتھی سے بحث کرتے
ہوئے کہا 'میں تم سے مال میں
بھی زیادہ ہوں اور تعداد کے
لحاظ سے بھی زیادہ طاقتور
ہوں'۔ اور وہ اپنے باغ میں
اس حال میں داخل ہوا کہ وہ
اپنی جان پر آفت ڈھا رہا تھا۔
'اس نے کہا کہ میں یہ گمان نہیں

وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ
بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ
تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ
ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝۳۷
لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ
اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝
وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ
قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ
لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ
تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ
مَالًا وَّوَلَدًا ۝ فَعَسٰى
رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ
خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ
يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا
مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا
زَلَقًا ۝ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا
غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ
طَلَبًا ۝ وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ
فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى
مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ
خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا
وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ
بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ وَلَمْ
تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ

کرتا کہ یہ کبھی برباد ہو جائے گا اور
میں قیامت کے آنے کا بھی گمان
نہیں رکھتا اور اگر میں اپنے رب
کی طرف لوٹایا ہی گیا تو اس سے
بھی بہتر مرجع پاؤں گا۔ اس کے
ساتھی نے بحث کرتے ہوئے
کہا، کیا تم نے اس ذات کا انکار
کیا جس نے تم کو مٹی سے بنایا،
پھر پانی کی ایک بوند سے پھر
تم کو ایک مرد بنا کر کھڑا کیا ۔
لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے
اور میں اپنے رب کا کسی کو شریک
نہیں ٹھہراتا ۔ اور جب تم اپنے
باغ میں داخل ہوئے تو تم نے
یوں کیوں نہ کہا کہ یہ جو کچھ ہے
سب اللہ کا فضل ہے ۔ اللہ کے
سوا کسی کو کوئی قوت و قدرت
حاصل نہیں ۔ اگر تم مجھے مال و اولاد
کے اعتبار سے اپنے سے کم تر
دیکھتے ہو تو امید ہے کہ میرا رب
تمہارے باغ سے بہتر باغ مجھے دے
اور تمہارے باغ پر آسمان سے
کوئی ایسی آفت نازل کرے کہ
وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے۔
یا اس کا پانی نیچے اتر جائے اور تم

مُنْتَصِرًا ۝ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ط هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ۝

اس کو کسی طرح نہ پا سکو - اور اس کے پھلوں پر آفت آئی تو جو کچھ اس نے اس پر خرچ کیا تھا، اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گر پڑا تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ اے کاش! میں نے کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بنایا ہوتا - اور اس کے پاس نہ تو کوئی جتھا تھا جو خدا کے مقابلے میں اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود ہی اس آفت کا مقابلہ کرنے والا بن سکا -"

ان آیات کی شرح کے ضمن میں پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ محض تمثیل بھی ہو سکتی ہے اور کوئی حقیقی واقعہ بھی ہو سکتا ہے جو بطور تمثیل یہاں بیان کیا گیا ہے - جن مفسرین کی رائے میں یہ کسی حقیقی واقعہ کا بطور تمثیل بیان ہے - مجھے وہ رائے زیادہ اپیل کرتی ہے -

دوسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ ان آیات میں جو شخص صاحبِ حیثیت اور باغات کا مالک تھا - اس کے اس اسبابِ دنیوی کی نسبت اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے - "ہم نے اس کے لئے دو باغ بنائے " " ان کو کھجوروں کے درختوں سے گھیرا ان میں نہر جاری کی " - یعنی اس دنیا میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے گو اس میں اس کی اپنی صلاحیت، محنت اور تدبیر بھی شامل ہوتی ہے، لیکن اس محنت و تدبیر کا کامیاب و بارآور ہونا خالصتاً مشیت باری تعالےٰ کے تابع ہوتا ہے چونکہ امرِ واقعہ یہی ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ط اور يٰاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ط هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ " لوگو! تم پر اللہ کے جو احسانات ہیں انہیں یاد رکھو - کیا اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ کوئی معبود اس کے سوا نہیں، آخر تم کیوں دھوکہ کھا رہے ہو" - جب انسان اللہ سے غافل اور محجوب ہوتا ہے

تو وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ جو مال و منال، ساز و سامان اور اسباب دنیوی میرے پاس ہیں، وہ میری ذاتی کوشش، محنت، تدبیر اور صلاحیت کا نتیجہ ہیں۔ اسی گھمنڈ میں قارون بھی مبتلا ہوا تھا اس کے پاس جو لاتعداد دولت تھی، اس کو وہ اپنی مساعی و تدابیر کا ثمرہ سمجھتا تھا۔ یہاں جس شخص کا ذکر ہے اس کے دماغ میں بھی یہی خنّاس سمایا ہوا تھا کہ جو نعمتیں مجھے حاصل ہیں، جن اسبابِ دنیوی کا میں مالک ہوں، وہ میری قابلیت و صلاحیت کا ثمرہ ہیں۔ اسی پندار کی وجہ سے وہ قیامت کے بارے میں تشکیک میں مبتلا اور اس مغالطے میں گرفتار ہوا کہ اس کا مال و منال اور اس کی وجاہت و حیثیت اس کی ذاتی اور لازوال ہے۔

تیسری بات پر خصوصی توجہ دیجئے کہ اس کے ساتھی نے اس رویّے پر اس کے ساتھ جو محاورہ کہا اور بحث و تمحیص کی، وہ یہ ہے کہ یہ نظریہ اپنی روح کے اعتبار سے کفر ہے اور مال و اسبابِ دنیوی پر اس نوع کا اعتماد شرک ہے۔ اس مردِ مومن اور حق پرست نے کہا تو یہ کہا کہ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ حالانکہ اُس مردِ متکبّر نے کسی بُت یا کسی غیر اللہ کے معبود ہونے کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا۔

چوتھی بات جو اس تمام گفتگو کا حقیقی مآل ہے وہ یہ ہے کہ جب آفتِ سماوی نازل ہوئی اور بادِ سموم کا ایک جھونکا آیا، جس نے دیکھتے دیکھتے اس باغ کو جلا کر ویران کر دیا تو اس خدا فراموش نے کفِ افسوس ملتے ہوئے جو کہا وہ یہ ہے کہ وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ "اے کاش! میں نے کسی کو اپنے ربّ کا شریک نہ ٹھہرایا ہوتا"۔ غور کا مقام ہے کہ وہ "کس نوع کے شرک" پر اظہارِ تأسف کر رہا ہے۔ اس پورے رکوع میں کسی دیوی یا دیوتا، کسی لات و منات، ہبل کا ذکر نہیں ہے۔ وہ شرک یہی شرک ہے کہ اس نے مادّی اسباب و وسائل اور جاہ و وجاہت و حشمت کو اپنے ذہن و قلب میں اس سنگھاسن پر براجمان کیا تھا جو خالصتہً صرف اللہ ہونا چاہیئے تھا۔ پس معلوم ہوا کہ مال و اسباب اور جاہ و حشمت کو اپنی قابلیت و صلاحیت اور اپنی کوشش و محنت کا ثمرہ و نتیجہ سمجھ لینا، اپنے استحقاقِ ذاتی کا کرشمہ خیال کر لینا اور یہ سمجھ بیٹھنا کہ یہ چیزیں اس سے چھین نہیں سکتا۔ اور پھر ان چیزوں کو بذاتہ نفع بخش اور موثر سمجھ لینا۔ شرک

سی نوع کے شرک سے مردِ مومن وشاکر نے اظہارِ برأت کیا تھا اور اسی نوع کے شرک کے ارتکاب پر اس متکبر ناشکرے اور خدا کی ربوبیت کے نظام سے محجوب شخص نے اظہارِ افسوس وندامت کیا تھا ۔ توحید تو یہ ہے کہ بندے کو جو نعمت بھی ملے جو اسباب ووسائل بھی اس کو حاصل ہوں جس وجاہت وحشمت سے وہ نوازا جائے وُہ ان سب کو خدا کا فضل وعطیہ سمجھے اور اشیاء کے خواص واوصاف کو اذنِ ربّ کا تابع سمجھے اور یہ یقین رکھے کہ خدا جب چاہے اس نعمت کو چھین سکتا ہے اور جب چاہے وہ مادّی اشیاء کی تاثیر اور خواص کو سلب کر سکتا ہے ۔ اس کا رویّہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہر اُس نعمت پر جو اس کو حاصل ہے اور ہر شے کی اثر پذیری سے اس کی زبان پر ترانۂ شکر وسپاس جاری ہو ۔ اور وہ کہے الحمدللہ ۔ سُبحان اللہ ۔ ماشآء اللہ ۔ لا حول ولا قوۃ الّا باللہ ۔ یہ فروتنی اور عجز وانکساری اور سپاس گزاری توحید کے مقتضیات کے لوازم میں شامل ہے ۔ اس طرزِ عمل کے متعلق سورہ بنی اسرائیل کی دوسری آیت کے آخری حصّے کو پھر ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِيْلًا ؕ " میرے سوا کسی اور پر توکل نہ کرنا ۔ ذاتِ باری تعالےٰ کے سوا کسی اور پر توکّل ہے تو یہ شرک فی التوکّل ہوگا ۔ وہ چاہے افراد ہوں، اشخاص ہوں، صاحبِ اقتدار واختیار لوگ ہوں، مال واسباب دنیوی ہو، اشیاء کے خواص اور اس کی تاثیر ہو ۔ چاند اور سورج اور کواکب کی گردش اور کشش ہو موسموں کا تغیّر وتبدّل ہو ۔ اگر ان میں سے کسی کے ساتھ بھی اعتماد اور بھروسے کا ذہنی وقلبی رشتہ قائم ہو گیا تو یہ شرک فی التوکّل ہے اور یہ دراصل فرع ہے شرک فی الصفات کی ۔

مادہ پرستی ہی کا یہ شاخسانہ ہے کہ آج کے دور کے مغرب کے فکر وفلسفے سے مرعوب تعلیم یافتہ انسان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہے کہ یہ کائنات قوانینِ طبعی (PHYSICAL LAWS) کے تحت خود بخود رواں دواں ہے ۔ اور یہ پورا کا پورا نظام ثقل (کشش) اور ردِّ ثقل میں جکڑا ہوا ہے ۔ یہ سب کچھ مادّے ہی کا عمل اور ردِّ عمل ہے جس کے باعث مختلف فزیکل اور کیمکل تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں ۔ اس فکر ونظریے کے حامل اذہان میں قرآن مجید کا یہ فیصلہ بیٹھتا ہی نہیں کہ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ " (وہ اللہ ہی ہے)

جو آسمان سے زمین تک دنیا کے نظام کی تدبیر کرتا ہے"۔ اور نہ ہی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ ۚ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ "آگاہ رہو اُسی (اللہ) کی خلق ہے اور اُسی کا امر (حکم و نظم و تدبیر) ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ سارے جہانوں کا مالک اور پروردگار۔" ان کے ذہن میں اگر خدا کا تصور ہے بھی تو بس اتنا کہ کوئی ہستی کوئی قوت ایسی ہے جس نے اس کائنات کو پیدا تو کیا لیکن اب اس کا اس کائنات اور اس کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی ہستی یا قوت کو وہ محرک اوّل اور علت العلل کی اصطلاحات سے موسوم کرتے ہیں جیسا کہ میں اشارتاً پہلے بھی عرض کر چکا۔

الغرض مادہ پرستی ہی اس دور کا سب سے بڑا شرک ہے اور اس کے بارے میں میرا شدید احساس یہ ہے کہ خال خال وہ سعید لوگ ہوں گے جو ذہناً و قلباً اس نوع کے شرک سے محفوظ ہوں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اگر کبھی فضا میں DUST SUSPENTION) ہو جائے تو شاید ہی کوئی شخص ہو جس کے پھیپھڑوں میں کچھ نہ کچھ گرد نہ پہنچ رہی ہو۔ لہٰذا میرے نقطۂ نظر سے موجودہ دور میں جس شرک نے غبار کی شکل میں پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے وہ یہی شرک ہے۔ اور اس سے بچنا آسان نہیں اِلَّآ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ۔

عقلیت پرستی

اسی شرک فی الصّفات کے ضمن میں ایک اور مسئلے کو بھی سمجھ لیجئے۔ قرآن مجید نے جو توحید کی تلوار ایک مومن کے ہاتھ میں دی ہے، وہ ہر نوع کے شرک کو کاٹتی چلی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں اس سے پہلے بھی اور موجودہ دور میں بھی ایک اور گمراہی رہی ہے اور وہ ہے۔ عقلیت قدیمہ اور عقلیت جدیدہ (RATIONALISM) اپنی اصل اور بنیاد کے لحاظ سے تو یہ مادّہ پرستی ہی کی فرع ہے۔ لیکن اس نے ایک دوسرا لبادہ اوڑھ رکھا ہے، جس کو عقلیت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا ابتدائی حملہ اسلام اور مسلمانوں پر اُس وقت ہوا تھا جو جب یونان و ایران کے فلسفوں اور ارسطو کی منطق سے ہمارے چند "دانشور" دورِ اموی کے اواخر میں متاثر ہوئے اور جو دورِ عباسی میں بڑی شدّت کے ساتھ اپنے عروج کو پہنچا۔

اسی کو میں نے عقلیت قدیمہ سے تعبیر کیا ہے۔ عقلیت جدیدہ کا حملہ اِس دور میں اس وقت شروع ہوا جب مغرب کی عقلیت (RATIONALISM) سے آگاہی حاصل ہوئی۔ یہ عقلیت اسلام پر نئے اسلوب اور نئے ہتھیاروں سے حملہ آور ہوئی اور برصغیر پاک و ہند میں اس کے اوّلین نشانہ بنے۔ سرسید احمد خان مرحوم۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے۔ پاک و ہند میں اس عقلیت کے پہلے پرچارک تھے۔ اس عقلیت کی جڑ یہی مادّے کے خواص کو اٹل تسلیم کر لینا ہے اور یہ تسلیم کر لینا ہے کہ یہ خواص مادّے میں قائم و دائم ہیں اور یہ کبھی اس سے منفک نہیں ہو سکتے۔ کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے جو مادّے کی صفت کو اس سے زائل کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ "معجزات" کا انکار کیا گیا اُس وقت بھی اور اِس وقت بھی ––"معجزہ" کیا ہے، اس کو ایک دو مثالوں سے سمجھئے۔ قرآن مجید بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنا عصا سمندر پہ مارتے ہیں اور سمندر پھٹ جاتا ہے۔ پانی کی صفت تو یہ ہے کہ وہ اپنی سطح برقرار رکھتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عصائے موسوی کی ضرب سے پانی اپنی صفت ترک کر دے۔ ناممکن۔ محالِ مطلق۔ پانی اپنی صفت نہیں چھوڑ سکتا۔ لہٰذا کوئی تاویل کیجئے۔ اور وہ تاویل یہ ہے کہ بس مدّ و جزر کا کوئی معاملہ تھا۔ جزر کے وقت حضرت موسیٰ نکل گئے۔ مدّ کے وقت فرعون اور اس کا لشکر آیا اور وہ غرق ہو کر ہلاک ہو گیا۔ گویا کہ اُس وقت کے فرعون اور اس کے حواریوں کو مدّ و جزر کا وہ علم ہی حاصل نہیں تھا۔ جو ان لوگوں کو حاصل ہوا ہے، جو اس کی یہ تاویل کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید نے تو وہ الفاظ استعمال کئے ہیں، جس میں کسی تاویل کی سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے۔ فرمایا۔

فَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنِ	"پس ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ مار
اضْرِبْ بِّعَصَاکَ	اپنا عصا سمندر پر"۔ یکایک سمندر
الْبَحْرَ ط فَانْفَلَقَ فَکَانَ	پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک
کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ	عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔"
الْعَظِیْمِ ہ (الشعراء آیت ۶۳)	

غور کیجیے کہ قرآن تو یہ بتا رہا ہے کہ سمندر پھٹا اس شان سے کہ پانی دونوں اطراف
میں چٹانوں کی مانند کھڑا ہو گیا اور درمیان میں راستہ بن گیا۔ دنیا آج تک مدوجزر
کی اس کیفیت سے ناواقف ہے جس میں پانی چٹان کی طرح کھڑا ہو گیا ہو۔ کسی
تجربے اور مشاہدے میں یہ بات آج تک نہیں آئی۔ لیکن یہ تاویل کیوں کی گئی؟
اس کی بنیادی گمراہی کو سمجھیے، وہ یہی ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ پانی اپنی صفت کو
ترک کر دے؟ یہ بات سائنٹیفک تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے۔ مادّی قانون
گویا اٹل ہے اس کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ پس اس طرح تو درحقیقت مادّے کو
"خدا" کے مقام پر بٹھا دیا گیا۔ اگر یہ بات یقین کے درجے تک پہنچی ہوئی
ہوتی کہ مادّہ مخلوق ہے اور اس کی ہر صفت خدا کی عطا کردہ ہے اور وہ اسی
وقت تک رہے گی جب تک خدا چاہے گا۔ وہ حکم خداوندی کے تابع ہے۔ خدا
جب چاہے گا مادّے کے خواص کو سلب کر لے گا اور جب چاہے گا لوٹا دے گا۔
اس لئے کہ کسی میں اس کا کوئی ذاتی وصف ہے ہی نہیں۔ ومیرا مجھ میں کچھ نہیں۔
جو کچھ ہے سو تو ہے ۔۔۔ آگ میں حرارت اس کی ذاتی نہیں کہ وہ جلائے۔ گو عام
قانون یہی ہے کہ آگ جلائے گی لیکن اللہ تعالےٰ جب چاہے گا اس سے اس کی یہ
صفت سلب فرمائے گا۔ چنانچہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو اس نے نہیں جلایا۔
اس لئے نہیں جلایا کہ خدا کا حکم آگیا تھا کہ "قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ
سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (الانبیآء ۶۹)" ہم نے کہا اے آگ! ٹھنڈی
ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر" ۔۔۔ اور آگ نے اس فرمان کی تعمیل کی اور
وہ گل و گلزار بن گئی۔ اونٹنی سے اونٹ پیدا ہوتا ہے، اس کے لئے ایک قانون ہے
وہ گابھن ہوگی، اس پر کچھ عرصہ گزرے گا۔ پھر وہ بچہ جنے گی۔ لیکن یہ کیا کہ ایک
چٹان میں سے ایک گابھن اونٹنی برآمد ہو گئی اور اس نے بچھڑا جنا۔ یہ کیسے ممکن
ہے! لہٰذا اس کی بھی کوئی سائنٹفک توجیہ کرنی پڑے گی۔ مرد اور عورت کے جنسی
اختلاط سے بچہ رحم مادر میں قرار پایا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ بغیر باپ اور جنسی
اختلاط کے پیدا ہو گئے! اس کی بھی کوئی تاویل کرنی پڑے گی ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ
چھوٹے چھوٹے پرندے اپنی چونچوں میں چھوٹے چھوٹے سنگریزے لاکر برسائیں اور وہ ابرہہ

کے لشکر کو تہس نہس کر دیں ۔ محال مطلق ۔ لہذا اس کی بھی کوئی عقلی توجیہ کی جائے گی۔ یہ ہے عقلیت سے مرعوبی کا عالم ـــــ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کو عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ تسلیم کیا جائے تو قرآن میں بیان کردہ کسی معجزے کی کسی تاویل کی سرے سے حاجت ہی نہیں ـــ اس کے برعکس اگر کسی نے بیچارے خدا کو مانا ہے ۔ کسی ایسے خدا کو مانا ہے کہ جس کے ہاتھ اُسی کے بنائے ہوئے قوانین طبعی نے جکڑ دئے ہیں اور وہ ان میں تبدیلی نہیں کر سکتا تو ایسا عاجز "خدا" قرآن کا بتایا ہوا خُدا نہیں ہے یہ ذہنوں کا تراشا ہوا کوئی خدا ہے ۔

شرک فی الصفات کی بحث کو میں یہاں ختم کرتا ہوں ۔ اب شرک فی الحقوق یا شرک فی العبادت کے موضوع پر گفتگو ہوگی ۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس سے قبل آپ شرک فی الصفات کے ضمن میں بطور اصول میں نے جو نکات بیان کئے تھے۔ ان کو ذہن میں پھر تازہ کر لیجئے ۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے لئے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ، وہی الفاظ مخلوق کی صفات کے لئے بھی استعمال ہوئے ہیں لہذا ایک مغالطہ لازماً لاحق ہوتا ہے ـ اس مغالطہ و التباس سے محفوظ رہنے کی صورت یہ ہے کہ تین مابہ الامتیاز امور و نکات ذہن میں مستحضر رہیں جن میں :۔

- پہلا نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بھی اپنی ہے ۔ کسی اور نے اس کو وجود نہیں بخشا بلکہ وہ از خود موجود ہے ۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ۔
- دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی اس کی ذات کی طرح ذاتی ہیں کسی اور کی عطا کردہ نہیں ۔ اور وہ قدیم ہیں ۔ ہمیشہ سے قائم و دائم ہر لحاظ سے کامل و اکمل ۔ اور لازوال ولافانی اور ہر احتیاج اور ہر ضعف سے مبرّا اور منزہ ہیں ۔
- تیسرا نکتہ یہ ہے کہ ماسوا یعنی ہر مخلوق کی ذات بھی عطائی ، وجود بھی عطائی اور اس کی صفات، اوصاف، خواص اور تاثیر بھی عطائی نیز ناقص ، محدود ، خارجی اسباب کی پابند اور اذنِ رب کی تابع ۔

یہ تینوں امور اگر ذہن و قلب پر نقش کالحجر کی طرح ثبت ہو جائیں تو یہی توحید ہے اس میں مغالطہ اور التباس ہو جائے تو وہ شرک فی الصفات ہو جائے گا (جاری)

ولایت اور تقویٰ کا اصل تصورِ دینی

از: ملک اقبال واحد - فیصل آباد،

نحمدہٗ و نصلے علےٰ رسولہ الکریم

بُعدِ نبوّت سے جس طرح سے دین کی بیشتر اصطلاحات مظلوم ہو چکی ہیں، جیسے عبادت، جہاد فی سبیل اللہ، احسان، مراقبہ، ذکر و فکر کہ اُن کے معانی اور مفاہیم اپنے اصل معانی اور مفاہیم اپنے اصل مدلول سے بدل کر کچھ سے کچھ ہو چکے ہیں۔ اُن میں سے ایک اصطلاح ولایت و تقویٰ ہے۔ جو قرآن و سنت، ایمان و یقین کی ایک وسیع المعانی وسیع الاطراف اصطلاح ہے۔ تاریخ کے صدیوں کے خانقاہی تسلسل نے ولایت و تقویٰ کو ایک خاص مفہوم دے دیا ہے۔ جو عوام کے اذہان میں رچ بس گیا ہے۔ اُس کی صورت اس کا خاکہ اُس کا نقشہ اُن کے نزدیک یہ ہے۔ کہ ولی اور متقی ایک ایسا شخص ہے۔ جو عبوسًا قمطریرا ہو۔ چہرہ خشک اور تلخ ہو لمبی تسبیح، غلیظ بوریہ، بوسیدہ حجرہ۔ میلا کچیلا اور بوسیدہ لباس بدمزہ طعام بھری اور روکھی روٹیوں کے ٹکڑے، معاشرہ سے الگ تھلگ کسی قبر مشید کا مجاور بن کر بیٹھ جانا چلّہ کشیاں گنڈے اور تعویذ کا دھندا عرس اور میلے ہو حق کے نعرے وجد و حال سماع و قوالی پیری مریدی بے سر و پا گفتگو رطب و یابس اقوال شطحیات کلغی والی لمبی ٹوپی گیروانہ یا سبز چوغے دم درود پھونکیں مارنا گرد و پیش حاجتیں پیش کرنے والوں کا ہجوم اور اس ہجوم میں بے سر و پا حکائتیں اور روایتیں بیان کرنا۔ فرائض سے تساہل، نوافل کی کثرت، طہارت سے فرار اور گندگی سے پیار، یہ ہیں وہ معیارات جن پر عام طور پر جاہل تو جاہل بسا اوقات اچھے پڑھے لکھے لوگ ولائت اور تقویٰ کو ناپتے اور تولتے ہیں۔ حالانکہ قرآن و سنت میں دورِ رسالت

اس نوع کا تقویٰ اور اس نوع کی ولایت کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اثبات مدعا کے
قرآن کی سورہ یونس کی ایک ہی آیت کافی ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے۔
رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے نہ کوئی حزن ہے۔ اور وہ اللہ
ے دوست وہ ہیں جو ایمان لائے اور پارسائی اختیار کرتے ہیں۔ ایسے ہی
ں ہیں جن کے لئے دنیا و آخرت میں تبشیر ہے۔ اور ایسے ہی لوگ ہیں جو فوز عظیم
ے مالک ہیں" (پ ۱۲) تقویٰ کا اصل مفہوم ڈرنا بچنا ہیں۔ لیکن یہ ڈرنا اور بچنا وہ
ہیں ہے۔ جو آدمی کسی موذی جانور کو دیکھ کر بر بنائے وحشت ڈرتا ہے۔ یہ ڈرنا
ور بچنا وہ ہے۔ کہ خالق کائنات خالق انس وجان کے خوف و خشیت سے انس
محبت سے غفلت و جلالت سے آدمی اُن نواہی سے بچے جو اس کے پروردگار
کے نزدیک منکرات ہیں۔ اور ولائت یعنی دوستی یہ ہے۔ کہ اُن معروفات کو
اختیار کرے جو اُسکی خوشنودی کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ معروفات میں
سر فہرست جو شے ہے۔ وہ مجاہدہ مع النفس ہے۔ خدا کے دین کی راہ میں
جہاد بالمال ہے۔ جہاد بالنفس ہے۔ فرائض کا اہتمام شدت سے ہو کبائر سے اجتناب
شدت سے ہو اور یہ سب کچھ کسی غار کوہ میں نہ ہو۔ معاشرہ کے درمیان بیچ میدان
اُن کے ہو۔ گویا اس کی زندگی میں زندگی کے تمام امور و معاملات میں حاکمیت
سروری جہاں بانی کا کوئی مقام نہ ابلیس کے لیے ہو۔ نہ شیطان کے لئے نہ الہ نفس کے
لئے ہو نہ الہ سماج کے لئے ہو نہ الہ اقتدار کے لئے ہو وہ معاشرہ کا ایک مقید
فرد ہو۔ یہ اعتبار سیرت معاشرے میں ممتاز و نمایاں ہو۔ خدا کی اطاعت میں اللہ کی
آیت عمر میں پیکر اخلاص ہو پیکر محسوس ہو۔ مجاہدہ فی سبیل اللہ میں دعوت و عزیمت
کا کوہ ہمالیہ ہو۔ کلمۃ اللہ ہی العلیا کا کوہ طور ہو۔ حقوق عباد میں محبت و مروت رحم و
کرم شفقت و ہمدردی عدل و انصاف امانت و دیانت صدق۔ راستی غرضیکہ
اخلاق میں حسن اخلاق میں کردار میں حسن کردار میں معاملات میں سچا اور کھرا
ایمان ویقین میں منبع و سرچشمہ ایمان و یقین علم و فضل میں عبقری اقامت دین
اور اقامت حق کی جد و جہد میں اپنے اوقات اپنی تمام تر صلاحیتوں سے لے کر
نقد جان ہتھیلی پہ لئے پھرتا ہو۔ اُس کی تمام تر تگ و تاز سرگرمیاں دلچسپیاں

بس اس مرکز اور محور سے وابستہ ہوں۔ کہ خدا کی زمین پر خدا کا دین سربلند ہو غالب ہو متسلط ہو حکمران ہو اسی ایک مقصد کے لئے اسی ایک نصب العین کے سامنے اسی ایک آدرش کے لئے وہ مرتا اور جیتا ہو۔

دور رسالت میں دور صحابہ میں دور تابعین میں دور تبع تابعین میں بعد کے پندرہ صدیوں کے علم وفضل کے ادوار میں ولایت یہی تھی ولایت کا یہی مفہوم تھا۔ تقویٰ یہی تھا۔ تقویٰ کا انداز و مقام یہی تھا۔ کوئی امتیازی لباس نہیں تھا۔ کوئی امتیاز طرز بود و ماند نہیں تھی کوئی امتیازی شان نہیں تھی کوئی امتیازی کلام نہیں تھا۔ کوئی امتیازی عبادت نہیں تھی۔ کوئی تکیے اور زاویے نہیں تھے۔ کوئی قبور و مزارات کے مجاور نہیں تھے۔ کوئی جلسے جلوس میلے ٹھیلے عرس وجد و حال کی گرم بازاریاں نہیں تھیں۔ بس ان کی امتیازی شان یہی تھی۔ کہ ان میں سے ایک ایک فرد خدا کے دین کا دستگار تھا۔ دن کا شہہ سوار تو رات کا شب زندہ بیدار تھا۔ وہ سب کے سب معاشرے کے درمیان زندگی گذارتے تھے۔ ہنستے تھے بولتے تھے کام کرتے تھے۔ کاروبار کرتے تھے شادیاں کرتے تھے بیاہ کرتے تھے۔ اہل وعیال کی کفالت میں ذرائع معاش اختیار کرتے تھے اور فرصت کے لمحات میسر آجاتے تو اپنی محفلوں میں مزاح بھی کرتے تھے شعر و سخن سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ تاہم خدا کی تابعداری دین کی اقامت میں ان کے قدم ایسے مضبوط کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہلائے جاسکیں تو ہل جائیں۔ ان کے قدم نہیں ہلائے جاسکتے تھے۔ اپنے فکر و نظر اپنے ایمان و یقین اپنے جہاد و قتال اپنے مشن اقامت دین اقامت حق میں وہ مضبوط چٹان تھے جو مخالف تہذیب مخالف نظریات آئے۔ وہ اس چٹان سے اپنے سر پھوڑنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکے۔ ان کی پوری تاریخ دعوت عزیمت میں کوئی تعدی کوئی استہزاء کوئی تضحیک کوئی دھمکی کوئی خوف کوئی میدان حرب و ضرب کوئی حربہ ظلم و تشدد اثر انداز ہونا تو ایک طرف رہا پرچھائیں بھی نہیں ڈال سکا۔

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ امور خلافت کی انجام دہی کے ساتھ بے سہارا مستورات کا سودا سلف بازار سے خرید کر لاتے، برتن مانجھتے جھاڑو دیتے لشکر اسامہ رضی

و تبوک روانہ کرتے مرتدین کی سرکوبی کرتے دکھائی دیتے ہیں - عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ امور خلافت کے ساتھ ساتھ بائیس لاکھ مربع میل علاقہ پر اسلام کا پرچم لہرا دیتے ہیں چند سالوں میں رومن امپائر اور پرشین امپائر ایسی سپر قوتوں کا تختہ الٹ کر رکھ دیتے ہیں - حقوق عباد اپنی رعایا کے حال میں بے چینی کا یہ حال ہے کہ عام الرماد کے قحط میں فاقوں پر فاقے کرتے ہیں - کہ کھال جگہ جگہ سے پھٹ جاتی ہے - عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ اپنی دور خلافت کی ذمہ داریوں کے ساتھ جان توڑ دیتے ہیں - لیکن عامۃ المسلمین کے درمیان خون ریزی کو پسند نہیں کرتے - حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ خلافت کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ مساکین کے شرب و اکل کے لئے ملک بھر میں لنگر کھول دیتے ہیں - اور خود روٹی پانی میں بھگو کر کھاتے ہیں - عمر بن عبدالعزیز کا حال یہ ہے - کہ اپنے دور خلافت میں دور خلفائے راشدین کے عہد و ادوار کو زندہ کر دیتے ہیں - اپنا نور نظر بیت المال کے سیب کو منہ میں ڈال لیتا ہے تو انگلی منہ میں ڈال کر سیب باہر نکالتے ہیں - کہ یہ عوام مسلمانوں کے بیت المال کا مال ہے - تابعین میں امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نفیس لباس پہنتے ہیں - نفیس کھانا کھاتے ہیں - کہ شوربہ عطر آمیز ہوتا ہے - بایں ہمہ خوف خدا کا یہ حال ہے - کہ ہر وقت خدا کے خوف سے آنکھیں اشک بار رہتی ہیں - امام ابوحنیفہؒ کپڑے کی تجارت کرتے ہیں کسی ایک تھان میں معمولی نقص واقع ہو جاتا ہے کارندوں کو فہمائش کرتے ہیں - کہ تھان کی فروخت پر گاہک کو نقص سے آگاہ کر دیا جائے - لیکن کارندوں سے سہو ہو جاتا ہے - آپ اس کی تلافی میں سینکڑوں تھان راہ خدا میں خیرات کر دیتے ہیں - محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ تیل کی تجارت کرتے ہیں - کسی ایک تیل کے ڈرم میں چوہا گر کر ہلاک ہو جاتا ہے - آپ احتیاط کے طور پر درجنوں تیل کے ڈرم نالیوں میں بہا دینے کا حکم دیتے ہیں یہ چند مثالیں ہیں ورنہ اسلامی تاریخ کے اوراق میں سے اس نوع کی مثالوں کو اگر اکٹھا کیا جائے تو تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو گی - کیا یہ سب لوگ ولی اور متقی نہیں تھے - اگر تم قوم کے اپنے روایتی پیمانوں میں ناپو تو شاید تم کو اس میں ایک بھی ولی

درمتقی نظر نہیں آئے گا۔ اس لیئے ان کی زندگیاں اُن کی زندگیوں کے مشاغل ظروف واحوال وہ نہیں تھے جو کچھ کہ عجمی تصوف کے مارے ہوئے کونوں کھدروں میں ولایت کی لمبی چوڑی دوکانیں سجائے بیٹھے ہیں۔ اور جن کی ساری ولایت غلط سلط روایات بیہودہ اقوال شطحیات کے سہارے پر قائم ہے۔ مَیں حیران ہوتا ہوں۔ کہ جب لوگ اس پیمانے کو لے کر ایک مومن صادق مسلم کامل دعوت حق کے مجاہد کو داعی حق کو داعی رجوع الی القرآن کی تحریک کے راہ نما کو ناپتے پھرتے ہیں جو بے شمار عزیمتوں کے پل طے کر کے خدمت دین خدمت حق کی وادی میں اپنے جان و مال کو ہتھیلی پر لے کر پہنچے ہے۔ اور جس نے اپنی پوری زندگی کو زندگی کی تمام تر صلاحیتوں کو اوقات کو مصروفیات کو اس داؤ پر لگا دیا ہے۔ کہ تخت یا تختہ یا خدا کا دین غالب ہوگا۔ ورنہ جان و مال کا نذرانہ تو اُس کے حضور بہر حال ہے۔

ولائت اور تقوے کا معیار جو قرآن وسنت سے متبادر ہے۔ اچھی طرح سے جان لینا چاہیئے۔ وہ یونان اور ایران سے نہیں آیا ہے۔ وہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے دور کے لاکھوں امتیوں کے سینوں میں سفینوں میں علم میں عمل میں جہد میں جہاد میں موجود ہے۔ جو چشم سر سے دیکھا جا سکتا ہے جس کو دیکھنے کے لئے سمجھنے کے لئے کسی لمبی چوڑی عقل کی فکر و نظر کی ضرورت نہیں ہے۔ اقامتِ دین کے لیئے ان کی استقامت تاریخ کے ایک ایک ورق پہ رقم ہے۔ اور استقامت ایک بڑی کرامت ہے (یہ کوئی کرامت نہیں کہ انسان ہواؤں میں اڑنے لگے سمندر میں چلنے لگے اس کرامت میں پرندے اور مچھلیاں انسان سے آگے ہیں) اس نوع کی کرامتوں سے اُس کرامت کو کیا نسبت جس کرامت کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے تو دوسرے ہاتھ میں قرآن ہے وہ اپنے علم و عمل سے اظہار و بیان سے قرآن کا چلتا پھرتا اشتہار ہے۔ اظہار ہے۔ معاشرہ کے ایک ایک فرد کے بالمقابل بھی اور پورے معاشرہ کے روبرو بھی حتیٰ کہ عند سلطان جائر کے سامنے بھی۔ وہ توحید کے ذروہ سنام پہ کھڑا ہوا کائنات بشری کے ایک ایک فرد کو للکار رہا ہے۔ ایک خدا ایک ایمان ایک کتاب ایک رسالت ایک حق

ایک الحق ایک نظامِ حیات کی جانب مسلسل بلائے جا رہا ہے۔ گویا وہ وسعت افلاک میں اعلائے کلمۃ الحق کی تکبیرِ مسلسل ہے۔ اور اس تکبیرِ مسلسل کے نتیجہ میں ہر مصیبت کو ہر آفت کو ہر باطل کو باطل کے ہر ظلم کو تشدد کو خندہ پیشی کے ساتھ محض خوشنودی رب کے لئے انگیز کئے ہوئے ہے۔ ہر باطل کے لئے وہ بلائے بے درمان ہے۔ ہر قیصر کے لئے وہ پیام موت ہے ہر کسریٰ کے لئے وہ پیغام مرگ ہے۔ بتاؤ کیا نسبت ہے۔ اُس نام نہاد ولایت کو مصنوعی اور جعلی تقویٰ کو جو خاک کی آغوش میں محوِ تسبیح و مناجات ہے۔ محض سامان نا ؤ نوش ہے۔ محض دوکان پیری مریدی ہے۔ محض ایک ڈھونگ ہے۔ محض ایک دکھاوا ہے۔ محض ریا و نمائش کا دُنیا کے مفاد کے لئے ایک کھیل ہے۔ تماشہ ہے۔ جس کے پاس چند جھوٹی سچی خوابیں ہیں۔ چند بے سروپا حکائیتیں ہیں۔ چند جنتر منتر ہیں۔ چند الٹی سیدھی کرامتیں ہیں۔ جن میں بیشتر مصنوعی ہوتی ہیں۔ یہ جوگ سنیاس اور بدھ مت کا تقویٰ اور ولائت لوگ اُس کے سامنے لے آئے ہیں۔ اور اس پیمانے سے اُس کو ناپنا چاہتے ہیں۔ جو حق کا علم بردار ہے۔ جان نثار ہے جان باز ہے۔ ہر باطل کا دشمن جان ہے۔ ہر باطل کے لئے کوہ گراں ہے۔ اس ظلمت بدوش باطل کی شب تار اُس کا وجود ایک روشنی ہے۔ ایک مشعل راہ ہے۔ جو ان ظلمتوں کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں میں تزکیۂ نفوس کی شمعیں جلا رہا ہے۔ تصفیہ قلب کے چراغ روشن کر رہا ہے۔ وہ ایمان کا ایک سدا بہار درخت ہے وہ یقین کا ایک سیل رواں وہ علم کا ایک سمندر وہ عمل کا ایک جہان جو الکتاب کی تلاوت آیات تفہیم کتاب سے کائنات انسانی کے زمین و آسمان بدلنے کے لئے رسولوں اور نبیوں کے مشن پر آ کھڑا ہوا ہے۔ کہ جس ولایت اور تقویٰ کی روشنی اور روشن گری سے نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کا ورق ورق اپنی درخشندگی میں شہوار ہے۔ آفتاب اور بدر کامل ہے۔ جس کی رات بھی اُسی طرح روشن ہے۔ جس طرح سے اُس کا دن روشن ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

قسط (۲) ——— احمد افضال

عورت — اور اسلامی معاشرہ

آج کا مغربی معاشرہ اور عورت

آج کل امریکہ اور یورپ وغیرہ میں عورتیں تقریباً ہر شعبے میں کام کر رہی ہیں لیکن ایسی عورتیں بمشکل سے چند فیصد ہیں جو کسی بڑے عہدے پر فائز ہوں۔ خواتین کی اکثریت کو نچلے درجے کے کام کرنا پڑتے ہیں۔ وہ یا تو ریستورانوں میں ویٹرس ہوتی ہیں یا ہوٹلوں میں مسافروں کے کمرے صاف کرنے اور چادریں بدلنے پر مامور ہوتی ہیں۔ انہیں یا تو دفاتر کے استقبالیئے پر بٹھا دیا جاتا ہے یا دکانوں پر مال بیچنے کا فرض سونپ دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادیٔ نسواں کی لمبی چوڑی بحثوں اور جلسے جلوسوں کے باوجود مغربی عورت غلام ہے۔ پہلے اس پر صرف ایک مرد کا تسلط تھا۔ اب وہ ان گنت مردوں کیلئے تفریح اور عیش کا سامان پیدا کرتی ہے، کسب معاش کے لئے آٹھ آٹھ گھنٹے کی سخت اور ذلت آمیز ڈیوٹیاں ادا کرتی ہے، اپنے گھر پہنچ کر کھانا پکانے، برتن دھونے اور گھر کی صفائی کا کام کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بدکرداری، بے راہ روی اور آوارگی کا ذریعہ بن رہی ہے۔

مغرب میں عورت کا مقدر ذلت، رسوائی، عریانی اور بے چارگی سے عبارت ہے۔ ذرا جوانی کے قریب پہنچی کہ ہوس پرست مردوں کا فٹ بال بن جاتی ہے جوانی گزر جائے تو اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ نہ شوہر جو اس کی حفاظت اور دستگیری کرے نہ اولاد جو اسے آرام پہنچائے۔ اس کا احترام اس وقت تک کیا جاتا ہے جب تک وہ دوسروں کے دل بہلانے کا سامان کر سکے۔ بوڑھی عورتوں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ حتیٰ کہ وہ بسوں اور ٹرینوں میں کھڑے ہو کر سفر کرتی ہیں اور ان کے لئے کوئی جوان مرد

ا اپنی جگہ چھوڑنے کے لئے رضامند نہیں ہوتا۔ بڑھاپے میں عورتوں کا سہارا صرف محتاج گھر ا رہ جاتا ہے۔ جہاں انہیں تفریحات مہیا کی جاتی ہیں مگر اس عمر میں ان کے لئے واحد خوشی یہ ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کو دیکھ سکیں، مگر یہ بات ان کے لئے سوہانِ روح ہے کہ جوان اولاد بات کرنا تو درکنار صورت دکھانے کی بھی روادار نہیں۔۔۔ اسی ہنی اذیت اور احساسِ تنہائی کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ موت کی منزل تک جا پہنچتی ہیں۔

صنفی انتشار

مغرب میں فحش کتابیں، رسالے، فلمیں اور گانے جس تیزی کے ساتھ لوگوں کو اخلاقی لحاظ سے پستی میں دھکیل رہے ہیں اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے نظریات کس طرح تبدیل ہو رہے ہیں۔ جو باتیں اور کام کچھ عرصہ پہلے تک سخت معیوب سمجھے جاتے تھے وہ آج عین ترقی اور تہذیب و شائستگی کی علامت بن گئے ہیں۔ ماحول میں صنفی انتشار اس حد تک رچ بس گیا ہے کہ معصوم بچے بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں۔ برطانوی مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے[1]

"ہماری غیر عقلی معاصرانہ بے صبری جس تیزی کے ساتھ رواں ہے اس نے ہمارے بچوں کی تعلیمی کیفیت میں ایک طوفان بپا کر رکھا ہے۔ ہم اس تیزی کے ساتھ انہیں بڑا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں گویا وہ چوزے ہیں اور ان کے انڈوں کو مشینوں کے ذریعے قبل از وقت سیا جا چکا ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ ہم انہیں جنسی بلوغت کے دور سے پہلے ہی جسمانی حظ سے آشنا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اس جسمانی حق سے محروم کر رہے ہیں جس کے تحت انہیں بچپن یا لڑکپن کے زمانے سے مستفید ہونا چاہیئے۔"

بچوں میں صنفی ہیجانات پیدا ہونے کے نتائج یہ نکلے ہیں کہ صرف واشنگٹن کے علاقے میں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک کے درمیانی عرصے میں تقریباً دو سو لڑکیاں جن کی عمریں چودہ سال سے زیادہ نہ تھیں، شادی کے بغیر مائیں بن چکی ہیں۔ جبکہ ایک برس کی مدت میں اسی شہر کی چار سو لڑکیوں نے ماں بننے سے پہلے اپنے بچوں سے نجات حاصل کر لی۔ ان لڑکیوں کی عمریں ۱۴ سال یا اس سے کم تھیں۔ ایک سماجی کارکن نے انکشاف کیا کہ ان میں سے ایک ما

---

[1] ماخوذ از "دورِ جدید کے عالمگیر فتنے" مصنفہ منشی عبدالرحمٰن خان

صرف ۹ سال کی تھی جبکہ اس کا بوائے فرینڈ ۱۴ برس کا تھا۔[۱]

بچوں میں جنسی سرگرمیوں کی کثرت کے باوجود قانون کی نظر میں انہیں مجرم سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں واشنگٹن کی سٹی کونسل میں طویل بحث آرائی کے بعد یہ اصول مرتب کیا گیا ہے کہ اگر سولہ سال سے کم عمر کے بچے اپنی باہمی رضامندی سے اپنے ہم عمروں کے ساتھ جنسی مشاغل میں معروف پائے گئے تو انہیں مجرم قرار نہیں دیا جائے گا۔[۲]

بچوں کا یہ حال صرف امریکہ میں ہی نہیں بلکہ دیگر مغربی ممالک میں بھی یہی صورتحال ہے۔ برطانیہ میں ۱۶ سال سے کم عمر کی غیر شادی شدہ ماؤں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ سرکاری طور پر اسکولوں کی بچیوں کو متوقع ناجائز اولاد سے نجات دلانے کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں یہ تعداد چار ہزار تھی۔ اگلے برس باقاعدہ ناجائز پیدائش کا تناسب بڑھ گیا۔ برطانیہ کے دفتر برائے مردم شماری اور سروے کے مطابق ۱۹۸۰ء میں زیر تعلیم لڑکیوں کے ۸۱۰۴ بچوں کی پیدائش متوقع تھی۔ ۴۴ فیصد نے بچے پیدا کئے۔[۳]

کچھ عرصے پہلے تک یہ حالت تھی کہ اسکول کی کسی لڑکی کے متعلق یہ افواہ بھی اڑ جاتی کہ وہ ماں بننے والی ہے تو اس کو اسکول چھوڑنا پڑتا تھا۔ مگر اب سماجی روایات اور نظریات کی تبدیلی کی وجہ سے ناجائز ولادت کوئی مسئلہ نہیں رہی۔ برطانیہ میں بیس برس سے کم عمر لڑکیوں سے پیدا ہونے والے ۴۵ فیصد بچے ناجائز ہوتے ہیں۔ بغیر شادی کے پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد سالانہ ایک لاکھ ہے۔[۴]

ورجینیا کے ایک اسکول کے پرنسپل نے اپنے اسکول کی حاملہ طالبات کے متعلق کہا کہ ان معصوم لڑکیوں کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت مول لے رہی ہیں، اور جب وہ مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہیں تو پھر معاشرے کا فرض ہے کہ ان کی معاونت کرے۔ اس معاونت اور حوصلہ افزائی کے نتیجے میں ایسی لڑکیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

ایلن گٹ میچر انسٹیٹیوٹ نے ایک جائزے کے بعد بتایا کہ امریکہ کے ہائی اسکول کی ہر دس میں سے چار لڑکیاں حاملہ ہو جاتی ہیں۔ ان لڑکیوں سے نرم سلوک کا ایک سبب

---

[۱] [۲] روزنامہ جنگ کراچی ۴ ستمبر ۱۹۸۱ء
[۳] 〃 〃 〃 ۲۱ ستمبر ۱۹۸۲ء
[۴] اردو ڈائجسٹ جولائی ۱۹۸۳ء

یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ ناتجربہ کار ہوتی ہیں اور حمل سے محفوظ رہنے کے لئے مناسب تدابیر پر عمل نہیں کر پاتیں اور اپنے اناڑی پن کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔[۱]
اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ناجائز بچوں کی تعداد جائز بچوں سے بڑھتی جا رہی ہے ۔ امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن میں ۱۹۸۰ء میں جتنے بچے پیدا ہوئے ان میں سے ۵۸ فیصد ناجائز تھے ۔ ان کی ماؤں میں ۲۰ فی صد سترہ سال سے کم عمر تھیں۔[۱]
یہ حال بچوں کا تھا۔ بڑوں میں ذہنی اور اخلاقی دیوالیہ پن انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ امریکہ میں پندرہ لاکھ سے زائد جوڑے شادی کے بغیر میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر کی عمر ۲۵ سال سے کم ہے۔[۲]
برطانیہ میں شادی کے بغیر غیر مردوں کے ساتھ رہنے کا رجحان ۲۵ فی صد ہو گیا ہے۔ اس وقت ساڑھے تین لاکھ کے قریب جوڑے شادی کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر میاں بیوی ہیں۔[۳] برطانیہ میں یہ سوال عام ہو گیا ہے کہ کیا شادی ضروری ہے؟ ظاہر ہے کہ جب دونوں صنفوں کو اپنی خواہش نفس کی تسکین کے ذرائع نہایت آرام سے مل جاتے ہیں تو انہیں بلاوجہ شادی بیاہ کے چکر میں الجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسکنڈے نیوین ممالک (ڈنمارک، سویڈن، ناروے اور آئرلینڈ) میں بھی شادی کو فرسودہ رسم سمجھنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ یہ لوگ آزاد محبت (   ) کے قائل ہیں۔ جب تک نبھے اکٹھے رہتے ہیں اور جب گذر نہ ہو سکے تو علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ فلاحی ریاست ہونے کی وجہ سے بچوں کی پرورش حکومت کے ذمے ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں والدین کو پریشان نہیں ہونا پڑتا اور وہ اپنی آزاد محبت کا کوئی نیا ساتھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ برازیل میں بھی یہی صورت حال ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق وہاں ناجائز بچوں کی تعداد پچاس لاکھ کے قریب ہے۔[۵]

طلاق اور تفریق

ترقی یافتہ ممالک میں طلاق اور تفریق کے واقعات بہت بڑھ گئے ہیں۔ صرف برطانیہ میں گزشتہ ۲۰ برس کے مقابلے میں طلاق کے واقعات میں ... فیصد اضافہ ہوا ہے اور اگر یہی رجحان رہا تو آئندہ پانچ برس میں اسی فیصد میاں بیوی کو طلاق ہو گی۔[۶] وہاں ہر ۳ میں سے دو شادیاں طلاق پر ختم ہوتی ہیں۔[۷] ایک معاشرے میں جہاں مرد اور عورت دونوں اپنا کماتے اور کھاتے ہیں، عورت کو کوئی شے ایک مرد کے ساتھ بندھے رہنے پر آمادہ کر

[۱،۲] روزنامہ جنگ کراچی ۱۸ دسمبر ۱۹۸۱ء

[۲] روزنامہ جنگ کراچی ۱۲ جولائی ۱۹۸۰ء

[۳] روزنامہ جنگ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۲ء

[۴] اردو ڈائجسٹ جولائی ۱۹۸۲ء

[۵] روزنامہ جنگ کراچی ۷ جنوری ۱۹۸۳ء

[۶] اردو ڈائجسٹ جولائی ۱۹۸۳ء

کرتی۔ مغربی ممالک میں طلاق ایسی ایسی باتوں پر لی جاتی ہے جنہیں سن کر روتا ہوا آدمی ہنس پڑے۔ کچھ عرصہ پہلے بلی پالنے کے مسئلے پر طلاق ہوئی۔ شوہر کو بلی پالنے کا شوق تھا، بیوی کو نفرت تھی۔ معاملہ عدالت تک جا پہنچا اور تفریق ہو گئی۔ شوہر نے کہا "بیویاں تو بہت ہیں مگر اس نسل کی بلی ملنا دشوار ہے۔ لہٰذا میں بیوی کو طلاق دے سکتا ہوں، بلی کو نہیں۔"

طلاقوں کا ایک اہم سبب خواتین کی معاشی خود مختاری ہے۔ ڈاکٹر سڈنی لیکر کا کہنا ہے:

"اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر شادی شدہ عورت اپنے شوہر سے زیادہ کماتی ہے تو وہ احساسِ برتری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور یہ احساسِ برتری شوہر سے اَن بَن کا باعث بن جاتا ہے۔ پھر لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اور دماغی سکون غارت ہو جاتا ہے[۱]"

امریکہ کے مردم شماری کے بیورو کے مطابق جو خواتین کلیدی عہدوں پر فائز ہیں ان میں طلاق کا رجحان دوسری عورتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ مثلاً جو خواتین افسر ہیں اور پچاس ہزار ڈالر سالانہ سے زیادہ کماتی ہیں ان میں طلاق یافتہ عورتوں کی تعداد دوسری عورتوں کے مقابلے میں چار گنا ہے۔ جبکہ ۲۵ ہزار ڈالر سالانہ کمانے والی عورتوں میں طلاق یافتہ عورتیں دوسری عورتوں کے مقابلے میں دگنی ہیں۔ ماہرینِ نفسیات نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ جو خواتین دفاتر میں اہم فیصلے کرتی ہیں انہیں دوسروں پر حکم چلانے کی عادت ہو جاتی ہے۔ وہ سوچتی ہیں کہ جب وہ معقول مشاہرہ لے رہی ہیں تو انہیں شوہر کے سہارے کی کیا ضرورت ہے[۲] ان خیالات نے طلاق اور علیحدگی کے رجحان میں اضافہ کر دیا ہے۔

جرائم

مغربی ممالک میں معاشرتی اور قانونی نظام کے نقائص نے ہر نوع کے جرائم کے فروغ میں مدد دی ہے۔ برطانیہ کے مختلف علاقوں میں رہنے والی ہر ساٹھ عورتوں میں سے چالیس یہ سمجھتی ہیں کہ اب باعزت طور پر زندہ رہنا دشوار ہو چکا ہے[۳]۔ غروبِ آفتاب کے بعد گھر سے نکلنا غیر محفوظ ہے۔ لیکن بہت سی خواتین کو بامرِ مجبوری یہ خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ جرائم پیشہ لوگوں کا نشانہ وہ افراد زیادہ بنتے ہیں جو شراب پی کر سڑکوں پر گھومتے ہیں۔

ایک مضمون میں یہ تفصیل آئی ہے کہ جب کسی اسکول سے لڑکیوں کی چھٹی ہوتی ہے تو پولیس کی پارٹیاں کاروں میں گشت کرتی ہیں اور فضا سے ہیلی کاپٹر دور دور تک نگاہ رکھتا ہے اور پولیس

---

[۱] اخبارِ جہاں ۴ جون ۱۹۷۹ء تا ۱۰ جون ۱۹۷۹ء
[۲] روزنامہ جنگ کراچی ۱۲ اگست ۱۹۸۱ء
[۳] روزنامہ جنگ ۸ اپریل ۱۹۸۳ء

سے رابطہ رکھتا ہے تاکہ جہاں کہیں اغوا کا کوئی واقعہ ہو، مجرم کو فوراً گھیر لیا جائے۔ ان تمام انتظامات کے باوصف روزانہ سو سے دو سو تک جبری اغوا کی وارداتیں ہو جاتی ہیں۔

بے راہ روی مغربی معاشرے میں زناکاری کی کثرت نے تمدن کی جڑ کاٹ دی ہے اور خاندانی نظام کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ وہاں عورت کا واحد مقصدِ حیات یہ باقی رہ گیا ہے کہ مردوں کے سامنے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ پرکشش بنا کر پیش کرے۔ مغرب میں جو بات مرد کی پسند ہوتی ہے وہ عورت کا فیشن بن جاتی ہے۔ عورت انتہائی مختصر لباس میں ہوتی ہے اور اس کے ساتھ مرد، پورے کپڑوں میں ملبوس ملے گا۔ چھریرا نظر آنے کی خواہش میں فاقہ کشی کا جنون بھی بڑھ رہا ہے [1] عورت کو اپنی غذا اور خوراک تک پر حق حاصل نہیں رہا ہے جسمانی حسن کا جو معیار ماہرین نے مقرر کر دیا ہے، ہر عورت اس پر پورا اترنے کے لئے، وزن گھٹانے، ورزشیں کرنے اور خوراک میں کمی کرنے پر تلی رہتی ہے۔ برطانیہ میں خواتین کے دس میگزین اسی موضوع پر شائع ہوتے ہیں کہ دبلا اور چھریرا بننے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں [2]

امراضِ خبیثہ ترقی یافتہ ممالک میں فحاشی اور عریانی کی شدت کا ایک لازمی نتیجہ امراضِ خبیثہ کی شکل میں سامنے آرہا ہے۔ آج سے تیس چالیس برس پہلے امریکہ کی قریب قریب ۹۰ فیصد آبادی ان امراض سے متاثر تھی۔ وہاں کے سرکاری ہسپتالوں میں ہر سال آتشک کے دو لاکھ اور سوزاک کے ایک لاکھ ساٹھ ہزار مریضوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ آج کل میڈیکل سائنس کی ترقی اور طبی معلومات کی کثرت کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء میں صرف واشنگٹن کے علاقے میں ۱۴ سال اور اس سے کم عمر کے تقریباً ایک لاکھ بچوں کو خطرناک جنسی بیماریوں میں مبتلا پایا گیا اور ان کا علاج کیا گیا۔ جبکہ بڑی عمر کے لوگوں میں یہ اوسط اس سے چھ گنا زیادہ تھا [3]

احتجاج مغربی ممالک میں بڑھتی اور پھیلتی ہوئی بے حیائی سے خود اہلِ مغرب کے اہلِ نظر عاجز آگئے ہیں۔ بلجیم یونیورسٹی کے پروفیسر گلٹن کہتے ہیں:

> "ہم نے، بلکہ سارے مغربی ممالک نے عورتوں کو آزاد کر کے جس قدر اخلاقی، تمدنی اور سیاسی غلطی کی ہے، شاید اس قدر شدید اور فاش غلطی کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہماری عورتیں قومی اور ملکی ناقص خدمات انجام دینے کے بجائے گھر کے

---

[1] روزنامہ جنگ کراچی ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۹ء [2] روزنامہ جنگ کراچی ۴ ستمبر ۱۹۸۱ء

[3] اردو ڈائجسٹ جولائی ۱۹۸۳ء

تنگ و تاریک چاردیواری میں رہتیں اور خانہ داری کے امور انجام دیتیں ۔[1]"

۲۶ مارچ ۱۹۷۳ء کو برطانیہ کے ایک شہر ٹونگم میں پچاس ہزار افراد نے ناجائز بچوں اور اسقاطِ حمل کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا۔ اس شہر میں صرف ۱۹۷۲ء میں ۱۵۹۲۵۰ ناجائز بچے پیدا ہوئے تھے ۔[2] ۱۹۷۵ء میں دس لاکھ ہپیوں نے شکاگو میں اس صدی کا سب سے بڑا جلوس نکالا۔ ان کے ہاتھوں میں کئی لاکھ کتبے تھے جن پر لکھا تھا

'مذہب کی طرف واپس چلو' [3]

تبصرہ یونان، روم، عرب، ایران اور ہندوستان کی تہذیبوں میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب صنفی جذبات کو بے لگام چھوڑا گیا تو نتیجہ سلطنت کی تباہی کی شکل میں برآمد ہوا۔ آج مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں اس سے زیادہ برے حالات ہیں لیکن وہ پھر بھی ترقی یافتہ کہلاتے ہیں۔ کیوں! اس کی دو وجوہات ہیں :

اوّل: یہ کہ مغرب کے قصرِ عظمت کو جس چیز نے سہارا دیا ہوا ہے وہ علوم و فنون کی ترقی ہے۔ ورنہ بے حیائی کی دیمک اس کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔

دوم : یہ کہ ترقی اور تنزلی کے مطابق ہمارے نظریات بدل گئے ہیں، جس چیز کو ہم ترقی سمجھ رہے ہیں وہ بدترین زوال ہے۔ اخلاقی دیوالیہ پن کے ساتھ ترقی ناممکن ہے۔ پس یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ مغرب جہاں ایک طرف مادی بلندی کی سمت رواں دواں ہے تو دوسری طرف اخلاقی زوال کی جانب بھی بڑھ رہا ہے۔ اور اس کی عظمت کا محل اب کوئی دن کا مہمان ہے۔ جوہری ہتھیاروں کی طاقت، ایک مضبوط اخلاقی نظریئے کے بغیر، اپنی خودکشی کے سوا کسی کام نہیں آسکتی۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مرد و زن کا آزادانہ اختلاط تمدن کے لئے سمِ قاتل ہے۔ ڈاکٹر جے۔ ڈی اَنوِن نے لکھا ہے :

"جنس اور تہذیب میں گہرا تعلق ہے۔ جذبۂ جنس پر قابو پانے کے بعد انسان میں ایک خاص توانائی پیدا ہو جاتی ہے جس سے معاشرہ کے کسی بلند نصب العین کی تکمیل کا کام لیا جا سکتا

---

[1] بحوالہ "دورِ جدید کے عالمگیر فتنے"

[2] "میری آخری کتاب" از غلام جیلانی برق

[3] " " "

ہے۔ جو لوگ عیاشی میں پڑ جاتے ہیں ان کی توانائی اتنی کم ہو جاتی ہے کہ وہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے [1]

لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ مغرب سے وہ چیز لیں جو اس کی ترقی کا سبب ہے یعنی علوم و فنون اور قوتِ عمل مگر وہ شے نہ لیں جو اسے زوال اور پستی کی طرف لئے جا رہی ہے مغرب کی مادّی ترقی اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اُن کا اخلاقی نظام بھی درست اور قابلِ اتباع ہو۔ بقول شاعرِ مشرق ؎

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست!
نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست!
محکمی او را نہ از لادینی است
نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

ترجمہ: مغرب کی قوت کا راز نہ تو چنگ و رباب میں ہے نہ بے پردہ بیٹیوں کے رقص میں، نہ گل رو ساحروں کے سحر میں، نہ عریاں پنڈلیوں اور بال تراشنے میں، انکے استحکام اور مضبوطی کا انحصار نہ تو لادینی نظامِ زندگی پر ہے اور نہ رومن رسم الخط کے فروغ پر۔ افرنگیوں کی قوت تمام کی تمام علم و فن کی بدولت ہے۔ یہی وہ آگ ہے جس سے ان کا چراغ روشن ہے۔

اسلام اور عورت

ہم دیکھ چکے ہیں کہ دورِ قدیم میں عورت کو نہایت پست درجے کی مخلوق سمجھا جاتا تھا عصرِ حاضر میں عورت کو ہر معاملے میں آزادی دی گئی ہے لیکن اس کے جو تباہ کن نتائج برآمد ہو رہے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ آزادی غیر فطری ہے۔ ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

---

[1] سیکس اینڈ کلچر۔ ڈاکٹر جے ڈی اَنوِن

راہِ عمل کیا ہے؟ صراطِ مستقیم کون سا ہے؟ اسلام ـــــ پہلا اور آخری دین ہے۔ وہ انسان کو اس کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے کے لئے واضح، غیر مبہم اور مکمل ھدایات دیتا ہے۔ یہ دینِ فطرت بھی ہے۔ لہٰذا اس کا ہر حکم فطرت کے عین مطابق اور اس کا ہر ضابطہ فطرت سے ہم آہنگی رکھتا ہے۔ عورت کا معاشرے میں کیا مقام ہو؟ مرد کے مقابلے میں اس کی کیا حیثیت ہو؟ اسے کیا کیا حقوق حاصل ہوں اور کون کون سے فرائض اس کے ذِمّے ہوں؟ ان تمام سوالوں کے تفصیلی جوابات قرآن حکیم اور سنّتِ رسول ؐ میں دے دیئے گئے ہیں اور جو مسلمان ہیں، انہیں چاہیئے کہ ان احکامات کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دیں۔

"کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ؐ کسی معاملے میں کوئی فیصلہ دے دیں تو پھر اسے اس معاملے میں خود بھی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔"   (احزاب ۳۶)

اسلام میں عورت کی حیثیت کو سمجھنے کے لئے چند اساسی اصول ذہن نشین کر لینے چاہئیں:

(۱) **مرد و زن کے درمیان اخلاقی مساوات**

جہاں تک اخلاقی اور بنیادی مساوات کا تعلق ہے، اسلام نے مرد اور عورت کو برابر قرار دیا ہے۔ جس طرح مرد پیدا ہوتا ہے، اسی طرح عورت بھی پیدا ہوتی ہے ـــــ دونوں نسلِ انسانی کے افراد ہیں اور انسان ہونے کے ناطے ایک جیسی عزّت کے مستحق ہیں:

"لوگو! اپنے پروردگار کا تقویٰ اختیار کرو۔ جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیئے"

(نساء - ۱)

اسلام میں عورت کا الگ اخلاقی اور دینی تشخص ہے۔ اس کا دین اس کے شوہر یا باپ کے تابع نہیں بلکہ وہ اپنے اعمال کے لئے خود جواب دہ ہے۔

"اور جو نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن تو ایسے ہی لوگ جنت میں جائیں گے اور ان کی ذرّہ برابر بھی حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔"   (نساء ۱۲۴)

"میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے کسی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے ہی سے ہو۔"   (آلِ عمران - ۱۹۵)

یہ بتانے کے لئے کہ عورت کا جدا اخلاقی تشخص ہے، سورۂ تحریم میں چار عورتوں کی مثالیں دی گئی ہیں۔ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویاں، جنھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا اور انبیاء کی زوجیت میں ہونے سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا ــــــ فرعون کی بیوی جن کا شوہر بدترین دشمنِ خدا تھا مگر وہ خود نہایت خدا پرست اور خدا ترس عورت تھیں ــــــ حضرت مریمؑ جن کی خود اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی۔ اب بھی کسی کو مرد و زن کے درمیان نیکی کے سلسلے میں مساوات میں کوئی شبہ ہو تو یہ آیت ملاحظہ ہو۔

"بے شک جو مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ہیں، ایمان لانے والے اور ایمان لانے والیاں ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صبر کرنے والے اور صبر کرنے والیاں ہیں، اللہ کے سامنے جھکنے والے اور جھکنے والیاں ہیں، صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں ہیں، روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں ہیں اور اندیشہ کی جگہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم مہیا کر رکھا ہے۔ (احزاب ـ ۳۵)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اور جتنے اخلاقی اوصاف مردوں میں ہو سکتے ہیں، وہی عورتوں میں بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی اخلاقی زاویۂ نگاہ سے مرد اور عورت میں کامل مساوات ہے۔

(۲) **قانونی مساوات نہیں ہے** | مرد و زن کے درمیان اس اعتبار سے تو قانونی برابری ہے کہ دونوں کے جان و مال کو مساوی اہمیت حاصل ہے اور جس طرح مرد کی جان اور مال کی حفاظت حکومت کا فرض ہے، اسی طرح عورت کی جان اور مال کا تحفظ بھی قانون کی ذمہ داری ہے۔ لیکن دو اہم معاملات ایسے ہیں جن میں مرد کو عورت پر تفوّق دیا گیا ہے یعنی ــــــ قانونِ وراثت اور قانونِ شہادت!!

قانونِ وراثت

اسلام کے قانونِ وراثت میں عورتوں کا حق مردوں سے آدھا رکھا گیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ "اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں یہ ہدایت کرتا ہے کہ مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ دو۔ (نساء ــــ ۱۱)

اسی طرح باپ کے مقابلے میں ماں کا حصہ نصف ہے۔ کیا یہ ناانصافی ہوئی؟ نہیں یہ

عین انصاف ہے۔ کیونکہ :

(الف) مرد پر اس کے بیوی بچوں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

(ب) عورت پر کسی کی، حتیٰ کہ خود اس کی اپنی ذمہ داری بھی نہیں ڈالی گئی۔ عورت کی کفالت باپ اور شوہر کے ذمے ہے۔ اس کو مہر اور نفقہ کے حقوق بھی حاصل ہیں جن سے مرد محروم ہے۔ فرض کیجئے ایک مرد کو وراثت میں کہیں سے دس ہزار اور عورت کو پانچ ہزار روپے ملتے ہیں۔ مرد کے دس ہزار اس کے بیوی بچوں اور دیگر زیر کفالت افراد پر تقسیم ہو جائیں گے۔ لیکن عورت پر چونکہ کسی کی ذمہ داری نہیں لہٰذا وہ اپنے پانچ ہزار کی اکیلی حقدار ہے۔ اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگرچہ مرد کو عورت سے دوگنا حصہ ملتا ہے مگر حقیقتاً عورت فائدے میں رہتی ہے۔

قانون شہادت

اسلامی نظام عدل و تعزیرات میں گواہی اور شہادت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

عورت کا قانون شہادت میں کیا مقام ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

"اور گواہ بناؤ اپنے مردوں میں سے دو، اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہوں میں سے پسند کرو تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔" (البقرہ ۔ ۲۸۲)

اس آیۂ مبارکہ میں ایک مرد کی گواہی کو دو عورتوں کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ یہ معاملہ عام تعزیرات کا ہے۔ حدود و قصاص کے نفاذ کے لئے عورتوں کی گواہی کافی نہیں، مردوں کی شہادت چاہیے۔ تاہم ایسے معاملات میں محض عورت کی گواہی بھی معتبر تسلیم کی جائے گی جن تک مردوں کی رسائی نہیں ہوتی۔

عورت کی شہادت کو مرد کی شہادت کے مقابلے میں نصف اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ عورت اپنے فطری جذبات، رحم، مروت، نرم مزاجی، نیک نفسی اور سادہ دلی کے باعث کسی ایسے مقدمہ میں تنہا شاہد بننے کی ذمہ دار نہیں ہو سکتی جس میں ملزم کو موت یا ایسی ہی کوئی سخت سزا دی جا سکتی ہو۔ اس آیت کے الفاظ سے یہ امر بھی سامنے آتا ہے کہ عورتوں کو بھول چوک اور نسیان لاحق ہونے کا امکان مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے کم از کم دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے تاکہ اگر ایک اپنے بیان میں واقعہ کا کوئی پہلو فراموش کر دے

طالبانِ علم قرآن و سنت کیلئے

خوشخبری

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ڈھائی سو سے زائد کیسٹس سے درج ذیل طریقہ کار
کے مطابق استفادہ کر سکتے ہیں

طریقہ کار

۱ - ہر شخص کیسٹ لائبریری کا ممبر بن سکتا ہے -
۲ - ممبر شپ فیس دس روپے سالانہ ہوگی -
۳ - ہر اس شخص کو جو کیسٹوں کا اجراء کروانا چاہے -/۳۰ روپے فی کیسٹ کے حساب سے زرِ ضمانت جمع کروانے ہوں گے جو قابلِ واپسی ہوں گے -
۵ - جاری کئے گئے کیسٹس ہر صورت میں دس دن بعد واپس کرنے ہوں گے -
۶ - کیسٹ واپس نہ آنے کی صورت میں کیسٹ فروخت تصور کی جائے گی -
۷ - لاہور سے باہر رہائش پذیر ممبر ایک ماہ تک کیسٹس اپنے پاس رکھ سکیں گے نیز انہیں یہ سہولت بھی حاصل ہوگی کہ وہ ایک وقت میں دس کیسٹوں کا اجراء کروا سکیں
۸ - بیرونِ لاہور کیسٹ بھجوانے کے لئے ڈاک و پیکنگ کا خرچ ممبر کے ذمہ ہوگا ایک سے دس کیسٹس تک ڈاک خرچ -/۸ روپے، بذریعہ منی آرڈر زرِ ضمانت کے ہمراہ الہدیٰ کیسٹ لائبریری کے نام ارسال کرنا ہوگا -

نوٹ : خواہش مند حضرات خط لکھ کر کیسٹ کی فہرست طلب فرمائیں

الہدیٰ کیسٹ لائبریری : دفتر تنظیم اسلامی

۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
کی مطبوعات میں
ایک اہم اضافہ
★
سانحۂ کربلا
ڈاکٹر اسرار احمد
کی
ایک اہم تقریر جواب کتابی شکل میں
شائع کی گئی ہے
صفحات — ۴۸
قیمت : ۳ روپے صرف
ملنے کا پتہ
۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون : ۸۵۲۶۱۱
EAGLE
ایگل
ایک عالمگیر قلم
EAGLE IRIDIUM
خوشخط، رواں
اور دیرپا
اسٹین لیس
اسٹیل کی
اریڈیم ٹپڈ نب
کے ساتھ
ہر جگہ دستیاب

افکار و آراء

"ملتِ اسلامیہ کا المیہ"

آج یہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اختلافات عروج پر ہیں، گروہوں کے درمیان، علاقوں اور صوبوں کے درمیان، برادریوں اور فرقوں کے درمیان، تو اس کی سب سے اہم وجہ یہ کہ ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم اس وقت تک اپنا کردار نہیں بنا سکیں گے، جب تک ہم اپنے ہمعصر لوگوں کا کردار خراب نہ کر دیں۔ ہماری اس منفی سوچ نے اتفاق واتحاد میں رخنوں کا لامتناہی سلسلہ دراز سے دراز تر کر دیا ہے اور ہم مجموعی حیثیت سے تعمیر کی بجائے تخریب کی راہ پر گامزن ہو گئے ہیں۔

یہ صورتِ حال اس وقت اور زیادہ خراب ہو جاتی ہے جب ہم اپنے مذہبی گروہوں کو ایک دوسرے کی تذلیل اور تحقیر کرتے دیکھتے ہیں۔ مذہبی فرقوں کی اس کشمکش اور چپقلش سے وہ گروہ انسانیت فائدہ اٹھا رہا ہے جو باطل کا حامی اور اسلام کا دشمن ہے اور وہ گروہ نقصان اٹھا رہا ہے جو حق پرست ہے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طور طریقوں کو دنیا میں عملاً قائم کرنے کا خواہشمند ہے۔ اسلام کے باغیوں اور کفر و الحاد کے پیروؤں کو سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچ رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کی نوجوان نسلوں کو یہ تأثر دینے میں کامیاب ہو رہے ہیں کہ "اسلام، خدا اور رسولؐ سب انسانی اختراع ہیں اور یہ مولویوں نے لوگوں کو بیوقوف بنایا ہوا ہے۔ پھر یہ کہ مولویوں کا اسلام ایک نہیں ہے تو اے نوجوانو! تم کون سے اسلام کو اسلام کہتے ہو؟ اگر اسلام ایک دین ہوتا تو یہ مسجدیں علیحدہ علیحدہ کیوں ہوتیں اور یہ ایک فرقے کا دوسرے فرقے کے خلاف کیوں محاذ بنتا۔"

بہرحال اسی قسم کی باتوں سے نوجوان نسل کو ادھر اسلام سے برگشتہ کیا جا رہا ہے، ادھر ہم اپنا اعتماد قائم کرنے کے لئے دوسروں کے اعتماد کو ختم کرنے پر، ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں اور موقع کس قدر نازک ہے۔ ہم کو اس کا ذرا احساس نہیں ہے۔ ہمارے مذہبی گروہ دین کے تقاضوں سے غافل ہو کر مسلمانوں کے درمیان نفرت کے بیج بونے اور حقارت کی کھیتیاں کاٹنے میں مصروف ہیں۔

اس وقت کو جو اللہ تعالیٰ بحیثیت امتِ مسلمہ ہم کو دئے ہوتے ہے غنیمت جانتے ہوئے ہم کو ایک ایسا نقطۂ اشتراک درکار ہے جو ملتِ اسلامی کو امتِ واحدہ میں سمو دے اور کفر و الحاد کے مقابلے میں بنیانٌ مرصوص بنا دے۔ دینی جماعتوں میں یہ بُعد دُوری، حسد اور عداوت عام مسلمان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس لئے کہ ان کے درمیان کوئی

جہ اختلاف نہیں ہے جو انہیں ایک دوسرے کے ساتھ چلنے سے روکتا ہو۔ اِن تمام فرقوں کی بنیادیں قرآن، سنت، اجماع اور اجتہاد پر مبنی ہیں جو سب کے نزدیک معتبر اور مشترک ہیں پھر ان بزرگوں نے اِس باب میں جو کچھ کیا ہے وہ اِس قدر قیمتی سرمایہ ہے کہ خود ان کے پیرؤوں کو اس کی خبر نہیں ہے تو آئیے ذرا اپنے ائمہؒ میں سب سے پہلے ہم یہ جان لیں کہ :

امام ابو حنیفہؒ کا نام نعمان بن ثابت ہے، کوفے کے رہنے والے ہیں۔ سنہ ٨٠ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ١٥٠ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ آپ کے زمانہ میں چار صحابی بقیدِ حیات تھے۔ بصرہ میں انس بن مالکؓ۔ کوفہ میں عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ۔ مدینہ میں سہل بن سعدؓ ساعدی اور مکہ میں ابوالطفیل عامر بن واثلہؓ۔ اِن کے ہزاروں شاگردوں میں سے دو بہت معروف و مشہور ہوئے۔ ایک امام محمدؒ اور دوسرے امام ابو یوسفؒ۔ دونوں نے بعض مسائل میں اپنے محترم استاذ ابو حنیفہؒ سے اختلاف کیا لیکن نہ عقیدت مجروح ہوئی نہ محبت میں فرق آیا۔ نہ انہوں نے خود کو حنفی کہا اور نہ اس مسلک کی بنیاد ڈالی۔ وہ خود کو صرف اور صرف مسلمان کہتے تھے کیونکہ اللہ نے دینِ اسلام کو قبول کرنے والوں کا نام قرآن میں مسلم اور مومن رکھا ہے۔ ہم نے اللہ کے رکھے ہوئے ناموں پر قناعت نہ کرتے ہوئے خود کو حنفی مسلمان کہلانے پر فخر کیا، وہ ایسا کیوں کرتے اور کرتے تو خدا کی پناہ یہ تجاوز شمار ہوتا۔

دوسرے امام مالک بن انس بن مالک ہیں سنہ ٩٥ھ میں پیدا ہوئے اور مدینہ میں سنہ ١٧٩ھ میں وفات پائی۔ آپ امام ابو حنیفہؒ (امام اعظم) سے عمر میں پندرہ سال چھوٹے ہیں۔ احادیث کی سب سے قدیم کتاب 'موطا' آپ ہی کی مرتب کردہ ہے۔ سالہا سال کی محنت کے بعد دس ہزار احادیثِ نبویؐ ہر کسوٹی پر پرکھ کر منتخب کیں۔ آپ مدینۃ الرسولؐ کے استاد الحدیث تھے اور ساٹھ سال تک روایتِ حدیث میں مشغول رہے۔ آپ کے ہزاروں شاگردوں میں امامِ شافعیؒ جیسے جلیل القدر لوگ گزرے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے نہ خود کو مالکی کہا اور نہ مالکی مسلک کی بنیاد ڈالی۔ بس اللہ کے دئیے ہوئے نام مسلم اور مومن ہی میں سب کچھ جانا اور اسی کو کافی سمجھا۔ امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ مجھے تو حضرت امامِ مالکؒ سے زیادہ کوئی قابلِ اطمینان نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اُن سے کوئی روایت ملے تو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لو۔ اس قدر عقیدت کے باوجود انہوںؒ خود کو کبھی مالکی نہیں بنایا۔

تیسرے امام شافعیؒ بمقام غزہ سنہ ١٥٠ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ٢٠۴ھ میں وفات پائی۔ آپ بنی ہاشم میں سے ہیں اور امام مالکؒ سے موطا کا درس لیتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادے عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ یہ شافعیؒ کون شخص ہیں تو جواب میں انہوں نے فرمایا کہ پیارے بیٹے! امام شافعیؒ دن کے آفتاب کی مانند ہیں خلقِ خدا کے حق میں وہ امن و عافیت کی طرح ہیں۔

—

اُن کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس کی نسبت اسلام کے ساتھ اس قدر زبردست ہو جس قدر امام شافعیؒ کی تھی۔ فرماتے ہیں کہ میں نے جب بھی کسی شخص سے مناظرہ کیا تو اس وقت یہی خواہش ہوئی کہ اللہ حق کو میری زبان سے واضح کر دے۔ خواہ اس کی زبان سے یعنی امام شافعیؒ کی۔ امام احمد بن حنبلؒ کی نظر میں امام شافعیؒ کی اتنی عظمت، عقیدت اور قدر و منزلت ہوتے ہوئے انہوں نے خود کو نہ کبھی شافعی کہلوایا نہ اس کے لئے کوئی گنجائش پیدا کی۔ حالانکہ وہ اگر ایسا کرتے تو قابلِ گرفت نہ ہوتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ خود کو دین کا ادنیٰ خادم سمجھا اور اللہ نے مُسلم اور مُومن جن ناموں سے اسلام کے پیروؤں کو موسوم فرمایا اسی پر ہر طریقے سے مطمئن رہے۔

چوتھے امام جناب **احمد بن حنبلؒ** ہیں جو ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے اور ۷۷ سال کی عمر پاکر ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔ امام شافعیؒ سے ۱۴ سال چھوٹے تھے۔ ابوزرعہ کہتے ہیں کہ انہیں دس لاکھ احادیث یاد تھیں۔ احمد بن سعیدؒ دارمی کہتے ہیں کہ میں نے کسی نوجوان کو امام احمد بن حنبلؒ سے زیادہ حدیثِ رسولؐ کا حافظ اور اس کے معانی اور فقہ کا واقف کار نہیں دیکھا۔ انہی کے متعلق امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں بغداد سے روانہ ہوا تو میں نے اپنے پیچھے کسی شخص کو امام احمد بن حنبلؒ سے بڑھ کر متقی، متورع، فقیہہ اور عالم نہیں چھوڑا مگر انہوں نے بھی نہ اپنے ناموں اور کاموں کے ساتھ کسی بھی لاحقہ اور سابقہ کی ضرورت محسوس نہ کی جیسے کہ بعد میں آنے والوں نے مستقل مسلک بنالئے اور مذہبی گروہ بندیوں میں اس قدر متشدد ہوگئے کہ اپنے فرقہ سے علاوہ دوسرے فرقے اُن کی نگاہوں میں گمراہ ٹھہرے۔

مسلمانوں کا مستقل مذہبی گروہوں میں تقسیم ہو جانا ملتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ تقسیم در تقسیم کا یہی عمل اپنی تمام تباہ کاریوں کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔ اب تو مساجد بھی فرقوں میں بٹ چکی ہیں اور ان کی پیشانیوں پر اُن کے مسالک نمایاں ہیں۔ فقہی مسائل میں یا جزدی معاملات میں جو غلو اور تشدد اختیار کیا گیا ہے اس سے مسلمانوں کے دل پھٹ چکے ہیں جس کی سزا وہ پچھلی صدیوں سے بھگتتے آرہے ہیں مگر احساسِ زیاں باقی نہیں رہا ہے کہ اپنا احتساب کریں اور مستقبل کی فکر کریں۔ اب اور اِس وقت ضرورت صرف اور صرف مسلمان بننے کی ہے۔ وہی مسلمان جو ہمارے آقا و پیارے نبی حضرت محمدؐ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رحمتِ دو عالم، آپ کے خلفائے راشدین، رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلف صالحین رحمہم اللہ اپنی بعد والی نسلوں کو بنانا چاہتے تھے۔ یہ تمام فرقہ بندیاں بعد کی پیداوار ہیں جو ہم جیسے کم علم لوگوں نے بنا ڈالیں۔ دلوں کو کاٹ بیٹھے۔ تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئے اور اللہ کی رسّی کو چھوڑ بیٹھے جس کے متعلق قرآن کے ذریعہ ہدایات دی گئی تھیں کہ "اے ایمان لانیوالو! اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو سب کے سب مل کر اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو"، پھر اسی طرح اُم تنبیہہ کو بھی بھلا بیٹھے کہ اگر تم نے اس کے برعکس کیا تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، دشمن سے تمہارا

سب ختم ہو جائے گا اور تم تباہ ہو جاؤ گے "، پھر اسی طرح آج ہم اس خوشخبری کو بھی نظر انداز کر رہے جو نبی پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی مبارک زبان سے ارشاد فرمائی:

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ جل جلالہٗ قیامت کے دن ارشاد فرمائے گا کہ کہاں ہیں وہ لوگ جو آپس میں دوستی رکھتے تھے میری بزرگی کے واسطے۔ آج کے دن میں اُن کو سائے میں رکھوں گا۔
یہ وہ دن ہے جس دن کوئی سایہ نہیں سوائے میرے سائے کے"۔

یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ اللہ کی بے پناہ شفقتوں اور انعامات کی بارشوں کو ہم غفلتوں کے دبیز پردوں میں چھپائے کفرانِ نعمت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس کے دین کو جگہ جگہ پامال ہوتے دیکھ رہے ہیں لیکن ہماری غیرتِ ایمانی بیدار نہیں ہوتی۔ آپس کی بحث و تکرار سے فرصت ملے تو سوچیں، کہ امتِ مسلمہ کیوں اور کس مقصد کے لئے وجود میں آئی، نبی پاکؐ کا دنیا میں بھیجنے کا مقصد کیا تھا؟ قرآنِ کریم کی کیا تعلیم تھی؟ اور اسے نبی پاکؐ نے کس طرح قولی و عملی طریقہ پر انسانوں کے لئے رائج فرمایا؟ بس یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جن کے جوابات پر ہماری دین و دنیا کی کامیابی کا انحصار ہے۔ (محمد صدیق خاں ۹۷/۴۔ ڈرگ روڈ۔ کینٹ کراچی ۸)

(۲)

ایں چہ بوالعجبیست؟

(گذشتہ سے پیوستہ)

از عبدالرحمان خاں مہمند

اور اب تکلف برطرف، قیام پاکستان کی اصلی اور حقیقی اساس کہ جسکی زبردست قوتِ اثر کے بغیر یہ نئی ریاست شاید کبھی معرضِ وجود میں نہ آتی اور جس سے بے رخی و بے وفائی کے نتیجے میں خسارے اور جگ ہنسائی کے سوا فی الحقیقت ملک و قوم کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ۵۸ء میں ایک بار پھر قوم کی نیم مردہ رگوں میں زندگی کی انتہائی رمق دوڑا گئی اور ملتِ پاکستان نے اجتماعی طور پر اپنے حقیقی مقاصد کی تحصیل کے لیے بے مثال قربانیاں پیش کیں۔ نتیجتاً "دورِ سیاہ" کو اپنی بساط لپیٹنا پڑی اور نئی روشنیوں کی جھلک دکھلاتا ہوا دورِ نو شروع ہوا۔ عزائم اس دور کے بانی کے بھی بڑے خوش کن اور اساسی نظریات و مقاصد سے ہم آہنگ تھے مگر کیا اُس کا عمل ان اونچے عزائم کے متقاضی اقدامات سے کوئی لگا کھاتا ہے؟ یا اگر نہج بدلی ہے تو کیا اسکے لابدی نتائج بھی سامنے آئے ہیں؟ اس کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں وسیع نقطۂ نظر سے معاملے کی تمام گرہیں کھولنا پڑیں گی اور پچھلے تقریباً چھ برس کی کارگزاری کو تنقیح کی سان پر چڑھانا پڑے گا تاکہ آئندہ کے لیے تحصیلِ خیر اور فلاحِ اُمت کے تقاضے پورے ہو سکیں!

لیکن یہاں ہم یہ امر واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے ہمارا مقصود شخصیت موضوع

میں کیڑے ڈالنا نہیں ہے اور نہ ہی اس کے کوئی منفی اثرات کسی بھی ذکی و فہیم قاری کے ذہن پر مرتسم ہو سکتے ہیں بلکہ اصل نیت جو بات کی تہہ میں کارفرما ہے، وہی اگر اسکے حقیقی مخاطبین پر واضح ہوجائے کہ ایک رجائیت پسندیہ قیاس کر سکتا ہے کہ شاید تاریخ کا دھارا ایک بار پھر صحیح رخ پر ڈالنے کی کوئی سنجیدہ کوشش مستقل عزم کیساتھ شروع کردی جائے۔ بصورت دیگر تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جن قوموں کے نفوس ناطقہ غلط پگڈنڈیوں پر سفر کریں، ان کی تقدیریں گہنا جایا کرتی ہیں اور یہ وہ تلخ سچائی ہے کہ جتنی جلدی اس سے اجتناب فکر کیا جائے گا، کاروان امت اتنی ہی جلد سسرالوں کی لعنت عظیمہ سے نکل کر عظمت پارینہ کیطرف گامزن ہوگا۔ !!

فی الاصل کسی بھی بڑے کام کے بحسن و خوبی تکمیل پذیر ہونے کے لیے چند بنیادی چیزوں کا ہونا ایک جزو لازم کی حیثیت رکھتا ہے ان میں اولین اور سب سے ضروری عنصر اس کام کے مبنی برحق ہونے کا مکمل یقین و ایمان ہے ایک ایسا ایقان جو کسی بھی درجے میں متزلزل نہ ہو۔ اور مخالف ہوا کا کوئی تیز ترین جھونکا بھی اسمیں لرزش پیدا نہ کر سکے اور جب یہ پہلی اینٹ بنیاد میں مضبوطی سے جم جائے تو اسپر اگلے تعمیری مراحل طے کرنے کے لیے بہترین اخلاص، صحیح ترین نہج پر اعلیٰ ترین منصوبہ بندی، جذبۂ محکم اور جہد مسلسل کا ہونا ناگزیر لوازمات میں شامل ہوتا ہے پھر ان اٹل اساسی ناصروں کے مستزاد ایک اور عنصر بھی حصول مقاصد کے ضمن میں نہایت اہم رول ادا کرتا ہے اور وہ یہ کہ اس راہ کی مسافرت میں رفیقان سفر بھی اپنے اندر مندرجہ بالا خوبیاں بدرجۂ اتم رکھتے ہوں اور کسی بھی نازک مرحلے پر ٹانگ کھینچنے والے حیران کی بجائے متعین کردہ منزل کے سیاق میں صائب الرائے اصحاب تعاون حاصل ہو۔ علاوہ ازیں جب ایک بات محکم ہوجائے تو پھر بغیر کسی امتیاز و ذہنی تحفظ مکمل طاعت کا جذبہ اپنی احسن ترین شکل میں کارفرما ہو!

چنانچہ ان راہنما اصولوں کے مطابق کوئی بھی حکمران اگر نفاذ اسلام کی کوشش ملک ہذا میں بھی کرتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ کامیابی کے در اس پہ وا نہ ہوتے۔ کیوں کہ یہ بات تو حق کی فطرت میں داخل ہے کہ اگر اسکے لیے کوئی سعی و جہد اسکی مطلوب نہج پر، مطلوب کردار کیساتھ کی جائے تو کامرانی منطقی طور پر لازماً قدم چومتی ہے مگر افسوس کہ یہاں اول تو بحیثیت نظام زندگی، اسلام کے فی زمانہ قابل عمل ہونے کے بارے میں یقین ہی نہیں تھا اور جب حکومت کی باگ ڈور اللہ کے کسی ایسے بندے کے ہاتھ میں آئی جو اس کے قابل عمل اور تقاضائے عمل پر یقین محکم رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی تنفیذ کی نیت بھی فی الواقع رکھتا تھا تو بات یوں الٹ پڑی کہ کام نہ تو کسی مضبوط منصوبہ بندی کے تحت ہوا اور نہ ہی سلیقے و ڈھنگ کا شمول مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے ضروری سمجھا گیا اور ہے ناطقہ سر بگریباں ہے، اسے کیا کہیے۔

یہ انتہائی بنیادی اور اولین درجے کے اقدامات کیے بغیر ہی اسلام جیسے اعلیٰ و منزہ دین کو الل ٹپ نافذ کرنے کی کوشش ناتمام کی گئی۔ ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر کے لیے کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا اکٹھا کرکے یہ سمجھ لیا گیا کہ ہم نے رستے کو سرے سے پکڑ لیا ہے اور عقل

س امر پر حیران رہ جاتی ہے کہ تعمیر سے پیشتر مجوزہ جگہ پر پڑے ہوئے گندگی و غلاظت کے ڈھیر
ہٹانے بھی ضروری نہیں سمجھے گئے۔
بدی اور خیانت کے سوتے بند کیے بغیر اور حقیقی معنوں میں تفتیش و تحقیق اور انصاف و
فیصلہ کی مربوط مشینری کی عدم موجودگی میں جب حدود آرڈیننس نافذ کیا گیا تو یہ بات اسی
وقت ہی اظہر من الشمس تھی کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکے گی۔ پھر اقتصادی میدان میں مطلوبہ
اصلاحات کے بغیر نظام زکوٰۃ کی پوری افادیت کبھی نکھر کر سامنے نہیں آسکتی اور سماجی زندگی میں
عزت و وقار کی غلط قدروں کے ہوتے ہوئے کیونکر آپ لوگوں میں حقیقی اسلامی شعور کیسے اُجاگر
کر سکتے ہیں؟ جہاں حال یہ ہو کہ جملہ ذرائع ابلاغ بے حیائی و تشدد کا آوازہ بلند کر رہے ہوں۔ ریڈیو
ٹی وی، فلم اور رسائل و جرائد پاکیزگی نفس اور اعلیٰ تعمیری سوچ پیدا کرنے کی بجائے گندگی ذہن
اور خباثت قلب پھیلانے کا "فرض منصبی" برسر عام ادا کر رہے ہوں۔ بازاروں میں کھلے عام
عورت کو "شو پیس" کے طور پر پیش کیا جاتا ہو کوئی اشتہار اس وقت تک مکمل نہ سمجھا جا رہا ہو کہ
جب تک عورت کی جاذبیت و کشش کے سارے رنگ اس میں زیادہ سے زیادہ حد تک بھر
نہ دیے جائیں پھر جس ملک کے بعض سینماؤں میں انتہائی قابل مؤاخذہ لچر فلمیں پورے دھڑلے کے ساتھ
دکھائی جاتی ہوں۔ جہاں بعض بدقماش جلب زر کی خاطر وی سی آر کے ذریعے لوگوں میں جرائم
بے غیرتی پھیلا رہے ہوں اور مختصر یہ کہ چاروں طرف سے حیا باختگی کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جا
رہی ہو، وہاں اگر آپ پوری قوت نافذہ رکھنے کے باوجود بھی ان چمکتی آنکھوں، اور خاموش
بولتی زبانوں کی حقیقی بنیادوں پر اصلاح نہیں کرتے۔ بلکہ محض زنا آرڈیننس نافذ کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں
کہ آپ نے دین کی بڑی خدمت سرانجام دی ہے اور تنفیذ اسلام کا ایک بڑا مرحلہ داخلی سطح کی
حد تک، طے کر لیا ہے تو حالات و مقتضیات کے تناظر میں اگر کسی صاحب نظر کی رائے لی جائے
تو نرم ترین الفاظ میں صرف یہی کہا جا سکے گا کہ

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے!

اس کی مثال تو ایسی ہے کہ آپ جلتی ہوئی آگ پر رکھے ہوئے پانی میں برف ڈالتے چلے جائیں۔
اور پھر حیران ہوں کہ پانی ٹھنڈا کیوں نہیں ہوتا؟ جس ریاست کی پولیس کا یہ حال ہو کہ ظلم و دھونس کی
وہ کونسی منزل ہے کہ جہاں تک اس کی رسائی ممکن نہیں اور رشوت جیسی لعنت جس کی گھٹی میں
پڑ چکی ہے، وہاں اگر اس ناسور کا بڑا اپریشن کیے بغیر حدود و تعزیرات کے نفاذ میں تفتیش
و تحقیق کے لیے اسی ادارے کو ہی دست و بازو بنایا جائے تو ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ
اسے اسلام کے نظام تعزیرات کو بدنام کرنے کی ایک لاشعوری کوشش نہیں سمجھا جائے گا؟
اس کے علاوہ جس معاشرے میں اقتصادی عدم توازن اعتدال کی حدود کو پھلانگ چکا ہو
اور تمام ذرائع ابلاغ بلا واسطہ و بالواسطہ سوسائٹی کے غریب و امیر طبقوں کے مابین موجود وسیع
خلیج کو نمایاں کرنے میں پیش پیش ہوں، وہاں اسلام سے متصادم بے مغز مگر بظاہر معاشی مساوات

کے علمبردار نظریات کو پاؤں پھیلانے سے کیسے روکا جاسکے گا اور بدعنوانی کے بہتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنا کیسے ممکن ہوگا؟

پھر جس ملک کے اندر بننے والی فلموں کی غالب اکثریت انتقام اور قتل و بہیمیت کے موضوعات پر مبنی ہو اور دیسی و بدیسی۔ غیراز شعائر دین فلموں کے ذریعہ چوری، ڈاکہ اور قتل جیسے قبیح افعال کو دلربا انداز میں پیش کیا جاتا ہو وہاں اگر چوری، ڈاکہ اور بربریت پر مبنی واردات قتل میں روز افزوں اضافہ ہو تو اس میں حیرانی کی چنداں کوئی علامت نہیں پائی جاتی! اور پھر اگر بغیر کسی ابتدائی اصلاح ایسی حالت میں حدود و دیگر شرعی سزائیں نافذ کر دی جائیں تو دین اسلام کی حقیقی روح اور انصاف کے بین نقطۂ نظر سے یہ کوئی خدمت اسلام نہیں ہو گی۔ بلکہ اس کا بالآخر نتیجہ موجودہ دور کے لیے اسلام کی فعالیت کے بارے میں تشکیک و ریب کے تاثرات کے پھیلاؤ کی صورت ہی نکلے گا!

پھر جس مملکت میں ٹیکسوں کا ایک ایسا غیر منصفانہ نظام رائج ہو کہ دیانت دار لوگ بھی اس کی ضربوں سے بچنے کے لیے خود کو جھوٹ بولنے پر مجبور سمجھیں، وہاں سچائی کی عظمت کا نقش کیسے ابھر سکے گا؟ جہاں سامانِ تعیش کی بے محابا درآمد کو ملکی ترقی اور مصنوعی چمک دمک کے لیے ضروری قرار دے دیا گیا ہو، جس سوسائٹی میں دنیوی عزت اور پاسِ ناموس کی ساری کی ساری اساس دولت کی کثرت میں مرتکز ہو کر رہ گئی ہو اور اللہ کے بندوں کو تقویٰ و پرہیزگاری اور علم و فہم کی بجائے معیارِ زندگی اور بنک بیلنس کے ترازو میں تولا جاتا ہو وہاں اگر طرزِ زندگی بدلے بغیر اور اصلاح کے ٹھوس زینوں پر قدم رکھنے سے پیشتر اسلام کا باہم نہایت مربوط ضابطۂ حیات بغیر کسی ربط کے ٹکڑوں ٹکڑوں میں، نافذ کرنے کی کوشش کی جائے گی، تو اس کے خاطر خواہ نتائج کبھی نہیں نکل سکتے۔

دراصل نصب العین کے حصول کے لیے ایک واضح، مرحلہ وار اور قابلِ عمل منصوبہ بنایا جانا چاہیئے تھا کیونکہ اصلاح کی اولین منزل ایک ایسی فضا کا قیام ہوتا ہے جس میں بدی اور گناہ کی طرف جانے والے راستے دشوار اور نیکی و بلند کرداری کی تحصیل میں آسانیاں و عزت کے سامان رکھ دیے جائیں، لوگوں کے سوچنے کا انداز ہی بدل دیا جائے اور اجتماعی طور پر تعمیر کے لیے وحدتِ فکر پیدا کی جائے۔ مگر ان بنیادی مقاصد کے حصول کے لیے حکومت کو ہمہ جہتی سطح پر کوشش کرنا پڑتی ہے اور اس کوشش میں فعال ترین اور ہمہ وقت چوکس و نگرانی کا کردار خود سربراہِ مملکت ادا کرتا ہے تاہم اصل کام شروعات سے پیشتر یہ ابتدائی سٹیج اس وقت تک تیار نہیں ہو سکتا جب تک ذرائع ابلاغ و اشاعت میں ایسی انقلابی تبدیلیاں نہ کی جائیں کہ جو دباؤ اور ناروا گھٹن پیدا کیے بغیر معاشرے میں ایک صحت مند عمومی اخلاقی حالت کی تیاری کا باعث بن سکیں لہٰذا یہ ایک لابدی ضرورت تھی کہ ایک ایسی مربوط و موثر پالیسی ڈیکلئر (DECLARE) کی جاتی کہ جس کے مکمل نفاذ کے بعد بے حیائی، بہیمیت اور سفلی ترغیبات کی اشاعت و پھیلاؤ کو زبردست تحدیدی اقدامات

کے ذریعے معدوم کردیا جاتا اور بداخلاق، ژولیدہ ذہن اور بزعمِ خود غلط عناصر سے سختی کے ساتھ نمٹنے کا ایک محکم و پائیدار نظام قائم ہوجاتا!

تفصیلات وجزئیات سے گریز کرتے ہوئے اب ذیل میں ہم یہاں اس مجوزہ پالیسی کا ایک اجمالی ڈھانچہ پیش کرتے ہیں کہ جس کا نفاذ پیش آمدہ حالات کے اندر کم از کم درجے میں ناگزیر کی حیثیت رکھتا تھا اور جسے معاشرے کے انتہائی اخلاقی بگاڑ کو آئیڈیل اسلامی ماحول میں تبدیل کرنے کی خاطر ایک درمیانی واسطے کے طور پر اپنائے بغیر چارہ نہیں تھا ——— چنانچہ حکومت کی جانب سے نفاذ کی نیتِ محکم کے ساتھ اعلان کیا جاتا کہ:۔

اولاً :۔ رومانس، انتقام و تشدد اور طبقاتی تعصب کے موضوع پر کوئی بھی فلم نہیں بنائی جاسکے گی۔

ثانیاً :۔ جرم وسزا اور پراسرار کہانیوں کے انعکاس کو کسی صورت برداشت نہیں کیا جائے گا۔

ثالثاً :۔ غیر ملکی فلمیں درآمد نہیں کی جائیں گی الا یہ کہ کسی خاص ٹیکنیکل یا اچھوتے موضوع پر بے حیائی سے پاک کسی فلم کی نمائش حکومت کی خاص اجازت سے کی جائے۔

رابعاً :۔ کسی بھی اشتہاری فلم میں عورت پردے سے نہیں لائی جاسکے گی۔

خامساً :۔ کسی بھی دستاویزی یا فیچر فلم میں کوئی عورت کسی بھی کردار میں غیر ساتر لباس میں پیش نہیں کی جاسکتی اور مزید یہ کہ اوڑھنیاں (دوپٹے) اپنے صحیح ترین مصرف میں آرہی ہوں۔

سادساً :۔ کسی بھی فلم میں شراب، جوا، رقص اور RAPE کے سین نہیں دکھائے جاسکتے۔ نیز کوئی بھی کردار اخلاق سے گرے ہوئے بے حیا رویے کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔

سابعاً :۔ کسی بھی قسم کا کوئی بھی نغمہ لچر مضامین سے بالکل مبّرا ہوگا بلکہ اس کے برعکس اس میں اسلامی وملی تاثر اور مشرقی روایات کا رنگ مثبت طور پر جھلکتا ہونا چاہیئے۔

ان مذکورہ بالا نواہی کے علاوہ صرف ایسی فلموں پر ہی ملک وملت کا سرمایۂ کثیر صرف کرنے کی اجازت ہوگی جن کا بنیادی مقصد لوگوں کو اپنے اسلاف کے صحیح کارناموں یا اعلیٰ کردار سے واقف کرانا، تقویٰ و پرہیزگاری کی اہمیت دلچسپ کہانی کے پیرائے میں اجاگر کرنا اور دین و ملک کے لیے جذبۂ جہاد بیدار کرنا ہوگا۔ یا پھر گھریلو و معاشرتی زندگی کے گوناگوں مسائل کے حوالے سے اسلامی احکامات وشعائر کے سیاق میں اعلیٰ اخلاقی رویوں کا درس ایک فرضی مگر حقیقی زندگی کے قریب ترین قصے کی صورت، مختلف کرداروں کے طرزِ عمل کے ذریعے دینا ہوگا۔

ٹی۔ وی کے لیے یہی پالیسی حکومت کے براہ راست کنٹرول کے باعث زیادہ چابکدستی کے ساتھ اپنائی جاسکتی تھی اور اس موثر ترین میڈیا کے ذریعے مثبت وتعمیری ماحول پیدا کرنے کی کامیابی کے راستے اور کشادہ ہوجاتے۔ اسی طرح ریڈیو کو بھی راہ نما اصول وضع کرکے دیئے جاسکتے تھے جن کی تعمیل کی صورت "بڑکوں" اور لغو نغموں کی بجائے نئی نسل کے کانوں میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے بہتر ومفید شیرینی گھولی جاسکتی تھی۔ پھر رسائل وجرائد کے ضمن میں اصلاح کی ابتدا اور فلمی ستاروں کے سکینڈلز (SCANDALS) پر مبنی تمام صحافت پر مکمل پابندی سے؛

کوئی رسالہ واخبار دیو مالائی کہانیاں، جرائم کی ترغیب آمیز داستانیں اور جنسیت زدہ مواد شائع کرنے کا مجاز نہ ہوتا۔ اور نہ کوئی دوکاندار اس نوع کا ملکی و غیر ملکی، قلمی یا تصویری سامان فاسد نہ بیچ سکتا۔

علاوہ ازیں بازاروں میں "رونق افروز" اشتہاری بورڈ یا کسی دوکان پر آویزاں کوئی تصویر کسی بھی خاتون کو کسی بھی حوالے سے EXPOSE نہ کر رہی ہوتی اور نہ ہی کوئی شخص دیسی و بدیسی بے ہودہ نغموں کے ریکارڈز اور کیسٹ فروخت کرنے کا کاروبار چلا سکتا۔

مذکورہ بالا بندشوں کے ساتھ ساتھ قوم کو ایک نئے اور عظیم انقلاب زندگی سے آہستہ آہستہ اور بہلو بہ پہلو روشناس کرانا اور اس کی نفسِ عظمت و برتری کا نقش عوام کے ذہنوں میں بڑی عمدگی کے ساتھ بٹھانا، جملہ ذرائع ابلاغ و اشاعت کا مقصد قرار دیا جاتا۔ مزید برآں دین اسلام جیسی نعمتِ عظمیٰ سے اکتساب فکر و عمل کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی حلاوتوں اور زندگی کے وسیع کینوس پر بکھرنے والے خوبصورت رنگوں کو مختلف دلکش طریقہ ہائے تعلیم و تمثیل کے ذریعہ عوام کے سامنے پیش کیا جا سکتا تھا جس سے ان کی آتشِ شوق بڑھتی اور ذہن ایک نئے طرز زندگی کو اپنانے کے لیے تیار ہو جاتے!

ابلاغ عامہ کے ذریعے مجموعی اخلاقی حالت کی درستگی اور تیاریٔ ذہن کے اس عمل کے ساتھ دوسرے معاشرتی روگ سمجھنا اور اُن کے صحیح علاج پر پوری توجہ دینا بھی ایک انتہائی ضروری امر تھا اور علاج کے اس مربوط پروگرام کا نقطۂ آغاز شعبۂ پولیس سے ہونا ایک لازمی تقاضا ہے۔ یہ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ چاہے کتنی ہی مراعات کیوں نہ دے دی جائیں اور چیکنگ کا انتظام کتنا ہی فعال کیوں نہ ہو۔ موجودہ پولیس سے من حیث المجموع خیر کی توقع رکھنا ایک عبث فعل ہی ہو گا۔ وجہ یہ ہے کہ ایک لمبے عرصہ کے غلط نظام کار کی بدولت ایسی علتیں اس کے مزاج میں راسخ ہو چکی ہیں کہ اب دین کے نظام عدل کو نافذ کرنے کے لیے ایک بہت بڑے آپریشن کی ضرورت اور ایک نئی اٹھان کی احتیاج ناگزیر کے درجے میں داخل ہے۔

لہذا اسلام کے پورے کے پورے نظام عدل و قسط اور خاص طور پر شرعی حدود کے نفاذ سے قبل ضروری تحقیق و تفتیش کے لیے انتہائی مناسب و موزوں تعداد پر مشتمل (جس کا اپنا الگ کیڈر سسٹم ہو) ایک نئی پولیس باڈی تیار کی جاتی اس نئی باڈی کے تمام کیڈرز کے لیے تعلیمی شعور، دینی فہم اور اخلاقی کردار کا معیار سخت کڑا رکھا جاتا اور اس کے چناؤ کو مختلف مرحلہ وار باریک چھلنیوں میں سے گزار کر پورا کیا جاتا نیز اس میں ذہین اور اعلیٰ خاندانی افراد کی کشش کے لیے باعزت و پروقار گزران پر مبنی تنخواہوں کا ایک الگ گریڈ سسٹم اپنایا جاتا۔ اور طمانیت بخش مراعات مہیا کی جاتیں!

پھر مخصوص اوصاف کی حامل منتخب کردہ اس نئی تنظیم کو قرآن و سنت کے مطلوبہ معیارِ کردار میں رنگنے اور جرائم کی تحقیق و تفتیش کے لیے اعلیٰ درجے کی فنی مہارت پیدا کرنے کی

خاطر خاص طور پر وضع کی گئی۔ ایک الگ اکیڈمی میں دو سال کی تربیت دی جاتی۔ اور اس بھرپور ذہنی و جسمانی تربیتی مرحلہ سے گزرنے کے بعد جو افراد کامیاب نکلتے ان میں مومنانہ فکر و کردار کی ایک نمایاں جھلک ضرور نظر آ رہی ہوتی۔ اب اس مرحلہ پر دوسری طرف ایک ضرب کاری لگانے کا موقعہ آ جاتا۔ چنانچہ پہلے سے موجود ساری پولیس نفری میں سے آفیسر کلاس میں دو تہائی اور ماتحت کلاس میں نصف افراد کو پنشن دے کر فارغ کر دیا جاتا (کیونکہ فی الحقیقت اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔) اور اس جبری ریٹائرڈ طبقے کے چناؤ کا کام نہایت دیانتدار، باصلاحیت اور قابل اعتماد وسیع مشینری سے لیا جاتا ان میں جن سے کم جرم سرزد ہوئے ہوتے انہیں کم سزا ملتی مگر جن کا اعمال نامہ بالکل سیاہ ہوتا انہیں ایک کھلی عبرت بنا دیا جاتا تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے وہ ایک ذہنی تازیانے کا باعث بنے رہیں۔ پھر موجود نفری میں آنے والی اس کمی کو نئی تیار شدہ پولیس سے پُر کر دیتے اور پچھلی باڈی میں سے بچ رہنے والوں کو بھی ایک سال کے اندر، چھ، چھ ماہ کی نئی تربیتی بھٹی میں سے گزار کر من حیث المجموع نئی تنظیم کی رہی سہی آلائشیں بھی دور کر دی جاتیں۔ اور ساتھ ہی ان کے لیے بھی نئی تنخواہ و مراعات کا نظام اپنا کر ساری پولیس میں یکتائی پیدا کر دی جاتی۔ اور یوں تین سال کے اس عرصہ میں پولیس کا ایک ایسا نیا اور مضبوط ڈھانچہ کھڑا ہو جاتا کہ جس کی دیانت، اعلیٰ اخلاق و کردار اور صلاحیت کار پر مکمل اعتماد کیا جا سکے۔

اس کے بعد اگر اس نئی تشکیل شدہ پولیس میں سے کوئی ذرا سا بھی راہ راست سے ہٹتا تو پرسش و تعزیر کا بے رحم کوڑا اس پر فوراً برستا۔ تاکہ شریعت کے سارے نظام عدل کو نافذ کرنے کے لیے اس بنیادی امدادی شعبے کی تمام چولوں پر امداد بحال رہے۔ اب جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ان اضافی اخراجات کا بوجھ کس طرح اٹھایا جاتا تو جواباً عرض ہے کہ انہی تین سالوں میں نظام اسلام کی تیاری کی مہم کسی ایک شعبے تک ہی محدود نہیں رہنی چاہیے تھی۔ بلکہ اقتصادی و صنعتی میدان میں اگر بالغ نظری اور کسی طرف سے دباؤ میں آئے بغیر وسیع تر قومی مفاد میں راست و منصفانہ فیصلے کیے جاتے اور بدعنوانی و بددیانتی کے گندے نالے سخت مارشل لاء ریگولیشنز کے مثالی اطلاق سے بند کر دیئے جاتے۔ تو اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا قومی بجٹ (جس کا اندازہ قریباً تیس فیصد قوم کے اجتماعی مفاد کی بجائے انفرادی و گروہی مفادات کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے) میں اتنی گنجائش ضرور نکل آتی کہ نئے مگر انتہائی ضروری اخراجات کی کفالت ہو سکے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ اللہ کے دین کے احیاء کے لیے نیک نیتی کے ساتھ کیا جانے والا کام اپنے اسباب و وسائل خود ہی پیدا کر لیتا ہے۔

به ایں همه تیاری ۔

انہی تین سالوں میں بعض دوسرے اقدامات کے ذریعے بھی قوم کا مزاج سطحی رخ سے اعلیٰ و تعمیری رخ پر ڈالا جانا ضروری تھا۔ چنانچہ اس عبوری عرصہ کے لیے اخلاقی جرائم، ظلم،

کی مختلف نوعیتوں اور لاقانونیت کی جملہ مکروہ صورتوں کو مارشل لاء کے سخت ضابطوں
کی چکی میں ہر ممکن حد تک پیسنے کا کام جاری رہتا۔ تاکہ ملک میں امن وامان کی ایک خوشگوار
فضا پیدا ہو اور جرائم پیشہ و دیدہ دلیر لوگوں کی طنابیں کسی جاسکیں۔ اعلیٰ اخلاقی اقدار کے فروغ
اور بنیادی محرکات کے خاتمے کی غرض سے گھروں سے باہر نکلنے والی عورتوں پر شرعی ساتر
لباس اور چادر کا استعمال لازمی کر دیا جاتا۔ ایک زبردست مہم کے ذریعے سمگلنگ کی بیخ کنی
کر دی جاتی اور اس پر چیکنگ کا ایک مضبوط نظام برقرار رکھا جاتا۔ مکانوں کی تعمیر میں رقبہ و آرائشی
میٹریل کے استعمال میں چند ضروری قدغنیں لگا دی جاتیں۔ ہر قسم کے غیر ضروری سامانِ تعیش کی
درآمد پر سخت پابندیاں عائد کر دی جاتیں اور تمام ضروری مصنوعات اپنے ملک کے اندر ہی تیار
کرنے کی ٹھوس بنیادیں رکھ دی جاتیں۔

پھر جدید دنیا اور اپنے دین کے اساسی نظریات کے جملہ تقاضوں کے ساتھ مطابقت
رکھتا ہوا نیا تعلیمی ڈھانچہ اسی PREPARATION PERIOD میں کھڑا کیا جاسکتا
تھا۔ نئے نظام میں درکار "حدود" کے سلسلے میں بالخصوص اور دوسرے امور میں بالعموم
اسلامی فقہ کے اعتبار سے نئے قوانین کی تدوین کے علاوہ ماہر جج اور قاضی حضرات تیار کیے جا
سکتے تھے (فقہ میں پبلک لاز میں اکثریتی مسلک اور پرائیویٹ لاز میں انفرادی مسلک کے
اطلاق کا اصول ایک محکم روش کے طور پر اپنایا جاتا)۔

حکومت فرقہ بندی میں انتہائی حکمت و مؤثر قوت کے ساتھ قابلِ ذکر حد تک کمی کر
سکتی تھی اور قوم کو منتشر گروہوں سے ملّتِ واحدہ کی شکل (جس حد تک صحت مند خطوط پر ممکن ہے)
دینے کا آغاز ہو جاتا۔ پھر شرک کے سوتے خشک کرنے میں مختلف النوع مدبرانہ اقدامات کے ذریعے
کامیابی حاصل کی جاسکتی تھی۔ سود کے خاتمے اور زکوٰۃ کے نفاذ کے لیے بہترین پالیسی کی مرحلہ وار
ترتیب و تشکیل کی جا سکتی تھی۔ بیوروکریسی کی تربیتِ نَو کے ذریعے انتظام مملکت کی یہ بنیادی
اینٹ بھی درست زاویے پر رکھی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ دفاعی نقطۂ نظر سے فوجی سطح
پر بالخصوص اور قومی سطح پر بالعموم ذہن و عمل میں ایک انقلاب برپا کیا جاسکتا تھا۔

چنانچہ تین سال کے اس انتہائی توجہ و محنت طلب 'ہوم ورک' کے نتیجے میں (حقیقت یہ
ہے کہ ایک صاحبِ عزیمت و باصلاحیت حکمران کے لیے یہ کوئی ناممکن اَمر نہیں ہے) بنیادی و ابتدائی
تیاری اس کم از کم سطح پر ضرور ہو جاتی کہ پھر ہم اس جدید و ترقی یافتہ دَور میں اسلام کے روشن و مکمل ضابطہ
حیات کو بغیر کسی ذہنی تحفظ، ہچکچاہٹ، احساس کمتری اور اندرونی و بیرونی سطح پر مختلف پریشرز کی پرواہ کیے فقط
اللہ ذوالجلال کی رحمت اور اپنی نیک نیتی و ہمت کے بھروسہ پر پوری قوت نافذہ کیساتھ متعارف کروا سکیں۔

اگر ایسے ہو جاتا تو اس مخلصانہ جدّوجہد کے نتائج اس قدر اثر انگیز نکلتے کہ انہیں حالات
شاید ہم ان کا تصوّر بھی نہ کر سکیں۔ تاریخ ایک لمبی استراحت کے بعد اسلام اور مسلمانوں کی نشاۃِ
ثانیہ کے حوالے سے ایک نئی کروٹ لیتی اور اس سنہری دَور کی نیو رکھی جا چکتی کہ جس کے انتظار

میں نہ جانے کتنی نسلیں اس صفحہ ہستی سے معدوم ہوگئیں اور سنت اللہ اور قوانین فطرت کے محکم دائمی تجربہ کی روشنی میں یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ پھر ہمارا ہر اگلا قدم دنیوی فلاح اور اخروی سرخروئی کی جانب ہی اٹھتا، زمین اپنے خزانے اگلنا شروع کر دیتی اور آسمان سے فضل برستا ——— اور مختصر یہ کہ طویل تاریخی کوتاہیوں کا قرض ملت اسلام اس دور میں، اس سرزمین پر چکانے کا آغاز کر دیتی! مگر وائے نصیب کہ شک و شبہ سے بالاتر اخلاص اور بلند عزائم رکھنے کے باوجود حقیقی تحصیل کامیابی کی کوئی ٹھوس منزل بھی طے نہیں کی جا سکی اور حصول مقاصد کی طرف جانے والے راستوں میں پائی جانے والی ساری کی ساری خلیجیں ابھی تک پاٹے جانے کے لیے کسی مرد قلندر کے نعرۂ مستانہ کی منتظر ہیں۔ اب تو امید کا پھاہا ہی اس رستے ہوئے زخم کا مرہم بن سکتا ہے۔

در طلب کوشش و مدہ دامنِ امید ز دست

دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

رفقاء تنظیم کے لئے ایک خوش کن خبر!

امیر تنظیم اسلامی - ڈاکٹر اسرار احمد اپنے دروس میں اکثر شیخ الہند کے ترجمے اور علامہ شبیر احمد عثمانی کے حواشی کا حوالہ دیتے ہیں - اور گاہے بگاہے رفقاء کو اس کے مطالعے کی تلقین بھی کرتے ہیں -

رفقاء کی سہولت کے لئے ادارے نے، قرآن کے وہ نسخے جن میں شیخ الہند کا ترجمہ اور علامہ عثمانی کے حواشی شامل ہیں، ایک محدود تعداد میں منگوائے ہیں - کراچی میں یہ نسخہ ۱۰۰/- روپے سے زائد قیمت پر دستیاب ہے جبکہ قارئین میثاق کے لئے یہ نسخہ ۹۰/- روپے میں ہدیہ کیا جائے گا۔ (علاوہ محصول ڈاک)

آفسٹ کاغذ، عمدہ طباعت اور پلاسٹک کا جزدان اس نسخے کی اہم خصوصیات ہیں - (میثاق کے پتے پر حاصل کیجئے)

رفتارِ کار

چار شہر ○ پانچ دن

(امیرِ تنظیم اسلامی کے جہلم تا بنوں کے دورے کی اجمالی رپورٹ)

یہ بات اب کوئی نئی اور غیر معمولی نہیں بلکہ آئے دن کا معمول ہے کہ امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اندرون اور بیرون ملک دعوت الی اللہ، دعوت رجوع الی القرآن کے داعی کی حیثیت سے لوگوں کی طلب اور پیاس بجھانے کے لئے اکثر و بیشتر دورہ پر جاتے رہتے ہیں اور اب ان کا لاہور میں قیام نسبتاً کم ہی ہوتا ہے۔

اسی طرح کا ایک پانچ روزہ دعوتی سفر پانچ ہی مقامات (جہلم، اسلام آباد، راولپنڈی، ٹیکسلا اور بنوں) کے لئے ۵ فروری ۸۴ء کی دوپہر سے شروع ہوکر ۹ فروری کی شام کو مکمل ہوا۔

ابتدائی دو روز تک امیر محترم کے یمین و یسار کی حیثیت صرف بھائی عاکف سعید صاحب اور بھائی سعید اسعد صاحب کو حاصل رہی اور تیسرے روز سے (۷ فروری تا ۹ فروری) راقم الحروف کو بھی امیر محترم کی رفاقت میسّر آئی۔

۵ فروری: ۵ فروری کو "پاکستان ٹوبیکو کمپنی" نزد جہلم، آفیسرز کالونی میں ایک مخصوص اجتماع سے امیر محترم کا خطاب تھا۔ جس کے بعد سوال و جواب کی نشست بھی تھی، واضح رہے کہ ہمارے لاہور کے ایک تنظیمی رفیق محترم جو لاہور کی کسی فرم میں A. C کا کورس مکمل کر رہے ہیں، مذکورہ کمپنی میں سالانہ Audit کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ (ظاہر بات ہے کہ کسی بھی واقعی و اصولی فکر و نظر کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اوّلاً تو اپنے حامل کی زندگی میں عملی روپ دھارے اور پھر طبعی طور پر اپنے اطراف و جوانب کو متاثر کرے، گویا عمل کے ساتھ ساتھ ابلاغ و دعوت کا بھی مرحلہ آتا ہے۔ اور ایک مردِ مومن "الدین النصیحۃ" کے پیشِ نظر انفرادی عمل و دعوت کے ذریعے نصح و خیر خواہی کا فریضہ انجام دیتا رہتا ہے۔ یہ اصولی و انقلابی تنظیم کا خاصہ ہے کہ اس کے افراد اور رفقاء میں بتدریج یہ ارتقائی عمل محسوس بھی ہو اور ظہور پذیر بھی ہو۔ ورنہ وہ ایک انجمن یا ادارہ تو ہوسکتا ہے لیکن وہ اصولی و انقلابی تنظیم کے زمرے میں نہیں آتی۔

الحمد للہ! بعض ایسے رفقا بھی ہیں جو اصلاح ذات کے ساتھ ساتھ ہمہ وقت و ہمہ تن مطلوبہ فکر و جذبہ رکھتے ہیں۔ فکری و عملی جذبہ سے سرشار ہوکر اپنا انفرادی اور ذاتی تشخص کھو کر اجتماعی، اصولی اور انقلابی تشخص کے علمبردار بن جاتے ہیں۔ پھر وہ جہاں کہیں بھی ہوں، خواہ سفر ہو یا حضر، دن ہو یا رات، آرام ہو یا بے آرامی، اپنے مشن کو نہیں بھولتے۔ ان کے نزدیک وقت کا صحیح مصرف و بہترین استعمال افراد اور معاشرہ کی اصلاح اور انقلاب ہوتا ہے ___ موصوف نے تفویض کردہ اور وقتی ذمہ داری کے ساتھ اصل اور حقیقی ذمہ داری کو نبھایا اور ممکنہ حد تک لوگوں تک دین کی بات پھیلائی اور پہنچائی۔ انہی کی مخلصانہ کاوش کا ثمرہ ہے کہ متعلقہ لوگ امیر محترم کی زبانی دین کے صحیح اور جامع تصوّر کو بالمشافہ سن سکے۔ اللہم سب کو عملاً پیشقدمی کی توفیق بخشے۔

جملہ رفقائے تنظیم اسلامی سے یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ وہ خالص رضائے الٰہی اور اخروی احساس مسئولیت کے پیشِ نظر اپنی ذمہ داریاں اور وفاداریاں امکان بھر پوری کرنے کی کوشش کریں گے اور ہر رفیق اپنی جگہ پر فکر و نظر، علم و عمل اور تبلیغ و دعوت کا روشن مینار ثابت ہوگا ___ آمین یا رب العٰلمین!

۶ فروری: ۶ فروری بروز پیر بعد نماز عشاء اسلام آباد کمیونٹی سنٹر میں امیر محترم نے سورۃ تغابن کا درس قرآن حکیم دیا۔ ایمانیات ثلاثہ اور ایمان کے ثمرات کو وضاحت سے بیان فرمایا۔ درس تقریباً تین گھنٹے جاری رہا۔

واضح رہے کہ اسلام آباد کمیونٹی سنٹر میں امیر محترم اگر پاکستان میں موجود ہوں تو ہر ماہ کے پہلے پیر کو، کافی عرصہ سے باقاعدگی سے درس قرآن دے رہے ہیں۔ اس دفعہ باوجود سخت سردی و بارش کے کمیونٹی سنٹر کا فرشی ہال پورا کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ اللہ ہماری قوم کو توفیق دے کہ وہ شوق استماع سے آگے بڑھ کر شوق عمل کی بھی تکمیل کر ڈالیں۔ ورنہ خدشہ ہے کہ تعطّل و جمود اللہ کے حضور ناقابل تلافی جرم قرار پائے۔

۷ فروری بروز منگل: راقم الحروف آج صبح ۸ بجے راولپنڈی پہنچا اور بقیہ پروگراموں میں امیر محترم کا شریک سفر و حضر رہا۔ ۹ بجے صبح کے بعد سے ایک بجے دوپہر تک کا وقت اسلام آباد میں گزرا۔ راقم الحروف نے بھائی حافظ عاکف سعید صاحب کی معیت میں یہ وقت شاہ فیصل مسجد اور اس سے ملحقہ جامعہ اسلام آباد کو دیکھنے اور پھرنے میں گزارا۔

ایک بجے کے بعد سے نماز مغرب تک کا وقت امیر محترم نے محترم جناب اکرم واسطی صاحب کی رہائش گاہ، جو ان کے اسکول سے ملحق ہے، میں گزارا، اس دوران راولپنڈی و اسلام آباد کے امیر محترم اور شکاگو اور امریکہ سے آئے ہوئے وہاں کے امراء سے ملاقاتوں کے علاوہ مقامی تنظیم کے رفقاء کی امیر محترم کے ساتھ خصوصی نشست بھی ہوئی۔ جس میں دو نئے نوجوان رفقاء جو فی الحال کسی مقامی کالج میں زیر تعلیم ہیں، بیعت کر کے تنظیم میں شامل ہوئے۔ (اس موقعہ پر واسطی صاحب کی پرتکلف اور پرخلوص ضیافت و مروت کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا)۔ اس خصوصی نشست کے باوجود، مزید یک روزہ امیر محترم کے ساتھ خصوصی نشست کی ضرورت محسوس ہوئی، جس میں وقت بھی کھلا ہو اور رفقاء بھی پوری ذہنی تیاری کے ساتھ اس کا بھرپور فائدہ اٹھائیں، غالباً ۵ مارچ کو اس کا انعقاد ہوگا، امید ہے کہ رفقاء چھٹی لے کر تیار رہیں گے۔

اس اجتماع کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ فہیم صاحب جن کا تعلق دیر سے ہے اور خط و کتابت کے ذریعے تنظیم میں شامل ہوئے تھے، وہ پہلے سے امیر محترم کے منتظر تھے آج انہوں نے امیر محترم کے ہاتھ پر واسطی صاحب کے گھر میں بیعت کی اور امڈتے ہوئے جذبات اور رقتِ قلبی کے ساتھ مزاحمت اور ذاتی بیمہ سے رجوع کرنے کا عزم کیا اور ساتھ ہی امیر محترم سے تنظیمی دعوت جو وہ خود بذریعہ کیسٹ و تنظیمی لٹریچر سے سمجھ چکے ہیں بصورت درس قرآن و خطاب آگے پہنچانے کی اجازت مانگی جو مل گئی۔

بعد نماز مغرب یہ مختصر سا قافلہ ٹیکسلا انجینئرنگ یونیورسٹی کی جانب رواں دواں ہوا جبکہ مغرب سے قبل آٹھ دس مقامی رفقاء تنظیم، مکتبہ و کیسٹس سونز کی دین پر لے کر ٹیکسلا روانہ ہو گئے تھے۔

اتنا عرض کرتا چلوں کہ ٹیکسلا انجینئرنگ یونیورسٹی میں امیر محترم کے خطاب کے پروگرام کے سلسلے میں اگرچہ وہاں کی اسلامی جمعیۃ طلباء کی خواہش کا زیادہ تر عمل دخل ہے لیکن اس سلسلہ میں فیصلہ کن کردار بھائی سعید اسعد صاحب کا ہے جنہوں نے مذکورہ یونیورسٹی سے سول انجینئرنگ میں B.E کیا ہے اور اب وہ تنظیم اسلامی میں شامل ہیں۔ اس سے پہلے اسلامی جمعیۃ طلبہ سے متاثر تھے۔ موصوف امیر محترم کے دوہرے رشتہ دار بھی ہیں یعنی داماد اور سگے بھتیجے۔ اور ایک تیسرا رشتہ بھی ہے جو ہمارے نزدیک سب سے اہم ترین ہے وہ یہ کہ نظری و فکری اور عملی اعتبار سے غلبۂ دین کے لئے ہمارے رفیق سفر ہیں۔ سعید اسعد صاحب لاہور سے بنوں اور بنوں سے واپس لاہور تک اپنی گاڑی سمیت امیر محترم کے رفیق سفر ہے اور بھائی عاکف سعید صاحب کے تعاون سے بیشتر راستہ ڈرائیونگ کی خدمات انجام دیں۔ اس اعتبار سے مجھ پر ان کا شکریہ ادا کرنا اخلاقاً واجب ہے۔

جوں ہی ہماری گاڑی انسٹی ٹیوٹ کے احاطہ میں اقبال ہال پہنچی، جہاں پہلے سے موجودہ یونین کے زیر اہتمام مشاعرہ جاری تھا، طلباء نے امیر محترم کی آمد پر پرجوش اور جذباتی نعروں سے استقبال کرتے ہوئے خوش آمدید کہا اور لاؤڈ اسپیکر پر مہمانِ گرامی کی آمد کی اطلاع کی، اگرچہ انسٹی ٹیوٹ میں پہنچنے سے قبل راولپنڈی میں طلباء کے مابین کشیدگی اور نازک صورتحال کا علم ہو گیا تھا اور مشاہدہ سے بھی اس کی تصدیق و توثیق ہو گئی۔ مگر الحمد للہ! کہ ۲ گھنٹے کے بھرپور خطاب کے دوران نہ تو کوئی ناخوشگوار واقعہ سامنے آیا اور نہ ہی بدمزگی و انتشار

کی سی کیفیت بلکہ اس پورے عرصہ میں جملہ طلباء اپنے اساتذہ و پرنسپل صاحب سمیت پرسکون اور ہمہ تن متوجہ رہے۔ امیر محترم نے جہاد اور
انقلاب کے مراحل پر مربوط گفتگو فرمائی۔ جس پر پرنسپل صاحب کے علاوہ طلباء کا بھی یہی تاثر تھا کہ ایسے موضوعات پر بیسیوں علماء نے اس سے
قبل یہاں اظہار خیال کیا مگر آج کا خطاب ان سب میں منفرد اور مدلل و محکم تھا۔ اقبال ہال کی نہ صرف جملہ نشستیں پر ہو گئیں بلکہ اسٹیج سے لے کر
جملہ اطراف و جوانب طلباء سے بھر گئے۔ جیسے بھی جہاں جگہ ملی وہ وہیں بیٹھے یا کھڑے ہو کر شوق استماع پورا کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب میں یہ
جذبہ و شوق عمل پیدا فرمائے۔ آمین

۱۱ بجے فارغ ہوئے تو منتظمین جلسہ نے کھانے کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ اس سے قبل پہنچنے پر بھی انہوں نے چائے وغیرہ سے ہماری
تواضع کی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان مخلص ساتھیوں کو جزائے خیر دے اور یہی دینی جوش و جذبہ برقرار رکھے۔ لگ بھگ بارہ بجے رات کو طلباء نے ہمیں
الوداع کہا اور ہم منزل مقصود بنوں کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ پشاور سے ہوتے ہوئے ہم پونے تین بجے رات کو کوہاٹ کی حدود میں داخل
ہوئے تو آگے اپنے کوہاٹ کے متوقع میزبان ڈاکٹر محمد مطیع اللہ صاحب کو اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ مسلح منتظر پایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کوہاٹ
شہر میں رات کو گھروں سے باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ چونکہ بعض قبائلی لوٹ مار اور اغواء کی وارداتوں میں مشغول رہتے ہیں۔ یہی
کیفیت بنوں شہر جا کر بھی معلوم ہوئی کہ پیسے بٹورنے کی خاطر مالدار اور پُرامن شہریوں کو دن دہاڑے کچھ قبائلی اغواء کر کے لے جاتے ہیں۔

۸ فروری بدھ : ہمارے میزبان محترم ڈاکٹر محمد مطیع اللہ صاحب نیک سیرت و کردار اور عمدہ اخلاق و دینی جذبہ کے حامل ہیں۔
ہیں جن سے امیر محترم کی پہلے سے کوئی واقفیت نہیں ہے بلکہ تعارف محض ماہنامہ "میثاق" کے توسط سے ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف
اپنے اقرباء اور معززین شہر کو اپنے یہاں امیر محترم کی آمد کی اطلاع اور ملاقات کی دعوت دی تو اکثر نے بقول ان کے "محض بڑ" سے تعبیر کیا۔
جب یہ بات حقیقت نکلی تو جملہ حضرات کو امیر محترم سے ملاقات کر کے تعجب اور دلی مسرت ہوئی۔ ہمارے میزبان محترم کے گھر سے متصل بڑی
مسجد میں نمازیوں کے اصرار و تقاضے پر امیر محترم نے صبح کی نماز کی امامت کی اور ناشتے پر ہمارے ساتھ معززین شہر نے بھی شرکت کی اور دوبارہ
دوبارہ آنے کی دعوت دے کر بعد اشتیاق و اصرار وقت مانگا۔ بغرض ملاقات آنے والے حضرات میں سے چند کے اسماء گرامی یہ ہیں: ریٹائرڈ
ل صاحبزادہ صادق نور صاحب، جناب ڈپٹی عاشق نور ریٹائرڈ پرنسپل، جناب محمود شوکت صاحب، جناب حاجی حنیف شاہ اور کوہاٹ کینٹ
بورڈ کے وائس چیئرمین جناب رؤف شاہ صاحب۔

۹ بجے صبح جب ہم بنوں شہر کے لئے روانہ ہوئے تو صاحب خانہ جناب ڈاکٹر محمد مطیع اللہ صاحب کے ہمراہ چند دیگر افراد ہمیں
الوداع کہنے کے لئے کوہاٹ شہر کی حدود سے باہر تک ہمارے ساتھ آئے (فجزاھم اللہ احسن الجزاء)

کوہاٹ سے روانگی سے قبل کوہاٹ سے امیر محترم نے استاذ مکرم مولانا الطاف الرحمٰن صاحب سے ٹیلیفون پر بات چیت کی اور
میں اپنی کوہاٹ موجودگی اور بنوں کی طرف روانگی کی اطلاع دی، استاذ محترم نے فرمایا کہ ہم بنوں شہر سے باہر آپ کا انتظار کریں گے۔ جب
قصبہ ٹوڈی میل پہنچے جو بنوں شہر سے تقریباً ۱۰ کلومیٹر پہلے آتا ہے تو ہم نے کالج بس کی موجودگی میں نوجوان طلباء کا ہجوم دیکھا جو متجسس نگاہوں سے
کسی آنے والے کے منتظر معلوم ہو رہے تھے۔ جو یقیناً امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہی تھے مگر عجیب اتفاق کہ ہم جھٹکے کے ساتھ رکے
بھی مگر مولانا الطاف الرحمٰن صاحب کو ان میں نہ پا کر فوراً ہی چل پڑے۔ ایک دو میل بمشکل آگے بڑھے تھے کہ دس بارہ کاروں پر
مشتمل ایک قافلہ مخالف سمت سے جاتے دیکھا، گمان تو نہیں بھی تھا کہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے میزبان حضرات ہوں مگر ایک تو بارہ تیرہ کلومیٹر
ابھی باقی تھا اور دوسرے یہ کہ مقدمۃ الجیش یعنی پہلی کار میں استاذ مکرم مولانا الطاف الرحمٰن موجود نہ تھے۔ تاہم کسی درمیانی کار میں
مولانا کو اور دیگر حضرات کو ہاتھ ہلاتا دیکھ کر ہم رک گئے۔ اتنے میں کالج اسٹوڈنٹس سے اوپر نیچے کھچا کھچ بھری ہوئی بس ہمارا پیچھا کرتی ہوئی
پہنچی۔ ہر طرف سے سوار اپنی سواریوں سے اتر کر معزز مہمان کی طرف پیشقدمی کرنے لگے۔ عجیب سماں اور ناقابل فراموش منظر تھا۔ جانبین
میں اجنبی افراد کی ہیجانات سی تھی مگر قربان جائیے پیغمبر آخر الزمان اور نبی عربی صلعم اور ان کے لائے ہوئے سچے دین اسلام کے کہ باوجود جان پہچان

بزاجت وطنی و شخصی، اخوت و محبت اور دینی جذبات کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ جانبین سے ہر شخص دوسرے سے بغل گیر ہو کر اپنی اسلامی و دینی محبت و خلوص کا احساس و یقین دلا رہا ہے۔ امیر محترم کا یہ استقبال محض دعوت رجوع الی القرآن کے سچے داعی و خادم کی حیثیت سے ہو رہا ہے۔ جس میں نعروں کے علاوہ Gun firing ہو رہی ہے۔ معززین شہر کے علاوہ طلباء کا جوش و خروش اور سچا اسلامی جذبہ دیدنی تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ مجوزہ پروگرام (یعنی کالج میں امیر محترم کا خطاب) پرنسپل صاحب کے اجازت نہ دینے پر منسوخ ہو چکا تھا باوجود اس کے طلباء نے اپنی دینی حمیت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس ہنگامہ خیز استقبال اور خوش آمدید کے بعد استقبالی قطاروں میں یہ قافلہ بنوں شہر کی طرف روانہ ہوا اور بھرے بازاروں سے گزر کر امیر محترم بار ایسوسی ایشن کے احاطہ میں پہنچے راستے میں بنوں کے شہریوں نے ہاتھ کے اشاروں اور آنکھوں کی چاہت سے استقبال کیا۔

پروگرام کے مطابق ٹھیک گیارہ بجے دن امیر محترم کو بنوں بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرنا تھا مگر استقبال کی وجہ سے پونے گھنٹہ تاخیر ہو گئی، احاطہ عدالت میں وکلاء اور جج صاحبان نے خوش آمدید کہا اور پہنچتے ہی کارروائی کا آغاز ہو گیا۔ بار ایسوسی ایشن کے صدر نے معزز مہمان کا بنوں اور خصوصاً ان کی دعوت پر بار میں تشریف آوری کا خلوص بھرے جذبات ایمانی کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور امیر محترم کو دعوت خطاب دی، امیر محترم نے Gathering کے مناسب حال "اسلام اور پاکستان" کے موضوع پر ۵۰ منٹ خطاب فرمایا جس میں قیام پاکستان کے محرکات کا تجزیہ پیش کیا اور نظریاتی مملکت کی سالمیت و بقاء اور جواز کے لئے "نفاذ اسلام" کو منطقی استدلال سے ثابت کیا، خطاب کے بعد چند افراد نے سوالات بھی کئے جن کے امیر محترم نے جوابات دیئے، وقت کی کمی کے باعث یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔

اس کے بعد ہمیں مہمان خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ اور میزبانی کا شرف پروفیسر جاوید اقبال صاحب اور جمشید اقبال صاحب نے حاصل کیا۔ بنیادی طور پر ہمارے میزبان اور دعوت کنندہ استاذ مکرم حضرت مولانا الطاف الرحمٰن صاحب تھے۔ جنہوں نے یہ سارا پروگرام جناب حضرت مولانا حاجی محمد صاحب جاذب اور دیگر علماء کرام کے تعاون سے ترتیب دیا تھا۔ اس موقعہ پر ہماری طرف سے جملہ حضرات جنہوں نے اس کار خیر میں دلچسپی اور عملاً حصہ لیا شکریہ کے مستحق ہیں۔ خصوصاً مولانا الطاف الرحمٰن صاحب جو اصلاً تو اپنے کسی ذاتی کام کے لئے گھر (بنوں) تشریف لے گئے مگر محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ چند دن ذاتی مشاغل کے بجائے اس پروگرام کی نذر کر دیئے۔ فی الواقع انہوں نے جس جذبہ اور تندہی کا ثبوت دیا، اس سے محسوس ہوتا تھا کہ گویا وہ ہماری تنظیم اسلامی کے رفیق اور کارکن ہیں۔

بحیثیت استاذ قرآن اکیڈمی مولانا محترم کو ہمیں قریب سے اور کھل کر دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ان کا کھرا پن، دوٹوک انداز، جرأت و بے باکی اور نصح و خیر خواہی کا جذبہ لائق تحسین و تقلید ہے۔ اس عرصہ میں جہاں مولانا محترم نے علماء حقہ کی ترجمانی و طرفداری اور موقف کی معتدلانہ تعبیر و تاویل سے ہمیں متاثر کیا ہے وہاں کھلے دل کے ساتھ اخذ و اعطاء اور افہام و تفہیم سے بھی کام لیا ہے۔ مولانا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ وسیع اور کھلے ظرف کے ساتھ بات سنتے ہیں اور جرأت و استقامت کے ساتھ استدلال و استشہاد کرتے ہیں۔ صحیح بات مانتے بھی ہیں اور منواتے بھی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر احساس مسئولیت کا جذبہ انسان کے باطن میں کارفرما ہو تو وہ تعصب، حمیت جاہلیہ اور اختلاف برائے تفرقہ سے بالقصد احتراز کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دو دھارے جن میں عملاً تا حال بعد المشرقین موجود ہے۔ باہم مل کر خالصتاً لوجہ اللہ، اقامت و غلبہ دین کی مشترکہ و متحدہ جدوجہد کریں تو بلاشک و ریب یہ امت مسلمہ کی صلاح و فلاح کی بڑی خدمت ہو سکتی ہے۔

باقی صوبوں کی نسبت صوبہ سرحد کے عوام کی اکثریت کی دین کے ساتھ عملی وابستگی علماء حقہ کی مخلصانہ مساعی کا واضح ثبوت ہے۔ ویسے بھی بنوں شہر کے علماء کرام کے مثبت اور پرخلوص طرز عمل کو دیکھ کر دل میں ان کے لئے عقیدت و احترام کے جذبات میں اضافہ ہوا ہے [illegible] اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنی رضا کے لئے ہمارے مابین انس و محبت اور اشتراک و اتحاد کے جذبات کو پیدا

چڑھائے تاکہ ہماری اجتماعی و متحدہ قوت اس کے دین کی نصرت اور اس کے اعداء کی سرکوبی میں صرف ہو۔ (آمین)

دوپہر کا کھانا پروفیسر صاحب کے ہاں کھایا اور رات کا کھانا اور قیام بھی انہی کے ہاں رہا جبکہ صبح کا ناشتہ جناب بہاء الدین صاحب کے ہاں تھا جس میں انہوں نے علماء کرام، معززین شہر، بلدیہ بنوں کے چیئرمین اور کونسلرز حضرات کو بھی مدعو کیا ہوا تھا۔ پروفیسر صاحب اور ان صاحب کے ہاں دعوت میں شریک ہو کر ہم نے سرحد کے مسلمانوں کی مہمان نوازی اور چاہت کا خوب مظاہرہ دیکھا۔

نماز ظہر کے بعد جامع مسجد میلاد النبی میں امیر محترم نے "عظمتِ قرآن" پہ ایک گھنٹہ خطاب فرمایا۔ واضح رہے کہ اسی مسجد میں دینی مدرسہ جس کے مہتمم جناب مولانا حضرت علی صاحب اور ناظم جناب مولانا حاجی محمد صاحب جاذب ہیں، کیلئے امیر محترم نے مدرسے کی خدمات و کارکردگی سن کر اپنے تاثرات بھی مہمانوں کے رجسٹر میں قلم بند کئے۔ اللہ تعالیٰ اس دینی مدرسہ کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ اب سے قبل اور بعد امیر محترم کی علماء کرام کے ساتھ خصوصی نشست بھی ہوئی اور اسی طرح پروفیسر جاوید اقبال صاحب کے مکان پر جہاں ٹھہرے ہوئے تھے علماء کرام و دیگر معززین شہر کے ساتھ بھی بعد نماز مغرب تعارفی و مذاکراتی نشست رہی۔

بعد نماز عشاء امیر محترم نے جامع مسجد ٹانچی بازار، جس کے خطیب و امام جناب حضرت مولانا حاجی محمد صاحب جاذب ہیں، تقریباً ۱½ گھنٹے "ہماری دینی ذمہ داریاں اور انقلاب کے مراحل" پر گفتگو فرمائی اور اسی مسجد میں پھر صبح کی نماز کے بعد سورۃ آل عمران کی آیات ۱۰۲، ۱۰۳ اور ۱۰۴ کا درس قرآن دیا اور اس کے بعد سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی۔

امیر محترم کو بنوں دوبارہ تشریف لانے کی دعوت علماء کرام، معززین شہر اور نوجوان طبقہ نے بڑے اشتیاق و محبت کے ساتھ دی جس پر امیر محترم نے آمادگی ظاہر کی۔ ان شاء اللہ ماہ مارچ ۸۴ء میں کوہاٹ اور بنوں دونوں شہروں میں خطابات اور درسِ قرآن کے لئے امیر محترم تشریف لے جائیں گے۔

روانگی: صبح کے درس قرآن اور ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم بنوں سے لاہور کی جانب عازم سفر ہوئے، واپسی پر مولانا الطاف الرحمٰن صاحب نے بھی بذریعہ کار بنوں سے لاہور تک سفر ہمارے ساتھ کیا۔ صبح نو بجے بنوں سے روانہ ہوئے۔ دوپہر کا کھانا میانوالی میں امیر محترم کے میڈیکل کالج کے ساتھی جناب ڈاکٹر محمد انور صاحب کے ہاں کھایا اور عصر کی نماز اور چائے گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل کے ہاں پی اور اس طرح تقریباً ۹ بجے شب قرآن اکیڈمی میں سفر کا اختتام ہوا۔ مرتب: (حافظ) محمد رفیق،

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

فیلو قرآن اکیڈمی !!

گوجرانوالہ میں ایک دن

۲۴، فروری جمعرات کو امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب طلبہ کی دعوت پر گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں تشریف لائے۔ آپ کے لئے طلبہ اس طرح امنڈ کر آئے کہ آڈیٹوریم کی تنگ دامانی نمایاں ہو گئی جب ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی تو لڑکے سٹیج پر بیٹھنا شروع ہو گئے اس موقع پر اپنے آگے بچھی ہوئی میز پر سے میز پوش اتار کر خود ڈاکٹر صاحب نے سٹیج پر بچھا دیا۔

بعض وجوہات کی بنا پر چونکہ طلبہ میں ایک بے چینی اور اضطراب سا تھا اس لئے خدشہ تھا کہ لڑکے خطاب سے پہلے یا خطاب کے دوران لاابالی انداز میں نعرہ بازی کرنے لگیں گے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی تقریر اول تا آخر پورے سکون و سکوت سے سنی گئی۔ پورا ہال سحر زدہ تھا۔ دین کی بات سننے میں نوجوان نسل کا یہ اشتیاق و انہماک بڑا خوش آئند اور امید افزا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا موضوع تھا "حضور صلی اللہ علیہ وسلم بطور قائدِ انقلاب"۔ آپ نے فرمایا حضور صلعم نے جس بے مثل و بے مثال انقلاب کی تکمیل فرمائی وہ ان چھ مراحل سے گزرا تھا۔ آج بھی اگر ہم اسلامی انقلاب چاہتے ہیں تو ان مراحل سے گزرے بغیر چارہ نہیں —— اول دعوت، دوم تنظیم، سوم تربیت، چہارم صبر و مصابرت، پنجم اقدام اور ششم تصادم —— لیکن یہ اس طرح نہیں ہے کہ ایک مرحلے سے گزر کر دوسرے میں داخل ہوا جائے۔ نہیں بلکہ یہ تمام مراحل ساتھ ساتھ ہی جاری رہتے ہیں۔

کالج میں خطاب کے بعد ڈاکٹر صاحب قریب ہی واقع جامع مسجد سٹیلائٹ ٹاؤن میں تشریف لے گئے۔ جہاں ظہر کی نماز کے بعد "ختم نبوت" کے موضوع پر خطاب فرمایا ــــ اگرچہ آپ کی گوجرانوالہ آمد کی تشہیر نہ ہو سکی تھی اور ویسے بھی یہ ایک کاروباری دن (Working day) تھا لیکن پھر بھی سامعین کی اچھی خاصی تعداد مسجد میں چشم براہ تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے معروف قرآنی آیت "وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" کی بجائے "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" والی آیت مقدسہ کو اپنے استدلال کی بنیاد بنایا۔ اس طرح کہ مضمون اپنی تمام باریکیوں، نزاکتوں اور رعنائیوں کے ساتھ قلوب میں اترتا چلا گیا۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی دعوت پیش فرمائی جس پر بہت سے حضرات نے لبیک کہا۔ چنانچہ نماز عصر کے بعد 581/B سٹیلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ میں دس سے زائد اصحاب نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ تنظیم کے پرانے رفیق جناب شیخ عبداللطیف صاحب کو مقامی تنظیم کا ناظم مقرر کیا گیا۔ اور یوں گوجرانوالہ کا یہ کامیاب دورہ اختتام پذیر ہوا۔ گوجرانوالہ کے لوگ پھر ڈاکٹر صاحب کی جلد تشریف آوری کی امید رکھتے ہیں۔

مرتب ــــــ محمد یعقوب

حویلی لکھا۔ ۲۶-۲۷ فروری ۱۹۸۴ء

مرتبہ: جلال الدین (رفیق تنظیم اسلامی)

۲۶ فروری کو صبح سوا گیارہ بجے ہم بذریعہ کار حویلی لکھا کے لئے روانہ ہوئے۔ اور تقریباً ۲½ بجے حویلی پہنچے ــــ کار سیدھی حویلی کے ٹاؤن ہال پہنچی۔ جہاں چیئرمین امداد حسین صاحب نے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا استقبال کیا۔ دوپہر کے کھانے کا اہتمام چیئرمین صاحب نے اپنے ہاں کیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں لیاقت علی خان لودھی صاحب کی رہائش گاہ پر لے جایا گیا۔ جہاں ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ نماز ظہر باجماعت ادا کرنے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا ــــ نماز عصر ساڑھے چار بجے جامع مسجد بلقیسیہ میں ادا کی۔ اس کے بعد امیر تنظیم نے حویلی کے علمائے کرام، اساتذہ کرام، اخباری نمائندگان اور وکلاء حضرات سے مختصر خطاب کیا اور سوالات کے جواب دیئے یہ سلسلہ مغرب تک جاری رہا۔

ڈاکٹر صاحب کا وہ مفصل خطاب جس کے لئے انہیں حویلی آنے کی دعوت دی گئی تھی چونکہ عشاء کے بعد تھا لہٰذا نماز مغرب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنی قیام گاہ پر کچھ آرام کیا ــــ رات کا کھانا بھی چیئرمین صاحب کے ہاں تھا۔ کھانے میں علماء حضرات، وکلاء، دیگر معززین شہر اور جلسے کے مہمانِ خصوصی جناب میاں منظور احمد صاحب وٹو چیئرمین ضلع کونسل اوکاڑہ بھی شریک تھے۔ نماز عشاء جامع مسجد بلقیسیہ میں ادا کرنے کے بعد ہم سب ٹاؤن ہال کے باہر جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ مہمانِ خصوصی جناب منظور احمد وٹو صاحب نے ابتداء میں ڈاکٹر صاحب کو خوش آمدید کہا اور تعارفی کلمات کہے۔ بعد ازاں رات ۹½ بجے سیرت النبیؐ پر ڈاکٹر صاحب کا مفصل خطاب شروع ہوا جو تقریباً پونے بارہ بجے تک جاری رہا۔ یہ ایک بھرپور جلسہ تھا جس میں ایک اندازے کے مطابق ۳ ہزار مرد اور پانچ چھ سو سے زائد خواتین شریک تھیں ــــ جلسہ گاہ کے باہر تنظیم کی کتابوں کا سٹال بھی لگایا گیا تھا۔

رات لودھی صاحب کے ہاں قیام کیا اور صبح فجر کے بعد امیر تنظیم نے جامع مسجد بلقیسیہ میں درسِ قرآن دیا۔ اور ہماری دینی ذمہ داریوں کو وضاحت سے بیان فرمایا۔ بعد میں سوال و جواب کی نشست ہوئی اور یہ سلسلہ ۹½ بجے تک جاری رہا۔ اس موقع پر ۲۹ افراد نے امیر تنظیم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ انہی میں سے ایک صاحب کو ان کا ناظم بنا دیا گیا ــــ بعد ازاں لودھی صاحب کے ہاں مزید دو افراد بیعت کر کے تنظیم میں شامل ہو گئے ــــ ناشتے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اجازت مانگی اور لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس طرح حویلی لکھا کا یہ مختصر لیکن بھرپور پروگرام اختتام کو پہنچا۔

امیر تنظیم کا دورۂ پشاور

(۲۹ فروری تا یکم مارچ ۱۹۸۴ء)

موجودہ لیپ کے سال نے ماہ فروری میں ایک دن کا اضافہ کیا اور یہی اضافہ پشاور کے رفقاءِ تنظیم کے لئے خصوصی طور پر اور اہالیان پشاور کے لئے عمومی طور پر موجبِ خیر و برکت ثابت ہوا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ رفقاء تنظیم اسلامی کے اصرار پر اور جناب حاجی عبدالرشید صاحب کی دعوت پر امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور قیم تنظیم اسلامی جناب قمر سعید قریشی صاحب دو روزہ دورے پر پشاور تشریف لائے۔

امیر تنظیم اسلامی راولپنڈی سے بذریعہ کار اکوڑہ خٹک تشریف لائے جہاں پر انہوں نے مشہور عالم دین جناب مولانا عبدالحق صاحب سے ملاقات کی اور کچھ دیر قیام فرمایا۔ اکوڑہ خٹک نوشہرہ سے چند میل دور ایک بہت بڑا قصبہ ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد یہاں پر مولانا عبدالحق صاحب نے ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھی جس کا شمار آج کل پاکستان کی عظیم دینی درسگاہوں میں ہوتا ہے۔ مولانا عبدالحق اور مولانا سمیع الحق صاحب سے ملاقات کے بعد امیر تنظیم اسلامی بعد دوپہر پشاور پہنچ گئے۔ اسی دوران قیم تنظیم اسلامی جناب قمر سعید قریشی صاحب براہ راست راولپنڈی سے پشاور تشریف لائے اور اپنی آمد کے فوراً بعد تنظیم کے دفتر تشریف لے آئے جہاں تمام رفقاء پہلے سے موجود تھے اور تنظیمی امور کے بارے میں ایک اجتماع ہونا قرار پایا تھا۔ قیم صاحب کے پہنچتے ہی اجتماع کا آغاز ہوا۔ مجاہد نسیم صاحب نے تلاوت کی۔ اس کے بعد قیم صاحب نے اجتماعاتِ خصوصی و عمومی کی کیفیات اور دعوتی سرگرمیوں کے بارے میں استفسارات فرمائے اور چند ضروری ہدایات دیں۔ دفتر کی لائبریری کے لئے کتب اور دوسرے مالی معاملات پر گفتگو ہوئی۔ جبکہ راقم نے نومبر تا جنوری کی کارکردگی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔

اس اجتماع کے لئے ۱۷ مختلف نکات پر مشتمل ایک ایجنڈا بنایا گیا تھا جنہیں صلاح الدین صاحب (امیر پشاور) نے ترتیب وار پڑھا اور ان نکات پر بات چیت ہوئی۔ اس موقع پر لائبریری، بیت المال اور میثاق و حکمتِ قرآن وغیرہ کی تمام فائلیں اور رجسٹر وغیرہ قیم صاحب کو دکھائے گئے۔

یہ اجتماع تنظیمی اعتبار سے بہت کامیاب رہا۔ متعدد تنظیمی معاملات نپٹائے گئے اور دعوتی سرگرمیوں کے بارے میں بھی قیم صاحب نے تفصیلی ہدایات دیں۔

امیر محترم کا یہ مختصر دورہ بنیادی طور پر دو خطاباتِ عام اور ایک سوال و جواب کی نشست پر مشتمل تھا۔ امیر محترم کا پہلا خطاب بعنوان "مسلمانوں کی دینی ذمہ داریاں" مرکز علوم اسلامیہ راحت آباد نزد پشاور یونیورسٹی ہونا قرار پایا تھا جس کے لئے عصر تا مغرب کا وقت مختص تھا۔ امیر محترم ٹھیک پونے پانچ بجے مرکز علوم اسلامیہ تشریف لے آئے۔ ادائیگی نماز کے بعد مولانا راحت گل صاحب بانی مدرسہ نے امیر محترم کا بڑے تپاک سے استقبال کیا اور آپ کو اوپر چھت پر لے گئے جہاں اجتماع کا انتظام کیا گیا تھا۔ امیر محترم نے سورۃ الحجرات کی آیات ۱۴ اور ۱۵ کا درس دیا اور پھر ان آیات کی روشنی میں اسلام اور ایمان کے مابین فرق واضح کیا اور ایمان کے لوازمات کی تشریح فرمائی۔ امیر محترم کا یہ خطاب سوا گھنٹے پر مشتمل تھا جسے تقریباً پانچ سو سامعین نے سنا جن میں اکثریت یونیورسٹی کے طلباء پر مشتمل تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد مولانا راحت گل صاحب نے چائے وغیرہ کا انتظام کر رکھا تھا۔ جبکہ چائے کے بعد انہوں نے امیر تنظیم کو مدرسے کے مختلف حصے دکھائے اور بعد میں بڑی گرم جوشی کے ساتھ رخصت کیا۔

اجتماع کے دوران تنظیم کے رفقاء نے مدرسے کے گیٹ کے قریب مکتبہ بھی لگایا جس میں لوگوں نے کافی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور خاصی تعداد میں کتب خریدیں۔

امیرِ محترم کا دوسرا خطاب بھی اسی دن یعنی ۲۹ فروری کو بعد از نمازِ عشاء پشاور کی تاریخی مسجد مہابت خان میں تھا جس کا عنوان تھا "سیرتِ نبویؐ کا انقلابی پہلو"۔ امیرِ محترم عشاء کی نماز کے لئے مسجد مہابت خان تشریف لائے۔ نماز کے بعد مولانا اشرف علی قریشی صاحب خطیب جامع مسجد مہابت خان نے چند تعارفی کلمات ادا کئے۔ امیرِ محترم نے سب سے پہلے قرآنی آیات کی روشنی میں اسوۂ رسولؐ کی پیروی کی اہمیت کو واضح فرمایا۔ اس کے بعد حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو کی تشریح کی اور اقامتِ دین کے لئے حضورؐ کے کئے گئے انقلابی اقدامات کا مفصل خاکہ سامعین کے سامنے پیش کیا۔ امیرِ محترم کا یہ خطاب سوا دو گھنٹے جاری رہا۔ جسے سننے کے لئے تقریباً ایک ہزار افراد مسجد میں موجود تھے۔ جنہوں نے بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ یہ خطاب سنا۔

یہاں پر حسبِ معمول تین مکتبے لگائے گئے جن میں لوگوں نے بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور کافی کتب خریدی گئیں۔ اس موقع پر یونیورسٹی اور صدر، واپسی کے لئے دو عدد بسوں کا بھی انتظام کیا گیا تھا جس کے لئے ڈاکٹر شکیل صاحب نے مالی اعانت کی۔

دوسرے دن ساڑھے دس بجے سوال و جواب کی نشست تھی۔ جس میں تقریباً دو سو لوگوں نے شرکت کی اور امیرِ محترم کے خطاب کے علاوہ متعدد دوسرے امور کے بارے میں بھی انتہائی دلچسپ سوالات کئے گئے۔ یہ نشست دو گھنٹے تک جاری رہی۔ بعد میں تنظیم میں شرکت کے خواہش مند حضرات کو تنظیم کے دفتر پہنچنے کی تاکید کی گئی اور اس طرح یہ نشست اختتام کو پہنچی۔ امیرِ تنظیم مسجد سے رخصت ہو کر تنظیم اسلامی کے دفتر تشریف لائے۔

تنظیم اسلامی کے دفتر میں امیرِ محترم نے سب سے پہلے قرآن اور حدیث کے حوالے سے بیعت کے نظام کی تشریح فرمائی۔ اس کے بعد دس افراد نے تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لئے امیرِ تنظیم کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر سب نے مل کر بارگاہِ خداوندی میں دین پر استقامت کے لئے دعا کی۔ امیرِ محترم نے اس موقع پر رفقاء کو چند ضروری ہدایات اور مفید مشورے بھی دیئے۔

تنظیم اسلامی کے دفتر سے امیرِ محترم وقار بٹ صاحب کے گھر تشریف لے گئے۔ جہاں امیرِ تنظیم کے ساتھ ساتھ رفقاءِ تنظیم اور چند دیگر حضرات بھی مدعو تھے۔ کھانے اور نماز سے فراغت کے بعد حاجی عبدالرشید صاحب کی قیام گاہ پر واپس تشریف لے آئے جو کہ اس دورے کے دوران امیرِ محترم کی جائے قیام تھی۔ وہاں کچھ دیر آرام فرمانے کے بعد امیرِ محترم اور جناب قیم صاحب نے واپسی کی تیاری کی اور ساڑھے تین بجے لاہور واپسی کے لئے ہوائی اڈے کی جانب روانہ ہو گئے اور اس طرح امیرِ محترم کا پشاور کا یہ دورہ جو کہ چوبیس گھنٹوں پر مشتمل تھا بخیر و خوبی اختتام کو پہنچا۔

امیرِ محترم کے اس مختصر لیکن جامع دورے کے نتیجے میں دس نئے رفقاء تنظیم میں شامل ہوئے اور اس طرح پشاور میں اس قافلۂ انقلاب کی تعداد اکتیس ہو گئی۔

اس دورے کے سلسلے میں اگر ہم حاجی عبدالرشید صاحب کا شکریہ ادا نہ کریں تو یہ بات احسان مندی کے خلاف ہو گی۔ کیونکہ حاجی صاحب نے نہ صرف امیرِ محترم کو دورے کی دعوت دی اور انتظامات کئے بلکہ اس دورے کے دوران تمام وقت وہ امیرِ محترم کے ساتھ رہے۔ اس دورے کے سلسلے میں ہم حاجی فقیر محمد صاحب اور حاجی راحت گل صاحب کے بھی مشکور ہیں۔ جنہوں نے یونیورسٹی میں امیرِ محترم کے پروگرام کو یقینی بنایا اور ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ مرتب: راجہ سردار احمد
قیم تنظیم اسلامی پشاور !!!

پہلا پتھر

(امیرِ تنظیم اسلامی کا دورۂ کوہاٹ)

پشاور کے جنوب میں چالیس میل کی مسافت پر پہاڑوں کے دامن میں آباد ایک وادی کوہاٹ کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ فوری

ے پہلے ہفتے میں امیر تنظیم اسلامی نے بنوں جاتے ہوئے چند گھنٹے یہاں مختصر قیام کیا۔ مگر اس مختصر قیام کے دوران بھی اپنے عقیدتمندان کی ایک اچھی خاصی تعداد کو شرف ملاقات بخشا۔ فجر کی نماز کی امامت محلہ مسجد حمام میں کی اور اس بات کا وعدہ فرمایا کہ آئندہ ماہ کوہاٹ کے لئے وقت نکالیں گے۔ پھر وعدہ وفا ہوا اور ۶ مارچ کی شام امیر تنظیم اسلامی کوہاٹ میں تھے۔ راقم کو میزبانی کا اعزاز حاصل ہوا ـــــ خواہشمندانِ ملاقات استقبال کے لئے سرِ شام ہی راقم کے گھر منتظر تھے۔ امیر تنظیم نے نماز عشاء کے بعد شہر کی سب سے بڑی مسجد، مسجد حضرت حاجی بہادرؒ میں خطاب عام فرمایا۔ اس خطاب سے مستفید ہونے کے لئے ہر طبقہ کے لوگ نہ صرف شہر بلکہ مضافات سے بھی پہنچے ہوئے تھے۔ یہ جلسہ مسجد کے تاریخی جلسوں میں سے ایک تھا۔ جس کی صدارت کرنل صفدر پراچہ نے کی۔ امیر تنظیم کی تقریر ۲½ گھنٹے تک جاری رہی اور لوگوں نے بڑی توجہ اور عقیدت سے خطاب سنا۔ رات کا کھانا حاجی حنیف شاہ کے ہاں کھایا۔ یہاں پشاور سے آئے ہوئے تنظیم کے رفقاء بھی موجود تھے۔

۷ مارچ کی صبح سے عقیدت مندوں کی حاضری اور ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ مختلف مسائل اور موضوعات زیرِ بحث آئے۔ ۱۱ بجے مقامی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کا پروگرام تھا۔ ٹھیک وقت پر بار روم پہنچے تو بار کے عہدے داران نے امیر تنظیم کا استقبال کیا۔ بار کے موجودہ صدر کی شخصیت پر اسلامی اعمال و کردار کا رنگ غالب ہے۔ صدر بار نے افتتاحی تقریر میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے انہیں شوریٰ سے استعفا پر خراجِ تحسین پیش کیا۔ بعد ازاں امیر تنظیم نے وکلا سے ملکی قیام کے پس منظر اور موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی۔ آئندہ کے لئے لائحہ عمل پیش کیا۔ سوال و جواب کا سلسلہ بھی ہوا۔ وکلا کی جانب سے پرتکلف چائے کا اہتمام بھی تھا۔ نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد کھانے کی دعوت میاں خیل قبیلہ کے سربراہ جناب شوکت محمود کے گھر تھی جو کہ خود بھی ایک ریٹائرڈ پرنسپل ہیں۔ ۳ بجے شام امیر تنظیم نے خواتین کی ایک نشست سے خطاب کیا۔ اندازہ تھا کہ ۱۵۰ کے قریب خواتین جمع ہو سکیں گی لیکن سخت حیرت ہوئی جب ۵۰۰ کے قریب خواتین ٹھیک وقت پر پہنچ گئیں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کے عام فہم لیکچر اور سادہ طرزِ بیان سے خواتین بے حد متاثر ہوئیں۔ تقریر کے بعد سوالات بھی کئے گئے اور بعد میں مکتبہ سے کتب کی خریداری بھی ہوئی۔ یہ بے حد حوصلہ افزا بات ہے۔ شام کی چائے کے لئے برادرم منصور علی شاہ (مکینیکل انجینئر) نے دعوت دی ہوئی تھی۔ عصرانہ میں شرکت اور نماز عصر کے بعد حاجی حنیف شاہ صاحب کے ہاں سوال و جواب کی نشست تھی جس میں شہر کے پڑھے لکھے اور باشعور طبقے کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہ نشست نماز مغرب تک رہی۔ نماز مغرب کے بعد امیر محترم نے کچھ آرام کیا اور پھر آئندہ پروگرام کے لئے روانہ ہو گئے۔ موتی مسجد نیو کالونی میں نماز عشاء ادا کی۔ نماز کے بعد درسِ قرآن کا پروگرام تھا جو کہ ۱۱ بجے شب اختتام پذیر ہوا۔ درس کے بعد لوگوں نے یہاں بھی مکتبہ پر خریداری کی۔ رات کے کھانے کی دعوت کرنل (ریٹائرڈ) ڈاکٹر صادق نور کے ہاں تھی ـــــ امیر محترم رفقاء کے ہمراہ دعوت میں تشریف لے گئے ۱۲ بجے اپنی قیام گاہ پر واپس تشریف لائے۔

۸ مارچ کی صبح نماز فجر مسجد حمام میں ادا کی۔ نماز کے بعد لاچی کے سعادت سحر نے امیر محترم کے ہاتھ پر کوہاٹ میں پہلی بیعت کی۔ کئی عقیدت مند ملاقات کے لئے بھی آئے۔ اس دوران مزید آٹھ افراد اور تین خواتین نے امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس دوران کیڈٹ کالج کوہاٹ اور ایک دینی مدرسہ کے منتظمین کی جانب سے خطاب عام کی دعوت آئی۔ لیکن ناسازیٔ طبع نے آج کے دن کے لئے خطاب کی اجازت نہ دی۔ اور اسے آئندہ کے لئے مؤخر کر دیا گیا۔ ٹھیک ۱۱ بجے دن امیر محترم اپنے رفقاء کے ہمراہ واپس پشاور روانہ ہوئے۔

محترم امیر تنظیم نے اپنے اس دورے میں اہلِ کوہاٹ کے دل پر اپنی دعوت اور شخصیت کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اہل کوہاٹ آج بھی ان کی دعوت خصوصاً انقلاب اسلامی کے مختلف مراحل کے حوالے سے مختلف مجالس میں محوِ گفتگو ہیں۔ کسی داعی کی دعوت کا یہی پہلا اہم مرحلہ ہوتا ہے جہاں وہ اپنی بات کو Talk of the city بنا لیتا ہے۔

مرتب: ڈاکٹر مطیع اللہ شاہ۔ کوہاٹ

امیرِ تنظیم کا دورۂ سندھ

۱۷ فروری ۸۴ء بروز جمعۃ المبارک ہمارے شفیق بزرگ ڈاکٹر پروفیسر سرجن نور الٰہی صاحب کی صاحبزادی کا نکاح کراچی میں ہوا۔ محترم ڈاکٹر نور الٰہی صاحب نہ صرف امیرِ محترم کے پرانے شفیق دوست ہیں بلکہ انجمن کے محسنین میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امیرِ محترم ان کی صاحبزادی کے نکاح میں آنے کی دعوت کو انکار نہ کر سکے۔ اسی تقریب کے سلسلہ میں امیرِ محترم کا کراچی کا دورہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک پروگرام بورڈ آف ہائر سیکنڈری ایجوکیشن کراچی میں بعد نماز ظہر بتاریخ ۱۶ فروری رکھ لیا گیا۔ جس میں امیرِ محترم نے سیرت النبیؐ کے جلسہ سے خطاب فرمایا اور اپنے مخصوص انداز میں سیرت النبیؐ کے انقلابی پہلو اور طریقِ کار کو مؤثر طریقہ سے سامعین پر واضح کیا۔ جمعرات ہی کو دفتر تنظیم کراچی میں امیرِ محترم کی رفقاء سے ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں آپ نے رفقاء سے خطاب کیا اور ایک سوال کے جواب میں امریکہ کے دورہ کے تاثرات بھی بیان فرمائے۔ دوسرے دن یعنی جمعہ ۱۷ فروری کو آپ نے کراچی میمن سوسائٹی کی گول میمن مسجد میں خطبہ نکاح سے پہلے خطاب جمعہ فرمایا۔ آپ کی تقریر کا موضوع تھا "حکمت و احکام جمعہ"۔ اس خطاب میں صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے بھی شرکت فرمائی اور مکمل خطاب بڑے غور سے سماعت فرمایا۔ جمعہ کی نماز کے بعد امیرِ محترم نے خطبہ نکاح کی تفسیر و تشریح بیان کی اور محترم ڈاکٹر سرجن نور الٰہی صاحب کی صاحبزادی کا نکاح پڑھایا۔ بعد نماز مغرب اسی مسجد میں امیرِ محترم نے "جہاد و قتال فی سبیل اللہ، مقصد، فرضیت اور لوازم سورۃ الصف کی روشنی میں" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ وقت چونکہ ایک ہی دن تھا اور ظاہر ہے کہ سورۂ صف جیسی عظیم سورۃ کا درس یا اس کے مضامین کا خلاصہ ایک نشست میں بیان نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے امیرِ محترم نے وعدہ فرمایا کہ وہ مستقبل قریب میں ان شاء اللہ اس مضمون کو مکمل فرمائیں گے۔ زہے نصیب کہ یہی وہ وعدہ تھا جو امیرِ محترم کے مستقبل قریب میں دورۂ سندھ کا سبب بن گیا اور آپ محترم نے ۱۰ مارچ سے ۱۵ مارچ تک سندھ کا دورہ فرمایا۔

۱۰ مارچ کو آپ بذریعہ ہوائی جہاز دوپہر میں کراچی پہنچے اور بعد نماز عشاء آپ نے اپنے وعدے کے مطابق کراچی میمن سوسائٹی مسجد میں سابقہ خطاب کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے اسی مضمون کو مکمل فرمایا۔ ۱۱ مارچ کو صبح ۱۰ بجے کراچی میں ایک رفیقہ تنظیم اسلامی کے مکان پر خواتین کا اجتماع ہوا۔ جس میں تقریباً ۱۰۰ سے زیادہ خواتین نے شرکت کی۔ موضوع خطاب تھا "جہاد میں خواتین کا کردار"۔ خطاب کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوئی جو تقریباً ایک بجے تک جاری رہی۔ ۱۱ مارچ ہی کو بعد نماز عصر تنظیم اسلامی کے دفتر میں ۱۰ مارچ کے خطاب ہی کی کڑی کے طور پر سوال و جواب کی نشست ہوئی اور بعد نماز مغرب رفقائے تنظیم اسلامی کراچی کا اجتماع ہوا جس میں امیرِ محترم نے رفقاء سے خطاب بھی فرمایا۔ اس اجتماع میں چار افراد نے امیرِ تنظیم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان میں سے ایک کا تعلق پشاور سے ہے جو اپنے کسی کام کی وجہ سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ امیرِ محترم کی تقریر کا اشتہار دیکھ کر مسجد تلاش کرتے ہوئے پہنچ گئے۔ خطاب سنا اور آخرکار بیعت کر لی۔

۱۲ مارچ کو امیرِ محترم نے مختلف اصحاب سے ملاقات فرمائی اور سہ پہر تین بجے ٹنڈو جام کے لئے تیار ہو گئے۔ ٹنڈو جام میں امیرِ محترم کا پروگرام پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے زرعی تحقیقی ادارے میں طے تھا۔ میزبان ادارے کے نمائندے ڈاکٹر محمد اشرف صاحب، اٹامک انرجی کالونی مسجد کے پیش امام صاحب اور مزید دو اصحاب ٹنڈو جام سے ایک نئی ویگن میں پروگرام کے مطابق امیرِ محترم کو لینے کراچی پہنچ گئے۔ کراچی میں مزید ایک کار کا اہتمام کیا گیا تھا۔ محترم عبدالرشید صاحب، محترم عبدالوہاب صاحب اور شعیب میاں شمول مکتبہ ہمارے ہمراہ تھے۔ اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ اور بحمد اللہ عصر سے چند منٹ پہلے منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ اٹامک انرجی کالونی کی مسجد میں باجماعت عصر کی نماز ادا کی اور مسجد کے قریب مغرب سے پہلے

ہی رفقا نے مکتبہ لگا دیا ۔ یہ ادارہ چونکہ تحقیقی ادارہ ہے ۔ اس لئے یہاں پر اعلیٰ تعلیم یافتہ سائنسدان حضرات رہائش پذیر ہیں
مسجد کمیٹی کے صدر محترم ڈاکٹر محسن اقبال صاحب ہیں جو کہ بہت سادہ طبیعت اور ملنسار ہیں ۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر محمد اشرف صاحب
جو رفیق محترم عبد الواحد صاحب عاصم کے اعزہ کے بہت ہی قریبی دوست نکلے ۔ ہماری میزبانی میں بہت پیش پیش تھے جبکہ
صدر مولانا وصی مظہر ندوی صاحب بھی عشاء سے پہلے ٹنڈو جام پہنچ گئے ۔ بعد نماز عشاء جلسہ کا آغاز ہوا ۔ تلاوت کلام پاک
کے بعد ڈاکٹر محسن اقبال صاحب نے محترم ڈاکٹر اسرار احمد کو خوش آمدید کہا اور تعارفی کلمات کہے ۔ اس کے بعد امیرِ محترم کا
خطاب شروع ہوا جو سیرت النبیؐ کے انقلابی پہلو پر مشتمل تھا ۔ یہ خطاب تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہا ۔ سامعین میں
اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے علاوہ ٹنڈو جام سے بھی کافی حضرات نے شرکت کی ۔ شرکاء کی تعداد کا محتاط اندازہ ۳۰۰ سے
۴۰۰ تک تھا ۔ سامعین نے بڑی توجہ سے خطاب کو سنا ۔ ان کے سامنے سیرت النبیؐ کو امیرِ محترم نے ایک نئے انداز میں
پیش کیا تھا ۔ امیرِ محترم کے خطاب کے بعد صدرِ مجلس نے فرمایا کہ میں اس وقت کچھ کہہ کر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقریر کے اثر
کو زائل کرنا نہیں چاہتا ۔ چنانچہ دعا پر یہ نشست اختتام کو پہنچی ۔ ۱۲ مارچ کو بعد نماز فجر مسجد ہی میں سوال و جواب کی
نشست ہوئی جس میں امیرِ محترم نے سامعین کے سوالات کے تسلی بخش جواب دیئے ۔

اس نشست کے بعد کالونی کے ریسٹ ہاؤس میں خصوصی ملاقات کا اہتمام کیا گیا تھا ۔ اس میں مختلف سائنسدان
اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات نے امیرِ محترم سے ملاقات اور مختلف دینی اور سیاسی امور پر گفتگو کی ۔ جن حضرات نے ملاقات کی ان
میں ڈاکٹر خوشنود احمد صاحب صدیقی، ڈاکٹر محسن اقبال صاحب، ڈاکٹر محمد اشرف صاحب، ڈاکٹر انصاری صاحب، ڈاکٹر
ملک صاحب اور ڈاکٹر ارشاد احمد خاں صاحب قابلِ ذکر ہیں ۔ ڈاکٹر ارشاد احمد صاحب کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے ۔
آپ ٹنڈو جام کی بہت معروف شخصیت ہیں ۔ آپ امیرِ محترم کے ہم عمر بھی ہیں ۔ دونوں کا سن پیدائش ۱۹۳۲ء ہے اور دونوں
حضرات نے تعلیم بھی تقریباً ایک ہی دور میں حاصل کی ۔ یہ نشست ۱۲ بجے تک جاری رہی ۔ اس دوران تنظیم
جلیسان ٹنڈو آدم کے صدر جناب امجد آرائیں صاحب اور عبد النصیر صاحب ٹنڈو آدم سے پروگرام کے مطابق امیرِ محترم
کو لینے آگئے ۔ ٹنڈو جام سے ہمیں پُرخلوص انداز میں رخصت کیا گیا اور دن کے بارہ بجے ہم ٹنڈو آدم کے لئے روانہ ہوگئے
امجد آرائیں صاحب ہماری کار میں بیٹھ گئے جبکہ بقیہ ہمارے ساتھی مکتبہ کے ساتھ امجد صاحب کی کار میں تھے ۔ راستہ میں
سرسبز کھیتوں سے ہوتے ہوئے ہم بخیر و عافیت ایک بجے ٹنڈو آدم پہنچے ۔ وہاں شہر کے باہر ہی چار موٹر سائیکل
سوار ہمارے منتظر تھے ۔ وہ ہمیں جلوس کی شکل میں شہر میں گھماتے ہوتے ہوئے صدر تنظیم جلیسان امجد آرائیں صاحب کی
قیام گاہ لے گئے ۔ وہاں پُرتکلف ظہرانہ کا اہتمام تھا ۔ راستہ میں ہم نے بازار اور اہم مقامات پر بینرز دیکھے جو کہ نہ صرف تنظیم جلیسان
کی طرف سے تھے بلکہ اور دوسرے کلب اور دکانداروں کی طرف سے آویزاں تھے ۔ جن میں استقبالیہ کلمات لکھے ہوئے تھے اور
امیرِ محترم کو بڑے بڑے القابات سے نوازا گیا تھا ۔ مثلاً عالم اسلام کے عظیم فرزند ۔ مفکر قرآن ۔ امیر تنظیم اسلامی ۔ عالم اسلام کے
مایہ ناز مفکر وغیرہ وغیرہ ۔ اس موقع پر اگر تنظیم جلیسان ٹنڈو آدم کا تعارف ہو جائے تو مناسب ہوگا ۔ یہ تنظیم ٹنڈو آدم کے صالح
نوجوانوں پر مشتمل ہے جو مذہبی و سماجی اور خدمتِ خلق کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے ۔ علمائے حق کو اپنے پروگراموں میں
دعوت دینا تاکہ صحیح فکر لوگوں تک پہنچے، ان کے مقاصد میں شامل ہے ۔ ان کی بڑی دیرینہ خواہش تھی کہ امیرِ محترم کو ٹنڈو آدم بلائیں ۔
اس کے لئے وہ کافی عرصہ سے کوشش کر رہے تھے ۔ یہاں تک کہ ان کے خلوص کی بنا پر ان کی خواہش بر آئی ۔ اور امیرِ محترم کا
ٹنڈو آدم کا دورہ طے پا گیا ۔ کھانے کے بعد ہمیں میونسپل ریسٹ ہاؤس لیجایا گیا جہاں ہمارے قیام کا انتظام تھا ۔ عصر کے بعد متعدد
احباب نے ریسٹ ہاؤس میں امیرِ محترم سے ملاقات کی اور مغرب کی نماز کے بعد ٹنڈو آدم جامع مسجد کے خطیب علامہ احمد میاں حمادی

نے امیرِ محترم سے ملاقات کی۔

ٹنڈو آدم میں جلسہ کا اہتمام مین بازار میں کیا گیا تھا جلسہ شروع ہونے سے کافی پہلے مکتبہ کا اہتمام کر دیا گیا۔ جلسہ میں ٹنڈو آدم میونسپل کمیٹی کے چیئرمین عبدالستار صاحب غوری نے بھی شرکت کی۔ امیرِ محترم نے حضورِ اکرمؐ کی سیرت کے انقلابی پہلو کو پیش کیا اور دعوت فکر دی کہ ہم بحیثیت مسلمان کس حد تک حضورؐ اکرم کے مشن میں شریک ہیں۔ ہماری زندگیوں کا رخ کس طرف ہے امیرِ محترم کا یہ خطاب دو گھنٹہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۴ مارچ کو صبح ۹ بجے میونسپل لائبریری میں امیرِ محترم کا درس قرآن تھا وہاں پر لاؤڈ سپیکر کا انتظام نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود امیرِ محترم نے اپنے گلے پر شدید بوجھ ڈالتے ہوئے ۴۵ منٹ تک سورہ الم کی ابتدائی آیات کا درس دیا۔ آپ نے فرمایا کہ سب سے بڑی خدمت خلق لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا اور جہنم کے راستے سے جنت کے راستے کی طرف ڈالنا ہے۔ دنیا کی تکالیف عارضی ہیں جو ختم ہو جائیں گی۔ لیکن آخرت میں جو معاملہ پیش آنے والا ہے اس کی فکر کرنی چاہیئے۔ لوگوں کو عذاب جہنم سے بچانا اصل میں سب سے بڑی خدمت خلق ہے۔

درس قرآن کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوئی جو مزید ایک گھنٹہ تک جاری رہی اسے بھی امیرِ محترم نے لاؤڈ سپیکر کے بغیر اپنے گلے پر شدید بوجھ سہتے ہوئے نبھایا اور حاضرین کے سوالات کے جوابات دیئے۔ اس نشست کے بعد قریب ہی دفتر میں میونسپل کمیٹی کے چیئرمین جناب عبدالستار صاحب غوری نے امیرِ محترم کو چائے پر مدعو کیا۔ اس کے بعد ہم ٹنڈو آدم سے حیدر آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ امجد آرائیں صاحب اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ ہمیں حیدر آباد تک چھوڑنے آئے۔ اللہ ان حضرات کو جزائے خیر دے اور ان کو اس بات کی توفیق دے کہ وہ حقیقی اور اولین خدمت خلق کو پہچانیں اور اپنی صلاحیتیں اس کے لئے وقف کر دیں آمین !

حیدر آباد میں ہم رفیق تنظیم اسلامی جناب عبدالقادر صاحب کے مکان پر پہنچے۔ وہاں ظہر کی نماز ادا کی۔ ٹنڈو آدم کے ذکر میں ایک بات بھول گیا کہ ہماری تنظیم کے بزرگ لیکن جواں عزم ساتھی محترم سعدی صاحب اپنے طور پر کراچی سے ٹنڈو آدم پہنچ گئے۔ آپکا تعلق بلتستان سے ہے۔ دین کے غلبہ کا جذبہ نوجوانوں سے زیادہ ہے۔ اور اسی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے اکثر اوقات اسی کام کے لئے وقف ہیں۔

عصر کے وقت جناب وارثی صاحب کے مکان پر لطیف آباد میں حیدر آباد کے رفقاء کا اجتماع ہوا جس میں امیرِ محترم نے رفقاء سے ملاقات کی۔ یہیں پر قاضی حمیدالدین صاحب بھی تشریف لے آئے جو کہ امیرِ محترم کے بہت عقیدتمند ہیں۔ آپ نے ٹیلیویژن پروگرام الہدٰی بڑے شوق سے سنا اور اس کو محفوظ بھی کر لیا۔ میثاق میں انہوں نے پڑھا کہ سورہ فاتحہ کی چوتھی نشست اور سورہ حٰم السجدہ کی تیسری نشست کا درس ادارے کے پاس نہیں۔ اس لئے وہ یہ دونوں درس لاہور بھیجنے والے تھے۔ امیرِ محترم کے پروگرام کا سنا تو خود دینے کے لئے آ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ اس طرح اب ادارے کے پاس الہدٰی مکمل ہو جائیگا اور قارئین اس سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

اسی دن یعنی ۱۴ مارچ کو امیرِ محترم نے کوٹری میں جلسہ سیرت النبیؐ سے خطاب فرمایا۔ انجمن خادمین ملت کوٹری کی مشہور انجمن ہے جس کے پروگراموں میں جلسوں کا اہتمام بھی ہے ہے۔ ان کی پرخلوص خواہش تھی کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کوٹری میں تشریف لائیں۔ اس کے لئے انہوں نے خط بھی لکھے اور ذاتی طور پر بھی ملاقات کر کے زور دیا۔ امیرِ محترم کا سندھ کا پروگرام بنا تو ان کو ان کے خلوص کی بنا پر ترجیح دی گئی اور خطاب طے پا گیا۔

امیرِ تنظیم نے دو گھنٹہ سے زیادہ کے خطاب میں انقلاب کے مراحل اور سیرت النبیؐ کا جامع خاکہ پیش کیا اور سامعین کو دعوت فکر دی۔ قارئین میثاق جانتے ہیں کہ امیرِ محترم کا خطاب ایک دعوت عمل لئے ہوئے ہوتا ہے۔ آپ کے سامنے

واضح مشن ہے جس میں امیرِ محترم نے اپنے آپ کو گھلا دیا ہے
یہاں پر بھی مکتبہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سامعین نے کتابوں میں بڑی دلچسپی لی اور خاص تعداد میں کتابیں حاصل کیں۔
امید ہے کہ امیرِ محترم کے ان پروگراموں سے بہتر نتائج مترتب ہوں گے۔ امیرِ محترم کے لیے دل سے تین دعائیں نکلیں۔
اللہ تعالیٰ امیرِ محترم کو ہدایت پر قائم رکھے، ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔ آمین۔ برکت کے نام سے مجھے برکت اللہ صاحب صدیقی یاد آگئے۔ آپ باشرع نوجوان ہیں۔ آپ امیرِ محترم کے پروگرام کے لئے نصیر آباد لاڑکانہ سے تشریف لائے۔ دینی جذبہ و شوق رکھتے ہیں۔ انہوں نے درس قرآن کا حلقہ قائم کیا ہوا ہے جس میں نوجوانوں کی کثیر تعداد شامل ہوتی ہے۔ کتابوں کے بہت ہی قدر دان ہیں۔ ہزاروں کتابیں ان کے پاس موجود ہیں۔ امیرِ محترم سے ملاقات کے خواہشمند تھے۔ انہوں نے لاڑکانہ میں امیرِ محترم کے پروگرام کی خواہش کا اظہار کیا۔

ایک بات جس کا ذکر رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ ٹنڈو جام میں احباب نے ڈاکٹر صاحب کا کتابچہ "نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں" ۵۰۰ کی تعداد میں خرید کر مفت تقسیم کیا۔ ٹنڈو آدم میں ۳۰۰ کی تعداد میں تقسیم کی گئیں جس میں ایک سو افراد کو پروگرام کے دعوت ناموں کے ساتھ جو کہ تنظیم جلیسان نے اہلِ علم اور ٹنڈو آدم کی اہم شخصیات کو بھیجے تھے تقسیم کی گئیں۔ کوٹری کے احباب نے بھی ۵۰۰ کی تعداد میں یہی کتاب خریدی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین
اور امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعے صحیح علم اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ جلسہ کے بعد عبدالقادر صاحب کے مکان پر قیام ہوا اور بعد نمازِ فجر ہم امیرِ محترم کے ہمراہ کراچی روانہ ہوگئے۔ ۱۵ مارچ کو امیرِ محترم نے کالٹیکس کے زیر اہتمام سیرت کے جلسہ سے خطاب فرمایا۔

رات کو گیارہ بجے روزنامہ حریت کے نمائندے جناب شہزاد چغتائی صاحب نے امیرِ محترم کا انٹرویو لیا جس میں مختلف ملی و قومی مسائل پر گفتگو ہوئی جس کی تفصیل آپ نے اخبارات میں پڑھ لی ہوگی۔

اس طرح امیرِ محترم کا یہ دورۂ سندھ مکمل ہوا اور امیرِ محترم لاہور کے لیے عازم سفر ہوگئے۔ مرتب: سید واحد علی رضوی
معاون نائب امیر تنظیم اسلامی برائے صوبہ سندھ

بقیہ: عورت اور اسلامی معاشرہ

تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ گواہی دینا فرض ہے۔ حق نہیں ہے۔ قرآن میں گواہی کے لئے کڑی شرائط مقرر کی گئی ہیں اور سخت تنبیہات آئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہادت دینا کھیل نہیں بلکہ اس کے لئے نہایت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اسلام نے عورت کو ان سخت حالات، عدالت کی جرح و قدح اور منظرِ عام پر لانے سے بچانے کے لئے اس پر گواہی دینے کا فرض عائد نہیں کیا۔ اگر کوئی دوسرا مرد گواہ نہ ملے تب ہی عورت کو زحمت دی جاتی ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور
"جو لوگ اللہ پر یقین کرنے والے ہیں ان کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کس کا ہو سکتا ہے" (المائدہ ۵۰)

ٹینٹ اور ترپال
بنانے کا ممتاز ادارہ
ایچ
نظام دین
اینڈ سنز
مرکزی دفتر
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

THE ORIGINAL

عطیہ: حاجی محمد سلیم

حاجی شیخ نور الدین اینڈ سنز لمیٹڈ (Exporters)

۳۰۱، لنڈا بازار، لاہور ۳۰۶۴۲۸ / ۳۰۵۴۶۹

عن الحارث الاشعری، قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

"امرکم بخمس

بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ"

(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد و جامع ترمذی)

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 33	APRIL 1984	No. 4

...مِیثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۳۳ : شمارہ ۵ | شعبان المعظم ۱۴۰۴ھ مطابق مئی ۱۹۸۴ء

مشمولات

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیمِ اسلامی
۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون : ۸۵۲۶۱۱

سب آفس : ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کتابت، فون برائے رابطہ
۲۱

شیخ جمیل الرحمٰن

عرضِ احوال

نحمدہ و نصلّی علٰی رسولہ الکریم

بفضلہٖ تعالیٰ سبحانہٗ، شعبان المعظم ۱۴۰۴ھ مطابق مئی ۱۹۸۴ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ شعبان المعظم کی عظمت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنا مہینہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ احادیث صحیحہ میں مروی ہے کہ نبی اکرمؐ اس ماہ میں کثرت کے ساتھ نفلی روزوں کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جن کو نبی اکرمؐ کے اتباع میں اس ماہ میں نفلی روزے رکھنے کی توفیق و سعادت بارگاہ رب العزت سے عطا ہو۔ اس سال شعبان المعظم اور رمضان المبارک کے مہینے مئی اور جون میں آرہے ہیں جو گرمی کے اعتبار سے نہایت شدید ہوتے ہیں۔ نیز ابھی کم از کم پانچ چھ سال یہ مہینے موسم گرما ہی میں آئیں گے۔ ایسے موسم میں ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن یعنی صومِ رمضان کی بجاآوری کا جو لوگ بھی ایمان اور احتساب کے ساتھ اہتمام کریں گے۔ ان شاء اللہ وہ اجرِ عظیم کے مستحق و مستوجب ہوں گے۔

امیرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بیرونِ پاکستان دعوتی دوروں کے پیشِ نظر یہ ممکن نہیں تھا کہ تنظیم اسلامی کا آٹھواں سالانہ اجتماع مئی ۸۴ء کے آخری عشرے سے قبل منعقد کیا جاتا۔ امیرِ محترم فی الحال حیدر آباد دکن (بھارت) کے دعوتی دورے پر تشریف لے گئے ہوئے ہیں۔ واپسی پر دہلی اور علی گڑھ میں امیرِ محترم کے درس قرآن یا خطاب کے پروگرام کا بھی امکان ہے۔ حیدر آباد دکن (بھارت) کے دورے کی تقریب یہ بنی کہ شمالی امریکہ سے امیرِ محترم کے بے شمار دروس و خطابات کے کیسٹ بھارت خاص طور پر حیدر آباد دکن پہنچے ہیں اور ایک وسیع ترین تعلیم یافتہ اور متدین حلقہ امیرِ محترم کی شخصیت اور تنظیم اسلامی کی آفاقی اسلامی انقلاب کی دعوت سے متعارف ہو چکا ہے جو اس دعوت کے داعی و قائد سے ملاقات اور خود موصوف کی زبان سے اسلامی انقلاب کے عالم گیر اصول و مبادی سننے کا عرصۂ دراز سے متمنی تھا اور قریباً دو سال سے وہاں سے امیرِ محترم کو حیدر آباد دکن تشریف لانے کی اصرار کے ساتھ دعوت مل رہی تھی۔ مشیت الٰہی میں جس کام کے لئے جو وقت مقرر ہوتا ہے، ہمارا ایمان ہے کہ اس میں تغیر و تبدل انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس دورے

کے علاوہ سعودی عرب سے بھی امیر محترم کو دعوتی دوروں کی کافی عرصہ قبل سے دعوت آئی ہوئی تھی۔ اور کوشش ہو رہی تھی کہ اس مرتبہ جو دورہ ہو تو وہ محض جدہ، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تک محدود نہ رہے بلکہ امیر محترم کو سعودی عرب کا Visit - Visa حاصل ہو جائے تاکہ اس دورے میں سعودی عرب کے دوسرے ان اہم و مشہور شہروں میں بھی موصوف تشریف لیجا سکیں جہاں بحمد اللہ تنظیم اسلامی کے رفقاء اور اس کی دعوت کے متاثرین کی تعداد موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مساعی کو مشکور فرمایا اور مطلوبہ ویزا حاصل ہو گیا جس کو مئی ۸۴ء کے اواخر تک استعمال کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ بھارت سے واپسی کے بعد ایک ہفتہ امیر محترم کا پاکستان کے مختلف شہروں میں دعوتی پروگرام طے ہے۔ جس سے ۴ مئی تک موصوف فارغ ہوں گے اور ان شاء اللہ ۵ مئی کو سعودی عرب کے لئے عازم سفر ہوں گے۔ جہاں عمرہ اور مسجد نبوی میں حاضری کی سعادت کے علاوہ مختلف شہروں میں امیر محترم کے دروس، خطابات اور مذاکروں کے پروگرام ہوں گے اور ۲۰ مئی یا اس کے متصلاً بعد پاکستان مراجعت ہو گی۔

ان حالات کے پیش نظر جنوری ۸۴ء کے مجلس مشاورت کے اجلاس میں تنظیم اسلامی کے آٹھویں سالانہ اجتماع کے لئے ۲۵ تا ۳۰ مئی ۸۴ء کی تاریخیں طے ہو گئی تھیں۔ ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا تھا کہ یہ سالانہ اجتماع امسال کراچی میں منعقد کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ چونکہ لاہور کی بہ نسبت کراچی میں گرمی کم ہوگی لیکن تنظیم اسلامی کراچی انتہائی کوشش کے باوجود کراچی میں کوئی ایسا مقام حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی جہاں پانچ روز تک قریباً چار سو اشخاص کی رہائش اور پھر اجتماع کی کارروائی کے انتظامات بحسن وجوہ ہو سکیں۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ یہ سالانہ اجتماع حسب سابق قرآن اکیڈمی ہی میں منعقد کیا جائے۔ توقع ہے کہ اس کی اطلاع "میثاق" کے اپریل ۸۴ء کے شمارے کے ذریعہ تمام رفقاء کو مل چکی ہو گی۔

اس موقع پر اچانک راقم کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول یاد آیا کہ عرفت ربی بفسخ العزائم۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر انسان کو فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیح ملی ہو تو روزمرہ کے مختلف انواع و اقسام کے حوادث اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ایک علی کل شئی قدیر ہستی ہے جس کے قبضۂ قدرت میں اس کائنات کی تدبیر ہے اور یہاں ہر عمل اور کوشش اسی وقت بار آور اور کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کا اذن اور اس کی مشیت ہو: وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ

اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کی ذات الحکیم ہے لہٰذا عزائم کے فسخ میں بھی یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی حکمتِ بالغہ کارفرما ہوتی ہے۔ جس کے اشارات ہمیں سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۲۹ کے آخری الفاظ مبارکہ فَیَنظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ، سورۂ یونس کی آیت ۱۴ کے آخری الفاظ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ اور سورہ ملک کی آیت نمبر ۲ کے اس حصّے سے مل سکتے ہیں جس میں موت وحیات کے اس سلسلہ کی غرض وغایت یہ بیان فرمائی گئی ہے: لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً۔

لہٰذا تنظیم اسلامی کے رفقاء کو اس نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے کہ یہ سب کچھ بارگاہ رب العزت سے ان کے امتحان کی حکمت کے پیشِ نظر بھی ہوسکتا ہے۔ جنہوں نے اپنی آزاد مرضی سے اپنے دینی فرائض کی بجاآوری کے لئے جس میں عبادتِ رب، شہادت علی الناس، اقامتِ دین بھی شامل ہیں، بیعت کے مسنون طریق کے مطابق خالصتاً رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی ہے وہ اس موقع پر عزیمت کا رویہ اختیار کرتے ہیں یا رخصت کا۔ ظاہر ہے کہ گرمی کے موسم میں سفر کی صعوبت لاہور کے شدید گرم موسم میں پانچ دن تک کا قیام ساتھ ہی اجتماعات کی مصروفیات کی وجہ سے بے آرامی اور اپنے روزمرہ کے معمولات کی قربانی ایک ایسی کسوٹی ثابت ہوسکتی ہے جو اس امر کی نشاندہی کرے کہ تنظیم کے رفقاء کو اپنے مقصد سے کتنا تعلق خاطر اور اپنے عہد کو پورا کرنے کا کتنا عزم اور ولولہ ہے!!

توقع ہے کہ رفقائے تنظیم اس اجتماع میں شرکت کا خصوصی اہتمام کریں گے اور کوئی معمولی عذر ان کی راہ میں حائل نہیں ہوگا الّا یہ کہ واقعی ایسا عذر درپیش ہو کہ جس کے متعلق ان کا ضمیر مطمئن ہو کہ یہ وہ عذر ہے جسے عذرِ شرعی قرار دیا جاسکتا ہے۔

یوں تو ہر نظریاتی وانقلابی جماعت کے سالانہ اجتماعات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں لیکن جب کوئی جماعت خالصتاً اپنے دینی فرائض کی انجام دہی کے لیے قائم ہو تو اس کی اہمیت کا کسی دنیوی نظریاتی جماعت سے ادنیٰ سا تقابل بھی خارج از امکان ہے۔ ہمارا دین تو وہ ہے، کہ جس کے حیطۂ اختیار سے اس کے ماننے والوں کی انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ بھی باہر نہیں ہے۔ ہمارا دین جہاں ایک طرف فرد کی اپنی سیرت وکردار کی تطہیر وتعمیر پر زور دیتا ہے، تو دوسری جانب ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ جس کی رگ وپے میں توحید جاری

الہُدیٰ
(چودھویں نشست)

اُولوالالباب کے ایمان کی کیفیت

سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع،
آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ کی روشنی میں

(مباحث ایمان)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۱)

السّلام علیکم۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسُولہِ الکریم امابعد:

حاضرینِ کرام وسامعینِ عظام!

امّ القرآن یعنی سورہ فاتحہ کے بارے میں چار نشستوں میں کسی قدر گفتگو کے بعد آج ہم اللہ کے نام سے اس سلسلۂ دروس قرآنی کے پانچویں سبق کا آغاز کر رہے ہیں جو سورہ آلِ عمران کی چھ آیات پر مشتمل ہے یعنی آیات نمبر ۱۹۰ تا ۱۹۵۔ یہ آیاتِ مبارکہ سورہ آلِ عمران کے آخری رکوع کے آغاز میں وارد ہوئی ہیں — آیئے پہلے ہم ان مبارک آیات کی تلاوت کر لیں اور ان کا ایک سلیس ترجمہ ذہن نشین کر لیں تاکہ اِن میں جو مضامین آ رہے ہیں، ان کا ایک اجمالی نقشہ ہمارے ذہنوں میں قائم ہو جائے۔

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم　　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ

لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ
قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ
سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ
النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَہٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝
رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا
بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَکَفِّرْ
عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا
وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّکَ
لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَہُمْ رَبُّہُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ
عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُکُمْ
مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ ہَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ
دِیَارِہِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُ
کَفِّرَنَّ عَنْہُمْ سَیِّاٰتِہِمْ وَلَاُدْخِلَنَّہُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ
مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ
حُسْنُ الثَّوَابِ ۝

صدق اللّٰہ العظیم

"یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے
الٹ پھیر میں نشانیاں ہیں ہوش مند اور باشعور لوگوں کے لئے۔
وہ لوگ جو یاد رکھتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر
لیٹے ہوئے اور غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق
میں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں اے ہمارے رب! تونے یہ سب کچھ بیکار
اور بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے، تو اس سے پاک ہے۔ پس ہمیں
آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب! جسے تونے آگ میں داخل
کر دیا اسے تونے رسوا کر دیا اور ایسے ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہ ہوگا۔

اے رب ہمارے! ہم نے ایک پکارنے والے کی پکار کو سُنا کہ وُہ ایمان کی دعوت دے رہا ہے کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر۔ پس ہم ایمان لے آئے ۔ سو اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری بُرائیوں کو ہم سے دُور فرما دے اور ہمیں اپنے نیکوکار بندوں کے ساتھ وفات دیجیو۔ اور اے رب ہمارے! ہمیں عطا فرما جس کا تو نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے اپنے رسولوں کی وساطت سے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو۔ یقیناً تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے ۔ تو اُن کی دعا قبول فرمائی ان کے رب نے کہ میں تو کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ وہ مرد ہو یا عورت ۔ اور تم سب ایک دوسرے ہی میں سے ہو۔ تو وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں اور جنہوں نے جنگ کی اور جنہوں نے اپنی گردنیں کٹوا دیں ان کی بُرائیوں کو میں لازماً دور کر دونگا اور ان کو لازماً داخل کرونگا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی ۔۔ یہ بدلہ ہوگا اللہ کے خاص خزانۂ فضل سے اور واقعہ یہ ہے کہ اچھا بدلہ تو اللہ ہی دیتا ہے"۔

اس سے پہلے کہ ہم ان آیاتِ مبارکہ میں وارد مضامین پر سلسلہ وار غور کریں۔ ہمارا اب تک جو معمول رہا ہے اس کے مطابق ان آیات کے بارے میں چند تمہیدی باتیں نوٹ فرمالیں۔

سب سے پہلی بات جو قرآن مجید سے ایک ذہنی مناسبت پیدا کرنے میں ممد ہے۔ وہ یہ کہ قرآن حکیم میں جو طویل سورتیں ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر کے آغاز اور اختتام پر جو آیات وارد ہوتی ہیں وہ بالعموم جامع ترین ہوتی ہیں۔ یہ بات ویسے عام دنیوی اصول کے مطابق بھی ہے ۔ جیسے کسی اچھی غزل کے مطلع اور مقطع کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے اور کسی اعلیٰ خطیب کے خطبے کے افتتاحی اور اختتامی کلمات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ ہمیں قرآن مجید

کی اکثر طویل سورتوں کے آغاز اور اختتام میں وارد ہونے والی آیات میں نظر آتا ہے۔ انہیں اصطلاح میں فواتح وخواتیم سُوَر کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیات کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ یہی وصف بکمال وتمام سورہ آلِ عمران کی ان آیاتِ مبارکہ میں ہے جن کی آغاز میں آپ نے تلاوت سنی۔

دوسری بات ان آیات کی عظمت کے سلسلہ میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان میں سے دو کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔ پہلی روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے مروی ہے۔ جسے شانِ نزول بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان سے ایک مرتبہ حضرتِ عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہما نے یہ فرمائش کی کہ "ام المؤمنین! مجھے آپؓ وہ واقعہ سنائیے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و واقعات میں آپؓ کو سب سے زیادہ پیارا لگا ہو"۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے ایک گہرے احساس کے ساتھ یہ فرمایا کہ "آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو ساری ہی باتیں نہایت پیاری تھیں۔ آپؐ کی تو ہر بات نہایت دل آویز تھی۔ تاہم تم نے فرمائش کی ہے تو میں تمہیں ایک واقعہ سناتی ہوں۔ ایک شب کو حضورؐ میرے پاس تشریف لائے لیکن اچانک آپؐ نے مجھ سے فرمایا "اے عائشہ! مجھے اجازت دو میں اس وقت اپنے اللہ کی عبادت کرنا چاہتا ہوں"۔ میں نے عرض کیا حضورؐ! مجھے آپؐ کا قرب نہایت عزیز ہے لیکن جو چیز آپؐ کو پسند ہو وہ اس سے بھی زیادہ محبوب ہے لہذا آپؐ کو اجازت ہے۔ تو آپؐ نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اور آپؐ پر رقت طاری ہوئی اور آپؐ روتے رہے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر آپؐ نے بہت طویل سجدہ کیا اس میں بھی گریہ طاری رہا جس کی بنا پر سجدہ گاہ گیلی ہو گئی۔ پھر آپؐ کچھ دیر لیٹے لیکن وہ کیفیت آپؐ پر برقرار رہی۔ یہاں تک کہ صبح صادق ہو گئی اور آپؐ پر رقت اور گریہ کی وہی کیفیت طاری رہی۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب فجر کی نماز کی اطلاع دینے کے لئے حاضر ہوئے اور انہوںؓ نے آنحضورؐ

کی اس کیفیت کو دیکھا تو انہوںؓ نے عرض کیا حضورؐ! آپؐ اور آپؐ پر یہ رقت اور یہ گریہ! حالانکہ اگر کہیں بالفرض آپؐ سے کوئی خطاء اور لغزش ہوئی بھی ہو تو اللہ تعالیٰ آپؐ کی تمام خطاؤں کو بخش دینے کا اعلان فرما چکا۔ تو جواب میں آپؐ نے فرمایا۔ اے بلال، میں کیوں نہ روؤں کہ آج کی شب میں میرے رب نے مجھ پر یہ آیات نازل فرمائی ہیں۔ پھر آپؐ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی۔ —————— "اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ - اِلٰی آخرِ السُّوْرۃ" —— دوسری روایت کے راوی ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ وہؓ یہ فرماتے ہیں کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول میں یہ شامل تھا کہ جب آپؐ رات کے وقت تہجد کے لئے اٹھتے تو آنکھ کھلتے ہی بے اختیار آپؐ کی زبان مبارک پر یہ آیات جاری ہو جاتی تھیں"۔ اب آپ چشمِ تصور سے دیکھئے کہ اللہ کا محبوب بندہ پچھلی رات کو اٹھا۔ اوپر آسمان ہے، ستارے ہیں، تاریکی اور سکون کی ایک کیفیت ہے۔ اس وقت جو واردات قلب پر طاری ہو رہی ہیں ان کی بہترین ترجمانی ان الفاظِ مبارکہ سے ہو رہی ہے:۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ - اِلٰی آخر السورۃ —— معلوم ہوا کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان آیاتِ مبارکہ سے خصوصی شغف تھا —— ان دونوں روایات کو امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر کبیر میں لاتے ہیں۔

تیسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان آیات کا موضوع کیا ہے؟ ان آیات کے موضوع کو اگر میں عنوان دوں تو وہ "ترکیبِ ایمان" ہے یعنی 'Synthesis of the Faith' ایمان کیسے وجود میں آتا ہے اور جو ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ، ایمان بالآخرہ اور ایمان بالرسالت ہیں ان میں باہمی ترتیب کیا ہے! بالخصوص یہ بات کہ اس کے ضمن میں قرآن مجید کا اپنا مخصوص طرزِ استدلال کیا ہے! وہ کس اسلوب سے ایمان باللہ کی دعوت دیتا ہے۔ کن دلائل سے معاد یعنی آخرت کا اثبات کرتا ہے۔ پھر یہ کہ اس

ایمان کے نتیجے میں انسانی شخصیت میں کیا کیفیات پیدا ہونی چاہئیں - یہ نہایت اہم موضوع ہے اس لئے کہ کون نہیں جانتا کہ ہمارے دین کی جڑ اور بنیاد تو درحقیقت ایمان ہے ـــ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آج کے درس کے ذیل میں ایمان کے بارے میں چند بنیادی باتیں آپ حضرات ذہن نشین کر لیں -

ایمان چند ماوراء حقائق اور چند امورِ غیبی کو مان لینے کا نام ہے - لیکن یہ جان لیجئے کہ اس ایمان کے دو رخ ہیں یا دو پہلو ہیں یا دو درجے ہیں - ایک رُخ یا یک پہلو یا ایک درجہ قانونی اور فقہی ایمان کا ہے - جس کی بنیاد پر ہم اس دنیا میں ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں - اس کا تمام دار و مدار اِقْرَارٌ بِاللِّسَان پر ہے - زبان سے اقرار کرنا کہ میں مانتا ہوں اللہ کو اس کی صفاتِ کمال کو، اس کی توحید کو - میں مانتا ہوں - نبوت و رسالت کو، ملائکہ کو، کتابوں کو، نبیوں اور رسولوں کو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین و المرسلین ہونے کو - میں مانتا ہوں - بعث بعد الموت کو، حشر و نشر کو، حساب و کتاب کو، جزا و سزا کو، جنت و دوزخ کو - یہ زبان سے جو اقرار ہے یہ دنیا میں ہمارے مسلمان سمجھے جانے کی بنیاد ہے ـــ ایمان کا دوسرا رُخ یا دوسرا پہلو یا دوسرا درجہ ہے حقیقی ایمان ـــ اور وہ عبارت ہے قلبی یقین سے ـــ ان تمام امور پر قلبی یقین پیدا ہو جائے - واقعہ یہ ہے کہ آخرت میں فلاح و نجات کا جو دار و مدار ہے وہ اس حقیقی اور قلبی ایمان پر ہے ـــ

جہاں تک پہلے ایمان یعنی اقرار باللسان کا تعلق ہے، اس کے بارے میں گفتگو کی ہمیں خاص حاجت نہیں ہے وہ تو ہمیں حاصل ہے - وہ تو ہمیں موروثی طور پر مل گیا ہے - ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے تو وراثتاً یہ عقائد ہمیں منتقل ہو گئے - لیکن اصل چیز وہ یقینِ قلبی ہے جس پر آخرت میں نجات کا انحصار ہے، ہمیں اس کی فکر ہونی چاہئیے بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

یقین پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

وہ یقینِ قلبی اور حقیقی ایمان ان آیات کا موضوع ہے - اس ضمن میں یہ

نکتہ نوٹ کرلیں کہ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ اگر ایک انسان جس نے مسلمان معاشرے میں آنکھ کھولی اور وہ دین کے اوامر و نواہی پر کاربند ہے تو چاہے ذہن، فکر اور شعور کی سطح پر اسے ماورائے حقائق اور امورِ غیبی کی حقیقی معرفت (Conscious Realisation) حاصل نہ ہوئی ہو تب بھی اس کو ایک نوع کے قلبی یقین کی کیفیت حاصل ہوجاتی ہے۔ اس لئے کہ جس طرح انسان کا باطن اس کے ظاہر پر اثر انداز ہوتا ہے اُسی طرح اس کا ظاہری طرزِ عمل، اس کا ظاہری رویہ اس کے باطن پر ایک عکس ڈالتا ہے، چاہے آپ اسے ایک غیر شعوری یقین کہیں لیکن وہ پیدا ہوجاتا ہے۔ مگر ہمیں اس وقت اس سے بھی بحث نہیں ہے ۔۔۔ ان آیات میں جو گفتگو ہو رہی ہے وہ اکتسابی اور شعوری ایمان کی ہے۔ جس کو ایک ذہین و فطین اور صاحب شعور و ادراک انسان اپنے ذاتی غور و فکر کے نتیجہ میں حاصل کرتا ہے۔ جن کو ان آیاتِ مبارکہ میں پہلی آیت میں اولوا الالباب قرار دیا گیا۔ یعنی ہوش مند لوگ، عقل سے کام لینے والے لوگ، صاحبِ خرد لوگ۔ ان کا معاملہ کیا ہوتا ہے!

تفصیلات میں تو ہم ان شاء اللہ اگلی نشستوں میں جائیں گے۔ فی الحال اس ضمن میں یہ نکات نوٹ کیجئے کہ ان آیات میں ان اولوا الالباب کے بارے میں پہلی بات یہ سامنے آئی کہ یہ لوگ کتابِ فطرت کے مطالعے اور مظاہرِ فطرت کے مشاہدے سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔ پھر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کے بعد اس کی ذاتِ اقدس سے ایک مضبوط ذہنی رشتہ و تعلق استوار کر کے مزید غور و فکر کرتے ہیں اور بقول علامہ اقبال مزید خرد کی گتھیاں سلجھاتے ہیں تو ان کی رسائی ایمان بالمعاد یعنی ایمان بالآخرۃ تک ہو جاتی ہے۔ گویا کہ معرفتِ الٰہی اور قانونِ مکافات و مجازاتِ عمل تک رسائی ان کے اپنے مطالعہ و مشاہدہ اور تعقل و تفکر کے عمل (Process) کا حاصل ہوتی ہے۔ پھر جب کسی نبی کی دعوت ایسے لوگوں کے کانوں میں پڑتی ہے۔ جو ان ہی امور پر مشتمل ہوتی ہے تو ایسے لوگ والہانہ انداز میں اس پر لبیک کہتے ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے کسی شاعر نے کہا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہی میرے دل میں ہے

دوسری بات یہ سامنے آئی کہ آخر میں ایسے لوگوں کی سیرت و کردار کی ایک جھلک دکھا دی گئی کہ یہ بوڑھے لوگ نہیں ہیں۔ یہ جہاں عقل و شعور کے اعتبار سے پختہ ہیں وہاں ان کا کردار اور ان کی سیرت بھی بہت مضبوط ہوتی ہے۔ اس کا نقشہ آیت نمبر ۱۹۵ میں آگیا ہے۔

اس درس کے ضمن میں تیسری اور آخری بات نوٹ کر لیں تاکہ اس کا ہمارے سابقہ دروس کے ساتھ جو ربط و تعلق ہے، وہ ہمارے سامنے آجائے وہ یہ ہے کہ سورۃ العصر میں انسان کی نجاتِ اخروی کی چار ناگزیر شرائط ہمارے سامنے آئی تھیں۔ ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایمان اور صبر یعنی پہلی اور آخری شرائط کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ درمیانی دو شرطیں گویا یہاں Understood ہیں۔ مقدر ہیں۔ بین السطور ہیں۔ پھر یہ کہ حضرت لقمان کی شخصیت ہمارے سامنے آچکی ہے وہ نبی نہیں تھے نہ ہی کسی رسول کے اُمتی تھے لیکن فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیحہ کی رہنمائی میں وہ ایمان باللہ اور توحید اور قانونِ مجازاتِ عمل تک پہنچ گئے تھے۔ یہی بات ہم سورہ فاتحہ میں دیکھ چکے ہیں کہ ایک سلیم الفطرت اور صحیح العقل انسان کہاں تک پہنچ پاتا ہے۔ اُسے اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی حاصل ہو جاتی ہے اور روزِ جزا و سزا کا شعور بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر وہ زندگی کے پیچیدہ مسائل میں تفصیلی رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے جس کے لئے وہ دستِ سوال دراز کرتا ہے۔ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ۔ یہاں سے رسالت کی ضرورت کی احتیاج کے لئے دلیل قائم ہوتی ہے۔ ان مباحث کے پس منظر میں آج ہم نے غور و تدبّر کے لئے ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ ان شاء اللہ ان آیات پر تفصیلی گفتگو آئندہ ہوگی۔ البتہ اس نشست میں، میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کے بارے میں کوئی سوال ہو یا وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال : ڈاکٹر صاحب! ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ان کا ذکر کیا ہے جو اسے ہر دم یاد کرتے ہیں۔ عملی طور پر ہر دم اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا کس طرح ممکن ہے۔؟

جواب : اصل میں ذکر کے معنی ہیں استحضار اللہ فی القلب۔ دل میں اللہ کو مستحضر رکھا جائے اور یہ عین ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی کسی دنیوی معروفیت میں ہو اس کے ہاتھ اس کام میں لگے ہوئے ہوں لیکن اللہ کی یاد اس کے دل میں موجود ہو۔ بلکہ ہمارے اکثر و بیشتر کام وہ ہیں جن کے دوران ہم اپنی زبانوں کو بھی ذکرِ الٰہی سے تر رکھ سکتے ہیں باقی ان آیات سے جو اصلاً مقصود ہے وہ یہ ہے کہ انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ کو اپنے قلب شعور میں مستحضر رکھے۔ اُسے یاد رکھے۔ اُسے یہ یقین رہے کہ ایک عالم الغیب ہستی اس کے ہر ہر عمل کو دیکھنے والی، ہر ہر ارادے کو جاننے والی ہر ہر قول کو سننے والی موجود ہے۔ اس کی نگران ہے۔ یہاں اصل میں خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو اس کائنات کی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں جیسا کہ علامہ اقبال نے اس شعر میں کہا ہے ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

تو جو لوگ یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ یہ کائنات کیا ہے! وجود کی حقیقت کیا ہے! زندگی کی حقیقت کیا ہے! ہم کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔!! وہ اگر اس غور و فکر میں اللہ تعالیٰ کی ذات کی یاد کا التزام نہیں کریں گے تو ان کا فکر کسی غلط سمت اور رُخ پر مڑ جائے گا۔

سوال : ڈاکٹر صاحب آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ قرآن پاک کی جو طویل سورتیں ہیں ان کی ابتدا میں اور آخر میں وہ مضامین آتے ہیں جن کا ہماری اخلاقی اور عملی زندگی سے گہرا تعلق ہوتا ہے تو کیا ان سورتوں کے درمیان میں ایسے مضامین نہیں آتے جن کا تعلق ہماری اخلاقی، رُوحانی اور عملی زندگی

سے ہوتا ہے۔؟

جواب: آپ نے اچھا کیا کہ یہ بات آپ نے پوچھ لی۔ پہلے تو اس بات کی تصحیح کر لیجیے کہ میں نے یہ نہیں کہا کہ طویل سورتوں کے آغاز اور اختتام پر وہ مضامین آتے ہیں جن کا ہماری روحانی، اخلاقی اور عملی زندگی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ فواتح و خواتیم سُوَر میں نہایت جامع باتیں آتی ہیں اور ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر میں نے عرض کیا تھا کہ جیسے کسی اچھی غزل کا مطلع اور مقطع بہت شاندار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ان مجالس میں اس سے پہلے بھی یہ بات آئی ہے کہ جب ہم قرآن مجید کی کسی آیت یا سورت یا کسی خاص مقام کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس کی خصوصی اہمیت ہے یا عظمت ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دوسری آیات غیر اہم ہیں۔ معاذ اللہ کوئی مسلمان ایسا کہنا تو کجا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں اپنی بات کے مفہوم کو دوبارہ عرض کیے دیتا ہوں۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اکثر طویل سورتوں کے آغاز اور اختتام پر بہت جامع آیات آتی ہیں۔ یعنی جو مضامین ان سورتوں میں طویل مباحث کی صورت میں آتے ہیں تو ویسے بھی منطقی اور عقلی طور پر بھی اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ آخر میں انہیں sum up کیا جائے اور جامعیت کے ساتھ ان مضامین و مباحث کو تھوڑے الفاظ میں سمو کر ایک Lasting Impression قاری یا سامع کے ذہن پر قائم کیا جائے۔ تو خواتیم سُوَر عموماً اس خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں۔

حضرات! اس مختصر نشست میں ان چھ عظیم آیات کے بارے میں جو تمہیدی اور ابتدائی باتیں آج ہمارے سامنے آئی ہیں ان کو اچھی طرح اپنے ذہنوں میں تازہ اور مستحضر رکھیے تاکہ آئندہ نشستوں میں ہم کسی قدر تفصیل میں جائیں تو آپ کے ذہن میں یہ خاکہ موجود ہو۔

وَآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ٥

توحید فی العلم یا توحید فی المعرفہ اور
توحید فی العمل یا توحید فی الطلب کا

فریضۂ اقامتِ دین

سے

ربط و تعلق

ڈاکٹر اسرار احمد

کے خطابِ درس کی چوتھی قسط

دین اللہ اب تیسرے مسئلہ کی طرف آئیے۔ جب اللہ کو مان لیا جائے کہ مطاعِ مطلق وہ ہے — حاکمیتِ مطلقہ اسی کی ہے۔ جب تسلیم کر لیا جائے کہ بادشاہِ حقیقی صرف وہی ہے۔ قانون دینے کا اصل مجاز وہی ہے۔ شارعِ حقیقی وہ ہے۔ اس کے نمائندے کی حیثیت سے رسول ہیں۔ لیکن اصلاً حکومت اللہ کی ہے۔ مطلقاً اطاعت اس کی ہے۔ اور یہ اطاعت بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو گی۔ اس بات کو قرآن مجید میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔ یہاں الرّسول سے مراد ہیں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک جگہ فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ "اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذنِ الٰہی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے"۔ اس آیت میں قاعدہ کلیہ کے طور پر یہ بات آگئی ہے کہ اللہ کی اطاعت کا واسطہ رسول ہی ہوا کرتے ہیں۔

قرآن حکیم میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کا مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے۔ وقت کی کمی کے لحاظ سے میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں ان سب کا احصاء کر سکوں۔ لہٰذا چند آیات پیش کرتا ہوں۔ سورۂ یوسف میں ایک جگہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا گیا: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ: "فرمانروائی اور حکم دینے کا اختیار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ...

طریق زندگی ہے"۔ اسی سورۂ یوسف میں دوسرے مقام پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے
کہا گیا: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝
"حاکمیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کو (کسی پر) بھروسہ کرنا ہے تو اسے
چاہیئے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کرے"۔ سورۂ انعام میں ایک دوسرے انداز سے اس بات کا اظہار فرمایا
کہ آگاہ ہو جاؤ حقیقی حاکمیت اللہ ہی کی ہے اور وہؐ (اپنی رعایا (انسان کا) حساب لینے میں
تیز ہے"۔ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ۝ حاکمیت صرف اللہ ہی کی ہے۔ لَهُ
الْحُكْمُ قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے۔ مزید برآں یہ مضمون مختلف اسالیب سے قرآن مجید
بار بار آیا ہے کہ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اور لَهُ الْمُلْكُ ـــ یہاں دونوں
جو حرف جار لام آیا ہے یہ لام تملیک بھی ہے اور لام استحقاق بھی ـــ یعنی FACTO AND
DE - JURE اسیؐ کی بادشاہت ہے۔ اور یہ بادشاہت دنیا کے عام بادشاہوں کی طرح کی نہیں
بلکہ اس شان سے ہے کہ وہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْ
وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ نہایت بزرگ و برتر و بالا ہے وہ ہستی (اللہ) جس
ہاتھ میں (کائنات) کی حکومت ہے اور وہؐ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ وہ جو چاہے کر سک
اس کے آڑے آنے والا کوئی نہیں ہے۔

اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ پر جو نظام بنے گا وہ دین اللہ ہوگا۔ آخری پارے کی مختصر سورت
"سورۃ النصر" میں یہ اصطلاح آتی ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ	"(اے نبی!) جب اللہ کی مدد آگئی اور
وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ	فتح نصیب ہوگئی تو آپؐ نے دیکھ لیا کہ لوگ
فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝	فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں"۔

ان آیات میں فتح مکہ کے بعد کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جب جزیرہ نمائے عرب کے چہار اطرا
سے قبائل پر قبائل مدینۃ النبی میں چلے آ رہے تھے۔ اللہ کی اطاعت اور جناب محمد رسول اللہ صلی اا
علیہ وسلم کو بحیثیت رسول اور اللہ کا نمائندہ تسلیم کر رہے تھے۔ آپ کا ہر حکم ماننے کے لئے آمادہ
اور اس طرح اسلام میں شامل ہو رہے تھے۔ گویا وہ دین اللہ میں داخل ہو رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو عمل کی جو تھوڑی سی آزادی دی ہے اور اسے ی
دیا ہے کہ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا "چاہے شکر گذار بندہ بن کر رہے چاہے ناش
تو اللہ کا مطالبہ یہ ہے کہ اپنی آزاد مرضی سے انسان اللہ کا مطیع، فرمانبردار، اطاعت گزار بن ک

اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر گوشے میں اسی کی ہدایت پر عمل پیرا ہو۔ یہ ہے لفظ دین کا حقیقی مفہوم اور مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْن کا اصل تقاضا۔ اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔

ہر دین غلبہ چاہتا ہے

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ "دین" اس نظام زندگی کو کہتے ہیں جس میں انفرادی سے لے کر اجتماعی زندگی تک کل زندگی ایک مطاع کی اطاعت کے تابع ہو تو ایک حقیقت اور سمجھ لیجئے وہ یہ کہ "ہر دین" اپنی فطرت کے اعتبار سے یہ چاہتا ہے کہ وہ قائم ہو اور غالب ہو۔ بادشاہ کا دین قائم و نافذ ہو تو بادشاہ کا دین کہلائے گا بادشاہ مغلوب ہو گیا تو پھر بادشاہ کا دین کہاں رہا! وہ تو ختم ہوا۔ جب تک بادشاہت قائم ہے جب تک دین الملک ہے ورنہ نہیں۔ جیسے آپ سورۂ زخرف میں دیکھئے جہاں فرعون کا قول نقل ہوا اس نے اپنی قوم کو منادی کرائی: وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ۔ "اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی اور کہا" اے میری قوم کے لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ سارا آب پاشی کا نظام میرے اختیار میں نہیں ہے!" میں جس کو چاہوں پانی دوں جس سے لئے چاہوں پانی روک لوں۔ پھر سورۂ بقرہ میں اس محاجہ کو دیکھئے جو نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تھا: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ "(اے نبی) کیا آپ نے اس شخص (نمرود) کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا انؑ کے رب کے بارے میں اس بنا پر کہ اللہ نے اسے حکومت دے رکھی تھی"۔ اس حکومت کی بنیاد پر اس کو زعم ہو گیا تھا کہ مختار مطلق اور علی الاطلاق حاکم و بادشاہ وہ ہے۔ وہ بھی خدائی کا مدعی تھا۔" جب حضرت ابراہیم نے اس سے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے: اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ۔ تو وہ سرکش بولا۔ "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے" قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ۔ روایات میں آتا ہے کہ اس نے دو قیدی جیل سے بلوائے۔ ان میں سے ایک کو آزاد کیا کہ جاؤ تم بری ہو اور دوسرے کی دربار ہی میں گردن اڑوا دی اور حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ دیکھو میں نے ایک کو زندہ رکھا اور ایک کو مروا دیا۔ تو کیا میرے پاس زندگی و موت کا اختیار ہے کہ نہیں! حضرت ابراہیمؑ نے جب دیکھا کہ یہ تو کج بحثی پر آ گیا ہے تو انہوں نے آخری بات کہدی کہ "میرا رب تو وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، طلوع کرتا ہے، تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا" قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ۔ اگر تجھے واقعی اختیار حاصل ہے تو یہ کر کے دکھا۔ لیکن اس بات

پردہ کافر مبہوت حیران اور ششدر ہو کر رہ گیا۔ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۔ وہ لاجواب ہو گیا، بغلیں جھانکنے لگا۔ جس طرح نمرود نے کہا تھا کہ زندگی اور موت میرے قبضہ میں ہے اسی طرح فرعون نے کہا تھا کہ اب پانی کا نظام اور حکومت کا انصرام میرے ہاتھ میں ہے۔ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي ـــ لہٰذا میرا حکم چلے گا۔ تو جب تک اس کا حکم چل رہا ہے تو دین الملک ہے یہ نہیں تو دین کہاں رہا! ختم ہو گیا۔ اسی طرح جب جمہور کو انتخاب کا حق حاصل ہے اور وہ اپنے نمائندوں پر مشتمل پارلیمان یا اسمبلی منتخب کرتے ہیں اور یہ منتخب پارلیمان جمہور کی حاکمیت کے اصول پر کاروبارِ حکومت چلاتی ہے تو جمہوریت بالفعل قائم ہے لیکن اگر کوئی فوجی سربراہ اپنے ساتھیوں کے تعاون سے اسمبلی یا پارلیمنٹ توڑ دے اور مارشل لاء نافذ کر کے بحیثیت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر حکومت کا انتظام و انصرام اور جملہ اختیارات سنبھال لے تو جمہوریت کہاں رہی! دین الجمہور ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ نظام تو وہی ہے جو بالفعل قائم ہو اور واقعتاً اس کے اختیارات کا سکہ چل رہا ہو۔ بالکل اسی طرح دین اللہ قائم و نافذ اسی وقت سمجھا جائے گا جب امر واقعی میں وہ نظام قائم ہو جس میں بالفعل اللہ ہی کو Supreme Authority Sovereign مانا گیا ہو۔ فی الحقیقت اللہ ہی کو تسلیم کیا گیا ہو۔ اسی کے احکام کے آگے سب کے سر جھکے ہوئے ہوں اور عملاً صورت حال یہ ہو کہ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۔ اللہ کا کلمہ سب سے اونچا ہو جائے۔ اللہ کی بات اس کا فرمان بالاترین ہو جائے۔ اور یہ ہو پورے نظام زندگی پر ـــ جزوی نہیں۔ کل کا کل نظام اللہ تبارک و تعالیٰ کی اطاعت میں جکڑا ہوا ہو۔

کامل غلبہ درکار ہے

جیسے کل میں نے بتایا تھا کہ انفرادی توحید جزوی مطلوب نہیں ہوتی۔ بلکہ کلّی مطلوب ہوتی ہے۔ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ o أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ o پس بندگی کرو اللہ کی، پرستش کرو اللہ کی اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے اور آگاہ ہو جاؤ اللہ کے لئے تو دین خالص مطلوب ہے" اللہ اس بات کے لئے تیار نہیں ہے کہ چلو آدھا دین میرا مان لو۔ کچھ اطاعت میری کر لو۔ آدھا دین کسی اور کا مان لو اس کی اطاعت بھی کر لو۔ یہ طرزِ عمل درکار نہیں ہے۔ اللہ کا مطالبہ تو یہ ہے کہ کل کا کل دین۔ کامل اطاعت اسی کے لئے خالص ہو جائے اور دین میں انسان پورا کا پورا داخل ہو جائے۔ اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۔ چنانچہ اس آیت کو نوٹ کیجئے جو سورۃ انفال کی آیت ہے کہ قتال کی آخری منزل کیا ہے؟ قتال و جہاد فی سبیل اللہ کا آخری ہدف کیا ہے؟

فرمایا: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ
"(اے مسلمانو!) ان (کافروں اور مشرکوں) سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ و فساد بالکل فرو ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے"[1]۔ یہ نہیں کہ اس کا کوئی جزو مان لیا جائے، مسجد میں تو اللہ کی مرضی چل رہی ہو، پارلیمنٹ میں نہ چلتی ہو، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس اور ماتحت عدالتوں میں نہ چلتی ہو۔ ذرائع ابلاغ میں نہ چلتی ہو بازار میں نہ چلتی ہو۔ منڈی میں نہ چلتی ہو۔ گھر میں نہ چلتی ہو۔ یہ تو معاذ اللہ تم نے اللہ کو ٹرخا دیا ہے۔ ایک بڑا ہی جزوی اور چھوٹا سا حصہ تو اس کو دیا ہے باقی سب دوسروں کو الاٹ کر دیا۔

تفریق دین

یہ ہے درحقیقت تفریقِ دین۔ جس کے متعلق میں نے کل بھی کچھ عرض کیا تھا اور آج بھی شروع میں کہا تھا کہ ہمیں لفظِ دین کے ساتھ: وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ پر بھی گہرائی میں اتر کر غور کرنا ہو گا۔ خاص طور پر یہاں فِیْہِ قابلِ توجہ ہے۔ فَرَّقَ، یُفَرِّقُ تَفْرِیْقًا کے کیا معنی ہیں، ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ علیحدہ علیحدہ کر دینا، پھاڑ دینا۔ دین ایک وحدت ہے۔ پورا نظامِ زندگی۔ انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔ ایک وحدت بن کر اللہ کے تابع آجائے تو یہ ہے دین اللہ۔ گویا کہ مکمل دین قائم ہو گیا۔ اگر یہ نہیں ہے اور حال یہ ہے کہ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ۔ دین کو پھاڑ دیا کچھ حصہ میں نے لے لیا، کچھ آپ نے لے لیا۔ کچھ کسی اور کو دے دیا ۔۔۔ دین کے ٹکڑے کر دیئے کہ کچھ حصہ کو ہم مانیں گے کچھ کو نہیں مانیں گے۔ یہ ہے تفریقِ دین ۔۔۔ کل میں یہ آیت آپ کو سنا چکا ہوں کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۚ "(اے محمدؐ) جو لوگ اس دین کے ٹکڑے کر دیں، اس کو پھاڑ دیں، اس کے حصے بخرے کر دیں اور خود ٹولیوں میں بٹ جائیں تو ایسے لوگوں سے آپؐ کا کوئی تعلق نہیں، ان سے آپؐ کو کوئی سروکار نہیں"۔ لرز جانا اور ڈر جانا چاہیئے اس وعید سے کہ کس طور پر اللہ عزوجل ایسے لوگوں سے اعلانِ برأت فرما رہے ہیں جو اللہ کے اس دین میں جو تمام انبیاء و رسل کا دین ہے تفرقہ ڈالنے کی روش اختیار کریں کہ ان سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ فِیْہِ میں یہ مفہوم غالب ہے۔

---

[1] یہی وجہ تھی کہ مانعین زکوٰۃ سے خلیفہ اوّل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قتال کیا تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو زکوٰۃ کے منکر نہیں تھے البتہ مرکزی بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ (مرتّب)

تفریقِ دین کا دوسرا مفہوم

اس کا ایک مفہوم اور بھی ہے جس کو میں کل بھی بیان کر چکا ہوں۔ وہ یہ کہ اقامتِ دین کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے امت کو بنیانِ مرصوص بن جانا لازم ہے۔ فقہی مسائل میں رائے اور تعبیر کا اختلاف بالکل دوسری چیز ہے۔ یہ اختلاف صرف فقہ کے چار مشہور و معروف ائمہ کرام امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ یا سلفی المسلک علماءِ کرام کے درمیان نہیں ہوا بلکہ صحابہ عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مابین بھی رہا ہے۔ یہ فقہی مسالک کے اختلافات اقامتِ دین کے فریضہ کی ادائیگی میں اگر روک بن جائیں۔ گروہ بندی ہونے لگے، 'من دیگرم تو دیگری' والا معاملہ ہو جائے تو یہ وحدتِ ملی ہی کے لئے مہلک نہیں بلکہ اقامتِ دین کے فریضہ کی انجام دہی میں بھی رکاوٹ بن جائے گا۔ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ میں اس نوع کے تفرقے سے بچنے کا بھی نہی کے اسلوب میں حکم دیا گیا ہے۔ چونکہ فریضۂ اقامتِ دین کی ادائیگی کے لئے پوری امت کی اجتماعی قوت درکار ہے۔ دین دنیا کے صرف ایک حصہ پر قائم کرنا تو مطلوب نہیں بلکہ پورے کرۂ ارض پر اللہ کا دین قائم کرنے کی جدوجہد کرنی ہے۔ پوری دنیا کو نورِ توحید سے منور کرنا ہے۔ گروہ بندی اور تفرقہ بازی کیوں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کا ذکر اسی درس میں ایک آیت کی تصریح و توضیح میں آگے آئے گا۔

فقہی اختلافات حدود کے اندر ہوں تو تفرقہ نہیں

دین ایک ہو، اور وہ ہو دین توحید۔ اس کے تحت تفصیلی قوانین میں تھوڑا تھوڑا فرق ہو، تعبیر (Interpretation) کا فرق ہو، استنباط کا فرق ہو، اجتہاد کا فرق ہو لیکن توحید کا اصول سب کے نزدیک ایک ہی ہو تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا یہ تفرقہ نہیں ہے۔ ہمارے تمام فقہا اور سلفی المسلک ائمہ کے نزدیک اصول ایک ہی ہے کہ حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے اور اس کے نمائندے کی حیثیت اس کے رسول کی ہے۔ اللہ اور رسول یہ ہیں اصل ستون جن پر دین قائم ہے۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ. اس اصول کے تحت مختلف نئے مسائل میں استنباط کیا جا رہا ہے۔ ہر مجتہد اور ہر فقیہ اللہ اور اس کے رسول کے منشاء کے مطابق کسی نئے مسئلہ میں حکم تلاش کر رہا ہے۔ اس میں کچھ نہ کچھ فرق واقع ہو سکتا ہے۔

موجودہ دور کی ایک مثال

آپ کو معلوم ہے کہ بھٹو صاحب کے خلاف قتل کا مقدمہ جب سپریم کورٹ میں آیا۔ یہ مقدمہ تو پاکستان کی تاریخ کا ایک حصہ بنے گا تو اس کے باوجود کہ قانون ایک ہی ہے۔ نئی شہادتیں سپریم کورٹ میں پیش نہیں ہوئیں۔ وہ تو ہائی کورٹ میں مقدمہ کی جو مثل تیار ہوئی تھی اور اس پر جو فیصلہ ہوا تھا اسی پر بحث و تمحیص،

جرح و تعدیل ہوتی ہے۔ اس نوع کے مقدمات کے سابقہ فیصلوں اور نظائر سے استدلال و استشہاد ہوتا ہے۔ مختلف شہادتوں کے مابین تضادات کی نشاندہی کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ مثلاً پرچہ مختلف شہادتیں ریکارڈ ہوئی تھیں ان میں سے ہر شہادت میں تضاد تلاش کیا گیا۔ سابقہ فیصلے کے ستم بیان کئے گئے ہیں۔ ان تمام امور پر فریقین کے وکلاء نے بحث کی ہے اور اپنے اپنے دلائل دیئے ہیں۔ اب دیکھئے قانون ایک، ساری مثل ایک، لیکن سپریم کورٹ کے جج صاحبان اختلاف کر رہے ہیں۔ اختلاف ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے پھانسی کی سزا کا حکم دیا اور جنہوں نے بری کرنے کا فیصلہ دیا ان میں سے کسی نے اصول سے اختلاف نہیں کیا، وہ سب قانون کو بھی تسلیم کر رہے ہیں۔ لیکن شہادتوں سے استنباط و استدلال میں اختلاف کر رہے ہیں۔ یہ اختلاف ہوا۔ پوری دنیا کو معلوم ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ فیصلہ کرنے والوں نے بدنیتی سے مختلف فیصلے دیئے ہیں۔ اور تو اور صرف دو جج ایک قانون کے تحت ایک ہی مقدمہ کو سنتے ہیں تو ان کی آراء میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے۔

اصل الاصول پس اختلاف شے دیگر ہے لیکن جہاں اصول بدل جائیں گے، وہ تفرق فی الدین ہو جائے گا۔ البتہ جب اصول یہ ہو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام واضح احکام یعنی نصوص قرآن و سنّت کی اطاعت اور تابعداری کی جائے گی۔ اور صرف اسی دائرے میں رہ کر جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے مقرر کر دیا ہے، معاملات طے کئے جائیں گے۔ تو یہ تفرقہ نہیں ہوگا بلکہ دین اللہ ہوگا۔

دین ہمیشہ سے ایک رہا ہے دین ہمیشہ سے ایک ہی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ دین جو حضرت آدم علیہ السلام کا تھا وہی دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ یہ دین ہے دینِ توحید — اللہ کو احد مان لینا۔ اسے وحدہٗ لاشریک لہ جان لینا۔ جب اس توحید کو آپ عملاً انفرادی زندگی میں لے آئیں گے۔ چونکہ صرف زبانی اقرار کافی نہیں ہے — تو وہ ہوگی اللہ کی عبادت کرنا، اپنی کل اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے — اسی توحید کو جب آپ اجتماعی نظام کے ذیل میں لائیں گے تو یہ ہوگی پورے نظام زندگی کو اللہ کے حکم کے تابع کر دینا۔ یہ ہوگا اجتماعی طور پر عملی توحید کا برپا کر دینا یا دین اللہ کو بالفعل قائم کر دینا۔ یہ ہے اقامت دین۔ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ

ایک غلط فہمی کا ازالہ ہمارے ہاں جو فقہی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ ان سب میں اصل الاصول توحید ہی ہے۔ مسلّماتِ دین سب کے نزدیک مشترک ہیں۔ سب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اطاعتِ مطلقہ کا سزاوار صرف ذات باری تعالیٰ ہے اور یہ اطاعت بواسطہ

رسولؐ ہوگی۔ جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیت رسول اللہ مطاع ہیں۔ آپؐ کے احکام آپؐ کے فیصلے، آپؐ کی سنت، آپؐ کے فرمودات واجب اطاعت اور واجب اتباع ہیں بفحوائے آیاتِ قرآنیہ: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ "جس نے بھی (محمدؐ) رسول اللہ کی اطاعت کی پس اس نے اللہ کی اطاعت کی" اور وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ "کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملہ کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔ سورۂ نساء میں فرمایا: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔ "(اے محمدؐ) آپؐ کے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپؐ ہی کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں: علاوہ ازیں اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کا حکم قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ کی اطاعت اور اسؐ کے رسولؐ کی اطاعت دین کے دو pillars ہیں۔ جن پر دینِ توحید قائم ہے۔ لہٰذا تمام فقہاء اور ائمہ دین رحمۃ اللہ علیہم کا دین یہی دین توحید ہے۔ وہ چاہے امام ابوحنیفہؒ ہوں۔ امام مالکؒ ہوں امام شافعیؒ ہوں، امام احمد بن حنبلؒ ہوں۔ امام بخاری ہوں وغیرہم۔ کتاب وسنت سے استدلال کرتے ہوئے جو تفاصیل طے کی جائیں گی تو بعض مسائل کے استنباط، تعبیر اور بعض میں اجتہاد وقیاس، راجح ومرجوح، افضل ومفضول کی آراء میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ اور رہا ہے۔ ان ائمہ عظام کے مابین معاذ اللہ دین کے معاملہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ فقہی مذاہب اور مسالک ہیں۔ سب کا دین، دینِ اسلام ہے۔ مسلکوں کے اختلافات میں کوئی حرج نہیں۔ سب حق ہیں۔ دین میں تفرقہ درست نہیں ہے یہ تو کفر ہو جائے گا۔ اس بات کو اس طرح بھی سمجھ لیجئے اور فرض کیجئے کہ کسی ملک میں غالب اکثریت امام مالکؒ کے مسلک پر چلنے والوں کی ہے تو جب وہ اپنے ملک میں اللہ کا دین قائم کریں گے تو وہاں مالکی فقہ رائج ہو جائیگی۔ کسی جگہ پر احناف کی عظیم اکثریت ہے تو وہ جب اپنے یہاں اللہ کا دین قائم کریں گے تو وہاں فقہ حنفی نافذ ہوگی۔ وقس علیٰ ذالک: لیکن فقہ کے اختلافات کے باوصف سب کا دین ایک ہی ہوگا اور وہ ہوگا دینِ اسلام، دینِ توحید ـــــ اس بات کو آج اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ دین اور شریعت یا دین اور فقہ میں

کیا فرق ہے ! یہاں بات دین کی ہو رہی ہے۔ شریعت کی نہیں۔ دین کے معاملہ میں متفرق نہ ہو۔ اس پر جمے رہو۔ اللہ ہی کو مطاعِ مطلق ماننا ہے۔ اسی کی حاکمیت تسلیم کرنی ہے۔ اسی کی تابعداری اور فرمانبرداری کرنی ہے۔ اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ اسی کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پر مبنی اپنا نظامِ حیات بنانا ہے۔ یہ ہے اقامتِ دین۔ اس کے بارے میں تفریق میں نہ پڑ جانا۔

دین اللہ کا قیام مشرکین پر بھاری ہوتا ہے

اس آیت مبارکہ میں آگے جو مضمون آرہا ہے اس کی تفہیم کے لئے مجھے تمہیداً کچھ باتیں عرض کرنی ہوں گی۔

نزولِ قرآن کا پس منظر اور تاویلِ خاص

دیکھئے قرآن مجید چونکہ ایک خاص دور میں نازل ہوا ۶۱۰ عیسوی سے لے کر ۶۳۲ عیسوی تک جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کے نزول کا زمانہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک خاص ملک یعنی عرب میں پورا کا پورا قرآن نازل ہوا۔ تیسرے یہ کہ قرآن مجید کے اوّلین مخاطب محمد رسول اللہ پھر آنحضور کے توسّط سے اوّلین مخاطب وہی لوگ تھے جو عرب میں آباد تھے۔ لہٰذا قرآن حکیم کی ایک تفسیر اس انداز میں ہم کریں گے کہ جب فلاں آیت یا فلاں سورت نازل ہوئی تو اس خاص پس منظر (Immediate Spectacle) میں اس کا کیا مفہوم سمجھا گیا ! یہ ہوگی قرآن مجید کی تاویلِ خاص ـــــ ہمیں اس آیت یا آیات یا سورت کو اس خاص پس منظر میں رکھ کر غور کرنا ہوگا کہ یہ کب نازل ہوئی! کس مرحلہ پر نازل ہوئی ! اس وقت اس کا مفہوم کیا سامنے آیا۔ ! اس پر کیا عمل ہوا ـــ ! یہ ہوگی تاویلِ خاص ـــ

تاویلِ عام

لیکن ـــ یہ لیکن بہت اہم ہے اس کو غور سے سنیئے ! لیکن قرآن حکیم صرف اس دور کے لئے نازل نہیں ہوا۔ ابدالآباد تک کے لئے یہ قرآن ہدایت و رہنمائی ہے۔ صرف عربوں کے لئے نہیں پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ ھُـدًی لِّلنّاس ہے ـــ لہٰذا دوسری تاویل ہوگی تاویلِ عام ـــ جس کے لئے مفسّرین کا اصول یہ ہے کہ الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوصِ السبب۔ خاص حالات جن میں آیتیں یا سورتیں نازل ہوئیں ان کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ الفاظ کو دیکھ کر ان کے عموم سے جو مطلب اخذ کیا جائے گا وہ قرآن مجید کا ابدی مفہوم و مطلب ہوگا

لیکن اس تاویلِ عام کے لئے ضروری ہے کہ تاویلِ خاص کو انسان سمجھ لے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عام تاویل میں قرآن کے منشاء سے بہت دور چلا جائے۔ اس کا امکان ہے اور غالب امکان ہے۔ لہٰذا پہلے تاویلِ خاص کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ پھر یہ کہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اس سے جو عام اصول نکل رہے ہوں یا استنباط کئے جاسکتے ہوں تو ان کو پلّے باندھ لینا چاہیئے کہ یہ ہے قرآن مجید کی ابدی رہنمائی ـــــ یہ ربط و تعلق ہے تاویلِ خاص اور تاویلِ عام کا۔

اب آپ تاویلِ خاص کے اعتبار سے اس پس منظر کو دیکھئے کہ جب یہ آیت نازل ہو رہی تھی کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مخاطبو! جن تک حضور دعوتِ توحید پہنچا رہے ہیں۔ یا اے محمدؐ کے نام لیواؤ! جنہوں نے اس دعوتِ توحید پر لبیک کہا ہے، اسے قبول کر لیا ہے "تمہارے لئے ہم نے وہی دین مقرر کیا ہے جو حضرت نوحؑ کو دیا۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ کو دیا علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام اور جواب ہم نے وحی کیا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب"۔ اور تمہارا فرض کیا ہے؟ "یہ کہ اس دین کو قائم کرو اور اس کے بارے میں تفرقہ میں نہ پڑو"۔ ـــ اب سمجھئے کہ کون کون لوگ اس وقت عرب میں تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین تھے۔

اوّلین مخاطب مشرکینِ عرب

سب سے پہلے مخاطب تو مشرکینِ عرب تھے جو ہدایتِ ربانی سے بہت دور جا چکے تھے۔ ان کے پاس کوئی آسمانی ہدایت کوئی آسمانی کتاب موجود نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر و بیشتر عرب حضرت اسمٰعیل کی اولاد ہیں۔ یہ عربِ مستعربہ کہلاتے ہیں۔ ان میں کچھ عربِ عاربہ ہیں، اصل عرب کے پرانے رہنے والے۔ اس لئے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تو اصل عرب کے رہنے والے نہیں تھے۔ وہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے ہیں جن کا اصل وطن تو عراق تھا جنہوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کو عرب میں آباد کیا تھا بفحوائے آیتِ قرآنی: رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ لہٰذا حضرت اسمٰعیلؑ خود اور ان کی ذریت عربِ مستعربہ کہلاتی ہے۔ یعنی عرب بن گئے ہیں اصل عرب نہیں ہیں۔ یمن وغیرہ سے جو قبائل نکلے وہ اصل عرب ہیں۔ مدینہ میں اوس و خزرج کے جو دو قبیلے تھے یہ اصلاً یمنی تھے۔ جو وہاں آکر آباد ہوئے ان کا تعلق عربِ عاربہ سے تھا۔ ایک تو یہ قبائل ہیں۔ لیکن ان پر اور عرب کے تمام قدیم قبائل پر حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا اتنا اثر ہوا کہ ان سب لوگوں نے اپنے آپ کو دینِ ابراہیمی پر ہی قرار دے دیا۔ حضرت ابراہیم کا ایک لقب حنیف بھی ہے۔ قرآن میں بھی آں جنابؑ کے ساتھ

یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا تمام عرب خود کو ملّتِ حنیفی پر عمل پیرا قرار دیتے تھے اور بنی اسمٰعیل کہلاتے تھے۔ پھر چونکہ حضرت ابراہیم کی نسل میں حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد نبی کوئی نہیں آیا اور یہ وقفہ کتنا ہے؛ آپ کو اندازہ ہونا چاہیئے۔ وہ ہے قریباً ڈھائی ہزار برس۔ اس عرصہ کے دوران کوئی نبی نہیں، کوئی رسول نہیں، کوئی کتاب نہیں ـــــ نبی آئے، رسول آئے، کتابیں نازل ہوئیں، ہدایت الٰہی کا سلسلہ جاری رہا لیکن دوسری نسل میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام سے چلی اور جو فلسطین کے علاقے میں آباد ہوئی۔ حضرت اسحٰق نبی ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت یعقوب نبی ہیں۔ ان کے بارہ بیٹوں میں سے حضرت یوسف نبی ہیں علیہم السلام چونکہ حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا لہٰذا اب یہ بنی اسرائیل کہلائے۔ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ اس نسل میں چلتا رہا۔ ان ہی میں حضرت موسیٰ ہیں۔ حضرت داؤد ہیں، حضرت سلیمان ہیں، علیہم السلام۔ ان ہی میں سے حضرت عزیر ہیں، حضرت زکریا ہیں، حضرت یحییٰ ہیں اور بے شمار نبیوں کا سلسلہ ہے جن کا ذکر تورات میں ہے۔ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام ـــ اور اس سلسلہ کے آخری نبی و رسول ہیں حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام۔

بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موقع پر عرب میں عربوں کے یہ دو گروہ عرب مستعربہ اور عرب عاربہ موجود تھے۔ جو اپنے آپ کو حضرت اسمٰعیل کی طرف منسوب کرتے تھے۔ وہ دین اور توحید سے بہت دور جا چکے تھے۔ کہنے کو وہ کہتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیمؑ کے پیروکار ہیں لیکن بدترین شرک میں مبتلا تھے۔ بت پرستی، ستارہ پرستی ان کے یہاں ہو رہی ہے، فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا ہوا ہے۔ توحید کی کوئی رمق ان میں باقی نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ حج کے جو مناسک ان کے یہاں چھوڑ گئے تھے ان میں بھی ردوبدل کر لیا ہے۔ مادر زاد برہنہ ہو کر طواف کرنے کو بڑی نیکی کا کام سمجھ رہے ہیں۔ نہ معلوم ان کے یہاں اور کیا کیا خرافات آ گئی ہیں۔ عربوں کے یہ دو گروہ ہیں جن کو قرآن مجید کہتا ہے اُمّیین اور مشرکین۔

دوسرے مخاطبین: اہل کتاب

دوسرا گروہ جو مخاطب تھا وہ نسل حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰقؑ سے چلی تھی جن کے بیٹے حضرت یعقوبؑ جن کا لقب اسرائیل تھا، سے اس کا نام بنی اسرائیل پڑ گیا تھا۔ یہ بھی آگے چل کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک وہ جو حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کو تو مانتے تھے لیکن حضرت عیسیٰؑ کا انکار کرتے تھے۔ یہ کہلائے یہود۔ دوسرے وہ جو حضرت عیسیٰؑ پر بھی ایمان رکھتے تھے کہ آنجناب

اللہ کے نبی و رسول تھے۔ البتہ ان کی اکثریت نے حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا بھی قرار دے رکھا تھا۔ وہ کہلائے نصاریٰ (عیسائی) ـــــ یہ دونوں گروہ بھی عرب میں آباد تھے۔ یہود کے مدینہ میں تین قبیلے تھے۔ خیبر میں ان یہود کا بہت بڑا گڑھ تھا۔ نجران میں نصاریٰ آباد تھے۔

مخاطب دو جماعتیں

لہٰذا بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وقت عرب میں دو جماعتیں تھیں۔ ایک تو وہ جو دین سے بہت بعید 'جاہل' ـــ ان کے پاس نہ شریعت نہ کوئی آسمانی کتاب اور بدترین شرک میں مبتلا۔ دوسری جماعت وہ تھی جن کے پاس آسمانی کتاب بھی تھی گو وہ کافی محرّف ہو چکی تھی اور شریعت بھی تھی۔ کم از کم یہود شریعت رکھتے تھے گو کہ اس میں بھی کافی تحریف ہو چکی تھی۔ ان کے یہاں علماء تھے، فضلاء تھے، مفتی تھے، قاضی تھے۔ ان کا سارا کا سارا نظام برقرار تھا۔ اسی طریقے سے نصاریٰ تورات کو بھی مانتے تھے اور ان کے پاس انجیل بھی تھی گو اس میں بھی کافی تحریف ہو چکی تھی۔ ان کے یہاں بھی بڑے بڑے علماء تھے، احبار بھی تھے اور رہبان بھی۔ ان دونوں طبقوں کو ذہن میں رکھئے۔ اب اس پس منظر میں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے اسے سمجھئے!

دعوتِ محمدیؐ کی مخالفت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت شروع کی اور آپؐ نے دیکھا کہ لوگ اس مطابقِ فطرت دعوت کو قبول نہیں کر رہے، ایمان نہیں لا رہے، مخالفت ہو رہی ہے کشمکش ہو رہی ہے۔ مٹھی بھر جو سعید روحیں ایمان لے آئی ہیں، ان پر تشدد ہو رہا ہے۔ ان کو شدید ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ حالانکہ اسی مکہ کے رہنے والے اجرائے وحی اور آغازِ دعوتِ توحید سے قبل آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت کرتے تھے۔ الصّادق کا خطاب حضورؐ کو کس نے دیا؟ الامین حضورؐ کو کس نے قرار دیا! ان ہی مکہ والوں نے۔ وہ تو آپؐ کے قدموں تلے اپنی آنکھیں بچھاتے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب آں حضورؐ نے دعوتِ توحید شروع کی تو وہی مکہ والے جو جان چھڑکتے تھے۔ اب وہی خون کے پیاسے ہو گئے

بنو ہاشم کی حمایت

وہ تو ابوطالب کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت محبت تھی، طبعی اور قلبی محبت۔ وہ اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن اس محبت کی وجہ سے آپؐ کو ان کی حمایت حاصل تھی۔ ابوطالب چونکہ بنو ہاشم کے قبیلہ کے سردار تھے۔ لہٰذا قبائلی دستور کے مطابق پورا قبیلہ سردار کے ساتھ تھا۔ چنانچہ بنو ہاشم کی جو قریش کا سب سے بااثر قبیلہ تھا، حضور کو حمایت حاصل تھی۔ اس لئے قریش کو نبی اکرمؐ کے خلاف کوئی براہِ راست اقدام کی جرأت نہیں

ہوئی۔ قریش جانتے تھے کہ اگر ہم نے محمد کو نقصان پہنچایا (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اس نظام کے تحت بنو ہاشم کا پورا قبیلہ خون کا بدلہ لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوگا۔ چاہے وہ ایمان لایا نہ ہوتا۔ اس طرح ایک خون ریز خانہ جنگی شروع ہو جائے گی جس کا وہ تحمل نہیں کر سکتے۔ پورے عرب میں ان کا رعب اور دبدبہ قریش کے تمام قبیلوں کے متحد ہونے کے سبب سے تھا۔ آپس کی جنگ ان کے لئے بڑی نازک صورت حال پیدا کر دیتی اور حال یہ ہوتا کہ — A house divided Amongst itself can not stand — قریش کو اندیشہ تھا کہ اگر ہمارے مابین تفرقہ ہو گیا تو ہماری ہوا خیزی ہو جائے گی۔ اس لئے وہ آں حضورؐ کے خون کے پیاسے ہونے کے باوجود آپؐ کی جان لینے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے لیکن مخالفت شدید تھی اور طرح طرح سے نبی اکرمؐ اور آپؐ کے اصحابؓ کو تکلیفیں پہنچانے کا سلسلہ جاری تھا۔

اہلِ کتاب کی مخالفت

دوسری طرف دعوتِ توحید قبول کرنے کی توقع اہلِ کتاب سے ہو سکتی تھی کہ چلو قریش تو جاہل ہیں ان کے پاس کتاب نہیں، شریعت نہیں، وحی کا نور ہے ہی نہیں۔ لیکن یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے پاس کتاب بھی ہے شریعت بھی ہے، دین کا علم بھی ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو نبی آخر الزماں کے منتظر تھے ان کی بعثت کے لئے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ تیرے آخری نبی کے ظہور کا وقت کب آئے گا۔ یہود کی جب اصل عربوں سے لڑائی ہوتی تھی تو وہ مار کھاتے تھے، پٹتے تھے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ سرمایہ دار تو مار کھاتا ہے جس طریقے سے ہندوستان میں مسلمان چاہے تھوڑے ہوتے تھے، اقلیت میں ہوتے تھے لیکن جب فساد ہوتا تھا تو بنیا مار کھاتا تھا۔ یہی معاملہ یہودیوں کا ہوتا تھا۔ وہ طبعی طور پر بزدل تھے لہٰذا وہ مار کھاتے تھے۔ لیکن جب وہ پٹتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ ٹھیک ہے اس وقت تو ہم تم سے پٹ گئے ہیں لیکن آخری نبی کے ظہور کا وقت قریب ہے جب ہم ان کی زیرِ قیادت تم سے جنگ کریں گے تو تم ہم پر غالب نہیں آسکو گے — یثرب میں رہنے والے اوس و خزرج کے عرب قبائل کو وہ دھمکیاں دیا کرتے تھے — یہود کی یہی دھمکیاں جس کو Irony of Fate کہیں گے، مدینہ والوں کے ایمان لانے میں سبقت کا ذریعہ بن گئیں۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ ہمارے یہاں یہود کے بڑے بڑے علماء ہیں، وہ یہ کہا کرتے ہیں کہ آخری نبی کے ظہور کا وقت ہے۔ لہٰذا جیسے ہی رات کی تاریکی میں مکہ کی وادی عقبہ میں مدینے سے آئے ہوئے چند اشخاص کی نبی اکرمؐ سے ملاقات ہوئی۔ آپؐ تبلیغ کے لئے گشت فرما رہے تھے۔ آپؐ نے

دیکھا کہ وادی عقبہ میں چھ آدمی پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ آپؐ نے ان کے سامنے دعوتِ توحید پیش فرمائی۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا کہ کہیں نہ ہوں یہ وہی نبی ہیں جن کی بعثت کا یہود ذکر کیا کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ ہم سبقت کرکے آپؐ کے ہاتھ پر ایمان لے آئیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہودی سبقت کر جائیں۔ یہود کی دی ہوئی خبروں کے ذریعے سے ان چھ حضرات کو تو ہدایت حاصل ہوگئی اور یہ ایمان لے آئے لیکن یہود کے علماء کا حال وہ رہا جس کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے : یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَ ھُمۡ ۔ یہ اگرچہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور قرآن مجید کو اچھی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس حضورؐ کی دشمنی میں یہود سب سے آگے بڑھ گئے ــــ وجہ یہ تھی کہ ان کا خیال تھا کہ نبی آخر الزمان ان میں سے مبعوث ہوں گے۔ ڈھائی ہزار برس سے نبوت ہمارے ہاں چلی آرہی ہے۔ یہ تار کبھی ٹوٹا ہی نہیں لیکن ان کی توقع کے خلاف بنی اسمٰعیل میں خاتم النبیین المرسلین کا ظہور ہوگیا۔ یہ بات ان کے لئے بہت بڑی آزمائش بن گئی کہ ہم بنی اسمٰعیل کے ایک فرد کے آگے کیسے جھک جائیں۔! وہ تو اُمّی قوم ہے، ان پڑھ قوم ہے، ان میں دین نہیں، کے پاس کوئی علم نہیں۔ یہ نبی کہیں سے فارغ التحصیل نہیں۔ ان کے پاس کسی دار العلوم کی نہیں۔ ان کے پاس کسی صاحبِ علم کی جانب سے کوئی Testimonial نہیں ہم ان کو نبی کیسے مان لیں۔! ہم تو پھر بہت گھٹیا ہو جائیں گے۔ ہماری علمیت، ہماری سیادت، ہماری قیادت ختم ہو جائے گی۔ ان کا یہ استکبار اور پندار ان کے قبول حق کی راہ میں آڑے آ گیا ـــ!!!

نبیٔ اکرمؐ کو تشویش

یہ ہے پس منظر ـــ اس آیت کے اگلے حصّہ کے بین السطور کا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ اپنی دعوت کے نتیجے کو دیکھ کر کچھ تشویش میں ہیں کہ لوگ کیوں ایمان نہیں لا رہے! آخر انہیں کیا ہو گیا ہے! میری دعوت کتنی صاف سادہ ہے۔ کتنی مطابقِ فطرت ہے۔ انسان کی فطرت کی بدیہیات کو اپیل کرنے والی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ ایمان نہیں لا رہے۔! اس پس منظر کو پیش نظر رکھئے اور اگلے کو پڑھئے۔ فرمایا :-

کَبُرَ عَلَی الۡمُشۡرِکِیۡنَ مَا تَدۡعُوۡھُمۡ اِلَیۡہِ ؕ

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بہت بھاری ہے مشرکین پر وہ چیز جس کی طرف

آپؐ انہیں بلا رہے ہیں۔ دعوت دے رہے ہیں۔"

آپؐ اسے سادہ بات سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ دعوتِ توحید ان کے رائج نظام کو درہم برہم اور تلپٹ کر دینے والی ہے۔ ان کا تو پورا نظام شرک پر قائم ہے، ان کے مفادات اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان کی چودھراہٹیں اس مشرکانہ نظام کی رہینِ منّت ہیں۔

مشرکانہ نظام سے وابستہ مفادات

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہزار دعوتِ توحید مطابقِ فطرت ہو لیکن اس کے جو لوازم، مقتضیات اور متضمنات ہیں ان کو وہ لوگ خوب سمجھتے ہیں جو مشرکانہ نظام میں قیادت و سیادت کے مناصب پر فائز ہوتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اس دعوتِ توحید کی ان کے مفادات پر کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے! دیکھئے اگر کسی بت کا استھان ہے اور لوگ وہاں آ کر چڑھاوے چڑھاتے ہیں تو کیا وہ بت کے پیٹ میں جاتے ہیں؟ وہ تو مجاوروں کے پیٹوں میں جاتے ہیں۔ وہاں کے جو پجاری اور ... ہیں سارے چڑھاوے تو ان کو مل رہے ہیں۔ کہنے کو وہ بت پر چڑھاوا ہے۔ اسی طور پر جو چڑھاوے قبروں پر چڑھائے جاتے ہیں، ان کے متعلق آپ نے کبھی سوچا کہ وہ جاتے کہاں ہیں؟ وہ سب مجاوروں اور گدی نشینوں کے پاس جاتے ہیں۔ وہ تو جب سے محکمہ اوقاف قائم ہوا ہے تو ایسی درگاہوں پر مقفل صندوق رکھ دیئے گئے ہیں کہ نقد نذر و نیاز ان میں ڈالی جائے۔ لیکن شاید آپ کو معلوم ہو کہ جب محکمہ اوقاف کا نظام زیرِ ترتیب تھا اسی دوران بڑی بڑی درگاہوں کے جو حضرات پشتی سجادہ نشین تھے، وہ ان زمینوں کو جو درگاہوں اور مقبروں کے نام وقف تھیں، اپنے ناموں پر منتقل کرا چکے تھے۔ اصل دولت تو محکمہ اوقاف کے سرگرم عمل ہونے سے قبل ہی وہاں سے جا چکی تھی۔ یہ بڑے بڑے پیر جو بڑے بڑے زمیندار اور وڈیرے بنے نظر آتے ہیں یہ کہاں سے بنے ہیں۔ انہی زمینوں کی بدولت بنے ہیں جو ان مقبروں اور درگاہوں کے نام وقف کی گئی تھیں اور اب وہ ان کی ذاتی ملکیت بنی ہوئی ہیں ــــ پس معلوم ہوا کہ شرک کا پورا نظام ہوتا ہی ہے مفادات کا ــــ اس نظام میں تو صرف اوپر کی دکھاوے کی چیزیں ہوتی ہیں کہ یہ منادر و مقابر ہیں ــــ یہ دیوتا اور دیویوں کے بت ہیں۔ یہ اولیاء اللہ کی قبور ہیں۔ اصل مقصد تو ان ناموں، ان استھانوں اور ان درگاہوں کی آڑ میں قیادت و سیادت اور حصول دولت ہوتا ہے۔ سومنات کے مندر کے اندر جو دولت تھی وہ کس کی ملکیت تھی! وہاں کے پجاریوں کی ملکیت تھی۔ لہٰذا مشرکین کبھی برداشت نہیں کر سکتے

تھے کہ نظامِ توحید قائم و نافذ ہو ــــ

آیت کے اس حصّے کے بین السطور نبی اکرمؐ کو تسلّی و تشفّی دی جا رہی ہے کہ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ٹھیک ہے کہ آپؐ جو دعوت دے رہے ہیں وہ فطرت کے مطابق، عقل کے مطابق اور بالکل سیدھی بات ہے ــ توحید سے بڑھ کر سیدھی بات اور کونسی ہوگی! توحید کے سوا مطابقِ فطرت بات کونسی ہوگی! توحید سے بڑھ کر مطابقِ عقل بات کونسی ہوگی! لیکن کسی بات کا مطابقِ فطرت و عقل ہونا اس کے قابلِ قبول کرنے کے لئے کافی نہیں۔ یہاں تو مسئلہ آتا ہے مفادات کا، چودھراہٹ کا، اس بات کا کہ مسند اور سجادہ محفوظ رہتا ہے کہ نہیں! وجاہت اور قیادت پر تو آنچ نہیں آرہی! اور ظاہر بات ہے کہ دعوتِ توحید ان تمام بتوں کو خواہ وہ مٹی اور پتھر کے ہوں، خواہ مفادات، قیادت، سیادت کے ہوں توڑ پھوڑ کر اور ملیامیٹ کر کے رکھ دیتی ہے۔ لہٰذا مشرکین پر یہ دعوت بہت بھاری ہے ۔ یہ اسے آسانی سے ہرگز برداشت نہیں کر سکتے ۔ لہٰذا فرمایا:

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ

اضطراب کا فطری سبب

میں نے کئی بار عرض کیا ہے کہ ایک کریم و شریف النفس انسان جبکہ رسالت کی ذمّہ داری بھی اس کے سپرد ہو یہ سوچتا ہے کہ کہیں میرے اندر تو کوئی نقص نہیں! لوگ جو ایمان نہیں لا رہے تو میری کوشش میں تو کوئی کمی نہیں۔! میری محنت میں تو کوئی کوتاہی نہیں۔! دعوت دینے کے میرے انداز میں تو کوئی خامی نہیں۔! انبیاء اور رسل علیہم السلام تو اس بارے میں بے نہایت تشویش میں مبتلا ہوتے ہیں چونکہ ان کو یہ ضابطۂ الٰہی معلوم ہوتا ہے کہ: فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ۝ "پس یہ لازماً ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں گے کہ جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے ہیں اور رسولوں سے بھی پوچھیں گے"۔ یعنی یہ کہ انہوں نے رسالت کے فرضِ منصبی کو کہاں تک اور کس طرح انجام دیا اور انہیں اس کا کیا جواب ملا۔ لہٰذا حضورؐ کو یہ تشویش ہوتی تھی کہ کہیں میری کوئی کوتاہی نہ ہو جس کے باعث مجھے اللہ کے ہاں جواب دہی کرنی پڑ جائے ــــ

نبی اکرمؐ کی دلجوئی

قرآن مجید میں بار بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف اسالیب سے جو تسلّی دی گئی ہے اور آپؐ کی جو دلجوئی کی گئی ہے وہ اسی لئے کہ آں حضورؐ لوگوں کے ایمان نہ لانے پر تشویش میں مبتلا ہو کر اپنی جان کو نہ گھلائیں: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ (اے نبی!) شاید آپؐ رنج، صدمے، تشویش اور غم میں اپنی جان کھو دیں گے کہ یہ لوگ ایمان

(کیوں) نہیں لاتے : حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ فَاِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ بِھٰدِ الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِھِمْ ؕ (اے نبیؐ) آپؐ مُردوں کو نہیں سنا سکتے نہ بہروں تک اپنی دعوت، اپنی پکار پہنچا سکتے ہیں جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں اور نہ ہی آپؐ اندھوں کو سیدھا راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہیں —— یہ وہ لوگ ہیں جو اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ : خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ —" (ان کے کفر پر اڑے رہنے کے باعث) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔ ان کے کانوں اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے"۔ بظاہر یہ چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں لیکن حقیقت میں یہ مر چکے ہیں۔ ان کی معنوی موت واقع ہو چکی ہے۔ بظاہر ان کے پاس سماعت بھی ہے بصارت بھی ہے لیکن معنوی اعتبار سے یہ بہرے اور اندھے ہیں یہ چلتے پھرتے قبرے ہیں۔ یہ چلتے پھرتے حیوانات ہیں۔ ان کے اندر کا انسان مر چکا ہے —— آپؐ کی تبلیغ و دعوت میں کوئی کمی نہیں ہے لہٰذا آپؐ تشویش نہ کریں۔ آپؐ یہ فکر دامن گیر نہ کریں کہ یہ ایمان کیوں نہیں لا رہے —!! اس تمام پس منظر، تشریح و توضیح کو پیشِ نظر رکھ کر آپؐ آخری بار پھر آیت کے اس حصہ کو دیکھئے کہ :

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ

(جاری ہے)

ؔ اس موقع پر سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۴ بھی پیشِ نظر رہے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرمؐ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن سنانے کی فرمائش کی اور وہ جب اس آیت پر پہنچے تو حضورؐ نے فرمایا : حَسْبُکَ حَسْبُکَ —— حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ " اس موقع پر جب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو تھے" یہ اس فرضِ منصبی کی گہرائی کا گہرا احساس تھا جو آنحضرتؐ کے سپرد کیا گیا تھا۔ آیت یہ ہے : فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَھِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَھِیْدًا ۝ " اے نبی غور کیجئے کہ اس روز کیا ہوگا جب ہم ہر اُمت پر (اس کے رسول کو) بطور گواہ لائیں گے اور (اے نبی) آپؐ کو ان سب پر گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے" (مرتب)

عن انسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

قال

لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما
یحب لنفسہ

(رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ
والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت
تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے
بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے
لئے پسند کرتا ہے۔

ملک اقبال واحد

اسلام میں عملی زندگی

ارشادات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

ایمان باللہ اور اس کے تقاضے

اہمیت و مقام

حضرت عثمان رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اس حال میں مرا کہ وہ یقین رکھتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو وہ جنت میں جائے گا" (مسلم)

مدارِ نجات

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے روایت ہے کہ "میں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ ہمارے دین میں مدارِ نجات کیا ہے؟ آپ نے فرمایا جو اس بات کی گواہی دے کہ خدا کوئی نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ۔ بس یہی اس کے لیے باعثِ نجات ہے۔" (دارقطنی)

اللہ کا ہمہ وقتی احساس

حضرت عبادہ بن صامت رضؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ :

"آپ نے فرمایا سب سے افضل ایمان یہ ہے کہ تو اس بات کا یقین رکھ کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ذات تیرے ساتھ ہے۔ جہاں بھی تو ہو" (طبرانی)

اللہ کا ڈر

حضرت ابوذر غفاری رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم جہاں ہو جس حال میں ہو خدا سے ڈرتے رہو اور ہر برائی کے پیچھے نیکی کرو وہ اس کو مٹا دے گی اور اللہ کے بندوں کے ساتھ

حُسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آؤ۔" (مسند احمد)

حضرت انس رضؓ بیان کرتے ہیں کہ

صرف اللہ سے حاجت روائی

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم کو چاہیئے کہ اپنی تمام حاجتیں اللہ تعالیٰ سے مانگا کرو۔ یہاں تک کہ اگر چپل کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ تعالےٰ سے مانگو۔"
(ترمذی)

حضرت معاذ بن جبل رضؓ سے روایت

اللہ ہی کے لیے محبّت و نفرت

ہے کہ "مَیں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے افضل اور اعلیٰ درجے کے متعلق سوال کیا کہ وہ کیا ہے اور اسے کس ذریعے سے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ یہ کہ بس اللہ ہی کے لیے تمہاری کسی سے محبت ہو اور اللہ ہی کے لیے دشمنی ہو۔ اور دوسرے یہ کہ تم اپنی زبان کو اللہ کے ذکر و یاد میں لگائے رکھو اور یہ کہ دوسروں کے لیے بھی وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو۔"
(مسندِ احمد)

حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضؓ سے روایت ہے

اللہ کی اطاعت

کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ اے لڑکے تُو اللہ کے احکام کا خیال رکھ۔ اللہ تعالیٰ تیرا خیال رکھے گا۔ اور دنیا و آخرت کی آفات سے تیری حفاظت کرے گا۔ تُو اللہ کو یاد رکھ جیسا کہ یاد رکھنا چاہیئے تو اس کو اپنے سامنے پائے گا۔ اور جب تو کسی چیز کو مانگنا چاہے تو بس اللہ سے مانگ۔ اور جب کسی ضرورت میں مدد کا محتاج ہو تو اللہ سے اعانت طلب کر اور اس بات کو دل میں بٹھا لے کہ اگر ساری دنیا بھی متفق ہو کر تجھے کسی چیز سے نفع پہنچانا چاہے تو اسی قدر نفع پہنچا سکے گی جو اللہ تعالےٰ نے تیرے لیے مقدّر کر دیا ہے۔ اور اگر ساری دنیا مِل کر تجھے نقصان پہنچانا چاہے تو صرف اسی قدر نقصان پہنچا سکے گی، جو اللہ تعالےٰ نے تیرے لیے پہلے سے لکھ دیا ہے۔"

(مسند احمد و ترمذی)

ایمان بالرّسالت اور اُس کے تقاضے

رسالتِ محمدیؐ کا مقام

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے۔ اگر موسیٰؑ تمہارے سامنے آجائیں اور تم ان کی پیروی کرو اور مجھے چھوڑ دو تو تم بلاشبہ سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے۔ اگر موسیٰؑ زندہ ہوتے اور میرا زمانۂ نبوت پاتے تو میری پیروی کرتے۔" (مشکوٰۃ)

رسالت کی گواہی

حضرت معاذ بن جبلؓ روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا جو سچے دل سے گواہی دے کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ۔ اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم اُس کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ کو اُس پر حرام کردے گا۔" (ترمذی)

اتّباعِ رسالت

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی خواہشاتِ نفس میری لائی ہوئی ہدایت (اسلامی قانون زندگی) کے تابع نہ ہو جائیں۔" (شرح السنۃ)

محبّتِ رسولؐ

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا۔ جب تک میں اُسے اپنے والدین، اولاد حتیٰ کہ تمام دنیا کے لوگوں سے زیادہ عزیز اور محبوب نہ ہوجاؤں۔" (بخاری)

اطاعتِ رسولؐ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: میری اُمّت کا ہر فرد جنّت میں داخل ہوگا۔ سوائے اُس کے جس نے میرا انکار کیا۔ پس جس نے میری نافرمانی کی اُس نے درحقیقت میرا انکار کیا۔ (بخاری)

اتباعِ سنّت

حضرت ابوسعید خدری رضؓ بیان کرتے ہیں کہ " رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : جس شخص نے پاک و حلال کھایا اور طریقِ سُنّت کے مطابق زندگی گزاری اور جس کی زیادتیوں سے لوگ امن میں رہے وہ جنّت میں داخل ہوگا۔ (ترمذی)

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا :
" اے میرے بیٹے ! اگر تجھ سے ممکن ہو تو صبح سے شام تک اس حال میں بسر کر دے کہ تیرے دل میں کسی سے کھوٹ اور کینہ نہ ہو۔ اے میرے بیٹے یہی میرا طریقہ اور میری سنّت ہے پس جس شخص نے میری پسند اور میرے طریقہ کو اختیار کیا اس نے مجھے دوست رکھا۔ اور جس نے مجھے دوست رکھا وہ جنّت میں میرے ساتھ ہوگا۔
(ترمذی)

ایمان بالکتاب اور اُس کے تقاضے

اہمیت و مقام

حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ سے روایت ہے کہ :
" رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں ارشاد فرمایا میں تمہارے لیے ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں۔ اگر تم نے اُس پر عمل کیا اور اُسے مضبوطی سے پکڑے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہ ہوگے اور وہ اللہ کی کتاب ہے۔" (صحیح مسلم)

عمل بالقرآن

حضرت صہیب رضؓ سے روایت ہے کہ " رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : جس شخص نے قرآن کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھا وہ درحقیقت قرآن پر ایمان نہیں لایا۔ (ترمذی۔)

ایمان بالآخرت اور اُس کے تقاضے

اہمیّت و مقام

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ " رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : قسم اُس ذات کی جس

کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر آخرت کے ہولناک احوال کے متعلق تمہیں وہ سب کچھ معلوم ہو جائے جو مجھے معلوم ہے تو تمہارا ہنسنا بہت کم ہو جائے اور تمہارا رونا بہت بڑھ جائے۔ (بخاری)

محاسبہ آخرت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت ہے کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن آدمی اپنی جگہ سے ہل نہ سکے گا جب تک پانچ باتوں کے بارے میں ان سے سوال نہ کر لیا جائے۔ اُس نے بحیثیت مجموعی اپنی زندگی کو کن کاموں میں کھپایا۔ اُس نے اپنی جوانی کن مشاغل میں گذاری۔ مال و دولت کے بارے میں کہ کہاں سے اور کن طریقوں سے اُس کو حاصل کیا۔ اور کن کاموں اور کن راہوں میں اُس کو صرف کیا۔ اور آخری بات یہ کہ جو کچھ علم (علم دین) حاصل کیا، اُس پر کس حد تک عمل کیا۔ (ترمذی)

ضیاعِ آخرت

حضرت ابی امامہ رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن مرتبہ و مقام کے لحاظ سے بدترین آدمی وہ ہوگا جس نے دنیا حاصل کرنے کے لیے اپنی آخرت کو ضائع کر دیا۔ (ابن ماجہ)

فکرِ عاقبت

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ڈرتا ہے وہ شروع رات میں چل دیتا ہے اور وہ عافیت و اطمینان کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ سنو اللہ کا سودا سستا نہیں مہنگا ہے۔ یاد رکھو اللہ کا سودا جنت ہے۔"
(ترمذی)

بدترین انسان

حضرت ابو امامہ رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن مرتبہ کے لحاظ سے بدترین انسان وہ ہوگا جو دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت برباد کر دے۔ (مشکوٰۃ)

اسلام

نظامِ زندگی

حضرت عباس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : ایمان کا مزہ اُس نے چکھا اور ایمان کی لذت اُسے ملی اور ایمان کے فائدے اُسے حاصل ہوئے جو اللہ کو اپنا ربّ، اسلام کو اپنا دین اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اپنا رسول اور ہادی بنانے پر دل سے راضی ہوگیا ۔ (مسلم)

پوری زندگی پورا اسلام

حضرت زیاد بن نعیم رضؓ سے روایت ہے کہ " رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : چار باتیں ہیں جن کو اللہ تعالےٰ نے اسلام میں فرض قرار دیا ہے ۔ نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج جو شخص ان میں سے تین ادا کرے وہ اُس کے لیے مفید نہیں ہوسکتیں تاوقتیکہ سب ادا نہ کرے ۔" (مسند احمد)

فضیلت ایمان و اسلام

حضرت عبداللہ رضؓ سے روایت ہے کہ " رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ۔ اللہ تعالےٰ نے جس طرح تم میں روزی تقسیم کی ہے اسی طرح تمہارے درمیان اخلاق کی بھی تقسیم ہے ۔ وہ دنیا تو سب کو دیتا ہے ۔ اُس کو بھی جس سے محبت کرتا ہے اور اُس کو بھی جس سے محبت نہیں کرتا ۔ لیکن دولتِ ایمان صرف اُس کو دیتا ہے جس سے محبت کرتا ہے ۔" (مستدرک حاکم)

عبادات

ارکان اسلام

حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم کی گئی ہے ۔ ایک اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود و خالق نہیں اور محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اس کے بندے اور رسول ہیں ۔ دوسرے نماز قائم کرنا ۔ تیسرے زکوٰۃ ادا کرنا ۔ چوتھے حج کرنا ۔ پانچویں رمضان کے روزے رکھنا ۔ (بخاری و مسلم)

ساز (اہمیت ومقام) حضرت عبداللہ بن شفیق بیان کرتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ۔۔۔ائے نماز کے کسی اور چیز کو ایسا نہیں سمجھتے تھے جس کا چھوڑ دینا کفر ہو۔" (ترمذی)

۔۔۔ع وخشوع حضرت عبادہ بن صامت رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دو ۔۔۔عت نماز اس طرح پڑھے کہ درمیان میں بالکل غافل نہ ہو تو اللہ تعالٰے اس کے ۔۔۔پلے تمام گناہ معاف کر دے گا۔" (مشکوٰۃ)

یکسوئی حضرت زید بن خالدؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز اس طرح سے پڑھے کہ درمیان میں بالکل غافل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دے گا۔ (مشکوٰۃ)

نماز مودع حضرت ابوایوب انصاری رضؓ سے روایت ہے کہ: "ایک شخص کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اُس شخص کی سی نماز پڑھو جو سب کو الوداع کہنے والا ہو۔" (مسند احمد)

افضل اعمال حضرت ابنِ مسعود رضؓ سے روایت ہے کہ "مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہترین عمل کے بارے میں سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا۔ مَیں نے پوچھا اس کے بعد کونسا عمل بہتر ہے۔ آپؐ نے فرمایا ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔ پھر مَیں نے پوچھا اس کے بعد کونسا عمل فضیلت رکھتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا خدا کی راہ میں جہاد کرنا۔" (بخاری ومسلم)

زکوٰۃ (اہمیت ومقام) حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص سونے اور چاندی کا مالک ہو (بقدر نصاب) اور وہ اُس کا حق (زکوٰۃ) ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اُس کے لیے سونے اور چاندی کی تختیاں بنائی جائیں گی جن سے اُس کی پیشانی اور پہلوؤں کو داغ دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ یہ عمل متواتر اور ابدی ہو گا۔" (مسلم)

مال کم نہیں ہوتا

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، صدقہ خیرات کرنے سے مال کم نہیں ہوتا۔ اور کسی کا قصور معاف کر دینے سے عزت میں کمی نہیں ہوتی۔ اضافہ ہی ہوتا ہے۔" (مسلم)

حج (اہمیت و مقام)

حضرت ابوامامہ رضؓ سے روایت ہے کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص باوجود استطاعت کے حج نہ کرے خدا کو اس کی پرواہ نہیں ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر" (دارمی)

حج مقبول

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حج مقبول و مبرور کا بدلہ صرف جنت ہے (بخاری و مسلم)

روزہ (اہمیت و مقام)

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص رمضان میں بلا کسی عذر کے ایک دن روزہ نہ رکھے تو ساری عمر روزے رکھنے سے بھی اس کا بدلہ نہیں ہو سکتا۔" (ترمذی)

ایمان و احتساب

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے روزہ رکھا ایمان و احتساب کے ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ (بخاری)

فاقہ نہیں روزہ

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ کھانا پینا چھوڑے۔" (بخاری)

حسنات

(پسندیدہ اخلاق)

اخلاصِ نیت

حضرت عمر رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام اعمال کا دارومدار

نیت پر ہے۔ آدمی کو اُس کی نیت کے مطابق اجر ملتا ہے۔ جس شخص نے اللہ اور رسول ؐ کے لیے ہجرت کی درحقیقت اُس کی ہجرت اللہ اور رسول ؐ کے لیے ہوئی اور جو کوئی کسی دنیاوی غرض کے لیے مہاجر بنا تو فی الواقع جس دوسری غرض و نیت کے لیے اُس نے ہجرت کی ہے بس اُسی کی طرف اُس کی ہجرت مانی جائے گی۔" (بخاری و مسلم)

اخلاصِ عمل

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا وہ تمہارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے۔" (مسلم)

حسنِ اخلاق

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: مومن اپنے حسنِ اخلاق کی وجہ سے قائم اللیل اور صائم النہار کا مرتبہ و مقام حاصل کر لیتا ہے۔" (ابو داؤد)

بھلائی

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جس سے لوگ بھلائی کے امیدوار ہوں اور جس کے شر سے محفوظ و مامون زندگی بسر کرتے ہوں۔" (ترمذی)

راست گفتاری

حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: تم سچائی کو لازم پکڑو۔ ہمیشہ سچ بولو۔ سچ بولنا نیکی کے رستہ پر ڈال دیتا ہے۔ اور نیکی جنّت تک پہنچا دیتی ہے۔ جھوٹ سے بچتے رہو۔ جھوٹ بولنے کی عادت آدمی کو فسق و فجور کے رستہ پر ڈال دیتی ہے اور فسق و فجور اُس کو دوزخ تک پہنچا دیتا ہے۔" (بخاری)

احسان

حضرت حذیفہ رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: تم ایسے نہ بنو کہ کہنے لگو لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے۔ اور اگر دوسرے لوگ ظلم اختیار کریں گے تو ہم بھی کریں گے۔ نہیں لوگ احسان کریں تب بھی تم احسان کرو اور اگر لوگ ظلم و برائی کا رویّہ اختیار کریں جب بھی تم ظلم کی روش اختیار نہ کرو۔" (ترمذی)

زہد (پرہیزگاری)

حضرت ابوذر رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: زہد حلال کو اپنے

اور پر حرام کر لینے یا مال کو ضائع کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ زُہد یہ ہے کہ تُو اپنے مقبوضہ وسائل پر خدا تعالےٰ سے زیادہ اعتماد نہ کرے اور پیش آمدہ مصیبت کا اجر تجھے مصیبت کے نہ آنے سے زیادہ مرغوب ہو۔" (ترمذی)

تسلیم و رضا

حضرت سعد رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ انسان کی سعادت مندی اس میں ہے کہ اللہ کی رضا پر راضی رہے۔ اور بدبختی اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بھلائی کا مطالبہ چھوڑ دے اور اُس کی قضا پر ناراض رہے۔" (ترمذی)

صبر

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: جو بندہ کسی جانی و مالی مصیبت میں مبتلا ہو اور اُس پر صبر اختیار نہ کرے نہ کسی سے اظہار کرے، نہ شکایت کرے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اُس کو بخش دیں گے۔" (طبرانی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: وہ مسلمان جو لوگوں کے درمیان رہتا ہے اور اُن کی ایذا رسانیوں پر صبر کرتا ہے اُس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں سے بے تعلق رہتا ہے اور ان کی ایذا رسانیوں پر دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔" (بخاری)

شُکر

حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: اُن لوگوں کی طرف نظر کرو جو تم میں سے کمزور تر ہیں۔ اپنے سے اُوپر والوں کو نہ دیکھو۔" (متفق علیہ)

صبر و شُکر

حضرت صہیب رضؓ روایت کرتے ہیں، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ ہر بات میں اُس کے لیے خیر ہی خیر اور بھلائی ہی بھلائی ہے اور یہ مومن کے سوا کسی کو نصیب نہیں۔ خوشی کی بات پیش آئے تو شکر کرتا ہے اور تکلیف و غم کا موقعہ ہو تو صبر کرتا ہے۔" (مسلم)

توکّل

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: میری اُمّت ... ستر ہزار بغیر حساب

کے جنت میں جائیں گے۔ اور یہ وہ بندگان خدا ہوں گے جو منتر نہیں کراتے، شگون بد نہیں لیتے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔" (بخاری)

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ" میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا۔ آپؐ فرماتے تھے اگر تم لوگ اللہ تعالےٰ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تم کو اس طرح سے روزی دے جس طرح کہ پرندوں کو دیتا ہے کہ صبح بھُوکے اپنے آشیانوں سے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے لوٹتے ہیں۔" (ترمذی)

رحم

حضرت جریرؓ ابن عبداللہ سے روایت ہے کہ" رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور رحمت سے محروم رہیں گے۔ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتے۔" (بخاری)

عفوو درگذر

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ" ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا میں اپنے خادم کا قصور دن میں کتنی دفعہ معاف کروں۔ آپؐ نے فرمایا ہر روز ستر دفعہ۔" (ترمذی)

نرمی

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دوزخ کی آگ ہر ایسے شخص پر حرام ہے جو مزاج میں تیز نہ ہو۔ لوگوں سے قریبی تعلق رکھنے والا اور نرم خُو ہو۔" (ابوداؤد)

حیا

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیا ایمان کا ایک حصّہ ہے اور ایمان کا مقام جنت ہے۔" (مسند احمد)

خندہ پیشانی

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیکی میں سے تُو کسی نیکی کو حقیر اور معمولی نہ سمجھ۔ اگرچہ وہ نیکی یہ ہو کہ تُو اپنے بھائی سے بشاش چہرہ کے ساتھ ملاقات کرے۔" (مُسلم)

قناعت

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کامیاب ہُوا وہ بندہ جس کو حقیقتِ اسلام نصیب ہوئی اور روزی اس کو بقدر کفاف ملی۔ اور اللہ تعالےٰ نے اس کو قلیل روزی پر قانع بنا دیا۔" (مُسلم)

استغنار — حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: دولت مندی مال و منال سے حاصل نہیں ہوتی۔ اصل دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔" (بخاری)

امانت داری — حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: جس میں امانت داری نہیں اُس میں ایمان نہیں۔" (شعب الایمان)

ایفائے عہد — حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: جس میں عہد کی پابندی نہیں، اُس میں دین نہیں۔" (شعب الایمان)

مہمان نوازی — حضرت ابوشریح رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: جو اللہ تعالےٰ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے، اُسے چاہیئے کہ مہمان کی عزت کرے۔" (الادب مفرد)

سادگی اور شرافت — حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: ایمان دار آدمی بھولا۔ سیدھا اور شریف الطبع ہوتا ہے اور منافق دھوکے باز اور ذلیل الطبع ہوتا ہے۔" (مستدرک حاکم)

تواضع اور خاکساری — حضرت عیاض بن حمار رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: حدیث قدسی ہے کہ تواضع اور خاکساری اختیار کرو جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے۔ کوئی کسی پر فخر نہ کرے۔" (ابوداؤد) (جاری ہے)

عَنْ عُثْمَانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهُ

قاری نصیر احمد غزنوی قسط (۸)

قادیانیت
اپنے لٹریچر کے آئینے میں

(گزشتہ سے پیوستہ)

عربی الہام

انتَ الشیخ المسیحُ الّذی لا یُضاعُ وقتُہٗ ۔ کمثلِکَ دُرٌّ لا یُضَاعَ ۔ اُریحُکَ وَلا اُجیحُکَ وَاخرِج منکَ قومًا ۔ اَصحَابُ الصُّفّۃِ وَمَا اَدرٰیکَ مَا اَصحَابُ الصُّفّۃ ۔ انت وجیہٌ فی حضرتی ۔ شَاْنُکَ عجیبٌ وَاَجرُکَ قریب ۔ یا احمد فاضت الرحمۃ علی شفتَیکَ ۔ (تذکرہ صفحہ ۶۵۹)

اردو الہام: یہ طریق اچھا نہیں اس سے روک دیا جائے مسلمانوں کے لیڈر عبدالکریم کو۔ اخویم مولوی عبدالکریم صاحب نے اپنی بیوی سے کسی قدر زبانی سختی کا برتاؤ کیا تھا۔ اس پر حکم ہوا اس قدر سخت گوئی نہیں چاہیئے۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۳۷، صفحہ ۳۸)

اردو الہام: آپ کے ساتھ انگریزوں کا نرمی کے ساتھ ہاتھ تھا۔ اسی طرف خدا تعالیٰ تھا جو آپ تھے۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۳۷)

الہام: مردوں کو جتنے چاہو ساتھ لے جاؤ۔ مگر عورتیں نہ جاویں۔ (تذکرہ صفحہ ۳۲)
ساتھ ہی یہ بھی الہام ہوا کہ موتا موتی لگ رہی ہے ۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم۔ صفحہ ۱۵۰)

فارسی الہامات

الہام: شخصے پائے من بوسیدہ من گفتم کہ سنگ اسود منم۔ (تذکرہ صفحہ ۳۷)
الہام: صادق آں باشد کہ ایام بلا می گذارد با محبت باوفا (تذکرہ صفحہ ۳۷)
الہام: دست تو۔ دعائے تو ترحم زخدا۔ (تذکرہ صفحہ ۱۸۵)
الہام: رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت (تذکرہ صفحہ ۴۶۸)

الہام: مباش ایمن از بازئ روزگار۔ تاریخ ۱۹۰۸ء ۲۶/اپریل۔
(تذکرہ ص۸۱۵)

۱۸۹۳ء۔ ۵/اپریل۔ پشت برقبلہ مے کنند نماز (۲) ۷/اپریل۔ الہام:
شد ترا ایں برگ و بار و شیخ و شاب۔ (تذکرہ ص۶۹۹، ص۶۹۸)

الہام: ہرچہ باید نوعروسے را ہمہ ساماں کنم (تریاق القلوب ص۲۰۲/۴۴)

ایک مرتبہ مجھے یہ الہام ہوا تھا۔ الہام: اے عمی بازی خویش کردی۔ و مرا
افسوس بسیار دادی (قادیان کے آریہ اور ہم ص۴۴/۴۴)

بلاتوقف یہ الہام ہوا۔ الہام: اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ (تریاق القلوب ص۲۱)

جَاءَنِیْ اٰئِیْلُ وَاخْتَارَ (ترجمہ) میرے پاس آئیل آیا اور اس نے مجھے چن لیا
ص۱ اس جگہ آئیل خدا تعالیٰ نے جبریل کا نام رکھا ہے اس لیے کہ بار بار رجوع کرتا ہے۔
(تذکرہ ص۶۵۹)

وحی: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ رَدَّ عَلَیْہِمْ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ شَکَرَ اللّٰہُ سَعْیَہٗ یعنی جو لوگ کافر ہو کر خدا تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں۔ ایک فارسی الاصل نے ان کا رد لکھا ہے۔ خدا اس کی کوشش کا شکر گذار ہے۔

وحی: لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ مُعَلَّقًا بِالثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ ۲۔ (تذکرہ ص۱۳۴)

{ خط کشیدہ حصہ قرآن مجید سے ہے ص۲ یہ حدیث شریف ہے
اس میں سے " اَوْ رِجَالٌ " کم کر دیا ہے۔ نصیر احمد }

نوٹ: عقل حیران ہے کہ خالق نے مخلوق کے کلام کو اپنا کلام بنا کر کیسے نازل کر دیا۔ شاعری کی اصطلاح میں ایسے کلام کو توارد یا سرقہ کہتے ہیں۔ نشان زدہ تینوں مصرعے فارسی کی مشہور ضرب الامثال سے ہیں۔ (نصیر احمد)

مسیح موعود، مثیل مسیح، مسیح ابن مریم

۱۔ ... ایک مسیح ہے جو مسیح موعود کے نام سے موسوم ہے جس کی مسلم

حدیث میں وجہ تسمیہ مسیح ہونے کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ مومنوں کی شدّت اور
ست اور ابتلاء کا غبار جو دجّال کی وجہ سے ان کے طاری حال ہوگا ان کے چہرے سے
نچھ دے گا یعنی دلیل و حجّت سے اُن کو غالب کر دکھائے گا۔ سو اس لیے وہ مسیح
ہلائے گا۔ کیونکہ مسح پونچھنے کو کہتے ہیں۔ جس سے مسیح مشتق ہے اور ضرور ہے کہ وہ
جّال معہود کے بعد نازل ہو۔ سو یہ عاجز دجّالِ معہود کے خروج کے بعد آیا ہے۔

(ازالۂ اوہام۔ حصہ دوم ص۴۸۸ ص۴۲۷)

عنی دوم : حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبو سیّاح تھے۔ پس اگر وہ صلیب کے
قعہ پر مع جسم آسمان پر چلے گئے تھے تو سیاحت کس زمانہ میں کی۔ حالانکہ اہلِ
نت بھی مسیح کے لفظ کی ایک وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ لفظ مسح سے نکلا ہے اور
سح سیاحت کو کہتے ہیں۔ (از حقیقت ص ۱۵۵/۲)

عنی سوم :- دراصل مسیح اس صدیق کو کہتے ہیں جس کے مسح یعنی چھونے میں خدا
ے برکت رکھی ہو اور اس کے انفاس اور وعظ و کلام زندگی بخش ہوں۔

(ایام الصلح ص ۲۹۴/۶۸)

مسیح موعود

نمبر ۱ : مسیح موعود :- خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں مسیح موعود ہوں۔ جس
نبیوں نے وعدہ دیا ہے اور میری نسبت اور میرے زمانے کی نسبت توریت اور
بخیل اور قرآن شریف میں خبر موجود ہے۔ (دافع البلاء ص۱۸ ص ۲۳۸/۲۲)

نمبر ۲ : میرا یہ دعویٰ کہ میں مسیح موعود ہوں۔۔ کتاب اللہ اور احادیث سے میرے پر
کھل گیا کہ میں مسیح موعود ہوں۔ عین صدی کے سر پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک شخص
بدعو ائے مسیح موعود پیدا ہو گیا۔ (کتاب البریہ ص ۲۰۵/۱۸۷ و نجم الہدیٰ ص۹۰ و تحفہ گولڑویہ ص ۳۲۷/۲۷۱)

مثیل مسیح

نمبر ۳ : میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا ہے کہ میں مسیح بن مریم ہوں۔۔۔ بلکہ میری طرف
سے عرصہ سات یا آٹھ سال سے برابر یہی شائع ہو رہا ہے کہ میں مثیل مسیح ہوں۔
(ازالۂ اوہام حصہ اول ص۱۹۲ ص۱۹۰)

اس عاجز کے دعوی مجدد اور مثیل مسیح ہونے اور ہمکلام الٰہی ہونے پر اب
بفضلہٖ تعالیٰ گیارہواں برس جاتا ہے۔ کیا یہ نشانی نہیں ہے۔ (نشانی آسمانی ص۳۷/۳۹)

ابنِ مریم

نمبر ۴: اس اُمت میں ایک شخص ہوگا کہ پہلے مریم کا مرتبہ اس کو ملے گا۔ پھر اس
میں عیسیٰ کی رُوح پھونکی جاوے گی۔ تب مریم میں سے عیسیٰ نکل آئے گا۔ یعنی وہ
مریمی صفات سے عیسوی صفات کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ گویا مریم ہونے کی صفت
نے عیسیٰ ہونے کا بچہ دیا اور اس طرح پر وہ ابنِ مریم کہلائے گا۔ جیسا کہ براہین احمدیہ
کے حصہ چہارم صفحہ ۴۹۶ میں درج ہے مریم کی طرح عیسیٰ کی رُوح مجھ میں نفخ کی گئی
اور استعارہ کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرایا گیا اور آخر کئی مہینے بعد جو دس مہینے
سے زیادہ نہیں بذریعہ اس الہام کے جو سب سے آخر میں براہین احمدیہ کے حصہ
چہارم صفحہ ۵۵۶ میں درج ہے مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا۔ پس اس طور سے میں
ابنِ مریم ٹھہرا۔ (کشتی نوح ص۴۵ ص۴۸/۵۰ و ص۴۹/۵۱ ص۴۶ ص۴۷ ص۵۰/۵۲)

چند مزید اقتباسات

اوّل تو یہ جاننا چاہیئے کہ مسیح کے نزول کا عقیدہ کوئی ایسا عقیدہ نہیں ہے
ہماری ایمانیات کا جزو یا ہمارے دین کے رکنوں میں سے کوئی رکن ہو بلکہ صدہا
پیشگوئیوں میں سے ایک پیشگوئی ہے جس کو حقیقت اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے جس
زمانہ تک یہ پیشگوئی بیان نہیں کی گئی تھی اس زمانہ تک اسلام کچھ ناقص نہیں تھا اور جب
یہ بیان کی گئی تو اس سے اسلام کچھ کامل نہیں ہوگیا۔ (ازالہ اوہام حصہ اول ص

میرا یہ بھی دعویٰ نہیں کہ صرف مثیل مسیح ہونا میرے ہی پر ختم ہو گیا ہے بلکہ میرے
نزدیک ممکن ہے کہ آئندہ زمانوں میں میرے جیسے دس ہزار بھی مثیل مسیح آجائیں ممکن
ہے کہ کسی زمانہ میں کوئی ایسا مسیح بھی آجائے جس پر حدیثوں کے ظاہری الفاظ صادق
آسکیں۔ (ازالہ اوہام حصہ اول ص۱۹۷ ص۲۰

گو میں اس بات کو تو مانتا ہوں کہ ممکن ہے کہ میرے بعد کوئی اور مسیح ابن مر

بھی آوے اور بعض احادیث کی رُو سے وہ موعود بھی ہو اور کوئی ایسا دجّال بھی آوے جو مسلمانوں میں فتنہ ڈالے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم ص۳۶۲ ص۴۹۱)

اس عاجز نے جو مثیل موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہے جس کو کم فہم لوگ مسیح موعود خیال کر بیٹھے ہیں۔ یہ کوئی نیا دعویٰ نہیں۔۔۔ میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ میں مسیح بن مریم ہوں۔ جو شخص یہ الزام میرے پر لگاوے وہ سراسر مفتری اور کذاب ہے۔
(ازالہ اوہام حصہ اول ص۱۹۲)

اب یہ سوال بھی قابلِ حل ہے کہ مسیح ابنِ مریم تو دجّال کے لیے آئے گا۔ آپ اگر مسیح ابنِ مریم کے رنگ میں ہو کر آئے ہیں تو آپ کے مقابل پر دجّال کون ہے؟ میرا مذہب یہ ہے کہ اس زمانے کے پادریوں کی مانند کوئی اب تک دجّال پیدا ہُوا ہے نہ قیامت تک پیدا ہوگا۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم ص۳۶۲ ص۴۸۸)

خدا نے اس امّت میں مسیح موعود کو بھیجا جو اس مسیح سے اپنی تمام شان میں بہت بڑھ کر ہے اور اس نے اس دوسرے مسیح کا نام غلام احمد رکھا۔
(دافع البلاء ص۲۳۳ ص۱۳ ص۱۴)

ابنِ مریم کے ذکر کو چھوڑو اس سے بہتر غلام احمد ہے۔ (دافع البلاء ص۲۰ ص۲۴/۲۴)

اشتہار چندہ منارۃ المسیح

خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے قادیان کی مسجد جو میرے والد صاحب مرحوم نے مختصر طور پر دو بازاروں کے وسط میں ایک اونچی زمین پر بنائی تھی۔ اب شوکتِ اسلام کے لیے بہت وسیع کی گئی۔۔۔۔ میرے دعویٰ کی ابتدائی حالت میں اس مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے زیادہ سے زیادہ پندرہ یا بیس آدمی جمع ہُوا کرتے تھے لیکن اب خدا تعالیٰ کا یہ فضل ہے کہ تین یا چار سو نمازی ایک معمولی اندازہ ہے اور کبھی سات سو یا آٹھ سو تک بھی نمازیوں کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اب اس مسجد کی تکمیل کے لیے ایک اور تجویز قرار پائی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسجد کی شرقی طرف جیسا کہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منشا ہے ایک بہت اونچا منارہ بنایا جائے۔۔۔ عنہ جن،

حدیث نبوی میں جو مسیح موعود کی نسبت لکھا گیا تھا کہ وہ منارۂ بیضاء کے پاس نازل ہوگا۔ اس سے یہی غرض تھی کہ مسیح موعود کے وقت کا یہ نشان ہے۔ احادیث نبویہ میں متواتر آ چکا ہے کہ مسیح آنے والا صاحب المنارہ ہوگا۔ یعنی اس کے زمانے میں اسلامی سچائی بلندی کے انتہا تک پہنچ جائے گی جو اس منارہ کی مانند ہے، جو نہایت اونچا ہوگا۔ ایسا ہی مسیح موعود کی مسجد بھی مسجد اقصیٰ ہے۔ مسجد اقصٰے سے مُراد مسیح موعود کی مسجد ہے جو قادیان میں واقع ہے جس کی نسبت براہین احمدیہ میں خدا کا کلام یہ ہے؟ ومبارک وکل امر مبارک یجعل فیہ اور یہ مبارک کا لفظ جو بصیغہ مفعول اور فاعل واقع ہُوا قرآن شریف کی آیت بارکنا حولہٗ کے مطابق ہے۔ پس کچھ شک نہیں جو قرآن شریف میں قادیان کا ذکر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے سُبۡحَانَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ۔ اور اس معراج میں جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم مسجد الحرام سے مسجد اقصٰے تک سیر فرما ہوئے، وہ مسجد اقصٰے یہی ہے۔ جو قادیان میں بجانب مشرق واقع ہے جس کا نام خدا کے کلام نے مبارک رکھا ہے۔ یہ منارہ وہ منارہ ہے جس کی ضرورت احادیث نبویہ میں تسلیم کی گئی اور اس منارۃ المسیح کا خرچ دس ہزار روپیہ سے کم نہیں ہے۔ اب جو دوست اس منارہ کی تعمیر کے لیے مدد کریں گے، مَیں یقیناً سمجھتا ہوں کہ وہ ایک بھاری خدمت کو انجام دیں گے اور مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ ایسے موقع پر خرچ کرنا ہرگز ہرگز ان کے نقصان کا باعث نہیں ہوگا وہ خدا کو قرض دیں گے اور مع سُود واپس لیں گے۔ کاش ان کے دل سمجھیں کہ اس کام کی خدا کے نزدیک کس قدر عظمت ہے۔ جس خدا نے منارہ کا حکم دیا ہے اس نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اسلام کی مُردہ حالت میں اسی جگہ سے زندگی کی روح پھونکی جائے گی۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۵ سے صفحہ ۲۴ تک۔ ۲۸ مئی سنہ ۱۹۰۰ء)

نوٹ: قابل غور بات یہ ہے کہ مسیح صاحب پہلے نازل ہو گئے۔ منارہ کی تعمیر کا اشتہار بعد میں دیا جا رہا ہے۔ (ن-۱)

قادیان کی تعریف

جس قدر فقراء و علماء و شرفاء و نجباء قادیان میں موجود تھے سب نکل گئے تھے۔ اور مختلف بلاد و امصار میں جاکر آباد ہو گئے اور یہ جگہ ان شریر اور یزیدی الطبع لوگوں سے پُر ہو گئی جن کے خیالات میں بجز بدی اور بدکاری کے کچھ نہیں تھا اور قادیان کو جو خدا کے تعالیٰ نے دمشق کے ساتھ مشابہت دی اور یہ بھی اپنے الہام میں فرمایا کہ اخرج منہ الیزیدیون یہ تشبیہ بوجہ ان ملحدوں اور شریروں کی جو اس قصبہ میں رہتے ہیں۔۔۔ دن رات دنیا کے فریبوں میں لگے رہتے ہیں۔۔۔ جو خدا تعالیٰ کے وجود کے منکر ہیں اور کسی چیز کو حرام نہیں سمجھتے۔ میں ان کے دلوں کو دیکھتا ہوں کہ زنا سے لے کر خونِ ناحق تک اگر موقع پاویں ان کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ یہ سب کام تعریف کے لائق ہیں۔۔۔ (اور) جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزیدی الطبع اور یزید پلید کی عادات اور خیالات کے پیرو ہیں جن کے دلوں میں اللہ اور رسول کی کچھ قیمت نہیں۔ اور احکامِ الٰہی کی کچھ عظمت نہیں جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔

(ازالہ اوہام۔ حصہ اول ص۱۳۵ ص۱۶۵ ص۱۶۷ ص۱۶۸)

ایک خط کے جواب میں عذرِ حج

قولہٗ۔ باوجود مقدرت کے حج نہیں کیا (یہ میری ذات پر حملہ ہے)

اقول۔ اس اعتراض سے آپ کی شریعت دانی معلوم ہو گئی۔ گویا آپ کے نزدیک مانع حج صرف ایک ہی امر ہے کہ زادِ راہ نہ ہو۔ عجیب حالت ہے کہ ایک طرف بداندیش علماء مکہ سے فتویٰ لاتے ہیں کہ یہ شخص کافر ہے اور پھر کہتے ہیں کہ حج کے لیے جاؤ اور خود جانتے ہیں کہ جب کہ مکہ والوں نے کفر کا فتویٰ دے دیا تو اب مکہ فتنہ سے خالی نہیں اور خدا فرماتا ہے کہ جہاں فتنہ ہو اس جگہ جانے سے پرہیز کرو۔ سو میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کیسا اعتراض ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ فتنہ کے زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی حج نہیں کیا[1] اور حدیث

اور قرآن سے ثابت ہے کہ فتنے کے مقامات میں جانے سے پرہیز کرو۔ یہ کس قسم کی شرارت ہے کہ مکہ والوں میں ہمارا کفر مشہور کرنا اور پھر بار بار حج کے بارے میں اعتراض کرنا۔ نعوذ باللہ من شرورہم۔ ذرا سوچنا چاہیئے کہ ہمارے حج کی ان لوگوں کو کیوں فکر پڑ گئی۔ کیا اس میں بجز اس بات کے کوئی اور بھید بھی ہے کہ میری نسبت ان کے دل میں یہ منصوبہ ہے کہ یہ مکہ کو جائیں اور پھر چند اشرار الناس پیچھے سے مکہ پہنچ جائیں اور شور قیامت ڈال دیں کہ یہ کافر ہے اسے قتل کرنا چاہیئے۔ مواضع فتن سے اپنے تئیں بچانا سنت انبیاء علیہم السلام ہے۔ مکہ میں عنان حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو ان مکفرین کے ہم مذہب ہیں۔ جب یہ لوگ ہمیں واجب القتل ٹھیراتے ہیں تو کیا وہ لوگ ایذا سے کچھ فرق کریں گے۔ اور اللہ تعالی فرماتا ہے، ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ پس ہم گنہگار ہوں گے اگر دیدہ دانستہ تہلکہ کی طرف قدم اٹھائیں گے اور حج کو جائیں گے اور خدا کے حکم کے برخلاف قدم اٹھانا معصیت ہے حج کرنا مشروط بشرائط ہے مگر فتنہ اور تہلکہ سے بچنے کے لیے قطعی حکم ہے جس کے ساتھ کوئی شرط نہیں۔ اب خود سوچ لو کہ کیا ہم قرآن کے قطعی حکم کی پیروی کریں یا اس حکم کی جس کی شرط موجود ہے۔

میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ آپ اس سوال کا جواب دیں کہ مسیح موعود جب ظاہر ہوگا تو کیا اول اس کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کو دجال کے خطرناک فتنوں سے نجات دے یا ظاہر ہوتے ہی حج کو چلا جائے۔ اس بات کا جواب دو کہ

نوٹ (۱) یہ بالکل غلط ہے۔ حج نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ نسئی کا سال تھا اور جاہلیت کے پرانے دستور کے مطابق یہ مہینہ ذی القعدہ کا قرار پایا تھا۔ بشیر الدین محمود احمد صاحب لکھتے ہیں نسئی یہ تھی کہ کسی سال وہ محرم کو حلال کر دیتے تاکہ لوٹ مار میں آسانی ہو جائے اور صفر کو محرم بناتے تھے۔ اس طرح سب مہینوں کو بدل کر تیرہ مہینوں کا سال کر دیتے تھے۔ پھر تغیر کر کے سال کو اپنی حالت پر لاتے۔

نوٹ (۲) مرزا صاحب کی تحریر سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ صحیح مسیح موعود نہ تھے۔ اگر واقعی وہی مسیح موعود ہوتے تو حدیث کے مطابق دجالی فتنہ

مسیح موعود دنیا میں آکر پہلے کس فرض کو ادا کرے گا۔ کیا پہلے حج کرنا اس پر فرض ہوگا یا یہ کہ دجالی فتنوں کا قصہ تمام کرے گا۔ یہ مسئلہ کوئی باریک نہیں ہے صحیح بخاری یا مسلم کے دیکھنے سے اس کا جواب مل سکتا ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ گواہی ثابت ہو کہ پہلا کام مسیح موعود کا حج ہے تو پھر ہم بہرحال حج کو جائیں گے۔ ہرچہ بادا باد۔

لیکن پہلا کام مسیح موعود کا استیصال فتن دجالیہ ہے۔ تو جب تک اس کام سے ہم فراغت نہ کرلیں حج کی طرف رخ کرنا خلاف پیشگوئی نبوی ہے۔ ہمارا حج تو اس وقت ہوگا جب دجال بھی کفر اور دجل سے باز آکر طواف بیت اللہ کرے گا۔ کیونکہ بموجب حدیث نبوی کے وہی وقت مسیح موعود کے حج کا ہوگا۔ سو جب دجال کو ایمان اور حج کے خیال پیدا ہوں گے وہی دن ہمارے حج کے بھی ہوں گے۔ اب تو پہلا کام ہمارا جس پر خدا نے ہمیں لگا دیا ہے دجالی فتنہ کو ہلاک کرنا ہے۔ کیا کوئی شخص اپنے آقا کی مرضی کے برخلاف کام کر سکتا ہے۔

(ایام الصلح ص ۱۶۸/۱۵، ۱۸۹ ، ص ۱۶۹/۱۶، ۱۹۰ ، ص ۱۷/۱۷، ۱۹۱)

ختم کر کے ضرور حج ادا فرماتے۔ مگر تمام احمدی حضرات جانتے ہیں کہ ان کو یہ سعادت نصیب نہ ہوئی۔ لہٰذا ان کی اپنی ہی تحریر کے مطابق مسیح موعود ہونے کا دعوےٰ باطل ہو جاتا ہے۔ رہی وہ آیت جو عذر حج میں پیش فرمائی ہے اس کا جواب یہ آیات ہیں۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ط اور اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نفس نہیں مر سکتا (کیونکہ اللہ نے) ایک مقرر میعاد والا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ (پارہ ۴ رکوع ۶۔ تفسیر صغیر ص ۹۵۔)

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ
تم جہاں کہیں بھی ہو موت تمہیں آ پکڑے گی۔ خواہ تم مضبوط قلعوں میں (ہی کیوں نہ ہو)
(پارہ ۵۔ رکوع ۷، تفسیر صغیر ص ۱۲۱)

مرزا صاحب کا نبی ہونے سے انکار

نبوت کا دعویٰ نہیں بلکہ محدثیت کا دعویٰ کیا ہے جو خدا تعالےٰ کے حکم سے کیا گیا ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۳۲۱ صفحہ ۴۲۰)

اگر یہ اعتراض پیش کیا جائے کہ مسیح کا مثیل بھی نبی چاہیئے۔ کیونکہ مسیح نبی تھا تو اس کا اول جواب تو یہی ہے کہ آنے والے مسیح کے لیے ہمارے سیّد و مولیٰ نے نبوت شرط نہیں ٹھہرائی بلکہ صاف لکھا ہے کہ وہ ایک مسلمان ہو گا اور عام مسلمانوں کے موافق شریعت فرقانی کا پابند ہو گا۔

(توضیح المرام صفحہ ۵۹ صفحہ ۱۸ - سنہ ۱۸۹۱ء)

مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔ یعنی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کا باپ نہیں ہے مگر وہ رسول اللہ ہے اور ختم کرنے والا ہے نبیوں کا۔ یہ آیت صاف دلالت کر رہی ہے کہ بعد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی رسول دنیا میں نہیں آئے گا اب وحی رسالت تا بقیامت منقطع ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۴۳۱ صفحہ ۴۳۲ سنہ ۱۸۹۱ء)

• خدائے تعالیٰ ایسی ذلت اور رسوائی اس امت کے لیے اور ایسی ہتک اور کسرِ شان اپنے نبی مقبول خاتم الانبیاء کے لیے ہرگز روا نہیں رکھے گا کہ ایک رسول کو بھیج کر جس کے آنے کے ساتھ جبرائیل کا آنا ضروری امر ہے اسلام کا تختہ ہی اُلٹا دیوے۔ حالانکہ وہ وعدہ کر چکا ہے کہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی رسول نہیں بھیجا جائے گا۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۱۱۶ سنہ ۱۸۹۱ء)

• قرآن کریم بعد خاتم النبیین کے کسی رسول کا آنا جائز نہیں رکھتا خواہ وہ نیا رسول ہو یا پرانا ہو۔ کیونکہ رسول کو علمِ دین بتوسط جبرائیل ملتا ہے اور باب نزول جبرائیل بہ پیرایہ وحی رسالت مسدود ہے۔ اور یہ بات خود ممتنع ہے کہ دنیا میں رسول تو آوے مگر سلسلہ وحی رسالت نہ ہو۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۵۱۱ سنہ ۱۸۹۱ء)

• خدا تعالےٰ جانتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور ان سب عقائد پر ایمان رکھتا ہوں جو اہل سنت والجماعت مانتے ہیں اور میں کلمہ طیبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

کا قائل ہوں اور قبلہ کی طرف نماز پڑھتا ہوں اور مَیں نبوت کا مدعی نہیں بلکہ ایسے مدعی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔ (آسمانی فیصلہ ص ۳/۳۱۳ جنوری ۱۸۹۲ء)

• جو شخص ایک نبی متبوع علیہ السلام کا متبع ہے اور اس کے فرمودہ پر اور کتاب اللہ پر ایمان لاتا ہے اس کی آزمائش انبیاء کی طرح آزمائش کرنا ایک قسم کی ناسمجھی ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام حصہ اول ص ۳۳۹ ۱۸۹۲ء)

• میر صاحب کے دل میں سراسر فاش غلطی سے یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ گویا مَیں ایک نیچری آدمی ہوں۔ معجزات کا منکر اور لیلۃ القدر سے انکاری اور نبوت کا مدعی اور انبیاء علیہم السلام کی اہانت کرنے والا اور عقائد اسلام سے منہ پھیرنے والا۔ سو مَیں ان اوہام کے دُور کرنے کے لیے مَیں وعدہ کر چکا ہوں کہ عنقریب میری طرف سے اس بارہ میں رسالہ مستقلہ شائع ہوگا۔

(آسمانی فیصلہ ص ۳۷/۳۴۷ جنوری ۱۸۹۲ء)

• اگرچہ مَیں نے بار بار بیان کیا اور اپنی کتابوں کا مطلب سُنایا کہ کوئی کلمہ کفر ان میں نہیں ہے نہ مجھے دعویٰ نبوت و خروج از اُمّت اور نہ مَیں منکر معجزات اور ملائک اور نہ لیلۃ القدر سے انکاری ہوں اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خاتم النبیین ہونے کا قائل اور یقین کامل سے جانتا ہوں اور اس بات پر محکم ایمان رکھتا ہوں کہ ہمارے نبی صلعم خاتم الانبیاء ہیں اور آنجناب کے بعد اس اُمّت کے لیے کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔ (نشانِ آسمانی ص ۲۱/۳۹۱ جون ۱۸۹۲ء)

• مَیں ایک مسلمان آدمی ہوں جو قرآن شریف کی پیروی کرتا ہوں اور قرآن شریف کی تعلیم کی رُو سے اس موجودہ نجات کا مدعی ہوں۔ میرا نبوت کا کوئی دعویٰ نہیں یہ آپ کی غلطی ہے۔ آپ کس خیال سے کہہ رہے ہیں کیا یہ ضروری ہے کہ جو الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ نبی بھی ہو جائے۔ مَیں تو محمدی اور کامل طور پر اللہ اور رسول کا متبع ہوں اور ان نشانوں کا نام معجزہ رکھنا نہیں چاہتا بلکہ ہمارے مذہب کی رُو ان نشانوں کا نام کرامات ہے۔ جو اللہ اور رسول کی پیروی سے دیئے جاتے ہیں۔
(جنگ مقدس ص ۱۵۶/۱۴۴ ۲۶ مئی ۱۸۹۳ء)

• خدا تعالیٰ نے میرا نام مسیح موعود رکھا ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اس راز پر غور کرو۔ اور جلدی نہ کرو۔ یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو بھیجے۔ بعد اس کے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بنایا ہے۔ ہرگز ہرگز نہیں ہوگا کہ سلسلہ نبوت کو ختم کرنے کے بعد دوبارہ جاری کیا جائے۔

(ترجمہ) (آئینہ کمالات اسلام حصہ دوم ص۳۷۹ منہ ۳۸۰ فروری ۱۸۹۳ء)

• مَیں نبی نہیں ہوں لیکن محدّث اللہ و کلیم اللہ ہوں۔ اس لیے کہ دینِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجدید کروں۔ (ترجمہ) آئینہ کمالات اسلام حصہ دوم ص۳۸۷ فروری ۱۸۹۳ء)

• ہمارے سید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور بعد آنحضرت صلعم نبی نہیں آسکتا۔ اس لیے کہ اس شریعت میں نبی کے قائم مقام محدّث رکھے گئے ہیں۔ (شہادت القرآن ص$\frac{۳۳}{۲۷}$ ص$\frac{۳۴}{۲۸}$ جون ۱۸۹۳ء)

• میرے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ مَیں نبوت کا دعویٰ کروں اور اسلام سے نکل جاؤں اور نافرمان قوم کے ساتھ مل جاؤں ... یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ بھی قرآن کے خلاف ہے وہ جھوٹ اور بے دینی اور کفر ہے۔ پس مَیں کس طرح نبوت کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔ حالانکہ مَیں مسلمان ہوں۔

(اردو ترجمہ۔ حمامۃ البشریٰ ص$\frac{۲۹۷}{۱۳۱}$ ص۸۰ فروری ۱۸۹۴ء)

• قرآن کا مدِ نظر انسان کی تمام استعدادیں تھیں اور ہر ایک استعداد کی اصلاح منظور تھی اور اسی وجہ سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ٹھہرے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر وہ تمام کام پورا ہو گیا جو پہلے اس سے کسی نبی کے ہاتھ پر پورا نہیں ہوا تھا۔ (ست بچن ص$\frac{۲۷۳}{۱۴۹}$ نومبر ۱۸۹۵ء)

• اگر کوئی کہے کہ فساد اور بدعقیدگی اور بداعمالیوں میں یہ زمانہ بھی تو کم نہیں پھر اس میں کوئی نبی کیوں نہیں آیا تو جواب یہ ہے کہ وہ زمانہ توحید اور راست روی سے بالکل خالی ہو گیا تھا اور اس زمانہ میں چالیس کروڑ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہنے والے موجود ہیں اور اس زمانہ کو بھی خدا تعالیٰ نے مجدد کے بھیجنے سے محروم نہیں رکھا۔

(نور القرآن ص۳۳۹ ۱۸۹۵ء)

• کیا ایسا شخص جو قرآن شریف پر ایمان رکھتا ہے اور آیت وَلٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ۔ کو خدا کا کلام یقین رکھتا ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول اور نبی ہوں۔

(انجام آتھم ص۲۷ ۱۸۹۶ء، ۲۲ جنوری ۱۸۹۷ء)

• جھوٹے الزام مجھ پر مت لگاؤ کہ حقیقی طور پر نبوت کا دعویٰ کیا۔۔ حقیقی نبوت کے دروازے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بکلی بند ہیں۔

(سراج منیر ص۵ مئی ۱۸۹۷ء)

• ہمارے مخالف جب کہ اس بحث سے عاجز آجاتے ہیں تو افتراء کے طور پر ہم پر تہمت لگاتے ہیں کہ گویا ہم نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور ہم معجزات اور فرشتوں کے منکر ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ یہ تمام افتراء ہیں۔

(کتاب البریہ ص۲۱۵/۱۹۷ ۲۴ جنوری ۱۸۹۸ء)

• قولہٗ۔ مسیح نبی ہو کر نہیں آئے گا اُمتی ہو کر آئے گا مگر نبوت اس کی شان میں مضمر ہوگی۔

• اقول۔ جب کہ شان نبوت اس کے ساتھ ہوگی اور خدا کے علم میں وہ نبی ہوگا تو بلاشبہ اس کا آنا ختم نبوت کے منافی ہوگا کیوں کہ در حقیقت وہ نبی ہے اور قرآن کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کا آنا ممنوع ہے۔

• اگر کوئی اور نبی نیا یا پرانا آوے تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیوں کر خاتم الانبیاءؑ رہیں۔ ہاں وحی ولایت اور مکالمات الٰہیہ کا دروازہ بند نہیں ہے۔

(ایام الصلح ص۳۰۹/۸۴ ص۴۵ جنوری ۱۸۹۹ء)

• میں ولایت کے سلسلہ کو ختم کرنے والا ہوں۔ جیسا کہ ہمارے سید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے سلسلہ کو ختم کرنے والے تھے۔ اور وہ خاتم الانبیاءؑ ہیں اور میں خاتم الاولیاء ہوں۔ (خطبۂ الہامیہ ص۶۹ ص۷۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۰۰ء)

نوٹ: ۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۰ء تک کی ۱۵ کتابوں کے ۲۲۔ اقتباسات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مرزا صاحب نبوت کے مدعی نہیں تھے۔ وہ بھی جملہ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق مدعی نبوت کو خارج از اسلام، کافر اور ملعون سمجھتے تھے۔

ٹینٹ اور ترپال
بنانے کا ممتاز ادارہ
ایچ نظام دین اینڈ سنز
مرکزی دفتر
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

عورت اور اسلامی معاشرہ

قسط ۳

احمد افضال

(۳) **خاندانی نظام میں مرد کی قوامیت** اسلام میں عورت کے مقام کو سمجھنے کیلئے تیسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ عائلی اور خاندانی نظام کو برقرار رکھنے کے لئے مرد کو عورت پر قوّام بنایا گیا: ارشادِ ربّانی ہے:۔

"مرد عورتوں پر قوّام ہیں، اس فضیلت کی بنا پر جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر عطا کی ہے اور اس بنا پر کہ وہ ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو عورتیں صالح ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کی غیر موجودگی میں اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی نگرانی کرتی ہیں:۔ (نسآء - ۳۴)

اس آیت میں خاندان اور گھر کے نظام اور مرد کے مقابلے میں عورت کی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔

(۱) مرد عورتوں پر قوّام ہیں

(۲) کیوں قوّام ہیں ——— اور

(۳) ان کی قوّامیت عورت سے کس شے کی مقتضی ہے

قوّام یا قیّم عربی زبان میں ایسے شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے کے انتظام کو ٹھیک ٹھیک چلانے اور اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات کا بندوبست کرنے کا ذمہ دار ہو۔ مراد یہ ہے کہ خاندان کے نظام کی خاطر مرد کو گھر کا سربراہ اور محافظ و نگران مقرر کیا گیا ہے۔ جس طرح ایک ملک کے دو صدر نہیں ہو سکتے اسی طرح ایک خاندان کے دو نگران یا دو سربراہ نہیں ہو سکتے۔ گھر کا سربراہ مرد کو کیوں بنایا گیا، عورت کو کیوں نہ بنا دیا گیا؟ سورۂ نسآء کی اس آیت میں اس حکم کی دو وجوہات بیان کی گئی ہیں۔

اوّل: وہ فطری تفوّق اور فضیلت جو صنفِ قوی کو صنفِ ضعیف پر حاصل ہے۔ مرد کو فطرت نے بعض ایسی خصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو عورت کو نہیں دیں یا اس سے کم دی ہیں۔ مرد میں فعل اور تاثیر کا مادہ رکھا گیا ہے اور عورت میں انفعال اور تاثر کا۔ خاندانی نظام کے بقا اور استحکام کے لئے ضروری ہے کہ ایک فرد فاعل ہو اور دوسرا منفعل۔ اگر دونوں میں ایک جیسی سختی ہو اور کسی کو کسی پر غلبہ حاصل نہ ہو تو سرے سے فعل ہی نہ ہو سکے۔ پس نسلِ انسانی کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ مرد یا عورت میں سے ایک کو دوسرے پر غلبہ حاصل ہو اور دوسرا پہلے کے مقابلے میں لطیف اور ضعیف ہو۔ عورت پر چونکہ بچے کی پیدائش اور تربیت کی بھاری ذمہ داری رکھی گئی ہے لہٰذا غلبہ اور قوامیت مرد کو دیا گیا اور یہ عین فطرت کا تقاضا تھا۔

دوم: مرد کی قوامیت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کا کفیل ہے۔ یہ کفالت دو طرح کی ہے

(۱) مہر (۲) نفقہ

مہر: مرد کا فرض ہے کہ وہ عورت کو مہر ادا کرے کیونکہ اس کو بیوی پر جو حقوقِ زوجیت حاصل ہوتے ہیں وہ مہر کا معاوضہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے

"اور عورتوں کے مہر خوشدلی سے ادا کرو" (نسآء - ۴)

نکاح کے وقت عورت اور مرد کے مابین مہر کا جو معاہدہ طے ہوا ہے، اسے پورا کرنا مرد کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ مہر ادا کرنے سے انکار کر دے تو بیوی کو حق ہے کہ اپنے نفس کو اس سے روک لے۔ یہ ایسا فرض ہے جس سے سبکدوش ہونے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ عورت شوہر کی ناداری کا لحاظ کر کے معاف کر دے یا احسان کر کے اپنے حق سے برضا و رغبت[1] دست بردار ہو جائے یا کچھ عرصہ کی مہلت دے۔ مہلت دینے کا جو مسئلہ ہے اسے مہر مؤجل کہتے ہیں۔ یعنی جس میں واضح طور پہ مدت کا تعین ہو کہ اتنی مدت میں مرد اسے ادا کرے گا جس مہر کی قرارداد میں مدت کا تعین نہ ہو وہ عند الطلب

---

[1] اس سلسلے میں رضا و رغبت شرط ہے۔ اگر بیوی کسی دباؤ کی وجہ سے مہر معاف کرے اور بعد میں اس کا مطالبہ کرے تو حضرت عمرؓ اور قاضی شریحؒ کے فیصلے کے مطابق شوہر کو مہر ادا کرنا ہوگا۔ کیونکہ اس کا مطالبہ بظاہر کرتا ہے کہ اس نے خوشدلی سے مہر معاف نہیں کیا تھا۔

سمجھا جائے گا۔ شریعت نے مہر کی کوئی مخصوص مقدار مقرر نہیں کی۔ اس کا تعین تمدنی حالات اور مرد کی معاشی کیفیت کا لحاظ کرتے ہوئے کیا جانا چاہیئے۔

نفقہ: مرد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ بیوی بچوں کے لئے کھانے، کپڑے اور رہنے سہنے کا انتظام کرے اور زندگی کی دوسری ضروریات فراہم کرے۔ اگر وہ اس کام میں سستی اور کوتاہی کا مظاہرہ کرے گا تو حکومت اسے ادائے فرض پر مجبور کرے گی۔ بیوی اگر دولتمند ہو تب بھی شوہر نفقہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ مرد۔ عورت پر فطری فضیلت اور انفاقِ مال کی وجہ سے قوام ہے۔ اس کی قوامیت بیوی سے دو باتوں کا تقاضا کرتی ہے:

(۱) اطاعت شعاری (۲) حفاظت للغیب

اطاعت: خاندان کے نظم کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ بیوی سربراہِ خاندان کی اطاعت کرے اور بچے اپنے والدین کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمہاری اطاعت کرے۔"

یہ اطاعت مشروط ہے۔ یعنی شوہر کسی ایسے کام کا حکم دے جس میں اللہ کی نافرمانی ہو یا خدا کے عائد کردہ کسی فرض سے رکنے کا حکم دے تو اس کی اطاعت سے انکار کر دینا بیوی کا فرض ہے۔ اس صورت میں اگر وہ شوہر کی اطاعت کرے گی تو دراصل خدا کی نافرمانی کرے گی۔

البتہ نفلی عبادات کے سلسلے میں اگر شوہر منع کرے تو اس کی بات ماننا چاہیئے۔

حفاظت للغیب: اس سے مراد یہ ہے کہ شوہر کی غیر حاضری میں بیوی اس کے مال حقوق، آبرو اور رازوں کی حفاظت کرے۔ حضورؐ نے فرمایا:

"بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو تو تمہارا دل خوش ہو جائے، جب تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمہاری اطاعت کرے اور جب تم گھر میں نہ ہو تو تمہارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔"

حجتہ الوداع کے خطبے میں آپؐ نے فرمایا:

"بیویوں پر تمہارا حق یہ ہے کہ تمہارے فرش کو ایسے لوگوں سے نہ روندوائیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھروں میں ایسے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ دیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو۔" (ترمذی)

اگر بیوی میں بداخلاقی کی مشتبہ علامتیں پائی جائیں اور وہ سرکشی کی طرف مائل ہو تو شوہر کو سختی کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

"اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو، انہیں سمجھاؤ (نہ مانیں تو) خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو (تب بھی باز نہ آئیں تو) مارو پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لئے بہانے نہ تلاش کرو۔" (نساء: ۳۴)

اس سلسلے میں دو باتیں سمجھ لینی چاہئیں:

(۱) جہاں ہلکی تدبیر سے اصلاح ہو سکتی ہو وہاں سخت تدبیر سے کام نہ لینا چاہئے۔

(۲) بیوی کو مارنے کی اجازت محض احتیاطی اور اصلاحی تدبیر ہے۔ اسے عمومی طور پر پسندیدہ نہیں سمجھا گیا ہے کسی شوہر کو حق نہیں کہ وہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بیوی کو زدوکوب کرتا رہے۔ حکم ہے کہ بلاضرورت نہ پیٹو۔ چہرے پر نہ مارو اور نہ اس طرح مارو کہ زخم پیدا ہو جائیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بیوی یا خادم کو کبھی نہیں مارا اور نہ کسی اور شخص پر کبھی اپنا ہاتھ اٹھایا۔ اں اللہ کی راہ میں یا حرمات الٰہی کی بے حرمتی کی وجہ سے اللہ کی خاطر کسی کو سزا دی ہو تو یہ اور بات ہے۔"[۱]

عورت کی اہم حیثیتیں

اسلام میں عورت کے مقام کے سلسلے میں تین اساسی اصول سمجھ لینے کے بعد آیئے عورت کی معاشرے میں اہم حیثیتوں کو بھی پہچان لیں۔ مغربی معاشرے میں عورت کی صرف ایک حیثیت مقبول ہے اور وہ ہے محبوبہ ـــــ اسلام میں بس یہی حیثیت نہیں ہے۔ قرآن و سنت کی تعلیمات میں عورت کے جو اہم روپ سامنے آتے ہیں وہ نہایت مقدس رشتوں سے عبارت ہیں۔ عورت یا تو ماں ہے، یا بہن ہے ورنہ بیوی ہے یا بیٹی ہے۔ ان قابلِ احترام رشتوں کے لئے عزت کا جو بلند مقام اسلام نے عطا کیا ہے اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب، فلسفے یا نظامِ حیات

میں نہیں ملتی۔

ماں اسلام نے والدین کی خدمت واطاعت پر زور دیا ہے لیکن ماں کا حق زیادہ بتایا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں آیا ہے:

" درحقیقت ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو برس دودھ چھوٹنے میں لگے۔" (لقمان - ۱۴)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ

"ایک شخص نے پوچھا" اے اللہ کے رسولؐ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟" آپؐ نے فرمایا "تیری ماں" پوچھا "اس کے بعد کون؟" فرمایا "تیری ماں" پوچھا "پھر کون؟" فرمایا "تیری ماں" پھر پوچھا "اس کے بعد کون؟" جواب ملا "تیرا باپ۔"

اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کے حقوق کو باپ کے مقابلے میں تین گنا زیادہ بتایا ہے۔ فقہانے کہا ہے کہ اگر والدین کو کچھ دینا ہو تو پہلے ماں کو دے اور باپ سے چار گنا زیادہ دے۔ اگر دونوں ایک ساتھ پانی مانگیں تو پہلے ماں کو پلائے۔ مزید یہ کہ جب والدین میں سے دونوں کی رعایت بیک وقت مشکل ہو تو والد کا حق مقدم رکھے۔ مگر خدمت میں ماں کو اوّلیت دے[1]

ماں کی عظمت اور حقوق کی فوقیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر وہ مشرک اور کافر ہو تب بھی حسنِ سلوک کی مستحق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" خدا نے تم پر ماؤں کی حق تلفی اور نافرمانی حرام کی ہے۔"[2]

آپؐ کا ارشاد ہے کہ:

" جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔"

بیوی ہم دیکھتے ہیں کہ فطری قانون کے مطابق ضعیف کو قوی کے مقابلے میں زیادہ رعایت

---

[1] فتاویٰ عالمگیری

[2] بخاری و مسلم

دی جاتی ہے۔ مثلاً درخت اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا انہیں کھڑے کھڑے خوراک
مل جاتی ہے۔ جانور چل پھر سکتے ہیں اس لئے انہیں اپنی غذا خود جا کر تلاش کرنا پڑتی ہے۔
انسان نباتات اور حیوانات دونوں سے افضل اور برتر ہے۔ لہٰذا اسے کم رعایت ملی ہے۔
انسان کو محنت کر کے پیسہ کمانا پڑتا ہے اور کھانا بھی پکائے بغیر نہیں کھا سکتا۔ اسلام دینِ فطرت
ہے اس لئے اس نے اپنے ہر حکم میں فطری قانون کو ملحوظ رکھا ہے۔ مرد کو اگر عورت پر فضیلت
دی ہے تو عورت کو مرد کے مقابلے میں زیادہ رعایتیں بھی عطا کی ہیں۔ مردوں کو حکم ہے کہ
وہ اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں بلکہ بیوی کے ساتھ نیک سلوک کریں۔ قرآن
کہتا ہے:

"اور عورت کے ساتھ نیک سلوک کی زندگی گزارو۔ پھر اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں
تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو، مگر اللہ نے اس میں (تمہارے لئے) بہت
کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔" (نسائ - ۱۹)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کوئی مومن شوہر اپنی مومن بیوی سے نفرت نہ کرے، اگر اس کی ایک عادت پسند
نہیں آتی تو دوسری عادتیں پسند آئیں گی۔"[۱]

آپؐ کا ارشاد ہے:

"تم میں سے بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے بھلے ہوں"

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"دنیا کی نعمتوں میں سے کوئی چیز نیک بیوی سے بڑھ کر نہیں ہے۔"[۲]

آپؐ نے مردوں کو تنبیہہ فرمائی ہے کہ

"خوب یاد رکھو بیویوں کا تم پر یہ حق ہے کہ تم ان کے لباس اور خوراک کے لئے حسنِ
انتظام کرو۔"[۳]

نیز آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ:

"بیوی کا حق یہ ہے کہ جب تو کھائے تو اسے کھلائے اور جب تو پہنے تو اسے پہنائے

---

[۱] مسلم [۲] ابن ماجہ [۳] ابن ماجہ

اور اس کے چہرے پر نہ مارے اور اس کے لئے بد دعا کے الفاظ نہ کہے اور اگر اس سے ترکِ تعلق کرے تو صرف گھر میں کرے[1]"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"عورتوں کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے" (بقرہ - ۲۲۸)

مرد کو ایک درجہ زیادہ اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی نگرانی و نگہبانی کا فرض انجام دے سکے اور گھر کا انتظام اچھی طرح چل سکے۔ لیکن مرد کے معمولی سے تفوق کا ان حقوق پر اثر نہیں پڑتا جو اسلام نے عورت کو بحیثیت بیوی دیئے ہیں۔ مثلاً خلع کا حق جس طرح مرد کو طلاق کا حق حاصل ہے، اسی طرح عورت کو بھی اختیار ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہے اور کسی طرح اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تو اس سے خلع حاصل کرلے۔ قرآن مجید میں ہے:

"تمہارے لئے حلال نہیں کہ جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس لو، اِلّا یہ کہ میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ وہ حدود اللہ پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ ایسی صورت میں کوئی مضائقہ نہیں اگر عورت کچھ معاوضہ دے کر عقدِ نکاح سے آزاد ہو جائے" (بقرہ - ۲۲۹)

یعنی اگر زن و شوہر میں موافقت نہیں ہو پا رہی، یا شوہر کسی وجہ سے بیوی کے لئے ناقابلِ برداشت ہے تو بیوی کچھ معاوضہ دے کر طلاق لے سکتی ہے۔ اگر شوہر طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو بیوی کو یہ حق ہے کہ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے اور قاضی صورتحال کا جائزہ لے کر تفریق کرادے۔ اگر شوہر پاگل پن یا کسی اور مرض کی وجہ سے بیوی کے لئے تکلیف دہ ہو تب بھی عدالت کو تفریق کرا دینے کا اختیار ہے۔

اسلام نے اس کو پسند نہیں کیا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کے داعیاتِ نفس کو پورا کرنے سے کسی جائز عذر کے بغیر محض اسے تکلیف پہنچانے کے لئے پہلو تہی کرے۔ اسے اصطلاح میں ایلاء کہتے ہیں اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت چار ماہ ہے۔ اس عرصے کے اندر مرد پر لازم ہے کہ اپنی بیوی سے تعلقِ زن و شو قائم کرے۔ ورنہ مدت

---

[1] ابوداؤد

گزرنے کے بعد اسے مجبور کیا جائے گا کہ عورت کو چھوڑ دے[1]۔ اس قانون کا مقصد یہ ہے کہ شوہر اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر بیوی پر ظلم نہ کر سکے۔

اسلام نے اس سے بھی منع کیا ہے کہ بیوی پسند نہ ہو مگر ستانے کی نیت سے بار بار طلاق دے کر رجوع کیا جائے جیسا کہ اسلام سے پہلے عرب میں رواج تھا۔ قرآن کی رُو سے جو شخص اپنی منکوحہ کو دو مرتبہ طلاق دے کر رجوع کر چکا ہو، وہ اپنی عمر میں جب کبھی اُسے تیسری بار طلاق دے گا، عورت اس سے مستقل طور پر جدا ہو جائے گی۔ ارشادِ ربانی ہے:

"اور جب تم عورتوں کو (دو مرتبہ) طلاق دید و اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے تو یا تو بھلے طریقے سے انہیں روک لو

یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ محض ستانے اور زیادتی کرنے کے لئے نہ روک رکھو۔ جو ایسا کرے گا وہ اپنے اوپر خود ظلم کرے گا۔ (البقرہ : ۲۳۱)

ضرر و تعدی کی دوسری شکلیں مثلاً مار پیٹ، گالم گلوچ اور روحانی اور جسمانی اذیتیں پہنچانا سب حرام ہیں۔ ایسی صورت میں بیوی اس کی مستحق ہے کہ قانون کی مدد لے کر اس مرد سے چھٹکارا پالے۔

بیٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں بیٹی کی پیدائش پر غم کے بادل چھا جاتے تھے، اکثر اوقات اسے زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اور جب قیامت میں زندہ گاڑی جانے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی؟ (التکویر۔ ۸،۹)

اسلام نے بیٹی کو بہت عزت بخشی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں تو وہ قیامت کے روز میرے ساتھ اس طرح آئے گا۔ یہ فرما کر آپؐ نے اپنی انگلیوں کو جوڑ کر بتایا"[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"جس کے ہاں لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ دفن نہ کرے، نہ ذلیل کر کے رکھے، نہ بیٹے کو اس

---

[1] سورۃ البقرہ ۲۲۶
[2] مسلم

پر ترجیح دے اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باپ کو بتایا کہ بیٹی کا وجود تمہارے لئے شرم کا باعث نہیں بلکہ اس کی پرورش اور حق رسانی تمہیں دوزخ سے بچانے کا سبب بن جائے گی۔ آپ کا فرمان ہے:

"جس کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوں اور وہ ان کی اچھی طرح پرورش کرے تو یہی لڑکیاں اس کے لئے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔"[2]

نیز آپ نے فرمایا:

"جب کسی کے گھر لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس کے ہاں اللہ تعالیٰ فرشتے بھیجتا ہے جو آکر کہتے ہیں، گھر والو! تم پر سلامتی ہو۔ پھر فرشتے بچی کو اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں، اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں "یہ کمزور جان ہے، جو ایک کمزور جان سے پیدا ہوئی ہے جو اس کی پرورش اور تربیت کرے گا، روزِ حشر اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شاملِ حال ہوگی۔"[3]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیٹیاں تھیں جبکہ بیٹے نوعمری ہی میں وفات پا گئے تھے۔ آپ کی بیٹیوں سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سفر پہ جاتے تو بیٹی سے مل کر جاتے۔ واپسی پر ان کے گھر بطورِ خاص تشریف لے جاتے۔ وہ ملنے آتیں تو پیار سے کھڑے ہو جاتے اور ان کی پیشانی چومتے۔

---

[1] ابوداؤد [2] مسلم [3] طبرانی

نوٹ

"امیرِ تنظیمِ اسلامی کے شب و روز" کا جو مستقل عنوان ہم نے شروع کیا ہے، اس بار امیرِ تنظیم کے بھارت تشریف لے جانے کے باعث ہمارے پاس اس کی تفصیلات نامکمل رہیں۔ چنانچہ اس ماہ وہ شائع نہیں کیا جا رہا۔ آئندہ ماہ ان شاء اللہ دو ماہ کی مصروفیات کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔

THE ORIGINA

افکار و آراء

مسئلہ بیعت

عاکف بھائی! اسلام مسنون

لاہور میں آپ سے ملاقات پر عاجز نے عرض کیا تھا کہ ایک مقالہ "بیعت" کے عنوان و موضوع پر تیار ہے۔ جو وہاں (یعنی لاہور میں) مکمل میرے پاس نہیں تھا۔ گھر آکر دیکھا تو اسے کئی اعتبارات سے نامکمل پایا۔ چنانچہ از سرِ نو اسے مرتب کیا اور کچھ عنوانات کا اضافہ بھی کیا۔۔۔۔

دو ماہ تک یہ مضمون طاقِ نسیاں کی زینت بنا رہا کہ اچانک ایک بار پھر اس مضمون کی یاد آئی۔ جب "میثاق" کے ایک شمارے میں مولانا سید مودودی مرحوم کا ایک مکتوب بیعت کے متعلق سامنے آیا۔ جس کے لیے ایک ادارتی نوٹ بھی لکھا گیا تھا جس میں مجھے مرحوم پر طنز کا سا انداز نظر آیا۔ جس سوالیہ نشان پر یہ انداز اختیار کیا گیا تھا اس کا جواب بھی اس مضمون میں موجود ہے۔ یہ معاملہ اس بات کی تمہید بنا کہ مجھے یہ جرأت ہوئی کہ اس مضمون کو اس کی تمام تر کمزوریوں کے ساتھ ارسال کر دوں۔۔۔۔

طالب خیر و دعا آپ کا بھائی

قاضی ظفر الحق

(واہ کینٹ)

حقیقت بیعت ان اللّٰہ اشتریٰ من المؤمنین انفسہم واموالہم بان لھم الجنۃ ط یقاتلون فی سبیل اللّٰہ فیقتلون ویقتلون قف وعدًا علیہ حقًا فی التوراۃ والانجیل والقرآن ط ومن اوفی بعھدہٖ من اللّٰہ فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم بہٖ ط وذالک ھو الفوز العظیم ۝

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ انہیں جنت ملے۔ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے

ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔ اس (طرزِ عمل) پر سچا وعدہ کیا گیا ہے، توراۃ میں بھی، انجیل میں بھی اور قرآن میں بھی۔ اور (یہ مسلّم ہے کہ) اللہ سے زیادہ اپنا عہد کون پورا کرنے والا ہے، تو تم لوگ اپنی اس بیع پر جس کا تم نے (اللہ تعالیٰ سے) معاملہ ٹھہرایا ہے خوشی مناؤ، اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ (بیان القرآن از حضرت تھانویؒ)

یہ آیت اس حقیقت کی طرف دلالت کرتی ہے کہ خرید و فروخت کا یہ معاملہ حق تعالیٰ اور مومنین کے درمیان طے ہوا ہے جس میں مشتری یعنی خریدار اللہ تعالیٰ ہیں اور بائع یعنی فروخت کنندہ مومنین ہیں اور معاملہ یہ ہے کہ مومنین کرامؓ غلبہ دین حق کے لیے اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد و قتال فی سبیل اللہ کریں گے۔ جس میں یا تو کفار کو قتل کر کے دین حق کو غالب کر دیں گے یا پھر اس کوشش میں ان کے ہاتھوں جام شہادت نوش کریں گے۔ اس کے صلے میں اللہ جل شانہٗ انھیں جنت عطا فرمائیں گے۔ جو بالیقین بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس صلے کا پکا وعدہ اللہ جل جلالہٗ نے تورات، انجیل اور قرآن میں فرمایا ہے تو جو شخص یہ تجارت کرے جان لے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ عہد نبھانے والا کوئی نہیں۔

بیعت کے دو حصے یا دو بیعتیں

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ الصف

ترجمہ: اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی سوداگری نہ بتلاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے بچالے (وہ یہ ہے کہ) تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو یہ تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے۔ اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو۔

(بیان القرآن از حضرت تھانوی)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی راہنمائی ایک ایسی تجارت کی طرف فرمائی ہے جس کے کرنے سے ہی مسلمان دردناک عذاب سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس تجارت کے سبب سے ان کے گناہوں کی مغفرت کر دی جائے گی۔ انہیں ایسی جنت میں داخل کر دیا جائے گا جس میں نہریں بہتی ہوں گی، اس میں انہیں رہنے کے لیے پاکیزہ ٹھکانے مہیا کیے جائیں گے جو ظاہر ہے کہ بہت عظیم کامیابی ہے اور اس کے کرنے سے دنیا میں انہیں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور کفار کے خلاف فتح مبین سے جلد ہی نواز دیا جائے گا۔ ان آیات میں بیان کردہ تجارت دو اجزا پر مشتمل ہے یعنی ایمان باللہ و بالرسول اور جہاد فی سبیل اللہ۔ ہم یہاں ان اجزاء کی مختصر تشریح کرتے ہیں۔

ایمان کا مادہ ہے اَمن جس کے معنی سکون اور عدم انتشار یا عدم خلفشار کے ہیں اصطلاح میں اس سے مراد دل میں یقین کی ایسی کیفیت کا پیدا ہو جانا ہے جس سے اللہ، رسالت اور آخرت کے بارے میں پیدا

شائبہ تک کا سایہ بھی دل پر نہ پڑے۔ یقین کے تین درجات ہیں۔ جو علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین ہیں۔ حق الیقین کو قرآن اطمینان قلب سے بھی تعبیر کرتا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیم اور طیور کے قصے میں مذکور ہوا ہے اور حدیث اسے احسان کا نام دیتی ہے یعنی ایمان کی بلند ترین چوٹی جیسا کہ حدیث جبرائیل میں وارد ہوا ہے کہ ان تعبداللہ کانک تراہٗ فان لم تکن تراہٗ فانہٗ یراک۔ یقین کے یہ درجات معرفتِ الٰہیہ میں مسلسل ترقی ہونے اور حدیث و اسوۂ نبوی کا حکیمانہ علم حاصل کرنے سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس غرض کے حصول کے لیے کسی طریقۂ نبوی کے عالم اور اس پر عامل شخص کے ہاتھ پر بیعت ارشاد کی جاتی ہے تاکہ شریعت محمدی کے تمام کلیات و جزئیات کی حقانیت مبرہن ہو کر دل میں جاگزیں ہو جائے۔ اور اتباع نبوی کا کامل التزام ہو سکے جس کے سبب سے ذات باری تعالیٰ کی محبت دل میں راسخ ہوتی ہے اور نتیجۃً حق تعالیٰ کی محبت اس بندے کی طرف التفات کرتی ہے۔ جس کے بغیر ترقیٔ ایمان ناممکن ہے۔ نقل

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

بیعت ارشاد کا اصل مقصد یہی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ علمی طور پر نورِ حق کا احقاق اور ظلمتِ باطل کا ابطال کیا جا سکتا ہے۔ یہ بیعت عین مطابق قرآن و سنت ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ اس تجارت کا دوسرا اور لازمی جزو ہے اس کے بغیر یہ تجارت مکمل نہیں ہوتی جہاد فی سبیل اللہ کی غرض و غایت غلبۂ دینِ حق علی الدین کلہ اور اتمامِ نورِ حق ہے جب تک یہ مقصد باقی ہے تمام امت مسلمہ پر جہاد فرض ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بیعت جہاد کی جاتی ہے اور یہ بھی عین مطابق قرآن و سنت ہے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عذاب الیم سے چھٹکارا اور دیگر انعامات بیک وقت یہ دونوں کام کرنے پر ملیں گے اگر مسلمان ادھوری تجارت کریں گے تو امید بھی ویسے ہی ملنے کی کرنی چاہیئے۔

بیعتِ جہاد کا ایک نمونہ

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم فمن نکث فانما ینکث علی نفسہٖ ومن اوفی بما عٰھد علیہُ اللہ فسیؤتیہ اجراً عظیماً ○ (الفتح)

ترجمہ: "جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں تو وہ واقع میں اللہ سے بیعت کر رہے ہیں خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے پھر بعد بیعت کے جو شخص عہد توڑے گا سو اس کے بیعت توڑنے کا وبال اسی پر پڑے گا۔ اور جو شخص اس بات کو پورا کرے گا جس پر بیعت میں خدا سے عہد کیا ہے تو عنقریب خدا تعالیٰ اس کو بڑا اجر عطا فرمائیں گے"

(بیان القرآن)

یہ آیتِ مبارکہ صلح حدیبیہ کے موقع پر اس وقت نازل ہوئی جب آنحضرت علیہ الصلاۃ و السلام نے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لیے صحابہ کرام سے جاں فروشی کی بیعت لی اس بیعت پر حق

تعالیٰ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا۔ لقد رضی اللّٰہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ۔ اسی لیے یہ بیعت بیعتِ رضوان کہلاتی ہے۔ اس آیت مبارکہ سے چند امور کی وضاحت ہوتی ہے۔ اوّلاً یہ کہ بیعت درحقیقت اللّٰہ تعالیٰ سے ہے ثانیاً یہ کہ بیعت لینے کا طریقہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کرانا یا لینا ہے۔ ثالثاً یہ کہ بیعت کر کے بلا قوی وجہ صحیح کے توڑنی نہیں چاہیئے اس سے گناہ ہوتا ہے۔ رابعاً یہ کہ جس امر پر بیعت کی جائے۔ اسے نبھانے پر حق تعالیٰ کی طرف سے اجرِ عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔

بیعتِ ارشاد کا ایک نمونہ

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَکَ عَلٰی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُھْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَہٗ بَیْنَ اَیْدِیْھِنَّ وَاَرْجُلِھِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَکَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْھُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَھُنَّ اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۲ (الممتحنہ)

ترجمہ: اے نبی جب آویں تیرے پاس مسلمان عورتیں، اقرار کرنے کو اس پر کہ شریک نہ ٹھہراویں، اللّٰہ کا کسی کو اور بدکاری نہ کریں اور اپنی اولاد نہ ماریں اور طوفان نہ لاویں، باندھ کر اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں اور تیری بے حکمی نہ کریں۔ کسی بھلے کام میں تو ان سے اقرار کرا اور معافی مانگ ان کے واسطے اللّٰہ سے۔ بے شک اللّٰہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (موضح قرآن از شاہ عبد القادرؒ)

اس آیت میں آنحضور نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم سے عورتوں کی بیعت کا تذکرہ ہے اس لیے چند امور کی وضاحت ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ بیعت ارشاد لیتے وقت کبائر اور شرک سے اجتناب کا اقرار کرانا چاہیئے دوم یہ کہ فی المعروف میں اطاعت کا اقرار لینا چاہیئے اس سے معلوم ہوا کہ جب فی المعروف کی قید رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت کے وقت بھی اللّٰہ تعالیٰ نے لگا دی تو پھر اور کون ایسا ذی وقار اور صاحب امر واطاعت ہے جس کی اطاعت غیر معروف میں جائز ہو حدیث لاطاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃ الخالق۔ اس ہی کی تشریح بیان کرتی ہے۔ اس آیت سے اس امر کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ عورتوں کے لیے صرف بیعتِ ارشاد ہی ہے کیونکہ بیعت جہاد صرف مکلفینِ جہاد ہی سے ہے اور عموماً عورتیں اس کی مکلف نہیں۔ اس آیت سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ معاشرے میں مروجہ برائیوں اور منکرات سے اجتناب کا بیعت ارشاد میں عہد لینا چاہیئے۔ اس آیت کے آخری حصے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیعتِ ارشاد لینے والے کو بیعت کرنے والوں کے لیے اللّٰہ تعالیٰ سے بھلائی طلب کرنی چاہیے اور ان کے لیے استغفار کرنی چاہیئے۔

ایک اشکال اور سلف صالحین کے عمل کی روشنی میں اس کا حل

جب دونوں بیعتیں ایمان وجہاد اور ترقی درجات اور اقامت دین کے لیے ضروری ہیں تو پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ دونوں ایک ہی شخص کے ہاتھ پر کی جائیں؟ اگرچہ یہ درست ہے کہ اصل مقصود دونوں بیعتیں کے بغیر حاصل نہیں ہوتا مگر یہ ضروری نہیں کہ انہیں ایک ہی فرد میں جمع بھی کر دیا جائے۔ خلفائے راشدین کے بعد جب سند خلافت پر کبھی اہل اور کبھی نااہل افراد رونق افروز ہونے لگے تو یہ ممکن نہ رہا کہ ان کی صحبت میں بھی ایمان وتقویٰ کمال درجے تک پہنچ سکے چنانچہ ائمہ تابعین نے بیعتِ جہاد واقامت دین تو انہیں کے ہاتھ پر باقی رکھی اور بیعتِ تقویٰ کے لیے دیگر کبار صلحاء اور اتقیاء سے رجوع کیا میرے علم کے مطابق سب سے پہلے بیعت ارشاد امام حسن بصری نے لی پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اور تصوف کے سلاسل اس کام کے لیے وجود میں آ گئے۔

احادیث میں بیعت کی تاکید

بیعت کی احادیث مبارکہ میں بھی بہت تاکید آئی ہے ازالۃ الخفاء کی جلد اوّل کی فصل اوّل میں حضرت شاہ ولی اللہ نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے جو یہ ہے۔ من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ۔ جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت نہیں (یعنی کسی امیر کی بیعت کا طوق گردن میں نہیں) وہ جاہلیت کی موت مرا۔ اس حدیث مبارکہ میں بغیر بیعت کے زندگی پر بڑی شدید وعید آئی ہے۔ اس لیے کہ بیعت کر کے آدمی اپنی زندگی اسلامی نظم جماعت اور قانونِ الٰہی کے مطابق گزارنے کا عہد کرتا اور اس کے مطابق پابند ہوتا ہے۔ جو شخص امیر کی بیعت نہیں کرتا گویا وہ قانونِ الٰہی سے دور اور آزاد رہ کر زندگی گزارنا چاہتا ہے لہٰذا وہ جاہلیت میں زندہ رہا اور جاہلیت میں مرا۔ دوسرے یہ کہ بیعت قیام خلافت و امارتِ شرعیہ کے حصول کا ذریعہ ہے اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ قیام خلافتِ اسلامیہ کے ذریعے جہاد و قضاء، احیائے علوم دین اور اقامت ارکان اسلام کریں نیز کفار کے شر کو حوزۂ اسلام سے دفع کریں لہٰذا جو شخص بیعت نہ کر کے ان امور و فرائض کی انجام دہی سے علاحدہ رہتا ہے وہ اسلام کو کمزور اور باطل کو توانا کرتا ہے چنانچہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ حدیث بیعتِ جہاد واقامت دین کے بارے میں وارد ہوئی ہے اور بیعتِ تقویٰ صرف سنت ہے صلحائے امت اور علماء دین نے اس کے تارک پر ملامت نہیں کی اور یہ اجماع امت ہے۔ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بیعت کا بہت اہتمام فرماتے۔ اور اسی قدر تاکید بھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔

ومما لاشک فیہ ولاشبھۃ انہ اذا ثبت عن رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم فعلٌ علیٰ سبیل العبادۃِ والاھتمام بشانہٖ فانہٗ لا ینزل عن کونہٖ سنۃً فی الدین۔

ترجمہ: اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ جب ثابت ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی عمل بطریق عبادت (نہ کہ بسبیلِ عادت) اور اہتمام کے ساتھ ہو تو وہ عمل سنت دینی سے کم تر نہیں۔ (القول الجمیل)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ آنحضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے ثابت شدہ بیعتوں کو جمع فرماتے ہیں۔

واستفاض عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان الناس کانو یبایعونہ تارۃً علی الھجرۃ والجھاد وتارۃ علی اقامۃ ارکان الاسلام وتارۃ علی الثبات والقرار فی معرکۃ الکفار وتارۃ علی التمسک با لسنۃ والاجتناب عن البدعۃ والحرص علی الطاعات کما صح انہٗ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بایع نسوۃً من الانصار ان لا ینحن۔

ترجمہ: اور احادیث مشہورہ میں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے بیعت لیتے تھے کبھی ہجرت وجہاد پر، کبھی اقامتِ ارکان اسلام پر اور کبھی کفار کے مقابلے میں معرکے میں ثبات وقرار پر، کبھی سنت پر جمنے اور بدعت سے بچنے پر اور کبھی طاعات میں حرص ورغبت پر اور یہ بھی منقول ہے کہ آپؐ نے انصار کی عورتوں سے نوحہ نہ کرنے پر بیعت لی۔

صحیح بخاری میں غزوۂ خندق کے وقت کا ایک ترانہ جو صحابۂ کرام نے مل کر پڑھا، منقول ہوا ہے۔ اس میں بھی بیعتِ جہاد کا تذکرہ موجود ہے۔

نحن الذین بایعوا محمدًا علی الجھاد ما بقینا ابدًا

ترجمہ: ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمدؐ سے جہاد پر ابدی بیعت کی ہے جب تک جان میں جان ہے۔

جس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اللّٰھم لا عیش الا عیش الآخرۃ اللّٰھم اغفر الانصار والمھاجرۃ

ترجمہ: اے ہمارے اللہ زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے (مہاجرین وانصار کے اس عمل یعنی بیعت پر) مہاجرین وانصار کی مغفرت فرمادے۔

غرض وغایتِ بیعت

شرع لکم من الدین ما وصی بہٖ نوحًا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہٖ ابراھیم وموسٰی

وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ ۔ (الشوریٰ آیت نمبر ۱۳)

بیعت فی نفسہ مطلوب نہیں ہے بلکہ بیعت اقامت دین کے حصول کا ذریعہ
ہے۔ بیعتِ امامت یا امارت سے مقصود یہ ہے کہ اقامتِ دین کا کام منظم اور
مشروع طریقے پر ہو سکے۔ اور ایک امیر کی امارت میں مسلمان جمع اور متحد رہیں کیونکہ
تفریق دین میں حرام ہے۔ اور ایک امیر کی امارت میں جمع ہو کر اس تفریق کا امکان
بہت کم ہو جاتا ہے۔

بیعت تقویٰ کیونکہ عام اور رائج ہے اس لیے اس کی اہمیت عوام و خواص میں مسلّم ہے مگر بیعت
ا کیونکہ تعامل امت کے وقت سے متروک ہے اس لیے طبیعتیں اس سے ناآشنا ہو گئی ہیں۔ اور
ل سے اس کی عظمت و اہمیت نکل گئی ہے ہم یہاں اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اس کی
ض و غایت اقامتِ دین اور امارت اسلامیہ کی اہمیت کو واضح کرنے والی آیات اور احادیث
ان کرتے ہیں۔ جن کو مشت نمونہ از خروارے سمجھنا چاہیئے۔

قال اللہ تعالیٰ

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (القرآن)

ولو ردوہ إلی الرسول وإلی أولی الامر منھم القرآن

قال النبیؐ

من خرج من بیتہ مجاھدا واصلح ذات البین وأطاع الإمام فنومہ و
یقظتہ حسنۃ من لم یعرف إمام زمانہ فقد مات میتۃ جاھلیۃ۔
وقال انا آمرکم بخمس بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد
فی سبیل اللہ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول مبارک ہے۔

لا اسلام الا بجماعۃ ولا جماعۃ الا بسماعۃ ولا سماعۃ الا بالطاعۃ (مشکوٰۃ)

یہ آیت اور احادیث اس بات کی صراحت نشاندہی کرتی ہیں کہ اسلام میں اقامتِ دین
جماعت و امارت کی کیا اہمیت ہے جس بات کا آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اتنے اہتمام
ساتھ حکم فرمایا ہو اور اس کو پورا کیے بغیر یا اس جد وجہد میں شریک ہوئے بغیر جو شخص مر جائے
ے جاہلیت کی موت کی وعید سنائی ہو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جن کا پایہ دین میں کسی سے مخفی
ہیں وہ یہ فرمائیں کہ بلا جماعت اسلام ہی نہیں اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا حکم مبارک
اطاعت کے بارے میں کہ امیر کی اطاعت کرو اور معاملات میں اس سے رجوع کرو کیا یہ اہل فہم حضرات

کے لیے قیام خلافت وامارتِ اسلامیہ کی جدوجہد کرنے اور اس غرض کے لیے بیعت کرنے اور لینے کے حق میں کم اور ناکافی دلائل ہیں۔

قیام خلافتِ اسلامیہ اور تقرریٔ امیر صحابہؓ کے نزدیک کتنی اہمیت کے حامل کام تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ صحابہ کرام نے آنحضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکفین وتدفین سے پہلے اسے سرانجام دیا۔ کبار صحابہؓ کا یہ عمل اس بات پر گواہ ہے کہ امت کو حتی الامکان تین دن بھی بغیر امیر کے نہ گزارنے چاہئیں۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے قبل وصیت فرمائی تھی کہ امیر کے چناؤ کا فیصلہ تین دن میں کرلینا مگر ادھر مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ پوری پوری زندگیاں بغیر امیر اور اسلامی نظم جماعت کے گزر جاتی ہیں مگر اس فریضے کی ادائیگی کا خیال تک نہیں آتا اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اقامتِ دین کے لیے کچھ سعی وجدوجہد کرنا بھی چاہے تو اس پر طرح طرح کے اعتراضات اور الزامات عائد کیے جاتے ہیں اور کیا عوام اور کیا خواص اس کے کام میں کیڑے نکالنے کا مستحسن فریضہ سرانجام دینے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہدایت وراہنمائی عطا فرمائے۔ اور حق کو پہچاننے اور اس کی اتباع کرنے اور اسے طاقتور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ خلافت راشدہ کی بنیاد بھی بیعت پر رکھی گئی تھی مگر ہم یہ حصہ حذف کر رہے ہیں کیونکہ یہ بات اتنی ہی مسلم الثبوت ہے جتنی کہ آفتاب کی روشنی۔

بیعت اور تحریکیں

اس برصغیر پاک وہند میں ایک عظیم تحریک جہاد وتنظیم، اصلاح وتجدید اور احیائے خلافت وامارتِ اسلامیہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھائی تھی۔ اس تحریک کی بنیاد بھی بیعت تھی۔ ہم یہاں حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی تصنیف گراں قدر "سیرت سید احمد شہید" سے اس کے ثبوت میں ایک مکتوب سید احمد شہید علیہ الرحمہ کا ایک حصہ نقل کر رہے ہیں۔ "قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر مرتبہ مجاہدین کا لشکر ایک بے سری فوج اور عام بلوائیوں کی طرح تھا اور کوچ ومقام میں کہیں نظم نہیں تھا اس لیے مال غنیمت شرع شریف کے قانون کے مطابق تقسیم نہ ہوسکا اس بنا پر تمام مسلمانوں نے جو موجود تھے۔ جن میں سادات، علماء، مشائخ، امراء اور خواص وعام تھے۔ بالاتفاق اس بات کو کہا کہ جہاد کا قیام اور کفر وفساد کا ازالہ امام کے تقرر کے بغیر مسنون اور شرعی طریقے پر انجام نہیں پاسکتا۔ اس بنا پر ۱۲ جمادی الاخرہ ۱۲۴۲ھ کو ان سب نے اس فقیر کے ہاتھ پر بیعت امامت کی اور اس کی اطاعت کا عہد کیا۔" میرے پاس سرِدست انڈونیشیا اور سوڈان میں اٹھائی گئی اسلامی تحریکیں جو خالص اقامت دین کے لیے اٹھائی گئی تھیں جنہیں امام بونجولؒ اور سید احمد مہدیؒ سوڈانی نے اٹھایا ان کا کوئی مستند حوالہ موجود نہیں مگر ذاتی علم کی بنا پر عرض کرسکتا ہوں کہ ان کی بنیاد بھی بیعت پر تھی۔ موجودہ دور میں اقامتِ دین کے لیے دو عظیم الشان تحریکیں برصغیر پاک وہند اور مصر وشام میں پروان چڑھیں جنہیں جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کے

ریاست اور طریق کار نیز عروج و زوال سے قطع نظر ہم صرف وہ شے جسے ان تحریکوں نے نظم جماعت کے لیے بنیاد بنایا بیان کرتے ہیں۔ وہ چیز بیعت ہے یا نہیں؟ ان میں الاخوان المسلمون کی بنیاد روایتاً بھی بیعت پر تھی یعنی اس کی ہیئت نہیں بدلی گئی تھی، البتہ جماعت اسلامی کی بنیاد بیعت کی روایتی شکل کو بدل کر غیر روایتی شکل پر رکھی گئی جیسا کہ آگے ثبوت کے طور پر مکتوبات مودودیؒ میں آرہا ہے۔ امام حسن البناؒ شہید کے قریب ترین ساتھی جناب امین اسماعیل صاحب اپنی تصنیف "الامام شہید" کے صفحہ ۱۰۱ پر رقم طراز ہیں۔ "ایک روز اچانک انھوں نے مجھے اپنے گھر طلب فرمایا، اور مجھے دیکھتے ہی میرا ہاتھ تھام کر بولے آئیے ہم بیعت کی تجدید کرلیں چنانچہ میں نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر خدا اور رسول کی وفاداری کا از سر نو عہد کیا۔"

امام مودودی رحمتہ اللہ علیہ اور بیعت

ہندوستان کے ایک سفیر محمد یونس صاحب نے حیدرآباد دکن سے بیعت کے اسلامی دستور پر وضاحت طلب کی تھی۔ اس کا جواب امام سید رحمتہ اللہ علیہ نے مارچ ۱۹۴۱ء میں اپنے ایک مکتوب کے ذریعے دیا جسے ہم محترم سید اسعد گیلانی کی تصنیف "سید مودودی دعوت و تحریک" کے باب مکتوبات و افادات سے نقل کررہے ہیں۔ اس مکتوب میں سے ہم نے وہ چیزیں جو نفس مضمون سے غیر متعلق تھیں حذف کردی ہیں مثلاً ان صاحب یا پیروں اور گدیوں سے متعلق باتیں۔

"اصطلاح میں بیعت سے مراد اطاعت اور پیروی کا اقرار ہے اس کی تین قسمیں ہیں۔

___ وہ بیعت جو کسی خاص موقع پر کسی خاص معاملہ کے لیے ہو۔ جیسے بیعتِ رضوان تھی کہ حضرت عثمان کی شہادت کی افواہ سن کر حضورؐ نے اہلِ مکہ سے جنگ کا ارادہ فرمایا اور اس وقت صحابہ کرام سے اس امر پر بیعت لی کہ وہ پیش آمدہ مہم میں آپ کے ساتھ جاں فروشی کریں گے۔

___ دوسری وہ بیعت جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق و روحانیت کی نیت سے ایک مرشد و معلم اس شخص سے لیتا ہے جو اس کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لیے آئے۔ یہ وہ بیعت تھی جو بالعموم اس شخص کو کرنی پڑتی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا۔ آپؐ اس سے اقرار کراتے تھے کہ وہ شرک، زنا، چوری وغیرہ سے پرہیز کرے گا۔ اور جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پہنچائیں گے۔ ان کی اطاعت کرے گا۔ اس بیعت کے لینے کا حق یا تو نبی کو پہنچتا ہے یا اس شخص کو جو نبی کے طریقے پر ہو، یعنی طریقۂ نبوی کا صحیح علم رکھتا ہو اس پر خود بھی عامل ہو اور بیعت لینے سے اصلاح و ارشاد کے سوا قطعاً کوئی دوسری نیت نہ رکھتا ہو۔

___ تیسری وہ بیعت ہے جو اسلامی جماعت کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام خدا اور اس کے رسول کا مطیع ہے اس وقت تک

جماعت کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے "من مات و لیس فی عنقہ بیعۃ" اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت پر زور دیا گیا ہے ان میں سے مراد تیسری بیعت ہے کیونکہ اس پر اسلامی جماعت کی زندگی اور اس کے نظام کا قیام منحصر ہے اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کام کے لیے تشریف لائے تھے اور جس امر عظیم کا بار آپؐ امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے"۔

"دسید مودودی دعوت و تحریک"۔ مطبوعہ مارچ ۱۹۸۰ء۔ صفحہ نمبر ۲۴۷، ۲۴۸ - مکتوب نمبر ۱۳۔

کتاب مذکورہ بالا میں ان مستفسر حب کے استفسارات تو موجود نہیں ہیں البتہ حضرت ممدوحؒ کے دوسرے جوابی مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جماعت اسلامی میں نظام بیعت کی عدم موجودگی پر استفسار کیا ہوگا۔ جس کا شافی جواب مولانا نے ۸ جون ۱۹۴۲ء کو دیا اسے بھی ہم مذکورہ بالا کتاب کے باب مکتوبات و مخاطبات کے مکتوب نمبر ۱۴ سے نقل کر رہے ہیں جو صفحہ ۲۴۰ اور ۲۴۱ پر درج ہے۔

"اصل یہ ہے کہ ایک چیز تو طریقۂ بیعت و ارشاد کی روح ہے اور دوسری چیز وہ خالص ہیئت و شکل ہے جس میں یہ طریقہ صدیوں سے متوارث چلا آرہا ہے جہاں تک اس کی اصل روح کا تعلق ہے وہ بالکل برحق، صحیح اور پاک ہے مگر جہاں تک اس کی ہیئت و شکل کا تعلق ہے وہ گمراہ کرنے والے پیروں اور جاہل مریدوں کے غلط طرزِ عمل کی وجہ سے اس قدر انحطاط کا شکار ہوگئی ہے اور اس کے ساتھ کچھ دوسرے لوازمات اس قدر خلط ملط ہوگئے ہیں کہ اصل روح نہ صرف یہ کہ اس کے اندر باقی نہیں رہی بلکہ جہاں نیک نیت لوگ اس ہیئت و شکل میں کوئی صحیح خدمت بھی کرتے ہیں وہاں بھی بہت جلدی اس کے خراب لوازم عود کر آتے ہیں۔ اس بنا پر میری رائے یہ ہے کہ پیری مریدی کی وہ خاص شکل بدل دی جائے اور اس کے بجائے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں سلسلۂ بیعت و ارشاد کی اصل روح تو موجود ہو مگر وہ خراب لوازم اور التباسات نہ ہوں۔ میں نے بہت غور و خوض کے بعد جو صورت تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ اولاً ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت نہ لی جائے بلکہ صرف زبانی عہد لیا جائے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے لیا کرتے تھے (گویا بنیاد بیعت ہی ہوگی مگر عام دستور اور مروجہ طریقے سے ہٹ کر) ثانیاً سلسلہ کسی شخص کی طرف منسوب نہ ہو۔ بلکہ "اسلام" کی طرف منسوب ہو تاکہ شخص خاص کی وابستگی آگے چل کر شخصیت پرستی تک نہ پہنچ سکے۔ ثالثاً تزکیۂ نفس اور اجرائے احکام اور اقامت نظم و انضباط وغیرہ کا کام جو شخص کے ہاتھ میں ہو وہ اس کی ذاتی حیثیت میں نہ ہو بلکہ جماعت کا سردار ہونے کی حیثیت میں ہو۔ حتیٰ کہ جب ایک شخص سردار نہ رہے اور دوسرا شخص اس کی جگہ آئے۔ تو لوگوں کی اطاعت

وابستگی بھی پہلے شخص سے ہٹ کر دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو جائے۔ نہ یہ کہ لوگ اسی شخص خاص کے گرویدہ رہیں جس کے امر پر ابتدا میں انھوں نے عہد کیا تھا یہ دونوں باتیں خلفائے راشدین کے دور کی تنظیم سے میں نے اخذ کی ہیں۔ ان کے مبارک دور میں اسلامی جماعت اسلام کی طرف منسوب تھی نہ کہ صدیق یا فاروق یا عثمان یا علی رضی اللہ عنہم کی طرف' اسی طرح لوگوں کی وابستگی

شخص صدیق' یا شخص فاروق سے نہ تھی بلکہ امیر المؤمنین سے تھی جو بھی وقت کا امیر ہو اور اطاعت نظام کی تھی نہ کہ شخص خاص کی''۔

اس سے معلوم ہوا کہ جماعت اسلامی کی بنیاد بھی اصلاً بیعت پر رکھی گئی تھی البتہ بعض مصالح کی بنا پر معروف طریقۂ بیعت بدل دیا گیا تھا''

بیعت کے عنوان سے یہ مضمون تقریباً جامع ہے کیونکہ اسلامی دنیا میں سینکڑوں تحریکیں اٹھیں اور تقریباً سب ہی کی بنیاد بیعت تھی اور ہر ایک کا احاطہ بیان کرنا ہمارا مقصود نہیں بلکہ صرف یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ تنظیم اسلامی کوئی نئی نویلی تنظیم یا تحریک نہیں جس کی بنیاد بیعت پر رکھی گئی ہے۔ بلکہ اس سے پہلے بھی اقامت دین کے لیے اٹھنے والی تحریکیں بیعت کی بنیاد پر ہی قائم کی گئیں۔ چنانچہ ہم نے انتہائی معروف تحریکوں کو بطور ثبوت پیش کیا ہے۔

وما توفیقی الا باللّٰہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

(۲)

آج کا مسئلہ

جناب آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کوٹھی اور کار کس طرح حاصل کی جائے اور بنک بیلنس کس طرح بنایا جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر آج کسی کی کوئی عزت نہیں۔ میں تنگ گلی کا رہنے والا ہوں۔ میرے کئی رشتہ دار امیر ہو گئے ہیں، انھوں نے باہر کوٹھیاں بنا لی ہیں۔ بیاہ شادی پر ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ تو وہ میرے سلام کا سرسری جواب دیتے ہیں اور کوئی بات نہیں کرتے، لیکن میرا جو رشتہ دار سرمایہ دار ہے۔ اس کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔ ان کے سلام کے جواب کے ساتھ خیر خیریت دریافت کرتے ہیں اور کوئی ان کی پرابلم ہو تو اس کے لیے اپنی مدد کی پیش کش کرتے ہیں۔ میرے سلام کے جواب کے بعد وہ میری طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ کیونکہ میرے پاس بنگلا، بیوک، بنک بیلنس جیسی کوئی چیز نہیں۔ میں ان کے کسی کام نہیں آسکتا۔ وہ میرے بچوں کے ساتھ اپنے بچوں کا رشتہ نہیں کر سکتے، بلکہ وہ میری گلی میں نہیں آسکتے جس گھر میں ان کے بزرگ رہتے تھے اور جہاں انھوں نے خود سرمایہ دار بننے تک زندگی گزاری تھی وہاں آنا ان کے لیے شرمندگی کا باعث

ں لیا ہے۔ دوستو! اب میں تمہیں ایک بات بتانے لگا ہوں کہ میں بھی سرمایہ دار بننے کی سوچ رہا ہوں
ں دفتر میں ملازم ہوں میں کوشش کروں تو میرے لیے کئی رستے کھل سکتے ہیں۔ ویسے بات کیا چھپانی ہے میرا کام
روع ہو چکا ہے۔ تم میری گھڑی اور میرے کپڑے نہیں دیکھتے۔ پر دوست یہ خدا کے حکموں کی نافرمانی کر کے ملے ہیں۔
ں کا مجھے بہت افسوس ہے۔ لیکن میرے دفتر کے ساتھی کہتے ہیں کہ شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خدا سے دور ہونا شروع ہو گیا ہے، لیکن آہستہ آہستہ دل کا کرب نوٹوں کے بنڈل میں
ب جاتا ہے پھر اپنی منزل، کوٹھی اور کار بھی اپنے سہانے روپ کے ساتھ نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اور
ل کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہے۔ بس دوست آج کل میں اس مصرعہ کو دہراتا رہتا ہوں۔ ع تیشہ ترگام زن
نزل ما دور نیست۔ میں نے ایک فریج خرید لی ہے۔ ایئر کنڈیشنر لے لیا ہے۔ بچے کہتے ہیں کہ رنگین T.V
لے آؤ۔ لیکن اسے میں کوٹھی بنا کر لاؤں گا۔ میں رقم بنک میں رکھتا ہوں۔ وہاں رقم اتنی ہو گئی ہے کہ اس سے
زیادہ رکھنی مناسب نہیں۔ اب میں رقم گھر میں جمع کرتا ہوں آج کل میں کچھ فکر مند رہنے لگا ہوں۔ ہاں کل ایک
عجیب بات ہوئی۔ T.V میں تلاوت ہو رہی تھی۔ سکرین پر اس کا ترجمہ آیا۔ یہ سورۂ فرقان کی آیتیں ہیں
اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے پوچھتا ہے "کبھی تم نے اس شخص کو دیکھا، جس نے اپنی
خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہوا ہے؟ کیا تم ایسے شخص کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ ان میں اکثر لوگ
سنتے اور سمجھتے ہیں؟ نہیں یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ یہ ان سے بھی زیادہ راہ بھولے ہوئے ہیں۔" دو
ان آیتوں کو پڑھ کر میرا ذہن سوچوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔ میری سوچ کہتی ہے کہ کیا تو نے اپنی خواہش
"بنگلا، بیوک اور بنک بیلنس" کو خدا نہیں بنایا ہوا؟ کیا تو نے اس کی خاطر خدا کو نہیں چھوڑ دیا؟ کیا تو ا
کے حکموں کی خلاف ورزی نہیں کر رہا؟ کیا تو اپنے دل میں اس خواہش کے بت کو براجمان نہیں کر بیٹھا؟ میں
کل سے پریشان ہوں۔ یہ خیال بار بار میرے دل میں آتا ہے۔ پھر میں سوچتا ہوں کہ اس راہ میں میں اکیلا
نہیں۔ آج کل سب اس راہ پر چل رہے ہیں۔ کاروباری لوگ ناجائز منافع کما رہے ہیں۔ ملاوٹ کر رہے ہیں
بلکہ وہ بیماروں کو بھی معاف نہیں کرتے، دوائیوں میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ نقلی مال بیچتے ہیں۔ سمگلنگ کرتے
ہیں۔ ملکی دولت باہر کے بنکوں میں جمع کراتے ہیں۔ کاریگروں کا مال کم سے کم قیمت پر خریدتے اور زیادہ سے
زیادہ قیمت پر بیچتے ہیں۔ صنعتکاروں سے جہاں تک ہو سکے مزدوروں کو تھوڑی تنخواہ پر ملازم رکھنے
کوشش کرتے ہیں اور خود ڈھیروں مال بناتے ہیں۔ ملت کے سب طبقے اس کام میں لگے ہوئے ہیں
سیاسی رہنما بھی کرسی چاہتے ہیں۔ دینی رہنماؤں کا ایک گروہ بھی دنیا کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ یہ اپنے
انتخابی جلسوں میں حکومت کی تمام غلطیاں گنواتے ہیں۔ لیکن سامنے بیٹھے ہوئے حاضرین جن نا
میں مبتلا ہیں۔ ان کے متعلق نہ انہیں تنبیہہ کرتے ہیں نہ انہیں نصیحت کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے
ان سے انہوں نے ووٹ لینے ہوتے ہیں۔ سو دوستو! میں کیا بتاؤں مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا کرو

جب کہ میں اپنی منزل کے قریب آ پہنچا ہوں۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ صاحبو میں ولدل میں پھنس گیا ہوں۔ دلدل میں۔

یہ کہانی ایک شخص کی نہیں۔ آج ہماری اکثریت کی یہ کہانی ہے۔ دنیا پرستی نے آج سب کی زندگی اجیرن کردی ہے۔ آج کوئی کام کرنا آسان نہیں۔ قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ اگر آپکے پاس پیسے ہیں تو آپ کے سب کام ہوجائیں گے۔ ہماری قومی زندگی کی مشینری دن بدن جام ہوتی جاتی ہے۔ یہ اس وقت کام کرتی ہے جب اس میں زر کا تیل دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۝ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۝

(الیل : ۵ سے ۱۰)

جس نے راہِ خدا میں مال خرچا اور پرہیزگاری اختیار کی اور ہدایت کی تصدیق کی اس کی زندگی ہم آسان سے آسان تر کرتے جائیں گے اور جس نے بخل کیا اور خدا سے بے پرواہی اختیار کی نیز ہدایت کو غلط جانا تو اس کی زندگی ہم مشکل سے مشکل تر کرتے جائیں گے۔

ہم جو کماتے وقت خدا کے حکموں کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس کی راہ میں خرچ کہاں کریں گے۔ اس آیت کے مطابق چونکہ ہم بخیلوں کی قوم ہیں اور ہم نے خدا سے بے پرواہی اختیار کی ہوئی ہے۔ اس لیے آج ہماری زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی جاتی ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ آج کل ہم اسلام کو نافذ کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں ہم پچھلی صدیوں میں بھی اسے نافذ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ پر اسلام تو اختیار کرنے کی چیز ہے ہم میں سے کوئی اسے اختیار کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ سب اسے نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ منزل ہماری دنیا ہے اور ہم مکہ پہنچنے کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ جیسے کوئی گاڑی کافرستان کی طرف جا رہی ہو۔ ہم اس کا رخ موڑنے کی بجائے اس کی اصلاح شروع کردیں۔ کبھی کھڑکیاں بدل دیں، کبھی چھت تبدیل کر دیں۔ اور کبھی سیٹیں اٹھا کر دری قالین بچھا دیں۔ ظاہر ہے اس سے گاڑی کے کافرستان پہنچنے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم نے اگر کعبہ کی طرف جانا ہے تو رخ اس کی طرف موڑنا پڑے گا۔ ہم کو رضائے خدا کی منزل اختیار کرنی ہوگی۔ جس معاشرے کی ہم کو تلاش ہے۔ وہ اس وقت پیدا ہوگا جب ہم خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی راہ میں حائل ہونے والی سب آزمائشوں میں کامیاب ہوجائیں گے۔ صرف وہی دل کی بیماریوں سے شفا پاتے ہیں جو اس راہ میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اسلام نافذ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ خود اسے اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دینے والوں میں وہ روح پیدا ہوتی ہے جو اسلامی اصولوں کی جان ہے۔ اسلام کے اصولوں پر صرف ایسے لوگ ہی عمل کر سکتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ صدیوں سے اس روح سے محروم ہوچکا ہے ایسے بے جان معاشرہ میں اسلامی اصلاحات کا جو حال ہوتا تھا۔ وہ

ہم سب کے سامنے ہے۔ لوگ بدستور بے چین ہیں۔ ماضی قریب میں ہم اورنگ زیب عالمگیر اور سید احمد شہید کی اصلاحی تحریکوں کے تجربے کر چکے ہیں۔ حال میں ہم نے خاکسار تحریک کی کوششوں کو دیکھا ہے۔ آج کل جماعت اسلامی اور جناب خمینی یہ تجربے کر رہے ہیں ہم ہزار سال تک بھی ایسی اسلامی اصلاحات کرتے رہیں تو تب بھی ہمیں پاک اور شریف معاشرہ کبھی نصیب نہ ہوگا۔ جب تک ہم "حق سبحانہٗ تعالیٰ" وَل اپنے دل دی مہار نہ موڑاں گے" اس وقت تک کامیابی نہیں ہوگی۔ اور یہ مہار ہمیشہ مفکروں اور مدبروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جس قوم کے دانشور دنیا کی بھول بھلیوں میں گم ہوں۔ وہ کبھی نجات نہیں پا سکتی۔ آج سوچنے سمجھنے والے ادیبوں کا یہ فرض ہے کہ وہ خود اس منزل کی طرف سبقت کریں۔ اپنی نگارشات کے ذریعے مسلمانوں کو رضائے خدا کی منزل کی طرف متوجہ کریں۔ اپنے مضمونوں افسانوں کہانیوں اور نظموں میں اس حقیقت کو اجاگر کریں۔ ملت کو محسوس طریقے اور غیر محسوس طریقے سے یہ ذہن نشین کرا دیں کہ نظر تبدیل کرو گے تو تمہاری جان بدل جائے گی، جان بدلے گی تو جہان بدل جائیگا۔

دوسرا کام صاحب قلم حضرات کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دوری کی وجہ سے جن گمراہیوں میں ہم پھنس گئے ہیں۔ ان کی پردہ دری کریں۔ ہم اپنے دین کو مسخ کر بیٹھے ہیں۔ سچا دین قرآن حکیم اور اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے نمونے میں پایا جاتا ہے۔ کوشش کرنے والوں کو اللہ کریم ضرور راہ دکھاتے ہیں۔

تیسرا کام یہ ہے کہ جو لوگ اپنا رخ سیدھا کریں، انہیں آپس میں ربط پیدا کرنا چاہیئے کیونکہ ان کی زندگی میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ وہ جائز منافع لیں گے تو دوسرے دکاندار اسے برداشت نہیں کریں گے۔ وہ رشوت سے بچیں گے تو ان کے دفتر کے ساتھی ان سے خطرہ محسوس کریں گے۔ ان سے چھٹکارا پانے کی کوشش کریں گے۔ ان کی آمدنی کم ہو جائے گی۔ ان کے گھروں میں تلخیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ان صاحبوں کو آپس میں تعلق پیدا کر کے ایک دوسرے کا درد بانٹنا چاہیئے۔

اب ہمیں اپنی خبر لینی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ زندگی کا بوجھ ناقابل برداشت ہو جائے۔ اور اگلی نسل مایوس ہو جائے۔ دشمن ہمارے دائیں اور بائیں دونوں طرف بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ موقع کی تلاش میں ہیں۔ وہ ہمیں چکی کے پاٹوں میں پیس دینا چاہتے ہیں۔ وہ ہم سے سب کچھ چھین لیں گے پھر اپنی مرضی کا امن دیں گے۔ مجبوری اور مقہوری ہمارا مقدر بن جائے گا۔

أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ۝ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کیوں تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

محمد شریف — لاہور

رفتارِ کار

امیرِ تنظیمِ اسلامی کا دورہ فیصل آباد

فیصل آباد مورخہ ۱۶، ۱۷، ۱۸ مارچ کے ایام میں امیرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے فیصل آباد کا دعوتی دورہ کیا ۱۶ مارچ کی شام کو امیرِ محترم ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کے ہمراہ بذریعہ کار فیصل آباد تشریف لائے اور بعد نمازِ مغرب زرعی یونیورسٹی ہال میں اطبائے جدید (ڈاکٹر دل) کے اجلاس میں ایک گھنٹہ سے زائد خطاب فرمایا۔ پورا ہال سامعین (جو دانشوروں پر مشتمل تھا) اپنی تنگیٔ داماں کی شکایت کر رہا تھا۔ خطاب کا موضوع تھا "اسلام کا فلسفۂ جہاد اور اقامتِ دین"۔ جو پوری توجہ سے سنا گیا۔ ۱۷ مارچ کو صبح سے ۱۲ بجے دن تک ملاقاتوں کا سلسلہ رہا۔ اسی دن ٹھیک ایک بجے دن آپ نے بار ایسوسی ایشن میں وکلاء سے "اسلام اور پاکستان" کے موضوع پر خطاب کیا۔ پاکستان کے قیام کے پس منظر اور پیش منظر اور موجودہ صورتِ حال پر آپ نے بڑی تفصیل سے جامع اور مدلّل اور مؤثر انداز میں روشنی ڈالی۔ سامعین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ پورا ہال باوجود اپنی وسعت کے تنگ دامنی پہ شکوہ سنج تھا۔ کم و بیش حاضری دو تین ہزار ہو گی۔ بعد کو سوال و جواب بھی ہوئے اور وکلاء کی طرف سے امیرِ محترم کی چائے سے تواضع کی گئی۔ مکتبہ بھی لگایا گیا تھا جس سے خاصی تعداد میں کتابیں فروخت ہوئیں۔ اسی دن رات کو بعد نمازِ عشاء امیرِ محترم نے عبداللہ پور کی ایک جامع مسجد میں، جو دارالعلوم فتح دین کے نام سے موسوم ہے، ڈیڑھ دو گھنٹہ تک خطاب فرمایا۔ خطاب کا موضوع دعوتِ دین منجملہ مراحل کے ساتھ یعنی مجاہدہ مع النفس، شہادت علی الناس، اقامتِ دین، نظمِ جماعت، اہمیتِ بیعت پر مشتمل تھا۔ سامعین کا اندازہ کم و بیش دو تین ہزار تھا۔ ۱۸ مارچ کی صبح کو اسی مسجد میں ابتداءً سوال و جواب کی نشست ہوئی اور بعد میں بیعت جس کے نتیجہ میں کم و بیش ۱۰ افراد نے بیعت کی۔ اسی دن نمازِ فجر کے بعد آپ نے اپنے قیام کی متصل مسجد صدیقیہ میں بھی درسِ قرآن دیا جو خاصی توجہ کے ساتھ سنا گیا۔ ۱۸ مارچ کی دوپہر کو بعد از طعام آپ مراجعت فرمائے لاہور ہوئے۔

امیرِ تنظیمِ اسلامی کا دورہ ملتان و وہاڑی

ملتان میں گرمیوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ پنکھے چلنے شروع ہو گئے ہیں۔ اور گو کہ بہار کی آمد آمد ہے اور ہر طرف پھول کھلے ہیں مگر دوپہر کو خاصی دھوپ ہوتی ہے۔ ایسے موسم میں امیرِ تنظیمِ اسلامی کی آمد سے دو دن قبل بارش کے چھینٹوں نے بہت خوش گوار اثر چھوڑا۔

۲۰ مارچ ۱۹۸۳ء کی صبح کی پرواز سے امیرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ملتان پہنچے۔ امیرِ ملتان حافظ غلام حیدر ترین اور رفیق مسعود احمد، منیر احمد اور عمر علی خاں نے ائیرپورٹ پر استقبال کیا۔ باقی تمام رفقاء امیرِ ملتان کے گھر جمع تھے جہاں اب تنظیم کا نیا دفتر کھل چکا ہے جس کے ساتھ ایک عدد مہمان خانہ بھی تعمیر ہو چکا ہے۔ امیرِ محترم سب سے بغل گیر ہوئے اور خیریت دریافت کی۔ تعارف کے بعد امیرِ محترم نے تنظیم کی پچھلے تین ماہ کی کارکردگی کے بارے میں دریافت کیا۔ گفت و شنید

ابھی جاری تھی کہ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی میں اسلامک سٹڈیز کے شعبے کے پروفیسر جناب حافظ ثنار احمد صاحب ایک لیکچرار اور دو طالب علموں کے ساتھ تشریف لائے۔ علیک سلیک کے بعد حافظ صاحب نے تنظیم کی تربیت کے بارے میں متعدد سوالات پوچھے جن کا ڈاکٹر صاحب نے خندہ پیشانی کے ساتھ مفصل جواب دیا۔ آخر میں امیر محترم نے تنظیم کا منتخب نصاب اور دوسری چند کتب حافظ صاحب کو ہدیۃً پیش کیں تاکہ وہ اپنی لائبریری میں انہیں رکھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ حافظ صاحب اور ان کے ساتھی کو ان کتب کا مطالعہ نصیب کرے اور دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

ظہر کی نماز اور دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر امیر محترم نے کچھ دیر آرام فرمایا۔ کیونکہ پچھلے تین ماہ سے مسلسل سفر میں تھے جیسا کہ پچھلے ماہ کے میثاق میں شائع ہو چکا ہے۔

عصر کے بعد رفقاءِ تنظیم کے اجتماع میں امیر محترم نے سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۱۱ کا درس دیا جس کے بعد سات رفقاء نے بیعت کی گو کہ وہ تنظیم میں پہلے شمولیت کر چکے تھے۔ ان میں حکیم عاشق حسین صاحب، عبدالرشید صاحب، حق نواز، محمد اجمل، مسعود احمد، منیر احمد اور محمد اکبر صاحب شامل ہیں۔

رات کو بعد نماز عشاء جلسہ شروع ہوا۔ تعارفی جملے راقم نے ادا کئے۔ اس کے بعد امیر ملتان نے مختصر تقریر کی اور آخر میں امیر محترم نے اقسام شرک کے موضوع پر نہایت ہی جامع مدلل اور علمی تقریر کی۔ حاضری ۶۰۰ کے قریب تھی۔ مگر ہماری توقع سے کم۔ کیونکہ اسی دن اسی وقت مصر کے قاری عبدالباسط جامع خیر المدارس میں قرأت فرما رہے تھے۔ لہٰذا کافی تعداد میں لوگ اس محفل میں گئے ہوئے تھے۔ بہر حال الحمد للہ جلسہ نہایت کامیاب رہا اور نظم برقرار رہا۔ تمام رفقاء نے جلسے کو کامیاب بنانے میں خوب محنت کی۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کے نتیجے میں تنظیم کو تقویت عطا فرمائے۔ آمین !!

۲۱ مارچ: صبح نو بجے سوال و جواب کی نشست ہوئی جو کہ گیارہ بجے تک جاری رہی۔ امیر محترم نے تمام سوالوں کا جواب نہایت احسن طریقے سے دیا اور اس بات پر زور دیا کہ ہم اپنے اختلافات کو پس پشت ڈال کر دین کی خدمت کریں اور اقامتِ دین کے پہلو پر تدبر کریں۔

سوال و جواب کے اختتام پر تین اشخاص نے بیعت کی جن میں سے جناب محمد منیر صاحب اور محمد خالد صاحب کا تعلق سورج میانی کے علاقے سے ہے اور تیسرے ساتھی جناب ظفر خان صاحب برادرم عبدالماجد خان صاحب کے ساتھ پاک عرب فرٹیلائزر فیکٹری میں انجینئر ہیں۔ آخر میں تنظیم کا ایک مختصر سا اجتماع ہوا جس میں بتایا گیا کہ امیر ملتان چونکہ اپنے ایک اہم کام کے سلسلے میں لاہور منتقل ہو رہے ہیں اور جب تک وہ واپس نہیں آتے برادرم عبدالماجد خان کو عارضی قائم مقام امیر اور جناب شفیع صاحب انچارج بیت المال کے فرائض انجام دیں گے۔

عصر کی نماز کے بعد دو کاروں پر مشتمل ہمارا مختصر قافلہ وہاڑی کے لئے روانہ ہوا۔ مغرب کی نماز وہیں جا کر ادا کی۔ وہاں قیام کا بندوبست جناب اسلام الدین (مرحوم) کے گھر کیا گیا تھا۔ بعد میں امیر محترم نے بتایا کہ ۱۹۴۷ء میں جو قافلہ بھونہ سے پاکستان پہنچا تھا اس کے امیر اسلام الدین صاحب تھے اور ڈاکٹر صاحب خود اس قافلے میں شامل تھے۔ ڈاکٹر منظور احمد اور ان کے رفقاء (امیر وہاڑی) جنہوں نے نہایت شاندار انتظام کیا ہوا تھا، ہمارا پرتپاک استقبال کیا۔ رات کو بعد از نماز عشاء ٹاؤن ہال کے گراؤنڈ میں امیر محترم نے ہمارے دینی فرائض کے موضوع پر نہایت جامع اور پر اثر تقریر کی۔ گراؤنڈ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حاضرین نے خطاب نہایت توجہ اور انہماک سے سنا۔

اگلے دن وہاڑی کی سب سے بڑی مسجد (باغ والی) میں بعد نمازِ عشاء امیر محترم نے سورۃ توبہ پر مشتمل درس دیا اور سیرتِ نبوی کی روشنی میں بیعت کی اہمیت کو واضح کیا۔ آپ نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر بیعت کا ذکر بھی کیا کہ جس کے بعد یہ سلسلہ ایسا ٹوٹا ہے کہ اب تک جُڑ نہیں پایا اور اسی سلسلے کے احیاء کے لئے تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ درس کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوئی اور صبح کا پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔ دوپہر کو گو کہ ہماری ملتان واپسی تھی مگر وکلاء کے ایک وفد کے پُرزور اصرار پر امیر تنظیم گیارہ بجے ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ اقامتِ دین کے پہلو پر ایک مختصر خطاب کیا اور سوالات کے جواب دیئے۔ جب ایک وکیل صاحب نے امیر تنظیم سے پوچھا کہ انقلاب کی راہ میں کون کون سی دشواریاں آپ کو پیش آرہی ہیں اور جواب یہ ملا کہ میرا اور آپ کا نفس تو سارے مجمع نے اس کی پُرزور تائید کی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اقامتِ دین کی اہمیت کا شعور عطا فرمائے اور اسے جس طرح حضور سرورِ کائنات ؐ نے ادا کیا اس طریقے پر ہمیں بھی اسے بجالانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

دو بجے تک ہم واپس ملتان پہنچ چکے تھے اور نمازِ ظہر ادا کر رہے تھے۔ امیر تنظیم کی روانگی سے قبل جناب شوکت منیر صاحب جو کہ ڈاکٹر صاحب کے پرانے کلاس فیلو بھی ہیں، نے بیعت کی۔

پانچ بجے راقم اور رفیق محمد اکبر صاحب امیر تنظیم کو ائرپورٹ پر الوداع کہنے گئے۔ وہ ہم سے بغلگیر ہوئے اور لاؤنج کی جانب بڑھے۔

مرتب: ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی

امیرِ تنظیمِ اسلامی کا دورہ بالاکوٹ، گڑھی حبیب اللہ و مظفر آباد

جناب سلیم خان صاحب صدر مرکزی سیرت کمیٹی گڑھی حبیب اللہ کی دعوت پر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ۴ اور ۵ اپریل ۱۹۸۴ء کو بالاکوٹ، گڑھی حبیب اللہ اور مظفر آباد کا دورہ کیا۔

اس دورے کے پہلے مرحلے میں محترم امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ۴ اپریل کو صبح قریباً ۸ بجے راولپنڈی سے ایبٹ آباد پہنچ گئے۔ ایبٹ آباد میں کچھ دیر آرام فرمانے اور مقامی رفقاء سے ملاقات کے بعد ڈاکٹر صاحب مع قمر سعید قریشی صاحب قیم تنظیم اسلامی، محمد احمد صاحب، اشرف صاحب، ڈاکٹر جمیل اختر راجپوت صاحب، خالد وحید صاحب، عبدالقیوم صاحب، محمد جمیل خان صاحب اور سلیم خان صاحب صدر مرکزی سیرت کمیٹی گڑھی حبیب اللہ تقریباً دس بجے صبح بالاکوٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ اسی قافلے میں ایک اور دوست جناب شیر افگن صاحب بھی مانسہرہ سے شامل ہو گئے۔ سوا بارہ بجے یہ قافلہ بالاکوٹ پہنچ گیا۔ جہاں مقامی علماء اور دوسرے حضرات نے ایک خوبصورت جگہ پر واقع خوبصورت پارک ہوٹل میں ڈاکٹر صاحب کا خیر مقدم کیا۔

پارک ہوٹل کے لاؤنج میں ہی متعدد حضرات نے جن میں مقامی علماء اور دوسرے حضرات شامل تھے، ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی اور مختلف امور پر تبادلۂ خیالات کیا۔ ڈیڑھ بجے دن ایک پُرتکلف کھانے کا اہتمام ہوا جس کے بعد ڈاکٹر صاحب مرکزی جامع سید احمد شہیدؒ مسجد روانہ ہوئے جہاں بعد از نمازِ ظہر ڈاکٹر صاحب نے تحریک شہیدین بالاکوٹ

کے پس منظر میں ایک مفصل بیان دیا۔ اس بیان کا موضوع جہاد تھا اور یہ بیان تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہا۔ جس کے دوران ہی نمازِ عصر پڑھی گئی۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان سننے کے لئے مختلف طبقہ ہائے فکر کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ بیان کے بعد سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع ہوا۔ بہت سے حضرات نے بڑی اہم نوعیت کے سوالات لکھ کر پیش کئے جن کے جوابات ڈاکٹر صاحب نے نہایت مدلل طور پر دیئے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتب اور کیسٹس لوگوں نے بڑے جوش و جذبے سے خریدیں اور اچھی خاصی تعداد میں کتب اور کیسٹس فروخت ہوئیں۔ اس مجلس کے بعد چائے کا اہتمام کیا گیا تھا

بالاکوٹ سے تقریباً سوا چھ بجے شام گڑھی حبیب اللہ کے لئے روانہ ہوئے۔ مغرب کی نماز راستہ میں پڑھی گئی۔ گڑھی حبیب اللہ میں قیام کا انتظام خان آف گڑھی کے مہمان خانہ میں تھا۔ وہیں کچھ دیر آرام کرنے اور رات کا کھانا کھانے کے بعد قریب ہی ایک نو تعمیر بڑی اور خوبصورت مسجد میں عشاء کی نماز پڑھی گئی۔ نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب نے "اسلام میں جماعت کے قیام اور اس کے لوازم و شرائط" کے موضوع پر تقریر کی۔ شروع میں حاضری بہت زیادہ نہ تھی البتہ بعد میں لوگ آنا شروع ہو گئے اور آہستہ آہستہ مسجد کا ہال بھر گیا۔ یہ خطاب تقریباً رات گیارہ بجے تک جاری رہا۔

۵ اپریل کو صبح ایبٹ آباد کے دو نئے اصحاب، جناب عبدالقیوم صاحب اور شیر افگن صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پر تنظیم میں شمولیت کی بیعت کی۔ اس طرح ایبٹ آباد میں تنظیم کے رفقاء کی تعداد چھ ہو گئی ہے۔ جس کے بعد محترم امیر تنظیم اسلامی نے خالد وحید صاحب کو مقامی تنظیم کا ناظم مقرر کر دیا۔

مظفر آباد روانگی سے قبل جناب ڈاکٹر صاحب نے مقامی رفقاء سے تنظیم کے انتظامی امور پر تبادلۂ خیال کیا اور جناب قمر سعید قریشی صاحب قیم تنظیم اسلامی نے بھی مختلف امور کے بارے میں ہدایات دیں۔ ایبٹ آباد سے ایک اور رفیق جناب محمد حنیف صاحب بھی گڑھی حبیب اللہ پہنچے۔

نو بجے صبح تمام مذکورہ اصحاب ڈاکٹر صاحب کی معیت میں مظفر آباد کے لئے روانہ ہوئے اور پونے دس بجے یہ مختصر قافلہ یونیورسٹی کالج مظفر آباد پہنچ گیا۔ جہاں کالج کے ڈین اور دوسرے اساتذہ و طلبہ کے نمائندوں نے ڈاکٹر صاحب کا خیر مقدم کیا۔ کالج کی بزمِ ادب نے یونیورسٹی کالج کے ہال میں مجلس کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس مجلس میں اساتذہ، علماء، دانشوروں اور طلبہ و طالبات کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ تلاوت یونیورسٹی کے ایک پروفیسر (جو کہ سعودی عرب سے تعلق رکھتے ہیں) نے کی۔ اُن کی خوش الحان تلاوت نے روح میں ایک تازگی سی رچا دی۔ تلاوت کے بعد جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے خطاب کیا۔ خطاب نہایت پُرتاثیر تھا۔ جس میں تحریک پاکستان، اتحاد بین المسلمین اور نظام نفاذِ اسلام پر تفصیلی گفتگو کی گئی۔ یہ تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے جاری رہی جس کے بعد سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت وضاحت کے ساتھ سوالات کے جوابات دیئے۔

تقریر کے بعد ڈین صاحب کے کمرے میں چائے کا اہتمام تھا۔ جہاں ڈاکٹر صاحب نے علماء اور دوسرے حضرات سے تبادلۂ خیالات بھی کیا۔ قریباً ایک بجے ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کالج سے مع رفقاء رخصت ہوئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنے لاہور کے رفقاء کے ساتھ مظفر آباد سے لاہور براستہ مری، راولپنڈی روانہ ہو گئے اور ایبٹ آباد کے رفقاء براستہ گڑھی حبیب اللہ واپس روانہ ہو گئے۔

مرتب: ناظم ایبٹ آباد

(بقیہ عرض احوال)

وساری ہو اور اس میں اللہ کے دین پر مبنی نظامِ عدل و قسط بالفعل قائم ہو۔ چنانچہ سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۵ میں رسولوں کی بعثت اور ان کے ساتھ کتاب و میزان (شریعت الٰہی) کے انزال کی غرض و غایت اسی نظامِ عدل و قسط کا قیام بیان فرمایا گیا ہے۔ پھر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی شان بھی یہی اظہار دین الحق بیان ہوئی ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ آج ہمارا دین ایک مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے دنیا کے کسی بھی گوشے میں غالب و نافذ نہیں ہے۔ تنظیم اسلامی اسی مقصد کی جدوجہد کے لیے قائم کی گئی ہے۔ یہی مقصد ہے جس کے لیے یہ قافلہ ترتیب دیا جا رہا ہے۔ لہذا ایسی جماعت یا تنظیم کے سالانہ اجتماعات دینی اعتبار سے جس اہمیت کے حامل ہو سکتے ہیں اس کا صحیح احساس ہر رفیق بادنیٰ تأمل خود کر سکتا ہے۔

جس طرح ایک صاحب بصیرت شخص کے لیے اس کی انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر میں اس کا شعور ذات ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح کسی اصولی، نظریاتی اور انقلابی جماعت کی صحت، استحکام اور اس کے صحیح رخ پر ترقی کے لیے اس جماعت کے ہر رفیق میں شعور جماعت بلکہ جماعت کے مقصد کا شعور ہونا لازم ہے۔ جس ہیئتِ اجتماعیہ کے رفقاء کے ذہنوں میں مقصدِ جماعت یا جماعتی نصب العین کا شعور مضمحل ہو جاتا ہے، وہ جماعت اپنے مقصد و مطلوب کی جانب پیش قدمی کرنا تو در کنار ملک و قوم اور دین کے لیے فتنہ بن سکتی ہے۔ لہذا اس اعتبار سے بھی ضروری ہے کہ ہر اسلامی تنظیم یا جماعت کے وابستگان سال میں کم از کم ایک مرتبہ جمع ہو کر اپنے مقصد کی شعوری تجدید کے ساتھ اپنی تنظیمی سرگرمیوں پر بھی ایک ناقدانہ نگاہ ڈالیں۔ اور صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب کریں اور اللہ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر اپنے ہدف کی طرف پیش قدمی کے لیے نیا جوش و ولولہ اور عزم مصمم لے کر اپنے گھروں کو لوٹیں۔

مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے چھٹے محاضراتِ قرآنی کی تین نشستوں میں صدر مؤسس انجمن اور امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد نے "جہاد بالقرآن" اور اسلامی انقلاب کے لیے! التزام جماعت اور مسئلہ بیعت جیسے اہم موضوعات پر خطاب فرمایا۔ یہ نشستیں برصغیر پاک و ہند کی معروف دینی و علمی شخصیت مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ العالی ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی و رکن مجلسِ شوریٰ دار العلوم دیوبند کے زیرِ صدارت منعقد

میں صدر موصوف کے علاوہ ان نشستوں میں دیگر جید علماء اور اصحاب دانش و بینش بھی موجود تھے امیرِ تنظیم نے تمام اہلِ علم حضرات کو پورے خلوص کے ساتھ دعوت دی، کہ قرآن مجید اور سیرت مطہرہ کے معروضی مطالعہ سے دینی فرائض کے جس جامع تصور اور نتائج تک وہ پہنچے ہیں ان کو اختصار کے ساتھ انہوں نے بیان کرنے کی کوشش کی۔ اگر ان کے غور و فکر، استنباط اور استدلال میں کوئی غلطی ہو تو اسے ان پر دلائل کے ساتھ واضح کی جائے۔ ایسی صورت میں وہ پورے خلوص کے ساتھ اس پر غور کریں گے اور اگر ان کا قلب و ذہن اس غلطی پر مطمئن ہو گیا تو ان شاء اللہ وہ اس کا برملا اعتراف و اعلان کریں گے۔ الحمد للہ تا حال ان تقاریر کے موقع پر شریک اہلِ علم کی جانب سے کسی غلطی کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ بلکہ ہماری معلومات کی حد تک تمام ہی حضرات نے اصولی طور پر امیر محترم کے موقف کی تصویب ہی کی۔ امیر محترم کے یہ خطابات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ لہذا کوشش کی جا رہی ہے کہ تنظیم اسلامی کے آٹھویں سالانہ اجتماع تک یہ دونوں خطاب کتابی صورت میں شائع ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو مشکور فرمائے۔ مزید برآں ان محاضرات میں جو بیش قیمت مقالہ جات پیش ہوئے تھے ان شاء اللہ وہ بالترتیب ماہنامہ حکمتِ قرآن کی زینت بنتے رہیں گے جو انجمن کا ترجمان ہے۔

عرصہ دراز سے میثاق میں طویل مضامین کا سلسلہ جاری ہے جن کو بالاقساط شائع کرنا ناگزیر ہو گیا ہے لیکن بعض اوقات چند ضروری، اہم اور فوری اشاعت کے متقاضی مضمون کی وجہ سے ان مسلسل مضامین میں سے کسی کی قسط رد کرنی بھی پڑ جاتی ہے۔ جس پر خود ادارے کو بھی ایک قسم کی ذہنی کوفت ہوتی ہے لہذا قارئین میثاق کو بھی یقیناً اس کوفت سے سابقہ پیش آتا ہوگا۔ جس پر ہم اپنے جملہ قارئین کی خدمت میں معذرت پیش کرتے ہیں۔ گزشتہ ماہ کے شمارے میں اس ادارے کا اظہار کیا گیا تھا کہ ۲۳ مارچ / ۸۴ کو "اسلام اور پاکستان" کے موضوع پر امیر محترم نے جو خطاب فرمایا تھا اس کے چیدہ چیدہ حصے آئندہ شمارے میں پیش کیے جائیں گے۔ لیکن اس کا موقع میسر نہ آسکا۔ ویسے اس موضوع پر اہم مباحث "اسلام اور پاکستان" نامی کتاب میں شامل ہیں۔ اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو کسی آئندہ شمارے میں چند اہم نکات پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

عطیہ: حاجی محمد سلیم

حاجی شیخ نور الدین اینڈ سنز لمیٹڈ (Exporters)

نمبر ۳۰۱، لنڈا بازار، لاہور ۳۰۶۴۲۸ / ۳۰۵۴۲۶

قارئین متوجہ ہوں!

ماہنامہ حکمتِ قرآن کا سالانہ زرِ تعاون اندرونِ ملک ۲۰/- روپے ہے جبکہ دوسرے ممالک کے لئے زرِ تعاون حسبِ ذیل ہے:

کینیڈا ۱۵۰/- روپے یا ۱۵ کینیڈین ڈالر

امریکہ، افریقہ، مغربی جرمنی، نائیجیریا ۱۵۰/- روپے یا ۱۲ امریکن ڈالر

انگلینڈ، ناروے، متحدہ عرب امارات ۱۰۰/- روپے

سعودی عرب، ابوظہبی، مصر، ایران ۶۰/- روپے

انڈیا ۸۰/- روپے

پاکستان کے دیگر شہر جہاں تنظیم کی ذیلی شاخیں قائم ہیں وہاں میثاق درج ذیل پتوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

★ پشاور: دفتر تنظیم اسلامی۔ نثار بلڈنگ پل پختہ نزد چوک یادگار، پشاور

★ ملتان: عبدالغنی صاحب، ملتان پولٹری کارنر۔ بالمقابل فاطمہ جناح ہسپتال ملتان۔ فون ۷۵۸۹۱

★ کوئٹہ: دفتر تنظیم اسلامی جناح روڈ کوئٹہ اور قاری افتخار احمد صاحب خطیب مسجد طوبیٰ مسجد روڈ کوئٹہ۔ فون ۷۷۶۹۰

★ کراچی: داؤد منزل۔ نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون ۲۱۳۷۰۹

★ راولپنڈی: یزی لینڈ اسکول ۱-E-۱۴۰ - راولپنڈی سٹلائٹ ٹاؤن فون ۴۳۷۳۶

★ گوجرانوالہ: جناب پاشا ہارون برکی، بی - ۸۱ ۵ - سٹلائیٹ ٹاؤن

★ سیالکوٹ: جناب محمد منیر اقبال - معرفت وحید کلینک چوک کوٹلی بہرام فون ۲۲۴۱۳

★ وہاڑی: ڈاکٹر منظور حسین منظور محمدی ہسپتال - X - ۱۷ - بلاک پیپلز کالونی

★ ایبٹ آباد: خالد وحید صاحب C-۱۷۴۹ اسول لائنز۔ فون ۲۳۰۳، ۴۴۲۹

★ فیصل آباد: دفتر تنظیم اسلامی بالمقابل گورنمنٹ رحمانیہ ہائی سکول (مکان حاجی عبدالواحد قیم تنظیم) پیپلز کالونی۔ فون ۳۰۹

عن عبد الله بن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم
السمع والطاعة
على المرء المسلم فيما احب وكره ما لم يؤمر بمعصية

روحِ فکر
قطرے میں سمندر اور ذرّے میں کائنات دیکھنا اب صرف
تصوراتی بات نہیں رہی۔
صدیوں سے علم و حکمت کے تجرباتی تسلسل نے ذرّوں کے جگر
چاک کرکے کائناتوں کا ایسا نظام دریافت کرلیا ہے جس کی بشارت
ہمارے دینِ مبین نے اب سے چودہ سو سال پہلے دی تھی۔
تسخیرِ کائنات کا مسئلہ مومن کے لیے آسمانی دعوتِ عمل بھی ہے
اور ارضی چیلنج بھی۔
چاند ستاروں کو فتح کرنا ازل ہی سے ہمارا مقدر بنا دیا گیا ہے۔ لیکن
اس کے لیے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی میں مہارت کی انتہائی
بلندیاں حاصل کرنی ہیں جو حصولِ علم کے بغیر ناممکن ہے۔
آیئے کوشش کریں کہ یہ مہم ہماری نسل سے آغاز ہو۔
رُوحِ سائنس کو سمجھیے۔

PEPSI

MIRINDA

ان شاء اللہ العزیز

حسبِ اعلان

تنظیمِ اسلامی پاکستان

کا

آٹھواں سالانہ اجتماع

۲۵ تا ۳۰ مئی ۱۹۸۴ء

قرآن اکیڈمی

۳۶ - کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

میں منعقد ہوگا

- توقع ہے کہ رفقاء تنظیم نے اجتماع میں اپنی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے مناسب اہتمام کر لیا ہوگا۔
- سالانہ اجتماع کی پہلی نشست کا آغاز چونکہ ۲۵ مئی ۱۹۸۴ء بعد نمازِ مغرب ہوگا لہٰذا مناسب ہوگا کہ رفقاء ۲۵ مئی کو نمازِ جمعہ مسجد دارالسلام میں ادا کریں اور وہاں سے قرآن اکیڈمی تشریف لے آئیں۔

Regd. L. No. 7360

MONTHLY "MEESAQ" LAHORE

Vol. 33 | MAY 1984 | No. 5

وَقَدْ اَخَذَ مِيثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ

PEPSI

MIRINDA

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۳۳ | شمارہ: ۶ | رجب المرجب ۱۴۰۴ھ مطابق جون ۱۹۸۴ء

مشمولات

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زر تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی
فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

آپ کے احباب کے لیے بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

"مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفۃً پیش کیجیے

دورانِ ماہِ رمضان اہل و عیال اور اعزہ و اقارب کے ساتھ اجتماعی مطالعہ کیجیے!

(نوٹ) اس کتابچے کا انگریزی اور عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، فارسی ترجمہ زیرِ طباعت ہے۔
اس کے حقوقِ اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے!

شائع کردہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴ - فون: ۸۵۲۶۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل الرحمٰن

عرضِ احوال

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

بفضلہ تعالیٰ وعونہٖ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ مطابق جون ۱۹۸۴ء کے میثاق کا شمارہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش ہے۔ 'میثاق' کا اجراء جون ۱۹۵۹ء کو عمل میں آیا تھا۔ اس اعتبار سے اس شمارے سے دعوتِ اسلامی کا یہ نقیب پوری ایک ربع صدی کا عرصہ طے کر کے اب چھبیسویں (۲۶) سال میں قدم رکھ رہا ہے ـــــ پرچہ جہاں تائید و نصرتِ الٰہی اور رفقاء کی سعی و محنت سے صوری و معنوی ۔۔۔ لحاظ سے ترقی پذیر ہے' وہاں اس کی اشاعت میں بھی بحمد اللہ ہر ماہ اضافہ ہو رہا ہے۔ عموماً جرائد کی تعدادِ اشاعت کے اظہار سے گریز کیا جاتا ہے لیکن ہم اس کے اظہار میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ اب الحمد للہ اشاعت سات ہزار سے تجاوز کر گئی ہے۔ توقع ہے کہ اگر قارئین میثاق کا تعاون اور رفقاء کی جدوجہد اسی طرح جاری رہی تو ان شاء اللہ ۱۹۸۴ء کی جلد کے خاتمے تک دعوتِ اسلامی کے اس علمبردار کی اشاعت دس ہزار سے تجاوز کر جائے گی۔ اس دور میں تفریحی جرائد و رسائل جس کثیر تعداد میں شائع ہو رہے ہیں' اس کے اعتبار سے میثاق کی تعدادِ اشاعت قابلِ ذکر محسوس نہ ہو لیکن ہمارے لئے یہ بات اس اعتبار سے باعثِ طمانیت ہے کہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کے متدین' فہیم اور اہلِ دانش و بینش کے طبقہ میں جو سنجیدہ لٹریچر پڑھتا اور اس پر غور و فکر کرتے ہیں' خالص دینی دعوت اور اسلامی فکر کے معاشرے میں ٹھوس بنیادوں پر نفوذ کی رفتار کیا ہے!

ہمارے لئے یہ امر بھی شکرِ الٰہی کا موجب ہے کہ اس کے خاص فضل و کرم سے مرکزی انجمن خدام القرآن اور تنظیمِ اسلامی کے مطبوعات کی اشاعت بھی جو زیادہ تر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب' صدر مؤسس انجمن اور امیرِ تنظیمِ اسلامی کی تالیفات یا ان کے دروس و خطابات پر مشتمل ہیں' بحمد اللہ روز افزوں ہے۔ ایک دور وہ تھا کہ کسی کتاب کے ایڈیشن کو دو ہزار طبع کراتے وقت ڈر لگتا تھا کہ پتہ نہیں یہ ایڈیشن کتنے عرصے میں نکل سکے گا اور کتنے عرصہ سرمایہ جامد رہے گا۔ یہی احساس ڈاکٹر صاحب موصوف کے دروس و خطابات کے کیسٹ تیار کراتے وقت تھا۔ لیکن الحمد للہ دعوتی تالیفات اور امیرِ محترم کے کیسٹوں کی طلب نہ صرف اطمینان بخش بلکہ انتہائی

حوصلہ افزا ہے۔ اس سے بھی اسلام کے انقلابی فکر کے نفوذ کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ وہ تو سرمایہ کی کمی آڑے آجاتی ہے، ورنہ اب ماشاء اللہ امیر محترم کے خطابات و دروس کی ہر کتاب اس امر کی متقاضی ہے کہ ہر ایڈیشن کم از کم دس ہزار کی تعداد میں شائع ہوا کرے۔

اسی تذکرے میں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ انجمن اور تنظیم اسلامی کے مکتبوں سے شائع ہونے والی ڈاکٹر صاحب موصوف کی کسی کتاب کی کسی نوع کی کوئی رائیلٹی ادا نہیں کی جاتی۔ بلکہ ہر کتاب پر اب باقاعدہ یہ نوٹ تحریر ہوتا ہے کہ " اس کتابچے کی طباعت و اشاعت کی ہر شخص کو کھلی اجازت ہے"۔ امیر محترم کی ہر تالیف و تصنیف ہوا اور پانی کی طرح عام ہے۔ جو شخص یا ادارہ چاہے اسے اپنے طور پر جس طرح چاہے شائع کرنے کا مجاز ہے ـــــ موجودہ مارکیٹ کے لحاظ اور دعوتی اعتبار سے ہر کتاب کی قیمت کم سے کم رکھی جاتی ہے اور منافع کا دخل آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں ہوتا۔ یہی صورت حال ڈاکٹر صاحب موصوف کے کیسٹوں کی ہے۔ ان کی بھی کوئی رائیلٹی ادا نہیں کی جاتی۔ اس میں جو بچت ہوتی ہے وہ نشر القرآن کیسٹ سیریز کی توسیع پر ہی لگ جاتی ہے اور یہ اس ادارے ہی کی ملک رہتی ہے ـــ مزید یہ کہ مرکزی انجمن اور تنظیم اسلامی کی کلیدی ذمہ داریوں پر جو حضرات فائز ہیں، ان میں سے اکثر حضرات اپنا پورا وقت اور بعض حضرات اپنی جز وقتی خدمات اعزازی طور پر صرف رضائے الٰہی کے لئے دے رہے ہیں۔

رجب المرجب ۱۴۰۰ھ کا آخری ہفتہ قرآن اکیڈمی میں علم و حکمت کے انوار کی بارش کا باعث ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا حسین علیؒ (واں بھچراں والے) اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے شاگرد رشید مولانا محمد طاہر مدظلہٗ (پنج پیر والے) نے جمعہ ۲۷ اپریل کی شام سے مختصر 'دورۂ قرآن' اور 'سُوَرِ قرآنی کے باہمی ربط و تعلق' پر اپنے درس کے سلسلہ کا آغاز فرمایا۔ ۲۸ اپریل سے یکم مئی تک یہ مجالس صبح و شام جاری رہیں۔ جبکہ ۲ مئی کو صرف صبح کی مجلس ہوئی۔ ہر مجلس چار گھنٹے کے وقت پر محیط ہوتی تھی۔ الحمد للہ مولانا مدظلہ العالی نے اس مختصر سے وقت میں جامعیت کے ساتھ تفویض کردہ اہم کام انجام دے لیا اور دورۂ قرآن مجید کی تکمیل فرمادی۔ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی عمر دراز کرے اور انہیں صحت و عافیت کے ساتھ قرآن حکیم کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے ـــــ ۲۷ اپریل کو مولانا موصوف نے جامع القرآن، قرآن اکیڈمی میں قبل از جمعہ خطاب بھی فرمایا اور صلوٰۃ جمعہ بھی پڑھائی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولانا موصوف کا مختصر تعارف بھی کرا دیا جائے۔

مولانا محترم ایک جید عالم دین اور مبلغ توحید ہیں۔ ۲۴ء میں دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے ۳۵ء میں مکہ مکرمہ میں ایک سال تک مولانا عبید اللہ سندھی سے قرآن مجید کے درس کا فیض حاصل کیا۔ چند دینی مدارس میں درس و تدریس کے بعد اپنے گاؤں پنج پیر جو سرحد کے علاقہ میں 'جہانگیرہ' سے صوابی کے راستہ پہ ہے، وہاں مولانا موصوف نے ایک دینی مدرسہ قائم کیا ہوا ہے۔ مولانا عربی کے اعلیٰ پائے کے انشاء پرداز ہیں ان کی اکثر تصانیف عربی میں ہیں۔ مولانا کا اصل ہدف توحیدِ خالص کی دعوت و تبلیغ اور مبتدعانہ و مشرکانہ عقائد و افعال کا ابطال اور بیخ کنی ہے۔ موصوف جماعت توحید والسنّتہ کے امیر بھی ہیں۔ مولانا اور جماعت کی مساعی سے موضع پنج پیر اور گرد و نواح کے ماحول میں خصوصاً اور دور دراز کے علاقوں میں عموماً توحیدِ خالص نے مضبوط بنیادوں پر جڑ پکڑ لی ہے۔ مولانا کافی ضعیف ہیں۔ اندازہ ہے کہ پچھتر سال سے زیادہ عمر ہوگی لیکن ہمت و حوصلہ جواں ہے اور نوجوانوں کے لئے قابلِ رشک اور پیروی ہے۔

جس وقت میثاق کا یہ شمارہ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا تو اس وقت تک رمضان المبارک کا وہ مہینہ سایہ فگن ہو چکا ہوگا یا ہونے والا ہوگا جس کی خبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے ایک مہینے کے آخری دن ایک خطبہ میں دی تھی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "لوگو! تم پر ایک عظمت و برکت والا مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے۔ اس کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس کے روزے فرض ہیں۔ رات کا قیام نفل ہے۔ اس مہینہ میں نوافل پر دوسرے مہینوں کے فرض کے برابر اور فرائض پر ستر فرضوں کے برابر ثواب ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے۔ صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے...... اس مہینے کے پہلے عشرے میں رحمت ہے۔ دوسرے عشرے میں مغفرت ہے اور آخری عشرے میں دوزخ سے آزادی ہے۔ یہ برکاتِ الٰہی کا مہینہ ہے۔ قرآن مجید نے اس مہینہ کی خصوصیت "تقویٰ" قرار دی ہے۔ اور نبی اکرمؐ نے بشارت دی ہے کہ جس نے رمضان کے روزے ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے۔ اور جس نے رمضان کی راتوں میں قیام کیا ایمان و احتساب کے ساتھ تو اس کے تمام پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ایمان اور احتساب روزے کے لئے لازمی شرائط ہیں۔ دراصل یہ تقویٰ ہی کی شرح ہے۔ "تقویٰ" مستلزم ہے ایمان و احتساب کو۔ جب یہ یقین ہو کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جو اپنی ذاتِ اقدس

اور صفات کمال میں تنہا و یکتا ہے اور آخرت میں ہر ذی نفس کو اس کے حضور میں محاسبے کے لئے کھڑا ہونا ہوگا تو اس کے دل میں اللہ کی نافرمانیوں سے بچنے کے لئے ایک مضبوط قوت ارادی پروان چڑھے گی۔ یہی مفہوم ہے اس آیت مبارکہ کا: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۔ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝

روزے کی یہ ایک اہم برکت ہے کہ وہ انسان کی قوت ارادی کی نہایت احسن طریق سے تربیت کرتا ہے۔ چونکہ نفس کے منہ زور گھوڑے کو لگام دینے کے لئے بڑی مضبوط قوتِ ارادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر روزے کے رکن کو ان تمام شرائط کے ساتھ بجا لایا جائے جو شریعت حقہ نے مقرر کی ہیں تو ایسے مسلمان کو اگلے گیارہ مہینے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور تقویٰ کی وہ مشق حاصل ہو جاتی ہے جو اس کی سیرت کی صحیح تعمیر کے لئے ضروری ہے۔

اس مہینہ میں مسلمان کا دل خواہی نخواہی طور پر دین کی طرف راغب ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر رفقاء اس مہینہ میں اضافی طور پر یہ بوجھ بھی اٹھائیں کہ زیادہ سے زیادہ حضرات سے رابطہ قائم کر کے ان کو دعوت رجوع الی القرآن اور تحریک تجدید ایمان ۔ توبہ ۔ تجدید عہد کا لٹریچر پہنچائیں تو انشاء اللہ یہ کام ان کی نیکیوں میں اضافہ کا باعث ہوگا لیکن یہ کام ایمان واحتساب کے ساتھ روزے رکھنے اور "قیام لیل" ...... میں حارج نہیں ہونا چاہئے۔ ہر چیز کا مقام و محل ہے اس کے اعتبار سے ہمیں اپنے معمولات میں نظر رکھنی چاہئے۔

یوں تو رمضان المبارک برکات کا مہینہ ہے۔ جہاں اکثر جگہ اس کی آمد کی بہاسے زیادہ پذیرائی ہوتی ہے وہاں قرآن اکیڈمی میں بھی اس بابرکت ماہ کی خوب پذیرائی ہوتی ہے اور علم وعرفان کے انوار کی بارش ہوتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ امیر محترم کا عموماً یہ معمول رہا ہے کہ تراویح کے ساتھ ساتھ موصوف تلاوت کردہ حصے کے اہم مطالب و مفاہیم پر روشنی ڈالا کرتے ہیں۔ امسال امیر محترم کا ارادہ ہے کہ وہ ہر پارے کا رواں ترجمہ کیا کریں گے اور اہم آیات کی مختصر تشریح بھی ـــــ پہلے بھی قرآن اکیڈمی میں تراویح کی نماز بارہ بجے شب کے قریب ختم ہوتی تھی۔ اگر ڈاکٹر صاحب کا یہ سلسلہ شروع ہوا تو ڈیڑھ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ گویا اکیڈمی میں رمضان المبارک کی ہر شب بیداری میں گزرے گی۔

تنظیم اسلامی کا آٹھواں سالانہ اجتماع ۲۵ تا ۳۰ مئی کو لاہور میں منعقد ہو رہا ہے۔ کوشش کی

جارہی ہے کہ یہ شمارہ اجتماع کے اختتام سے قبل طباعت کے مراحل سے گزر کر پریس سے آجائے۔ اسی طرح اس امر کی بھی بھرپور کوشش ہو رہی ہے کہ امیر محترم کے خطابات پر مشتمل تین نئی مطبوعات بھی اجتماع کے موقع پر پریس سے آجائیں۔ ایک کتاب امیر محترم کے خطاب "اسلام میں عورت کا مقام" پر مشتمل ہے۔ یہ خطاب مئی ۸۲ء میں "میثاق" کی اشاعتِ خصوصی میں شائع ہو چکا ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ اس کو اتنا قبولِ عام حاصل ہوا کہ اس اشاعت خصوصی کا دوسرا ایڈیشن بھی طبع کرانا پڑا۔ یہ پرچہ دفتر میں ختم ہوئے عرصہ ہو گیا لیکن اس کی مانگ برابر آرہی تھی۔ لہٰذا اب اسے کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں امیر محترم کے خطاب کے علاوہ چند دوسری مفید چیزیں بھی شامل ہیں۔ "اسلام میں عورت کا مقام" وقت کا سب سے زیادہ زیر بحث، نازک اور اہم مسئلہ ہے۔ توقع ہے کہ جو لوگ بھی خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کو سمجھنا چاہیں گے ان کے لئے ان شاء اللہ اس کتاب کا مطالعہ انتہائی مفید رہے گا۔ دعوتی نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ طبقے بالخصوص اپنی ان دینی بہنوں تک پہنچایا جائے جو یا تو معاشرے کے دباؤ میں یا مغالطوں میں آکر اس معاملہ میں تذبذب کی شکار ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ان شاء اللہ ان پر یہ امر واضح ہو جائے گا کہ صنف نازک پر اسلام نے کتنے عظیم احسانات کئے ہیں اور ان پر ان کی جسمانی ساخت اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے ایک اسلامی معاشرے میں کتنا بلند و اعلیٰ اور ارفع و باوقار مقام عطا کیا ہے۔ اور معاشرت کا وہی شعبہ ان کے سپرد کیا گیا ہے جو عین ان کی فطری ساخت اور ذہنی افتاد سے کامل موافقت و مطابقت رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ "مساواتِ مرد و زن" کا نعرہ درحقیقت ان کو مغالطہ دے کر ان کے کاندھوں پر وہ بوجھ بھی لادتا ہے جس کی فاطر فطرت کی طرف سے وہ ہرگز مکلف نہیں ہیں۔

دوسری کتاب امیر محترم کے خطاب بعنوان "دینی فرائض کا جامع تصوّر" پر مشتمل ہے موصوف نے قریباً دو سال قبل کراچی میں مسلسل پانچ دن میں سورہ حدید مکمل اور سورہ صف مکمل کا درس دیا تھا۔ اس پروگرام کی تکمیل جمعرات کو ہوئی تھی۔ متصلاً جمعہ کے دن امیر محترم نے مندرجہ بالا موضوع پر اجتماع جمعہ میں ایک مختصر لیکن جامع خطاب ارشاد کیا تھا۔ جو اسی زمانے میں کیسٹ سے منتقل کر لیا گیا تھا۔ امیر محترم کا ارادہ تھا کہ وہ اس موضوع پر ایک مقالہ تحریر فرمائیں گے۔ اس کی ایک قسط انہوں نے تحریر بھی کر لی تھی جو محاضراتِ قرآنی کے خصوصی اجلاس منعقدہ اکتوبر ۱۹۸۳ء میں پیش بھی کی گئی تھی لیکن دوسری قسط کی تحریر

کی نوبت تاحال نہیں آئی ۔ یہ خطاب میثاق میں بھی تاحال شائع نہیں ہوا تھا۔ اس خطاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زبان اور طرزِ استدلال بہت عام فہم ہے ۔ لہٰذا اسے بھی کتابی شکل میں شائع کرنے کے انتظامات ہو رہے ہیں ۔

تیسری کتاب امیر محترم کے اس خطاب پر مشتمل ہے جو موصوف نے محاضراتِ قرآنی منعقدہ مارچ ۱۹۸۴ء کی پہلی نشست میں "جہاد بالقرآن" کے موضوع پر ارشاد فرمایا تھا۔ یہ خطاب امیر محترم کے ان خطابات میں سے ایک ہے جن میں اندازِ خطابت، فصاحت و بلاغت اور طرزِ استدلال نہایت مؤثر ہیں ۔ ان شاء اللہ یہ خطاب تنظیم اسلامی کی مطبوعات میں ایک قیمتی اضافہ شمار ہو گا اور دعوتِ اسلامی کے تعارف اور توسیع کے لئے ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہو گا ۔ اسی خطاب کی دوسری کڑی "اسلامی انقلاب کے لئے التزام جماعت اور مسئلہ بیعت" کے موضوع پر امیر محترم کی وہ تقریر ہے جو موصوف نے اس محاضرات کی تیسری نشست میں کی تھی ۔ ارادہ تھا کہ یہ خطاب بھی کیسٹ سے منتقل ہو کر تنظیم اسلامی کے آٹھویں سالانہ اجتماع کے موقع پر منصّۂ شہود پر آ جائے لیکن وقت بھی مختصر تھا اور خوشنویس حضرات کی دستیابی بھی مسئلہ بنی ہوئی تھی ۔ لہٰذا اس ارادے کے باوجود یہ کام انجام نہ پا سکا ۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو یہ خطاب کتابی شکل میں شوال کے اختتام تک شائع ہو جائے گا ۔

امیر محترم ہندوستان حیدر آباد دکن کے دعوتی دورے پر ۹ اپریل کو عازم سفر ہوئے تھے اور ۲۵ اپریل کو مراجعت ہوئی تھی ۔ ۲۷ اپریل کے اجتماع جمعہ میں امیر محترم نے اس دورے کے تأثرات و مشاہدات پر اظہار خیال فرمایا ۔ ساتھ ہی قادیانیوں سے متعلق اس صدارتی آرڈی ننس پر بھی تبصرہ کیا جو اسی روز کے اخبارات میں شائع ہوا تھا ۔ مزید برآں چونکہ جمعہ کو ۲۴ رجب کی تاریخ تھی جس کے تین دن بعد شب معراج تھی ۔ لہٰذا اختصار کے ساتھ موصوف نے اس محیر العقول واقعہ پر بھی روشنی ڈالی ۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تقریر کیسٹ سے منتقل کر کے "تذکرہ و تبصرہ" کے عنوان سے اسی شمارے میں پیش کی جا رہی ہے ۔ ہندوستان کے اس دورے میں امیر محترم کے فرزند رشید میاں ڈاکٹر عارف رشید سلمہ ان کے ساتھ تھے ۔ وہ اس دورے کی تفصیلی روداد لکھ رہے ہیں، کوشش ہے کہ وہ اسی شمارے میں شامل ہو جائے ــــ امیر محترم ۵ مئی کو اپنی اہلیہ محترمہ اور اپنے دوسرے فرزند اور راقم کے

رفیق کار میاں حافظ عاکف سعید سلمہٗ کے ساتھ عمرے اور دعوتی دورے پر سعودی عرب تشریف لے گئے ہیں۔ اس مرتبہ امیر محترم کے پاس Visa - Visit ہے۔ لہٰذا عمرے اور مسجد نبوی میں حاضری کی سعادت کے ساتھ ہی ان شاء اللہ سعودی عرب کے بعض مشہور شہروں میں دعوتی پروگرام بھی ہوں گے۔ ۲۰ مئی کو واپسی کا پروگرام ہے۔ اللہ تعالیٰ امیر محترم کو صحت کے ساتھ اپنی حفظ و امان میں رکھے تاکہ دعوت کی توسیع کا کام جاری رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس طرح دعوتی سرگرمیوں میں مصروف و مشغول ہیں، وہ بظاہر احوال نہایت ہی صبر آزما ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی توفیق اور جذبہ صادق ڈاکٹر صاحب کو عطا نہ ہوا ہوتا تو یہ کام آسان نہ رہتا۔ امام ترمذیؒ اور امام دارمیؒ نے اپنی مرتب کردہ مجموعہ احادیث میں سند صحیح کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے جس میں مہبط وحی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کی عظمت، اس کا مقام، اس کا مرتبہ و رتبہ واضح فرمایا ہے۔ اس حدیث کے آخر میں نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: من قال بہٖ صدق ومن عمل بہٖ اجر ومن حکم بہٖ عدل و من دعا الیہ ھدی الیٰ صراط مستقیم ط " جس نے قرآن کے مطابق بات کہی اس نے سچی بات کہی، اور جس نے قرآن پر عمل کیا وہ مستحق اجر ہوا، اور جس نے قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کیا اس نے عدل و انصاف کیا اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی اس کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب ہوگئی"۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو اور ان لوگوں کو جو قرآن کی دعوت میں اپنی زندگیاں لگا رہے ہیں اور کھپا رہے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بشارت کا مصداق و مستحق قرار دے جو اس حدیث کے آخری حصہ میں بیان ہوئی ہے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

جناب حافظ نصیر احمد غزنوی کی مرتب کردہ کتاب " اظہارِ حق ۔ قادیانیت اپنے لٹریچر کے آئینہ میں " کی بالاقساط اشاعت ' میثاق ' میں ہو رہی ہے۔ اس کی ابھی تقریباً نصف اقساط باقی ہیں۔ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جون کے شمارے کی قسط کے بعد اس کی اشاعت بند کر دی جائے۔ اللہ کو منظور ہوا تو اب تک کی شائع شدہ اقساط اور بقیہ اقساط کو کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے گا ـــــــ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۶ کے دوسرے

قرآن مجید کے متعلق یہ الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔ اس کا صحیح فہم اس وقت حاصل ہوتا ہے، جب موجودہ دور کے ان فتنوں کا معروضی طور پر مطالعہ کیا جائے۔ جو اپنے باطل نظریات کے حق میں دلائل لانے کے لئے قرآن حکیم کی آیات ہی کو بازیچۂ اطفال بناتے ہیں۔ قادیانیت اس کی بدترین مثال ہے۔ پھر منکرین حدیث ہیں، اباحیت پسند گروہ ہے جو اپنے مذموم و باطل نظریات و افکار کے لئے قرآن ہی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ کہیں ستر و حجاب کے احکام کی من مانی تاویلات کرتا ہے۔ کہیں عورت کے حدود کار اور اس کے حقوق و فرائض کا تعین قرآن سے ہٹ کر موجودہ ناخدا آشنا تہذیب کی بنیاد پر کرتا ہے لیکن اسے عین قرآن کے مطابق قرار دیتا ہے۔ کہیں ربا (سود) کو نئی شکلیں دے کر اور ان کے دلفریب نام رکھ کر خلق خدا کو دھوکا دیتا ہے۔ کہیں سرمایہ داری اور زمینداری کے موجودہ استحصالی نظام کی تائید میں قرآن سے دلائل فراہم کرتا ہے۔ کہیں اشتراکیت کے لادین فلسفے اور فکر کو قرآن سے ثابت کرتا نظر آتا ہے۔ ایسے ہی کج فہم بلکہ دنیا دار لوگوں کے متعلق قرآن میں ارشاد فرمایا گیا۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ —

"جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں (قرآن کی آیات) متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو (قرآن کی منشاء کے خلاف) معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا اور کون جان سکتا ہے۔"

البتہ راسخ العلم لوگوں کے سینوں کو اللہ تعالیٰ ان متشابہات پر بھی انشراح صدر عطا فرماتا ہے اور وہ اس سے بھی دانائی و حکمت کی باتیں معلوم کرتے ہیں ــــ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان فتنوں سے محفوظ رکھے۔ دین کا علم نہ ہونے یا ناقص و محدود ہونے کے باعث ان کیاد شکاریوں کا بڑی آسانی سے ہمارے سادہ لوح عوام شکار ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ ہمارے علماء کرام اپنی اصل قوت ان فتنوں کے سدباب کے محاذ پر لگائیں، جو وحدت ملت کو پارہ پارہ کرنے اور اسلام کے حقیقی خدوخال کو مسخ کرنے کا باعث بنے ہوئے ہیں اور اپنی صلاحیتیں، اپنا علم، اپنی توانائیاں اسلام کی حقانیت پر مبنی دعوت کو عام کرنے کی جدوجہد کریں تاکہ عوام ان فتنوں سے محفوظ رہ سکیں ــــ اگر ہم ان فتنوں سے غافل رہے تو یہ ہماری دینی، ملی اور قومی زندگی کے لئے انتہائی مہلک ثابت ہو سکتے ہیں

الہدیٰ (پندرھویں نشست)

اُولوالالباب کے ایمان کی کیفیت

سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع
آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ کی روشنی میں

(مباحث ایمان)

ڈاکٹر اسرار احمد

ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۲)

اَلسَّلامُ علیکم۔ نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ امّا بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم　　بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ۚۙ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

معزز حاضرین اور محترم ناظرین!

گذشتہ نشست میں ہم نے سورہ آلِ عمران کی چھ آیات یعنی آیت ۱۹۰ تا ۱۹۵ کی تلاوت کی تھی اور ان کا ایک رواں و سادہ ترجمہ بھی ذہن نشین کرلیا تھا او

ان کے بارے میں بعض تمہیدی باتیں بھی نوٹ کر لی تھیں - آج ہمیں ان آیات پر ذرا زیادہ گہرائی میں جا کر غور و فکر کرنا ہے - اس مقصد کے لئے میں نے آج ابتدائی تین آیات کی آغاز میں دوبارہ تلاوت کی ہے - میرا خیال ہے کہ ان کا ترجمہ بھی کر دوں تاکہ آپ اُسے پھر ایک بار ذہن نشین کر لیں - ترجمہ یہ ہے -

" یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں نشانیاں ہیں ہوش منداور باشعور لوگوں کے لئے - وہ لوگ جو بیٹھے اور کھڑے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اے رب ہمارے! تو نے یہ سب کچھ بیکار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا، تو اس سے پاک ہے - پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا - اے رب ہمارے! بے شک جسے تو نے آگ میں داخل کیا اُسے تو نے پوری طرح رسوا کر دیا اور ایسے ظالموں کے لئے یقیناً کوئی مددگار نہیں ہوگا -"

ان آیات مبارکہ کے متعلق جیسا کہ پچھلی مرتبہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ان میں ایمان کی بحث آرہی ہے - ایمان کن کا! ہوش منداور باشعور لوگوں کا - پہلی آیت میں جو لفظ آیا ہے 'اولی الالباب' سب سے پہلے اس پر اپنی توجہ کو مرتکز کیجئے - 'الباب والے' - الباب جمع ہے لُب کی - لُب کسی چیز کے اصل جوہر کو کہتے ہیں - ہم اُردو میں بھی بولتے ہیں کہ "پوری بحث کا لُبّ لباب یہ ہے" تو کسی شے کا اصل جوہر اس کا لُب کہلاتا ہے اب غور کیجئے کہ انسانیت کا اصل جوہر کیا ہے - !آپ کو معلوم ہے کہ اہل منطق اور اہل فلسفہ نے انسان کو حیوانِ عاقل قرار دیا ہے - لہٰذا انسان کا خلاصہ، انسان کا اصل جوہر، اس کا لُب لباب انسان کی عقل ہے - اولوا الالباب سے مراد وہ ہوش منداور باشعور لوگ ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں - جیسا کہ میں نے پہلے بھی ایک مرتبہ عرض کیا تھا کہ فہم قرآن کا ایک اہم اور سنہری اصول ہے کہ: اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا

قرآن مجید کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے - چنانچہ اس اصول کو سامنے رکھ کر جب ہم نگاہ دوڑاتے ہیں تو عجب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ آیتِ مبارکہ سورہ آل عمران کے بیسویں رکوع کی پہلی آیت ہے اور سورہ بقرہ کے بیسویں رکوع کی پہلی آیت میں بھی یہی مضمون آیا ہے اور بڑی تفصیل کے ساتھ آیا ہے فرمایا :

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ص وَّتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ه

اب نوٹ کیجئے کہ اس آیتِ مبارکہ میں مظاہر فطرت (NATURAL PHENOMENA) کی ایک طویل فہرست آگئی ہے - ترجمہ یہ ہے کہ :

"یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور اس کشتی میں جو سامان کو لے کر دریا میں چلتی ہے جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے اور وہ پانی کہ جو اللہ نے بلندی سے برسایا اور اس کے ذریعے سے زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ کیا اور اس زمین میں ہر قسم کی جان دار چیزوں کو پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلنے میں اور اس بادل کے چلنے میں جو آسمان اور زمین کے مابین معلق ہیں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں -"

دیکھئے یہاں آخر میں الفاظ آئے "لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ" جب کہ سورہ آلِ عمران میں الفاظ آتے ہیں لِّأُولِي الْأَلْبَابِ معلوم ہوا کہ اولوالالباب وہ لوگ ہیں کہ جو عقل سے کام لیتے ہیں - جن کی عقل پر جذبات و شہوات اور تعصب کے پردے پڑے نہیں ہوتے جو تفکر و تدبر

کرتے ہیں۔ جن کا شعور بیدار ہوتا ہے ۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ہر معاشرے میں ہر دور میں انسانوں کی عظیم اکثریت تو ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جنہیں اگر دو پاؤں پر چلنے والے حیوان قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا ۔ اس لئے کہ وہ جس ماحول میں آنکھیں کھولتے ہیں وہاں جو کچھ ہوتا دیکھتے ہیں وہی کرنے لگتے ہیں ۔ اُن کی اپنی آزاد فکر کوئی نہیں ہوتی ۔ آزاد سوچ کوئی نہیں ہوتی ۔ وہ غور ہی نہیں کرتے کہ ہم کون ہیں ! کہاں سے آئے ہیں ! ہماری زندگی کا مآل کیا ہے ! مبدأ کیا ہے ! معاد کیا ہے ! اس کا مقصد کیا ہے ! ۔ لیکن ہر دور میں ہر معاشرے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا مزاج تقلیدی نہیں ہوتا جو خود سوچنا چاہتے ہیں ۔ جو اصل اور بنیادی سوالات فلسفہ اور مذہب کے مابین مشترک ہیں، وہ ان کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں اور گویا وہ زندگی کا راستہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر چلنا چاہتے ہیں یہ ہیں وہ لوگ جو اولوا الالباب ہیں، ہوش مند لوگ، باشعور لوگ ۔ ان کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کسی معاشرہ کا BRAIN TRUST ہوتے ہیں، یہ کسی سوسائٹی کا INTELLECTUAL MINORITY ہوتے ہیں ۔ ذہین و فطین اقلیت ہوتے ہیں ۔ اب ان کے بارے میں قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ اگر یہ لوگ کتاب فطرت کا مطالعہ کریں تو انہیں اس کائنات میں ہر چہار طرف نشانیاں نظر آئیں گی ۔ نشانیاں کس کی ۔ ؟ اس کی صراحت نہیں کی گئی ۔ مراد ہے اللہ کی نشانیاں ۔ ایمان باللہ کا ذریعہ کتاب فطرت کا مطالعہ ہے ۔ اور یہ جو مظاہر فطرت ہیں، ان کا مشاہدہ ہے کہ ان میں سے ہر ہر چیز اللہ کی نشانی ہے ۔

دیکھئے عربی لفظ "آیت" کے معنی ہیں 'نشانی' ۔ اب غور کیجئے کہ ہم نشانی کسے کہتے ہیں ! کسی شے کی یا کسی شخص کی یا کسی ہستی کی نشانی وہ شے جس کو دیکھتے ہی ذہن بے اختیار اور بلا ارادہ اُس شے، یا اُس شخص یا ہستی کی طرف منتقل ہو جائے ۔ آپ کے دوست کی ایک نشانی آپ کے پاس ہے ۔ آپ کو بہت عرصہ سے اس دوست سے ملاقات نہیں ہوئی ۔ وہ

آپ کی یادداشت کے انبار میں گم ہوگیا ہے یا محو ہو چکا ہے یہاں تک کہ آپ ایک روز اپنا سوٹ کیس کھولتے ہیں اور وہ رومال یا قلم یا کوئی دوسری چیز آپ کی نگاہ میں آتی ہے جو آپ کے دوست نے اپنی نشانی کے بطور آپ کو دی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی دفعتاً وہ دوست آپ کو یاد آجاتا ہے۔ یہ ہے نشانی کا حقیقی مقصد اور اس کی اصل غایت۔ قرآن مجید کے نزدیک اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ اللہ کی نشانی ہے۔ یہ نشانیاں آفاق میں بھی ہیں، انفس میں بھی ہیں۔ یہ نشانیاں کائنات میں ہر چہار طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ خود ہمارے اندر اور وجود میں بھی ہیں۔ جیسے ایک مقام پر فرمایا:
سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ۔ "ہم انہیں دکھلائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور خود ان کے اپنے وجود میں ان کے اپنے اندر، ان کی اپنی ہستی میں"۔ گویا اس کائنات اور انسان کے اپنے باطن میں بے گنت اور بے شمار اللہ کی نشانیاں موجود ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایک صاحب خرد کو اللہ یاد آسکتا ہے۔

یہ بات یاد رکھئے کہ قرآن مجید ایمان باللہ یا معرفت خداوندی کے لئے اہل منطق کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ وہ اللہ کی ہستی کے اثبات کے لئے منطقی دلائل نہیں دیتا بلکہ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ قرآن حکیم بدیہیات فطرت پہ اپنے استدلال کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ جیسے کسی نشانی کو دیکھ کر کوئی یاد آجاتا ہے ایسے ہی اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ اللہ کی نشانی ہے۔ اس کو دیکھ کر ان پر غور و فکر کر کے انسان اللہ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ اسے کسی درجہ میں منطق کا جامہ پہنانا چاہیں تو اس کا تجزیہ یوں ہوگا کہ یہ وجود، یہ سلسلۂ کون و مکان عقلاً مستلزم ہیں ایک خالق کو۔ کوئی تو پیدا کرنے والا، کوئی تو بنانے والا ہونا چاہیئے۔ آپ سے آپ تو کوئی چیز وجود میں نہیں آتی۔ کوئی ہستی ہے کہ جس نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے۔ گویا کہ اس کائنات کی اپنی جگہ پہ جو موجودگی ہے ور جمادات و نباتات اور حیوانات کا جو وجود پایا جاتا ہے وہ خالق کے وجود

کے لئے دلیل ہے۔ لہٰذا اس معنی میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کائنات ذات و اسمائے صفاتِ باری تعالیٰ کی جلوہ گاہ ہے۔ اس کائنات، جملہ موجودات اور نظام کائنات پر ہم جب غور کریں گے تو نظر آئے گا کہ اس کا پیدا کرنے والا عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ اس کائنات کی وسعتوں کا اندازہ کرو اور دیکھو اور سوچو کہ اس کائنات کے پیدا کرنے والے کی خلّاقی کا کیا عالم ہے اور اس کی قدرت کا کیا ٹھکانا ہے! پھر یہ کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ بھی ہے۔ اس کے علم میں کہیں کوئی کمی اور نقص نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اس کائنات کا خالق العزیز یعنی زبردست اور غالب بھی ہے۔ پوری کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کا محکوم و مطیع ہے ساتھ ہی اس کائنات کا پیدا کرنے والا ایک حکیم کامل بھی ہے اس لئے کہ اس نے جو کچھ تخلیق فرمایا ہے اس میں ہر چیز حکمت سے پُر ہے۔ یہاں کوئی چیز بے مقصد اور بلا غایت نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کائنات کے مشاہدے سے وجودِ باری تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال تک انسان کا ذہن پہنچے گا۔ یہ مفہوم ہے ان دو آیات کا یعنی سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کے درس کی پہلی آیت کا اور یہی مفہوم ہے سورہ بقرہ کے بیسویں رکوع کی آیت نمبر ۱۶۴ کا جو میں نے ابھی آپ کو سنائی۔

اس کائنات کی گتھی کو سلجھانے کے لئے انسان کے ہاتھ میں یوں سمجھئے کہ الجھی ہوئی ڈور کا جو سرا ہاتھ آیا تو وہ ہے معرفت خداوندی۔ اللہ کو پہچاننا۔ ظاہر بات ہے کہ اس الجھی ہوئی ڈور کو آپ نے مزید سلجھانا ہے تو اس سرے کو ہاتھ سے نہ چھوڑیئے گا۔ ورنہ ساری کی کرائی محنت ضائع ہو جائے گی۔ اسی میں یہی ربط ہے کہ اولو الالباب کے تذکرہ کے معًا بعد ان کے اوصاف ان الفاظِ مبارکہ میں بیان فرما دیئے:۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِہِمْ۔ جب اپنے غور و فکر اور کتابِ فطرت کے مطالعے اور مظاہرِ فطرت کے مشاہدے سے ان اولو الالباب نے اللہ کو پہچان لیا تو ہر دم اور ہر لحظہ وہ اللہ کو یاد رکھتے ہیں۔ اللہ

ان کے دل میں ہر آن مستحضر رہتا ہے ۔ ذکر کے معنی میں عرض کر چکا ہوں کہ استحضار اللہ فی القلب ہیں ۔ دل میں اللہ کی یاد موجود ہے اور اس سرے کو ہاتھ میں رکھ کر مزید گتھی سلجھائیں : وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ " اور وہ مزید غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں" آگے بڑھنے سے پہلے میں اس موقع پر یہ بات نوٹ کرا دوں کہ ذکر و فکر یہاں جس کیفیت کے حامل ہو کر ساتھ ساتھ آئے ہیں وہ بڑی اہمیت پر مشتمل ہیں ۔ اس لئے کہ انسان کے غور و فکر کا عمل (PROCESS) صحیح رُخ پر اُسی وقت آگے بڑھے گا جب کہ بیک وقت یہ دونوں چیزیں موجود ہوں ۔ یہ گاڑی کے دو پہیے ہیں گاڑی ایک پہیہ پر نہیں چلے گی ۔ ذکر بھی ہو اور فکر بھی ہو دونوں ضروری ہیں ۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں یہ دو حلقے جُدا جُدا ہو گئے ہیں ۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو ذکر کے لذّت آشنا ہیں لیکن وہ فکر کے میدان میں قدم نہیں رکھتے ۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو غور و فکر کی وادی تو طے کرتے ہیں لیکن ذکر کی لذّت سے محروم رہتے ہیں ۔ لہذا دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ ہو گئی ہیں اور مطلوبہ نتائج اسی لئے پیدا نہیں ہو رہے ۔ مولانا رومؒ نے اس کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ کہا ہے ؎

این قدر گفتیم باقی فکر کن   فکر اگر جامد بود رَو ذکر کن

اتنا تو ہم نے تم کو بتا دیا آگے سوچو، غور و فکر کرو اور اگر فکر میں کہیں رکاوٹ محسوس کرو وہ جامد ہو جائے تو پھر ذکر کرو ع ذکر آرد فکر را در اہتزاز ! اس ذکر سے فکر میں پھر ایک حرکت پیدا ہو گی ۔ وہ صحیح رُخ پر اور صحیح سمت میں آگے بڑھے گا ۔ ذکر را خورشید این افسردہ ساز ۔ یہی بات علامہ اقبال بڑی خوبصورتی سے کہتے ہیں ؎

جذبہ قرآں ضیغمی روباہی است   فقر قرآں اصل شاہنشاہی است

فقرِ قرآں ؟ اختلاطِ ذکر و فکر   فکر را کامل نہ دیدم جُز بہ ذکر

"قرآن کے بغیر شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے ۔ اصل شہنشاہی قرآن
کے تعلیم کردہ فقر میں ہے ۔ جانتے ہو یہ فقرِ قرآنی کیا ہے؟
یہ ذکر و فکر دونوں کے مجموعے سے وجود میں آتا ہے اور حقیقت
یہی ہے کہ ذکر کے بغیر فکر کامل نہیں ہو سکتا"

اس آیتِ مبارکہ میں دیکھیے فرمایا: اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج یہاں ذکر کی اہمیت کو تین حالات کے حوالہ سے جن سے انسان عالم بیداری میں مسلسل دوچار رہتا ہے' بیان کیا گیا ہے یعنی کھڑے جس میں چلنا آپ سے آپ شامل ہے' بیٹھے جس میں کام میں مشغول ہونا شامل ہے۔ اور پہلوؤں پر لیٹے جس میں آرام کا مفہوم شامل ہے' اللہ کی یاد کا اہتمام والتزام کرتے ہیں ۔ اس کے ذکر سے زبان سے تحمید و تسبیح ، تہلیل و تمجید کے مسنونہ کلمات کی ادائیگی بھی مراد ہے اور دل میں اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر اور علیم و خبیر اور حفیظ و رقیب (نگران) ہونے کا یقین ہونا بھی شامل ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کائنات کی تخلیق میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں ۔

ذکر و فکر کے اس اختلاط سے وہ جس نتیجہ تک پہنچتے ہیں اس کو آگے بیان فرمایا: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ج سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ہ وہ پکار اٹھتے ہیں " اے رب ہمارے ! تو نے یہ سب بے مقصد اور بلا غایت اور بیکار پیدا نہیں کیا ۔ تو پاک ہے' منزّہ ہے اس سے کہ کوئی کارِ عبث کرے ۔ پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا" یہاں قدرے تفصیل کی ضرورت ہے ۔ ان اولو الالباب کے سامنے جو پہلی بات آئی وہ یہ ہے کہ اس کائنات میں کوئی چیز بے مقصد نہیں ہے ۔ اور دوسری بات جس کا یہاں ذکر نہیں ہے لیکن جسے ہم اپنے دوسرے سبق کے ضمن میں سورہ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس میں مجازاتِ عمل کے متعلق حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کہ : یٰبُنَیَّ اِنَّھَا

اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ تفصیل سے پڑھ چکے ہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ فطرت انسانی میں نیکی و بدی اور تقویٰ و فجور کا شعور و امتیاز ودیعت شدہ ہے۔ الہامی طور پر اس کا ضمیر جانتا ہے کہ نیکی، نیکی ہے۔ بدی، بدی ہے[1]۔ لہٰذا عقل کا تقاضا یہ ہے کہ نیکی کے نتائج اچھے نکلیں۔ بدی کے نتائج برے نکلیں۔ گندم از گندم بروید جو ز جو۔ دُنیا میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر معاملہ الٹا ہے۔ نیکوکار لوگوں کے لئے یہاں مصائب اور تکالیف ہیں۔ آپ ذرا فیصلہ کر لیجئے کہ مجھے جھوٹ نہیں بولنا معلوم ہوگا کہ زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ حرام و حلال کی حدود پر کاربند رہنے کا فیصلہ کیجئے تو دو وقت کی سوکھی روٹی ملنی بھی مشکل ہو جائے گی۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے نہ کچھ اصول ہیں نہ اقدار ہیں نہ ہی وہ کچھ قیود و حدود کے پابند ہیں۔ ان کو جہاں بھی موقع ملتا ہے اور ہاتھ پڑتا ہے۔ وہ دست درازی سے نہیں چوکتے۔ ان کے لئے یہاں عیش ہے اور آرام ہے۔ یہاں ان کے اور ان کے اہل و عیال کے لئے سہولتیں مہیا ہیں — ان دو متضاد و مختلف نتیجوں کو دیکھ کر چند سوالات ہر باشعور انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ وہ یہ کہ یا تو یہ دنیا ناقص ہے مکمل نہیں ہے۔ یا پھر ہمارا وہ خیال غلط ہے کہ نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے۔ یہ صرف ہماری خوش فہمی (WISHFUL THINKING) ہے — پھر ...... اگر فطرت اس بات پر مصر ہو کہ نہیں حقیقت نفس الامری یہی ہے کہ نیکی نیکی ہے، بدی بدی ہے یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہیں: وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ تو پھر عقل اور ذہن انسانی یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس دُنیا کی زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہونی چاہیئے جس میں اخلاقی نتائج بھرپور طریقے پر برآمد ہوں نیکوکاروں کو

---

[1] وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (الشمس آیات ۷-۸)

ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ ملے ۔ بدکاروں کو ان کی بدی کی بھرپور سزا ملے[1]
یہ ہے وہ عقلی سفر ایمان باللہ سے ایمان بالآخرت تک کا کہ جب اولوالالباب
اللہ کو یاد رکھتے ہوئے مزید غور و فکر کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہاں
کوئی شے بے مقصد و بیکار نہیں ہے ۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے باطن
میں نیکی، تقویٰ اور بدی، فجور کا جو شعور ہے وہ بے نتیجہ رہے ۔ اس دُنیا
میں ان کا نتیجہ نہیں نکل رہا ۔ لازماً ایک دوسری زندگی ہونی چاہیئے جس
میں نیکی اور بدی کے بھرپور طور پر نتائج برآمد ہوں اور نیکوکاروں کو جزا
اور بدکاروں کو سزا ملے ۔ جب وہ لوگ اس عقلی نتیجے تک پہنچ جاتے
ہیں تو وہ اللہ تعالےٰ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر استدعا کرتے ہیں کہ "اے
ہمارے ربّ تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا ۔ تو پاک ہے ۔ اے
ہمارے ربّ ! اُس زندگی کی عقوبت اور سزا سے ہمیں بچا نیو ۔ اُس زندگی
میں جو آگ میں جھونک دیا گیا وہ تو ذلیل و رسوا ہو گیا اور ہمیں اس
بات کا یقین ہے کہ وہاں ظالموں کا مددگار کوئی نہیں ہو گا : رَبَّنَا مَا
خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ رَبَّنَآ اِنَّكَ
مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ط وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ
اَنْصَارٍ ○

ان آیات میں خلاصہ ہے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے عقلی
سفر کا ۔ یہ فطری اسلوبِ استدلال ہے جو ان تین آیات میں جس
جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے میرے محدود مطالعۂ قرآن حکیم کی حد تک
اسکی کوئی دوسری نظیر موجود نہیں ہے — آج کے درس کے سلسلہ

---

[1] یہ بات سورہ قلم میں بایں الفاظ مبارکہ فرمائی گئی : اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ
كَالْمُجْرِمِيْنَ ○ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○ "کیا ہم (آخرت میں) فرماں
برداروں اور مجرموں کا ایک سا حال کر دیں گے ؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تم کیسے (وہمی
و خیالی) حکم لگاتے ہو ؟" آیات ۳۵ - ۳۶ (مرتب)

میں کوئی سوال ہو ——— یا کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال وجواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! قرآنِ مجید کی رو سے عقل کا کیا مقام ہے۔؟

جواب: ان آیات مبارکہ میں تو یقیناً عقل کی تو بڑی عظمت آئی ہے۔ ان کے متعلق فرمایا گیا ہے: اُولِی الْاَلْبَابِ، قَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ہوشمند لوگ، صاحب خرد لوگ، وہ لوگ جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ لیکن عقل کے بارے میں بہت صحیح بات علامہ اقبال نے اس شعر میں کہہ دی ہے ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور   چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے[1]

صرف عقل انسان کو منزل تک نہیں پہنچاتی۔ اگرچہ اس کو صحیح راہ پر ڈال دیتی ہے۔ یہ POINTER ہے، چراغِ راہ ہے راہ دکھانے والی روشنی ہے لیکن منزلِ مقصود تک انسان کو پہنچانے والی چیز وحیِ آسمانی ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے فرمایا کہ کسی چیز کا وجود اس کے خالق کو ثابت کرتا ہے۔ کارلائل جو مشہور فلاسفر ہے وہ اس چیز کو مانتا تھا لیکن پھر وہ سوال کرتا تھا کہ اس خالق کا وجود ثابت کرنے کے لئے پھر ایک خالق کا وجود ہونا چاہیئے۔ اگر آپ سے اس سوال کا جواب مانگا جائے تو وہ کیا ہوگا۔؟

جواب: یہ بات بالکل صحیح ہے کہ خالص منطق یقیناً اس کا تقاضا کرے گی۔ پھر آپ خود غور کریں کہ یہ سلسلہ لامتناہی ہوگا چونکہ ہر چیز کے خالق کا وجود ثابت کرنے کے بعد بھی یہ سوال باقی رہے گا۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید نے منطقی طرزِ استدلال اختیار نہیں کیا۔ واقعہ

---

[1] علامہ مرحوم کا یہ شعر بھی بڑا پیارا ہے ؎
عقل گو آستاں سے دور نہیں   اس کی تقدیر میں حضور نہیں (مرتب)

یہ ہے کہ ہمارے بہت سے متکلمین نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے کہ محض منطق سے وجودِ باری تعالٰے ثابت نہیں کیا جا سکتا - اور جیسا کہ آپ کے علم میں ہو گا کہ کانٹ نے اپنی مشہور کتاب THE CRITIQUE OF PURE REASO میں ثابت کیا ہے کہ باری تعالٰے کے وجود کے اثبات پر جو منطقی دلائل قائم کئے گئے ہیں، منطق خود ان کا توڑ کر دیتی ہے لہذا منطقی دلائل سے اللہ کے وجود کو ثابت کرنا واقعہ یہ ہے کہ ممکن نہیں ہے۔
وجود باری تعالٰے کا علم فطرتِ انسانی میں ودیعت شدہ ہے اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ حکمتِ قرآنی کی بنیاد صرف منطقی استدلال پر نہیں ہے بلکہ اس کی اصل اساس بدیہیاتِ فطرت پر ہے - آپ اپنی فطرت کی بنیاد پر جس چیز کو جانتے اور مانتے ہیں ان میں عقلی مسلمات کے اضافے سے حکمتِ قرآنی کا عمل مکمل ہوتا ہے -

حضرات ! ان آیاتِ مبارکہ کے بارے میں عرض ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس مختصر وقت میں ان کی عظمتوں کا بیان ممکن نہیں ہے - بہر حال ہمارے سامنے ایک خلاصہ آیا ہے کہ اللہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان کے ضمن میں قرآن حکیم کیا عقلی استدلال پیش کرتا یا شعور و فکر کے لئے کون سا راستہ تجویز کرتا ہے - اللہ تعالٰے ہمیں بھی اس راہ سے یقین محکم عطا فرمائے -

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین o

خریدار حضرات سے گذارش ہے کہ وہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں - ایسا نہ کرنے کی وجہ سے ادارہ کو غیر ضروری زحمت اٹھانی پڑتی ہے - امید ہے کہ آپ آئندہ ہماری گذارش کو ملحوظِ خاطر رکھیں گے - (ادارہ)

توحید فی العلم یا توحید فی المعرفہ اور
توحید فی العمل یا توحید فی الطلب کا

فریضۂ اقامتِ دین

سے ربط و تعلق

ڈاکٹر اسرار احمد

کے خطابِ درس کی پانچویں قسط

اس آیت مبارکہ کے آخری حصہ میں علمی اعتبار سے ایک اہم مضمون آرہا ہے۔ اسے بھی توجہ کے ساتھ سنئے اور ذہن نشین کرنے کی کوشش کیجئے ـــــ فرمایا :

اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ ۝

"اللہ ہی کھینچ لیتا ہے اپنی طرف جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اپنی جانب جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔"

یہ بڑی اہم بات ہے کسی شخص کے راہ ہدایت پر آنے کے دو طریقے ہیں۔ یہ مختلف طبائع اور مزاج کی بات ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو تو اللہ ہی فیصلہ کرکے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور بعض لوگ محنت کرکے کوشش کرکے رجوع کرکے اللہ کے راستے کی طرف آتے ہیں۔

اجتباء اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان یہ بھی ہے کہ وہ چاہے تو کسی راہ چلتے کو بلالے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدین سے مصر جارہے تھے کہ راستہ ہی سے کھینچ بلایا اور کوہِ طور پر نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا۔ آپؑ سے کلام فرمایا : وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ وہ کلیم اللہ ہو گئے۔ حضرت عمرؓ گھر سے ننگی تلوار لے کر آں حضورؐ کے قتل کے پختہ ارادے سے نکلے تھے لیکن راستہ ہی سے ان کا رُخ اپنی ہمشیرہ کے گھر کی طرف پھیرنے کے اسباب پیدا فرما دیئے جو خود اور ان کے شوہر حضرت سعید ابن زیدؓ ایمان لا چکے تھے۔ بہن کی عزیمت دیکھ کر حضرت عمرؓ کا دل موم

ہوا۔ کلام الٰہی سننے کی خواہش کی اور سن کر دل کی کایا ہی پلٹ گئی۔ حجابات دور ہو گئے۔ وہی ننگی تلوار جو قتل کے ارادے سے لے کر گھر سے نکلے تھے غلاموں کی طرح گلے میں ڈال کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہو کر جاں نثارانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ہو گئے۔ دربارِ نبویؐ سے فاروق کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔ حضرتِ حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی اجتبار ہوا۔ آں حضورؐ کو مکہ میں دعوتِ توحید دیتے ہوئے چھ سال بیت گئے تھے۔ آپؐ کی شدید مخالفت ہو رہی تھی لیکن حمزہ ان سب سے بے نیاز اپنے مشاغل میں لگے رہتے تھے جن میں نمایاں شوق تیر کمان لے کر علی الصبح شکار کو نکل جانا اور شام کو واپس آنا تھا۔ ایک شام جب واپس آئے تو لونڈی نے اس زیادتی کا ماجرا سنایا جو اس روز ابوجہل نے آں حضورؐ کے ساتھ کی تھی۔ قرابت داری کے جذبہ نے جوش کھایا۔ پہلے تو جا کر کمان سے ابوجہل کا سر پھاڑا اور کہا لو میں بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاتا ہوں۔ پھر حضورؐ کی خدمت میں آکر فی الواقع مشرف باسلام ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔ اسداللہ واسد رسولہ اور سید الشہداء کے القاب سے ملقب ہوئے۔

انابت

دوسری قسم کے لوگ خود ہدایت کے طالب ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ جو ہدایت کا طالب ہے اسے ہم ہدایت دیں گے۔ اس نے تو گویا ہم پر اپنا حق قائم کر دیا۔ اس لئے کہ وہ خود طالبِ ہدایت ہے۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ جو لوگ ہمارے لئے محنتیں کریں۔ کوشش کریں۔ ہدایت کے طالب بنیں اس کے لئے قربانیاں دیں ان کے لئے ہمارا پختہ وعدہ ہے کہ ہم انہیں لازماً اپنے راستہ کی ہدایت دیں گے ـــ یہی بات یہاں فرمائی کہ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ ۝ "اللہ ہدایت دیتا ہے اپنی جانب اس کو جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے"۔ جو بھی حق کا طالب اور متلاشی ہے۔ جس کے دل میں بھی انابت ہے۔ جس میں حق کی طلب صادق ہے جو کسی تعصب اور عصبیت میں مبتلا نہیں ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ راہِ ہدایت دکھاتا ہے اور اس پر اس کو لے آتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کی درخشاں مثال ہیں۔ وہ اپنی فطرتِ سلیمہ اور طلبِ حق کی بنیاد پر صدیق اکبر کے مقامِ ارفع پر فائز ہوئے ـــ عشرہ مبشرہ میں اکثر وہی حضراتِ گرامی شامل ہیں جو راہِ حق کے از خود جویا تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ ہیں جو طلبِ حق میں کہاں سے روانہ ہوئے، کن کن منازل پر ٹھہرے اور پھر کس طرح دامنِ محمدیؐ سے وابستہ ہوئے۔ یہ انابت الی اللہ کی مثالیں ہیں۔

صوفیاء کی دو اصطلاحات — سالک مجذوب اور مجذوب سالک

ہمارے یہاں صوفیاء میں دو اصطلاحیں رائج ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کچھ ہوتے ہیں سالک مجذوب اور کچھ ہوتے ہیں مجذوب سالک۔ سلوک عربی کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں چلنا — لہٰذا سلوک کے معنی راستہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح طریق اور طریقت بھی چلنے اور راستہ کو کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک سالک مجذوب وہ ہیں جو خود چل کر اللہ کی طرف آتے ہیں اور اللہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ بھی لیتا ہے، انہیں ہدایت دیتا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے رجوع کیا ہے — جیسے حضرت ابوبکر صدیق، وہ تو پہلے سے حق کے متلاشی ہیں۔ اسی راستے پر چلے آرہے ہیں حقیقت کے دروازے پر وہ بھی دستک دے رہے تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ دروازہ کھلا جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے۔ اسی لئے انہوں نے فوراً تصدیق کی اور حضور کے ہاتھ پر ایمان لے آئے۔ انہیں تصدیق کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگا۔ حضور فرماتے ہیں کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جس کو میں نے دعوت پیش کی ہو اور اسے کچھ نہ کچھ تردد نہ ہوا ہو اور اس نے کچھ نہ کچھ توقف نہ کیا ہو سوائے ابوبکر کے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ وجہ یہ تھی کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

مجذوب سالک وہ ہیں جن کو پہلے اللہ تعالیٰ خود ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور انہیں ہدایت دیتا ہے۔ پھر ان کو تربیت کے مراحل سے گزارا جاتا ہے جیسے حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

یہ مفہوم ہے سالک مجذوب اور مجذوب سالک کا — صوفیاء نے یہ اصطلاحات شاید آیت کے اسی حصہ سے اخذ کی ہیں کہ: اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۞ "اللہ جسے چاہے چن کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جو خود اس کی طرف رجوع کرے تو اللہ اسے لازماً ہدایت دیتا ہے"

اہلِ ایمان کو تسلی

آیت کے اس حصے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے توسط سے اہل ایمان کے لئے تسلی و تشفی کا پہلو بھی موجود ہے کہ مکہ کے مشرکین کی شدید مزاحمت و مخالفت اور جور و تعدی نیز انتہائی مایوس کن حالات سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ راستہ کھولے گا اور وہ تبارک و سبحانہ و تعالیٰ کچھ لوگوں کو اپنے دین کی طرف کھینچ لے گا۔ ان مشرکین میں جو نیک سرشت ہوں گے، جن کی فطرت سلیم ہوگی، جن کی عقل سلیم ہوگی، جن میں

ذرا بھی انابت ہوگی، وہ خود چل کر آجائیں گے۔ اللہ ان کو بھی راہِ ہدایت سے بہرہ مند فرمائیگا۔

اہل کتاب کی مخالفت کا سبب

اب آگے والی آیت میں دوسری جماعت یعنی اہلِ کتاب کی مخالفت کے سبب کو اختصار لیکن انتہائی جامعیت و بلاغت سے بیان فرمایا جارہا ہے۔ مشرکینِ عرب تو بے علم تھے۔ ان پڑھ تھے۔ ان کے پاس شریعت نہیں۔ وہ وحی، نبوّت و رسالت اور انزالِ کتب سماوی سے بالکل ناآشنا۔ ان کے مقابلہ میں تھے یہود اور ان کے علماء و فضلاء۔ ان کے پاس کتاب، ان کے پاس شریعت، وحی اور انزالِ کتبِ سماوی سے وہ واقف، سلسلہ نبوت و رسالت سے وہ آشنا۔ توحید سے وہ روشناس، بعث بعد الموت کے وہ قائل، حساب کتاب اور جنت و دوزخ کے وہ مقر۔۔۔ ان کے لئے تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید میں کوئی اجنبیت نہیں تھی۔ کوئی نرالی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ تو خود نبی آخر الزماں کے ظہور کے منتظر تھے۔ جن کتابوں کو وہ خود آسمانی کتابیں تسلیم کرتے تھے ان میں یہ پیشین گوئیاں موجود تھیں کہ خاتم النبیین والمرسلین کی بعثت فاران کی چوٹیوں اور کھجوروں کے جھنڈ کے علاقہ میں ہوگی۔ وہیں ان کا ظہور ہوگا جس سے مراد حجاز کے علاقہ کے سوا کوئی دوسرا مقام نہیں ہوسکتا[1] حضرت سلمان فارسیؓ ایک عیسائی راہب سے یہ اطلاع پاکر ہی حجاز کے لئے عازم سفر ہوئے تھے۔۔۔ پھر یہود اوس و خزرج کو دھمکیاں دیتے تھے کہ آخری نبی کے ظہور کا زمانہ قریب ہے، جب ہم ان کی زیرِ قیادت تم سے جنگ کریں گے تو لازماً تم پر غالب آئیں گے۔ لیکن قرآن شہادت دیتا ہے کہ یہ یہود آں حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں مشرکین سے بھی زیادہ شدید تھے اور آپؐ کی دعوتِ توحید کے خلاف قریش اور عرب کے دوسرے قبائل سے ریشہ دوانیوں اور سازشیں کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ فتنہ و فساد کو اکسانے میں پیش پیش رہتے تھے۔۔۔ ان کی مخالفت کے سبب کو اگلی آیت میں بیان

---

[1] ممکن ہے کہ اسی وجہ سے یہود کے تین بڑے قبیلے فلسطین اور شام کے علاقے چھوڑ کر مدینہ اور خیبر میں آکر آباد ہوئے ہوں۔ اور اوس و خزرج کے قبیلوں کو نبی آخر الزماں کے ظہور کی خبریں دیتے ہوں۔ (مرتب)

کیا گیا ہے۔ اس آیت مبارکہ کے بھی پہلے شَرَعَ لَکُمۡ والی آیت کی طرح تین حصے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ تینوں حصوں کی علیحدہ علیحدہ تشریح و توضیح کروں۔ فرمایا:

وَمَا تَفَرَّقُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ

"اور ان لوگوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس حال میں کہ ان کے پاس علم آچکا تھا (بلکہ تفرقہ کا سبب یہ تھا) کہ وہ ایک دوسرے پر زیادتی کریں"

سیاقِ کلام سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ آیت کے اس حصے میں اہل کتاب کے تفرقہ کا ذکر ہے۔ اسی آیت کے آخری حصہ میں وراثتِ کتاب کا ذکر آرہا ہے۔ وارثِ کتاب تو یہود و نصاریٰ ہی تھے۔ آیت کے اس حصہ میں تفرقہ کا سبب نہایت جامعیت اور بلاغت سے بیان ہو رہا ہے کہ ان اہل کتاب نے جو تفرقہ کیا ہے۔ وہ جو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، وہ جو منقسم ہو گئے تو اس کا باعث لاعلمی نہیں ہے بلکہ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ہے ـــــ دیکھئے کتنی عجیب بات ہے۔ دین و شریعت ایک ہے۔ یہود و نصاریٰ دونوں تورات کے ماننے والے ہیں۔ پھر بھی تفرقے میں مبتلا ہیں۔ پھر تفرقہ در تفرقہ ہے۔ یہود بھی مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور نصاریٰ بھی۔ اور ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں[1]۔ حالانکہ پوری تاریخ مشترک۔ آج بھی عیسائی جس کتاب کو بائبل کہتے ہیں، اس کا بڑا حصہ تو OLD TESTAMENT "عہد نامہ عتیق" ہے۔ یہ دراصل تورات اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد "NEW TESTAMENT "عہد نامہ جدید" ہے۔ جس میں چار کتابیں وہ ہیں جو اناجیل اربعہ کہلاتی ہیں ـــ ان کے بعد پال اور دوسروں کے خطوط ہیں، جن کو وہ "رسولوں کے خطوط" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہودی جن انبیاء کو مانتے ہیں، عیسائی بھی ان سب کو مانتے ہیں لیکن تفرقہ ہے۔ ضد در ضد ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف فتوے ہیں۔ یہ سب کیوں اور کس لئے ہے؟ میں یہ ساری باتیں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ جب بھی کوئی توحید کی خالص دعوت لے کر اٹھے گا۔ حالات یہی ہوں گے۔ اسے اسی نوع کے حالات سے سابقہ پیش آکر رہے گا۔ یہ صورتِ حال کبھی نہیں بدلے گی۔ بقول علامہ اقبال ؎

---

[1] موجودہ دور میں صرف اسلام دشمنی میں عیسائی ان یہود کے حامی، پشت پناہ اور حلیف بن گئے ہیں۔ درآنحالیکہ ان کے عقیدے کے مطابق حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھوانے والے یہودی تھے۔ (مرتب)

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

آج بھی اگر تجدید و احیاءِ دین کے لئے اور خالص دعوتِ توحید کے لئے کمر کس کے کوئی قافلہ چلے گا تو اسے انہی نوع کے دو گروہوں سے واسطہ پڑے گا اور سابقہ پیش آئے گا۔ جیسے دورِ حاضر میں۔ یا تو ہمارے عوام الناس ہیں کہ جن کو دین کی کوئی خبر نہیں۔ ان کے نزدیک دین نام ہے محض ایک عقیدے کا اور چند رسومات کا۔ ان کو حقیقی دین کا علم سرے سے ہے ہی نہیں ـــ ان کا دین تو قبر پرستی ہے یا تعزیہ پرستی۔ ان کے دین کا سب سے بڑا مظہر یا عرس ہے۔ تعزیوں کے جلوس ہیں۔ یا اب ایک اور جلوس کا اضافہ ہو گیا ہے جو عید میلاد النبی کا جلوس ہے ان کا دین تو ان ہی چیزوں کا نام ہے ان کے سوا ان کو دین کا اور کوئی علم اور خبر ہے ہی نہیں۔ نماز سے انہیں سروکار نہیں روزے سے انہیں بحث نہیں ـــ ان کا کُل کا کُل دین بس ان چیزوں کا نام ہے۔ یہ گروہ تو گویا ان لوگوں کے مشابہ ہو گیا جو حقیقتِ نفس الامری سے بہت دور نکل گیا تھا۔ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا۔ ان کے لئے خالص توحید والے دین کی طرف آنا بڑا ہی مشکل ہے۔ آسان کام نہیں ہے۔ اِلَّا ماشاء اللہ ـــ ہمارے یہاں دوسرا گروہ وہ ہے جن کے فتوے چلتے ہیں۔ دین کے مسائل کے لئے جن کی طرف لوگوں کا رجوع ہے۔ جن کی دینی مسندیں ہیں جن کے اونچے اونچے مناصب ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر جن کا سرکار دربار سے ربط و تعلق قائم ہو جائے وہ تو یوں سمجھئے کہ کریلا اور نیم چڑھا۔ ان میں جو جو خرابیاں پروان چڑھتی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ علمائے سوء کی اکثریت بھی اکثر و بیشتر ان ہی میں سے ہوتی ہیں جو سرکاری درباری علماء ہوتے ہیں۔ ایسے ہی علماءِ سوء کے فتووں سے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی پیٹھ پر کوڑے برستے رہے ہیں۔ ایسے ہی علماء کے فتووں سے مجددِ الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کو جیل میں ڈالا گیا ہے۔ ان ہی کے فتووں سے امام ابوحنیفہؒ جیل میں ڈالے گئے اور ان کو کوڑے لگائے گئے۔ جب امام مالکؒ کی مشکیں کس کے کوڑے لگے ہیں اور گدھے پر بٹھا کر ان کی مدینہ کی گلیوں میں جو تشہیر کی گئی ہے تو کیا اس کی پشت پر اس وقت کے درباری مفتیان کے فتوے موجود نہیں تھے۔ جن کے فتاویٰ اس وقت کی حکومت کو حاصل نہ ہوں! یہ درباری سرکاری اقتدارِ وقت کے منہ چڑھے ہی تو عالم و فاضل لوگ تھے جنہوں نے جلال الدین اکبر کو "دینِ الٰہی" عطا کیا تھا۔ اکبر کا تو باپ بھی دینِ الٰہی خود تجویز نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو مرتب کرنے والے تو ابوالفضل اور فیضی تھے جو بہت بڑے عالم تھے۔ اتنے بڑے عالم کہ ابوالفضل نے قرآن مجید کی پوری تفسیر اس طور پر لکھی

کہ اس میں کوئی حرف نقطہ والا نہیں آیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حال ہی میں سیرت مطہرہ پر ایک ایسی کتاب بھی لکھی گئی ہے جس میں نقطہ والا کوئی حرف نہیں آیا جس کی صدرِ مملکت صاحب کی جانب سے بڑی مدح کی گئی ہے۔ یہ تو سیرت کی کتاب تھی۔ ابوالفضل نے تو قرآن کی پوری تفسیر لکھی کہ جس میں کوئی نقطہ والا حرف نہیں آیا۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ اس تفسیر پر علماء نے کوئی نکیر کی ہو۔ ممکن ہے کہ تفسیر میں اس نے کچھ گڑبڑ نہ کی ہو لیکن یہ وہی شخص ہے جو اکبر کے لئے "دینِ الٰہی" تصنیف کر رہا ہے۔ اور اکبر کی اس راہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے[1]۔ لہٰذا جب بھی منظّم طور پر توحید کی دعوت اٹھے گی یہ دو طرفہ یلغار ہو گی۔ مخالفتیں ہوں گی۔ ابتلاء اور آزمائش اسی طور سے آئیں گی جیسے اس وقت آئی تھیں۔

اس آیت کے اس حصہ کے عموم لفظ کے بین السطور BETWEEN THE LINES اگر آپ دیکھیں گے اور READ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ ہیں وہ مراحل و ادوار جو خالص دعوتِ توحید کے نتیجے میں ہمیشہ آ کر رہیں گے۔ ایک وہ عوام، جہلاء جو دین سے دور نکل گئے ان کو دین سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ کوئی تعلق ہی نہیں۔ سوائے بدعات، رسومات اور خرافات کے وہ دین سے کوئی واسطہ اور علاقہ رکھتے ہی نہیں۔ ایک وہ جن کا پڑھنا پڑھانا بھی ہے۔ دین سے تعلق بھی ہے۔ مسندیں بھی ہیں۔ فتاویٰ بھی ہیں۔ ارشاد بھی ہے، سب کچھ ہے۔ لیکن اِلّا ماشاء اللہ حال یہ ہے: وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ

تفرقے کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ حق جب آئے تو وہ واضح نہ ہو۔ گنجلک ہو۔ تو اس کی اس آیت کے آغاز میں نفی کر دی گئی ہے کہ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ پس معلوم ہوا کہ تفرقہ کا باعث لاعلمی اور ناواقفیت نہیں ہے: "العلم" ان تک پہنچ چکا تھا۔ ہدایتِ ربّانی اور حق جب بھی آیا ہے بہت مبرہن، واضح اور بیّنہ بن کر آیا ہے۔ آخری پارے کی سورۂ بیّنہ میں بھی یہ مضمون آیا ہے۔ فرمایا: وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ؕ "جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی انہوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر

---

[1] امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے قرآن مجید کا جب فارسی کا ترجمہ کیا تھا تو وقت کے علماء نے شاہ صاحب کے خلاف کفر کا فتویٰ دیدیا تھا۔ چنانچہ عوام کے ایک گروہ نے اسی فتویٰ سے متاثر ہو کر شاہ صاحبؒ پر دہلی کی جامع مسجد فتحپوری میں ان کو قتل کرنے کے لئے یلغار بھی کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا تھا۔ (مرتب)

اس کے بعد کہ ان کے پاس "البینہ" آگئی تھی ۔۔۔ یعنی حق روشن و مبرہن صورت میں انکے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ ان اہل کتاب نے اندھیرے میں ٹھوکر نہیں کھائی بلکہ روز روشن میں جان بوجھ کر وہ راہ حق سے بھٹکے ہیں۔ ٹھیک ہے اہل عرب نے ٹھوکر کھائی، مکہ والوں نے ٹھوکر کھائی تو اندھیرے میں کھائی۔ ان کے پاس تو روشنی تھی ہی نہیں لیکن یہود تو اندھیرے میں نہیں تھے۔ وہ تو نبی اکرمؐ اور قرآن کو ایسے پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو: یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۔۔۔ پھر بھی ایمان نہیں لا رہے۔ کیوں؟ اس کو آیت کے اس حصے کے آخر میں بیان کیا گیا: بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۔۔۔ اس تفرقے کا اصل محرک ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خواہش اور کوشش۔ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی تمنا اور سعی۔ ایک دوسرے پر ور آنے کی فکر۔ پھر قومی و گروہی مفادات۔ مناصب، تفاخر، وجاہت و حشمت، مذہبی قیادت و سیادت، ان پر مستزاد تکبر ہے، حسد ہے کہ یہ فضیلت بنی اسمٰعیل کو کیوں مل گئی۔ یہ تو ہمارے خاندان کی میراث ہے۔ ڈھائی ہزار برس تک نبوت کا سلسلہ ہمارے ...... یہاں جاری رہا ہے۔ کسی اور کو یہ فضیلت مل جائے، یہ ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں یہ PERSONALITY CLASH تھا۔ یہ شخصیتوں کا تصادم تھا۔ یہ کون اوپر اور کون نیچے کا جھگڑا تھا۔ بالاتر کون ہے اور کم تر کون! یہ سارا فساد دراصل اس کا تھا۔ یہ لوگوں کی انانیت تھی جس کے باعث وہ تفرقے میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنی دنیوی اغراض اور مصالح کی خاطر حق سے اعراض ہی نہیں بلکہ اس کی مخالفت اور دشمنی پر کمر کس رکھی تھی۔ اب ان تمام تشریحات و تصریحات کے ساتھ۔ آیت کے اس حصے کو پھر دیکھ لیجئے: وَمَا تَفَرَّقُوْآ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ط

(جاری ہے)

شذرات

محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے ۲۵/اپریل ۸۴ء کو ہندوستان کے دورے سے واپسی کے بعد ۲۷ اپریل کے جمعہ کی تقریر میں جن تین موضوعات پر اظہارِ خیال فرمایا تھا اس کو "شذرات" کے عنوان کے تحت کیسٹ سے منتقل کر کے قدرے حک و اضافہ کے ساتھ میثاق کے قارئینِ کرام کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا جا رہا ہے (ادارہ)

(ڈاکٹر صاحب نے خطبۂ مسنونہ، سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت، سورۂ النجم کی آیات از ۱۱ تا ۱۸ کی تلاوت، بعدہٗ ادعیۂ مسنونہ کے بعد فرمایا)

حضرات ! دو ہفتوں کی غیر حاضری کے بعد آج ملاقات ہوئی ہے[1]۔ آج متعدد ایسی باتیں جمع ہوگئی ہیں جن کے بارے میں مختصر اظہارِ خیال مناسب ہے۔ میرے یہ دو ہفتے چونکہ ہندوستان میں گزرے ہیں۔ اور اس سرزمین سے ہمارا تعلق یہ ہے کہ ہم میں بہت سے وہ لوگ ہیں جو وہاں سے نکالے یا نکلے ہوئے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند بہرحال تاریخی، جغرافیائی اور عمرانی اعتبارات سے ایک وحدت تھا۔ وہ اس لیے تقسیم ہوا کہ مسلمانوں کی قومیت کسی زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک آفاقی ملت اور عالمی اُمت کے افراد ہیں۔ ہمارے تحت الشعور میں یہ بات رچی بسی ہے۔ پھر شعوری طور پر یہ خطرہ محسوس ہوا کہ آزاد بھارت میں غیر مسلموں کی عظیم اکثریت مسلمانوں کی اقلیت کے دینی و قومی تشخص کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی، لہٰذا مسلمانوں کو ایک علاحدہ آزاد و خود مختار علاقہ جس میں ان کی اکثریت ہے، ملنا چاہیئے تاکہ وہ اس ملک پر اللہ کا دین قائم کریں چنانچہ تحریکِ پاکستان چلی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ۱۴ اگست ۴۷ء کو پاکستان کے نام سے ایک آزاد و خود مختار سلطنت کا وجود عمل میں آگیا۔ یہ سلطنت دو حصوں میں منقسم تھی اور ان کے مابین ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ تھا۔ مراد ہے، مشرقی پاکستان۔ جو ہماری ناعاقبت اندیشیوں، غلط پالیسیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے پاکستان سے کٹ گیا اس کا نام بھی بنگلہ دیش ہوگیا اور اب مغربی پاکستان ہی "پاکستان" کے نام سے دنیا کے نقشہ پر موجود ہے۔ بہرحال پاکستان کو قائم ہوئے سینتیسواں سال چل رہا ہے۔ تقسیم کے وقت ہندوستان میں رہنے والے تمام مسلمان

---

[1] امیر محترم ۹ اپریل سے ۲۵ اپریل تک بھارت میں حیدر آباد دکن دعوتی دورے پر تشریف لے گئے۔ (ادارہ)

تو نقل مکانی کر کے پاکستان نہیں آسکے اور اس وقت کی قریباً نصف تعداد ــــ پانچ کروڑ کے لگ بھگ ــــ وہیں رہ گئی۔ پاکستان آنے والے متعدد خاندان ایسے ہیں جن کے اعزہ و اقارب تاحال ہندوستان میں مستقل طور پر مقیم ہیں۔ اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم ہندوستان کے مسلمان شہریوں سے اپنے ذہن کو خالی کر لیں۔ لہٰذا یہاں کے مسلمانوں کو وہاں کے مسلمانوں کے حالات سے دلچسپی ہے۔ میں پہلی مرتبہ ۸۰ء میں جب ہندوستان گیا تھا تو واپس آ کر میں نے وہاں کے اپنے مشاہدات و تاثرات تفصیل سے بیان کیے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ اب بھی آپ حضرات کی یہ خواہش ہوگی کہ اس سلسلہ میں کوئی نئی بات ہو تو میں اسے آپ حضرات کے گوش گذار کروں۔

دوسرا معاملہ اس اہم خبر سے متعلق ہے جو آج ہی صبح آپ نے اخبارات میں پڑھی ہوگی۔ یہ نہایت ہی اہم خبر ہے جو بہت عرصہ کے بعد پڑھنے میں آئی ہے۔ قادیانیوں کے متعلق خواہ وہ ربوہ سے وابستہ ہوں خواہ لاہوری مکتبِ فکر سے، صدر صاحب کے جاری کردہ آرڈیننس پر بھی میں آج کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

تیسرے یہ کہ آپ کو معلوم ہے کہ آج رجب کی ۲۴ تاریخ ہے۔ ہجرت سے ایک سال قبل اسی ماہ رجب کی ستائیسویں تاریخ کو وہ محیر العقول واقعہ پیش آیا تھا جسے ہم واقعہ معراج[1] بھی کہتے ہیں اور اسراء کے لفظ سے بھی تعبیر کرتے ہیں ــــ اسی مناسبت سے ارادہ یہ ہے کہ کچھ باتیں اس ضمن میں بھی آپ حضرات کے سامنے رکھوں ــــ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ۔

ہندوستان کے حالیہ دورے کے تاثرات و مشاہدات

جہاں تک ہندوستان کے سفر کا تعلق ہے تو جو باتیں میرے پہلے سفر کا مشاہدہ تھیں ان کو میں تفصیل سے پہلی واپسی کے بعد بیان کر چکا ہوں۔ اُس وقت بھی اور آب بھی میری رائے یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا اور اسلام کا مستقبل بہت مخدوش ہو جاتا اگر وہاں اللہ کے فضل و کرم سے چند خاص حالات پیدا نہ ہو جاتے۔ ان حالات کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کے لیے اُس درجہ کی تشویش ناک اور مخدوش صورتِ حال فی الوقت موجود نہیں ہے کہ جس درجے کا پہلے اندیشہ تھا ــــ ایک تو یہ کہ ہندوستان میں بھی تاحال کوئی ایک مرکزی نیشنلزم DEVELOP نہیں ہو سکا۔ ہندوستانی قوم پرستی کا جذبہ اگر مضبوط ہو گیا ہوتا تو یقیناً مسلمانوں کے حالات وہاں ناگفتہ بہ ہو جاتے۔ وہاں بھی صورتِ حال کم و بیش وہی ہے جس کا ہمیں بھی کبھی کبھی تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ علاقائیت پسندی یا علاقائیت

---

[1] 'معراج النبیؐ' کے موضوع پر اسی نام سے محترم ڈاکٹر صاحب کا ایک خطاب مطبوعہ شکل میں موجود ہے (مرتب)

پرستی یا صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینے کے مطالبات ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں یہ جذبات ہمارے یہاں سے کے مقابلے میں زیادہ شدید ہیں۔ جنوبی ہند اور شمالی ہند کے مابین ایک مستقل رسہ کشی ہے۔ چونکہ تہذیب کا بڑا فرق ہے۔ زبانوں کا بڑا بنیادی فرق ہے۔ آپ کو یہ بات جو میں نے پہلے بھی بیان کی تھی یاد ہو، اور جنہوں نے نہیں سنی، وہ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ اگرچہ شمالی ہند کا رہنے والا ہو یا جنوبی ہند کا دونوں ہی ہندو کہلاتے ہیں لیکن ان کے یہاں اس وسیع فرق و تفاوت ہے کہ شمالی ہند میں رام چندر جی وہاں کے ہندوؤں کے ہیرو ہیں بلکہ وہ ایک طرح سے اوتار ہیں، معبود ہیں اور راون، باغی، فسادی، چور، ڈاکو اور شر کی علامت ہے۔ اس کا پتلا شمالی ہند میں ہر سال "رام لیلا" کے تہوار پر جلایا جاتا ہے ـــــ جنوبی ہند میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ وہاں کے ہندوؤں کا ہیرو راون ہے۔ وہ اس کی ایک نوع کی پوجا کرتے ہیں اور رام چندر جی کو وہ لٹیرا، غاصب، ظالم اور جنوبی ہند کی آزادی سلب کرنے والا حملہ آور سمجھتے ہیں۔ بعض شہروں میں رام چندر جی کا پتلا جلایا بھی جاتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنا تضاد اور فرق و تفاوت موجود ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں بھی سندھ میں کچھ کج فہم اور PERVERTED ذہن کے لوگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو لٹیرا اور ڈاکو کہا اور راجہ داہر کو محب وطن قرار دیا۔ درحقیقت یہ اس نوع کی چیزیں ہیں کہ جب علاقائیت پرستی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا نتیجہ اس طریقے سے ظہور کرتا ہے۔

دوسرا معاملہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ پہلے بڑی شدت کے ساتھ آسام وغیرہ میں اور اس علاقے میں جو ہندوستان کا شمالی شرقی کونا ہے جو قریباً ہندوستان سے کٹا ہوا ہے۔ ایک چھوٹا سا کوریڈور ہے جو بنگلہ دیش کے شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ اس علاقے کو ہندوستان سے ملاتا ہے۔ اس علاقے کے چار پانچ صوبے ایک علاحدہ سا علاقہ کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ دھرم کے لحاظ سے سب ہندو ہیں پھر بھی ان کی تہذیب اور زبان ایک دوسرے سے نہیں ملتی۔ بہت فرق ہے۔ اس کے باعث ان کی آپس میں چشمک چلتی رہتی ہے اور مرکزی حکومت سے بھی ان کے روابط ناخوشگوار ہیں اور ان میں رخنہ پڑتا رہتا ہے۔ اب ہماری سرحد سے متصل شمال مغرب میں بھارتی پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اور سکھوں کے ایک مؤثر گروہ کی مرکزی حکومت سے جو کشمکش چل رہی ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ روزانہ اخبارات میں خبریں آتی رہتی ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے ہندوستان کی لیڈر شپ کی توجہات ان گمبھیر مسائل کی طرف مرتکز ہو گئی ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کو سانس لینے کا موقع مل گیا ہے اور ان کے لیے یہ صورت حال نتیجہ کے اعتبار سے مفید ہے۔

تیسری بات جس کا ہندوستان جا کر صحیح اندازہ ہوتا ہے، جسے میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں،

یہ ہے کہ ہندوستان میں خود ہندوؤں میں تاحال ذاتیں اور چھوت چھات اسی طرح موجود ہے جیسی آزادی سے پہلے تھی۔ ہریجنوں کے ہندو دھرم کو چھوڑنے کے بھی وہاں متعدد واقعات ہوئے ہیں۔ جن کی خبریں اخبارات کے ذریعے یہاں بھی پہنچتی رہی ہیں۔ مزید اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو مذہب کا کوئی احیا نہیں ہوسکا۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہندومت میں اتنی جان، اتنا دم خم، اتنا وزن نہیں ہے کہ دنیا میں جدید علوم اور Sciences کی ترقی کی بدولت جو نقطۂ نظر پیدا ہوا ہے اس کا مقابلہ کرسکے۔ لہٰذا ہندو دیومالا کے احیا کی کوئی شکل پیدا ہونا مشکل ترین مسئلہ نظر آتا ہے۔ ہندو قوم پرستی تو پیدا ہوسکتی ہے لیکن ہندو مذہب کا احیا میرے نزدیک قریباً خارج از بحث ہے۔ آزادی کے بعد یہ ہوتا کہ ہندو قوم کا اپنے مذہب سے زیادہ لگاؤ پیدا ہوتا اسے زندہ کرنے کے لیے زیادہ سرگرمی ہوتی تو وہ صورت حال وہاں پیدا نہیں ہوئی۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے وہاں کے مسلمانوں کو ایک سہارا ملا ہے۔ ہم اسے INDIRECT RELIEF کہیں گے۔ لیکن بہرحال نتیجے کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے صورت حال نسبتاً بہتر ہوئی ہے۔

اس حالیہ دورے میں میرا زیادہ وقت حیدرآباد دکن میں گزرا ہے۔ اس کا یہاں سے بڑا طویل فاصلہ ہے، وہ گویا جنوبی ہندوستان کا سرا ہے۔ حیدرآباد دکن استخلاص وطن تک ہندوستان کی بڑی عظیم ریاست تھی جو مسلمان تمدن کا بہت بڑا گہوارہ رہی ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور اس سے متعلق جو ادارے تھے، انھوں نے اردو زبان کو جتنی تقویت پہنچائی اور تمام علوم حتیٰ کہ ہر نوع کی سائنس، انجینیرنگ اور میڈیکل کی تعلیم تقسیم سے قبل وہاں اردو میں ہو رہی تھی اور انتہائی زرِ کثیر خرچ کرکے ہر شعبے کے لیے نصاب اردو میں مدوّن و مرتب کر لیے گئے تھے۔ اتنی عظیم خدمات جامعہ عثمانیہ نے اردو کے لیے انجام دی تھیں۔ پھر یہ کہ میر عثمان علی خان بعض خوبیوں کے حامل بھی تھے۔ نوابوں اور راجہ مہاراجاؤں میں جس قسم کی خامیاں اور کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اپنی جگہ ہیں۔ لیکن میر عثمان علی خان میں علم دوستی اور علماء کی قدر و منزلت بہت زیادہ تھی ان کے دور میں ہندوستان میں جہاں کہیں بھی مسلمان اصحاب علم و فضل اور ماہرینِ فن موجود تھے۔ ان میں سے اکثر کو کونے کونے سے کھینچ کر حیدرآباد میں بلانا اور مختلف اداروں میں ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کو لگانا ان کا قابلِ ستائش کارنامہ ہے۔ اس طرح حیدرآباد دکن میں اتنا بڑا علمی سرمایہ جمع ہوا کہ اس کے گہرے اثرات تاحال حیدرآباد کی فضا میں موجود ہیں۔ اگرچہ ہندوستان کی حکومت کی جانب سے ستمبر ۴۸ء میں پولیس ایکشن کے دوران اور اس کے متصلاً بعد ریاست حیدرآباد دکن پر جو کچھ بیتی تھی اس کے ایک وقتی ردِ عمل کے طور پر مایوسی کی کیفیت سے وہاں کے مسلمان دوچار ہوئے تھے۔ اتنی بڑی ریاست کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن جانا بڑا عظیم سانحہ تھا پھر وہاں ان

حالات کی وجہ سے ہندوؤں میں جو سرکشی پیدا ہوئی اور ان میں جو انتقامی جذبات مشتعل ہوئے تو اس دور میں بڑے ہی سخت اور کٹھن حالات سے حیدر آباد کے مسلمانوں کو سابقہ پیش آیا۔ لیکن بحمد اللہ اب جو صورتِ حال ہے تو وہاں بہت حد تک سکون کی کیفیت ہے۔ البتہ کبھی کبھی وہاں کھٹ پٹ ہو جاتی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات ہو جاتے ہیں۔ لیکن اب وہاں کا مسلمان ذہناً اس کے لیے بالکل تیار ہے کہ اگر اسے ایسی صورت حال سے نمٹنا پڑ جائے۔ تو اسے اس میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آتی۔ کم و بیش پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی کیفیت یہی ہے کہ وہ اس نوع کے حالات سے نمٹنے کے لیے ذہناً اور عملاً تیار ہیں۔ میں وہاں کے مسلمانوں کے اس عزم اور حوصلے کے لیے اپنی گفتگوؤں میں آج کل ایک مثال دے رہا ہوں۔ وہاں بھی میں نے یہ مثال دی ہے کہ جیسے بعض امراض ایسے ہیں کہ وہ جب کسی کو لاحق ہو جائیں تو ڈاکٹر مریض سے کہا کرتا ہے کہ بھائی اب تمہیں اسی مرض کے ساتھ زندہ رہنا ہے YOU HAVE TO LIVE WITH IT اب اگر کسی کو ذیابیطس ہو گئی ہو تو یہ جڑ سے جانے والی بیماری نہیں ہے۔ ایسے مریض کو اپنی عادات، مرغوبات اپنی خوراک کو اس بیماری کے ساتھ Adjust کرنا ہو گا۔ اپنے معمولات میں کچھ ترمیم کر کے اسے اسی مرض کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ تو ہندوستان کے مسلمانوں نے اس بات کو ذہناً قبول کر لیا ہے کہ ہمیں اسی صورت حال کے ساتھ یہیں زندہ رہنا ہے۔ لہٰذا جب کبھی کوئی مڈبھیڑ، کوئی فساد، کوئی خون ریزی ہوتی ہے تو مسلمان اس صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ ویسے بحیثیت مجموعی یہ صورت حال جنوبی ہند میں نہیں ہے۔ یعنی تامل ناڈ، کرناٹک اور کیرالہ وغیرہ جو خالص جنوبی ہند کے صوبے ہیں۔ یہ نام بھی آپ میں سے بہت سے لوگوں کے لیے نئے ہوں گے۔ اس لیے کہ ہندوستان میں گنتی کے صوبے اپنے سابقہ ناموں کے ساتھ باقی رہ گئے ہیں۔ وہاں نئے نئے صوبے وجود میں آئے ہیں، نئے نئے پردیش ہیں، نئے نام ہیں۔ پھر حکومت ہند نے صوبوں کی جو نئی حد بندی کی ہے وہ خالص لسانی LINGUISTIC بنیاد پر کی ہے ہر صوبے کی اپنی ایک زبان ہے۔ وہاں کے تمام اندرونی معاملات اسی زبان میں طے ہوتے ہیں۔ صوبے کی حکومت کا تمام کاروبار صوبے کی حد تک صوبائی زبان میں ہو گا۔ مرکز سے ان کا رابطہ انگریزی کے ذریعے ہو گا۔ ہندی زبان کی بالادستی DOMINATION کو جنوبی ہند نے کسی طرح تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ ہندی پورے ہندوستان کی سرکاری زبان نہیں ہے۔ بلکہ صوبوں کی مرکز سے رابطہ کی اور صوبوں کے باہمی ربط کی زبان انگریزی ہے۔ اس طرح وہاں صورتِ حال بڑی حد تک بدل چکی ہے۔

جہاں تک جنوبی ہند کے تین بڑے بڑے صوبوں کا تعلق ہے تو وہاں مسلمان بڑے امن

اور سکون سے ہیں اور ان صوبوں کی حد تک فرقہ وارانہ فسادات کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ شمالی ہند میں فسادات ہوتے رہتے ہیں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ وہاں بھی مسلمانوں نے طے کر لیا ہے کہ ہمیں یہاں اسی صورت حال کے ساتھ ہی زندگی بسر کرنی ہے۔ میں یہ بات پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ شمالی ہند میں میرے پہلے سفر کے موقع پر کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ۱۷ء تک تو ہماری ذہنی کیفیت یہ تھی کہ ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا محافظ پاکستان ہے۔ جب پاکستان دولخت ہو گیا اور ظاہر بات ہے کہ دو خطوں کے علاحدہ ہو جانے کے باعث اس کی مجموعی طاقت نصف ہی نہیں ہوئی بلکہ کئی گنا گھٹ گئی۔ پھر ہمارا جو رعب اور بھرم تھا۔ تو ۱۷ء میں سقوطِ پاکستان کا جو سانحہ و حادثہ ہوا تو وہ ختم ہوا۔ ساتھ ہی ہمارا وقار اور ہماری عزت بھی پہلے جیسی نہیں رہی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم نے یہ سوچا کہ پاکستان اپنی ہی حفاظت کر لے، یہی کافی ہے۔ باقی رہا یہاں کا معاملہ، تو یہاں خود ہمیں اپنی حفاظت کرنی ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے اور اب اگر کوئی نازک مرحلہ درپیش ہو گا تو مار کر مریں گے، بھیڑ بکریوں کی طرح نہیں مریں گے۔ الحمد للہ وہ اپنے اس عزم اور ارادے میں پختہ ہیں اور ان میں اب مرعوبیت اور شکست خوردگی کے آثار نہیں رہیں۔ یہاں پاکستان میں بیٹھ کر ہمارا گمان ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسلمان بڑی پریشانیوں سے دوچار ہو گا۔ لیکن وہاں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ضرور ہوا ہے کہ جیسے انگریزی غلامی کے عہد میں ہوا تھا کہ مسلمانوں میں سرکار پرست حلقے کے لوگ انگریزی تہذیب میں بالکل رنگے گئے تھے۔ ہمارے ہاں بھی اس زمانے کی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کچھ CIVIL MARRIAGE ہو گئیں۔ میں نام نہیں لینا چاہتا لیکن اس زمانے میں یہ ہوا ہے کہ ہمارے کچھ بڑے TOP کے لیڈر تھے۔ جن کی بچیوں نے ہندوؤں سے، سکھوں سے یا کسی دوسرے سے شادیاں کر لی تھیں۔ اس طرح کی کوئی اِکّا دُکّا مثال اب وہاں بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ مثالیں شاذ کے درجے میں ہیں الشاذ کالمعدوم۔ اس پر آپ یہ قیاس نہ کریں کہ شاید بحیثیتِ مجموعی وہاں یہ معاملہ ہو گیا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے بلکہ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ دینی اعتبار سے وہاں کا مسلمان ہمارے مقابلہ میں بہت بہتر حالت میں ہے۔ ہمیں دولت کی ریل پیل، فراوانی اور آسائشوں نے دین سے بہت دور کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ آسائشیں اور دولت کی فراوانی دینی اعتبار سے مفید ہونے کے بجائے ہمارے حق میں نقصان دہ ہوئی ہیں۔ وہاں چونکہ ہر وقت مقابلے کی کیفیت رہتی ہے۔ لہٰذا وہاں اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھنے کا احساس اور جذبہ زیادہ ہے اور وہ اپنے دین کی بقا کے لیے ہم سے زیادہ فعال اور ACTIVE ہیں۔ وہ ہم سے زیادہ اپنی جگہ دینی کام کر رہے ہیں۔ اس وقت بھی ہندوؤں کی طرف سے کوششیں

ہو رہی ہیں خاص طور پر راجستھان میں کہ بڑے پیمانے پر مسلمانوں کو شدھی کر لیا جائے۔ اس لیے وہاں بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو نام کے مسلمان ہیں۔ جیسے میو قوم تھی کہ ماضی میں کسی بزرگ سے متاثر ہو کر اس کے ایک قبیلے نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن نہ ان کی تعلیم ہوئی، نہ تربیت ہوئی تو نام بھی ملے جلے سے رہے۔ ان میں مسلمانیت بھی تھی اور ہندوئیت بھی۔ رہن سہن خالص ہندوانہ اسی طرح راجستھان کے بہت سے اسی قسم کے قبیلوں کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ ہندو ان کو شدھی کرنے کی بڑی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن مسلمان اس طرف سے غافل نہیں ہیں، بیدار ہیں، اس کی روک تھام کی کوشش کر رہے ہیں — دوسری طرف یہ صورتِ حال بھی ہے۔ کہ جنوبی ہند میں ہندو مسلمان ہو رہے ہیں۔ وہاں گاؤں کے گاؤں ایک ساتھ مسلمان ہوئے ہیں۔ وہاں ہندوستان کی اصل ڈاور قوم کے لوگ اسلام کی طرف راغب اور مائل ہو رہے ہیں۔ اور وہاں مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا جارحانہ اور مؤثر انداز ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے تبلیغی کوششیں ہندوؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔

ایک بہت اچھی بات جو میرے خیال میں اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے جس سے ہندوستان کے مسلمان دو چار ہیں۔ یہاں کے مقابلے وہاں مجھے صورتِ حال بہت بہتر نظر آئی وہ یہ کہ جس طرح ہمارے یہاں بھی علاحدہ علاحدہ فقہی مکاتیبِ فکر ہیں، ان میں اختلافات ہیں۔ اسی طرح وہاں بھی ہیں۔ وہاں بھی مختلف مسالک کے لوگ موجود ہیں۔ بلکہ پاکستان میں حنفی ہیں، اہلِ حدیث ہیں اور شیعہ ہیں۔ جب کہ ہندوستان میں شافعی مسلک کے لوگ بھی کافی تعداد میں ہیں۔ مہاراشٹر اور کیرالہ ہندوستان کے مغربی ساحل کے دو ایسے صوبے ہیں جہاں شافعی المسلک مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ چونکہ اسی علاقہ میں عرب تاجروں کی تبلیغ سے اسلام پھیلا تھا جو زیادہ تر شافعی المسلک تھے۔ بمبئی کی جامع مسجد جو سب سے بڑی مسجد ہے وہ شافعی مسلک کی ہے، وہاں کے خطیب و امام شافعی ہیں — تو یہ فقہی اختلافات وہاں بھی ہیں۔ اسی طریقے سے جس طرح مختلف جماعتیں دین کے لیے یہاں کام کر رہی ہیں۔ جیسے یہاں جمعیت العلماء ہے تو جمعیت علماءِ ہند وہاں بھی ہے اور بڑی قوی اور مؤثر ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولانا اسعد میاں اس کے سربراہ ہیں۔ پھر جماعت اسلامی یہاں ہے تو جماعت اسلامی وہاں بھی ہے، تبلیغی جماعت یہاں ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ تبلیغی جماعت کا اصل مرکز ہے ہی ہندوستان میں۔ تو جو تحریکیں اور جماعتیں ہمارے یہاں سرگرمِ عمل ہیں، وہاں بھی برسرِکار ہیں۔ لیکن جو اچھی بات ہے وہ یہ ہے کہ یہاں ہمارے مختلف مکتب ہائے فکر میں اور تحریکوں میں جو تلخی ہے جو بُعد ہے، وہ

وہاں نہیں ہے بلکہ وہاں بحیثیت مجموعی رواداری بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر باہمی تعاون کی فضا موجود ہے۔ میں جنوبی ہندوستان میں جہاں بھی گیا وہاں میں نے یہی بات دیکھی۔ دہلی میں اور علی گڑھ میں بھی میں نے یہی خوشگوار کیفیت دیکھی۔

اس باہمی تعاون و اشتراک کی دو وجوہات ہیں جو بآسانی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ یہ کہ چونکہ وہاں ایک مشترک دشمن سے مقابلہ ہے اور ہر وقت ہے لہٰذا مسلمانوں کے اندر اختلاف کی خلیج بڑھنے نہیں پاتی۔ چونکہ ان کو اندازہ ہے کہ یہاں ہم کن حالات سے دوچار ہیں اور ہمیں کس طرح اپنا تحفظ کرنا ہے یہ طرزِ عمل اس لحاظ سے نہایت مفید ہے کہ وہ اپنے اختلافات کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ اور اختلافی مسائل پر مناظرہ و مجادلہ سے حتی الامکان اپنا دامن بچاتے ہیں۔ میں نے پچھلے سفر میں بھی مشاہدہ کیا تھا اور اس موقع پر بھی کہ وہاں اکثر دیوبندی اور اہلِ حدیث حضرات بریلوی مکتبِ فکر کی مساجد میں ان کے امام کی اقتداء میں نمازیں ادا کر لیتے ہیں۔ یہی روش اکثر بریلوی حضرات کی بھی ہے۔ یہ رواداری یقیناً باہمی اشتراک و تعاون میں بے حد ممد ہے ـــــ ثانیاً یہ کہ وہاں سیاست کے میدان میں کوئی خاص توقع نہیں ہے ـــــ اس کے برعکس یہاں پاکستان میں انتخابی سیاست نے زیادہ خرابی پیدا کی ہے۔ چونکہ جماعت اسلامی کو بھی انتخاب میں جانا ہے لہٰذا اسے بھی ووٹ چاہئیں۔ نورانی میاں کی جمعیت کو بھی ووٹ چاہئیں۔ اور مفتی محمود مرحوم کی جمعیت کو بھی ووٹ چاہئیں۔ ان سب کے پاس اپیل تو ایک ہی ہے۔ ووٹ اسلام ہی کے نام پر مانگے جائیں گے۔ لہٰذا جب تک وہ اپنے اپنے اسلام کو ممیز نہ کریں اور اس کا ایک جداگانہ تصور و تاثر اور تشخص قائم نہ کریں۔ تو اپنے لیے علاحدہ ووٹ کیسے حاصل کریں گے یہ وہ چیز ہے، جس نے یہاں فقہی و کلامی اختلافات نے فرقہ واریت کی شکل اختیار کر رکھی ہے اور اسے جنگل کی آگ کی طرح بڑھا دیا ہے۔ انتخابات میں حصہ لینے کی خاطر یہی اختلافات دینی اعتبار سے ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جمہوریت کے قیام کے لیے اتحاد ہو جائے گا چاہے اس اتحاد میں سوشلسٹ اور علاقائی قومیت کے نظریات رکھنے والی پارٹیاں بھی شامل ہوں، لیکن دین کیلئے آپس میں تعاون و اشتراک نہیں ہوگا الا ماشاء اللہ۔[1]

---

[1] پاکستان میں جماعتی عصبیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انجمن کے زیرِ اہتمام جو قرآن کانفرنسیں اور محاضرات منعقد ہوئے۔ ان میں اصرار کے ساتھ دعوت کے باوجود جماعت اسلامی کے اکابر نے اس عذر کی بنیاد پر حصہ لینے سے معذرت کا اظہار کیا کہ ڈاکٹر اسرار احمد کو جماعت اسلامی سے اختلافات ہیں حالانکہ اہم اختلاف پالیسی اور طریق کار کا ہے۔ الحمد للہ ان میں دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مسالک کے علماء اور اہلِ دانش نے بھرپور تعاون کیا اور اس پلیٹ فارم سے قرآن کا پیغام و پیام پہنچایا۔ (مرتب)

ہندوستان میں یہ چیز نہیں ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ یہاں مسلمان اتنی اقلیت میں ہیں کہ سیاسی اعتبار سے محب دین حلقوں کے لیے اس میدان میں کوئی CHANCE نہیں ہے۔ ویسے لبرل قسم کے مسلمان کانگریس (آئی) میں بھی ہیں۔ دوسری کانگریس اور جنتا پارٹی میں بھی ہیں۔ مسلم لیگ کا سیاسی پلیٹ فارم بھی موجود ہے بکچھ مسلمان ان کے ذریعے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں منتخب بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ کہ من حیث المجموع کسی مسلمان جماعت کا اقتدار میں آنا خارج از امکان و بحث ہے۔ یہ بات بھی اس تغیر کے لیے ممد ہو گئی ہے کہ دینی جماعتوں میں اپنا اپنا علاحدہ تشخص قائم کرنے کا جذبہ زیادہ نہیں ہے۔ کافی بڑی حد تک دبا ہوا ہے۔ یہ جماعتیں اپنے اپنے طریقے پر کام کر رہی ہیں تبلیغی جماعت اپنے طور پر کام کر رہی ہے۔ جماعت اسلامی کا اپنا ایک انداز ہے۔ علماء کے جو دوسرے حلقے ہیں۔ وہ اپنے اپنے طریقوں پر دین کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ ان میں اشتراک و تعاون بھی ہے۔ پچشمک نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ان جماعتوں کے علاوہ وہاں بہت سے مقامی طور پر نئے ادارے قائم ہو گئے ہیں جو اپنی اپنی جگہ علمی و تحقیقی انداز سے دعوت و تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ پورے ہندوستان میں بحیثیت مجموعی ان سب کے مابین فضا تعاون کی ہے۔ وہ فضا آپ کو یہاں دیکھنے میں نہیں آئے گی۔ میں نے اس حالیہ سفر کے سولہ دنوں میں سے دس دن حیدر آباد دکن میں گزارے ہیں۔ وہاں خاص طور پر میں نے دیکھا کہ وہاں بحمداللہ یہ فضا بہت نمایاں ہے۔ وہاں باہم بڑا تعاون ہے۔ رواداری ہے۔ مختلف جماعتوں اور اداروں کا اپنا علاحدہ علاحدہ طریق کار بھی ہے لیکن صاف محسوس و مشہود ہوتا ہے کہ مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ اس تعاون و اشتراک کی بڑی برکات ہیں جو وہاں ظاہر ہو رہی ہیں۔

ایک اور خاص بات جو اس مرتبہ سامنے آئی ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم کا کام وہاں بڑی تیزی کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کا سب سے بڑا CREDIT وہاں کی جماعت اسلامی کو جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت سرکاری طور پر تسلیم شدہ OFFICIALLY RECOGNIZED سترہ زبانیں ہیں۔ ویسے تو زبانیں اس سے بھی زیادہ ہو جائیں گی لیکن ان کو بولیاں کہیں گے۔ جو لٹریری زبانیں ہیں ان کی تعداد سترہ ہے۔ ان میں سے الحمد للہ ثم الحمد للہ بارہ زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ وہاں لوگوں نے بتایا کہ جب کسی مقامی زبان کے ترجمہ قرآن مجید کے تعارف کے لیے تقاریب منعقد ہوئیں تو ان میں ہندوؤں خاص طور پر ان کے نوجوانوں نے بھی شرکت کی۔ اس واقعہ کا حال بھی ایک معتبر ذریعہ سے مجھ تک پہنچا ہے۔ کہ ایسی ہی ایک تقریب میں کچھ ہندو نوجوانوں نے منتظمین میں سے ایک مسلمان کا گریبان پکڑ لیا اور کہا "ظالمو تم نے ہزار برس تک اس کتاب کو کہاں چھپائے رکھا؟

آج تم اسے INTRODUCE کرا رہے ہو! ایک ہزار برس سے تم یہاں ہو۔ کتاب الہی تمہارے پاس تھی، تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ اس میں کیا لکھا ہے"! (یہ روایت بالمعنی و مفہوم ہے) ـــــ واقعہ یہ ہے کہ یہ ہمارا قومی و ملی جرم ہے۔ جس کی سزا ہم نے بھگتی ہے۔ جب ہندوستان کا ہندو چپے چپے پر مسلمان تہذیب کے آثار اور مسلمانوں کے تمدن کی باقیات الصالحات، بڑی عظیم مساجد، عالی شان عمارات دیکھتا ہے تو اس کے دل میں انتقامی آگ بھڑکتی ہے کہ ہماری سرزمین پر باہر سے آنے والوں کی تہذیب و تمدن کا سکہ چلتا رہا اور ہم سینکڑوں سال ان کے غلام رہے۔

حیدر آباد شہر کا یہ حال ہے کہ اگرچہ وہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، لیکن تناسب کے لحاظ سے وہ شہر کی مؤثر اقلیت ہے۔ تیس لاکھ آبادی کے شہر میں مسلمان چودہ لاکھ ہیں۔ شہر میں ۴۵ فیصد ان کی آبادی بن جاتی ہے۔ لیکن حیدر آباد شہر کے دو حصے ہیں، ایک قدیم حیدر آباد اور ایک جدید حیدر آباد۔ قدیم شہر میں مسلمان تقریباً ۸۰ فیصد آباد ہیں۔ جدید میں تعداد بہت کم ہے ـــــ وہاں آدمی گھومتا ہے تو ایک چیز کا مشاہدہ کرتا ہے جو اب ہمارے ہاں قریباً نامانوس ہو گئی ہے۔ ہمارے یہاں وی سی آر کی وجہ سے خرابیوں کا جو سیلاب آ رہا ہے، اس کے باعث ادنیٰ درجہ میں سہی یہ فائدہ ہوا ہے کہ سینما کے بڑے بڑے نیم عریاں نوع کے بڑے بڑے اشتہارات اور قدآدم تصاویر کا جگہ جگہ لگے ہونا اب ہمارے یہاں زیادہ نمایاں نہیں رہا۔ یہ وبا حیدر آباد میں بہت شدید نظر آئی۔ اور ہندوستان میں جو فلمیں بن رہی ہیں ان کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ ان میں عریانی اور بے حیائی ہمارے یہاں سے بہت زیادہ ہے ـــــ اس کا مظہر جا بجا بڑے بڑے پوسٹروں کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس کو نظر انداز کر دیں تو حیدر آباد شہر پر مسلمان تہذیب کی چھاپ فیصلہ کن ہے۔ ہر جگہ شاندار مساجد دیکھنے میں آئیں گی کوئی چھوٹا سا مندر کہیں نظر آ جائے تو آ جائے ـــــ حال ہی میں ایک پہاڑی پر برلا مندر کے نام سے ایک نیا مندر تعمیر ہوا ہے جو بلندی پر ہونے کی وجہ سے دور سے نظر آتا ہے۔ یہ علاحدہ بات ہے، کم از کم ہمیں حیدر آباد شہر میں کوئی بڑا مندر نظر نہیں آیا۔ اس کے برعکس مسجدیں ایک سے ایک شاندار اور فن تعمیر کا شاہکار ـــــ مکہ مسجد جو شہر کے وسط میں ہے جیسے ہمارے ہاں شاہی مسجد ہے۔ البتہ مکہ مسجد اتنی بڑی نہیں ہے، اس سے چھوٹی ہے۔ لیکن شہر کے بالکل وسط میں واقع ہوئی ہے اور اس کی COMMANDING حیثیت ہے ـــــ پھر ہر محلہ میں بڑی بڑی مساجد ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر حیدر آباد دکن اسلامی تہذیب و تمدن کا کتنا عظیم گہوارہ رہا ہے ـــــ ان چیزوں کو دیکھ کر ایک حسرت کا دل پر تاثر تو قائم ہوتا ہے کہ آخر یہ ہمارے ہاتھ سے کیوں چھن گئیں ـــــ ہندوستان میں یہ بپتا مسلمانوں پر کیوں آئی۔ لیکن اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے حکمرانوں نے عیش کیے ہیں، عمارتیں بنائیں ہیں، باغات لگوائے ہیں

اور مقبرے بنانے میں تو ــــــــ باقاعدہ دوڑ میں حصّہ لیا ہے۔ لیکن بحیثیت مسلمان دعوت و تبلیغ، شہادت علی الناس کے جو دینی فرائض عائد ہوتے تھے۔ ان کو ادا نہیں کیا۔ قرآن حکیم کا توحید پر مبنی انقلابی فکر دوسروں تک کیا پہنچاتے خود مسلمان اس سے ناواقف رہے۔ اور اب تک اس سے ناواقف ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر اقبال کا ایک مصرع ہے کہ ؎ مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے تو ہندوستان کا مسلمان اسلام کے لیے اب زیادہ بیدار، فعال اور چوکس ہے اور اب وہاں مناسب نہج سے دعوت و تبلیغ کا کام ہو رہا ہے۔ مستقبل کے حالات کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اس خیال کو خارج از بحث نہیں کہا جا سکتا کہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہندوستان میں ہو اور اللہ تعالیٰ اپنا فضل اس طور سے فرما دے کہ۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ہم یہاں عیش و آرام اور اپنا معیار زندگی بلند کرنے کی فکر میں پڑے رہیں۔ ہمارے سیاسی زعماء اپنے اختلافات سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوں۔ ہمارے علمائے کرام اپنے علم و فضل سے لوگوں کی اصلاح اور ان کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن کرنے کے بجائے فقہی اور گروہی تحفظات کے چکر میں پڑے رہیں اور انتخابی سیاست ہی میں الجھے رہیں، سیاسی سرگرمیوں میں ہی منہمک رہ جائیں، اور ہندوستان کا مسلمان ان مشکلات اور نامساعد حالات کے باوجود جو کام کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور وہاں اسلام کا کام بہتر شکل میں ابھر کر ہمارے سامنے آجائے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ط

دہلی، علی گڑھ اور خاص طور پر حیدرآباد دکن میں دینی لحاظ سے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ وہاں تا حال پردہ موجود ہے۔ ہمارے یہاں سے کوئی تقابل ہی نہیں۔ ہمارے یہاں سے تو پردہ قریباً ختم ہو چکا ہے۔ کراچی اور لاہور جیسے شہروں میں آپ کو برقعے شاذ ہی کہیں نظر آجائیں گے۔ مسلمانوں کی تقریبات، شادی بیاہ کے معاملات میں، میرا یہ خیال ہے کہ کہیں سینکڑوں میں کوئی ایک خاتون برقعہ والی ہو۔ ورنہ برقع ہمارے یہاں معدوم کے درجے میں آگیا ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں نظر آتا ہے کہ وہاں اس لحاظ سے حالت بہت بہتر ہے۔ وہاں مسلمانوں کی معاشرت و تہذیب کا جو نقشہ تقسیم سے پہلے تھا وہ برقرار ہے۔ اکثریت کی یہی کیفیت ہے حالانکہ ایسی بات نہیں ہے کہ وہاں کی مسلمان عورت بیدار نہیں ہے۔ یا جدید تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہے۔ حیدرآباد میں میرے درس اور تقریر میں بہت بڑی تعداد میں خواتین نے شرکت کی۔ وہاں میری روزانہ دو

سوا دو گھنٹے کی ایک تقریر عشاء کے بعد ہوتی تھی۔ تین دن تو مرکزی مقام کے لحاظ سے مکہ مسجد میں ہوئی ہیں چونکہ شہر کافی پھیلا ہوا ہے تو باقی دنوں میں مختلف جگہوں پر بڑی مساجد میں جلسے ہوئے ہیں آخری جلسہ جو ۱۹ اپریل کی شب کو مکہ مسجد میں ہوا ہے تو اس کی حاضری کے بارے میں وہاں کے منتظمین کا محتاط اندازہ یہ ہے کہ دس ہزار کے قریب اس میں صرف مرد شریک تھے — مکہ مسجد کا صحن دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ درمیان میں خاندان آصفیہ کے بادشاہوں کے مقبرے ہیں — صحن کا دو تہائی حصہ مسجد کے دالان سے متصل ہے اور ایک تہائی مقبروں کے بعد ہے۔ جہاں خواتین کی نشست کا انتظام تھا۔ بائیں صحن کے ساتھ بڑی گیلری بھی ہے۔ منتظمین نے مجھے بتایا کہ اتنی ہی تعداد میں وہاں خواتین بھی شریک تھیں۔ اتنا بڑا جلسہ وہ بھی خالص دینی مقصد کے لیے لوگوں کے بقول مثالی تھا ئیں نے قریباً دو گھنٹے اس میں "حقیقتِ ایمان" کے موضوع پر تقریر کی مجھے بتایا گیا کہ مجال ہے کہ دورانِ تقریر ایک آدمی بھی اس مجمع سے اٹھا ہو۔ پھر یہ کہ ہندو پریس نے میرے دورس اور تقریروں کے بارے میں تفصیلی رپورٹیں اخبارات میں شائع کی ہیں۔ اپنے تأثرات بیان کیے ہیں۔ میری دعوت کے بارے میں مضامین لکھے ہیں اور اسے سراہا ہے۔ وہاں ایک ہندو بڑا LEADING ADVOCATE ہے۔ مکہ مسجد میں وہ میری دوسری تقریر میں شریک ہوا اور ایک بڑا سا پھولوں کا ہار لے کر آیا۔ اور میرے گلے میں ڈالا۔ وہ ایک سپاسنامہ بھی پڑھنا چاہتا تھا۔ اس کی تو اجازت نہیں دی گئی — تو وہاں ہندوؤں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو FACE VALUE پر بات سننے اور اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں — حیدرآباد میں رابندر ناتھ ٹیگور کے نام سے ایک بہت بڑا آڈیٹوریم بنا ہے۔ اس آڈیٹوریم میں پہلی مرتبہ میرے حیدرآباد جانے سے دینی اجتماع ہوا۔ ورنہ وہاں ناچ رنگ کے پروگرام ہوتے ہیں "ثقافتی طائفے" اس میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں سے وہاں ثقافتی طائفے ہی عموماً جایا کرتے ہیں — تو اس میں پہلا دینی اجتماع میری اس VISIT پر ہوا ہے۔ جس میں کثیر تعداد میں ہندوؤں نے بھی شرکت کی تھی۔ بہرحال چند موٹی موٹی باتیں ئیں نے اپنے ہندوستان کے چند شہروں کے حالیہ دورے کے متعلق آپ کے گوش گزار کر دی ہیں۔

آپ دعا کریں وہاں کے مسلمان جن حالات میں بھی ہیں انہیں اللہ استقامت دے۔ دنیا کے اعتبار سے ان کے لیے ترقی کے اتنے مواقع نہیں ہیں جو ہمارے لیے یہاں کھل گئے۔ دنیوی ترقی کے جو دروازے ہمارے لیے کھل گئے ہیں۔ دینی اعتبار سے ان کو ہم نے اپنے لیے مضر بنا لیا ہے جس کے پاس دو پیسے آ گئے، خوشحالی اور آسودگی آ گئی اس گھر سے برقع رخصت ہوا۔ تہذیب معاشرت کے انداز بدل گئے۔ شعائر دینی سے بُعد بڑھ گیا۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ معلوم ہوا کہ تنگی ترشی

کے ساتھ برقع بھی تھا، پردہ بھی تھا۔ دین سے کسی نہ کسی درجے میں شغف بھی تھا۔ ذرا سی بھی کشادگی حاصل ہو گئی ہے تو بہت سی چیزوں کو جو ہمارے دین اور تہذیب کے شعار میں شامل ہیں اور شامل رہی ہیں اٹھا کر پھینک دیا گیا ہے۔ بہر حال میرا ASSESSMENT یہ ہے کہ دینی اعتبار سے ہندوستان کا AVERAGE مسلمان پاکستان کے AVERAGE مسلمان سے بہت بہتر حالت میں ہے۔ اور وہاں اسلام کا مستقبل کسی درجہ میں بھی قطعاً مخدوش نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میرے اندازے میں بظاہر احوال جو صورت نظر آئی ہے ویسے تو سب کچھ اللہ ہی کو معلوم ہے واللہ اعلم۔ اس اعتبار سے شاید پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان میں اسلام کا مستقبل بہتر ہو۔

قادیانیوں کے متعلق آرڈیننس

دوسری بات مجھے اس تاریخی فیصلہ کے متعلق عرض کرنی ہے جس کا ایک آرڈیننس کے ذریعہ تعزیرات پاکستان میں اضافہ ہو گیا ہے جو آج صبح کے اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ یہ دراصل ایک نیچرل اور منطقی قدم ہے۔ ۱۹۷۴ء کے دستور میں قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے متعلق جو شق شامل کی گئی تھی، اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ یہ قدم فوراً ہی اٹھا لیا جاتا۔ لیکن سابقہ حکومت میں اس طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی، موجودہ حکومت کو بھی یہ فیصلہ کرنے میں بہت وقت لگا ہے۔ سات سال گزر گئے تب یہ قدم اٹھایا گیا ہے لیکن بہر حال اسے دیر آید درست آید کہہ لیں یا ' BETTER THAN NEVER ' بالکل نہ ہونے سے ہونا بہر کیف بہتر ہے کے مصداق یہ بہت مستحسن قدم ہے۔ اس لیے کہ کافی عرصے سے واقعتاً یہ محسوس ہو رہا تھا کہ قادیانیت کا رویہ پھر OFFENSIVE ہو گیا ہے۔ ان کا رویہ شدید جارحانہ ہو گیا ہے۔ اور بڑے شد و مد کے ساتھ ان کی اپنی تبلیغ کا سلسلہ جاری تھا۔ یہاں آتے وقت ایک صاحب نے ان کا ایک کتابچہ مجھے دیا ہے جس کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ اخبارات کے ساتھ وہ بڑے پیمانے پر تقسیم ہوا ہے۔ ان کی جرأتیں اتنی بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ جن کی وجہ سے افواہوں کی شکل میں عوام میں یہ بدگمانی بھی پھیل گئی تھی کہ صدر ضیاء الحق صاحب قادیانی ہیں۔ بہت بڑے بڑے جرنیلوں کے متعلق کہا گیا کہ وہ قادیانی ہیں۔ اگرچہ میں نے کبھی اس قسم کی باتوں کو تسلیم نہیں کیا۔ ایسی باتیں اڑا دی جاتی ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ تاثر قادیانیوں ہی کی طرف سے دیا گیا ہو۔ ان قادیانیوں کی طرف سے اپنی سرگرمیوں کے اعتبار سے جارحیت کی ایک کیفیت کافی عرصہ قبل سے پیدا ہو گئی تھی اس لئے بھی یہ شک و شبہات

تھے جو ذہنوں میں سر اٹھا رہے تھے۔ الحمد اللہ جو فیصلہ ہوا ہے، بہت عمدہ ہوا ہے، مستحسن ہوا ہے۔ اس نے تمام بدگمانیوں کو ختم کر دیا ہے اور توقع یہی ہے کہ اب اس پر پوری طرح عمل درآمد بھی ہوگا۔ بہرحال اس صحیح اقدام اور فیصلہ پر میں صدر ضیاء الحق صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں۔

میں یہ بات عرض کروں گا کہ یہ سارا معاملہ ہمارے لیے خوشی کا موجب نہیں ہے بہرحال یہ قادیانی ہمارے ہی جسد کا ایک ٹکڑا تھے۔ لیکن ان کو بہت ہی مجبوری اور خود ان کی اپنی ضلالت، سرکشی و بغاوت کی وجہ سے کاٹا گیا ہے۔ امت مسلمہ کی پوری تاریخ یہ گواہی دیتی ہے کہ تکفیر میں کبھی خوشی حاصل نہیں ہوئی کہ کسی شخص یا گروہ کا تعلق امت سے منقطع کر دیا جائے۔ بلکہ ہمارے یہاں تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات بہت معروف ہے۔ کہ اگر کسی شخص میں تین پہلو کفر کے نظر آئیں لیکن ایک پہلو اسلام کا نظر آئے۔ تب بھی اسلام والے پہلو کو سامنے رکھیئے اور تکفیر کی طرف مت جائیے۔ ویسے خود قادیانیوں نے اور ان کے زیر اثر بعض لوگوں نے جن میں ہمارے ایک چیف جسٹس صاحب بھی تھے۔ جو اب فوت ہو چکے ہیں یہ بہانہ بنایا کہ مسلمان تو ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہی رہتے ہیں۔ بریلویوں نے دیوبندی اور اہل حدیث گروہ کو کافر کہا اور انہوں نے بریلویوں کو کافر کہا۔ حنفی اہل حدیث کو کافر کہتے ہیں۔ اور اہل حدیث حنفیوں کو ــــ یہ شاذ باتیں ہوتی ہیں کہ کوئی شخص جوش خطابت میں آکر یا تعصب سے مغلوب ہو کر ایسی بات کہہ دے تو ایسا نہیں ہوا ہے کہ امت نے بحیثیت امت ان باتوں کو کبھی SERIOUSLY لیا ہو ــــ مناظرانہ انداز اور مخالفانہ جوش میں علم قسم کے واعظین ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں اور عوام کا ایک گروہ بھی اس سے کسی درجہ میں متأثر ہو جاتا ہے ــــ عام طور پر سلسلہ چلتا رہتا ہے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ امت نے باقاعدہ قانونی اور عدالتی انداز میں کسی فرد واحد کی نہیں بلکہ ایک پورے گروہ کی تکفیر کر کے اس کا تعلق امت سے منقطع کر دیا ہو۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے دوسرے گروہ موجود ہیں کہ اگر ان کے اعتقادات کا جائزہ لیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ ان کو کسی طور پر بھی مسلمان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن چونکہ تکفیر سے مسلمانوں کو دلچسپی نہیں اس لیے عموماً ایسے گروہوں کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، جنہوں نے جارحیت اختیار نہیں کی اور اپنے گروہ کے معتقدات کی تبلیغ سے گریز کیا ہے۔ ورنہ میں آپ سے برملا کہتا ہوں کہ اگر اسماعیلی فرقے کے اعتقادات کا جائزہ لیا جائے تو کسی طرح بھی یہ کہنا ممکن نہیں ہوگا کہ انہیں مسلمان شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ علاحدہ سا ایک طبقہ ہیں ــــ جس نے ایک COMMUNITY کی صورت اختیار کر لی ہے۔ وہ اپنے معتقدات کی تبلیغ نہیں کرتے۔ دوسروں پر تنقید نہیں کرتے۔ ان میں جارحیت نہیں ہے۔ وہ سوشل کاموں میں مگن ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں نے ان کی طرف کبھی توجہ نہیں دی ــــ قادیانیوں کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔

پہلی اور اہم ترین بات تو یہ ہے کہ پہلے انہوں نے اپنے سوا سب مسلمانوں کو کافر ٹھہرایا ہے۔ پہلے انہوں نے مسلمانوں کی تکفیر کی ہے۔ انہوں نے قرار دیا ہے کہ جو غلام احمد کو نبی نہیں مانتا، وہ کافر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ بالکل منطقی نتیجہ ہے دعوائے نبوت کا۔ اگر کوئی کسی حقیقی نبوت کا انکار کرے تو وہ لازماً کافر۔ اسی طرح اگر کوئی جعلی اور جھوٹی نبوت ہے تو جو اس کا اقرار کرے تو وہ کافر۔ نبوت تو اس دنیا میں اللہ کی عدالت ہوتی ہے۔ یہ شئے قاطع ہے یہ علاحدہ کر دیتی ہے۔ آپ سوچیئے کہ یہودیوں اور ہمارے مابین فرق کیا ہے۔ اللہ کے دو نبی ایسے ہیں، جن کو وہ نہیں مانتے۔ باقی تو سب کو مانتے ہیں۔ انہوں نے انکار کیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا۔ دو نبیوں کے انکار کی وجہ سے من دیگرم تو دیگری۔ ہم اور ہو گئے وہ اور ہو گئے۔ اسی طریقہ سے عیسائیوں کا معاملہ ہے وہ حضور کو نہیں مانتے۔ حضرت مسیح کو مانتے ہیں۔ وہ غلو کرتے ہیں حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، یہ علاحدہ بات ہے بہرحال انکار تو نہیں کرتے۔ انکار صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کرتے ہیں۔ لہذا یقیناً ہمارے نزدیک وہ کافر اور ہم حضرت عیسیٰ کو ماننے کے باوجود ان کے نزدیک کافر۔ پس معلوم ہوا کہ یقیناً نبوت کا دعویٰ تقسیم کر دینے والا اور علاحدہ کر دینے والا دعویٰ ہے۔ لہذا اپنے سوا تمام دنیا کے مسلمانوں کی تکفیر کے PROCESS کا آغاز انہوں نے کیا۔ بلکہ ہم نے بہت عرصہ صبر کیا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو جو غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں مانتے ایسی ایسی گالیاں دی ہیں اور مسلمان عورتوں کے متعلق ایسی رکیک اور بیہودہ زبان استعمال کی ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ ان کو سنا کر اپنی زبان کو ناپاک کروں۔

آپ کو معلوم ہے کہ قائد اعظم نے سر ظفر اللہ خاں قادیانی کو کس طرح اٹھایا اور ابھارا اور کتنے بڑے مقام تک پہنچایا۔ ذاتی طور پر وہ کتنے بڑے محسن تھے ظفر اللہ خاں کے۔ لیکن اس شخص نے جو ظلم کیا وہ آپ سب کو معلوم ہے۔ یا تو وہ اس وقت وہاں موجود نہ ہوتا کہیں باہر چلا جاتا۔ لیکن ائد اعظم کے جنازے کی نماز تک موجود رہا لیکن نماز میں شرکت نہیں کی۔ اخبار والوں کے استفسار راس نے برملا یہ کہا کہ "آپ چاہیں تو ایک کافر حکومت کا مجھے مسلمان وزیر سمجھ لیں اور چاہیں تو لک مسلمان حکومت کا کافر وزیر سمجھ لیں"۔ معلوم ہوا کہ یہ کام شروع انہوں نے کیا۔ مسلمان تو جب ب آمد بجنگ آمد والا معاملہ ہوا ہے اور محسوس کیا ہے کہ ایک تو انہوں نے نبوت کی بنیاد پر اپنی لحدہ ایک امت اور ملت بنا لی اور وہ بہت منظم اور مضبوط ہو گئی۔ اس لیے کہ نبوت کی بنیاد پر گروہ اٹھے گا، اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کس کی ہو گی۔ کوئی جماعت اتنی مضبوط نہیں ہو سکتی۔ فی نبی کی جماعت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ باقی جتنی جماعتیں ہوں گی، ان کے سربراہوں سے ان کے ل سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ کیا نبی سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے؟ نبی سے اختلاف

کرتے ہیں تو ایمان کے لالے پڑتے ہیں۔ لہذا مرزا غلام احمد نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے ایک تو اس کا بھرپور فائدہ اٹھالیا۔ اپنی تنظیم اس نے بڑی مضبوط کر لی۔ دوسری طرف انگریزی حکومت کی اس نے چاپلوسی، کاسہ گدائی اور اپنی اور اپنی جماعت کی وفاداریوں کی یقین دہانی کرا کے اس کی سرپرستی حاصل کر لی۔ انگریز کا اصول ہی یہ تھا کہ DIVIDE AND RULE لئے مسلمانوں کے اندر افتراق پیدا کرنے اور ان کی اجتماعی قوت کو منتشر کرنے کے لیے ایک مہرہ مل گیا جسے انہوں نے اپنی بساطِ سیاست پر خوب استعمال کیا اور اس سے خوب فائدہ اٹھایا پھر یہ کہ ان قادیانیوں کی جسارت اتنی بڑھی کہ انہوں نے دینی اصطلاحات کے ساتھ دھڑلے سے وہ بھی اصطلاحات استعمال کیں جو نبی اور ان کے اہل بیت اور حواریین کے ساتھ مختص ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اپنی عبادت گاہوں کو مسجد کے نام سے موسوم کیا اذان کا وہی طریقہ رکھا جو مسلمانوں میں رائج ہے۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں کی صفوں میں گھسنے کا راستہ نکالا۔ وہ لوگ جن کو ان چیزوں کی خبر نہیں ہے۔ رفع اور نزولِ مسیح کے متعلق انہیں صحیح دینی معلومات نہیں ہیں یا تکمیل و اکمالِ نبوت کے مسائل سے ان کو صحیح واقفیت نہیں ہے۔ قادیانیوں نے یہ چند مسائل پکڑے ہوئے ہیں اور مسلمانوں میں نفوذ کر رہے تھے۔ اور اندر ہی اندر وہ ہمارے جسدِ ملی کو دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے۔ اس لیے مجبوراً مسلمان اٹھ کھڑا ہوا اور ۵۳ء میں ایک عظیم تحریک ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے لیے چلی۔ یوں کہنے کو ہمارا وہ دور اچھا دور تھا۔ لیکن اس دور میں جو کچھ ہوا ہے وہ آپ کو یاد ہوگا۔ وہ ہماری تاریخ کے بدنما داغوں میں سے ایک داغ ہے۔ یہی ہمارا شہر لاہور اس دور میں بدترین مارشل لاء کی گرفت میں تھا اور یہاں جو خون ریزی ہوئی تھی اور ہمارے ایک جرنیل صاحب نے مسجد وزیر خاں کو اس طرح فتح کیا تھا۔ جیسے ایک بیرونی حملہ آور کسی شہر کو فتح کرتا ہے یہ سانحہ ہم میں سے اکثر کو یاد ہوگا۔ ہماری تاریخ کا یہ ایک تاریک افسوس ناک باب ہے بہرحال اس وقت کی قربانی رائیگاں نہیں گئی اگرچہ اس کے بعد بیس برس بیت گئے۔

لیکن جب وہ تحریک دوبارہ اٹھی تو بحمد اللہ ۷۴ء میں جو تحریک اٹھی تھی، وہ چونکہ خالص غیر سیاسی تھی۔ اس کے سربراہ تھے مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ وہ بالکل سیاسی شخصیت نہیں تھے بلکہ ایک جید اور مشہور و معروف عالم دین تھے۔ یہی چیز اس تحریک کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی۔ پھر یہ کام اس شخص کے دورِ اقتدار میں ہوا جس کا اس وقت نام لینا بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ بھٹو میں جو کچھ خرابیاں تھیں، وہ تھیں لیکن اس نے جو چند اچھے کام کیے تھے اس کا CREDIT بہرحال اسے دیا جانا چاہیے۔ ایک کام اس نے یہ کیا کہ اس ملک کو ایک متفقہ دستور دیا۔ اس معاملہ میں اس نے اپنے اندر کافی لچک پیدا کی۔ اس نے

دوسری سیاسی پارٹیوں کے نقطۂ نظر کو دستور میں ACCOMMODATE کیا۔ پھر یہ کہ دستور پر سب جماعتوں کے دستخط لیے کہ یہ ہمیں منظور ہے۔ یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اگرچہ بعد میں اس نے خود یہ CREDIT ضائع کر دیا کہ اس نے اس دستور کو ترمیم در ترمیم در ترمیم کے ذریعہ سے موم کی ناک بنا دیا۔ دستور کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسی دستاویز ہوتی ہے کہ جس میں آسانی سے تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ تاکہ اس کا تسلسل قومی زندگی میں برقرار رہے۔ لیکن بھٹو نے ملک کو ایک متفقہ دستور دینے کے CREDIT کو خود ضائع کر دیا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا جو دوسرا کام ہوا تھا وہ اتنے صحیح نہج پر ہوا تھا کہ دنیا کا کوئی شخص اس پر انگلی نہیں رکھ سکا۔ حالانکہ برطانیہ ہو، امریکہ ہو اور دوسری بڑی طاقتیں ہوں وہ سب ان کی پشت پناہ ہیں۔ تمام ان کے ساتھ ہمدردی رکھتی ہیں۔ دنیا کا عام طور پر SECULAR ذہن ہے۔ مذہب کی بنیاد پر یہ ذہن تفریق قبول نہیں کرتا اور یہاں چونکہ یہ تفریق مذہب کی بنیاد پر ہوئی تھی لہذا عہدِ جدید کے ذہن کے خلاف ہم نے یہ قدم اٹھایا تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔ قادیانیوں کی برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا جو معاملہ رہا ہے اس کا کوئی بدلہ وہ چکانا چاہے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس کی خاص ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں لیکن یہ کہ جس PROCESS کے تحت یہ کام ہوا تھا اس پر کسی کو اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ اس وقت ملک کا جو منتخب با اختیار ادارہ تھا۔ یعنی نیشنل اسمبلی اس نے اس کا فیصلہ کیا۔ اسمبلی نے پہلے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس نے قادیانیوں کو بھرپور موقع دیا کہ آؤ اور اپنی صفائی پیش کرو۔ تمہارے لٹریچر سے جو اقتباس پیش کیے جا رہے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے بے شمار دعوے کیے تھے اور اس کا آخری دعویٰ نبوت کا دعویٰ تھا۔ اگر یہ بات غلط ہے تو اپنی صفائی پیش کرو۔ انہوں نے کمیٹی کے سامنے جا کر اپنی صفائی بھی پیش کی ہے۔

چنانچہ بالکل عدالتی عمل PROCESS کے مطابق اور اس کے نہج پر تمام FINDINGS کی گئیں۔ پھر فیصلہ نہ کسی فردِ واحد کا ہوا اور نہ ہی اس کمیٹی نے کیا بلکہ اس نے اپنی FINDINGS ملک کے با اختیار منتخب ادارے میں پیش کیں اور یہ اس کا فیصلہ تھا۔

یہ ایک بہت اچھا کام تھا جو اس وقت ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد اس فیصلے کے مقتضیات پر عمل درآمد کا مرحلہ تھا۔ اس پر کچھ بھی کام نہیں ہوا۔ قادیانی اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہے۔ دھڑلے سے کہتے رہے۔ ان کی عبادت گاہ مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ مسلمان دھوکہ کھا جائے گا۔ جس شخص کو پتہ نہ ہو وہ وہاں نماز ادا کرنے داخل ہو جائے گا۔ اور وہاں اس کو کوئی ایسی DOSE پلائی جائے اور ایسی تبلیغ اس پر کر دی جائے یا اسے دنیوی ترقی کا سبز باغ دکھایا جائے کہ وہ بہک

جائے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ اس بات پر سپریم کورٹ میں مقدمہ بھی چلتا رہا ہے کہ قادیانیوں کو روکا جائے کہ وہ اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہ کہیں ـــــ اب تو اس سے بھی آگے کی بات طے کر دی گئی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہ کہیں بلکہ اسے مسجد کی شکل دینے کے بھی وہ مجاز نہیں ہیں وہ کسی اور طرز کی عمارت بنانا چاہیں تو بنائیں ـــــ لاہور میں گلبرگ میں شاہ جمال میں ان کی ایک مسجد ہے۔ اس کی وضع اور ساخت بالکل مسجد کے مطابق ہے لیکن وہ اسے مسجد نہیں کہتے۔ اس کا نام انہوں نے "دار الذکر" رکھا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے وہ جو چاہیں نام اختیار کر لیں لیکن یہ کہ وہ اس کی شکل مسجد کی نہ رکھیں اور اسلامی اصطلاحات قطعی استعمال نہ کریں۔ اس کے بعد بہر حال ایک MINORITY کی حیثیت سے ان کو تمام حقوق حاصل ہیں اور حاصل رہیں گے۔ جیسے ہمارے یہاں عیسائی اور دوسری مذہبی اقلیتوں کو حقوق دیے گئے ہیں۔ لیکن وہ اسلام کی چادر اور اس کے لبادے میں خود کو چھپا کر مسلم معاشرے میں جو زہر گھول رہے تھے۔ اور انہوں نے جارحیت کا جو انداز اختیار کیا ہوا تھا اس کا راستہ صدر صاحب کے جاری کردہ آرڈیننس کے ذریعے سے ان شاء اللہ تعالیٰ رک جائے گا۔ میں اس اقدام پر صدر مملکت جنرل ضیاء الحق صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں اور ان علماء کرام کی خدمت میں بھی ہدیۂ تبریک و تحسین پیش کرتا ہوں جنہوں نے اس سلسلہ میں محنتیں کی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل سے تحفظ ختم نبوت کی مجلس عمل چونکہ کافی فعال و متحرک ہو گئی تھی اور ملک کے بہت سے ممتاز شہروں میں نہایت کامیاب ختم نبوت کانفرنسیں منعقد ہو چکی تھیں اور اسلام آباد، راولپنڈی میں وہ کانفرنس آج منعقد ہونے والی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو حرکت ہوئی ہے یہ اسی کی برکت ہے جو ظاہر ہوئی ہے اس کا CREDIT بھی حکومت کو دینا چاہیئے۔ کہ صورت حال بگڑنے دینے کے بجائے اس نے اس کا بروقت اندازہ کر لیا اور پہلے ہی صحیح قدم اٹھا کر ان مطالبات کو جو علماء کی طرف سے پیش کیے جا رہے تھے۔ بڑی حد تک تسلیم کر لیا ـــ میں پھر ایک بار ان علماء کرام اور تنظیموں کو مبارکباد دیتا ہوں جنہوں نے اس سلسلہ میں محنتیں کیں۔ اور اس میں حصہ لیا ہے ان کے ہم احسان مند ہیں ان سب کا شکریہ ہم پر واجب ہے اور حکومت بالخصوص صدر مملکت جنرل ضیاء الحق صاحب کا بھی ہم شکریہ ادا کرتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس آرڈیننس کے تمام مقتضیات پر صحیح طور پر عمل درآمد فوراً شروع ہو جائے گا۔ اس لیے کہ یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ بیوروکریسی اس کے EARNESTLY نفاذ میں ڈھیل دے اسے IGNORE کرے اور ہو سکتا ہے کہ یہ آرڈیننس صرف تعزیرات میں درج ہو کر رہ جائے اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو کیا عجب ہے کہ مواد پھر اندر ہی اندر پکنے اور پھر دھماکے کی صورت اختیار کرے۔ اس قسم کا کوئی دھماکہ بھی اس وقت پاکستان کے لیے انتہائی

مہلک ہوگا۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ کون کس وقت اس دھماکے سے فائدہ اٹھائے۔ لہٰذا ہر نوع کی دھماکہ خیز SITUATION سے بچ کر رہنے ہی میں پاکستان کی عافیت ہے۔

معراج النبی

تیسری بات مجھے شبِ معراج کے متعلق عرض کرنی ہے جو دو دن کے بعد آنے والی ہے۔ ۱۴۰۵ سال ہجری قبل یہ محیّر العقول واقعہ پیش آیا ہے۔ یعنی ہجرت سے قریباً ایک سال پہلے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے اور اس واقعہ کے متعلق کم از کم اٹھائیس صحابہؓ سے احادیث مروی و منقول ہیں۔ جن میں چند بڑی طویل احادیث بھی ہیں۔ یہ دَور چونکہ عقلیت پرستی کا دور ہے۔ اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے اٹھارویں۱۸ اور انیسویں۱۹ صدی عیسوی کا جو Scientific Rationalism تھا۔ اس کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ نیوٹن فزکس کا دَور اور تھا اور یہ دَور جس میں ہم سانس لے رہے ہیں وہ آئن اسٹائن کی فزکس کا دَور ہے۔ اب نظریہ اضافت کی بات ہو رہی ہے لیکن ہمارے یہاں ابھی تک کچھ لوگ ایسے ہیں جو پچھلی دو صدیوں کی جو ذہنی فضا تھی اسی میں تا حال رہ رہے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے واقعہ معراج کی ایسی ایسی توجیہہ کرتے ہیں کہ اس محیّر العقول واقعہ کی اہمیت بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ واقعۂ معراج کے ایک واقعہ ہونے کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کا انکار کفر کے درجے تک جا پہنچے گا۔ اس لیے کہ یہ واقعہ قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے جن میں متفق علیہ روایت بھی شامل ہے جس سے اوپر کوئی درجہ سند کے اعتبار سے نہیں ہے۔ جس حدیث کی صحت پر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں کا اتفاق ہو جائے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اب وہ صحت کے لحاظ سے قریباً قرآن مجید کے ہم پلہ ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید بھی ہم تک بحیثیت روایت و نقل ہی پہنچا ہے۔ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے صحابہؓ نے سُنا، اس کو یاد کیا، محفوظ رکھا۔ کتابت بھی ہوئی ہے۔ لیکن قرآن کی جو حفاظت ہوئی ہے وہ سن کر ہوئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ ادا ہوا ہے جیسے الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ حضورؐ نے خود تو لکھا نہیں۔ لہٰذا قرآن بھی اصلاً منقول ہے۔ احادیث میں اگرچہ درجے ہیں ضعیف بھی ہیں، مدغم بھی ہیں۔ لیکن وہ احادیث جو ان دو ائمۂ حدیث جنہوں نے احادیث کو جانچنے اور پرکھنے یعنی جرح و تعدیل کے جو سخت ترین معیارات قائم کیے تھے، حدیث کی سند کے اعتبار سے جس پر متفق ہو جائیں تو وہ قریباً قرآن مجید کے ہم پلہ روایت شمار ہوتی ہے۔ لہٰذا واقعۂ معراج کے متعلق ایک طویل متفق علیہ روایت بھی موجود ہے۔

یہ واقعہ تھا کیا؟ اسے اس محدود وقت میں جو ہمارے پاس ہے۔ اجمالاً سمجھئے۔ قرآن مجید جس ماورائی نظام کو ملکوت السموات والارض کہتا ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے جیسے ملائکہ ہیں۔ جو نہ معلوم کہاں کہاں

موجود ہیں۔ ہر شخص کے ساتھ بھی دو دو فرشتے موجود ہیں جو اس کے تمام اعمال اور ارادوں کو ریکارڈ کر رہے ہیں۔ نامۂ اعمال میں نیکیوں اور بدیوں کا علاحدہ علاحدہ اندراج ہو رہا ہے۔ پھر ایک حدیث شریف میں آنحضور نے خبر دی ہے جو میں نے بار بار سنائی ہے کہ: عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ یتلون کتاب اللہ ویتدارسونہ بینھم الا نزلت علیھم السکینۃ وغشیتھم الرحمۃ وحفتھم الملئکۃ و ذکرھم اللہ فیمن عندہ۔ "حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب بھی کبھی اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں لوگ اس کام کے لیے جمع ہوں کہ اللہ کی کتاب پڑھیں اور آپس میں سمجھیں اور سمجھائیں تو ان پر سکینت کا نزول ہوتا ہے۔ رحمت خداوندی ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور ملائکہ ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں"۔ تو ملائکہ موجود ہیں، اللہ تعالیٰ کی جو عالمی و تکوینی سلطنت و حکومت ہے اس کے یہ ملائکہ کارندے ہیں یہ اس کی سول سروس ہے۔ یہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ میں لگے ہوئے ہیں لیکن ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہیں۔ یہ غیب کا عالم ہے۔ اسی طریقہ سے جنت و دوزخ یہ غیب کے امور ہیں۔ اسی طرح سے جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے! قیامت کس طور پر ہوگی! یہ مستقبل کے معاملات ہیں یہ بھی غیب سے متعلق ہیں۔ پھر یہ کہ ایمان بالغیب دین اور ایمان کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات غیب میں ہے یا ہم اس سے غیب میں ہیں۔ بہر حال ہمارے اور اللہ کی ذات کے درمیان غیب کا ایک پردہ حائل ہے یہ کہنے سے کہ اللہ غیب میں ہے یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ ہم اللہ سے غیب میں ہیں ہم محجوب ہیں۔ اللہ تو عیاں ہے، وہ تو ہر جگہ موجود ہے ھُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ۔ اسی لیے شیخ علی ہجویری نے اپنی کتاب کا نام رکھا "کشف المحجوب" ہم حجاب میں ہیں۔ لہذا اس حجاب کا پردہ چاک کر کے حقائق کو روشن کر دینا یہ اس کتاب کا موضوع ہے لہذا اس کا نام رکھا "کشف المحجوب"۔ اب ان تمام غیبی امور کا معاملہ یہ ہے کہ جب تک یقین نہ ہو تو ایمان کی جڑ اور بنیاد ہی قائم نہیں ہوتی۔ اس یقین کو پیدا کرنے کے لیے اللہ نے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا۔ اب اگر ان انبیاء و رسل میں وہ یقین کامل ہوگا تب ہی وہ دوسروں تک پھیلے گا اور متعدی ہوگا لہذا اللہ تعالیٰ نبیوں اور رسولوں کو گاہے گاہے چند امور غیبی کے مشاہدات کراتے رہے ہیں۔ جیسے فرمایا: وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۔ "اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان و زمین کی جو خفیہ حکومت ہے۔ اس ملکوت کا مشاہدہ کراتے رہے۔ سیر کراتے رہے تاکہ وہ اصحاب یقین میں سے ہو جائے"۔ اس لیے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ ایک ہے خبر اور ایک ہے مشاہدہ۔ عربی میں اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ۔ خبر اور معاینہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

پس یہ مشاہدات ہیں جو انبیاء و رسل کو کرائے گئے۔ تورات میں آپ دیکھیں گے کہ بہت سے انبیاء کے مکاشفات ہوں کے مشاہدات، ان کے رؤیا، ان کے خوابوں کا بڑی تفصیل سے ذکر ہے۔ جس طرح محمدؐ کی ذاتِ مبارک میں نبوت و رسالت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ اسی طرح مشاہدات و مکاشفات کا معاملہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت گرامی میں اپنی انتہائی چوٹی تک پہنچ گیا۔ اور اسی کا نام ہے معراج یا اسراء۔

اس واقعہ کی تفاصیل میں احادیث میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ اس فرق کو کچھ لوگ ان احادیث کی نفی کی بنیاد بنا لیتے ہیں حالانکہ یہ فرق ہی یہ ثابت کر رہا ہے کہ واقعہ حقیقی ہے۔ غور کیجئے کہ ایک واقعہ یہاں ظہور پذیر ہو اور دس آدمی اس کو دیکھنے والے ہوں۔ ایک گھنٹے کے بعد آپ ان میں سے ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ پوچھئے کہ یہ واقعہ کیا تھا؛ وہ سب کے سب سچے ہوں گے، دیانت دار ہوں گے۔ لیکن ان کے بیان میں فطری طور پر فرق واقع ہو جائے گا کوئی کسی بات کو پہلے بیان کرے گا۔ اور دوسری باتوں کو بعد میں کوئی اس کے بالکل برعکس آخری باتوں کو پہلے اور پہلی بات کو آخر میں بیان کرے گا۔ اسی طرح سنی ہوئی بات کے بیان میں بھی تقدیم و تاخیر فطری ہے پھر ہر شخص کا اپنا ذاتی ذوق بھی ہے۔ کسی کے نزدیک کوئی چیز اہم تر ہے۔ کسی کے نزدیک دوسری چیز اہم تر ہے۔ کسی کا مشاہدہ کسی ایک پہلو سے زیادہ ہے اور کسی کا دوسرے پہلو سے زیادہ۔ تو بیان میں یہ فرق و تفاوت در حقیقت خود اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ واقعہ ہوا ہے۔ اسے بہت سوں نے دیکھا ہے بہت سوں نے معتبر لوگوں سے اسے سنا ہے۔ لیکن جب وہ آگے بیان کریں گے تو اس میں فرق و تفاوت ہو جائے گا۔ یہی صورتِ حال احادیث کے فرق کی ہے۔ البتہ جو روایات باہم متعارض و متضاد ہیں، ان کی ہمارے علماء کرام یہ توجیہہ و تاویل کرتے ہیں کہ واقعہ معراج ایک سے زیادہ مرتبہ ہوا ہے۔ یہ بات قطعی طور پر سمجھ میں آنے والی ہے۔ بہر حال یہ بات سمجھ لیجئے کہ واقعہ معراج امت میں تقریباً مجمع علیہ ہے۔

ان تمام احادیث اور متفق علیہ روایت سے اس واقعہ کی تصویر یہ بنتی ہے کہ ہجرت سے تقریباً ایک سال قبل رجب کی ستائیسویں شب کو آنحضور حطیم میں استراحت فرما رہے تھے۔ حطیم کعبہ شریف کا ہی ایک حصہ ہے جو چہار دیواری کے باہر رہ گیا ہے۔ سیلاب کی وجہ سے کعبہ اجرائے وحی سے قبل گر گیا تھا۔ تو جب قریش نے دوبارہ تعمیر کی تو ان کے پاس سامانِ تعمیر کچھ کم تھا تو انہوں نے اس کا ایک حصہ باہر چھوڑ دیا، وہی حطیم کہلاتا ہے۔ اب اس کے گرد ایک گول سا دائرہ بنا ہوا ہے۔ جو لوگ حج یا عمرے کو گئے ہیں ان کو معلوم ہے کہ لوگ وہاں جا کر بڑے ذوق شوق سے نوافل ادا کرتے ہیں، ان کی بڑی فضیلت ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ "میں وہاں آرام سے لیٹا ہوا تھا کہ ایک آنے والا آیا اور اس نے مجھے بیدار کیا۔" میں یہ واقعہ حضرت

مالک ابن صعصعہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آپ کو سنا رہا ہوں جو متفق علیہ روایت ہے۔
"پھر اس نے میرا سینہ چاک کیا"۔ حضورؐ نے حلق کے گڑھے سے ناف تک کے حصہ کی طرف اشارہ فرمایا۔
"پھر میرا دل نکالا اور ایک سنہری طشت لایا گیا جو ایمان سے بھرا ہوا تھا پھر اس سے میرا دل دھویا گیا اور اس میں ایمان و حکمت بھر دیے گئے"۔ اس قسم کی باتیں عقلیت گزیدہ یا عقلیت پرست لوگوں کو عجیب معلوم ہوتی ہیں لہٰذا وہ انکار کر دیتے ہیں، حالانکہ سرجری اب جس حد تک پہنچ گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ چیزیں کسی درجہ میں ناقابل یقین نہیں ہیں OPEN HEART سرجری آج ہو رہی ہے انسانوں کے ہاتھوں آلات کی مدد سے ہو رہی ہے تو اس میں استبعاد کی کیا بات ہے کہ اللہ جو علیٰ کل شیئٍ قدیر ہے اس نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ہاتھوں یہ کارنامہ سرانجام دلایا۔ ویسے نبی اکرمؐ کا سینۂ مبارک ایمان سے منور اور حکمت سے لبریز ہی تھا۔ لیکن درجات کا معاملہ ہے۔ اسے پھر دھویا گیا ہے اور مزید انوار و ایمان و حکمت اس میں بھر کر پھر اسے سی دیا گیا ہے۔ حضورؐ آگے ارشاد فرماتے ہیں "پھر میرے پاس ایک چوپایہ لایا گیا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا، وہ سفید تھا اس کا نام براق ہے۔ اس کا ہر قدم حد نگاہ تک پڑتا تھا۔ پھر مجھے اس پر سوار کرایا گیا۔ اور جبرئیلؑ میرے ساتھ چلے یہاں تک کہ وہ مجھے کر آسمان دنیا تک پہنچ گئے"۔ اب اس روایت میں زمینی سفر کے حصہ کا بیان نہیں ہے۔ اسے سورۂ بنی اسرائیل کی جس کا دوسرا نام اسراء ہے پہلی آیت اور احادیث کی دوسری روایات کو ملا کر اس خلا کو پُر کیا جاتا ہے۔ پہلے آپ مسجد اقصٰی پہنچے، اسی کو اصل میں کہتے ہیں اسراء۔ اسراء کے معنی ہیں رات کے وقت کسی کو کہیں لے جانا۔ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں فرمایا: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ سفر گھر سے نہیں بلکہ مسجد حرام سے شروع ہوا ہے۔ اس آیت کے بعد مضمون ہے: بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ "اس مسجد اقصٰی کے (جو یروشلم قدس میں ہے) ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا"۔ وہ علاقہ ظاہری اعتبار سے بھی بابرکت ہے کہ بڑا ہی سرسبز و شاداب اور زرخیز علاقہ ہے۔ رہی باطنی برکات تو ان کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں نبی ہیں جو وہاں دفن ہیں۔ اندازہ مشکل ہے کہ وہ علاقہ کتنے انبیاء علیہم السلام کا مدفن ہے اور کتنوں کا وہ مسکن رہا ہے۔ مسجد اقصٰی میں کتنے نبیوں نے سجدے کیے ہیں۔ کتنے نبیوں نے وہاں اعتکاف اور مراقبے کیے ہیں۔ علاوہ ان کے وہاں جو اثرات ہیں، پوری فضا میں اس کی جو برکات ہیں اس کی قرآن مجید گواہی دے رہا ہے: اَلَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ۔ وہاں نبی اکرمؐ کو کس مقصد کے لیے لے جایا گیا! اس کا ذکر اسی آیت میں آگے فرمایا: لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا۔

"تاکہ ہم اپنے بندے (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی آیات (نشانیوں) میں سے کچھ نشانیاں دکھائیں"
اب وہاں کون سی آیات (نشانیاں) دکھائی گئیں۔ اس کا یہاں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لیے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے بیان اور تعبیر کے لیے ہماری زبان میں الفاظ نہیں ہیں۔ ان کو بیان کیا جائے تو مفہوم صحیح طور پر CONVAY نہیں ہوگا اور بہت سے مغالطے پیدا ہو جائیں گے بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا بیان نہ کرنا بیان کرنے سے بہتر قرار پاتا ہے۔ اس لیے سکوت مناسب ہوتا ہے چونکہ اس کو بیان کرنا کماحقہٗ ممکن نہیں ہوتا۔ اس آیت کے آخر میں فرمایا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ہ "سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا تو صرف وہی ہے"! یہ حصر کا اسلوب ہے یعنی یہ اللہ کے علم کامل کی شرح ہے۔ باقی وہ جس کو چاہے سناتا اور دکھاتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کو ملکوت السمٰوٰت والارض کا مشاہدہ کرانے کی غایت میں بیان کر چکا۔ کہ انہیں مجسم یقین بنانا ہوتا ہے تاکہ ان کے وجود سے یقین پھوٹے اور ماحول میں سرایت کرے۔ ان کی مبارک صحبت سے لوگوں کے اذہان وقلوب ایمان ویقین سے منور ہوں۔ انبیاء کرام کو پیکر یقین اور الیقین مجسم بنانا ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ انہیں دکھاتا ہے جو دکھاتا ہے۔ سناتا ہے جو سناتا ہے۔ لیکن سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا وہ اکیلا اللہ ہی ہے۔

اب پھر آئیے سفر معراج کی طرف۔ یہ پہلا سفر بیت الحرام سے مسجد اقصا تک زمینی سفر ہے۔ جس کا ذکر سورۂ اسراء کی پہلی آیت میں بغیر کسی ابہام، ایہام کے بیان ہوا۔ اس کے بعد آسمانی سفر شروع ہوا۔ مسجد اقصا کے حالات کی تفصیل ہمیں احادیث میں ملتی ہے۔ وہ یہ کہ وہاں تمام انبیاء موجود تھے اور ان کی امامت فرمائی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ــــ اس کی جو غایت ہے۔ اور اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے اب اس کو سمجھیے ــــ تمام انبیاء عظام ؑ کی امامت کرانے کی غایت بادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سید الانبیاء والمرسلین ہیں۔ دوسری غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے جو دو شاخیں چلیں، ایک بنی اسرائیل اور ایک بنی اسماعیل۔ بنی اسماعیل کا اوّل روز سے روحانی مرکز خانہ کعبہ ہے۔ بنی اسرائیل کا روحانی مرکز بیت المقدس بنا۔ نبی اکرم مکہ میں پیدا ہوئے۔ خود بنی اسمٰعیل میں سے ہیں تو گویا خانہ کعبہ کی آپ سے آپ وراثت آپؐ کو حاصل ہے ہی۔ جو فتح مکہ کے بعد بالفعل بھی حاصل ہوگئی۔ اس سفر معراج کے ذریعہ بیت المقدس کی وراثت اور وہاں کی برکات بھی اللہ تعالیٰ نے نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیں۔ گویا کہ دونوں قبلے نبیؐ اکرم کی تحویل میں دے دیے گئے۔ لہٰذا دراصل تاقیام قیامت امت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی کا حق ہے کہ یہ دونوں قبلے اس کی تحویل میں رہیں یہ دوسری بات ہے کہ جیسے بنی اسرائیل کے عروج کے دور میں ان

کے جرائم کی پاداش میں دو مرتبہ مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی ہوئی ہے اغیار کے ہاتھوں۔ اس میں مسجد کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں اس کا ذکر ہے۔ اسی طرح ہمارے جرائم کی وجہ سے ہماری تولیت میں آنے کے بعد دو مرتبہ بیت المقدس کی بے حرمتی ہو چکی ہے۔ اس موضوع پر میرے ایک مضمون کا انگریزی ترجمہ "THE RISE AND DECLINE OF MUSLIM UMMAH" کے نام سے کتابی شکل میں موجود ہے اور اردو مضمون میری کتاب "سرافگندیم" کی ابتدا میں شامل ہے جو حضرات دلچسپی رکھتے ہوں ـــ وہ تفصیلات کے لیے ان کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ پہلی مرتبہ ۱۰۹۹ء میں ہماری بداعمالی اور جرائم کی پاداش اور صلیبی جنگوں کے نتیجے میں بیت المقدس اور فلسطین کا پورا علاقہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو واگزار کرایا تھا۔ اس دور میں اٹھاسی برس تک مسلمانوں کا یہ قبلہ اوّل عیسائیوں کے قبضہ میں رہا اور عیسائیوں نے وہاں مسلمانوں پر جو بہیمانہ مظالم کیے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ صرف ایک دن میں بیت المقدس کے شہر میں ستر ہزار مسلمان قتل کیے گئے۔ اب ہماری زندگیوں میں دوسری بار ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں بیت المقدس اور تمام فلسطین نیز اردن و شام کے بہت سے علاقے پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ یہ بھی ہماری بداعمالیوں اور جرائم کی سزا ہے۔ کہ ہمیں یہ ذلت یہودیوں کے ہاتھوں اٹھانی پڑی۔ اس پر یہودیوں کے قبضہ کو سترہ سال تو بیت گئے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ یہودیوں کے ہاتھوں سے یہ علاقہ کب واپس لیا جائے گا۔ یہودیوں نے جب سے بیت المقدس پر قبضہ کیا ہے اسی وقت سے وہ کسی نہ کسی بہانے سے مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کرتے رہتے ہیں۔

بہرحال میں نے یہاں سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت کے متعلق نہایت اختصار کے ساتھ ضروری باتیں عرض کر دی ہیں ـــ اب یہاں سے اسی براق پر جو آسمانی سفر شروع ہوا ہے اس کی تفصیل نبی اکرم ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمائی ہے جو حضرت مالک ابن صعصعہؓ سے مروی ہے اور متفق علیہ روایت ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ـــ جس آسمان پر پہنچے وہاں حضرت جبرئیلؑ نے دستک دی ہے، سوال جواب ہوئے ہیں اور ہر آسمان پر حضورؐ کی چند جلیل القدر انبیاء ورسل سے ملاقات ہوئی ہے۔ چھٹے آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو آنحضورؐ کے جدِّ امجد ہیں، ملاقات ہوئی۔ خلیل اللہ بیت المعمور سے پیٹھ لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ یہ بیت المعمور جو ہے تو در حقیقت ـــ..... اس کا ہی ایک عکس بیت الحرام کا کعبہ شریف ہے۔ وہ ہے اصل بیت اللہ۔ ہماری زمین والا کعبہ اس کا ایک عکس یا نمونہ ہے ـــ اس بیت المعمور کے متعلق روایات

میں آتا ہے کہ ستر ہزار فرشتے اس میں روزانہ داخل ہوتے ہیں اور جو فرشتہ ایک مرتبہ اس میں داخل ہوا تو اسے دوبارہ داخل ہونے کی نوبت نہیں آتی ہے۔ اس سے آپ اندازہ کیجئے: وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ "اللہ کے لشکروں کو جاننے والا کوئی نہیں سوائے اس کی ذات سبحانہٗ و تعالیٰ کے" ان کی تعداد کا ایک تصور اس سے کیجئے کہ ستر ہزار فرشتے اس بیت المعمور میں روزانہ داخل ہو کر رکوع و سجود اور اللہ کی تحمید و تسبیح کرتے ہیں اور ان کے دوبارہ داخل ہونے کی باری نہیں آتی۔

پھر آگے حدیث میں مذکور ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔ وہاں آنحضورؐ کو جو مشاہدات ہوئے۔ قرآن مجید میں سورۂ نجم میں اس کا ذکر موجود ہے۔ فرمایا: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۝ "اس کے دل نے جھٹلایا نہیں جو کچھ دیکھا"۔ اس میں ایک عجیب کیفیت کا بیان ہے۔ کسی وقت آپ کسی خاص چیز کو دیکھ رہے ہوتے ہیں لیکن دل میں بے یقینی کی سی کیفیت ہوتی ہے کہ پتہ نہیں جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں حقیقی شے ہے کہ نہیں اور وہ پکار اٹھتا ہے: آنچہ می بینم بہ بیداری است یا رب یا بخواب؟ اے اللہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں بیداری میں دیکھ رہا ہوں یا خواب میں دیکھ رہا ہوں؟، کوئی ایسی حقیقت جو اچانک آپ کے سامنے منکشف ہو گئی ہو جیسے آپ کے کوئی قریبی عزیز ہوں، وہ کئی سال سے کہیں گئے ہوئے ہوں، آپ کو ان کی کوئی خیر خبر نہ ہو اور وہ اچانک آپ کے سامنے آجائیں تو آپ سوچیں گے کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا حقیقت دیکھ رہا ہوں۔ کوئی اطلاع نہیں تھی کوئی خبر نہیں تھی۔ پہلے سے آدمی مطلع ہو ذہناً تیار رہے لیکن یہاں فرمایا: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۝ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا دل نے جھٹلایا نہیں بلکہ دل نے یقین کیا کہ صحیح دیکھ رہے ہیں۔ یہ ہے انسان کے حواس ظاہری اور اس کی باطنی کیفیت کا کامل منطبق ہو جانا۔ کوئی شبہ کوئی وسوسہ دل میں نہیں ہے کہ میرے اس دیکھنے میں کوئی مغالطہ تو نہیں، کوئی تخیل تو نہیں، کہیں میری نگاہ کا دھوکہ تو نہیں۔ آگے فرمایا: أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۝ وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ۝ "کیا تم ان سے جھگڑتے ہو جو انہوں نے آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بے شک انہوں نے اس کو (مراد ہیں حضرت جبرئیل) پھر ایک بار اترتے دیکھا ہے"۔ یعنی حضورؐ کوئی سنی سنائی بات نہیں کہہ رہے ہیں، انؐ کا مشاہدہ ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ جس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اسے کوئی جھٹلاتا رہے ملتا رہے تو اپنی بات کہتی ہے۔ وہ اپنا مشاہدہ بیان کرے گا۔ آگے فرمایا: عِندَ سِدْرَةِ الْمُنتَهَىٰ ۝ عِندَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ ۝ حضورؐ کو یہاں حضرت جبرئیل کی جو ملکوتی صورت میں رویت ہوئی ہے۔ وہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہوئی ہے جس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ کیا ہے؟ ویسے تو اس کا ترجمہ ہوگا "بیری کا وہ درخت جو مخلوق کی انتہا ہے"۔ منتہیٰ ختم ہو جانے والا تمام یہاں سے آگے وہ حریم ذات ہے جہاں مخلوق میں سے کسی کی رسائی نہیں ہے۔ کسے باشد۔

سدرۃ المنتہیٰ وہ مقام ہے جہاں احکام نازل ہوتے ہیں اور فرشتے یہاں سے تلقّی کرتے ہیں اور ان کی تعمیل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہاں کے بارے میں ہمارے سلف سے ایک اختلاف رائے چلا آرہا ہے۔ دلائل کی بنا پر کوئی ان میں سے کوئی رائے رکھے تو اسے کوئی ملامت نہیں کی جاسکتی۔

ہمارے سلف میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ پر نبی اکرمؐ نے ذاتِ باری تعالیٰ کا براہِ راست مشاہدہ کیا ہے۔ یہ رائے رکھنے والوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے صحابی بھی شامل ہیں۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا مشاہدہ نہیں ہوا بلکہ آیاتِ ربّانیہ کا مشاہدہ ہوا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جیسی فقیہہ یہ رائے رکھتی ہیں۔ انہوں نے فرمایا: اَللّٰہُ نُوْرٌ اَنّٰی یُرٰی "اللہ تو ایک نور ہے اسے کیسے دیکھا جاسکتا ہے!" نور کے ذریعہ سے کسی چیز کو دیکھا جاسکتا ہے، نور تو نور ہے۔ اسے کہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ سورۃ النجم کی اگلی آیت اسی رائے کی تصدیق کرتی ہے۔ فرمایا: اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی ٥ "جبکہ اس بیری کے درخت کو ڈھانپے ہوا تھا جو ڈھانپے ہوئے تھا" اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ ہم تم کو کیا بتائیں کہ اسے کیا ڈھانپے ہوئے تھا، تم نہیں سمجھ سکو گے۔ تمہاری زبان میں اس کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ بہت سے حقائق اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ انسانی زبان میں ان کی تعبیر نہیں ہوسکتی۔ نئے الفاظ لائے جائیں تو ابلاغ و اعلام کا حق ادا نہیں ہوگا۔ انہیں کون سمجھے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس بات کو مجمل رکھا۔ اسے کھولا نہیں: اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی ٥۔ معلوم ہوا کہ تجلیاتِ ذاتِ باری کا وہاں نزول ہو رہا ہے۔ اب اس کی تعبیر کے لیے ہماری زبان میں کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس آیت سے آگے درمیان میں ایک آیت چھوڑ کر الفاظ یہ ہیں: لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی ٥ "وہاں نبی اکرمؐ نے اپنے رب کی عظیم ترین آیات (نشانیوں) کا مشاہدہ فرمایا"۔ یہاں بھی لفظ آیات آیا ہے۔ اس کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ سورۂ بنی اسرائیل میں بھی لفظ آیات آیا تھا۔ وہ مجرد آیات آیا تھا: لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا۔ لیکن یہاں آیا: مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی۔ سب سے عظیم آیات۔ گویا اللہ کی عظیم ترین آیات وہ ہیں جن کا مشاہدہ فرمایا جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سدرۃ المنتہیٰ پر۔ پس قرآن کا ذکر تو یہیں تک ہے۔ حدیث میں بھی اس سے آگے کوئی صراحت نہیں ہے۔ اگر ذاتِ حق کا بھی مشاہدہ ہوا ہوتا تو اس کا قرآن میں یا حدیث میں ذکر ہوتا۔ لیکن اس کی کوئی صراحت قرآن و حدیث میں نہیں ملتی۔ البتہ ہمارے سلف میں سے بعض حضرات نے یہ نتیجہ اخذ ضرور کیا ہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا کہ اگر کوئی یہ رائے رکھے تو رکھ سکتا ہے۔ رہا ہماری شاعری کا معاملہ تو اس میں بڑے مبالغے ہیں وہ مبالغے درست نہیں ہیں، مثلاً علامہ اقبال یہ کہہ گئے ہیں ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات　　تو عین ذات می نگری در تبسمی!

یہ بات درست نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ کو جو چیز بے ہوش کرنے والی تھی، وہ جلوۂ ذاتی تھا۔ جلوۂ صفاتی نہیں تھا۔ جلوۂ صفاتی تو ہم میں سے ہر شخص دیکھ رہا ہے۔ یہ کائنات کیا ہے! یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا جلوہ ہی تو ہے۔ کل کائنات صفاتِ الٰہی کی جلوہ گاہ ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ یہ کل کائنات اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے اظلال ہیں۔ ان کا سایہ ہے۔ یہ پوری تخلیق اللہ کی صفات ہی کا مظہر ہے۔ تو کوہِ طور پر جلوۂ صفات نہیں بلکہ جلوۂ ذاتی تھا کہ اس کا پرتو جب پہاڑ پر ڈالا ہے تو پہاڑ اس کا تحمل نہ کر سکا اور ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے ۔۔۔ سدرۃ المنتہیٰ پر ذات باری تعالیٰ کا دیدار ثابت نہیں ہے۔ نہ قرآن سے نہ حدیث سے۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ یہ ہے: وَلَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی ٥ کہ آنحضور نے اپنے رب کی عظیم ترین (نشانیوں) آیات کا مشاہدہ کیا۔

حدیث میں البتہ یہ مذکور ہے کہ یہاں مکالمہ ہوا ہے۔ سورہ بقرہ کی آخری دو آیات حضورؐ کو عطا ہوئیں ہیں۔ یہ تحفہ ہے امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے جو شب معراج میں دیا گیا۔ پنجگانہ نمازوں کی فرضیت ہوئی ہے اور حضورؐ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپؐ کی امت میں سے ہم ہر اس شخص کو آخر کار بخش دیں گے جو شرک کا مرتکب نہ ہوا ہو، یہ ہمارا وعدہ ہے۔ آپؐ کی امت کا جو فرد شرک کے ارتکاب سے بالکلیہ مجتنب رہے گا، ہم اس کی مغفرت فرما دیں گے۔ نماز میں جو 'التحیات' ہم پڑھتے ہیں یہ وہ مکالمہ ہے جو معراج کی شب کو باری تعالیٰ اور نبی اکرمؐ کے مابین ہوا۔ اسی موقع پر آپ کے سامنے دودھ، شہد اور شراب کے برتن لائے گئے اور آپؐ نے دودھ کا برتن اٹھا لیا۔

اب مجھے اس آیت کی تشریح میں کچھ عرض کرنا ہے: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ٥ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اگر علامہ اقبال کا ایک شعر میرے مطالعہ میں نہ آتا تو شاید اس آیت کا مفہوم میری سمجھ میں کبھی نہ آتا۔ اگرچہ اس شعر میں برعکس کیفیت بیان ہوئی ہے جو میں آگے عرض کروں گا۔ اس آیت کے سیاق میں آیت ہے: اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی ٥ اور سباق میں یہ آیت ہے: لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی ٥ ان کے درمیان میں یہ آیت وارد ہوئی ہے: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ٥ "حضورؐ کی نگاہ نہ تو کج ہوئی اور نہ حد سے آگے بڑھی"۔ یہ دو باتیں بڑی عجیب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی وقت میں کسی شے کے نظارے کے تحمل کی طاقت نہ ہو جیسے کسی وقت ایسا ہوتا ہے کہ روشنی بہت تیز آتی ہے۔ کہ اس کے سبب سے یا آنکھیں چندھیا جائیں گی یا بند ہو جائیں گی۔ ہم فوراً نگاہیں ہٹا لیں گے۔ چونکہ ہماری بصارت میں اتنی طاقت اور اتنا تحمل نہیں ہے کہ اس نور، اس روشنی کو برداشت کر سکے۔ اس کو کہا جائے گا۔ زاغ البصر۔ نگاہ ٹیڑھی ہو گئی۔ وہ

اس سیلابِ نور کا تحمل نہ کر پائی جو سامنے آیا اور وہ کج ہو گئی، یا ہٹ گئی۔ دوسری یہ ہے کہ بے ادبی کی کیفیت پیدا ہو جائے اور حدِ ادب سے تجاوز ہو جائے۔ دونوں کیفیتوں کی اس آیت میں نفی کی گئی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت جو مشاہدہ کیا۔ وہ آیاتِ کبریٰ و تجلیاتِ ربانی کا ہو یا حضرت علی کی رائے کے مطابق خود ذاتِ باری کا ہوا ہو تو اس شان سے وہ مشاہدہ ہوا ہے کہ نہ نگاہ چکاچوند ہوئی اور نہ ہی اس نے حدِ ادب سے تجاوز کیا۔ ادب کا جو مقام ہے وہ ملحوظ رہا ـــــ یہ بات میں نے کیسں کہی کہ یہ آیت میری سمجھ میں نہ آتی اگر علامہ اقبال کا ایک شعر میرے مطالعہ میں نہ آیا ہوتا تو اب میں اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ بالِ جبریل میں علامہ کی ایک نظم ہے "ذوق و شوق" مجھے یہ نظم بہت پسند ہے۔ اس میں وہ شعر ہے جو علامہ عجیب کیفیت میں کہہ گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہی آیت مبارکہ ان کے ذہن میں ہو جس نے یہ شعر کہلوا دیا ہو۔ جس میں کتنی متضاد کیفیات کو سمو دیا گیا ہے۔ علامہ کہتے ہیں ؎

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا! گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب

اب یہ باتیں بالکل برعکس ہیں، ایک یہ کہ حوصلہ نہیں۔ وہ حسن و جمال اس درجۂ کمال کا ہے کہ اس نے مرعوب کر لیا ہے کہ نگاہ جا کر اس کو دیکھنے کا مجھے حوصلہ نہیں۔ اگرچہ میری نگاہ میں ایک شوخی اور بے ادبی تھی۔ میں بہانہ ہی تلاش کرتا رہا۔ لیکن حوصلۂ نظر پیدا نہ ہو سکا۔ ان دونوں چیزوں کا جب تقابل کریں گے۔ تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ برعکس کیفیات اس آیت میں ہیں: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۔ نگاہ نہ حدِ ادب سے آگے بڑھی اور نہ کج ہوئی کہ تحمل نہ کر سکے۔ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بھی دکھایا اسے آپؐ نے دیکھا اور ایسے دیکھا جیسے دیکھنے کا حق ہے۔ پورا تحمل آپؐ کی ذاتِ مبارک میں موجود تھا۔ لیکن عبدیت کے مقام سے آگے نہیں بڑھے۔ عبدیت کے حوالے سے عرض کرتا ہوں کہ مجھے ابنِ عربی کا یہ شعر بہت پسند ہے جو میں نے بارہا آپ کو سنایا ہے۔ یہ موازنہ ہر دم سامنے رہنا چاہیئے کہ ؎

اَلْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰى ! ! وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ !

"بندہ بندہ ہی رہتا ہے چاہے اسے کتنا ہی عروج حاصل ہو جائے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ کر بندے ہی رہے۔ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ اور فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ ۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ نجم میں اسی مقامِ عبدیت کو نمایاں رکھا گیا۔ ایک صحیح حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری حصہ میں سمائے دنیا پر نزولِ اجلاس فرماتا ہے۔ لیکن اس پہلے آسمان پر نزول فرمانے کے باوجود وہ اللہ ہی رہے گا۔ معبود ہی رہے گا۔ خالق ہی رہے گا۔ مخلوق نہیں بن جائے گا۔ اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ کر جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بندے ہی رہے اور عبدیت کی شان یہ رہی کہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۔

میں نے یہ چند باتیں واقعۂ معراج کے بارے میں اس مختصر وقت میں عرض کی ہیں۔ میں نے تین چار سال قبل ماڈل ٹاؤن میں واقعہ معراج پر ایک تقریر کی تھی۔ ہمارے بزرگ ساتھی شیخ جمیل الرحمٰن صاحب بڑی ہمت اور ذوق و شوق کے ساتھ میرے دروس قرآن اور تقاریر کو ٹیپ سے اتارنے کا کام کر رہے ہیں۔ جن میں سے اکثر شائع ہو چکی ہیں۔ معراج النبی والی تقریر بھی مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ میں نے آج ہی صبح اس کو پہلی بار پڑھا ہے۔ میں تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں خود حیران ہوا کہ میں نے ایک مختصر تقریر میں اتنی اہم باتیں کیسے سمو دیں۔ یہ خاص اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے ــــــــ اس کتاب میں وہ حدیث بھی مکمل طور پر شامل ہے جس کا حوالہ میں آج کی گفتگو میں دے چکا ہوں۔ نیز قرآن مجید کے دو نص مقامات پر جن کا ذکر آج آیا ہے اس میں قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو موجود ہے۔ یہ رجب کا آخری عشرہ ہے۔ دنوں کی مناسبت سے ایک ذہنی آمادگی اور طبیعت کا رجحان ہوتا ہے اگر طبیعت میں اس مسئلہ کو مزید سمجھنے کا میلان پیدا ہوا ہو تو میں آپ سے عرض کروں گا کہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں اور اپنے احباب تک پہنچائیں۔
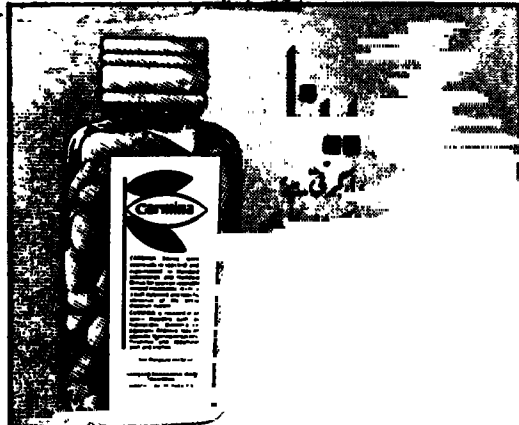
نشر القرآن کی نئی کیسٹ سیریز

قاری نصیر احمد غزنوی

اظہارِ حق

قسط (۹)

قادیانیت

اپنے لٹریچر کے آئینے میں

(گزشتہ سے پیوستہ)

مرزا صاحب کا شکمِ مادر سے نبی ہونے کا دعویٰ

ہمارا اجتہاد خطا کر جائے تو اس میں الہامِ الٰہی کا کیا قصور ہوگا۔ کیا نبیوں کے اجتہادات میں اس کا کوئی نمونہ نہیں۔

(آسمانی فیصلہ ص ۳۱/۳۴۴ جنوری ۱۸۹۲ء)

افسوس کہ ان لوگوں نے ان خیالات کے ظاہر کرنے کے وقت یہ نہیں سوچا کہ ان تاویلوں سے دنیا میں کسی نبی کی پیشگوئی قائم نہیں رہتی۔ کیونکہ ہر ایک جگہ اس وہم کا دروازہ کھلا ہے کہ اتفاقی واقعہ ہے۔ پس اگر یہی رائے سچی ہے تو انہیں اقرار کرنا چاہیئے کہ تمام نبیوں کی نبوت پر کوئی ثبوت نہیں۔ اور سب اتفاقی واقعات ہیں۔ توریت اور قرآن نے سب سے بڑا ثبوت نبوت کا صرف پیشگوئی کو قرار دیا ہے۔

(استفتاء ص ۱۱۱/۴ ۱۲ مئی ۱۸۹۷ء)

اور یہ اعتراض جو تم کرتے ہو نئے نہیں۔ نوشتوں کو پڑھو کہ پہلے بدفہم لوگوں نے بھی ایسے ہی اعتراض نبیوں پر کیے ہیں۔ تمہارے دل ان سے مشابہ ہو گئے۔

(استفتاء ص ۱۵۹/۲۱ ۱۲ مئی ۱۸۹۷ء)

کیا کسی کو یاد ہے کہ کاذب اور مفتری کو افتراؤں کے دن سے ۲۵ برس تک مہلت دی گئی جیسا کہ اس بندے کو کاذب بول ملا جاتا ہے جیسا کہ کھٹل اور ایسا نابود کیا جاتا ہے جیسا کہ بلبلہ اگر کاذبوں اور مفتریوں کو اتنی مدت تک مہلت دی جاتی اور صادقوں

کے نشان ان کی تائید کے لیے ظاہر کیے جاتے تو دنیا میں اندھیر پڑ جاتا۔
(سراج منیر ص۴۴/۲ مئی ۱۸۹۷ء)

بعض نادان کہتے ہیں کہ ہر دفع عذاب اور موت کی پیشگوئیاں کیوں کی جاتی ہیں۔ یہ نادان نہیں جانتے کہ ہر ایک نبی انذاری پیشگوئیاں کرتا رہا ہے۔ (سراج منیر ص۵۸/۵۹ مئی ۱۸۹۷ء)

تیسویں پیشگوئی: اور پھر فرمایا کہ جو لوگ تیرے پر ایمان لائیں گے ان کو خوش خبری دے کہ وہ اپنے رب کے نزدیک قدم صدق رکھتے ہیں اور جو میں تیرے پر وحی نازل کرتا ہوں تو ان کو سُنا خلق اللہ سے منہ مت پھیر اور ان کی ملاقات سے مت تھک۔ اور اس کے بعد یہ الہام ہوا وسع مکانک یعنی اپنے مکان کو وسیع کرے۔ اس پیشگوئی میں صاف فرمادیا کہ وہ دن آتا ہے کہ ملاقات کرنے والوں کا بہت ہجوم ہوگا۔ (سراج منیر ص۴۳/۷۱ مئی ۱۸۹۷ء)

میں تمہارے پاس تخمیناً بیس برس سے آیا ہوں۔ پس سوچ لو کہ کیا یہ دروغ گو کی مدت ہے۔ (حجۃ اللہ ص۸۶ ص۲۳۴/۹۶ ۱۲ مئی ۱۸۹۷ء)

نوٹ: فرق ملاحظہ ہو ایک ہی ماہ اور ایک ہی سنہ کی کتابیں ہیں۔ پہلی میں مدت ۲۵ سال دوسری میں ۲۰ برس بتائی ہے (ن ا)

یہ ہرگز ممکن نہیں کہ کوئی شخص کھُلا کھُلا خدا پر افتراء کرے اور کہے کہ میں اس کا نبی ہوں اور اپنا کلام پیش کرے اور کہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ حالانکہ وہ نہ نبی ہو نہ اس کا کلام خدا کا کلام ہو۔ اور پھر اسے سچوں کی طرح مہلت دے دے سو یہی قانون خدا تعالیٰ کی قدیم سنت میں داخل ہے کہ وہ نبوت کے جھوٹا دعوے کرنے والے کو مہلت نہیں دیتا بلکہ ایسا شخص جلد پکڑا جاتا ہے اور اپنی سزا کو پہنچ جاتا ہے۔
(تحفہ قیصریہ ص۱۶ ص۲۵۸/۹ ۲۵ مئی ۱۸۹۷ء)

جواب میں اتنا لکھنا کافی ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کی نبوت ثابت ہوتی رہی ہے اسی طرح میرے اس دعوے کو میرے خدا نے ثابت کیا ہے۔
(کشف الغطاء ص۲۱۶/۴ ر ص۲۱۷/۱۴ ۲۷ دسمبر ۱۸۹۷ء)

ماموریں کے پہچاننے کا یہ اصول ہے کہ ان کو اس طریق سے پہچانا جائے جس طریق سے انبیاء کی نبوت پہچانی جاتی ہے۔ اس لیے میری تکذیب کوئی انوکھی بات

نہیں کیونکہ ہر ایک نبی سے ٹھٹھا اور استہزاء کیا گیا۔ (نجم الہدیٰ ص۱۴۳ ۲۰ نومبر ۱۸۹۸ء)

دیکھو صفحہ ۵۰۴ براہین احمدیہ میں یہ الہام ہے جری اللہ فی حلل الانبیاء
جس کا ترجمہ یہ ہے خدا کا رسول نبیوں کے لباس میں اس الہام میں میرا نام رسول بھی رکھا گیا۔
اور نبی بھی جس شخص کے خود خدا نے یہ نام رکھے ہوں اس کو عوام میں سے سمجھنا کمال درجہ
کی شوخی ہے۔
(ایام الصلح ص ۳۰۹/۸۴ ص ۷۵ جنوری ۱۸۹۹ء)

جب کہ اجتہادی غلطی ہر ایک نبی اور رسول سے بھی ہوئی ہے تو ہم بطریق تنزل
کہتے ہیں کہ اگر ہم میں سے بھی کوئی اجتہادی غلطی ہوئی بھی تو وہ سنتِ انبیاء ہے۔
(تریاق القلوب ص ۲۹/۱۹۲ ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۲ء)

اور سچ مچ میرا رب میرے ساتھ ہے میرے بچپن سے میری لحد تک۔
(خطبۂ الہامیہ ص ۶۱ ۱۱ اپریل ۱۹۰۰ء)

مدعی رسالت کو تیس برس تک مہلت دی اور لو تقول علینا کے وعدہ کا
کچھ خیال نہ کیا تو اسی طرح نعوذ باللہ یہ بھی قریب قیاس ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کو بھی باوجود کاذب ہونے کے مہلت دے دی ہو۔
(اربعین نمبر ۳ ص ۳۹۱/۴۹ ، ص ۳۹۲/۵۰ ص ۶ ، ص ۷ ۱۵ دسمبر ۱۹۰۰ء)

اور منجملہ دلائل صدق کے یہ بھی ایک دلیل ہے اور خدا تعالیٰ کے قول کی بھی
تصدیق تبھی ہوتی ہے کہ جھوٹا دعویٰ کرنے والا ہلاک ہو جائے ورنہ منکر پر کچھ حجت
نہیں ہو سکتی۔ (اربعین نمبر ۴ ص ۴۳/۹۲ ص ۴۵/۹۳ ۱۵ دسمبر ۱۹۰۰ء)

(اعتراض) جو میری نسبت اُن کے منہ سے نکلتے ہیں تو ان میں تمام نبی شریک
ہیں میری نسبت جو کہا جاتا ہے پہلے سب کچھ کہا گیا ہے۔
(اربعین نمبر ۴ ص ۴۶/۱۲۷ ۲۹ دسمبر ۱۹۰۰ء)

کیونکہ ہماری تمام بحث وحی نبوت میں ہے جس کی نسبت یہ ضروری ہے کہ
بعض کلمات پیش کر کے یہ کہا جائے کہ یہ خدا کا کلام ہے جو ہمارے پر نازل ہوا ہے
غرض پہلے تو یہ ثبوت دینا چاہیئے کہ کونسا کلام الٰہی اس شخص نے پیش کیا ہے۔
جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ پھر بعد اس کے یہ ثبوت دینا چاہیئے کہ جو تیئس
برس تک کلام الٰہی نازل ہوتا رہا ہے وہ کیا ہے (اربعین نمبر ۴ ص ۴۷/۱۴۵ ۲۹ دسمبر ۱۹۰۰ء)

براہین احمدیہ میں اور کئی جگہ رسول کے لفظ سے اس عاجز کو یاد کیا گیا۔ میری نبوت اور رسالت باعتبار محمد اور احمد ہونے کے ہے۔۔۔۔ اور چونکہ میں ظلی طور پر محمد ہوں۔ (ایک غلطی کا ازالہ۔ (۵ نومبر ۱۹۰۱ء ص ۲۰۸ تا ۲۱۶)

اب میں بموجب آیہ کریمہ وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ اپنی نسبت بیان کرتا ہوں کہ خدا تعالےٰ نے مجھے تیسرے درجے میں داخل کر کے وہ نعمت بخشی ہے کہ جو میری کوشش سے نہیں بلکہ شکم مادر میں ہی مجھے عطا کی گئی ہے۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۶۸ ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء)

نوٹ : ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۷ء تک کی ۱۲ کتابوں کے ۱۸ اقتباسات سے ثابت ہو رہا ہے کہ مرزا صاحب دعوے کے آغاز ہی سے نہیں بلکہ شکم مادر سے خود کو نبی سمجھتے تھے۔ (ن ا)

مرزا صاحب کے ایام بعثت

(۱) میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا ہے کہ میں مسیح بن مریم ہوں۔۔۔ بلکہ میری طرف سے عرصہ سات یا آٹھ سال سے برابر یہی شائع ہو رہا ہے کہ میں مثیل مسیح ہوں۔

(ازالۂ اوہام حصہ اول صفحہ ۱۹۲ ص ۱۹۰ ۱۸۹۱ء)

نوٹ : اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۴ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۵ سال، ۴ ماہ، ۲۶ دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۲) براہین احمدیہ کے دیکھنے سے ظاہر ہوگا کہ یہ عاجز تجدید دین کے لیے اپنی عمر کے سن چالیس میں مبعوث ہوا۔ جس کو قریباً گیارہ برس کے گزر گیا۔

(نشان آسمانی صفحہ ۳۴ ۳۶۴ - جون ۱۸۹۲ء)

نوٹ : اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۱ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۶ سال ۱۰ ماہ ۲۶ دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۳) واضح رہے کہ یہ عاجز اپنی عمر کے چالیسویں برس میں دعوتِ حق کے لیے بالہام خاص مامور کیا گیا اور بشارت دی گئی کہ اسی برس یا اس کے قریب تیری عمر ہے۔ سو اس الہام سے چالیس برس دعوت ثابت ہوتی ہے جن میں سے

دس برس کامل گذر بھی گئے۔ دیکھو براہین احمدیہ ص۲۳۸۔

(نشانِ آسمانی ص ۱۴/۴۴ جون ۱۸۹۲ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۲ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۵ سال ۱۱ ماہ ہوتے ہیں (ن ا)

(۴) اس عاجز کے دعوے مجدد اور مثیل مسیح ہونے دعوے ہمکلام الٰہی ہونے پر اب بفضلہ تعالیٰ گیارہواں برس جاتا ہے۔ کیا یہ نشان نہیں ہے۔

(نشانِ آسمانی ص ۳۷/۴۹ جون ۱۸۹۲ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۱ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۶ سال ۱۱ ماہ ۲۶ دن ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے تینوں اقتباسات کے خط کشیدہ حصے قابلِ غور ہیں۔ (ن ا)

(۵) یہ عاجز قریباً گیارہ برس سے شرف مکالمہ الٰہیہ سے مشرف ہے۔

(برکات الدعا ص۲۶ اپریل ۱۸۹۳ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۲ء ثابت ہوتا ہے
وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۶ سال ۲۶ دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۶) میں آج تم میں ظاہر نہیں ہوا بلکہ سولہ برس سے حق کی دعوت کر رہا ہوں۔ تمہیں یہ بھی سمجھ نہیں کہ مفتری جلد ضائع ہو جاتا ہے۔

(ضیاء الحق ص۳۱۷۔ ۱۸۹۵ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۷۹ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۹ سال ۴ ماہ ۲۶ دن ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ۱۸۹۳ء میں گیارہ برس ۱۸۹۵ء میں سولہ برس لکھے ہیں۔
(ن ا)۔

(۷) میرے دعویٰ الہام پر پورے بیس برس گذر گئے اور مفتری کو اس قدر مہلت نہیں دی جاتی۔ (انجام آتھم ص۴۹ دسمبر ۱۸۹۶ء ۲۲ جنوری ۱۸۹۷ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۷۶ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۳۱ سال ۵ ماہ ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۸) کیا کسی کو یاد ہے کاذب اور مفتری کو افتراؤں کے دن سے پچیس برس تک مہلت دی گئی جیسا کہ اس بندہ کو۔ (سراج منیر صفحہ ۴ مئی سنہ ۱۸۹۷ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت سنہ ۱۸۷۲ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۳۶ سال ۴ ماہ ۲۶ دن ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ انجام آتھم (۲۲ جنوری سنہ ۱۸۹۷ء) میں مدتِ بعثت بیس برس اور سراج منیر (مئی سنہ ۱۸۹۷ء) میں مدتِ بعثت پچیس برس تحریر فرمائی ہے۔
(ن ا)

(۹) میں تمہارے پاس تخمیناً بیس برس سے آیا ہوں۔ بس سوچ لو کہ کیا یہ دروغ گو کی مدت ہے۔ (حجۃ اللہ صفحہ ۸۶ صفحہ ۲۳۴/۹۶ - ۲۹ مئی سنہ ۱۸۹۷ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت سنہ ۱۸۷۷ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۳۱ سال ۴ ماہ ۲۶ دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۱۰) اگر میں جھوٹا ہوتا تو دعوے کے بعد تیس سال تک کیسے زندہ رہتا۔
(خطبہ الہامیہ صفحہ ۳۱۳ - ۱۱ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء سے اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت سنہ ۱۸۷۰ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۳۶ سال ایک ماہ ۱۵ دن ثابت ہیں (ن ا)

(۱۱) براہین احمدیہ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دعوےٰ منجانب اللہ ہونے اور مکالماتِ الٰہیہ کا قریباً تیس برس سے ہے اور اکیس برس سے براہین احمدیہ شائع۔۔۔۔ ہے۔ (اربعین نمبر ۴ صفحہ ۳۹۱/۴۹ صفحہ ۶ - ۱۵ دسمبر سنہ ۱۹۰۰ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت سنہ ۱۸۷۰ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۳۷ سال ۵ ماہ ۱۲ دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۱۲) قریباً تیس سال سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ (دافع البلاء صفحہ ۲۴۲/۲۹ - ۲۲ اپریل سنہ ۱۹۰۲ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت سنہ ۱۸۷۲ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۳۶ سال ایک ماہ ۴ دن ہوتے ہیں۔

(۱۳) حافظ صاحب علم سے بے بہرہ ہیں۔۔۔ کسی عیسائی یا یہودی کو طاقت نہ ہوئی کہ کسی ایسے شخص کا نشان دے جس نے افتراء کے طور پر مامور من اللہ ہونے

کا دعویٰ کر کے تیئیس برس پورے کیے ہوں۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۶ صفحہ ۲۴/۸ یکم ستمبر ۱۹۰۲ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۷۹ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۸ سال ۸ ماہ ۲۵ دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۱۴) اس اکیس برس کے عرصہ میں براہین احمدیہ سے لے کر آج تک میں نے چالیس کتابیں تالیف کی ہیں اور ساٹھ ہزار کے قریب اپنے دعوے کے ثبوت کے متعلق اشتہارات شائع کیے ہیں۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲ صفحہ ۲۶/۲ یکم ستمبر ۱۹۰۲ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۱ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۷ سال ۸ ماہ ۲۶ دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۱۵) تم دیکھتے ہو کہ میرا دعوےٰ منجانب اللہ ہونے کا ۲۳ برس سے بھی زیادہ کا ہے جیسا کہ براہین احمدیہ کے پہلے حصّہ پر نظر ڈال کر تم سمجھ سکتے ہو۔
(تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۶۳ صفحہ ۱۴/۶۴ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۰ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک قریباً ۲۸ سال ۷ ماہ ۲۶ دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۱۶) میرا دعوےٰ منجانب اللہ ہونے کا اور نیز مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ سے مشرف ہونے کا قریباً ستائیس برس سے ہے یعنی اس زمانہ سے بھی بہت پہلے سے ہے کہ جب براہین احمدیہ ابھی تالیف نہیں ہوئی تھی۔
(لیکچر لاہور صفحہ ۴۳ صفحہ ۱۸۸/۴۲ صفحہ ۱۸۹/۴۳ صفحہ ۴۴۔ ۳۔ ستمبر ۱۹۰۴ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۷۷ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۳۰ سال ۸ ماہ ۲۳ دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۱۷) میری عمر ۶۷ سال کی ہے اور میری بعثت کا زمانہ تیئیس سال سے بڑھ گیا ہے۔
(لیکچر لدھیانہ صفحہ ۲۹۳/۵ ۴ر نومبر ۱۹۰۵ء)
اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۲ء ثابت ہوتا ہے وفات تک ایام بعثت ۲۶ سال ۶ ماہ ۲۲ دن ہوتے ہیں (ن ا)

(۱۸) میں قریباً چھبیس برس سے اپنی وحی برابر آج تک شائع کر رہا ہوں۔
(تحفۃ الندوہ صفحہ ۱/۱۲ ۹ر اکتوبر ۱۹۰۶ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۲ء ثابت ہوتا ہے وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۵ سال ۷ ماہ ۱۷ دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۱۹) مَیں خدا تعالیٰ کی تئیس برس کی متواتر وحی کو کیونکر رد کر سکتا ہوں۔ میں اس کی پاک وحی پر ایسا ہی ایمان لاتا ہوں جیسا کہ ان تمام وحیوں پر ایمان لاتا ہوں جو مجھ سے پہلے ہو چکی ہیں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۴/۱۵۴ ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء)

منوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۴ء ثابت ہوتا ہے۔ وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۴ سال ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۲۰) میرے اس دعوے اور الہام پر پچیس سال سے زیادہ گذر چکے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایام بعثت سے بھی زیادہ ہیں۔ کیونکہ وہ تئیس برس تھے اور یہ تیس برس کے قریب اور ابھی معلوم نہیں کہ کہاں تک خدا تعالیٰ کے علم میں میرے ایام دعوت کا سلسلہ ہے۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۰۶ صفحہ ۲۱۴/۲۱۴ صفحہ ۲۱۵/۲۱۵ صفحہ ۲۰ ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء)

منوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۷۷ء ثابت ہوتا ہے۔ وفات تک ایام بعثت قریباً ۳۱ سال ۱۲ دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۲۱) جب مجھ کو یہ الہام ہوا: اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ تو مَیں نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ خدا مجھے ضائع نہیں کرے گا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۲/۲۲ صفحہ ۲۱ ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء)

منوٹ: یہ الہام غالباً ۱۸۸۰ء کا ہے۔ اس کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۰ء معلوم ہوتا ہے۔ وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۸ سال ۴ ماہ ۲۶ دن ہونے چاہئیں (ن ا)

(۲۲) مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ جب سلسلہ الہامات کا شروع ہوا تو اس زمانہ میں مَیں جوان تھا اب مَیں بوڑھا اور ستّر سال کے قریب عمر پہنچ گئی اور اس زمانہ پر قریباً پینتیس سال گذر گئے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۴۶ صفحہ ا ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء)

منوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۷۲ء ثابت ہوتا ہے۔ وفات تک ایام بعثت قریباً ۳۶ سال ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۲۳) ہر ایک کو معلوم ہے کہ میرے اس دعوے پر کہ مَیں خدا تعالیٰ سے مامور ہو کر آیا ہوں اور اس کے مکالمہ و مخاطبہ سے مشرف ہوں چھبیس برس کے قریب عرصہ گذر گیا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۶۱ صفحہ ا ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۱ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۷ سال ہوتے ہیں۔ (ن ا)۔

(۲۴) ساٹھ سے ہیں کچھ برس میرے زیادہ اس گھڑی
سال ہے اب تیسواں دعوےٰ پہ از روئے شمار

درثمین ص۱۲۵ منقول از براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۹۷ مطبوعہ ۱۹۰۸ء

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۷۸ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۳۰ سال ہوتے ہیں۔ (ن ا)

(۲۵) ایک عظیم الشان نشان یہ ہے کہ آج سے ستائیس برس پہلے یا کچھ زیادہ میری یہ حالت تھی کہ میں ایک احد من الناس تھا اور ایسا گمنام تھا کہ صرف چند آدمی ہوں گے جو میرے صورت آشنا ہوں گے اور کسی عزت اور وجاہت کا مالک نہیں تھا... اس زمانہ میں خدا نے میرے آئندہ عروج اور شوکت وجلال کی خبر دی جو دو سال بعد میری کتاب براہین احمدیہ میں چھپ کر شائع ہوگئی جس کو آج پچیس برس گذر گئے۔ (چشمۂ معرفت۔ دوسرا حصہ ص۳۰۵ ۱۵ مئی ۱۹۰۸ء)

نوٹ: اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۸۱ء ثابت ہوتا ہے۔
وفات تک ایام بعثت قریباً ۲۷ سال ۱۱ دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)۔

(۲۶) میں تخمیناً تیس برس سے خدا کے مکالمہ اور مخاطبہ سے مشرف ہوں۔
(پیغام صلح ص۲۴ مطبوعہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء

نوٹ: یہ مرزا صاحب کی وفات سے دو دن قبل کی کتاب ہے۔ اس عبارت کے مطابق سنہ بعثت ۱۸۷۸ء ثابت ہوتا ہے۔ وفات تک ایام بعثت قریباً ۳۰ سال ۲ دو دن ہوتے ہیں۔ (ن ا)

نوٹ: مرزا صاحب کے ایام بعثت پڑھ کر آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ان کے دعوئے نبوت میں کتنی صداقت ہے۔ ایک سنہ کی کتابوں ہی میں نہیں، ایک کتاب میں بھی کہیں کچھ اور کہیں کچھ مدت تحریر کی ہے۔ منصب نبوت پر فائز ہونا تو نہایت اہم بات ہے، حجاج کرام تو حج ادا کرنے کے سال کو بھی یاد رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک

بہت بڑا انعام خداوندی ہے۔ یہی حال دنیاوی اعزازات ومعاملات کا ہے۔ ہر شخص اپنے ڈاکٹر، انجنیئر، جسٹس، چیف جسٹس، وکیل، بیرسٹر، لیکچرار، پروفیسر، ڈی سی، ایس پی، آئی جی، کرنل، جنرل، سفیر، وزیر یا صدر مملکت ہونے کے سن کو نہیں بھولتا۔ ایسے ہی اور اہم معاملات، مثلاً شادی بیاہ، موت میت، دکان کا افتتاح یا مکان کی تعمیر وغیرہ کا سن یاد رکھنا بھی عام سی بات ہے۔ حیرت وتعجب ہے، کہ مرزا صاحب کو اپنا سالِ بعثت کیوں صحیح یاد نہیں رہا، جب کہ پانچ استادوں کے شاگرد اور (بقولِ خود) پڑھے لکھے نبی تھے۔ انہوں نے اپنی پہلی وحی ضرور لکھی ہوگی۔ اگر نہیں لکھی تو یہی وجہ ہو سکتی ہے، کہ یا تو وہ وحی کا مطلب نہیں سمجھے یا وہ بھول گئے ہوں۔ سوال یہ ہے جو شخص اتنا غبی ہو کیا وہ نبی ہو سکتا ہے؟

(نمبر ۱)

مرزا صاحب کے ایامِ بعثت کے تضادات — ایک نظر میں

(۱) سنہ بعثت ۱۸۸۴ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۵ سال ۴ ماہ ۲۶ دن۔

(۲) سنہ بعثت ۱۸۸۱ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۶ سال ۱۰ ماہ ۲۶ دن۔

(۳) سنہ بعثت ۱۸۸۲ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۵ سال ۱۱ ماہ۔

(۴) سنہ بعثت ۱۸۸۱ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۶ سال ۱۱ ماہ ۲۶ دن۔

(۵) سنہ بعثت ۱۸۸۲ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۶ سال ۲۶ دن۔

(۶) سنہ بعثت ۱۸۷۹ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۹ سال ۴ ماہ ۲۶ دن۔

(۷) سنہ بعثت ۱۸۷۶ء : ایامِ بعثت تقریباً ۳۱ سال ۵ ماہ۔

(۸) سنہ بعثت ۱۸۷۲ء : ایامِ بعثت تقریباً ۳۶ سال ۴ ماہ ۲۶ دن۔

(۹) سنہ بعثت ۱۸۷۶ء : ایامِ بعثت تقریباً ۳۱ سال ۴ ماہ ۲۶ دن۔

(۱۰) سنہ بعثت ۱۸۷۰ء : ایامِ بعثت تقریباً ۳۶ سال ایک ماہ ۱۵ دن۔

(۱۱) سنہ بعثت ۱۸۷۰ء : ایامِ بعثت تقریباً ۳۷ سال ۵ ماہ ۱۲ دن۔

(۱۲) سنہ بعثت ۱۸۷۲ء : ایامِ بعثت تقریباً ۳۶ سال ایک ماہ ۴ دن۔
(۱۳) سنہ بعثت ۱۸۷۹ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۸ سال ۸ ماہ ۲۵ دن۔
(۱۴) سنہ بعثت ۱۸۹۱ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۷ سال ۸ ماہ ۲۶ دن۔
(۱۵) سنہ بعثت ۱۸۸۰ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۸ سال ۷ ماہ ۲۶ دن۔
(۱۶) سنہ بعثت ۱۸۷۷ء : ایامِ بعثت تقریباً ۳۰ سال ۸ ماہ ۲۳ دن۔
(۱۷) سنہ بعثت ۱۸۸۲ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۶ سال ۹ ماہ ۲۲ دن۔
(۱۸) سنہ بعثت ۱۸۸۳ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۵ سال ۷ ماہ ۲۱ دن
(۱۹) سنہ بعثت ۱۸۸۴ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۴ سال۔
(۲۰) سنہ بعثت ۱۸۷۷ء : ایامِ بعثت تقریباً ۳۱ سال ۱۲ دن۔
(۲۱) سنہ بعثت ۱۸۸۰ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۸ سال ۴ ماہ ۲۶ دن۔
(۲۲) سنہ بعثت ۱۸۷۴ء : ایامِ بعثت تقریباً ۳۴ سال۔
(۲۳) سنہ بعثت ۱۸۸۱ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۷ سال۔
(۲۴) سنہ بعثت ۱۸۷۸ء : ایامِ بعثت تقریباً ۳۰ سال۔
(۲۵) سنہ بعثت ۱۸۸۱ء : ایامِ بعثت تقریباً ۲۷ سال ۱۱ دن
(۲۶) سنہ بعثت ۱۸۷۵ء : ایامِ بعثت تقریباً ۳۰ سال ۲ دن۔

نوٹ

ہم جملہ مسلمان، خواہ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہتے بستے ہوں، کسی بھی رنگ و نسل کے ہوں، کسی بھی زبان میں گفتگو کرتے ہوں، کسی بھی مسلک کے پیرو ہوں، سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خاتم النبیین مانتے ہیں اور ظلی و بروزی نبوت کے قائل نہیں ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام اولادِ سیدنا حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام میں بے مثال اور یکتا ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جس طرح اللہ جل شانہٗ اپنی ذات و صفات میں یکتا ہے، اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

بھی اپنی ذات و صفات میں یکتا ہیں۔ یہ عقیدہ کوئی نیا نہیں، جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہے۔ اور انشاء اللہ قیامت تک یہی رہے گا۔ ہم اس بات پر پختہ ایمان و یقین رکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بھی آپ کا مثیل و نظیر نہیں ہوسکتا۔ مگر جناب کرشن، رام چندر، مرزا غلام احمد قادیانی رودر گوپال صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے اس متفقہ فیصلے اور عقیدے پر ضرب لگانے اور آپ کی یکتائی کو ختم کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

اگر کسی بے مثال و بے نظیر ہستی یا شئے کی یکتائی ختم کرنی ہو تو اس کی مثال و نظیر پیدا کرلی جائے۔ پھر وہ ہستی یا شئے بے مثال و بے نظیر نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ اس کی مثال و نظیر موجود ہوگی۔ مرزا صاحب نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بے مثالی، بے نظیری و یکتائی کو ختم کرنے کے لیے آپ کا مثیل و نظیر ہونے کا دعویٰ کردیا۔ اس کی دو ہی ممکن صورتیں تھیں، یا تو وہ آنحضرت کو اپنے جیسا بنالیتے، یا خود اُن جیسا بن جاتے۔ جس سے اُن کی بے مثالی و یکتائی ختم ہوجاتی۔ انہوں نے دوسری صورت اختیار کی۔ اپنا جیسا تو بنانا بہت مشکل کیا ناممکن تھا۔ اس لیے زبردستی اُن جیسا بننے کی کوشش کی، اور بزعمِ خود اُن جیسا ہونے کا دعویٰ کردیا۔ یہ ویسے بھی آسان تھا۔ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام فضائل و شمائل کتابوں میں محفوظ ہیں، صرف مطالعہ کرکے اپنے اوپر چسپاں کرنے کی ضرورت تھی اور یہ انہوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا تھا۔ مرزا صاحب نے اپنے خیال کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان و بزرگی بڑھانے کے لیے اُن کے مثیل و نظیر ہونے کا دعویٰ کردیا ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دراصل انہوں نے توقیر کے پردے میں تنقیص کی ہے۔

بقول شاعر شمع قربت بجھ گئی یہ کس نے ٹھنڈی سانس لی
ہائے ہمدردی کے پردے میں اندھیرا ہوگیا

(العبراحمد)

ہندوستان میں ۱۵ پندرہ دن

از قلم : ڈاکٹر عارف رشید، نیلو قرآن اکیڈمی !!!

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

قارئین میثاق کے علم میں ہوگا کہ ابّا جان عرصہ پانچ سال سے ہر سال بغرض درس قرآن امریکہ جا رہے ہیں ـــــ برصغیر پاک و ہند کے رہنے والے حضرات جو کم و بیش گذشتہ بیس سال سے وہاں مقیم ہیں ان میں سے عظیم اکثریت حیدرآباد دکن (انڈیا) سے متعلق ہے جو وہاں کی مذہبی اور سماجی سرگرمیوں میں پیش پیش ہیں۔ ایسے بہت سے حضرات نے حیدرآباد دکن میں موجود اپنے عزیز و اقارب کو امریکہ میں ریکارڈ شدہ ڈاکٹر صاحب کی تقاریر کے کیسٹ CASSETTES بھیجے۔ ان کیسٹ کی وہاں بے شمار نقول تیار کی گئیں اور لوگوں میں پھیلائی گئیں ـــــ لوگوں نے ان کیسٹ کو سنا اور اب وہ اس بات کے خواہش مند ہوئے کہ کس طرح ڈاکٹر صاحب کو یہاں مدعو کیا جائے۔ ان ہی حضرات میں سے ایک صاحب جناب حید رمحی الدین غوری صاحب گذشتہ سال امریکہ کو مستقلاً خیرآباد کہہ کے حیدرآباد آ گئے تھے ـــــ وہ ڈاکٹر صاحب کے مزید کئی کیسٹ ساتھ لائے۔ ان کے بقول ان کیسٹ کی ہزاروں نقول تیار کی گئیں اور حیدرآباد کے دینی شغف رکھنے والے حلقے میں پھیلا دی گئیں۔ نتیجۃً لوگوں کی پیاس مزید بڑھی اور گذشتہ سال ماہ اکتوبر، نومبر میں ان کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کے لئے دعوت نامے موصول ہونا شروع ہو گئے ـــــ بہرحال انڈیا کے لئے پاسپورٹ پر ENDORSEMENT کروائی گئی۔ اور ویں ہمیں انڈیا کے تین شہروں یعنی حیدرآباد، دہلی اور لکھنؤ کا ویزا مل گیا ـــــ

۹ اپریل ۱۹۸۴ء : لاہور سے روانگی

مورخہ ۹ اپریل بروز سوموار راقم اور ابّا جان شام چار بجے کی ائر انڈیا کی پرواز سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے ـــ پرواز کل ۴۰ منٹ کی تھی لاہور اور دہلی کے مابین کل فاصلہ لگ بھگ تین صد (۳۰۰) میل ہے لیکن حکومت انڈیا اور پاکستان کی طرف سے جو قوانین وضع کئے گئے ہیں وہ کچھ ایسے پیچیدہ ہیں کہ اس چالیس منٹ کی فلائیٹ کے لئے مہینوں خوار ہونا پڑتا ہے ـــــ بہرحال انڈیا کے وقت کے مطابق ہم لوگ شام پونے چھ بجے

دہلی ائرپورٹ پر تھے۔ امیگریشن اور کسٹم سے فارغ ہوئے، کسٹم والوں نے ہم سے صرف ایک سوال کیا کہ آپ لوگوں کے پاس بادام تو نہیں ہیں؟ — جواب نفی میں تھا۔ بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا سامان کسٹم کے عملے کی دست درازیوں سے محفوظ رہا — ائرپورٹ پر جناب وحیدالدین خاں صاحب مدیر ماہنامہ "الرسالہ" دہلی اور ان کے فرزند ثانی ثنین صاحب موجود تھے۔ جناب وحیدالدین خاں صاحب وہاں کے معروف دینی سکالر ہیں۔ موصوف کے فکر اور اباجان کے فکر میں مکمل ہم آہنگی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود دلی لگاؤ بہت ہے۔ ائرپورٹ سے گھر جاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں کسی کو رسیو (Receive) کرنے ائرپورٹ پر بہت کم جاتا ہوں لیکن باوجود مصروفیت کے آپ (اباجان) کو لینے آگیا ہوں — رات دہلی میں بسر کی، رات گئے تک دہلی کے اصحاب علم اباجان سے ملاقات کے لئے آتے رہے —

۱۰ اپریل ۱۹۸۴ء : حیدرآباد کے لئے روانگی

اگلے روز یعنی ۱۰ اپریل کو صبح ساڑھے پانچ بجے کی فلائیٹ سے حیدرآباد کے لئے روانگی تھی۔ کل ایک گھنٹہ اور چالیس منٹ کی پرواز کے بعد ہم لوگ حیدرآباد پہنچ گئے۔ بہت سے حضرات رن وے کے قریب ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لئے اباجان کے استقبال کو کھڑے تھے۔ ائرپورٹ سے ایک قافلے کی شکل میں ہم اپنی جائے قیام "المرکزالاسلامی" حیدرآباد پہنچ گئے — ملنے والوں کا ہجوم تھا، چیدہ چیدہ لوگوں سے تفصیلی تعارف ہوا۔ جن کا ذکر ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں آجائے گا۔

نماز عصر کے بعد گھر سے نکلے۔ اور سابق امیر جماعت اسلامی آندھرا پردیش جناب محمد یونس صاحب سے ملاقات کی غرض سے ان کے گھر پہنچ گئے — موصوف کئی ماہ سے علیل تھے۔ دل کا عارضہ تھا۔ بہرحال مختصر ملاقات کے بعد ہم لوگ واپس آگئے — بعض حضرات کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ موصوف، اباجان سے ملاقات کے خواہشمند تھے لہٰذا اول روز ہی ان سے ملاقات ہوگئی۔ حیدرآباد سے واپسی سے دو روز قبل ان کا انتقال بھی ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ نماز جنازہ، ان کی خواہش کے مطابق اباجان نے ہی پڑھائی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی خاص رحمت سے نوازے۔ آمین !!

اسی روز نماز عشاء کے بعد "مسجد یک مینارہ" میں اباجان کا مفصل خطاب ہوا۔ سورۃ آلِ عمران کی آیت ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴ پر بیان تھا۔ لوگوں کا دینی ذوق و شوق دیدنی تھا۔ مسجد کا وسیع صحن بھر گیا اور لوگ باہر سڑک پر کھڑے ہوکر درس قرآن سنتے۔

رہے۔ حکومت سے اجازت لے کر سڑک کے دونوں طرف رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی تھیں اور لوگوں کے لئے جگہ بنا دی گئی تھی۔ یہ درسِ قرآن لگ بھگ پونے دو گھنٹے جاری رہا۔ رات ساڑھے گیارہ بجے واپس اپنی جائے قیام پر پہنچ گئے۔

۱۱ اپریل بروز بدھ نمازِ فجر سے فارغ ہوتے ہی تھے کہ چند حضرات ملاقات کی غرض سے تشریف لے آئے۔ ان میں سے ایک صاحب، حیدرآباد میں انجینئرنگ کالج میں لیکچرار ہیں۔ ان سے پاکستان اور اس کے مستقبل پر خاصی گفتگو ہوئی ــــ وہ اپنے ساتھ ایک انگلش میگزین Young Muslim Digest لائے تھے جس کے کئی شمارے انہوں نے اباجان کو پڑھنے کے لئے دیئے ــــ انڈیا کے نظامِ تعلیم میں جو جو خرابیاں ہیں اور جس طرح مسلمان بچوں اور نوجوانوں کو اسلام سے بدظن کیا جاتا ہے مذکورہ میگزین اس کے خلاف ایک جہاد کا درجہ رکھتا ہے۔ مسلمان بچوں کے اندر ان کے اسلاف کے واقعات کے ذریعے دینی جذبہ بیدار کیا جاتا ہے۔ اور اس کو احساس دلایا جاتا ہے کہ ؎

وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

دوپہر کے اوقات میں "حیدرآباد پولیس آفس" جانا ہوا تاکہ اپنا پاسپورٹ دکھا کر حیدرآباد میں پہنچ جانے کا اندراج کرایا جاسکے ــــ نمازِ عصر کے بعد پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا ــــ میڈیکل کالج سے متعلق دو نوجوان ڈاکٹرز تشریف لائے۔ ان کی خواہش تھی کہ غیر مسلم ڈاکٹرز (بشمول مسلمان ڈاکٹروں کے) کے ساتھ ایک نشست رکھی جائے۔ جس میں اباجان کا ایک خطاب ہو اور پھر سوال و جواب کا ایک سیشن ہو۔ بہرحال اس کام کے لئے ۱۵ اپریل کے دن دوپہر ساڑھے تین بجے کا وقت طے پاگیا ــــ

مغرب کی نماز کے بعد بھی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور گذشتہ رات کی مسجد یک مینار والی تقریر کے بارے میں بعض حضرات نے سوالات کیے جن کا تشفی بخش جواب مل جانے پر وہ حضرات مطمئن ہوگئے۔

بعد نمازِ عشاء عیضا اسکول کے گراؤنڈ میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بہت بڑا میدان تھا۔ جس کے نصف حصّہ میں دریاں بچھی تھیں ــــ ساڑھے نو بجے تک حاضرین خاصی تعداد میں جمع ہوگئے ــــ اباجان کی تقریر شروع ہوئی جس میں سورۃ الحجرات کے آخری رکوع کی چند آیات کو بنیاد بنا کر اسلام اور ایمان کا فرق واضح کیا گیا۔ ایمان کے رکن رکین یعنی جہاد فی سبیل اللہ کے مراحل کا بیان اور پھر قتال فی سبیل اللہ کا بیان

بھی بھرپور انداز میں ہوا۔ راقم سوچ رہا تھا کہ سرزمین ہند میں اسلام کے غلبے کے لئے جنگ و جدال کی ترغیب و تحریص گویا کھلی بغاوت کے مترادف ہے، پھر یہ کہ چونکہ وہاں کے جرائد میں آج کی تقریر کا اشتہار بھی تھا تو انڈین گورنمنٹ کے انٹیلی جنس کے شعبے سے متعلق افراد لازماً موجود ہوں گے ۔ اور ان کے سامنے اسلام کے غلبے کے لئے کوشش کا بیان ......!! بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ پونے دو بجے کی تقریر میں گنتی کے افراد کے علاوہ کوئی شخص بھی اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ لگ بھگ دو ڈھائی ہزار کا مجمع تھا اور خواتین کے لئے بھی انتظام موجود تھا۔۔۔ اس پروگرام سے فارغ ہو کر تقریباً رات بارہ بجے واپس اپنی جائے قیام پر پہنچ گئے۔

۱۲ اپریل بروز جمعرات

صبح ساڑھے آٹھ بجے انڈین انٹیلی جنس کے رکن انکوائری کے لئے آ گئے۔ کل ہم پولیس آفس میں حیدر آباد آمد سے متعلق اندراج کرانے گئے تھے۔ لہٰذا اگلے روز معمول کے مطابق وہ لوگ سوال و جواب کے لئے پہنچ گئے ۔۔۔ جلد ہی ان سے فراغت حاصل ہوئی اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ دوپہر کے کھانے تک جاری رہا۔

شام عصر کی نماز سے فارغ ہو کر حیدر آباد کی ایک مشہور شخصیت سے ملاقات کی غرض سے گئے۔ خلیل اللہ حسینی صاحب جو کئی کتابوں کے مصنف اپنی سوچ کے مطابق دینی کام میں مشغول بھی ہیں خاصے ضعیف ہیں۔ ان کے زبانی معلوم ہوا کہ راجستھان میں مسلمانوں کو ہندو بنانے کا عمل زور و شور سے جاری ہے ۔ اس ضمن میں خلیل اللہ حسینی صاحب اور ان کے رفقاء سرگرم عمل ہیں ۔۔۔ نماز عشاء کے بعد عیضا سکول کے گراؤنڈ میں آج پھر خطاب تھا۔ سامعین کی تعداد کل کی نسبت زیادہ تھی ۔۔۔ تقریر کا عنوان تھا "ختم نبوّت سیرت النبیؐ کی روشنی میں" ۔۔۔ حیدر آباد میں قادیانیوں کی سرگرمیاں کافی ہیں اور وہ اپنے مختصر سے کتابچے مسلمانوں میں بانٹتے رہتے ہیں۔ لہٰذا آج کا موضوع اس ضمن میں خصوصی اہمیت کا حامل تھا اور وہ لوگ جن کے ذہنوں پر قادیانیت کی تبلیغ کے زیر اثر شبہات پیدا ہو گئے تھے، کافی مطمئن ہوئے، جس کی گواہی اگلے روز وہاں کے مقامی حضرات نے بھی دی۔

چلتے چلتے ایک بات وہاں کی معاشرت سے متعلق بھی عرض کرتا چلوں۔ عیضا سکول کے مذکورہ بالا پروگرام کے لئے زمین سے تین چار فٹ بلند ایک سٹیج تیار کیا گیا تھا ۔۔۔ راقم معمول کے مطابق سامعین کے ساتھ ہی دریوں پر بیٹھا تھا کہ جناب قاری قطب الدین صاحب نے مجبور کر کے سٹیج پر بٹھا دیا ۔۔۔ وہاں اور بھی کئی حضرات تشریف فرما تھے ۔۔۔ کچھ دیر بعد محسوس ہوا کہ ابا جان تو تقریر کر ہی رہے تھے، بقیہ حضرات جو سٹیج پر بیٹھے تھے، ان کے منہ بھی مسلسل ہل رہے ہیں ۔۔۔ اب جو سامعین کے بارے میں غور کیا تو وہاں بھی یہی عالم تھا ۔۔۔ غور کرنے سے معلوم

ہوا کہ کسی کے منہ میں پان ہے، کسی کے چھالیہ ہے، کسی کے سونف ہے ـــ سٹیج پر بیٹھنے والوں میں سے صرف راقم ہی تھا جس کا منہ ساکت تھا ، میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک بزرگ کی پوٹلی میں سے (جو ان کے سامنے پڑی تھی) ان کی اجازت کے ساتھ تھوڑی سی سونف نکالی اور ع "یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں" کے مصداق ان کی صف میں شامل ہو گیا ۔

۱۳ / اپریل بروز جمعۃ المبارک

آج صبح ناشتہ کا پروگرام وسطِ شہر میں واقع جناب معین الدین صاحب کے مکان پر تھا ۔ ناشتہ کافی پر تکلف تھا ۔ دسترخوان انواع و اقسام کی نعمتوں سے پُر تھا ۔ حیدر آباد کے رہنے والے اکثر حضرات صبح نو ساڑھے نو بجے ثقیل ناشتہ کر کے گھر سے نکلتے ہیں اور پھر عموماً شام کو جلد کھانا کھا لیتے ہیں ۔ اسی مناسبت سے ان کا ناشتہ بہت ثقیل ہوتا ہے ۔ ناشتہ کے بعد ان ہی کے مکان پر ایک نشست سوال و جواب کے لئے مخصوص تھی ـــ کئی حضرات کی جانب سے سوالات ہوئے جن میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے سلسلے میں آپ کا طریقِ کار کیا ہوگا ! جواباً اباجان نے فرمایا کہ ایک مسلمان حکومت کے ہوتے ہوئے ، جو اگرچہ صرف نام کے اعتبار سے مسلمان ہے ، اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ایک ایسی تنظیم کا قیام ضروری ہے جس کے رفقاء ایک امیر کے ہاتھ پر سمع و طاعت اور جہاد فی سبیل اللہ کی بیعت کریں ۔ ان کی بھرپور تربیت کی جائے اور جب ایک ایسی جمعیت فراہم ہو جائے کہ امیر کو ان کے بارے میں اعتماد ہو کہ وہ جان ہتھیلیوں پر رکھ کر آئے ہیں اور امیر کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہیں تو وہ اس نظام کے کسی منکر کے خلاف ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں گے ـــ مثلاً جماعت کا امیر اگر فیصلہ کرے کہ ہم ۱۱ اگست کو خواتین کی کھلے بندوں جو پریڈ ہوتی ہے اس کو نہیں ہونے دیں گے ـــ تو اب اس منکر کے خلاف ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوگی ۔ اگر حکومت وقت اس پر رضامند ہو جائے کہ پریڈ نہیں ہوگی تو کسی اور منکر کے خلاف یہی طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا اور منکرات کو ختم کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا ۔ اسطرح بجائے اس کے کہ خود اقتدار کے طالب بن کر سامنے آئیں ، اسی حکومت کے ہاتھوں منکر کی تنکیر کرائی جائے گی اور معروف کو رائج کرایا جائے گا لیکن اگر حکومتِ وقت اس پر تیار نہ ہو تو ظاہر ہے اس منکر کے خلاف جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترنا ہوگا ۔ گولیاں کھانی ہوں گی ۔ ماریں سہنی ہوں گی ، جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی ہوں گی ۔ لیکن یہ سب منحصر ہے اس بات پر کہ امیر کو یقین اور اعتماد ہو اپنے ساتھیوں کی تعداد پر بھی اور ان کی جانفروشی پر بھی ......!! یہ ہے وہ طریق کار جس کے ذریعے کسی نام نہاد اسلامی حکومت میں حقیقی اسلامی انقلاب لایا جا سکتا ہے ـــ آج کا پروگرام اس اعتبار سے اباجان کے لئے خاصا دشوار ہو گیا کہ جمعۃ المبارک کی تقریر کے لئے دو مساجد

کا اعلان کر دیا گیا تھا ۔ للہٰذا نماز جمعہ سے قبل جامع مسجد معظم پورہ میں خطاب ہوا جس میں حکمت واحکام جمعہ کے موضوع پر ایک گھنٹہ کا خطاب تھا ـــــ یہ مسجد حیدر آباد میں تبلیغی جماعت کا مرکز ہے اور شہر کے خاصے بارونق علاقے میں واقع ہے ـــــ نماز جمعہ کے فرائض ادا کرتے فوراً "مسجد سلیمہ خاتون" کے لئے روانگی ہوئی ۔ اور وہاں سورۃ رحمٰن کی ابتدائی تین آیات پر خطاب ہوا ۔ اس مسجد میں نمازی حضرات جمعہ کی نماز سے فارغ ہوکر ہمہ تن انتظار کر رہے تھے ـــــ جیسے ہی ابا جان پہنچے خطاب شروع ہو گیا جو لگ بھگ ایک گھنٹہ اور دس منٹ جاری رہا۔

اسی روز بعد نماز عشاء جامع مسجد دارالشفا میں آیۂ برّ (سورۃ بقرہ آیت نمبر ۱۷۷) کا درس تھا ـــــ اگر مسجد کا اپنا صحن بھی کافی کشادہ تھا لیکن وہاں کی منتظمہ نے مسجد سے ملحقہ گراؤنڈ منتخب کیا ـــــ لیکن یہ بھی ناکافی ثابت ہوا اور لوگوں نے سڑک پر کھڑے ہو کر درس قرآن سنا ـــــ آیۂ برّ کے حوالے سے " نیکی کی حقیقت " کا جو مفہوم حاضرین کی سمجھ میں آیا وہ ان کے بقول عام تصوّر نیکی سے بالکل الگ تھا ـــــ عموماً نیکی کو عبادات کے مترادف خیال کیا جاتا ہے یعنی جو شخص نماز ، روزہ ، حج اور زکوٰۃ پر عمل کرے گا وہ نیک انسان ہوگا ـــــ جبکہ اس کے بالکل برعکس سورۂ بقرہ کی آیت زیر درس میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر بالکل آخر میں ہے ۔ اوّلین شے ایمان باللہ ، ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت کے بعد انفاق مال فی سبیل اللہ ہے ۔ پھر نماز اور زکوٰۃ ہے اور پھر ایفائے عہد اور سختی کی حالت میں یا جنگ کی صورت میں صبر ـــــ اور آخر میں ایک جامع حکم کہ تم نیکی کو اپنے پیمانوں سے ناپتے ہو ، حقیقتاً متقی اور نیک تو یہ لوگ ہیں!

حیدر آباد کے رفقا کا ایک تقاضا راقم سے بھی تھا کہ وہ بھی کسی پروگرام میں درس قرآن دے یا مختصر سا خطاب کرے ـــــ راقم نے اس سے تو معذرت کی لیکن آج ابا جان کے درس سے قبل راقم نے سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی تلاوت کی اور ان آیات کا سلیس ترجمہ بھی کیا ۔!! گویا وہاں کے پروگراموں میں جزوی شرکت راقم کی بھی ہوگئی ـــــ ابا جان کے بقیہ پروگراموں سے قبل تلاوت کے لئے منتظمین بعد میں بھی راقم کو موقع دیتے رہے ۔

۱۴ اپریل بروز ہفتہ

بیرسٹر اکبر علی صاحب حیدر آباد کی ایک معروف شخصیت ہیں ـــــ مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ سے متعلق ہیں اور صوبہ یوپی اور اڑیسہ کے گورنر بھی رہ چکے ہیں ۔ حیدر آباد آمد کے اگلے روز بھی ہم ان سے ملاقات کی غرض سے گئے تھے ۔ ان کا شدید تقاضا تھا کہ انسٹی ٹیوٹ میں ابا جان کا ایک خطاب ہو ـــــ آج صبح دس بجے کا وقت اسی لئے معیّن تھا ـــــ انسٹی ٹیوٹ کے آڈیٹوریم میں " ماضی قریب کی احیائی تحریکیں " کے ذیل میں مولانا ابوالکلام آزاد اور دعوت جہاد اور قرآن ' پر

مفصل خطاب ہوا ـــ اس پروگرام میں عثمانیہ یونیورسٹی کے پولیٹیکل سائنس کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ جناب ایس اے باری بھی موجود تھے جنہوں نے اس تقریر کے بارے میں ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا کہ "ڈاکٹر صاحب! میں عثمانیہ یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس میں بے شمار حضرات کو پی ایچ ڈی کروا چکا ہوں لیکن آج کی تقریر میں تحریک شہیدین، تحریک آزادی ہند اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریک حزب اللہ اور پھر ان میں دو تحریکوں یعنی تحریک شہیدین اور حزب اللہ کی بنیاد کا بیعت پر ہونا، مصر کی تحریک اخوان المسلمون، سوڈان کی مہدی سوڈانی کی تحریک، طرابلس (موجودہ لیبیا) کی سنوسی، برصغیر کی تحریک اسلامی اور دیگر تحریکوں کا تجزیہ جس انداز میں آپ نے فرمایا ہے یہ صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔" ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○ ـــ دوپہر کے آرام کے بعد مولانا تقی الدین صاحب کے مدرسے کی طرف سے دعوت تھی۔ وہاں پہنچتے ہی ان کی جانب سے پُرتکلف عصرانے کا اہتمام تھا ـــ پھر مدرسے سے ملحقہ مسجد "مسجد اجالے شاہ" میں جو لگ بھگ ڈھائی سو سال پرانی ہے سورۃ الحج کی آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ..... الخ پر درس دیا ـــ شدید گرمی کے باوجود کثیر تعداد میں لوگ جمع تھے ـــ
واپسی پر جناب نعمت اللہ صاحب کے، جو مجلسِ اشاعتِ اسلام حیدرآباد کے صدر ہیں اور حیدرآباد کے کاروباری حلقے میں اونچے مقام پر ہیں، آفس کی سیر کی۔ ابا جان کی آمد سے ان کا آفس ایک کیسٹ ورکشاپ کی صورت اختیار کر چکا تھا جہاں ان کے بقول حیدرآباد میں کی گئی تمام تقریروں کی کیسٹ کی نقول تیار کی جا رہی تھیں۔ روزانہ ڈھائی سو کیسٹ تیار ہوتے تھے جو نمازِ عشاء کے اجتماع کے بعد ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کی آمد سے ایک ہفتہ قبل ایک خصوصی مہم کے ذریعے "راہ نجات" اور "اسلام کا معاشی نظام" پر مشتمل کیسٹ، چار پانچ ہزار کی تعداد میں ریکارڈ کیے گئے اور انتہائی ارزاں قیمت پر فروخت کیے گئے ـــ راقم کا ذہن ایران کے انقلاب کی جانب منعطف ہوا، وہاں بھی خمینی صاحب کے وہ کیسٹ ہی اس انقلاب کی بنیاد بنے تھے جو لاکھوں کی تعداد میں ایران میں پھیل گئے تھے ـــ آج بھی حسب معمول نمازِ عشاء کے بعد "جامعہ انوار العلوم" میں سورۃ حٰمٓ السجدہ کی منتخب آیات اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا! پر درس ہوا جو لگ بھگ سوا دو گھنٹے جاری رہا۔ حاضرین کی تعداد تین ہزار سے کم ہرگز نہ تھی ـــ دعوت الی اللہ کے موضوع پر قرآن کا ذروۂ سنام یعنی وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○ پر مفصل گفتگو ہوئی۔ اسی کے ذیل میں دعوت

اِلیٰ اللہ کے تین مدارج اُدۡعُ اِلیٰ سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡھُمۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ کا بیان بھی ہوا ــــــ رات سوا بارہ بجے اجتماع گاہ سے واپسی ہوئی۔

۱۵ اپریل بروز اتوار آج یوم تعطیل ہے۔ نماز فجر سے فراغت کے بعد سے ملاقاتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو ساڑھے گیارہ بجے تک جاری رہا۔ دو تین دنوں سے حیدرآباد کا موسم شدید سے شدید تر ہو رہا تھا اسی لئے آج ایک صاحب نے ہمارے کمرے میں ائیرکنڈیشنر فٹ کر دیا جس کی وجہ سے دوپہر کے آرام میں مدد ملی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا اجر عطا فرمائے ــــــ آج دوپہر ساڑھے تین بجے نوجوان ڈاکٹرز کے تشکیل کردہ پروگرام کے مطابق حیدرآباد کے سب سے بڑے تھیٹر 'رویندرا بھارتی' میں 'اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات' کے موضوع پر خطاب تھا ــــــ چونکہ اس پروگرام میں مخصوص دعوت ناموں سے ہی شرکت ہو سکتی تھی اس لئے اجتماع عام کی سی فضا تو نہیں پیدا ہو سکی۔ سامعین کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی جن میں غیر مسلم ڈاکٹر بھی شامل تھے۔ سوا گھنٹے کی تقریر کے بعد یہ پروگرام اختتام کو پہنچا۔ بعد میں لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ پہلی مرتبہ اس تھیٹر میں قرآن کی آیات کی تلاوت کی گئی ہے۔ اور اسلام کے موضوع پر کوئی پروگرام ہوا ہے۔ ورنہ یہ تھیٹر تو رقص اور گانوں وغیرہ ایسے پروگراموں کیلئے مخصوص ہے۔ اس پروگرام کی وجہ سے شہر حیدرآباد میں ایک خوشگوار فضا پیدا ہو گئی۔ نماز عصر اسلامک سنٹر میں پڑھی اور پھر مغرب تک لوگوں سے گفتگو کا دور جاری رہا۔ ــــــ نماز عشاء کے بعد آج پھر 'جامعہ انوار العلوم' کے گراؤنڈ میں جلسۂ عام کا اہتمام تھا۔ آج درسِ قرآن کے لئے ابا جان نے سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ کا انتخاب فرمایا تھا۔ یہ خطاب بھی لگ بھگ سوا دو گھنٹے جاری رہا ــــــ سورۃ الشوریٰ کے الفاظ وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ کے حوالے سے "قیام نظام عدل اجتماعی" پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ رات سوا بارہ بجے واپس اپنے جائے قیام پر پہنچ گئے ــــــ !!

۱۶ اپریل بروز سوموار آج صبح کا ناشتہ (حیدرآبادی ناشتہ) جناب حسن الدین صاحب کے یہاں تھا۔ جو "المرکز الاسلامی" کے رکن ہیں ــــــ موصوف خاصا عرصہ امریکہ میں بھی گزار چکے ہیں اور وہاں بھی دینی سرگرمیوں میں زور و شور سے حصہ لیتے رہے ہیں۔ ناشتہ کے بعد قیام گاہ

پہنچے تو وہاں جماعت اسلامی کے سابق رکن جناب عبدالقادر صاحب اباجان سے ملاقات کے لئے موجود تھے ـــــ دوپہر سوا بارہ بجے گھر سے روانہ ہوئے اس لئے کہ جامع مسجد نواز جنگ میں آج ظہر سے قبل یعنی ساڑھے بارہ بجے درسِ قرآن کا پروگرام تھا۔ اس پروگرام میں اباجان نے سورۃ الحج کی آخری آیت کا درس دیا۔ درس کے فوراً بعد نماز ظہر ادا کی اور قریب ہی موجود جناب معین صاحب کے گھر ٹھہرانے میں شریک ہوئے ـــــ دوپہر ساڑھے تین بجے کے قریب واپسی ہوئی اور تھوڑے آرام کے بعد پھر تیار ہوئے۔ اس لئے کہ "مدینہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ" میں نماز عصر کے فوراً بعد "اسلام کا معاشی نظام" کے موضوع پر خطاب تھا۔ مغرب تک تقریر جاری رہی ـــــ نماز مغرب کے بعد تھوڑا آرام کیا اور پھر جامع مسجد مشیر آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ جہاں حسب معمول نماز عشاء کے بعد خطاب تھا ـــــ سورۃ لقمان کے رکوع ثانی کا درس ہوا۔ یہ مسجد چار سو سال قدیم ہے یعنی ۱۵۸۰ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ اونچے اونچے محراب اور وسیع و عریض صحن۔ درمیان میں وضو کے لئے ایک حوض مسجد کے صحن میں اونچے اونچے کھجور کے درخت ـــــ رات ساڑھے نو بجے تقریر شروع ہوئی اور سوا گیارہ بجے ختم ہوئی ـــــ دورانِ درس منتظمین میں سے ایک صاحب نے اباجان کو چٹ بھیجی کہ لوگوں سے قریب قریب ہونے کی درخواست کی جائے۔ اس لئے کہ سامعین کی تعداد بڑھ رہی ہے ـــــ اباجان نے اس کام کے لئے دو تین منٹ کا وقفہ بھی دیا ـــــ لوگ قریب ہونے میں سستی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس پر اباجان نے برجستہ کہا ـــــ ؎

حضرت داغؔ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ میرے قریب حضرت داغ سے ملتے جلتے پرانے زمانے کے ایک بزرگ بیٹھے تھے ـــــ ان کے آگے خالی جگہ موجود تھی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ "حضور! ڈاکٹر صاحب یہ آپ ہی کے بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں۔" انہوں نے خاص نظروں سے راقم کی جانب دیکھا اور سامنے موجود خالی جگہ پُر کر لی ـــــ!

۱۷ اپریل بروز منگل نماز فجر کے بعد حیدر آباد کی ایک بزرگ شخصیت جناب محمد سالم مدوسی صاحب سے ایک طویل نشست رہی۔ موصوف دو سال قبل پاکستان تشریف لائے تھے۔ اکیڈمی میں بھی چند دن قیام کیا تھا اور لاہور ہی میں ایک رکشہ کے ایکسیڈنٹ میں ان کی دونوں ٹانگیں کئی جگہ سے ٹوٹ گئی تھیں۔ اس موقع پر جس صبر کا مظاہرہ آپ نے کیا وہ ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا ـــــ آج ناشتے کے لئے ہم قاری قطب الدین صاحب کے ہاں مدعو تھے جو مجلس اشاعت اسلام کے سیکرٹری ہیں۔ اپنی رہائش گاہ کے قریب ہی

انہوں نے ایک مدرسہ قائم کیا ہوا ہے۔ جہاں لگ بھگ ایک سو طالب علم پڑھتے ہیں۔ موصوف نے ہمیں اپنے مدرسے کی سیر بھی کرائی۔ دورانِ سیر موصوف نے ایک احاطے کی جانب اشارہ کرکے فرمایا کہ یہ اس آبادی کا "خبرستان" ہے ــــ عام آدمی خبرستان سن کر یہی سمجھے گا کہ غالباً یہاں سے خبریں نشر ہوتی ہیں۔ دراصل حیدرآباد کے حضرات 'ق' نہیں بول سکتے، اس کی بجائے 'خ' بولتے ہیں۔ موصوف نے جو خبرستان کہا تھا وہ اصل میں قبرستان کہنا چاہتے تھے۔ ناشتے سے فراغت کے بعد وہاں کے رفقاء کے اصرار پر 'نہرو زولوجیکل پارک' کی سیر کی۔ واپسی پر 'طور بیت المال' کو بھی دیکھا جس کے سربراہ جناب وزارت پاشا صاحب نے ہمیں اس بیت المال کے قیام کے پس منظر اور موجودہ طریق کار سے آگاہ کیا۔ ظہرانے کا اہتمام جناب حیدر محی الدین غوری صاحب نے کیا تھا ــــ دوپہر میں آرام کے بعد 'اقبال اکیڈمی' کے لئے روانہ ہوئے جہاں عصر تا مغرب 'ابا جان' کو خطاب کرنا تھا ــــ دورانِ خطاب ابا جان نے اکیڈمی کے کام کو سراہا اور تجویز پیش کی کہ اسی نہج پر اگر "قرآن اکیڈمی" کا قیام روبعمل آسکے تو ان شاء اللہ بہت مفید ثابت ہوگا ــــ آج 'مکہ مسجد' میں تین روزہ خطاب کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو روزانہ نمازِ عشاء کے بعد ہونے تھے۔ مکہ مسجد اندرون شہر واقع ہے اور حیدرآباد میں اس کا وہی مقام ہے جو لاہور میں 'شاہی مسجد' کا۔ بہت وسیع و عریض صحن جس کے وسط میں بڑا سا تالاب۔ اونچے اونچے دو مینار ــ مسجد کے ستون اور محراب کم و بیش ساٹھ فٹ بلند ــــ خطاب کا عنوان تھا "حقیقت و اقسام شرک" ــــ آج صرف شرک فی الذات اور شرک فی الصفات پر گفتگو ہوئی۔ آج کے اجتماع کی خاص بات یہ تھی کہ حیدرآباد میں گاندھی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین شیشا چاری بھی اسٹیج پر موجود تھے جو عقیدے کے لحاظ سے ہندو ہیں۔ انہوں نے پھولوں کا ایک بہت بھاری ہار ابا جان کو پہنایا ــ تمام تقریر بڑے غور سے سنی اور اس دوران نوٹس بھی لیتے رہے ــ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ آج شرک فی الذات کا بیان تھا جس کے ضمن میں ہندو عقیدے کا ذکر بھی آیا۔ درس کے دوران راقم نے کئی بار ان کے چہرے کی جانب دیکھا کہ شاید تیور بگڑے ہوئے ہوں لیکن شیشا چاری گردوپیش سے بے خبر ہمہ تن درس کی جانب متوجہ تھے اور درس کے نوٹس لے رہے تھے

اگلے روز ڈاکٹر صاحب کے نام ان کا خط موصول ہوا جو تحسینی کلمات اور ڈاکٹر صاحب کی شان میں ایک قصیدے پر مشتمل تھا۔۔ ہمیشہ کی طرح اس پروگرام سے فارغ ہو کر رات ساڑھے بارہ بجے اپنی قیام گاہ پر پہنچے ــــ!!

۱۸/ اپریل بروز بدھ | صبح نمازِ فجر کے بعد 'مجلس قرأت و تجوید' سے متعلق ۲۵، ۳۰ حضرات آئے خاصی دیر مختلف امور پر گفتگو جاری

رہی۔ ناشتہ ایک صاحب کے ہاں تھا جہاں امیر تبلیغی جماعت 'آندھرا پردیش' سے بھی ملاقات ہوئی ـــــ ناشتے سے فارغ ہو کر ادارۂ ملیہ گئے بانی مولانا جمیل احمد صاحب سے ملاقات کے لئے ان کے مدرسے گئے۔ موصوف نے کل نماز فجر کے بعد ادارے کی مسجد میں ابا جان کا ایک پروگرام بھی طے کر لیا ـــ واپسی پر حیدر آباد کے عجائب گھر 'سالار جنگ میوزیم' کی سیر کی اور ـــ چار مینار (ایک تاریخی مقام) سے ہوتے ہوئے واپس قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ نماز عصر جامع مسجد معظم پورہ میں ادا کی جہاں نماز کے بعد ابا جان نے مولانا محمد یونس صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی اور نماز جنازہ سے قبل ایک مختصر سا خطاب بھی فرمایا ـــ مجلس اشاعت اسلام کی جانب سے آج ایک دعوت کا اہتمام المرکز الاسلامی ہی میں تھا۔ نماز مغرب سے قبل لگ بھگ پون گھنٹہ اراکین مجلس اشاعت اسلام اور دیگر مدعوئین سے خطاب فرمایا ـــ نماز عشاء کے بعد مکہ مسجد کے لئے روانگی ہوئی جہاں آج حقیقت شرک کے ضمن میں شرک فی العبادت کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔

۱۹ راپریل بروز جمعرات نماز فجر کے فوراً بعد مختصر سا ناشتہ کیا اور پروگرام کے مطابق ادارۂ ملیہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ صبح ساڑھے چھ بجے خطاب شروع ہوا اور سوا آٹھ بجے تک جاری رہا۔ عنوان تھا " ہماری دینی ذمہ داریاں " ـــ جامعہ ملیہ سے واپسی پر ایک مسجد کا سنگ بنیاد رکھا ـــ! دوپہر کے آرام اور نماز عصر کے بعد المرکز الاسلامی کے تحت ایک اجتماع تھا۔ جس سے ابا جان نے خطاب فرمایا جو لگ بھگ سوا گھنٹے جاری رہا ـــ آج نماز عشاء کے بعد حیدر آباد میں آخری پروگرام تھا ـــ مسجد کا صحن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کم و بیش بیس ہزار کا مجمع تھا۔ جن میں خاصی تعداد میں خواتین بھی شامل تھیں ـــ "حقیقت و ماہیت ایمان" کے موضوع پر لگ بھگ ڈھائی گھنٹے کا خطاب ہوا۔ رات پون بجے واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے ـــ یاد رہے آج رات کا کھانا حیدر آباد کی مشہور و معروف اور متمول ترین لوگوں میں سے ایک شخصیت جناب ابراہیم مستقلی صاحب کے ہاں تھا۔ موصوف کے والد ماجد کا تعلق عرب سے تھا اور والدہ حیدر آباد کی تھیں ـــ کھانے میں 'مرق' نامی ایک عربی ڈش بھی تھی، جو انہوں نے بطور خاص تیار کروائی تھی ـــ آج کی رات اس اعتبار سے بہت برکت کی حامل تھی کہ رات 'ڈھائی بجے' المرکز الاسلامی کی چھت پر کھلے آسمان تلے، گیارہ حضرات نے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی اور امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کی ـــ صبح نماز فجر کے فوراً بعد مزید تین حضرات نے بیعت کی۔ اس طرح حیدر آباد میں کل ۱۴ حضرات نے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔

۲۰ راپریل بروز جمعۃ المبارک صبح ساڑھے پانچ بجے ائرپورٹ کے لئے روانگی

ہوئی اور وہاں سے نو بجے ہم لوگ دہلی پہنچ گئے ـــــ ائرپورٹ پر جناب ڈاکٹر اقبال انصاری صاحب موجود تھے جو علیگڑھ یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات سے وابستہ ہیں ـــــ موصوف نے اباجان کے علیگڑھ میں پروگرام کی تشکیل کے سلسلے میں بہت محنت کی اور کسی نہ کسی طرح علی گڑھ کا خصوصی ویزا حاصل کر لیا ـــــ نماز جمعہ جامع مسجد دہلی کے قریب ہی چتلی قبر کے علاقہ میں واقع مدرسہ حسین بخش میں ادا کی (معلوم ہوا یہ وہی مدرسہ ہے جہاں سالہا سال تک سحبان الہند مولانا احمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان میں اجتماع جمعہ کو خطاب فرمایا کرتے تھے اور اسی مدرسہ کے مہتمم بھی تھے۔ ان کا قرآن حکیم کا درس بھی اسی مدرسہ میں ہوا کرتا تھا)۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب اس مسجد کے خطیب ہیں۔ موصوف اکتوبر ۸۲ میں سالانہ محاضرات قرآنی میں شرکت کے لئے بطور خاص لاہور بھی آئے تھے ـــــ موصوف نے مسجد میں اعلان فرما دیا کہ خطاب جمعہ کی ذمہ داری ڈاکٹر صاحب ادا کریں گے۔ لہٰذا الحکمت و احکام جمعہ کے موضوع پر خطاب فرمایا ـــــ نماز جمعہ سے فارغ ہوتے ہی ریلوے اسٹیشن روانہ ہوئے۔ علیگڑھ کی گاڑی پکڑی ـــــ مغرب کے بعد علیگڑھ یونیورسٹی کے وسیع و عریض ہال 'کینیڈی ہال' میں "اقامت دین اور اس کا طریق کار" کے موضوع پر مفصل خطاب فرمایا۔

۲۱ اپریل بروز ہفتہ صبح کی ٹرین سے دہلی واپس آ گئے ـــــ آج شام مغرب کی نماز کے بعد المرکز الاسلامی 'دہلی' میں اباجان کا ایک خطاب تھا۔ یاد رہے کہ مولانا وحید الدین خان صاحب کی رہائش بھی اسی مرکز میں ہے۔ موصوف نے اپنے انتہائی قریبی دوستوں کو دعوت دی تھی۔ یہ خطاب بھی لگ بھگ دو گھنٹے جاری رہا۔ خطاب کا موضوع تھا "تاریخ امت مسلمہ اور اس کی بنی اسرائیل کی تاریخ سے مماثلت" ـــــ

۲۲ اپریل بروز اتوار ناشتے کے لئے ہم جماعت اسلامی ہند کے مرکز میں مدعو تھے۔ اس دورۂ ہند کے ضمن میں اباجان کی ایک شدید خواہش یہ بھی تھی کہ مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب سے ملاقات ہو جائے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ مرکز میں مولانا سے ملاقات ہو گئی اور اباجان نے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ ہدیتہً ان کو دیا۔ "جماعت اسلامی ہند" کی مجلس شوریٰ کا اجتماع دو دن سے جاری تھا۔ لہٰذا تمام ہندوستان سے جماعت کے امراء اور قیم اور ارکان شوریٰ جمع تھے۔ ناشتے سے قبل اور بعد میں بھی پاکستان میں اسلام کا مستقبل اور اس ضمن میں جماعت اسلامی پاکستان کا کردار' کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوئی ـ واپسی پہ دہلی میں مقیم مولانا افتخار

فریدی صاحب سے ملاقات کی ان کی زبانی معلوم ہوا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ آج رات دہلی تشریف لائیں گے ــــــ اس پر آباجان نے لکھنؤ کا ٹکٹ کینسل کروا دیا۔ اس لئے کہ لکھنؤ صرف مولانا علی میاں (مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب) سے ملاقات کے لئے جانا تھا ــــــ نماز عشاء کے بعد مولانا علی میاں سے ملاقات کی۔ موصوف کو کل اپنے کسی پروگرام کے سلسلے میں 'اردن' روانہ ہونا تھا۔ لہٰذا ان کے آرام کے پیشِ نظر ہم لوگ جلد ہی ان سے اجازت لے کر واپس آگئے۔

۲۲ تا ۲۴ اپریل یہ دن ہم نے دہلی میں ہی گزارے۔ دہلی کے گلی کوچوں میں سے گذرتے ہوئے جگہ جگہ آپ کو مسلمانوں کی عظمت کے نشانات ملیں گے۔ مسلمانوں کی تعمیر شدہ مساجد، قلعے اور باغات اور لال قلعہ جو شاہجہاں نے تعمیر کیا جو فن تعمیر میں خصوصی مقام رکھتا ہے ــــــ یہ وہ سرزمین ہند ہے جہاں مسلمانوں کے آٹھ سو سال انتہائی شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی ہے۔ لیکن

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے؟
شمشیر وسناں اوّل طاؤس ورباب آخر

کے مصداق شان وشوکت کا ذرہ ذرہ ختم ہوا اور اب مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں وہ اظہرمن الشمس ہیں۔ اب بھی ضرورت ہے کہ برِصغیر پاک و ہند کے مسلمان نوجوانوں میں ان کے اسلاف کے حوالے سے جذبۂ جہاد پیدا کیا جائے۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے!!
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

دہلی کے مختلف حضرات سے ملاقاتیں کیں۔ حکیم محمد سعید صاحب کے بڑے بھائی جناب حکیم عبدالحمید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنا قائم کردہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز اور ہمدرد طبیہ کالج دکھایا اور پُرتکلف چائے کے ساتھ تواضع کی۔ ان ہی کی گاڑی میں 'مہرولی' (پرانا دہلی) اور قطب مینار کی سیر بھی کی ــــــ قریب ہی واقع خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر حاضری دی۔ جن کے مرید ہیں خواجہ فریدالدین شکر گنج رحؒ اور ان کے مرید ہیں حضرت نظام الدین اولیاء ــــــ یہ وہ حضرات ہیں جن کے ہاتھوں پر لاکھوں لوگوں نے اسلام قبول کیا ــــــ ۲۴ اپریل کو مغرب کی نماز کے بعد غالب اکیڈمی کے ہال میں آباجان کی ایک تقریر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر تھی۔ جس کا اہتمام 'ادارۂ ہمدرد' نے کیا تھا۔

۲۵ اپریل بروز بدھ صبح ناشتے کے بعد مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب سے ملاقات کی غرض سے درگاہ شاہ رحیم الدینؒ گئے۔

مدرسہ سے ملحق ہی ایک احاطہ ہے جہاں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے چاروں بیٹے یعنی شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی رحمہم اللہ علیہم مدفون ہیں۔ ان حضرات کی قبور پر حاضری دی۔ دل ان حضرات کی عظمت کے احساس سے معمور تھا۔ ذہن علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی جانب منتقل ہوگیا جو انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی کی قبر پر حاضری کے بعد فرمایا تھا۔

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

(اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ مَرْقَدَھُمْ وَاَکْرِمْ مَنْزِلَھُمْ وَاَلْحِقْھُمْ بِالصّٰلِحِیْنَ)

شام ڈھائی بجے کی پرواز سے ہم واپس لاہور پہنچ گئے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالْمِنَّۃ !!

حیدرآباد میں جناب عبداللہ صدیقی صاحب، جناب حیدر غوری صاحب، جناب قطب الدین صاحب۔ جناب قاری عبدالعلیم صاحب، جناب شفیع بھائی اور جناب قاری تقی الدین صاحب نے جس طرح ہمارے آرام کا خیال رکھا۔ اس کے لئے ان حضرات کے حق میں دل دعا نکلتی ہے اور مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ (جو انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکرگزار بھی نہیں بن سکتا) کے مصداق ہم ان حضرات کا زبانی شکریہ بھی ادا کرتے ہیں ـــــ اور دہلی میں جناب وحید الدین خاں صاحب ان کے صاحب زادے ثانی اثنین اور جناب نورالدین آزاد صاحب کے بھی انتہائی شکر گزار ہیں کہ انھوں نے دہلی میں ہمیں کسی تکلیف کا احساس نہ ہونے دیا۔

آخر میں قارئین میثاق سے عرض کروں گا کہ وہ دعا فرمائیں کہ ہندوستان میں ان پندرہ دنوں کے دوران جو محنت کی گئی ہے۔ اللہ اس کو قبول فرمائے اور اس کو لوگوں کے لئے ہدایت اور راہنمائی کا ذریعہ بنائے۔ آمین !!

عن انسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

قال

لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما
یحب لنفسہ

(رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ
والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت
تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے
بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جیسے وہ اپنے
لئے پسند کرتا ہے۔

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید: ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا
جس میں بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے
بڑے فوائد بھی ہیں۔

THE ORIGINAL

ٹینٹ اور ترپال
بنانے کا ممتاز ادارہ
ایچ
نظام دین
اینڈ سنز
مرکزی دفتر
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

کے چھٹے سالانہ

محاضراتِ قرآنی

میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دو فکر انگیز خطابات

(۱)

جہاد بالقرآن

زیر طباعت ہے -

(۲)

اسلامی انقلاب کیلئے التزامِ جماعت اور مسئلہ بیعت

زیر تکمیل ہے - ان شاء اللہ العزیز ماہ جولائی کے وسط میں منصۂ شہود پر آجائے گا -

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol 33 | JUNE 1984 | No. 6

وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن —— لاہور

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۳۳ | شمارہ ۷ | شوال المکرم ۱۴۰۴ھ مطابق جولائی ۱۹۸۴ء

مشمولات

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ مرکزی تنظیم اسلامی

فون : ۸۵۲۶۱۱

سب آفس : ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

بفضلہ تعالیٰ شوال المکرم ۱۴۰۴ھ مطابق جولائی ۱۹۸۴ء کا شمارہ ہدیۂ قارئین ہے۔ امسال تقریباً پورا ملک گرمی کی جس شدید لہر کی زد میں آیا ہوا ہے اس کا اندازہ ہمارے قارئین کرام کو بخوبی ہوگا۔ اس پر مستزاد اس شدید ترین موسم گرما میں رمضان المبارک کے روزے ۔۔۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہوا کہ اس شمارے کے اکثر و بیشتر مضامین مئی ۸۴ ہی میں کتابت کے مراحل سے گزر چکے تھے۔ اسی باعث ہم اس قابل ہوئے کہ پرچہ انشاء اللہ وقت پر منصۂ شہود پر آجائے گا۔

بحمداللہ و عونہٖ تنظیم اسلامی کا نواں سالانہ اجتماع ۲۵ مئی کو شروع ہو کر ۳۰ مئی کو اختتام پذیر ہوا۔ (سابقہ شمارے میں غلطی سے اس اجتماع کو آٹھواں سالانہ اجتماع لکھا گیا تھا۔ حالانکہ یہ نواں سالانہ اجتماع تھا) اس گرمی کے شدید موسم میں کراچی سے لے کر پشاور تک جہاں جہاں بھی مقامی تنظیمیں، اسرہ جات اور منفرد رفقاء رہائش پذیر ہیں وہاں سے رفقاء کی اکثریت نے اس اجتماع میں شرکت کی۔ شکاگو (شمالی امریکہ) سے بھی جناب ڈاکٹر محمد افضل فردوسی صاحب نے اس اجتماع میں شرکت کی۔ موصوف صرف اجتماع میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے تھے۔ رفقاء کے علاوہ متعدد حضرات بحیثیت مبصر اس اجتماع میں شریک ہوئے۔ جن میں سے چودہ افراد امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر کے تنظیم اسلامی میں شامل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو استقامت عطا فرمائے۔

اس اجتماع میں مرکزی تنظیم کی سالانہ رپورٹ کے ساتھ ساتھ مختلف مقامی تنظیموں کے امراء کی جانب سے اپنے اپنے علاقوں میں تنظیم کے دعوتی و تبلیغی کاموں اور سرگرمیوں کی رپورٹ

بھی پیش ہوئی۔ مزید براں امریکہ اور کینیڈا کی تنظیموں اور بیرون ملک جہاں جہاں تنظیم کے منفرد رفقاء موجود ہیں، ان کی سرگرمیوں کی رپورٹ بھی پیش ہوئی ـــــــ اس اجتماع کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ یہ محض تنظیم کی سال بھر کی کارگزاریوں اور سرگرمیوں کی رپورٹوں اور ضابطے کی کارروائیوں پر مشتمل نہیں تھا بلکہ اس کی نوعیت تربیتی اجتماع کی بھی تھی چنانچہ پانچ دن تک امیر محترم نے دروس قرآن حکیم اور لیکچرز کے ذریعہ تنظیم کی دعوت کے اصول و مبادی، اس کی خصوصیات اور ان امور پر جو دوسری دینی جماعتوں کے مقابلے میں تنظیم اسلامی کے لیے مابہ الامتیاز ہیں، بڑے شرح و بسط اور مستحکم استدلال کے ساتھ روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی قرآن حکیم کے مختلف مقامات کے حوالے سے وہ اوصاف بھی بیان فرمائے جو اس ہیئت اجتماعیہ کے رفقاء میں مطلوب ہیں جو وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کے پیش نظر وجود میں آئی ہو اور جس کا نصب العین صرف اور صرف آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول اور اُخروی نجات و فلاح ہو ـــــــ راقم کا محتاط اندازہ ہے کہ اس سالانہ اجتماع میں امیر محترم نے روزانہ قریباً چھ سات گھنٹے تک مختلف موضوعات کے ذیل میں خطاب فرمایا ـــــ سوالات کے جوابات دیے، اشکالات کو رفع کیا، پھر تنظیم کی پیش کردہ رپورٹوں پر تبصرہ فرمایا اور مفید مشورے دیے۔ واقعہ یہ ہے کہ امیر محترم جس طرح اپنی زندگی اور صحت جیسی متاع عزیز کو اللہ کے دین کی سرفرازی کے لیے لگا رہے ہیں، اس میں رفقاء کے لیے ایک اہم سبق ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ امیر محترم کی ان مساعی کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور آخرت میں ان کو اجر عظیم سے نوازے۔ امیر محترم نے اس مقصد کے لیے قرآن حکیم کے جن مقامات کا انتخاب فرمایا تھا، انشاء اللہ اس پر مشتمل جلد ہی دوسرا منتخب نصاب مرتب ہو کر شائع ہو جائے گا۔ نیز کوشش ہو گی کہ ان دروس کو ٹیپ سے منتقل کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝

اس اجتماع میں تین دن تک نماز فجر سے پہلے امیر محترم نے ان سورتوں کے مطالب و مفاہیم بھی اختصار سے بیان کیے جن کی اس روز نماز فجر کی دونوں رکعات میں قرأت ہوئی تھی۔ مزید براں تین دن تک نماز فجر کے بعد جناب ڈاکٹر تقی الدین صاحب پی ایچ ڈی اور فارغ التحصیل درس نظامی (نائب امیر تنظیم اسلامی برائے سندھ) نے

ایک گھنٹہ تک درسِ حدیث دیا جس کا موضوع یہ تھا کہ جو ہیئتِ اجتماعیہ عبادتِ رب، شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لیے قائم ہوئی ہو، اس کے رفقاء کو تعلق مع اللہ کے لیے ان مسنون اذکار و اوراد کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

سابقہ شمارے میں اس ارادے کا اظہار کیا گیا تھا کہ امیر محترم نے مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیرِ اہتمام چھٹے محاضرات قرآنی میں "جہاد بالقرآن" اور "اسلامی انقلاب کے لیے التزام جماعت اور مسئلہ بیعت" پر جو دو تقاریر کی تھیں، ان کو نویں سالانہ اجتماع تک شائع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بحمداللہ اپریل ہی میں دونوں تقاریر کو ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر لیا گیا تھا۔ لیکن انسان کے چاہے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ چنانچہ ایک خوش نویس صاحب اپنی چند ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے جہاد بالقرآن والی تقریر کی کتابت کا کام وقت پر مکمل نہ کر سکے حالانکہ ان کو ڈیڑھ ماہ کا وقت دیا گیا تھا۔ بہر حال انشاء اللہ یہ دونوں تقاریر اب جولائی کے اواخر یا اگست کے اوائل میں شائع ہو جائیں گی ۔۔۔ الحمد للہ امیر محترم کے دو خطابات پر مشتمل ایک "اسلام میں عورت کا مقام" اور دوسرے "دینی فرائض کا جامع تصور"، تنظیم اسلامی کے نویں سالانہ اجتماع کے اختتام سے قبل ہی منصۂ شہود پر آگئی تھیں۔ امیر محترم کے یہ دونوں خطابات نہایت اہم ہیں۔ بالخصوص پہلا خطاب وقت کے اہم اور نازک ترین مسئلہ یعنی "اسلام میں عورت کا مقام" پر کتاب و سنت کی روشنی میں نہایت مدلل بحث کی گئی ہے ۔۔۔ ہم قارئین میثاق کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ان دونوں کا بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں اور اگر ان کا دل گواہی دے کہ ان میں حق بات کہی گئی ہے تو ان کو اپنے حلقۂ تعارف و اثر میں پھیلائیں۔ انشاء اللہ ان کا یہ تعاون، تعاون علی البر شمار ہو گا۔

جیسا کہ میثاق کے قارئین کو علم ہو گا کہ ۱۹۷۹ء سے ہر سال امیر محترم کا شمالی امریکہ کے لیے دعوتی دورہ ہو رہا ہے۔ ۸۳ء میں تو یہ دورہ دو مرتبہ ہوا۔ ایک جولائی میں اور دوسرا دسمبر میں۔ برصغیر پاک و ہند کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات شمالی امریکہ میں مقیم ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ برصغیر کے Talent کا کثیر حصہ شمالی امریکہ میں مقیم ہے چنانچہ

ان تک تنظیم اسلامی کی دعوت پہنچانا انشاءاللہ مستقبل قریب میں پاکستان میں توسیع واستحکام دعوت کے لیے انتہائی مفید ہو گی۔ چونکہ ان میں سے متعدد حضرات جلد ہی مراجعت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان دوروں کے نتیجہ میں بحمداللہ شکاگو (امریکہ) اور ٹورنٹو (کناڈا) میں تنظیمِ اسلامی قائم ہو چکی ہے اور رفقاء میں ایسے تعلیم یافتہ حضرات کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ جو مختلف علوم وفنون میں پی ایچ ڈی ہیں۔ بعض ایسے حضرات بھی ہیں جنہوں نے کئی مضامین میں پی ایچ ڈی کر رکھا ہے۔ مزید براں امریکہ اور کناڈا کے چند دوسرے شہروں میں بھی دعوت کا بیج پڑ چکا ہے اور مختلف مقامات سے لوگ منفرد طور پر تنظیم اسلامی سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ اس جمہوریت زدہ دور میں انتہائی تعلیم یافتہ افراد کا سمع وطاعت اور ہجرت وجہاد کے لیے بیعت کے نظام کو قبول کر کے تنظیم اسلامی میں شمولیت درحقیقت خالصتہً اللہ تعالیٰ ہی کا فضل وکرم ہے۔

امسال امیر محترم ۷ر جولائی کو سال رواں کے لیے پھر شمالی امریکہ کے دعوتی دورے پر تشریف لے جا رہے ہیں۔ اس دورے میں ہمارے رفیق ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب فیلو قرآن اکیڈمی انشاءاللہ امیر محترم کے ہمراہ ہوں گے۔ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت عطا فرمائی ہے کہ انہوں نے نہ صرف دعوت کے تمام اصول ومبادی کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ بلکہ امیر محترم کے دروس وخطابات کو اپنے ذہن وقلب میں اچھی طرح جذب کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خطابت کے وصف سے بھی نوازا ہے۔ اس وقت تک ڈاکٹر سمیع صاحب دروس قرآن اور خطاب کے لحاظ سے صف دوم میں سب سے ممتاز شخصیت ہیں۔ امیر محترم کا ارادہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کو کچھ عرصہ کے لیے شکاگو کے مرکز کے لیے وقف کر دیا جائے۔ تاکہ موصوف اس مرکز میں مستقل طور پر بیٹھ کر ایک طرف دعوت قبول کرنے والوں کی تربیت اور تنظیمی اعتبار سے استحکام کی کوشش کریں تو دوسری طرف امریکہ کے مختلف شہروں میں مقیم برصغیر پاک وہند کے لوگوں میں توسیع دعوت کے لیے بھی سعی وجد وجہد کر سکیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کو استقامت عطا فرمائے، ان کی مساعی کو مشکور فرمائے اور ان سب کو ان کے لیے توشۂ آخرت بنا دے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب امیر تنظیم اسلامی ۵ رمئی ۱۹۸۹ کو عمرہ ادا کرنے کے لئے حجاز مقدس تشریف لے گئے تھے۔ اس مبارک سفر میں ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ اور ان کے منجھلے بیٹے حافظ عاکف سعید ان کے ہمراہ تھے۔ امیر تنظیم کا یہ سفر ۱۱ دنوں پر محیط تھا۔ اس دورے میں موصوف کو وزٹ دیزے (Visit Visa) کی سہولت حاصل تھی جس کے باعث آپ کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ آپ جدہ، مکہ اور مدینہ کے علاوہ سعودی عرب کے دیگر شہروں کا بھی دورہ کر سکیں۔ چنانچہ ۶۔ مئی کو عمرہ ادا کرنے کے بعد امیر محترم ایک روز کے لئے ڈاکٹر شجاعت برنی کے ہمراہ طائف تشریف لے گئے۔ سعودی عرب میں چونکہ حکومت کی جانب سے عائد شدہ پابندیوں کے باعث کوئی کھلا (Open) اجتماع کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ڈاکٹر برنی صاحب نے ایک صاحب کے مکان پر اجتماع کا اہتمام کیا تھا۔ جہاں ایک Selected Gathering سے ڈاکٹر صاحب نے خطاب کیا ۱۰۔ مئی کو امیر تنظیم جدہ تشریف لے گئے تھے جہاں احباب نے ایک اجتماع کا اہتمام کیا تھا۔ یہ اجتماع رفیق تنظیم اسلامی فیض اللہ خاں صاحب کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا۔ جہاں ۸۰ کے لگ بھگ افراد جمع تھے۔ امیر محترم نے "ہماری دینی ذمہ داریاں" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ جدہ سے بذریعہ ہوائی جہاز ڈاکٹر صاحب ریاض تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر برنی آپ کے شریک سفر تھے۔ وہاں دو مقامات پر خطاب کا موقع ہوا۔ جہاں سامعین کی اچھی خاصی تعداد اجتماعات میں شریک ہوئی۔ ریاض سے امیر تنظیم ظہران تشریف لے گئے۔ ائیرپورٹ پر پرائم انڈسٹریز کے شہباز چودھری صاحب استقبال کے لئے موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا قیام دمام میں رہا۔ یہاں دو بھرپور پروگرام ہوئے۔ پہلا پروگرام پٹرولیم یونیورسٹی ظہران میں ہوا۔ جہاں ایک محدود اجتماع سے امیر محترم نے خطاب فرمایا۔ بعد ازاں ایک پروگرام پاکستان کمیونٹی سکول میں ہوا۔ سکول کے نگران جناب عباس حسین ملک صاحب نے بڑے پیمانے پر اجتماع کا اہتمام کیا تھا۔ چنانچہ سکول کے احاطے میں تقریباً دو ہزار افراد کے ایک بھرپور اجتماع سے ڈاکٹر صاحب نے خطاب فرمایا۔ سعودی عرب کے مخصوص حالات کے اعتبار سے یہ ایک بہت بڑا اجتماع تھا ــــ ظہران سے ڈاکٹر صاحب ریاض تشریف لائے اور وہاں سے بذریعہ کار مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے۔ اس طویل سفر میں رفیق تنظیم جناب محمد رفیق صاحب ان کے "رفیق" تھے۔ راستے میں بریدہ میں چند گھنٹے قیام کیا جہاں زبیر عمر صدیقی صاحب سے ملاقات رہی۔ زبیر عمر صاحب نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے کچھ احباب کو جمع کر لیا اور ایک اجتماع کی صورت بن گئی۔ مدینہ منورہ میں دو دن قیام رہا اور تیسرے روز یعنی ۱۷۔ مئی کو جدہ واپسی ہوئی۔ وہاں شام کو پھر ایک اجتماع سے خطاب تھا۔ یہاں موضوع تھا "جماعت کی ضرورت اور نظام بیعت" ــــ یہاں لگ بھگ ۱۶۰ افراد کا اجتماع میں شریک تھے۔ اگلے روز جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر طلعت برنی کی معیت میں مسجد حرام تشریف لے گئے اور اگلے روز ۱۹۔ مئی کو رات ۸½ کی فلائٹ سے کراچی کے لئے عازم سفر ہوئے۔ اس طرح دو ہفتوں پر محیط یہ بھرپور پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔

رمضان المبارک رحمت، مغفرت اور عتق من النار کا مہینہ ہے۔ یہ شہر الصبر ہے۔ اس مبارک مہینے میں ہر سال قرآن اکیڈمی میں قرآنی علوم و عرفان کی بارش ہوتی ہے۔ امسال اس بہار کی ۲۲ رمضان المبارک تک کی روداد راقم کے رفیق کار میاں حافظ عاکف سعید سلمہ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔
(جمیل الرحمٰن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رمضان اور قرآن کا جو باہمی تعلق ہے دینی ذوق رکھنے والے حضرات اس سے بخوبی واقف ہیں۔ محترم والد صاحب امیر تنظیم اسلامی رمضان المبارک سے متعلق اپنی تقاریر میں اس نکتے پر خاص زور دیا کرتے ہیں کہ دیگر تمام مہینوں پر رمضان المبارک کو جو فضیلت حاصل ہے "درحقیقت قرآن کی وجہ سے ہے کہ یہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰن۔ اور اس مبارک مہینے کی رات میں قیام اللیل یا تراویح کا جو نظام دین میں قائم ہے یہ دراصل قرآن حکیم کے ساتھ تجدید تعلق کا ایک پروگرام ہے[1]۔ لہٰذا اس ماہ کے دوران اس بات کا بھرپور اہتمام کیا جانا چاہیے کہ قرآن حکیم کے ساتھ ہمارا تعلق صحیح خطوط پر استوار ہو اور ہم زبان سے زیادہ وقت اس قرآن کو سننے اور اس کے مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش میں صرف کریں۔

جامع القرآن، قرآن اکیڈمی میں یوں تو ہر سال ہی تراویح کے ذیل میں خصوصی پروگرام ترتیب دیا جاتا رہا ہے لیکن اس سال دورہ ترجمۂ قرآن کا جو پروگرام یہاں چل رہا ہے وہ ایک منفرد شان کا حامل ہے اور غالباً اپنے طرز کی یہ پہلی کامیاب کوشش ہے۔ نماز تراویح کی ہر چار رکعتوں سے قبل ان میں پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ محترم والد صاحب بیان کرتے ہیں اور جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے ربطِ آیات کی جانب بھی اشارہ فرما دیتے ہیں۔ اس طرح کل پانچ مرحلوں (Sessions) میں تراویح کا پروگرام مکمل ہوتا ہے۔ ہر چار رکعتوں اور اس سے قبل ترجمے کے بیان میں اوسطاً ۵۰/۵۵ منٹ صرف ہوتے ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر چار سے ساڑھے چار گھنٹوں کے مابین یہ پروگرام مکمل ہوتا ہے۔ رات ۹½ بجے عشاء کی جماعت کھڑی ہوتی ہے اور صبح ۲ بجے یہ سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ اور چونکہ اس کے فوراً بعد سحری کھانے کا وقت ہوتا ہے۔ اس طرح گویا تمام رات نماز تراویح اور دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام میں گزرتی ہے۔

[1] ملاحظہ فرمائیے ڈاکٹر صاحب کا مختصر پمفلٹ "حقیقت صوم"

پروگرام کی طوالت اور موسم کی شدت کے پیش نظر ابتداءً خیال یہ تھا کہ یہ پروگرام بہت کٹھن ہو جائے گا۔ اور اس میں شرکاء کی تعداد بہت کم رہے گی لیکن یہ اللہ کا خصوصی فضل وکرم ہے کہ اس نے اس بظاہر کٹھن پروگرام کو شرکاء کے لئے بہت آسان بنا دیا اور ان کا عام تاثر یہ ہے کہ یہ پروگرام اتنا مفید اور پرکشش ہے کہ پوری رات جاگنے کے باوجود کسی مرحلے پر بھی بوریت یا گرانی کا احساس نہیں ہوتا اور یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل اور اس کے کلام کی برکت کا مظہر ہے۔

اس ماہ مبارک کے آغاز میں مذکورہ بالا پروگرام میں شرکاء کی تعداد تقریباً دو صد تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بتدریج شرکاء کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور اب آخری عشرے کے آغاز سے یہ تعداد ساڑھے تین صد سے متجاوز ہو چکی ہے۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃ

(سولہویں نشست)

اُولوا الالباب کے ایمان کی کیفیت

سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع
آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ کی روشنی میں

(مباحث ایمان)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۳)

السلام علیکم نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ   بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا
بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَکَفِّرْ
عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا
وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۭ اِنَّکَ
لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ

عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ (صدق اللہ العظیم)

حاضرین کرام اور محترم ناظرین !

یہ اس سلسلۂ دروس کے پانچویں درس کا نصف ثانی ہے جو سورہ آل عمران کی آیات ۱۹۳، ۱۹۴ اور ۱۹۵ پر مشتمل ہے - ان سے پہلے کی آیات پر ہم نے گزشتہ نشست میں جو قدرے تفصیلی گفتگو کی تھی، ایک محقق و مفسر اور مفکر کے قول کے مطابق اس کا حاصل ہے ایمانِ عقلی - یعنی ایک سلیم الفطرت انسان اپنی عقل کی رہنمائی میں جب ذہنی و فکری سفر طے کرتا ہے تو کتاب فطرت کے مطالعے اور مظاہر فطرت کے مشاہدے اور اپنے تعقل و تفکر سے وہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت تک خود پہنچ جاتا ہے - اب ان آیات میں جو ہم آج پڑھ رہے ہیں، ایمانِ سمعی کا ذکر ہے - یعنی وہ لوگ جو اپنی عقل کے سفر کے نتیجے میں اُس مقام تک پہنچ چکے ہوتے ہیں جس کا ابھی ذکر ہوا - تو ان کے کانوں میں جب کسی نبی کی دعوت پہنچتی ہے جو ان ہی امور پر مشتمل ہوتی ہے کہ مانو اس حقیقت کو کہ اس کائنات کا ایک خالق و مالک ہے وہ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہے. وہ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ہے - وہ اَلْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ہے - مانو اس بات کو کہ زندگی صرف اس دنیا کی زندگی نہیں ہے اور موت زندگی کے خاتمے کا نام نہیں ہے بلکہ موت زندگی کا ایک وقفہ ہے یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر - اصل زندگی کا سفر موت کے بعد شروع ہوتا ہے : وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ - اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے کاش کہ انہیں معلوم ہوتا۔ اُس زندگی میں اس زندگی کے اعمال کے بھرپور نتائج نکلیں گے - ان امور

پر مشتمل جب کسی نبی کی دعوت ان اولوالالباب کے سامنے آتی ہے تو ظاہر بات ہے کہ پھر ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ نبی کی دعوت پر والہانہ لبیک کہتے ہیں۔ ان کی تصدیق کرتے ہیں بالکل اس کیفیت کے ساتھ جو اس شعر میں ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان کے اس موقع پر جو احساسات اور جذبات ہوتے ہیں انہیں الفاظ کا جامہ پہنا کر ان آیاتِ الٰہیہ میں دعا کی صورت میں ہمارے سامنے رکھا گیا ہے۔ ذرا ترجمہ کو ایک مرتبہ پھر ذہن میں تازہ کر لیں :-

"اے رب ہمارے! ہم نے سنا ایک پکارنے والے کی پکار کو کہ وہ ایمان کی صدا لگا رہا ہے، ایمان کی منادی کر رہا ہے کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر پس ہم ایمان لے آئے۔ تو اے ہمارے رب! ہماری اب تک کی زندگی کی جو خطائیں ہیں، غفلت کی جو زندگی اب تک گزری ہے۔ اس میں جو گناہ اب تک ہم سے سرزد ہوئے ہیں، ان کو معاف فرما دے اور اگر ہمارے دامن کردار پر کوئی دھبے اور داغ ہیں تو انہیں تو اپنے فضل و کرم سے دھو ڈال : وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا - اور جب ہم اس دنیا سے رخصت ہوں جب تو ہمیں وفات دے تو اپنے نیکوکار بندوں کی معیت ہمیں عطا فرما۔ انہیں ہمیں شامل فرما: وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ - پھر اے رب ہمارے! ہمیں وہ سب کچھ عطا کیجیو جس کا وعدہ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے توسط اور وساطت سے کیا ہے - اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو یقیناً تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنے والا نہیں ہے"

یہ بڑی عظیم دعا ہے اور عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں جو بہت سے امور مشابہت کے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے سورہ بقرہ کے اختتام پر بھی ایک عظیم دعا آئی ہے = رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (الیٰ آخر السورۃ)- اسی طرح یہ عظیم دعا ہے جو سورہ آل عمران کے آخری رکوع

میں وارد ہوئی ہے۔

اب جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کو ہم دینی اصطلاح میں "صدیقین" کہتے ہیں۔ جو نبی کی دعوت کو قبول کرنے میں پیش قدمی کرتے ہیں، کوئی توقف نہیں کرتے۔ انہیں اس بارے میں کوئی اشتباہ لاحق نہیں ہوتا۔ وہ کوئی اعتراض وارد نہیں کرتے۔ وہ کوئی جرح نہیں کرتے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ آپ ہم کو یہ دعوت دینے والے کون ہوتے ہیں! بلکہ ان کے قلوب کی کیفیت وہ ہوتی ہے کہ جیسے کوئی نمازی وضو کر کے نماز کے لئے تیار بیٹھا ہو اور صرف انتظار کر رہا ہو کہ اذان کی آواز جیسے ہی کان میں آئے وہ فوراً مسجد کا رُخ کرے۔ یہی کیفیت صدیقین کی ہوتی ہے جن کی فطرتیں صالح ہوتی ہیں۔ جن کی عقل سلیم ہوتی ہے جو خود غور و فکر کے نتیجے میں ان نتائج کے آس پاس پہنچ چکے ہوتے ہیں کہ جن کی دعوت وحی کے ذریعہ سے انبیاء کرام اور رسل عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام تک پہنچتی ہے۔ پھر وہ اس دعوت کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ان صدیقین کو اس دعوت کو قبول کرنے میں کوئی تذبذب، تأمل اور تردّد نہیں ہوتا چونکہ یہ تو خود ان کی اپنی فطرت کی پکار ہوتی ہے۔ یہ تو ان کے باطن کے مضمر حقائق ہوتے ہیں جو نبی کے قلب پر وحی کا جامہ پہن کر وارد ہوتے ہیں اور اب نبی کی زبان سے ان کے کانوں میں پڑ رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی جو شانِ تصدیق ہے، وہ جس کیفیت کے ساتھ ایمان لاتے ہیں، اس میں ایک والہانہ انداز ہوتا ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جس کے سامنے بھی دعوت رکھی اس نے تھوڑی دیر کے لئے ضرور کچھ توقف کیا۔ سوائے ابوبکرؓ کے کہ انہوں نے ایک لمحہ کا توقف کئے بغیر فوراً میری تصدیق کر دی۔ اب آپ خود سوچئے کہ ایسا کیوں ہوا! معلوم ہوا کہ ان کے قلب و ذہن کے اندر یہ کیفیات پہلے سے موجود تھیں لہٰذا انؓ کو اُن حقائق کے ادراک، شعور اور پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ واقعہ معراج کی تصدیق کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ کو بارگاہ نبوت و رسالت سے 'صدیق' کا لقب اور خطاب ملا تھا۔ اور پوری اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اکبر ہیں رضی اللہ

تعالےٰ عنہ وارضاہُ - انبیاء کرام کے بعد آں جنابؓ صدیقیت کی کامل ترین مثال ہیں۔ اسی لئے ہمارے جمعہ کے خطبوں میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ابوبکرنؓ الصدّیق - مفسرین کا اس امر پر اجماع ہے کہ سُورۃ الّیل کی یہ آیات صدیقین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں: فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ٥ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ٥ اور ان کی مصداق کامل ہے ذاتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

یہ بھی ذہن میں رکھیئے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اگرچہ پورے عرب میں بالعموم جہالت کی شدید اور گہری تاریکیاں تھیں اور مکہ میں بالخصوص ظلمت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور عالم یہ تھا کہ جس "دنیا کے بتکدوں میں وہ پہلا گھر خدا کا"۔ وہ گھر جو تعمیر ہوا تھا توحید کیلئے اور اقامتِ صلوٰۃ کے لئے وہ گھر تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے - لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فطرتِ انسانی بالکل مسخ ہو چکی تھی - اسی مکہ کی سرزمین میں عین اسی دور میں ابوبکرؓ بھی موجود ہیں - جنہوں نے کبھی شرک نہیں کیا - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ابھی وحی نبوّت کا آغاز بھی نہیں ہوا لیکن ابوبکرؓ پہلے سے موحد تھے - اسی طرح حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ بھی ابتداہی سے موحد تھے - اور بھی مثالیں موجود تھیں۔ ایک صاحب زید بن عمر بن نفیل تھے جن کا آں حضورؐ پر وحی کے آغاز سے قبل انتقال ہو گیا تھا، ان کا حال روایات میں یہ آتا ہے کہ وہ کعبہ کے پردے پکڑ پکڑ کر اللہ سے دُعا کیا کرتے تھے کہ "اے ربّ! میں صرف تیری پوجا کرنا چاہتا ہوں میں ان تمام معبودانِ باطل سے اعلانِ برأت کر رہا ہوں جن کو اہل مکہ پوجتے ہیں اور جن سے تیرے گھر کو آباد کر رکھا ہے - میں تیری ہی پرستش کرنا چاہتا ہوں لیکن میں نہیں جانتا کہ کیسے کروں!" ان ہی کے صاحبزادے ہیں حضرت سعید ابن زید رضی اللہ تعالےٰ عنہ جو یکے از عشرۂ مبشرہ ہیں - جو حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے بہنوئی ہیں - ظاہر بات ہے کہ زید جیسے موحد کی آغوش میں تربیت پانے والے کی فطرت میں ان تمام حقائق کا موجود ہونا بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے - یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حضورؐ پر ایمان لانے میں سبقت کی - روایات میں چند اور حضرات کا بھی ذکر ملتا

ہے جو اپنی فطرت سلیمہ اور عقل صحیحہ نیز اپنے غور و فکر سے توحید اور معاد کی معرفت حاصل کر چکے تھے لیکن ان کا نبی اکرم پر آغاز وحی سے قبل انتقال ہو گیا تھا۔

تو یہ ہیں درحقیقت اولوالالباب، ہوش مند اور باشعور لوگ جو عقل کی رہنمائی میں سفر کر رہے ہیں، جن کی فطرت مسخ نہیں ہوئی ہے۔ فطرت میں ودیعت شدہ حقائق ابھی اجاگر ہیں۔ لہذا ایسے لوگ جب انبیاء علیہم السلام کی دعوت سنتے ہیں تو کسی رد و قدح کے بغیر فوری طور پر اس کو قبول کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال قرآن مجید میں ایک اور بھی ہے۔ ساتویں پارے کی پہلی آیت ہے:

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ "اور جب انہوں نے سنا جو کچھ نازل ہوا ہے رسول پر (صلی اللہ علیہ وسلم)، تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ نکلی ہیں شدتِ تاثر کی وجہ سے۔ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ۔ معرفتِ حق کا اتنا گہرا اثر ان کے قلوب پر ہوا۔ اور جذبات کے اندر وہ کیفیت پیدا ہوئی کہ بے اختیار آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی لگ گئی اور ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے پس ہمارے نام بھی حق کے گواہوں میں درج فرما لے۔" رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

اس کے بعد اب اس دعا کا جواب آ رہا ہے۔ اس جواب میں ایسے حضرات کی عملی زندگی اور ان کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی دکھا دی گئی۔ پہلے تو اجابتِ دعا کی بشارت اور نوید سنائی گئی: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ۔ یہ بالکل ایسی کیفیت ہے جیسے فارسی کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے:

؎ چو تیر از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از در حق بہر استقبال می آید

اس شعر کا اردو میں شعر ہی میں ترجمہ کر دیا گیا:

؎ ڈرو مظلوم کی آہوں سے جب اٹھتی ہیں سینوں سے
قبولیت ہے کرتی خیر مقدم عرش سے آ کر

تو ان صدیقین کی دعا کا جواب گویا کہ فوری طور پر مل رہا ہے۔ اِدھر دعا زبان سے نکلی ہے اُدھر اُسے شرفِ قبولیت عطا ہو گیا۔ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ "پس ان کی دعا کو قبول فرمایا ان کے رب نے" اور اس کیفیت کے ساتھ کہ فرمایا: أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم۔ "میں تو کسی بھی عمل کرنے والے کے کسی عمل کو ضائع نہیں کرتا"۔ چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی میرے یہاں ضائع ہونے والا نہیں۔ مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ "وہ عمل کرنے والا خواہ مرد ہو خواہ عورت"۔ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ۔ "تم ایک دوسرے ہی سے ہو، تم آپس میں ایک ہو"۔ تمہاری جو جدا صنفیں ہیں تو یہ ایک تمدنی ضرورت کے تحت ہیں۔ ورنہ نوع کے اعتبار سے تم ایک ہی ہو۔ عورتوں کے اپنے اعمال ہیں، ان کی اپنی نیکیاں ہیں۔ ان کی اپنی کمائی ہے جس کا اللہ کے یہاں انہیں بھرپور صلہ مل جائے گا۔ دین میں، نیکی میں، خیر میں اور دین کے لئے قربانیاں دینے میں کوئی فرق و تفاوت نہیں ہے۔ مردوں کے لئے بھی میدان کھلا ہے عورتوں کے لئے بھی۔ اس کے بعد الفاظ آئے، جیسا کہ میں نے عرض کیا، مؤمنین صادقین کی عملی روش سامنے لائی گئی۔ پہلے تو اپنی یہ سُنّت بیان فرما دی کہ میں تو کسی چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی ضائع کرنے والا نہیں۔ تمہارے اعمال تو بہت بڑے ہیں۔ تمہارے ایثار و قربانی کی تو بہت اونچی شان ہے: فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ۔ "تو وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی، تو جو اپنے گھروں سے نکالے گئے"۔ یہاں ہجرت اور اخراج مِن دیار کے الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔ بظاہر تو یہ ہم معنی اور ہم مفہوم ہیں، ان کی مراد ایک ہی ہے۔ لیکن ہجرت کا لفظ ہمارے دین کی ایک وسیع المفہوم اصطلاح ہے۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ کے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جانا جہاں عبادتِ رب کا فریضہ انجام دینے میں غیر معمولی اور ناقابلِ برداشت مشکلات نہ ہوں۔ اس کے دوسرے بھی متعدد مفاہیم ہیں: جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ پوچھا گیا: اَیُّ الْھِجْرَۃِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمایئے کہ سب سے اعلیٰ و افضل ہجرت کون

سی ہے؟" اب جواب سُنیے۔ حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں: اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ۔ "کہ تو ہر اس چیز اور ہر اس کام کو چھوڑ دے جو تیرے رب کو پسند نہیں ہے" ایک اور حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: هَاجِرُوْا وَلَا تَهَجَّرُوْا۔ "صحیح طور پر غلط عمل ترک کر کے مہاجر بنو صرف زبانی کلامی مہاجر نہ بنو" لہٰذا یہاں اس لفظ کو اسکے عموم پر رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اس طرح فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا کا مفہوم ہوگا کہ "وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی خاطر ہر اس چیز کو تج دیا، ہر اس چیز سے ترکِ تعلق کر لیا جو اللہ کو پسند نہیں" کوئی چیز ان کے لئے راہ حق میں روڑا نہ بن سکی۔ کوئی چیز اس راہ میں ان کے پاؤں کی بیڑی نہ بن سکی۔ وہ جب اپنے رب سے جڑے ہیں تو اس شان کے ساتھ جڑے ہیں کہ جو چیز بھی اللہ کو ناپسند ہے، اس سے کٹ گئے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ اَلْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ لِلّٰهِ۔ کسی سے محبت ہے تو صرف اللہ کے لئے اگر کسی سے بغض و عداوت ہے تو صرف اللہ کے لئے۔ یہاں ان لوگوں کی کیفیت بیان ہو رہی ہے: فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا۔ "وہ لوگ جنہوں نے ہجرت اختیار کی"۔ وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ۔ "اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے"۔ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ۔ اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں۔" جو کچھ بیتا ہے حضرت بلال پر، حضرت خباب بن ارت پر، حضرت یاسر رضی اللہ تعالےٰ عنہم اور حضرت سُمیہ پر رضی اللہ تعالےٰ عنہا اور دوسرے بہت سے صحابہ کرام پر رضوان اللہ علیہم اجمعین اس سے ایذاؤں کا اندازہ کیجئے۔ ان حضرات رضی اللہ عنہم نے صرف کلمہ توحید ہی تو قبول کیا تھا۔ کوئی اور جھگڑا تو نہیں تھا۔ زر، زمین اور زن کے جھگڑے جو دنیا میں مشہور و معروف ہیں ان میں سے کوئی تنازعہ اور قضیہ نہیں تھا۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو مخالفت تھی! وہ کس لئے تھی! فِيْ سَبِيْلِيْ، میرے راستہ کی وجہ سے تکلیفیں پہنچائی گئیں، میرے کلمۂ توحید قبول کرنے اور اس کی دعوت دینے کی وجہ سے یہ مقدس حضرات تشدد اور مصائب کا نشانہ بنے Persecution کا نوالہ بنے۔ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا۔ اس سے قبل جن ایذاؤں کا ذکر ہوا ان کا تعلق

تو مکی دور سے ہے۔ اب مدنی زندگی کے دور کا ذکر آرہا ہے۔ سورۃ آل عمران
مدنی ہے۔ اس دور میں قتال اور جنگ کا سلسلہ شروع ہوا۔ جنگ کیا ہے۔
جیسا کہ آیت برّ کے مطالعے کے دوران ہمارے سامنے یہ بات آچکی ہے کہ نقدِ جان
ہتھیلی پہ رکھ کر اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے ایک بندہ مومن معرکۂ قتال اور
میدانِ جنگ میں آجائے اور یہ نیکی کی بلند ترین چوٹی ہے۔ وَقٰتَلُوْا " اور
انہوں نے اللہ کی راہ میں جنگ کی"۔ وَقُتِلُوْا " اور انہوں نے اس راہ میں
اپنی گردنیں کٹوا دیں۔ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا"، تو جن لوگوں کا یہ
مقام ہے۔ جن کے یہ مراتب ہیں۔ جن کے ایثار و قربانی کی یہ شان ہے۔ تو
لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۔" ہم لازماً ان سے ان کی بُرائیوں کو دُور
کر دیں گے۔ بر بنائے طبع بشری کہیں کوئی لغزش ہو گئی ہو۔ کبھی جذبات کی رَو
میں اگر کسی غلط حرکت کا صدور ہو گیا ہو۔ اس سے ہم چشم پوشی فرمائیں گے۔
ہم ان کو معاف فرمائیں گے۔ ان کے دامنِ کردار پہ اگر سابقہ زندگی کی سابقہ
عادات کی وجہ سے کوئی داغ اور دھبہ ہے، ہم اُسے دھو ڈالیں گے۔ ان کے
نامۂ اعمال میں سابقہ زندگی کی وجہ سے اگر سیاہی کے کچھ داغ ہیں تو ان کو
ہم صاف کر دیں گے"۔ یہاں پر لامِ (ل)، مفتوح اور آخر میں نونِ (ن) مشدّد
لَاُكَفِّرَنَّ، آیا ہے۔ یہ عربی زبان میں تاکید کا سب سے بڑا (.........)
اسلوب ہے۔ مفہوم ہو گا کہ "میں لازماً دور کر دونگا۔ ان سے انکی برائیاں"۔
وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۔" اور میں
لازماً ان کو داخل کروں گا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں"۔
ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۔" یہ بدلہ ہے خاص اللہ کے پاس سے"۔ یہاں پر
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ " ہے اُس میں خاص کیفیت ہے۔ یعنی میں اپنے خاص خزانۂ
فضل سے انہیں نوازوں گا۔ یہ لوگ میرے وہ مقربینِ بارگاہ ہوں گے کہ جن کو جو کچھ
میں عطا کروں گا وہ اپنے خاص خزانۂ فیض سے عطا کروں گا۔ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ
حُسْنُ الثَّوَابِ ۔" اور یہ جان لو کہ اچھا بدلہ اور صلہ صرف اللہ کے پاس ہے"۔
یہاں عِنْدَهٗ کو پہلے لا کر اس میں حصر کا مفہوم پیدا کیا۔ میں حصر کے اسلوب کے متعلق

پہلے آپ کو بتا چکا ہوں - یہاں اس اسلوب سے "صرف" کا مفہوم پیدا ہوا "اچھا بدلہ تو صرف اللہ ہی کے پاس ہے"۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ انسان محنتیں کرتا ہے، بھاگ دوڑ کرتا ہے تو کسی نہ کسی فائدہ، نفع اور بدلہ کو پیشِ نظر رکھتا ہے - اولاد پر انسان محنت کرتا ہے، اپنے آپکو ۔۔۔ کرتا ہے اس اُمید میں کہ ہمارے بڑھاپے میں یہ ہمارا سہارا بنیں گے - لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں اولاد کی طرف سے خلاف توقع ایک غلط طرزِ عمل سامنے آجاتا ہے - انسان کو صدمے سہنے پڑ جاتے ہیں - اولاد کے غلط طرزِ عمل کی وجہ سے اس میں نفسیاتی و ذہنی کرب پیدا ہو جاتا ہے - معلوم ہوا کہ صرف وہ محنت، وہ کوشش لازماً سپھل اور نتیجہ خیز ہو گی جو اللہ کے لئے کی گئی ہو - اس کا اچھا بدلہ مل کر رہے گا - ہر وہ وقت امر ہو جائے گا جو اللہ کے لئے صَرف کیا ہوا اور اس کے دین میں لگا ہو - ہر وہ پیسہ محفوظ ہو جائے گا جو اللہ کے دین کے لئے خرچ ہوا ہو - وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ؕ -

اس طرح آپ نے دیکھا کہ ان آیاتِ مبارکہ میں ایک مکمل انسانی شخصیت کا ہیولیٰ آگیا - اس کے باطنی فکر، اس کی سوچ کا نقشہ ابتدا میں آیا - اس کی عملی روش، اس کا کردار، اس کا عملی رُخ، یہ آخر میں آگیا - ان دونوں کو جمع کر لیجئے - ایک بندۂ مومن کی ایک مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے — اب اس ضمن میں کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں -

سوال و جواب

سوال : ڈاکٹر صاحب ! ایک شخص شروع میں دانستہ یا نادانستہ غلط راہ اختیار کرتا ہے، کفر کی راہ پر چلتا ہے - لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ اصلاح پذیر ہو جاتا ہے اور نیکی کی راہ پر آجاتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اُسے معاف فرما دیں گے ؟ اور اس کی سابقہ غلطاؤں کو ختم کر دیں گے ؟

جواب : جی ہاں ! بالکل ایسا ہی ہو گا - اس کے لئے ہماری دینی اصطلاح ہے توبہ - اگر توبہ خلوص و اخلاص کے ساتھ ہوتی ہے تو وہ سابقہ زندگی کے تمام گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے - اسی طرح جب کوئی شخص صدقِ دل کیساتھ

کفر سے اسلام میں داخل ہوتا ہے تو اس کے حالتِ کفر کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں ۔ اسلام میں داخل ہوتے ہی اس کی بالکل نئی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے ۔

سوال : آج کے درس میں چند دعائیں آئی ہیں ، میں چاہوں گا کہ آپ ذرا دُعا کی اہمیت کو مزید واضح کریں ۔ !

جواب : اصل میں یہ مضمون ان مجالس میں چوتھے درس کے دوران زیرِ بحث آ چکا ہے ۔ میں نے حدیثِ نبویؐ بھی سنائی تھی کہ اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ ۔ دُعا عبادت کا اصل جوہر ہے ۔ دعا درحقیقت وہ چیز ہے جو اُس نسبت کو ظاہر کرتی ہے جو بندے اور ربّ کے مابین ہے ۔ عبد اور معبود کے مابین تعلق کو دُعا استوار اور مستحکم کرتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر جب یہ ایمان و ایقان ہے کہ صرف وہی عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے تو بندہ سراپا احتیاج بن کر اسی کے سامنے اپنا دستِ سوال دراز کرے ۔ عبدیّت کا جو مظہرِ اتم ہے وہ دعا ہے ۔ نماز بھی درحقیقت اپنی رُوح کے اعتبار سے دُعا ہی ہے ۔

حضرات ! آج کی اس نشست میں مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا پانچواں درس جو نصاب کے حصہ ثانی "مباحثِ ایمان" پر مشتمل ہے اس کا دوسرا سبق ختم ہوتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اِن اولوالالباب لوگوں میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرمائے جو کتابِ فطرت کے مطالعے اور مظاہرِ فطرت کے مشاہدے سے معرفتِ ربانی کی دولت حاصل کرتے ہیں اور جن کی سیرت و کردار کا ایک اہم گوشہ اس درس کی آخری آیت کے مطالعہ سے ہمارے سامنے آیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اسی سیرت و کردار کا حامل بنائے ۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ
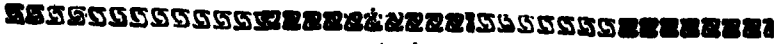
وَ آخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

عن انسؓ عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم

قال

لا یؤمن احدکم حتی یحبّ لاخیہ ما یحبّ لنفسہ

(رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

توحید فی العلم یا توحید فی المعرفہ اور
توحید فی العمل یا توحید فی الطلب کا

فریضہ اقامت دین

سے ربط و تعلق

ڈاکٹر اسرار احمد

کے خطاب و درس کی چھٹی قسط

اب اگلی آیت پر آئیے۔ فرمایا:

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ

"اور اگر (اے محمدؐ) آپؐ کے رب کی طرف سے ایک کلمہ طے نہ ہو چکا ہوتا، ایک وقت معیّن تک کے لئے بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے مابین قصّہ چکا دیا جاتا۔"

یعنی ابھی مہلتِ عمر ہے۔ افراد کو بھی اس وقت تک کے لئے مہلت ہوتی ہے جب تک موت نہیں آتی۔ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ۔ جب تک موت کا گھونگرو نہیں بولتا، توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ ہر نفس کے لئے یہ ضابطہ مقرر ہے کہ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ "اللہ کسی کو قطعی مہلتِ عمل نہیں دیتا جب موت کا مقررہ وقت آجاتا ہے"۔ اجلِ مسمّٰی کے اندر اندر عمل کا اختیار ہے۔ یہ مہلت و اختیار نہ ہو تو پھر آزمائش کیسی؟ بالجبر اگر اللہ ہدایت دے دے تو اس ہدایت پر انعام کیسا؟ بالجبر کسی کو غلط راستے پر ڈال دے تو اس کی سزا چہ معنی دارد؟ لہٰذا اللہ عزّ وجلّ یہ اختیار اور مہلت دیتا ہے، افراد کو بھی اور امتوں کو بھی۔ چنانچہ فرمایا کہ چونکہ ہماری طرف سے مہلت کا ضابطہ پہلے ہی سے مقرر ہے۔ ابھی ان کو ڈھیل دینی ہے۔ ابھی ان کے لئے مہلت عمل ہے۔ ابھی ان کو اختیار حاصل ہے جدھر چاہیں جائیں۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا۔ اور یہ کلا: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ

وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ اگر ہمارا یہ ضابطہ اور قانون نہ ہوتا ، ہماری یہ سنّت نہ ہوتی تو ہم ان کا قصہ چکا دیتے ۔ ابھی جھگڑا طے کر دیتے ۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علاحدہ کر دیتے

آیت کے اس حصّے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے توسط سے اہل ایمان کے لئے بھی تسلّی کا ایک پہلو موجود ہے کہ تشویش نہ کیجئے ۔ ابھی وقت لگے گا ۔ اللہ کا آخری فیصلہ آکر رہے گا ۔ احقاقِ حق اور ابطال باطل ہو کر رہے گا ۔ اور انجام کار کے طور پر سب کو ہمارے حضور حاضر ہونا ہی ہے ۔ وہ فیصلہ کی آخری ساعت بھی آکر رہے گی ۔ اجل مسمّٰی تک آپؐ بھی انتظار کیجئے اور مخالفین بھی ۔ اس تشریح اور توضیح کے ساتھ آیت کے اس حصّہ کو پھر پڑھئے ! وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ط

وارثین کتاب کا نقشہ

اب اس آیت کے آخری حصہ پر آئیے ! فرمایا :۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ○

" اور جو لوگ جو کتاب کے وارث بنائے گئے ان کے بعد درحقیقت وہ اس (کتاب) کے بارے میں ایسے شک اور شبہ میں مبتلا ہو چکے ہیں جس نے ان کے دلوں میں خلجان پیدا کر دیا ہے "

آیت کے اس ٹکڑے کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے ۔ یوں تو قرآن مجید کا ہر لفظ اور ہر آیت عظمت کی حامل ہے لیکن میرا گہرا تأثر ہے کہ سورۂ شوریٰ کی زیر درس یہ تین آیات عظیم ترین آیات میں سے ہیں ۔ اقامتِ دین کی جدوجہد میں جو بھی PROBLEMS سامنے آتے ہیں ان سب کا حل اور جواب ان تین آیات میں موجود ہے ۔ جب کبھی یہ کوشش ہوگی تو اس وقت جو مسائل اٹھیں گے ان سب کے لئے یہاں رہنمائی موجود ہے ۔ فرمایا : اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ : رسولوں کے امتی حاملینِ کتاب تشکیک میں مبتلا ہو چکے ہیں جس نے ان کے اذہان و قلوب میں خلجان اور انتشار پیدا کر دیا ہے ۔ یہ کتاب کے ماننے اور جاننے والوں کا حال ہے ۔ جو امیین ہیں ان کی کیفیت یہ نہیں ہے اس لئے کہ ان کے پاس تو سرے سے کوئی کتاب ہے ہی نہیں ۔ یہ گفتگو درحقیقت اہلِ کتاب کے بارے میں ہو رہی ہے کہ جن کے پاس علم ، کتاب اور شریعت موجود ہے وہ سب تمام لیوا ایک رسول کے ہیں لیکن آپس میں دست و گریبان ہیں[1] نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آئندہ نسلوں کا

---

[1] اشارہ ہے یہود و نصاریٰ کے متعدد فرقوں کی طرف (مرتب)

اعتماد ہی اٹھتا چلا جاتا ہے ـــــ آج آپ جو دیکھ رہے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل کا اعتماد ہی دین سے اٹھتا چلا جاتا ہے۔ وہ کیوں ؟ اس لئے کہ ان کا روز کا مشاہدہ ہے کہ ملک کے علماء حضرات کی اکثریت دین کی نام لیوا ہے لیکن ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ اِلَّا ماشاء اللہ۔ سب کہتے یہ ہیں کہ ہمارا مقصد ہے کہ دین کو قائم کیا جائے۔ اسلامی نظام بالفعل نافذ ہو۔ لیکن ایک دوسرے کی ٹانگیں گھسیٹی جارہی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا منفی اثر ہمارے معاشرے پر پڑ رہا ہے۔ لوگ اندھے بہرے تو نہیں ہیں۔ نوجوان بڑے حساس ہوتے ہیں۔ تفرقہ کا یہ نقشہ دیکھ کر انہیں پھر دین ہی کے بارے میں شک پڑ جاتا ہے اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید دعویٰ کرتا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ؕ لیکن نوجوان دیکھتا ہو کہ نمازی تو بڑا پکا ہے۔ لیکن جتنا پکا نمازی ہے اتنا بڑا بلیک مارکیٹر بھی ہے۔ اس کا اعتماد نماز پر قائم ہوگا کہ ہٹے گا ! نماز پر سے اعتماد ہٹے گا۔ قرآن پر سے اعتماد ہٹے گا کہ قرآن دعویٰ کر رہا ہے کہ نماز بُرے کام سے روکنے والی شے ہے اور یہ سب کچھ کر رہا ہے اور اس کے ساتھ نمازی بڑا پکا ہے۔ ایسے ہی ہمارے معاشرے میں وہ لوگ ہیں جو کثرت کے ساتھ حج اور عمرہ کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اسمگلر بھی ہیں۔ اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کے باعث نوجوانوں کا دین پر سے اعتماد اٹھنا شروع ہوجاتا ہے ـــــ اسی غلط طرزِ عمل کی عکاسی کی گئی ہے آیت کے اس حصہ میں : وَاِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡرِثُوا الۡکِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِھِمۡ " اور جو لوگ وارث بنائے گئے کتاب کے ان کے بعد" یہاں غور کیجئے کہ "ان کے بعد" سے کیا مراد ہے۔ ! وہ لوگ جو تفرقے ڈال کر چلے گئے، اب ان کے بعد اگلی نسل کتاب الٰہی کی وارث ہوئی ـــــ جیسے ہم قرآن حکیم کے وارث ہیں ـــــ یہاں جو ذکر ہو رہا ہے وہ تورات اور انجیل کا ہو رہا ہے۔ لیکن جو لوگ تفرقے ڈال گئے تو ان کے بعد آنیوالے ان تفرقوں کے سبب سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہوگئے۔ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ مُرِیۡبٍ ۝ یہاں مریب شک کی صفت ہے۔ شک جب دل میں یہ خلجان پیدا کردے کہ پتہ نہیں کچھ ہے بھی یا نہیں ؟ واقعتاً یہ کتاب الٰہی ہے کہ نہیں ؟ یہ گروہ بھی اسی کتاب کو ماننے کا مدعی اور وہ گروہ بھی اسی کتاب کے ماننے کا مدعی۔ یہ بھی اسی کتاب کو پڑھ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ روشنی کا مینار اور ہدایت کا منبع و سرچشمہ ہے۔ وہ بھی اسی بات کے دعویدار ہیں لیکن حال یہ ہے کہ آپس میں دست و گریباں ہیں۔ یہ ان کو کافر کہہ رہے ہیں اور وہ ان کی تکفیر کر رہے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اس تفرقہ بازی سے عوام بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ کا اعتماد دین پر سے، کتاب الٰہی پر سے اور علماء پر سے اٹھتا چلا جاتا

ہے ــــــ!!

یہ پس منظر ہے۔ دو جماعتیں دعوتِ محمدؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موقع پر موجود تھیں۔ ایک تو مشرکین کا گروہ۔ ان کے متعلق فرمایا گیا: كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۞ اے نبیؐ آپ کی دعوتِ توحید ان مشرکین پر بہت بھاری ہے۔ یہ اتنی دور نکل گئے ہیں کہ ان کے لئے لوٹنا آسان نہیں ہے ان میں سے اللہ ہی جس کو چاہے گا اس دعوتِ توحید کے لئے چن لے گا اور اپنے دین کی طرف کھینچ لے گا۔ اور جن کے دل میں تھوڑی سی بھی انابت ہے وہ جلد یا بدیر آپ کے جاں نثاروں میں شامل ہو جائیں گے ــــ رہا دوسرا گروہ اہلِ کتاب کا گروہ تو ان کے متعلق حضورؐ کو جو فکر لاحق ہو رہی تھی کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لا رہے ہے تو اس کا ازالہ اس آیت میں فرما دیا گیا: وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ ــــ اے نبیؐ آپ تو پھر بھی ایک نئی کتاب لے کر آئے ہیں۔ آپؐ کی دعوتِ نبوت ان کے لئے نئی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو تو یہ بھی مانتے ہیں اور وہ بھی۔ پھر بھی ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں ــــ اور تو اور خود بھی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے ہیں۔ تو جو اتنے انانیت پرست ہیں کہ ایک کتاب کے ماننے کے باوجود متفرق ہیں وہ آپؐ کی بات کیسے تسلیم کر لیں گے۔! یہی بات علامہ اقبالؒ نے جوابِ شکوہ میں ہمارے لئے کہی ہے ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

ہماری فرقہ بندی کس سے پوشیدہ ہے۔ نہ معلوم کتنے فرقوں میں ہم بٹے ہوئے ہیں! اس کے نزدیک وہ کافر، اس کے نزدیک یہ کافر۔ اس کے سوا کوئی اور بحث سننے میں نہیں آتی۔ اِلَّا ماشاء اللہ!

لہٰذا حضورؐ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اللہ آپؐ کے لئے راستہ نکالے گا لیکن آپؐ ان یہود سے توقع نہ رکھئے کہ کیونکہ یہ تو کتابوں کو جاننے والے ہیں۔ توحید کو ماننے والے ہیں۔ ان کے یہاں بڑے بڑے علماء ہیں۔ لہٰذا یہ تو فوراً مان لیں گے۔ لیکن نہیں ان کی انانیت ان کی

راہ کا وہ پتھر ہے جو کسی طرح بھی انہیں آگے نہیں بڑھنے دے گا بلکہ یہی آپ کی دشمنی میں سب سے آگے ہوں گے: لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَھُوْدَ ——اب ان حالات اور اس پس منظر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا کرنا ہے! اس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے۔ قرآن مجید کی یہ بڑی عجیب آیت ہے۔ عجیب کے لفظ سے کہیں آپ اور کوئی مفہوم نہ لے لیں۔ عربی میں عجیب کے معنی ہیں۔ بہت دلکش، بڑی پیاری، دل کو لبھانے والی بات، چیز اور کام۔ ہمارے ہاں عجیب وغریب کا جو مفہوم ہے حیرت والی بات، تو اسے اپنے ذہن سے نکال دیجئے۔

اعجب ایمان اس لفظ عجیب پر مجھے ایک حدیث یاد آگئی۔ تصور کیجئے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان جلوہ افروز ہیں—— آپ صحابہؓ سے سوال فرماتے ہیں کہ "تمہارے نزدیک سب سے زیادہ اعجب ایمان کس کا ہے؟"—— یہ بھی حضورؐ کی تعلیم و تربیت کا ایک انداز ہے ——! اعجب ہے عجیب کا اسم تفضیل۔ حضورؐ صحابہؓ سے دریافت فرما رہے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ تمہارے خیال میں سب سے زیادہ پیارا، سب سے زیادہ دلکش ایمان کس کا ہے! صحابہؓ نے کہا فرشتوں کا۔ حضورؐ نے فرمایا: وَمَا لَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ "وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے وہ تو اپنے رب کے پاس ہیں"۔ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ان کے لئے غیب میں ہوتے ہوئے بھی مشہود ہے۔ وہ ہر لحظہ اور ہر آن تجلیاتِ ربانی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ احکام الٰہی ان کے پاس براہ راست آتے ہیں، جن کی وہ تنفیذ کرتے ہیں۔ ان کی نگاہوں کے سامنے حقائق منکشف ہیں۔ وہ ایمان رکھتے ہیں تو کون سا کمال کرتے ہیں! وہ تو ابوجہل کے سامنے بھی جہنم لے آئی جائے تو وہ فوراً ایمان لے آئے گا۔ لہٰذا ان کے ایمان کے اعجب ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ پھر صحابہؓ نے عرض کیا "فالانبیاء" نبیوں کا ایمان! تو حضورؐ نے فرمایا: وَمَا لَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَالْوَحْیُ یَنْزِلُ عَلَیْھِمْ "وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے جبکہ وحی ان پر نازل ہوتی ہے" یعنی انبیاء پر اللہ کا فرشتہ وحی لے کر آتا ہے۔ انہیں غیب کی خبریں دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی نشانیوں میں سے کچھ نشانیوں کا ان کو مشاہدہ کراتا ہے۔ لہٰذا ان کا ایمان اعجب کیسے ہوگا! تیسری بار صحابہ کرامؓ نے ڈرتے ڈرتے ہوئے عرض کیا: فنحن۔ "پھر ہم ہیں" ہمارا ایمان ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ وَاَنَا بَیْنَ اَظْھُرِکُمْ۔

ہم کیسے ایمان نہ لاتے جب کہ میں تمہارے مابین موجود ہوں" اب نبی اکرمؐ نے خود جواب دیا ۔ سمجھانی تو یہ بات تھی ان اعجب الخلق إلیّ ایمانًا یأتون من بعدی یجدون صحفا فیه کتاب الله فیؤمنون بما فیها "میرے نزدیک سب سے زیادہ دلکش ایمان والے وہ ہوں گے جو میرے بعد آئیں گے ۔ ان کو تو اوراق ملیں گے جن میں اللہ کی کتاب درج ہوگی ۔ اور وہ اس پر ایمان لائیں گے" یہ لوگ ہوں گے جن کا ایمان اعجب ہوگا ۔ سب سے دلکش ہوگا ۔ اس مقام پر ایک اہم بات سمجھ لیجئے ۔ یہاں افضلیت کی بات نہیں ہو رہی ۔ دلکش ہونے کی بات ہے ۔ افضل ایمان صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ہے پوری امت میں ۔ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابیؓ کا ایمان بھی بڑے سے بڑے ولی اللہ سے افضل ہے ۔ یہاں میں نے سمجھانے کے لئے ادنیٰ استعمال کیا ہے ورنہ کسی صحابی کے لئے بھی ادنیٰ کا لفظ مناسب نہیں ہے ۔ لہٰذا یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ افضلیت بالکل جدا بات ہے اور یہ شرف صرف صحابہ کرامؓ کو حاصل ہے ۔ ایمان کا پیارا ہونا ۔ دلکش ہونا بالکل دوسری بات ہے ۔ اس کو CONFUSE نہ کر لیجئے گا ۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس موجود تھے ۔ آپؐ خود اپنی ذات میں ایک معجزہ ہیں ، عظیم ترین معجزہ ، لہٰذا انؓ کے لئے ایمان لانا آسان تھا ان کی بہ نسبت جو بعد میں آئیں گے اور جو نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیضیاب ہوئے اور نہ جنہوں نے آں جنابؐ کے چہرۂ انور کا دیدار کیا ۔ اور وہ قرآن مجید کے منبع ، سرچشمہ اور نور سے ایمان اخذ کر رہے ہیں تو دلکش ایمان ان کا ہے ۔ اس معنی میں ، میں نے کہا تھا کہ اگلی آیت نمبر ۸ بڑی دلکش آیت ہے ۔

نبی اکرمؐ کی رسالت کا فرض منصبی : دعوت اور قیام عدل

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہو رہا ہے ۔ طویل آیت ہے اور اس میں نہایت اہم مضامین جامعیت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ۔ لہٰذا میں آیت کی حصوں میں تشریح و توضیح کروں گا ۔ پہلا حصہ ہے :

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ : "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پس آپؐ اسی کی دعوت دیتے رہیئے"

اب آیت کے اس حصے کو سمجھنے کے لئے میری کل کی تقریر پس منظر میں لے آیئے ۔ میں نے توحید کی دو شاخیں بیان کی تھیں ۔ پہلی توحید علمی یا نظری یا توحید فی المعرفۃ یا توحید

فی العقیدہ ــــ دوسری توحید عملی۔ پھر اس توحید عملی کی بھی دو شاخیں ہیں۔ ایک توحید انفرادی و ذاتی۔ دوسری توحید اجتماعی ــــ ذاتی و انفرادی توحید یہ ہے کہ "اللہ ہی کی بندگی اور پرستش کرو اپنی اطاعت کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے: فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ " آگاہ رہو اللہ کے لئے تو خالص دین ہی ہے"۔ آپ نے انفرادی سطح پر یہ کر لیا تو آپ کی ذات کی حد تک عملی توحید نافذ ہو گئی۔ اب عملی توحید کی دوسری منزل ہے کہ اجتماعی نظام پر بھی اس کو قائم اور نافذ کیجئے۔ پورا نظام زندگی اس کا مظہر بن جائے کہ لِيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ــــ یہ ہو گی توحید اجتماعی، یہی اقامت دین ہے۔ اسی کا حکم سورہ شوریٰ کی زیر درس پہلی آیت میں آچکا ہے: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۝ ــــ توحید عملی کا انفرادیت سے اجتماعیت تک پیش رفت کے مابین نقطۂ ماسکہ (LINK) کیا ہے؟ وہ ہے دعوت ــــ ایک فرد نے ذاتی طور پر توحید اختیار کی تو فطری تقاضا یہ ہو گا کہ وہ اس کی طرف دوسروں کو بلائے ــــ دوسروں کو دعوت دے۔ ان کو بھی توحید کی طرف راغب کرے۔ انہیں بھی اللہ کی بندگی کی طرف پکارے۔ پھر جو اس دعوت پر لبیک کہیں ان کو وہ مجتمع کرے۔ ان کو منظم کرے۔ ان کی تربیت کرے۔ یہاں دعوتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے تین مراحل کا ذکر آگیا[1]۔ پھر اس کے لئے لازم ہو گا وہ ان تین مراحل سے گزر کر ایک طاقت فراہم کرے اور نظام باطل کو تلپٹ کر کے رکھ دے۔ اسے بیخ و بن سے اکھیڑ کر دین اللہ کو قائم کر دے۔ تاکہ اجتماعی توحید کی تکمیل ہو جائے۔ اب انفرادی توحید اور اجتماعی توحید کے درمیان LINK کیا ہے؟ نقطۂ ماسکہ کیا ہے؟ وہ ہے دعوت۔ سورہ حٰمٓ السجدہ کی آیت نمبر ۳۳ کو ذہن میں رکھیے جس کا ذکر میری کل کی تقریر میں آچکا ہے: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ اور یہاں فرمایا: فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ یہاں کلمہ "فا" اور "لام غایت" نے ذٰلِكَ سے مل کر اس آیت کو ماسبق آیات سے بھی مربوط

---

[1] دعوتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے انقلابی پہلو اور ان کے جملہ مراحل کی تفہیم کے لئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اس درس قرآن اور خطاب کا مطالعہ ان شاء اللہ نہایت مفید رہے گا۔ جو حال ہی میں "مسلمانوں کے فرائض دینی اور اسوۂ رسولؐ" کے نام سے کتابی شکل میں منظر شہود پر آگیا ہے۔ (مرتب)

کر دیا ہے اور اس پس منظر سے بھی جو اس پوری سورۂ شوریٰ کے نزول کے وقت موجود تھا جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اس دعوت کا ہدف کیا ہوگا؟ وہ ہوگا اقامتِ دین: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۔ اے نبیؐ! اسی کی دعوت دیجئے کہ اللہ کے دین کو قائم کرو، نافذ کرو، برپا کرو، مجتمع و منظم ہو جاؤ، باطل سے ٹکراؤ اور اس تصادم کے لئے خود کو قربانی اور ایثار کے لئے تیار کرو۔ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ کی یہ ہوئی تشریح و توضیح

استقامت کا حکم

آگے چلئے فرمایا: وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ " اور ڈٹے رہیئے جمے رہیئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے"۔ آپؐ کو کیا حکم ہوا تھا۔ وہ قدرے تفصیل سے میری کل کی تقریر میں بیان ہو چکا ہے۔ آج بھی اس کا حوالہ آیا ہے۔ اس کا پھر اعادہ کر لیجئے۔ کیا حکم ہوا تھا فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ط۔ پھر کیا حکم ہوا تھا! قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ط۔ پھر کیا حکم ہوا: قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ط کہہ دیجئے اے محمدؐ! (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے تو یہ حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے فرمان کے سامنے سر جھکاؤں۔ سب سے پہلے میں اس کا فرمانبردار بنوں۔ اور کہہ دیجئے کہ میں تو اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے اسی کی عبادت کرتا ہوں اور کروں گا ـــــ یہاں انشائیہ اسلوب سے آپؐ سے فرمایا جا رہا ہے: وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ "پس آپؐ ڈٹے رہیئے، مستقیم رہیئے اس پر جو آپؐ کو حکم ہوا ہے" ـــــ یعنی مخالفت تو ہے۔ کوئی شک نہیں۔ دباؤ پڑ رہا ہے کوئی شک نہیں۔ آپؐ کے لئے مصائب کے بڑے بڑے طوفان آتے نظر آ رہے ہیں، یہ سب صحیح ہے لیکن آپؐ نے کھڑے رہنا ہے اور جمے رہنا ہے۔

آپ مکی دور کی سورتوں کو دیکھیں گے تو اس استقامت کے لئے آپ کو نظر آئے گا کہ آنحضورؐ کو بار بار صبر کی تلقین و وصیت کی جا رہی ہے اور آں جنابؐ کے توسط سے یہ تلقین اہل ایمان کو بھی ہو رہی ہے۔ سورۂ مدثر میں فرمایا گیا: وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ " اے محمدؐ! اپنے رب کے راستے کی دعوت میں پیش آنیوالی مشکلات پر صبر کیجئے" سورۂ احقاف میں فرمایا گیا: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ "صبر کیجئے اے محمدؐ! (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے ہمارے اولوالعزم پیغمبر صبر کرتے آئے ہیں"۔ سورۂ نحل میں فرمایا گیا: وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ " اے محمدؐ! صبر کیجئے اور آپ کا سہارا بس اللہ ہی ہے" یعنی صبر کے لئے بھی کوئی سہارا

برکار ہے تو آپؐ کا سہارا ہم خود ہیں۔ آپؐ کے صبر کی بنیاد تو ہم سے تعلق اور محبت ہے ___ سورہ قلم میں فرمایا گیا: فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ "(اے محمدؐ!) پس صبر کیجیے اور اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجیے۔ مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیے گا"۔ یہاں صاحب الحوت سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے ذرا جلدی کی تھی۔ عجلت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ معاذ اللہ کسی گناہ کا کوئی سوال نہیں، کسی نبی سے کسی گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا۔ ہوا یہ تھا کہ دین کی حمیت و غیرت اتنی غالب آگئی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کیے بغیر اپنی قوم سے ان کے کفر پر اڑے رہنے کے باعث متنفر اور مایوس ہو کر اس قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہاں یہ فرمایا گیا کہ ایسا نہ کیجیے گا۔
سورۂ مزمل میں فرمایا گیا: وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا " اے نبیؐ! صبر کیجیے اس پر جو کچھ یہ مشرکین کہہ رہے ہیں اور ان سے بہتر و احسن طریق سے کنارہ کشی اختیار کیجیے"۔ نقل کفر کفر نباشد، دعوتِ توحید پیش کرنے کے نتیجے میں مشرکین میں سے کوئی پاگل کہہ رہا ہے، کوئی کہہ رہا ہے کہ دماغ خراب ہو گیا ہے، کوئی شاعر کہہ رہا ہے، کوئی ساحر کہہ رہا ہے اور کوئی کہہ رہا ہے کہ ساحر نہیں بلکہ مسحور ہیں، ان پر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔ یہ اس جادو کے زیر اثر ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ بھی نہیں ہے، آسیب زدہ ہیں ان پر کوئی جن آگیا ہے یہ مجنون ہیں۔ یہ ساری باتیں سن رہے ہیں جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور حکم ہو رہا ہے کہ صبر کیجیے اس پر کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں: وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ ۝ ___ پھر آنحضورؐ کو تسلی اور تشفی بھی دی جا رہی ہے۔ سورۂ قلم میں فرمایا گیا: نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝ مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ۝ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ۝ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝ " ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں! آپؐ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ اور یقیناً آپؐ کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے اور (اے نبیؐ!) تحقیق آپؐ اخلاق کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہیں" ___ لہٰذا ان مشرکین کی باتوں کا اثر نہ لیجیے۔

یہ ہے سارا پس منظر جس میں حضورؐ سے فرمایا جا رہا ہے: وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ___ دباؤ کتنا ہی سخت ہو، مخالفت کتنی ہی شدید ہو، استہزا اور تمسخر کتنا ہی دل آزار اور اذیت ناک ہو، حالات کتنے ہی ناموافق و ناساعد ہوں، ماحول کتنا ہی ناسازگار ہو، اے نبیؐ! آپؐ کو عبادتِ رب، دعوت الی اللہ اور اقامتِ دین کی جدوجہد اور جہد و جہاد کا جو حکم ہوا ہے، اس پر جمے رہیے، ڈٹے رہیے۔ نوٹ کیجیے گا کہ سورہ حٰم السجدہ کی جو آیت دعوت الی اللہ کے ضمن میں، میں نے کل آپ کو سنائی تھی، اس سے دو آیات پہلے والی آیت نمبر ۳۰ میں استقامت کا ذکر آ چکا ہے۔ فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ٥ میں کہا کرتا ہوں کہ اس لفظ استقامت میں قیامت پوشیدہ اور مضمر ہے۔ کہو کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اس پر چٹان کی مانند جم جاؤ۔ اب کوئی طوفان کتنا ہی سخت اور شدید آئے تمہارے قدموں میں جنبش اور لغزش پیدا نہ کر سکے۔ لہٰذا قولی اور عملی ہر نوع کی مخالفت کو اے محمدؐ! آپ جھیلئے۔ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۚ

مصالحانہ رویہ کی ممانعت

اس آیت کا اگلا حصہ ہے، فرمایا:

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۚ

"اور (اے نبیؐ!) ان (مشرکوں اور کافروں) کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے!"

دباؤ کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ قریش کے مشرک سرداروں نے جب یہ محسوس کیا کہ اس دعوت توحید کو روکنے میں ہر نوع کے استہزاء و تمسخر اور شدید جور و ستم کے باوجود ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں اور وہ نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت توحید سے روک سکے ہیں نہ ان کے مظالم سعید لوگوں کو دعوت قبول کرنے سے باز رکھ سکے اور نہ ہی دعوت قبول کرنے والے کسی شخص کو مصائب سے ہراساں کر کے دین چھوڑنے پر آمادہ کر سکے تو مشرکین کی طرف سے نبی اکرمؐ کے پاس سفارتیں اور پیشکشیں آنی شروع ہو گئیں اور آپؐ کے سامنے مصالحت کا یہ فارمولا پیش کیا جانے لگا کہ کچھ ہم آپؐ کی بات مان لیتے ہیں کچھ آپ ہماری بات مان لیں۔ سورۂ قلم میں آغاز ہی میں یہ فرمایا گیا تھا کہ: فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ٥ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ٥ "پس اے نبیؐ! آپؐ ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آئیں یہ تو چاہتے ہیں کہ آپؐ کچھ ڈھیلے پڑیں، کچھ مداہنت کریں تو یہ بھی ڈھیلے پڑیں اور مداہنت کا رویہ اختیار کریں؟" انہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ آپؐ کے قدموں کو ذرا بھی لغزش نہیں آتی یہ پورا زور لگا کر بھی ان کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اب یہ چاہتے ہیں کہ مصالحت ہو جائے، کچھ مان لیجئے کچھ منوا لیجئے۔ ... کا معاملہ کیجئے۔ کچھ دیجئے کچھ لیجئے۔ ہماری بھی تو ناک رہ جائے۔ ہماری بھی کچھ عزت رہ جائے۔ ساری کی ساری بات آپ کی مان لی جائے یہ ممکن نہیں ہے۔ آپؐ کو پیشکش کی گئی کہ اگر اس دعوت توحید کے ذریعے آپ کو دولت درکار ہے تو اشارہ کر دیجئے ہم دولت کے انبار

کے قدموں میں لگا دیں گے۔ اگر آپ اقتدار چاہتے ہوں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنانے کے لئے تیار ہیں۔ اگر آپ کسی خاص خاتون سے نکاح کرنے کی خواہش رکھتے ہوں تو اشارہ کر دیجئے وہاں نکاح ہو جائے گا۔ یہ ہوتا ہے دام ہم رنگ زمیں۔ اللہ کی طرف بلانے والا اللہ کا بندہ شدید مشکلات اور مصائب میں گھرا ہوا ہے۔ حالات اتنے ناسازگار اور ناموافق ہیں کہ بظاہر کہیں راستہ نکلتا نظر نہیں آرہا۔ ان حالات کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے جن سے اس وقت آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان دوچار تھے۔ اس وقت ایسی ایسی پیشکشیں آتی ہیں تو نفس تو کہتا ہے کہ قبول کر و۔ چلو اس وقت یہ سو فی صد نہیں مانتے، پچاس فی صد ماننے کے لئے تیار ہیں، اسی کو غنیمت سمجھ کر مصالحت کر لی جائے۔ رفتہ رفتہ ان کو رام کر لیا جائے گا اور پورے دین پر عمل پیرا ہونے کے لئے ان کو آمادہ کر لیا جائے گا۔ لیکن حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ نہیں۔ ڈٹے رہیے۔ دین کل کا کل قبول کریں تو ٹھیک ہے۔ جزوی دین، دین ہے ہی نہیں۔ اسی لئے یہاں فرمایا گیا: وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ ان ہی احکام الٰہی کے پیش نظر مشرکین کی دام ہم رنگ زمیں پیش کشوں اور قتل کرنے کی دھمکیوں کے جواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے جو تاریخ میں آب زر سے لکھے جائیں تو بھی اس جواب کی شان کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ آپ نے مشرکین کو جواب دیا:

"اگر تم میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دو تب بھی میں اس دعوت سے باز نہیں آسکتا۔ یا تو میں اس دعوت کی تبلیغ میں اپنی جان دیدوں گا یا اللہ اس کو کامیابی سے ہمکنار فرمائے گا۔"

یہ تھی اس حکم کی عمل اور قول میں تعمیل کہ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ علامہ اقبال نے اس بات کو بڑی خوبصورتی سے اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے   شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

نوٹ کیجئے کہ یہی صورت حال مدینہ منورہ میں بھی پیش آگئی تھی۔ وہاں بھی یہود کے علماء کا مطالبہ یہی تھا کہ کچھ لیجئے کچھ دیجئے۔ کچھ ہماری باتیں مانیئے کچھ ہم آپ کی باتیں مان لیں گے۔ اسی پس منظر میں سورۂ بقرہ میں جو مدنی سورت ہے فرمایا گیا: وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۔ اے نبی! یہ یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں

گے جب تک آپ ان کی ملت (طور طریقوں) کا اتباع نہ کریں؟ یہ تو اپنے تعصب اور اپنی عصبیت
کی وجہ سے اپنی بات پہ اڑے ہوئے ہیں۔ یہ آپ سے کبھی راضی نہ ہوں گے۔ آپ اگر انہیں
کچھ رعائتیں دینے پہ آمادہ ہو جائیں تب بھی یہ آپ کی بات نہیں مانیں گے۔ اصل مسئلہ تو یہ دینی
قیادت کا۔ آپ ان کے پیچھے چلیں تب یہ خوش ہوں گے۔ یہ اہل کتاب اچھی طرح جانتے تھے
کہ آپ بحیثیت رسول دین کے معاملہ میں کسی مصالحت کے لئے تیار ہی نہیں ہو سکتے تھے اس
لیئے ان کی مصالحانہ پیش کش بھی اخلاص وخلوص پر مبنی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس لئے ہوتی تھی کہ
اپنے عوام اور حلقۂ اثر کو یہ مغالطہ دیں کہ ہم تو مصالحت کی برابر کوشش اور پیش کش کر رہے ہیں لیکن
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی اپنے موقف پر بضد ہیں۔ قرآن حکیم نے ان اہل کتاب کے نفاق کو
مختلف اسالیب سے فاش کیا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۸۵ طویل آیتوں میں سے ایک
ہے۔ اس میں پہلے تو ان اہل کتاب کے ان جرائم کا ذکر کیا گیا ہے جو وہ اپنی کتاب اور اپنی شریعت
کی خلاف ورزیوں کے طور پر کرتے تھے۔ جو کام خود ان کی شریعت میں حرام تھے ان کا ارتکاب
کرتے تھے پھر بھی اس بات کے دعوے دار تھے کہ ہم شریعتِ موسوی پہ کاربند ہیں۔ اس پہ کامل
ایمان رکھتے ہیں ـــــ ان کے چند جرائم گنوا کر فرمایا گیا:

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ
وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا
جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ
إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ
وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ
أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللَّهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ○

"تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان
لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر
کرتے ہو! پھر تم میں سے جو لوگ
ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے
کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر
رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب
کی طرف پھیر دیئے جائیں۔ اللہ ان حرکات
سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔"

آیت کا یہ حصہ یہود کے اس طرز عمل کی مکمل عکاسی ہے جو انہوں نے اللہ کی شریعت کو
حصوں میں تقسیم کر کے اختیار کیا ہوا تھا۔ وہ اس جرم کا ارتکاب کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی
نازل کردہ شریعت کے کچھ حصوں پہ عمل کرتے تھے۔ اور کچھ حصوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ یا ان کے
بالکل خلاف عمل کرتے تھے۔ گویا ان کی اطاعت اخلاص وخلوص سے خالی تھی۔ اس میں ملاوٹ شامل

ہوگئی تھی۔ اس میں نفس کی چاہت اور خواہشات کی پیروی کی آمیزش ہوگئی تھی۔ اس طرزِ عمل
پر آیت کے اس حصے میں جو سخت وعید آئی ہے وہ لرزا دینے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دین و
شریعت کے ساتھ جو بھی یہ معاملہ کرے گا کہ ایک طرف اللہ کی توحید، اس کی کتاب اور اس
کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے کا دعویٰ ہو، دوسری طرف اس کے دین اور اس
کی شریعت کے ساتھ یہ معاملہ ہو کہ کچھ حصے پر عمل ہو اور کچھ حصہ کو چھوڑ دیا جائے یا اس کے
برخلاف عمل کیا جائے تو اس امت کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ وہی معاملہ کرے گا جو سابقہ
امت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا اور وَلَا تَجِدُ لِسُنَّةِ
اللّٰهِ تَحْوِيْلًا آج ہم بحیثیت امت دنیا میں ذلیل و خوار ہیں۔ ہمارا کوئی وقار نہیں، ہماری
کوئی وقعت نہیں۔ یہ نقد سزا ہے جو ہم کو دنیا میں مل رہی ہے اس جرم کی کہ ہم نے بھی
یہود کی طرح دین و شریعت کو اجزاء میں تقسیم کر رکھا ہے۔ مسجدوں میں تو اللہ کا حکم چلے،
عدالتوں میں، اسمبلیوں میں، معاشیات میں، معاشرت میں، ملک کے مجموعی اور اجتماعی
نظام میں اللہ کے احکام بے دخل رہیں ــــ ان چند جملہ ہائے معترضہ کے بعد اصل مضمون کی
طرف آیئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ
اُمِرْتَ اور منع فرمایا جا رہا ہے کہ ان منکرینِ حق کی خواہشات کی ہرگز پیروی نہ کیجئے گا۔ دراصل
اس اسلوب میں ان کفار اور مشرکین کو متنبہ کرنا ہے کہ تم ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)
سے یہ توقعات نہ رکھو کہ وہ تمہاری خواہشات کی پیروی کریں گے۔ یہ سب مفاہیم و معانی
آیت کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں سموئے ہوئے ہیں کہ: وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ

ایمان بالکتاب

آگے چلئے اور قرآن مجید کا یہ اعجاز دیکھئے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں نہایت جامعیت کے ساتھ نہایت اہم مضامین و موضوعات کا احاطہ کر لیتا ہے۔ کوزے میں سمندر بند کرنے کا محاورہ اگر صد فی صد راست آتا ہے تو وہ قرآن مجید کی ہر آیت پر راست آتا ہے۔
ــــ اب اسی آیت کا اگلا حصہ پڑھئے اور دیکھئے کہ ایک بات ڈنکے کی چوٹ کہنے کا نبی اکرم کو حکم ہو رہا ہے۔ فرمایا:

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ

"اور اے نبیؐ! کہہ دیجئے کہ میں تو ایمان رکھتا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے"
یہاں توقف کر کے پہلے "مِنْ كِتَابٍ" کی کچھ شرح سمجھ لیجئے۔ تفصیل کے لئے وقت
نہیں لہٰذا اشارات ہی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ یہاں "مِنْ كِتَابٍ" فرما کر یہ بات واضح
کی گئی ہے کہ نبی اکرمؐ صرف قرآن کریم ہی کو منزّل من اللہ تسلیم نہیں فرماتے تھے بلکہ ہر آسمانی
کتاب کو ماننے کا اقرار فرماتے تھے۔ اسی بات کو سورۂ بقرہ کے آخری رکوع میں اس طرح واضح
فرمایا گیا ہے: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ
بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۔ "ہمارے یہ رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم)
اس ہدایت یعنی قرآن پر ایمان لائے ہیں جو ان کے رب کی جانب سے ان پر نازل کی گئی ہے
اور وہ بھی ایمان رکھتے ہیں جنھوں نے ہمارے رسولؐ کی تصدیق کی ہے۔ یہ سب اللہ پر اور اس
کے فرشتوں پر اور اس کی طرف سے نازل کردہ تمام کتابوں پر اور اس کی طرف سے مبعوث کئے
جانے والے تمام رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں"۔۔۔ اور ہمارے رسولؐ اور ان کے اصحاب
کا قول یہ ہے: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ "ہم اللہ کے رسولوں کے
مابین تفریق نہیں کرتے"۔ مطلب یہ ہوا کہ تورات، زبور، انجیل اور دوسرے صحیفے جو بھی اللہ
کی طرف سے نازل ہوئے ان سب پر بھی اور قرآن پر بھی ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ قرآن مجید
درحقیقت تمام آسمانی کتابوں کا مُہیمن و مصدّق ہے۔ پہلی کتابیں محرّف ہو گئیں، صحیفے گم ہو گئے۔
قرآن ان سب کا جامع ہے اور تا قیامِ قیامت محفوظ رہے گا۔ چونکہ حضورؐ خاتم النبیین والمرسلین
ہیں۔ اسی طرح اللہ کے تمام رسولوں کی بھی خاتم النبیین والمرسلین اور آپؐ کے صحابی تصدیق
کرتے ہیں ۔۔۔ اب آئیے آیت کے اس حصّے کی طرف۔ آپ نے دیکھا کہ آیت نمبر ۱۴
میں لفظ کتاب آچکا ہے: وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ
مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۔ بظاہر یہ کتاب کے ماننے والے ہیں، بظاہر یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا
ایمان تورات پر ہے۔ لیکن ان کا یقین متزلزل ہو چکا ہے اپنے دینی سربراہوں کا کردار دیکھ
کر ان کے رویّہ کو دیکھ کر، ان کے تفرقے کو دیکھ کر ان کتابوں پر سے ان کا اعتماد اٹھ چکا
ہے۔ ان کا ایمان ہل چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہاں نبی اکرمؐ کی زبان سے کہ
کہلوایا جا رہا ہے: یہ کہ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ "میرا ایمان
تو اس کتاب پر ہے جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور میرا سارا عمل اس کے مطابق ہے۔ میں

اس پرچھا ہوا ہوں ـــــ

قرآن میں تبدیلی کا مطالبہ سورۂ یونس میں مشرکین کے اس مطالبہ کا حوالہ آیا ہے جو وہ قرآن میں تغیر و تبدل کے لئے کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ ہو جائے تو ہماری اور آپ کی صلح ہو سکتی ہے۔ سورۂ یونس میں فرمایا: وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ط " اور جب انہیں ہماری روشن اور بیّن آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو آخرت میں ہم سے ملنے کا یقین نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اسی میں ردّ و بدل کر دو"۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ قرآن بہت Rigid ہے۔ یہ بالکل بے لچک ہے۔ اس کا موقف بہت سخت ہے۔ آخر دوسروں کو بھی Accomodate کیا جانا چاہیئے۔ مصالحانہ رویہ (Compromising Attitude) بھی تو ہونا چاہیئے۔ لہٰذا کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا پھر اسی میں تغیر و تبدل کرو ـــ کچھ اس کی سختی کم کرو اور اسے نرم بناؤ۔ اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ط ـــ جواب کیا دلوایا گیا۔

قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ (آیت ۱۵)

"اے نبی! کہہ دیجئے کہ میرے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ میں اپنے جی سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر دوں۔ میں تو خود اسی کے اتباع پر مامور ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے ہولناک عذاب کا خوف ہے"۔

"یعنی اگر یہ باتیں میں اپنے جی سے کہہ رہا ہوتا۔ یہ میرے اپنے نظریات ہوتے۔ میرا اپنا کوئی پروگرام ہوتا۔ کوئی پارٹی منشور ہوتا جس کو چند لوگوں کی مشاورت سے بنایا گیا ہوتا تو میں اس میں ترمیم و تنسیخ کر سکتا تھا۔ کوئی ردّ و بدل ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ اللہ کا کلام ہے اس کے فرامین ہیں جو میں تمہیں پڑھ کر سنا رہا ہوں"۔ ـــ میں آپ کو کل کی تقریر میں سورہ زمر کی یہ آیت سنا چکا ہوں: وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ مجھے تو حکم ملا ہے کہ اللہ کا پہلا فرمانبردار میں خود بنوں۔ چنانچہ اللہ کے احکام کے سامنے سر جھکانے والا اور اس کی تابعداری کرنے والا سب سے پہلے میں خود ہوں۔ اس لئے میرے لئے

یہ کہاں ممکن ہے کہ قرآن مجید میں کوئی تبدیلی کرسکوں۔ معاذاللہ ثم معاذاللہ ـــــ یہی تو بات تھی کہ اسی زمر کے آخر میں کس قدر جلالی انداز ہے کہ: قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ٥ اے نبی کہہ دیجئے جاہلو! کیا تم مجھے بھی حکم اور مشورہ دے رہے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی اور پرستش شروع کر دوں۔ اے حرص و ہوا کے بندو! مجھے اپنے اوپر قیاس نہ کرو مجھے مصلحتوں کے راستے نہ دکھاؤ۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کی بندگی کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کروں۔ مجھے تو حکم ملا ہے: بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ٥ میں اللہ ہی کی بندگی اور پرستش کرتا رہوں اور اس کے شکرگزار بندوں میں شامل رہوں۔ وہی حکم یہاں ہے کہ: قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ؟

(جاری ہے)

بقیہ "درس حدیث"

اللہ کے راستے میں جدوجہد ایک اجتماعیت کے بغیر ناممکن ہے اور اس عمارت میں اجتماعیت کو سیڑھی کے ایک طرف لگے ہوئے کٹہرے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ پہلی سطح پر لوگ جب مل جل کر ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اللہ کی بندگی کریں گے تو اگرچہ معاشرے کے لوگ اسے ناپسند کریں گے مگر اس کے ساتھی جو اس راہ پر چل رہے ہیں وہ اسے گلے سے لگائیں گے۔ اسی طرح دعوت دین کے کام میں اللہ کے پیغام کی نشر و اشاعت میں سرمایہ، قوتِ تحریر، قوت تقریر اور دوسرے تمام وسائل کو بروئے کار لایا جائے گا تب جا کر بات بنے گی۔ اسی طرح تیسرے اور آخری مرحلے کو سر کرنے کے لئے تو ایک ARMY DISCIPLINE والی جماعت تیار کرنا ہوگی جو اپنے امیر کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار رہو۔ جس طرح نماز کے لئے وضو شرط ہے اور یہ شرط فرض کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ اسی طرح دین کی تبلیغ و دعوت، شہادت علی الناس اور اقامت دین جو فرائض دینی میں شامل ہیں، لزوم جماعت شرط ہے اور اس طرح ایک دینی ہیئتِ اجتماعیہ کا قیام و التزام بھی فرض کے درجہ میں آجاتا ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العلمين

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

شبیر احمد نورانی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو انتہائی قیمتی نعمتوں سے نوازا ہے ان میں سے ایک نعمت زبان ہے جس کا صحیح استعمال انتہائی خوشگوار نتائج پیدا کرتا ہے لیکن اگر اسے غلط استعمال کیا جائے تو ہر قسم کے فساد اور خرابی کی جڑ بن جاتی ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ اور سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تحفظ پر بہت زور دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

۱۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝ (الاسراء: ۳۶)

ترجمہ: "کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو یقیناً آنکھ کان اور دل سب کی باز پرس ہوگی۔"

۲۔ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝ (ق: ۱۸)

ترجمہ: "کوئی لفظ زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو" (جو لفظ بھی زبان سے نکلتا ہے اسے ضبط کرنے والا ایک حاضر باش نگران موجود ہوتا ہے)

۳۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ (المؤمنون)

ترجمہ: یقیناً فلاح پائی ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں اور لغویات سے دور رہتے ہیں۔

۱۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کون سا مسلمان بہترین ہے؟

فرمایا: جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں (بخاری، مسلم، نسائی)
اسی معنی کی روایت بخاری و مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی روایت کی ہے۔

۲۔۔۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بہترین عمل کون سا ہے؟ ارشاد ہوا "وقت پر نماز کی ادائیگی"۔ میں نے عرض کی اس کے بعد کونسا؟ آپ نے فرمایا "یہ کہ لوگ تیری زبان سے محفوظ رہیں"۔ (امام طبرانی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے)

۳۔۔۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راہِ نجات کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ تم اپنی زبان قابو میں رکھو۔ اپنے گھر پر قناعت کرو۔ اور اپنے گناہوں پر رو۔ (ابوداؤد، ترمذی، بیہقی)

اسی معنی کی حدیث طبرانی نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے ۔۔۔ اور طبرانی و بیہقی نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے۔

۴۔۔۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا "جو مجھے زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کی ضمانت دے میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں"۔ (بخاری، ترمذی)

۵۔۔۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جسے اللہ تعالیٰ نے زبان اور شرمگاہ کے شر سے محفوظ کر دیا وہ جنت میں داخل ہو گیا"۔ (ترمذی - ابن حبان)

۶۔۔۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تین باتیں ناپسند فرمائی ہیں۔ ۱۔ فضول باتیں کرنا۔ ۲۔ مال ضائع کرنا۔ ۳۔ بلامقصد سوال کرتے رہنا۔ (بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد)

۷۔۔۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
"انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ غیر متعلق باتیں چھوڑ دے" (ترمذی)

۸۔۔۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا جو کچھ بھی ہم بولتے ہیں کیا وہ ہمارے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "تیری ماں تجھ کو روئے لوگ اپنی زبانوں کی وجہ سے ہی جہنم میں اوندھے منہ ڈالے جائیں گے۔ تیری سلامتی اس میں ہے کہ تو ہمیشہ

موش رہے۔ جونہی تو نے بات کی یا تیرے حق میں جائے گی یا تیرے خلاف۔" (طبرانی)

زبان کی حفاظت اور کم از کم گفتگو کے متعلق ذخیرہ حدیث میں غالباً ساٹھ کے قریب حدیثیں پائی جاتی ہیں ان میں سے چند کا تذکرہ بطور نمونہ قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے تاکہ یہ فیصلہ فرمالیں کہ زیادہ گفتگو دنیا و آخرت میں مفید ہے یا کم از کم؟

مسلمان کی عزت

مسلمان کی عزت کا کیا مقام ہے؟ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کیا مقام دیا ہے؟

اس کے لیے مندرجہ ذیل احادیث کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

۱۔ حضرت ابی بکرہ رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے موقع پر یہ فرماتے ہوئے سنا: "بلاشبہ تمہارے خون، مال اور عزت تم پر اسی طرح محترم ہیں جیسے آج کا دن، اس مہینے میں اور اس شہر کے اندر" توجہ کرو! میں نے بات تم تک پہنچا دی ہے۔ (بخاری، مسلم)

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ہر مسلمان پر مسلمان کا خون، عزت اور مال قابلِ احترام ہیں" (مسلم، ترمذی)

۳۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "سود کی بہتر اقسام ہیں، سب سے چھوٹی قسم کا گناہ ایسا ہے جیسے آدمی اپنی والدہ کے پاس شہوت سے جائے اور بدترین قسم اپنے بھائی پر زیادتی کرنا ہے۔ (طبرانی)

اس معنی کی روایت ابن ابی الدنیا نے "کتاب ذم الغیبہ" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کی ہے۔

۴۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

"اللہ کے ہاں بدترین گناہ کسی مسلمان کی عزت سے کھیلنا ہے"، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا (الاحزاب: ۵۸)

ترجمہ: اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بے قصور اذیت دیتے ہیں انہوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے۔

(ابو یعلی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

۵۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نقل فرمایا "بدترین زیادتی

مسلمان کی عزت پر ناحق حملہ کرنا ہے" (ابوداؤد)

کیا اس کے بعد بھی کسی مسلمان کا دل یہ بات گوارا کرے گا کہ وہ کسی مسلمان کی عزت کو نشانہ بنا کر اس سے محظوظ ہوتا رہے اور لطف اندوز ہو۔ یہ چند احادیث پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ ذخیرہ حدیث اس طرح کے احکام سے مالا مال ہے۔

غیبت کیا ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے دریافت کیا تمہیں معلوم ہے غیبت کیا ہے؟ انہوں نے کہا اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "تم اپنے بھائی کا تذکرہ اس طرح کرو جو اسے ناپسند ہو" کسی نے پوچھا۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اگر میرے بھائی کے اندر یہ بات موجود ہو؟ آپ نے فرمایا، جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر تمہارے بھائی میں موجود ہے تو تم نے غیبت کی اور اگر وہ بات اس میں موجود ہی نہیں تو تم نے بہتان باندھا۔ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

چنانچہ غیبت کی تعریف یوں ہوئی "کہ کسی مسلمان کا اس انداز میں تذکرہ کرنا جو اسے ناپسند ہو۔ اور اس کی تحقیر مقصود ہو۔

غیبت کی حرمت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ○ (الحجرات: ۱۲)

ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں تجسس نہ کرو، اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو تمہیں خود یہ ناپسند ہے۔ اللہ سے ڈرو اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے"

توجہ طلب

اس فقرے میں اللہ تعالیٰ نے غیبت کو مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دے کر اس فعل کے انتہائی گھناؤنا ہونے کا تصور دلایا ہے، مردار کا گوشت کھانا بجائے خود نفرت کے قابل ہے کجا کہ وہ گوشت بھی کسی جانور کا نہیں بلکہ انسان کا ہو اور انسان بھی کوئی اور نہیں خود اپنا بھائی ہو۔ پھر اس تشبیہ کو سوالیہ انداز میں پیش کر کے اور زیادہ مؤثر بنا دیا گیا ہے تاکہ ہر شخص اپنے ضمیر سے پوچھ کر خود فیصلہ کرے کہ آیا وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے کے لیے تیار

ہے؟ اگر نہیں ہے اور اس کی طبیعت اس چیز سے گھن کھاتی ہے تو آخر وہ کیسے یہ بات پسند کرتا ہے کہ اپنے ایک مومن بھائی کی غیر موجودگی میں اس کی عزت پر حملہ کرے جہاں وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکتا اور جہاں اس کو یہ خبر تک نہیں ہے کہ اس کی بے عزتی کی جا رہی ہے؟ اس ارشاد سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ غیبت کے حرام ہونے کی بنیادی وجہ اس شخص کی دل آزاری نہیں ہے جس کی غیبت کی گئی ہو، بلکہ کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا بجائے خود حرام ہے قطع نظر اس سے کہ اس کو اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ اور اس کو اس فعل سے اذیت پہنچے یا نہ پہنچے۔ ظاہر ہے کہ مرے ہوئے آدمی کا گوشت کھانا اس لیے حرام نہیں ہے کہ مُردے کو اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ مُردہ بے چارہ تو اس سے بے خبر ہوتا ہے۔ کہ اس کے مرنے کے بعد کوئی اس کی لاش بھنبوڑ رہا ہے۔ مگر یہ فعل بجائے خود ایک گھناؤنا فعل ہے۔ اسی طرح جس شخص کی غیبت کی گئی ہو، اس کو بھی اگر کسی ذریعہ سے اس کی اطلاع نہ پہنچے تو وہ عمر بھر اس بات سے بے خبر رہے گا۔ کہ کہاں کس شخص نے کب اس کی عزت پر کن لوگوں کے سامنے حملہ کیا تھا اور اس کی وجہ سے کس کس کی نظر میں وہ ذلیل و حقیر ہو کر رہ گیا ہے۔ اس بے خبری کی وجہ سے اسے اس غیبت کی سرے سے کوئی اذیت نہ پہنچے گی مگر اس کی عزت پر بہر حال اس سے حرف آئے گا، اس لیے یہ فعل اپنی نوعیت میں مُردہ بھائی کا گوشت کھانے سے مختلف نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن ج ۵ - ص ۹۴)

مذکورہ آیت کی وضاحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انداز میں بیان فرمائی ہے۔

۱ ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بنو اسلم قبیلے کا ایک آدمی (ماعز بن مالک الاسلمی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنے بارے میں زنا کا چار مرتبہ اقرار کرتے ہوئے کہا میں نے کسی عورت سے بدکاری کی ہے۔ ہر مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے رُخ پھیر لیا۔ آخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا، تم یہ اقرار کیوں کر رہے ہو، اس نے عرض کی میری خواہش ہے کہ آپؐ مجھے پاک کر دیں۔ چنانچہ آپؐ نے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ اور وہ سنگسار کر دیا گیا۔ جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری کو دوسرے سے یہ کہتے سُن لیا۔ "اسے دیکھو اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ مگر اس کے نفس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا، جب تک یہ کتے کی موت نہ مر گیا" راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے پھر کچھ دیر چلتے رہے۔ آپؐ ایک گدھے کی لاش سے گزرے جس کی پھولنے کے بعد ٹانگ بھی اٹھی ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا فلاں فلاں کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا ہم حاضر ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو (غیبت کرنے والا اور سننے والا) حکم دیا کہ "اس گدھے کی لاش کھاؤ"، انہوں نے عرض کی اے اللہ کے رسولؐ اسے کون کھا سکتا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ابھی ابھی

جو تم اپنے بھائی کی عزت پر حرف زنی کر رہے تھے وہ اس گدھے کی بدبودار لاش کھانے سے زیادہ بری ہے۔" (ابن حبان)

دیگر کتابوں میں بھی اس معنی کی حدیث پائی جاتی ہے اگرچہ الفاظ میں کچھ کمی بیشی ہے۔ میری گزارش ہے کہ اس حدیث کو دوبارہ سہ بارہ پڑھیں اور غور فرمائیں!!!

۲۔۔۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھے کہ اچانک بدبودار ہوا آئی اسی وقت آپؐ نے سوال کیا تم جانتے ہو یہ ہوا کیسی ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو لوگوں کی غیبتیں کرتے ہیں۔ (مسند الامام احمد رحمہ اللہ۔ سند بالکل صحیح ہے)

غیبت سننا اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کی غیبت کرے تو شریعت کی نگاہ میں انتہائی قبیح اور گھناؤنا جرم ہے اسی طرح کسی کی غیبت سننا بھی شرعاً حرام اور ناجائز ہے۔ حسبِ ذیل شرعی دلائل پر غور فرمائیں اور نصیحت حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ (المؤمنون : ۳)

ترجمہ: جو لوگ لغویات سے اعراض کرنے والے ہیں۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ○ (الاسراء: ۳۶)

ترجمہ: کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو۔ جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؗ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ؗ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ○ (القصص: ۵۵)

ترجمہ: اور جب انھوں نے بے ہودہ بات سُنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے، تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ تمہیں دُور سے ہی سلام ہے ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔

۱۔۔۔ حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر دریافت کیا مالک بن الدخشم کہاں ہے؟ ایک آدمی نے کہا وہ منافق ہے اسے اللہ اور رسول سے کوئی محبت نہیں آپؐ نے فرمایا، ایسا مت کہو، تمہیں خبر نہیں کہ اس نے لا الٰہ الا اللہ صرف اللہ کی رضا کیلئے کہا ہے"

اللہ تعالیٰ نے آگ ہر اس آدمی پر حرام کر دی ہے جس نے لا الٰہ الا اللہ اس کی رضا کے لیے کہا ہو۔

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف غیبت کرنے والے بلکہ سننے والے کو بھی حکم دیا کہ وہ گدھے کی بدبودار لاش کھائیں کیونکہ جرم میں وہ دونوں برابر کے قصوروار ہیں۔

اس موقع پر تو ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی عزت کا محافظ بن جائے اور حتی الوسع اپنے بھائی کا دفاع کرے جیسا کہ مندرجہ احادیث کی روشنی سے معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کی عزت کا دفاع کیا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے کہ اسے آگ سے بری کر دے۔ (مسند امام احمد۔)

۲۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے اپنے بھائی کی عزت کا دفاع کیا اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کے چہرے سے آگ دور رکھے گا۔ (ترمذی)

۳۔ حضرت جابر بن ابی طلحہ الانصاری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں اس کی تذلیل کی جا رہی ہو اور اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہو۔ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر کرتا ہے جہاں اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو اور اس کی تذلیل و توہین کی جا رہی ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی مدد ایسے موقع پر کرتا ہے جہاں وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے۔ (ابوداؤد)

نوٹ: مذکورہ بالا احادیث اس حدیث کی تائید کرتی ہیں۔

غیبت کرنے والے کا حالِ قبر: حضرت ابی بکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا اور ایک دوسرا آدمی آپ کے بائیں طرف تھا۔ اچانک ہمارے سامنے دو قبریں آگئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے۔ اور ان کو کسی بڑی بات پر عذاب نہیں ہو رہا جبکہ وہ اللہ کے ہاں عذاب کے لحاظ سے بہت بڑی ہیں۔ آپ نے فرمایا، تم میں سے کون ایک شاخ لے کر آئے گا ہم دونوں دوڑے اور میں آگے نکل گیا۔ میں ایک شاخ لے آیا۔ آپ نے اسے دو ٹکڑے کیا اور ہر قبر پر ایک ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ مزید فرمایا، "جب تک یہ تر و تازہ رہیں گی، ان کو کم عذاب ملے گا"۔ ایک کو محض غیبت اور دوسرے کو پیشاب کے چھینٹوں کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے۔

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ روایت فرمایا ہے۔
دیگر کتب میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

غیبت کرنے والا میدانِ حساب میں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا، تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ نے عرض کی جس کے پاس مال و متاع نہ ہو، آپ نے ارشاد فرمایا "میری اُمت میں مفلس وہ ہے جو نماز روزہ کی ادائیگی کے ساتھ روزِ قیامت حاضر ہو (اور اس کے ساتھ ساتھ) کسی کو گالی دی، کسی پر بہتان لگایا، کسی کا مال کھایا، کسی کا خون بہایا اور کسی کو مارا۔ پھر ہر ایک کو اس کی نیکیاں اس کے حق کے مطابق بانٹ دی جائیں گی۔ اور اگر حقوق ختم ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں۔ تو ان کی بُرائیاں لے کر اس کے ذمے ڈال دی جائیں گی پھر اسے آگ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ (صحیح مسلم، الترمذی)

غیبت کرنے والے کا عذاب

۱۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کرائی گئی تو آپ نے آگ میں ایک گروہ کو دیکھا جو بدبودار لاش کھا رہا تھا۔ پوچھا جبریلؑ یہ کون ہے؟ کہا یہ وہ ہیں جو لوگوں کی غیبتیں کرتے تھے۔ (صحیح سند کے ساتھ امام احمدؒ نے ذکر کیا ہے)

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جب مجھے معراج ہوا تو ایسی قوم کے پاس سے گزرا جن کے ناخن تانبے کے تھے۔ اپنے سینوں اور چہروں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے پوچھا جبریل یہ کون ہیں؟ کہا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے (غیبت کرتے تھے) اور ان کی عزت پر حملہ آور ہوتے تھے۔ (ابوداؤد)

غیبت کا کفارہ

اگر کسی مسلمان سے اپنے بھائی کی غیبت سرزد ہو جائے تو اس کا کفارہ حسب ذیل ہوگا۔
۱۔ جس آدمی کی غیبت ہوئی ہے اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ تو غیبت کرنے والا اس کے حق میں اس قدر استغفار کرے کہ اس کا اپنا دل مطمئن ہو جائے۔ کہ میں نے اپنے بھائی کی حق رسی کر دی ہے۔

امت کے معتبر علماء کا یہی فتویٰ ہے ــــ اور اس کے علاوہ کوئی صورت ممکن بھی نہیں۔

۲۔ اور اگر وہ زندہ ہے اور یہ ممکن ہے کہ اس سے معذرت کر لی جائے۔ تو غیبت کرنے والا اس سے معذرت کرے۔

دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو

سی کے ذمے اس کے بھائی کا حق ہو وہ اسے اس دن سے پہلے معاف کروالے جس دن نہ کوئی دینار ہوگا نہ درہم۔ ہاں تو صرف اس کی نیکیاں لی جائیں گی۔ اور اگر نیکیاں نہ ہوئیں تو دوسرے کی برائیاں اسے سونپ دی جائیں گی (بخاری مسلم)

عفو و درگذر

ایک سچے مسلمان کا یہ مقام ہے کہ اگر اس سے کوئی (خواہ مسلمان یا کافر) بھی عفو و درگذر کی درخواست کرے تو وہ فوراً اسے خندہ پیشانی سے قبول کرلے کیونکہ اللہ احکم الحاکمین کا ارشاد ہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (اعراف : ۱۹۹)

ترجمہ : نرمی و درگذر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔

اور بندۂ مومن کی اللہ تعالیٰ نے یہ صفت بیان فرمائی ہے۔

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (آل عمران : ۱۳۴)

ترجمہ : جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ایسے نیک لوگوں کو اللہ تعالیٰ بہت پسند کرتا ہے۔

مزید ارشاد ہوا۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (الشوریٰ : ۴۳)

ترجمہ : اور جو شخص صبر سے کام لے اور درگذر کرے تو یہ بڑے اولو العزمی کے کاموں میں سے ہے۔

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو معاف کرنا اپنی طرف سے معافی کا ذریعہ اور سبب قرار دیا ہے۔

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النور : ۲۲)

ترجمہ : انہیں معاف کر دینا چاہیئے اور درگذر کرنا چاہیئے کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے۔

سنتِ مطہرہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ معاف کر دینا، درگذر کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں انتہائی پسندیدہ ہے اور رفع درجات کا موجب ہے۔

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے۔ کہ انکساری سے کام لوں۔ تم میں سے کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے اور نہ کوئی کسی پر فخر جتائے۔ (مسلم)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ تھی کہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا البتہ حدود اللہ کی خلاف ورزی پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ضرور سزا دی ہے (بخاری مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "صدقہ سے مال

کم نہیں ہوتا، بندہ اگر معاف کرے تو اللہ تعالیٰ اسے مقام عزت عطا کرتا ہے اور جس نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے انکساری کی اللہ تعالیٰ اس کا مقام بلند فرماتا ہے (مسلم)

اسی معنی کی حدیث متعدد کتب میں موجود ہے۔

غیبت کی جائز شکلیں

خاتم المرسلین سید الاولین والآخرین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کے مطالعہ سے مندرجہ قانون وقاعدہ سمجھ میں آتا ہے۔

کہ غیبت صرف اس صورت میں جائز ہے جب شرعاً اس کی ضرورت ہو اور واقعۃً یہ ضرورت اس کے بغیر پوری نہ ہوسکتی ہو۔ لہٰذا محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل شکلیں جائز قرار دی ہیں۔

۱۔ مظلوم اپنی شکایات ظالم کے خلاف عدالت یا حاکم کے سامنے پیش کرے۔

۲۔ بغرض اصلاح کسی فرد یا ادارے کی شکایات کسی فرد یا ادارے کو کرے جو اس کی اصلاح کرسکتا ہو۔

۳۔ مفتی کے سامنے بغرض فتویٰ صورت مسئلہ پیش کرے۔

۴۔ مسلمانوں کو شر سے محفوظ کرنے کے لیے حدیث کے راویوں، مقدمہ کے گواہوں یا اہل تصنیف و تالیف کی کمزوریوں سے آگاہ کرے۔ اسی طرح رشتے ناطے کے مشورے، کاروباری معاملے، امانتوں کے بارے میں احتیاط کی خاطر کسی کے بارے میں نامناسب بات کرنا بھی شامل ہے۔

۵۔ ان لوگوں کے خلاف آواز بلند کرنا جو فسق و بدعت علی الاعلان کررہے ہوں اور ان کی وجہ سے معاشرے کا دینی معیار تباہ ہورہا ہو۔

۶۔ افراد کا ایسا نام لینا جن سے وہ مشہور ہوں اگرچہ الفاظ نامناسب ہی کیوں نہ ہوں جیسے اعمی (اندھا) اعمش (بھینگا)، اعرج (لنگڑا) وغیرہ وغیرہ۔

جن احادیث کو بنیاد بناکر محدثین کرام نے قاعدے وضع کیے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا آنے دو مگر قوم کا بدترین فرد ہے۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ فلاں فلاں آدمی ہمارے دین کو بالکل نہیں سمجھتے (بخاری)

۳۔ حضرت فاطمہ بنت قیس کہتی ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ ابوالجہم، اور معاویہ رضی اللہ عنہما نے مجھے پیغام نکاح بھیجا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، معاویہ رضی اللہ عنہ غریب آدمی ہے اور ابوالجہم رضی اللہ عنہ کی لاٹھی ہمیشہ کندھے پر ہوتی ہے (بہت مارتا ہے۔ یا بہت سفر کرتا ہے)

۹۔۔۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ ابو سفیان کی اہلیہ "ہند" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور کہا ابو سفیان بخیل آدمی ہے۔ وہ اتنا خرچ نہیں دیتا جو مجھے اور میری اولاد کو پورا ہو۔ "یہ کہ از خود بلا اطلاع لے لوں۔ آپ نے فرمایا مناسب طریقے سے جتنا تجھے اور تیری اولاد کو پورا ہو لے لیا کر۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین) (بخاری، مسلم)

مدین النصیحۃ

غیبت کا باعث عام طور پر کسی بھائی سے ذاتی رنجش یا اس کی شرعی خلاف ورزی کی بنا پر دینی حمیت ہوتی ہے۔ لہٰذا بجائے اس بھائی کی غلطی کو نامناسب طریقے سے اچھالنے کے (جس سے غلطی اور برائی کو تشہیر بھی ملے اور بھائی کی عزت بھی جائے) مناسب اور بہتر یہ ہے کہ اس مسلمان بھائی سے براہ راست رابطہ قائم کر کے اس سے وضاحت طلب کر لی جائے اگر کسی کو غلط فہمی ہو گی تو ازالہ ہو جائے گا۔ اور اگر واقعۃً اس سے خطا سرزد ہوئی ہے تو اس کو بہتر اور مناسب طریقے سے توجہ دلائی جائے۔ وہ یقیناً اس پر شرمسار ہو گا۔ اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معذرت چاہے گا۔ اور اگر کسی وجہ سے اس سے رابطہ ناممکن ہو تو کسی دوسرے صاحب اثر مسلمان بھائی کے ذریعے اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ خیر خواہی کا بھی یہی تقاضا ہے۔ خیر القرون سے دو مثالیں برائے غور حاضر خدمت ہیں۔ خالی الذہن ہو کر ان پر غور فرمائیں۔

حضرت ابو الدرداءؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے درمیان کسی بات پر تکرار ہو گئی۔ حضرت عمر، ابوبکر سے ناراض ہو کر چلے گئے۔ حضرت ابوبکر ان کے پیچھے معذرت کے ارادے سے گئے۔ لیکن انہوں نے معذرت قبول نہ کی بلکہ دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت ابو الدرداء کا بیان ہے کہ ہم اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے حضرت ابوبکر کو دیکھتے ہی کہا کہ "تمہارا یہ ساتھی نیکی میں آگے بڑھ گیا ہے" حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے کیے پر شرمساری ہوئی۔ وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اسلام کیا اور آپ کے پاس بیٹھ کر سارا واقعہ سنایا۔ حضرت ابو الدرداء کہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصے میں آ گئے جبکہ حضرت ابوبکر مسلسل یہ کہے جا رہے تھے۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ بخدا قصور میرا زیادہ ہے۔ آپ نے تکرار فرمایا "کیا تم میرے ساتھی سے درگذر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس نے میرا اس وقت ساتھ دیا جب تم نے جھٹلایا تھا۔ الخ (رضی اللہ عنہم اجمعین) (بخاری، کتاب التفسیر)

حضرت عثمان ؓ بیان فرماتے ہیں کہ جب آں جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو سب صحابہ کو شدید صدمہ ہوا۔ حتیٰ کہ بعض تو بالکل پریشان حال ہو گئے۔ میرا حال بھی یہی تھا، میں اسی حال میں تھا

کہ حضرت عمر گزرے اور سلام کیا جس کی مجھے قطعاً خبر نہ ہوئی چنانچہ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کے پاس شکایت کی پھر وہ دونوں میرے پاس آئے اور سلام کیا، حضرت ابوبکر نے کہا کیا بات تھی؟ کہ تم نے اپنے بھائی عمر کے سلام کا جواب نہیں دیا، میں نے کہا، میں نے تو ایسا نہیں کیا۔ حضرت عمر نے جواباً کہا، بخدا تم نے ایسا ہی کیا ہے حضرت عثمان کہتے ہیں، میں نے کہا مجھے آپ کے گزرنے اور سلام کرنے کی قطعاً خبر نہیں، حضرت ابوبکر نے کہا عثمان سچ کہتا ہے۔ ہاں تجھے اس اہم معاملے (وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم) نے بے خبر کر دیا تھا۔
(مشکوٰۃ بحوالہ مسند الامام احمد)

آخری گذارش

قارئین کرام:- اس ساری بحث میں کوشش صرف یہی کی گئی ہے کہ صرف آیات مبارکہ اور سنت ثابتہ کو من وعن بلا تبصرہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ اقوال وغیرہ سے دانستہ اعراض کیا۔ تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح اور قابل اعتماد سنت آپ کے سامنے آجائے۔ اور آپ علیٰ وجہ البصیرہ اس پر صدق دل سے عمل کر سکیں۔ امید ہے کہ آپ اس پر غور کر کے فیصلہ کریں گے کہ موجودہ رویہ بہتر ہے یا کہ سنت کے مطابق عمل کرتے ہوئے غیبت کو ترک کرنا۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

پروردگار: ہمیں دنیا اور آخرت میں بھلائی عطا فرما، اور آگ کی سزا سے محفوظ کر دے۔

اعتذار

گذشتہ ماہ (جون) کے میثاق میں ابا جان کے "دورۂ ہند" پر مشتمل راقم کی ایک مفصل روداد شائع ہوئی تھی جس پر کراچی سے ہمارے ایک قابلِ احترام قاری نے "اغلاط نامہ" مرتب کر کے راقم کو ارسال کیا تھا — راقم اُن کا شکریہ ادا کرتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ وہ آئندہ بھی میثاق کی تحریروں کے ضمن میں اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہیں گے۔ البتہ چند مُو ایسے ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے — اوّلاً: حیدر آباد دکن میں ابا جان کا ایک خطاب "اعزہ اسکول" کے میدان میں تھا جس کو راقم نے "عیضاء" اسکول لکھا تھا۔ اہل حیدر آباد میں ابا جان کے خطابات کے ضمن میں جو کارڈ انہوں نے تقسیم کئے تھے اُن پر "عیضاء" اسکول ہی تحریر تھا — ثانیاً: بعض غلطیاں ایسی بھی تھیں جنکی پروف ریڈنگ کرتے ہوئے راقم نے نشان دہی کر بھی دی تھی، بعض اسباب کی وجہ سے اُنکی تصحیح رہ گئی — ثالثاً: حیدر آبادی حضرات کے 'ق' کو 'خ' تلفظ کرنے کا جو ذکر راقم نے کیا تھا، اُس سے کسی درجے میں بھی اُن کا استہزاء مقصود نہیں تھا بلکہ ایک واقعہ کا بیان تھا — راقم کو پوری اُمید ہے کہ ہمارے حیدر آبادی بزرگوں اور بھائیوں نے اُس کا "اتنا بُرا" منایا ہوگا —!!

درسِ حدیث

ڈاکٹر عبدالسمیع

حدیث ۱

إنما الاعمال بالنیات و — "بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر
انما لکل امرئ ما نوای — ہے اور یقیناً ہر شخص وہی
کچھ پائے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو بہت سے محدثین نے ایمان و اسلام کی اصل بنیاد قرار دیتے ہوئے اپنے مرتب کردہ مجموعہ ہائے احادیث میں پہلے نمبر پر رکھا ہے اس حدیث کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو بہت سے اصحاب رسول نے بیان کیا مگر جہاں اکثر احادیث اگر مختلف لوگ بیان کریں تو مفہوم کے مشترک ہونے کے باوجود الفاظ کا کچھ نہ کچھ فرق رہ ہی جاتا ہے جس طرح ایک واقعہ بہت سے لوگوں نے دیکھا اس واقعے اور اس کے دوران ہونے والی گفتگو کو ہر شخص اپنے الفاظ میں بیان کریگا یہی معاملہ اکثر احادیث کا ہے لیکن یہ حدیث ان چند احادیث میں سے ہے جس کو بیان کرنے والے بھی سینکڑوں لوگ ہیں مگر اس کے الفاظ بھی تمام روایات میں ایک ہی ہیں۔ فنِ حدیث کی اصطلاح میں ایسی حدیث کو "متواتر لفظی" کہتے ہیں۔

اس ارشادِ نبوی کے اندر سب سے پہلی بات تو یہ نوٹ کرنے کی ہے۔ کہ 'لکل امرئ ما نوای' میں "کل" سے پہلے جو "ل" آئی ہے وہ اشارہ کر رہی ہے کہ کسی شخص کے حق میں جو انعام آتے گا اس سے معلوم ہوا کہ پہلے حصے میں جن اعمال کا تذکرہ ہے وہ نیک اعمال ہی ہیں جبکہ نیک نیتی کے ساتھ

بُرائی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ البتہ بھول چوک میں کی گئی برائی اس کے تحت آسکتی ہے کہ اس برائی کا اخلاقی نتیجہ جو آخرت میں ظاہر ہونا چاہیئے وہ زائل کردیا جائے گا جبکہ دنیا میں اس بُرائی کا اثر بہرحال ظاہر ہوکر ہی رہے گا مثلاً اگر کوئی شخص غلطی سے کسی پرندے کا شکار کرتا ہوا انسان پہ فائر کر بیٹھے تو اس کی غلطی کا لحاظ کرتے ہوئے آخرت کی سزا تو معاف ہوسکتی ہے مگر گولی اپنا طبعی اثر تو دکھا کر رہے گی یعنی کسی کو زخمی کرنا یا قتل کرنا وغیرہ علاوہ ازیں اور بھی بُرائیاں توبۃ النصوح کے ذریعہ معاف ہوسکیں گی۔

نیک اعمال کے سلسلے میں یہ حدیث بلاشبہ بہت بنیادی ہے کہ ایک عمل بظاہر کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو لیکن اگر اس سے مقصود اللہ کی رضا جوئی اور اللہ کی فرمانبرداری اور آخرت کا اجر نہ ہو تو وہ عمل دنیوی شہرت یا اس طرح کا کوئی دنیوی فائدہ تو شائد دے سکے مگر آخرت کے دن اللہ کے ترازو میں کوئی وزن نہ پائے گا۔

اس حدیث سے مطلوب اعمال میں خلوص پیدا کرنا ہے۔ خلوص کے معنی خالص ہونے کے ہیں اور خالص کا اطلاق اسی چیز پر ہوتا ہے جو سو فیصد خالص ہو۔ علامہ اقبال نے ٹیپو سلطان پر اپنی مشہور نظم میں فرمایا تھا۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

لہٰذا اللہ کو خوش کرنے کی بجائے انسانوں سے داد لینے کی خاطر سخاوت، اللہ کے راستے میں جنگ اور قرآن مجید کو پڑھنے پڑھانے جیسے بہترین اعمال بھی حضورؐ کے ایک اور فرمان کے مطابق قیامت کے دن بیکار ثابت ہوں گے۔ اللہ جب اپنے ان بندوں سے اپنے احسان جتلا کر یہ پوچھے گا کہ تم کیا کرکے لائے ہو تو سخی اپنی سخاوت، شہید فی سبیل اللہ اپنی قربانی اور قاری و عالم قرآن اپنی خدمت کا حوالہ دے گا۔ جس پر پروردگار کہے گا تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم نے یہ کچھ اس لئے کیا تھا کہ لوگ تمہیں "سخی" "بہادر" یا "قاری اور عالم" کہیں۔ تو وہ دنیا میں کہا جاچکا اب یہاں تمہارے لئے کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا انہیں اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائیگا یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اخلاصِ نیت کا بنیادی تقاضا اللہ کی فرمانبرداری ہے۔

بذا حکم معلوم ہو جانے کے بعد اس حکم کو بجا لانا نہ چاہتے ہوئے بھی ضروری ہوگا۔
بس بنیادی نیت کے صحیح ہونے کے بعد اگر اضافی طور پر انسان کے اندر یہ خیال
پیدا ہو کہ لوگوں میں شہرت بھی ہوگی تو کوئی مضائقہ نہیں بس انسان اس خیال
کو حتی الامکان دل میں جگہ نہ دے اور اس کو کسی بھی صورت اصل محرکِ عمل نہ بننے
دے ۔اس خیال کی نفی کرنے کی غرض سے نیکیوں کو ترک کرنا کسی صورت روا نہیں
بلکہ فرائض کی بجا آوری سرِ عام کرنا اور نوافل کی ادائیگی چھپ چھپ کرنا مشکور ہوگی۔
تنہائی میں چھپ کر ادا کئے گئے نوافل ان شاء اللہ فرائض میں خلوص کی کمی کی تلافی
کا سبب بنیں گے اور فاسد خیالات رفتہ رفتہ کم ہوتے چلے جائیں گے۔

حدیث ۲

بنی الاسلام علی خمس	اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے
شہادۃ ان لا الہ الا	اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے
اللہ وان محمدا رسول اللہ	سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور یہ کہ
واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ	محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول
وحج البیت وصوم رمضان	ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ

ادا کرنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا“

اس حدیث مبارکہ میں حضور ؐ نے اسلام کی پانچ بنیادوں کا تذکرہ کیا ہے۔
ایک اور حدیث میں ان پانچ میں سے ایک یعنی ”نماز“ کو دین کا ستون قرار دیا ہے اس
سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور ؐ کے نزدیک دین اسلام کی مثال ایک عمارت کی سی ہے۔
جس کی پانچ بنیادوں میں چار کی حیثیت ستونوں کی ہے اور ایک یعنی ایمان
(اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب) کی حیثیت معروف معنوں میں
عمارت کی بنیاد کی ہے۔

ایمان / بنیاد

کسی عمارت کی بنیاد کے بھی دو حصے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو
زمین کھود کر رکھی جاتی ہے اور بنیاد کا دوسرا حصہ جو زمین سے
باہر نظر بھی آتا ہے جسے جدید تعمیر میں (PLINTH) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے

اوّل الذکر اسلام کی پیش نظر عمارت میں تصدیق قلبی یا دل سے مان لینے کی مثال ہے جبکہ مؤخر الذکر یعنی ..... اقرار باللسان یعنی زبانی اقرار کی۔

عبادات/ارکان

اسلام کی اس عمارت میں ارکان اور ستونوں کی حیثیت حاصل ہے ان چار عبادات کو جن کو اکثر و بیشتر کل اسلام سمجھ لیا جاتا ہے جو انتہائی نامعقول روش ہے۔ چونکہ کسی عمارت کی بنیاد اور ستونوں کی اہمیت کا انکار تو ممکن ہی نہیں ہے لیکن ان کو مطلوب اور مقصود کبھی نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی ستونوں اور بنیاد کو عمارت کہا جاتا ہے البتہ بنیاد جتنی گہری ہوگی اور بنیاد اور ستون جس قدر مضبوط ہوں گے عمارت اور اس کی منزلیں اسی قدر مضبوط اور دیرپا ہوں گی۔

اگر کوئی عمارت بغیر بنیاد کے کھڑی کردی جائے یا اس کی بنیاد زیادہ گہری نہ ہو یا اس کے ستون اور بنیاد ناپختہ ہوں تو کون نہیں جانتا کہ ذرا سی تیز آندھی، شدید بارش اور معمولی زلزلہ بھی اس عمارت کو زمین بوس کردے گا۔ لہٰذا اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کی بنیاد یعنی ایمان اگر سطحی (یعنی زبانی اقرار) ہو یا کمزور ہو اسی طرح اس کے ستون یعنی نماز روزہ حج اور زکوٰۃ اگر مضبوطی سے کھڑے نہ کئے گئے ہوں تو ایسی عمارت دین کے راستے میں آنے والے مصائب کی ایک آندھی اور جان و مال کے نقصان کی دھمکی زلزلے کی شکل میں ایک ہی جھٹکے سے زمین پر آرہے گی۔

اسلام کے تین تقاضے

تین منزلیں: قرآن و سنت کی روشنی میں دین اسلام کے تین تقاضے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

(i) عبادت رب:- اللہ کی غلامی کو اختیار کرنا اور اللہ اور رسول کے تمام احکام کو بجالانا۔

(ii) دعوتِ دین:- دوسروں تک اللہ کے پیغام کو پہنچانا اور اللہ کا بندہ بننے کی دعوت دینا۔

(iii) اقامتِ دین:- دین کو قائم کرنا۔ اسلام کو دنیا میں غالب کرنا۔

اسلام کے پیش نظر نقشے میں ان تینوں مطالبوں کو تین چھتوں کی صورت میں دکھایا
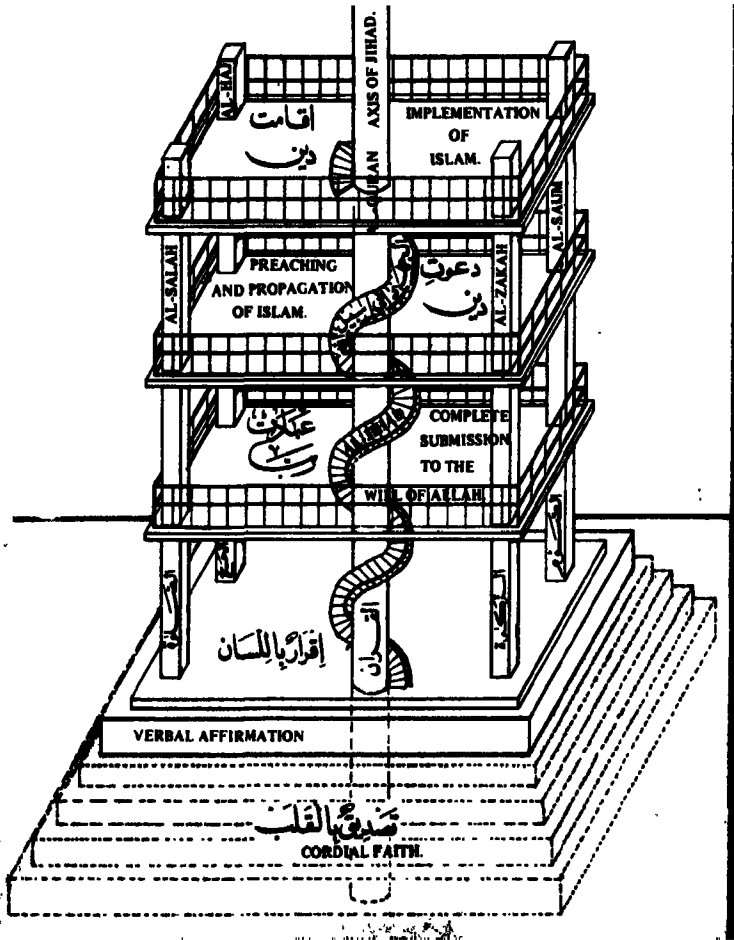
فرائض دینی کا خاکہ

کیا ہے ۔۔۔ ان تینوں میں پہلا مطالبہ جسے پہلی چھت کی حیثیت حاصل ہے عبادتِ رب ہے یہ ایمان کا اولین تقاضا ہے یعنی ایمان کی صورت میں جس ہستی کو اپنا خالق و مالک اور پالنے والا مانا ہے اُس کے احکامات کو مانا جائے اور اسکی بلا چون چرا پوری زندگی میں اطاعت کی جائے اس کے احکام جو اس کے رسول کی وساطت سے ہم تک پہنچے ہیں ان کو بجالایا جائے اگرچہ وہ نفس کو ناپسند ہی کیوں نہ ہوں خواہ کسی

خاص وقت میں دل ان پر آمادہ نہ ہو بلکہ "نوکر کی تے نخرہ کی" کے مصداق مالک کا ہر حکم ایک مخلص نوکر کی طرح مانا جائے۔

اسلام کا دوسرا تقاضا جسے دوسری چھت سے دکھایا گیا ہے، دوسروں کو اللہ کا بندہ بننے کی دعوت ہے۔ یہ بھی ایمان کا تقاضا ہے چونکہ ایمان صرف اللہ کو اپنا مالک رب ماننے پر نہیں، تمام مخلوقات کا خالق و مالک ماننے پر لایا گیا تھا لیکن بالفعل چاند سورج زمین ہوائیں پودے پرندے چرند تو اس کا حکم مانتے نظر آتے ہیں مگر انسان اس کا نافرمان ہے جبکہ یہ بھی اس کا دیا ہوا رزق کھاتا اور اسی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس سطح پر بندگی کی یہ دعوت افراد کو ذاتی سطح پر ہوگی بغیر دباؤ کے ہوگی یعنی یہ کہ لوگوں کو اپنی آمادگی سے بندگیٔ رب کو اختیار کرنے کی دعوت دی جائے گی۔

اسلام کا تیسرا تقاضا اقامتِ دین ہے یعنی اللہ کی زمین پر اللہ کے احکام کو نافذ کرنا جہاں دوسری سطح پر افراد کو کھلی اجازت تھی کہ وہ چاہیں تو اللہ کو مانیں اور چاہیں تو انکار کریں وہاں اس سطح پر مذکورہ بالا اجازت کے ساتھ ساتھ ان دوسرے افراد کو اسلام میں رکاوٹ کی اجازت نہیں ہوگی یعنی ملک کا قانون اسلام ہی کا ہوگا بالفاظِ دیگر ( ) کی حد تک ہر شخص کو اپنے اپنے مذہب پر رہنے کی اجازت ہوگی جبکہ ( ) اللہ ہی کا ہوگا۔

سیڑھی / جہاد اسلام کی اس عمارت پہ چڑھنے کے لئے جس سیڑھی کی ضرورت پڑتی ہے (جو اس نقشے میں گول سیڑھی کی شکل میں دکھائی گئی ہے) وہ "جہاد" ہے۔ جہاد کا لفظ جہد (کوشش) سے نکلا ہے اور جہاد کے معنی ہیں کسی مخالف قوت کے ساتھ کشمکش کرنا۔ یہ کشمکش ہر سطح پر مطلوب ہوگی۔ پہلی منزل پر چڑھنے کے لئے بھی انسان کو ایک طرف اپنے نفس کے حیوانی تقاضوں اور شیطان سے کشمکش کرنی ہوگی تو دوسری طرف معاشرے کے ساتھ چومکھی جنگ لڑنا ہوگی۔ اسی طرح دوسری منزل یعنی دعوت دین کا فریضہ انجام دینے کیلئے معاشرے کے تمام باطل نظریات کے خلاف جہاد کرنا پڑے گا اور دعوت دین کے لئے ارشاد ربانی "اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ"

کے مصداق دعوتِ دین کو دلنشین واعظانہ پیرائے میں بھی عوام کے سامنے رکھنا پڑے گا۔ اور معاشرے کے ذہین افراد کے سامنے حکمت و دانائی کے ساتھ پیش کرنا ہوگا اور عوام الناس کے اوپر سے باطل نظریات کی مرعوبیت کو ختم کرنے کے لئے بحث مباحثے کے میدان میں بھی دعوت کے مخالفین کو زیر کرنا پڑے گا اور تیسری منزل پر چڑھنے کے لئے یعنی اللہ کے دین کو دنیا میں قائم کرنے کے لئے یہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی شکل (یعنی اللہ کے راستے میں جنگ) اختیار کرے گا لہذا باطل قوتوں اور اللہ کے دین کے قیام میں رکاوٹ بننے والے افراد سے نبٹنے کے لئے سیف بدست میدان میں آنا پڑے گا اور آگ اور خون کی دشوار وادی سے گذر کر ہی یہ فرض ادا ہو پائے گا چونکہ وہ لوگ جن کا VESTED INTEREST سابقہ باطل نظام میں ہوگا وہ کبھی اسلام کے غلبہ کو پسند نہیں کریں گے۔ لہٰذا وہ مدافعت کریں گے اور ان کو کچلے بغیر بات نہیں بنے گی۔

سیڑھی کا محور / قرآن مجید

یہ اسلام کی اس عمارت کا مرکزی وجود ہے۔ یہ آسمان سے نازل ہو کر انسان کے دل میں اتر جاتا ہے تو دل میں ایمان کی تخم ریزی ہوتی ہے اور ایمان دل میں جڑ پکڑتا ہے جتنی گہری جڑ یہ پکڑے گا اور دل سے شکوک و شبہات کے کانٹے نکل جائیں گے اتنا ہی مضبوط جذبۂ جہاد انسان کے دل میں پیدا ہوگا اور اس سارے جہاد کے لئے مرکز و محور کی حیثیت بھی اسی قرآن کو حاصل رہے گی یہ قرآن اللہ سے رابطہ اور اس کا کلام ہونے کی وجہ سے اللہ کے ساتھ اس کے بندے کے لئے ہم کلام ہونے کا ذریعہ بنے گا۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس اور شیطان کے حملوں سے بچاؤ کے لئے بھی انسان کے پاس سہارا قرآن مجید ہی ہے۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (سورۃ البقرہ)

اسی طرح اللہ کی بندگی کی دعوت کا بہترین ذریعہ بھی قرآن کے پیغام کو عام کرنا ہے اور آخری مرحلے کی مشکلات و مصائب میں انسان کا واحد سہارا اللہ ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے قرآن کی کثرت کے ساتھ تلاوت کا حکم دیا گیا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

ٹینٹ اور ترپال
بنانے کا ممتاز ادارہ
ایچ
نظام دین
اینڈ سنز
مرکزی دفتر
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

(آخری قسط)

عورت
اور
اسلامی معاشرہ

احمد افضال ________

سورۂ احزاب میں ارشادِ الٰہی ہے:

"اپنے گھروں میں ٹک کر رہو۔" (آیت۔ ۳۳)

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"عورت مستور رہنے کے قابل چیز ہے۔ جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے اور اللہ کی رحمت سے قریب تر وہ اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے گھر میں ہو۔"[1]

ایک اور حدیث میں ہے:

"عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے اور وہ اپنی رعیت کے لئے جواب دہ ہے۔"[2]

معلوم ہوا کہ عورت کا دائرۂ کار اس کا گھر ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں کے فرائض بالکل جدا اور علیحدہ ہیں۔ دونوں کی جسمانی اور ذہنی ساخت اور صلاحیتیں مختلف ہیں۔ مزاجی و عقلی اعتبار سے دونوں کی پختگی اور رخامی بھی ظاہر ہے۔ عورت کو نرم مزاج، لطیف جذبات، شیرینی اور نزاکت دی گئی ہے۔ جبکہ مرد کو مضبوط جسمانی اور دماغی اعصاب، جذبات سے زیادہ عقل سے کام لینے کی صلاحیت اور شدائد (جنگی یا کاروباری مصائب) کا مقابلہ کرنے والی فطرت عطا کی گئی ہے۔ عورت کی ساخت میں قدرتی طور پر جمنے اور ٹھہرنے کے بجائے جھکنے اور ڈھل جانے کی خاصیت ہے۔ جبکہ مرد کی فطرت میں شدت، سخت گیری، سرد مزاجی، تحکم اور مزاحمت ہے۔ عورت کی فطرت گریز اور فرار سے عبارت ہے۔ جبکہ مرد کی

---

[1] ترمذی

[2] بخاری

فطرت میں اقدام اور جسارت ہے۔ درحقیقت دونوں صنفوں کی قوتوں اور صلاحیتوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کس صنف کو کس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

عورت اپنی رائے، عقل، مزاج اور ظاہری و باطنی ساخت کے لحاظ سے صاحبِ عقل مرد اور بے عقل بچّے کے درمیان کی کڑی ہے۔ اگر فطری قانون میں بالغ اور بچّے کے عمل کی حدود جدا جدا ہیں تو عورت اور مرد کے فرائض بھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ یہ درست ہے کہ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو ذہنی اور عقلی صلاحیتوں کے اعتبار سے مردوں کی ہم پلہ ہوتی ہیں اور ایسے مرد بھی ہوتے ہیں جو جذبات کے اعتبار سے عورتوں جیسے ہوں۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ قانون اور ضابطے اکثریت کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ استثناء اپنا کلیہ نہیں بناتے بلکہ دوسرے کلیات کو ثابت کرتے ہیں۔ مرد اور عورت کے دائرہ ہائے کار کا تعین اکثریت کے مزاج اور اکثریت کی صلاحیتوں کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔ اور کرنے والا خود خالقِ کائنات ہے جس کے علم اور جس کی حکمت پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ ہم اور آپ لوگوں کی صلاحیتوں کا تعین زیادہ بہتر انداز میں کر سکتے ہیں یا وہ ہستی جس نے ہم سب کو تخلیق کیا ہے؟

"کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے! حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے؟"

(الملک - ۱۴)

پس معلوم ہوا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ سب کا خالق ہے اور سب کی کمزوریوں اور صلاحیتوں کو بھی جانتا ہے۔ لہٰذا اس بات کا فیصلہ کرنے کا حق بھی اسی کو ہے کہ کس کا دائرۂ کار کیا ہو؟ ہمارا فرض تو یہ ہے کہ اس کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیں ـــــ

اسلام اور فطرت نے عورت پر جو فرائض عائد کئے ہیں، وہ اس قدر اہم ہیں کہ انہیں غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دینا نہایت خطرناک غلطی ہے۔ عورت کے فرائض اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ وہ اگر ان کی طرف کما حقہٗ توجہ دے تو اسے کسی دوسری سرگرمی کی جانب دیکھنے کا وقت بھی نہ ملے۔ ملک کی ترقی کے لئے جتنی ضرورت اچھے سائنسدانوں، منتظموں، سپہ سالاروں اور سیاستدانوں کی ہے اتنی ہی ضرورت اچھی ماؤں اور اچھی بیویوں کی بھی ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عورت بیرونِ خانہ سرگرمیوں میں الجھ کر بھی بچوں کی درست پرورش اور صحیح نگہداشت کر سکتی ہے وہ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ نوعِ انسانی کی تکثیر اور حفاظت کے لئے فطرت نے چار ادوار مقرر کئے ہیں حمل، وضعِ حمل، رضاعت اور تربیت۔ ان میں سے ہر دور عورت کی زندگی کا انتہائی مشکل دور

ہے جس سے غفلت برتنا نہ صرف اس کے لیئے بلکہ بچے کے لئے بھی مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ نسلِ انسانی کی فلاح کے نقطۂ نظر سے ان میں سب سے اہم دور تربیت کا زمانہ ہے۔ بچہ جب عالمِ غیب سے دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کا ذہن ایک ایسی تختی کی مانند ہوتا ہے جو ہر قسم کی تحریر لکھے جانے پر آمادہ ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں جو بات بھی اسے سکھائی جائے وہ نقش کالحجر ہو جاتی ہے۔ ماں کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اچھی تربیت دے اُسے بھلے بُرے کی تمیز سکھائے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ماں جسے معاشی اور سیاسی سرگرمیوں سے فرصت نہ ملتی ہو، اپنی اولاد کی درست تربیت نہیں کر سکتی۔

اسلام نے معاشرتی اور عائلی زندگی میں ماں کو مرکزی مقام دیا ہے۔ ماں اپنے بچوں کی تربیت کے ذریعے سارے معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ اگر پردے میں رہے تو اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اسے عضوِ معطّل بنا دیا گیا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہونے کے باوجود سارے کارگاہِ عالم کو چلا رہا ہے۔ اسی طرح عورت بھی چار دیواری میں محدود اور مستور ہونے کے باوجود اپنے فرائض انجام دے سکتی ہے اور ملک و ملّت کی تعمیر و ترقی میں اپنا حصّہ ادا کر سکتی ہے۔

جہاں تابی ز نورِ حق بیاموز کہ او با صد تجلّی در حجاب است

درحقیقت عورت کا اصل رُوپ اور اس کی اصل معراج اُس کا ماں ہونا ہے۔ عورت کا فرض فیکٹریوں میں اشیاء کی پیداوار نہیں ہے بلکہ انسانیت سازی ہے۔ وہ نوعِ انسانی کی تکثیر اور اس کی حفاظت و تربیت کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اسی میں اس کی عظمت ہے۔ رابعہ بصریؒ سے کسی نے طنزاً کہا کہ عورتیں نبی نہیں بنتیں۔ آپؒ نے جواب دیا "صحیح ہے۔ ہم نبی نہیں بنتیں نبی جنا کرتی ہیں ـــــ"

یہ امر ناقابلِ تردید ہے کہ اقوام کا عروج ان کی ماؤں کے فیض کا نتیجہ ہوتا ہے اور درحقیقت مائیں ہی کسی قوم کی تقدیر کا فیصلہ کرتی ہیں ؎

خنک آں ملتے کز وارداتش
قیامت ہا بہ بیند کائناتش!
چہ پیش آید چہ پیش افتاد او را
تواں دید از جبین امہاتش

یاد رکھنا چاہیئے کہ عورت کا جسمانی نظام، ساخت، ذہنی صلاحیتیں اور جذبات واحسا
سب اس لئے ہیں کہ وہ ماں بنے۔ لہٰذا ہر وہ کام جو فریضۂ امومت کی راہ میں رکاوٹ ہو عور
پر ظلم کے مترادف ہے۔

پردہ

اسلامی معاشرے میں عورتوں اور مردوں کو آزادانہ میل جول کی اجازت نہیں۔ عور
گھر تک محدود رہنے کا حکم ہے۔ ضرورتاً باہر نکلے تو چادر میں مستور ہونا لازمی ہے۔ ان احک
بعض کم فہم لوگ دقیانوسیت، رجعت پرستی اور انتہاپسندی بتاتے ہیں لیکن ہمیں اسلام کے
اس کے پورے نظام سے الگ کر کے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ پردے کا لفظ جن احکامات پر
استعمال ہوتا ہے وہ خود دوسرے احکامات سے مربوط ہیں۔ ان سب احکام وضوابط کا ایک
مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک پاکیزہ اور صالح معاشرہ قائم کیا جائے جہاں مرد اور عور
اپنے فطری فرائض کی طرف متوجہ رہیں اور اجتماعی ماحول میں صنفی ہیجانات نہ پھیل سکیں
مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام نے جو ہدایات دی ہیں ان ہی کا ایک جزو "پردہ" ہے
پردے کی ضرورت اور اہمیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ بدکاری اور ا
محرکات کے انسداد کے لئے اسلام نے جو نظام دیا ہے وہ مربوط شکل میں سامنے ہو
اسلامی نظام معاشرت میں بے حیائی کی روک تھام کے لئے جو نظام وضع کیا گیا
کے تین حصے ہیں

۱۔ اصلاح باطن

۲۔ حدود و تعزیرات

۳۔ انسدادی تدابیر

(۱) **اصلاحِ باطن** | اسلام نے لوگوں کی باطنی اور قلبی حالت کو پاکیزہ رکھنے
یہ احکامات دیئے ہیں:

(الف) بے حیائیوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ کھلی ہوں یا پوشیدہ (الا

(ب) کہہ دو، میرے رب نے تمام بے حیائیوں کو حرام قرار دے دیا ہے خوا
ہوں یا خفیہ۔ (اعرا

(ب) حیاء سے صرف بھلائی پہنچتی ہے[1]۔
سب سے بُرا آدمی وہ ہے جس کی فحش گفتگو سے بچنے کے لئے لوگ اسے چھوڑ دیں ۔۔۔۔!![2]

(ج) شرم وحیا کی صفت مَردوں کے لئے بھی پسندیدہ ہے اور عورتوں کے لئے بھی۔
حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو مدین کے سفر میں دو دیہاتی لڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا۔
ان لڑکیوں کی جو خوبی قرآن میں درج کی گئی وہ حیاء ہے۔ فرمایا" تو ان دو لڑکیوں میں سے ایک شرماتی ہوئی ان کے پاس آئی" (قصص۔۲۴)
جنّت کی عورتوں کی ایک صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ شرمیلی نگاہوں والی ہونگی[3]۔
حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق صحابہؓ کہتے ہیں کہ آپ کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے[4]۔

(د) زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یہ بے حیائی ہے اور بہت بُرا راستہ ہے (بنی اسرائیل۔۳۲)
کوئی بندہ اس حال میں زنا نہیں کرتا کہ وہ مومن بھی ہو۔ (حدیث[5])

(ہ) اسلام نے عصمت وعفّت کو خاص اہمیت دی ہے۔ پاکبازی اللہ کے پیغمبروں کی صفت ہے۔ حضرت یوسف علیہ السّلام نے جس ضبطِ نفس اور پاکبازی کا مظاہرہ کیا، اس کی گواہی خود عزیزِ مصر کی بیوی نے دی" اور میں نے اس کو چاہا تو وہ بچا رہا" (یوسف۔ ۳۲) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس لئے ہوا" تاکہ ہم اس سے بدی اور بےحیائی کو دور کردیں۔ درحقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا (یوسف۔ ۲۴)

(۲) حدود وتعزیرات — اسلام نے زنا اور قذف کے لئے باقاعدہ سزائیں مقرر کی ہیں۔ فرمایا:

"تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو" (نساء۔ ۱۵)

جرم ثابت ہونے پر زانی مرد اور زانی عورت، ان میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو (نور۔۲)

---

[1] بخاری [2] بخاری [3] الرحمٰن [4] بخاری
[5] بروایت حضرت ابن عباسؓ

یہ سزا غیر شادی شدہ زانی کے لئے ہے۔ اگر ان میں سے کوئی شادی شدہ ہو تو اس کے لئے سنگساری کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ یہ سزائیں یقیناً سخت ہیں۔ مگر اسلام چند افراد کو سخت سزا دیکر لاکھوں کو بے شمار تمدنی، اخلاقی اور عمرانی مفرتوں سے بچانا چاہتا ہے۔

قذف (زنا کی جھوٹی تہمت لگانا) کے مجرم کے لئے دو سزائیں ہیں:

(۱) اسّی کوڑے مارے جائیں۔

(۲) آئندہ ان کی گواہی قبول نہ کی جائے۔[۱]

اگر شوہر اپنی بیوی پر الزام لگائے یا اس کے بچے کو اپنا تسلیم کرنے سے انکار کردے تو اس کے "لعان" کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ یعنی شوہر اور بیوی عدالت کے سامنے پیش ہوں۔ قاضی پہلے دونوں کو موقع دے گا کہ اپنے قصور کا اعتراف کرلیں۔ جب دونوں اپنی سچائی پر اصرار کریں تو لعان کرا دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے:

"اور جو لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کا الزام لگائیں اور اپنے سوا اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو ایسے شخص کی گواہی یہ ہے کہ وہ چار بار اللہ کی قسم کھاکر کہے کہ وہ سچا ہے اور پانچویں بار قسم کھاکر کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ اور عورت سے سزا اس طرح ٹل جائے گی کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھاکر کہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور پانچویں بار قسم کھاکر کہے کہ اگر وہ سچا ہے تو اس (عورت) پر اللہ کا غضب ہو۔" (نور - ۶ تا ۹)

لعان کے بعد قاضی دونوں میں تفریق کرا دے گا اور پھر ان دونوں کا باہم نکاح نہ ہو سکے گا۔ بچہ، ماں سے منسوب ہوگا، باپ سے نہیں۔ لہٰذا لعان کے بعد کسی کو حق نہیں ہوگا کہ وہ عورت کو زانی کہے، اگر اس نے کہا تو قذف کی سزا مستحق ہوگی۔

(۳) **انسدادی تدابیر** | یہ تدابیر کئی طرح کی ہیں اور انہیں چند بڑے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

(۱) نکاح

(۲) گھر سے باہر کا پردہ

(۳) گھر کے اندر کا پردہ

---

[۱] سورۃ النور - ۴

(۴) مردوں کے لئے کچھ احکامات

(۱) **نکاح** اس سلسلے میں اسلام نے دو اہم کام کئے ہیں:
ایک یہ کہ نکاح کرنے کی ترغیب دی ہے اور دوسرے یہ کہ نکاح کو سماجی اور معاشی لحاظ سے آسان بنایا ہے:

اسلام کی رو سے انسانی تمدن کی بنیاد ایک مرد اور ایک عورت کی باہمی رفاقت سے وجود میں آتی ہے۔ اسلام نے انسان کے جنسی داعیہ کو نہ تو بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ جہاں چاہے اور جس طرح چاہے اپنا کام کرے، اور نہ اسے دبانے اور ختم کرنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ بعض مذاہب کی تعلیم ہے۔ بلکہ اس نے قوانینِ فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے اس داعیہ کے لئے حدود مقرر کئے ہیں تاکہ وہ اپنے دائرے کے اندر آزاد رہے۔ نہ تو اسے کچل دیا جائے اور نہ بے لگام کر دیا جائے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت پیدا کردی"

(روم - ۲۱)

اسلام نے اسے گوارا نہیں کیا ہے کہ معاشرے میں کوئی ایک مرد اور عورت صنفی خواہش رکھتے ہوئے بھی مجرّد رہ جائے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اے نوجوانو! تم میں سے جو شخص نکاح کی استطاعت رکھتا ہو اسے چاہیئے کہ نکاح کرلے کیونکہ نکاح غضِ بصر اور شرمگاہ کی حفاظت کا باعث ہے[۱]"

نیز آپ نے فرمایا:

"جب ایسا رشتہ آجائے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اس سے نکاح کردو ورنہ زمین میں بڑا فتنہ اور فساد برپا ہوگا[۲]"

ایک اور روایت میں ہے کہ تین چیزوں کو مؤخر نہیں کرنا چاہئے۔ ان میں سے ایک مجرّد عورت کا نکاح ہے جب کہ اس کی برابری کا رشتہ مل جائے[۳]

مسلمان کے لئے مناسب نہیں کہ رزق کی تنگی یا ذمّہ داریوں سے بچنے کے لئے نکاح نہ

۱؎ بخاری ۲؎ ترمذی ۳؎ ترمذی

کرے۔ بلکہ اسے کوشش کرنا چاہیئے اور خدا سے فضل واعانت کا امیدوار رہنا چاہیئے:
اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

"تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کا نکاح کردو۔ اگر وہ مفلس ہوں تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔

(نور - ۲۳)

نکاح کے فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا ہے کہ اگر کوئی غریب مسلمان کسی خاندانی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو تو مسلمان باندی ہی سے نکاح کرے[1] ان تمام افراد کو جن کے نکاح طلاق یا خلع یا تفریق کی وجہ سے فسخ ہو گئے ہوں، دوسرا نکاح کرنے کی غیر مشروط اجازت ہے۔ بیوہ عورتوں پر بھی نکاح ثانی کے لئے کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔

تعدد ازدواج: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ:

(۱) جنگوں وغیرہ میں مردوں کی بڑی تعداد ختم ہو جاتی ہے اور معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

(۲) کچھ لوگ ایک بیوی پر قناعت نہیں کر سکتے اور تھوڑے عرصے کے لئے بھی بیوی سے جدا رہنا ان کے لئے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ یہ افراد معاشرے میں صنفی انارکی پھیلانے لگتے ہیں۔

(۳) کبھی کبھی بیوی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوتی یا کسی دائمی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں شوہر اسے جدا کر دے گا اور کوئی دوسرا اس سے نکاح کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔

اوپر کی تینوں صورتوں کا حل اسلام میں یہ دیا گیا ہے کہ مرد ایک وقت میں چار نکاح کر سکتا ہے[2] اس اجازت سے یہ تینوں مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

(۱) اگر عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں بڑھ جائے اور ہر عورت کے لئے الگ مرد سے شادی کرنا ممکن نہ رہے تو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت عورتوں کی مشکل آسان کر دیتی ہے۔ اس طرح ہر عورت کو شوہر کا سہارا مل جاتا ہے۔

---

[1] نساء ۲۵ [2] نساء ۱۲۹

۲) جو شخص ایک بیوی پر قناعت نہیں کر سکتا، بجائے اس کے کہ وہ دائرۂ نکاح کے باہر آوارگی کرتا پھرے، اسے دوسرا نکاح کرنے کی اجازت ہے۔

۳) اگر بیوی اولاد پیدا نہیں کر سکتی یا دائمی مریضہ ہے تو اسے طلاق دے کر بے سہارا نہ چھوڑنا چاہیئے۔ اسے رکھتے ہوئے دوسرا نکاح کر لینا زیادہ بہتر ہے۔

تعدد ازدواج کی صورت میں شرط صرف ایک ہے اور وہ ہے عدل ـــ اللہ تعالیٰ ان نکاحوں کی اجازت دے کر فرماتا ہے:

"لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو" (نساء ۳)

عدل کا مطلب ہے، نفقہ اور معاشرت اور تعلقاتِ زن و شو میں برابری ـــ زبانی اور قلبی میلان میں عدل نہ تو ممکن ہے اور نہ اس کا حکم دیا گیا ہے۔ جو شے مطلوب ہے یہ ہے کہ

"ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو لٹکتا چھوڑ دو۔" (نساء ۱۲۹)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم معاشرتی لحاظ سے اپنی ازداج میں انصاف فرماتے تھے لیکن کہتے تھے"

'خدایا یہ میری تقسیم ہے۔ جہاں تک میرے بس میں ہے اور جو تیرے بس میں ہے اور میرے بس میں نہیں ہے اس پر گرفت نہ فرمانا۔' (یعنی اگر ایک بیوی سے میری قلبی رغبت زیادہ ہو تو یہ میرے بس میں نہیں ہے، اس پر میری گرفت نہ فرما۔)

اوپر کے مباحث سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے مرد اور ہر عورت کے نکاح کا انتظام کر دیا ہے۔ یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ اسلام میں نکاح کوئی مشکل اور پیچیدہ کام نہیں ہے۔ قرآن و سنت کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ شارع نے نکاح کو آسان بنایا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور قابل توجہ ہیں۔

(۱) چند بہت ہی قریبی رشتوں کو چھوڑ کر باقی تمام افراد سے نکاح جائز ہے۔ اس کے لئے ذات پات کے جھگڑوں میں پڑنا بھی غلط قرار دیا گیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

۱؎ اصحاب السنن

"نکاح میں لوگ عورت کے حسب ونسب کو، اس کے حُسن کو اور اس کی دولت کو دیکھتے ہیں۔ مگر تم مسلمانوں کو صرف اس کا دین اور اخلاق دیکھنا چاہیئے"[1]

زیادہ سے زیادہ جس بات کا لحاظ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی معاشرتی حیثیت میں برابر ہوں۔ اس سے ان کے درمیان موافقت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

(۲) مہر اور جہیز میں بھی اعتدال کا حکم دیا گیا ہے۔ اتنا بڑا مہر مقرر کرنا حرام ہے۔ جسے شوہر ادا نہ کر سکتا ہو اور جیسا جہیز آج کل دیا اور لیا جاتا ہے، عہد رسالت میں اس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سب سے اچھا نکاح وہ ہے جو مشقت میں آسان ہو"۔[1]

نیز آپؐ کا ارشاد ہے کہ:

"سب سے زیادہ برکت ایسی عورتوں میں ہوتی ہے جن کے نکاح میں زیادہ خرچ نہ کرنا پڑے"[2]

اسلام نے شادی کے اخراجات کا تمام تر بار مرد پر ڈالا ہے۔ لڑکی والے اس سے بری ہیں۔ ان پر نہ جہیز دینا واجب ہے نہ کھانا کھلانا۔ ولیمہ کی دعوت البتہ مسنون ہے مگر وہ شوہر کے ذمے ہے۔ حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ نکاح کرنے والے نے جب کہا کہ وہ ولیمہ کے لئے کچھ پیش نہیں کر سکتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حاضرین اپنے اپنے گھروں سے کھانا لائیں اور سب مل کر کھالیں، ولیمہ ہو جائے گا۔" اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے دین نے نکاح کو کتنا آسان بنایا ہے اور ہم نے اسے کس قدر مشکل بنا ڈالا ہے۔

(۳) اسلام میں نکاح کے لئے نہ لمبی چوڑی رسومات کی کوئی ضرورت ہے اور نہ مذہبی پیشوا یا عالم کی۔ دو گواہوں کے سامنے مرد اور عورت اپنی رضامندی کا اظہار کر کے خود ہی اس مقدس فریضے کو انجام دے سکتے ہیں۔

(۴) **گھر سے باہر کا پردہ** | اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی طرح سج دھج نہ دکھاتی پھرو" (احزاب - ۳۲)

---

[1] بیہقی [2] مسند احمد

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے لئے زیادہ پسندیدہ طرزِ عمل یہی ہے کہ وہ گھر میں سکون اور وقار کے ساتھ رہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ عورتوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "ساری فضیلت تو مرد لوٹ کر لے گئے۔ وہ جہاد کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ ہم کیا عمل کریں کہ ہمیں بھی مجاہدین کے برابر اجر مل سکے؟" جواب دیا "جو تم میں سے اپنے گھر میں بیٹھے گی وہ مجاہدین کے عمل کو پالے گی۔"[1]

اسلام میں جمعہ اور جماعت کی اہمیت کوئی مخفی امر نہیں مگر حضورؐ نے عورتوں کو جمعہ کی نماز سے مستثنیٰ فرمایا ہے:

"جمعہ کی نماز باجماعت ادا کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے مگر چار اشخاص مستثنیٰ ہیں: غلام — عورت — بچہ اور مریض۔"[1]

باجماعت نماز میں عورتوں کو شرکت کی اجازت ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں مسجد میں عورتوں کے داخلے کے لئے الگ دروازہ تھا اور علیحدہ صفیں بنتی تھیں۔ مگر یہ تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ عورتوں کے لئے ان کے گھر کی نماز مسجد کی نماز سے افضل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اپنی عورتوں کو مساجد میں آنے سے نہ روکو اگرچہ ان کے لئے ان کے گھر زیادہ بہتر ہیں۔"[2]

نیز فرمایا:

"عورتوں کے لئے بہترین مسجد ان کے گھر کے اندرونی حصے ہیں۔"[3]

حضرت عائشہؓ بنی امیہ کے دور کے حالات دیکھ کر فرماتی ہیں:

"اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے جو اب ہیں تو ان کا مسجدوں میں آنا اسی طرح بند فرما دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کا آنا بند کیا گیا تھا۔"[4]

اگرچہ عورت کا دائرۂ عمل اس کا گھر ہے، تاہم اس کا گھر سے باہر نکلنا بالکل ہی ممنوع نہیں کیا گیا۔ حضورؐ کا ارشاد ہے۔

"اللہ نے تم کو اپنی ضروریات کے لئے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے"[5]

عورتوں کے لئے حکم یہ ہے کہ جب وہ باہر نکلیں تو "اپنی سج دھج نہ دکھاتی پھریں" —

---

[1] ابوداؤد
[2] مسند احمد، ابوداؤد
[3] احمد، طبرانی
[4] بخاری
[5] بخاری

(الاحزاب ۳۳)۔ اصل میں لفظ " تبرّج " آیا ہے۔ جس کا مطلب ہے نمایاں ہونا، ابھر کر اور کھل کر سامنے آنا، ظاہر ہونا۔ عورت کے لئے تبرّج کا مطلب ہے اپنے حسن کی نمائش کرنا، لباس اور زیور کی خوبصورتی کا اظہار کرنا اور چال ڈھال سے اپنے آپ کو نمایاں کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ عورتیں جب باہر نکلیں تو اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے نمایاں کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ احتیاط کے ساتھ چادر میں مستور ہو کر نکلیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

" اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور ستائی نہ جائیں۔ (احزاب۔ ۵۹)

اصل میں " جلباب " کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جلباب اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جو پورے جسم کو چھپائے۔ مراد یہ ہے کہ چادر اچھی طرح لپیٹ کر اس کا ایک حصّہ اپنے اوپر لٹکا لیا کرو تاکہ جسم اور لباس کی خوبصورتی کے علاوہ چہرہ بھی چھپ جائے۔ البتہ آنکھیں کھلی رہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس حکم پر کس طرح عمل کیا گیا، یہ جاننے کے لئے مندرجہ ذیل روایات ملاحظہ ہوں:

کسی جنگ میں ایک خاتون امِ خلادؓ کے لڑکے شہید ہو گئے۔ وہ ان کے متعلق معلوم کرنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں لیکن اس دہلا دینے والے حادثے کے باوجود ان کے چہرے پر نقاب پڑا ہوا تھا۔ ایک صحابیؓ نے حیرت سے پوچھا " بی بی! اس وقت بھی تمہارے چہرے پر نقاب ہے؟ خاتون نے اطمینان سے جواب دیا " ہاں۔ میں نے بیٹا کھویا ہے، حیا نہیں کھوئی "۔[1]

حضرت عائشہؓ واقعۂ افک کی روایت میں فرماتی ہیں:

"...... جنگل سے واپسی پر میں نے دیکھا کہ قافلہ جا چکا ہے تو وہیں بیٹھ گئی اور ایسی نیند آئی کہ وہیں پڑ کر سو گئی۔ صبح کو صفوان ابن معطل ادھر سے گزرے تو دور سے کسی کو پڑے دیکھ کر وہاں آ گئے اور مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے کیونکہ حجاب کے حکم سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھا تو ان کی آواز سے یکایک

---

[1] ابوداؤد

آنکھ کھل گئی اور میں نے چادر سے اپنا منہ چھپا لیا۔"

عورتوں کو باہر نکلنے کی صورت میں ہدایت ہے کہ ایسی خوشبو نہ لگائیں جو لوگوں کو متوجہ کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

"جو عورت عطر لگا کر لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہے وہ آوارہ قسم کی عورت ہے۔"[1]

نیز آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"مردوں کے لئے وہ عطر مناسب ہے جس کی خوشبو نمایاں اور رنگ مخفی ہو اور عورتوں کے لئے وہ عطر مناسب ہے جس کا رنگ نمایاں اور خوشبو مخفی ہو۔"[2]

حکم ہے کہ عورتیں چست یا باریک لباس پہن کر مردوں کے سامنے نہ آئیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ:

"اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر جو لباس پہن کر بھی ننگی رہیں۔"[3]

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ

"اپنی عورتوں کو ایسے کپڑے نہ پہناؤ جو جسم پر اس طرح چست ہوں کہ سارے جسم کی ہیئت نمایاں ہو جائے۔"[4]

حفصہ بنت عبد الرحمٰنؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور وہ ایک باریک دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے اس کو پھاڑ دیا اور ایک موٹی اوڑھنی ان پر ڈالی۔[5]

حکم ہے کہ اس طرح نہ چلیں کہ زیوروں کی جھنکار پیدا ہو:

"وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے اس کا لوگوں کو علم ہو جائے (نور - ۳۱)

(۳) **گھر کے اندر کا پردہ** اسلام نے گھر کے اندر رہنے کے لئے بھی بعض ضابطے مقرر کئے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اے نبیؐ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نگاہیں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (نور - ۲۷)

نگاہیں بچانے کا مفہوم یہ ہے کہ عورتیں نامحرم مردوں[6] کو بلا وجہ اور بلا ضرورت نہ دیکھیں۔

---

[1] مؤطا امام مالک، صحیح مسلم [2] ترمذی، ابوداؤد [3]

[4] المبسوط [5] مؤطا امام مالک [6] وہ مرد جن سے شادی جائز ہے

ورنہ اگر فتنے کا امکان نہ ہو تو عورتیں، مردوں کو دیکھ سکتی ہیں۔

روایت ہے کہ سنہ ۷ھ میں حبشیوں کا وفد مدینے آیا اور اس نے مسجد نبویؐ کے پاس تماشہ کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشہ دکھایا[۱]

شرمگاہوں کی حفاظت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کریں اور دوسرے یہ کہ وہ اپنا ستر کسی کے سامنے نہ کھولیں۔ شوہر کے سوا باقی تمام مردوں کے لئے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ باقی جسم عورت کا ستر ہے۔ ناف سے گھٹنے تک کا حصۂ جسم عورت، عورت کے سامنے بھی ظاہر نہیں کر سکتی۔

"اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے۔" (نور - ۲۱)

یعنی عورتیں، گھر میں رہتے ہوئے بھی غیر مردوں کے سامنے اپنے بناؤ سنگھار اور حسن اور زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں۔ زینت سے مراد جسم کے وہ حصے بھی ہیں جن میں مختلف آرائشیں کی جاتی ہیں اور وہ چیزیں بھی مراد ہیں جن سے بناؤ سنگھار کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ گھر میں جو نامحرم مرد ہوں یا باہر سے آئیں ان کے سامنے عورت اپنی خوبصورتی کا اظہار نہ کرے۔ ہاں اگر کبھی اتفاق سے بلا ارادہ کوئی زینت ظاہر ہو جائے مثلاً چادر سر سے ڈھلک جائے یا ہاتھ پاؤں کی کسی زینت کا اظہار ہو جائے تو اس پر گرفت نہیں ہے۔

"اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔" (نور - ۲۱)

یعنی چادر سے اپنا گریبان چھپائے رکھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لئے جائز نہیں کہ اپنے جسم میں سے کچھ ظاہر کرے سوائے چہرے کے اور اس کے۔" (یہ فرما کر آپؐ نے اپنی کلائی پر اس طرح ہاتھ رکھا کہ آپؐ کی گرفت کے مقام اور ہتھیلی کے درمیان صرف ایک مٹھی بھر جگہ رہ گئی)[۲]

گھر میں رہتے ہوئے، محرم رشتہ داروں کے سامنے عورت کا پردہ یہ ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ باقی جسم چادر میں چھپا ہوا ہو۔ البتہ کام کاج کے دوران اگر پنڈلیاں یا بازو ظاہر کرنے کی ضرورت پیش آ جائے تو اجازت ہے۔

"وہ اپنے بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے:-

۱؎ صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد ۲؎ ابن جریر

(۱) شوہر (۲) باپ (۳) خسر (۴) بیٹے (۵) شوہر کے بیٹے جو اس کی دوسری بیوی سے ہوں (۶) بھائی (۷) بھتیجے (۸) بھانجے (۹) اپنے میل جول کی عورتیں (۱۰) اپنے مملوک (۱۱) وہ زیردست مرد جو عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے (۱۲) وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہیں ہوئے ہوں۔" (نور۔۳۱)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عورت ان رشتہ داروں کے سامنے اظہارِ زینت کرسکتی ہے جن سے نکاح حرام ہے۔ مقصد یہ ہے کہ گھر میں رہنے اور کام کاج کرنے میں کوئی تنگی اور دشواری نہ ہو۔ اس آیت میں ماموں اور چچا کا ذکر نہیں کیونکہ وہ باپ کی جگہ ہیں۔ رضاعی رشتہ دار بھی محرموں میں شامل ہیں۔ لہٰذا ان کے سامنے زینت ظاہر کرنا جائز ہے۔ عورتوں کے سلسلے میں تصریح ہے کہ وہ "اپنی عورتیں" ہوں۔ یعنی جانی پہچانی، باحیا اور نیک اطوار ہوں۔ ورنہ آوارہ اور بداطوار عورتوں سے مسلم خواتین کو پردہ ہی کرنا چاہیئے۔ رہیں وہ عورتیں جن کے اخلاق و تہذیب کا علم نہ ہو تو ان سے ویسا ہی پردہ ہونا چاہیئے جیسا نامحرم رشتہ دار سے ہوتا ہے۔ یعنی ہاتھ اور چہرے کے علاوہ سارا جسم اور زینت چھپانا چاہیئے۔

لونڈی اور غلام کے سامنے اظہارِ زینت جائز ہے، نیز ان مردوں کے سامنے بھی جائز ہے جو تابع، زیردست اور ماتحت ہوں اور بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے صنفی خواہش نہ رکھتے ہوں۔ نیز دس بارہ سال تک کے لڑکوں کے سامنے عورت زینت کا اظہار کرسکتی ہے۔

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"نبیؐ کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔" (احزاب۔ ۳۲)

یعنی عورتوں کو اگر اجنبی مرد سے بات کرنا پڑے تو سیدھے سادے، کھرے اور کسی حد تک خشک لہجے میں گفتگو کی جائے، آواز میں کوئی شیرینی یا لہجے میں کسی قسم کی لگاوٹ نہ ہو تاکہ سننے والا کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔

"جو بوڑھی عورتیں اب نکاح کی امیدوار نہیں وہ اگر اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنا مقصود نہ ہو۔ تاہم وہ بھی حیاداری ہی برتیں تو ان کے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے۔" (نور۔ ۶۰)

یعنی جو عورتیں جوانی کی حد سے نکل کر بڑھاپے کی منزل تک پہنچ گئی ہوں اور جن میں بن ٹھن کر رہنے کا شوق ختم ہو گیا ہو وہ اگر چادر اتار کر ننگے سر رہیں تو کوئی حرج نہیں ہے[۱]

(۴) مَردوں کے لئے کچھ احکامات

پردے کے احکام صرف عورتوں تک محدود نہیں بلکہ ایک صالح معاشرے کے قیام کے لئے مردوں کو بھی کچھ احکامات دیئے گئے ہیں:

(۱) **استیذان**: ہدایت کی گئی ہے کہ اچانک اور بلا اطلاع کسی کے گھر میں داخل نہ ہو جایا کرو۔ اسلام سے پہلے اہلِ عرب میں رواج تھا کہ وہ صبح بخیر یا شام بخیر کہتے ہوئے بے تکلف دوسروں کے مکان میں گھس جاتے تھے اور بسا اوقات اہلِ خانہ اور خواتین کو ایسی حالت میں دیکھ لیتے جس میں دیکھنا خلافِ تہذیب ہے۔ اس لئے خدا نے حکم دیا ہے کہ لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک یہ معلوم نہ کر لو کہ تمہارا آنا صاحبِ خانہ کے لئے ناگوار تو نہیں ہے اور آنے سے پہلے سلام کر کے اجازت لے لیا کرو[۲]۔ اجازت لینے کے لئے مسنون طریقہ یہ ہے کہ تین مرتبہ مناسب وقفوں سے پکارا جائے۔ اگر جواب نہ ملے یا کہا جائے کہ چلے جاؤ تو دروازے پر جم جانا درست نہیں ہے بلکہ بُرا مانے بغیر لوٹ جانا چاہیئے اپنی ماں بہنوں حتیٰ کہ بیوی کے پاس بھی بلا اطلاع نہیں پہنچ جانا چاہیئے۔ بلکہ اجازت لیکر اور اطلاع دے کر آنا چاہیئے۔

حکم ہے کہ جن وقتوں میں لوگ عموماً کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہیں ان اوقات میں ملازم اور بچے وغیرہ بلا اجازت کمروں میں داخل نہ ہو جایا کریں۔ ان وقتوں کے سوا دوسرے وقتوں میں اگر وہ بغیر اجازت آجایا کریں تو کوئی حرج نہیں ہے[۲]

(۲) **غضِّ بصر**: مَردوں کو حکم ہے کہ وہ نامحرم خواتین کو نہ گھوریں، دوسرے لوگوں کے سَتر پر نگاہ نہ ڈالیں اور نہ فحش مناظر پر نظر جمائیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

"اے نبیؐ! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔" (نور۔)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

---

۱ سورۂ نور ۔ ۶۰ ۲ سورۂ نور ، ۵۸ ، ۵۹

"جس مسلمان کی نگاہ کسی عورت کے حسن پر پڑے اور وہ نگاہ ہٹالے تو اللہ اس کی عبادت میں لطف اور لذت پیدا کر دیتا ہے[1]

نیز آپؐ نے فرمایا:

"اے علیؓ! ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا۔ پہلی نگاہ تو معاف ہے مگر دوسری نہیں"[2]

کسی اجنبی عورت کو دیکھنے کی بعض صورتوں میں اجازت ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو تو اسے اجازت ہے کہ چوری چھپے، اس پر ایک نظر ڈال لے اس کے علاوہ عدالتی کارروائی یا گواہی کے لئے قاضی کا کسی عورت کو دیکھنا، تفتیش جرم کے لئے پولیس کا کسی عورت کو، یا علاج کے لئے طبیب کا مریضہ کو دیکھنا بھی جائز ہے۔

مردوں کو حکم ہے کہ وہ کسی دوسرے مرد کے ستر پر نگاہ نہ ڈالیں یعنی کسی کی ناف سے گھٹنے تک کا حصہ دیکھنا حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"کوئی مرد کسی مرد کے ستر کو نہ دیکھے اور کوئی عورت کسی عورت کے ستر کو نہ دیکھے"[3]

(۳) تخلیہ اور لمس کی ممانعت: اسلام نے حکم دیا ہے کہ کوئی مرد کسی ایسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ رہے جو نہ بیوی ہو اور نہ ان رشتہ داروں میں سے ہو جن سے نکاح ابدی طور پر حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ ہو جہاں کوئی محرم موجود نہ ہو۔ کیونکہ ایسی صورت میں ان دو کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے"[4]

نیز آپؐ کا ارشاد ہے:

"عورتوں کے پاس خلوت میں رہنے سے بچو"

ایک انصاری نے پوچھا "اے اللہ کے رسولؐ، دیور اور جیٹھ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" فرمایا:

---

[1] مسند احمد۔ [2] مسند احمد، ترمذی

[3] احمد، مسلم، ابوداؤد [4] مسند احمد

"وہ تو موت ہے"[1] (یعنی اس سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے)

اسلام نے اسے بھی پسند نہیں کیا ہے کہ مرد، نامحرم خواتین کو چھوئیں یا ان سے مصافحہ کریں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے۔

"یہ تو گوارا کیا جا سکتا ہے کہ آدمی کے سر میں لوہے کی کیل ٹھونک دی جائے لیکن یہ گوارا نہیں کہ وہ کسی ایسی عورت کو چھوئے جو اس کے لئے حلال نہ ہو"[2]

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب عورتوں سے بیعت لیتے تو مصافحہ نہیں کرتے تھے، صرف زبانی اقرار کرواتے تھے[3] یہ ہدایت نامحرم خواتین کے لئے۔ باپ بیٹی کو، بھائی بہن کو یا شوہر بیوی کو چھو سکتا ہے۔ بوڑھی عورتوں کے ساتھ خلوت میں بیٹھنا جائز ہے اور ان سے مصافحہ کرنا بھی منع نہیں۔

(۴) مسلمان مردوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر انہیں اجنبی عورتوں سے کوئی کام ہو تو روبرو ہو کر بات نہ کریں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

"نبیؐ کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لئے زیادہ مناسب طریقہ ہے (احزاب - ۵۳)

متفرق احکام

انسدادی تدابیر کے ضمن میں اسلام نے چند متفرق احکام بھی دیئے ہیں۔ مثلاً

(۱) شراب حرام کی گئی

(۲) عورتوں کا مردوں کے سامنے گانا یا رقص کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ مردوں کے لئے اجنبی عورت کی آواز سننا بھی ناپسندیدہ ہے۔ لہٰذا عورت کو اذان دینے سے منع کیا گیا۔

(۳) شعراء پر پابندی لگائی گئی کہ وہ کسی عورت کے حسن کی خوبیاں نظم میں بیان نہ کریں۔

(۴) معاشرے میں بےحیائی پھیلنے کے باقی تمام ذرائع یہ کہہ کر بند کئے گئے کہ

"جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان کے گروہ میں فحاشی پھیلے ان کے لئے دنیا و آخرت

---

[1] مسند احمد بخاری، مسلم [2] بخاری، مسلم [3] ترمذی، نسائی، ابن ماجہ

میں دردناک عذاب ہے۔ (نور - ۱۹)

چند شبہات کا ازالہ

ستر اور حجاب کے احکامات کے ضمن میں بعض شبہات پیدا ہو گئے ہیں یا پیدا کئے گئے ہیں، نامناسب نہ ہو گا اگر یہاں ان کا ازالہ کر دیا جائے۔

(۱) پردہ عورت کی ترقی میں رکاوٹ ہے: یہ شبہ سراسر غلط ہے۔ پردہ عورت کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بلکہ اس کے لئے معاون ثابت ہوتا ہے۔ درحقیقت عورت کی ترقی وہی ہے جو وہ عورت کی حیثیت سے کرے۔ مرد بننا نہ تو عورت کا فرض ہے، نہ حق، نہ مردانہ زندگی میں اس کا حصہ لینا معاشرے کے لئے فائدہ مند ہے اور نہ وہ اس زندگی میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ پس عورت کی اصل اٹھان اور ترقی یہ ہے کہ وہ بہترین بیٹی، بہترین بیوی اور بہترین ماں بنے یہ نہیں کہ وہ سائنس دان یا سیاست دان یا ماہرِ معیشت بن جائے۔ اور اسے اچھی بیٹی بیوی اور ماں بنانے کے لئے پردہ یقیناً ممد و معاون ہے۔

(۲) پردہ ملک کی ترقی میں رکاوٹ ہے: یہ شبہ بھی قطعی غلط ہے۔ پردہ ملک کی ترقی میں نہیں، ملک کی بربادی میں رکاوٹ ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ملک کی ترقی کے لئے عورت اور مرد دونوں کا معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینا ضروری ہے وہ غلطی پر ہیں۔ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ مرد کمائے اور بیوی گھر کے نظام کو کفایت اور بچت کے ساتھ چلائے اور شوہر کو گھر اور بچوں کی طرف سے مطمئن رکھے تاکہ وہ سکون سے اپنے فرائض ادا کر سکے۔ اگر کسی وجہ سے عورتوں کا بھی اقتصادی پیداوار میں حصہ لینا ضروری ہو تو اسلامی حکومت ان کے لئے گھر پر صنعت و حرفت اور سلائی وغیرہ کا انتظام کر سکتی ہے۔ بہر حال ملک کی ترقی کے لئے عورتوں کا بے پردہ ہونا بالکل بے بنیاد دلیل ہے۔ وہ پردے میں رہتے ہوئے بھی مادی ترقی میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

(۳) عورت پردے کی وجہ سے جاہل رہ جاتی ہے: یہ ایک بالکل بے اصل دعویٰ ہے اسلام نے تعلیم نسواں کی کہیں حوصلہ شکنی نہیں کی۔ عورتوں کو دینی اور دنیوی علوم سیکھنے کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ ان کی تعلیم کو اسی قدر ضروری سمجھا گیا ہے جس قدر مردوں کی تعلیم کو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لئے ایک دن مخصوص فرما دیا تھا۔ جب آپؐ باقاعدہ مسلم

خواتین کو جمع کر کے وعظ و نصیحت فرماتے تھے۔ آپؐ کی ازواج مطہرات خصوصاً حضرت عائشہؓ اپنی فقہی بصیرت کی وجہ سے نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں کی بھی معلّمہ بنیں۔ تعلیم نسواں کے سلسلے میں اسلام کی دو شرائط ہیں:۔

۱۔ عورتوں کو وہی تعلیم و تربیت دی جائے جو انہیں ان کے اصل دائرے یعنی گھر میں مفید بنائے۔

۲۔ حصول تعلیم کے دوران وہ شریعت کی حدود سے تجاوز نہ کریں۔ مثلاً مخلوط تعلیم کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(۴) عہدِ رسالت میں عورتیں جنگوں میں حصّہ لیتی تھیں: یہ صحیح ہے کہ غزوۂ بدر اور غزوۂ احزاب میں صحابیاتؓ نے بھی شرکت کی۔ بعض نے زخمیوں کو پانی پلایا، ان کی مرہم پٹی کی اور تیر اٹھا اٹھا کر مجاہدین کو دیئے۔ کچھ خواتین نے باقاعدہ جنگ میں حصّہ لیا اور شہید ہوئیں۔ لیکن یہ دونوں غزوات پردے کے احکام نازل ہونے سے پہلے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان میں عورتوں کی شرکت سے "مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے" پر دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ ستر اور حجاب کے احکامات نازل ہونے کے بعد حضورؐ نے عورتوں کی غزوات میں شرکت کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا "یا رسولؐ اللہ! ہم جہاد کو سب سے افضل نیکی سمجھتی ہیں تو کیا ہم جہاد نہ کریں؟" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں، بلکہ تمہارے لئے سب سے افضل نیکی حجِ مبرور ہے[1]"۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ "تمہارا حج جہاد ہے[2]"۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر و حجاب کے احکام نازل ہونے کے بعد بھی خواتین اسلام نے جنگوں میں مجاہدین کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمت انجام دی[3]۔

اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کا جنگ میں حصّہ لینا، مجاہدین کے لئے کھانا پکانا اور زخمیوں کی تیمارداری کرنا بالکل منع نہیں ہے بلکہ ضرورت کے تحت خواتین یہ کام کرسکتی ہیں اور اس کے لئے کسی حد تک پردے میں تخفیف بھی جائز ہے۔ لیکن جب ہنگامی حالات ختم ہو جائیں

---

[1] مسند احمد [2] بخاری [3] بخاری

حجاب کو پھر انہی حدود پر قائم ہو جانا چاہیئے جو مقرر کئے گئے ہیں۔

(۵) حضرت عائشہؓ کا عملی سیاست میں حصہ لینا: یہ درست ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کے خون کے بدلے کا مطالبہ کیا اور اس کے نتیجے میں حضرت علیؓ سے وہ جنگ ہوئی جسے جنگ جمل کہتے ہیں۔ لیکن اس واقعے سے عورتوں کے سیاست میں حصہ لینے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ قطع نظر اس کے کہ کونسا فریق حق پر تھا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو ایک غیر جانب دار شخص تھے کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ کا گھر ان کے لئے ہودج سے بہتر تھا[۱]۔ حضرت علیؓ نے ام المؤمنینؓ کو جو خط لکھا اس میں معاملے کے صحیح یا غلط ہونے پر کوئی بحث نہیں کی بلکہ فرمایا:

"عورتوں کو جنگ اور مردوں کے معاملات میں پڑنے سے کیا تعلق؟"

حضرت عائشہؓ نے جواب دیا:

"اب گلے شکوے کا وقت نہیں رہا"

معلوم ہوا کہ انہیں اپنی غلطی کا اعتراف تھا۔ اور وہ مانتی تھیں کہ انہیں میدان سیاست میں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ مگر حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے اور ان کے لئے اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لینا ناممکن ہو چکا تھا۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو آخر وقت تک اپنی غلطی پر پچھتاوا رہا اور وہ توبہ و استغفار کرتی رہیں۔

(۶) مردوں کو نظریں بچانے کا حکم: اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں کو جو نظریں بچانے کا حکم دیا ہے، اس سے بعض لوگ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ عورتوں کے لئے چہرہ چھپانے کا حکم نہیں ہے یہ استدلال مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر غلط ہے۔

۱۔ بعض اوقات ضرورتاً ایک مسلمان عورت کو چہرہ ظاہر کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ غیر مسلم عورتوں کے چہرے کھلے ہوں گے

۳۔ حج کے موقع پر نقاب پہننا منع ہے لہٰذا ایسی صورت میں مردوں کی نگاہ عورتوں پر پڑ سکتی ہے۔

۴۔ لوگ جب دوسروں کے گھروں میں جائیں گے تو وہاں بھی عورتوں پر نظر پڑ سکتی

---

[۱] الامامۃ والسیاسۃ

ہے ——— !

حرفِ آخر

جیسا کہ آپ نے دیکھا دنیا کی کوئی تہذیب معاشرے میں عورت کے مقام کا ٹھیک ٹھیک تعین نہیں کرسکی۔ یہ کام صرف اسلام کا ہے کہ اس نے ایک مکمل نظامِ حیات دیا اور ہر فرد کو اس کی صلاحیتوں کے اعتبار سے فرائض سونپے۔ عورت کا جو مقام اور رتبہ اسلام نے مقرر کیا ہے وہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ خدا و رسولؐ کی اطاعت و پیروی کریں اور دنیا کی گمراہ قوموں کے نقشِ قدم پر نہ چلیں۔

"یہ مشرک تمہیں آگ کی طرف بلا رہے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے
تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بلا رہا ہے" (بقرہ۔۲۲۱)

آپ کا انتخاب کیا ہے ؟

قسط نمبر (۲)

اسلام میں عملی زندگی

ارشاداتِ رسول ﷺ کی روشنی میں

ملک اقبال واحد

خاموشی

حضرت عبداللہ بن عمرو رضؓ سے روایت ہے کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے خاموشی اختیار کی، اُس نے نجات حاصل کرلی۔" (ترمذی)

متانت و وقار

حضرت سہیل بن ساعدی رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کاموں کو متانت اور اطمینان سے انجام دینا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جلد بازی کرنا شیطان کی طرف سے ہے۔" (ترمذی)

سنجیدگی

حضرت ابن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بُردباری، سکون، اور سنجیدگی کو پسند کرتا ہے۔" (مسلم)

شفقت و احترام

حضرت ابنِ عباس رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اپنے چھوٹوں پر رحم نہ کھائے، بڑوں کی تعظیم نہ کرے، نیکی کا حکم نہ دے اور بُرائی سے منع نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (ترمذی)

صدقہ

حضرت ابوذر رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا اپنے بھائی کی خوشی کی خاطر مسکرا

دینا صدقہ ہے۔ کوئی نیک بات کہہ دینا بھی صدقہ ہے، کسی کو بُری بات سے روک دینا بھی صدقہ ہے، کسی کو راستہ بتا دینا بھی صدقہ ہے۔ راستہ سے رکاوٹ کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ اور اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔
(ترمذی)

سخاوت حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے تم دوسروں پر خرچ کرتے رہو، میں تم پر خرچ کرتا رہوں گا۔" (بخاری)

طہارت حضرت ابو مالک اشعری رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طہارت و پاکیزگی ایمان کا نصف ہے۔" (مسلم)

چھ ۶ باتیں حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے، کہ "رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم چھ باتوں کی ضمانت دو۔ میں تمہارے لیے جنّت کی ضمانت دیتا ہوں۔ بات کرو تو سچ بولو۔ وعدہ کرو تو پورا کرو۔ جب کوئی امانت تمہارے سپرد ہو تو ٹھیک ٹھاک ادا کرو۔ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو۔ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھو۔ اپنے ہاتھوں کو کسی کو ستانے اور کسی کا مال حرام لینے سے روکو۔
(مسند احمد)

اخوّت حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم مومنین کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحم کرنے میں، محبّت کرنے میں ایک دوسرے پر مہربانی کرنے میں ایک جسم کے مانند پاؤ گے جس طرح ایک عضو کو تکلیف ہونے پر تمام بدن جاگ کر مدافعت کرتا ہے۔"
(متفق علیہ)

محبّت حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جنّت میں ہرگز داخل نہیں ہوسکتے۔ جتنی کہ ایمان لاؤ اور تم ہرگز ایمان پر قائم نہیں رہ سکتے جب تک کہ ایک دوسرے کے ساتھ محبّت نہ کرو۔" (مسلم)

مُنکرات

(ناپسندیدہ اخلاق)

شرک

حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُمید ہے کہ اللہ تعالےٰ ہر گناہ کو بخش دے۔ مگر اُس شخص کے گناہ کو نہیں بخشا جائے گا جو حالتِ شرک میں مرے یا کسی مسلمان کو جان سے مار ڈالے۔" (ابو داؤد)

مُنافقت

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے، کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی تین نشانیاں بتائیں۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے۔ اور جب اُس کے سپرد کوئی امانت کی جائے تو خیانت کرے۔" (بخاری)

قتلِ مُسلم

حضرت عبداللہ بن عمرو رضؓ سے روایت ہے، کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ساری دنیا کی تباہی اللہ کے نزدیک ایک مسلمان کے قتل کے بالمقابل ہلکی ہے۔" (مشکوٰۃ)

سب وشتم

حضرت عبداللہ رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اُسے قتل کرنا کفر ہے۔" (بخاری)

زنا اور شراب

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ" رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے زنا کیا یا شراب پی۔ اللہ تعالیٰ اُس کا ایمان اس طرح سے نکال لیتا ہے جیسے انسان اپنی قمیص سر کی طرف سے اُتار لیتا ہے۔" (مستدرک حاکم)

مسکرات اور لہو ولعب

حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پینے، جوا کھیلنے اور نرد و شطرنج اور نقارہ و بربط سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے۔" (ابو داؤد)

خیانت نظر حضرت جریر بن عبداللہ رضؓ سے روایت ہے کہ "اچانک پڑ جانے والی نگاہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: میں اپنی نگاہ پھیر لوں۔" (مسلم)

سُود حضرت جابر رضؓ سے رعایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے سود دینے والے اور سود لینے والے اور سود کے گواہوں پر۔ اور فرمایا وہ سب برابر ہیں گناہ میں۔" (مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سود کے گناہ کے ستر حصے ہیں۔ جس کا ایک معمولی حصہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے جماع کرے۔" (ابن ماجہ)

ریاء حضرت شداد بن اوس رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اُس نے شرک کیا۔ جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اُس نے شرک کیا۔ جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ وخیرات کیا اُس نے شرک کیا۔" (مسند احمد)

غیبت حضرت ابوسعید رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیبت زنا سے بھی زیادہ شدید اور سنگین ہے۔ صحابہ رضؓ نے عرض کیا کہ وہ کس طرح؟ فرمایا: آدمی زنا کرتا ہے تو صرف توبہ کرنے سے اُس کی مغفرت ہو سکتی ہے۔ مگر غیبت کرنے والے کو جب تک وہ شخص معاف نہ کر دے جس کی اُس نے غیبت کی ہے، اُس کی مغفرت نہ ہوگی۔" (شعب الایمان)

غیبت کیا ہے؟ حضرت ابوہریرہ رضؓ سے رعایت ہے، کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ فرمایا تمہارا اپنے بھائی کی ایسی بات کرنا جو اُسے ناگوار ہو۔ کہا گیا اگر ہمارے بھائی میں واقعی وہ بات موجود ہو تو پھر؟ فرمایا اگر واقعی وہ بات اُس میں پائی جاتی ہے تو تم نے اُس کی غیبت کی۔ اور اگر نہیں پائی جاتی تو تم نے اُس پر بہتان لگایا۔" (مسلم)

بہتان حضرت حذیفہ رضؓ بیان کرتے ہیں کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی پاکباز کو بہتان لگانے سے سو سال کے عمل برباد ہو جاتے ہیں۔" (البزار)

چغل خوری

حضرت حذیفہ رضؓ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں "آپ فرماتے تھے چغل خور آدمی جنت میں نہ جا سکے گا۔"

غصہ

حضرت بہز بن حکیم رضؓ روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غصہ ایمان کو ایسا خراب کر دیتا ہے، جیسے ایلوا شہد کو خراب کر دیتا ہے۔" (بخاری)

جھوٹ

حضرت معاذ بن جبل رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زبان کے ثمرات (جھوٹ اور غیبت وغیرہ) لوگوں کو منہ کے بل جہنم میں گراتے ہیں۔" (ترمذی)

دورخا پن

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم قیامت کے دن سب سے زیادہ بُرے حال میں اُس آدمی کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اُس کا رُخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور ہوتا ہے۔" (بخاری)

درشت کلامی

حضرت حارثہ بن وہب رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سخت کلام اور درشت مزاج آدمی جنت میں نہ جا سکے گا۔" (ابوداؤد)

فحش گوئی بدکلامی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن لعن طعن کرنے والا فحش گو اور بدکلام نہیں ہوتا۔" (ترمذی)

خیانت

حضرت عبادہ بن صامت رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دھاگا اور سوئی تک ادا کرو اور خیانت سے بچو۔ اس لیے کہ خیانت قیامت کے دن رسوائی و ندامت کا موجب ہوگی۔" (مشکوٰۃ)

رشوت

حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔" (مشکوٰۃ)

رشوت کے چور دروازے

حضرت ابو امامہ رض سے روایت ہے، کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی نے کسی کی سفارش کی اور سفارش پر اُسے ہدیہ ملا اور اُس نے قبول کر لیا تو وہ بلاشبہ سُود کے دروازوں کے بڑے دروازے میں داخل ہو گیا" (مشکوٰۃ)

حسد

حضرت ابو ہریرہ رض سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حسد سے بچو۔ حسد آدمی کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے" (ابوداؤد)

تکبّر

حضرت عبداللہ بن مسعود رض سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے دل میں ذرّہ برابر بھی تکبّر ہوگا وہ جنّت میں داخل نہ ہو سکے گا" (مسلم)

ظُلم

حضرت ابو ہریرہ رض سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان وہ ہے، جس کی زبان درازیوں سے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس کی طرف سے اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں لوگوں کو کوئی خوف و خطر نہ ہو" (ترمذی)

اعانت ظُلم

حضرت اوس بن شرجیل رض سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کسی ظالم کی مدد کے لیے اور اُس کا ساتھ دینے کے لیے چلا۔ درآں حالیکہ وہ جانتا تھا کہ یہ ظالم ہے، وہ اسلام سے خارج ہو گیا" (شعب الایمان)

جھُوٹی قسم

حضرت اشعث بن قیس رض سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی کا مال جھُوٹی قسم کھا کر مار لے گا وہ اللہ کے سامنے کوڑھی ہو کر پیش ہوگا" (ابوداؤد)

شماتت

حضرت واثلہ رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں "تم اپنے کسی بھائی کی مصیبت پر خوش نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کو اس مصیبت سے نجات دے دے اور تم کو مبتلا کر دے" (ترمذی)

(جاری ہے)

رفتارِ کار

تنظیمِ اسلامی کے نویں سالانہ اجتماع کی رپورٹ

از ۲۵ تا ۳۰ مئی ۱۹۸۴ء

مرتبہ: محمد اکرم بھٹی

مسلمانانِ لاہور واقعتاً بڑے خوش قسمت ہیں کہ انہیں رب العزت نے اس بار بھی مملکت خداداد پاکستان اور بیرونِ پاکستان سے آنے والے ان خوش بخت حضرات کی میزبانی کا شرف بخشا جو کہ صریحاً قرآن کے طرزِ فکر پر مبنی اقامت دین کے لیے برپا کی گئی تحریک تنظیم اسلامی کے نویں سالانہ اجتماع میں شرکت کے لیے لاہور آئے۔ مئی کے شدید گرم موسم میں ایک نظم کے تحت رفقاء تنظیم اسلامی کا اجتماع اور اس اجتماع کے پروگراموں سے صحیح طور پر استفادہ اور اقامت دین کے لیے تن من دھن نچھاور کرنے کا عزم مصمم حاصل کرنے کے لیے اس بار خیبر سے لے کر کراچی تک کے ہم مقصد عزمِ جواں کے حامل رفقاء کا یہ اجتماع تربیتی اور تنظیمی دونوں پہلوؤں پر محیط رہا۔ رفقائے کراچی، کوئٹہ اور راولپنڈی اپنی تمام تر تنظیمی ہیئت کے ساتھ اجتماع میں شریک ہوئے۔ آزاد کشمیر، گلگت، فیصل آباد، ملتان، وہاڑی کی ابتدائی مراحل طے کرتی ہوئی تنظیموں کے رفقاء اِک ولولۂ تازہ لیے شریکِ اجتماع تھے۔ اور یقیناً اس ولولۂ تازہ کی آبیاری امیر تنظیم اسلامی نے بڑی جان کاری سے کی۔

ابتدائے اجتماع ۲۵ مئی کو بعد نماز مغرب امیرِ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد کے خطاب سے ہوا۔ جس میں امیرِ محترم نے سورۃ المدثر کی ابتدائی چار آیات کی روشنی میں فریضہ اقامت دین اور اس کے لوازم اور تقاضوں پر گفتگو کی۔ پہلے روز کی کارروائی نماز عشاء پر اختتام پذیر ہوئی۔

۲۶ مئی کے پروگرام کا آغاز جناب ڈاکٹر تقی الدین صاحب نائب امیر تنظیم اسلامی سندھ کے درسِ حدیث سے ہوا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ولایت کی منزلِ اول یعنی ذکر الٰہی کی ضرورت اور اس سے حاصل ہونے والے نتیجہ یعنی قربِ الٰہی کا احادیثِ رسول ؐ کی روشنی میں بڑے ناصحانہ انداز میں درس دیا۔

اس روز کی نشستِ دوئم میں امیرِ محترم نے دین کی جانب سے مسلمانوں کی اجتماعی

اور انفرادی ذمہ داری کا تصور اور اس ذمہ داری کے جملہ مراتب کو واضح کیا۔ درس کی دوسری نشست میں امیرِ محترم نے سورہ نور کی آیات ۵۴ تا ۵۶ اور ۶۲ تا ۶۴ کی روشنی میں سمع و طاعت اور امیر و مامور کے تعلق پر مبنی تنظیمی ہیئت کو اجاگر کیا اور واضح کیا کہ تنظیم اسلامی اس نہج پر کام کر رہی ہے۔

۲۶ مئی کے تیسرے پروگرام میں پاکستان میں قائم مختلف علاقائی تنظیموں کا تعارفی سلسلہ شروع ہوا۔ تنظیم اسلامی کراچی کی تاسیس سے مئی ۸۴ء تک کی مختصر رپورٹ جناب ڈاکٹر تقی الدین نے پیش کی۔ اسی روز بعد نمازِ عصر کے اجتماع میں تنظیم اسلامی کوئٹہ کی روئیداد جناب میاں محمد نعیم نے پیش کی۔ اس رپورٹ کی خاص بات ان اصحاب کے عزمِ صمیم کا ذکر تھا جنہوں نے نہی عن المنکر کے معاملے کو اپنی ذات سے شروع کیا اور سودی نظام پر مبنی بنک کی ملازمت کو ترک کیا۔ اور جنہوں نے شادی و مرگ کے ضمن میں تمام غیر اسلامی رسومات کو ترک کر کے جہادِ عملی کا آغاز کر دیا۔ اس رپورٹ نے یقیناً تمام ساتھیوں کو عزمِ نو عطا کیا۔

۲۶ مئی کا آخری پروگرام امیرِ محترم کے چار روزہ درسِ قرآن کے پروگرام کی دوسری کڑی تھا۔ جس کے ذریعہ امیرِ محترم نے قرآن و حدیث کی روشنی میں نظامِ بیعت پر سیر حاصل بحث کی۔ آج کے درسِ قرآن سے، جو سورہ شوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ پر محیط تھا، دین اور شریعت کا فرق واضح کیا۔ اصحابِ رسول اور ان کے بعد کے اہلِ ایمان کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے امیرِ محترم نے یہ بات سمجھائی کہ تفرقہ و افتراق کے نتیجے میں خود وارثینِ کتاب ہی کتاب کے معاملہ میں شک میں پڑ جاتے ہیں۔ اور اس طرح دین سے بیگانہ ہو جاتے ہیں پس ہر داعیٔ حق کو لازم ہے کہ وہ اقامتِ دین کے لیے سرگرمِ عمل ہو۔ اور راہ سے ہٹے ہوئے لوگوں کی تقلید میں یا خوشنودی کے لیے کام نہ کرے بلکہ اللہ کے دین کی طرف ہی لوگوں کو دعوت دے۔

۲۷ مئی۔ آج کے پروگرام کا آغاز بھی بعد نمازِ فجر جناب ڈاکٹر تقی الدین کے درسِ حدیث سے ہوا۔ دوسری نشست بسلسلہ نظمِ جماعت میں امیرِ محترم نے نظمِ جماعت سے متعلق احادیث کا درس دیا۔ بمطابق پروگرام تیسری اور چوتھی نشست تنظیم اسلامی کی ذیلی تنظیموں کے تعارف پر مبنی تھی۔ آخری نشست بعد نمازِ مغرب ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم

اسلامی کے درسِ قرآن پر مبنی تھی۔ آج کی نشست میں امیرِ محترم نے سورہ شوریٰ کی آیت
۱۵، سورہ فتح کی آیات ۲۸ اور ۲۹ کی روشنی میں اقامتِ دین کے ایک اہم رخ یعنی "نظام
عدل کا بذریعہ اقامتِ دین قیام" پر تفصیلی بحث کی اور اقامتِ دین کے لیے قائم ہونے
والی جماعت میں شامل لوگوں کے شب و روز کے اوصاف اور معاشرہ کے ساتھ ان کے
برتاؤ کے پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

۲۸ مئی کا آغاز بھی رفقائے تنظیم نے نمازِ فجر کے بعد درسِ حدیث میں شمولیت سے
کیا۔ آج کا درس بھی ڈاکٹر تقی الدین صاحب نے ذکرِ الٰہی کے مدارج پر دیا۔ آج کی دوسری
نشست میں امیرِ محترم کا درسِ قرآن بسلسلہ اسلامی نظمِ جماعت، سورہ انفال کی آیات
۴۵، ۴۶ اور ۴۷ اور سورہ آلِ عمران کی آیات ۱۵۲ اور ۱۵۹ پر مبنی تھا۔ اس درس کا ماحصل
اطاعتِ امیر تھا کہ مامورین کو ہر دائرہ معروف کے اندر رہتے ہوئے اپنے امیر کی سمع و طاعت
کے نظام پر مبنی اطاعت کرنا لازم ہے ورنہ نظمِ جماعت تہہ و بالا ہو جائے گا۔ اور جماعت
کے اندر انتشار اور افتراق پیدا ہو جائے گا۔ امیر موصوف نے نہایت فصاحت کے ساتھ
امیر اور مامور کے تعلق پر روشنی ڈالی اور عفو و درگزر اور ایک دوسرے کے لیے استغفار
کی بنیاد پر ان تعلقات کی استواری پر زور دیا۔

آج کی نمازِ مغرب تک کی بقیہ نشستوں میں تنظیمی امور پر گفتگو رہی۔ بعد نمازِ مغرب کی
آج کی نشست ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درسِ قرآن پر مبنی تھی جو کہ انہوں نے
سورہ آلِ عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ کی روشنی میں دیا۔

۲۹ مئی کے پروگرام کے آغاز پر ذکر و فکر پر مبنی احادیث کے درس سے ہوا جو کہ ڈاکٹر
تقی الدین صاحب نے دیا۔ دوسری نشست میں بسلسلہ نظمِ جماعت امیرِ تنظیمِ اسلامی کا
درسِ قرآن تھا۔ جو کہ سورہ المائدہ کی آیات ۵۴ تا ۵۶ اور سورہ المجادلہ کی آیات ۹ تا ۱۱ اور
۲۱ تا ۲۲ پر مشتمل تھا۔ اس میں امیرِ محترم نے دینی جماعت میں ارتداد کا مفہوم اور اس کے
مضمرات، نجویٰ اور اس سے پیدا شدہ نتائج اور آدابِ مجلس کا تفصیلی ذکر کیا۔ اور رفقائے تنظیم
پر واضح کیا کہ ان باتوں سے پرہیز جماعت کے لیے ازبس ضروری ہے۔

نمازِ مغرب سے پہلے کی نشست میں حسبِ معمول تنظیمی امور زیرِ بحث رہے۔ بعد
نمازِ مغرب آج امیرِ موصوف کا خصوصی خطاب تھا جو کہ سورہ فتح کی آیات ۱۰ اور ۱۸ اور

سورۃ الممتحنہ کی آیت ۱۲ پر درس کی شکل میں تھا۔ لیکن آغاز درس سورہ توبہ کی آیات ۱۱۱ اور ۱۱۲ سے ہوا کہ اللہ نے مومنین کے ساتھ جنت کا سودا ان کے جان و مال کے بدلے میں کر لیا ہے۔ کہ وہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا ئیں۔ امیر موصوف نے اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے اپنا مال و جان کھپانے والوں کی شیرازہ بندی کی صورت کی وضاحت کی اور تفصیلاً بیان کیا کہ یہ جماعت سمع و طاعت کی بنیاد پر بیعت کے ذریعہ قائم ہونے والی جماعت ہی ہو سکتی ہے۔ امیر موصوف نے اس اختتامی درس قرآن میں حاضرین مجلس کے سامنے تنظیم اسلامی کی دعوت کو کھول کر پیش کیا۔

۲۰ مئی کا دن خصوصی اہمیت کا حامل دن تھا کہ وطن عزیز کے چپہ چپہ سے آئے ہوئے رفقاء کی روانگی اور اس سے پہلے امیر محترم کا خصوصی اختتامی خطاب تھا۔ امیر موصوف نے تنظیم کے قیام سے اب تک کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے خوشی و اطمینان کا اظہار فرمایا کہ کل جس قافلہ کے وہ واحد فرد تھے آج اس میں سالار قافلہ کو جاں نثار ساتھی میسر آ گئے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس قافلے نے اب سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ بعد نماز ظہر بیرون لاہور سے آئے ہوئے رفقاء کی روانگی تھی۔ کہ وہ تو ولولۂ تازہ، جذبۂ جاوداں اور عزم لازوال لیے اقامت دین کے سفر پر رواں دواں ہو گئے۔ لیکن رفقائے لاہور کو افسردگی اور وقتی فراق دے گئے۔ انشاء اللہ العزیز یہ قافلہ اپنی منزل (یعنی صرف اور صرف رضائے الٰہی) کے حصول کی طرف استقلال اور جذبۂ صادقہ کے ساتھ رواں دواں رہے گا اور اللہ کی رحمت سے ہمیں امید ہے کہ اس کے شرکاء جنت الفردوس میں بھی شرکاء ہی ہوں گے۔

PEPSI

MIRINDA

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا
جسمیں جنگ کی بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کیلیئے
بڑے فوائد بھی ہیں۔

مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

کے چھٹے سالانہ

محاضراتِ قرآنی

میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دو فکر انگیز خطابات

(۱)

جہاد بالقرآن

زیرِ طباعت ہے۔

(۲)

اسلامی انقلاب

کیلئے

التزامِ جماعت

اور

مسئلہ بیعت

زیرِ تکمیل ہے۔ ان شاء اللہ العزیز ماہ جولائی کے وسط میں منصۂ شہود پر آجائے گا۔

THE ORIGINAL

Hollow-Core Slab in Pakistan

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلس منتظمہ کے فیصلے کے مطابق آئندہ

قرآن اکیڈمی کے رفاقت (فیلوشپ) اسکیم

کے لئے نوجوانوں کے انتخاب کیلئے تمہید کے طور پر

دو سالہ تدریسی نصاب

کا سلسلہ شروع کیا جائیگا جس میں پہلے سال اکثر و بیشتر وقت عربی قواعد و ادب کی تعلیم پر صرف ہوگا (ضمناً کچھ فارسی بھی پڑھائی جائیگی!) اور دوسرے سال تفسیر قرآن میں مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب (مرتبہ ڈاکٹر اسرار احمد) حدیث شریف میں مشکوٰۃ المصابیح، منطق میں مرقاۃ، اصول فقہ میں نور الانوار اور فقہ میں نور الایضاح اور منتخب حصے کنز الدقائق کے پڑھائے جائیں گے — اور جو نوجوان اس کورس کو کامیابی سے پورا کر لیں گے اور اُن کے بارے میں محسوس ہوگا کہ تحقیقی و تخلیقی کام کی صلاحیت رکھتے ہیں صرف ان ہی کو رفاقت سکیم میں لیا جائے گا۔

اس کورس کے لئے ایم اے - ایم ایس سی — اور بی اے، بی ایس سی کے امتحانات کم از کم سیکنڈ ڈویژن میں پاس شدہ نوجوانوں کو لیا جائے گا اور اس دو سال کے عرصے کے دوران مقدم الذکر کو ایک ہزار روپے ماہانہ اور موخر الذکر کو آٹھ سو روپے ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا - اگرچہ اس میں سے ماہ بماہ ادائیگی صرف پچھتر فیصد کی ہوگی (یعنی علی الترتیب -/۷۵۰ اور -/۶۰۰ روپے ماہانہ) بقیہ پچیس فیصد انجمن کے پاس اُن کے حساب میں جمع رہے گا اور کورس کی کامیابی کے ساتھ تکمیل پر یکمشت ادا کر دیا جائے گا - جو طالبعلم درمیان میں چھوڑ جائیں گے یا اُن کے نامناسب طرز عمل یا غیر تسلی بخش رفتار کار کی بنا پر اکیڈمی ان کا اخراج کردے گی اُن کی یہ جمع شدہ رقم ضبط کر لی جائے گی!

اس کورس کا آغاز ان شاء اللہ یکم اگست ۸۴ء سے ہو جائے گا - شمولیت کے خواہاں نوجوان زیادہ سے زیادہ ۱۵ جولائی تک اپنی درخواستیں اپنی سندات کی نقول کے ساتھ زیر دستخطی کو قرآن اکیڈمی، ۳۶ - کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور - ۱۴ کے پتے پر ارسال کر دیں -

نوٹ

ایم بی بی ایس، بی ڈی ایس اور بی ایس سی انجنیئرنگ کو بھی ایم اے اور ایم ایس سی کے مساوی شمار کیا جائے گا!

المعلن: ڈاکٹر ابصار احمد، آنریری ڈائرکٹر، قرآن اکیڈمی، لاہور

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 33	JULY 1984	No. 7

جہاد بالقرآن

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز خطبہ

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

PEPSI

MIRINDA

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۳۳ | شمارہ ۸ | ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ مطابق اگست ۱۹۸۴ء

مشمولات

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی

فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۲۰۰۹

جمیل الرحمٰن

عرضِ احوال

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

بفضلہ تعالیٰ وعونہٖ ماہنامہ میثاق کا شمارہ بابت ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ مطابق اگست ۱۹۸۴ء قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ یہ شمارہ کافی وقت کے ساتھ منصۂ شہود پر آسکا ہے اس لئے کہ ہمارے دو مستقل خوش نویس صاحبان رمضان المبارک کے آخری عشرے میں علیل ہوگئے اور تاحال پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے۔ تاہم انہوں نے پرچہ کی تیاری میں ہمارے ساتھ ہر ممکنہ تعاون کیا۔ جزاھما اللہ خیرًا۔ قارئین سے ان کی مکمل صحت یابی کی دعا کی درخواست ہے۔

اس شمارے کی اہم چیز امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے اس خطاب کی پہلی قسط ہے جو "جہاد بالقرآن" کے موضوع پر موصوف نے انجمن خدام القرآن لاہور کے چھٹے سالانہ محاضرات قرآنی کے افتتاحی اجلاس میں ۲۵ مارچ کو ارشاد کیا تھا۔ یہ اجلاس جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے برصغیر پاک وہند کی مشہور و معروف علمی شخصیت جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ العالی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ موصوف ان محاضرات کے لئے خاص طور پر ہندوستان سے تشریف لائے تھے۔

ارادہ یہ تھا کہ یہ خطاب کتابی صورت میں تنظیم اسلامی کے نویں سالانہ اجتماع کے موقع پر منصۂ شہود پر آجائے۔ اس کے لئے تیاری بھی کر لی گئی تھی اور ۲ اپریل ۱۹۸۴ء تک اس کو کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے کتابت کے لئے ایک نئے خوش نویس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ان کا وعدہ تھا کہ وہ مکمل کتابت ۲۷ اپریل کو دے دیں گے۔ لیکن انسان بے بس ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ خوش نویس صاحب نے اس کتابت کو ۱۲ جولائی کو مکمل کر کے ہمارے حوالے کیا ـــــ اس تاخیر میں بھی اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت کارفرما نظر آرہی ہے کہ اپریل سے ۶ جولائی ۸۴ء تک امیر محترم اسی موضوع پر متعدد خطابات ارشاد فرما چکے ہیں۔ ہر خطاب میں چند نئے نکات اور نیا مستحکم طرزِ استدلال سامنے آ رہا ہے۔ گویا کہ جو محاضرات قرآنی کے افتتاحی اجلاس میں

کھلی تھی رفتہ رفتہ ایک شگفتہ پھول کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ اس میں مزید حسن اور نکھار آرہا ہے۔ لہٰذا اپنے معاون میاں حافظ عاکف سعید سلّمہ کے مشورے کے مطابق اب اس خطاب کی پہلی قسط اس شمارے میں قارئین کے استفادہ کے لئے پیش ہے۔ ان شاء اللہ امیر محترم کے اس موضوع پر اب تک جو خطابات ہوئے ہیں اور جو مستقبل قریب میں ہوں گے ان میں سے کوئی خطاب منتخب کر کے کتابی شکل میں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ورنہ پہلا خطاب تو تیار ہے ہی — 'میثاق' میں اس کی اشاعت کی تکمیل کے بعد اسے پمفلٹ کی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔

اس شمارے میں دوسرے خاصے کی چیز اس پروگرام کی روداد ہے جو رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ میں صلوٰۃ تراویح کے ساتھ دورہ ترجمہ قرآن اور اس کی مختصر تشریح و توضیح کی صورت میں قرآن اکیڈمی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ راقم کی معلومات کی حد تک برصغیر پاک و ہند میں اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے اس نوع کا کام پہلی بار مکمل طور پر انجام پذیر ہوا ہے۔ اس طرح یہ کام ایک تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ جون جیسے گرم مہینہ میں جبکہ امسال موسم گذشتہ سالوں کے مقابلے میں شدید تر تھا، ہر شب کو ۲ بجے تک دورہ ترجمہ قرآن اور صلوٰۃ تراویح کی ادائیگی کے لئے وقت دینا بادی النظر میں بڑا مشکل اور کٹھن کام تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جو تسہیل فرمائی اور امیر محترم کی جس طرح نصرت فرمائی اس کا شکر الفاظ میں ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ کام درحقیقت راقم کے نزدیک وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا کی عملی تفسیر تھی۔

جیسا کہ گذشتہ شمارے میں تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ ۲ جولائی کو امیر محترم شمالی امریکہ کے دعوتی دورے پر تشریف لے جانے والے ہیں۔ بحمد اللہ پروگرام کے مطابق امیر محترم تشریف لے جا چکے ہیں۔ چھ جولائی کو جمعہ تھا۔ امیر محترم نے جامع الصفا عقب الاعظم اسکوائر کراچی میں خطبہ جمعہ سے قبل "جہاد بالقرآن" کے موضوع پر نہایت دلنشین اسلوب سے خطاب ارشاد فرمایا۔ (یہ خطاب محاضرات قرآنی کے چھٹے سالانہ اجلاس میں بھی کیا گیا تھا جس کی پہلی قسط اس شمارے میں شامل ہے) حاضری خلاف توقع بہت تھی۔ یہ وسیع و عریض جامع مسجد بھی تنگیٔ داماں کا سماں پیدا کر رہی تھی۔ صلوٰۃ جمعہ کے بعد امیر محترم نے "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکیں اور علماء کے خدشات" کے موضوع پر خطاب ارشاد فرمایا۔ جمعہ سے قبل والے قریباً نصف سے زائد افراد اس میں شریک رہے۔ (ان شاء اللہ یہ خطاب ستمبر کے شمارے میں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی)۔ اس دورے میں ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کے علاوہ قرآن اکیڈمی کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر ابصار احمد صاحب ایم۔اے پی ایچ ڈی۔ ایم فل، رفیق تنظیم اور اعزازی مدیر "ماہنامہ حکمت قرآن"

بھی امیر محترم کے شریک سفر ہیں۔ ان شاء اللہ ۱۰ اگست ۸۴ء تک امیر محترم کی پاکستان مراجعت ہو گی موصوف کی عدم موجودگی میں مسجد دارالسلام میں تقریر، خطبہ اور صلوٰۃ جمعہ کے فرائض ڈاکٹر تقی الدین صاحب انجام دے رہے ہیں۔ اور قائم مقام امیر تنظیم محترم قمر سعید قریشی صاحب ہیں۔

تنظیم اسلامی کا تعلیمی و تربیتی چالیس روزہ پروگرام

یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ کسی انقلابی تحریک کے کارکنوں میں جذبۂ عمل پیدا کرنے کے لئے مقصد کا شعور اور اپنے نقطۂ نظر کی حقانیت پر انشراح صدر ہونا اشد ضروری ہے پھر ان میں وہ صلاحیت اور سلیقہ بھی ہونا چاہیئے جو کسی دوسرے فرد کو اپنی دعوت سے متعارف کرانے کے لئے ضروری ہے۔ نیز انہیں لوگوں کے اشکالات اور مخالفین و معاندین کے اعتراضات اور الزامات کا جواب بھی معلوم ہونا چاہیئے۔

مندرجہ بالا اوصاف کو پیدا کرنے کے لئے ایک نہایت وسیع الاطراف اور جامع تعلیمی نظام سے کارکنوں کو گزارنا ناگزیر ہے۔ پھر چونکہ کسی دعوت سے متعارف ہونے کے بعد اس میں عملی طور پر شریک ہونے والوں کے سابقہ پس منظر کے اعتبار سے مختلف استعداد کے لوگ اس میں موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا کسی ایک کورس میں سب کے لئے دلچسپی پیدا کرنا مشکل کام ہے اور اس کے پیش نظر تعلیمی نظام کا مختلف مدارج پر مبنی ہونا ضروری ہے جس میں مختلف لوگ مختلف مراحل میں شریک ہو سکیں اور جن کے لئے ضروری ہو وہ بالکل ابتدائی مراحل تعلیم و تربیت سے سلسلہ تعلیم سے گزریں۔

مزید برآں ایک اسلامی انقلابی تحریک کے کارکن یا بالفاظ دیگر داعی الی اللہ کے لئے جہاں کتاب اور سنت کے علم اور فرائض دینی کے شعور کو پیدا کرنے کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے وہیں ان کی عملی تربیت یعنی تزکیۂ نفس اور ان میں تعلق مع اللہ کو پیدا کرنے کی سعی کرنا اس سے بھی زیادہ اہم کام ہے۔ آپ چاہیں تو اسے تعمیر سیرت و کردار کا نام دے لیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام فطری طور پر جس اعلیٰ نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول کی طرف نوع انسانی کو متوجہ کرتا ہے۔ اس کے یقین اور ایمان کا لازمی نتیجہ ایک اعلیٰ سیرت و کردار کی حامل شخصیت کا معرض وجود میں آنا ہے۔ اسی سے آگے چل کر ایک اعلیٰ اقدار پر مبنی معاشرہ وجود میں آئے گا۔ اور بالآخر ایک عدل و قسط پر مبنی نظام حکومت کا قیام ممکن ہو گا لہٰذا مؤثر داعی حقیقی وہی ہو سکتا ہے کہ جس کے ظاہر اور باطن، قول و فعل میں پوری مطابقت پائی جاتی ہو۔

جب ہم ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر ایک انقلابی اسلامی تحریک کے کارکنوں کے

تعلیم اور تربیت کے نظام کا کوئی خاکہ اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ کام نہایت دشوار اور کٹھن معلوم ہوتا ہے لیکن دوسری طرف یہ ناگزیر بھی ہے لہٰذا صرف اللہ کی تائید اور توفیق کے بھروسے پر تنظیم اسلامی کے رفقاء کے لئے بیس بیس دن پر مشتمل تعلیمی و تربیتی کورس مرتب کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کا پہلا کورس بحمداللہ تعالیٰ ۲۰ جولائی ۱۹۸۳ء سے شروع ہو گیا ہے اور اس پہلے مرحلہ کے اختتام کے متصلاً بعد دوسرا بیس روزہ کورس رکھا گیا ہے تاکہ جو لوگ پہلے مرحلہ کو کامیابی کے ساتھ مکمل کرلیں اور ان کے لئے چالیس دن کی چھٹی پر آنا بھی ممکن ہو تو وہ ایک ہی سفر میں دو نصابی مراحل طے کرلیں۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ جو حضرات اس قسم کے بیس بیس روزہ آٹھ مراحل کو مکمل کرلیں گے انہیں کام کرنے کی کافی حد تک صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ اس پہلے پروگرام میں تا حال تیس رفقاء شریک ہوتے ہیں پروگرام کا مختصر تعارف یہ ہے کہ دن کے اوقات میں تجوید کے بنیادی اصولوں کی تعلیم عربی کی ابتدائی و بنیادی تعلیم۔ فارسی کی ابتدائی و بنیادی تعلیم، نیز دعوتی تالیفات کا مطالعہ، اس مذاکرہ اور افہام و تفہیم۔ رکھی گئی ہے۔ صبح صلوٰۃ فجر اور شام صلوٰۃ مغرب کے بعد احادیث شریفہ کے دروس رکھے گئے ہیں۔ ان احادیث کا درس پیش نظر ہے جن سے محاسبۂ اخروی پر قلوب میں حقیقی و پختہ یقین پیدا ہو سکے چونکہ انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز ہونے والا مؤثر ترین ایمان' ایمان بالآخرہ ہے۔ علاوہ ازیں ان احادیث کا درس بھی شامل کیا گیا ہے جن میں آداب ' اذکار متواردہ، تسبیح و تحمید، تکبیر، تہلیل، استغفار وغیرہ کے معمولات یومیہ کی تعلیم ہے۔ تاکہ شرکاء ان کو زبانی یاد کرکے ان کو اپنے معمولات میں شامل کرنے کی توفیق پائیں۔ مزید برآں تلاوتِ قرآن حکیم کی صحت کے لئے بھی پروگرام رکھا گیا ہے اور قیام اللیل کا بھی بند و بست پیش نظر ہے۔

اس تعلیمی و تربیتی پروگرام کے منتظم و نگران اعلیٰ کے فرائض محترم ڈاکٹر تقی الدین صاحب پی ایچ ڈی کو تفویض کئے گئے ہیں۔ جن کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی نے مرکز میں نائب امیر برائے تعلیم و تربیت مقرر کیا ہے۔ اسی مقصد کے لئے ڈاکٹر تقی الدین صاحب کراچی سے لاہور منتقل ہونے کا انتظام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جب مغربی جرمنی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے تو ان کا الاخوان المسلمون سے تعلق رہا ہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر ان کا کچھ عرصہ سعودی عرب میں بھی قیام رہا ہے۔ عربی زبان پر انہیں پہلے سے عبور حاصل ہے اور کتاب و سنت پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ سعودی عرب سے کراچی مراجعت کے بعد موصوف اپنے طور پر کراچی میں دعوت و تبلیغ اور قرآن حکیم کی تعلیم و تدریس کا کام کر رہے تھے۔ قریباً

چار سال قبل موصوف تنظیم اسلامی سے متعارف ہوئے اور اس کی دعوت کو اپنے فکر و نظر کے مطابق پاکر اس پر لبیک کہا۔ تنظیم میں شامل ہونے کے بعد موصوف نے درس نظامی کے نصاب کی تکمیل کی طرف توجہ دی۔ چونکہ محمد اللہ عربی زبان پر عبور پہلے ہی سے حاصل تھا اور قرآن و حدیث کا ذاتی مطالعہ تھا۔ لہٰذا بہت کم عرصہ میں درس نظامی کی تکمیل کر لی۔ اب وہ باقاعدہ مستند عالم دین ہیں۔

اس تعلیمی و تربیتی پروگرام میں عربی کی تعلیم کے لئے حافظ احمد یار صاحب سابق صدر شعبۂ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی اور فارسی تعلیم کے لئے جناب شبیر احمد صاحب بخاری سابق ڈائریکٹر آف ایجوکیشن صوبہ پنجاب نے اپنی خدمات پیش کی ہوئی ہیں ——— اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر سے نوازے ——— دیگر امور کے لئے قرآن اکیڈمی کے فیلوز میں سے حافظ عاکف سعید اور حافظ محمد رفیق کے سپرد بھی کچھ ذمہ داریاں کی گئی ہیں درس حدیث محترم ڈاکٹر تقی الدین صاحب نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر و ادنیٰ کوشش کو بارآور فرمائے اور اس میں حصہ لینے والوں کو اس سے صحیح استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس پروگرام کو تنظیم اسلامی کے رفقاء کیلئے خیر و برکت اور رحمت و مغفرت کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

اسٹاپ پریس

۲۸ جولائی: تازہ ترین اطلاع یہ ملی ہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی کے برطانیہ کے دعوتی دورے کا پروگرام بھی بن گیا ہے۔ موصوف کا وہاں قریباً ایک ہفتہ قیام رہے گا۔ آپکی واپسی ۱۴ اگست تک متوقع ہے!

(بقیہ الہدیٰ)

حضرات! ہم نے اس مختصر وقت میں اس آیتِ مبارکہ کو سمجھنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ ہم پر آج کے سبق میں واضح ہوا کہ ایمان درحقیقت ایک نور ہے، ایک روشنی ہے جس سے انسان کا باطن منور ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب انسان کا باطن منور ہو جائے گا تو اس کے کچھ آثار اس کے رویئے میں، اس کے اخلاق میں، اس کی دلچسپیوں میں، اسکی سیرت و کردار میں نمایاں ہوں گے۔ اب اگلے درس میں ان شاء اللہ ہم اسی رکوع کی آیات کے حوالے سے ان اثرات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ وَمَا توفیقی الا باللہ العلی العظیم

وَاٰخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین ۰

(۱۷ویں نشست)
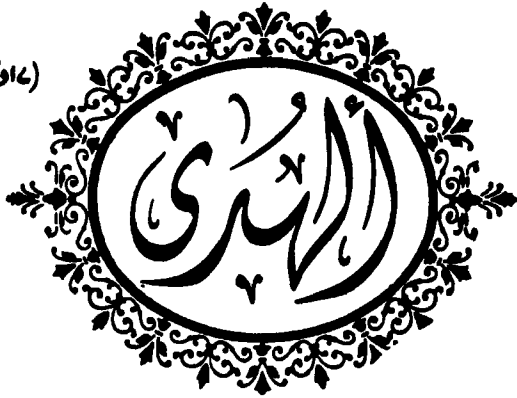
نورِ ایمانی کے اجزائے ترکیبی:
نورِ فطرت اور نورِ وحی

(مباحث ایمان ۔ درس ثالث)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۱)

السلام علیکم ۔ نحمدہٗ و نصلی علٰی رسولہ الکریم ۔ اما بعد
اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ
فِیۡہَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ فِیۡ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ
کَاَنَّہَا کَوۡکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ
زَیۡتُوۡنَۃٍ لَّا شَرۡقِیَّۃٍ وَّ لَا غَرۡبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیۡتُہَا یُضِیۡٓءُ
وَ لَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡہُ نَارٌ ؕ نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ ؕ یَہۡدِی اللّٰہُ

لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۙ

صدق اللہ العظیم ہ

وہ اللہ ہی روشنی ہے آسمانوں اور زمین کی - اس کے نور کی مثال یوں ہے جیسے ایک طاق ہو اس میں ایک چراغ ہو - چراغ ایک شیشے (فانوس) میں ہو اور وہ شیشہ ایک چمکدار ستارے کے مانند روشن ہو - اس چراغ میں جلتا ہے تیل ایک ایسے مبارک زیتون کے درخت کا جو نہ شرقی ہو نہ غربی - اس کا روغن بھڑک اٹھنے کو تیار ہو خواہ اُسے آگ نے نہ چھوا ہو - یہ روشنی ہے روشنی پر - اللہ ہدایت دیتا ہے اپنے نور کی جانب جس کو چاہتا ہے - اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے - اور اللہ تو ہر چیز سے کما حقہٗ واقف ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے -

معزز حاضرین و محترم سامعین !

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس ان مجالس میں ہو رہا ہے، اس ضمن میں یہ چھٹا سبق ہے اور مباحث ایمان کے ذیل میں درس ثالث، یہ درس سورہ نور کے پانچویں رکوع پر مشتمل ہے - جس کی پہلی آیت اور اس کا رواں ترجمہ ابھی آپ نے سماعت فرمایا -

یہ رکوع کل چھ آیات پر مشتمل ہے - یہ رکوع پورے قرآن مجید میں بھی ایک منفرد اہمیت کا حامل ہے - بالخصوص سورہ نور میں اس کی حیثیت بالکل ایسے ہے جیسے ایک بہت اعلیٰ اور خوبصورت انگوٹھی ہے جس کے درمیان میں نہایت قیمتی نگینہ جڑا ہوا ہے - اس لئے کہ سورہ نور کل ۹ رکوعوں پر مشتمل ہے اور یہ پانچواں رکوع عین اس کے وسط میں واقع ہے - چار رکوع اس سے قبل ہیں اور چار رکوع مابعد - اس میں ایمان اور اس کی اصل حقیقت کو تمثیلات کے پیرائے میں سمجھایا گیا ہے - چنانچہ پہلی آیت جو ہمارے آج کے درس کا موضوع ہے، اس میں ایمان کی حقیقت، اس کی ماہیت کے لئے تمثیل لائی گئی کہ وہ

ایک نور ہے، روشنی ہے جس سے انسان کا قلب، اس کا سینہ اور نتیجۃً اس کا پورا وجود، اس کی پوری شخصیت منوّر ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کہ اس نور کے اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک وہ نورِ فطرت جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ ہے اور دوسرا نورِ وحی جس سے اس نور کی تکمیل ہوتی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم میں تمثیلوں اور تشبیہوں کو اس قدر کثرت سے کیوں استعمال فرمایا گیا ہے۔ ا یہ بات بھی جان لیجئے کہ صرف قرآن مجید ہی میں نہیں بلکہ تمام آسمانی کتابوں کا یہ ایک وصفِ مشترک ہے خصوصاً انجیل میں تمثیلیں نہایت کثرت سے بیان ہوئی ہیں۔ نہایت اعلیٰ تمثیلیں، جو دنیا کے اکثر کلاسکل ادب میں ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔۔ ان کا اصل سبب یہ ہے کہ بعض مضامین اتنے لطیف ہوتے ہیں اور عام انسانی فہم و ادراک سے بالعموم اتنے بلند ہوتے ہیں کہ اگر انہیں عام انداز میں بیان کیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ فائدے سے زیادہ نقصان ہو جائے اور عوام اس سے مغالطے میں مبتلا ہو جائیں۔ دوسری طرف ان حقائق کا ایک اجمالی تصوّر دینا بھی انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے ضروری ہے لہٰذا آسمانی کتابوں میں ایسے حقائق کے ضمن میں تمثیل یا تشبیہ کا پیرایہ اختیار کیا گیا تاکہ اس سے ہر شخص اپنے فہم و شعور کے مطابق اس کا مطلب اخذ کر لے۔ چنانچہ انجیل میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک حواری نے سوال کیا کہ "اے باپ! آپ تمثیلوں میں گفتگو کیوں کرتے ہیں!" حضرتِ مسیحؑ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ "تاکہ وہی سمجھیں کہ جن کا سمجھنا مفید ہے" یعنی تمثیل کی احتیاج انسان کو ہے، اللہ کو نہیں: وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط۔ "اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے" وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ط۔ "اور اللہ کو تمام چیزوں کا علم ہے" ۔۔ اور علم کما حقہ بھی ہے اور کما ہی بھی۔ ہر شے کی اصل حقیقت اس پر روشن ہے۔ تمثیل کی احتیاج معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، اللہ کو نہیں ہے بلکہ اصلاً ہمیں ہے۔ اسکی ایک اور مثال بھی میں آپ کے سامنے رکھ دوں کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ قانونِ اسلامی کی بنیاد صرف قرآن مجید پر نہیں ہے بلکہ سنتِ رسول بھی اس کی دوسری

بنیاد ہے اور ضروری ہے۔ تو بعض لوگ ناسمجھی میں یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو سنت کی ضرورت ہے! قرآن سنت کا محتاج ہے! معاذ اللہ۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم قرآن کو سمجھنے اور زندگی کے تمام گوشوں اور معاملات میں عملی رہنمائی کے حصول کے لئے سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے محتاج ہیں۔ قرآن میں فرمایا گیا: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ "(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) اور ہم نے آپ کی جانب یہ ذکر یعنی قرآن نازل فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے واضح کریں جو اُن کے لئے نازل کیا گیا ہے۔" قرآن کی تبیین، قرآن کی تشریح و توضیح یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرضِ منصبی ہے اور ہم قرآن کو سمجھنے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات اور ارشادات کے محتاج ہیں۔ بالکل یہی بات یہاں ہے کہ تمثیلوں کی احتیاج اللہ کو نہیں ہے: وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ۔ ان کی احتیاج ہمیں ہے۔

اب آیئے اس تمثیل پر غور کیجئے ارشاد ہوتا ہے: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "آسمانوں اور زمین کی روشنی اللہ ہی ہے"۔ ظاہرِ الفاظ سے یہاں ایک مغالطہ ہو جاتا ہے کہ شاید یہاں نور کا اطلاق باری تعالیٰ کی ذات پر ہو رہا ہے اس مغالطہ سے بچنے کی بڑی ضرورت ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق یہ جان لیجئے بقولِ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کہ وہ ذات وراء الوریٰ ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ یا جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الذَّاتِ اِدْرَاكٌ۔ "اللہ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہو جانے ہی کا نام ادراک ہے۔" معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد۔ جب انسان جان لیتا ہے کہ میں اللہ کی ذات کو جان نہیں سکتا تو یہی کمالِ عرفان ہے۔ یہی بات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمائی: وَالْبَحْثُ عَنْ كُنْهِ الذَّاتِ اِشْرَاكٌ۔ "اللہ کی ذات کے بارے میں بحث اور کھود کرید سے انسان شرک اور فتنہ میں مبتلا ہو جائے گا۔" امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر کبیر میں بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ یہ نور کوئی مادی شے ہے یا یہ کوئی عارضی کیفیت ہے۔ اور ان دونوں کی نسبت باری تعالیٰ کے ساتھ محال ہے، ناممکن ہے لہٰذا نور کا اطلاق ذاتِ باری تعالیٰ

پر نہیں ہے۔ پھر ایک دلیل یہاں بھی موجود ہے۔ اس آیت میں دو مرتبہ آیا ہے۔ "نورِہٖ" — یہ مرکب اضافی ہے جب کسی شے کی اضافت کسی کی طرف کی جاتی ہے تو وہ شے اس کا غیر ہے۔ جیسے میرا قلم، قلم علٰحدہ ہے۔ میں علٰحدہ ہوں۔ یہ نسبت میرے اور قلم کے مابین ہے۔ تو نورہٖ کے معنی ہیں اس کا یعنی اللہ کا نور۔ تو نور کا اطلاق ذاتِ باری تعالیٰ پر درست نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں لفظِ نور بطورِ استعارہ آیا ہے۔

اب آپ سمجھئے۔ ہم جس نور سے واقف ہیں، اُسے نورِ خارجی کہیئے۔ خارجی روشنی۔ یہ نور یا روشنی اصل میں اشیاء کے ظہور کا ذریعہ بنتی ہے۔ ہم سب یہاں موجود ہیں۔ روشنی کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ لیکن کسی سبب سے یہ روشنی چلی جائے۔ فیوز ہو جائے تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکیں گے درآں حالیکہ ہم سب کی آنکھوں میں دیکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ اشیاء کا ظہور بواسطہ نور ہو رہا ہے۔ یہ ہے نورِ خارجی — اسی طرح ایک نور باطنی ہے۔ جس سے حقائقِ اشیاء ظاہر ہوتی ہیں۔ جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دُعا آئی ہے: اللّٰھم ارنی حقیقۃ الاشیاءِ کماھیَ۔ اے اللہ مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی فی الواقع وہ ہیں۔" شاید اسی سے شاعر نے خیال لے کر کہا ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن   جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا!

تو وہ جو ایک بصیرتِ باطنی ہے اُسے ایک نورِ باطنی کی ضرورت ہے اور وہ نورِ باطنی ہے معرفتِ نورِ خداوندی ہے اسی نور خداوندی کا ذکر ہے سورۂ بقرہ میں آیت الکرسی سے متصلاً دوسری آیت میں: اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ — اللہ کو پہچان لیں گے۔ تو اس کائنات کے جملہ حقائق، حقائقِ کونیہ، حقائقِ تکوینی، حقائقِ تشریعی، سب کے سب روشن ہو جائیں گے، نظر آئیں گے۔ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ آغاز کیا ہے! اختتام کیا ہے! اس کائنات کی حقیقت کیا ہے! حیات کی حقیقت کیا ہے! موت کی حقیقت کیا ہے! خیر کی حقیقت کیا ہے! شر کی حقیقت کیا ہے! علم کسے کہتے ہیں۔ مجازات و مکافات کیوں ضروری ہیں؟

یہ ساری چیزیں انسان کو معلوم ہوں گی اگر وہ اللہ کو جان لے۔ جس طریقے سے ہماری بصارتِ ظاہری کے لئے نورِ خارجی ضروری ہے اسی طرح اندرونی بصیرت کے لئے نورِ باطنی، نورِ معنوی ضروری ہے جو عبارت ہے معرفتِ خداوندی سے: اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

اب آگے چلیے ارشاد فرمایا: مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْہَا مِصْبَاحٌ۔ یہاں جو "نُوْرِہٖ" ہے، اس کی تفسیر میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ متکلمین کی اکثریت نے اسے نورِ ہدایت قرار دیا ہے کہ یہاں تمثیل نورِ ہدایت کے لئے ہے۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ یہاں مراد ہے قرآن۔ چونکہ خود قرآن مجید میں کئی مقامات پر قرآن کو "نور" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہاں نور سے مراد ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپؐ کے بارے میں فرمایا گیا: سِرَاجًا مُّنِیْرًا ط۔ "آپؐ ایک روشن چراغ ہیں۔" ویسے ہم تینوں کو جمع کرلیں تو کوئی حرج نہیں یہ ایک ہی بات ہے۔ جیسے سورہ بیّنہ میں ارشاد فرمایا: لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ لا "یہ سارے اہل کتاب اور یہ سارے مشرکین باز آنے والے نہ تھے اپنے کفر اور شرک سے جب تک کہ ان کے پاس تنبیہ نہ آجاتی۔" آگے فرمایا کہ وہ اَلْبَیِّنَہ کیا ہے۔ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً لا فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ہ "رسول اللہ کی طرف سے جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتے جن میں بالکل راست اور درست باتیں لکھی ہوئی ہوں۔" رسول اور صحیفے پاک نامیں یہ مل کر ایک وحدت بنتے ہیں اور یہ ہے بیّنہ ـــ یہ ہے اللہ کی دلیل، یہ ہے اللہ کی حجت، یہ ہے اللہ کی برہان۔ ویسے 'مَثَلُ نُوْرِہٖ' کے ضمن میں دو صحابہؓ کی رائے نہایت قابلِ غور ہے۔ یہ دونوں صحابہؓ وہ ہیں جن کی قرآن فہمی کی خصوصی فضیلت حضورؐ نے بیان فرمائی ہے۔ ایک ہیں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما اور دوسرے حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرت اُبی ابن کعبؓ فرماتے ہیں کہ یہاں مراد ہے: مَثَلُ نُوْرِ مَنْ اٰمَنَ ـــ "مثال اس کے نور کی جو ایمان لے آیا۔" اس کو جو ایمان لے آئے اللہ تعالےٰ

کی طرف سے ایک نور عطا ہوتا ہے - اور حضرت عبداللہ ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ یہاں مراد ہے: مَثَلُ نُوْرِہٖ فِیْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ - " اللہ کا ایک نور وہ بھی ہے جس کی جلوہ گاہ بنتا ہے ایک مومن کا قلب " مراد ہوا ایمان - ایمان کا محل و مقام قلب مومن ہے ——— اس میں جو نور ایمان پیدا ہوتا ہے آگے اس کی تمثیل بیان کی گئی ہے کہ جیسے ایک طاق ہے —— اب ذرا آپ غور کیجئے اور اپنے جسم کی ساری ہڈیوں کے پنجرے کو اپنے تصور میں لائیے - تو سینے کی جو ہڈیاں اور پسلیاں ہیں وہ بالکل ایک طاق کے مانند ہیں - ڈایافرام (DIAPHRAGM) جو ہمارے سینے کو معدے وغیرہ سے جدا کرتا ہے، اس کا فرش ہے اور اس پر اس کا قلب رکھا ہوا ہے - جب یہ قلب ایمان سے منور ہو جاتا ہے تو اب یہ ایک چراغ ہے: كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ - " جیسے ایک طاق ہو اور اس میں ایک چراغ رکھا ہوا ہو " یہ چراغ ایک شیشے میں ہے: اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ - دیکھئے اگر چراغ شیشہ (فانوس) میں نہ ہو کسی قندیل میں نہ ہو تو چراغ کی لو ہوا سے اِدھر اُدھر منتشر ہوتی رہتی ہے - جب چراغ شیشے میں آجاتا ہے تو وہ ایک مرکز پر ایک جگہ پر قائم رہتی ہے جس سے روشنی بالکل یکساں طریقے اور ہموار طور پر اپنے ماحول میں سرایت کرتی ہے - اس چراغ میں جو تیل جلتا ہے —— اب اس تمثیل کی جو اصل فصاحت و بلاغت ہے وہ آ رہی ہے: اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ - " فانوس کی کیفیت یہ ہو جیسے چمکتا اور جگمگتا ہوا تارا - اس چراغ میں جلتا ہو ایک ایسے بابرکت زیتون کے درخت کا تیل ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا روغن آپ سے آپ سلگ جانے کے لئے بیتاب ہو - چاہے آگ نے ابھی اُسے چھوا نہ ہو۔ " اس زیتون کے درخت کے متعلق حضرت ابن عباس رض کا قول ہے کہ اُس سے ایسا درخت مراد ہے جو یا تو کسی پہاڑی کی چوٹی پر ہے یا کسی میدان میں تنہا درخت ہے ایسے درخت پر صبح سے لے کر شام تک سورج کی حرارت و تمازت اثر انداز ہوتی ہے - اگر درختوں کا کوئی جھنڈ ہو تو اگر اس کے شرقی گوشے میں کوئی درخت ہوگا تو شام

کی دھوپ اُسے نہیں ملے گی ۔ اگر غربی گوشے میں کوئی درخت ہوگا تو صبح کی دھوپ اُسے میسر
نہیں آئے گی ۔ لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں ۔
کہ ایسے درخت کا تیل نہایت صاف و شفاف ہوتا ہے ۔ وہ بھڑک جانے پر
تیار ہوتا ہے ۔ اس شرقی و غربی کے لفظ سے میرا ذہن علامہ اقبال کے اس
مصرع کی طرف منتقل ہوا ع درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی ۔ یہ جو
نسبتیں ہوتی ہیں انکی وجہ سے بھی انسان میں عصبیت پیدا ہوجاتی ہے جس کے
باعث وہ حقائق سے محروم ہوجاتا ہے ۔

زیتون کے اس درخت کے روغن کی خصوصیت و کیفیت یہ بیان ہوئی ہے
کہ وہ اتنا صاف و شفاف ہے کہ بھڑکنے اور مشتعل ہونے کے لئے بیتاب ہے ، مچل
رہا ہے چاہے اُسے آگ نے نہ چھوا ہو ۔ جدید دور میں اس کی اگر ہم مثال دیں
گے تو وہ پٹرول ہے ۔ آپ مٹی کے تیل سے بھی دیا جلاتے ہیں ۔ لیمپ اور
لالٹین روشن کرتے ہیں ۔ سرسوں کے تیل سے بھی دیا جلائیں گے ۔ لیکن اس
کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں ۔ اس کے لئے بتی چاہیئے ، کپڑا چاہیئے ۔
تب وہ جلے گا ۔ اس کو براہ راست دیا سلائی دکھائیں تو وہ نہیں جلے گا ۔ اس
کے برعکس پٹرول ہے کہ دیا سلائی اس سے ابھی دور ہے ۔ قریب بھی نہیں
لیکن پٹرول اس روشن دیا سلائی کو خود آگے بڑھ کر آگ کو پکڑنے اور لپکنے
کے لئے بیتاب ہے ۔ ع نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے ۔ یہاں یہ
انداز ہے ۔

پس اس روغن سے درحقیقت ایک سلیم الفطرت انسان کی مثال دی
گئی ہے ، جس نے اپنی انسانیت کے جوہر کو اور اپنی فطرت کو محفوظ رکھا ۔ اس میں
کثافتیں نہیں آنے پائیں ۔ اس میں عصبیتیں نہیں ہیں ۔ بلکہ وہ اپنی اصل حقیقت
پر سلامتیٔ طبع اور سلامتیٔ فطرت کے ساتھ قائم و برقرار ہے ۔ یہ روغن بھڑک
اٹھنے کو تیار ہے اگر نورِ وحی ذرا اس کے قریب آجائے تو اس کا باطن جگمگا
اُٹھتا ہے ۔ جیسے حضرتِ ابوبکر صدیق ، حضرت علی ، حضرتِ عثمان ، حضرت زید بن
حارثہ اور سابقون الاوّلون صحابہ کرام رضی اللہ تعالٰی عنہم اور جیسے خدیجۃ الکبٰریٰ

رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ درحقیقت یہ مثال ان صدیقین کے ایمان کی ہے کہ جو خود بیتاب ہوتے ہیں کہ جیسے توحید کی دعوت سامنے آئے اُسے آگے بڑھ کر قبول کر لیں۔ جیسے ہم نے سورہ آل عمران کے آخری رکوع کی آیات کے مطالعہ میں اس آیت کا بھی مطالعہ کیا تھا: رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۔ بس یہ ہے وہ نورِ ایمان جس کے اجزائے ترکیبی دو ہیں، ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی ۔ اسی حقیقت کو اس آیت مبارکہ میں آگے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ " نور پر نور"۔ دو انوار سے مرکب ہو کر نورِ ایمان تیار ہوتا ہے۔ جس سے انسان کا قلب منوّر ہوتا ہے، پھر وہ طاق منوّر ہوتا ہے، پورا سینہ اس سے منوّر ہوتا ہے۔ پھر ان انوار سے انسان کا پورا وجود، اس کی پوری شخصیت منور ہو جاتی ہے۔ پھر جو انسان وجود میں آئے گا، اس کا نقشہ اگلی آیات میں دیا گیا ہے جو ان شاء اللہ ہم اگلی نشست میں پڑھیں گے۔ اب آج پہلی آیت کے بارے میں، میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کے متعلق اگر کچھ سوالات ہوں تو آپ پیش فرمائیں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے درس کے دوران بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق بحث و تمحیص سے گریز کرنا چاہیئے اس وجہ سے کہ بعض اوقات بات شرک تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کو جان لینا ایک بندہ مومن بننے کے لئے دلیل ہے۔ کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے۔؟

جواب: بڑا پیارا سوال ہے، بہت متعلق سوال ہے۔ اصل میں اللہ کو جان لینے یا اللہ کی معرفت کے دو اجزا ہیں۔ ایک ہے اللہ کی ذات کو جان لینا۔ ایک ہے اللہ کی صفات کو جان لینا۔ ہم اللہ کی ذات کو نہیں جان سکتے وہ وراء الوریٰ ہے ثم وراء الوریٰ ہے۔ جیسا کہ میں نے تفصیل کے ساتھ عرض کیا۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کا جو علم ہے یا اس کی جو معرفت ہے وہ کُل کی کُل اس تعالیٰ کی صفات سے متعلق ہے۔ ہم اللہ کو اس کی صفات کے حوالے ہی سے جان سکتے ہیں۔ اسی

کی ذاتِ سبحانہٗ کو جان لینا ہمارے لئے ممکن نہیں - اس بات کی تفہیم کے لئے میں نے حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا، جو صحابہ کرامؓ میں سب سے اعلیٰ وارفع عارف باللہ ہیں، یہ قول آپ کو سنایا تھا = اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الذَّاتِ اِدْرَاكٌ : اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک سے عاجز آجانا ہی ادراک ہے - ذات کا تصور مستلزم ہے محدودیت (Limitation) کو اور اللہ کے متعلق جہاں محدودیت کا الحاق ہوا وہیں شرک ہو گیا چنانچہ یہی بات اُمت کے دوسرے بڑے عارف حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اُس قول میں ہے جو میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ: وَالْبَحْثُ عَنْ كُنْهِ الذَّاتِ اِشْرَاكٌ -

سوال : ڈاکٹر صاحب! اللہ تعالیٰ کے اسم علیم کی وضاحت تشنہ سی محسوس ہوئی - اس کی ذرا مزید توضیح فرمائیں -

جواب : اس آیت میں لفظ "عَلِیْمٌ" آیا ہے - اس مقام پر یہ لفظ صفت کے طور پر آیا ہے - اسم کے طور پر نہیں آیا - جب اس پر الف لام داخل کر کے معرفہ بنائیں گے یعنی "اَلْعَلِیْمُ" تو یہ اللہ تعالیٰ کا صفاتی اسم بن جائے گا بہر حال جب صفت یا اسم صفت کے طور پر لفظ علیم اللہ کے لئے آئے گا تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ تعالیٰ ہر شے کو جاننے والا ہے اور شے کے ساتھ ہی اس کی اصل حقیقت کو جاننے والا ہے - ہم جن چیزوں پر لفظ علم کا اطلاق کرتے ہیں، وہ اس شے کی ظاہری یا خواص یا تجربات سے متعلق کچھ باتیں ہوتی ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں پھر یہ کہ ہمیں ان کی تحصیل کرنی ہوتی ہے - جب کہ اللہ تعالیٰ بذاتہٖ ہر شے کی اصل حقیقت کو جاننے والا ہے - اُس ذاتِ سبحانہٗ کو معاذ اللہ نہ تحصیلِ علم کی ضرورت ہے نہ اشیاء کے خواص و تاثیر کے لئے تجربات کی، اس لئے کہ وہ ہر شے کا خود ہی خالق ہے اور ہر چیز کی اصل حقیقت کو وہ خود بنانے اور از خود جاننے والا ہے - جیسا کہ میں نے تمثیل کے ضمن میں بھی عرض کیا تھا کہ معاذ اللہ اس کی اللہ کو حاجت نہیں ہے - تعلیم و تفہیم اور شعور و ادراک کے لئے تمثیلوں کی احتیاج ہم کو ہے - ہم اس کے محتاج ہیں -

(بقیہ صفحہ ۲۶ پر)

جہاد بالقرآن

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَزَّ وَجَلَّ فِیْ سُوْرَۃِ الْفُرْقَانِ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
فَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا ○
صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ○

محترم صدرِ مجلس، مکرم علمائے عظام اور معزز حاضرین کرام!

آپ حضرات کو اخباری اعلان سے یہ علم ہو چکا ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام ہونے والے اس چھٹے سالانہ محاضراتِ قرآنی میں مجھے بطورِ افتتاحیہ: **جہادِ بالقرآن** کے موضوع پر کچھ عرض کرنا ہے چنانچہ میں نے اس وقت کی اپنی گفتگو کے عنوان کے طور پر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر ۵۲ کی تلاوت کی ہے۔ اس میں نبی اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ

"(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان کافروں کا کہنا بالکل نہ مانیے"، وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا ○ "اور اُن کے ساتھ مجاہدہ کیجیے، کشمکش کیجیے۔ اس قرآن کے ذریعے سخت مجاہدہ اور شدید کشمکش"۔ چونکہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام اسی بنیاد پر عمل میں آیا تھا چنانچہ اس کے زیرِ اہتمام دسمبر ۱۹۷۲ء سے مسلسل سات سال تک قرآن کانفرنسوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا اور لاہور اور کراچی میں بفضلہٖ تعالیٰ ہم نے سات نہایت عالی شان سالانہ قرآنی کانفرنسیں منعقد کیں۔ اس کے بعد بعض اسباب سے ہم نے عنوان بدلا۔ جن میں سب سے بڑا سبب یہ تھا جس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے لئے باعثِ مسرت اور یہ بارگاہ رب العزت میں ہماری ان حقیر کوششوں کے مقبول ہونے کا کسی درجہ میں سہی، ایک مظہر بھی ہے کہ "قرآن کانفرنس" کا لفظ اتنا مقبول ہوا اتنا معروف اور مشہور ہوا کہ جا بجا نہ صرف متعدد قرآن کانفرنسیں، جنہیں بجا طور پر قرآن کانفرنسیں قرار دیا جاسکتا ہے،

منعقد ہوئیں بلکہ بات یہاں تک جا پہنچی کہ اگر کسی تجوید کے مدرسہ کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد کا انعقاد ہوا تو اس کا عنوان بھی "قرآن کانفرنس" قرار دیا جانے لگا تو ہم نے پھر اس کو چھوڑ کر 'محاضراتِ قرآنی' کی اصطلاح سے ان مجالس کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں بنیادی طور پر پیشِ نظر یہ بات تھی کہ کانفرنسوں میں ایک طرف سامعین کا اور دوسری طرف مقررین کا جو ہجوم ہو جایا کرتا ہے اور تحریری مقالات و خطبات کی بجائے عام طور پر تقریریں زیادہ ہوتی ہیں تو مطلوبہ مقاصد کما حقہٗ حاصل نہیں ہوتے۔ گو یقیناً اس سے یہ فائدہ تو حاصل ہوا کہ قرآن مجید لوگوں کی نظر و التفات کا نقطۂ ماسکہ و ارتکاز (FOCUS) بنا۔ اس کی طرف توجہات مرتکز ہوئیں۔ اس کی تلاوت کے ساتھ اس کے مطالعے، اس کی تعلیم و تعلّم اور اس میں تفکر و تدبر کے شوق و ذوق میں اضافہ ہوا۔ میرے نزدیک الحمدللہ یہ بھی بہت بڑا کام ہے۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے جلسوں کی افادیت اتنی نہیں جتنی ایک پرسکون ماحول میں مقالہ پیش کیا جائے یا لیکچر دیا جائے، پھر اس پر گفتگو، مذاکرہ اور افہام و تفہیم کا بھی موقع ہو، اس سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اگرچہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ محاضرات قرآنی سے سے جو مقصد حاصل کرنا پیشِ نظر تھا تا حال اسے ہم پوری طرح روبعمل نہیں لا سکے ہیں لیکن اس مرتبہ ان شاء اللہ ان محاضرات کی ایک نشست اسی طرز پر منعقد ہوگی جس میں 'اجارہ کی شرعی حیثیت' کے موضوع پر ایک مقالہ پیش ہوگا اور اس پر دیگر علمائے کرام اور اہل دانش و بینش کو گفتگو کا موقع فراہم کیا جائے گا تاکہ اس موضوع کے تمام جوانب و اطراف کھل کر سامنے آجائیں۔ بہرحال آج ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اِس چھٹے محاضراتِ قرآنی کی پہلی نشست کا آغاز کر رہے ہیں جو برِصغیر پاک و ہند کے مشہور و معروف عالمِ دین ممتاز شخصیت مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہٗ، ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی دیوبند، رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند اور ایڈیٹر ماہنامہ برہان دہلی (بھارت) کی صدارت میں منعقد ہو رہی ہے۔ مولانا کی یہ بڑی کرم فرمائی ہے کہ پیرانہ سالی اور شدید مصروفیات کے باوجود وہ ہماری درخواست پر بھارت سے تشریف لائے اور از راہِ تلطّف و تعاون موصوف نے اِن محاضرات کی تین نشستوں کی صدارت قبول فرمائی اور تین موضوعات پر اپنے گراں قدر ارشادات سے محاضرات کو مستفید فرمانے کی منظوری بھی عطا فرما دی جس کے لئے میں ذاتی طور پر بھی اپنی جانب سے اور مرکزی انجمن خدام القرآن کی طرف سے، مزید جملہ شرکاء مجلس کی

جانب سے مولانا موصوف کی خدمت میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔ یہ شکریہ محض رسمی نہیں ہے بلکہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تعمیل میں خلوصِ دل کے ساتھ ہے کہ : لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ مَنْ لَا یَشْکُرُ النَّاسَ ۔

درحقیقت یہ محاضراتِ قرآنی جہاد بالقرآن ہی کے سلسلے کی کڑیاں ہیں، لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ میں اِس نشست میں جہاد بالقرآن کے موضوع پر چند باتیں ابتدا میں عرض کردوں یہی باتیں درحقیقت مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے تمام مقاصد کی نشان دہی بھی کریں گی اور اس کے لئے ہمارے استدلال کا جو صغریٰ کبریٰ ہے، ان شاء اللہ اس کو بھی سامنے لے آئیں گی۔

جس آیتِ مبارکہ کی میں نے آغاز میں تلاوت کی ہے، اس میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں۔ ایک "لفظِ جہاد" جو اس آیتِ مبارکہ میں دو مرتبہ آیا ہے، ایک فعل امر کے طور پر جَاہِدْ اور دوسرے مفعول مطلق کے طور پر جِہَادًا کَبِیرًا۔ نہ صرف جہاد بلکہ شدید جہاد۔ بہت بڑا جہاد ۔ اس آیت میں اِس کا حکم دیا جارہا ہے، جناب محمد کو صلے اللہ علیہ وسلم: وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيرًا۔

مَیں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ بات تو سب کی سمجھ اور فہم میں بڑی آسانی سے آجاتی ہے لیکن یہاں بِهٖ کا جو چھوٹا سا لفظ آیا ہے، مَیں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اکثر و بیشتر ہمارے اہلِ علم حضرات بھی اس کی اہمیت پر غور و فکر کے بغیر سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ مَیں نے اسے نوٹ کیا ہے کہ جہاں بھی قرآن کے لئے بِهٖ بطور ضمیر مجرور مفعولی آیا ہے، ہمارے اہلِ علم الّا ماشاء اللہ اس کا وہ حق ادا نہیں کرتے جسے کماحقہٗ کہا جاسکے۔ اس بِهٖ کی اہمیت کے اظہار کے لئے دو مثالیں پیش کرتا ہوں :

پہلی مثال سورۂ بنی اسرائیل سے ہے، جہاں فرمایا : وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۔ میرا اندازہ ہے کہ تہجد کی فضیلت، تہجد کی اہمیت، تہجد کا مقام، اس کا مرتبہ، یہ تو ہمارے یہاں معروف ہے، مشہور ہے۔ کسی کو اس کی توفیق ملی ہو یا نہ ملی ہو۔ اس کی عظمت سے، اس کی برکات سے میرے خیال میں ہر وہ مسلمان بخوبی واقف ہوگا جس کا تھوڑا بہت بھی دینی مزاج ہے۔ لیکن یہاں بھی 'بِهٖ' پر اتنی توجہ نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہئے۔ تہجد میں اہم ترین شے قیام وہ بھی طویل قیام ہے اور اس میں ترتیل کے ساتھ تلاوتِ قرآن ہے :

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۙ
لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں عموماً وہ عام نوافل کی طرح آٹھ رکعتیں پڑھ لیتے ہیں پھر بیٹھ کر مختلف اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں اور زیادہ وقت اس میں صرف کرتے ہیں۔ الّا ماشاء اللہ۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے لیکن اس کی برکات سے کما حقہٗ استفادہ تب ہو گا جب اس میں طویل قیام ہو اور اس میں ترتیل کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت ہو۔ دوسری مثال سورۃ مریم کی ہے، جہاں فرمایا:

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۔

یہاں بھی غور فرمائیے کہ تبشیر و انذار کے لئے "بِہٖ" سے قرآن مجید ہی کو ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہوتا کیا ہے! یہ کہ ہمارے یہاں وعظوں میں اور خطبوں میں اکثر و بیشتر یہ کام اولیاء اللہ کے تذکروں یا مولانا رومؒ کی مثنوی سے لیا جاتا ہے۔ قرآن کی طرف بہت کم ہی توجہ دی جاتی ہے بعینہٖ یہی معاملہ اس آیت کریمہ کا ہے: وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۔ معلوم ہوا کہ یہاں جس جہاد کا حکم دیا جا رہا ہے اس شد و مد کے ساتھ، اس اہتمام کے ساتھ، اس تاکید اور EMPHASIS کے ساتھ اس کے لئے ایک ذریعہ، ایک آلہ، ایک ہتھیار ہے جو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا ہے۔ اس کے لئے بھی ایک تلوار ہے جو آپؐ کے دست مبارک میں تھمائی گئی ہے اور وہ ہے: قرآن حکیم۔ لہٰذا فرمایا کہ اے نبی! ان مشرکین و کفار کے ساتھ جہاد کیجئے۔ اس قرآن کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد، میں صاحب صدر کی بالخصوص اور علمائے کرام کی بالعموم اجازت سے اس وقت کچھ تھوڑی سی وضاحت اس لفظ جہاد کی کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اہل علم کے لئے ہو سکتا ہے کہ میری یہ سخن تراشی کچھ گراں گزرے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں جو دوسرے شرکاء ہیں ان کے لئے یہ بات مفید ہو گی۔

پہلی بات یہ کہ میرے نزدیک جہاد ہمارے دین کا مظلوم ترین تصور (CONCEPT) ہے۔ مظلوم ہونے کے اعتبار سے اس کے ہم پلہ دوسری شے جو آتی ہے وہ قرآن ہے۔ ہمارے دین کی یہ دو مظلوم ترین حقیقتیں ہیں۔ جہاد کے بارے میں اتنے مغالطے ذہنوں میں ہیں کہ حد و شمار نہیں۔ پھر خاص طور پر ہماری تاریخ میں ایک دور وہ بھی آیا کہ جب ہم براہِ راست محکوم بنے نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہنی و فکری اعتبار سے بھی۔ یعنی دو طرفہ غلامی کے پنجے میں ہم گرفتار ہوئے۔ اس وقت اہل مغرب کی طرف سے ہم پر جہاد کے حوالے سے

بڑے جارحانہ حملے ہوئے ۔ استہزاء اور تمسخر ہوا ۔ انہی کی بات یوں کہی گئی ہے کہ :
۶ ۔ بُو آتی ہے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

چنانچہ ماضی قریب میں ہمارا انداز معذرت خواہانہ (APOLOGETIC) رہا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اب یہ دور اصلاً گزر چکا ہے لیکن تا حال اس کے باقیات السیئات ۔ کچھ لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں اور جب تک ہم ان کو اچھی طرح کھرچ نہیں دیں گے اس وقت تک دین کی کوئی مثبت اور پائیدار اور فعال تحریک جو نتیجہ خیز بھی ہو اٹھانا ممکن نہیں ہوگا ۔

دوسری بات یہ کہ جہاد کے بارے میں سب سے پہلا مغالطہ ذہنوں میں یہ بٹھا دیا گیا اور اس کے نتائج بہت دُور رس ہیں کہ جہاد کے معنی 'جنگ' ہیں ۔ اس بارے میں میری رائے ہے کہ اغیار اور بیگانوں کی کارستانی کے ساتھ ساتھ یگانوں اور اپنوں کی بھی غلطیاں ہیں اپنوں کی بڑی اکثریت نے بھی جہاد کو 'جنگ' ہی قرار دیا ہے جب قرآن مجید مستقل طور پر دو اصطلاحات استعمال کر رہا ہے ۔ ایک جہاد فی سبیل اللہ اور دوسری قتال فی سبیل اللہ ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر ہمارے دینی لٹریچر میں جنگ کے تمام مدارج و مراحل کے لئے بطور عنوان لفظ جہاد استعمال ہو جاتا ہے اور جنگ کو 'جہاد' ہی سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ ہوتے ہوتے ہمارے ذہنوں میں جہاد اور قتال مترادف کی حیثیت سے جاگزیں ہو گئے اور عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ جہاد کے معنی ہیں جنگ ۔

تیسری بات یہ کہ ظاہر ہے کہ جنگ ہر وقت اور ہمیشہ تو نہیں ہوتی لہذا جہاد فرضِ کفایہ رہ گیا اور فرضِ عین کی فہرست سے خارج ہو گیا ۔ پھر یہ کہ جب کبھی جنگ کا مرحلہ آتا تھا تو جتنی نفری کی ضرورت ہوتی تھی وہ نکل آئی تو بقیہ لوگوں کی طرف سے وہ فرض ادا ہو جاتا تھا ۔ یہی فرضِ کفایہ کا تصور ہے اور بالکل صحیح تصور ہے ۔ لہذا ہمارے یہاں جو فقہی تصورات و معیارات ہیں اور سوچ کے جو پیمانے ہیں ان میں گویا صفِ اوّل کی شے جہاد رہا ہی نہیں ۔ اس کا فرضِ عین ہونا پس منظر میں چلا گیا حتیٰ کہ ذہنوں سے اوجھل اور محو ہو گیا ۔ الّا ماشاء اللہ ۔

چوتھی بات یہ کہ اس پر ستم بالائے ستم اور بناء الفاسد علی الفاسد یہ ہوا کہ ہم نے یہ وطیرہ بنا لیا کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے گویا وہ جہاد فی سبیل اللہ کر رہا ہے ۔ حالانکہ ایک مسلمان ذاتی حیثیت سے جہاں فاجر و فاسق ہو سکتا ہے وہاں ظالم بھی ہو سکتا ہے جیسے خود مسلمانوں کے متعلق ایک حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ آتے ہیں : اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا

وَمَظْلُوْمًا ۔ لہٰذا مسلمانوں کا کوئی بادشاہ یا کوئی سرداہ یا کوئی قوم یا کوئی گروہ ظالم بھی ہو سکتے ہیں
یک ناحق جنگ بھی شروع کر سکتے ہیں ۔ صرف اپنے مفادات کے لئے ، صرف اپنے اقتدار
وسعت دینے کے لئے ۔ اپنی سلطنت کی حدود کی توسیع کے لئے ۔ جبکہ ان کے پیش نظر دین
ی کوئی خدمت نہ ہو ۔ اعلائے کلمۃ الحق کا کوئی مقصد نہ ہو ۔ ظاہر ہے کہ ایسی جنگ کیسے جہاد
قتال فی سبیل اللہ شمار ہو جائے گی ! جبکہ ہمارے سامنے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ
اضح حدیث موجود ہے : عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ
وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِیُرٰی
مَکَانُہٗ فَمَنْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰہِ ۔ ابی موسیٰؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا ، اس نے
ریافت کیا کہ حضور ایک شخص جنگ کرتا ہے مال غنیمت کے لئے اور ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنے ذکر
و شہرت کے لئے اور ایک شخص جنگ کرتا ہے ۔ اپنی (یا اپنے قبیلہ کی) سربلندی دیکھنے کے لئے
س کس کی جنگ اللہ کے راستہ میں ہوگی ؟ حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ
کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۔ صرف اس کی جنگ فی سبیل اللہ ہوگی جو جنگ کرے
کہ اللہ کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے ۔ خیال رہے کہ یہ حدیث متفق علیہ ہے ۔ تو قتال فی سبیل اللہ
وہ ہے جو اللہ کے جھنڈے کی سربلندی کے لئے کیا جائے نہ کہ ہر مسلمان کی یا مسلمانوں کی
حکومت کی ہر نوع کی جنگ جہاد و قتال فی سبیل اللہ قرار دی جانے لگے ۔ بہرحال یہ ہیں وہ
مغالطے جو تہہ در تہہ کچھ اغیار کی کرم فرمائی اور کچھ اپنوں کی ستم ظریفی سے ذہنوں میں بیٹھ گئے
ہیں اور ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تصور کو نکھار کر سامنے لایا جائے کہ جہاد فی سبیل اللہ
درحقیقت ہے کیا ؟ اور جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ میں فرق کیا ہے ؟

میں نے بہت غور کیا کہ ایک عام اردو داں کے لئے وہ لفظ کونسا ہوگا جو اس لفظ
جہاد کے مفہوم کو صحیح صحیح ادا کر دے ۔ اہل علم جانتے ہیں کہ لفظ جہاد باب مفاعلہ سے ہے اور
باب مفاعلہ کے اکثر مصادر میں فریقین کی شرکت ہوتی ہے ۔ پھر ایک دوسرے پر غالب
آنے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہوتا ہے ، جیسے بحث سے مباحثہ ۔ اس طریقہ سے جہد سے
مجاہدہ اور قتل سے مقاتلہ ۔ اسی مجاہدہ سے جہاد اور مقاتلہ سے قتال مصدر بنے ۔ قتال میں
بات دو طرفہ ہو جاتی ہے ۔ جبکہ قتل یک طرفہ عمل ہے ۔ کوئی شخص جا رہا ہے کسی نے گولی
مار دی یا خنجر گھونپ دیا درآں حالیکہ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ یہ

حادثہ ہو جائے گا۔ یہ قتل ہے لیکن جب دو فریق آمنے سامنے ہو کر دونوں ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہو جائیں تو یہ اُن کا قتال یا مقاتلہ ہے ان فریقین کے مابین۔ اسی طرح جہد کا عمل ہے "کوشش"۔ یہ عام فہم لفظ ہے اور جہد کا لفظ عام طور پر اُردو میں مستعمل ہے لیکن جہاد یا مجاہدہ اس کے معنی و مفہوم ہوں گے کوششوں کا تصادم، کوششوں کا ٹکراؤ۔ کوششوں کا مقابلہ۔ جس کے لئے ایک لفظ ہو گا کشمکش۔ انگریزی میں ہوگا "STRUGGLE" اور آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کے بعد PREPOSITION کے طور پر AGAINST کا لفظ آتا ہے۔ یعنی کوئی رکاوٹ ہے۔ کوئی چیز درمیان میں راستہ روکنے والی ہے تو STRUGGLE AGAINST ہے درحقیقت جہاد یا مجاہدہ کا صحیح صحیح لغوی مفہوم۔

مَیں اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے اپنے غور کے نتائج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مَیں نے جب اس مسئلہ پر غور کیا تو جہاد کے تین بڑے بڑے درجے اور ہر درجہ کے تین پہلو یا تین چھوٹی تقسیمیں ہیں جو میرے سامنے آئی ہیں، مَیں ان کو اہلِ علم کے سامنے ان کی تائید و توثیق یا اصلاح کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ مَیں قرآنِ مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں، مجھے اہلِ علم سے رہنمائی حاصل ہونے پر دلی مسرت ہو گی۔ مَیں خلوصِ دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھ پر میری غلطی واضح کر دی جائے تو مَیں سرِ تسلیم خم کرنے میں ایک لمحہ کے لئے بھی تردد نہیں کروں گا، بلکہ غلطی کی نشان دہی کرنے والے صاحب کا صمیم قلب سے احسان مند ہوں گا۔

میرے نزدیک یہ تین بڑے بڑے درجے ان بنیادی فرائض سے متعلق ہیں جو ہمارا دین اپنے ماننے والوں پر عائد کرتا ہے۔ پچھلے محاضرات میں، مَیں نے اس موضوع پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی تھی۔ دین کی طرف سے ہر مسلمان پر جو تین بنیادی فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی بنیادی تفہیم کے لئے ایک تین منزلہ عمارت کی تمثیل یا تشبیہہ بہت ہی مفید ہے۔

پہلی منزل ہے خود اللہ کا بندہ بننا۔ اور یہ بندگی ہمہ وجوہ ہوگی، ہمہ تن ہوگی۔ ہمہ وقت ہوگی۔ یہ جزوی نہیں ہوگی۔ قرآن میں فرمایا گیا، يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: وَأَنِيبُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ○ اس رویہ کا دینی اصطلاح میں نام ہے اسلام۔ سرِ تسلیم خم کرنا۔ گردن نہادن/ TO SURRENDER اسی کے لئے مزید دو اصطلاحات ہیں، ایک اطاعت ـــــ مقاومت و مدافعت ترک کر کے برضا و خوشی،

فرمانبرداری قبول کرنا جس کے لئے قرآن مجید میں بار بار حکم دیا گیا: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔ اسے انگریزی میں یوں کہیں گے TO GIVE UP ALL KIND OF RESISTANCE WHOLE HEARTEDLY

دوسرا تقویٰ۔ اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا۔ اس کی نافرمانی سے باز رہنا۔ تقویٰ کا حکم قرآن مجید میں بڑی تکرار اور تاکید سے آیا ہے، اس میں چوٹی کی آیت ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ اطاعت و تقویٰ میں مثبت و منفی رویّہ سامنے آتا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔

اس پہلی منزل کے لئے چوتھی اور آخری جامع ترین اصطلاح ہے عبادت ——— اس میں اسلام، اطاعت اور تقویٰ کے تمام مفاہیم آگئے۔ اس لفظ عبادت کے سمجھنے کیلئے فارسی کے دو الفاظ کو جو اردو میں مستعمل ہیں جمع کریں گے تو مفہوم ذہن نشین ہوجائے گا۔ وہ الفاظ ہیں بندگی اور پرستش۔ بندگی غلامی کو کہتے ہیں اس میں اطاعت کا پہلو غالب ہے۔ پرستش کے معنی ہیں مخلصانہ اور والہانہ محبت۔ سورۂ زمر میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے فرمایا: فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ۝ پھر سورۂ بیّنہ میں ان دونوں کو نہایت حسین و جمیل اسلوب بیان میں جمع کر دیا گیا۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ ط از روئے قرآن مجید جن و انس کی تخلیق کی غایت یہی عبادتِ رب قرار دی گئی ہے، بفحوائے آیتِ مبارکہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝ آگے بڑھنے سے قبل میں چاہوں گا کہ اس موقع پر عرض کردوں کہ اس پہلی منزل کو سر کرنے کے لئے ایک بندۂ مومن کو سہ گونہ جہاد یعنی مجاہدہ و کشمکش کرنی پڑے گی۔

اس پہلی منزل پر کشمکش کرنی پڑے گی اپنے نفس سے ——— نفس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا: اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ "نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے"۔ اَمَّارَۃ امر سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی بہت ہی زیادہ اکسانا۔ نہایت ترغیب دینا۔ سختی سے حکم دینا۔ لہٰذا اللہ کا بندہ بننے کے لئے پہلی کشمکش خود اپنے نفس کے ساتھ کرنی پڑے گی چنانچہ جب حضورؐ سے سوال کیا گیا اَیُّ الْجِھَادِ اَفْضَلُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ۔ تو آپؐ نے فرمایا: اَنْ تُجَاھِدَ نَفْسَکَ فِیْ طَاعَۃِ اللّٰہِ۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آں حضورؐ نے فرمایا

جَاهِدُوْا اَهْوَآءَكُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْنَ اَعْدَآءَكُمْ۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد ہے: اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ۔ سفرِ تبوک سے واپسی پر حضورؐ نے صحابۂ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: رَجَعْتُمْ مِّنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ
پس پہلی کشمکش ہر اس شخص کو اپنے نفس سے کرنا ہوگی جو واقعتاً اللہ کا بندہ بننا چاہتا ہے اسی نفس کے متعلق مولانا رومؒ نے کیا خوب بات کہی ہے ؎

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست ٭ لیک او را عون، ایں را عون نیست

میرے پاس لاؤ لشکر نہیں ہے۔ میں زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ورنہ میرا نفس اندر سے وہی کچھ دعویٰ کر رہا ہے جو فرعون نے کیا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا، ملکِ مصر کے بارے میں: وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ۔ میرا وجود ہے، میرا نفس اس پر حکومت کا دعویدار ہے۔ پس پہلی کشمکش، پہلا جہاد، پہلا اور سب سے بڑا مجاہدہ مع النفس ہے۔ جس نے اس منزل کو سَر نہیں کیا، وہ اگر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے تو میرے نزدیک اس کیلئے ہلکے سے ہلکا لفظ حماقت ہے۔ اس کشمکش کے ساتھ ہی دو چیزیں مزید ہیں۔ یہ سہ گونہ کشمکش ہوگی۔ اِس نفس کو تقویت دینے کے لئے ایک طاقت موجود ہے، وہ ہے شیطان لعین اور اس کی صلبی و معنوی ذریت۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اس نفس کو تقویت پہنچائے اس میں پھونکیں مارے۔ اس میں جتنے بھی سفلی محرکات ہیں انہیں مشتعل کرے۔ ایک حدیث کی ابتداء میں الفاظ آتے ہیں: اِنَّ اِبْلِیْسَ لَهٗ خُرْطُوْمٌ كَخُرْطُوْمِ الْكَلْبِ وَاضِعُهٗ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ یُذَكِّرُ الشَّهَوَاتِ وَاللَّذَّاتِ وَیَأْتِیْهِ بِالْاَمَانِیْ وَیَأْتِیْهِ بِالْوَسْوَسَةِ عَلٰی قَلْبِهٖ لِیُشَكِّكَهٗ فِیْ رَبِّهٖ۔ ایک دوسری متفق علیہ حدیث ہے: اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ۔ قرآنِ مجید میں مختلف اسالیب سے بے شمار مقامات پر شیطان کے اغواء اور فریب سے خبردار اور متنبہ کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا: اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا۔ لوگو! شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن سمجھو، دشمن جانو، اور سورۂ کہف میں بڑا پیارا انداز ہے۔ اس میں آپ ایک لطیف سا طنز پائیں گے۔ اس آیت کو میں جب بھی پڑھتا ہوں تو مجھے عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ فرمایا: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّیَّتَهٗٓ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا۔ "اور یاد کرو جب

ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے ۔ وہ جنوں میں سے تھا۔ سو اس نے اپنے رب کے حکم سے رُوگردانی کی ، وہ حد سے نکل گیا " اب اس آیت کا اگلا حصّہ ہے جس کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں " کیا تم مجھے چھوڑ کر اس شیطان لعین اور اس کی ذریت کو اپنا دوست اور حامی بنا رہے ہو حالانکہ وہ تمہارے ازلی دشمن ہیں۔ اور کیا ہی بُرا بدل ہے جو ان ظالموں کو نصیب ہوا " پس کشمکش ہوگی ، مجاہدہ ہوگا شیطان اور اس کی صلبی و معنوی ذریت کے ساتھ اور اس کو شکست دینا ہوگی ۔ اس لفظ شکست سے میرا ذہن اچانک علامہ اقبال ؒ کے فارسی کلام میں ان کی نظم " نالۂ ابلیس " کی طرف منتقل ہوا جو مجھے بہت ہی پسند ہے ۔ اس کے چند اشعار آپ کو سناتا ہوں ۔ وہ اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے کہ پروردگار ! یہ انسان تو میری چوٹ کا نہیں ، میرے مقابلے کا نہیں ۔ ایک مشتِ خس ہے جس کے لئے میری ایک چنگاری کافی ہے ۔ اس انسان کو اگر سُوکھی گھاس ہی بنانا تھا تو مجھ میں اس قدر تیز و تند آگ رکھنے کا کیا فائدہ ہوا ؎

ابنِ آدم چیست یک مشتِ خس است ؛ مشتِ خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نبود ؛ ایں قدر آتش مرا دادن چہ سُود؟

نظم کا آخری شعر تڑپا دینے والا ہے ؎

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست
لذّتے شاید کہ یابم در شکست!

" الٰہا ! کوئی تو زندہ مردِ حق پرست ایسا ہو جو مجھے شکست دے دے ۔ تاکہ میں بھی تو کبھی شکست کا لذّت آشنا ہو سکوں " تو دوسری کشمکش اور دوسرا مجاہدہ یہ ہوگا۔

تیسری کشمکش ایک بگڑے ہوئے معاشرے کا جو سماجی دباؤ (SOCIAL PRESSURE) ہے ، اس سے ہوگی ۔ معاشرہ کا دباؤ آپ کو ایک خاص رخ پر دھکیلے گا ۔ اس لئے کہ ایک ہجوم جس سمت میں جا رہا ہو اس سمت میں چلنا بہت آسان ہے آپ کو کوئی زور نہیں لگانا پڑے گا وہ آپ کو خود دھکیل کر لے جائے گا ۔ لیکن اس کی مخالف سمت میں چلنا بہت مشکل ہے ۔ ع ۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز ۔ اس طرح کوئی تصادم نہیں ہوگا ۔ کوئی کشمکش نہیں ہوگی ۔ کوئی FRICTION نہیں ہوگی ۔ دنیوی نقطۂ نظر سے عافیت اس میں ہے ، چین ہے ، سکون سے زندگی بسر ہوگی کہ زمانہ تم سے موافقت

ں کر رہا تم زمانے کے ساتھ موافقت کرو۔ لیکن غیرت و حمیّت کا تقاضا بالکل برعکس ہے
ع۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز۔ زمانہ تم سے موافقت نہیں کرتا تو تم اس سے
ہو۔ پس پہلی منزل پر تین اطراف و جوانب میں یہ تین کشمکشیں ہیں جو ہر اُس شخص کو کرنی
ں گی جو واقعۃً اللہ کا بندہ بننے کا ارادہ اور عزم رکھتا ہو۔

دوسری منزل ہے اس دین کو عام کرنا، دوسروں تک پہنچانا۔ اسے پھیلانا۔ اس کے
چار اصطلاحات اہم ہیں۔ پہلی دو اصطلاحات ہیں تبلیغ و دعوت۔ یہ بھی اطاعت و تقویٰ
طرح تصویر کے دو رخ ہیں جس طرح وہ دو الفاظ مثبت و منفی مفہوم کے حامل ہیں۔ بات
ب ہی ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہونا اور کاربند رہنا،
اعت ہے۔ اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا تقویٰ ہے۔ اسی طرح تبلیغ پہنچانا ہے اور
ت لوگوں کو کھینچ کر راہِ حق پر لے آنا ہے۔ یہ بھی ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں۔ تبلیغ کے
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکیدی حکم آیا: يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ
نْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع
امت کو جو آخری تاکیدی حکم دیا وہ اسی تبلیغ کا تھا، فرمایا: فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ
غَائِبَ۔ مزید برآں حضورؐ نے یہ فرما کر ہر مسلمان کے لئے فریضۂ تبلیغ آسان ترین فرما دیا
لِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً۔ دعوت کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکیدی حکم ہوا: اُدْعُ
ىٰ سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔
بڑی اہتم بالشان آیت ہے۔ اس پر میں آگے کچھ عرض کروں گا۔ یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ اس
یت میں دعوت کی تین سطحیں (LEVELS) بیان ہوئی ہیں۔ دعوت کیلئے
بدیٰ ایک اٹل اور رہنما اصول اس آیتِ مبارکہ میں بیان کر دیا گیا: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ
عَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ دعوت اللہ کی طرف ہو، اس کے
اتھ ہی داعی کی سیرت و کردار عمل صالح کا مظہر ہو۔ مزید برآں وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے
سلمان کہلائے۔ کسی فقہی مسلک کی طرف نہ دعوت ہو اور نہ ہی اس کا لیبل چپاں ہو! جو
خص اللہ کی طرف دعوت دے اس سے بہتر بات اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ میں نے پہلی اور
دوسری منزل سے متعلق جن اصطلاحات کا ذکر کیا ہے اُن کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ عام
ر پر یہ باتیں لوگوں بالخصوص اہلِ علم کے سامنے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان پر عمل پیرا ہیں

یا نہیں۔ اگر ہیں تو ان کا تناسب کیا ہے! اسی دوسری منزل کے لئے دو اصطلاحات مزید ہیں جو بڑی اہم ہیں لیکن ان کا ادراک و شعور قریباً معدوم کے درجے میں آگیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں الا ماشاء اللہ چندہی لوگ ہوں گے جو اُن کی اہمیت کو سمجھتے اور جانتے اور اس پر عمل کرتے ہوں گے۔ ان میں تیسری اصطلاح ہے: اَمْر بالمعروف وَنَهْي عَنِ المُنکَر نیکیوں کا پرچار۔ ان کی تلقین، ان کا حکم اور برائیوں سے، بدی سے لوگوں کو روکنا۔ بدی ا/ برائی کے راستہ میں آڑے آنا۔ ہماری ایک دینی تحریک میں امر بالمعروف پر ایک درجہ میں عمل بھی ہو رہا ہے تو اس میں نہی عن المنکر سے صرفِ نظر ہے۔ حالانکہ حدیث شریف میں نہی عن المنکر پر زیادہ زور ہے EMPHASIS ہے۔ صحیح مسلم شریف کی حدیث ہے:

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَ ذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔ ایک اور حدیث کے آخر میں الفاظ آئے ہیں: وَمَا وَرَاءَ ذٰلِکَ حَبَّةُ خَرْدَلٍ مِّنَ الْاِیْمَانِ۔ "اے مسلمانو! تم میں سے جو کوئی منکر دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ یعنی طاقت سے روکے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے یعنی نصیحت و تلقین کرے۔ اس کی بھی طاقت نہ ہو تو (کم ازکم) دل میں اس پر کڑھے دل میں پیچ و تاب کھائے اور یہ کمزور ترین ایمان (کی نشانی) ہے۔" دوسری حدیث کے آخری حصہ کی ترجمانی یہ ہے کہ "اگر دل میں کڑھن بھی نہ ہو، احساسات میں غم و غصے کی کیفیات بھی پیدا نہ ہوں تو جان لو کہ تمہارے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔"

ہمارے اس دَور کے لحاظ سے، مسلم شریف کی ایک دوسری حدیث بہت اہم ہے توجہ سے سنیئے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا

مَا مِنْ نَّبِیٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِیْ اُمَّتِهٖ قَبْلِیْ، اِلَّا کَانَ لَهٗ فِیْ اُمَّتِهٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِیَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ۔

ترجمہ: مجھ سے پہلے جس نبیؑ کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا، اس کے اپنی امت میں ایسے حواری اور ساتھی ہوا کرتے تھے جو اُس نبی کی سنت پر عمل کرتے تھے، اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اُن حواریین کے بعد ایسے نالائق جانشین آتے تھے جو اپنے قول پر عمل نہیں

ـتے تھے اور وہ کام کیا کرتے تھے جن کا انہیں (اللہ کی طرف سے) حکم نہیں ہوا کرتا تھا تو ایسے
ـگوں سے جو ہاتھ سے جہاد کرے تو وہ (بھی) مومن ہے اور جو زبان سے جہاد کرے تو وہ
بھی) مومن ہے اور جو دل سے جہاد کرے تو وہ (بھی) مومن ہے اور اس کے درے
ائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔" یہ ہے نہی عن المنکر کی ہمارے دین میں
ہمیت ۔ یہ فتویٰ ہے حقیقی مفتیٔ اعظم حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ۔ اُن کا فتویٰ
عوذ باللہ) کون رد کرے گا؟ اگر رد کرے گا تو کیا اس کا ایمان سلامت رہ جائے گا!
س دوسری منزل کے لئے چوتھی جامع ترین اصطلاح ہے 'شہادت علی الناس' ۔ جیسے
ہلی منزل کے لئے جامع ترین اصطلاح میں نے عبادت بیان کی تھی، دوسری منزل کیلئے
شہادت علی الناس جامع ترین اصطلاح ہے ۔ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور آخری
رسول ہیں ۔ لہٰذا آپ کی امت بھی آخری امت ہے ۔ یہ امت اس لئے برپا کی گئی ہے کہ تا
قیام قیامت یہ امت نوع انسانی پر حق کی اپنے قول و عمل سے شہادت دے : وَكَذٰلِكَ
جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔
اور اس طرح (اے مسلمانو!) ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا ہے تاکہ تم نوع انسانی پر گواہ ہو
جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائیں۔" سورۂ حج کے آخری رکوع کی آیت، اس موضوع پر بڑی عظیم
آیت ہے ۔ یہاں عکسی ترتیب آئی ہے ۔ یہاں پہلے رسول کا پھر امت کا ذکر ہے، فرمایا: وَجَاهِدُوْا
فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ "اور جہاد کرو اللہ کے لئے جیسا کہ اور جتنا کہ اس کے
لئے جہاد کا حق ہے۔" اور ذرا احساس تو کرو، اپنے آپ کو پہچانو تو سہی۔ "اس نے تمہیں چن
لیا ہے، پسند کر لیا ہے ۔ تمہارا خاص مقصد کے لئے SELECTION ہو گیا ہے ۔ درمیان
میں ایک SUBORDINATE ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ
مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا ۔ اس کے بعد اِجْتَبٰى کا
مقصد بیان ہوا: لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ
تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم پوری نوع انسانی کے لئے گواہ بن جاؤ، لوگوں پر اپنے قول و عمل
سے حق کی شہادت دے کر حجت قائم کرو تاکہ قیامت کے دن عدالت خداوندی میں گواہی دے
سکو TESTIFY کر سکو کہ پروردگار ہم نے تیرا دین ان تک پہنچا دیا تھا۔" شہادت علی
الناس وہ اصطلاح ہے کہ یہاں آکر امت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تعلق کار رسالت

سے جُڑ جاتا ہے چونکہ آں حضورؐ آخری نبی اور آخری رسُول ہیں۔ اب یہ آپ کی امّت کی ذمہ داری ہے کہ تبلیغ کے ذریعہ، دعوت کے ذریعہ اور اپنے قول و عمل کی ہم آہنگی اور یکسانی کی شہادت کے ذریعہ دین الحق کو بالفعل قائم کرکے اس کی برکات کے ذریعہ لوگوں پر حجت قائم کرے۔ اس شہادت کی اہمیت کا اندازہ سورۃ النساء کی اس آیت سے لگائیے، فرمایا: فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۞ "اُس دن کیا ہوگا؟ جس دن ہم ہر امّت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے اور اے نبیؐ! ان سب پر آپؐ کو گواہ بنا کر لائیں گے" عدالتِ خداوندی میں رسول دراصل استغاثہ کے گواہ ہوں گے، وہ کہیں گے اے پروردگار! ہم نے تیرا پیغام اپنے قول و عمل سے شہادت دیتے ہوئے بنی نوعِ انسان تک پہنچا کر ان پر حجت قائم کردی۔ شہادت علی الناس کی ذمہ داری کی نزاکت کو سمجھ لیجئے۔ اگر بالفرض رسولؐ اللہ کا پیغام نہ پہنچاتے تو اللہ کے یہاں وہ مسئول ہوتے۔ انہوں نے پہنچا دیا تو وہ بری ہو گئے۔ اب لوگ جواب دہ ہوں گے[1] نبی اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ کے مجمع سے گواہی لی۔ اَلَاهَلْ بَلَّغْتُ؟ اور پورے مجمع نے بیک زبان ہو کر گواہی دی: قَدْ بَلَّغْتَ وَ اَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ۔ تین بار یہ سوال و جواب ہوئے۔ اس کے بعد حضورؐ نے آسمان کی طرف پھر مجمع کی طرف اپنی انگشتِ مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ۔ امت کا اجتباء جہاں بہت بڑا اعزاز ہے وہاں بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ اگر امّت نے اس شہادت علی الناس کا فریضہ انجام نہیں دیا تو بنی نوعِ انسان کی گمراہی کے وبال سے عدالتِ خداوندی میں بچنا محال ہو جائے گا اور نبی اکرمؐ کی گواہی ہمارے خلاف ہو جائے گی

اس تبلیغ و دعوت کے بھی تین LEVELS ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس مغالطہ میں مبتلا رہیں کہ ہم تو تبلیغ کا حق ادا کر رہے ہیں، درآں حالیکہ صورتِ تبلیغ ہو، حقیقی تبلیغ نہ ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ الحمدللہ اس دَور میں ایک خاص سطح

---

[1] یہی بات سورۃ اعراف میں اس اسلوب سے بیان فرمائی ہے۔
فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ۞ پس یہ لازماً ہو کر رہنا ہے، کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور رسولوں سے بھی پوچھیں کہ (انہوں نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا کہ نہیں اور ان کو کیا جواب ملا۔ (مرتب)

تبلیغ و دعوت کے لئے ایک بہت وسیع حرکت ہوچکی ہے۔ اس کے VOLUME کا جہاں تک تعلق ہے وہ بڑا متاثر کن ہے۔ میرا اپنا محتاط اندازہ یہ ہے کہ کم ازکم ایک لاکھ افراد اس گلوب پر ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں۔ لیکن میں پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ عرض کروں گا کہ تبلیغ اور دعوت کے لئے اگر ہم نے قرآنی ہدایات کو اپنا امام نہ بنایا اور اُن کے مطابق کام نہ کیا جاسکا تو مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ اس ضمن میں مَیں وہی آیات دوبارہ پیش کرتا ہُوں جو مَیں پہلے آپ کو سنا چکا ہُوں۔ پہلی آیت ہے : یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ تبلیغ کا اصل محور و مرکز قرآن مجید ہونا چاہئے۔ اس آیتِ مبارکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے وہ قرآنِ مجید ہے : بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ ؕ پھر حضورؐ کے ارشادِ مبارک نے ہر مسلمان کے لئے قرآنِ حکیم کی تبلیغ کے کام کو آسان بنادیا ہے بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً ؕ "پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت پہنچاؤ" یہاں "عنّی" کا لفظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ یہ لفظ یہاں جس معنی و مفہوم کا حامل ہے، اسے انگریزی میں ادا کیا جائے تو وہ ہوگا ON MY BEHALF ۔ قرآنِ مجید کی تبلیغ کی اصلاً ذمہ داری ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چنانچہ اسی آیتِ مبارکہ کے اگلے حصہ میں فرمایا : وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ؕ اور اگر آپ نے (بالفرض) یہ کام نہیں کیا تو آپؐ نے تبلیغ رسالت کا حق ادا نہ کیا۔" مَیں نے ترجمہ میں لفظ بالفرض کا اضافہ اس لئے کیا ہے کہ نبی اکرمؐ کے متعلق ذرا سا یہ گمان کہ آپ قرآنِ حکیم کی تبلیغ میں کوتاہی فرمائیں گے، ایمان کے منافی ہوجائے گا۔ معاذاللہ ثم معاذاللہ۔ یہ اسلوب بیان درحقیقت امت کے انتباہ WARNING کے لئے اختیار فرمایا گیا ہے کہ کہیں وہ اِس ذمہ داری سے غافل نہ ہوجائے جو پوری امت پر بحیثیتِ کل اور ہر مسلمان پر بحیثیتِ امتیِ رسولؐ عائد ہوتی ہے۔ دوسری آیت جس کی تفصیل مَیں نے مؤخر کردی تھی، اس کے حوالے سے دعوت کی تین سطحوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ آیتِ مبارکہ ہے : اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ؕ "(اے نبیؐ!) دعوت دو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت و دانائی کے ساتھ اور عمدہ وعظ و نصیحت کے ساتھ اور (ہٹ دھرم، ضدی اور حجتی) لوگوں کے ساتھ مجادلہ کرو، اس طریق پر جو بہت ہی عمدہ ہو" ہر دَور اور ہر معاشرے میں آپ کو لوگوں کی تین سطحیں ملیں گی۔ ایک سب سے بلند سطح کے لوگ ہوتے ہیں : INTELLECTUAL MINORITY، ذہین اقلیت۔ اسی

INTELLIGENTSIA بھی کہتے ہیں۔ یہی BRAIN TRUST کہلاتا ہے۔ یہ طبقہ MINUTE MINORITY میں ہوتا ہے لیکن یہی طبقہ معاشرے میں مؤثر ترین ہوتا ہے اور معاشرے کا رخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جیسے میرے جسم میں دماغ ہے جو وزن کے لحاظ سے کم و بیش آدھ سیر کا ہوگا، لیکن یہ میرے پورے وجود اور میرے پورے تن و توش کو کنٹرول کرتا ہے۔ ہاتھ پکڑ سکتا ہے لیکن کس شے کو پکڑے، کس کو نہ پکڑے، اس کا وہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ٹانگیں مجھے لے کر چل سکتی ہیں لیکن کس سمت میں چلیں، کس میں نہ چلیں اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کا رخ درحقیقت INTELLECTUAL MINUTE MINORITY کرتی ہے۔ اس کو جب تک دعوت دینے کا تقاضا دلیل کے ساتھ، برہان کے ساتھ پورا نہیں کیا جائے گا۔ یہ طبقہ کوئی اثر قبول نہیں کرے گا۔ جیسے قرآن یہود کو کھلا چیلنج کرتا ہے: قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۞ اگر اس INTELLECTUAL MINORITY کو اعلیٰ علمی و فکری سطح پر مدلل طور پر آپ دین کی دعوت پیش نہیں کریں گے تو یہ ذہین اقلیت متاثر نہیں ہوگی۔ آپکو اسے BY PASS کرنا ہوگا اور BY PASS دل کے آپریشن میں بہت مفید ہوتا ہے، لیکن اسلامی انقلابی عمل میں بہت خطرناک ہوتا ہے۔ عوامی سطح پر بات پھیلتی چلی جا رہی ہے لیکن اگر ذہین اقلیت میں وہ بار نہیں پا رہی تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا، اجتماعی سطح پر کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لہٰذا یہاں ہدایت آئی: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ. اس حکمت کے ساتھ جس کے متعلق ایک مقام پر فرمایا: وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۞ "اور جس کو حکمت، دانائی ملی اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی، بہت خیر مل گیا"۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے یہاں 'حکمت' کو حکمتِ عملی کے معنی میں لے کر اس آیتِ مبارکہ کی بڑی حق تلفی کی ہے۔ حکمتِ عملی بالکل دوسری چیز ہے۔ اگرچہ یہ بھی یقیناً مطلوب شئے ہے لیکن یہاں جس شان کے ساتھ یہ لفظ آیا ہے، درحقیقت اس کا مفہوم حکمتِ عملی نہیں ہے بلکہ براہین کے ساتھ دلائل کے ساتھ دانائی کے ساتھ اس دعوت کو پیش کرنا ہے۔ اگر سوسائٹی کی ذہین اقلیت کو اس وقت اور اس دور کی اعلیٰ علمی و فکری سطح پر دعوت پیش نہ کی جائے تو معاشرہ بحیثیتِ مجموعی کبھی متاثر نہیں ہو سکتا۔ دوسری سطح ہے عوامی۔ ان کو دعوت ہوگی عمدہ وعظ اور دل نشین نصیحت کے ذریعے۔ ان عوام کو کسی دلیل اور حجت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُن کے لئے ضرورت ہے موعظۂ حسنہ کی، وہی اُن کے لئے کفایت کریگی۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ۔ یہاں تک دوسری سطحوں کا بیان ہوگیا البتہ دوسری سطح کے لئے یہ بات نہایت اہم ہے کہ سننے والے یہ محسوس کریں کہ جو وعظ کر رہا ہے وہ ہم پر اپنی دینداری، علمیت اور شخصیت کی دھونس نہیں جمانا چاہتا، بلکہ مخلص ہے۔ وہ ہماری خیر خواہی کے لئے بات کہہ رہا ہے، اسے کسی دنیوی اجر اور صلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ساتھ ہی انہیں یہ اعتماد ہو کہ یہ بہروپیا نہیں ہے: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ والا معاملہ نہیں ہے بلکہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اپنی ذاتی اور نجی زندگی میں اس پر خود بھی عمل پیرا ہے۔ یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں، ایک موعظۂ حسنہ دوسرے واعظ کا اعلیٰ کردار تو معاملہ ہوگا، 'از دل خیزد بر دل ریزد' اور ——————

ع ۔ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ یہ ہے عوامی سطح پر دعوت و تبلیغ۔

میں جانتا ہوں کہ اس دور میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ایک بڑے طبقے میں عام طور پر وعظ کو ایک گالی کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ بڑے ہی استحقار کے انداز میں کہا جاتا ہے "اجی وعظ کہہ رہے ہیں" حالانکہ وعظ بڑی عظیم اور مؤثر شے ہے اور قرآنی اصطلاح ہے لیکن اس کا ایک مقام، ایک جگہ ہے جہاں یہ تاثیر دکھاتا ہے۔ غیر موقع اور بے محل یہ عمل ہوگا تو غیر مؤثر رہے گا۔ وَضْعُ الشَّیْئِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ یہ ہے ظلم۔ اِن عوام کو آپ فلسفہ پڑھائیں گے تو حماقت ہوگی اور اُن INTELLECTUALS کو آپ وعظ پلائیں گے تو یہ کام بھی غیر معقول ہوگا۔ ہر شے کو اپنی جگہ پر رکھنا ہی عدل ہے۔ تیسری سطح ہے جو ہر معاشرے میں موجود ہوگی وہ اُن لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ہٹ دھرم ہوتے ہیں جو کبھی مان کر نہیں دیں گے۔ جن کے اپنے مفادات ہوتے ہیں جن کی CO-OPERATIVE SOCIETIES بنی ہوتی ہیں۔ جن کے VESTED INTERESTS ہوتے ہیں جو اپنے مفادات کی وجہ سے کور بینا ہو چکے ہوتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات علیٰ وجہ البصیرت لوگوں کو گمراہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر اِن لوگوں کے زہر کا تریاق فراہم نہ کیا جائے تو یہ عوام النّاس کو گمراہ کرتے چلے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں مناظرہ کا فن وجود میں آیا۔ پھر اس نے باقاعدہ ایک خاص ٹیکنیک اور SPECIALIZATION کی شکل اختیار کی۔ موجودہ دور میں کچھ لوگوں نے اسے پیشہ ہی بنا لیا تو اس میں چند خرابیاں آئیں۔ مجمع عام ہے، داد مل رہی ہے، تحسین ہو رہی ہے، تالیاں بج رہی ہیں، نعرے لگ رہے ہیں۔ گویا اتنی بڑی جیوری JURY

ہے جس کے سامنے دو پہلوان عقلی کشتی لڑ رہے ہیں۔ یہ بات علیحدہ ہے۔ لیکن قرآن مجید جلّ جلالہٗ کہتا ہے' وہ احسن طریق پر محکم دلائل اور براہان کے ساتھ ہونا ضروری ہے، دعوت کی یہ تیسری سطح لازمی ہے۔ اگر یہ آپ نہیں کریں گے تو اغیار سے شکست کھائیں گے۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے معاشرے میں عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ہم کوئیں کے مینڈک کی طرح ایک ہی دائرے میں چکر لگاتے رہے اور فقہی تعبیرات، راجح و مرجوح، افضل و مفضول کے ردّ و قبول میں آپس ہی میں مناظرے اور دنگل جماتے رہے اور جما رہے ہیں جبکہ اندر ہی اندر عیسائیت دیمک کی طرح ہمارے معاشرے کو کھاتی چلی جا رہی ہے۔ اسی طرح دعوتی سطح پر اس دور میں قادیانیت بہت فعّال ہوگئی ہے۔ میں اس کا اس اعتبار سے اس وقت ذکر کرنا نہیں چاہتا کہ اس کا موجودہ سیاسی صورتِ حال سے کیا تعلق ہے۔ یہ پلیٹ فارم وہ نہیں ہے کہ اس موضوع پر گفتگو ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت قادیانیت جارحانہ انداز میں بہت فعّال ہے[1] اور یہ بات جان لیجئے کہ ایک عام آدمی تو کجا اچھا بھلا پڑھا لکھا بلکہ عالمِ دین بھی ان کے مناظرین و مبلغین کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ الّا ماشاء اللہ۔ جب تک جس طرح خاص خاص موضوعات پر ان قادیانی مناظرین و مبلغین کو TRAIN کیا گیا ہے۔ اس کے ردّ اور ابطال کے لئے اسی طرح ہمارے ذہین و فطین لوگوں کو ٹریننگ نہ ملے۔ ایک وقت میں جب یہاں انگریز کی حکومت کی سرپرستی میں بڑے زور شور کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی تھی اور پادری فینڈر نے برصغیر میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اگر اس وقت، وہ مردِ حق کھڑا نہ ہوگیا ہوتا جن کا نام نامی مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہے، رحمۃ اللہ علیہ۔ تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں مسلمان کس طرح عیسائیت کے اس سیلاب کی نذر ہو جاتے۔ اس پادری فینڈر نے پورے ہندوستان کے علماء کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر، OPEN CHALLENGE THROW کیا۔ مبارزت طلبی کی، للکارا۔ مولانا کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ خم ٹھوک کر میدان میں آئے اور پادری فینڈر کو میدان چھوڑ کر ہندوستان سے بھاگنا پڑا۔ پھر وہ ترکی پہنچا وہاں بھی اس نے یہی ہتھکنڈے شروع کئے۔ عثمانی سلطنت نے مولانا کیرانوی'' کو ترکی آنے کی دعوت دی۔ مولاناؒ جب وہاں پہنچے تو پادری فینڈر وہاں سے بھی فرار ہوگیا۔ تو دعوت کی یہ بھی ایک سطح ہے یہ تیسری سطح ہے۔ کچھ لوگ اس کا تحقیر کے انداز میں ذکر کرتے ہیں حالانکہ یہ بھی کرنے کا کام ہے۔ اگرچہ قرآن اس

---

[1] یہ تقریر قادیانیوں کے بارے میں صدارتی آرڈیننس سے قبل کی ہے (مرتب)

بن ہیں ایک امتیازی اخلاقی معیار قائم رکھنے کا حکم دے رہا ہے: جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط اس مجادلے میں بھی بالکل ان کی سطح پر نہ اتر آؤ۔ تمہارا داعیانہ کردار اور اس کی ایک اخلاقی شان ضرور رہنی چاہئے۔ ظاہر بات ہے، کہ ایک شخص ان تینوں سطحوں پر کام نہیں کر سکتا۔ ہر کام کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ جو سب سے اونچا کام ہے۔ اس کے لئے اس دور میں جس کی ضرورت ہے اس کو میں ایک لفظ میں ادا کردوں تو وہ ہے "علم کو مسلمان بنانا،" علم ملحد ہو چکا ہے اس کے بارے میں بڑی پیاری بات علامہ اقبالؒ نے کہی ہے ؎

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے ٭ علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

معرفتِ خداوندی کی تلوار اس علم کی نیام میں سے نکلی ہوئی ہے۔ یہ خالی خول ہے بلکہ صرف یہ نہیں ہے بلکہ اس میں الحاد کا خنجر اس تلوار کی جگہ پیوست کر دیا گیا ہے۔ اس علم کو مسلمان بنانا آسان نہیں ہے لوگ نظامِ تعلیم کی بات کیا کرتے ہیں۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ نظام اتنی بڑی بات نہیں ہے یہ تو ایک تعلیم دینے کا ذریعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی علم کہاں ہے جسے پہنچایا جائے۔ محض دینیات کا ایک گھنٹہ یا اسلامیات کا ایک شعبہ قائم کرنے سے کام نہیں چلے گا جبکہ طبیعیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات اور وہ دوسرے علوم جو ایک طالب علم حاصل کر رہا ہے۔ ان کی رگ وپے میں الحاد اور مادہ پرستی رچی بسی اور سرایت کئے ہوئے ہے۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ کہا تھا ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا ٭ کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

پورے علم کی توحید کی بنیاد پر جب تک تدوینِ نو نہیں ہوگی، تمام علوم کو جب تک مسلمان نہیں بنایا جائے گا، ہماری نئی نسل کے اذہان کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں ظاہر بات ہے کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔ جب تک سینکڑوں اور ہزاروں اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ۔ کو اپنا اصولِ عمل MOTTO بنا کر میدان میں نہیں آئیں گے اور اُن کو اداروں اور حکومت کی جانب سے مناسب ذرائع مہیا نہیں کئے جائیں گے اس وقت تک یہ کام کیسے ہوگا۔ ہاں وعظ کی سطح پر ہمیں زیادہ جوہرِ قابل TALENT مل سکتا ہے۔ رہا مجادلہ کی سطح پر افراد کی ضرورت تو اس کیلئے خصوصی تربیت گاہوں کی ضرورت ہے۔ میں نے صاف صاف عرض کیا تھا کہ ایک شخص یہ تینوں کام انجام نہیں دے سکتا۔ ہمیں درجہ بندی GRADATION کرنا ہوگی۔ اب تینوں

سطح پر کام کرنے کے لئے وہ باصلاحیت نوجوان جن کے دل میں واقعی دین کا کام کرنے کی تڑپ ہے، ولولہ ہے، امنگ اور جذبہ ہے وہ آگے بڑھیں، ان اعلیٰ و ارفع مقاصد کے لئے اپنا دنیوی کیریئر قربان کریں اور اپنی جانیں ان مقاصد کے حصول میں کھپائیں جب ہی جا کر یہ کام ہو گا اور یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل۔ دین کی تبلیغ اور دعوت کے لئے مال و جان کو ان تینوں سطحوں پر کھپانا۔

میرا بھی ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ عجب حسنِ اتفاق ہے کہ میں نے نہی عن المنکر سے متعلق جو دو حدیثیں سنائی تھیں، ان میں نہی عن المنکر کے کام کی انجام دہی کے لئے تین سطحوں ہی کا بیان ہوا ہے۔ پہلی سطح ہے: بدی اور برائی کو ہاتھ یعنی قوت و طاقت سے روک دینا۔ دوسری: اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے، وعظ سے اور تلقین و نصیحت سے اس کو روکنا اس کی مذمت کرنا۔ تیسری: اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں اسے برا جاننا۔ اس پر گھٹن محسوس کرنا۔ اس پر پیچ و تاب کھانا اور یہ آخری سطح ایمان کے کمزور ترین ہونے کی دلیل ہے۔ دوسری حدیث میں ان تینوں سطحوں کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے جس رسول کو بھی اللہ نے مبعوث کیا۔ اُنؑ کی امت میں حواری اور صحابی پیدا ہوئے جو اُنؑ کی تعلیمات کو مضبوطی سے تھامتے تھے، اس پر خود عمل پیرا ہوتے تھے۔ اور اُن کو خلقِ خدا کے سامنے پیش کرتے تھے۔ ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آتے تھے کہ جو اُن کو حکم دیا گیا تھا وہ نہیں کرتے تھے اور وہ کرتے تھے جن کا ان کو حکم نہیں دیا گیا۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ۔ اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔

اس دوسری منزل کے لئے ایک دوسرا عنوان ہے اور وہ ہے نظریاتی کشمکش۔ یہاں تصادم ہے فکری تصادم۔ اگر آپ توحید کو پھیلانا چاہتے ہیں تو مشرکانہ اوہام رکھنے والے موجود ہیں، ان سے نظریاتی سطح پر تصادم اور مقابلہ ہو گا آپ کو WALK OVER نہیں مل جائے گا۔ کس قدر اہم بات ہے، کہ قرآن مجید نے یہی لفظ جہاد مشرک والدین کے لئے دو جگہ استعمال کیا ہے، ایک سورۂ لقمان میں اور دوسرے سورۂ عنکبوت میں۔ جو نوجوان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتے تھے تو ان کے مشرک والدین اُن پر دباؤ ڈالتے تھے کہ وہ واپس
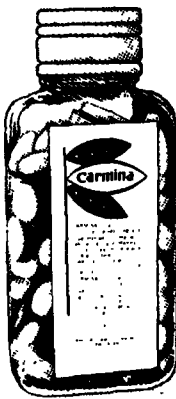
اپنے آبائی دین پر آجائیں : وَاِنْ جَاھَدٰكَ عَلٰٓی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا۔ معلوم ہوا کہ مشرک بھی مجاہد تھے۔ وہ مجاہد فی سبیل الشرک اور مجاہد فی سبیل الطاغوت تھے اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ بھی مجاہد تھے اور وہ تھے مجاہد فی سبیل اللہ اور مجاہد فی التوحید۔ یہ کشمکش آپ کو ہر دَور میں ملے گی اور یہ بات بغیر استثناء کے، حقیقتِ نفس الامری ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی !

(جاری ہے)

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ
فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ
وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ
(الحدید : ۲۵)
اور ہم نے لوہا اتارا
جسمیں جنگ کی بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کیلئے
بڑے فوائد بھی ہیں۔

توحید فی العلم یا توحید فی المعرفہ اور
توحید فی العمل یا توحید فی الطلب کا

فریضہ اقامتِ دین

سے ربط و تعلق

ڈاکٹر اسرار احمد

کے خطاب و درس کی ساتویں قسط

اب آگے اس آیت کریمہ کا نہایت ہی اہم حصہ آرہا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۱۵ طویل آیات میں سے ایک ہے اور اس آیت کے ہر حصہ میں معانی و مفاہیم کے سمندر پنہاں ہیں۔ اب اگلے حصہ پر توجہات کو مرتکز کیجئے۔ فرمایا:

وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ

"اور مجھے حکم ملا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں"

یہ حصہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی صحیح تفسیر و تعبیر یہ ہے کہ "دین اللہ" درحقیقت اجتماعی نظام عدل و قسط ہے۔ دین اللہ قائم کرنے کا مقصد کیا ہے! وہ یہ ہے کہ انسانوں کے مابین عدل و قسط اور انصاف کا نظام قائم و نافذ ہو۔ تمدن کی جو بھی پیچیدگیاں در اینچ پیچ ہے، ان سب کو رفع کر کے ایک مبنی بر انصاف نظام قائم ہو، معاشرے کے کسی فرد کے بھی حقوق تلف نہ ہوں۔ معاشرے کا کوئی طبقہ کسی دوسرے طبقہ کا استحصال نہ کر سکے۔ عورت اور مرد کے درمیان توازن ہو اور مبنی بر انصاف توازن ہو۔ سرمایہ اور محنت کے درمیان توازن ہو اور مبنی بر قسط و عدل توازن ہو۔ فرد اور معاشرے کے درمیان توازن ہو اور یہ توازن بھی عدل

قسط پر مبنی ہو۔ ان تمام اعتبارات سے عدل و قسط قائم کرنا ہی شریعت کا منشأ و مدعا ہے
اس بات کو مزید سمجھنے کے لئے سورۂ حدید کی پچیسویں آیت دیکھئے جس کے آغاز میں فرمایا:
لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ
لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ " بلاشبہ اور بالتحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو بیّنات کے ساتھ بھیجا اور
ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل و قسط پر قائم ہو جائیں" قرآن حکیم کی یہ بڑی اہم
بالشان آیتوں میں سے ایک ہے۔ اس میں رسولوں کی بعثت اور ان کو معجزات اور واضح و روشن
دلائل دیئے جانے کا مقصد بھی بیان ہوا ہے اور کتب نیز ساتھ ہی میزان یعنی شریعت کے
نزول کی غایت بھی واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے۔ ان تمام کی غرض و غایت یہ بیان فرمائی
گئی ہے کہ بنی نوع انسان عدل و قسط پر قائم ہوں۔ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ایک ایسا
اجتماعی نظام حیات نافذ اور جاری و ساری ہو جو مبنی بر عدل و قسط اور انصاف ہو۔ جس پر
کاربند ہو کر کوئی کسی کا خون نہ چوسے، کوئی کسی کا استحصال نہ کرے۔ کوئی کسی کو ناجائز طور پر
دبائے نہیں۔ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، کوئی کسی کی حق تلفی نہ کرے۔ کوئی کسی پر جور و ستم اور
دست درازی نہ کرے۔ لہٰذا صرف دین اللہ اور المیزان یعنی شریعتِ الٰہی کے ذریعے انسان
کو وہ معیارِ حق و باطل مل سکتا ہے جو ٹھیک ٹھیک تول کر بتا دے کہ انسانی معاشرے میں
حقوق و فرائض کا توازن کیا ہے! نظریات و افکار میں حق کیا ہے! باطل کیا ہے! اخلاق و
معاشرت میں طہارت و پاکیزگی کے معیارات کیا ہیں! یہی نظام متعین کرتا ہے کہ عبد و معبود
کے درمیان صحیح تعلق کی اساسات کیا ہیں! اس حیاتِ دنیوی کا آخرت کی ابدی زندگی
سے ربط و تعلق کیا ہے۔!

اظہار دین الحق

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرہ نمائے عرب میں بنفسِ نفیس بالفعل
دین اللہ قائم، غالب اور نافذ کر کے دکھا دیا۔ خلافتِ راشدہ میں
اسی نظام عدل و قسط کے مزید خدّ و خال نمایاں ہوئے۔ اسی لئے اسے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ
کہا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر جب بیعت خلافت ہوئی تو
آپؓ نے جو پہلا خطبہ دیا یعنی POLICY STATEMENT کا اعلان کیا تو اس
میں اسی عدل و قسط کے نظام کی وضاحت میں فرمایا کہ ' اے لوگو! میرے نزدیک تم سے ہر
قوی کمزور رہوگا جب تک کہ میں اس سے حق وصول نہ کر لوں اور ہر کمزور میرے نزدیک قوی

ہوگا جب تک کہ اس کا حق اسے دلوا نہ دوں ۔۔۔ پھر یاد کیجئے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس موقع پر کیا ارشاد فرمایا تھا جب اسلام کے نظام عدل و قسط کا جھنڈا عرب و عجم اور شمالی افریقہ کے وسیع علاقوں پر لہرانے لگا تھا اور اللہ کا کلمہ ہی سب سے بلند ہو گیا تھا کہ "عمر کو یہ اندیشہ مضطرب اور بے چین کئے رکھتا ہے کہ اگر کوئی کتا بھوک سے عراق میں ہلاک ہو گیا تو آخرت میں مجھ سے اس کی بازپرس نہ ہو جائے۔ مجھ سے جواب طلبی نہ ہو جائے"۔ جس نظام عدل و قسط میں اس کا سربراہ بھوک سے ایک کُتّے کے ہلاک ہو جانے پر خوفزدہ اور ہراساں رہتا ہو، اس سے اندازہ لگائیے کہ انسان کے حقوق کی عدل و انصاف کے ساتھ پاسداری اور ادائیگی کا اس نظام میں کیا مقام ہوگا!! ۔۔۔ یہاں ایک اور بات نوٹ کر لیجئے جس کو میں پہلے بھی اپنے دروس میں کئی بار بیان کر چکا ہوں کہ قرآن حکیم کا یہ اسلوب ہے کہ اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور بیان ہوتے ہیں ۔ سورہ حدید میں تو تمام رسولوں کے ساتھ کتابوں اور میزان کے نازل فرمانے کی غایت اور اس کا مقصد بیان فرمایا گیا کہ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ اسی سورہ شوریٰ کی سترھویں آیت میں نبی اکرمؐ پر کتاب یعنی قرآن اور میزان یعنی شریعت کے نزول کا ذکر موجود ہے :

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ط [1]

پس یہ دین اللہ، یہ شریعت، یہ میزان درحقیقت نظام عدل و قسط ہے ۔ یہ عادلانہ و منصفانہ اجتماعی نظام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو عطا فرماتا رہا ۔ اور جس کا اکمال و اتمام ہوا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر : اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط آج (یعنی نبی اکرمؐ کے توسط سے آپؐ کے زمانہ بعثت میں) میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام بطور دین (نظامِ حیات) قبول کر لیا ہے"۔

---

[1] سورۂ شوریٰ کی آیت زیرِ درس میں تو حضورؐ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ 'وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ' سورۂ نساء کی آیت نمبر ۵۸ میں تمام اہل ایمان سے فرمایا گیا: وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ° (اے مسلمانو!) جب بھی تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو"۔ اسی طرح سورۂ نحل کی آیت کے آغاز میں نہایت تاکیدی اسلوب (باقی اگلے صفحہ پر)

(باقی اگلے صفحہ پر)

کسی واعظ اور رسولؐ کی دعوت کا فرق

یہاں پر وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ کے ضمن میں ایک بات اور سمجھ لیجئے۔ یہ بھی اہم اور ضروری بات ہے کہ ایک ہوتا ہے واعظ ۔ وعظ کہا اور اگلی منزل۔ اگر کوئی پیشہ ور واعظ ہے تو اس کا اصل مقصود و مطلوب یہ ہوتا ہے کہ اس کے وعظ کی دھوم ہو، اس کے زورِ خطابت کی سامعین داد دیں، جہاں جائے لوگ نعروں سے استقبال کریں۔ وہاں گلے میں ہار پڑیں۔ عمدہ سے عمدہ کھانا ملے، بطور نذرانہ خدمت ہو جائے پھر اگلی منزل ہے۔ وہاں بھی وعظ کہا۔ مطلوب حاصل کیا پھر اگلی منزل ہے ___ ایک وہ ہے جو کھڑا ہو جاتا ہے اور منادی کرتا ہے کہ میں وعظ کہنے نہیں آیا نظام عدل و قسط قائم کرنے آیا ہوں۔ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ___ اب تو زمین و آسمان کا فرق واقع ہو گیا۔ ناجائز طور سے کمائی کرنے والے اور حرام خوری کرنے والے لوگ اپنی حرام اور ناجائز طریقے سے کمائی ہوئی دولت میں سے کسی واعظ کو کچھ نذرانے کے طور پر دے دیں۔ خوب مرغن کھانا کھلا دیں، ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ نظام وہی رہے گا، نظام پر کوئی آنچ نہیں آنی چاہیئے۔ ہمارے ظالمانہ نظام، ہمارے تشدد، ہمارے استحصال، ہمارے دباؤ، ہمارے مشرکانہ یا مبتدعانہ عقائد، ہمارے جاہلیت پر مبنی رسم و رواج اور ہماری حرام خوریوں پر آنچ نہیں آنی چاہیئے ___ ان پر نکیر نہ ہو، ان کو چیلنج نہ کیا جائے۔ نذرانے لے لو، چڑھوائے چڑھ والو، کوئی اور خدمت ہے تو بتاؤ، حاضر ہیں۔ چندے لینے ہیں، حاضر ہیں۔ لیکن ہمارے نظام کو مت چھیڑنا۔ لیکن جہاں بات یہ آ جائے کہ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ۔ میں صرف وعظ کہنے نہیں آیا ہوں میں نظام عدل و قسط قائم کرنے آیا ہوں۔ میں مامور من اللہ ہوں۔ مجھے تو اس کا حکم ملا ہے۔ لہٰذا جو لوگوں کا طرح طرح سے خون چوس رہے ہیں وہ تو مخالفت کریں گے۔ جن کے مفادات پر زد پڑتی ہو آنچ آتی ہو وہ کسی طور اس کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ایک غلط اور ظالمانہ نظام کا جو ناجائز انتفاع ہے جو VESTED INTEREST ہے وہ ختم ہو جائے۔ یہ بات ان کے لئے ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو گی۔ وہ اس سے کبھی بھی دست بردار ہونے کے لئے

(تسلسل) سے فرمایا گیا: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ "(اے مسلمانو!) اللہ تمہیں عدل اور بھلائی کرنے کا حکم دیتا ہے۔" (مرتب)

آمادہ نہیں ہوں گے They can't take it lying down کہ وہ آپ کو موقع دے دیں Walk over دے دیں کہ چلئے آپ نظام عدل وقسط قائم کردیں۔ وہ تو مزاحمت کریں گے، مخالفت کریں گے، اس دعوت کو کچلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے ۔ عدل قائم کرنے کا کیا مطلب ہے؟ یہی کہ جن لوگوں کو جو ناجائز مراعات حاصل ہیں، وہ ان سے چھین لی جائیں۔ لہٰذا اب تصادم ہوگا، اب لڑائی ہوگی، اب مقابلہ ہوگا، اب حزب اللہ اور حزب الشیطان آمنے سامنے آئیں گے۔ اب مقاتلہ طے کرے گا کہ کون اپنے موقف میں سچا اور مخلص تھا۔ کون اس کے لئے کتنی قربانیاں دینے کے لئے تیار تھا! اب تو فیصلہ اس طور پر ہوگا۔ پس یہ چیزیں بڑی مختلف ہیں۔ ایک وعظ کی بات ہے، عقیدے کی دعوت ہے، اس کی تبلیغ ہو رہی ہے جیسے عیسائی مشنریز۔ نظام سے ان کو کوئی غرض نہیں، کوئی تعرض نہیں، اس پر کوئی تنقید ونکیر نہیں، تمہارا جو نظام ہے رکھو۔ ملوکیت ہے تو رہے ہمیں اس سے کیا لینا ہے۔ کوئی قوم دوسری قوم پر مستبدانہ طور پر مسلط ہے تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں تو اپنے عقیدے کو پھیلانا ہے ۔ وہ بھی اکثر وبیشتر Back Door سے پھیلایا جاتا ہے کہ معاشرے کے گرے پڑے طبقات میں کہیں دودھ اور گھی کے ڈبے بانٹ دیئے کہیں بسکٹ اور اسی نوع کی چیزیں تقسیم کردیں۔ کہیں ان کے علاج ومعالجہ کے لئے ہسپتال قائم کر دیئے۔ کہیں ان کی تعلیم کے لئے مشنریز اسکول اور کالج کا انتظام کر دیا۔ ان طور طریقوں سے ان کے ذہنوں میں اپنا عقیدہ داخل کر دیا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ ان کے پاس نہ کوئی نظام ہے نہ شریعت۔ محض عقیدہ ہے یا چند رسوم (Rituals) ہیں۔ ان کا کام اس پر ختم ہو جاتا ہے کہ پہلے کسی کا نام عنایت اللہ یا کرشن چندر تھا تو ان کے نام عنایت مسیح اور کرشن مسیح میں تبدیل کرا دیئے۔ اور مردم شماری میں ان کا نام و مذہب بدلوا کر ان لوگوں کو مطمئن کر دیا جو اوپر بیٹھے اس کام کے لئے اربوں ڈالر سے بھی زیادہ رقوم کے سالانہ بجٹ فراہم کرتے ہیں۔ تو یہ تبلیغ اور تبلیغ ہے اور ایک تبلیغ وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ آنحضورؐ نے ڈنکے کی چوٹ اعلان فرمایا وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۔ میں تمہارے مابین عدل قائم کرنے آیا ہوں۔ میں مامور من اللہ ہوں۔ میری بعثت کا تکمیلی مقصد یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین اور میزان، (شریعت) اللہ کا نازل کردہ وہ نظام عدل وقسط بالفعل

ائم کردوں کہ جس سے تل کر حق کے مطابق ملے جس کو جو کچھ ملے۔ کوئی شخص اور کوئی طبقہ کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کر سکے۔ کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے جو ظالم کا ہاتھ پکڑ لے ور مظلوم کی دادرسی کرے۔ وہ نظام جو عدوان، جور، ظلم اور استحصال سے پاک وصاف نظام ہو ۔۔ میں محض واعظ بن کر نہیں آیا ہوں ۔۔۔۔۔ آیت کے اس چھوٹے سے ٹکڑے یں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا انقلابی پہلو کوزے میں سمندر کی مانند سمویا ہوا ہے۔ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا یہ انقلابی پہلو عموماً لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں ہے۔ حالانکہ آنحضورؐ کی بعثت کی امتیازی شان ہی اللہ کی کبریائی، اس ی حاکمیت پر مبنی نظام عدل وقسط کا قیام اور اس کا غلبہ ہے ۔ بالکل آغاز ہی میں آں حضورؐ س منصب پر فائز فرمائے گئے تھے ۔ سورۂ مدثر کی ابتدائی تین آیات ذہن میں لائیے جو اکثر مفسرین کے نزدیک تیسری وحی ہے : یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ یہی بات سورۂ فتح، سورۂ توبہ اور سورۂ صف میں بایں الفاظِ مبارکہ فرمائی گئی : هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۔ دنیا میں جو بھی نظام ہائے اطاعت رائج ہیں ان سب پر اللہ کے دین کو غالب کرنا آنحضورؐ کا فرضِ منصبی ہے۔ پنی حیاتِ طیبہ میں آپؐ نے بنفسِ نفیس جزیرہ نمائے عرب میں بالفعل یہ نظام قائم کر کے اور چلا کے دکھایا ۔ اسی انقلابی نظریہ اور دین کو خلافتِ راشدہ نے اس وقت کی معلوم ومہذب دنیا کے بڑے حصہ پر غالب کر دیا ۔۔۔۔۔ اسی بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے اس حصہ میں کہلوایا گیا ہے :

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ

حجت بازی سے کنارہ کشی کا اصل الاصول

آگے چلئے ۔ ابھی آیت نمبر ۱۵ ہی چل رہی ہے ۔ جس میں پہلے حضورؐ سے فرمایا گیا کہ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۔ یعنی مشرکین کی شدید ترین مزاحمت اور اہل کتاب کی بدترین مخالفت کے باوجود آپؐ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت پر مبنی اقامتِ دین کی دعوت دیتے رہیے ۔ ان معاندین کی طرف سے جو تشدد اور تعدی ہو رہی ہے اس پر صبر کیجئے اور اپنے موقف پر مستقیم

رہیئے ۔ جمے رہیئے ۔ ان کی خواہشات کی قطعی پرواہ نہ کیجئے ' اور ان سے کہہ دیجئے کہ میں تو اس کتاب پر ایمان رکھتا ہوں جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور کہہ دیجئے کہ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ : اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل قائم کروں ـــــ آگے آں حضورؐ کو جو کہنے کا حکم آرہا ہے اس حصّہ کا بھی تعلق " قُلْ " سے ہے :

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ ۚ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۚ ○

" (اے نبی کہدیجئے) اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی ۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ۔ ہمارے درمیان کوئی حجّت بازی اور کوئی جھگڑا نہیں ۔ اللہ ہم سب کو ایک روز جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے ۔ "

یہ بات کس سے کہی جا رہی ہے! مشرکین سے بھی اور خاص طور پر اہلِ کتاب سے ۔ ماقبل آیت میں ان کا ذکر آ چکا ہے ۔ لہٰذا قریب تر وہ ہی ہیں ۔ ویسے بھی توحید کے وہ مقرّ ' نبوّت و رسالت سے وہ واقف ' نبی آخر الزماں کے ظہور و بعثت کے وہ منتظر ـ پھر بھی وہ مخالفت میں پیش پیش ۔ اسی لئے ان سے خطاب کر کے سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا : وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ " اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر) نازل کی ہے ۔ اور جو اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود ہے ۔ لہٰذا تمہارے لئے یہ بات ہرگز مناسب نہیں بلکہ جائز نہیں کہ تم ہی سب سے پہلے اس کا انکار کرنے والے بنو " ـــ تمہارے پاس تورات ہے جس میں ھُدًی وَّ نور ہے ۔ اس کے باوجود تم ہمارے رسولؐ کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے ہو ۔ مشرکین مکّہ کی پیٹھ ٹھونک رہے ہو ۔ ان کو حجّت کے لئے مواد فراہم کر رہے ہو ـــــ ان کو ہمارے نبیؐ سے طرح طرح کے سوالات کرنے اور الجھنے کی ترکیبیں سکھا رہے ہو ـــــ سُن رکھو کہ اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی ۔ معقول دلائل سے حق تم پر واضح ہو چکا ہے ۔ اب اپنے اعمال کا نتیجہ ہمیں ملے گا اور اپنے اعمال کا نتیجہ تم بھگتو گے ـــــ ہمارے مابین کسی حجّت بازی اور کج بحثی کی ضرورت نہیں ہے ۔ تم کہتے ہو کہ ہم توحید پر کاربند ہیں اور دین ہی کے لئے کام کر رہے ہیں تو اللہ عالم الغیب ہے وہ فیصلہ فرما دے گا اگر خلوص سے ہم توحید پر عمل پیرا ہیں اور اس کے دینِ توحید کو ایک نظام حیات کی حیثیت

سے قائم کرنے کی جد وجہد کر رہے ہیں تو ہم اللہ سے اجر پا لیں گے ۔۔۔ ہم تمہارے اعمال کا اجر نہیں لے سکتے ۔ تم ہمارے اعمال کا اجر نہیں پا سکتے ۔ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کے اعتبار و لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں مسئول و ماجور ہوگا ۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۔ ہر ذی نفس اپنی کمائی کے عوض اللہ کے ہاں رہن ہے ۔ جو نیکی یا بدی وہ کمائے گا اسی کے مطابق اسے بدلہ مل کر رہے گا ۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بالحق تخلیق فرمایا ہے ۔ تاکہ آخرت میں ہر متنفس کو اس کی اس دنیا میں کمائی کا پورا بدلہ دیا جائے ۔ وہاں لوگوں پر ہرگز ظلم نہیں کیا جائے گا ۔ کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی ۔ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ٥ ۔۔۔۔ لِهٰذَا لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللّٰهُ ایک روز ہم سب کو جمع کر دے گا ۔ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۔ اس حصّہ کی شرح میں آگے بیان کروں گا ۔ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ٥ اور ہم سب کو اسی کی طرف جانا ہے ۔

ہمارے لیے عظیم رہنمائی

موجودہ حالات میں اس آیت کے آخری حصّہ میں ہمیں بڑی عظیم رہنمائی ملتی ہے ۔ امّت کی تاریخ پر چودہ صدیوں کا زمانہ بیت گیا ہے ۔ امّت میں فرقے موجود ہیں ۔ لوگ اس بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں ۔ ایک حدیث میں بہتّر فرقوں کا ذکر آیا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ وہاں بہتّر کی تعداد کثرت کے لئے آئی ہے ۔ ورنہ اتنے فرقے موجود نہیں رہے ۔ مشہور فرقے تو سنّی ، شیعہ ، خارجی اور معتزلہ رہے ہیں ۔ ان میں بھی سنّی اور شیعہ اصل فرقے ہیں جن کے مابین قریباً ساڑھے چودہ سو برس سے مسلسل کشمکش چلی آرہی ہے ۔ چونکہ ان کے مابین نہایت بنیادی و اصولی اور اساسی (FUNDAMENTAL) اختلافات ہیں ۔ خلافت کا تصوّر اور امامت کا تصوّر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں ۔ سنّی مکتبِ فکر کے نزدیک معصومیت خاصّۂ نبوّت ہے ۔ نبی کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ۔ نبوّت ختم ہوئی تو معصومیت بھی ختم ہوئی جبکہ شیعہ مکتبِ فکر میں امام کی معصومیّت جزوِ ایمان ہے ۔ پھر ان کے ہاں امامت

صرف آلِ فاطمہؓ میں منحصر ہے اور ان کے لئے مختص ہے۔ ان کے ہاں البتہ کئی فرقے ہیں جن میں وہ بھی ہیں جو امام غائب کے قائل اور ان کے ظہور کے منتظر ہیں اور وہ بھی ہیں جن کا امام مسلسل چلا آرہا ہے۔ اور ہر دور میں حاضر و موجود رہتا ہے۔ ان میں حلول کے قائل بھی موجود ہیں ــــــ مجھے اس وقت اس مسئلہ پر گفتگو نہیں کرنی۔ صرف اتنا جان لیجئے کہ اس مکتب فکر یعنی اہل تشیع میں بیشمار فرقے ماضی میں بھی رہے ہیں اور اب بھی موجود ہیں ــ باقی رہا اہل سنّت والجماعت کا معاملہ تو یہ غلط فہمی دور کر لیجئے کہ حنفی ہوں، مالکی ہوں، شافعی ہوں، حنبلی ہوں، اہل حدیث ہوں ان کے مابین کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ یہ حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ چند فقہی امور و مسائل کی تفصیلات کی تعبیر، توضیح، تشریح، تفسیر، ترجمانی (INTERPRETATION) اور انطباق و استنباط (IMPLICATION) میں تھوڑا تھوڑا اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ میں اس بات کو پہلے بھی وضاحت سے بیان کر چکا ہوں۔ یہ تو ہماری بدقسمتی ہے کہ چند پیشہ ور واعظوں اور چند علمائے سوء نے اپنی مسندیں، اپنی قیادتیں، اپنی چودھراہٹیں اور اپنی سیادتیں قائم رکھنے اور چمکانے کے لئے چند فروعی مسائل پر جن کی دین میں گنجائش موجود ہے نزاعی مسائل بنا کر مورچہ بندی کر رکھی ہے اور اپنی انانیت کے تحت امّت کی وحدت کو پارہ پارہ کر رکھا ہے۔ اس وقت مجھے ان سے بھی بحث نہیں ہے بلکہ مجھے اس موقعہ پر جو عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ خلوص و اخلاص اور نیک نیّتی سے دین کا کام کرنے والوں میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ رائے کا بھی اور طریقِ کار کا بھی ــ یہ اختلاف بھی مبنی بر اخلاص ہو سکتا ہے۔ اس کو ایک سادہ سی مثال سے اس وقت میں آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں چونکہ یہ عملی مسئلہ ہے۔

ایک ایسے پرانے مریض کا تصور کیجئے جو کسی ایک مرض میں نہیں بلکہ بہت سی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ اس کی حالت متعدد امراض کی وجہ سے ناگفتہ بہ اور نزار ہے۔ اس کے دل میں بھی ضعف ہے اس کا جگر بھی خراب ہے۔ اس کے گردے بھی ماؤف ہو رہے ہیں۔ نزلے اور زکام میں بھی وہ مبتلا ہے۔ اب اگر آپ اس مریض کے علاج و معالجہ کے لئے چار حکیم یا ڈاکٹر لا کر کھڑے کر دیں گے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ حکیم اور ڈاکٹر کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا مریض اس کے علاج سے شفا پائے اور صحت یاب ہو جائے۔ وہ مریض کے لئے چاہتا ہے یا اپنی نیک نامی، شہرت اور منفعت کے لئے چاہتا ہے اس کو چھوڑیئے۔ بہر حال وہ مریض کی شفا ضرور چاہے گا لیکن ہو سکتا ہے کہ پورے خلوص و اخلاص اور نیک نیّتی کے باوجود ان چاروں کی تشخیص اور تجویز میں بھی فرق ہو۔

ایک کی تشخیص و تجویز یہ ہو کہ اس کے جگر کی فکر کرو۔ اہمیت جگر کی ہے۔ دوسرے کا خیال ہو کہ اہمیت گردوں کی ہے ان کی فکر کرو۔ کہیں گردوں نے کام چھوڑ دیا تو مریض ہاتھ سے گیا تیسرے کی رائے ہو کہ اس وقت اصل توجہ پھیپھڑوں پر دی جانی چاہئے اور پہلے نزلہ و زکام کی فکر کرنی چاہئے چوتھے کا اصرار ہو کہ دل کا معاملہ اوّلین اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی پہلے فکر لازم ہے۔ چاروں معالج مخلص ہیں۔ دل سے مریض کی شفا کے متمنی ہیں لیکن تشخیص و تجویز میں اقدمیت و اوّلیت اور اہمیت کے معاملہ میں اختلاف کر رہے ہیں۔

اس مثال میں اب مریض کی جگہ امّتِ مسلمہ کو رکھ لیجئے۔ کوئی مخلص و دیانتدار اور دردمند اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ شیطان کے ہتھکنڈوں، اغیار کی ریشہ دوانیوں، دوست نما دشمنوں کی سازشوں کے باعث امت صدیوں سے بیمار ہوتے ہوتے فی الوقت اعتقادی، فکری و نظری اور عملی و اخلاقی اعتبارات سے بے شمار بیماریوں اور خرابیوں میں مبتلا ہے۔ اللہ کے دین کا جھنڈا بتمام و کمال کہیں بھی سربلند نہیں ہے۔ جو دین فاران کی چوٹیوں سے آفتابِ عالم تاب کی طرح طلوع ہوا تھا، جس نے نورِ توحید سے کرۂ ارضی کے ایک بڑے حصّہ کو منوّر کر دیا تھا، آج اس دین پر غربت و مسکنت طاری ہے۔ کفر و الحاد، شرک و زندقہ، بدعات کے اندھیاروں میں یہ آفتابِ ھدایت گہنا گیا ہے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ چند لوگوں کے دلوں میں اپنے دین اور اپنے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی امّت کا درد پیدا فرماتا ہے۔ وہ لوگ غور و فکر کرتے ہیں کہ تجدید و احیاءِ دین اور اصلاحِ امّت کے کام کا آغاز کس طور سے کیا جائے۔ کس کام کو اقدمیت و اوّلیت دی جائے۔ جس رائے پر ان کا دل ٹھک جاتا ہے۔ انہیں انشراحِ صدر حاصل ہو جاتا ہے اس کے مطابق کام کے لئے وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ تمام معاملہ اجتہادی ہوتا ہے اس لئے کہ وحی کا سلسلہ تو منقطع ہو چکا۔ نبوّت تو جنابِ محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ختم ہو چکی۔ لہٰذا جو دردمند شخص احیاءِ دین اور اصلاحِ امّت کے لئے اٹھتا ہے وہ اجتہادی طور پر کوشش کرتا ہے کہ بہتر سے بہتر طریق پر دین کی تجدید کا، اسلام کی سربلندی کا، اقامتِ دین کا، امّت کی اعتقادی و عملی خرابیوں کی اصلاح کا کام کر دوں۔ اس کی تشخیص اور تجویز سے پورے اخلاص و خلوص اور نیک نیتی کے باوجود بھی اختلاف ممکن ہے۔ اس بات کو سامنے رکھئے اور آیت کے آخری حصّے کو پڑھئے اور یہ نتیجہ اخذ کیجئے کہ ایسے اشخاص اور ایسی جماعتوں کو باہم دست و گریباں نہیں ہونا چاہئے۔ اپنے اپنے طریقوں پر دین کی خدمت اور احیاءِ اسلام کے لئے خلوص و اخلاص

کے ساتھ عمل پیرا رہیں لیکن ایک دوسرے پر الزام تراشی نہ کریں، ایک دوسرے کی ٹانگیں نہ گھسیٹیں اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جذبات پروان نہ چڑھائیں بلکہ جہاں تک ہو سکے تعاون واشتراک کا معاملہ کریں ۔ ایک دوسرے کی خیر خواہ رہیں اور انداز وہ اختیار کریں جس کی طرف ہمیں اس آیتِ مبارکہ کے ان الفاظ میں رہنمائی مل رہی ہے کہ اَللّٰہُ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ " اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے؛ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ " ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال؛ لَا حُجَّۃَ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ " ہمارے اور تمہارے مابین حجت، بحث وتمحیص اور مناظرہ کی کوئی ضرورت نہیں" اَللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا ۔ اگر ہم مخلص ہیں اور اخلاص کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور تم بھی مخلص ہو اور خلوص سے کام کر رہے ہو تو اللہ ایک دن ہمیں جمع کر دیگا منزل اگر ایک ہے تو لازماً سب ایک دن ایک جگہ جمع ہو جائیں گے ـــــ میں اس کے لئے یہ مثال دیا کرتا ہوں کہ ۹ ذی الحجہ کو منیٰ سے لاکھوں انسان چلتے ہیں؛ سب کو جانا عرفات ہے۔ وقوفِ عرفہ کرنا ہے، وہی اصل حج ہے۔ عرفات جانے کے لئے ہزاروں قافلے بنے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا جھنڈا علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ اور اونچا رکھا جاتا ہے تاکہ اس قافلے کا کوئی آدمی ذرا اِدھر اُدھر ہو جائے تو اپنے جھنڈے کو دیکھ کر قریب آ جائے ورنہ بچھڑ گیا تو گیا۔ اب ملنا مشکل ہے۔ اب یا تو ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں ملاقات ہو گی یا تین چار دن بعد مکہ مکرمہ میں ـــــ لہٰذا لوگ قافلوں کی شکل میں چلتے ہیں لیکن منزل سب کی ایک ـــــ جن لوگوں کو حال ہی میں حج کی سعادت نصیب ہوئی ہو وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب تو منیٰ سے عرفات کے لئے چھ بڑی کشادہ سڑکیں ہیں لیکن یہ سب سڑکیں قافلوں کو کہاں پہنچائیں گی! عرفات ـ سب قافلے وہاں جمع ہو جائیں گے۔ پس دین کی خدمت یا اقامتِ دین کی جدوجہد جو لوگ اور جو جماعتیں بھی خلوص و اخلاص کے ساتھ کر رہی ہیں اور ان کے طریق کار میں اختلاف ہے ـــــ طریق راستہ ہی کو کہتے ہیں ـــــ تو جیسے منیٰ سے عرفات کے لئے چھ طرائق یعنی راستے جا رہے ہیں، اسی طرح ان لوگوں اور جماعتوں کے طریق کار بھی مختلف ہو سکتے ہیں ـــــ چونکہ یہ اجتہادی معاملہ ہے اب یہاں اور کہیں بھی نبوت نہیں ہے۔ لہٰذا طریق کار میں اختلاف ہو تو فکر مندی کی کوئی بات نہیں۔ اگر منزل ایک ہے تو قریب سے قریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔ اور آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں منزل پر پہنچ کر تو سب ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں گے۔ چلئے اگر دنیا میں ہم قریب نہ بھی ہوئے تو ایک دن آتا ہے جب اپنے رب کے حضور میں حاضری ہو گی: اَللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا

وَ اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ۔ آخر لوٹنا تو وہیں ہے۔ وہیں پتہ چل جائے گا کہ کون کتنے پانی میں تھا!
وہیں حقیقت کھل جائے گی کہ کس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹیاں بندھ گئی تھیں۔ کون جماعتی
عصبیتِ جاہلیہ میں گرفتار ہو گیا تھا۔ کون خلوص کے ساتھ چل رہا تھا! کون کس شخصیت کی عقیدت
کا غلام ہو گیا تھا! ہر ایک کی حقیقت کھل جائے گی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا ہو جائے گا
کون مخلص تھا اور کون غیر مخلص! وہاں سب عیاں ہو جانا ہے۔ جو مخلصین ہوں گے وہ باہم دگر شیر و شکر
ہو جائیں گے۔

اس موقع پر میرا ذہن ایک واقعہ کی طرف منتقل ہوا ہے۔ سورۂ حجر میں الفاظ آئے ہیں: "وَ
نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ o" اور ہم ان کے دلوں
میں اگر ایک دوسرے کی طرف سے میل ہوا تو ہم اسے نکال دیں گے اور وہ آپس میں بھائی بھائی بن
کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔" یہ اہلِ ایمان کا ذکر ہو رہا ہے کہ جب ان سے کہا جائے گا کہ
جنت میں سلامتی کے ساتھ بے خوف و خطر داخل ہو جاؤ! اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ o تو
اہلِ ایمان کے دلوں میں بر بنائے طبعِ بشری اپنے کسی بھائی کے دل میں کوئی رنجش اور میل ہو گا تو
جنت میں اللہ اس کو دلوں سے نکال دے گا۔ جس واقعہ کی طرف میرا ذہن منتقل ہوا ہے وہ یہ
ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ آیت میرے اور معاویہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔
رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ ایک دوسرے کی طرف سے دلوں میں میل تو آیا تھا۔ جب تلواریں نیاموں سے
باہر آ گئی تھیں۔ تو یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ دونوںؓ کے دل ایک دوسرے سے آئینہ کی طرح صاف تھے۔
شکوہ، شکایت اور گِلا ایک دوسرے سے پیدا ہوا اسی لئے حضرت علیؓ کہہ رہے ہیں کہ جنتی ہم دونوں
ہیں۔ رنجش کی وجہ سے اس دنیا میں دلوں میں جو میل آ گیا ہے، جو کدورت پیدا ہو گئی ہے تو
اللہ تعالیٰ جنت میں ہمارے دلوں کو صاف کر دے گا۔ اس کے لئے سورہ حجر کی حضرت علیؓ نے
وہ آیت پڑھی جو میں نے آپ کو سنائی ہے۔

لہٰذا دنیا میں خلوص و اخلاص کے ساتھ دین کے لئے کام کرتے ہوئے ایک دوسرے
سے گلے و شکوے ہو جاتے ہیں۔ اگر حضرتِ علی اور حضرتِ معاویہ کے مابین رنجش پیدا ہوئی رضی اللہ
تعالیٰ عنہما جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں تو ہم کیسے یہ دعویٰ کریں گے کہ ہمارے
دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے کبھی کوئی میل آتا ہی نہیں، کوئی رنجش کبھی پیدا ہوتی ہی
نہیں۔ لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ تصور ذہن میں رکھا جائے کہ: اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۗ لَنَآ اَعْمَالُنَا

ںکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ۚ لَاحُجَّۃَ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمۡ ۚ اَللّٰہُ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا وَ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ۝ اس
ن ہیں، میں ایک اور بات بھی کہا کرتا ہوں ۔ ہم جمع نہ بھی ہوئے تو کوئی حرج نہیں۔ ہمارا کام
بح ہو جائے گا۔ آپ بھی محنت کر رہے ہیں دین کے لئے اور میں بھی دین ہی کے لئے محنت کر رہا
ں تو ان محنتوں کے ثمرات کہاں جمع (CREDIT) ہوں گے ؟ ظاہر بات ہے کہ دین کے
تے ہیں۔ فرض کیجئے کہ کوئی ایک شخص کسی ایک جماعت کے ذریعے سے دین کے قریب آ جاتا
، اور کوئی دوسرا شخص کسی دوسری جماعت کے ذریعے سے دین کے قریب آیا تو کام تو جمع
گئے چاہے وہ قافلے جمع نہ ہوئے ہوں ۔ اَللّٰہُ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا وَاِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ۝

صلِ گفتگو

میں نے آغاز ہی میں عرض کیا تھا کہ اقامتِ دین کے موضوع پر یہ تین
آیات اہم ترین ہیں ۔ اس کے مخاطبین، اس کے مخالفین، مخالفت کی
ہ، تفرقہ کا سبب، ان سب کا علاج، پھر جو داعی ہو اس کا کردار، اس کو کن باتوں کو ملحوظ
نا ہے۔ ان تین آیات میں یہ تمام مضامین آ گئے اور میں نے اپنی امکانی حد تک ان کی
ریح و توضیح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ ؏

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آغاز میں میں نے اس سورۂ مبارکہ کی نو آیات ۱۳ تا ۲۱ کی تلاوت کی تھی ۔ اب چھ آیات
رہ گئی ہیں جن کا مختصر تشریح کے ساتھ ان شاء اللہ ہم مطالعہ کریں گے ۔ میں آپ سے گذارش
وں گا کہ آپ اسی صبر و اطمینان اور توجہ کے ساتھ تشریف رکھیں جس کا اب تک آپ نے مظاہرہ
ہے تاکہ درس کا جو نصاب اس نشست کے لئے پیشِ نظر تھا وہ مکمل ہو جائے ۔

مخالفین و معاندین کے لیے انتباہ

فرمایا : وَالَّذِیۡنَ یُحَآجُّوۡنَ فِی اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا اسۡتُجِیۡبَ لَہٗ " اور جو لوگ اللہ کے
ب میں ابھی بحث و مباحثہ اور حجت بازی میں پڑے ہوئے ہیں "۔ یہاں فِی اللّٰہِ سے مراد فِیۡ
یۡنِ اللّٰہِ ہے " ابھی تک جو لوگ اللہ کے دین کے بارے میں جھگڑوں ہی میں پڑے ہوئے
ں حالانکہ اللہ کی پکار پر لبیک کہی جا چکی "۔ آگے بڑھنے سے قبل آیت کے اس حصہ کو وضاحت
ے سمجھ لیجئے۔ دیکھئے جب کوئی نئی دعوت اٹھتی ہے تو کچھ لوگ تو اتنے ذہین ہوتے ہیں کہ وہ اس

کو اس کی Face value پر قبول کر لیتے ہیں اور ان میں اتنی جرأت بھی ہوتی ہے کہ : ؎
ہرچہ بادا باد ۔۔ ماکشتی درآب انداختیم ۔۔ اب جو ہو سو ہو، ہم نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ اب
تیریں گے تو اس کے ساتھ اور ڈوبیں گے تو اس کے ساتھ ۔۔ لیکن سب لوگوں میں اتنی ہمت
نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں کہ جن کو حقیقت تو معلوم ہو جاتی ہے کہ بات صحیح ہے لیکن منجدھار
میں چھلانگ لگانے کے لئے جو ہمت درکار ہوتی ہے اس کا ان میں فقدان ہوتا ہے۔ اس کی مثال
یوں سمجھئے کہ جیسے ایک جنگل ہے۔ اس میں جانے کا کوئی راستہ ہونا تو درکنار کوئی پگڈنڈی بھی
بنی ہوئی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں کوئی بڑی ہمت والا ہی ہوگا جو اس میں داخل ہوگا لیکن
اگر کچھ لوگوں نے چل کر کوئی پگڈنڈی بنا دی ہو تو نسبتاً کم ہمت لوگ بھی اس پر چل پڑنے کا اپنے
اندر حوصلہ پیدا کر لیں گے۔ چونکہ ان کو نظر آرہا ہے کہ راستہ بنا ہوا ہے اور کچھ لوگ اس پر چل کر جنگل
میں داخل ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔۔۔ یہی بات یہاں کہی جا رہی ہے : وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ
فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ ۔ اللہ کے دین کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد
بھی جو لوگ دعوت کو قبول کرنے والوں سے حجت بازی کر رہے ہیں، اس آیت میں وہ لوگ مراد
ہیں ۔۔ میرے مطالعہ اور اندازے کے مطابق سورۂ شوریٰ کے نزول کا زمانہ مکی دور کا آخری
تیسرا حصہ یعنی سن آٹھ نبوی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس وقت تک بہت سے ایسے لوگ بھی ایمان
لا چکے تھے جو قریش میں ایک باحیثیت مقام رکھتے تھے اور ایسے بھی جو دبے ہوئے طبقے سے تعلق
رکھتے تھے۔ گویا کہ بہت سے لوگوں نے بیچ منجدھار کود کر دکھا دیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے
تشدد جھیل کر، مصائب برداشت کر کے اور قربانیاں دے کر اعلیٰ مثالیں قائم کر دی تھیں ۔۔
اس طرح ان لوگوں کے لئے جو کم ہمت تھے، پگڈنڈی بن گئی ہے۔ راستہ بن گیا ہے۔ اب ان کے
لئے اس پر چلنا آسان ہو گیا ہے۔ جو اب بھی تعویق میں ہوں، لیت و لعل میں ہوں، جو اب
بھی حجت بازی میں پڑے ہوں، معلوم ہوا کہ اب ان کا کوئی عذر اللہ تعالیٰ کی جناب میں لائق
پذیرائی نہیں رہا۔ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۔ ان کی حجت، ان کی دلیل ان
کے رب کے پاس بالکل باطل ہے۔ پادر ہوا ہے : وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ
شَدِيْدٌ ۝ اور ان پر اللہ کا شدید غضب نازل ہو کر رہے گا۔ ان کے لئے بہت بڑا
عذاب ہے" ۔۔۔ قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ اس آیت میں ان کم ہمت لوگوں کے لئے بھی
انتباہ ہے جو دعوت کو حق سمجھ لینے کے باوجود مشرکین و مخالفین کے تشدد اور تعدی کے خوف

سے دعوت کو قبول کرنے میں ہچکچا رہے ہیں اور ان کے لئے بھی شدید وعید ہے کہ جن کے دل دعوت کی حقانیت تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ اپنے مفادات، اپنے تعصبات اور اپنی عصبیت کے باعث دعوت کو قبول کرنے کے بجائے اس کی راہ میں معاند بنے ہوئے ہیں اور اس دعوت کو کچلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور ان کا ساتھ دے رہے ہیں جو صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور وہ سرے سے دعوت کی حقانیت کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اس آیت میں تینوں قسم کے لوگ مخاطبین ہیں۔

الکتاب والمیزان — قرآن و سنّت

اگلی آیت میں وہ مضمون آرہا ہے جو میں نے لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ کی توضیح و تشریح کے ضمن میں سورہ حدید کی ایک آیت کے حوالے سے بیان کیا تھا۔ میرے نزدیک سورہ شوریٰ مکی سورتوں میں اتنی ہی اہمیت کی حامل ہے جتنی مدنی سورتوں میں سورہ حدید — سورہ حدید میں رسولوں کی بعثت، ان کو بیّنات عطا کرنے، ان کے ساتھ کتابیں اور میزان یعنی شریعت نازل فرمانے کی غرض و غایت ان الفاظ مبارکہ میں بیان فرمائی گئی تھی کہ: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ یہاں فرمایا:

اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ط

"اللہ ہی ہے وہ ذات جس نے حق کے ساتھ کتاب اتاری اور میزان بھی اتاری"۔

جیسے حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر کتاب تورات نازل ہوئی تو اس کے ساتھ شریعتِ موسوی اتری۔ ویسے ہی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوا تو اس کے ساتھ المیزان یعنی شریعت یا دین الحق نازل ہوا۔ یہی بات اس آیت مبارکہ کی ابتداء میں ایک دوسرے اسلوب سے فرمائی جو سورہ توبہ، سورہ فتح اور سورہ صف میں بایں الفاظ وارد ہوئی۔ ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ — "وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھیجا الھدٰی اور دین الحق کے ساتھ" — یہاں "و" واو عطف ہے — دین الحق، الھدٰی سے مختلف شے ہے، علیحدہ

چیز ہے۔ اس معنی میں کہ الہدیٰ یعنی قرآن مجید میں علمی ہدایت ہے، اصولی ہدایت ہے اور سنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام اس کی عملی تفسیر ہے، اس کا عملی مظاہرہ (Demonstration) ہے۔ جب قرآن حکیم کے ساتھ سنّتِ رسول جمع ہو جائے گی تو دین الحق بنے گا۔ وہ میزان یعنی شریعت سامنے آئے گی کہ کس کا کیا حق ہے اور کس کے کیا فرائض ہیں۔ کیا واجبات ہیں! اور طے ہو گا کہ WHAT IS DUE TO HIM AND WHAT IS DUE FROM HIM اس پر لازم کیا ہے اور اس کا حق کیا ہے۔ یہ ہے کتاب اور میزان جو اللہ نے نازل فرمائی ——

غور طلب بات

اب غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے میزان کس لئے نازل فرمائی! ایسے ہی رکھی رہے یا اس میں تولا جائے! میزان تو اس لئے اتاری گئی کہ نصب ہو۔ دین اس لئے دیا گیا کہ قائم ہو— دین اگر قائم نہ ہو تو وہ دین ہے ہی نہیں پھر تو وہ مذہب بن گیا۔ وہ صرف ایک عقیدہ بن گیا۔ وہ صرف ایک cult بن گیا۔ وہ محض چند رسوم (Rituals) کا مجموعہ بن گیا۔ دین تو وہ ہوتا ہے کہ ایک نظام کی حیثیت سے بالفعل قائم و نافذ ہو۔ اس کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھ لیجئے۔ انگریز کے دورِ غلامی میں جس نظام کی اصل حکمرانی تھی وہ "دین انگریز" تھا۔ تاجِ برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے مطاعِ مطلق برطانوی پارلیمنٹ تھی۔ تمام فوجداری اور دیوانی قوانین اس کے بنائے ہوئے تھے اور ان کے مطابق ہی ملک کا نظام چل رہا تھا۔ البتہ دوسرے مذاہب کے ساتھ مسلمانوں کو بھی یہ آزادی حاصل تھی کہ نجی زندگی میں نمازیں پڑھ لو، روزے رکھ لو، حج کو چلے جاؤ، اپنے طور پر زکوٰۃ ادا کر دو۔ شادی بیاہ کی رسوم اپنے طور پر بجا لاؤ۔ Private اور شخصی معاملات میں انگریز سرکار کو کوئی سروکار نہیں لیکن ملک کا نظام اور قانون Law of the Land انگریز کا بنایا ہوا رائج و نافذ رہے گا۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر ہی علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

فرمایا کہ توضیحِ حقیقت کے اظہار کے لئے بر سبیلِ تذکرہ دوبارہ ہو گئی۔ اب پھر آیت زیرِ درس پر توجہ مرتکز کیجئے، فرمایا: اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ط " اللہ ہے وہ جس نے حق کے ساتھ اتاری ہے کتاب بھی اور میزان بھی" سورہ حدید میں بعثتِ رسول، انزالِ کتب و میزان کی جو غرض و غایت بیان فرمائی گئی تھی کہ: لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ط " تاکہ لوگ عدل و قسط پر قائم ہو جائیں" اس کو آیت کے اس حصے کے ساتھ ذہن و قلب پر ثبت کر لیجئے تو اَقِيْمُوْا

الــذِیْنَ اور وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ کے جملہ مقتضیات و متضمنات واضح ہو کر آپ کے سامنے آجائیں گے ۔

انجام سے متعلق تنبیہ

آگے چلئے ۔ اسی آیت کے دوسرے حصہ میں فرمایا :

وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ ٥

"اور (اے نبیؐ) آپ کو کیا معلوم کہ قیامت قریب ہو سر پر آئی کھڑی ہو"

یہاں انداز مختلف ہے ۔ اس میں انسانوں کی ایک فطری اور نفسیاتی کمزوری پر متنبہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ حقیقت کو انہوں نے پہچان بھی لیا لیکن دل کے اندر جو چور ہے اور مفادات و لذاتِ دنیوی سے جو انس ہے اس کی وجہ سے تعویق و تاخیر کا معاملہ ہوتا ہے ۔ سوچ کا انداز یہ ہو جاتا ہے کہ بات تو حق ہے قبول کرنی چاہئے اور ہم ضرور قبول کریں گے ذرا فلاں فلاں کاموں سے فارغ ہو جائیں پھر ہم بھی میدان میں کود پڑیں گے ۔ بس یہ یہ ذمہ داریاں ہیں ان سے نمٹ لیں ، ذرا بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں ان سے عہدہ برآ ہو جائیں تو پھر ہم اقامت دین کی جدوجہد میں ہمہ وقت اور ہمہ تن لگ جائیں گے اور اپنی ساری توانائیاں اور اپنے تمام اوقات اللہ کی راہ میں لگا دیں گے ۔ اس سے بڑا فریب اور دھوکہ کوئی نہیں اور دھوکہ کس کو دے دیں گے ۔ حقیقی بات یہ ہے کہ اس سے بڑی خود فریبی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی ۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ عمر کا یہ دنیا کسے تمام نہ کرد اپنی بچیوں سے فارغ ہوں گے تو آگے نواسیاں اور پوتیاں ہونگیں ۔ اپنی ذمہ داریوں سے فراغت کیسے ہوگی ۔ نسل تو آگے پھیلے گی ، بڑھے گی اور نہ معلوم کیا کیا معاشرتی پیچیدگیوں PROBLEMS سے سابقہ پیش آگئے گا ۔ اور جب آپ اپنے کاموں سے فارغ ہوں گے ۔ ـــــ اوّل تو فراغت ملتی نہیں ۔ لیکن فرض کیجئے کہ کسی نے سوچ رکھا ہو کہ ریٹائر ہو جاؤں پھر دین کے لئے کام کروں گا تو حکومت بھی اس وقت ریٹائر کرتی ہے جب صلاحیت و اہلیت برائے نام رہ جاتی ہے ۔ ایسی حالت و کیفیت میں آپ دین کے لئے کریں گے کیا ! اس لئے کہ حکومت نے ریٹائرمنٹ کی مدت خوب سوچ سمجھ کر رکھی ہے ۔ توانائیاں تو خدمتِ سرکار میں ختم ہوئیں اب تو آپ کی حیثیت SPENT UP FORCE کی ہے ۔ یہ ہیں وہ دھوکے اور فریب جو انسان کا نفس خود اسے دیتا ہے ۔ سورہ حدید میں یہ مضمون اہل ایمان کے لئے مختص ہو کر آیا ہے ۔ وہاں فرمایا : اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ

"کیا وقت آ نہیں گیا ہے اہل ایمان کے لئے کہ جھک جائیں ان کے دل اللہ کی یاد میں اور اس کے سامنے جو حق سے نازل ہوا ہے"۔ یہ تاخیر اور تعویق۔ اور یہ بات کہ یہ کر لوں وہ کر لوں پھر دین کے کام میں لگ جاؤں گا۔ خود فریبی کے اس چکر سے کب نکلو گے! وہی بات نبی اکرمؐ سے مخاطب ہو کر بطور واقعہ اور حقیقت فرمائی جا رہی ہے، وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ۝ " اور (اے نبیؐ) آپ کو کیا خبر کہ قیامت (فیصلہ کی گھڑی) قریب ہی آ لگی ہو۔"

انتہائی قابلِ توجہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھیے کہ ایک قیامت تو آخری قیامت ہے اور ایک میری اور آپ کی انفرادی (INDIVIDUAL) قیامت ہے۔ یعنی میری اور آپ کی موت۔ وہ تو ہم سب کے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ ہم میں سے کون جانتا ہے کہ وہ کب آئے گی! جگر مراد آبادی مرحوم کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

ارباب ستم کی خدمت میں اتنی ہی گذارش ہے میری
دنیا سے قیامت دور سہی دنیا کی قیامت دور نہیں

موت کی صورت میں ایک قیامت انسان پر اس دنیا میں بھی آتی ہے جسے ہم قیامت صغریٰ کہتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من مات فقد قامت قیامتہٗ " جو مر گیا اس کی قیامت تو قائم ہو گئی! مہلتِ عمر اور مہلتِ عمل ختم ہوئی ۔۔۔ کیا معلوم وہ چھوٹی قیامت میرے سر پر منڈلا رہی ہو۔ مجھے لاہور جانا نصیب نہ ہو۔ کسے یقین ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ کل صبح طلوع ہونے والا سورج میں لازماً دیکھوں گا۔ اگر دل میں یہ یقین ہو تو بہت بڑا دھوکہ ہے۔ فرمایا: وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ۔۔۔ کس برتے پر، کس امید میں تم یہ چیزیں مؤخر کر رہے ہو! اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرض ادا کرنے کی فکر کرو۔ اس کے لئے جدوجہد کرو۔ اَنْ اَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ۔ اس کے لئے کمربستہ ہو جاؤ۔ سر بکف ہو کر میدان میں نکلو۔ باطل سے پنجہ آزمائی کے لئے تیار ہو کر آؤ۔ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ کا تقاضا خاتم النبیین والمرسلین کے امتی کی حیثیت سے پورا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔ تنظیم پیدا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب یعنی قرآن مجید اور میزان یعنی شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام حق کے ساتھ نازل کی ہے، اس پر مبنی نظامِ عدل و قسط قائم کرنے کی جدوجہد کرو۔ ورنہ تم کو کیا پتہ کہ موت تمہارے سرہانے کھڑی ہو۔ تم اسی تعویق و تاخیر میں رہو اور مہلتِ عمر تمام ہو جائے ۔۔۔ یہ جملہ مفاہیم اس آیتِ مبارکہ میں بیان ہوئے کہ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝

(جاری ہے)

جمیل الرحمٰن

فصلِ بہار

جون کے مہینے میں قرآن اکیڈمی میں

قرآنی علوم و معارف کے انوار کی بارش

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى خُصُوْصًا

عَلٰى اَفْضَلِهِمْ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ مُحَمَّدِ الْاَمِيْنِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْن

امتِ مسلمہ اس امر پر متفق ہے اور اس پر اجماع ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلی وحی سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات کی شکل میں نازل ہوئی : اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ ان آیات میں دو مرتبہ لفظ اِقْرَاْ آیا ہے جس کے معنی ہیں "پڑھ"۔ قَرَاَ يَقْرَاُ سے یہ فعل امر ہے۔ اسی سے فعلان کے وزن پر لفظ "قرآن" بنا۔ سب سے زیادہ پڑھی جانے والی شے" اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اس وصف اور اسم صفت ہی کو اپنی کتابِ مبین کا سب سے زیادہ مشہور و معروف بلکہ اسم عَلَم "القرآن" قرار دے دیا۔ اس کتاب حمید کے متعدد صفاتی نام اور بھی ہیں لیکن اس کا اسم عَلَم "القرآن" ہی ہے اور پوری دنیا یہ تسلیم کرتی ہے جس میں یگانے بھی شامل ہیں اور بیگانے بھی، جس میں اس کتاب پر ایمان رکھنے والے بھی ہیں اور اس کے وحی الٰہی ہونے کے منکر بھی کہ قرآن ہی دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ یہ شرف صرف قرآن ہی کو حاصل ہے کہ یہ کتاب اس پر ایمان رکھنے والوں میں سے لاکھوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہے اور دنیا میں جہاں بھی معتدبہ تعداد میں مسلمان بستے ہیں وہاں ہر سال رمضان المبارک میں ہزاروں حفاظ تراویح میں پورا قرآن سناتے ہیں اور لاکھوں سے بھی متجاوز قرآن کی تلاوت سنتے ہیں۔ ان خصوصیات میں کوئی کتاب بھی قرآن مجید کی شریک و سہیم نہیں ہے لیکن اپنی جگہ یہ بھی واقعہ ہے جو حد درجہ افسوسناک بھی ہے کہ اوّل تو اس کتاب کے منزل

من اللہ ہونے پر ایمان رکھنے والوں کی عظیم اکثریت عربی زبان سے نابلد ہے۔ جبکہ قرآن حکیم کی زبان عربی ہے۔ دوسرے یہ کہ جن کی زبان عربی ہے یا جو عربی سے بخوبی واقف ہیں، ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو محض ایک کتابِ مقدس کا مقام دے رکھا ہے اور وہ محض اس کی تلاوت و قرأت پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اور اسی کو باعثِ اجر و ثواب سمجھتے ہیں جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ ھدًی للناس ہے، انفرادی و اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو، کوئی گوشہ اور کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے لئے اس کتابِ الٰہی میں ہدایت و رہنمائی موجود نہ ہو۔ اور اس کے نزول کا اوّلین مقصد یہ ہے کہ قرآن کے اصولوں پر مبنی نظام اجتماعی قائم اور نافذ کیا جائے۔ مسلمان بحیثیت مسلمان اس دنیا میں عزت و وقار حاصل کر ہی نہیں سکتا جب تک وہ بحیثیت امّت و ملّت اس قرآن کو عملی طور پر اپنا ہادی و امام نہ بنالے اور اس کتابِ ہدایت کے مطابق اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو استوار نہ کرلے۔ بقول علامہ اقبال ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن

بحمد اللہ ہر دور میں ایسے رجالِ دین پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے اور اس فرقانِ حمید پر عمل کرنے کی دعوت دینے کے لئے اپنی زندگیاں کھپادیں اور کھپا رہے ہیں۔ ان ہی خوش بخت حضرات میں ڈاکٹر اسرار احمد بھی ایک خادمِ قرآن مجید کی حیثیت سے شامل ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے یہ توفیق بخشی کہ انہوں نے دعوتِ رجوع الی القرآن کو ایک تحریک کی شکل میں برپا کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے اور وہ کتاب و سنّت کی اساسات پر اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔

اللہ رب العزت جو نعم المولیٰ اور نعم النصیر ہے اس کی تائید و نصرت کا مظہر امسال ایک عجیب شان سے سامنے آیا اور اس نے دعوتِ رجوع الی القرآن اور تفہیم القرآن کے لئے وہ راہیں کھول دیں جن کی طرف وہم و گمان بھی نہیں جاتا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ۱۶ ر یوم کے ہندوستان کے دعوتی دورے سے ۲۵ ر اپریل کو واپس آنے کے بعد حسبِ معمول پاکستان میں دعوتی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے۔ اس کے پہلو بہ پہلو ۵ ر مئی کو عمرہ ادا کرنے اور سعودی عرب کے بعض شہروں کا دورہ دینے کی بدولت دورہ کرنے کے لئے روانگی کے انتظامات بھی ہو رہے تھے۔ اس پر مستزاد تنظیم اسلامی کے نویں سالانہ

اجتماع (۲۵ تا ۳۰ مئی) کے انتظامی مسائل بھی پیش نظر تھے۔ جن پر ۳۱ مئی کو امیر موصوف محترم بھائی قمر سعید قریشی قیم تنظیم اسلامی سے تبادلہ خیال اور مشورے فرما رہے تھے۔ امیر محترم نے اس مشاورت میں راقم کو بھی طلب فرمایا۔ اسی مشاورت کے دوران یہ مسئلہ بھی زیر گفتگو آیا کہ آنے والے رمضان المبارک میں جامع قرآن' قرآن اکیڈمی میں تراویح کا کیا انتظام ہو۔ امیر محترم نے فرمایا کہ تراویحہ کے دوران تلاوت کردہ حصہ کے اہم مطالب و مفاہیم پر کئی بار روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس کے کیسٹ بھی تیار ہیں۔ انہی باتوں کا اعادہ کچھ جچتا نہیں پھر موسم بھی گرمی کے لحاظ سے شدید سے شدید تر ہوتا چلا جائے گا۔ کوئی ایسا پروگرام سوچنا چاہیئے کہ جس میں جدت بھی ہو اور افادیت بھی۔ نیز شرکاء کا ذوق و شوق بھی قائم رہے پھر امیر محترم نے فرمایا کہ " اس موقع پر اچانک میرے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ کیوں نہ اس رمضان المبارک میں تراویح شروع ہونے سے قبل چار رکعتوں میں جتنا قرآن حکیم پڑھا جانے والا ہو' اس کا رواں ترجمہ اہم نکات کی ممکنہ حد تک مختصر تشریح' ربط آیات اور نظم سُوَر کے ساتھ بیان کیا جائے۔ پھر ہر ترویحہ میں اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے۔ اس طرح اگر اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید حاصل رہی تو ۲۹ رمضان تک دورۂ ترجمہ قرآن مکمل ہو جائے گا "۔ بھائی قمر سعید صاحب تو امیر محترم کے اس خیال پر پھڑک اٹھے۔ اور انہوں نے اصرار کے ساتھ فرمایا کہ ایسا ضرور ہونا چاہیئے نیز موصوف نے فرمایا کہ اس طرح ان شاء اللہ یہ ترجمہ مختصر تشریحات کے ساتھ کیسٹوں میں ریکارڈ ہو جائے گا جس سے بے شمار طالبان فہم قرآن مستقل طور پر استفادہ کر سکیں گے۔

راقم نے بھی قمر بھائی کی رائے کی تائید کی۔ امیر محترم نے اس اندیشے کا اظہار فرمایا کہ " اگر یہ کام شروع کیا گیا تو ترجمہ قرآن کے اس کام میں اور بیس رکعات تراویح کی ادائیگی میں کم از کم چار ساڑھے چار گھنٹے کا وقت لگ جائے گا۔ اگر ہم صلوٰۃ عشاء ساڑھے نو بجے شب شروع کریں گے تو پیش نظر پروگرام دو بجے سے قبل ختم ہونا ممکن نہ ہوگا۔ شرکاء کے لئے یہ پروگرام بہت بھاری پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ اندیشہ ہے کہ شرکاء زیادہ تعداد میں اور پابندی کے ساتھ اس پروگرام میں شرکت نہ کر سکیں چونکہ اس طرح پوری شب بیداری میں گزرے گی۔ مزید یہ کہ امسال گرمی کا موسم شدید ترین ہونے کے آثار ہیں اور رمضان المبارک کا پورا مہینہ جون میں گزرے گا جو گرمی کے اعتبار سے اس کے شباب کا مہینہ ہوتا ہے۔ لہٰذا کوئی فیصلہ کرتے وقت ان تمام امور کو سامنے رکھنا ہوگا "۔ بھائی قمر سعید کی رائے یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر یہ کام ضرور ہونا چاہیئے اور ان شاء اللہ حاضری پچھلے سالوں کے مقابلے میں زیادہ ہی ہوگی۔ اور اہم تر بات یہ ہے کہ اس طور پر قرآن مجید

کا ترجمہ اور اہم تشریحات ریکارڈ ہو جائیں گی جن سے مستقبل میں 'دعوت رجوع الی القرآن' تحریک
تجدید ایمان۔ توبہ۔ تجدید عہد کے کارکنان و رفقاء کو بڑی مدد ملے گی جبکہ موجودہ مصروفیات کے
پیش نظر تحریری طور پر یہ کام ہونا بعید از امکان نظر آتا ہے ـــــ امیر محترم نے فرمایا کہ وہ اس تجویز
کے تمام پہلوؤں پر غور کریں گے اور سعودی عرب سے واپس آکر فیصلہ کریں گے لیکن اللہ کا کرنا یہ
ہوا کہ اس خیال کا میثاق میں تذکرہ ہو گیا اور بات عام ہو گئی۔ نیز اکثر حلقوں سے اصرار ہونے لگا کہ
یہ پروگرام ضرور ہونا چاہیئے۔

امیر محترم کی حجاز مقدس سے ۱۲ مئی کو لاہور واپس تشریف آوری ہوئی اور موصوف نے یہ
خوشخبری سنائی کہ انہوں نے مجوزہ پروگرام کو اللہ کی تائید و نصرت کے بھروسے پر روبعمل لانے کا فیصلہ
کر لیا ہے۔ امیر محترم کے اس فیصلے پر سب ہی کو خوشی ہوئی البتہ یہ اندیشہ راقم کے دامن گیر تھا کہ
امیر محترم بھارت اور سعودی عرب کے نہایت مشقت سے بھرپور دوروں سے واپس تشریف لائے
ہیں۔ پھر ۲۲ مئی سے ۲۴ مئی تک تنظیم اسلامی کی مجلس مشاورت کے اجلاس بعدہ ۲۵ مئی سے ۳۰
مئی تک تنظیم اسلامی کے نویں سالانہ اجتماع کے ضمن میں مسلسل اور تھکا دینے والی مصروفیات سے سابقہ
پیش آئے گا کہیں امیر محترم کی صحت متاثر نہ ہو جائے جس کے باعث یہ مفید کام درمیان میں معطل نہ
ہو جائے چونکہ یکم جون سے رمضان المبارک کے آغاز کا امکان تھا۔ لہٰذا ان شدید ترین مصروفیات
اور مشقت کے بعد موصوف کو آرام کے لئے کوئی وقت ملنا ممکن نہ تھا

لیکن اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کا اظہار جس شان سے ہوا اور " وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا
فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا " کا وعدہ الٰہی جس طور سے پورا ہوا اس کا کسی قدر اندازہ تو
فی الواقع صرف وہی کر سکتے ہیں جو اس پروگرام میں شریک رہے ہوں (تاہم اس پروگرام کا پس منظر
اور اس کی تفصیلات اور اس کے بارے میں شرکاء کے تاثرات کو قارئین میثاق تک پہنچانے
کے لئے کچھ تھوڑی بہت کاوش ادارے کی جانب سے میثاق کے ان صفحات میں ہو رہی ہے)ـــــ
چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید و توفیق کا مظہر تھا کہ رمضان المبارک کی دوسری شب سے
قرآن اکیڈمی میں قرآنی علوم و معارف اور اس کے انوار کی بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلی
شب کو حکومت کی طرف سے رمضان کے چاند کی رویت کا اعلان کافی تاخیر سے ہوا۔ اس لئے اس
پروگرام کا اس شب آغاز نہیں ہو سکا۔ دوسری شب جامع قرآن میں تراویح سے قبل چار رکعات میں تلاوت
کئے جانے والے حصے کے ترجمہ اور ضروری تشریح کا محترم ڈاکٹر صاحب نے آغاز فرما دیا۔ پھر ہر

ترکیبی اگلی چار رکعات میں تلاوت کئے جانے والے حصے کا ترجمہ و تشریح اور ربط و نظم آیات و سُور کا سلسلہ ۲۹ ر رمضان المبارک کی شب تک مسلسل جاری رہ کر بفضلہ تعالیٰ و عونہٖ یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا جس کو ترجمہ کے مقابلے میں ترجمانی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

پروگرام کے بارے میں بھائی قمر سعید قریشی کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ ابتداء ہی سے شرکاء کی تعداد پچھلے سالوں کے مقابلے میں زیادہ تھی بلکہ روزانہ اس تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ انجمن کی طرف سے اس پروگرام کا ۱۲ر مئی کی اشاعت میں لاہور کے چند اخبارات میں اشتہارات کے ذریعہ اعلان کر دیا گیا تھا۔ لیکن حاضری میں اضافہ کا ایک اہم سبب یہ بنا کہ جو حضرات اس پروگرام میں شریک ہوئے جب انہوں نے اس کی افادیت کو محسوس کیا تو انہوں نے اس کا اپنے حلقۂ تعارف و اثر میں تذکرہ کیا جس کے نتیجے میں شرکاء کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ قرآن اکیڈمی میں موسم بہار کے جشن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ آخری عشرہ میں تو یہ کیفیت تھی کہ ہر شب کو قریباً یک صد موٹریں جامع قرآن کے اطراف میں جمع ہو جاتی تھیں اور یہی کیفیت موٹر سائیکلوں کی ہوتی تھی۔ شدید گرمی کے باوصف شرکاء کا ذوق و شوق اور شغف دیدنی تھا۔ شرکاء کی کثیر تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات پر مشتمل تھی جس میں ڈاکٹرز، انجینئرز، پروفیسر، وکلاء، ممتاز صنعت کار اور تجار غرض کہ ہر طبقہ کے افراد شامل تھے جو دن میں اپنے معمولات و مشاغل بھی ادا کرتے تھے اور شب میں اللہ کے گھر میں حالتِ قیام میں قرآن مجید کا سماع ہوتا اور حالتِ قعود میں تلاوت کئے جانے والے حصے کے پہلے سے ترجمہ اور تشریحات و توضیحات کے ذریعے قرآن حکیم کے علوم و معارف، حِکَم و عِبَر سے مستفید و مستفیض ہوتے۔ یقیناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا روزانہ ظہور ہوتا رہا ہوگا کہ : ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ یتلون کتاب اللہ و یتدارسونہ بینہم الا نزلت علیہم السکینۃ وغشیتہم الرحمۃ وحفتہم الملائکۃ وذکرھم اللہ فیمن عندہ ـــــ اس پورے پروگرام میں خواتین کی بھی اچھی خاصی تعداد شریک رہی۔ اس دورۂ ترجمہ قرآن کا یہ فائدہ بھی یقیناً ہوا ہوگا کہ تلاوت کردہ قرآن مجید کے حصے کے کم از کم پچیس فیصد مطالب و مفاہیم سامعین کے شعور و ادراک کی گرفت میں آتے رہے ہوں گے۔

اس تجویز کی ابتداء میں حاضری کی کمی کا اندیشہ تھا لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ جامع قرآن

کے ہال، اس سے ملحق گیلری اور صحن میں قریباً سات سو نمازیوں کی گنجائش ہے لیکن پہلے ہی عشرے کے بعد تنگیٔ داماں کا سماں پیدا ہوگیا اور آخری عشرے میں تو صورت حال یہ ہوئی کہ بعض مرتبہ شرکت کے بعض خواہش منداصحاب جگہ نہ ملنے کی وجہ سے واپس جانے پر مجبور ہوئے ۔ گرمی بھی پورے شباب پر تھی لیکن اصلاً تو اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم تھا اور اس کتاب عزیز کا فیضان کہ اس کی کتاب مبین کے مطالب ومفاہیم سے واقفیت حاصل کرنے والے مشتاقان کے لئے اس پورے پروگرام میں تسہیل پیدا ہوگئی ۔ اور کسی درجے میں سہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی ایک کیفیت اور جھلک سامنے آگئی اور اس کا عملی تجربہ ہوگیا کہ : وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ

معلوم ہوا ہے کہ ماضی میں اس ضرورت کے پیش نظر کہ جو کچھ نماز تراویح میں پڑھا جائے اس کا کچھ مفہوم بھی لوگوں کے علم میں آئے ۔ بعض مشہور دینی درسگاہوں میں اس کا اہتمام کیا گیا کہ نماز تراویح کے آخر میں یا ہر چار رکعتوں کے بعد پڑھی گئی آیات کے چیدہ چیدہ نکات کا بیان ہو جائے اس سلسلے کے ابتدائی تجربات لوگوں کی عدم دلچسپی کے باعث نہ چل پائے اور جن دینی درسگاہوں میں یہ مبارک سلسلہ شروع کیا گیا تھا وہاں اس سلسلے کو جلد ہی بند کرنا پڑا ۔ شاید وہاں جو سلسلہ تھا وہ محض اہم اور چیدہ چیدہ نکات کا بیان تھا ۔ ہماری معلومات کی حد تک پورے قرآن مجید کے ترجمے کی کوشش کہیں اور نہیں کی گئی ۔ بہر حال ہر کام کے لئے اللہ کی مشیت میں ایک وقت متعین ہوتا ہے ۔ اس موقع پہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق محترم ڈاکٹر صاحب کے شامل حال ہوئی ۔

اسی تبارک وتعالیٰ نے موصوف کے دل میں یہ خیال ڈالا ۔ پھر ان کو انشراح قلبی عطا فرمایا ۔ ان کو ہمت دی ؎ ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ !

اس اہم پروگرام کے دوران ڈاکٹر صاحب کی دو تین دن خاصی طبیعت خراب رہی لیکن عین تراویح کے وقت اسی رب الکریم فداہ الرحمہ نے ان کی طبیعت بحال فرمادی ۔ نیز لوگوں کے دلوں میں اس سے استفادہ کا ارادہ اور اشتیاق پیدا فرمایا اور پھر اپنے خاص فضل سے اس کی تکمیل کے لئے ان کو ہمت اور توفیق بخشی

تنظیم کے رفیق بھائی حافظ محمد رفیق سلمہ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے جن کے حسن قرأت نے نورٌ علیٰ نور کا کام کیا ۔ شرکاء کا یہ تاثر ہے کہ ان کی قرأت کا یہ انداز تھا کہ قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ سامعین کی سمجھ میں اتر رہا تھا ۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۔

اس دورۂ ترجمہ قرآن یا ترجمانی قرآن کے تجربے کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب موصوف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلم معاشرے میں فی الوقت جو بے شمار مشرکانہ و مبتدعانہ اوہام اور رسوم جاری و ساری ہیں اور شفاعتِ باطلہ کے جس عقیدے نے جڑیں پکڑ رکھی ہیں ان سب کا بڑی حد تک ازالہ عوامی سطح پہ دورۂ ترجمہ قرآن سے ہو سکتا ہے اور خالص توحید کا فہم عوام الناس میں راسخ کیا جاسکتا ہے۔

رمضان المبارک کی عظمت اور صوم و قیام اللیل کی افادیت نیز ان کے باہمی ربط و تعلق کے متعلق راقم اپنی جانب سے کچھ عرض کرنے کے بجائے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی نہایت مختصر لیکن حد درجہ جامع تالیف "عظمت صوم" کے چند اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے جس سے یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ زبان یا من ترکی و من ترکی نمی دانم والے معاملے کو حل کرنے کے لیے کس طرح اللہ تعالیٰ نے محترم ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی فرمائی اور ان کو اس سعادت سے نوازا اور ان کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا اہل و مصداق بننے کا موقع مرحمت فرمایا:

مَن قال بہٖ صدق وَمن عمل بہٖ اُجِرَ وَمن حکم بہٖ عَدَلَ وَمن دعا الیہِ ھُدِیَ الیٰ صراط مستقیم۔

"اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ رمضان المبارک کے پروگرام کی دو شقیں ہیں۔ ایک دن کا روزہ اور دوسرے رات کا قیام اور اس میں قرأت و استماعِ قرآن: اور اگرچہ ان میں سے پہلی شق فرض کے درجے میں ہے اور دوسری بظاہر نفل کے، تاہم قرآن مجید اور احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دونوں نے اشارۃً اور کنایۃً واضح فرمایا کہ یہ ہے رمضان المبارک کے پروگرام کا جزو لاینفک: یہی وجہ ہے کہ احناف کے نزدیک نماز تراویح واجب کے درجے میں شمار ہوتی ہے) —— چنانچہ قرآن نے وضاحت فرمادی کہ روزوں کے لئے ماہ رمضان معین ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں قرآن مجید نازل ہوا تھا، گویا یہ ہے ہی نزولِ قرآن کا سالانہ جشن!!

شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ	رمضان کا مہینہ تھا جس میں قرآن
اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ	مجید نازل ہوا۔

اور احادیث نے تو بالکل ہی واضح کردیا کہ رمضان المبارک میں 'صیام' اور 'قیام' لازم و ملزوم

کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ :

۱۔ امام بیہقی نے رمضان المبارک کی فضیلت کے ضمن میں جو خطبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا 'شعب الایمان' میں نقل کیا ہے' اس کے الفاظ ہیں ۔

جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً	اللہ نے قرار دیا اس میں روزہ رکھنا
وَقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا	فرض اور اس کا قیام اپنی مرضی پر

گویا قیام اللیل اگرچہ "تَطَوُّعًا" ہے تاہم اللہ کی جانب سے 'مجعول' بہرحال ہے۔

۲۔ بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے حضرت ابوہریرۃ سے روایت کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّ	جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان
اِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ	و احتساب کے ساتھ بخش دیئے گئے اس
ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا	کے تمام سابقہ گناہ ۔ اور جس نے (راتوں)
وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ	کو قیام کیا رمضان میں ایمان و احتساب
مِنْ ذَنْبِهٖ	کے ساتھ بخش دیئے گئے اس کے جملہ سابقہ گناہ

۳۔ امام بیہقی نے 'شعب الایمان' میں حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص سے روایت کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

اَلصِّيَامُ وَالْقُرْاٰنُ يَشْفَعَانِ	روزہ اور قرآن بندہ مومن کے حق میں
لِلْعَبْدِ يَقُوْلُ الصِّيَامُ اَیْ رَبِّ	سفارش کریں گے۔ روزہ کہے گا۔ اے
اِنِّیْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ	رب ! میں نے اسے روکے رکھا دن میں
بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِيْهِ وَ	کھانے اور خواہشات سے پس اس کے
يَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ	حق میں میری سفارش قبول فرما اور قرآن
بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِيْهِ فَيُشَفَّعَانِ	کہے گا میں نے روکے رکھا اسے رات کو

نیند سے پس اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما تو دونوں کی سفارش قبول کی جائے گی۔

اور اب غور فرمائیے صوم رمضان کی حکمتوں پر !

حقائق متذکرہ بالا کے پیش نظر صیام و قیام رمضان کی اصلی غایت و حکمت اور ان کا اصل ہدف و مقصود ایک جملے میں اس طرح سمویا جا سکتا ہے کہ : ــــــ ایک طرف روزہ انسان

کے جسدِ حیوانی کے ضعف و اضمحلال کا سبب بنے تاکہ روحِ انسانی کے پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیاں کچھ ڈھیلی ہوں اور بہیمیت کے بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی اور سسکتی اور کراہتی ہوئی روح کو سانس لینے کا موقع ملے ـــــ اور دوسری طرف قیام اللیل میں کلامِ ربانی کا روح پر ورود و نزول اس کے تغذیہ و تقویت کا سبب بنے ـــــ تاکہ ایک جانب اس پر کلامِ الٰہی کی عظمت کماحقہٗ منکشف ہو جائے اور وہ اچھی طرح محسوس کر سکے کہ یہی اس کی بھوک کو سیری اور پیاس کو آسودگی عطا کرنے کا ذریعہ اور اس کے دکھ کا علاج اور درد کا درمان ہے ـــــ اور دوسری جانب روحِ انسانی از سر نو قوی اور توانا ہو کر "اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز" ہو گویا اس میں تقرب الی اللہ کا داعیہ شدت سے پیدا ہو جائے اور وہ مشغول دعا و مناجات ہو جو اصل روح ہے عبادت کی اور لبِّ لباب ہے رشد و ہدایت کا!

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں صوم رمضان سے متعلق آیات میں:

اوّلاً ـــــ مجرد صوم کی مشروعیت اور اس کے ابتدائی احکام کا ذکر ہوا اور اس کی غرض و غایت بیان ہوئی "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" کے الفاظ میں اور

ثانیاً ـــــ صومِ رمضان کی فرضیت اور اس کے تکمیلی احکام کا بیان ہوا اور اس کے ثمرات و نتائج کا ذکر ہوا دو طرح پر:

ایک ـــــ "وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ" کے الفاظ میں جو عبارت ہے انکشافِ عظمتِ نعمتِ قرآن اور اس پر اللہ کی جناب میں ہدیۂ تکبیر و شکر پیش کرنے سے ـــــ اور

دوسرے ـــــ "وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ...... لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ" کے الفاظ میں جو عبارت ہے انسان کے متوجہ الی اللہ و متلاشیٔ قرب الٰہی اور مشغولِ دعا اور محوِ مناجات ہونے سے جو اصل حاصل ہے عبادت رب کا:

الغرض! صیام و قیامِ رمضان کا اصل مقصود یہ ہے کہ روحِ انسانی بہیمیت کے غلبے اور تسلط سے نجات پا کر گویا حیاتِ تازہ حاصل کر لے اور پوری شدت و قوت اور کمالِ ذوق و شوق کے ساتھ اپنے رب کی جانب متوجہ ہو جائے۔"

امپورٹ ۔ ایکسپورٹ کا قابلِ فخر ادارہ
رینبو انٹرنیشنل
فون: ۳۰۳۳۵۵ / ۳۰۳۳۷۷
برآمدی اشیاء
آرٹ سلک فیبرکس گارمنٹس ٭ بیڈشیٹس
کاٹن کلاتھ ٭ کاٹن گارمنٹس ٭ احرام تولیہ ٭ تولیہ
ہینڈی کرافٹس ٭ لکڑی کا فرنیچر ۔
درآمدی اشیاء
لاکھ دانہ ٭ سٹکر فلم ٭ سوچ سٹارٹر
ربڑ لیٹکس ٭ پولیسٹر ریان ۔
مرکزی دفاتر
I فلور غلام رسول بلڈنگ ۶ شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور
ذیلی دفاتر: کراچی ۔ فیصل آباد ۔

دورۂ ترجمہ قرآن کے شرکاء کے تأثرات

مرتبہ: محمد احمد

(ریکارڈنگ انجینئر نشر القرآن)

الحمدللہ ! ۲۹ ویں شب کو ۱۲ بجے دورۂ ترجمۂ قرآن کا نہایت بابرکت مگر کسی قدر کٹھن پروگرام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ دورہ ترجمہ قرآن کو ۹۰ c کے ۷۴ کیسٹوں پر مشتمل سیٹ میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ ادارہ نشر القرآن کا یہ سب سے طویل اور مشکل ترین پروجیکٹ ہوگا۔ یہ سیٹ ادارہ نشر القرآن سے رابطہ قائم کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر جن تأثرات کا اظہار کیا گیا ان کا خلاصہ پیش خدمت ہے ۔۔۔۔۔۔!!

اختتام پروگرام پر کچھ شرکاء کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ سب سے پہلے ملک کے مشہور و معروف سائیکالوجسٹ و ڈائریکٹر فونٹین ہاؤس لاہور ڈاکٹر رشید چوہدری صاحب نے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ہماری سب سے بڑی کمزوری عربی زبان سے ناواقفیت ہے کہ ہم قرآن مجید کے مفاہیم کو براہ راست سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہمیں اپنی پہلی فرصت میں ہی عربی زبان پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ ہم اس مقدس کتابِ ہدایت کے تمام پہلوؤں سے واقف ہو سکیں۔ انہوں نے فرمایا کہ دورۂ ترجمہ قرآن کی سماعت کے دوران بعض بہت اہم نکات جو ہمیں آج تک معلوم نہ تھے ان سے واقفیت حاصل ہوئی اور قرآن حکیم کا تصورِ حیات حقیقی معنوں میں سامنے آیا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر خود عامل ہوں، اسے دوسروں تک پہنچائیں اور بالفعل قرآن و سنت پر مبنی ایک معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کریں۔ ہم کو پورے قرآن حکیم کی تراویح کی نماز کے ساتھ ترجمہ اور ضروری تشریحات سننے کی جو سعادت ملی ہے اس کا حق اور شکر اسی طرح ادا ہوگا۔

وزیر خان صاحب محکمہ ٹیلی گراف و ٹیلیفون میں ڈائریکٹر اکاؤنٹس ہیں۔ اس مرتبہ وہ جامع القرآن ہی میں معتکف بھی تھے۔ انہوں نے بھی عربی زبان پر عبور کو بنیادی ضرورت قرار دیا۔

اور فرمایا کہ اس پروگرام کا فائدہ تو ہوا اگر صحیح معنوں میں ہم حق اس طرح ہی ادا کر سکتے ہیں کہ اپنی زندگیاں میں احکامات ربانی کو جوں کا توں داخل کر لیں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں۔ اپنی منزل رب العزت کی رضا ہی کو سمجھیں۔ آخرت سنوارنے میں لگ جائیں۔ یہی ہمارا مقصد حیات ہے۔ اسی کے لئے ہمیں کوشاں ہو جانا چاہیئے۔

ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ صاحب: خواجہ صاحب شادباغ کے سابق کونسلر ہیں اور بہت ہی معروف اور ہردلعزیز پرنسپل ہیں۔ بچوں میں تعلیمات قرآنی کا شوق پیدا کرنے کے لئے چلڈرن قرآن سوسائٹی کے پلیٹ فارم پر کام کر رہے ہیں۔ موصوف نے پنجابی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کر کے ماحول کی یکسانیت کو بدل دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے شکر و سپاس کے بعد امیر محترم اس پروگرام کی بخیر تکمیل پر مبارکباد کے مستحق ہیں اور امیر محترم نے جس آسان اور قابل فہم انداز میں قرآن حکیم کا ترجمہ و آیات کے سیاق و سباق اور ربط و نظم کو بیان کیا ہے اس سے ہر ہر پہلو اجاگر ہو گیا ہے اور ہمارے اوپر ایک واضح حجت قائم ہو گئی ہے۔ اب پکڑ آئے گی تو یہ کہ قرآن کو اگر سمجھ لیا تھا تو اس پر عمل کیوں نہیں کیا۔ لمحہ فکریہ یہ ہے کہ ہمارا جواب کیا ہو گا۔ آئیے آج عہد کریں کہ اپنی زندگیوں اور ماحول کو احکام قرآنی میں رنگ لیں۔ انقلاب قرآنی کے لئے تمام اختلافات سے بالاتر ہو کر ایک امت کی حیثیت سے تمام نوع انسانی پر حجت قائم کر دیں۔ یہ ایک فرض ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر عائد کیا تھا اسے پورا کر دیں تاکہ آخرت میں سرخرو ہو سکیں۔ خواجہ صاحب نے مزید کہا کہ "جہاں شرکاء پروگرام نے باقاعدگی سے شدید گرمی میں روزے رکھے اور راتوں کو پروگرام میں بھرپور شرکت کی وہاں ان کی روزمرہ کی معروفیات حسب سابق جاری رہیں —

یہاں ایک محترم دوست کا ذکر کر دینا باعث دلچسپی ہو گا جو کہ گھی کارپوریشن میں جنرل مینجر ہیں۔ اس سلسلہ میں روزانہ شیخوپورہ جایا کرتے ہیں۔ دوران رمضان ان کی معروفیات میں دورہ ترجمہ قرآن بھی شامل ہو گیا اور وہ اس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے۔ انسان پکا ارادہ کر لے تو اللہ تعالیٰ کٹھن کام کو بھی آسان کر دیتا ہے۔

آخر میں ہماری دعا ہے کہ رب کریم ہماری زندگیوں کو کتاب مبین کے تابع کر دے اور ہمیں حقیقی معنوں میں مومن بنا دے۔ اور ہمیں ہمت و توفیق عطا فرمائے کہ ہم سچے اور حقیقی طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا حق ادا کر سکیں۔ آمین یا رب العٰلمین!

جناب محمد اشرف صاحب نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ وہ سعودی

عرب میں جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ سے متعلق ہیں۔ تعطیلات گذارنے اپنے وطن لاہور آئے ہوئے تھے۔ اخبارات میں تراویح کے ساتھ جناب ڈاکٹر اسرار احمد کے دورۂ ترجمہ قرآن کا اشتہار دیکھا چنانچہ شروع ہی سے اس میں شرکت کی لیکن تین چار دن ہی شرکت ممکن تھی چونکہ تعطیلات ختم ہو رہی تھیں۔ یہ پروگرام بالخصوص قرآن حکیم کے مطالب و مفاہیم پر ڈاکٹر صاحب کی عمیق نظر اس پر مستزاد ان کا انتہائی موثر اور دل میں گداز پیدا کرنے والا اسلوب بیان، ان چیزوں نے ذہن و قلب پر اتنا گہرا اثر کیا کہ اس پروگرام کو چھوڑ کر سعودی عرب جانے پر کسی طرح دل آمادہ نہیں تھا۔ لیکن ملازمت کا معاملہ اور مجبوری تھی۔ لہٰذا بادل نخواستہ ڈیوٹی Join کرنے کے لئے سعودی عرب چلا گیا۔ حرم شریف پہنچ کر عمرہ ادا کیا اور ملتزم سے لپٹ کر نہایت الحاح وزاری کے ساتھ اللہ سے دعا کی کہ وہ اپنے خاص فضل سے کوئی ایسا موقع فراہم کر دے کہ میں فوراً ہی لاہور پہنچ جاؤں تاکہ اس پروگرام میں آخر تک شریک رہ کر اس سے اپنے ذہن، قلب اور روح کو قرآن حکیم کی سماعت کے ساتھ اس کے مطالب و مفاہیم سے منور کر سکوں۔

ع دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ۔ کے مصداق دعا قبول ہوئی ۔ دوسرے روز جیسے ہی اپنی ڈیوٹی پر پہنچا فوری طور پر ایک ایسا سبب پیدا ہو گیا کہ مجھے سرکاری کام سے پاکستان آنے کے احکام مل گئے۔ چنانچہ میں نے نہایت عجلت کے ساتھ تفویض کردہ کام نمٹایا اور بعجلت عازم سفر ہو کر لاہور پہنچ گیا۔ اور اس طرح دوبارہ اس بابرکت اور مفید پروگرام میں اللہ تعالیٰ نے شرکت کی سعادت عطا فرمائی ـــــ موصوف نے مزید کہا کہ مطالعہ اور ترجمہ قرآن حکیم کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن خوش الحانی کے ساتھ سمع قرآن میں جو کیف ہے اور ڈاکٹر صاحب کے حد درجہ پُر تاثیر اور جامع اندازِ بیان سے قرآن حکیم کے جو معارف اس پروگرام میں منکشف ہوتے ہیں، وہ پہلے نہیں ہوئے تھے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کتاب و سنت کا محض سکالر کی حیثیت سے مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسے اپنے قلب و ذہن حتیٰ کہ روح میں جذب کر لیا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے کلام پاک میں معجزانہ طور پر کشش، جاذبیت اور بے نہایت اثر رکھا ہے وہاں ڈاکٹر صاحب کے سینے کو اپنے کلام کے معارف، اس کے عرفان کا اعلیٰ فہم عطاء فرمایا ہے اور ساتھ ہی انتہائی پر تاثیر اسلوب و انداز بیان بھی عنایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کی مساعی کو دنیا و آخرت میں مشکور فرمائے ۔ پاکستان اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اسے ڈاکٹر صاحب جیسا مخلص خادم قرآن حکیم میسر آگیا ہے۔ اب اہل پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ ایک طرف وہ اپنی زندگیاں قرآنی تعلیمات کے مطابق استوار کرنے کی کوشش کریں دوسری طرف

اس خادمِ دین کے ساتھ تن، من، دھن سے عملی تعاون کرکے کتاب و سنّت کی تعلیمات کی
دعوت و تبلیغ کے ذریعہ اسلامی انقلاب عملاً برپا کرنے کی راہ ہموار کرنے کے لئے کوشاں
ہوں۔ اسی میں دنیا اور دین کی فوز و فلاح مضمر ہے۔

جناب شبّیر احمد صاحب بخاری سابق ڈائریکٹر ایجوکیشن پنجاب نے اپنے مراسلہ میں
جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس میں سے اس پروگرام سے متعلقہ حصّہ حسب ذیل ہے:

"برعظیم پاک و ہند میں تراویح کا جو روایتی طریق جاری ہے وہ اپنی پوری سعادتوں
برکتوں اور روحانی لطافتوں کے باوجود اس روح اور جذبے سے محروم ہوتا چلا جا رہا
ہے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا امتیازِ خصوصی تھا اور وہ حرف و معنی (قرأت و فہم) کا
باہمی بامعنی اور نتیجہ خیز رابطہ تھا جو ایک باشعور اسلامی زندگی کی ٹھوس اساس فراہم کر سکتا تھا
ہمارے ساتھ یہ المیہ بھی ہوا کہ برطانوی استبداد نے اپنی سامراجی مصلحتوں کے پیشِ نظر ہمارا
رشتہ عربی اور فارسی سے بے حد کمزور کر دیا اور گذشتہ ڈیڑھ دو صدیوں میں ہم عامۃ المسلمین
کے لئے تراویح میں تلاوت کردہ قرآنی آیات سمجھنے کا کوئی متبادل نظام بروئے کار نہیں لا سکے۔

میرے بعض دوست جنہیں دیو بند ڈابھیل اور دیگر دینی اداروں سے تعلق رہا ہے محسوس
کرتے ہیں کہ بلاشبہ اس خصوص میں جزوی، تشنہ اور سطحی، ہنگامی مساعی کے سوا ہم کوئی
مستقل اور مستحکم نظام برپا نہیں کر سکے جن میں ہر چار رکعت سے پہلے، پڑھی جانے والی آیات
کا ترجمہ اور ضروری مقامات کی تشریح کی جا سکے۔

کچھ لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ مسلسل سماعِ قرأت کا کیف اور ذوق درمیان میں کسی
وعظ و کلام کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے برعکس کچھ لوگ ذہنی کیف و سرور کو اتنا اہم نہیں
سمجھتے اور ان کا موقف یہ ہے کہ اصل مقصد تو ہم عجمیوں کے لئے قرآن مجید سمجھنا ہے محض حسن
سماعت ہی کافی نہیں۔ مقصود حسنِ شعور ہے حسنِ معنی ہے۔

امیرِ خدام القرآن محترم حضرت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا اس سال کا تجربہ نمازِ تراویح
افادیت کا ایک روشن تر پہلو سامنے لاتا ہے جو حسنِ سماع اور حسنِ شعور کا امتزاجِ جمیل ہے
شب بیداری کا عرصہ اگرچہ طویل تر ہے اور بعض کمزور طبائع اس سے متاثر بھی ہوں گی لیکن
ڈاکٹر صاحب کی عزیمت نے اسے سہل کر دیا ہے۔ دراصل اس تجربے کی کامیابی میں ان کا
ذاتی شغفِ قرآنی اور وہ جذبۂ محبت قربانی کارفرما ہے جو وہ اپنے رفقاء میں پیدا کر سکے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۷۴ پر)

ھدایات

از: ڈاکٹر اسرار احمد: امیر تنظیم اسلامی

مرتبہ: چوہدری غلام محمد ناظم تنظیم اسلامی

تنظیم اسلامی پاکستان کے ۹ ویں سالانہ اجتماع کی مختصر رپورٹ ماہنامہ میثاق کے جولائی ۸۴ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ لیکن اس اجتماع میں امیرِ تنظیم کے اختتامی خطاب کی تفصیلات اور بالخصوص اس موقع پر رفقاء کے لیے امیرِ تنظیم کی ہدایات شاملِ اشاعت نہ ہو سکی تھیں۔ یہ خطاب چونکہ خصوصی اہمیت کا حامل تھا لہذا اس کا خلاصہ اس شمارے کے ذریعے سے قارئینِ میثاق تک پہنچایا جا رہا ہے۔ ویسے ان ہدایات میں دعوتِ دین کا کام کرنے والے ہر فرد کے لئے رہنمائی موجود ہے (ادارہ)

امیر محترم نے سورہ والضحیٰ اور سورہ انشراح کے حوالہ سے گفتگو کا آغاز فرمایا اور اس کے پس منظر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی کیفیات ابتداءً احساس فرض کا بوجھ، مشکلات اور مایوسی کی تاریکیاں بعدہٗ فضل خداوندی سے آسانیوں کا ظہور اور صبح امید کی نمود کا تذکرہ فرما کر تنظیم اسلامی کے گزشتہ ادوار کی تفصیلات بیان فرمائیں کہ کس طرح انتہائی مشکل مراحل میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم نے ہماری دستگیری کی۔ الحمد للہ ابتدائی مشکلات کا دور گزر چکا اور اب اس سالانہ اجتماع سے ایک امید افزا کیفیت کا احساس ہو رہا ہے۔ قافلہ تشکیل پا چکا ہے۔ اگرچہ ابھی ہم نے کچھ فاصلہ طے نہیں کیا مگر اہم سفر کا آغاز ہو چکا ہے۔ اب انشاء اللہ العزیز قافلہ کی وسعت بھی بڑھے گی اور رفتار میں بھی اضافہ ہوگا۔ امیر محترم نے تحدیث نعمت کے طور پر بعض اطمینان بخش باتوں کا بھی تذکرہ فرمایا جن میں تمام تر سالانہ اجتماع کی مجموعی کیفیت، میثاق و حکمت قرآن کی روز افزوں اشاعت، مالیاتی حالات کی اطمینان بخش کیفیت اور سب سے بڑھ کر سنت بیعت کے مردہ تصوّر کو زندہ کرنے کی توفیق شامل ہے۔ امیر محترم نے آئندہ سال کو استحکام کا سال قرار دیا۔ اور رفقاء کو تہذیب و تربیتِ ذات کی طرف متوجہ فرمایا اور آئندہ پروگرام میں اولین ترجیح ایک موزوں

توحیدی نظام کے قیام کو قرار دیا۔ آپ نے اس کی متوقع تفصیلات کی طرف بھی کچھ اشارے فرمائے اور رفقاء کو ان سے استفادہ کی تلقین فرمائی۔ آخر میں امیرِ محترم نے چند عمومی ہدایات تلقین فرمائیں جن کا اجمالی تذکرہ حسب ذیل ہے۔

۱:۔ **ادب و احترام** ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ "با ادب بانصیب، بے ادب بے نصیب" ہماری تہذیب کا رخ یہی ہے۔ یہ احترام و تعظیم اور حفظ مراتب ہر پہلو سے ہونا چاہیئے۔ عمر، علم، مرتبہ و مقام اگرچہ وہ دنیاوی ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اگر یہ ہمارے بھائی کو میسر ہے اور اس نے اس کو خدمت دین میں لگا دیا ہے تو وہ زیادہ لائق ستائش اور قابلِ احترام ہے۔ اسی طرح تنظیم اسلامی کے نظم میں بھی اس کا درجہ بدرجہ اہتمام ضروری ہے۔ امیرِ محترم نے مولانا شبیر احمد عثمانی کے حواشی قرآن کے حوالہ سے یہ بتایا کہ امیر اور مامورین کے مابین تعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے مابین تعلق کا ایک عکس ہونا چاہیئے، اس کے بغیر وہ فضا پیدا نہیں ہو سکتی جس میں برکات اور سعادتوں کا نزول ہو۔

۲:۔ **اسلاف سے تعلق** اسلاف سے بالخصوص ادب و احترام اور حسن ظن کا تعلق استوار رہنا چاہیئے۔ اگرچہ وہ تنقید سے بالاتر نہیں اور ان سے اختلاف ممکن ہے۔ ہمارے لیے اصل رہنمائی اور حجت کتاب و سنت ہے۔ دشمنان اسلام نے ہمارے بزرگوں کے ملفوظات اور کتب میں تدسیس کی ہے۔ اگر ان کے کسی معاملہ کی تاویل ممکن نہ ہو تو اسے انہی دشمنان اسلام کے کھاتے میں ڈال دینا اور اسلاف سے حسنِ ظن قائم رکھنا مناسب ہوگا۔ امیرِ محترم نے مزید فرمایا کہ اسلاف کی متفقہ رائے سے اختلاف خواہ وہ کسی ایک ہی مسئلہ میں ہو انتہائی خطرناک ہے۔ اس طرح فتنوں کا آغاز ہوتا رہا ہے۔ قادیانیت اور پرویزیت کے ناسور اسی طرح پیدا ہوئے۔ اگر کسی مسئلہ میں اسلاف کا اختلاف رائے ہو تو کسی ایک رائے کو اختیار کر لیا جائے لیکن مجمع علیہ مسائل سے انحراف اسلاف سے قطع تعلق کے مترادف ہے۔

۳:۔ **فقہی اختلافات سے گریز** رفقاء کے لیے ضروری ہے کہ فقہی اختلافات کو کبھی گفتگو کا موضوع نہ بنائیں ان کا بیان ہماری تحریک سے مطابقت نہیں رکھتا۔ آپ جس فقہی مسلک پر مطمئن ہیں اس پر عمل کیجئے آپ کا خاموش عمل زیادہ اثر انگیز ہوگا۔

۴:۔ **لٹریچر کا مطالعہ** ہماری تحریک کی بنیاد قرآن حکیم سے اکتساب فیض ہے اور اس کے

لیے تلقین ہوتی رہی ہے۔ نتیجۃً لٹریچر کے معاملہ میں کچھ بے اعتنائی کی کیفیت ہے۔ لہٰذا ہم آہنگی پیدا نہیں ہو رہی۔ اس عدم توازن کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ امیر محترم نے ہر رفیق کے لیے ضروری قرار دیا کہ اپنی پہلی فرصت میں مندرجہ ذیل چار کتب کا مطالعہ ضرور کرے۔
۱۔ تحریک جماعت اسلامی، ۲۔ سرافگندیم، ۳۔ قرارداد تاسیس، ۴۔ شرائط شمولیت و نظام العمل۔
اوّل الذکر دو کتابیں ہمارے کام کا تاریخی جائزہ، تاریخ امت مسلمہ اور امیرِ محترم کے پس منظر سے بحث کرتی ہیں۔ اور اس کام سے وابستہ حضرات کے لیے یہ بہت ضروری ہیں آخر الذکر دو کتابچے انتہائی اہم ہیں اور خصوصی اجتماعات میں ان کا مطالعہ وقتاً فوقتاً ہوتے رہنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ بھی اب ہمارے پاس لٹریچر کا ایک اچھا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔ رفقاء بالخصوص نوجوان اس کا اس طرح بغور مطالعہ کریں کہ استدلال کی کڑیاں ذہن میں محفوظ ہو جائیں۔ مضمون کو پوری طرح جذب کرنے کے بعد ہی بہتر پیش کش کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

۵ **تجوید و قرأت** اس فن کو اس حد تک حاصل کرنا بہت ضروری ہے کہ قرآن مجید کا صحیح پڑھنا آجائے امیر محترم نے مزید فرمایا کہ ہر رفیق کو کم از کم منتخب نصاب اور آخری پارہ ضرور حفظ کر لینا چاہیئے۔

۶ **ذاتی محاسبہ** ہر رفیق کو اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیئے اور یہ عادت پختہ کر لینی چاہیئے۔ کہ اپنے فرائض پر کڑی نگاہ رہے لیکن دوسروں کی کوتاہیوں سے صرفِ نظر ہو۔ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا۔

۷ **تفریغ اوقات** امیر محترم نے ارشاد فرمایا کہ رفقاء کا کچھ وقت فارغ کرنا اس وقت ہماری بہت بڑی ضرورت ہے۔ اب دعوتی مقاصد کے لیے اکیلے نکلنا کچھ زیادہ سود مند نہیں رہا۔ بلکہ لوگ قافلہ کی شکل میں نکلیں اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کام سنبھالیں یہ کام ہر سطح پر جاری ہونا چاہیئے۔ مرکزی اور صوبائی سطح پر، شہروں، قریوں اور محلوں میں قافلے ترتیب پائیں اور دعوت فروغ پذیر ہو۔ اس کے لیے مرکز نے منصوبہ بندی مشکل کام ہے۔ رفقاء کے احساس فرض اور ادائیگی فرض کی دھن ہی سے مسئلہ حل ہوگا اور توسیع دعوت کے نئے افق روشن ہوں گے۔

امیر محترم نے خطاب کے آخری حصہ میں اذکار مسنونہ کی اہمیت کو واضح فرماتے ہوئے

کہا کہ اگرچہ مجسم اور سب سے بڑا ذکر قرآنِ حکیم اور اس کی جامع ترین صورت نماز ہے جس میں انسان کے اعضاء و جوارح اور قلب و ذہن مصروفِ ذکر ہوتے ہیں۔ تاہم اذکارِ مسنونہ بالخصوص ادعیہ ماثورہ سے انسان کے معمولات کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ اور زندگی کی ہر حرکت کی دو نسبتیں قائم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا الفاظ محمدی ہیں۔ اس کے علاوہ حضور اکرمؐ سے ثابت اذکار امراضِ قلب کے لیے تریاق کا اثر رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعہ قلب پر مسلسل معرفتِ الٰہی کا فیضان ہوتا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِین

(بقیہ: تأثرات)

اس لئے شاید کسی دوسری جگہ جہاں Motivation اس سطح تک نہ ابھر پایا ہو یہ تجربہ اتنا کامیاب نہ ہو سکے۔

لیکن خدام القرآن کی یہ عملی سعی قرآن فہمی کی جانب ایک بھرپور قدم ہے جو انشاء اللہ اپنے لئے خود نئی نئی راہیں خود پیدا کرے گا جو منزل رسی کی دلیل ہوں گی۔

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ملک اقبال واحد

بخل

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دھوکہ باز، بخیل اور احسان جتانے والا آدمی جنت میں نہ جا سکے گا۔" (ترمذی)

حرص و ہوس

حضرت کعب بن مالک رضؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دو بھوکے بھیڑیے جن کو بکریوں میں چھوڑ دیا جائے، اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا نقصان انسان کی حرص دولت و جاہ اُس کے دین کو پہنچاتی ہے۔" (ترمذی)

ضرر رسانی اور فریب

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ روایت کرتے ہیں، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے یا اس کو فریب دے وہ ملعون ہے۔" (ترمذی)

آبرو ریزی

حضرت سعید بن زید رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سب سے بڑا سود مسلمان کی بلا وجہ آبرو ریزی ہے۔" (ابوداؤد)

ترک غیر مفید

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کے اسلام کے کمال میں یہ بھی داخل

ہے کہ وہ فضول اور غیر مفید باتوں اور کاموں کو چھوڑ دے۔" (ابن ماجہ)

غیر ذمہ داری حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ آدمی کے لیے یہی جھوٹ کافی ہے کہ جو کچھ سُنے اسے بیان کرتا پھرے۔" (متفق علیہ)

بدگمانی حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بدگمانی سے بچو اس لیے کہ بدگمانی بڑا جھوٹ ہے۔" (متفق علیہ)

فضول خرچی حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے فضول بحث و کلام کو، اور کثرت سے سوال کرنے کو اور مال کے ضائع کرنے کو۔" (مسلم)

گناہِ صغیرہ حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " اے عائشہ حقیر اور معمولی گناہوں سے بھی بچو۔ اللہ تعالیٰ اُن کے بارے میں بھی باز پرس کرنے والا ہے۔" (ابن ماجہ)

ہوسِ اقتدار حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب تم امارت اور حکومت کے حریص ہو جاؤ گے۔ لیکن وہ قیامت کے دن ندامت اور رسوائی کا سبب ہو گی۔" (بخاری)

عصبیّت جاہلیت حضرت واثلہ رضؓ سے روایت ہے کہ " میں نے عرض کیا یا رسول اللہ عصبیّت جاہلیت کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا عصبیّت یہ ہے کہ تو ظلم پر اپنی قوم کی حمایت کرے۔" (ابو داؤد)

عیش و آرام طلبی حضرت معاذ بن جبل رضؓ سے روایت ہے، کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: معاذ! عیش اور آرام طلبی سے بچتے رہنا۔ خدا کے خاص بندے عیش طلب اور آرام پسند نہیں ہوا کرتے۔" (مسند احمد)

حبطِ اعمال حضرت ثوبان رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین باتیں ہیں جن کے ساتھ کوئی عمل نفع نہ دے گا۔

اللہ کے ساتھ شرک، والدین کی نافرمانی اور معرکۂ حق و باطل سے فرار (مسلم)

درازامیدیں حضرت عروہ بن شعیبؓ اپنے دادا کے واسطے سے روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس امت کی پہلی اصلاح دولتِ یقین اور زہد و پرہیزگاری کی وجہ سے ہوئی ہے اور اس کی سب سے پہلی ہلاکت اور بربادی بخل اور دراز امیدوں کی وجہ سے ہوگی" (شعب الایمان)

خودکشی حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کبیرہ گناہوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا۔ خودکشی کرنا اور دیدہ و دانستہ جھوٹی بات کہنا" (بخاری)

ذمہ داری سے فرار حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کے لیے یہی گناہ کافی ہے کہ جس کا کفیل ہو اس کی کفالت سے ہاتھ اٹھا لے" (ابوداؤد)

گناہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت فرمائی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اگرچہ تم کو قتل کر ڈالا جائے یا جلا دیا جائے، اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہ کرو اگرچہ وہ تم کو اپنے اہل و عیال اور مال و منال چھوڑ دینے کا حکم دیں۔ ایک بھی فرض نماز قصداً نہ چھوڑو۔ جس نے ایسا کیا اس کے لیے اللہ کی حفاظت باقی نہ رہی۔ شراب کبھی نہ پیو اس لیے کہ یہ تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ ہر گناہ سے بچو اس لیے کہ گناہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے"
(مسند احمد)

حقوق وواجبات

اللہ تعالیٰ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جانتے ہو بندوں کا خدا پر اور خدا کا بندوں پر کیا حق ہے؟ خدا کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور جب وہ ایسا کریں تو اُس پر یہ حق ہے کہ پھر ان کو عذاب نہ دے" (مسند احمد)

ماں باپ

حضرت ابی امامہ رضؓ سے روایت ہے کہ "ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماں باپ کے حقوق کے بارے میں سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ماں باپ اولاد کے لیے جنت بھی ہیں اور دوزخ بھی (یعنی ان کی اطاعت و خوشنودی سے جنت اور ان کی نافرمانی و ناراضگی سے دوزخ ملتی ہے۔)" (ابن ماجہ)

ماں

حضرت مغیرہ رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر ماں کی نافرمانی، اس کو اذیت رسانی، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، بخل اور گداگری کو حرام قرار دیا ہے۔ اور بے فائدہ بحث و کلام، زیادتیِ سوال، اور مال کو ضائع کرنا مکروہ قرار دیا ہے۔" (بخاری)

باپ

حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اللہ تعالیٰ کی رضامندی باپ کی رضامندی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناخوشی باپ کی ناخوشی میں ہے۔" (ترمذی)

شوہر

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں کسی کو کسی کے آگے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔" (ترمذی)

خدّام

حضرت علی رضؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زندگی کے آخری کلمات کی روایت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا نماز کی نگہداشت اور اہتمام کرو اور جو تمہارے دستِ نگر ہوں اُن کے بارے میں خدا سے ڈرتے رہو۔" (الادب المفرد)

ہمسایہ

حضرت انس بن مالک رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی بندے کا ایمان راہِ راست پر قائم نہیں رہ سکتا جب تک اُس کا دل راہِ راست پر قائم نہ ہو اور کسی کا دل راہِ راست پر قائم نہیں رہ سکتا جب تک اُس کی زبان راہِ راست پر قائم نہ ہو اور کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہمسایہ اُس کی شرارتوں سے محفوظ نہ ہو۔" (مسند احمد)

مسلم حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کے مسلمان پر چھ حقوق ہیں۔ جب وہ ملے تو سلام کرے۔ جب وہ پکارے تو جواب دے۔ جب وہ چھینکے اور الحمد للہ کہے تو یرحمک اللہ کہے۔ جب بیمار ہو تو مزاج پرسی کے لیے جائے۔ جب مرے تو جنازہ کا ساتھ دے اور آخری بات یہ ہے کہ اس کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرے۔" (ترمذی)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے۔ کوئی کسی کو بے یار و مددگار نہ چھوڑے۔ جو کسی کی حاجت پوری کرے گا، اللہ اُس کی حاجت پوری کرے گا۔ جو کسی کی تکلیف دُور کرے گا اللہ اس کی تکلیف دور کرے گا۔ جو کسی کی عیب پوشی کرے گا اللہ اُس کی عیب پوشی کرے گا۔ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے، کہ" رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار بدگمانی کو عادت نہ بنانا۔ بدگمانی جھوٹی بات ہے۔ غیبت نہ کرنا اور نہ سننا۔ حسد اور بغض سے بچنا۔ اور اے اللہ کے بندو آپس میں بھائی بھائی بن کر رہنا جیسا کہ تم کو اللہ کا حکم ہے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ چنانچہ کوئی اپنے بھائی پر ظلم نہ کرے۔ حقیر نہ جانے۔ رُسوا نہ کرے۔ مسلمان کا مال خون اور عزت دوسرے مسلمان پر مطلق حرام ہے۔" (ترمذی)

اقتصاد و معاش

رزقِ حلال حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایمان اور نماز کی فرضیت کے بعد حلال و طیّب روزی کی تلاش و جدّ و جہد فرض ہے۔" (بیہقی)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، کہ" رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص خدا کے مقرر کردہ رزق کو حاصل کیے بغیر موت کا شکار نہ ہوگا۔

سنو۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور رزق کے حصول میں ناجائز ذرائع سے کام نہ لو۔ رزق کے ملنے میں تاخیر تمہیں ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر آمادہ نہ کر دے۔ اللہ کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ صرف اُس کی اطاعت سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔" (شرح السنۃ)

حضرت ابوسعید خدری رضؓ سے روایت ہے کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص رزقِ حلال کھائے، میری سنت پر عمل کرے اور مخلوق کو اپنے شر سے محفوظ رکھے، وہ جنت میں داخل ہوگا۔" (ترمذی)

سچا تاجر حضرت ابوسعید خدری رضؓ سے روایت ہے، کہ: " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچا اور دیانت دار تاجر قیامت کے دن نبیوں، صدیقوں اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔" (ترمذی)

برکت حضرت ابوخالد رضؓ سے روایت ہے کہ" رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خرید و فروخت کرنے والوں کو (خریداری فسخ کرنے کا اس وقت تک) اختیار ہے جب تک الگ نہ ہوں۔ اگر وہ سچائی سے کام لیں، سچ بولیں تو اُن کی تجارت میں برکت دی جائے گی۔" (بخاری)

حُسنِ معاملہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضؓ سے روایت ہے کہ" رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جو شخص چاہتا ہے کہ اسے دوزخ سے دُور رکھا جائے اور اُسے جنت میں داخل کر دیا جائے تو اُس کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اُس کی موت اللہ تعالیٰ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ ہو اور لوگوں کے ساتھ اُس کو وہی معاملہ کرنا چاہیئے جو وہ چاہتا ہے کہ لوگ اُس کے ساتھ کریں۔" (مُسلم)

نرمی و فیاضی حضرت جریر بن عبداللہ رضؓ سے روایت ہے، کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اُس شخص پر رحم فرمائے۔ جو خرید و فروخت میں، اور اپنے حقوق کا تقاضا کرتے وقت نرمی و فیاضی سے کام لے۔" (بخاری)

مقروض حضرت ابوقتادہ رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اُسے قیامت کی سختیوں سے بچائے، وہ تنگ دست مقروض کو مہلت دے یا قرض معاف کر دے۔" (مسلم)

(جاری ہے)

افکار و آراء

بیعت علیٰ ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(مکہ میں رسول اللہؐ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت)

میثاق کے گذشتہ شماروں میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی جاتی رہی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جماعت سازی کا جو اسوہ دیا وہ بیعت کی بنیاد پر تھا۔ اس بیعت کا ذکر جو سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے وہ مدنی دور سے شروع ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ اگرچہ مکہ کے نزدیک منیٰ کے علاقہ میں لی گئیں لیکن عملی طور پر اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مکی دور ختم ہو چکا تھا کیونکہ مکہ والوں نے حضورؐ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور آپؐ کے لئے اب شہر مکہ میں کوئی جگہ نہ تھی۔ مزید براں بیعت کرنے والے تمام کے تمام لوگ مدینہ کے رہنے والے تھے اور انہوں نے آنحضورؐ کو مدینہ تشریف لے جانے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ یہ بیعت حقیقتاً مدنی دور کا آغاز تھا۔ مکی زندگی میں مسلمانوں کو حکمت دعوت کے ضمن میں ہاتھ باندھے رکھنے اور Retaliate نہ کرنے کا حکم تھا۔ لیکن اس بیعت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صرف تزکیۂ نفس کی بیعت نہ تھی بلکہ اصلاً جہاد اور قتال کی بیعت تھی۔ تاریخ کی کتابوں نے اس کو بیعتِ الحرب یعنی جنگ کی بیعت کا نام بھی دیا ہے۔

دوسری بیعت عقبہ جو ذی الحجہ ۱۳ نبوی کو ہوئی اس میں ۷۳ مرد اور دو عورتیں شامل تھیں۔ حضورؐ نے اس وقت فرمایا کہ جس کو بولنا ہو مختصر بولے اور بات کو طول نہ دے۔ کیونکہ مشرکین کے جاسوس کھوج میں لگے ہوئے ہیں حضرت عباس بن عبدالمطلب نے بات کا آغاز کیا اور فرمایا "اے خزرج کے لوگو ہم نے محمدؐ کی غیر مسلم لوگوں کے خلاف حمایت وحفاظت کی ہے۔ اب وہ تمہارے ہاں جانے پر راضی ہیں تم ان کو مدعو کر رہے ہو تو سوچ لو کہ تم اس ذمہ داری کو اٹھا لوگے! اگر تم کسی درجے میں بھی اس بات کا اندیشہ رکھتے ہو کہ تمہیں ان کا ساتھ چھوڑ دینا اور انہیں دشمنوں کے حوالے کر دینا پڑے گا تو بہتر یہی ہے کہ ابھی سے انؐ کو چھوڑ دو۔ کیونکہ وہ اپنی قوم میں مضبوط حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں ہم نے کہا۔ یا رسول اللہ! آپ ارشاد فرمائیں اور اپنے لئے جو عہد ہم سے لینا چاہیں لے لیں۔" اس

پر حضورؐ نے اپنی تقریر میں قرآن پڑھا۔ اللہ کی طرف دعوت دی۔ اسلام کی طرف رغبت دلائی اور اس کے بعد فرمایا "میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم میری اسی طرح حمایت و حفاظت کروگے جس طرح خود اپنے بال بچوں کی کرتے ہو۔ براء بن معرورؓ نے حضورؐ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر عرض کیا "جی ہاں اس اللہ کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے ہم آپؐ کی ہر اس چیز سے حفاظت کریں گے جس سے ہم خود اپنی جان اور اپنی آل اولاد کی حفاظت کرتے ہیں۔ پس یا رسول اللہ! ہم سے بیعت لیجئے ہم جنگ آزما لوگ ہیں۔ ہم نے اپنے باپ دادا سے اس کو وراثت میں پایا ہے۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری فرماتے ہیں عقبہ میں ہم نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! ہم کس بات پر آپؐ سے بیعت کریں۔ حضورؐ نے فرمایا اس بات پر کہ تم اچھے اور برے ہر حال میں حکم سنوگے اور اطاعت کروگے۔ خوشحالی ہو یا بدحالی ہر صورت میں مال خرچ کروگے۔ نیکی کا حکم دوگے اور برائی سے روکوگے اور اللہ کے معاملے میں حق بات کہوگے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈروگے اور اس بات پر کہ جب میں تمہارے ہاں آؤں تو تم ہر اس چیز سے میری حفاظت کروگے جس سے اپنی جانوں اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔ اس کے بدلے میں تمہارے لئے جنت ہے۔ اس پر ہم اٹھ کر آپؐ کی طرف بڑھے اور آپؐ کا ہاتھ جماعت کے سب سے کمسن نوجوان اسعد بن زرارہ نے اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا "ٹھہرو اے اہل یثرب ہم اپنے اونٹ دوڑاتے ہوئے ان کے پاس اس کے سوا کسی اور وجہ سے نہیں آئے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج ان کو نکال کر اپنے ساتھ لے جانا تمام عرب کی دشمنی مول لینا ہے۔ اس کے نتیجے میں تمہارے نونہال قتل ہوں گے اور تلواریں تمہارا خون چاٹیں گی۔ لہٰذا تم اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ تھام لو اور تمہارا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ لیکن اگر تمہیں اپنی جانوں کا خوف ہے تو پھر ابھی سے چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کردو کیونکہ اس وقت عذر کردینا اللہ کے ہاں زیادہ قابل قبول ہوگا۔" اس پر سب لوگوں نے کہا "اسعد ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔ خدا کی قسم ہم اس بیعت کو ہرگز نہ چھوڑیں گے اور نہ اس سے ہاتھ کھینچیں گے۔" اس کے بعد سب لوگوں نے بیعت کی۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جب مدینہ والوں نے آنحضورؐ کو نبی اور رسول مان لیا تو ان پر واضح تھا کہ نبی کا ہر حکم شرعاً واجب الاطاعت ہوتا ہے کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے باقاعدہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کی اور وہاں موجود ہر آدمی اس عمل میں شامل تھا۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

زیر نظر مضمون میں ہم دیکھیں گے کہ یہ بیعت صرف مدنی دور کا خاصہ نہیں بلکہ حضورؐ کی دعوت کے مکی دور کے بالکل ابتدائی زمانہ میں حضورؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اسلام کی بیعت کی گئی۔ اس بات کے ثبوت میں صحیح مسلم شریف کی ایک روایت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

عن ابن عباس قال ان ضماداً قَدِمَ مکۃ وکان من ازد شنوءۃ وکان یرقی من ھذا الرّیح فسمع سفھاءَ اھل مکۃ یقولون ان محمدًا مجنون فقال لو انی رأیت ھذا الرجل لعلّ اللہ یشفیہ علی یدی قال فلقیہ فقال یا محمد انّی ارقی من ھذا الرّیح فھل لک فقال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ان الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ من یھدہِ اللہ فلا مضلّ لہ و من یضلل فلا ھادی لہ و اشھد ان لا الٰہ الّا اللہ وحدہ لا شریک لَہٗ وَاشھد انّ محمّدًا عبدہ و رسولہ اما بعد فقال اَعِدْ عَلَیَّ کلماتک ھٰؤُلاءِ فاعادھن علیہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ثلث مراتٍ فقال لقد سمعت قول الکھنۃ وقول السحرۃ وقول الشعراء فما سمعت مثل کلماتک ھٰؤلاء ولقد بلغن قاموس البحر ھات یدک ابا یعک علی الاسلام

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ حضرت ضماد (یا ضِماد) رضی اللہ عنہ مکہ آئے اور ان کا تعلق قبیلہ شنوءہ کے ازد سے تھا اور وہ جنوں کی ہوا (جنون) کا علاج جھاڑ پھونک (تعویذ) سے کرتے تھے۔ پس انہوں نے مکہ کے بیوقوفوں سے سن لیا ان کو یہ کہتے ہوئے کہ محمدؐ مجنون ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا اگر میں اس آدمی کو دیکھوں تو شاید اللہ میرے ہاتھ سے ان کو شفا دے فرمایا پھر وہ آپ سے ملے پس کہا اے محمدؐ میں جنوں کی ہوا سے جھاڑ کرتا ہوں کیا آپ کو بھی یہ عارضہ ہے؟ (یا میں علاج کردوں) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک کل شکر اللہ کے لئے ہے ہم اس کی حمد کرتے ہیں اور اس سے مدد مانگتے ہیں جس کو اللہ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کو وہ گمراہ کردے اس کے لئے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی

قال فبايعه — دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول

(رواہ مسلم) — ہیں۔ اس کے بعد حضرت ضماد نے فرمایا
میرے سامنے یہ کلمات دُہرائیے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کلمات کا تین
بار اعادہ کیا۔ پھر انہوں نے فرمایا میں نے کاہنوں کے اقوال بھی سن رکھے ہیں اور جادوگروں
کی باتیں اور شعراء کی باتیں بھی سنی ہوئی ہیں لیکن میں نے آپ کے کلمات کی طرح کے کلمات
نہیں سنے۔ یہ تک سمندر کی گہرائی جیسی جامع باتیں پہنچ گئیں۔ لائیے اپنا ہاتھ میں اسلام
پہ آپ کی بیعت کروں گا۔ فرمایا پھر نبی اکرم نے ان سے بیعت لی۔

نبی اکرمؐ نے جب پوری تندہی سے اسلام کی دعوت دینا شروع کی تو ابتداء میں جب
کفار کو زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ اور وہ حضورؐ کی اس محنت اور تندھی کو دیکھتے تھے تو کہتے تھے کہ
مجنون ہیں ان کو جنون ہو گیا ہے (نعوذ باللہ من ذلک) چنانچہ سورۃ قلم کی دوسری آیت
میں فرمایا گیا: مَآ اَنۡتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ بِمَجۡنُوۡنٍ۝ آپؐ اپنے رب کی نعمت سے مجنون ہرگز نہیں
یہ بات یاد رہے کہ جب نبی اکرمؐ کی دعوت آگے بڑھی اور اس کا ہدف عیاں ہوا تو کفار
آپؐ کو اس طرح مجنون نہیں کہتے تھے بلکہ شدید تشدد پر اتر آئے۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ جو مکہ کے
بیوقوفوں کی زبان سے ادا ہوئے ظاہر کرتے ہیں کہ واقعہ ابتدائی دور کا ہے۔

عرب کے معاشرہ میں دو دوست جب کوئی معاہدہ کرتے یا کسی معاملے میں ایک
دوسرے کا ساتھ دینے کا وعدہ کرتے تو ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس قول کو پختہ کرتے۔ بالکل اسی
معروف طریقے کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اسلام میں برقرار رکھا اور اس کی توثیق (Sanction)
فرمائی۔ ظاہر بات ہے کہ جب دو آدمی ایک چھوٹے سے دنیاوی معاملے میں ہاتھ میں ہاتھ دے
کر قول و قرار لیتے ہیں تو غلبۂ دین حق کی جد و جہد جیسے اہم معاملہ میں کیوں نہ یہ عمل کیا جاتا۔ یہ ہی
حضورؐ کا عمل ہے جو مسنون ہے۔

(ریاض الحق)

نام اور شخصیت

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نام انسان کی شخصیت و کردار پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں ہمیں
بحیثیت مسلمان یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم نام اچھے رکھیں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام جب کسی شخص یا مقام
کا نام برا دیکھتے تو تبدیل کر دیتے اور ایک بچے کے اپنے والدین پر جو حقوق ہیں ان میں سے ایک
یہ بھی ہے کہ اس کا نام اچھا رکھا جائے حدیث شریف میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ

نام عبداللہ، عبدالرحمٰن اور عبدالعزیز ہیں یعنی جن ناموں کی نسبت عبودیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگائی جائے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اولاد کے اچھے نام رکھے آپؐ کے ایک بیٹے کا نام عبداللہ تھا، جس کا لقب طیب وطاہر تھا اور آپؐ کے پہلے بیٹے کا نام قاسم تھا جس کی نسبت سے نبی کریمؐ ابوالقاسم کنیت فرماتے تھے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ کنیت رکھنا بھی سنت محبوب الٰہی ہے۔

نام نہ صرف اس آدمی کے بلکہ اس شخص کے والدین کے خیالات ومعتقدات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اکثر جب ہندوستانی حضرات سے واسطہ پڑتا ہے اور ان کے دین کا پتہ نہ ہو کہ یہ کس دین کے پیروکار ہیں تو دین معلوم کرنے کا مہذب طریقہ نام پوچھ لینا ہے۔

لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے بھی اچھے نام رکھنے چاہئیں۔ نبی کریمؐ نے اپنی بیٹیوں کے نام بہترین تجویز فرمائے۔ یعنی زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ۔ اور مرد کی طرح عورت کے نام کی بھی نسبت اس کے والد کی طرف ہونی چاہیے۔ ہمارے معاشرے میں ایک غلط سوچ رواج پاگئی ہے کہ شادی کے بعد عورت اپنا نام تبدیل کر کے خاوند کے نام سے ملالیتی ہے یہ طرز عمل سراسر غیر اسلامی ہے۔ اور انگریزوں کی تقلید ہے، اسلامی لحاظ سے مثلاً ایک عورت کا نام رقیہ ہے اور اس کے والد کا نام عبدالکریم ہے تو یہ رقیہ بنت عبدالکریم کہلائے گی۔ اور شادی کے بعد بھی اس نام سے پکاری جائے گی، اور خاوند کا نام اس کے نام کا حصہ نہیں بن جائے گا۔ عورت کے نام کے ساتھ اس کے باپ کا نام رہنے کی وجہ سے اس کا اپنا تشخص مجروح نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے خاندان کا نام بھی برقرار رہے گا اور پھر دوسری نہایت تکلیف دہ وہ صورت حال ہوتی ہے جب ایک عورت کسی سے شادی کرنے کے بعد اپنا نام تبدیل کر لیتی ہے اور اگر خدانخواستہ طلاق ہو جائے تو اس کا نام تبدیل کرنا ایک مسئلہ بن جاتا ہے، کراچی میں قیام کے دوران مجھے ایک ایسی لیڈی ڈاکٹر کی کیفیت یاد ہے کہ جو شادی کے بعد اپنا نام تبدیل کر کے مسز فلاں ہو چکی تھیں۔ اب ان کو طلاق ہو گئی ہے۔ لیکن وہ بدستور اسی نام سے معروف تھیں۔ اب جو شخص بھی ان کو اس نام سے پکارتا تو وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی کیونکہ اب ہر شخص سے جھگڑنا اور نام تبدیل ہو جانے کی وجہ بتانا ایک اچھا خاصا مشکل کام تھا۔

جہاں جہاں بھی سوشلسٹ انقلاب آیا تو انہوں نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ مسلمانوں کے نام تبدیل کر دیے جائیں تاکہ ان کا ماضی سے رشتہ کٹ جائے۔ روس کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کے نام بھی بالکل تبدیل ہو گئے ہیں اور البانیہ میں تو باقاعدہ قانونی طور پر اسلامی نام رکھنے سے منع کر دیا گیا ہے۔

بعض اوقات اکثریت میں رہتے ہوئے اقلیت بھی اپنے ناموں کا تشخص کھو دیتی ہے۔ جیسے ہندوستان کے صوبہ کیرالا کے ایک شخص کو میں ہمیشہ غیر مسلم سمجھتا رہا کیونکہ اس کا نام پریت تھا۔ لیکن بعد میں واضح ہوا کہ وہ دراصل مسلمان ہے اور اس کا اصلی نام فرید ہے جو عدم معرفت کی وجہ سے پریت بن گیا ہے۔

تاہم ہر معاشرے میں کچھ نام بوجوہ زیادہ رواج پا جاتے ہیں۔ مثلاً سعودی عرب میں زیادہ نام عبداللہ، عبدالعزیز اور عبدالرحمٰن وغیرہ ہیں یا پھر سعود، فہد اور خالد زیادہ نام ہیں، جبکہ ہمارے ملک میں زیادہ تر نام حسین، علی اور حیدر کے سابقے یا لاحقے کے ساتھ ہیں۔ جیسے غلام علی، غلام حیدر اور غلام حسین اور اسی طرح خادم علی، خادم حسین وغیرہ اور بعض اوقات غلام محمد اور غلام غوث بھی نام رکھے جاتے ہیں لیکن یہ نقطہ قابل غور ہے کہ ہمارے ہاں غلام صدیق، غلام فاروق اور غلام عثمان یا پھر خادم صدیق، خادم فاروق اور خادم عثمان ایسے نام بہت ہی قلیل بلکہ بالکل ناپید ہیں۔ اور یہ نام بھی بہت کم رکھے جاتے ہیں جو حدیث شریف میں اللہ کے محبوب نام بتائے گئے ہیں جن کی نسبت عبودیت اللہ کی ذات بابرکات کی طرف ہو۔

کچھ ایسی ہی صورت عورتوں کے ناموں کی نسبت بھی ہے کہ ان کے نام بھی غلام فاطمہ، غلام زہرا اور غلام سکینہ تو بکثرت پائے جاتے ہیں لیکن غلام عائشہ یا غلام حفصہ بہت ہی معدوم ہیں۔

ہمارے معاشرے کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ہم مرکب نام رکھنے کے عادی ہیں اور اس طرح ایک شخص کے تین تین نام ہو جاتے ہیں جیسے مثال کے طور پر میرا نام ریاض حسین شیخ ہے جبکہ سعودی عرب میں ایک ہی نام رکھا جاتا ہے اور سعودی معاشرے میں میرا نام ریاض اور حسین میرے والد محترم کا نام شمار کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہاں پر کسی آدمی کے نام کے ساتھ اس کے باپ دادا کا نام بھی عموماً لکھا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص پورا نام محمد عبداللہ فاروق علی الرشیدی لکھے گا تو اس سے مراد اس کا نام محمد اس کے والد کا نام عبداللہ اس کے دادا کا نام فاروق اس کے پردادا کا نام علی اور اس کا خاندان رشیدی ہوگا اس طرح اپنا سلسلۂ نسب یاد رکھنا بھی بہت آسان ہے جبکہ ہمارے ہاں بہت ہی کم لوگ ہیں جو اپنے پردادا وغیرہ کا نام جانتے ہیں پھر ہندوستان کے تو کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں والد کا نام اس کے اپنے نام سے پہلے لکھا جاتا ہے جیسے مثلاً عبدالقادر موئدین کٹھو تو اس میں اس شخص کا نام موئدین ہے اور اس کے والد کا نام عبدالقادر ہوگا۔

ماحول اور مکان بدل جانے سے بھی بعض اوقات ناموں کے سلسلے میں دشواریاں پیش

آجاتی ہیں جیسے ہمارے ایک دوست کا نام اللہ دتہ ہے جو کہ سعودی عرب کے لحاظ سے ایک غیر معقول نام ہے کیونکہ یہاں ایک شخص کا ایک ہی نام سمجھا جاتا ہے اور اس قاعدے کے لحاظ سے اس کا نام صرف اللہ بن جاتا ہے اس لیے اس کو ہمیشہ اپنے نام کی تشریح کرنی پڑتی ہے۔ کہ اس نام کا عربی ترجمہ عطاء اللہ ہے اور عربی میں بندہ نام بھی رکھا جاتا ہے جو ہمارے لیے عجیب ہے۔

ہمارے ہاں کے مرکب نام ہونے سے مزید کئی اشکال بھی پیدا ہو جاتے ہیں جیسے کئی دیہاتی اپنے نام پیراں دتہ بھی رکھ لیتے ہیں یا پھر نذر عباس، نذر حسین اپنے نام بھی رکھے جاتے ہیں اور پھر کلب عباس اور کلب حسین تک بھی نام سننے گئے ہیں۔ یہ نام اپنے معنوں کے اعتبار سے محل نظر ہیں۔

بعض اوقات نام لستنے لمبے بھی ہو جاتے ہیں کہ پھر پورا نام لکھنے میں دشواری سے بچنے کے لیے صرف مخففات ہی لکھ دیے جاتے ہیں جیسے ایک صاحب اپنا نام کے پی ایس اے حسین خان (K.P.S.A. HUSSEIN Khan) لکھا کرتے تھے جب پورا نام دریافت کیا گیا تو پتہ چلا کہ پورا نام تو خاکِ پائے سمِ اسپ حسین خان ہے۔ یعنی حسینؓ کے گھوڑے کے پاؤں کی خاک۔ ہمارے لمبے لمبے ناموں کے بارے میں مجھے سید ضمیر جعفری کا وہ دلچسپ شعر یاد آ رہا ہے۔

نام جو پوچھا تو چھ سطروں میں نام آتا نہیں
کام جو پوچھا تو کوئی خاص کام آتا نہیں!

بعض ممالک میں یہ رواج بھی پایا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص حج کرنے چلا جائے تو اس کے نام کے ساتھ لفظ حاجی کا سابقہ لگا دیا جاتا ہے بلکہ سوڈان میں تو اگر کوئی حج والے دن پیدا ہو تو اس کا نام ہی الحاج رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ حج بھی تو اسلام کا اسی طرح رکن ہے جیسے نماز۔ پھر اگر کوئی نماز صحیح طریقہ سے ادا کرتا ہے تو اس کے نام کے ساتھ "نمازی" کا سابقہ نہیں لگایا جاتا اور یہ معاملہ صرف حج تک ہی محدود کیوں ہے؟ حالانکہ حج تو اہلیت ہونے کی بناء پر فرض ہے لیکن نماز ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ (ابو عبداللہ ریاض شیخ)

(پیش کردہ افکار و آراء سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں ہے)

ٹینٹ اور ترپال
بنانے کا ممتاز ادارہ
ایچ
نظام دین
اینڈ سنز
مرکزی دفتر
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سانیو

SANYO

AIRCONDITIONERS REFRIGERATORS & FREEZERS
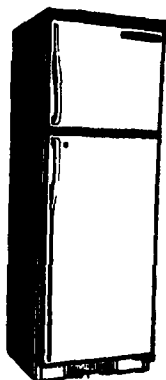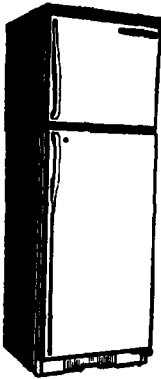
NO-FROST REFRIGERATORS

with exclusive features

- Two door with built-in lock.
- Spacious freezer compartment with drainage system, a new feature
- Indicator pilot light on front door.
- In 4 pleasing colours (Green, Gold, Almond and White).
- One Year free service and 5 Years Guarantee on Compressor.
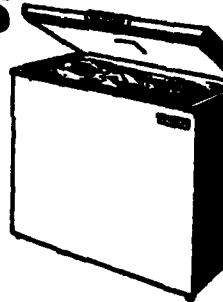
CHEST/UPRIGHT FREEZERS

AIR-CONDITIONERS

new in utility
with higher efficiency

Capacity: 1½ Ton, 18000 BTU/h
Noiseless Operation.
Trouble Free Service. Auto Deflector (Swing System).
Brown Teak Wood finish Grill.
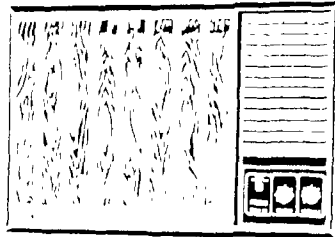
Available at all
SANYO
Authorised Dealers

MANUFACTURED/ASSEMBLED IN PAKISTAN

SPECIAL ATTENTION: Please ensure that you get your Worldwide Trading Company's 5 year Guarantee Certificate in order to avail free after Sales Service

SOLE AGENTS IN PAKISTAN FOR ALL SANYO PRODUCTS

WORLDWIDE TRADING CO.

(SANYO CENTRE)
GARDEN ROAD, SADDAR, KARACHI. PHONES: (PABX) 525151-55 (5 Lines)
CABLE: "WORLDBEST" TELEX 26109 WWTCO PK

786/WW-109 83

EAGLE
EAGLE IRIDIUM
ایگل
ایک عالمگیر قلم
خوشخط، رواں
اور دیرپا
اسٹین لیس
اسٹیل کی
اریڈیم ٹپڈ نب
کے ساتھ
ہر جگہ دستیاب
آزاد فرینڈز اینڈ کمپنی

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 33 | AUGUST 1984 | No. 8

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۳۳ | شمارہ ۹ | ذی الحجہ ۱۴۰۴ ہجری مطابق ستمبر ۱۹۸۴ء

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی
فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۶۰۰۹

مشمولات

آئندہ ماہ کے دوران امیر تنظیم اسلامی کی متوقع مصروفیات

۳ ستمبر۔ بعد دوپہر۔ روانگی از لاہور برائے اسلام آباد۔
" " بعد نماز مغرب۔ درس قرآن کمیونٹی سنٹر اسلام آباد (آبپارہ)
۴ ستمبر۔ اجتماع خصوصی رفقائے تنظیم اسلامی راولپنڈی اسلام آباد (فیری لینڈ ہائی سکول راولپنڈی)
" " شام۔ خطاب عام۔ فیری لینڈ ہائی سکول۔
۵ ستمبر صبح۔ نشست برائے سوال وجواب۔ فیری لینڈ ہائی سکول۔
" " دوپہر۔ روانگی از راولپنڈی۔
" " ظہر تا عصر۔ خطاب عام۔ گوجرخاں۔
" " رات۔ خطاب عام۔ جلال پور جٹاں (امکان ہے)
۹ ستمبر تا ۱۱ ستمبر۔ کراچی میں قیام اور مختلف دعوتی پروگرام ہوں گے۔ ۱۱ ستمبر کو رفقائے تنظیم اسلامی کراچی کا اجتماع خصوصی ہوگا۔ کراچی میں قیام کے دوران تفصیلات کے لئے جناب عبدالواحد عاصم صاحب قیم تنظیم اسلامی کراچی سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے (فون ۲۱۴۷۰۹)
۱۴ ستمبر بعد از عشاء۔ خطاب عام۔ عالی مسجد ملتان روڈ۔ لاہور۔
۱۶ ستمبر۔ بعد دوپہر۔ روانگی برائے پشاور۔
" " شام۔ خطاب عام۔ گرین ہوٹل پشاور۔
۱۷ ستمبر۔ قبل از دوپہر۔ نشست برائے سوال وجواب
" " " اجتماع خصوصی تنظیم اسلامی پشاور۔
" " بعد از دوپہر۔ روانگی برائے دیر۔ سوات۔
۱۷ ستمبر شام تا ۲۰ ستمبر دوپہر۔ قیام دیر۔ سوات۔
۲۰ ستمبر شام۔ واپسی لاہور۔
۲۱-۲۲-۲۳ ستمبر بعد از نماز مغرب۔ جامع مسجد صدر بازار لاہور چھاؤنی۔ رفقائے تنظیم اسلامی لاہور کے لئے تربیتی اجتماعات۔

علاوہ ازیں حسب معمول مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں قبل از نماز جمعہ خطاب عام اور جمعہ بعد از نماز مغرب جامع مسجد باغ والی نزد گھاس منڈی شاہ عالم مارکیٹ لاہور اور ہفتہ بعد از نماز مغرب قرآن اکیڈمی لاہور میں تنظیم اسلامی لاہور کے اجتماعات میں درس قرآن کا سلسلہ جاری رہے گا۔
ان شاء اللہ

جمیل الرحمٰن　　　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

توقع ہے کہ ان شاء اللہ العزیز ذو الحجہ ۱۴۰۴ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۴ء کا یہ شمارہ عید الاضحی سے قبل قارئین کرام کے ہاتھوں تک پہنچ جائے گا۔ اس شمارے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ العالی کے خطاب "جہاد بالقرآن" کی دوسری اور آخری قسط کے ساتھ ہی موصوف کا وہ مکمل خطابِ جمعہ بھی شامل ہے جو ۲۹ رمضان المبارک کو "قرآن کے نام اٹھنے والی تحریکیں اور علماءِ کرام کے خدشات" کے عنوان سے کیا گیا تھا ـــــ یہ دونوں خطاب نہایت توجہ سے مطالعہ کے متقاضی ہیں۔ قارئین کرام کو عید الاضحیٰ کی تعطیلات کے باعث یقیناً معمول سے کچھ زیادہ فرصت مہیا ہوگی لہٰذا ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ گذشتہ شمارے میں شائع شدہ 'جہاد بالقرآن' کی پہلی قسط اور موجودہ شمارے میں شامل قسط نیز ڈاکٹر صاحب موصوف کے ۲۹ رمضان والے خطاب کا بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں۔

"جہاد بالقرآن" کے موضوع پر خطاب کے دوران ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا تھا کہ "میں ان (باتوں) کو اہل علم کے سامنے ان کی تائید و توثیق یا اصلاح کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ میں قرآن کا ادنیٰ طالب علم ہوں، مجھے اہل علم سے رہنمائی حاصل ہونے پر دلی مسرت ہوگی۔ میں خلوص دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھ پر میری غلطی واضح کر دی جائے تو میں سرِ تسلیم خم کرنے میں ایک لمحہ کے لئے بھی تردّد نہیں کروں گا۔ بلکہ غلطی کی نشان دہی کرنے والے صاحب کا صمیم قلب سے احسان مند ہوں گا" ـــــ ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس پیش کش کے پیش نظر قارئین میثاق اور بالخصوص ان اہل علم و دانش کی خدمت میں ہم گذارش کریں گے جن کی خدمت میں میثاق پہنچتا ہے یا جن کی نظر سے گزرتا ہے کہ وہ ان دونوں خطابات کے متعلق اپنی تنقید، تبصرے، مشورے اور آراء سے ہمیں اور ڈاکٹر صاحب کو مستفید ہونے کا موقع مرحمت فرمائیں۔ ان خطابات کے طرزِ استدلال

واستشہاد اور مضامین و مباحث میں کتاب و سنّت کی رو سے کوئی غلطی نظر آئے تو اس کی دلائل کے ساتھ ضرور نشان دہی فرمائیں۔ ان شاء اللہ العزیز ڈاکٹر صاحب موصوف ان پہ کھلے دل سے غور فرمائیں گے اور اگر مطلع کردہ غلطی پہ مطمئن ہوگئے تو اس کا برملا اظہار و اعلان بھی کر دیں گے ۔۔۔۔ نیز ضرورت متقاضی ہوئی تو موصول شدہ آراء کو 'میثاق' میں شائع کرنے پر بھی غور کیا جائے گا۔

ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ملک کی معروف دینی درسگاہوں اور علمائے عظام نیز اہلِ دانش و بینش کے مکمل پتے حاصل کر کے اگست و ستمبر کے شمارے ان کی آراء کے حصول کے لئے ان کی خدمت میں بھیجے جائیں۔ اس ضمن میں ہمیں 'میثاق' کے قارئین سے یہ تعاون درکار ہے کہ وہ اپنے علاقے کے مشہور و معروف علمائے کرام کے مکمل نام و پتے سے ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ اگر ان حضراتِ گرامی کے اسمائے گرامی ہماری مرتّب کردہ فہرست میں شامل نہ ہوں تو ان حضرات کی خدمت میں بھی یہ شمارے ارسال کئے جاسکیں۔ قارئین کرام کا یہ تعاون انشاء اللہ تعاون علی البر کے زمرے میں شمار ہوگا۔

ان دونوں خطابات کی طوالت کے باعث میثاق میں قسط وار شائع ہونے والے اور چند دوسرے مضامین شاملِ اشاعت نہیں کئے جاسکے جس پر ہم قارئین سے معذرت خواہاں ہیں۔ ان شاء اللہ العزیز یہ مضامین آئندہ شمارے میں شامل ہوں گے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کی شمالی امریکہ (ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کناڈا) کے بعض شہروں اور ساتھ ہی برطانیہ کے دعوتی دورے سے ۱۳ اگست کو بحمد اللہ بخیر و عافیت مراجعت ہوگئی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ شمارے میں عرض کیا گیا تھا کہ اس دورے میں محترم ڈاکٹر ابصار احمد ڈائرکٹر قرآن اکیڈمی بھی امیر محترم کے ہم سفر تھے۔ موصوف سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس دورے کی مختصر لیکن جامع روداد 'میثاق' کے لئے تحریر فرمادیں۔ اگر مشیتِ الٰہی سے یہ کام تکمیل پا گیا تو یہ روداد ان شاء اللہ 'میثاق' کے قارئین تک پہنچ جائیگی۔

ہمارے دین میں خوشی کی دو تقاریب (تہوار) مقرر ہیں جن کے لئے اسلامی اصطلاح "عید" ہے۔ ان "عیدین" کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو فرض عبادات سے

متعلق فرمادیا ہے۔ عیدالفطر کا تعلق روزے کی فرض عبادت کی تکمیل اور عیدالاضحیٰ کا تعلق فریضۂ حج کی ادائیگی سے ہے۔ حج اور عیدالاضحیٰ۔ یہ دونوں شعار حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت کے گرد گھومتے ہیں۔ حج کا رکنِ رکین تو وقوف عرفات ہے اس کے علاوہ سورۂ حج میں دو بنیادی ارکان کا ذکر ملتا ہے۔ ایک اللہ تعالیٰ کے نام پر جانوروں کی قربانی اور دوسرے طواف بیت اللہ شریف کا ۔ کون نہیں جانتا کہ حج ارکان اسلام میں سے صلوٰۃ، زکوٰۃ اور صوم تینوں فرض عبادات کی روح کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے لیکن ارکانِ حج صرف مقررہ تاریخوں اور دنوں میں صرف ارض مقدس کے مقررہ مقامات پر ہی ادا کئے جا سکتے ہیں۔ جس میں مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا کی شرط موجود ہے ۔ اب تو اس میں حکومت کے مقرر کردہ قرعہ اندازی میں نام نکلنے کی شرط بھی شامل ہوگئی ہے ۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ حج کے ارکان میں سے ایک اہم رکن قربانی بھی ہے۔ لہٰذا 'قربانی' کے عمل کو کتاب وسنت نے اتنی وسعت و توسیع دی ہے کہ روئے زمین پر بسنے والا ہر ذی استطاعت مسلمان اپنے اپنے مقامات پر مقررہ دنوں میں جانوروں کی قربانی پیش کر کے حج کے ایک اہم رکن کی ادائیگی میں شریک ہو کر اللہ کی رحمت، برکت اور مغفرت میں سے حصہ پالے ۔ پھر دنیا بھر میں جانوروں کی قربانی کی ایک اہم حکمت یہ بھی ہے کہ مسلمان ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ابتلاء و آزمائش سے پُر زندگی کی سب سے بڑی آزمائش کی سنت میں شریک ہو جائیں اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی عزیز اور محبوب ترین چیز کو قربان کرنے کا جذبہ ۔ فتح مکہ سے قبل مدینہ منورہ میں بھی عیدالاضحیٰ کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ جانوروں کی قربانی دیا کرتے تھے۔ چنانچہ قربانی کی حکمت معلوم کرنے کے لئے صحابہ کرامؓ کی طرف سے حضورؐ سے سوال کیا گیا: مَا هٰذِهِ الاضاحی یا رسول اللہ ۔" اے اللہ کے رسولؐ ان قربانیوں کی حقیقت کیا ہے؟" جواب میں حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنۃ ابیکم ابراھیم " یہ تمہارے جدِ امجد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی سنت ہے" اس کی تعبیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے ایک خطاب میں کی ہے (یہ خطاب مطبوعہ شکل میں موجود ہے) اس کے دو اقتباسات کو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے جن سے قربانی کی حکمت اور ایک پیغام بھی ہمارے سامنے آتا ہے:

"یہ (قربانی) اس عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے کہ جس میں ایک سو سالہ بوڑھے باپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے اکلوتے بیٹے کے گلے پر جو نوجوانی کے دور میں قدم رکھ رہا ہے، چھری پھیر دی تھی جو گویا کہ اللہ کی راہ میں قربانی کی آخری صورت ہو سکتی ہے کہ اپنی محبت، اپنے جذبات اور اپنے احساسات کو اللہ کی رضا جوئی کے لئے قربان کر دیا جائے۔ یہ وہ واقعہ ہے جو اس لحاظ سے نوعِ انسانی کی تاریخ کی ایک عظیم علامت (Symbol) بن گیا ہے اور اس طرح یہ قربانی ہمیشہ کے لئے شعائرِ دین میں شامل کر دی گئی ہے۔ یہ اس قربانی کی روح کو بیدار اور برقرار رکھنے کا بھی ایک اہم ذریعہ بن گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو ایک بندۂ مؤمن سے مطلوب ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی محبوب ترین چیز بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی اس قربانی کی یادگار ہے جو ہر سال منائی جاتی ہے۔"

اسی خطاب کے آخر میں محترم ڈاکٹر صاحب مسلمانوں کو ان الفاظ میں ان کا فرض یاد دلاتے ہیں:

"ہمارے لئے لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ ہم سوچیں، غور کریں اور اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیں۔ کیا واقعتاً ہم اللہ کی راہ میں اپنے جذبات و احساسات کی قربانی دے سکتے ہیں! کیا واقعتاً ہم اپنی محبوب ترین اشیاء کی اللہ کی راہ میں قربانیاں دے سکتے ہیں! کیا واقعتاً ہم اللہ کے دین کی خاطر اپنے وقت کا ایثار کر سکتے ہیں! جبکہ یہ زمانہ Time is Money کا ہے ـــــ کیا ہم اپنے ذاتی مفادات کو اللہ اور اس کے دین کے لئے قربان کر سکتے ہیں! اپنے علائقِ دنیوی، اپنے رشتے اور اپنی محبتیں اللہ کے دین کی خاطر قربان کر سکتے ہیں! اگر ہم یہ سب کر سکتے ہیں تو عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی بھی نورٌ علیٰ نور ـــــ اور اگر ہم اللہ کے دین کے لئے کوئی ایثار کرنے کے لئے تیار نہیں تو جانوروں کی یہ قربانی ایک خول اور ڈھانچہ ہے جس میں کوئی روح نہیں ہے۔"

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

جانوروں کا ذبح کرنا رہ گیا ہے۔ اس میں جو روحِ ابراہیمی تھی وہ موجود نہیں ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم میں سے ہر شخص کو اپنے دل کو ٹٹولنا چاہئے کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ میری زندگی سنّتِ ابراہیمی کے مطابق ہے یا نہیں! اگر ہے تو جانوروں کی قربانی کی بھی ہماری زندگی کے ساتھ ایک مطابقت ہے۔ اگر نہیں ہے تو یہ ایسا ہی ہے کہ نیم کے درخت پر ثمرِ بہشت کا ایک آم لاکر ہم نے دھاگے سے باندھ دیا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا! ـــــ اس سے وہ درخت آم کا نہیں ہو جائے گا۔ وہ تو نیم ہی کا درخت ہے اور وہی رہے گا۔ ہماری جو کیفیات بالفعل ہیں وہ تو یہی ہیں کہ ہم نے نیم کے درختوں پر ادھر ادھر سے کچھ آم لاکر ٹانک لئے ہیں اور جس طرح ہم نے دین کے دوسرے بہت سے حقائق کو محض رسموں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، اسی طرح قربانی کی اصل روح بھی ہمارے دلوں سے غائب ہو چکی ہے اور اب اس کی حیثیت بعض کے نزدیک ایک رسم کی ہے اور اکثر کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر ایک قومی تہوار کی ـــــ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہر سال پندرہ بیس لاکھ سے بھی زائد کلمہ گو حج کرتے ہیں اور بلا مبالغہ پورے کرۂ ارض پر کروڑوں کی تعداد میں ہر سال عید الاضحٰی کے موقع پر قربانی دی جاتی ہے لیکن وہ روحِ تقویٰ کہیں نظر نہیں آتی جس کی رسائی اللہ تک ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے　　وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے

نماز و روزہ و قربانی و حج　　یہ سب باقی ہے تُو باقی نہیں ہے

یعنی اللہ کا تقویٰ مسلمانوں میں کم یاب بلکہ عنقا شے بن کر رہ گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس طرف عقل و شعور کے ساتھ ہم میں اس بات کی طلب پیدا ہو کہ ہم متوجہ ہوں کہ معلوم کریں کہ کُل رُوحِ دین کیا ہے!

روحِ قربانی کیا ہے ! جس کا ایک نمونہ اور جس کی ایک یادگار ہم ہر سال جانوروں کی قربانیوں کی شکل میں مناتے ہیں ــــ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی اصل حقیقت کا فہم عطا فرمائے اور ہمیں ہمت دے کہ ہم واقعتاً اپنے مفادات، اپنے جذبات، اپنے احساسات اور اپنی محبتیں ان سب کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام پر قربان کرسکیں ــــ اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اصل روحِ قربانی کو اپنی شخصیتوں میں جذب کرسکیں اور عید قربان پر جب اللہ کے نام پہ جانور کی قربانی کریں اور اسے ذبح کریں تو ساتھ ہی عزم صمیم بھی کرلیں کہ ہم اپنا تن من دھن، اس کی رضا کے لئے، اس کے دین کی سربلندی کی راہ میں قربان کردیں گے ــــ گویا بقول شاعر ؎ میرا سب کچھ میرے خدا کا ہے

اور بمصداقِ الفاظِ قرآنی : اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۔

اختتام پر ایک ضروری گذارش یہ ہے کہ اسلامی اصطلاحات کا بے دریغ دوسری چیزوں کے لئے استعمال کسی طرح صحیح نہیں ہے بلکہ ہمارے نزدیک یہ عمل آخرت میں مؤاخذۂ رب العزت کا سبب بن سکتا ہے "عید" کی اصطلاح اصلاً اسلامی اصطلاح ہے اور اس کا اطلاق انہی تقاریب پر درست ہے جو ہمارے دین میں مقرر ہیں ۔ اس معاملہ میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے اور ضروری ہے کہ دوسری تقاریب کے لئے "عید" کی اصطلاح استعمال کرنے سے اجتناب کیا جائے ۔ اسی موقع پر ہم اپنے ان دینی بھائیوں اور بزرگوں کی خدمت میں نہایت دل سوزی سے عرض کریں گے جو ایک مخصوص انداز کی تبلیغ کے لئے گھروں سے نکلنے یا ملکی قومی انتخابی مہمات میں حصہ لینے یا فقہی و کلامی تعبیرات کے اختلافات کے ضمن میں جلسہ وجلوس میں شرکت کرنے کو بدر و اُحد اور حنین کے معرکوں میں شرکت قرار دیتے ہیں ــــ کہاں اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جاں نثاری کے وہ معرکے اور کہاں یہ چیزیں !! ــــ توقع ہے کہ متعلقہ بزرگ اس گذارش پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے ۔ جزاہم اللہ خیراً

دہم

(اٹھارھویں نشست)

(مباحث ایمان ۔ درس ثالث)

نورِ ایمانی کے اجزائے ترکیبی:

نورِ فطرت اور نورِ وحی

سورۂ نور کے پانچویں رکوع کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۲)

السلام علیکم ۔ نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ۔ امّا بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَ یُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّ لَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَ اِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۙ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ۙ لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ یَزِیْدَھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۔ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ

"ان گھروں میں کہ جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ انھیں بلند کیا جائے، ان میں اللہ کے نام کا ذکر کرتے ہوئے اس کے لئے تسبیح کرتے ہیں، صبح کے اوقات میں بھی اور شام کے اوقات میں بھی، وہ جواں مرد وہ باہمت لوگ جنھیں غافل نہیں کر سکتی کوئی تجارت اور کوئی سودا اللہ کی یاد سے اور نماز کے قائم کرنے سے اور زکوٰۃ

کی ادائیگی سے۔ وہ ڈرتے رہتے ہیں اس دن کے تصور سے کہ جس دن الٹ جائیں گے دل بھی اور نگاہیں بھی۔ تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو جزا عطا فرماتے ان کے بہترین اعمال کی اور انہیں مزید عطا فرماتے اپنے فضل سے۔ اور اللہ عطا فرماتا ہے جس کو چاہے بلا حد و حساب: دیج فرمایا بڑی عظمت والے اللہ نے)

محترم حاضرین و معزز ناظرین!

یہ سورہ نور کے پانچویں رکوع کی دوسری، تیسری اور چوتھی آیات ہیں، جن کی ابھی آپ نے تلاوت اور ان کا ترجمہ سماعت فرمایا۔ اس رکوع کی پہلی آیت کے بارے میں پچھلی نشست میں بیان ہوا تھا کہ اس میں ایمان کی حقیقت، ایمان کی ماہیت، ایمان کی ایک نور سے مشابہت سے متعلق حقائق بیان ہوتے ہیں، اور یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ ایمانِ حقیقی کا مرکز اور محل و مقام قلبِ انسانی ہے ـــــ

جیسا کہ پچھلی نشست میں عرض کیا گیا تھا کہ اگر ایمانِ حقیقی کا یہ نور فی الواقع کسی قلب میں پیدا ہو جائے تو اس کے اثرات اس کی پوری شخصیت میں، اس کے کردار میں، اس کی سیرت میں، اس کے رویے میں، اس کی دلچسپیوں میں ظاہر ہوں گے۔ اسی کا ایک نقشہ ہے جو ان آیات میں ہمارے سامنے آتا ہے جن کی آج تلاوت کی گئی ہے اور اس کا رواں ترجمہ بیان کیا گیا ہے ـــــ پہلی بات تو یہ سامنے آئی کہ اس روئے ارضی پر خارجی اعتبار سے اس نورِ ایمانی کے سب سے بڑے مراکز مسجدیں ہیں۔ اللہ کے وہ گھر جن میں اہلِ ایمان ہر روز پانچ مرتبہ جمع ہوتے ہیں۔ نورِ ایمانی کا یہ ارتکاز فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ، ان گھروں میں خاص طور پر نمایاں نظر آئے گا جن کو بلند کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے ـــــ اس بارے میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ایک بہت ہی عمدہ اور پیارا قول ہمیں ملتا ہے وہ فرماتے ہیں المساجدُ بیوتُ اللّٰہِ فی الارض۔ وھی تضیئی لِاھلِ السمآءِ کما تضیئی النجومُ لِاھلِ الارض ـ "مسجدیں زمین پر اللہ کے گھر ہیں اور آسمان والوں کو وہ اسی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں جیسے کہ زمین والوں کو ستارے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں" ـــــ اس سے ظاہر ہے کہ اس نورِ ایمان کے سب سے بڑے مراکز اللہ کے یہ گھر ہیں۔ اور جن لوگوں کے دلوں میں وہ نورِ ایمان پیدا ہو جاتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی دلچسپیوں کا سب سے بڑا مرکز مسجدیں ہوتی ہیں چنانچہ ایک حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات قسم کے اشخاص وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ حشر کے دن میدانِ حشر میں خاص اپنے عرش کے سائے تلے جگہ دے گا۔ جب کہ کسی کو بھی کسی اور جگہ سایہ میسر نہیں ہوگا۔ ان میں ایک قسم کے لوگ وہ بھی ہوں گے جن کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: وَرَجُلٌ قَلْبُہٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ "وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے ـــــ وہ مسجد سے باہر نکلتا ہے ـــ اس کے گھر بار کی ضروریات ہیں، کاروبار کی ضروریات ہیں، معاشں کی مصروفیات ہیں، دیگر حوائج ہیں۔ لیکن اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے جیسے مچھلی کو پانی سے نکال دیا گیا ہو۔ وہ ایک ضرورت ہے، ایک مجبوری ہے، جس کے تحت وہ مسجد سے نکلا ہے، ورنہ اس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے اور وہ منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی پھر اذان کی آواز آئے، وہ فوراً لپک کر مسجد کی طرف روانہ ہو جائے۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ۔ مساجد کو بلند کرنے کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے متعلق ایک رائے تو یہ ہے کہ اس کا مفہوم مجرد تعمیر کرنا ہے۔ تعمیر کے لئے بھی لفظِ رفع کنایۃً قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے جیسے سورہ بقرہ میں آیا ہے: وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد ہے تعظیم و احترام ـــــ مسجد کو ہر نوع کی گندگی اور نجاست سے پاک رکھنا اور ہر قسم کے لغو کاموں اور لغو گفتگوؤں سے بھی اسے محفوظ رکھنا ـــــ تو ایک تعظیم و احترام ظاہری ہے جیسے کہ بیت الحرام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ۔ "ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل (علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام) سے یہ عہد لے لیا تھا کہ وہ میرے گھر کو پاک و صاف رکھیں گے طواف کرنے والوں کے لئے اور اعتکاف کرنے والوں کے لئے اور وہاں رکوع و سجود کے لئے آنے والوں کے لئے" پھر یہ کہ وہ نجاستِ معنوی سے بھی پاک ہو، شرک کی آلودگیوں سے بھی پاک ہو: وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا۔ "مساجد صرف اللہ ہی کے لئے ہیں وہاں اس تعلیٰ کے سوا کسی اور کو پکارا نہ جا رہا ہو" ایک رائے یہ ہے کہ بستی میں مسجد کی تعمیر بلند رکھی جائے تاکہ وہ دور سے نظر آئے اور اسے اس بستی میں نمایاں مقام حاصل ہو، وہ اس بستی کا مرکز محسوس ہو ـــ عربی بڑی فصیح و بلیغ زبان ہے۔ اس کے اکثر الفاظ معانی و مفاہیم کا گنجینہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ یہاں "ترفع" میں یہ تینوں ہی مفاہیم شامل ہیں۔

آگے چلئے: فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ۔ "اور ان گھروں میں ذکر کیا جائے اس تعلیٰ کے نام کا" ـــــ یہاں ہمارے دین کی ایک جامع اصطلاح "ذکر" کا بیان ہوا۔ اس اصطلاح میں ہر نوع کا ذکر آ گیا۔ نماز خود ایک ذکر ہے: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ۔ "نماز قائم کرو میرے ذکر (میری یاد) کے لئے" پھر قرآن حکیم اپنے آپ کو "الذکر" اور "ذکریٰ" قرار دیتا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا

الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ اور: وَجَآءَکَ فِیْ ھٰذِہِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَۃٌ وَّذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۔ قرآن خود کو "تذکرہ" بھی کہتا ہے: کَلَّآ اِنَّہٗ تَذْکِرَۃٌ ــــ گویا خود قرآن حکیم ذکرِ کامل اور ذکرِ مجسّم بھی ہے۔ ایک بڑی پیاری حدیث ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللّٰہ یتلون کتاب اللّٰہ ویتدارسونہ بینھم الا نزلت علیھم السکینۃ وغشیتھم الرحمۃ وحفتھم الملٰئکۃ وذکرھم اللّٰہ فیمن عندہ ــــ "جب کبھی بھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوتے ہیں اس کی کتاب کے درس و تدریس اور افہام و تفہیم کے لئے تو ان پر سکینت کا نزول ہوتا ہے۔ رحمتِ الٰہی ان کو اپنے سائے میں لے لیتی ہے۔ فرشتے ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کا ملأ اعلیٰ یعنی ملائکۃ المقربین کی محفل میں ان کا ذکر فرماتا ہے کہ اس وقت میرے کچھ بندے میرے ایک گھر میں صرف میری کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے جمع ہوتے ہیں"۔

آگے چلئے: فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ٥ ان گھروں میں اس کی صبح کے وقت اور شام کے اوقات میں تسبیح کرتے ہیں ــــ یہاں غُدُوّ مصدر ہے، اس کی جمع نہیں ہوتی، قرآن مجید میں یہ ہمیشہ واحد آتا ہے۔ آصال اصیل کی جمع الجمع ہے۔ اصیل کی جمع اُصُل اور اس کی جمع اصال ــــ اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ صبح کے وقت تو فرض نماز ایک ہی ہے۔ لیکن سورج کے ذرا سے ڈھلنے کے بعد سے یعنی شام کے اوقات میں چار فرض نمازیں ہیں کہ جن کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں آصال آیا جس کے معنی ہیں شام کے اوقات۔ اسی کی طرف اشارہ ہے سورہ بنی اسرائیل کی اس آیت مبارکہ میں: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۔ "سورج کے ذرا سے ڈھلنے کے بعد سے لے کر نماز کو قائم کر و رات کے تاریک ہو جانے تک"۔ ــــ اس میں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء، چار فرض نمازیں آگئیں ــــ اور وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ، سے صلوٰۃ الفجر مراد ہے۔ اس طرح پنجگانہ فرض نمازوں کا ذکر ہو گیا۔ یہاں بھی یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ سے اصلاً مراد پنجگانہ فرض نمازیں ہیں، تبعاً جملہ مسنونہ تسبیحات بھی اس میں شامل ہیں ــــ آج کے سبق کی پہلی آیت کی قدرے تشریح و توضیح یہاں ختم ہوئی۔

اب آگے چلئے۔ یہ کن لوگوں کا ذکر ہے؟ فرمایا: رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ "وہ جواں ہمت لوگ جنہیں غافل نہیں کر سکتی کوئی تجارت اور کوئی سودا ــــ

پہلے تو یہاں یہ سمجھ لیجئے کہ "رجال" سے یہاں صرف مردوں ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ تبعاً اس میں خواتین بھی
شامل ہیں۔ پھر یہ کہ یہاں یہ لفظ کنایہ کے طور پر آیا ہے۔ مراد ہے باہمت لوگ —— اس لئے کہ اس
دنیا میں نہ معلوم انسان کے لئے کتنے PRESSURE، کتنے دباؤ، کتنے موانع، کتنی تحریصات،
کتنی ترغیبات، کتنی Temptations ہیں جن سے اسے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اگر وہ اللہ کے
احکام کو لگائے رکھنا چاہتا ہے تو اسے بڑی کشمکش سے سابقہ پیش آتا ہے، لہٰذا اللہ کی یاد سے غافل
نہ ہونے کے لئے بڑی مضبوط قوتِ ارادی کی ضرورت ہے۔ کہیں تجارت آپ کو اپنے اندر گم کر لے
—— اب اس لفظ "گم" سے مجھے علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آیا۔ ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے ۔۔۔ مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

کہیں مومن دنیوی مشغولیتوں، مصروفیتوں اور دلچسپیوں میں گم ہو جاتے گا —— لہٰذا یہاں
فرمایا گیا کہ نہ تجارت اسے اپنے اندر گم کر سکے گی اور نہ ہی کوئی سودا اور لین دین —— تجارت عام ہے
اور بیع خاص ہے۔ یہ عطف الخاص علی العام کی ایک مثال ہے۔ ویسے بھی بیع میں فوری طور پر
کوئی منفعت پیشِ نظر ہوتی ہے۔ تجارت تو ایک سلسلہ ہے جو پھیلا ہوا ہے، لیکن جب کوئی سودا
ہو رہا ہوتا ہے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ اس سودے میں مجھے اس وقت کتنا نفع حاصل ہو رہا ہے
اور اذان کی آواز آگئی ہے تو کوئی بات نہیں۔ اگر جماعت چلی بھی جاتے تو میں علاحدہ نماز ادا کر لوں
گا، اس وقت یہ سودا چھوڑنا پڑے گھاٹے کا معاملہ ہو جاتے گا —— لیکن ان باہمت لوگوں کا حال
ہوتا ہے، لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ "انہیں غافل نہیں کرپاتی کوئی تجارت
اور نہ کوئی سودا، اللہ کی یاد سے" یہاں ذرا ذہن میں لائیے سورہ منافقون کے دوسرے رکوع کی
پہلی آیت جس میں فرمایا گیا کہ اگر نفاق سے بچنا چاہتے ہو تو ہر دم ہر لحظہ اللہ کی یاد کا اہتمام کرو: يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ "اے اہل ایمان تمہیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے
غافل نہ کرنے پائیں، اگر ان میں منہمک ہو کر، ان میں مصروف ہو کر، ان میں مشغول ہو کر اللہ کی یاد
سے غافل ہو گئے، اللہ ہی یاد نہ رہا تو جان لو کہ یہ بڑے خسارے کا سودا ہے۔ یہ بڑی ہلاکت اور
بربادی کی طرف لے جانے والی بات ہے"

آگے چلیے — وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ۔ دنیوی مصروفیات میں انسان اتنا گم
ہو جائے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام ہی نہ رہے اور مال کی محبت اتنی غالب نہ ہو جائے کہ زکوٰۃ ادا

کرنی بھی دوبھر نظر آتے۔ تزکیہ نفس کے لئے نہ صرف یہ کہ ہر سال نصاب کے مطابق زکوٰۃ دے بلکہ زکوٰۃ
کے علاوہ بھی ایک بندہ مومن ابنائے نوع کی خدمت اور بھلائی میں صدقات دے بلکہ جیسا کہ ہم آیت
بر کے مطالعے میں یہ حدیث پڑھ چکے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: ان فی المال لحق سوی الزکوٰۃ
"تمہارے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی مستحقین کا حق ہے"۔ اور بطور استشہاد آپؐ نے اس آیت مبارکہ
(آیت بر) کا یہ حصہ تلاوت فرمایا: وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ
وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ۔

آگے چلئے۔ فرمایا کہ اس سب کے باوصف ان کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ ان میں اپنی دینداری
کا کوئی تکبر، کوئی عُجب، کوئی پندار کوئی گھمنڈ پیدا ہو جائے۔ ان تمام حسنات اور اعمال صالحہ کے باوصف
ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لرزہ براندام رہتے ہیں، کانپتے رہتے ہیں، لرزاں و ترساں رہتے ہیں اس
دن کے خیال سے جس کی ہولناکی کا عالم یہ ہے کہ اس دن دل اُلٹ جائیں گے، آنکھیں پتھرا جائیں گی۔
یہ کنایہ اور استعارہ ہے قیامت کی ہولناکی اور اس کے شدائد و مصائب کے لئے —— وہ دن کہ جو
بچوں کو بوڑھا کر دے گا: یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا۔ یہ باہمت لوگ اللہ سے لو لگانے اور
ہر دم اس کی یاد کا التزام کرنے کے باوجود اس دن کے تصور سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں:
یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ۔ یہاں آج کے سبق کی دوسری آیت کا
مختصر بیان تمام ہوا۔

آگے چلئے۔ اب آج کے مطالعے کی آخری آیت کو بھی سمجھ لیں۔ فرمایا: لِیَجْزِیَھُمُ اللہُ
اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا۔ یہاں ابتدا میں جو لام حرف جار آیا ہے تو یہاں یہ لام عاقبت کے طور پر آیا ہے۔
مراد یہ ہوگی کہ ان سب کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کو جزا دے گا بہت عمدہ، بہت اعلیٰ، نہایت
احسن ان کے اعمال کی —— یہاں احسن کا تعلق دونوں طرف ہو سکتا ہے۔ جزا کے لئے بھی احسن
کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بہت عمدہ، اعلیٰ، احسن جزا دے گا۔ اور اعمال کو بھی احسن سے
تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اچھے سے اچھے انسان کے تمام اعمال برابر اور مساوی قدر و قیمت کے تو نہیں
ہوتے۔ پھر یہ کہ انسان سے کچھ کوتاہیاں اور خطائیں بھی سرزد ہو جاتی ہیں —— الانسان
مرکب من الخطاء والنسیان —— انسان تو دو چیزوں کا پتلا ہے۔ اس سے غلط
کا صدور بھی ہو جاتا ہے، خطا کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے۔ بھول چوک بھی اس کی جبلت اور خمیر
میں شامل ہے۔ تو اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اعمال میں سے جو جو

کے اعمال ہوں گے ان کے اعتبار سے ان کی جزا کا حساب لگایا جائے گا۔ ان کی جزا ان کے اعلیٰ ترین اعمال کی مناسبت سے مترتب ہوگی۔ جو کم تر درجے کے اعمال وہ نظر انداز کر دیئے جائیں گے اور جو کوتاہیاں اور خطائیں ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ اپنی شانِ غفاری و رحیمی و ستاری سے ان کے نامۂ اعمال میں سے دھو دے گا، صاف کر دے گا، ڈھانپ لے گا۔ جیسا کہ ہم سورہ آلِ عمران کے آخری رکوع کے مطالعہ کے دوران دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ "میں لازماً ان کی برائیوں کو ان کے نامۂ اعمال سے محو کر دوں گا" وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ "اور میں لازماً ان کو ان باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں نہریں رواں دواں ہوں گی"۔ یا جیسے سورہ ہود میں یہ اصول بیان فرمایا: اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ —— لہٰذا ان کا آخرت میں جو مقام اور مرتبہ معین ہوگا وہ ان کے اعلیٰ اور احسن اعمال کی نسبت، مناسبت اور ان کے اعتبار سے ہوگا۔

آگے چلیے۔ یہ جزا یعنی اجرت تو حساب کتاب سے ملے گی۔ جتنی محنت ہے، جتنی مشقت ہے اس کے مطابق جزا ملے گی۔ اس پر مزید ہے فضل جو اللہ تعالیٰ خاص اپنی طرف سے عنایت فرمائے گا، چنانچہ فرمایا: وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ "اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو مزید عطا فرمائے گا۔" یہ فضل کسی استحقاق کی بنیاد پر نہیں ملتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی دین ہے اور یہ فضل کسی حساب کتاب کا پابند نہیں ہے بلکہ: وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ "اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے بلا حساب و کتاب" اس فضل کے لئے کوئی حساب کتاب نہیں ہے بلکہ یہ فضل بلا نہایت ہوگا۔ بِغَيْرِ حِسَابٍ سے یہاں یہ سب کچھ مراد ہے۔

اب یہاں تھوڑا سا توقف کر کے ہمارا جو سابقہ سبق تھا اس کے ساتھ آج کے اس سبق کو جوڑ کر ایک حقیقی بندہ مومن کی شخصیت کا ایک مکمل نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیجئے —— آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارا سابقہ سبق سورہ آلِ عمران کی آخری چھ آیات پر مشتمل تھا۔ اس میں بھی ایمان کی ترکیب یعنی SYNTHESIS OF FAITH بیان ہوئی تھی کہ ایمان باللہ ایمان بالآخرہ اور پھر ایمان بالرسالت کیسے وجود میں آتا ہے! —— پھر وہاں بندہ مومن کی شخصیت کا نقشہ، تصویر کے ایک رخ کی حیثیت سے سامنے لایا گیا۔ وہ نقشہ کیا تھا؟ سعی و جہد، ایثار و قربانی، جہاد و قتال، صبر و مصابرت —— چنانچہ آپ کو یاد ہوگا کہ وہ الفاظ تھے: وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِيْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا "جن لوگوں نے

میرے لئے اپنا گھر بار چھوڑا، جو میرے لئے اپنے وطن سے نکال دیئے گئے، جنھیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں، تکلیفیں دی گئیں، جنھوں نے میرے لئے جہاد کیا قتال کیا، اور انھوں نے میرے دشمنوں کو قتل بھی کیا اور خود اپنی جانیں بھی دیں۔ قَاتَلُوْا وَ قُتِلُوْا ۔ یہ ہے بندہ مومن کی زندگی کا ایک نقشہ ـــــ جد و جہد، کوشش و محنت، کشمکش و تصادم، صبر و ثبات، ایثار و قربانی، حتیٰ کہ نقد جان کے نذرانوں کا گزران، اسی تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے۔ اس میں ذکر الٰہی کے ساتھ ایک قلبی انس، ایک محبت، دوام ذکر۔ اللہ تعالیٰ کی یاد کو دل میں بھی مستحضر رکھنا اور اپنی زبان کو بھی اس کے ذکر سے تر و تازہ رکھنا۔ پھر نماز کا قائم کرنا، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کرنا۔ اس میں ذوق و شوق، اس میں ذکر و شغل۔ پھر اس میں رقت قلبی، اس میں خوف اور خشیت الٰہی یہ نقشہ ہے جو آج کے سبق میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں کہ ایک تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں اور تصویر ان دونوں رخوں سے مکمل ہوتی ہے۔ اگر یک رُخا نقشہ سامنے رہے گا تو شخصیت بھی یک رخی رہے گی، معاملہ ONE SIDED رہے گا۔ اصل میں ایک بندہ مومن کی شخصیت کے یہ دونوں رُخ ہیں جو مطلوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ایک بندہ مومن کی شخصیت میں یہ دونوں رخ بیک وقت موجود ہوں۔ چنانچہ پوری امت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا جو امتیازی مقام ہے وہ ان دونوں مقامات پر بیان ہوا ہے۔ ان میں ہمیں یہ دونوں رنگ بکمال و تمام بیک وقت صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں نظر آتے ہیں، چنانچہ دشمنوں نے اس کی گواہی دی ہے ـــــ عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے کہ الفضل ما شھدت بہ الاعداء ۔ "اصل فضیلت وہی ہے جس کی گواہی دشمن دیں۔" چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں جب سلطنتِ کسریٰ سے مسلح تصادم ہوا ہے تو ایرانی افواج کے جاسوسوں اور مخبروں نے مسلمانوں کی افواج کا خوب اچھی طرح جائزہ لے کر ایرانی سپہ سالار کو جو رپورٹ دی تھی، اس کے یہ الفاظ نہایت قابل غور ہیں اور ان کی ذہانت پر دلالت کرتے ہیں کہ: ھُمْ رُھْبَانٌ بِالَّیْلِ وَ فُرْسَانٌ بِالنَّھَارِ ـــــ یہ عجیب لوگ ہیں، دن میں یہ شہسوار اور میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہیں اور یہی لوگ رات کے وقت راہب بن جاتے ہیں، مصلوں پر کھڑے ہوتے ہیں، ان کے آنسوؤں سے ان کی سجدہ گاہیں تر ہو جاتی ہیں۔ یہ اپنے رب کے حضور الحاح و زاری میں اپنی راتوں کا بیشتر حصہ گزارتے ہیں ـــــ دنیا نے پہلے بھی راہب دیکھے تھے اور اب بھی دیکھے جاتے ہیں۔ وہ دن میں راہب ہیں تو رات میں بھی راہب۔ ان کو جنگ سے کیا سروکار! ـــــ اسی طرح پہلے بھی فوجیں ہوتی تھیں۔ آج بھی ہیں۔ پہلے بھی اور آج بھی

کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جہاں بھی فوجوں کا پڑاؤ ہو جاتے وہاں آس پاس کی کسی خاتون کی عصمت محفوظ رہنی مشکل ——— ان فوجیوں کی راتیں شراب و شباب سے شغل کرنے میں گزرتی تھیں اور گزرتی ہیں ——— جب کہ ان مومنوں کی راتیں اپنے رب کے حضور خشوع و خضوع میں بسر ہوتی ہیں۔

پس ایک بندہ مومن کی مکمل شخصیت: "هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ" کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے۔ فرسان بالنہار والا رُخ سورہ آلِ عمران کے آخری سبق میں ہمارے سامنے آیا تھا۔ رھبان باللیل کی صحیح تعبیر آج کے سبق سے سامنے آئی۔ اس طرح ایک بندہ مومن کی مکمل شخصیت کا ہیولیٰ ہمارے سامنے آجاتا ہے ——— اللہ تعالیٰ ہمیں بھی کسی ادنیٰ درجہ ہی میں سہی ان اوصاف کا مصداق بننے کی توفیق عطا فرمائے ——— اب اس ضمن میں اگر کچھ سوالات ہوں تو آپ بخوشی پیش کر سکتے ہیں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا فکر کے ساتھ ذکر ضروری ہے۔؟

جواب: اس سوال کا اجمالاً جواب تو صرف "ہاں" میں ہے۔ لیکن آپ کو یاد ہو گا کہ سورہ آلِ عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی چھ آیات کے سبق میں یہ بات تفصیل سے زیرِ بحث آچکی ہے۔ اس ضمن میں ایک سوال کے جواب میں بھی اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اس سبق میں ہم نے پڑھا تھا۔ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ ذکر و فکر درحقیقت اسلام کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ جب یہ دونوں بیک وقت موجود ہوں اور حرکت میں ہوں، تب ہی گاڑی آگے بڑھے گی۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! اللہ تعالیٰ کا فضل تو ہر حال میں شامل ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری شعوری کوششوں کو کیا اہمیت حاصل ہے؟

جواب: سوال غیر واضح اور گنجلک ہے۔ بہرحال جو کچھ میں سمجھا ہوں اس کے مطابق جواباً عرض کئے دیتا ہوں کہ اصل میں ہماری شعوری کوشش ہی فضلِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کا اختیار مطلق ہے۔ وہ جس کو جو چاہے عطا فرمائے۔ وہ ابوجہل اور ابولہب کو بھی ایمان کی ہدایت فرما سکتا تھا۔ لیکن قرآن حکیم کے معروضی مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی چیز ہے انسان کا اپنا ارادہ اور اپنی نیت! اس کا اختیار انسان کو حاصل ہے کہ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی

تائید اور اس کی توفیق جب انسان کے شاملِ حال ہوتی ہے تو بیڑا پار ہوتا ہے۔ یہاں بھی ہم نے دیکھا کہ پہلے ان باہمت لوگوں کی اپنی طبیعت، اپنے ارادے، اپنی نیت اور اپنی کوشش کی کیفیات بیان ہوتیں کہ وہ یہ کرتے ہیں، وہ کرتے ہیں۔ ان کی لَو اللہ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ یادِ الٰہی سے ان کو انتہائی انس ہے۔ انتہائی مناسبت ہے پھر بھی وہ آخرت کی خشیت اور خوف سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ لہٰذا اجر تو انھیں اپنے ان بہترین اعمال کی بنیاد پر ملے گا جن کے کسب میں ان کی شعوری کوششوں کا دخل ہوگا۔ البتہ اس راہ میں اللہ تعالیٰ ان کے لئے آسانی اور تسہیل فرمائے گا۔ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى۔ اب اس اجرت کے بعد اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا، اپنے فضلِ خاص سے مزید نوازے گا۔ اس کیلئے اللہ سبحانہٗ کسی حساب کتاب کا پابند نہیں ہے ——— ایک سادہ سی مثال ہے۔ آپ نے ایک مقررہ وقت اور مقررہ اجرت پر کسی سے کوئی کام لیا۔ اس نے وہ کام نہایت اعلیٰ و احسن طریق سے انجام دے دیا، تو آپ مقررہ اجرت کے علاوہ اُسے بطور انعام جو چاہیں دے سکتے ہیں۔ اجرت سے زائد جو کچھ اُسے ملے گا وہ فضل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی توفیق دے کہ ان دو اسباق میں ہمارے سامنے ایک بندۂ مومن کی مکمل شخصیت کے جو اوصاف آتے ہیں، ان تمام اوصاف کو ہم اپنے اندر بھی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ہماری طرف سے عزم و ارادہ ہوگا تو یقیناً توفیق، تائید اور تسہیل اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے شاملِ حال ہو جائے گی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

قارئین متوجہ ہوں!

ماہنامہ "میثاق" کے بعض مستقل خریداروں کی شکایت کے پیشِ نظر ادارے نے طے کیا ہے کہ آئندہ سے چندہ ختم ہو جانے کی اطلاع پیشگی طور پر دو ماہ قبل دے دی جایا کرے گی۔ تاکہ جو حضرات منی آرڈر بھیجنا چاہیں وہ بروقت منی آرڈر بھیں ارسال کر دیں۔ اور اس طرح یہ تکلیف دہ صورت نہ پیش آئے کہ آپ کی جانب سے منی آرڈر بھیجا جا چکا ہو لیکن بروقت ہم تک نہ پہنچنے کی وجہ سے ہم یہاں سے رسالہ وی پی بھیج دیں (ادارہ)

قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات
اور
ان کے بارے میں علماء کرام کے خدشات

> محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے امسال رمضان المبارک کے تیسرے اور چوتھے اجتماعات جمعہ میں مسجد دارالسلام میں جہاد بالقرآن کے موضوع پر تقاریر کی تھیں۔ آخری جمعہ کو مندرجہ بالا موضوع پر اظہار خیال فرمایا تھا جس کو معمولی حک و اضافے کے ساتھ کیسٹ سے منتقل کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

الحمد للہ وکفٰی والصلوٰۃ والسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی خصوصًا علٰی افضلھم سید المرسلین خاتم النبیین محمد الامین وعلٰی آلہ وصحبہ اجمعین ۔ اما بعد، قال اللہ تبارک وتعالٰی فی سورۃ یونس:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۵ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۵

وَقَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی فِی سُوْرَۃِ الْبَقَرَہ:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا ۚ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا ۚ وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۵

وَقَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ فِی سُوْرَۃِ اٰلِ عِمْرَان:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي ۔ اَللّٰهُمَّ أَلْهِمْنَا رُشْدَنَا وَأَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا۔

اَللّٰهُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ وَأَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى ۔

آمین ۔ یارب العلمین

حضرات! پچھلے دو جمعوں سے میری گفتگو ایک موضوع پر چل رہی ہے جس کا جامع عنوان ہے "جہاد بالقرآن" ــــ اس ضمن میں، میں نے پہلے جمعہ میں تمہیدی طور پر اپنی ان باتوں کو ایک نئی ترتیب سے پیش کیا تھا جو بارہا میں آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ وہ باتیں یہ ہیں کہ قرآن مجید کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آلۂ انقلاب قرآن حکیم ہے۔ حضورؐ کی جدوجہد کو ہم اگر دو مرحلوں میں تقسیم کریں تو ایک مرحلہ مکی دور ہے۔ دوسرا مرحلہ مدنی دور ہے ــــ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مدنی دور میں نمایاں ترین چیز تلوار ہے اور مکی دور کی نمایاں ترین چیز قرآن مجید ہے یہ وہ معنوی تلوار ہے جس نے نظریاتی اور اعتقادی سطح پر شرک، کفر، الحاد اور زندقہ کا قلع قمع کیا۔ مدنی دور کی تلوار حقیقی تلوار ہے، جس نے مشرکین و کفار کے ساتھ نبرد آزمائی کی ــــ اصل میں یہ دو تلواریں ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمائی تھیں بحوالۂ آیتِ سورہ حدید: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ۔ یہی سبب ہے اس بات کا کہ ہمارے تحت الشعور میں ایک بندۂ مومن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ ہے اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار نظر آتی ہے۔ ہمیشہ سے یہ ایک تصور ہے جو ہمارے اجتماعی تحت الشعور میں موجود ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ جب اسی طرح میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ، آپؐ کی بائیس تئیس سالہ جدوجہد اور آپؐ کے انقلابی عمل پر غور کیا تو یہی دو اہم مراحل میرے سامنے آتے

لہ ان شاءاللہ العزیز یہ تقاریر مستقبل قریب میں کتابی شکل میں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ جہاد بالقرآن کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کی محاضرات قرآنی والی تقریر کی پہلی قسط گزشتہ شمارہ میں شائع ہو چکی ہے اور دوسری قسط اس شمارے میں شائع کی جا رہی ہے (ادارہ)

ان کو بھی میں بار ہا بیان کر چکا ہوں ۔حضورؐ نے آغازِ وحی کے بعد توحید کے انقلابی نظریہ کی تن تنہا تبلیغ و دعوت کا آغاز فرمایا۔ اس کا اصل آلہ تھا قرآن مجید ــــــ آپؐ کی تمام مساعی کا قرآن مجید ہی محور و مدار تھا۔ جو سعید روحیں آپؐ پر ایمان لائیں، آپؐ نے ان کی تربیت و تزکیہ فرمایا، ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی ۔ انھیں منظم فرمایا اور اس طرح ایسے سعید و متقی افراد کی ایک جماعت ، ایک جمعیت تیار فرمائی جن کے قلوب میں ایمان و یقین اس طور سے پیوست اور نقش ہو گیا کہ ان کے اندر دینِ توحید کے لئے تن من دھن قربان کرنے کا جذبہ ۔ اس راہ میں پیش آنے والے بڑے سے بڑے مصائب و شدائد کو برداشت کرنے کا عزم اور حوصلہ ۔ راہِ حق میں جامِ شہادت نوش کرنے کا ذوق و شوق ۔ یہاں تک کہ اگر اللہ کے دین کے لئے گھر بار ، بیوی بچے ، اعزہ و اقارب کو چھوڑنا پڑے تو اس کیلئے ہمہ تن آمادگی ــــــ الغرض ایثار و قربانی کے وہ عزائم جو کسی انقلابی تحریک کے لئے لابد ہوتے ہیں ان میں اپنے نقطۂ عروج و کمال کو پہنچے ہوئے تھے ــــــ پھر یہ کہ اپنے ہادی اور رہنما صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ بھی اس جماعت کے ہر فرد کے لئے حکم کے درجہ میں تھا کہ جو بات آپؐ نے فرمادی اس پر سرِ تسلیم خم ہے ۔ اس پر نورٌ علیٰ نور یہ بات کہ یہ رویّہ اور طرزِ عمل صرف رضائے الٰہی کے پیشِ نظر تھا ــــــ جدید اصطلاح کے بموجب ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایسے فدائین اور جاں نثاروں کی جماعت تھی جو مکمل طور پر COMMITTED افراد پر مشتمل تھی ۔ پھر یہ کہ سمع و طاعت (DISCIPLINE) کا نظام بکمال و تمام موجود تھا ۔ ساتھ ہی جماعت کے ہر فرد کا تزکیہ نفس اس کمال تک ہو گیا تھا کہ جتنے بھی نفسِ انسانی کے رذیل تقاضے ہیں ، شہوات و لذات کے جو ناشائستہ داعیات ہیں ، دل کے جو امراض ہیں ، اخلاق کے جو ذمائم ہیں ، ان سب سے انھوں نے اپنے قلوب و نفوس کو پاک کر لیا تھا اور ان پر قابو یافتہ ہو گئے تھے ۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی جماعت کے اوصاف کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ان کی مدح فرمائی ہے ۔

اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ اس جماعت نے جد و جہد کی ، قربانیاں دیں ، کفر کی طاقت سے پنجہ آزمائی کی ۔ مقاتلہ کیا ، يُقْتَلُوْنَ وَيَقْتُلُوْنَ ۔ انھوں نے کفار کو قتل بھی کیا اور خود بھی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا ۔ اس اجتماعی جد و جہد کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جزیرہ نمائے عرب میں انقلاب برپا کر دیا ۔ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ جماعت کیسے وجود میں آئی ! تو یہ درحقیقت جہاد بالقرآن کے ذریعہ وجود میں آئی ــــــ قرآن کے ذریعہ دعوت ، قرآن کے ذریعہ تذکیر ، قرآن کے ذریعہ انذار و تبشیر ، قرآن کے ذریعہ تزکیہ نفس ۔ راتوں کو کھڑے رہو قرآن کے ساتھ ۔ پوری رات

کھڑے رہو یا دو تہائی یا نصف یا ایک تہائی، قرآن کے ساتھ: وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ. رات کا ایک حصہ جاگ کر گزارو، اس قرآن کے ساتھ۔ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ یہ قرآن ہے قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ اللہ کی طرف سے نازل کردہ وعظ اور نصیحت بھی یہ قرآن ہے۔ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ اور ہم جو یہ قرآن نازل کر رہے ہیں تو یہ اہل ایمان کے لئے شفا ہے اور رحمت ہے ـــــ پس معلوم ہوا کہ اس جماعت کی تیاری میں مرکز ومحور قرآن رہا ہے۔ قرآن کو اس کا ذریعہ کہہ لیں، اس کا ہتھیار کہہ لیں، اس کا آلہ کہہ لیں، اس کا نسخہ کہہ لیں، یہ سب باتیں قرآن پر راست آئیں گی۔ مولانا حالی نے کیا خوب کہا ہے:ـ

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا | اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

یا بقول علامہ اقبال ـ

مصطفیٰؐ اندر حرا خلوت گزیں | قوم و آئین و حکومت آفریں

میں نے دوسرے جمعہ کی تقریر میں وہ پانچ محاذ گنوائے تھے جن پر اس وقت دینی اعتبار سے جدوجہد اور کش مکش کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی میں نے عرض کیا تھا کہ ان پانچوں محاذوں کے لئے اصل ہتھیار، اصل تلوار قرآن ہے۔ ان محاذوں پر جہاد بالقرآن ہوگا، چاہے وہ جاہلیت قدیمہ کا محاذ ہو جس میں مشرکانہ اوہام ہیں، بدعات ہیں، شفاعتِ باطلہ کا تصور ہے۔ اس کا توڑ ہوگا تو صرف قرآن سے ـ اور میں نے عرض کیا تھا کہ محض دورۂ ترجمہ قرآن اس کے لئے بہت کافی ہے۔ دوسرا محاذ جاہلیت جدیدہ کا محاذ ہے۔ یعنی الحاد ہے، مادہ پرستی ہے۔ ہر اس چیز کا انکار ہے جو انسان کے حواس کی گرفت میں نہ آسکے جو VERIFIABLE نہ ہو۔ اس کے لئے بھی تلوار قرآن ہے، لیکن یہ ذرا محنت طلب معاملہ ہے کہ قرآن کی حکمت اور اس کے فلسفے کی گہرائیوں میں ڈوب کر، غوطہ زنی کر کے علم وحکمت کے موتی نکالنے ہوں گے۔ معرفت الٰہی کے جو حقائق فطرتِ انسانی میں جبلی طور پر مضمر ہیں، انکو قرآنی فطری استدلال کے ذریعے شعور کی سطح پر لانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ بدیہیاتِ فطرت کو اپیل کر کے باطل کا ابطال کرنا ہوگا۔ اور دورِ جدید کی اصطلاحات کے ذریعہ قرآنی طرزِ استدلال کا ابلاغ کرنا ہوگا۔ یہ کام اگر نہیں کریں گے تو جاہلیت جدیدہ کا مقابلہ نہایت مشکل ہوگا ـــ تیسرے محاذ کے لئے میں نے عرض کیا تھا کہ بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت ہے اس کا علاج ہے صحبتِ اصحاب یقین۔ بقول علامہ ـ صحبتِ صالح ترا صالح کند۔ یہ سب سے

زیادہ آسان اور سہل ذریعہ ہے۔ لیکن یہ اصحاب یقین کہاں سے آئیں گے! یہ بھی قرآن کے ذریعے ایسے لوگ جب قرآن میں غوطہ زنی کرتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے، جو تعلیمات پیش کر رہا ہے، جو استدلال کر رہا ہے۔ وہ ان کی بدیہیات فطرت کے مطابق ہیں۔ یہ حقائق ان کے باطن میں مضمر ہیں، قرآن ان کو واشگاف اور منکشف کر کے تحت الشعور سے شعور کی سطح پر لا رہا ہے۔ اس طرح قرآن ان کا باطنی تجربہ بن جاتا ہے۔ جیسے میں نے مثال دی تھی کہ آپ کو معلوم ہے کہ چینی میٹھی ہوتی ہے۔ یہ علم الیقین ہے۔ لیکن جب آپ نے اسے چکھا تو آپ کے اس تجربے نے بھی بتا دیا کہ واقعی چینی میٹھی ہے۔ تجربہ سے جو یقین حاصل ہوتا ہے، اس کا نام ہے حق الیقین۔ چنانچہ قرآن حکیم پر حق الیقین انسان کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ قرآن حکیم پر غور و فکر اور تدبر میں منہمک ہوتا ہے۔ اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرتا ہے تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ میرے دل کی آواز ہے۔ میری فطرت اس سے مطابقت رکھتی ہے میرا قلب و ذہن اسے مان رہا ہے اور قبول کر رہا ہے۔ اس احساس سے در حقیقت وہ یقین پیدا ہوتا ہے جسے حق الیقین کہا جائے گا۔ اسی کو علامہ اقبال نے اپنے لیکچرز میں INTERNAL EXPERIENCE کہا ہے جیسے ہمارا EXTERNAL EXPERIENCE ہوتا ہے کہ ہم نے آگ پر رکھے ہوتے کسی توے کو چھوا تو فوراً تجربہ ہو گیا کہ توا گرم ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی —— اسی طریقہ سے جب قرآن مجید پر غور و تدبر کرنے والا شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ تو میری اپنی فطرت کی ترجمانی ہے۔ اس شعر کے مصداق، ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

اس طور سے قرآن مجید پر حق الیقین پیدا ہوتا ہے۔

چوتھے محاذ کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ وہ ہمارے سامنے فرقہ واریت کا محاذ ہے۔ اس فرقہ واریت کی شدت کو کم کرنے اور غیریت کو ختم کرنے کے لئے ہمیں کوئی ایسی بنیاد، کوئی ایسی جڑ، کوئی ایسا مرکز درکار ہے۔ جو ذہنی ہم آہنگی پیدا کرے۔ پھر یہی ذہنی ہم آہنگی لوگوں کے اندر آپس میں قرب اور وابستگی کا ذریعہ بنے۔ یہی مفہوم حبل اللہ کا ہے۔ میں بارہا یہ عرض کر چکا ہوں کہ حبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ وقت کی کمی کے باعث میں اس وقت قرآن مجید کے حبل اللہ ہونے کے احادیث صحیحہ سے دلائل پیش نہیں کر سکوں گا —— یہ دلائل آپ کو میری بہت سی تالیفات میں مل جائیں گے۔ اسی کی تفہیم کے لئے میں نے آغاز میں سورہ آل عمران کی ایک آیت کے پہلے حصے کی

تلاوت کی تھی: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔

پانچواں محاذ ہماری نفس پرستیاں ہیں، شیطان کی وسوسہ اندازیاں ہیں۔ ہمارے نفس کے متعلق قرآن مجید ہمیں متنبہ کرتا ہے: اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اور بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَہٗ۔ ہمارا نفس عادی ہو چکا ہوتا ہے لذت کوشیوں کا، حرام خوریوں کا، غلط کاموں کی ہمیں عادتیں پڑ گئی ہیں۔ تو ان تمام برائیوں کے لیے جو تلوار ہے وہ قرآن مجید ہی ہے۔ اس مضمون پر مجھے علامہ اقبال کے یہ اشعار بہت ہی پسند ہیں جو بارہا میں آپ کو سنا چکا ہوں

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است   زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی   کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

معلوم ہوا کہ اس محاذ کے لئے بھی ہمارے پاس تلوار قرآن مجید ہے — لہٰذا ان پانچوں محاذوں پر ہمیں قرآن کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔

آج میں ایک نہایت اہم لیکن بہت پیچیدہ مسئلہ پر گفتگو کا آغاز کر رہا ہوں۔ آج میری تقریر کا اصل موضوع یہی مسئلہ ہے۔ اب تک جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ پچھلے دو جمعوں کی تقاریر کا خلاصہ بھی ہے اور آج کی تقریر کے لئے بمنزلہ تمہید بھی۔

مسئلہ یہ ہے کہ عرصے سے میرے ذہن میں ایک بڑا سوال بلکہ اشکال رہا ہے — میں نے جتنا قرآن کو پڑھا اور اس پر اپنی استعداد کے مطابق اس پر غور و فکر کیا، پھر سیرتِ مطہرہ کا معروضی مطالعہ کیا، حضورؐ کی حیاتِ طیبہ جن جن مراحل اور ادوار سے گزری ہے ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہجِ عمل اور انقلابی پہلو کو سمجھنے کے لئے سوچ بچار کیا تو اس نتیجہ تک پہنچا کہ قرآن مجید کو مرکز و محور بنا کر ایک دعوت کا آغاز کیا جائے اور ایک خالص اسلامی انقلابی تحریک برپا کرنے کی سعی و جہد کی جائے — جس کے لئے دلائل میں تفصیل سے پچھلے دو جمعوں میں بیان کر چکا ہوں اور ان کا ملخص آج بھی میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے — مجھے کچھ بزرگ ہستیوں کی طرف سے اس کی بھرپور تائید بھی ملی — میں نے کئی بار عرض کیا ہے اور آج پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں اور اس میں مجھے ہرگز باک نہیں ہے — میرے نزدیک چودھویں صدی ہجری کی دو عظیم ترین شخصیتیں گزری ہیں۔ نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی حد تک بلکہ میرے اندازے کے مطابق پورے عالمِ اسلامی کی حد تک — ان میں سے ایک علامہ اقبال ہیں، جو سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم سے نکل کر آئے جنھوں نے قدیم و جدید مکاتیبِ فکر کا معروضی مطالعہ کیا

چنانچہ اسی لئے انھوں نے کہا ہے۔ ؎

عذاب دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں　　کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

اور دوسری شخصیت ہیں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمود الحسن دیوبندی ــــ جو دارالعلوم کی فضا سے نکلے تھے اور جو علمائے حقانی کے صحبت یافتہ اور فیض یافتہ تھے ــــ یہ ہیں میرے نزدیک دو عظیم ترین شخصیتیں۔ ان میں سے میں حضرت شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کو چودھویں صدی کا مجدد مانتا ہوں۔ ان دونوں کی طرف سے مجھے تائید ملی۔ علامہ اقبال کے اشعار بارہا آپ کے سامنے میں نے پیش کئے ہیں، مثلاً ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

معلوم ہوا کہ ہمارے سامنے تجدید و احیائے دین کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم قرآنِ حکیم کی طرف رجوع کریں۔ چنانچہ علامہ نے کتنے پُرتاثیر اسلوب سے کہا ہے۔ ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی　　شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ　　در بغل داری کتابِ زندۂ

امتِ مسلمہ کے زوال کا سبب قرآن سے دوری و مہجوری ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ اس کتابِ زندہ پر عمل پیرا ہو جو وہ بغل میں دبائے بیٹھا ہے یا اسے پیٹھ پیچھے ڈال رکھا ہے۔ یہی عصائے موسیٰ ہے جو ہمارے پاس ہے۔ بلکہ میں بلا ارادہ تنقیص یہ عرض کروں کہ عصائے موسویؑ کی قرآن کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ چونکہ عصائے موسیٰؑ کی معجز نمائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رخصت ہوئی جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا معجزہ قرآن مجید آج بھی زندہ ہے اور تاقیامِ قیامت زندہ و پائندہ رہے گا۔ اس کا یہ چیلنج جو چودہ صدی قبل دیا گیا تھا، قیامِ قیامت تک قائم و باقی رہے گا: وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ۔

علامہ اقبال کی ملّی و خالص اسلامی و ولولہ انگیز شاعری سے تو میں زمانہ طالب علمی ہی سے روشناس

---

[1] محترم ڈاکٹر صاحب کی مشہور تالیف "علامہ اقبال اور ہم" میں ایک مستقل باب "اقبال اور قرآن" کے عنوان سے شامل ہے جس میں علامہ نے قرآن حکیم کے بارے میں جن جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے اس سے متعلق اکثر اردو اور فارسی کے اشعار شامل ہیں (مرتب)

تھا۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب وہ ۱۹۲۰ء میں اسارت مالٹا سے رہائی پاکر وطن واپس آتے ——— انگریزوں نے حضرت کو اس وقت چھوڑا تھا جب وہ ٹی بی کی تھرڈ اسٹیج کو پہنچ چکے تھے، ورنہ وہ اس مردِ حق پرست کو کب چھوڑنے والا تھا۔ تو حضرت شیخ الہندؒ نے دارالعلوم دیوبند میں ایک عظیم بات ارشاد فرمائی۔ یہ عظیم بات روایت کی ہے مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم نے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرما تھے علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا، اس وقت فرمایا کہ "ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں"۔ یہ الفاظ سُن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسّی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں؟ (حضرت شیخ الہندؒ نے) فرمایا:

> "میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہورہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوتے، ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی میں قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے"۔"

یہ عوامی درسِ قرآن کا لفظ ہم تک نہ پہنچتا اگر مولانا مفتی محمد شفیعؒ اس کو بیان نہ کرتے ان کا حافظہ بڑا قوی تھا۔ وہ پاکستان کے مفتی اعظم تھے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۲۰ء میں یہ لفظ "عوامی" استعمال فرمایا جب کہ یہ لفظ عوام وخواص میں سے کسی کی زبان پر آیا نہیں تھا۔ جیسا کہ 'عوامی' کا لفظ ہمارے دور میں عام ہوگیا ہے۔ لیکن آج سے قریباً چونسٹھ "۶۴" برس قبل "عوامی درسِ قرآن" کا لفظ حضرت شیخ الہند نے استعمال کیا۔ یہ بھی ان کی دور بینی اور دور اندیشی کی دلیل ہے ——— GENIUS اُسی کو کہتے ہیں جو مدت بعد کے حالات کو دیکھ رہا ہو۔

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ الہندؒ کی اس بات پر بڑا خوبصورت اور بڑا موزوں تبصرہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث و آفات سے دوچار ہیں، اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے، قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا۔ غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو یہ خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی"

واقعتہً حضرت شیخ الہندؒ اور مفتی محمد شفیعؒ کے خیالات و آراء سے مجھے بڑی تقویت ملی کہ میں نے اپنے غور و فکر اور سوچ بچار کے نتیجے اور تحت الشعور میں علامہ اقبال کی ولولہ انگیز اسلامی شاعری کے تاثر کی بدولت دعوت رجوع الی القرآن کا جو کام شروع کر رکھا ہے اس کی تائید استاذ الاساتذہ شیخ الشیوخ اور میری رائے کی حد تک چودھویں صدی کے مجدد نیز مفتی اعظم پاکستان کی آراء سے حاصل ہو گئی۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّة۔

ایک طرف تو صورتِ حال یہ تھی، دوسری طرف مجھے شروع ہی سے ایک دوسرے تجربے سے مسلسل سابقہ پیش آتا رہا۔ مجھے یہ کام کرتے ہوئے تقریباً بیس سال ہونے کو آتے اور میں نے اس کا آغاز اسی آپ کے شہر لاہور سے کیا تھا۔ میں بحمد اللہ اسی کام میں مسلسل لگا ہوا ہوں۔ میں نے تو بہرحال اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ تجربہ یہ ہوا کہ جیسے جیسے کام اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید سے آگے بڑھنا شروع ہوا تو ویسے ویسے چند علماء کی طرف سے کچھ مخالفت بھی شروع ہو گئی۔ ان کی جانب سے کچھ اندیشوں کچھ خطروں کا اظہار ہونے لگا کہ یہ دعوت کیا ہے! کہیں قرآن کا نام لے کر کوئی نیا فتنہ تو نہیں اٹھ رہا! میں حیران ہوتا تھا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ پھر یہ کہ مخالفت صرف ایسے علماء کی طرف سے نہیں تھی کہ جن کے بارے میں لوگوں کی رائے اچھی نہ ہو بلکہ ثقہ علماء، وہ جن کا میرے اپنے دل میں بھی بڑا احترام ہے۔ جن کے ساتھ میرا حسنِ عقیدت کا معاملہ ہے، میں نے محسوس کیا کہ سب کے سب کچھ الرجک (ALLERGIC) ہیں، قرآن کے نام کی دعوت سے بہت گھبراتے ہیں۔ انہیں کچھ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ قرآن، قرآن، قرآن کا جو لفظ لیا جا رہا ہے تو کہیں یہ انکار سنت والی بات نہ ہو جائے۔ کہیں حدیث کا انکار تو کرنے نہیں چلے —— تو اس طرح کا کچھ تجربہ مسلسل ہوا اور یہ میرے لئے ایک پریشانی کا موجب

تو رہا لیکن میں بحمد اللہ کام میں لگا رہا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مزاج کچھ ایسا دیا ہے اور آج سے نہیں بلکہ بچپن سے دیا ہے کہ جو بات حق معلوم ہو، اس پر ڈٹے رہو ——— میری عمر چوبیس برس کی تھی، جب میں نے جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع منعقدہ ماچھی گوٹھ میں کھڑے ہو کر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم سے جماعت کے انقلابی طریقہ کار کو چھوڑ کر انتخابی طریق کار اختیار کرنے کی پالیسی سے ڈٹ کر اختلاف کیا تھا۔ مولانا مرحوم میرے والد کی عمر کے تھے، پھر میرے محسن بھی تھے۔ کہ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے مجھے دین کا صحیح مفہوم اور ایک مسلمان کی دینی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہوا تھا۔ جس پر محکم یقین مطالعہ قرآن سے حاصل ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک مزاج دیا ہے کہ جو بات سمجھ میں آتی ہے اس کا برملا اظہار کیا جاتے۔ لہٰذا مولانا مودودی مرحوم کی انتخابی سیاست کے موقف پر میں نے جماعت اسلامی کا رکن رہتے ہوتے اپنا اختلافی موقف دلائل کے ساتھ تحریری شکل میں بھی پیش کیا اور ماچھی گوٹھ میں اسٹیج پر کھڑے ہو کر بھی ——— اگر کوئی دلیل سے میری رائے اور میرے موقف کو غلط ثابت کر دے تب تو میں فوراً ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوتا ہوں اور اپنی غلطی تسلیم کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا لیکن اگر کوئی اسے دلیل سے غلط ثابت نہیں کرتا تو مجھے اس کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی کہ میری بات کی کون مخالفت کر رہا ہے۔ کسے باشد۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے یہ مزاج دیا ہے۔ میں نے جہاں تک اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کی گہرائی میں جا کر ٹٹولا ہے PROBE کیا ہے تو میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ الحمد للہ ثم الحمد للہ مجھ میں انانیت اور عجب نہیں ہے اور میں شعوری طور پر اپنے رب سے پناہ طلب کرتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے اس روگ سے محفوظ رکھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق عجب مہلکات میں سے سب سے زیادہ مہلک اور شدید مرض ہے۔

اس اعتبار سے میرا جو مزاج ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں مسلسل یہ سوچتا تو ضرور رہا کہ آخر علماء کرام کو یہ الرجی کیوں ہے! وہ کیوں بدظن ہیں! کیوں ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ کچھ اندیشے اور خدشات محسوس کرنے لگتے ہیں؟ لیکن چونکہ کوئی ٹھوس بات سامنے نہیں آئی تو میں اپنی دھن میں لگا رہا۔ کام میں، میں نے قطعاً کوئی ڈھیل نہیں آنے دی۔ لیکن مجھے پچھلے سال کے دوران اس معمے کا حل مل گیا اور علماء کرام کے طرزِ عمل اور رویّہ کا سبب میری سمجھ میں آگیا۔

لہ یہ بیان "تحریک جماعت اسلامی ـــ ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے مطبوعہ موجود ہے (مرتب)

ہمارے علماء کی طرف سے بالخصوص ان کی طرف سے جن کا ہمارے قدیم دینی حلقوں سے تعلق ہے، جن اندیشوں اور خدشات کا اظہار ہوتا ہے، اصل میں اس کا سبب ان کا ایک طویل تجربہ ہے۔ وہ تجربہ یہ ہے کہ ماضی بعید و قریب میں مسلمانوں میں جتنی بھی گمراہ تحریکیں اٹھیں، وہ سب قرآن کا نام لے کر اٹھیں۔ چکڑالویت اٹھی قرآن کے نام پر —— اسی طریقہ سے پرویزیت اٹھی قرآن کے نام پر —— اور تو اور قادیانیت اٹھی قرآن کے نام پر۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے کام کی ابتداء قرآن کی عظمت کے بیان سے کی۔ ان گمراہ تحریکوں کی تکنیک (Technique) اور طریق کار (METHODOLOGY) کو میں آگے چل کر قدرے تفصیل سے ذکر کروں گا ——

ان سب سے پہلے بہت سی گمراہیوں کا سر سید احمد خاں نے آغاز کیا قرآن کے نام پر —— تو معلوم ہوا کہ پے بہ پے اتنے چرکے لگے ہیں اور علماء کو ایسے غلط تجربات ہوتے ہیں کہ جیسے ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے کہ "دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے"! یا ایک دوسری کہاوت ہے کہ "جو سانپ سے ڈسا ہو وہ رسی سے ڈرتا ہے"! یہی انداز اب ہو گیا ہے اور ایک عقدۂ لاینحل بن گیا ہے کہ ہمارے دینی حلقوں کا یہ مزاج ہے کہ قرآن کے نام پر اٹھنے والی کسی بھی دعوت اور تحریک کے بارے میں ان کو فوراً ایک خطرہ، ایک اندیشہ اور ایک سوءِ ظن لاحق ہو جاتا ہے اور ان کی جانب سے خدشات کا برملا اظہار ہونے لگتا ہے جو مخالفت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ سابقہ غلط تجربات کی بنیاد پر ان کا اس قدر الرجک ہو جانا بڑی حد تک قابلِ فہم ہے۔

علمائے کرام کے بارے میں، میں یہ بات صاف صاف عرض کرتا ہوں کہ ان حضرات کا احترام ملحوظ رکھنے اور ان سے حسنِ عقیدت رکھنے کے باوصف میں ان کے بارے میں نہ خود کسی غلو اور افراط و تفریط میں مبتلا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات مبتلا ہوں۔ ہمارے یہاں جو علماء پائے جاتے ہیں، ان میں علمائے حق بھی ہیں اور علمائے سوء بھی۔ علمائے سوء سے کوئی زمانہ کبھی خالی نہیں رہا۔ علمائے سوء اس زمانے میں بھی سرکار دربار سے بھی متعلق رہے اور عوام الناس سے بھی جو زمانہ ہمارے دور سے کئی اعتبارات سے کہیں بہتر تھا۔ دنیاداری اور اصحاب اختیار و اقتدار کی خوشنودی کے حصول کا معاملہ بہرحال ہر دور میں رہا ہے —— امام دارالہجرہ امام مالک کی جب مشکیں کس کر، منہ پر سیاہی مل کر گدھے پر سوار کر کے مدینہ کی گلیوں میں گھمایا گیا تھا جب امام اعظم امام ابوحنیفہ کو جیل میں ڈالا گیا تھا، جب امام شافعی کے لئے بار بار شہر بدر ہونے کے احکام جاری ہوتے رہتے

تھے، جب امام احمد بن حنبل کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی اور وہ مار سہنی پڑی تھی کہ اگر ہاتھی کو بھی اس طرح مارا جائے تو وہ بھی بلبلا اٹھے، جب امام ابن تیمیہ کو جیل میں ڈالا گیا، وہیں انھوں نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی، جب مجدد الف ثانی سید احمد سرہندی کو قید کیا گیا، اور جب چند خوانین سرحد نے بیعت قبول کرنے کے باوصف بھی غازی و مجاہد سید احمد بریلوی سے غداری کی، رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ تو کیا آپ کے خیال میں ان تمام افعال کی پشت پر علمائے سوء کے فتاویٰ موجود نہیں تھے جو وقت کے صاحبانِ اقتدار و اختیار کی خوشنودی کے لئے دیئے گئے تھے! ـــــ تو دنیا داری اور فتویٰ فروش علمائے سوء ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ ہمارا زمانہ تو ظاہر بات ہے کہ فتنہ کے اعتبار سے اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو پیشگی متنبہ فرما دیا تھا کہ یوشک ان یأتی علی الناس زمان: "اندیشہ ہے کہ لوگوں کو ایک ایسے زمانے اور دور سے سابقہ پیش آئے گا": لا یبقی من الاسلام الا اسمہ: "اسلام پر عمل ختم ہو جائے گا صرف اس کا نام رہ جائے گا" ولا یبقی من القرآن الا رسمہ: "اور قرآن پر عمل ترک ہو جائے گا، اس کی بطور رسم تلاوت باقی رہ جائے گی" مساجدھم عامرۃ وھی خرابٌ من الھدیٰ "مسلمانوں کی مسجدیں (بظاہر) آباد ہوں گی لیکن (بباطن) ویران اور (حقیقی) ہدایت سے خالی ہوں گی": علماءھم شر من تحت ادیم السماء من عندھم تخرج الفتنۃ وفیھم تعود ـــــ حدیث کا یہ حصہ میری آج کی تقریر سے متعلق ہے۔ حضورؐ نے خبر دی کہ آسمان کے نیچے مسلمانوں کی بدترین مخلوق علماء ہوں گے، سارے فتنے ان ہی میں سے اٹھیں گے اور ان ہی میں لوٹ جائیں گے" اس اعتبار سے ہمارے یہاں علمائے سوء بھی ہیں اور کثرت سے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں یہ انتباہ فرمایا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا وہاں یہ بشارت بھی دی کہ علمائے حقانی سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہے گا۔ یہ ضمانت دی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: لا تزال طائفۃ من امتی قائمین علی الحق "میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ حق پر قائم رہے گا" ظاہر بات ہے کہ علمائے حق کے بغیر دین کا کوئی تصور ہی نہیں، لہٰذا ہر دور، ہر زمان، ہر مکان میں علمائے حقانی بھی لازماً موجود رہیں گے۔ پس یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ پر ہیں، جہاں تک علمائے سوء کا معاملہ ہے، فتویٰ فروش مولوی ہوں یا اسی طرح کے جو گھٹیا کردار کے لوگ ہمارے معاشرے میں موجود ہیں، ان کی باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اگر علمائے حق کی طرف سے تشویش کا اظہار ہو، اگر انھیں بھی خطرات و خدشات اور اندیشے محسوس ہوا

نو یقیناً قابلِ غور مسئلہ ہے۔ ان علمارِ حق کی تشویش اگر وہ شخص نظر انداز کر دے گا جو خادمِ دین ہو، خادمِ قرآن ہو، خادمِ ملت ہو تو وہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارے گا کسی اور کا نقصان نہیں کرے گا آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ پچھلے جمعہ میں نے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے ہم خیال دس بیس یا سو پچاس پیدا کر کے دنیا سے چلا جاتے تو یہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس میں ذرا سی ذہانت ہو اصلاحیت ہو۔ کچھ نہ کچھ لوگ اُسے مل جائیں گے جو اس کے حواریین بن جائیں گے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پیشِ نظر یہ ہے کہ دین کی ایک ہمہ گیر دعوت اٹھا کر اقامتِ دین اور اسلامی انقلاب کے لئے جدوجہد کرے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی کودن اور احمق ہی شخص ہو گا جو یہ سمجھتا اور توقع رکھتا ہے کہ علمائے حق کی اشیر باد کے بغیر، علمائے حقانی کی تائید و تعاون کے بغیر، ان اہالیان علم و فضل، ان متقیانِ دین کی دعاؤں کے بغیر کوئی ایسی تحریک پروان چڑھ سکے اور نتیجہ خیز ہو سکے۔ ایسے شخص کے لئے اگر وہ مخلص ہے ان علمائے حقانی کا اعتماد حاصل کرنا لازم ہے۔ میں اس مسئلہ پر برابر اور مسلسل غور کرتا رہا کہ آخر کیا بات ہے کہ جن حضراتِ گرامی کو میں علمائے حق گردانتا ہوں، جن سے حسنِ عقیدت رکھتا ہوں، مجھے ان کا تعاون حاصل کیوں نہیں ہو رہا۔ بلکہ دبی دبی زبان سے اور کبھی برملا ان کی طرف سے اختلاف کا اظہار ہو رہا ہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے میری رہنمائی فرمائی اور یہ عقدہ کھل گیا کہ ان علمائے حقانی کے خدشات کا سبب وہ گمراہ کن نظریات اور تحریکیں ہیں جو اس برصغیر پاک و ہند میں قریباً ایک صدی کے دوران وقتاً فوقتاً قرآن کے نام پر اٹھتی رہی ہیں۔ میں ان کی طرف ابتدا میں اشارہ کر چکا ہوں، اب میں قدرے تفصیل سے ان کے متعلق کچھ باتیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں کی نام نہاد حکومت بالکل ختم ہو گئی اور برصغیر پاک و ہند پر سیاسی اعتبار سے حکومت برطانیہ کا تسلط و استیلاء کامل طور پر ہو گیا تو غلامی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک یہ نوتے سال کا دور ہے۔ اس دور میں قرآن کے حوالے سے جو سب سے پہلی زوردار آواز اٹھی ہے، وہ سر سید احمد خاں کی ہے۔ پندرہ پاروں کی انہوں نے تفسیر بھی لکھی۔ انہوں نے ایسے ایسے فتنے اٹھا دیئے کہ حد و بس ہے۔ جنات کا انکار، فرشتوں کا انکار، وحی کا قریباً انکار ۔۔۔ ان سب کی ایسی توجیہہ و تاویل جو سراسر قرآن کے خلاف تھی۔ ظاہر بات ہے کہ کھلم کھلا انکار تو کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے جنات کا برملا انکار نہیں کیا لیکن یہ کہا کہ قرآن نے مشتعل مزاج اور اجڈ قسم کے لوگوں کو جن سے تعبیر کیا ہے، وہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں ہے۔ فرشتوں کا بھی برملا انکار نہیں کیا۔ کہا تو یہ کہا کہ یہ جو FORCES OF THE NATURE ہیں، قواتے

طبعیہ ہیں ان کو فرشتے کہا گیا ہے۔ ان کا کوئی علیحدہ وجود نہیں، وہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں، ان کا علیحدہ کوئی تشخص نہیں۔ معجزات کا انکار۔ ان کی یہ تاویل کی گئی کہ یہ بھی PHYSICAL PHENOMENA تھے۔ طبعیات کے عجیب و غریب اور غیر معمولی مظاہر تھے، ان کو خواہ مخواہ معجزات سمجھ لیا گیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر سمندر سے نکل گئے اور فرعون کا لشکر غرق ہو گیا تو یہ مد و جزر کا کرشمہ تھا۔ سمندر مد پر آ گیا جب کہ فرعون اپنے لشکر کو لے کر سمندر میں اترا تھا اور جزر کی کیفیت میں حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے ساتھ نکل گئے۔ گویا اپنے دور کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ مصری قوم مد و جزر سے ناواقف تھی۔ ایسی گمراہ کن تاویلات ہیں جو سر سید احمد خاں نے کیں۔ کھلم کھلا انکار کسی چیز کا نہیں کیا، ان کی پیدا کردہ گمراہیوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ ان سب کا بیان اس وقت ممکن نہیں ہے۔ میں نے اس موضوع پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جو میری کتاب "اسلام اور پاکستان" میں شامل ہے۔ اسی مضمون میں میں نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب "اسلام" میں وحی کے بارے میں جو گمراہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے بقول قرآن سارے کا سارا ایک وقت خدا کا کلام بھی ہے اور کلام رسول بھی، وحی ایک چشمہ کے مانند قلب محمدیؐ میں پھوٹا تھا۔ تو اس کے بارے میں نے لکھا تھا کہ اس گمراہی کا آغاز کرنے والے تو سر سید احمد خان ہیں۔ یہ گمراہی تو نہ معلوم کتنی جگہ انڈے بچے دے چکی ہے۔ چنانچہ سر سید اس کے قائل نہیں تھے کہ جبریل امینؑ وحی لے کر نازل ہوتے تھے اس طرح تو فرشتوں کا تشخص تسلیم کرنا پڑتا جس کے وہ انکاری تھے۔ چنانچہ ان کا شعر ہے۔ ؎

ز جبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم

ان گمراہ کن تاویلات کے باوجود ایک اچھی بات سر سید احمد خاں کے حق میں جاتی ہے اور یہ کہ اگرچہ انہوں نے اپنی تفسیر میں یہ باتیں کہیں، لیکن نہ تو انہوں نے کوئی دینی جماعت بنائی نہ کسی دینی فرقہ کا انہوں نے آغاز کیا۔ وہ اصل میں مشہور و معروف ہوتے ایک سماجی مصلح SOCIAL REFORMER اور مسلمانوں کے ایک قومی لیڈر کی حیثیت سے۔ چونکہ ان کا دینی معاملہ صرف نظریات کی حد تک رہا۔ انہوں نے ان کی بنیاد پر کوئی تنظیم قائم نہیں کی۔ کوئی جماعت نہیں بنائی لہٰذا اس نے ایک فتنہ کی شکل اختیار نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام نے ان کا زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ پھر دوسرے اعتبارات سے ان کے احسانات بھی مسلمانان ہند پر ہیں۔ لہٰذا ان کے معاملہ میں کسی نہ کسی حد تک نرمی کا معاملہ کیا جاتا رہا۔

لیکن اس کے پہلو بہ پہلو جو ایک بڑا فتنہ اٹھا اس کا بانی تھا مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی۔

اس نے اپنی تحریک قرآن کے نام پر اٹھائی اور قرآن کے نام پر بات شروع کی۔ میں اس کے ابتدائی دور کے دو شعر آپ کو سناتا ہوں جس سے معلوم ہو گا کہ شروع شروع میں اس نے اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لئے کس طرح خدمتِ قرآن کا لبادہ اوڑھا۔ اس کا ایک شعر ہے۔ ؎

جمال وحسن قرآں نورِ جان ہر مسلماں ہے　　قمر ہے چاند اوروں کا ہمارا چاند قرآں ہے

دوسرا شعر ہے۔ ؎

اے بے خبر بخدمتِ قرآں کمر بہ بند　　زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند[1]

" اے بے خبر مسلمان قرآن کی خدمت کے لئے کمر کس لو، تیار ہو جاؤ اس سے پہلے کہ آواز لگائی جائے کہ فلاں شخص اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یعنی موت سے پہلے پہلے جو فرصت مہیا ہے اُسے قرآن کی خدمت کے لئے لگا دو"۔ اب آپ اس سے اندازہ کیجئے کہ اس کی تکنیک کیا تھی۔ پھر اس نے آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں سے بڑے کامیاب مناظرے کئے۔ ان سب کا سراغ آپ کو اس کے ابتدائی لٹریچر میں مل جائے گا۔ لیکن پھر ہوا کیا! اس شخص نے اپنا اعتماد پیدا کر کے وہ گمراہی پھیلائی جو سرطان کی طرح جسدِ ملّی سے چمٹ گئی۔ جب لوگوں کا کثیر تعداد میں اس کی طرف رجوع ہوا عقیدتمندوں کی ایک معتد بہ تعداد اس کے گرد جمع ہو گئی تو اس کے دماغ کے اصل خنّاس نے ظہور شروع کیا، شیطان نے پیٹھ ٹھونکی اور سبز باغ دکھانے شروع کئے تو اس نے دعووں کا پے در پے آغاز کر دیا۔ کہیں مجدّد ہونے کا دعویٰ، کہیں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ، اس سے آگے بڑھ کر ظلّی اور بروزی نبی ہونے کا دعویٰ اور بالآخر صاحب وحی نبی ہونے کا دعویٰ۔ اور نہ معلوم اس نے کیا کیا دعاوی کئے ہیں۔ ہمارے "ماہنامہ میثاق" میں قسط وار ایک طویل مضمون چھپتا رہا ہے اور بھی ملک میں بعض علمائے کرام اور اہل قلم نے اس کے لٹریچر سے اس کی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی تصویر پیش کی ہے۔ ان کو پڑھ کر انسان حیران ہوتا ہے کہ ان تحریروں کا لکھنے والا شخص صحیح العقل انسان بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کجا یہ کہ اسے نبی مان لیا جائے۔ مزید حیرانی اس وقت ہوتی ہے کہ جب نظر آتا ہے کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ اس کے پیچھے لگ گئے، اس پر بحیثیت نبی ایمان لے آئے۔ ان میں سے کوئی انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کا جج رہا ہے، کوئی نوبل پرائز ہولڈر ہے۔ اس کی بڑی وجہ جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ انگریزی سرکار کی سرپرستی مرزا غلام احمد کو حاصل ہو گئی تھی لہذا

---

[1] دوسرا مصرعہ دراصل شیخ سعدیؒ کا ہے (مرتب)

اس کے متبعین کو حکومت کی طرف سے بڑی مراعات ملیں، ان کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مواقع حاصل ہوتے، سرکاری ملازمتوں اور منصبوں پر وہ فائز ہوتے رہے۔ اس طرح مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان لانا دنیوی ترقی اور انگریزی دورِ حکومت میں اثر ورسوخ نیز اعلیٰ ملازمتوں کے حصول کا ذریعہ بن گیا ـــــ بہرحال یہ دوسرا بڑا چرکہ مسلمانوں کو لگا اور ابتداً یہ فتنہ دعوتِ قرآن کا نام لیکر اٹھا اور آگے بڑھا۔

پھر ہمارے دور میں غلام احمد پرویز ایں جہانی نے جو گمراہی پھیلائی اور جو مسلسل پھیل رہی ہے وہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ چکڑالویت ہو، پرویزیت ہو اور دوسرے منکرین سنت کے جو ہیں ان کا تو سارے کا سارا اوڑھنا بچھونا قرآن کا نام ہے قرآنی نظام ربوبیت کے نام سے [illegible] نظریۂ اشتراکیت اور الحاد کے علمبردار ہیں۔ ان کے نزدیک معاذ اللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف اپنے دور کی حد تک واجب الاطاعت تھے وہ بھی "مرکزِ ملت" کی حیثیت سے نہ کہ رسول کی حیثیت سے۔ رسول کی حیثیت سے تو بس ان کا کام قرآن کو پہنچانا اور حالات وظروف کے مطابق اس کی عملی تعبیر (INTERPRETATION) کرنا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کا جو نظام دنیا کو دیا تھا، جس کا کامل ظہور خلافت راشدہ کے دورِ سعید میں ہوا، ان منکرین حدیث وسنت کے نزدیک وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اپنے دور کا ہر "مرکزِ ملت" قرآن سے اصول لے کر شریعت کا نظام رائج کرنے کا مطلقاً مختار و مجاز ہے۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ، صوم و حج کو وہ مستقل ارکانِ اسلام تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کی رائے میں احوال وظروف کے مطابق ان میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے اور لازماً ہونا چاہیئے۔ یہ گمراہ کن پوری تحریک قرآن کے نام پر اٹھی اور اسی نام پر وہ ہمارے معاشرے میں گمراہی پھیلا رہی ہے۔

ہمارے علمائے حق کو پے بہ پے یہ جو چرکے لگے ہیں اور تجربات ہوتے ہیں، ان کی وجہ سے جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے اور سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے ـــ یہ ہے اصل سبب جس کی وجہ سے یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ ہمارے ہاں جو فقہی مسالک ہیں اور علمائے کرام کے جو حلقے ہیں ان میں سے جو علمائے حق ہیں وہ بہت ہی متردد اور فکرمند ہو جاتے ہیں کہ قرآن کا نام لے کر کچھ لوگ آگے آ رہے ہیں ـــــ میں نے آغاز میں جن آیات کی تلاوت کی ہے ان میں سورہ البقرہ کی آیت ۲۶ بھی پڑھی ہے۔ جس میں یہ الفاظ آتے ہیں، یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ قرآن ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور

بہتوں کو اسی قرآن کے ذریعہ ہدایت دیتا ہے۔ اصل میں فیصلہ کن چیز ہوتی ہے انسان کی اپنی باطنی کیفیت۔ اگر کسی شخص میں عجب ہے، تکبر ہے، استکبار ہے، شہرت و وجاہت طلبی ہے، کچھ بننے کی آرزو ہے، اپنی عقل و فہم پر اعتماد میں غلو ہے، اپنی بڑائی اور انفرادیت کے اظہار کی خواہش اور شوق ہے، وہ کسی پندار اور گھمنڈ میں مبتلا ہے اور اس کا چاہے صبح و شام قرآن مجید سے کتنا ہی اعتنا ہو اور کتنا ہی تعلق ہو، ایسا شخص آج نہیں تو کل خود بھی فتنے میں مبتلا ہوگا اور بہتوں کو فتنے میں مبتلا کرنے کا باعث بن جائے گا۔ لیکن اگر اس کی طبیعت میں خلوص و اخلاص ہے، تواضع ہے، انکسار ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں قرآن کی جو خدمت کر رہا ہوں وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے کر پا رہا ہوں۔ اس میں میرے کسی ذاتی کمال کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر یہ انداز ہوگا تو انشاء اللہ العزیز قرآن مجید اپنی ہدایت اس پر روشن کرتا چلا جائے گا۔

اب اس ضمن میں ایک اہم بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اصل METHODOLOGY کیا ہوتی ہے۔ ان تمام گمراہ فرقوں اور تحریکوں کا طریق کار (METHODOLOGY) یہ ہے، اور یہ سب میں مشترک وصف ہے — اور میں اس وقت اس کو اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ پھر ملاقات ہوتی ہے یا نہیں یا امیر مینائی کے اس شعر کے مصداق ؎

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے ۔۔۔ پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ پر میں اپنے غور و فکر کے نتائج اور اپنے خیالات وضاحت سے آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں، وہ METHODOLOGY یہ ہوتی ہے، طریق کار یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک آدھ مسئلہ کو پکڑ کر جو امت میں متفق علیہ رہا ہے، مجمع علیہ رہا ہے۔ تمام فقہائے کرام، تمام محدثین عظام، تمام علمائے حقانی، تمام مفسرین کرام سب کے سب اس مسئلہ کو مانتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن اس ایک مسئلہ کو اٹھا کر لوگوں کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیجئے کہ یہ بات غلط ہے اس ایک تیر سے کتنے شکار ہو گئے! اگر آپ نے اس متفق علیہ مسئلہ کے بارے میں لوگوں کو بدظن کر دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ذہن و قلب میں یہ بات ڈال دی بلکہ بٹھا دی کہ سارے فقہاء کودن تھے، سارے محدثین ناسمجھ تھے، سارے مفسرین بے علم تھے، سارے علماء امت بے عقل تھے اور ہیں کہ اتنی سیدھی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی، جو ہمارے ممدوح کی سمجھ میں آتی ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے کہ جو عموماً ایسے لوگوں کو تمام اکابر اسلاف سے سوءِ ظن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ لوگ یا تو اس

بے لنگر جہاز کے مانند ہیں جو لہروں کے رحم وکرم پر ہے، لہریں اس جہاز کو جدھر چاہیں لے جائیں۔ یا کٹی ہوئی پتنگ کے مواقق ہیں۔ ڈور کٹ گئی، اب پتنگ ہوا کے رحم وکرم پر ہے وہ جدھر لے جائے اب جیسے ہی اسلاف سے بدظنی پیدا ہوئی۔ شیطان کو موقع مل گیا کہ وہ گمراہی پر گمراہی کا دروازہ کھولتا چلا جائے اور ظلمات فوق ظلمات کا نقشہ جمادے ——— اس لئے کہ ان کے دلوں میں تو عظمت کا سکہ اپنے ممدوح کا بیٹھ جاتا ہے کہ جو بات خلفائے راشدین کی سمجھ میں نہیں آئی، امام ابوحنیفہ کے پلے نہیں پڑی، امام مالک کے ذہن کی جہاں تک رسائی نہیں ہوئی، امام شافعی جس کو سمجھنے سے قاصر رہے، امام احمد ابن حنبل جس کی تہہ تک پہنچ نہ پائے، رضی اللہ عنہم ورحمۃ اللہ علیہم اجمعین ——— مزید یہ کہ امت کے تمام قابل اعتماد مفسرین چاہے وہ متقدمین میں سے ہوں یا متاخرین میں سے، جس بات کے فہم سے عاری رہے، تمام علمائے حقانی کی عقل جس بات کے سمجھنے سے عاجز رہی ——— قرن اوّل سے تاایں دور جس مسئلہ میں پوری امت کا تواتر کے ساتھ اجماع رہا ہے وہ اجماع غلط رہا ہے۔ اس مسئلہ کا صحیح عقدہ تو ہمارے ممدوح عالم دین اور مفسر قرآن پر منکشف ہوا ہے۔ لہٰذا شعوری یا غیر شعوری طور پر ان معتقدین کے قلب وذہن میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ ان تمام اسلاف کا امام مطلق اور مجتہد مطلق تو ہمارا ممدوح ہی ہے۔ عقیدت مند لوگ جب اجماع امت کے خلاف ایک مسئلہ میں اپنے ممدوح کی رائے کو مان لیں تو بہت آسان ہو گیا کہ وہ جو چاہے زہر گھول دے۔ جو کڑوی گولی چاہے اپنے عقیدت مندوں کے حلق سے اتروادے ——— یہ ہے مشترک METHODOLOGY یہ ہے مشترک طریق کار۔

ان لوگوں کو معتقدین کس طرح اور کہاں سے ملتے ہیں جو اس فتنہ کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں یہ بات بھی تجزیہ طلب ہے۔ اس بارے میں اپنے غور وفکر کا نتیجہ آپ حضرات کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ عموماً وہ تعلیم یافتہ لوگ جو دین کے نہ طالب علم ہوتے ہیں نہ انھوں نے خود دین کا بنیادی طور پر مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ دنیوی تعلیم کے اعتبار سے وہ چاہے گریجویٹ ہوں، علوم جدیدہ میں سے کسی علم میں پی ایچ ڈی ہوں، کوئی قانون میں بار ایٹ لا ہو۔ کسی نے CONSTITUTIONAL LAW میں SPECIALIZATION کیا ہو وہ ملکی آئین میں درجہ تخصص رکھتا ہو۔ کسی نے سائنس اور انجینئرنگ کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کی ہوں۔ لیکن دین کے بنیادی علم سے کوئی شغف نہیں، اس کا کوئی فہم نہیں، اس معاملہ میں بالکل کورے۔ الاماشاءاللہ۔ زیادہ سے زیادہ تقلید آباء کے طور پر نماز روزے سے کچھ تعلق رہا تو رہا ورنہ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ اس طبقے کے متعلق

ایک بزرگ کہا کرتے ہیں اور بالکل صحیح کہا کرتے ہیں "پڑھے لکھے جاہل" دین کے اعتبار سے تو یہ ان پڑھ ہیں چونکہ اس طبقے میں بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ انھیں ناظرہ قرآن تک پڑھنا نہیں آتا۔ یہ طبقہ ہے جس میں سے اکثر ایسے لوگوں کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں۔ انھیں نظر آتا ہے کہ دین اور قرآن کے یہ لوگ بڑے خادم ہیں، بڑے عالم ہیں، بڑے معقول لوگ ہیں، بڑے ذہین و فطین ہیں ان کی ذہانت و فطانت کا دنیا میں لوہا مانا جا رہا ہے۔ لیکن چونکہ ان کا براہ راست دین کا اپنا مطالعہ نہیں ہوتا لہذا جس شخص کو بھی انہوں نے اس طور سے مان لیا کہ دین کی فلاں اہم بات اس کی سمجھ میں آئی ہے جو آج تک کسی اور کی سمجھ میں نہیں آئی تھی تو پھر وہ شخص ایسے لوگوں کو جدھر چاہے لے جاتے۔ پھر ایسے لوگ اندھے اور بہرے ہو کر اس کا اتباع کرتے ہیں، اس کی پیروی کرتے ہیں ـــ بغرض تفہیم میں چند مثالیں قدرے تفصیل سے پیش کرتا ہوں۔

سرسید احمد خان کا اس موقع پر میں تذکرہ نہیں کروں گا چونکہ وہ جن گمراہیوں کے بانی و مبانی تھے ان کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ ان کی ذات سے کوئی فرقہ، کوئی جماعت، کوئی تنظیم وجود میں نہیں آئی۔ انہوں نے سماجی طور پر مسلمانوں کی خدمت کو اپنے لئے عملی جولان گاہ بنایا اور ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس میدان میں انہوں نے مسلمانان برصغیر پاک و ہند کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ لہذا سرسید کی بات یہاں چھوڑ دیجیے ـــ اب آپ دیکھئے مرزا غلام احمد قادیانی نے کیا کیا۔ اس نے جب ابتدا قرآن کا نام لے کر اور آریہ سماجیوں نیز عیسائیوں سے مناظرے کر کے اپنا ایک مقام بنا لیا۔ معتدبہ افراد اس کے حلقہ ارادت و عقیدت سے وابستہ ہو گئے تو اس نے ایک مسئلہ اٹھایا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا بجسدِ شریف زندہ آسمان پر اٹھا لئے جانا اور پھر انہی حضرت ابن مریمؑ کا بجنسہٖ، بعینہٖ بنفس شریف دوبارہ آسمان سے نازل ہونا، یہ وہ مسئلہ ہے جو امت کا متفق علیہ عقیدہ ہے۔ سلف سے لے کر خلف تک اس پر پوری امت کا اجماع چلا آ رہا ہے۔ متعدد احادیث صحیحہ اس مسئلہ پر موجود ہیں۔ تمام فقہاء امتؒ جن کے علم و فضل تک آج کے دور کا انسان بیسیوں مرتبہ مر کر دوبارہ پیدا ہو جائے تو بھی نہیں پہنچ سکتا، وہ سب کے سب اس کو مانتے ہیں۔ تمام محدثین کرامؒ اس کو مانتے ہیں۔ آج تک جتنے بھی امت میں قابل اعتماد متکلمین و مفسرین پیدا ہوئے ہیں وہ تمام کے تمام اس کو مانتے ہیں۔ لیکن غلام احمد قادیانی نے "رفع و نزول مسیح" کے انکار کا مسئلہ کھڑا کر دیا چونکہ وہ دور SCIENTIFIC RATIONALISM کا دور تھا اور سائنس بھی ابھی

دور میں تھی. آئن اسٹائن کا دور شروع نہیں ہوا تھا. لہٰذا اس زمانے میں یہ (NEWTONIAN)
بات ایک انگریزی دان اور عقلیت زدہ شخص کے لئے بڑی عجیب سی تھی کہ ایک زندہ انسان کیسے
آسمان پر اٹھایا جاسکتا ہے! پھر وہ کیسے آسمان سے نازل ہوگا. اس نے اس مسئلہ کو ہوا دی.
تعلیم یافتہ لوگوں کو تو یہ مغالطہ دیا اور عوام کو اس دلیل سے فریب دیا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سید المرسلین ہیں، افضل الرسل ہیں. تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضورؐ تو انتقال فرما جائیں
اور آپ کا جسدِ اطہر لحد میں زیر زمین دفن ہو، اور حضرت مسیح اس خاکی جسم کے ساتھ آسمان پر زندہ ہوں
اس طرح تو حضرت مسیحؑ ہمارے رسولؐ سے افضل قرار پاتے ہیں. حضرت مسیحؑ کو ان کے حواریوں نے
انہیں صلیب سے اتار لیا تھا وہ زندہ تھے. خفیہ طور پر ان کا علاج و معالجہ ہوا. پھر وہ چھپتے چھپاتے
بیت المقدس سے نکل گئے اور کشمیر میں آکر آباد ہوئے، وہیں طبعی موت مرے اور دفن ہوتے. ہمارے
مولویوں نے اس بات کو نہیں سمجھا اور غلط تاویلات کرتے رہے. چنانچہ اس مسئلہ کو اس نے
خوب ہوا دی اور اس کے ذریعہ سے اس نے اپنے معتقدین کو سلف سے کاٹ دیا. جب وہ لنگر کٹ
گیا، ڈور کٹ گئی تو اب وہ ہوا کے رحم و کرم پر ہیں، جس طرف چاہو ان کو لے جاؤ اور جو چاہو ان سے
منوالو. اس لئے کہ معلوم ہوا کہ سب سے بڑھ کر عالم تو یہ ہے. اب اس نے بتدریج دعاوی شروع
کئے. اس نے کہا کہ احادیث میں جس مسیح کے آنے کی خبر ہے وہ بذاتہٖ مسیح نہیں بلکہ مثیلِ مسیح کی
ہے اور وہ مسیح موعود اور مثیلِ مسیح میں ہوں. نوبت بایں جا رسید کہ پھر وہ صاحب وحی نبی بن بیٹھا
اور اپنے ہزاروں ماننے والے اپنے گرد جمع کر لئے اور بہت سی خلق خدا کی گمراہی کا سبب بن گیا.

اسی طریقہ کو غلام احمد پرویز نے استعمال کیا. لونڈی غلاموں کا مسئلہ اٹھا دیا، یتیم پوتے کی وراثت
کا مسئلہ اٹھا دیا، قتل مرتد کا مسئلہ کھڑا کر دیا. تعدّدِ ازدواج کا مسئلہ کھڑا کر دیا. یہ وہ مسائل ہیں جو
قرن اوّل سے تا امروز متفق علیہ رہے ہیں. اہل سنت کے تمام فقہی مکاتب کا ان پر اجماع ہے. یتیم
پوتے کی وراثت کا مسئلہ بڑا احساس (TOUCHY) ہے. اس نے بڑے PATHETIC انداز
میں اس مسئلہ میں رقت آمیزی (PATHOS) پیدا کی اور اپنے زورِ قلم سے یتیم پوتے کے لئے
ہمدردیاں حاصل کیں. اس طرح قرآن کے نام پر ان تمام متفق علیہ مسائل کے خلاف ایک محاذ بنا کر بہت
سے لوگوں کو اس نے انکارِ حدیث و سنت کی ضلالت میں مبتلا کر دیا. حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ بھی
شریعتِ اسلامی کی الف، با، تا بھی جانتے ہیں، وہ اس کی بنیادوں کو جانتے ہیں، اس کے دلائل کو
جانتے ہیں. لیکن ہمارے معاشرے کے پڑھے لکھے جاہل تو ایک کھلی چراگاہ ہیں اور ایک ایسا میدان

موجود ہے کہ کوئی بھی ذہین انسان اپنی انشاء پردازی اور اپنے خاص اسلوب نگارش کو کام میں لے کر دھواں دھار کتابیں لکھے اور اس طبقے میں سے کثیر تعداد میں لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لے ایک جمعیت فراہم کر لے۔ اب خود سوچئے کہ جو لوگ قائل ہو گئے ان کے اذہان پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ میں ہلکے سے ہلکے انداز میں یہ تاثرات بیان کروں تو وہ یہ ہوں گے کہ ہمارے ائمہ کرام، ہمارے فقہائے عظام، ہمارے لائق احترام محدثین، مفسرین اور علماء بڑے بھولے بھالے تھے کہ ان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں۔ ان کی حقیقت منکشف ہوئی ہے تو اس شخص پر ہوئی ہے۔ یہ ہے وہ METHODOLOGY جس سے قرآن کے نام پر اٹھنے والی دعوتوں اور تحریکوں نے منفی انداز اختیار کیا۔ لوگوں کو اسلاف سے بدظن کر دیا اور ان کا حال کٹی ہوئی پتنگ کا سا ہو گیا کہ ہوا جدھر چاہے اس کو لے جائے۔

میرے لئے اس معاملہ میں بہت بڑی تشویش والی بات ہو گئی تھی۔ وہ یہ کہ ایک بزرگ جن سے میرا بھی طویل عرصہ تک قریبی تعلق و رابطہ رہا ہے۔ میں نے ان کی خدمت بھی کی ہے اور ان کے فکر کی بھی۔ میں نے ان کی کتابوں کو شائع بھی کیا ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا جب رجم کے مسئلہ میں آ کر ان بزرگ نے بھی وہی روش اختیار کی۔ ساری عمر قرآن کے پڑھنے پڑھانے میں بتا کر آخر کار یہ ہوا کہ رجم کے متعلق یہ رائے دے دی کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کے لئے اسلام میں حد علیحدہ علیحدہ نہیں ہے بلکہ شادی شدہ زانی کے لئے بھی وہی سو کوڑے ہیں جو قرآن میں آتے ہیں۔ رجم کا معاملہ تو تعزیر سے متعلق ہے۔ کوئی شخص غنڈہ ہو، اول درجے کا بدمعاش ہو، جو معاشرے میں سانڈ بنا پھرتا ہو لیکن پکڑ میں نہ آ رہا ہو، ایسا شخص جب پکڑ میں آ جائے گا تو وہ رجم کر دیا جائے گا ورنہ رجم باقاعدہ حد نہیں ہے۔ عام شادی شدہ زانی کی سزا وہی سو کوڑے ہیں جو قرآن میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگ کو معاف کرے ابھی وہ زندہ ہیں اور انہیں توفیق دے کہ وہ رجوع کریں اور توبہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کی ہمت دے۔ آدمی کے سر پر جب ایک فلسفہ سوار ہو جاتا ہے تو وہ تمام احتیاطوں کو نظر انداز کر کے اپنی رائے کے حق میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جس کی اس سے توقع نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں، جن کی توبہ کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح روایت موجود ہے کہ اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر ایک بڑے گروہ پر تقسیم کر دی جائے تو کافی ہو جائے[۱]۔ ان صحابی

---

[۱] اہل سنت کے تمام مکاتب فکر کے نزدیک جن چھ کتب احادیث کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے، ان میں مسلم شریف کا شمار دوسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ حضرت ماعز ابن مالک اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق رجم کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے لیے ان بزرگ نے اپنی تحقیق کے نتیجہ میں لفظ استعمال کر دیا "نہایت بد خصلت غنڈا" اور یہ اپنی تفسیر میں استعمال کیا۔ نقل کفر، کفر نہ باشد۔ یہاں تک لکھ دیا کہ "روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کسی غزوے کے لیے نکلتے تو یہ چپکے سے دبک کر بیٹھ رہتا اور مردوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر شریف بہو بیٹیوں کا تعاقب کرتا۔ بعض روایات سے اس تعاقب کی نوعیت بھی واضح ہوتی ہے کہ اس طرح تعاقب کرتا جس طرح بکرا بکریوں کا کرتا ہے۔" آگے اس سے بھی زیادہ ایک نہایت غیر شائستہ بات لکھی ہے۔ وہ ہم آپ کو نہیں سنانا چاہتا۔ آگے اپنی تحقیق ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی شرارتوں کی رپورٹ ملتی رہی لیکن چونکہ کسی صریح قانون کی گرفت میں یہ نہیں آتا تھا اس وجہ سے آپؐ نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ بالآخر یہ قانون کی گرفت میں آگیا۔ آپؐ نے اسکو بلوا کر تیکھے انداز میں پوچھ گچھ کی۔ وہ تاڑ گیا کہ اب بات چھپانے سے نہیں چھپ سکتی اس وجہ سے اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ جب اقرار کر لیا تو آپؐ نے اس کے لئے رجم کا حکم دے دیا۔" شاید اسی سے متاثر ہو کر شریعت کورٹ نے یہ فیصلہ دے

(بقیہ صفحہ گزشتہ) یہ ارشاد مروی ہے: لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ أُمَّةٍ لَوَسِعَتْهُمْ مصنف عبد الرزاق میں حضرت ماعز اسلمیؓ کے بارے میں حضورؐ کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں: إِنَّهُ الْآنَ لَفِي أَنْهَارِ الْجَنَّةِ يَنْغَمِسُ (مرتب)

[1] ان بزرگ کی تحقیق کا تجزیہ کیجئے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ معاذ اللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موجودہ دور کے تھانہ داروں کی طرح THIRD DEGREE استعمال کر کے ان صحابی کو اقرار جرم پر مجبور کر دیا تھا۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ اس طور پر حاصل شدہ اقرار جرم کی قانوناً کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس طرح واضح ثبوت کے بغیر محض "تیکھے انداز سے پوچھ گچھ" کے نتیجہ میں مجبور کر کے اقرار جرم کرانے کا الزام معاذ اللہ اس ہستی صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد ہوتا ہے جو نظام عدل و قسط قائم کرنے کے لئے مبعوث ہوئی تھی، وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ۔ مزید برآں ایک نہایت قابل غور بات یہ ہے کہ ان محقق مفسر قرآن نے متعدد مرتبہ لکھا ہے کہ "روایات سے معلوم ہوتا ہے" لیکن کسی ایک روایت کا بھی حوالہ نہیں دیا۔ جب کہ تحقیق کا حق اور انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ایک صحابی پر جب زبان طعن کھولی ہے تو ان روایات کا حوالہ بھی دیا جاتا تاکہ تحقیق کی جا سکتی کہ ان روایات کا مقام کیا ہے۔ اکثر معتبر کتب احادیث میں جو روایات ملتی ہیں ان سب کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بغیر کسی جبر و اکراہ کے از خود اعتراف و اقرار جرم کیا تھا۔ نبی اکرمؐ نے ان کو ٹالنا چاہا لیکن وہ مصر رہے کہ ان کو پاک کر دیا جائے۔ حضورؐ نے تحقیق فرمائی کہ یہ نشہ تو نہیں کرتے، ان پر دیوانگی کا تو دورہ نہیں پڑتا۔ جب ایسی کوئی بات نہیں نکلی کہ شک کا فائدہ ان صحابی کو پہنچ سکتا تو آپؐ نے ان کے اصرار پر رجم کی حد جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ (مرتب)

دیا تھا کہ رجم اسلامی حد نہیں ہے، وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ بعض حضرات کی کوششوں کے نتیجے میں — اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ حکومت نے اپنے ہی قائم کردہ شریعت کورٹ کے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی۔ مجھے اس وقت اچھی طرح یاد نہیں کہ سپریم کورٹ نے از خود اس فیصلہ کو کالعدم قرار دے کر رجم کو "اسلامی حد" قرار دیا یا اس فیصلہ کو نظرِ ثانی کے لئے پھر شریعت کورٹ کو REFER کر دیا اور شریعت کورٹ نے بالآخر طے کر دیا کہ رجم معین اسلامی حد ہے اور اگر شادی شدہ زانی کا جرم ثابت ہو جائے یا وہ بغیر کسی دباؤ کے خود اقرار کر لے تو اس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہیں لہٰذا ایسے فرد پر چاہے وہ مرد ہو یا عورت، رجم کی حد جاری کی جائے گی۔ یہاں میں آپ حضرات کو یہ بھی بتا دوں کہ جتنے بھی رجم ہوتے ہیں، وہ اقرار کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ اللہ کا فضل ہے کہ یہ گمراہی بڑے پیمانے پر تو نہیں آئی۔ اگر خدانخواستہ شریعت کورٹ کا وہ فیصلہ برقرار رہتا تو آپ کو معلوم ہے کہ عدالتوں کے فیصلے تو لٹریچر کا مستقل جزو بنتے ہیں، وہ نظائر بنتے ہیں۔ ان کے حوالے دیئے جاتے ہیں، ان سے سند پکڑی جاتی ہے۔ لہٰذا اس طرح ایک بہت بڑی گمراہی کو قانونی جواز حاصل ہو جاتا۔ اللہ تعالےٰ نے اس سے بچا لیا۔

لیکن ان بزرگ کا ایک مستقل حلقہ تو ہے۔ ان کے معتقدین تو موجود ہیں جو انہی کی آنکھوں سے دیکھتے اور ان ہی کے کانوں سے سنتے ہیں، ان کی رائے پر اندھا اعتماد رکھتے ہیں چنانچہ اسی حلقے سے ایک نوجوان ایسے نکلے کہ انھوں نے آگے بڑھ کر جو جسارت کی ہے وہ بھی مسلمانوں کے کلیجے کو چھید دینے اور چھلنی کر دینے والی ہے ——— اور وہ اس غامدی خاتون کے بارے میں کہتے ہیں کہ معاذ اللہ "وہ چکلا چلاتی تھی" وہ غامدی خاتون جن کے بارے میں احادیث صحیحہ میں تفصیلات ملتی ہیں کہ وہ خود چل کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ "حضورؐ مجھ سے وہ خطا سرزد ہو گئی ہے جس کی سزا رجم ہے مجھے پاک کر دیجئے میں نہیں چاہتی کہ مجھے اس کی سزا آخرت میں ملے۔ مجھے اس گناہ سے یہیں پاک کر دیجئے" حضورؐ نے ہر طرح انھیں ٹالا کہ کیا کہہ رہی ہو! کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی ہو! انھوں نے کہا حضورؐ مجھے تو اس گناہ سے حمل ہے حضورؐ نے فرمایا کہ "حمل ہے تو قصور تمہارا ہے، اس ننھی جان کا کیا قصور ہے جو تمہارے پیٹ میں ہے۔ جاؤ وضع حمل کے بعد آنا" وضع حمل کے بعد وہ اللہ کی بندی پھر آ گئی۔ آپ سوچئے کہ رجم کی سزا سے زیادہ واقعتہ سخت سزا اور کوئی نہیں۔ پتھر مار مار کر ہلاک کرنا۔ سنگسار کرنا۔ لیکن وہ اللہ کی بندی چل کر پھر آ رہی ہے کہ "حضور ولادت ہو گئی ہے مجھے پاک کر دیجیے" حضورؐ فرماتے ہیں کہ ابھی اس کا وجود تیرے وجود کا محتاج ہے، یہ زندہ کیسے رہے گا۔ جاؤ اس کو دودھ پلاؤ" وہ اللہ کی بندی چلی گئی

اور تیسری مرتبہ حاضر ہوتی۔ بچہ اس کی گود میں ہے اور روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں ہے اور عرض کرتی ہے کہ حضورؐ دیکھئے کہ یہ بچہ اب اس قابل ہو گیا ہے کہ اپنی غذا حاصل کر سکتا ہے۔ یہ میرے دودھ کا محتاج نہیں رہا۔ مجھے پاک کر دیجئے۔" میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس خاتون کے رجم کا حکم دیتے وقت کتنا بڑا پتھر اپنے دل پر رکھا ہو گا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، جن کی شان خود اللہ تعالےٰ نے رؤف و رحیم بیان فرمائی ہے۔ لیکن حضورؐ نے شریعت کا تقاضا پورا فرمایا اور اس خاتون کو رجم کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس خاتون کے بارے میں، جس کی توبہ مثالی توبہ[1] ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوفِ آخرت اس کے دل پر کس طرح نقش تھا، لیکن ان بزرگ کے حلقے کے ایک نوخیز صاحب ایسے اٹھے کہ انہوں نے یہ کہہ دیا کہ "وہ چیکلا چلاتی تھی"۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ اپنے ممدوح کی وکالت میں اس حد تک پہنچ گئے۔ انہوں نے اس واقعہ سے متعلق عام صحیح احادیث کو یکسر مسترد کر دیا۔ یہ ہیں وہ فتنے جو اُسی انداز میں آپ کے شہر لاہور میں امڈ رہے ہیں۔

یہی صاحب جواب ان بزرگ کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے اور رجم کے معاملے میں ان کے سب سے بڑے ADVOCATE ہونے کا "شرف" رکھتے ہیں۔ وہ آج سے قریباً تین چار سال پہلے ایک بہت بڑا "کارنامہ" سرانجام دے چکے ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سے بھی خود کو بالاتر سمجھنے کے زعم میں مبتلا ہیں۔ ابھی ان کی عمر اغلباً تیس بتیس برس ہے۔ لیکن حال یہ ہے کہ انھوں نے اس وقت قرآن کے قانونِ وراثت پر ایک مضمون لکھا تھا جو ان کے رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ قرآن کا قانونِ وراثت کسی کی سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ یہ تو میں بتا رہا ہوں۔ اور یہ کہ کلالہ کے معنی تو آج تک کوئی سمجھ ہی نہیں سکا ——— کلالہ کا وہ قانون جو سورۃ النساء میں آیا ہے، جس کے بارے میں اسی سورۃ مبارکہ کے آخر میں ایک مزید توضیحی آیت آئی جس کے آخر میں اس توضیح کا سبب بیان فرمایا گیا: یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا "اللہ (اس قانون) کی تمہارے لئے تبیین فرما رہا ہے، مبادا تم گمراہ ہو جاؤ" ——— ان صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اس کے باوجود امت چودہ صدیوں تک گمراہ رہی، کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کلالہ کا قانون کیا ہے! اب میں اس کو بیان کر رہا ہوں۔ یہ ہے "کڑوا کریلا اور نیم چڑھا" والا معاملہ۔

---

[1] اسی صحیح مسلم میں غامدیہ خاتونؓ کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے: فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَۃً لَوْ تَابَھَا صَاحِبُ مَکْسٍ لَغُفِرَ لَہٗ (مرتب)

اب یہ نوجوان رجم کے معاملے میں ان بزرگ کے ہم نوا بھی ہو گئے اور ان کے حلقہ معتقدین میں بھی شامل ہو گئے۔ تو یہ ایک فتنہ ہے جو اس وقت اسی شہر لاہور میں جڑیں پکڑ رہا ہے۔

میں نے ایک مرتبہ پہلے ایک صاحب دین کے متعلق کہا تھا کہ عموماً ہوتا یہ ہے کہ جب فتنہ کا آغاز ہو رہا ہوتا ہے تو توجہ نہیں ہوتی۔ جب وہ اپنی جڑیں زمین میں اتار لیتا ہے، وہ تناور درخت بن جاتا ہے۔ اس کی شاخیں پھیل جاتی ہیں، تب کچھ لوگ اپنی کلہاڑیاں اور تیشے لے کر آتے ہیں۔ لیکن اس وقت کچھ پیش نہیں جاتی۔ چونکہ وہ فتنہ مضبوط تناور درخت بن چکا ہوتا ہے۔ اس کی شاخیں بہت دور تک پھیل چکی ہوتی ہیں اور اس کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی ہوتی ہیں —— اسی لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس فتنہ کے متعلق آپ حضرات کو بروقت خبردار اور آگاہ کر دوں۔ چونکہ یہ کام بھی قرآن کے نام پر ہو رہا ہے۔ اس کے لئے بھی جو شور اور ہنگامہ ہے وہ بھی قرآن کے حوالے سے ہے۔ یہ ایک تازہ ترین مثال آگئی ہے۔ اس کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ ایک ہی مسئلہ ہے اس پر اتنی تشویش کی ضرورت کیا ہے! میں نے عرض کیا تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے پہلے ایک ہی مسئلہ رفع و نزول مسیحؑ کا کھڑا کر کے اس نے اپنے معتقدین کو سلف سے خلف تک جس مسئلہ پر اجماع رہا ہے اس کے متعلق شک اور ریب میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کو اپنے ماضی اور اسلاف سے کاٹ دیا تھا۔ اسی مسئلہ کو منوا کر وہ درجہ بدرجہ آگے بڑھا۔ مجدد ہونے کا دعویٰ کیا۔ جن لوگوں نے یہ دعویٰ مان لیا تو پھر ان کے حلق سے مسیح موعود مثیل مسیح اور بالآخر نبی ہونے کے دعاوی تسلیم کرا لئے۔ ورنہ غور کیجئے کہ ختم نبوت، رفع و نزول مسیح کے علاوہ، وہ اکثر ان چیزوں کو مانتے ہیں جو ہمارے ہاں تسلیم شدہ ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے وہ قائل۔ قرآن کو ماننے کے وہ مدعی، کعبہ شریف کو امت کا مرکز تسلیم کرنے کے وہ معترف — اپنی عبادات کے مقام کو مسجد سے موسوم کرنے پر وہ عامل، یہ تو ہم نے ختم نبوت کے انکار کی وجہ سے ان کی تکفیر کر کے ان کو کاٹا۔ اور اب حال ہی میں صدارتی آرڈیننس کی رو سے ان کے لئے اسلامی اصطلاحات کے استعمال کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ لہٰذا جان لیجئے کہ فتنہ کسی ایک یا چند مجمع علیہ مسائل کے مقابلے میں نئی اور اچھوتی بات زوردار طریقے اور مغالطہ آمیز طرز استدلال سے پیش کرنے ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس کو ہمارے معاشرے کے تعلیم یافتہ "جہلاء" کے حلق سے اتروا دیا جاتے تو پھر ایک ایسی چراگاہ مل جاتی ہے۔ اور ایک ایسا میدان حاصل ہو جاتا ہے کہ اس میں شکاری جس طرح چاہیں شکار کھیلیں۔

میں نے چاہا کہ چونکہ ان بزرگ سے میرا بھی قریبی تعلق رہا ہے اس لئے بات وضاحت سے

آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں۔ جیسے ہی طباعت کے بعد ان کی تفسیر کی چوتھی جلد میں رجم کی بحث
میرے علم میں آئی اسی وقت الحمد للہ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں اس جلد کو دوبارہ شائع نہیں کروں۔
اس لئے کہ میرا تعلق اسلاف کے ساتھ ہے۔ اور اسلاف سے خود کو کاٹ دینا ہلاکت کے مترادف
ہے۔ میں نے دعوت رجوع الی القرآن شروع کرتے وقت چند اصول اپنے پلے باندھ لیے تھے
جن کا ذکر میں آگے کروں گا۔

میں یہ بات کئی بار عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ میں عالم دین ہونے
کا ہرگز مدعی نہیں ہوں۔ میں قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور ادنیٰ خادم ہوں۔ میں نے امت کے
موجودہ زوال کے اسباب پر قرآن و سنت کی روشنی میں غور کیا تو جس تشخیص تک پہنچا وہ میں بیان
کر چکا ہوں۔ مجھے اس کی تائید الحمد للہ حضرت شیخ الہندؒ سے ان کی عمر کے آخری دور کے عزائم سے مل
گئی۔ میں اسی کام میں لگا ہوا ہوں۔ مجتہد ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ فقہ کے متعلق میرا مطالعہ
محدود ہے۔ چنانچہ میں فقہی مسائل کے متعلق استفسارات کے جواب دینے سے حتی الامکان اجتناب
برتتا ہوں۔ میں نے ماہنامہ میثاق کے ذریعہ اعلان کر دیا تھا اور تنظیم اسلامی کے نویں سالانہ اجتماع
میں اپنے رفقاء سے بھی کہہ دیا تھا کہ جس فقہی مسلک پر آپ مطمئن ہیں اس پر عمل کیجئے۔ کوئی مسئلہ پیدا
ہو تو اپنے مسلک کے مستند علماء اور دارالافتاء سے رجوع کیجئے — پھر یہ کہ میری پختہ رائے ہے اور
میں اس پر جازم ہوں کہ کسی مسئلہ پر اسلاف کی متفقہ رائے سے اختلاف خواہ وہ کسی ایک مسئلہ
ہی میں کیوں نہ ہو انتہائی خطرناک ہے۔ اس طرح فتنوں کا آغاز ہوتا ہے۔ قادیانیت اور پرویزیت
کے ناسور اسی طرح پیدا ہوئے — غور کیجئے کہ آج کل کے ہم لوگ جس نوعیت کے ہیں، ہماری
سیرت و کردار کے جو معیارات ہیں ان کے اعتبار سے کوئی مجتہدِ مطلق بن کر کھڑا ہو جائے اور خلفائے
اربعہ، ائمہ اربعہ، تمام محدثین کی متفق علیہ اور مجمع علیہ رائے کے خلاف رجم کے معاملہ میں کہہ دے کہ یہ
حد نہیں ہے، تو دینی اعتبار سے یہ کتنی خطرناک بات ہے۔ یہ تو تمام اسلاف کے فہم دین کے خلاف
اظہار عدم اعتماد ہے۔ رجم کا مسئلہ وہ ہے کہ جس سے خوارج اور چند معتزلہ کے سوا کسی نے اختلاف
نہیں کیا۔ سلفی مسلک کے ماننے والے بھی اس کو "حد" قرار دیتے ہیں۔ امام ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ بھی
اسے حد قرار دیتے ہیں۔ پھر اہل سنت کے تمام مسالک کے علاوہ اہل تشیع کے جتنے بھی
ہیں وہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ رجم حد ہے۔ ایسے متفق علیہ مسئلہ کے خلاف اپنا "اجتہاد" پیش
کرنا — یہ ہوتا ہے دراصل کسی فتنہ کے آغاز کا سبب۔

ان بزرگ کے بارے میں تو میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے پیشِ نظر کسی فتنہ کا آغاز ہے۔ وہ عمر کے
جس اسٹیج پر ہیں وہ طبعی عمر کی قریباً آخری اسٹیج کے زمرے میں آتی ہے۔ حسرت ہوتی ہے تو اس
بات پر کہ عمر کے آخری حصہ میں کوئی شخص ایسی کمائی لے کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پہنچے۔ ان کے لئے تو
معاملہ حسرت ناک اور افسوس ناک ہے۔ لیکن وہ نوجوان جو ہیں، ان کا جو اٹھان ہے کہ آج وہ رجم کے
معاملہ میں ان بزرگ کے ہمنوا اور وکیل بنے ہیں۔ اس سے پہلے وہ کہہ چکے ہیں کہ قرآن کے قانونِ میراث
کا اور کلالہ کے معنوں کو ان کے سوا آج تک کوئی سمجھا ہی نہیں۔ یہ دعویٰ یقیناً ایک بالقوۃ (POTENTIAL)
فتنہ ہے اس کے اندر یقیناً وہ امکانات موجود ہیں جو کسی فتنہ کو جنم دیا کرتے ہیں۔

اب آخری بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے اس DILEMMA یعنی اس
دوہری مشکل کا حل کیا ہے! یہ DILEMMA کہ ایک طرف قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ سے یہ
معلوم ہوتا ہے کہ دین کا جو بھی نتیجہ خیز، پائیدار اور مستقل کام ہوگا وہ قرآن کے ذریعہ ہوگا۔ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کا اساسی منہجِ انقلاب قرآن مجید تھا: يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ حضورؐ نے دعوت و تبلیغ، تزکیہ و تربیت کا کام کیا تو قرآن کے ذریعہ کیا۔
حکمت کی تعلیم دی تو قرآن کے ذریعہ دی۔ صحابہ کرامؓ کو بنیانِ مرصوص بنایا تو قرآن کے ذریعہ
بنایا۔ اب اگر کوئی کام کرنا چاہے گا تو قرآن مجید کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ
پانچوں محاذوں کے لئے کارگر اور مؤثر تلوار ایک ہی ہے اور وہ قرآن ہے۔ ماضی قریب کے ہمارے
دو اکابر ایک شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ایک علامہ اقبال مرحوم، وہ اسی کے مؤید اور ADVOCATE
ہیں کہ کام اگر ہوگا تو قرآن کے ذریعہ ہوگا۔ دوسری طرف قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں کا یہ حشر ہے
اسی وجہ سے علمائے کرام کے اندر سوءِ ظن ہے۔ وہ قرآن کے نام پر اٹھنے والی دعوت اور تحریک سے
خطرہ محسوس کرتے ہیں، اندیشوں و خدشات میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ایں ہم بچہ شتر است، ہو سکتا ہے
کہ یہ شخص بھی کوئی نیا فتنہ کھڑا کر دے۔ میں جب اس نتیجے پر پہنچا تو اس وقت سے مجھے علماء کرام
کے اس موقف سے ایک ہمدردی پیدا ہو گئی۔ لیکن اس DILEMMA کا حل کیا ہے! اس
حل کے ضمن میں میرے سامنے ایک پانچ نکاتی پروگرام ہے جو میں آج آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں
"مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے نام سے میرا ایک کتابچہ ہے۔ جس میں، میں نے قرآن مجید کے
پانچ حقوق بیان کئے ہیں۔ جہاد بالقرآن کے ضمن میں پانچ محاذ میں نے آپ کو گنوائے۔ پانچ ہی وہ نکات
میں بیان کر رہا ہوں جو اس DILEMMA کا حل ہیں۔ میں اس کو اس اعتبار سے پیش کر رہا ہوں

کرلامحالہ کام تو قرآن مجید ہی کے ذریعہ کرنا ہوگا۔ البتہ فتنہ سے بچنے کے لئے پانچ نکات، پانچ اصول ملحوظ رکھنے اور پانچ اقدامات کرنے ہوں گے۔

پہلا تو یہ ہے کہ اسلاف کے ساتھ دل کا، محبت کا، عقیدت کا، احترام کا ہمارا تعلق کسی طور سے بھی کٹنے نہ پائے۔ اس کا اس درجہ اور اس حد تک اہتمام کیا جائے کہ اگر ہمارے بزرگوں کی کتابوں میں کوئی ایسی چیز نظر آ بھی جائے جو ہمارے لئے بظاہر قابلِ اعتراض ہو تو اولاً ہم اس کی بہتر سے بہتر تاویل کرنے کی کوشش کریں گے اگر تاویل کی گنجائش موجود ہو، لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہم یہ رائے قائم کریں گے کہ یہ قابلِ اعتراض بات ان کی کتاب میں کسی اور نے شامل کر دی ہوگی۔ اس لئے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ اعداء نے بڑے پیمانے پر یہ کام کئے ہیں —— اس مسئلہ پر پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے بڑی تحقیق و تفتیش اور محنت و کاوش سے "تاریخ تصوف" نامی کتاب لکھی تھی وہ تو فرقہ واریت کی نذر ہو گئی اور وہ منظرِ عام پر نہ آ سکی، لیکن اس کتاب کا ایک باب وہ تھا جسے کوئی سرکاری ادارہ شائع کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے ہمت دی اور میں نے اسے شائع کر دیا۔ اس باب کا عنوان ہے: "اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش"۔ آپ کو دعوت دوں گا کہ اس کا مطالعہ ضرور کریں۔ یہ کتاب ہمارے مکتبہ سے دستیاب ہے۔ اس میں چشتی صاحب مرحوم نے سینکڑوں مثالیں جمع کر دی ہیں کہ کتابوں میں باطل پرست خاص طور پر باطنی فرقے کے لوگوں اور غالی قسم کے اہلِ تشیع نے اہلِ سنت کے صحیح العقیدہ صوفیاءِ کرام کی کتابوں میں ایسی باتیں شامل کر دی ہیں جو ان کے مسلمہ صحیح عقیدے اور مشائخ کے خلاف ہیں ان میں تدلیس ہے۔ تحریف ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے صحیح حوالے کے ساتھ یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ کسی مشہور اور بڑے عالم کی زندگی ہی میں ان کی کتاب میں تحریف و تدلیس ہو گئی۔ وہ کہیں گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی کتاب میں وہ باتیں لکھی ہوئی ہیں جو کبھی ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی تھیں۔ انھوں نے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ جواب ملا کہ یہ کتاب آپ کی ہے اور اس میں یہ لکھا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک سازش کے تحت ہمارے بہت سے بزرگوں کی کتابوں میں تدلیس و تحریف ہوئی ہے۔ لہٰذا اسلاف میں سے کسی معتبر و معتمد عالم اور بزرگ کی کسی کتاب میں کتاب و سنت کے اعتبار سے کوئی قابلِ اعتراض بات نظر آئے گی تو اسے تدلیس و تحریف سمجھا جائے گا۔ ایسے معتمد علیہ کسی بزرگ کی توہین کرنا، ان کی تنقیص کرنا، ان کے احترام کو مجروح کرنا یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ میں اس بارے میں بیان کر چکا ہوں کہ اسلاف سے منقطع ہو کر انسان بے لنگر کا جہاز یا کٹی ہوئی پتنگ

کر رہ جاتا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس پر سورہ حج میں بیان کردہ یہ تمثیل بڑی حد تک صادق
آتی ہے: خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ اَوۡ تَهۡوِىۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ مَكَانٍ
سَحِيۡقٍ ۔ جیسے کوئی شخص آسمان سے گر گیا ہو، اب یا تو شکاری پرندے اس کا گوشت نوچ لیں،
اسے اچک کر لے جائیں یا وہ ہوا کے رحم و کرم پر ہے کہ وہ اس کو جس کھائی میں چاہے لے جا کر پھینک
دے ــــــ یہی معاملہ ہو جائے گا ان لوگوں کا جن کا اسلاف کے ساتھ ادب، احترام، تعظیم، اعتماد
اور محبت کا تعلق کمزور پڑ جاتا ہے یا منقطع ہو جاتا ہے۔ اس کو ہمیشہ ایک CRITERIAN کی حیثیت
سے پیش نظر رکھیے اور جو شخص بھی دین کی کسی خدمت کا مدعی ہو، اس کو پرکھنے، اس کے خلوص کو جانچنے
کا ایک معیار اور اصول یہ بھی بنا لیجئے کہ اس کی صحبت میں بیٹھنے سے، اس کی باتیں سننے سے، اس
کی کتابیں پڑھنے سے آیا اسلاف کے ساتھ دل میں احترام، محبت اور حسن ظن پیدا ہوتا ہے یا اس
کے برعکس سوءِ ظن کا معاملہ پیدا ہوتا ہے! یہ بھی گویا اس بات کے لئے ایک اہم پہچان ہوگی کہ
جو کام بھی خدمتِ دین یا قرآن کے نام پر اٹھا ہے آیا وہ صحیح رُخ پر جا رہا ہے یا غلط رُخ پر۔

دوسری بات یہ کہ تقلید جامد اور اجتہاد مطلق کے درمیان ہمیں ایک معتدل راستہ اختیار کرنا
ہوگا۔ تقلیدِ جامد سے میری مراد کیا ہے! یہ کہ بس ایک فقہ کو اس طرح پکڑ کر بیٹھے ہیں کہ اس سے ذرا
بھی اِدھر یا اُدھر نہ خود ہوں گے نہ برداشت کریں گے۔ انسان اس معاملہ میں اتنا زود حس اور الرجک
ہو جائے کہ کسی دوسرے فقہ کی کوئی بات سامنے آئے تو وہ یہ سمجھے کہ میں کوئی اور ہوں اور یہ کوئی اور ہے
"من دیگرم تو دیگری" والا معاملہ ہو جائے۔ یہ درحقیقت وحدتِ امت کے لئے سخت نقصان دہ ہے
رہا عوام کا معاملہ تو ان کے بارے میں، میں کہوں گا کہ اتباعِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نیت
سے کسی ایک فقہ کو مستقلاً اختیار کر لیں تو مطلقاً کوئی حرج نہیں۔ وہ تو اپنے مسلک کے معتمد علماء سے
جا کر فتویٰ لیں گے، انہیں کیا معلوم کہ اس معاملہ میں امام ابوحنیفہؒ کی دلیل کیا ہے۔ امام مالکؒ کی
دلیل کیا ہے۔ امام شافعیؒ کی دلیل کیا ہے! اور امام احمد بن حنبلؒ کی دلیل کیا ہے! اگر معلوم بھی ہو جائے
تو ان میں اتنا فہم نہیں ہوتا کہ وہ موازنہ کر سکیں کہ کس کی دلیل قوی اور اقرب الی السنہ ہے۔ لہٰذا
ان کے لئے عافیت اسی میں ہے کہ وہ ایک فقہ کی پیروی کریں۔ چونکہ اہل سنت کے تمام فقہی مسالک
و مکاتب کا مأخذ کتاب و سنت ہی ہے۔ جیسے ایمان کے سلسلہ میں عوام کے بارے میں، میں نے
عرض کیا تھا کہ کسی صاحب یقین و ایمان کی صحبت بھی کفایت کر سکتی ہے۔ اسی طرح سے ان کیلئے
کسی ایک فقہ کی پیروی کرنے میں مطلقاً کوئی حرج نہیں۔ البتہ ان پر یہ بات واضح کر دینی ضروری

ہے کہ اہل سنت کے تمام مسالک مبنی بر کتاب و سنت ہیں، تاکہ دوسرے مسلک کے پیروکاروں کے متعلق ان کے دلوں میں غیریت کا احساس بالکل پیدا نہ ہو۔ رہا ان حضرات کا معاملہ جو دین کے خادم ہیں، جو میدان میں آکر دین کی خدمت کر رہے ہیں، جن کے سامنے اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور احیائے دین کی منزل ہے، انھیں تو یقیناً اس تقلید جامد سے نکلنا پڑے گا، ان کو سمجھنا چاہیئے کہ جب ہم مانتے ہیں کہ اہل سنت کے تمام مسالک ہمارا COMMON HERITAGE ہے، ہمارا مشترکہ اثاثہ ہے، ہمارا علمی ورثہ ہے۔ ائمہ اربعہ کو تو ہم مانتے ہیں کہ یہ اہل سنت کے امام ہیں۔ اور امام بخاریؒ کی کتاب کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ "اصح الکتب بعد کتاب اللہ الصحیح البخاری" تو کم از کم ان پانچ دائروں کی حد تک تو اپنے قلب اور ذہن کو کشادہ اور وسیع کیا جائے ——— میں نے مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے حوالے سے جو "وحدت امت" کے نام سے مطبوعہ موجود ہے، میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے قرآن کی تبلیغ و دعوت کے بارے میں عزائم آپ کو سنا چکا ہوں جن کا اظہار حضرت شیخ الہندؒ نے اسارت مالٹا سے واپسی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں علماء کے ایک اجتماع میں کیا تھا۔ اسی کتاب میں بہتی وقت مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ایسا واقعہ مفتی صاحبؒ نے بیان کیا ہے کہ اسے آب زر سے بھی لکھا جائے تو بھی اس کی عظمت کا حق ادا نہیں ہوتا اور جس کو جس قدر عام کیا جائے اسی قدر انشاء اللہ ہمارے یہاں فقہی معاملات میں جو تشتت ہے، اس میں بڑی حد تک اعتدال آسکتا ہے ——— میں کوشش کروں گا کہ اجازت لے کر مفتی صاحبؒ کی اس کتاب کو انجمن کی طرف سے چھپوا کر زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے ——— مفتی صاحبؒ راوی ہیں کہ حضرت انور شاہؒ نے ایک موقع میں تنہائی میں بڑی حسرت کے ساتھ مجھ سے کہا: "میاں، مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی"۔ مفتی صاحبؒ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں۔ اگر عمر ضائع ہوئی تو کس کام میں لگی!۔ تو شاہ صاحبؒ نے کہا کہ میں اپنی بہترین توانائیاں اور صلاحیتیں اس کام میں لگاتا رہا کہ فقہ حنفی کو دوسرے فقہوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح ثابت کروں اور اسی کے حق میں دلائل لاؤں حالانکہ یہ بات اللہ کے ہاں پوچھی نہیں جائے گی۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے جو کچھ فرمایا اس کو سونے سے بھی زیادہ قیمتی چیز جیسے ہیرے جواہرات سے بھی تولا جائے تو وزن میں شاہ صاحبؒ کا قول انشاء اللہ بھاری رہے گا۔ مفتی صاحبؒ کہتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا۔

"اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں، ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہاء جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں، کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب محتمل الخطاء (درست مسلک جس میں خطاء کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو خطاء محتمل الصواب (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں، اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔"

پھر فرمایا:۔

"ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطاء۔ اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح، یا یہ کہ یہ صحیح ہے، لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطاء ہو، اور وہ خطاء ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو، دنیا میں تو یہ ہے ہی، قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی، برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہو گا۔"

مفتی صاحب کہتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزید الفاظ یہ تھے:۔

"اللہ تعالیٰ شافعیؒ کو رسوا کرے گا نہ ابوحنیفہؒ کو، نہ مالکؒ کو نہ احمد بن حنبلؒ کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے، جنھوں نے نورِ ہدایت چار سو پھیلایا ہے، جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں، اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ حشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس یہ نہیں ہو گا۔"

وقت کی اہم اور شدید ترین ضرورت ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کا قول اور حضرت مولانا انور شاہ

کاشمیریؒ کے ان اقوال کو کم ازکم دیوبندی اور تھانوی حلقوں میں جتنا پہنچا سکیں پہنچائیں تاکہ جو ان حلقوں کے متوسلین ہیں، ان کے عقیدت مند ہیں کم ازکم ان کی تو آنکھیں کھلیں کہ ہمارے نہایت ہی قابل اعتماد متقی، متدین یہ دو اکابر اپنی عمر کے آخری دور میں پہنچ کر اپنے تجربات کی روشنی میں کن نتائج تک پہنچے تھے، علمی اور جہاد حریت کے اعتبار سے جہاں شیخ الہندؒ کا بلند ترین مقام سمجھا جاتا ہے، وہاں حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے اور سب ہی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ محدث اور فقیہہ ہونے کے اعتبار سے وہ چودہویں صدی کی شخصیت نہیں ہیں بلکہ وہ تو پرانے دور کی علمی شخصیتوں کے ساتھ تولے جانے والی شخصیت ہیں۔ انھیں بیہقیٔ وقت کہا جاتا ہے۔ ان بزرگوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں جو باتیں کہی ہیں کاش ان کے متوسلین تو کم ازکم ان پر غور کریں، سوچیں اور اپنے طرز عمل میں ان اکابر کی باتوں کے پیش نظر خوش گوار اور صحت مند تبدیلی لانے کی فکر کریں، ان اقوال کی شہادت دینے والے بزرگ کون ہیں! وہ ہیں مفتیٔ پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ جن کے ثقہ راوی ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا —— شاہ کاشمیریؒ کے خیالات کے پیش نظر ایک معتدل راستہ نکالنا ہوگا۔ خاص طور پر ان حضرات کو جو علمی میدان میں خدمت دین اور خدمت قرآن میں لگے ہوئے ہیں —— میں نے اس کے لئے ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے، میں اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت کر رہا ہوں، چونکہ بات سمجھانے کے لئے نئی اصطلاحات وضع کرنی پڑتی ہیں، اصلاً یہ اصطلاح میں نے اپنے فقہی موقف کے لئے وضع کی ہے۔ میں اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ میں نیم مقلد ہوں۔ میں مقلد ہوں پانچ کا صرف ایک کا نہیں۔ چار تو اہل سنت کے متفق علیہ ائمہؒ ہیں، اور پانچویں امام بخاریؒ، جن کی کتاب کے متعلق سب مانتے ہیں کہ "اصح الکتب بعد کتاب اللہ"۔ میں ان پانچ کے دائرے کے اندر اندر رہنے میں اپنے لئے عافیت سمجھتا ہوں۔ اللہ کرے کہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ کسی ایسی عظیم شخصیت کو کھڑا کردے جس کے تقوے، جس کے تدین، جس کے فہم دین جس کی اصابت رائے، جس کے خلوص و اخلاص پر امت کے بڑے حصہ کا بالخصوص علمائے حق کی اکثریت کا اجماع ہو جائے تو وہ تمام فقہی مسالک میں عمیق غور و فکر کے بعد پوری للّٰہیت اور خدا ترسی کے ساتھ امت کو ایک فقہی مسلک پر مجتمع کر دے تو کر دے اور کسی مسئلہ کے متعلق دین کے دائرے کے اندر اجتہاد مطلق کر دے تو کر دے۔ اس دور میں میرے نزدیک ہم جیسے ممطھٹے جھیبنے اس طرح کی حرکت کریں گے تو دین کے خلاف بغاوت اور ایک بہت بڑے فتنہ کا آغاز کرنے کا باعث بنیں گے۔ رہیں اس دائرے کے اندر لیکن یہ نہیں کہ بس ایک ہی ہو، عوام کا معاملہ اور ہے وہ اپنے مسلک

کے مطابق عمل بھی کریں اور روزمرہ کے مسائل میں اپنے ہی مسلک کے معتمد علماء کی طرف رجوع کریں، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہی ہدایت میں نے تنظیم اسلامی کے رفقاء کو دی ہے۔ فقہی مسائل کے بارے میں، میں اپنی رائے کے اظہار سے بھی حتی الامکان گریز کرتا ہوں۔ البتہ میرا ایک مزاج ہے، میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میں مقلدِ محض نہیں ہوں۔ میں نیم مقلد ہوں، میں ان پانچوں ائمہ کا مقلد ہوں، ان پانچوں دائروں سے باہر جانے کو میں غلط سمجھتا ہوں، یہ ہماری مشترک متاع ہے ان دائروں کے اندر اندر جس کی رائے کو بھی اقرب الی السنہ اور اقرب الی الصواب سمجھتا ہوں، اس کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں ——— میرے مزاج، میری افتادِ طبع اور میری احتیاط کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ آپ کے اس شہر لاہور ہی کی نہیں بلکہ عالم اسلام کی مشہور علمی درس گاہ اور دارالعلوم کی ایک جید شخصیت، عالم دین، شیخ الحدیث کی خدمت میں آج سے قریباً ڈھائی سال قبل میں نے حاضر ہو کر اپنی تمام کتابیں ان کے قدموں میں ڈال دیں اور ان سے عرض کیا کہ اگر ان میں سے آپ کسی ایسی بات کی نشان دہی فرما دیں جو ائمہ اربعہ اور امام بخاری رحمہم اللہ کے دائرے سے باہر کی ہے تو میں ان کو اپنی کتابوں سے حذف کر دوں گا ——— میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف حنفیت میں منحصر ہے تو میرا راستہ اور ہے اور آپ کا اور ——— انھوں نے کہا ہم ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں، جب کہ ہم ان سب کو اہل سنت کے ائمہ تسلیم کرتے ہیں تو میں نے عرض کیا کہ میں ان شاء اللہ ان تمام باتوں سے رجوع کر لوں گا جو امت کے مسلمہ ان پانچ ائمہ عظام کے دائرے سے باہر کی ہوں گی۔

اس پروگرام کی تیسری شق دعوت رجوع الی القرآن سے متعلق ہے۔ میں نے اشارہ کیا تھا کہ جب میں نے دعوت کا آغاز کیا تھا تو چند اصول پلے باندھ لئے تھے۔ کام کے ساتھ ساتھ بفضلہ تعالیٰ ان اصولوں پر وثوق حاصل ہوتا رہا اور اللہ کی توفیق سے چند اور اصول بھی سامنے آتے رہے جن کو میں نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ وہ اہم اصول پیش کئے دیتا ہوں۔

دعوتِ الی القرآن کا ایک تعلق احکام سے ہے۔ اس ضمن میں میرا ایک مستقل اور اٹل موقف رہا ہے۔ اور وہ بالکل منطقی ہے کہ اس کا سارا دارو مدار اور تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ حضورؐ سے جتنے زیادہ قریب تھے، اسی نسبت سے سب سے زیادہ استفادہ انھوں نے کیا۔ یہ حضرات تھے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ نمبر دو پر تابعین صحابہ کرامؓ

کے تربیت و صحبت یافتہ اور نمبر تین پر آتے ہیں تبع تابعین۔ تابعین سے مستفیض و مستفید ہونے والے اور تربیت پانے والے حضرات رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ——— اسی کی وضاحت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کے آغاز میں ہمیں ان الفاظ میں ملتی ہے کہ خَیْرُ اُمَّتِیْ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ۔ جو جتنا دور تھا، اس کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ جو جتنا قریب ہے وہ اتنا ہی قابلِ اعتماد ہے۔ اس نے اگر حضورؐ کو نہیں دیکھا تو حضورؐ کے تربیت یافتہ لوگوں کو دیکھا ہے، ان کی صحبت اٹھائی ہے۔ اگر ان کو نہیں دیکھا تو ان کے تربیت یافتہ لوگوں کو دیکھا ہے ان سے فیض اور افادہ حاصل کیا ہے تو امت کا یہ جو تواترِ عمل ہے یہ سنّت کو معلوم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ لہذا احکامِ دین کا جہاں تک تعلق ہے، اس میں کوئی نئی بات کہنا فتنہ ہے۔ یہ ہے اصل فساد کی جڑ۔ اس میں تو کوشش ہو کہ پیچھے اور پیچھے جاؤ حتیٰ کہ پہنچ جاؤ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ ؎

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست!

جہاں تک دین پر عمل کا تعلق ہے میں عرض کردوں کہ ایک پارے کے بقدر بھی وہ آیات نہیں بنیں گی جو عملی طور پر احکامِ دین سے متعلق ہیں، جن سے فقہی مسائل کا استنباط ہوتا ہے عمل کا اصل میں سارا دارومدار سنتِ رسول پر ہے۔ قرآن مجید میں نماز کی کتنی تاکید ہے۔ اسے ہر وہ شخص جانتا ہے جس کا دین سے ذرا بھی تعلق ہے۔ بلکہ اس بات کو تو وہ بھی جانتے ہیں جن کا دین سے عملی تعلق منقطع ہے لیکن نماز کی ہیئت اور ترتیب کہاں سے ملے گی! اوقات کہاں سے ملیں گے! قرآن میں اشارات ہیں لیکن نماز سے متعلق پورا نظام سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ملے گا: صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ "نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے دیکھتے ہو" لہذا جہاں تک احکامِ دین اور فقہی مسائل کا تعلق ہے وہ سنت میں ملیں گے سنت ہی احکامِ قرآن کی عملی تفسیر ہے۔ اسی سے استنباط ہوگا، استشہاد ہوگا۔ حتیٰ کہ اجتہاد ہوگا لہذا اس معاملہ میں پیچھے سے پیچھے جائیے۔ آگے مت جائیے۔ احکام کے بارے میں ائمہ مجتہدین اور محدثین کے دائرے سے باہر قدم نہ نکالیے۔

دوسرا یہ اصول میں نے گرہ میں باندھ رکھا ہے کہ قرآن اور احادیثِ صحیحہ میں جو معجزات، خارقِ عادات اور محیر العقول برکات و واقعات مذکور ہیں ان سب پر ہمیں حرف بہ حرف (LITERALLY) ایمان لانا ہوگا۔ اس لئے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور وہ جس

رب اور خالقِ کائنات سے انسان کا تعارف کراتا ہے، وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کی شان کا بھی حامل ہے۔ وہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ بھی ہے، اور صرف وہی الملک، القدوس اور العزیز الحکیم ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں، میں کسی تاویل کا روادار نہیں۔ ان کو جوں کا توں قبول کرنا میں ایمان کا لازمی جزو سمجھتا ہوں۔

تیسری بات یہ کہ قرآن مجید میں جن انبیاء و رسل اور جن اقوام و ملل کا ذکر ہے، وہ بطور تذکیر اور بطور عبرت ہے۔ قرآن تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے کہ جس میں تمام معلومات بیان یا جمع کر دی گئی ہوں، اس ضمن میں میری رائے ہے کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ، علم، جستجو، تحقیق اور معلومات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا آ رہا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا اس معاملہ میں اگر ہمارے متقدمین علماء، محققین اور مفسرین کی آراء موجودہ تحقیقات و معلومات اور فراہم شدہ DATA سے مطابقت نہ رکھتی ہوں تو یہ بالکل فطری بات ہے، اس سے متوحش اور تشویش میں مبتلا ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ جوں جوں تحقیقات و معلومات کا دائرہ وسیع ہوگا اس کے نتیجہ میں قرآن مجید کی حقانیت مزید مبرہن ہوتی چلی جائے گی اور قرآن میں جو اشارات ہیں وہ کھلتے چلے جائیں گے، اور جو اجمال ہے وہ واضح ہوتا چلا جائے گا۔

اسی طرح قرآن حکیم سائنس کی کتاب بھی نہیں ہے۔ اصلاً یہ کتاب ہدایت ہے، ھُدًی لِّلنَّاسِ ہے۔ لیکن یہ خالقِ کائنات کا کلام ہے لہٰذا اس میں بے شمار SCIENTIFIC PHENOMENA کی طرف اشارے کیے گئے ہیں، کوئی اشارہ GEOLOGY (علم طبقات الارض) سے متعلق ہے، کوئی چیز ASTRONOMY (علم فلکیات) کے میدان کی ہے۔ کوئی چیز BIOLOGY (علم الابدان) PHYSIOLOGY (علم الحیات) سے تعلق رکھتی ہے، کوئی چیز اور کوئی چیز EMBRYOLOGY (علم جنینیات) کے دائرے کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید میں EMBRYOLOGY کا کتنی بار REFERENCE آیا ہے کہ نطفہ ہوتا ہے، علقہ (لوتھڑا) ہوتا ہے، مضغہ (بوٹی) ہوتا ہے۔ پھر عظام (ہڈیوں) کا مرحلہ آتا ہے، پھر اس پر لحم (گوشت) چڑھتا ہے۔ پھر وہ زندہ انسان کی صورت میں رحمِ مادر سے تولد ہو جاتا ہے۔ الغرض جتنے بھی سائنٹفک پہلو اور گوشے ہیں، ان سب کے متعلق قرآن مجید میں اشارات موجود ہیں۔ ان کے متعلق جدید تحقیقات کی روشنی میں اگر یہ رائے دی جائے کہ ہمارے متقدمین علماء و مفسرین ان امور کو سمجھ نہ پاتے تو یہ کوئی اچنبھے اور چونکا دینے والی بات نہیں، ان کے زمانے میں سائنس

کا علم جس STAGE پر تھا، ظاہر بات ہے کہ وہ اسی کے مطابق قرآن مجید کے اشارات کی توجیہہ، تاویل، تشریح و توضیح کریں گے۔ ان کے دور تک سائنسی معلومات کا دائرہ بہت محدود تھا، اس سے آگے وہ کیسے جاتے! کوئی بھی اپنے دور کی موجود معلومات کے دائرے سے آگے نہیں جا سکتا۔ سات آسمانوں کی انھوں نے جو تعبیر کی۔ برجوں کی انہوں نے جو توجیہہ کی، کُلٌّ فِی فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ کی جو تعبیر کی یا جو بھی انہوں نے سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ کا مفہوم سمجھا ان سب کو انہوں نے اس وقت کے فراہم شدہ DATA کی روشنی میں سمجھا اور بیان کیا۔ سائنس نے ہمارے دور میں جو ترقی، جو تحقیق کی ہے جو انکشافات کئے ہیں ان کی روشنی میں اب ان کی جو تعبیر اور توجیہہ کی جاتے گی، جو مفہوم بیان کیا جاتے گا تو یہ بات غلط نہیں ہوگی اور نہ اس سے ہمارے متقدمین کی کوئی توہین یا تنقیص ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں چند ایسے حقائق سامنے آئیں جو موجودہ تحقیقات سے بھی آگے کے ہوں لہٰذا قرآن کے عجائبات بھی مزید واضح ہوتے رہیں گے۔

اسی طرح قرآن حکیم تخلیق کائنات کے جو ادوار اور تخلیق آدم کے جو مدارج بیان کرتا ہے پھر آفاق و انفس سے توحید باری تعالیٰ کے متعلق جو بدیہی اور فطری استدلال پیش کرتا ہے ان سب کو جدید دور کے مسلّم انکشافات، تجربات اور SCIENTIFIC FACTS کی روشنی میں موجودہ تعلیم یافتہ طبقے کی تفہیم و تعلیم کے لئے جدید اصطلاحات کے حوالے سے بیان کرنا ضروری ہوگا، یہی ابلاغ کا تقاضا ہے۔ اس کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح موجودہ دور کے تمام مادہ پرستانہ نظریات، ملحدانہ افکار اور طاغوتی نظام ہائے زندگی کے مقابلے میں قرآن کی انقلابی دعوتِ توحید پر ایمان لانے اور پھر اس ایمان و ایقان کے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق جو مقتضیات، مضمرات، مطالبات اور توحید کی جو COROLLARIES ہیں، اس کے جو صریح و منطقی اور بدیہی نتائج ہیں، ان کو موجودہ دور کی اصطلاحات کے حوالے سے پیش کرنا ضروری ہے۔ یعنی انسان کی ابن آدم ہونے کے باعث کامل مساوات۔ اللہ کے نزدیک اکرم و اشرف وہ ہے جو اللہ کا سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ ـــــــ ہر نوع کی انسان کی حاکمیت مطلقہ کی نفی۔ یعنی اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ کی توضیح اور اثبات اور حاکمیت کی جگہ خلافت کا تصور ـــــ ملکیت مطلقہ کی نفی اور لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کی

شریح اور ملکیتِ مطلقہ کی جگہ امانت کا تصور ـــــ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرآن
ے بارے میں جو ایک طویل حدیث آئی ہے ، میرے نزدیک اس کے آخری الفاظ . ولا یشبع
نہ العلماء ولا یخلق من کثرۃ الرد ولا تنقضی عجائبہ یعنی علماء کبھی
س کتاب سے سیر نہ ہو سکیں گے . نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی
ور نہ ہی اس کے عجائبات یعنی نئے نئے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا ۔ اس کا حقیقی مفہوم
ی ہے کہ دنیا میں قرآن مجید ، فرقانِ حمید ہی اس ہدایت کی حامل کتاب ہے جو ہر دور کے مشرکانہ
دا ناآشنا اور ملحدانہ تمام نظام ہائے زندگی کے مقابلے میں توحید پر مبنی ، ہر نوع کے استحصال ، تعدی
ستبداد سے پاک اجتماعی نظام عدل و قسط انسان کی رہنمائی اور فلاح کے لئے پیش کرتا ہے . اسی نظام
و بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد ہی اقامتِ دین کی جدوجہد ہے اور میری پختہ رائے ہے کہ جب
ک موجودہ اصطلاحات کے حوالے سے دین حق کو دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا نہ دعوت
تبلیغ کا کما حقہ حق ادا ہوگا ، نہ ابطالِ باطل ہوگا نہ احقاقِ حق ـــــ چنانچہ میں اپنی دعوت میں
ن تمام امور کو ملحوظ رکھتا ہوں اور انشاء اللہ رکھوں گا . میرے نزدیک اسی طرزِ فکر و عمل کا نام ہے
حکمتِ دین ـــــ میں نے آج یہ باتیں آپ کے سامنے قدرے تفصیل اور مربوط طریقے
سے بیان کی ہیں ، تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں جو کچھ بھی اپنی استعداد و
ستطاعت کے مطابق قریباً بیس برس سے کام کر رہا ہوں اور دن رات جس کام اور جس
عوت کی دُھن مجھ پر مسلط ہے وہ بحمد اللہ انہی اصولوں کے تحت ہے . اللہ تعالیٰ مجھے اپنے
زراہ فضل سے مزید توفیق و ہمت دے کہ اس کی کتاب عزیز کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر
سکوں اور اس کے علوم و معارف کی توضیح و تشریح کی سعادت پا سکوں اور اسی حال میں آخرت
ے لئے رختِ سفر باندھوں ،

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ اس دورِ فتن میں جبکہ : ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا نقشہ
ماری نگاہوں کے سامنے ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدا ناآشنا اور ملحدانہ نظریات ، افکار ،
ذاہب اور نظام ہائے زندگی کے باعث پوری دنیا میں فساد رونما ہو چکا ہے ، انسانیت تیزی
ے ساتھ ہلاکت خیزی کی طرف چل جا رہی ہے . امتِ مسلمہ جو امر بالمعروف ، نہی عن المنکر ، دعوت
لی اللہ اور دعوت الی الخیر کے لئے برپا کی گئی تھی ، كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ
الْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ، وہ خود خوابِ غفلت میں پڑی

ہوتی ہے۔ لہٰذا اس دور میں کرنے کا اصل کام کیا ہے! وہ ہے نوعِ انسانی کو دعوتِ توحید و ایمان دینا اور توحید علمی و عملی کو بالفعل قائم کرنے کی جد و جہد کرنا۔ اسی کا نام تکبیرِ ربّ ہے، اسی کا نام اظہارِ دین الحق علی الدین کلہ ہے —— اب جو بھی دعوت اور تحریک اس مقصد کو لے کر اٹھے اس کے سربراہ اور رفقاء کو اپنے اوپر لازم کر لینا چاہیئے کہ وہ علماء حق سے ربط و ضبط رکھیں گے، اپنے اوقات و مصروفیات میں سے وقت نکالیں گے اور ان کی خدمت میں حاضری دیں گے۔ ان سے رہنمائی حاصل کریں گے، معلوم کریں گے کہ ان کے مغالطے کیا ہیں! ان کے خدشات کی نوعیت کیا ہے! بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انھیں کوئی غلط بات پہنچا دی جاتی ہے۔ ہمارے موقف کے متعلق انھیں مغالطے دے دیئے جاتے ہیں۔ وہ اپنی نیک نیتی سے راویوں پر اعتماد کر کے ان غلط خبروں کو درست مان لیتے ہیں، چونکہ جو شخص خود نیک نیت ہوتا ہے وہ دوسروں کے ساتھ بھی حسنِ ظن کا معاملہ کرتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لئے بیعت کا جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے تو قریباً ڈیڑھ دو سال قبل اس کے خلاف اخبارات میں تین علماء کا فتوےٰ شائع ہوا تھا۔ جس میں بیعت کے طریقہ کار کو کسی دینی ہیئتِ اجتماعی کی تشکیل کے لئے غلط قرار دیا گیا تھا۔ تو اس ضمن میں جب میں نے ایک عالمِ دین سے رجوع کیا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ انھوں نے مجھے بتایا کہ مجھے تو وہ بیان دکھایا ہی نہیں گیا۔ مجھے تو فلاں صاحب نے ٹیلیفون پر کچھ بتایا تھا۔ اس میں بیعت کا مسئلہ تھا ہی نہیں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس پر آپ کا نام بھی دے دیا جائے۔ انھوں نے جن صاحب کا نام لیا وہ بھی ایک ابھرتی ہوئی بڑی مذہبی شخصیت ہیں۔ لہٰذا انھوں نے نیک نیتی سے سمجھا کہ اتنی بڑی شخصیت جو بات بتا رہی ہے وہ صحیح ہو گی۔ اس لئے انھوں نے اپنے نام کی شمولیت کی منظوری دے دی۔ چنانچہ ان کی خدمت میں حاضری کا یہ فائدہ ہوا کہ پھر ان بزرگ نے اپنا تردیدی بیان اخبارات کو جاری کرایا کہ میرے نزدیک دینی ہیئت اجتماعیہ کے لئے بیعت کے طریق کار کے اختیار کرنے میں شرعی نقطۂ نظر سے قطعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔" یہ بات ان بزرگ کی نیک نفسی اور خلوص کی دلیل ہے۔ اگر میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوا ہوتا تو یہ غلط بات بڑھتی، اس کے نہ معلوم کہاں کہاں اور کیا کیا اثرات مترتب ہوتے۔ لیکن ربط و ضبط کے ذریعہ سے مغالطوں اور سوء ظن کو اگر بالکل نہیں تو بہت حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ میں ان صاحب کے پاس بھی گیا جنھوں نے ٹیلی فون پر ان عالمِ دین سے گفتگو کی تھی۔ ان سے تبادلۂ خیال اور افہام و تفہیم بھی کی جو اگرچہ نتیجہ خیز نہیں ہوئی لیکن بہرحال

میں نے دلائل کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر ان کے سامنے رکھ دیا۔

پانچویں اور آخری نکتے کے متعلق میں پوری دیانت داری سے عرض کرتا ہوں کہ میرا موقف یہ ہے کہ صرف وقتی تدبیر کے طور پر نہیں بلکہ قلب کی گہرائیوں سے ہر وہ دعوت جو اقامتِ دین کو اپنا ہدف بنا کر کھڑی ہوئی ہو، اس کے لئے لازم ہے کہ علمائے حق کا اعتماد CONFIDENCE حاصل کرے۔ اس کے لئے پوری کوشش کرے، بھرپور کوشش کرے۔ میں دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں کہ کوئی شخص اپنی جگہ کتنا ہی پھنے خاں بنا پھرتا ہو، وہ اس وقت تک امت کے اندر دین کا کوئی مؤثر کام نہیں کر سکے گا جب تک وہ ان علماء کا اعتماد حاصل نہ کرے جن کے متعلق اسے یہ یقین ہو کہ ان میں للہیت ہے، خلوص و اخلاص ہے، تقویٰ ہے اور ان میں انانیت و نفسانیت نہیں ہے۔ چھوڑ دیجئے ان کو جو علمائے سو ہیں، جن کو اپنی گدیوں کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، جنھیں یہ اندیشہ ہر وقت پریشان کئے رکھتا ہے کہ ہمارے گلّے کی بھیڑیں ٹوٹ کر کسی اور کے گلّے میں شامل نہ ہو جائیں۔ جہاں تک ہمارے علمائے حقانی کے اندیشوں اور خدشات کا تعلق ہے اس کے اسباب میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ وہ ان کے تلخ تجربات کی وجہ سے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب بھی ان کے سامنے ان کے پورے احترام و ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا موقف پیش کیا جائے گا اور ان سے مستقل و مسلسل ربط و ضبط قائم رکھا جائے گا تو ان شاء اللہ العزیز ان کی تائید اور ان کی دعائیں ضرور حاصل ہوں گی۔

یہاں تک ان پانچ احتیاطی نکات کے متعلق میری معروضات ختم ہوئیں۔ مجھے احساس ہے کہ مقررہ وقت سے زیادہ وقت ہو گیا ہے۔ اب میں آپ کو چند باتیں یاد دلا کر اپنی معروضات جلد ختم کروں گا۔

مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام ۱۹۷۳ء میں اغلباً پہلی قرآن کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں کون کون سے لوگ تشریف لائے تھے! اس میں مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تھے۔ جو لوگ اس کانفرنس میں شریک تھے انہیں یاد ہو گا کہ اس وقت میں نے کہا تھا کہ ہمارے یہاں قران السعدین اس ساعت اور گھڑی کو کہا جاتا ہے جب دو سعید چیزیں جمع ہو جائیں لیکن یہاں تو بفضلہٖ قران السعداء ہو گیا ہے۔ اس اعتبار سے کہ اس پہلی کانفرنس میں عظیم شخصیتوں کے جانشین موجود تھے۔ وہاں ایک طرف مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدظلہ تشریف فرما تھے جو مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ اشرفیہ کے صاحبزادے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے اسٹیج پر مولانا

عبید اللہ انور صاحب مدظلہ تشریف فرماتے تھے جو مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور جانشین ہیں اور تیسری عظیم شخصیت جو علمائے دارالعلوم دیوبند کی جانشینی کے اعزاز اور شرف رکھتے تھے، تشریف رکھتے تھے یعنی مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ و نور اللہ مرقدہ، میری تو ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ جملہ مکاتب فکر کے علماء کو ایک اسٹیج پر قرآن کا پیغام خلق خدا تک پہنچانے کے لئے جمع کیا جاتے۔ چنانچہ ہماری قرآن کانفرنسوں میں جو اہم دینی و علمی شخصیتیں شریک ہوتی رہی ہیں، ان میں سے چند نام پیش کرتا ہوں۔ مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ، نامور عالم و محدث حضرت مولانا محمد گوندلوی مدظلہ .... ، مولانا مفتی محمد حسین صاحب نعیمی، مولانا مفتی تقی صاحب عثمانی مدظلہ خلف مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ (موجودہ جسٹس شریعت کورٹ) مولانا ابوبکر غزنوی مرحوم، مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ، پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم، مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ، ڈاکٹر جسٹس تنزیل الرحمن صاحب مدظلہ (موجودہ چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل) مزید براں بھارت کے کئی نامور علمائے کرام اور اہل دانش و بینش نیز بہت سے ہمارے ملک کے نامور علمائے کرام اور دانشوران قرآن کانفرنسوں کی صدارت، ان میں شرکت اور اپنے بیش بہا خیالات سے حاضرین کو مستفیض فرما چکے ہیں۔ نیز مولانا حامد میاں مدظلہ خلیفہ مجاز حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ خود تشریف نہیں لاسکے، لیکن ہر کانفرنس کے لئے انہوں نے باہتمام اپنا وقیع مقالہ ارسال فرمایا۔ اس وقت جلدی میں جو نام نوک زبان پر آتے ان کو بیان کر دیا گیا ہے ورنہ الحمدللہ ہر کانفرنس اس لحاظ سے بے مثال تھی کہ قرآن مجید کے پیغام کے لئے ہر مسلک کے علماء نے تعاون فرمایا ـــــ جو حضرات میرے قریب ہیں وہ جانتے ہیں کہ رجم کے سلسلہ میں جن بزرگ کا ذکر ہوا ہے، اس وقت میرا ان سے بڑے قرب کا معاملہ رہا تھا۔ تو اس وقت انھوں نے میرے اس طرز عمل پر یہ کہہ کر تنقید کی تھی کہ "ان مولویوں کو سر پر بٹھا کر کیا لینا ہے۔ ان مولویوں کی تو ہمیں تردید کرنی ہے۔" لیکن اللہ کا فضل یہ ہے کہ میرا مزاج یہ نہیں ہے۔ میں علماء کرام کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔ مؤدبانہ حاضر ہوا کرتا ہوں اور میں تو یہ سمجھا کرتا ہوں کہ میرے لئے تحفظ کی ایک چیز یہ ہے کہ میں عالم دین نہیں ہوں، محض قرآن مجید کا ایک طالب علم اور ادنیٰ خادم ہوں۔ ورنہ اگر کہیں مجھے بھی کوئی غرّۂ علمی ہو گیا ہوتا۔ میں بھی کسی زعم میں مبتلا ہو گیا ہوتا تو اس عُجب کی وجہ سے میرے دماغ میں بھی خناس پیدا ہو گیا ہوتا جو میرے لئے آخرت میں ہلاکت کا سبب بن جاتا۔ میرے لئے سب سے بڑی ڈھال یہی ہے کہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں امیؔ رسول

اللہ علیہ وسلم کا اُمّی امتی ہوں اور میں صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ سے کسی عُجب میں مبتلا ہونے
پناہ کا طالب رہتا ہوں۔

مجھے ایک بات اور یاد آئی۔ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" نامی میرا جو کتابچہ ہے، وہ میں
۶۶ء میں لکھا تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن جو قریب الختم تھا اس کا ایک نسخہ ۱۹۷۰ء میں، میں نے
لانا محمد یوسف بنوریؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا جب کہ وہ مسجد نبوی میں معتکف تھے۔ میں نے
سے عرض کیا کہ حضرت! اس کو بنظر غائر ملاحظہ فرما لیجئے چونکہ میں اسے بڑے پیمانے پر پھیلانے
ارادہ رکھتا ہوں۔ ارادہ میرا ہے اس کو پورا کرنے والا اللہ ہے۔ مجھے آپ کی رہنمائی درکار ہے
کوئی غلطی ہو تو نشان دہی فرمائیں، میں اس کو درست کر لوں گا۔ مولانا نے ازراہ شفقت اور
راہ تعاون علی البر میری درخواست قبول فرما لی۔ اعتکاف کی حالت میں مسجد نبوی میں اسے
ھا اور صرف ایک جملہ میں ترمیم فرما دی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس ترمیم سے وہ جملہ مزید نکھر آیا۔
ا جو مفہوم تھا وہ اس ترمیم سے اور واضح ہو گیا۔ میرے جملہ سے جس مغالطے کے پیدا ہونے کا
مکان تھا، بحمد اللہ مولانا نور اللہ مرقدہ کی ترمیم سے اس کا احتمال ختم ہو گیا۔ تو اللہ کے فضل و
م سے میرا مزاج تو یہ ہے۔ آج سے نہیں ہے ابتداء سے ہے۔ اس "عجب اور تکبر" کو میں ہی
د، میں نے ہی سمجھا ہے، الحمد للہ میں اس سے بچنے کی شعوری طور پر اللہ سے پناہ طلب کرتا
ہتا ہوں۔ نبی اکرمؐ نے تین مہلکات میں سے اس عُجب کو شدید ترین باعثِ ہلاکت قرار دیا ہے
پ سے بھی درخواست ہے کہ میرے حق میں دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے مجھے بچائے
ر بھی کام کرنے کی توفیق ملی ہے اسی کے فضل و کرم سے ملی ہے۔

کل رمضان المبارک کی ۲۹ ویں شب کو جامع قرآن، قرآن اکیڈمی میں ہمارا دورہ ترجمہ
رآن ختم ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ کی توفیق و نصرت سے یہ کام تکمیل کو پہنچا ہے۔ آج صبح مجھے خیال
رہا تھا جس کو آپ حضرات کے سامنے بیان کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں تو دل سے
ات کرتا ہوں اور کھلی بات ہے مجھے ایک امید ہوئی ہے کہ جیسے ہم نے "قرآن کانفرنس" کے سلسلہ کا
۸۴ء میں آغاز کیا تو وہ اتنا عام ہو گیا کہ جس کے بعد مختلف دینی حلقوں کی طرف سے قرآن
کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا جو مسلسل جاری ہے۔ ہمیں اس پر خوشی ہے۔ ہم نے کچھ اور نئے
کام شروع کئے تو اس منہج پر بھی کام شروع ہو گیا۔ اللہ سب کو توفیق دے اور سب کے کاموں
یں برکت دے۔ ان کو دین کے لئے سازگار بنائے۔ ایک کام کے لئے بیسیوں ادارے ہوں، سینکڑوں

اشخاص ہوں، لیکن آپس میں ٹکراؤ نہ ہو، تصادم نہ ہو تو یہ بڑی نیک فال ہے۔ اسی طریقے سے میری معلومات کی حد تک رمضان المبارک میں تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن پہلی مرتبہ پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے۔ جن لوگوں کو توفیق ملتی ہے اور جن میں ذوق و شوق ہے وہ تراویح پڑھتے ہیں۔ اگر تراویح سے قبل اور پھر ہر ترویحہ میں پڑھے جانے والے قرآن مجید کا صرف ترجمہ سنا دیا جائے تو میرا اندازہ ہے کہ شرکاء چاہے وہ عربی سے بالکل ہی ناواقف ہوں کم از کم پڑھے جانے والے قرآن مجید کے پچیس فیصد حصے کے مفہوم کو سمجھتے چلے جائیں گے۔ اس لئے کہ ترجمہ کے ذریعہ قرآنی الفاظ کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی قائم ہو جاتی ہے ——— ——— ان کو فوراً سنا دیا جاتے تو یہ ذہنی رابطہ معنی اور مفہوم کو سمجھنے میں ممد ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے اور بڑی بڑی مساجد میں بڑے پیمانے پر ہمارے علماء کرام اس کام کی طرف توجہ دیں تو میرے نزدیک یہ بہت بڑا BREAK THROUGH ہو جائے گا اور جیسا کہ ہمارے بعض احباب نے کل ختم قرآن کے موقع پر اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا کہ یہ کام جتنا کٹھن نظر آ رہا تھا، اتنا کٹھن ثابت نہیں ہوا سینکڑوں کی تعداد میں جن لوگوں نے شرکت کی ہے، ان میں اکثر وہ حضرات بھی تھے جو رات دو بجے تک اس پروگرام میں شریک رہے اور دن کو انہوں نے اپنے معمولات کے مطابق کام پورے بھی کئے۔ اور الحمدللہ یہ نہیں ہوا کہ شروع شروع میں لوگ آ گئے ہوں پھر جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہو، مسلسل حاضری بڑھتی چلی گئی۔ ۲۰ویں شب کو تو یہ حال ہو گیا تھا کہ ہماری جامع قرآن میں ——— بہت سے حضرات کو تراویح ادا کرنے کی جگہ نہیں ملی انہیں کھڑے رہنا پڑا۔ کل رات بھی صورت حال یہ تھی کہ مسجد بالکل PACKED تھی۔ کل ہی بہت سے شرکاء نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر اللہ کو منظور ہوا اور میری زندگی میں اگلا رمضان آنا ہے اور مجھے اس کام کی دوبارہ توفیق ملی تو کیا کریں گے۔ اس مسجد میں تو زیادہ سے زیادہ سات سو اشخاص کے لئے نماز باجماعت ادا کرنے کی گنجائش ہے۔ اس میں وسعت کا کوئی امکان نہیں۔ بہرحال ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہال کے اوپر دوسرا ہال تعمیر کر لیں۔ کام کا آغاز ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ جلد مکمل ہو جائے گا۔ لہٰذا DOUBLE STOREY تو ہم کر لیں گے۔ اس سے آگے ہم شاید فی الحال نہ جا سکیں، لیکن تمنا یہ ہے کہ اللہ کرے ہمارے واجب الاحترام رجال دین کی توجہ اس طرف مبذول ہو جاتے اور وہ اس کام کو شروع فرما دیں تو میرے نزدیک یہ کام بہت مفید ہو گا۔ خاص طور پر جاہلیت قدیمہ کے تمام مشرکانہ اوہام کی جڑیں کاٹ دے گا۔ اور شفاعت باطلہ کے جو عقائد ذہنوں میں بیٹھے

ہوتے ہیں ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے گا، اوہام کا طومار انشاء اللہ تراویح کے ساتھ لفظی ترجمہ کے ذریعے چھٹتا چلا جائے گا اور توحید خالص نکھر کر اذہان میں جاگزیں ہوتی جائے گی۔ اس لئے کہ ترجمہ سننے کے بعد جو شخص بھی تراویح کی نماز ادا کرے گا تو قرآن مجید کا اعجاز ظاہر ہوگا اور جاہلیت قدیمہ کا قلع قمع ہوتا چلا جائے گا۔

میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہوں، آپ بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی اب تک خیر کی توفیق بخشی ہے وہ عز و جل وہ الشکور الحلیم اسے شرفِ قبولیت بھی عطا فرمائے اور دوسرے لوگوں کو بھی ہمت دے کہ اگر میرے ساتھ جڑ کر، مل کر اور میرے دست و بازو بن کر یہ کام کرنا چاہیں تو ان کے دلوں کو انشراح عطا فرمائے۔ نہیں تو ان کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ صحیح منہج پر دین کا کام کریں۔ یہ صرف میرا کام نہیں ہے۔ یہ ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی اور سرفرازی کے لئے اپنا تن، من، دھن لگائے اور اللہ تعالیٰ ایسے تمام لوگوں کی مساعی کو مشکور فرمائے۔ اگر ہمارے دلوں میں خلوص ہوا تو آج نہیں تو کل ہم جمع ہو جائیں گے، اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيْرُ۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے کسی بارے میں اس وقت کوئی اندیشہ ہو یا کسی کو میرے بارے میں خدشات ہوں تو اپنی اپنی جگہ خلوص و اخلاص اور خشیتِ الٰہی کے ساتھ کام کریں گے تو ہم یہاں جمع نہ بھی ہو سکے تو دین کی جو بھی صحیح خدمت ہوگی، وہ انشاء اللہ مستقبل میں ایک جگہ مجتمع ہوگی اور آخرت میں تو ہم سب کو بالآخر جمع ہونا ہی ہے: اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيْرُ۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

❁❁❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قسط ۲

جہادِ بالقرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

جہاد کی تیسری منزل سب سے کٹھن، سب سے بھاری اور سب سے مشکل ہے۔ دین کو غالب کرنے کے لئے، قائم کرنے کے لئے، نافذ کرنے کے لئے، اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے۔ اس مقصد کے لئے کہ دین کا تجزیہ اور اس کے حصے بخرے کئے بغیر وہ کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے؛ جہاد کرنا جیسے انفرادی سطح پر، وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ آیا تھا، ویسے ہی اجتماعی سطح پر دین کے غلبہ کے لئے جہاد کی بلند ترین چوٹی ذروۂ سنام کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ یہ ہے سب سے کٹھن اور مشکل مرحلہ، اس کی وجہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ پہلی منزل پر ذاتی سطح پر نفس کے ساتھ کشمکش تھی۔ دوسری منزل پر اہل زیغ کے ساتھ نظریاتی اور فکری سطح پر کشمکش تھی۔ اس تیسری منزل پر طاغوتی نظام کو ہٹانے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے، اس لئے کہ دو نظام کسی حال میں بھی CO-EXIST نہیں کر سکتے۔ پچاس مذہب بھی ایک بالاتر نظام کے تحت اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ مذاہب کے مابین PEACEFUL CO-EXISTANCE ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل عملی بات ہے PRACTICABLE ہے۔ اس لئے کہ دنیا کا غالب تصور یہی ہے کہ مذہب تو لوگوں کے انفرادی اور نجی مسائل و معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اجتماعیات کے تمام امور میں مذہب کا عمل دخل اس دور میں تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ یہ SECULAR FIELD ہے جیسا کہ انگریز کے دور میں ہندوستان میں اصل نظام اجتماعی (LAW OF THE LAND) سرکار انگلشیہ کا تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے تمام مذاہب کے لوگوں کو آزادی تھی کہ وہ اپنے شخصی معاملات PERSONAL LAW) میں اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں۔ انگریزی حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں

تھا۔ جیسے دستوری اور نظری طور پر تو فی الوقت موجودہ بھارت میں بھی یہ بات تسلیم شدہ ہے۔ تمام مذاہب کے حقوق دستور میں معین ہیں۔ یہ دوسری بات ہے، کہ پھر برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر۔

بہر حال ایک ملک میں دین یعنی نظامِ اجتماعی ایک ہی رہ سکتا ہے۔ دو نظام نہ رہ سکتے ہیں نہ چل سکتے ہیں جس طرح ایک نیام میں بیک وقت دو تلواریں نہیں سما سکتیں اسی طرح ملک میں دو نظام نہیں چل سکتے۔ ایک گدڑی میں بہت سے درویش سما سکتے ہیں لیکن ایک شال میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے۔ معلوم ہوا کہ ہر نظام اپنا غلبہ چاہتا ہے اور اگر اسلام محض مذہب نہیں بلکہ دین ہے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ تو اس کو غلبہ درکار ہے۔ یہ منزل انگریزوں کی دو سو سالہ غلامی کی وجہ سے ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو گئی تھی اور اب بھی بڑی مشکل سے یہ تصور لوگوں کے ذہنوں کے سامنے آرہا ہے چونکہ غلامی کے قریباً ان دو سو سالوں کے درمیان اسلام دین نہیں رہا تھا، صرف مذہب بن گیا تھا۔ لہٰذا ہمارا سارا تصور اکثر و بیشتر تو پہلی منزل تک محدود ہے یعنی عبادات اور حلال و حرام کے موٹے موٹے احکام ہم جانتے ہیں۔ دوسری منزل کی طرف بھی پیش رفت ہوئی یعنی تبلیغ۔ دین کو پہنچانا، اسے عام کرنے کی کوشش کرنا، لیکن یہ بات ذہنوں سے اوجھل ہو گئی کہ ہمارا دین اپنا غلبہ چاہتا ہے: اَلْحَقُّ یَعْلُوْا وَلَا یُعْلٰی ۔ اسلام دین ہے اور دین ہوتا ہی وہ ہے جو غالب ہو۔ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

میں بڑے جزم کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام جب غالب ہوتا ہے تو دین ہوتا ہے اور جب مغلوب ہوتا ہے تو صرف مذہب رہ جاتا ہے۔ ہماری دو سو سالہ سیاسی اور فکری غلامی نے اس مذہبی تصور کو اس طریقے سے ہمارے ذہنوں میں نقش اور راسخ کر دیا ہے کہ اگر بڑی محنت کے بعد کسی کے سامنے یہ تصور واضح ہوتا ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے تو تھوڑے عرصہ کے بعد مضمحل ہو کر ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور پھر توجہ اس کے مذہبی تصور تک محدود ہو جاتی ہے۔ ہمارا اسلام کا محض مذہبی تصور اتنا راسخ ہو چکا تھا کہ ہمارے بعض زعماء نے انگریز کی حکومت کی بڑی مدح بھی کی تھی کہ اس نے ہمیں بڑی مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔

لہٰذا اس حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلانا یا اس میں حصہ لینا مسلمانوں کے لئے قطعی نامناسب ہے۔ اسی پر مردِ قلندر اقبال نے یہ پھبتی چُست کی تھی ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام کا غلبہ اور اسلام کا ایک دین کی حیثیت سے بالفعل قائم و نافذ کرنا۔ یہ ہے ہمارے فرائضِ دینی کی تیسری اور بلند تر منزل۔

اب آیئے! ایک قاعدۂ کلیہ اور اٹل اصول کی طرف۔ آپ اپنا نظام لانا چاہتے ہیں تو نافذ و قائم الوقت نظام کو ہٹانا ہوگا۔ جیسا کہ مولانا رومؒ نے کہا ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

انقلاب کے لئے یہ عمل لازم و لابد ہے، ناگزیر ہے۔ سیدھی سیدھی سی بات ہے کہ جو نظام بھی کہیں قائم ہوتا ہے، اس کے ساتھ VESTED INTERESTS، مفادات، چودھراہٹیں، سیادتیں، قیادتیں، وابستہ ہوتی ہیں۔ مراعات یافتہ طبقات —————— جن کو اپنے حق سے زیادہ مل رہا ہے جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں، جن کے پاس اختیارات اور حقوق کا ناجائز ارتکاز ہوگیا ہے، وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی اس نظام کو چھیڑے اسے ہاتھ لگائے۔ علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے۔ ع "نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے"۔ ہوش میں آؤ، اپنی قوتوں کو مجتمع کرو۔ یہ ایک آندھی آرہی ہے جو تمہارے مفادات اور تمہاری مراعات کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائے گی۔ یہ کشمکش بڑی شدید ہے۔ قرآنِ مجید دو مقامات پر کہتا ہے: هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝ یہ ہے اٹل قانون۔ مشرک کبھی دینِ حق کا غلبہ برداشت نہیں کرسکیں گے۔ تصادم ہوکر رہے گا۔ یہ ہے اصل تصادم۔ اب یہ تصادم بالفعل (PHYSICAL تصادم ہوگا اب نظریاتی تصادم اگلے مرحلہ میں داخل ہوگا۔ اب طاقت، طاقت سے ٹکرائے گی۔

اس بالفعل تصادم (PHYSICAL COLLISION) کے بھی تین مرحلے ہیں۔ سیرت النبیؐ پر تقاریر کے موقع پر میں نے اُن کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اِس وقت اُن کو محض جمع کر رہا ہوں

تاکہ اس خاکے میں یہ بھی سامنے آجائیں۔ اس بالفعل تصادم میں پہلے مرحلہ کو ہم کہیں گے صبرِ محض۔
ماریں کھاؤ مگر اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بارہ برس مکہ میں یہی حکم رہا کہ اگر ———
——— ——— تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگی پیٹھ
لٹایا جارہا ہے لیٹ جاؤ RETALIATE نہیں کر سکتے۔ اس کو جدید اصطلاح میں کہیں گے،
PASSIVE RESISTANCE قدم پیچھے نہ ہٹے۔ کلمۂ توحید اور کلمۂ طیبہ پر قائم رہو۔ لیکن ہاتھ
اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ دوسرا مرحلہ آتا ہے کہ اگر طاقت اتنی فراہم ہوگئی ہے کہ اقدام
کیا جا سکتا ہے تو آگے بڑھو اور باطل کو للکارو اور چیلنج کرو ——— اس نظام کی کسی دکھتی ہوئی رگ
کو چھیڑ دو۔ اسے جدید اصطلاح میں کہا جائے گا Active Resistance۔ تیسرا اور آخری مرحلہ ہے
قتال۔ ARMED CONFLICT آج سے تمہارے ہاتھ بھی کھول دیئے گئے ہیں، اُذِنَ لِلَّذِيْنَ
يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ "آج سے، ان لوگوں کو اجازت
دی گئی جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر پوری
قدرت رکھتا ہے۔" مکی دور، صبرِ محض کا دور تھا۔ مدینہ منورہ ہجرت کے بعد نبی اکرمؐ نے
اقدام فرمایا اور چھاپہ مار دستے بھیج کر قریش کی تجارت کے دونوں راستوں کو جو مکہ سے یمن
اور مکہ سے شام کی طرف جاتے تھے مخدوش بنا دیا گویا قریش کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔ چونکہ اُن
کی معاش کا بہت بڑا انحصار ان ہی راستوں کے ذریعہ تجارت پر تھا۔ اس کو جیسا کہ میں نے عرض
کیا تھا جدید اصطلاح میں Active Resistance کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر انقلابی عمل میں
لازمی آخری مرحلہ آتا ہے اور وہ ہوتا ہے مسلح تصادم۔ یہ انقلابی دعوت وقت کے جن فراعنہ
کے مفادات کو چیلنج کرتی ہے، وہ جب اس دعوت کو توسیع پذیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو
اس کو کچلنے کے لئے اپنی عسکری طاقت کو میدان میں لاتے ہیں ——— اور اس طرح
مسلح تصادم کا تیسرا اور آخری مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہر انقلابی دعوت کو لازماً اس آخری مرحلہ
سے سابقہ پیش آکر رہتا ہے جب یہ انقلابی دعوت RETALIATE کرتی ہے وقت کے رائج
و نافذ نظام کے ساتھ۔ اب تک تو وہ جھیل رہی تھی۔ برداشت کر رہی تھی۔ لیکن جب وہ
اقدام کا مرحلہ شروع کرتی ہے تو نظامِ باطل اس کو کچلنے کے لئے اپنی پوری طاقت کے ساتھ
بڑھتا ہے اور آخری مرحلے پر مسلح تصادم کا آغاز ہو جاتا ہے اور انقلاب کا یہی مسلح تصادم،
جہاد کی آخری چوٹی قتال فی سبیل اللہ بن جاتا ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ اپنی مدافعت

میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی لیکن آخری مرحلے پر وہ وقت آجاتا ہے کہ جس کے متعلق حکم الٰہی آتا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ ـ "اب تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے۔" وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ "ہوسکتا ہے کہ تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو دراں حالیکہ اسی میں تمہارے لئے خیر ہو اور ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں پسند ہو دراں حالیکہ اس میں تمہارے لئے شر ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔" اس قتال کا ہدف، TARGET وہ ہے جو میں پہلے آپ کو سنا چکا ہوں کہ "مسلمانو! اب جبکہ تمہاری تلوار نیام سے باہر آگئی ہے تو یہ اُس وقت تک نیام میں نہیں جائے گی، جب تک فتنہ وفساد بالکل فرو نہ ہوجائے اور اللہ کے خلاف بغاوت بالکل کچل نہ دی جائے اور دین کل کا کل اللہ ہی کے لئے نہ ہوجائے۔" وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ـ یہاں 'فتنہ' سے مراد کیا ہے! اس کی ہمارے اکثر صاحب علم مختلف تشریحات و توجیہات کرتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ چونکہ تصور غیر انقلابی بن گیا ہے لہٰذا جہاں کہیں بھی انقلابی بات آئی ہے تو پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فتنوں کا شمار مشکل ہے، استحصال بھی فتنہ ہے، ناانصافی بھی فتنہ ہے، لیکن وہ اصل فتنہ کیا ہے جو اس آیت میں مراد ہے؟ اور جو اُمّ الفتن ہے۔ وہ یہ ہے کہ:

> یہ زمین اللہ کی ہے، اس کا جائز حاکم صرف اس کی ذات ہے۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ـ اگر زمین پر تشریعی معاملات اور اجتماعی نظام حیات میں اللہ کے سوا کسی اور کا حکم چل رہا ہے تو یہ اس کے خلاف صریح بغاوت ہے۔ یہی سب سے بڑا فتنہ ہے۔

یہاں فتنہ سے اصلاً یہی فتنہ مراد ہے۔ اسی کے متعلق ایک مقام پر فرمایا گیا: وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ـ اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا: وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ـ غور کیجئے وہاں قتال و مقاتلہ کن کے خلاف تھا! اپنی ہی قوم اور اپنے قبیلہ کے لوگ، اپنے ہی بھائی بند، اپنے ہی اعزا و اقارب مدِمقابل تھے لیکن وہ طاغوتی نظام کے علمبردار تھے اور امتِ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس بات پر مامور کی گئی تھی کہ اجتماعی نظام خالصتاً توحید کے انقلابی نظریے پر قائم ہو: اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ـ اور اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ـ سورۃ توبہ

اور سورۂ صف میں جہاں خاتم النبیین والمرسلین کی بعثت کی امتیازی شان یہ بیان ہوئی ہے۔ هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ تو دونوں مقامات کے آخر میں فرمایا گیا: وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ "اور چاہے مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔ جن لوگوں کے مفادات، جن کی قیادت و سیادت نظامِ باطل سے وابستہ ہوں، وہ اس بات کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ اُن کا طاغوتی نظام بیخ و بُن سے اکھاڑ کر توحید پر نظامِ عدل و قسط قائم کیا جائے۔ وہ تو مزاحمت کریں گے، مخالفت کریں گے اور اپنی پوری طاقت دین اللہ کے قیام و نفاذ کو روکنے کے لئے صرف کر دیں گے۔ لہٰذا اللہ کے فرمانبرداروں کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ کے باغیوں سے پنجہ آزمائی کریں۔ نبرد آزمائی کریں اور اللہ تعالیٰ کی تشریعی حکومت کو قائم کرنے کیلئے اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کر دیں تاکہ "حق بحق دار رسد" والا معاملہ ہو جائے۔ جو لوگ یہ قربانی دیں تو وہ سرخرو ہیں مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔ لیکن اگر ایمان کے دعویدار بیٹھے رہیں، باطل کے ساتھ کوئی کشمکش نہ کریں بلکہ اس کے زیرِ عافیت چین کی بانسری بجائیں۔ اپنے معیارِ زندگی کی بلندی ہی مقصود و مطلوب بن جائے تو یہ طرزِ عمل دنیوی قانون میں بھی ABETMENT یعنی اعانتِ جرم شمار ہوتا ہے۔ یہ باغیوں کے ساتھ ایک نوع کا تعاون قرار دیا جاتا ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا سب سے بڑا سبب ہی بغاوت ہوئی ہے۔ کائنات کے تکوینی نظام پر جس اللہ کی حکومت قائم ہے نہ یہ زمین اسی اللہ کی ہے۔ لہٰذا اس پر بھی اُسی کی تشریعی حکومت قائم ہونی چاہئے: إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ۔ حکم دینے کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے۔ لیکن اس اصل الاصول کو چھوڑ کر کوئی فردِ واحد ہو، کوئی قوم ہو۔ عوام ہوں۔ کیسے باشندے۔ کوئی بھی ہو، وہ اگر اپنا حکم چلوا رہا ہے تو درحقیقت وہ خدائی کا مدعی ہے اور اللہ کا باغی ہے۔ مسلمان تو وہ ہے جو صرف اللہ کا وفادار ہو۔ اس موقع پر اچانک میرا ذہن اس مقدمہ بغاوت کی طرف منتقل ہوا جو ہمارے ہی شہر کراچی کے خالق دینا ہال میں ہمارے چند اکابر کے خلاف پہلی جنگِ عظیم کے دوران قائم ہوا تھا۔ ہمیں جہاں اپنوں ہی کے طرزِ عمل کے سبب سے ندامت کے ساتھ اپنی گردن جھکا لینی پڑتی ہے وہاں یہ مقدمہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ ہماری تاریخ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کے ذکر سے ہمیں کسی درجے میں سہارا ملتا ہے، کہ انہوں نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک مسلمان کے شایانِ شان ہے۔ ان اکابر نے پہلی جنگِ عظیم کے اُس ٹریبونل کے سامنے جو انگریزی حکومت نے بغاوت کے مقدمہ کے لئے قائم کیا تھا برملا کہا تھا کہ ہاں ہم انگریزی حکومت کے باغی ہیں۔ اس لئے کہ مسلمان صرف اللہ کا وفادار ہو سکتا ہے وہ کبھی

غیر اللہ کا وفادار نہیں ہو سکتا بہرحال یہ ہیں جہاد کے تین درجے۔ ان کو مزید پھیلائیں گے تو نو درجے بن جائیں گے اور
نویں منزل پر جا کر یہ جہاد قتال بنتا ہے۔ جو اس کی چوٹی ہے۔ اس کا CLIMAX ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ سورۃ صف میں جہاں جہاد کی بات ہوئی وہاں یہ بات صراحت سے سامنے آتی ہے
کہ جہاد تو ایمان کی بنیاد (BASE) ہے۔ جہاد نہیں کرو گے تو عذاب جہنم سے چھٹکارا پانے کی
امید محض امید موہوم ہے۔ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ اس کی کوئی برہان اور دلیل تمہارے پاس نہیں
ہے۔ عذاب الیم سے رستگاری کے لیے ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں چنانچہ اس سورۃ مبارکہ
میں فرمایا: يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ۔

"اے اہل ایمان! میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تم کو عذاب الیم سے نجات دلا دے؟ (وہ
یہ ہے کہ) ایمان (پختہ) رکھو اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اس کی راہ میں اپنے مالوں
سے اپنی جانوں سے" معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ جہاد ناگزیر ہے۔ اس سے تو مفر ہے ہی نہیں
یہ تو نجات کی شرط لازم ہے۔ آپ فقہی اصطلاحات سے ذرا صرف نظر کر لیں کہ یہ فرض ہے یا نہیں
یا یہ کہ یہ فرض عین ہے یا کفایہ ہے۔ قرآن مجید تو یہ بتاتا ہے کہ جہاد نہیں تو ایمان نہیں۔
دلیل کے لئے سورۃ حجرات کی آیت نمبر ۱۵ سنیے فرمایا: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ
رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝

"مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر اس شان سے ایمان لائے کہ
ان کے قلوب تشکیک اور خلجان میں نہیں پڑے بلکہ ان کو یقین قلبی حاصل ہو گیا اور جنہوں نے
جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں۔ بس صرف یہی لوگ ہیں جو اپنے
دعوئ ایمان میں سچے ہیں" اس آیت مبارکہ میں حصر کے دو اسلوب آتے ہیں ایک اِنَّمَا اور
دوسرے اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ اسی لئے میں نے ترجمانی میں اس اسلوب کو پیش
نظر رکھا ہے۔

آگے چلیے۔ اگر کوئی دنیوی محبت اللہ کی راہ میں جہاد سے روکنے کے لیے پاؤں میں
بیڑی بن کر پڑ گئی تو قرآن مجید کا فتویٰ کیا ہے! اسے سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۲۴ میں بیان
کیا گیا، فرمایا: قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ
اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

اللہ کی محبت، اس کے رسول (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کی عظمت و اہمیت پر قرآن حکیم کی بڑی جامع اور مہتم بالشان آیت ہے۔ اس آیت کی ترجمانی کے لیے عرض کرتا ہوں کہ اس آیت میں مسلمانوں کے سامنے ایک معیار اور کسوٹی رکھ دی گئی ہے ان سے فرمایا گیا ہے کہ اپنے باطن میں ایک ترازو نصب کر لو اور پھر جائزہ لے لو کہ تمہاری اصلی دلی محبتوں کا کیا حال ہے فرمایا کہ اے نبی! ان مسلمانوں سے کہہ دیجیئے کہ اپنے دل میں نصب شدہ میزان کے ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں ڈالو۔ پہلی اپنے باپوں کی محبت، دوسری اپنے بیٹوں کی محبت، تیسری اپنے بھائیوں کی محبت چوتھی اپنی بیویوں کی محبت، پانچویں اپنے رشتہ داروں اور اعزہ و اقارب کی محبت، ماں، بیٹی، بہن اور شوہر کی محبتوں کا بھی ان میں احاطہ ہو گیا۔ یہ پانچ محبتیں علائق دنیوی سے متعلق ہیں۔ پھر ان کے ساتھ چھٹی محبت اس مال کی جو بڑے چاؤ کے ساتھ تم نے جمع کیا ہے۔ ساتویں اس کاروبار کی محبت جو بڑی محنت سے تم نے جماتے ہیں جس میں تم نے خون پسینہ ایک کیا ہے جس کے متعلق تم کو اندیشے لاحق رہتے ہیں کہ کہیں کساد بازاری نہ آجائے، کہیں گھاٹا نہ ہو جائے اور آٹھویں ان مکانوں کی محبت جو تم نے بڑے ارمانوں سے تعمیر کیے ہیں، جن کی زیبائش و آرائش پر تم نے پانی کی طرح پیسہ لگایا ہے۔ یہ تین محبتیں اسباب و سامان دنیوی سے متعلق ہیں۔ اب تقابل کے لیے دوسرے پلڑے میں تین محبتیں ڈالو، ایک اللہ کی محبت، دوسری اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت، اور تیسری اس کی راہ میں جہاد کی محبت۔ اب دیکھو کونسا پلڑا بھاری پڑا۔ کونسا جھکا! اگر ان آخر الذکر محبتوں کا پلڑا ہلکا رہ گیا اور علائق وسامان دنیوی کی محبتوں والا پلڑا بھاری پڑ گیا تو جاؤ گومگو کی حالت میں مبتلا رہو اور انتظار کرو۔ میں محاورے کے طور پر فَتَرَبَّصُوْا کا صحیح مفہوم ادا کرنے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ جاؤ دفع ہو جاؤ حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔
حتیٰ کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے اور اللہ ایسے فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

یہاں فاسق کا لفظ انتہائی قابلِ توجہ ہے جس مسلمان کا دل جہاد کی محبت سے خالی اور اس کی اہمیت و عظمت سے غافل ہے اس کا شمار بھی فاسقوں میں ہوتا ہے۔ میرا ظنِ غالب ہے کہ اسی آیت مبارکہ سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ شعر کہا تھا:

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

معلوم ہوا کہ جہاد سے تو مفر ہے ہی نہیں۔ سورۃ حجرات کی جو آیت میں نے آپ کو سنائی ہے وہ اس بات پر دال بلکہ میرے غور و فکر کی حد تک نصِ قطعی ہے کہ ایمان حقیقی کے دو رکن ہیں نمبر ایک ہر نوع کے ریب و تشکیک اور ذہنی خلجان سے مبرا یقین قلبی اور دوسرا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد۔

بلاشبہ کلمہ شہادت، اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، حج اور صوم رمضان، پانچ ارکان اسلام ہیں۔ ان میں شہادتین کو بنیاد اور دوسرے چار کو ستون کا مقام حاصل ہے، بنیاد اور ستون کے بغیر کسی عمارت کی تعمیر کا تصور ممکن ہی نہیں، لہٰذا میں نے جو تین منزلہ عمارت کی مثال پیش کی تھی اس کی ہر منزل کے لیے یہ ارکانِ اسلام ناگزیر و لابد ہیں، ایمان حقیقی کے دو رکن ہیں ایک قلبی یقین اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ، جہاں تک میں نے غور کیا ہے، نجات کا کوئی دوسرا راستہ اس جہاد کے بغیر کم از کم مجھے نظر نہیں آتا۔ سورۃ العصر میں نجاتِ اخروی کے جو چار ناگزیر لوازم بیان فرمائے گئے ہیں اس میں تیسرا لازمہ، تیسری ناگزیر شرط، تواصی بالحق قرار دی گئی۔ سورۃ ہود کی پہلی آیت مبارکہ میں یہ اصول بیان فرمایا گیا ہے۔ الٓرٰ تِلْکَ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۙ چنانچہ اسی کے مطابق قرآن حکیم اسی تواصی بالحق کی شرح کے لیے مزید کئی اصطلاحات بیان کرتا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح بھی اس کی توضیح و تشریح اور تفصیل ہے۔

ہاں قتال فی سبیل اللہ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی چوٹی ہے۔ یہ اس کا ذروۂ سنام ہے۔ یہ مقام محبوبیت ہے: اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا کَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۔ یہ وہ اعلیٰ مقام ہے کہ اس راستے میں جان دینے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ سورۃ بقرہ میں فرماتا ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ اور سورۃ آل عمران میں فرمایا: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ۔
یہ وہ ارفع مرتبہ ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی تمنا اور آرزو فرمایا کرتے تھے

وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنْ اَغْزُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَاُقْتَلَ ثُمَّ اَغْزُوَ فَاُقْتَلَ۔

"اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، میری تمنا اور آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں لڑوں اور قتل کر دیا جاؤں اور پھر مجھے زندہ کیا جائے اور میں پھر اللہ کی راہ میں جنگ

کروں اور قتل کر دیا جاؤں۔" کتب احادیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دعائیں منقول ہیں: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ اور اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ لیکن سورہ مجادلہ میں اللہ تعالےٰ نے اپنی یہ سنت بیان فرمائی ہے: کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے یعنی طے فرما دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ یقیناً اللہ ہی زور آور اور زبردست ہے۔" رسول کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تحفظ حاصل ہوتا ہے اور وہ مقتول نہیں ہوتے چونکہ عالم ظاہری میں اس طرح رسول کے مغلوب ہونے کا پہلو نکلتا ہے۔ البتہ انبیاء علیہم السّلام کو یہ خصوصی تحفظ نہیں دیا گیا چنانچہ وہ قتل کیے گئے ہیں جس کی سب سے بڑی مثال حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل ہے ضمناً یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ رفع آسمانی کی یہ بھی ایک دلیل ہے چونکہ وہ بھی رسول تھے (علیہ السلام)۔ وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ ۔ پھر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بھی ہے کہ جس قوم کی طرف رسول مبعوث کیا جاتا ہے، وہ قوم اگر رسول کا انکار کر دے اس پر صرف محدود سے چند لوگ ہی ایمان لائیں تو اہلِ ایمان کو بچا کر اس قوم کو عذابِ استیصال کے ذریعہ اسی دنیا میں ہی تباہ و برباد اور ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے، انہوں نے آنجنابؑ کا انکار کیا لیکن انہیں عذاب استیصال سے تاحال نیست و نابود نہیں کیا گیا۔ یہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے لیے دلیل ہے۔ حضرت مسیحؑ قربِ قیامت میں جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی کی حیثیت سے نزول فرمائیں گے اور ان شاء اللہ انہی کے ہاتھوں تمام یہودی عذابِ استیصال و ہلاکت کا مزہ چکھیں گے۔

البتہ قتال ہر وقت نہیں ہوتا۔ موقع محل کے اعتبار سے ہوتا ہے اگر کوئی اسلامی حکومت بالفعل قائم ہو اور اسے غیر مسلموں سے فی سبیل اللہ جنگ کا مرحلہ درپیش ہو تو حالات کے لحاظ سے حسب ضرورت فوج موجود ہے یا مزید ضرورت کے لیے لوگ جنگ کے لیے نکل آئیں تو قتال فرض عین نہیں فرض کفایہ ہو جائے گا۔ لیکن 'جہاد' وہ چیز ہے جو ایک مسلمان پر شعور کی عمر کو پہنچتے ہی فرض ہو جاتا ہے۔ اس جہاد کے مختلف مدارج ہیں جن میں سے بعض کا کسی قدرے تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں اور بعض کی طرف محدود وقت کے باعث میں نے محض اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ قتال اس جہاد کے عمل کی

آخری چوٹی ہے اس کا ذروۂ سنام ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے لگایئے جو صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِہٖ نَفْسَہٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَۃٍ مِّنْ نِفَاقٍ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا جو شخص اس حال میں مر جائے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہ کرے اور اس کے دل میں اس کا خیال آیا ہو نہ اس کی تمنا اور آرزو پیدا ہوئی ہو تو ایسے شخص کی موت نفاق کی ایک شاخ ایک نوع و قسم پر ہوگی۔"

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

ایک اور بات میں آج آپ حضرات کے سامنے رکھنی چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اگرچہ میں بھی اس بات کا قائل ہوں کہ ہمیں حتی الامکان جدید اصطلاحات سے احتراز کرنا چاہیئے۔ ہمیں کتاب و سنت کی اصل اصطلاحات کے ساتھ چمٹے رہنا چاہیئے عافیت اسی میں ہے ورنہ بالکل غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر غلط نظریات اذہان میں رینگ کر آجاتے ہیں اور پیوست ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ایک یہ بھی دشواری پیش آتی ہے کہ ہر دَور کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے، ہر دَور کی چند مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں جو بات کی تفہیم کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اگر اس زبان اور ان اصطلاحات کے ساتھ بات نہیں کی جائے گی تو ابلاغ کا حق ادا نہیں ہوگا۔ COMMUNICATION GAP رہ جائے گا۔ لہٰذا میرے نزدیک VIA-MEDIA یہ ہے درمیانی راہ یہ ہے کہ وقتی طور پر ابلاغ اور افہام کے لیے ان اصطلاحات کو EMPLOY یعنی استعمال کیا جائے لیکن اپنے فکر کو مستقلاً ان اصطلاحات کے حوالے سے استوار کیا جائے جو کتاب و سنت کی ہیں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر میں آپ کے سامنے عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ "جہاد" کے لیے آج کے دَور کی اصطلاح ہے "انقلاب" "انقلابی عمل" بھی جہاد ہے۔ اس انقلابی عمل پر میں نے سیرتِ مطہرہ کے حوالوں سے اور اصولی اعتبار سے متعدد تقریریں کی ہیں۔ البتہ اس میں تھوڑا سا فرق واقع ہوتا ہے۔ میں نے جہاد کے حوالے سے جو تین سطحیں (LEVELS) بیان کی ہیں، انقلابی عمل میں ان کی ترتیب بدل جائے گی۔ جب ہم انقلاب کی بات

کریں گے تو سب سے پہلے دعوت کا مرحلہ آئے گا۔ اس لیے کہ ہر انقلابی فکر کی PROPAGATION اس کی نشر و اشاعت، اس کو پھیلانا۔ اس کو عام کرنا، اسے ذہنوں میں اتارنا، اس کو دلائل کے ساتھ حق ثابت کرنا، اس انقلابی عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طرح درمیانی منزل اب پہلی ہوگئی ہے۔

انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ جو لوگ اس فکر کو قبول کریں انہیں منظم کیا جائے۔ اس لیے کہ انقلاب بغیر جماعت کے نہیں آتا۔ میں پھر عرض کر دوں کہ اس اجتماع میں جس میں بفضلہٖ تعالیٰ علمائے کرام اور اہلِ دانش و بینش بھی موجود ہیں، میں اپنے مطالعہ اور غور و فکر کے نتائج کو واشگاف طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ بات بالکل واضح ہو جائے۔ اس موقع پر اس امر کی صراحت بھی کر دوں کہ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ انفرادی طور پر دین کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ انفرادی سطح پر تبلیغ ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اسی کی سب سے اعلیٰ اور درخشاں مثال حضرت نوح علیہ السلام کی ہے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت دیتے رہے۔ سورۃ نوح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب علیہ السلام نے کس کس طور اور طریقے سے دعوت و تبلیغ کے فریضہ کی انجام دہی کے لیے مساعی کی ہیں اور پھر کتنی حسرت کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا ہے کہ قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاءِي إِلَّا فِرَارًا ۝ وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۝

لیکن قوم مردہ ہو چکی تھی۔ اس نے حضرت نوح کی دعوتِ توحید کو قبول نہیں کیا۔ اس سے اعراض و انکار کیا۔ ساڑھے نو سو برس کی دعوت و تبلیغ کا جو نتیجہ نکلا اس کو سورۃ ہود کی آیت نمبر ۴۰ کے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ "اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اس (نوحؑ) کے ساتھ ایمان لائے تھے۔" یہاں "قلیل" وہ معنی دے رہا ہے جو انگریزی میں A LITTLE دیتا ہے یعنی بہت ہی کم۔ معدودے چند" قرآن حکیم میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؑ پر ان کے گھر والے ہی ایمان لائے تھے۔ اس میں بھی ایک بیٹے نے دعوتِ حق قبول نہیں کی تھی۔

ہ کفر پر ہی اڑا رہا تھا ممکن ہے کہ چند انگلیوں پر گنے جانے والے اور لوگ بھی
یمان لائے ہوں، بہرحال ساتھی نہ ملے، جمعیت فراہم نہیں ہوئی۔ اگلا قدم کیسے اٹھتا
عوان و انصار نہ ہوں تو اگلی منزل کی طرف پیش رفت کیسے ہو۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام
ی استقامت و مصابرت دیکھیے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت و تبلیغ میں لگا دیئے اور کہا
جیئے اور اپنے فرضِ منصبی کو ادا کر دیا۔ ہمارے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ ایک مخلص
شخص اپنی پوری زندگی اس کام میں لگا دے وہ اللہ تعالےٰ کے یہاں سرخرو اور کامیاب
ہوگا۔ معاشرہ اگر مر چکا ہے۔ حق کو قبول کرنے کی صلاحیت معدوم ہو چکی ہے تو کوئی
RESPONSE نہیں ملے گا۔ ساتھی میسر نہیں آئیں گے۔ اس کا کوئی قصور نہیں،
وہ سرخرو ہے۔ اگلا قدم اٹھانے اور اگلی منزل کی طرف پیش رفت کرنے کا موقع ہی نہیں
ملا لہٰذا وہ بری الذمہ ہے۔ اسی طریقے سے تربیت، تزکیہ، تدریس، تعلیم، تصنیف
تالیف یہ سارے کام دین کے ہیں اور یہ انفرادی طور پر ہو سکتے ہیں اور بحمداللہ ہمارے
یہاں یہ سب ہی کام ہو رہے ہیں۔

لیکن جب آخری منزل کی بات ہوگی، اصل ہدف کی بات ہوگی جس کو میں اب
انقلاب سے تعبیر کر رہا ہوں، دین کا غلبہ، دین کا قیام، دین کا نفاذ، دین کی
سربلندی، میرا یہ حسنِ ظن ہے کہ یہاں کوئی احمق شخص ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ یہ کام
انفرادی طور پر ممکن ہے، میرے نزدیک احمق کا لفظ بھی بہت ہلکا ہے، ایسا خیال رکھنے
والا شخص فاتر العقل ہی ہو سکتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ تنظیم کے بغیر
کوئی اجتماعی کام نہیں ہو سکتا، چاہے وہ خیر کے لیے ہو چاہے شر کے لیے، جو اشخاص لوگوں
کی جیبیں کاٹتے ہیں ان کی بھی تنظیم ہوتی ہے، آج کل ڈاکے پڑنا روزمرہ کا معمول ہو گیا
ہے۔ ان ڈاکوؤں کے بھی گروہ GANGS ہوتے ہیں، تنظیم ہوتی ہے تخریب کاری
کے لیے بھی تنظیمیں قائم ہیں۔ جو لوگ اس ملک میں اشتراکی انقلاب لانا چاہتے ہیں،
ان کی بھی باقاعدہ تنظیمیں موجود ہیں۔ لہٰذا اقامت اور اظہارِ دین کے لیے تنظیم اور
جماعت ناگزیر ہے۔ اس سے مفر نہیں ہے

جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گناہگار سوئے دار چلے ہیں

حضرت نوح علیہ السلام کے بالکل برعکس میں دوسری مثال حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دیا کرتا ہوں، سورۃ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ میں جن پانچ اُولوالعزم من الرسل کا ذکر ہوا ہے، ان میں زمانی ترتیب کے لحاظ سے اوّلین ہیں حضرت نوح علیہ السلام اور آخری ہیں جنابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، درمیان میں تین رسول ہیں۔ حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اس طرح حضرت موسیٰ بالکل وسط میں آتے ہیں۔ اب دیکھئے اوّل و آخر میں کتنی متضاد کیفیت ہے کہ ایک نے ساڑھے نو سو برس دعوت دی، کوئی اعوان و انصار نہیں، جمعیت ہی فراہم نہیں ہوئی تو اگلا قدم کیسے اٹھے! اور دوسرے کا معاملہ یہ ہے کہ کل بیس برس میں دنیا کا عظیم ترین صالح انقلاب برپا فرما دیا۔ میں بیس سال فتح مکہ اور اس کے بعد غزوہ حنین کی کامیابی کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں چونکہ اس کے ساتھ ہی جزیرہ نمائے عرب تک انقلاب اسلامی کی تکمیل ہو گئی تھی تا یہ الاقیا اور فیصلہ کن چیز کیا ہے۔ اسے سورۃ فتح کی آیات نمبر ۲۸، ۲۹ کے حوالے سے سمجھئے! فرمایا۔

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔"

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

صحابہ کرام کی وہ جمعیت، وہ تنظیم، اجتماعی طاقت COMMITTED لوگ DEDICATED لوگ جو اپنے آپ کو TOTALLY IDENTIFY کر کے نبی اکرمؐ کے اعوان و انصار بنے ہیں کہ "ہرچہ بادا باد ما کشتی درآب انداختیم"، جو غزوۂ بدر سے قبل ایک مشاورت میں کہہ رہے ہیں کہ "اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ

ہم سے کیا پوچھ رہے ہیں۔ بسم اللہ کیجئے جو بھی آپ کا ارادہ ہو، کیا عجب کہ اللہ ہمارے ذریعے آپ کو آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے جو کہہ رہے ہیں کہ حضورؐ آپ ہمیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھیوں پر قیاس نہ فرمائیے جنہوں نے کہا تھا۔
فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔
جہاں آپؐ کا پسینہ گرے گا وہاں اپنا خون بہانا ہمارے لیے سعادت ہو گی، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جملہ یاد کیجیے جو کہہ رہے ہیں کہ حضورؐ آپؐ ہم سے کیا مشورہ لے رہے ہیں: اِنَّآ اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ - ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں ہم آپؐ کی تصدیق کر چکے، ہم آپ کو اللہ کا رسول تسلیم کر چکے۔ اب خدا کی قسم اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے۔ اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی اونٹنیوں کو دبلا کر دیں گے لیکن برک غماد تک جا پہنچیں گے جو عرب کا ایک دور دراز علاقہ ہے جس کی راہ میں لق ودق صحرا پڑتا ہے۔ یہ ہے وہ فیصلہ کن اور مابہ الامتیاز بات اگر جمعیت نہ ہو۔ اس میں بنیان مرصوص کی کیفیت نہ ہو۔ اس میں سمع وطاعت کا وصف و جوہر نہ ہو۔ اس میں نظم وضبط نہ ہو، وہ تربیت یافتہ نہ ہو، اس کو اللہ کی رضاء سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہ ہو، اس کو زندہ رہنے سے زیادہ اللہ کی راہ میں جان دینا عزیز نہ ہو تو اگلی منزلوں کی طرف پیش رفت اور پیشقدمی کے مراحل آئیں گے ہی نہیں حضرت نوحؑ کو ایسے ساتھی نہ ملے، اگلے مرحلے کا معاملہ درپیش ہی نہ ہوا۔ لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے اعوان و انصار مل گئے جنہوں نے دعوتِ توحید پر لبیک کہا۔ دعوتِ حق کو قبول کیا اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا اور انہوں نے دعوت الی اللہ، اعلائے کلمۃ اللہ، شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لیے شدائد و مصائب، فقر و فاقہ، کشمکش و تصادم، جہاد و قتال کے مراحل میں جاں نثاری، قربانی و ایثار، صبر و تحمل اور استقامت کی وہ مثالیں قائم کیں کہ جن کے متعلق میں وثوق کے ساتھ عرض کیا کرتا ہوں کہ ان کی نظیر تاریخ انسانی نہ آج تک پیش کر سکی ہے۔ اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی۔ اللہ کی طرف سے حضور کو ایسے جاں نثار اصحاب کا ملنا اس لیے بھی تھا کہ اظہار دین الحق آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا، لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط چونکہ آپ آخری نبی اور رسول ہیں

بلند ابنفس نفیس دین حق کو ایک نظام اجتماعی کی حیثیت سے قائم اور نافذ کرکے تاقیا
قیامت نوعِ انسانی پر حجت قائم کرنا بھی آپ کے فرائض منصبی میں ایک امتیازی نش
رکھتا تھا۔ اب آیئے سورۃ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ میں اولوالعزم من الرسل میں سے باکل
بس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ آنجناب کی بعثتیں بھی دو نوعیتوں کی حا
ایک آنجنابؑ آلِ فرعون کی طرف رسول تھے۔ اِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغٰى
اور دوسرے آپؑ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ آنجنابؑ کی دعا پر آپ
کی معاونت کے لیے آپؑ کے بھائی حضرت ہارون کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا گیا
مصر میں دونوں حضرات علیہما السلام دعوت وتبلیغ اور بنی اسرائیل کی تربیت وتزک
میں ہمہ وقت وہمہ تن لگے رہے، حتیٰ کہ فرعون کے اعراض، سرکشی، دشمنی اور ا
کے باعث ہجرت کا مرحلہ آگیا اور آپ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مص
نکل جائیں۔ آپ کے ساتھ لاکھوں کی جمعیت تھی۔ جب آپ بنی اسرائیل کے ساتھ صحرا
سینا پہنچے تو اگلا اور آخری مرحلہ دین کے قیام، اظہار، غلبہ اور نفاذ کے لیے قتال
درپیش آیا اور وحی الٰہی کے ذریعے حکم ہوا کہ ارضِ مقدس (فلسطین) میں داخل ہو
حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا: يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَ
اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝
لیکن قوم بودی نکلی، بزدل نکلی، تھڑدلی نکلی اور اس نے کورا جواب دے دی
قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ
فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝
نتیجہ یہ نکلا کہ انقلابی عمل وہیں رُک گیا، اگر یہ اقامتِ دین کا کام اجتماعی قوت
منظم جمعیت کے بغیر ممکن ہوتا تو اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ اور ا
ساتھی دوسرے پیغمبر حضرت ہارون موجود — علیٰ نبینا وعلیہما السلام کے مبارک
سے تکمیل پاتا۔ لیکن ساتھیوں کی بزدلی اور پیٹھ دکھانے کے باعث انقلابی عمل
تک نہ پہنچ سکا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ نے قوم کو بشارت دی تھی، اللہ کی طرد
کہ ارضِ مقدس تمہیں دی جاچکی ہے اب تمہاری ہمت درکار ہے، پیٹھ دکھاؤ
تو ناکام وخاسر ہو جاؤ گے۔ آیت میں آپ کو سنا چکا ہوں، قوم کی اس بزدلی،

کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور پاداش اپنا حکم سنا دیا۔ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ۔ ان کی نافرمانی اور بزدلی کی وجہ سے ان پر ارضِ مقدس چالیس سال تک حرام کر دی گئی۔ اب یہ اسی صحرا میں اس مدت تک بھٹکتے رہیں گے۔ حضرت موسٰے علیہ السلام قوم کی اس ڈھٹائی، نافرمانی، بزدلی اور کورے جواب سے اتنے آزردہ اور دل گرفتہ ہوتے کہ انؑ کی زبان پر آ گیا: قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ وَاَخِىْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ۔
حضرت موسٰے علیہ السلام کے اس واقعہ سے سبق ملتا ہے کہ اگر جمعیت ہو لیکن وہ INDISCIPLINE ہو۔ اس میں سمع و طاعت کا جوہر نہ ہو۔ اس میں نظم وضبط نہ ہو تو بھی انقلابی عمل آخری مرحلہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے وہ جماعت درکار ہے جس کے متعلق آنحضورؐ نے فرمایا: امرکم بخمس: بالجماعة والسمع والطاعة والهجرة والجهاد فی سبیل الله۔ ایک روایت میں امرکم بخمس کے بعد الفاظ آتے ہیں: الله امرنی بھن۔ اس طرح یہ حکم مزید مؤکد ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اقامتِ دین کے مرحلے کو طے کرنے کے لیے ٹھیٹھ اسلامی اصول سمع وطاعت پر مبنی ایک منظم جماعت ناگزیر و لابد ہے، یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ جہاد کی میں نے جو سطحیں بیان کی ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بھی جماعتی زندگی لازم ہے۔ اکیلا شخص معاشرے کے دباؤ، نفس کی ترغیبات اور ابلیس لعین کی تحریصات کے مقابلے میں مشکل ہی سے ٹھہر سکتا ہے۔

دعوت کے ساتھ تربیت کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کی اہمیت کو اکبر الہ آبادی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس شعر میں بیان کیا ہے۔

؎ تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

علامہ اقبال نے ان کو اپنا مرشد معنوی مانا ہے۔ میرا گمان ہے کہ علامہ کے اس شعر میں جو میں آپ کو سنانے والا ہوں، اس کا مرکزی خیال علامہ نے اکبر کے اسی شعر سے مستعار لیا ہے، لیکن اپنا اپنا اسلوب، اپنا اپنا مقام اور اپنا اپنا رنگ ہے۔ اقبال نے اسے جس طرح ادا کیا ہے اس کی اپنی ایک شان ہے۔

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

اور علامہ کی فارسی شاعری میں یہ مضمون CLIMAX پر آتا ہے

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

یہ تربیت ہے، یہ تزکیہ ہے، یہ تعلق باللہ ہے۔ یہ رضائے الٰہی کے حصول کی آرزو تمنا ہے۔ ان چیزوں سے وہ اجتماعی طاقت وجود میں آتی ہے جس کو سلطنت جم پر دے مارنا ہے جس کو باطل اور طاغوت سے جا ٹکرانا ہے۔

اگلے تین مراحل وہی ہیں جو بیان ہو چکے ہیں PASSIVE RESISTANCE
ہے (ACTIVE RESISTANCE) ہے۔ پھر ARMED CONFLICT
ہے۔ لیکن یہ جو پہلا مرحلہ ہے، جسے انقلابی عمل میں اصل حیثیت و اہمیت اور اوّلیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے دو مرحلے وہ ہیں جہاں جہاد قرآن سے ہوگا۔ پہلا مرحلہ ہے دعوت وہ نظریاتی تصادم، وہ نظریاتی کشمکش، اس کے لئے بندۂ مؤمن کے ہاتھ میں جو تلوار ہے وہ قرآن ہے۔ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۝ اس کے ساتھ حکمت بھی ہو: ذٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ۔ اس حکمت کے ذریعے دعوت وتبلیغ، یہ قرآن موعظۂ حسنہ بھی ہے: قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ ۝ اسی میں جدال بھی ہے، مشرکین سے، ملحدین سے، منافقین سے، اہل کتاب سے، ان کے ساتھ مجادلہ کا ذریعہ بھی یہی قرآن ہے، سورۃ نحل کی اس آیت میں یہ تمام طریقے نہایت حسین طریقے سے آ گئے: اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ
پس قرآن کی تلوار ہاتھ میں لے کر نظریاتی تصادم وکشمکش کے میدان میں کود پڑو۔ انذار قرآن کے ذریعے سے: وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ ۚ
تبشیر قرآن کے ذریعے سے۔ میں آپ کو سورۃ مریم کی آیت سنا چکا ہوں جس میں انذار اور تبشیر دونوں کا ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے: فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ۝ میں اپنے اس احساس کا اعادہ کر

رہا ہوں کہ اس "بیلہ" پر ہمارے اکثر اہلِ علم نے کماحقہٗ توجہ نہیں دی۔ سورہ کہف کی پہلی دو آیات میں بھی انذار و تبشیر کے لیے ذریعہ نہایت جمیل اسلوب سے قرآن کو قرار دیا گیا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۔ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۔
تذکیر قرآن سے ہے:۔ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۔ معلوم ہوا کہ دعوت و تبلیغ کہہ لیں یا نظریاتی تصادم و کشمکش کہہ لیں، اس کا ذریعہ اس کا آلہ قرآن ہے۔ ہم نے تو اس قرآن کو وعظ کا ذریعہ بھی نہیں بنایا۔ اقبال نے اس کے مرثیے کہے ہیں۔

واعظِ دستاں زن افسانہ بند — معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او — با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او

واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھتا ہے اس کے الفاظ بھی پرشکوہ اور بلند و بالا ہوتے ہیں لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے۔ اس کا سارا وعظ قرآن کے بجائے یا تو خطیب بغدادی سے ماخوذ ہوتا ہے۔ یا دیلمی سے اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف، شاذ اور مرسل روایات سے رہ گیا ہے۔" ہمارے عام واعظین نہ معلوم کہاں کہاں سے ضعیف حدیثیں لاتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے ہمارے دور میں ضعیف حدیثوں کے حوالے سے تبلیغ ایک باقاعدہ INSTITUTION کی صورت اختیار کر گئی ہے، فضائل کے بیان اور نیکیوں کی تلقین کے لیے اولیائے کرامؒ کی غیر مصدقہ کرامات کا ذکر ہے۔ ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کا سہارا ہے۔ حالانکہ موعظہ حسنہ تو یہ قرآن ہے۔ دل کی کایا پلٹ دینے کے وصف کا حامل یہ قرآن ہے لیکن اس کو سمجھنا بھی مت، تفسیر تو درکنار اس کا ترجمہ بھی نہ پڑھنا۔ اس کی تو بس تلاوت کر کے ثواب حاصل کر لیا کرو۔ وعظ و نصیحت کے لیے ضعیف روایات یا بے سروپا قصے کہانیاں جن کو ایک عام معقول انسان کا ذہن بھی قبول نہ کرے اور اسے فوراً رد کر دے اور ان کو تسلیم کرنے پر اس کا دل تیار نہ ہو۔ اس کے ذریعہ سے ابلاغ کیا ہوگا۔ بس

پہلا جہاد بالقرآن ہے دعوت کے لیے۔ نظریاتی تصادم میں ہماری تلوار قرآن ہے اگرچہ اس کا حق ادا کرنا اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ - کی بشارتِ نبویؐ کو چند سعید روحیں اپنا مقصدِ زندگی بنائیں۔ ان کو اس کے لئے کھپنا پڑے گا۔ اس کے لئے زندگیاں لگانی ہوں گی۔

دوسرا مرحلہ ہے تربیت۔ اس کے لیے بھی ہمارے پاس اصل تلوار قرآن ہے ذرا غور تو کیجئے کہ قرآن اس کا مدعی ہے اس حقیقت کا کہ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ میں ہوں۔ لیکن ہم نے تزکیۂ نفس کے لیے کہاں کہاں بھیک مانگی ہے اور پھر اس کے لیے فلسفے اور پورے پورے نظام مدوّن کیے ہیں مگر اس کوچے میں گزر نہیں ہے تو قرآن کا نہیں ہے۔ اقبال نے اس کا بھی نوحہ کہا ہے۔

صوفیِ پشمینہ پوش حال مست   از شرابِ نغمۂ قوّال مست

آتش از شعرِ عراقی در دلش   در نمی سازد بقرآں محفلش

"پشمینہ پوش صوفی اپنے حال میں مست اور قوالی کی شراب سے مدہوش ہے اس کے دل میں عراقی کے شعر سے آگ بھڑک جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں" اور بالفرض کچھ ہو بھی تو اس کا کوئی اثر نہیں جو مدعی ہے شفاء لما فی الصدور کا، جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا جس کے لیے وہ کہتا ہے: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ لیکن اس کی ناقدری کا یہ عالم ہے کہ اور سب کچھ استعمال ہو جائے گا ہم نے سارے کوچے گھنگال لیے، دَر دَر سے بھیک مانگ لی لیکن یہ دروازہ بند ہے تزکیہ بھی اسی قرآن کے ذریعے ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کو بھی اس دَور میں اقبال نے خوب پہچانا ہے۔ مجھے معاف فرمائیں، میں علمائے کرام کی عظمت اور ان کے مقام و مرتبہ کا جس درجے معترف ہوں وہ سب کو معلوم ہے۔ لیکن اس حقیقت کو بیان کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ان حقائق کا جو انکشاف اقبال پر ہوا ہے اور ان کا جو شعور و ادراک علامہ کو حاصل ہوا ہے وہ مجھے اس دَور میں اور کہیں نہیں نظر آتا۔ کس خوبصورتی سے کہتے ہیں ؎

کشتنِ ابلیس کارِ مشکل است ٭ زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی ❊ کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ وہ انسان کے دلوں میں ڈیرا لگا لیتا ہے اور اس کی رسائی انسان کے دل کی گہرائیوں تک ہے بہتر راستہ یہ ہے کہ اسے قرآن کی حکمت و ہدایت کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنا لیا جائے غور کیجئے ہر شعر میں احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ کو کس طرح سمو دیا ہے میں آپ کو یہ حدیث سنا چکا ہوں کہ: اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ۔ شیطان انسان کے وجود میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے کہ خون" پہلے شعر میں اس کا حوالہ ہے۔ دوسرا شعر بھی ایک حدیث نبوی سے ماخوذ ہے۔ ایک مرتبہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ کسی صحابی نے بڑی ہمت اور جرأت کی، اللہ تعالے انہیں اجر دے وہ دریافت نہ کرتے تو یہ حکمت ہم تک کیسے پہنچتی؟ انہوں نے سوال کیا کہ "کیا حضورؐ آپ کے ساتھ بھی ہے؟" آپ نے جواب میں فرمایا کہ "ہاں، ہے لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے"، یہ ہے وہ بات جو اس مصرعہ میں علامہ نے کہی ہے۔ خوشتر آں باشد کہ مسلمانش کنی، لیکن وہ مسلمان کس طور سے ہوگا اسے علامہ دوسرے مصرعہ میں بیان کرتے ہیں۔ کشتۂ شمشیرِ قرآنش کُنی۔ یہ قرآن شیطان کو مسلمان بناتا ہے، اگر زہر وہ ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے تو یہ قرآن بھی وہ تریاق ہے جو پورے وجود میں سرائت کرتا ہے، ظاہر ہے اگر تریاق زہر سے زیادہ موثر نہ ہو تو زہر کا اثر کیسے زائل ہوگا۔ اس بات کو بھی اقبالؒ نے کہا ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

یہ قرآن جب کسی کے اندر سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب آجاتا ہے۔ اب وہ انسان بالکل بدلا ہوا انسان بن جاتا ہے۔ یہ باطنی انقلاب ہے، اندر کی تبدیلی ہے۔ میں بات کو مختصر کرنے کے لیے اس شعر میں اپنا مفہوم شامل کر رہا ہوں، یہ باطنی انقلاب، یہ اندر کی تبدیلی، ایک عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بنتی ہے ورنہ انقلاب کہاں سے آئے گا۔ جہاں دیگر شود کا پہلا اور اصل مفہوم تو یہ ہوگا کہ جس انسان کے اندر قرآن کے ذریعے تبدیلی آگئی، اس کے لیے جہان بدل گیا۔ اس کی دیکھنے والی

نگاہ بدل گئی ۔ اس کا زاویہ نظر بدل گیا ۔ اس کی اقدار بدل گئیں ۔ اب اس کے لیے یہ جہان وہ نہیں ہے بلکہ جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا ۔ یہ عالمِ پیر مر رہا ہے والا معاملہ ہے ۔ جب کسی کے دل میں قرآن اتر جائے ، اس کے لیے اب یہ عالم نیا عالم ہے ۔ اس کا نقطۂ نظر اور مطلوب و مقصود بدل گیا ہے اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اگر ایسے فدائین کی ایک ڈسپلن جماعت وجود میں آ جائے جس کے دل میں قرآن جاگزیں ہو جائے تو یہ تبدیلی عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہے ، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے اندر جوشِ ایمانی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ اسی قرآن کی بدولت ہی پیدا ہوا تھا ۔ یہ مختصر سی اور بے سروسامان جماعت ، ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار لے کر کسریٰ و قیصر کے وقت کی دو عظیم سلطنتوں سے جا ٹکرائی تھی اور بیس سال کے مختصر عرصہ میں اوّل الذکر کو بالکل نیست و نابود اور آخر الذکر کو مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ سے بالکلیہ بے دخل کر دیا تھا اور ان علاقوں پر اللہ ہی کے دین کا جھنڈا لہرانے لگا تھا ۔

حاصل کلام یہ کہ انقلابی عمل کی دو سطحیں ہیں یا یوں کہہ لیں کہ جہاد کے دو EVELS۔ ہیں ، مجاہدہ مع النفس کے لیے ہمارے ہاتھ میں تلوار قرآن ۔ اور نظریاتی کشمکش اور تصادم کے لیے بھی ہماری تلوار قرآن ، تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اسی جہاد بالقرآن کا عزم لے کر میں ۱۹۶۵ء کے آواخر میں ساہیوال سے لاہور منتقل ہوا تھا ۔ ورنہ ۱۹۵۴ء میں لاہور سے ایم بی بی ایس کر کے میں ساہیوال میں مقیم ہو گیا تھا ۔ لاہور آ کر میں نے بالکل تن تنہا اس کام کو شروع کیا ۔ اس وقت کوئی ساتھی نہیں ، کوئی ادارہ نہیں ، کوئی انجمن نہیں ۔ 'میثاق' کا چارج سنبھالا تو تنہا ، خود ہی اس کا ایڈیٹر خود ہی مالک ، خود ہی پروف ریڈر ، حتیٰ کہ خود ہی اس کا چپڑاسی ۔ پھر دارالاشاعت الاسلامیہ قائم کیا ۔ وہ بھی تنہا ، وہی 'میثاق' والی صورتِ حال ، سا تھ ہی مولانا حسرت موہانی کے اس مصرعہ کے مصداق سے ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی ۔ مطب بھی کر رہا تھا ، نبضیں بھی دیکھ رہا تھا اور نسخے بھی لکھ رہا تھا ۔ اسی دوران کئی علاقوں میں مطالعہ قرآن کے حلقے قائم کیے ۔ اور منتخب نصاب کا درس شروع کیا ۔ قرآن کی دعوت کا یہ اعجاز کہ اعوان و انصار ملتے چلے گئے ۱۹۷۲ء کے اوائل میں میں نے میثاق میں مرکزی انجمن

خدامُ القرآن اور اس کے زیرِ انتظام قرآن اکیڈمی کے قیام کا خاکہ پیش کیا۔ الحمدللہ بعض درد مند اور اہلِ دل حضرات نے اس پر لبیک کہی اور ۱۹۷۲ء کے وسط میں باقاعدہ انجمن قائم ہو گئی۔ میں نے انجمن کے خاکے اور پھر دستور کی تقدیم میں یہ شعر درج کیا تھا۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

الحمدللہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۴ء تک قریباً بارہ سال انجمن کے قیام پر گزر گئے اس عرصہ میں جو بھی بن آیا ہے اور جس کام کی بھی اللہ کی طرف سے توفیق ملی ہے وہ آپ حضرات کے سامنے ہے، انجمن کا قیام۔ اس کے لیے دفاتر، رہائشی کوارٹرز، ہوسٹل، جامع القرآن، قرآن اکیڈمی کی تعمیرات، علوم و معارفِ قرآنی کی نشر و اشاعت کے لیے مکتبہ کا قیام۔ پاکستان کے چند دوسرے شہروں کے دعوتِ رجوع الیٰ القرآن کا پیغام پہنچانے کے لیے دَورے اور دروس و خطابات کے ذریعے دین کے جامع تصوّر کو اجاگر کرنے کی کوشش، قرآن کانفرنسوں اور ایب محاضراتِ قرآنی کا انعقاد، مختلف شہروں میں قرآنی تربیت گاہوں کا انتظام، ساتھ ہی اسی پیغام کے لیے بیرونِ پاکستان کے اسفار۔ میں نے یہ کام صرف اس مقصد کے لیے گنوائے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ ان سب کاموں کو آپ "جہاد بالقرآن" کے عنوان کے تحت اپنے حافظے میں درج کر لیں۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب خالصتہً اللہ ہی کی طرف سے اس دَور کے سب سے مؤثر ذریعۂ ابلاغ ٹیلی وژن پر پورے پندرہ ماہ تک "الہدیٰ" کے نام سے قرآن مجید کا پیغام اس ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا، میرے ساتھی یہاں موجود ہیں، وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ میرے یہاں آج تک ٹیلی وژن نہیں ہے۔ میں اس کوچے کا مسافر ہی نہیں۔ پہلی مرتبہ جب اسلام آباد سے ٹی وی کے ایک پروڈیوسر صاحب لاہور انجمن کے دفتر رمضان المبارک میں روزانہ "الکتاب" کے عنوان سے تقاریر کی تجویز لے کر تشریف لائے تو اس وقت انجمن کی مجلسِ منتظمہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر ان سے ملنے گیا۔ انہوں نے کہا کہ پورے رمضان میں روزانہ بارہ منٹ کا "الکتاب" کے عنوان سے ایک پروگرام ہو گا۔ اس میں آپ کو ایک ...رے کے بارے میں کچھ بیان کرنا ہو گا۔ میں نے کہا مت ماری گئی ہے، مجھے ایک

آیت کے بیان کے لئے بسا اوقات ایک گھنٹہ درکار ہوتا ہے اور آپ ایک پارے کے لئے مجھے بارہ منٹ عطا کر رہے ہیں۔ میں اس مختصر سے وقت میں کہوں گا کیا؟ میں نے معذرت کی کہ مجھ میں اس کی نہ صلاحیت ہے اور نہ جرأت، آپ کسی اور کو تلاش کیجئے۔ میں دفتر والوں سے یہ کہہ کر ان کی چائے وغیرہ سے تواضع کر کے ان کو رخصت کر دو، انجمن کے اجلاس میں واپس آگیا۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ کون صاحب تھے؟ کیا معاملہ تھا۔ میں نے جب بتایا تو سب اراکین میرے سر ہو گئے کہ آپ نے یہ کیا کیا، پانچ منٹ بھی دیں تو لو! وہ اس ذریعۂ ابلاغ کی اہمیت سے واقف تھے۔ وہ اس دنیا کے رہنے والے ہیں، میں اصل میں اس دنیا کا رہنے والا ہوں ہی نہیں، میری ایک چھوٹی سی علیحدہ دنیا ہے، میں اسی میں مگن ہوں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ میں اسی دنیا میں دفن ہو جاؤں اور مجھے اس سے باہر کی ہوا نہ لگے، نہ مجھے نہ میرے اہل و عیال کو۔ بہرحال اراکین کے اصرار پر میں دوبارہ اٹھ کر گیا، وہ صاحب ابھی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ساتھیوں کے اصرار پر میں یہ پیشکش منظور کرتا ہوں۔ دو سال رمضان المبارک میں روزانہ "الکتاب" کا پروگرام ٹی وی پر نشر ہوا، پھر تیسرے سال رمضان ہی میں "الٓمٓ" سیریز چلی۔ پھر "الہدیٰ" کا ہفتہ وار پروگرام شروع ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے یہ راستہ پیدا فرما دیا۔ پھر جب بالکل درمیان میں "الہدیٰ" کا پروگرام ختم ہوا، درمیان میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ میں اس پروگرام میں "مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا سلسلہ وار بیان کر رہا تھا — وہ نصف ہوا تھا کہ اچانک یہ پروگرام بند کر دیا گیا۔ جب سے وہ ختم ہوا ہے، میں قطعی مطمئن ہوں کہ یہ اللہ ہی کا فیصلہ ہے اور اس میں یقیناً خیر ہے: عَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

اس "الہدیٰ" کے پروگرام کے ذریعے ملک بھر میں ایک پیاس پیدا ہو گئی۔ لوگوں کی یہی پیاس ہے جو مجھے کھینچ کر جگہ جگہ لے جا رہی ہے اور عرصہ سے صورت حال یہ ہے کہ میں عموماً لاہور سے ہفتہ کی صبح کو نکلتا ہوں اور جمعرات کی رات یا جمعہ کی صبح کو یہاں واپس پہنچتا ہوں۔ اگر آج شہر شہر جا کر میں قرآن کا پیغام پہنچا رہا ہوں تو ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے "الہدیٰ" کے پروگرام کو بنایا۔ ورنہ کون

جانا تھا۔ اور اگر ہم ابھی پچاس برس بھی لگے رہتے تو اپنے محدود ذرائع اور وسائل سے اتنا وسیع حلقۂ تعارف پیدا نہیں ہوسکتا تھا اور معاشرے میں اتنی پیاس پیدا نہیں ہوسکتی تھی جو بظاہر احوال نظر آرہی ہے۔

بہرکیف میں گفتگو کے اختتام سے قبل عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی ہمارا ذریعۂ دعوت ہے۔ نظریاتی تصادم اور کشمکش کے لئے ہماری تلوار قرآن حکیم ہے، جہاد بالقرآن ہی ہمارا طریق کار ہے۔ نفس اور شیطان سے کشمکش کے لئے بھی ہمارے ہاتھ میں واحد تلوار قرآن مجید ہے۔ وقت کی محدودیت کے پیشِ نظر اجمالاً عرض کر رہا ہوں کہ تزکیۂ نفس کے لئے قرآن نے جو پروگرام دیا ہے، اس میں دو مؤثر ترین چیزیں ہیں۔ ایک قیامُ اللیل۔ دوسری اس قیام میں ترتیل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت و قرأت، ابتدا میں قیامُ اللیل کا حکم اطلاقی شان کے ساتھ آیا تھا: يَآ أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۙ نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۙ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝ بعد میں جب اس نے ایک معیّن شکل اختیار کی ہے تو حکم آیا: وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ، رات کا جاگنا اور مجرد جاگنا نہیں بلکہ قیام میں قرآن کی طویل قرأت و تلاوت۔ یہ دو ہتھیار ہیں جس سے ایک بندۂ مؤمن کی جہاد بالقرآن کے لئے سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، اس کی دعوت، موعظہ اور مجادلہ میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

میں آج جہاد بالقرآن کے ذیل میں یہ باتیں آپ کے سامنے عرض کرنی چاہتا تھا، مجھے احساس ہے کہ میں نے اندازے سے زیادہ وقت لے لیا ہے۔ میں جنابِ صدر مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہٗ علمائے کرام، دانشور حضرات اور جملہ شرکا کا انتہائی شکرگزار ہوں کہ تمام حضرات نے میری معروضات کو توجہ سے سماعت فرمایا۔ اللہ تعالےٰ اس قرآن کو ہاتھ میں لے کر ہمیں باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے کی سعادت اور خود اپنے شیطان اور اپنے نفس سے لڑنے کے لیے اس قرآن کی تلوار کو استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اَللّٰهُمَّ آنِسْ وَحْشَتَنَا فِيْ قُبُوْرِنَا۔ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ وَاجْعَلْهُ لَنَا إِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً۔ اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

(الحدید: ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے اور لوگوں کیلئے

بڑے فوائد بھی ہیں۔

اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ

۳۲- ایمپرس روڈ- لاہور

ضر حاضر کی بے نظیر تفسیر

معارف القرآن

حقائق و معارف کلام اللہ اور علوم قرآن کا جامع ذخیرہ

۶ جلدیں

چھپ کر تیار ہیں

حضرت العلامہ شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ

پاکستان بھر میں واحد تقسیم کار مکتبہ مدنیہ لاہور

ہدیہ: ۳۰۰ روپے اعلیٰ ڈائی دار جلد سٹاک محدود فوراً حاصل کیجیے

ہمارے ہاں ہر قسم کی دینی و نصابی کتب نیز ردِ شرک و بدعت پر لاجواب لٹریچر بھی دستیاب ہے وی پی بھیجنے کا خصوصی انتظام موجود ہے۔ اپنے مسلک کے مکتبہ سے تعاون کر کے اسے اس قابل بنائیں کہ وہ مزید اپنے اکابر کی تالیفات شائع کر سکے۔ علماء اہل سنت دیوبند کی تصنیفات کا واحد مرکز

مکتبہ مدنیہ ۱۷۔ اردو بازار لاہور۔ فون ۶۲۵۲۰

ٹینٹ اور ترپال
بنانے کا ممتاز ادارہ
ایچ نظام دین اینڈ سنز
مرکزی دفتر
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

پاکستان کی کھلی فضاؤں میں
پاکستان کی
کھلی فضاؤں میں
اذانوں کی گونج
ہماری روحانی میراث
کی آئینہ دار ہے
اور
مشینوں کے چلتے ہوئے پہیوں کا شور
ہماری صنعتی ترقی کا مظہر ہے
ملکی صنعت قوم کی خدمت ہے اور قومی خدمت ایک عبادت ہے
سروس اپنے شوز کی ایکسپورٹ سے زرِ مبادلہ کما کر دن رات
وطنِ عزیز
کی خدمت میں سرگرم عمل ہے
سروس شوز۔ دُنیا کے گوشے گوشے میں مقبول

عن انس رضؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
لا یؤمن احدکم
حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ
(رواہ البخاری)
حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جیسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔
رشید جیولری ہاؤس لاہور
ٹمپل روڈ
سوہا بازار
٣١١۴٠ — ٣٠۴٣٣
٦۴۴٣٣ — ۵٦۴٧٩
پروپرائیٹر: اے وحید

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
کی مطبوعات میں
ایک اہم اضافہ
عیدالاضحیٰ
اور
فلسفہ قربانی
ڈاکٹر اسرار احمد
کی
ایک اہم تقریر جس کا مطالعہ ان شاء اللہ
کئی شکوک و شبہات کو دور کر دے گا۔
صفحات - ۴۸
قیمت : ۳ روپے صرف
ملنے کا پتہ
۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۲۶۱۱
EAGLE
EAGLE IRIDIUM
ایگل
ایک عالمگیر قلم
خوشخط، رواں
اور دیرپا
اسٹین لیس
اسٹیل کی
اریڈیم ٹپڈ نب
کے ساتھ
ہر جگہ دستیاب

الحمد للہ
ایک اور اعزاز

Regd. L. No. 7360

MONTHLY "MEESAQ" LAHORE

Vol. 33	SEPTEMBER 1984	No. 9

تذکرہ و تبصرہ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

ماہنامہ **میثاق** لاہور

جلد ۳۳ | شمارہ ۱۰ | محرم الحرام ۱۴۰۵ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۴ء

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون : ۸۵۲۶۱۱

سب آفس : ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

مشمولات

شیخ جمیل الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

بحمداللہ محرم الحرام ۱۴۰۵ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۴ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اسلامی تقویم کے لحاظ سے اس ماہ مبارک سے پندرھویں صدی کے پانچویں سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس نئے سال کی آمد پر قارئین کرام اور جملہ مسلمانانِ عالم کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس سال کو عالم اسلام اور ارضِ پاکستان کے لئے بالخصوص اور پوری دنیا کے لئے بالعموم امن و سلامتی کا سال بنائے: ھِلَالُ رُشْدٍ وَّخَیْرٍ۔ مزید برآں اس کے دوران اللہ تعالیٰ کے علم کامل کے مطابق جن مسلمانوں کی مہلتِ عمر تمام ہونے والی ہو ان کا خاتمہ ایمان پر ہو اور جن مسلمانوں کے لئے اس عزّوجل کے علم کامل و ازلی کی رو سے مزید مہلتِ عمر باقی ہو ان کی زندگی اسلام کے رنگ میں رنگ جائے: اَللّٰھُمَّ مَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ وَمَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ۔

اس شمارے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد دامت برکاتہم کا وہ مکمل خطاب "تذکرہ و تبصرہ" کے عنوان سے شامل ہے جو موصوف نے شمالی امریکہ اور انگلستان کے دعوتی دورے (از ۶ جولائی تا ۱۴ اگست ۸۴) سے مراجعت کے بعد ۱۷ اگست ۸۴ء کے جمعہ کو مسجد دارالسلام لاہور میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس خطاب میں سلطنتِ خداداد پاکستان کے موجودہ حالات پر اور بعض دینی امور پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ خاص طور پر ان منکرات و بدعات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو جشنِ آزادی کے موقع پر اور مختلف انداز سے ہمارے معاشرے میں تیزی سے فروغ پا رہی ہیں۔ ایک طرف اربابِ اقتدار کی طرف سے یہ نوید جانفزا سات سال سے سنائی جا رہی ہے کہ اس ملک میں اسلام آ رہا ہے دوسری جانب اس کی طرف سے منکرات و بدعات کی سرپرستی ہو رہی ہے۔ یہ تضادِ قول و عمل اللہ تعالیٰ کی سخت بیزاری کا باعث ہوتا ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ قارئین جب اس خطاب کا مطالعہ کریں گے تو انہیں محسوس ہوگا کہ اس کا اسلوب و انداز ناقدانہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ملک اس وقت جن خارجی اور داخلی

خطرات میں گھرا ہوا ہے، وہ کسی بھی بالغ نظر شخص سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ان سنگین اور تشویش ناک صورتِ حال میں ہمارا قومی سطح پر راہرو پشت بمنزل رہنا اور قول وعمل کے تضاد میں مبتلا نظر آنا یقیناً ایک دلِ حسّاس میں تلخ نوائی پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وقت کا تقاضا ہے کہ بات دلیل کے ساتھ ساتھ تنقید کے انداز سے کہی جائے۔ قرآن مجید میں بھی جو ھُدًی لِّلنَّاسِ ہے یہ اسلوب موجود ہے۔ وہ جہاں ترغیب و تشویق دلاتا ہے، دل گداز موعظت و نصیحت کا انداز اختیار کرتا ہے۔ وہاں وہ زجر و توبیخ، تنقید اور جھنجوڑنے کا اسلوب بھی اختیار کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال سورہ صف کی دو آیات سے پیش کی جا چکی ہے۔ مزید برآں سورہ حدید میں جو خطاب بہ امّتِ مسلمہ کے ضمن میں بڑی جامع سورت ہے۔ یہ انداز بہت نمایاں ہے۔ اس سورہ مبارکہ میں ' وَمَا لَكُمْ ' اور کئی مقامات پر ' اعلموا ' فرما کر امّت کو جھنجوڑا گیا ہے اور ایک آیت کا حصّہ تو لرزا دینے والا ہے ، اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ' یہی بات محترم ڈاکٹر صاحب موصوف نے اربابِ اقتدار اور پاکستان کے مسلمانوں سے کہی ہے کہ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائیں۔ اپنی کوتاہی کا اعتراف اور توبہ کریں۔ انابت الی اللہ اختیار کریں اور اخلاص کے ساتھ اصلاح کی طرف متوجہ ہوں ــــ کہیں ایسا نہ ہو کہ قوموں اور ملکوں کی قسمت کے فیصلے کے لئے اللہ کے علم ازلی میں جو مہلت مقرر ہے وہ ختم ہو جائے اور پھر خسران الدنیا والآخرہ کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے اور ہم کفِ افسوس ملتے ہی رہ جائیں۔ ہمیں ڈرنا چاہیے کہ ہمارے ساتھ یہ معاملہ نہ ہو جائے ــــ
سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝
اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا شَرَّ مَا تَعْنِيْتُ ۔

راقم کے اندازے کے مطابق جولائی ۸۳ء سے وسط ستمبر ۸۴ تک ڈاکٹر صاحب موصوف کی دعوتی سرگرمیاں اس عروج پر رہی ہیں کہ پچھلے تمام ریکارڈ مات ہو گئے ہیں۔ ۱۳ اگست ۸۴ء کو شمالی امریکہ اور انگلستان کے پُر مشقت دورے سے واپسی ہوئی اور ۱۴ اگست سے بھرپور تنظیمی اور دعوتی سرگرمیاں جاری ہو گئیں جن کا کچھ اندازہ " رفتارِ کار " کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ اس طویل سفر سے واپسی پر موصوف پر تکان اور اضمحلال طاری تھا۔ اور طبیعت مائل بہ ملالت بھی نظر آتی تھی لیکن دعوت الی اللہ کی جو دھن ان پر مسلط ہے اس نے انہیں مصروف

رکھا اور وہ اسی جوش و جذبے کے ساتھ لگے رہے ۔ ان دنوں میں اکثر اوقات تو موصوف نے دو دو بلکہ تین تین تقاریر کیں ۔ ساتھ ہی مسلسل سفر کی مشقت مستزاد ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ عالم اسباب و علل کے اصول پر تخلیق فرمایا ہے اور اسی عزّ و علا کے اذن سے طبعی قوانین کے اثرات ظہور پذیر ہوتے ہیں ۔ بلاتشبیہ عرض ہے کہ فخرِ دو عالم ، سید وُلدِ آدم ، محسنِ انسانیت جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے لئے بھی اذنِ الٰہی سے ان طبعی قوانین کا ظہور رہا ۔ طائف کی گلیوں میں پتھروں کی بوچھاڑ سے جسمِ اطہر لہولہان ہوا ۔ پائے مبارک ؑ اس پاک خون کے باعث نعلین شریف میں جم گئے ، ضعف کے سبب سے غشی کی کیفیت بھی طاری ہوئی ۔ غزوہ اُحد میں دندانِ مبارک شہید ہوئے ۔ چہرۂ مبارک خونِ اقدس سے رنگین ہوا ۔ خود کی کڑیاں رُخِ انور میں پیوست ہوئیں ۔ جب حضورؐ پر ان قوانینِ طبعیہ کا اطلاق ہوا تو ڈاکٹر صاحب کی بساط کیا ؟ ان پر بھی قوانینِ طبعی کا اطلاق ہوا ۔ اس مسلسل مشقت کے نتیجے میں ۱۵ ستمبر کی شب کو جبکہ تنظیم اہلِ سنّت والجماعت کے اجلاس میں ، جس میں ملک کے مشہور و معروف داعی توحید جناب مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری ، اس تنظیم کے امیر بھی شریک تھے ، توحید کے موضوع پر قریباً پونے دو گھنٹے کی تقریر کر کے اور اتنا ہی وقت حضرتِ شاہ صاحب مدظلہ العالی کے گرانقدر ارشادات کی سماعت کے بعد قریباً رات کو ڈیڑھ بجے تک قرآن اکیڈمی واپسی ہوئی تو کمر کے درد کا جو امریکہ سے واپسی کے بعد ہی سے محسوس ہو رہا تھا ۔ اس کا شدید حملہ ہوا ۔ ساتھ ہی تیز بخار بھی ہو گیا ۔ کمر کے درد کی شدّت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا بھی دشوار ہو گیا ۔ اب تا دمِ تحریر ۲۳ ستمبر بحمداللہ اتنا افاقہ ہوا ہے کہ بخار اتر گیا ہے اور فرض باجماعت تو کھڑے ہو کر ادا ہو رہے ہیں ۔ لیکن سنن و نوافل کی بیٹھ کر ادائیگی ہو رہی ہے ۔ موصوف لاہور کے معروف فزیشن جناب ڈاکٹر عبدالرزّاق صاحب قاضی کے زیرِ علاج ہیں ۔ دوسرے مشہور فزیشن جناب ڈاکٹر راشد رندھاوا صاحب بھی علاج میں شریکِ مشورہ ہیں ۔ ان دونوں حضرات کا مشورہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کم از کم دو ماہ تک مکمل آرام کریں اور ہر نوع کی جسمانی و ذہنی مشقت کے کاموں سے پرہیز کریں ۔ خاص طور پر سفر سے اجتناب کریں ۔ اسی کے پیشِ نظر وہ تمام پروگرام فی الوقت ملتوی کر دیئے گئے ہیں جو لاہور اور باہر سوات کے مختلف شہروں نیز پشاور کے لئے ستمبر کے اواخر تک انجام دینے تھے ۔ راقم کو ڈاکٹر صاحب کی سیماب وش طبیعت ، اور دعوت کے کام سے ان کا کے والہانہ لگاؤ کا

بخوبی اندازہ ہے۔ اس لیئے اندیشہ ہے کہ جوں ہی ان کی طبیعت ذرا اور سنبھلے گی تو دعوتی سرگرمیاں اور اسفار کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ بہر حال وہی ہوتا ہے اور وہی ہو گا جو مشیتِ الٰہی میں طے ہے: وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ انسان کی چاہت اور اس کا ارادہ بھی مشیتِ الٰہی کے تابع ہوتا ہے ۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس خادم دین اور خادم قرآن کو صحت و تندرستی کے ساتھ تادیر سلامت رکھے اور انہیں اس خدمت کی مزید توفیق عنایت فرمائے۔

اَذْهِبِ الْبَاْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِیْ

لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُکَ لَا یُغَادِرُ سَقَمًا ــــــــ

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

رفقائے تنظیم کے نام امیر تنظیم اسلامی کا ایک خط

محترم رفقاءِ تنظیم اسلامی، وَفَّقَنَا اللّٰہُ وَاِیَّاکُمْ لِمَا یُحِبُّ وَیَرْضٰی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! ـــــ امید ہے کہ آپ بفضلہٖ تعالیٰ مع جمیع متعلقین بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ میں سے بہت سے حضرات کے علم میں میری حالیہ علالت آ چکی ہوگی۔ اب سے دو سال قبل بھی میری کمر میں شدید تکلیف ہوئی تھی، اس بار پھر اس کا اعادہ ہوا۔ سبب ریڑھ کی ہڈی کی کوئی خرابی ہے جس کی حتمی تشخیص فی الحال نہیں ہو پا رہی۔ اس کے اسباب میں سے ایک تو وہی بات ہے جو متعدد مواقع پر بہت سے بزرگوں اور احباب کی جانب سے انگریزی محاورے "موم بتی کو دونوں طرف سے جلانے" کے حوالے سے تنبیہاً کہی جاتی رہی اور دوسرا سبب پے بہ پے تقاریر کے لئے اپنے گلے اور اس کی آواز کو درست رکھنے کے لئے ایک فوری طور پر سریع الاثر لیکن دیرپا اثرات کے اعتبار سے نہایت مضرِ صحت دوا (BETNE LAN) کا استعمال ہے ـــــ بہر حال مجھے آئندہ کے لئے کچھ فیصلے کر لینے پڑے ہیں جن پر میں ان شاء اللہ العزیز کاربند رہنے کی پوری کوشش کروں گا۔ وہ یہ ہیں :-

(۱) ان شاء اللہ اس مضرِ صحت دوا کا استعمال آئندہ بالکل نہیں کروں گا جس کے لئے لازم ہے کہ پے بہ پے تقاریر کے پروگرام اب ہرگز نہ رکھے جائیں اور تقریروں کا معاملہ اب فی الجملہ بہت کم کر دیا جائے۔ اور

(۲) بیرونِ ملک اور اندرونِ ملک دورے بھی اب کم کروں گا۔ بیرونِ ملک سفر بالعموم دو ہفتے اور زیادہ سے زیادہ تین ہفتے سے طویل تر کوئی نہ ہو گا۔ اور اندرونِ ملک سڑکوں کے ذریعے طویل سفر سے بھی حتی الامکان اجتناب کرنا ہو گا۔

اس سلسلے میں اس وقت جو بات آپ حضرات سے عرض کرنے کی ہے وہ یہ کہ آئندہ تنظیم اسلامی کی توسیعِ دعوت کے ضمن میں میرا ذاتی حصہ بہت کم ہو جائے گا۔ اور اس کے ضمن میں سارا بوجھ اب آپ حضرات کو اٹھانا ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ میں نے گذشتہ بیس سالوں

کے دوران اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس تعالیٰ کی توفیق و تیسیر سے دین کے جامع اور ہمہ گیر تصور اور بالخصوص اس کے مطالبات و مقتضیات کا صحیح اور مکمل تصور قرآن حکیم اور سنت و سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اساس پر تفصیلاً مبرھن اور واضح کر دیا ہے —— جو زیادہ تر تو لاتعداد کیسٹوں میں محفوظ ہے اور اب بحمد اللہ اس کا ایک بڑا اور بہت حد تک کافی حصہ تحریری شکل میں بھی موجود ہے، لہٰذا آپ کے پاس اس فکر اور دعوت کی اشاعت کے ضمن میں کافی ذرائع موجود ہیں۔ اور ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ آپ میں سے ہر شخص اب اس دعوت کی اشاعت کو اپنا ذاتی فرض سمجھے —— اور توسیع دعوت کے ضمن میں میرے دوروں اور تقریروں پر بالکل انحصار نہ رکھے۔ جس کا میں "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" کی رو سے اب مکلف بھی نہیں رہا ہوں —— —— اللہ کے ہر کام میں خیر مضمر ہوتا ہے، امید ہے کہ اس ظاہری شر سے بھی ان شاء اللہ یہ خیر برآمد ہوگا کہ میں ایک تو کچھ تحریر کی جانب متوجہ ہو سکوں گا اور دوسرے، 'قرآن اکیڈمی' کے تعلیمی اور تربیتی منصوبوں کی نگرانی کے لئے زیادہ وقت نکال سکوں گا — بیدہ التوفیق وعلیہ التکلان !! —— بہرصورت، دعوت کی توسیع و اشاعت کا سارا بوجھ اب آپ حضرات کو اٹھانا ہے، ہم میں سے ہر شخص کو اللہ کے حضور اپنا حساب پیش کرنا ہے۔ اور جسے جتنی بات زیادہ سمجھ میں آگئی ہو اتنی ہی اس کی ذمہ داری زیادہ ہو جاتی ہے۔ آپ نے اگر دین کے تقاضوں کو سمجھ لیا ہے تو اب ان کی ادائیگی آپ کی ذمہ داری ہے اور جب تک ہم میں سے ہر شخص اسے اپنی ذمہ داری اور اپنا فرض اور اپنا کام سمجھ کر نہیں کرے گا تنظیم کا کام آگے نہیں بڑھ سکے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو اور ہمیں اپنی کتاب عزیز اور دین حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق عطا فرمائے! فقط والسلام علی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ "

اسرار احمد عفی عنہ

یکم محرم الحرام ۱۴۰۵ھ

الہُدیٰ

(انیسویں نشست)

(مباحثِ ایمان۔ درسِ ثالث)

نورِ ایمانی کے اجزائے ترکیبی

نورِ فطرت اور نورِ وحی

سورۂ نور کے پانچویں رکوع کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۳)

السلام علیکم۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ امابعد

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۞ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــــًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ صدق اللّٰہ العظیم

"اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے سراب یعنی دھوپ میں چمکتا ہوا ریت جسے دور سے دیکھ کر ایک پیاسا پانی سمجھتا ہے - یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچتا ہے تو نہیں پاتا وہ کچھ بھی - البتہ اللہ کو موجود پاتا ہے جو اس کا حساب چکا دیتا ہے اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی - یا اُن کی مثال ان اندھیروں کی ہے جو کسی گہرے سمندر میں ہوں - جنہیں ڈھانپے ہوئے ہو موج اور اس کے اوپر ایک اور موج - اور اس پر سایہ کئے ہوئے ہوں بادل - تاریکیاں ہیں تاریکیوں پر - اگر وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اُسے بھی نہیں دیکھ پاتا - اور جسے اللہ ہی روشنی عطا نہیں فرمائے پھر اس کے لئے کہیں سے بھی کوئی روشنی نہیں ہے۔"

معزز حاضرین و محترم ناظرین!

یہ سورہ نور کے پانچویں رکوع کی آخری دو آیات ہیں جن کی تلاوت اور جن کا رواں ترجمہ آپ نے سماعت فرمایا ہے --- ان آیات میں کفر کی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے دو تمثیلیں بیان ہوئی ہیں - یہ بالکل وہی اصول ہے جو عربی کی ایک مقولے میں سامنے آتا ہے کہ : تعرف الاشیاء باضدادھا۔ کسی شے کی حقیقت ایک تو آپ خود اس شے پر غور و فکر کر کے سمجھتے ہیں دوسرے یہ کہ اس چیز کی جو ضد ہے اس پر اگر آپ غور کریں گے تو اس سے بھی اُس شے کی حقیقت پر روشنی پڑے گی اور وہ منقح و واضح ہو کر شعور و ادراک کی گرفت میں صحیح طور پر آ جائے گی - جیسے دن کی اصل حقیقت رات کے پس منظر میں خوب نمایاں ہوتی ہے - روشنی کی اصل حقیقت تاریکی کے پس منظر میں زیادہ اجاگر ہوتی ہے --- اسی طرح ایمان کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے ایک طرف تو نہایت فصیح و بلیغ تمثیل سامنے آ چکی - جس میں ایمان کو ایک نور سے تشبیہ دی گئی اور وہ نور مرکب ہے دو انوار سے --- ایک نورِ فطرت ہے دوسرا نورِ وحی -- ان دونوں کے امتزاج سے نورِ ایمان وجود میں آتا ہے -

جس کا محل و مقام ہے قلب ۔ جیسے سورہ حجرات میں فرمایا : وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے خطاب ہے : " اللہ تعالیٰ نے تمہارے نزدیک ایمان کو محبوب کر دیا ہے اور اُسے تمہارے دلوں میں کھپا دیا ہے ۔ تمہارے دلوں کو اس سے مزین و منور کر دیا ہے " ۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا سابقہ دو اسباق میں کہ ایمان کے اس نورِ باطنی کا ظہور انسانی شخصیت میں کن کن اوصاف کی صورت میں ہوتا ہے ۔ اب اسی حقیقتِ ایمان کو سمجھانے کے لئے دو تمثیلیں بیان ہو رہی ہیں ۔ اس کی ضد کو بھی سمجھو ۔ ان تمثیلوں میں پہلی تمثیل میں کچھ بین بین کی سی کیفیت بیان ہوتی ہے لیکن دوسری تمثیل میں گویا تاریکی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی دکھائی گئی ہے ۔ ان دونوں تمثیلوں کے بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ پہلی تمثیل میں اہل کفر کی جو سیّآت ہیں ، ان کی جو بداعمالیاں اور بدکاریاں ہیں ، ان کی شہوات اور ہوائے نفس کی پرستش کی جو کیفیت ہے اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے ۔ ایک دوسری رائے ہے جو بڑی وقیع ہے ۔ وہ یہ کہ پہلی تمثیل میں کفر کا جو انجام ہوگا اُس کو واضح کیا گیا ہے اور دوسری تمثیل میں اس دُنیا میں انسان جو کفر کے اندھیروں میں بھٹکتا ہے اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے ۔

بہر حال ان تمثیلوں پر غور کرنے سے قبل ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی ضروری ہے وہ یہ کہ یہاں کفر سے مراد قانونی کفر نہیں ہے ۔ مبادا ہم یہ گمان کریں کہ یہ تو صرف غیر مسلموں اور کھلے کافروں کے متعلق بات ہو رہی ہے اور ہم مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ اگر یہ گمان اور مغالطہ لاحق ہو گیا تو ان آیاتِ مبارکہ میں قرآنِ حکیم کی جو ہدایت اور رہنمائی ہے اُس سے ہم محروم رہ جائیں گے ۔ جیسے ایمان کے دو درجے ہیں ، ایک قانونی ایمان ہے اور ایک حقیقی ایمان ہے ۔ قانونی ایمان کا تعلق " قول " سے ہے ، شہادت سے ہے ۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ اشھد ان محمدا رسول اللّٰہ ۔ اور

حقیقی ایمان کا تعلق تَصۡدِیۡقٌ بِالۡقَلۡب سے ہے - اسی طرح سے کفر کی بھی دو قسمیں اور دو درجے ہیں - ایک کفر قانونی ہے، ظاہری ہے - ایک شخص کھلم کھلا اللہ کا، رسالت کا اور آخرت کا منکر ہے ایک کفر باطنی ہے یعنی ظاہر میں تو اقرار ہے لیکن بباطن ان سب کا انکار چھپا ہوا ہے - اور اس کے مطابق اس کا عمل نہیں ہے — جس کے بارے میں ہمارے اس دور کے ایک درویش کا ایک قول ہے جو وہ بڑے کیف کے عالم میں کہا کرتے تھے - غور سے سماعت فرمائیے - وہ کہا کرتے تھے : "جو دم غافل سو دم کافر" - انسان کا جو وقت بھی غفلت میں بیتتا ہے، وہ ایک نوع کے کفر میں گزرتا ہے — جیسے علامہ اقبال کا یہ شعر میں نے آپ کو پچھلی نشست میں سنایا تھا -

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

تو جب انسان گم شدگی کے عالم میں اللہ کو بھولے ہوئے ہے - وہ اللہ سے محجوب ہو گیا ہے، اوٹ میں آگیا ہے، پردے میں آگیا ہے - تو یہ گم شدگی کی کیفیت ہے اگرچہ ہم اس کو قانونی کفر نہیں کہیں گے - کفر کے ایک معنی ناشکرا پن بھی ہیں تو یہاں دراصل کفر کی جو تمثیلیں بیان ہو رہی ہیں، وہ کفرِ حقیقی اور کفرِ معنوی کی ہیں - کفرِ قانونی اور کفرِ فقہی کی نہیں ہیں - یہ وہ باطنی کیفیت ہے جس میں انسان کا قلب ایمان کے حقیقی نور اور حقیقی روشنی سے محروم ہوتا ہے -

اب اس کفرِ حقیقی ومعنوی کی بھی دو کیفیات ہو سکتی ہیں - ایک تو یہ کہ ایسا شخص بھی کسی نہ کسی سبب اور جذبے سے کوئی نیکی، کوئی بھلائی، کوئی اور کسی نہ کسی رفاہ عام کا کام کر رہا ہے - اس نے کوئی یتیم خانہ بنوا دیا ہے - کوئی کنواں کھدوا دیا ہے - کوئی شفاخانہ اور ہسپتال بنوا دیا ہے - کوئی FOUNDATION قائم کردی ہے - کوئی خیراتی ادارہ قائم کر دیا - کچھ اشخاص ایسے ہیں جو ان کاموں میں ممد ومعاون ہیں - اگر یہ سارے کام اللہ کے

یقین، آخرت پر ایمان اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے بغیر ہیں تو ان اعمال کی حقیقت پہلی تمثیل میں آئی ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ جیسے ایک لق و دق صحرا میں ایک چٹیل میدان میں دیکھنے والے کو دور سے پانی نظر آتا ہے۔ یہاں ظمآن کا لفظ "فعلان" کے وزن پر آیا ہے۔ جیسے اسی وزن پر رحمان، آتا ہے۔ وہ ہستی جس کے اندر رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی شان کے ساتھ ہو ظمآن کے معنی ہوں گے وہ شخص جو پیاس سے مرا جا رہا ہو۔ اُسے دور سے پانی نظر آ رہا ہے اور وہ جس طرح بھی ہو گھسٹتا ہوا، سسکتا ہوا وہاں پہنچتا ہے حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَـيْـــًٔـا۔ اس کی حسرت کا اندازہ کیجئے۔ جب وہ وہاں پہنچتا ہے تو پانی اسے نہیں ملتا۔ ہاں موت کو منتظر پاتا ہے۔ اور موت کیا ہے؟ موت شاہدارہ ہے۔ جس سے گزرنے کے بعد اللہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ لہذا فرمایا: وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ۔ "اور وہاں اللہ کو موجود پاتا ہے۔" فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ "وہ تعٰی اس کا حساب چکا دیتا ہے۔" اس کا مطلب کیا ہے! یہ کہ ایسا شخص جب قیامت کے دن اللہ کے حضور میں پہنچے گا تو اسے گمان ہوگا کہ میں نے دنیا میں بڑے نیک کام کئے تھے۔ میں نے خیراتی ادارے قائم کئے تھے میں نے (FOUNDATION) بنائے تھے۔ میں نے یتیم خانہ قائم کیا تھا۔ میں نے ان اداروں کی بلامزد خدمات انجام دی تھیں۔ لہذا اُسے ان اعمال پر کچھ تکیہ ہوگا، ان کا کچھ سہارا ہوگا۔ جیسے ریگستان میں دور سے چمکتا ہوا ریت پیاسے کو پانی نظر آ رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ سراب ہوتا ہے اسی طرح ایسا شخص جب عدالتِ الٰہی میں محاسبہ کے لئے کھڑا ہوگا تو اُسے معلوم ہوگا کہ چونکہ ان اعمال کی بنیاد ایمان پر نہ تھی بلکہ نورِ ایمان کے بغیر کسی ریاکاری کے لئے شہرت طلبی کے لئے، ناموری کے لئے یا دنیوی کسی منفعت یا مصلحت کے لئے ٹیکس بچانے کے لئے سرکار دربار میں رسائی حاصل کرنے کے لئے یہ تمام کام کئے گئے تھے تو ان کاموں کی آخرت میں کوئی حقیقت نہیں

ہو گی۔ یہ تمام اعمال وہاں سراب ثابت ہوں گے۔ جیسے سراب کا معاملہ ہوتا ہے کہ دور سے چمکتا ہوا ریت پانی نظر آتا ہے جبکہ حقیقت میں پانی کا وجود نہیں ہوتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ حساب چکا دے گا یعنی یہ تمام اعمال بے نتیجہ رہیں گے اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی اس کی شان تو یہ ہے کہ: اَللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ —

یہ مضمون ہمارے اس قرآنی منتخب نصاب کے درس نمبر دو میں بھی آچکا ہے۔ آیتِ البر میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ حقیقی نیکی کیا ہے! وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ۔ کوئی عمل جس کی بنیاد میں ایمان نہیں ہے وہ نیکی نہیں ہے چاہے بظاہر وہ نیکی کا عمل نظر آتا ہو۔ بظاہر بھلائی ہے، نیکی ہے، خیر کے کام ہیں حتّٰی کہ نماز ہے، روزہ ہے، صدقہ ہے۔ نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ کام ریاکاری کے لئے، لوگوں پر اپنی دین داری کی دھونس جمانے کے کئے گئے ہیں تو یہ شرک ہے۔ من صلّٰی یرائی فقد اشرك ومن صام یرائی فقد اشرك ومن تصدق یرائی فقد اشرك۔ "جس نے نماز پڑھی دکھاوے کے لئے اس نے شرک کیا۔ جس نے روزہ رکھا دکھاوے کے لئے اس نے شرک کیا۔ جس نے صدقہ وخیرات دکھانے کے لئے کیا اس نے شرک کیا" اگر ان چیزوں کی بنیاد ہے ایمان حقیقی پر — اللہ پر ایمان، آخرت کا یقین، فرشتوں، کتابوں اور انبیاء کی تصدیق، ان پر ایمان — اللہ کی رضا جوئی، آخرت کی جزا طلبی اگر اعمال کے اصل محرکات یہ ہیں تب تو یہ سب نیکیاں ہیں ورنہ یہ سب سراب ہیں۔

قرآن حکیم میں دو اور مقامات پر یہ تمثیل بڑے حسین پیرائے میں آئی ہے۔ سورۂ نور کے فوراً بعد سورۃ الفرقان ہے۔ اس میں ارشاد ہوتا ہے اور اس ارشاد میں عجیب کیفیت ہے۔ فرمایا: وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝۔ "جنہیں یہ لوگ بڑے بڑے

ل سمجھ رہے ہیں، جن پر انہوں نے تکیہ کیا ہوا ہے - جن پر ان کو بھروسہ
ہے - ہم قیامت کے دن ان اعمال کی طرف بڑھیں گے اور انہیں ہوا میں
اڑا دیں گے - بلاتشبیہ نقشہ یہ ہوگا جیسے ٹھوکر مار کر کسی مشتِ غبار کو
ہوا میں اڑا دیا جاتا ہے --- اس لئے کہ ان اعمال کی بنیاد ایمان پر نہ تھی اور
وہ خالصتہً لِوَجْہِ اللہ نہیں کئے گئے تھے --- سورۃ ابراہیم میں فرمایا:
مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨاشْتَدَّتْ
بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۔ "جن لوگوں کو اپنے رب پر ایمان
حقیقی میسر نہیں ہے، انکی نیکیاں، ان کے اعمال اس راکھ کے مانند ہیں
کہ جب ان پر ایک تیز جھکڑ چلے گا، شدید آندھی آئے گی تو راکھ منتشر ہو
جائے گی - اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی، آگے ارشاد فرمایا: لَا يَقْدِرُوْنَ
مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۔ "وہ تو سمجھ رہے
ہوں گے کہ ہم نے آگے بڑے بڑے اعمال بھیج رکھے ہیں لیکن ان میں سے کوئی
بھی ان کے ہاتھ نہ آسکے گا - اس طرح انسان کا بہت دور کا گمراہ ہو جانا اور
محروم ہو جانا ہے -" پس کفر کی ایک تمثیل تو یہ ہے کہ ملمع کی جھوٹی کچھ نیکی
ہے - جو خلوص و اخلاص سے خالی اور ایمانِ حقیقی سے تہی دست ہے -

دوسری وہ انتہائی کیفیت ہے کہ یہ ملمع والی نیکی بھی نہیں ہے - خود
غرضی ہے، اپنی ہی خواہشات، اپنی ہی شہوات، اپنی ہی اغراض کی پیروی
ہے --- انسان ان ہی کا بندۂ بے دام بن کر رہ گیا ہو - کوئی جھوٹ موٹ
کی نیکی اور دکھاوے کا خیر بھی زندگی میں نہ ہو - کوئی بھلائی چاہے وہ ملمع
کی بھلائی ہو اس کی بھی کوئی کرن اس کی سیرت و کردار میں نظر نہ آئے - یہ
گویا ضلالت اور گراوٹ کی آخری انتہا ہے - اس کو یہاں تعبیر کیا: ---
ظُلُمٰتٌ ۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ - "یہ تو تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں" - اس
کے لئے یہاں جو تمثیل دی گئی ہے - اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک فرنچ
ایڈمرل اس تمثیل کے مطالعہ سے ایمان لے آئے - انہوں نے تحقیق کی تو ان

کو معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں کبھی سمندری سفر
نہیں کیا۔ یہاں جو تمثیل ہے اس کے بارے میں ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ تمثیل
صرف وہ ہی شخص دے سکتا ہے جس کی بیشتر زندگی سمندر کے سفر میں
گزری ہو اور اُسے گہرے سمندر میں اکثر طوفانوں سے سابقہ پیش آیا ہو
سمندر کی گہرائی میں اندھیرے کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ جبکہ موجوں پر موجیں
چڑھی چلی آ رہی ہوں اور اوپر بھی بادل ہوں کہ ستاروں کی کوئی چمک بھی
پانی پر منعکس نہ ہو رہی ہو۔ لہٰذا (ABSOLUTE DARKNESS)
کا کوئی تخیل و تصور (CONCEPT) انسان کے لئے ممکن نہیں
ہے۔ لیکن ان کے نزدیک سمندر کی تہہ کے اندر جو شدید ترین تاریکی ہوتی
ہے، وہی انسان اُس کا تصور کر سکتا ہے، جسے عملاً کسی اندھیری رات
میں جبکہ بادل بھی چھائے ہوئے ہوں سمندر میں کسی طوفان سے سابقہ پیش
آیا ہو۔ لہٰذا انہوں نے تسلیم کر لیا کہ قرآن کلام الٰہی ہے جو محمد پر نازل ہوا "صلی
اللہ علیہ وسلم" اور وہ ایمان لے آئے۔

یہاں وہ تمثیل بیان کی گئی: اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ۔ "یا
ان اندھیروں کے مانند جو بڑے گہرے سمندر کی تہہ میں ہوتے ہیں"۔ يَّغْشٰىهُ
مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ۔ "اس پر ایک موج اور پھر اس پر دوسری
موج چڑھی چلی آ رہی ہے"۔ مِنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ۔ "پھر مطلع بھی صاف
نہیں ہے۔ ابر آلود ہے، بادل چھائے ہیں"۔ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ
بَعْضٍ۔ "تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں"۔ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ
يَرٰىهَا۔ یہ تو ہماری زبان کا بھی محاورہ ہے۔ "ہاتھ کو ہاتھ سجھائی
دینا"، اس لئے کہ ایک انسان جب اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اُسے
(SENSE OF DIRECTION) تو حاصل ہے۔ اُسے سمت کا احساس ہے
کہ میرا ہاتھ کدھر ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے ہاتھ کو بھی دیکھ نہیں پا رہا تو معلوم
ہوا کہ انتہائی تاریکی ہے: اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا۔

جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے۔ تو اسے کو بھی نہیں دیکھ پاتا۔ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا۔ "اور جس کو اللہ ہی نے نور عطا نہ فرمایا ہو۔" فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔ "اس کو نور کہاں سے میسر آجائے گا!" — نور اصل میں تو نورِ ایمان ہے۔ اگر نورِ ایمان میسّر نہیں تو پھر تو تاریکیاں ہی تاریکیاں ہیں

میں نے اس درس کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ جیسے نورِ خارجی اشیاء کے ظہور کا ذریعہ بنتا ہے ویسے ایمان جو نورِ باطنی ہے وہ حقائق کے ظہور کا ذریعہ بنتا ہے۔ نورِ ایمان نہ ہو تو حقائق کو دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ اسی کو بصیرت یعنی باطن کا مشاہدہ کہا جاتا ہے۔ رہی ہماری ظاہری بصارت تو وہ تو حیوانات کو بھی حاصل ہے۔ کسی عارف نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

دم چیست! پیامے است — شنیدی نہ شنیدی!
در خاکِ تو یک جلوۂ — عام است نہ دیدی!
دیدن دگر آموز — شنیدن دگر آموز

اس دیدن دگر اور شنیدن دگر سے انسان محروم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بخاری و مسلم میں باسناد صحیح یہ دعا منقول ہے جو حضورؐ خاص طور پر فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَّفِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَّعَنْ یَّمِیْنِیْ نُوْرًا وَّعَنْ یَّسَارِیْ نُوْرًا وَّفَوْقِیْ نُوْرًا وَّتَحْتِیْ نُوْرًا وَّاَمَامِیْ نُوْرًا وَّخَلْفِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا وَّفِیْ لِسَانِیْ نُوْرًا وَّفِیْ عَصَبِیْ نُوْرًا وَّلَحْمِیْ نُوْرًا وَّدَمِیْ نُوْرًا وَّشَعْرِیْ نُوْرًا وَّبَشَرِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ نُوْرًا وَّعَظِّمْ لِیْ نُوْرًا اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا۔

"اے اللہ! میرے دل میں نور پیدا فرما، میری بصارت میں نور عطا فرما میری سماعت میں نور عطا فرما۔ میری داہنی جانب سے نور دے اور میری بائیں جانب سے بھی نور عنایت کر۔ اور میرے اوپر سے نور دے اور میرے قدموں تلے سے نور دے۔ اور میرے آگے سے نور دے اور میری پشت کے پیچھے سے نور دے اور میرے لیے نور ہی نور کر دے اور میری زبان میں نور دے اور میری رگ و پے میں نور بھر دے اور میرے گوشت میں نور بھر دے اور میرے خون میں نور بھر دے اور میرے بالوں میں نور دے اور میری کھال میں نور دے میری جان کو نور سے لبریز کر دے اور میرے نور کو فراخ و وسیع فرما دے اور مجھے نور ہی نور عطا کر!"

ایک اور روایت کے آخر میں الفاظ آتے ہیں: اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ لِنُوْرِکَ۔ "اے اللہ میری رہنمائی فرما اپنے نور کی طرف۔"

اس سبق کی پہلی نشست میں ہم پڑھ چکے ہیں: یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ط "اللہ رہنمائی فرماتا ہے اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے"۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں بھی یہ اُمنگ، یہ ولولہ اور یہ آرزو پیدا فرما دے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی کفر و شرک، الحاد و زندقہ، مادہ پرستی، ریاکاری اور منافقت کے اندھیروں سے نکال کر ایمان اور اعمال صالحہ کی طرف پیش قدمی کی توفیق عطا فرمائے ــــ اب آج کے سبق کے ضمن میں کوئی سوال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال: ان آیات میں جس سراب کا ذکر آیا ہے، تو دیکھنے میں آتا ہے کہ اکثر لوگ اسی سراب میں مبتلا ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ حقائق سے محجوب ہیں اور وہ اندھیرے

میں ہیں۔ ان کو اندھیرے اور تاریکی سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لانا ان حضرات کی ذمہ داری ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے نورِ ایمان عطا کیا ہو۔ جیسے سورہ حدید میں فرمایا: هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۔ "وہی ہے اللہ جو اپنے بندے (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قرآن حکیم کی روشن آیات نازل فرما رہا ہے تاکہ اے لوگوں تم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئیں۔" اب جن کی بھی آنکھیں کھل گئی ہوں، جو جاگ گئے ہوں جن کو بھی نورِ ایمان کی کوئی رمق میسر آگئی ہو یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو ایمان حقیقی کی دعوت دیں جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا یُؤمن احدکم حتّٰی یُحِبَّ لاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لنفسه "تم میں سے اس وقت تک کوئی شخص (حقیقی) مومن نہیں ہو سکتا جبتک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہ چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔" اگر ایمانِ حقیقی کی روشنی کسی کو میسر آئی ہے تو اس کو عام کرنا، اُسے پھیلانا، اس سے لوگوں کو حصہ پہنچانا اُس کی ذمہ داری ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آج کے درس میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سریع الحساب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک الحسیب بھی ہے اس کی مزید توضیح فرمائیں۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام نامی اسم گرامی الحسیب بھی ہے وہ قیامت کے دن ہر انسان کا اس دنیا کے تمام اعمال ہی کا نہیں، نیتوں اور ارادوں کا بھی حساب لے گا۔ اس ذات سبحانہٗ کو حساب لینے کے لئے جمع تفریق کی ضرورت نہیں ہوگی جو ہمیں حساب کتاب میں لاحق ہوتی ہے اس کے جو (COMPUTERS) ہیں، ان کا کوئی انسان تصور ہی نہیں کر سکتا۔ سورہ کہف میں تھوڑا سا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کافر چیخ اٹھیں گے جب ان کا اعمال نامہ ان کے سامنے آئے گا اور کہیں گے: یٰوَیْلَتَنَا

مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا۔
ہائے ہماری شامت! یہ اعمال نامہ کیسا ہے! اس میں تو ر
MINUTEST DETAILS) کو بھی نہیں کیا ہے - چھوٹی سے
چھوٹی بات بھی اس میں موجود ہے اور جیساکہ آخری پارے کی سورۃ زلزال
میں فرمایا: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴿﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ
مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿﴾ " جو کوئی ذرّے کے ہم وزن نیکی کریگا اپنے
سامنے موجود پائیگا اور جو کوئی ذرّے کے ہم وزن بدی کمائیگا تو اُسے دیکھ
لے گا"۔

تو اللہ تعالیٰ ہر انسان کا پورا پورا حساب عدالتِ اُخروی میں لے گا۔
الحسیب میں یہ تمام مفاہیم شامل ہیں -

حضرات! آج مطالعۂ قرآن حکیم کے ہمارے منتخب نصاب کا چھٹا
سبق تین اقساط میں بفضلہٖ تعالیٰ وسبحانہٗ مکمل ہوا - اس سبق میں
ایمان کی حقیقت بھی ہمارے سامنے آئی اور ایمان کے مضمرات و ثمرات بھی
ہمارے سامنے آئے اور ایمان حقیقی کی محرومی کی جو کیفیات ہیں، وہ بھی دو
تمثیلوں کی شکل میں ہمارے سامنے آگئیں - ہمیں اللہ تعالیٰ سے ایمانِ حقیقی
عطا فرمانے کی دُعا کرنی چاہیئے اور کفر سے بچنے کے لیئے اسی کے دامن میں پناہ
لینی چاہیئے - اللّٰھم انا نسئلك الایمان والیقین ونعوذ بك من
الکفر والشرك والنفاق -

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین۔

تذکرہ و تبصرہ

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ۵ جولائی کو لاہور سے بیرونی ممالک کے دعوتی دورے کے لئے عازمِ سفر ہوئے تھے۔ موصوف کی ۱۲ اگست ۸۲ء کو لاہور مراجعت ہوئی۔ ۱۷ اگست کو موصوف نے خطابِ جمعہ کے ضمن میں مسجد دارالسلام لاہور میں جو خطاب ارشاد فرمایا وہ معمولی حک و اضافہ کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم خصوصاً علی افضلھم سید المرسلین وخاتم النبیین محمد الامین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین: اما بعد قال اللہ تبارک وتعالیٰ فی سورۃ الحج:

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُۙ ﴿۳۹﴾ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۴۰﴾ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۔
صدق اللہ العظیم۔

عن عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ قال بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ وعلی اثرۃ علینا وعلی ان لا ننازع الامر اھلہ وعلی ان نقول بالحق اینما کنا ولا نخاف فی اللہ لومۃ لائم۔ (متفق علیہ)

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ۔

حضرات! وطن عزیز سے انتالیس[۳۹] دن کے بعد جو واپسی ہوئی تو حسنِ اتفاق سے اگلا ہی دن، یوم استقلال یا جدید اصطلاح میں "عید استقلال" تھا۔ ساتھ ہی جب لاہور کی سڑکوں پر کچھ آنا جانا ہوا تو بعض بالکل نئی چیزیں مشاہدے میں آئیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دوران میں اقامت صلوٰۃ کا ایک نظام بھی موجودہ حکومت کی طرف سے بڑے زور شور، بڑے اہتمام، بڑی تشہیر اور بڑے دعاوی کے ساتھ شروع کیا گیا ہے۔ اس سے یقیناً عوام میں بھی ایک خوشگوار ردّ عمل ہے۔ میں نے آغاز میں سورۂ حج کی جو آیاتِ مبارکہ تلاوت کی ہیں یعنی آیات ۳۹، ۴۰، اور ۴۱۔ تو ان میں سے آیت نمبر ۴۱ کا اسوقت بہت چرچا ہے۔ لہٰذا یہ آیت کریمہ لوگوں کے ذہنوں میں بھی ہے اور زبانوں پر بھی۔ پھر مضامین میں، بیانات میں، اور معلوم ہوا ہے کہ ٹی وی پر اس کا کافی تذکرہ ہو رہا ہے۔ میری مراد ہے اس آیت کریمہ سے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝

حالیہ مشاہدات اور حاصل شدہ معلومات کے ضمن میں بعض باتیں ایسی ہیں جو دین کے اس فہم و شعور کے نتیجے میں جو کسی بھی ادنیٰ درجہ میں سہی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمایا ہے کہ میرے لیے لمحۂ فکریہ بن گیا ہے کہ اگر ان باتوں کو میں اس وقت بیان نہ کروں تو میرے نزدیک وہ کتمانِ حق ہوگا[1]۔ لہٰذا میں اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہوں کہ ان کو بلا خوف لومتِ لائم آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں یہ یوم استقلال یا "عید استقلال" کو جس شان و شوکت کے ساتھ، جس کرّ و فرّ اور جس اسراف و تبذیر کے ساتھ منایا جا رہا ہے یہ یقیناً دینی اعتبار سے "معروفات" کی فہرست میں کسی بھی دلیل سے نہیں آتا بلکہ "منکرات" کی فہرست میں آتا ہے۔ اوّل تو اس کے لیے لفظ "عید" کا استعمال ہی میرے نزدیک انتہائی

---

[1] وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝
"باطل پر حق کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور حق کو ہرگز نہ چھپاؤ۔ جب کہ تم حق کو جانتے ہو۔"
(البقرہ ۴۲) (مرتب)

قابلِ اعتراض ہے۔ ہمارے دین میں صرف دو ہی عیدیں ہیں جو ہمیں اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے عنایت ہوئی ہیں ایک عیدالفطر ہے اور دوسری عیدالاضحیٰ ہے ان کے علاوہ کسی بھی تیسرے یا چوتھے دن کے لیے لفظ عید کا استعمال یقیناً دینی اعتبار سے محل نظر ہے اور اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ہیں قادیانیوں پر یہ اعتراض ہے کہ وہ اسلامی شعائر کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جب کہ ان کو ان کے استعمال کا قطعی حق نہیں ہے۔ اسی طرح دینی شعائر کے لیے جو اصطلاحات ہیں، اگر جدید قسم کی قومی تقریبات آپ منانا بھی چاہیں تو دینی اصطلاحات کا جامہ ان کو پہنانا یقیناً اُسی قبیل کی ایک شے ہے۔

مزید برآں اس میں جو اسراف و تبذیر کا معاملہ ہو رہا ہے۔ کڑوڑہا روپیہ جس طرح صرف ہو رہا ہے میں اُسے بھی دینی لحاظ سے صحیح نہیں سمجھتا۔ میں تحریک پاکستان کے فلسفے کو اُس کے مقاصد کو لوگوں کے ذہنوں میں اتارنے اور اس کا شعور اجاگر کرنے کو یقیناً ایک بہت بڑی قومی ضرورت سمجھتا ہوں یقیناً پوری قوم کو بالخصوص ہماری نئی نوجوان نسل کو اس بات کا علم اور شعور حاصل ہونا چاہیے اور اس کا بار بار اعادہ ہونا چاہیے کہ پاکستان کن مقاصد کے لیے قائم کیا گیا تھا! اس کی منزل کیا تھی! وہ منزل تا حال آئی ہے یا نہیں؟ ہم سینتیس ۳۷ برس کے بعد بھی اس منزل تک پہنچ پائے ہیں یا تا ہنوز تلاشِ منزل میں سرگرداں ہیں! یہ مسائل اپنی جگہ غور طلب بھی ہیں اور جواب طلب بھی۔ لیکن بہر حال اس ملک کے قیام کے جو مقاصد تھے، تحریک پاکستان کے جو عوامل تھے، اس کا جو پس منظر تھا، اس میں جن شخصیتوں نے اہم کردار ادا کیا ہے، ان سے پوری قوم کو بالعموم اور نوجوان نسل کو بالخصوص واقف کرانا میرے نزدیک مستحسن کام ہے اور اس کی بڑی ضرورت ہے البتہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس کے لیے طریقہ کون سا اختیار کیا جائے! اس کے لیے مثبت طریق تو یہ ہوگا کہ ہم اس منزل کی طرف صحیح خطوط پر پیش قدمی اور پیش رفت کریں جس منزل تک پہنچنے کے لیے یہ ملک قائم کیا گیا تھا۔ یہی چیز دراصل مستحکم اساس بنتی ہے مزید براں یہ کہ اگر ہمیں یہ دن قومی تاریخ کے اعتبار سے منانا ہی ہو تو آن بان، شان و شوکت، آرائش و زیبائش اور جلوسوں کے بجائے، اس دن ملک بھر میں جلسے ہوں، ان میں تقاریر ہوں، مقالے پڑھے جائیں، اخبارات میں مضامین شائع ہوں۔ ذرائع ابلاغ عامہ ٹیلیویژن اور ریڈیو پر تحریک پاکستان کے پس منظر اور پاکستان کے قیام کے مقصد کو موثر طریقوں سے اُجاگر کیا جائے۔

ثالثاً ہمارے نصاب تعلیم میں مسلم انڈیا اور خاص طور پر تحریک پاکستان کی مستند تاریخ کو مستقلاً
شامل کیا جائے۔ یہ وہ طریقے ہیں جو مفید بھی ہیں اور مستحسن بھی۔ ان کی ہر اعتبار سے شدید
ضرورت ہے۔ لہٰذا کوئی شخص بھی ان سے اختلاف نہیں کرے گا۔ لیکن میری دیانت دارانہ
رائے ہے کہ چند سالوں سے یوم استقلال کو جس طور اور انداز سے ایک جشن اور تہوار کی صورت
میں منایا جا رہا ہے وہ صحیح و مؤثر طریق کار نہیں ہے اس سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے
بلکہ قوم کے لیے یہ ایک تہوار اور کھیل تماشوں اور تفریح کا دن بن کر رہ گیا ہے۔ موجودہ طریق
دینی اعتبار سے بھی بدعات اور اسراف و تبذیر کی فہرست میں آتا ہے اور قومی اعتبار سے
بھی یہ طریقہ مفید ہونے کے بجائے نقصان دہ ہے۔ اس طرح ایک طرف ہر سال کروڑوں
روپے بالکل بے مصرف خرچ ہوتے ہیں، آرائش و زیبائش، محراب سازی اور جلوسوں
اور اسی نوعیت کے کاموں کی نذر ہوتے ہیں۔ جو میرے نزدیک قومی سرمایہ کا ضیاع ہے۔
دوسری طرف قوم اسے ایک قومی تہوار کی طرح محض تفریحاً منانے کی عادی ہوتی جا رہی ہے۔ پھر
ایک نہایت ہی قابل غور بلکہ حد درجہ قابل اعتراض بات یہ ہے کہ اس یوم استقلال یا جشن
استقلال کو چند سالوں سے "عید" کی خالص دینی اصطلاح سے موسوم کیا جا رہا ہے۔
پھر جس شکل میں چند سالوں سے یہ عید منائی جا رہی ہے اس کے متعلق میں آج سوچ رہا تھا
کہ ہمیں ہمارے دین نے "عید" کا جو تصور دیا ہے، اس میں جو وقار ہے، اس میں دینداری
خدا پرستی کا جو مظاہرہ ہے وہ نہ تو کسی مذہب اور دھرم اور قومی تہواروں میں نظر آتا
ہے۔ تمام مذاہب کے تہواروں میں یہ اعلیٰ اقدار مفقود ہیں اور نہ ہی اس نام نہاد
عید استقلال میں۔ ہماری دونوں عیدیں کیا ہیں! عید گاہ کی طرف تکبیرات کے ترانے
پڑھتے ہوئے جاؤ۔ واپسی میں راستہ بدلو اور پھر یہی ترانہ تمہاری زبانوں پر جاری ہو۔ فضا
اس ترانے سے معمور ہو جائے۔ پھر یہ تکبیرات بھی وہ ہیں کہ جن میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی، اس
کی توحید اور اس کی حمد کا عوامی سطح پر اعلان و اقرار ہے۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ و اللہ اکبر، اللہ اکبر و للہ الحمد۔

اور اللہ اکبر، اللہ اکبر کبیراً، الحمد للہ کثیراً، سبحان اللہ بکرۃً و اصیلاً۔

پھر ان عیدین کے لیے تاکید ہے کہ صبح غسل کر کے اچھا لباس پہنو۔ خوشبو لگاؤ۔ طلوع آفتاب
کے بعد ایک جگہ جمع ہو، امام کی اقتداء میں دوگانہ باجماعت ادا کرو۔ یہ شکرانے کی نماز ہے،

پھر امام بحیثیت نائب رسول کھڑا ہو۔ خطبہ دے جس میں شرکا کے لیے تذکیر ہو، موعظہ ہو، نصیحت ہو۔ یہ ہے ہماری عیدین کا معاملہ جو ہمارے دین نے ہمیں تلقین فرمایا ہے۔

آپ نے کئی بار یہ حدیث سنی ہو گی جو حضرت انس ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہجرت کے بعد جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں قدیم زمانے سے سالانہ "جشنوں" دو تہواروں کا سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ ان میں لوگ طرح طرح کے کھیل تماشوں کا سامان کیا کرتے تھے اور لہو ولعب میں تہوار مناتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں دریافت فرمایا اور جب بتایا گیا کہ یہ ہمارے سالانہ جشن اور تہوار ہیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ ہمارے رب نے مسلمانوں کے لیے دو سالانہ عیدیں عطا فرمائی ہیں، جو تمہارے تہواروں سے کہیں بہتر ہیں۔ ان میں سے ایک عیدالفطر ہے جس کا تعلق رمضان المبارک کے روزوں سے ہے یہ روزوں کو پورا کرنے کا شکرانہ ہے۔ اور دوسری عیدالاضحیٰ۔ جس کا تعلق حج اور قربانی سے ہے پھر یہ کہ جس شان سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، آپؐ کے اصحابؓ نے اور آپؐ کے خلفاء راشدینؓ نے ان عیدین کو منایا وہ درحقیقت ہمارے لیے قابلِ تقلید ہی نہیں واجب التقلید معاملہ ہے۔

اس کے برعکس دوسری قومیں جس طریقے پر اپنے مذہبی جشنوں اور اپنے قومی تہواروں کو مناتی ہیں، وہ ہمارے سامنے ہیں، جن کے متعلق میں نے ابھی عرض کیا کہ ان میں خدا پرستی اور وقار ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتا۔ بلکہ یہ سرتاسر لہو ولعب کا مظہر ہوتے ہیں۔ ہر انصاف پسند آنکھ یہ دیکھ سکتی ہے کہ ہم نے جو نئی عیدیں منانے کا ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ دوسری قوموں کے جشنوں اور تہواروں سے بہت مماثل ہوتا جا رہا ہے۔ دینی مزاج رکھنے والا ہر شخص ان نئی عیدوں کے متعلق خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ ہماری قوم ان کو منانے کا جو رنگ اور طور طریقے اختیار کرتی چلی جا رہی ہے آیا وہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے نقشِ قدم پر ہے یا اغیار کی تقلید ہے! ۔ میں آج سوچ رہا تھا تو میرا ذہن منتقل ہوا کہ قرآن مجید میں آلِ فرعون کے ایک تہوار کے لیے یوم السنیتہ کا لفظ آیا ہے جس کا سورۂ طٰہٰ میں ذکر ہے۔ ہوا یوں کہ جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے فرعون کے دربار میں تشریف لا کر توحید کی دعوت پیش کی، لیکن اس نے دعوت رد کر دی۔ حالاں کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی نبوت کے ثبوت کے طور پر دو معجزے پیش کئے

تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو عطا فرمائے تھے یعنی عصا اور یدِ بیضا۔ ان کو دیکھ کر فرعون کو اسکی سوا کوئی اور تدبیر اور چال نہ سوجھی کہ ملک کے تمام نامی گرامی جادوگروں کو بلا کر ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرایا جائے تاکہ اس وقت جس صورتِ حال سے سابقہ ہے اس سے کسی طور پر گلو خلاصی ہو سکے۔

لہذا فرعون نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ کوئی دن مقرر کرو کہ جس روز ہمارے جادوگر تمہارا مقابلہ کر سکیں تو حضرتِ موسیٰ نے جواب میں فرمایا مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ وَأَنْ يُحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۝ "تمہارے ساتھ یَوْمُ الزِّيْنَةِ طے ہوا۔ اور دن چڑھے لوگ جمع ہوں" یعنی ان کا کوئی بناؤ سنگھار، اپنی زینت، اپنی آرائش و زیبائش کے اظہار اور اپنے رعب اور دبدبے کے مظاہرہ کا دن تھا جس کو وہ جشن کے طور پر مناتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے وہ دن مقرر فرمایا تاکہ مقابلہ علیٰ رؤس الاشہاد ہو۔ خلقِ خدا دیکھے کہ معاملہ کیا ہو رہا ہے!۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ معجزات کی شان کیا ہے اور جادوگروں کے جادو کی حقیقت کیا ہے!

ہمیں تو اپنے قومی جشن کے طور طریقے دیکھ کر ایسا نظر آتا ہے کہ ہم تو یَوْمُ الزِّيْنَةِ کی طرز پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ نہ کہ ان باوقار عیدین کے طور پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں عطا فرمائی تھیں۔ پھر ایک اور حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے اور یہ ہر شخص کے سامنے کی بات ہے کہ وہ دو عیدیں جو ہمیں اللہ اور اس کے رسول نے عطا فرمائی تھیں؛ وہ ان نئی دو عیدیں یعنی، عید میلاد النبی اور عید استقلال کے مقابلے میں پس منظر میں چلی جا رہی ہیں۔ اُن عیدوں کی تو ے مقابلے میں حیثیت و اہمیت بہت کم رہ گئی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ قوم کی عظیم اکثریت کا لگاؤ اُن عیدوں سے تو برائے نام رہ گیا ہے۔ اصل لگاؤ ان دو نئی عیدوں سے ہے۔ اس بات سے وہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ جہاں بھی کوئی بدعت آئے گی وہاں لامحالہ سنت پیچھے ہٹے گی۔ یہ قانون ہے اگر آپ دینی و قومی اعتبار سے کوئی نئی رسم ایجاد کریں گے تو دین کا کوئی نہ کوئی حقیقی شعار یقیناً پس منظر میں چلا جائے گا۔ ہر بدعت، سنت کو FADE AWAY کرے گی۔ لہذا یا تو سنت کی اہمیت کم ہو جائے گی یا وہ بالکل ختم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس چیز سے بچائے کہ ہم سنت کو بالکل ہی ختم کر دیں لیکن اندیشہ یہ ہے کہ جس رُخ پر ہم آگے بڑھ رہے ہیں،

اس کا یہ نتیجہ تو بہر حال نکل آیا ہے کہ وہ اصل عیدیں پس منظر میں چلی گئی ہیں اور مسلمانانِ پاکستان کے لیے جو دو نئی "عیدیں" ایجاد کی گئی ہیں وہ کافی نمایاں ہو گئی ہیں ۔ ان کا جس طور پر سرکاری سطح پر انتظام ہوتا ہے اس سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری طور پر "اصل عیدیں" یہ دو ہیں یعنی عید میلاد النبی اور عید استقلال۔

میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ میں بیرونِ ملک کے دعوتی دوروں سے ۳ اگست کی رات کو لاہور پہنچا ہوں ۔ اسلیئے ان تین دنوں میں لاہور کی سڑکوں پر آنے جانے کا اتفاق کم ہوا۔ ۴ اگست کو تنظیم اسلامی لاہور کے اجتماع میں بعدہ دو دن مجلس مشاورت کے اجلاسوں میں شرکت کے باعث مصروفیت رہی۔ ذرا نکلا ہوں تو سڑکوں پر چند اکابر کی 'ڈیو ہیکل' تصاویر نظر آئی ہیں ۔ یہ گویا "معروفات" اور "نیکیوں" کا اضافہ ہے جو اس دور میں ہو رہا ہے تصویر کشی، خاص طور پر ہاتھ سے بنائی جانے والی جانداروں کی تصاویر کے متعلق امّت کے تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حرام مطلق ہیں ۔ جدید زمانے میں چند جدید ذہن کے علماء، خاص طور پر علماءِ عرب کی اکثریت نے اختلاف اگر کیا ہے تو کیمرے سے اُتاری ہوئی تصاویر کے بارے میں کیا ہے۔ جو عکس محفوظ کرنے کی تعریف میں آتا ہے، ہاتھ سے نہیں بنایا جاتا ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں ہاتھ سے جاندار اور غیر جاندار بنائی جانے والی تصاویر اور ہاتھ سے مجسمے بنانے کا رواج تھا اور یہ قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا۔ مجسمے اور ہاتھ سے جانداروں کی تصاویر بنانے کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شدید وعید ارشاد فرمائی ہے[1] اور اسکو ناجائز اور ممنوع قرار دیا ہے۔ مجسمہ سازی بھی طبعاً اسی وعید اور حرمت کے دائرے میں آتی ہے۔ البتہ

---

[1] عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اصحاب ھذہ الصور یعذبون یوم القیامۃ یقال لھم احیوا ما خلقتم وقال ان البیت الذی فیہ الصورۃ لا تدخلہ الملائکۃ (متفق علیہ) ترجمہ :- حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (جاندار چیزوں کی) تصویریں بنانے والوں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا ۔ ان کو حکم دیا جاتے گا کہ جو تصویر تم نے بنائی ہے، اس میں روح پھونک کر اسے زندہ کرو۔ (لیکن وہ ایسا نہ کرسکیں گے لہٰذا عذاب جاری رہے گا۔) پھر فرمایا جس گھر میں تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ (مرتب)

جب کیمرہ ایجاد ہوا تو ایک اختلاف ہو گیا۔ پاک و ہند کے علمار کی بڑی اکثریت اس کی قائل رہی ہے اور اب بھی ہے کہ کسی جاندار کی کیمرے سے بنائی ہوئی تصویر پر بھی اسی حکم کا اطلاق ہوگا جو ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر پر ہوتا ہے۔ لیکن اکثر علمائے عرب کی یہ رائے سامنے آئی کہ کیمرے کی تصویر پر ہاتھ سے جاندار کی بنائی جانے والی تصویر کی حرمت کا اطلاق نہیں ہوتا۔

برصغیر پاک و ہند میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے متعلق تو وثوق سے معلوم ہے کہ وہ یہی رائے رکھتے تھے۔ آج سے قریباً ستر سال قبل ان کے جو رسائل "الہلال اور البلاغ" شائع ہوتے تھے وہ باتصویر ہوتے تھے۔ مزید یہ کہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی رائے بھی یہی تھی لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی اس رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ واللہ اعلم۔ بہرحال ہمارے یہاں بھی ایسے علماء رہے ہیں اور اب بھی موجود ہوں گے جن کی رائے علمائے عرب کی اس رائے کے مطابق ہے کہ ہاتھ سے بنائی جانے والی جانداروں کی تصاویر اور مجسموں پر تو حرمت کے اسی حکم کا اطلاق ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لیکن کیمرے کی تصاویر اس حکم کی زد میں نہیں آتیں، یہ مختلف شے ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے جو علمار کیمرے کی تصاویر کی حرمت کے قائل ہیں، انہوں نے بھی اس کی وہاں تک تو اجازت دی ہے، جہاں کوئی تمدنی حقیقی ضرورت ہو۔ جیسے شناختی کارڈ کا معاملہ ہے۔ پاسپورٹ کا معاملہ ہے۔ مجرموں کی تصاویر کا معاملہ ہے طبی ضروریات کا معاملہ ہے۔ الغرض جہاں بھی ناگزیر تمدنی حقیقی ضرورت ہو تو اس کے لیے اس کے استعمال کو بکراہت قبول کیا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ بات جان لیجئے کہ اس تصویر کشی میں اور اس کی حرمت و ممانعت میں اصل علت اور اصل حکمت ہے، وہ شخصیت پرستی کے سدباب کی علت و حکمت ہے یہی تصویریں ہیں جو بعد میں معبود بنتی رہی ہیں اور ان کو پوجا گیا ہے۔ آج ہمارے ملک میں جس پیمانے اور جس انداز سے یہ کام کیا جا رہا ہے اس میں اس علت و غایت کے ظہور کا شدید احتمال موجود ہے[1] اس لیے کہ یہ ان شخصیتوں کی تصاویر ہیں جن کے متعلق

---

[1] آغا خانی لوگوں کو مرتب نے "آغا خاں" کی تصویر کو ہار پہناتے، اس کے آگے دیے جلاتے اور مراقبہ کرتے اپنی گناہگار آنکھوں سے دیکھا ہے (مرتب)

ہمارا یہ تصور ہے اور اُسے مزید پختہ کیا جا رہا ہے کہ وہ ہمارے محسن ہیں۔ یہ ہماری تاریخ کی عظیم ترین شخصیتیں ہیں، وہ ہماری قومی تحریک کے عظیم عمائد ہیں لہٰذا ان حضرات سے ہمارا ایک ربط قلبی ہونا چاہیئے، ان سے محبت ہونی چاہیئے، ان سے عقیدت ہونی چاہیے۔ یہی تو وہ اصل علت ہے کہ جب اس میں غلو ہوتا ہے تو ان بزرگوں کو معبود کے درجے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اسی کی وجہ سے شریعت میں تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے لیکن ہمارے یہاں اسی میں غلو پیدا کرنے کی یہ تمام و کمال کوشش کی جا رہی ہے۔ اس طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید دور میں دین کے تصورات میں جو اضافے ہو رہے ہیں شاید ان ہی "معروفات" کی فہرست میں یہ چیز بھی شامل کر لی گئی ہے۔ ابھی تک معاملہ یہ تھا کہ نوٹوں پر قائداعظم کی تصویر چل رہی ہے ابھی تک معاملہ یہ تھا کہ سرکاری بڑے دفاتر اور ایوانوں میں قائداعظم مرحوم ، خصوصاً اور علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی عموماً قدآور یا اوپر کے جسم کی ہاتھ سے بنائی ہوئی ساویر مستقل طور پر آویزاں رہتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایوب خاں صاحب اور بھٹو صاحب کی ان کے دور اقتدار میں ان کی تصاویر لگائی جاتی رہی ہوں اور اب موجودہ صاحب اقتدار شخصیت کی تصاویر آویزاں ہوں۔

بہرحال کچھ عرصہ پہلے تک یہ معاملہ زیادہ تر بڑے بڑے سرکاری دفتروں اور حکومت کے ایوانوں تک محدود تھا۔ لیکن اب ان اکابر کی تصاویر کو جس انداز، جس شان اور جس آن ان کے ساتھ سڑکوں پر نصب کیا گیا ہے اس سے تو اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ ہمارا معاشرہ معروفات کے بجائے دینی اعتبار سے منکرات کی طرف ارتقاء کر رہا ہے۔ اس کی پیش قدمی قطعی مخالف سمت میں ہو رہی ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ یہ کیمرے کی بنائی تصاویر نہیں ہیں بلکہ ہاتھوں سے بنائی ہوئی تصاویر ہیں جن کے متعلق میں پورے عالم اسلام کے علماء کی رائے آپ کو بتا چکا ہوں وہ سب اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ ابھی میں نے آپ کو بتایا کہ آجکل سورہ حج کی اکتالیسویں آیت کا بڑا چرچا ہے۔ جس میں ارشاد فرمایا گیا:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۔

تو آخری دو احکام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ صرف یہ کہ نظر انداز اور پس پشت

ڈال دیئے گئے ہیں بلکہ ان کے برعکس کام ہو رہا ہے۔ معروفات کو دبایا اور منکرات کو فروغ دیا جا رہا ہے تو یہ چند چیزیں وطن سے واپسی پر فوری طور پر میرے مشاہدے میں آئیں۔ لہٰذا ان کے متعلق جو بھی میرے تاثرات تھے، وہ میں نے بلاخوفِ لومتِ لائم آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔

میں انہی حالاتِ حاضرہ کے متعلق چند دوسری باتیں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں معروف معنوں میں ہرگز ایک سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ میں نے اس سے پہلے بھی کبھی سیاسی تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ میرا اب بھی DECLARE فیصلہ ہے، علیٰ رؤس الاشہاد اعلان ہے کہ آئندہ بھی کبھی کسی سیاسی تحریک میں جو سیاسی انداز میں اگر حکومت کے خلاف چلے گی تو میں اس میں حصہ نہیں لوں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری چند PRIORITIES ہیں۔ چند کاموں کو میرے نزدیک اوّلیت وا قدمیّت حاصل ہے۔ ہر شخص کی اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ اصل میں کس کام کے لیے اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو صرف کر رہا ہے میری ترجیحات میں مقدم ترین، قرآن مجید کے اس فرمان کی تعمیل میں کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ "صرف اور صرف اللہ کا دین اسلام ہے۔ باقی ساری چیزیں اور سارے کام اس کے تابع ہیں میں نے دین کی خدمت کے لیے جس طریق کار کو قرآن و سنت سے اخذ کیا ہے، ان دینی ذرائع سے سمجھا ہے، میں اُس پر عمل پیرا ہوں۔ اسی کام میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ لگا چکا اور جو باقی ہے وہ ابھی میں لگا ہوں اور میری اللہ سے دُعا ہے کہ وہ مجھے اسی کام میں اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو لگانے کی مزید توفیق عطا فرمائے اور میں اسی حالت میں آخرت کے لیے رختِ سفر باندھوں۔

جہاں تک ملک کی سیاسی صورتِ حال کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں جو بھی میری دیانت دارانہ رائے رہی ہے، اس کا میں نصح اور خیرخواہی کے انداز میں بھی اور ناقدانہ انداز میں بھی متعدد بار برملا اظہار کر چکا ہوں۔ اسی ضمن میں، میری رائے ہے کہ مارشل لا کا اتنا طویل عرصے تک تسلسل ہمارے ملک کی سالمیت، اس کی یکجہتی، اتحاد اور اس کی سلامتی کے لیے نہایت مضر اور خطرناک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہماری قوم واقعتاً سیاسی اعتبار سے تاحال نابالغ ہے اور اس میں سیاسی شعور موجود نہیں ہے اس قوم میں جمہوریت کی نہ قدر ہے اور نہ اس کے چلانے کی صلاحیت

ہے۔ اس اعتبار سے قوم نا بالغ بھی ہے اور یتیم بھی۔ بُرا نہ مانیے گا ہماری سیاسی جماعتوں نے اسی خیال کو تقویت دینے کے لیے کئی بار PART PLAY کیا ہے اسی کے نتیجے میں فوج کو بار بار یہ موقع ملا ہے کہ وہ اس میدان میں قدم رکھے اور اقتدار کی باگ ڈور سنبھالے۔ آخر ہندوستان میں فوج کو آج تک اسکی جرأت کیوں نہیں ہوئی! اس کا آخر کچھ سبب تو ہے! جب کہ دونوں ملک بیک وقت آزاد و خود مختار ممالک کی فہرست میں شامل ہوئے تھے۔ لیکن ہم نے ثابت کیا ہے کہ جس طرح ایک نا بالغ یتیم کو سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ہم بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر چلنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

بہرحال وجوہ کچھ بھی ہوں امر واقعہ یہ ہے کہ جو مارشل لا نوّے دن کے وعدے پر لگایا گیا تھا اب اس کا ۱۰ر جولائی ۱۹۸۴ء کو آٹھواں سال شروع ہو گیا ہے ملک کی خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ مارشل لا خود ہٹ جائے۔ اگر مارشل لا کو ہٹانے کے لیے کوئی تحریک چلی تو اس کا کوئی مفید و مثبت نتیجہ نہیں نکلے گا۔ بلکہ ایک خرابی ختم ہوگی تو اس کی جگہ کوئی دوسری خرابی آ جائے گی۔ اس لیے موجودہ مارشل لا کو جلد از جلد صحیح خطوط پر سیاسی عمل جاری کرانا چاہیئے۔

بہرحال میرا فیصلہ ہے کہ نہ میں نے پہلے کسی سیاسی تحریک میں حصہ لیا ہے اور نہ اب لوں گا۔ جو جماعت میں نے قائم کی ہے اس کا طے شدہ فیصلہ ہے کہ انتخاب کی طرف ہمیں کبھی جانا نہیں ہے زیادہ سے زیادہ ہم انتخاب میں ووٹ دے سکتے ہیں وہ بھی دو شرطوں کے ساتھ۔ ایک یہ کہ جس کو ووٹ دیا جائے وہ ہمارے علم کی حد تک پابند شریعت ہو اس لیے کہ جو شخص اللہ کے قانون کا پابند نہیں اس سے ہم کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اس ملک کے لیے کوئی بھلا کام کرے گا۔ جو اللہ کا وفادار نہ ہو وہ اس ملک کا کیسے وفادار ہوگا! تو ایک شخص کیسے اس قسم کے امیدوار کو ووٹ دینے کی ذمہ داری قبول کرلے کہ جو پابند شریعت نہ ہو۔ ہم نے ایک اضافی شرط یہ بھی لگائی ہے کہ وہ شخص کسی ایسی پارٹی سے بھی تعلق نہ رکھتا ہو جس کے منشور میں کوئی بات خلاف شریعت ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص خود تو پابند شریعت ہوتا ہے لیکن اپنی سادہ لوحی کے باعث یا کسی اور سبب سے کسی ایسی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے جس کے منشور میں کوئی نہ کوئی شق اسلام کے خلاف ہوتی ہے تو جہاں یہ دونوں شرطیں پوری ہو جائیں تو ہم اس ملک کے شہری ہیں لہٰذا ہم اپنا ووٹ استعمال کریں گے۔ لیکن اگر یہ شرطیں پوری نہیں ہوتیں تو ہم کم سے کم یہ ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ کسی بھی ایسے شخص کے

حق ہیں رائے دی جائے اور اسے ملک کے معاملات میں دخیل ہونے کا حق دار سمجھا جائے درآں
حالیکہ وہ خود اللہ اور اس کے رسول کے احکام کا پابند نہ ہو۔ تو اس اعتبار سے ہم غیر سیاسی
لوگ ہیں، میں خود ذاتی طور پر اور وہ تنظیم بھی جو میں نے قائم کی ہے۔

ہمارا جو مثبت طریق کار ہے وہ میں کئی بار بیان کر چکا ہوں وہ تو ایک ہی طریق کار ہے
جو میرے نزدیک سنت اور سیرت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ماخوذ ہے اور اسی پر
مبنی ہے۔ لہذا میں نے اسی کو اپنے لیے اور اپنی تنظیم کے لیے اختیار کیا ہے اور میری کوشش یہ
کہ حتی الامکان اسی پر عمل پیرا ہو کر اور کاربند رہ کر ایک اسلامی انقلاب کے لیے جو بھی ابتدائی
اور تمہیدی اقدامات ہیں ان کے لیے میں نے اور میرے ساتھیوں نے خود کو کھپا دیا ہے۔ اور
کھپائے رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس سے پہلے بھی میں نے عرض کیا تھا کہ ہم لوگ اندھے بہرے نہیں ہیں کہ ہم دیکھ
سن نہ رہے ہوں کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے اور اس کے بارے میں ہماری کوئی رائے نہ ہو
آج سے لگ بھگ پونے دو سال قبل ایک خط میں نے صدر مملکت کو لکھا تھا۔ ابتداءً وہ کھلا خط نہیں
لیکن عرصہ تک جب مجھے نہ اسکی رسید ملی اور نہ جواب ملا بلکہ میرے پاس ڈاکخانے کی رجسٹری
کی جو جوابی رسید آئی وہ بھی بغیر دستخط کے تھی تب میں نے اس خط کو مجبوراً پریس کے حوالے کیا
اس سے قبل بھی میں صدر صاحب کو ایک خط لکھ چکا تھا جس کا نہ جواب آیا نہ رسید۔ ایسا
ہوتا ہے کہ بڑے آدمی کے ارد گرد بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں جو کہ بہت سی باتیں ان تک
پہنچنے نہیں دیتے اس کا ایک ثبوت بھی مجھے مل گیا۔ صورت یہ ہوئی کہ میں جب ۵ رمئی ۸۳ء
کو صدر صاحب سے ملاقات کے لیے پنجاب گورنر ہاؤس حاضر ہوا اور میں نے اُن سے اپنے
پہلے خط کا ذکر کیا جو کئی مہینے قبل میں نے ان کو لکھا تھا۔ میں اس خط کی نقل بھی ساتھ لے گیا
تھا۔ میں نے صدر صاحب کو وہ خط دکھایا اور انہیں بتایا کہ مجھے تا حال اس کا کوئی جواب نہیں
ملا تو صدر صاحب نے اسکو دیکھ کر اور پھر پڑھ کر حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ مجھے تو یہ خط
دکھایا نہیں گیا۔ تو معلوم یہ ہوا کہ ان کے ارد گرد کچھ ایسی چھلنیاں لگی ہوئی ہیں کہ ان چھلنیوں میں سے
ہر چیز چھن کر صدر صاحب کے پاس وہی چیز پہنچے جو یہ لوگ مناسب سمجھیں۔ یہ وجہ تھی
پھر میں نے اس خط کو اشاعت کے لیے اخبار کو دیا اگرچہ اس نے اس میں قطع و برید کی، کاٹ
کی۔ لیکن بہر حال جس حال میں بھی وہ سامنے آسکا پبلک میں آگیا۔ تو اس وقت کے حالات

کے پیشِ نظر میں نے صدر صاحب کی خدمت میں اپنی رائے پیش کی تھی جو مخلصانہ بھی تھی اور میرے نزدیک اُس وقت نہایت مفید بھی تھی۔ [1]

اس وقت ہمارا ملک جس صورتِ حال سے دوچار ہے میں اس کے پیشِ نظر پورے اخلاص اور خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ زکوٰۃ کا نظام ہمارے ملک میں قائم کیا گیا ہے۔ اس کا بڑا دعویٰ بھی ہے۔ شہرہ بھی اور پروپیگنڈہ بھی۔ لیکن اس میں ابتداء سے خامی تھی جس کے بارے میں مَیں نے صدر صاحب سے خدا کا واسطہ دے کر ایک نجی ملاقات میں عرض کیا تھا کہ اس سلسلے میں ہمارے شیعہ بھائیوں نے جو ایجیٹیشن کیا ہے اور آپ سے ایک وعدہ حاصل کر لیا ہے اس کے نتیجہ میں آپ کو اپنا قدم واپس لینا ہے تو خدا کے واسطے جزوی طور پر نہ لیجئے گا۔ بلکہ کلی طور پر لیجئے گا۔ اپنا آرڈیننس واپس لے لیجئے۔ کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ اس سے پہلے بھی یہ ملک چل رہا تھا اور آئندہ بھی چلتا رہے گا۔ نماز عبادات میں شامل ہے آپ اس کے لیے جبر نہیں کر سکتے البتہ تشویق و ترغیب دلا سکتے ہیں، ماحول کو ایسا سازگار بنا سکتے ہیں کہ لوگوں میں نماز کا شوق از خود ابھرے۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی اگرچہ اسلامی نظامِ معیشت کا ایک اہم ستون ہے لیکن وہ عبادات کی فہرست میں شامل ہے۔ لہذا آپ اس کے معاملہ میں بھی صحیح اسلامی شعور پختہ ہونے تک اگر یہ فیصلہ کریں کہ فی الحال اس میں جبر نہیں کر سکتے تو بہتر یہ ہے کہ اس آرڈیننس کو واپس لے لیجئے۔ اس میں ترمیم نہ کیجئے۔ اس لیے کہ اگر آپ نے یہ کیا کہ شیعہ حضرات کو اس سے مستثنیٰ کر دیا تو نا واقف اور "کمزور ایمان" والے سینوں میں شیعہ بنانے کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ وہ بات ہے جو کہ بالفعل ہوئی اور اس کے نتائج لوگوں کے سامنے آ رہے ہیں اور یہ خبریں مل رہی ہیں کہ ہماری دیہاتی آبادی میں کالے جھنڈے بڑی کثرت سے کھڑے ہو گئے ہیں اسلئے کہ ہمارے ایمان کی جو مجموعی صورتِ حال ہے وہ کس سے پوشیدہ ہے وہ کمزوری تو الم نشرح ہے۔ پھر ظاہر بات ہے کہ شیعہ سنّی کا اختلاف سب

---

[1] محترم صدر مملکت کے نام ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ خط ماہنامہ میثاق کے فروری ۱۹۸۲ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ علیحدہ بھی مطبوعہ شکل میں موجود ہے جو حضرات اس کا مطالعہ کرنا چاہیں۔ طلب فرما سکتے ہیں (مرتب)

کے نزدیک کفر اور اسلام کا اختلاف تو ہے نہیں۔ لہٰذا اس جبری زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہونے کے لیے اس اختلاف کے باعث فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے تو ہمارے معاشرے میں کمزور عقیدے اور بے عملی کے شکار کتنے سنی ہوں گے جو شیعہ بھائیوں کی ذرا سی کوشش سے یہ رنگ اختیار نہیں کریں گے۔ یہ وہ بہت بڑا اندیشہ تھا اور میں نے بر وقت اللہ کا واسطہ دے کر صدر صاحب سے عرض کیا تھا کہ آپ نہ کیجئے گا۔ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ وہی ہوا۔ پرنالہ وہیں گرا اور اس کے جو نتائج برآمد ہونے چاہیئے تھے وہ برآمد ہوئے اور پورے ملک کے سامنے ہیں۔

مزید برآں اس ضمن میں دوسرا اہم تر معاملہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے نظام کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ پورے معاشرہ کے اندر جو بھی معاشی اعتبار سے فرق و تفاوت کا معاملہ پیدا ہوتا ہے یہ اس کا علاج اور حل ہے لیکن اگر دنیا کے سامنے صورتِ حال یہ آئی ہو کہ پاکستان میں زکوٰۃ کا نظام قائم و نافذ ہو بھی گیا لیکن معاشرہ میں معاشی فرق و تفاوت جوں کا توں موجود ہے اس میں تو سر مو بھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ بال برابر بھی کوئی فرق نہیں ہوا! اس ملک میں معیشت کا جو نظام پہلے تھا اب بھی وہی ہے۔ دوسری طرف جب کہ بتلایا یہ جا رہا ہے کہ زکوٰۃ کا نظام نافذ ہو چکا ہے۔ تو خود ہی غور کیجیئے کہ اس صورت حال کو دیکھ کر لوگ نظامِ زکوٰۃ سے بددل اور مایوس ہوں گے یا نہیں؟ اور ان کے دل میں اسلام سے لگن اور محبت پیدا ہوگی یا اس کے برعکس معاملہ ہوگا! اس سے کوئی نیک نامی حاصل ہو گی یا بدنامی!

پھر یہ کہ اوّل تو زکوٰۃ صرف اس رقم پر واجب کی گئی ہے جو بینکوں میں جمع ہے۔ سوال یہ ہے کہ مالِ تجارت پر زکوٰۃ کیوں عائد نہیں کی گئی جب کہ انکم ٹیکس کے گوشواروں سے ان پر زکوٰۃ کا حساب بھی آسان ہے کیا کوئی فرقہ ایسا بھی ہے جو یہ کہتا ہو کہ مالِ تجارت پر زکوٰۃ نہیں ہے! ہر فقہی مسلک کے نزدیک جس طرح نقد پیسہ اگر وہ نصاب کی حد میں آتا ہو زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح مال تجارت پر بھی زکوٰۃ ہے۔ لہٰذا ہر سال اس پر بھی زکوٰۃ عائد ہونی چاہیئے اور وصول کی جانی چاہیئے۔

البتہ بڑی بڑی فیکٹریوں کی جو عمارتیں ہیں، ان میں جو مشینیں ہیں، ان پر میری معلومات کی حد تک تمام مسالک کا اتفاق ہے کہ وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کی یہ رائے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر BASE کرتی ہے کہ کاریگر لوگوں کے اوزار زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں جیسے بڑھئی ہے۔ لوہار ہے، یا کوئی اور کاریگر ہے تو ان کے اوزاروں پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔ یہ بالکل عین انصاف ہے لیکن کہاں کاریگروں کے ہتھیار اور کہاں لاکھوں روپے کی مشینری! لہٰذا یہ مسئلہ ہمارے لیے محل نظر ہوگا کہ ملوں اور فیکٹریوں کی کروڑوں روپے کی مشینوں کو کاریگر کے اوزاروں پر قیاس کیا جائے گا یا نہیں! چلیے یہ معاملہ اجتہادی ہوگا۔ اس پر علماء کا کوئی مستند بورڈ ہی کوئی حتمی فیصلہ کرسکتا ہے۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ اس میں ہمارے علماء کو دین کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے کوئی راہ نکالنی ہوگی۔ لاکھوں اور کروڑوں روپے کی مالیت کی مشینوں کو کاریگر کے اوزاروں پر قیاس کافی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ لیکن ملوں اور فیکٹریوں میں جو بھی خام مال اور تیار مال موجود ہے اس کے بارے میں کسی فقہی مکتب میں قطعی اختلاف نہیں ہے سب کا اس پر اتفاق ہے کہ جیسے نقد اثاثہ ہے اسی طرح ہر نوع کا تجارتی مال بھی اثاثہ ہے۔ زیورات بھی اثاثہ ہیں۔ ان سب پر ایک سال کی مدت گزرنے کے بعد زکوٰۃ عائد ہوگی۔ اس میں کسی کے نزدیک بھی اختلاف نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ہم نے انگلی کٹا کر شہیدوں میں نام لکھوانے کا معاملہ کیا ہے۔

اب تک اس زکوٰۃ کی تقسیم کے نظام کا معاملہ یہ ہے کہ کہنے کو نظامِ زکوٰۃ نافذ بھی ہوگیا لیکن معاشرے میں اونچ نیچ اور فرق و تفاوت جوں کا توں ہے۔ اس کی مناسب تعبیر یہ ہوگی کہ BEGGARLY کے انداز کو ایک بہتر شکل دے دی گئی ہے۔ بھیک دینے اور خیرات بانٹنے کی جو شکل ہے وہ منظم ہوگئی ہے اس کے سوا اس کا کوئی مثبت اور خوشگوار نتیجہ ہمارے معاشرے میں نہیں آیا ہے۔ افلاس و غربت جوں کی توں ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ ایک منصوبہ بندی کے ساتھ زکوٰۃ کے ذریعہ معاشرے میں سے پہلے کام کے اہل مستحقین افراد کو روزگار یا وسائل مہیا کئے جاتے تاکہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے لیے خود کفیل UNIT بن جاسکتے۔

---

[1] تقسیم زکوٰۃ کے لیے جو نظام رائج ہے اس میں بھی کافی نقائص ہیں۔ اسے اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے بھی استعمال کیا جا رہا ہے اور "اندھا بانٹے ریوڑیاں اپنے ہی اپنے کو دے" کا معاملہ بھی کافی حد تک اس میں موجود ہے۔ (مرتب)

اسی طرح سود کا معاملہ ہے۔ اس کے متعلق حال ہی میں بڑے دعوے سے کہا جا رہا ہے کہ جلد ہی پورا سودی نظام ختم کیا جا رہا ہے تو اس کے متعلق تو نظام کو دیکھ کر ہی رائے دی جا سکے گی کہ یہ متبادل نظام کس حد غیر سودی اور اسلام کی منشا کے مطابق ہے۔ میں کوئی ماہر اقتصادیات نہیں ہوں۔ اس معاملہ میں مجھے جن لوگوں کے دینی فہم پر اور دیانت پر بھروسہ ہے اور پھر وہ ماہرین اقتصادیات بھی ہیں، ان کی رائے پر اعتماد کرنا ہوگا۔ لیکن اس سے پہلے جو کچھ ہوا ہے اور تا حال ہو رہا ہے یعنی P. L. S. کا جو کاؤنٹر کھولا گیا ہے، اس کے متعلق جہاں تک ہم نے تحقیق کی ہے تو معلوم ہوا کہ وہی سود ہے اس میں سر مو کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف یہ ہوا ہے کہ لیبل بدل دیا گیا ہے۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ PRIZE BONDS کا سلسلہ نہ صرف یہ کہ جاری ہے بلکہ اس میں ہر سال نئی ATTRACTION پیدا کی جاتی ہے۔ پرائز بونڈز میں نہ صرف سود INVOLVE ہے بلکہ اس میں جوئے کا عنصر بھی بکمال و تمام شامل ہے مزید برآں حکومت کی مختلف INVESTMENT CERTIFICATES کی جو اسکیمیں چل رہی ہیں اور نئی نئی جاری ہوتی رہتی ہیں ان کے متعلق تو ایک عام پڑھا لکھا شخص بھی بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ صد فی صد سودی اسکیمیں ہیں۔

اسلامی نظام معیشت و اقتصادیات کے اعتبار سے دو ہی چیزیں اہم ترین ہیں۔ ایک سود کا خاتمہ، دوسرے تحصیل و تقسیم زکوٰۃ کا نظام۔ ان کے حوالے سے اگر ہم نے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ سود ختم ہوا اور نظام زکوٰۃ نافذ ہو گیا۔ لہٰذا اقتصادی و معاشیاتی شعبہ میں اسلام آگیا! کہنے کو تو اسلام آگیا لیکن عام لوگوں کی معاشی و اقتصادی حالت میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ معاشرے میں تو کوئی فرق و تفاوت دور ہوتا نظر نہیں آتا۔ سرِ مو کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سنجیدگی سے اس تضاد کو دیکھیے کہ ایک طرف بڑے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ اسلام آگیا۔ اسلام آگیا۔ لیکن دوسری طرف منکرات کو فروغ ہو رہا ہے۔ رشوت بڑھتی جا رہی ہیں CORRUPTION میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بے پردگی اور بے حیائی بھی روز افزوں ہے اسلام آ رہا ہے لیکن عورتوں کی آزادی کی تحریک میرے نزدیک اس صدی میں جس طریقے سے ترکی میں مصطفےٰ کمال اتاترک نے چلائی تھی اور اس کے بعد بعض دوسرے ممالک میں

چلائی گئی ہے۔اسی سطح پر اس مارشل لار کے دور میں "اسلامی جمہوریہ پاکستان" میں حکومت کی سرپرستی میں چل رہی ہے فرق صرف یہ ہے کہ ان تمام منکرات پر "اسلام آ رہا ہے" اسلام آ رہا ہے" کا لبادہ پڑا ہوا ہے۔اسی وجہ سے یہ چیز دبی ہوئی ہے ورنہ مغربی تہذیب کے زیر اثر مساوات مرد و زن اور آزادیٔ نسواں کی تحریک ہمارے معاشرے میں پورے زور شور سے جاری ہے اور اس کی پشت پر مدد کے لیے ملک کے قومی ذرائع ابلاغ بے دریغ استعمال ہو رہے ہیں۔

اسلام آ رہا ہے اور ساتھ ہی یہ چیزیں بھی آ رہی ہیں۔منکرات کے فروغ کا معاملہ صاف نظر آ رہا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو ثقافت اس ملک میں آج سے آٹھ دس سال پہلے تھی کیا اسی ثقافت کی آج ترویج نہیں ہو رہی! کیا اسی کی سرپرستی موجودہ حکومت نہیں کر رہی ہے! مادام نور جہاں کبھی فوٹوؤں میں جنرل محمد یحییٰ خاں کی گود میں بیٹھی نظر آتی تھی! تو اس کا استقبال بڑے اکرام و اعزاز کے ساتھ گورنمنٹ ہاؤس میں اس وقت نہیں ہو رہا! فرق و تفاوت کیا ہے! فرق صرف ایک شخص کا ہے کہ اُس کی گود میں کوئی ایکٹریس بیٹھی نظر نہیں آتی۔

الحمدللہ یہ بھی بڑی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو منکرات کی اس حد تک جانے سے محفوظ رکھے۔ لیکن اس فرق کے علاوہ سوال تو پورے رویّے کا ہے۔ سوال اس پوری ثقافت کا ہے۔ اگر ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی صدرِ مملکت کی طرف سے ایوان حکومت میں بڑی شان اور آن بان کے ساتھ پذیرائی ہو رہی ہو اور وہ ہو رہی ہو اس حال میں کہ ایک طرف ترویج اسلام کے دعوے ہیں۔ دوسری طرف یہ صریح تضاد ہے۔ پھر یہ بھی کہا جائے۔ یہ قول صدر صاحب سے منسوب تمام اہم اخبارات میں آیا ہے کہ "دیکھ لیجئے میں کرڑ نہیں ہوں، اسی لیے آپ کے درمیان موجود ہوں"۔ تو نہایت ہی سوالیہ نشان ذہن میں ابھرتا ہے کہ وہ کون سا اسلام ہے جس کے نفاذ کے عزائم کا اظہار سات سال سے بھی زیادہ عرصے سے مسلسل کیا جا رہا ہے اور بڑے دعاوی کیساتھ یہ سلسلہ جاری ہے۔

ؔ محترم صدر مملکت نے ایک ٹیلیویژن انٹرویو میں ٹی وی کے پروگرام "نیلام گھر" کے COMPILER طارق عزیز صاحب کو "مبلغ اسلام" کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ (مرتب)

میں ہرگز اس وقت یہ باتیں نہ کہتا اگر یہ چیزیں کسی اور دَور میں ہو رہی ہوتیں۔ جہاں ہمارے معاشرے میں بے شمار خرابیاں چلی آ رہی ہیں، ان میں اس نوعیت کی خرابیاں بھی موجود ہیں لیکن "اسلام آ رہا ہے" کے دعووں کے ساتھ ان منکرات میں کمی کے بجائے فروغ ہونا نہایت دُکھ کی بات ہے۔ ان منکرات میں سے کسی کو ہدف بنا کر مورچہ بندی کرنا میرے پیشِ نظر نہیں ہے۔ میرا مستقل موقف تو یہ ہے کہ ہم قرآن و سنت سے ماخوذ طریق کار کے مطابق اسلامی انقلاب کے لیے میدان ہموار کرتے چلے جائیں۔ لیکن جب یہ سب کچھ ان ہاتھوں سے ہو رہا ہو، جن کا اوڑھنا بچھونا اسلام ہو، جو اُٹھتے بیٹھتے اسلام کا نام لیتے ہوں۔ جو اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم نے یہاں اسلام قائم کیا ہے، قائم کر رہے ہیں اور قائم کیے بغیر نہیں جائیں گے۔ ایسی صورتِ حال میں معاملات شدید تشویش کا باعث بن جاتے ہیں کہ یہ پیش قدمی کس سمت میں ہو رہی ہے۔ یہ اسلام کی طرف ہو رہی ہے یا اس کی مخالف سمت میں جا رہی ہے! یہ راہرو پشت بمنزل ہے یا اس کا چہرہ منزل کی طرف ہے۔ یہ فیصلہ بہرحال کرنا پڑے گا اور بات صحیح صحیح کہنی پڑے گی اس لیے کہ ایسی صورتِ حال میں خاموش رہ جانا میرے نزدیک کتمانِ حق ہے حق کا چھپا لینا ہے[1]

اسی لیے میں نے آج آغاز میں سورۂ حج کی تین آیات کی تلاوت کے بعد ایک متفق علیہ حدیث کا ایک بڑا حصہ بھی شامل کیا تھا اور آپ کو معلوم ہے کہ سند کے اعتبار سے متفق علیہ روایت سے اونچا حدیث کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس حدیث میں ان دعدوں کا ذکر ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیعت کے وقت صحابہ کرامؓ سے لیا کرتے تھے۔ اس حدیث کے راوی ہیں حضرت عبادہ ابن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ بَایَعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "ہم نے بیعت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے" عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ "اس بات پر کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے" فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ "خواہ مشکل ہو خواہ آسان ہو" وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ "خواہ ہماری طبیعت آمادہ ہو خواہ آمادہ نہ ہو اور ہمیں جبر کرنا پڑے"۔ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا۔

---

[1] وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ (البقرہ نمبر ۱۴۰) "اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے (حق کی) شہادت موجود ہو اور وہ اُسے چھپائے؟"۔ (مرتب)

" اور اس بات پر کہ خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے"۔ وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ۔" اور اس بات پر کہ ہم صاحب امر، اولوالامر سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ چھینا جھپٹی نہیں کریں گے۔ ہم اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہیں کریں گے"۔ یہ تمام مفاہیم حدیث کے اس درمیانی چھوٹے سے ٹکڑے میں شامل ہیں۔ وَعَلٰى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ۔" اور اس بات پر (بیعت کی) کہ ہم حق کہتے رہیں گے جہاں اور جس حال میں بھی ہوں اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف کھا کر یا بد دل ہو کر صحیح و حق بات کہنے سے باز نہیں رہیں گے"۔ یہ بیعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تھی — اور — میری بات توجہ سے سنیئے۔ اور یہ بیعت ہر مسلمان کی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اگر وہ کسی درجہ میں بھی حضورؐ کے دامن سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھتا ہے۔ یہ بیعت ہر مسلم و مومن کے دعوئ اسلام و ایمان کے مقتضیات و متضمنات میں آپ سے آپ شامل ہے۔ IMPLIED ہے۔ اگرچہ ہم اس شرف سے محروم ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں اپنا ہاتھ دے کر اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کر کے بیعت کی ہوتی لیکن ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اصولاً ہماری یہ بیعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔ یہ ساری باتیں اور یہ سارے کام ہمیں کرنے ہوں گے جو اس بیعت کے الفاظ میں بیان ہوئے۔ اگر نہیں کرتے تو پھر ہمارا تعلق نبی اکرمؐ کے ساتھ قائم نہیں ہے۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

یہ زائرین حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

یہی وفاداری کا معاملہ ہے جسے جوابِ شکوہ میں علامہ نے یوں بیان کیا ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں!
یہ جہاں چیز ہے کیا! لوح و قلم تیرے ہیں

میں نے یہ بات موجودہ حکومت کے سامنے کئی مرتبہ رکھی ہے۔ شوریٰ میں یہ بات کہی ہے جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب صدر مملکت سے ذاتی طور پر مئی ۱۹۸۳ء کی ملاقات میں عرض کی ہے جب میں شوریٰ سے اپنا استعفیٰ ان کو پیش کرنے گیا تھا۔ میں نے

ان سے عرض کیا کہ آپ نے اس ملک میں شریعت کورٹ بنائی - اتنا بڑا تاریخی کام کیا کہ یہ کورٹ تمام قوانین کی جانچ پڑتال کرسکتی ہے کہ وہ شریعت کے مطابق ہیں یا ان کا کوئی جزو یا کل کا کل، کوئی قانون شریعت کے خلاف تو نہیں ہے - پھر آپ نے اپنی صوابدید کے مطابق اس ملک کے چوٹی کے جو بھی ماہرین شریعت تھے، انہیں وہاں لاکر بٹھایا ہے کسی اور نے اُن کو آپ پر ٹھونسا نہیں ہے۔ آپ کا اپنا SELECTION ہے۔ آپ کا اپنا ہے۔ آپ کے اپنے پسندیدہ لوگ ہیں ۔ ان کے علم پر، ان کے تقویٰ پر، ان کی امانت پر، ان کی دیانت پر آپ کو پورا اعتماد ہے تب ہی آپ نے انہیں اتنے اونچے منصب پر بٹھایا ہے ۔ لیکن آپ نے یہ کیا کیا کہ عائلی قوانین کے بارے میں ان کے ہاتھ باندھ دیئے ۔ اس قانون کے بارے میں وہ غور نہیں کر سکتے ۔ کوئی رٹ وہ چاہے بھی تو وہ اُسے سن نہیں سکتے ۔ ان عائلی قوانین کو کوئی چیلنج کرے تو وہاں اس کی سماعت ہو ہی نہیں سکتی ۔ میں نے اُن سے کہا کہ "یہ کیسا عجیب معاملہ ہے ۔ ہمارے قرآن میں اور احادیث میں، خاص طور پر قرآن مجید میں جس سے ہر دینی شغف رکھنے والا فرد واقف ہے، سب سے زیادہ تفصیلی احکام جو ملتے ہیں، وہ عائلی زندگی سے متعلق ہیں"۔ ملک کا سیاسی ڈھانچہ کیا ہو! اس کے بارے میں تفصیلی احکام نہیں ہیں۔ صرف DIRECTIVE PRINCIPLES دیئے گئے ہیں ۔ اصول دیئے گئے ہیں۔ اسی طریقے سے معاشی ڈھانچہ کیا ہو! اس کے لیے بھی چند چیزیں حرام کر کے ہمارے لیے گویا کہ وہ FOUR CORNERS معین کر دیئے گئے ہیں کہ اُن سے باہر قدم نہیں رکھا جا سکتا ۔ باقی رہا اس کا کوئی تفصیلی ڈھانچہ تو وہ آپ کو قرآن میں نہیں ملے گا۔ وہاں تو آپ کو راہنما اصول ملیں گے ۔ اور اسی میں حکمت تھی ۔ چوں کہ سیاسی اور اقتصادی اعتبارات سے ابھی زمانے میں اور ترقی اور ارتقاء ہونا تھا ۔ اللہ کے علم میں تو تھا کہ ابھی صنعتی انقلاب بھی آنے والا ہے ۔ صنعتی انقلاب کے بعد اس دنیا میں بالکل نئے معاشی مسائل پیدا ہو کر رہیں گے ۔ لہذا تفصیلی ڈھانچہ اس وقت کے مجتہدین امت کے لیے چھوڑ دیا جائے کہ جو چیزیں حرام مطلق ہیں، ان کی حدود مقرر کر دی گئیں ۔ باقی اب تمہیں اختیار ہے کہ اس دائرے کے اندر اندر اپنے لیے حالات کی مناسبت سے کوئی نظام تجویز کر لو ۔ اسی طریقے سے سیاسی ارتقاء کا عمل ابھی جاری تھا۔

بائلی نظام سے آگے شہری ریاستیں، اس سے آگے مملکتیں اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ تصوّر آنا جو آج دنیا میں موجود ہے کہ STATE علیحدہ ہے۔ GOVERNMENT علیحدہ ہے۔ اس وقت تک تو ان کے مابین کوئی DIFFERENTIATION موجود تھا ہی نہیں۔ کوئی فرق و امتیاز تھا ہی نہیں۔ ریاست اور حکومت ایک شے سمجھے جاتے تھے۔ لہٰذا اس وقت سیاسی اعتبار سے بھی ہمیں کوئی تفصیلی ڈھانچہ نہیں دیا گیا۔ گویا ہمارے ہاتھ کھلے چھوڑے گئے کہ تفصیلی سیاسی ڈھانچہ حالات وظروف کے مطابق تم بنا سکتے ہو۔ ہاں اس کے بنیادی اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتے۔ ان میں پہلا بنیادی اصول ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ دوسرا اصول ہے اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۔ ان ہی دو اصولوں کو سورہ حجرات کے آغاز میں بایں الفاظ مبارکہ فرمایا گیا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۔ حاکمیتِ مطلقہ اللہ کی ہے۔ اللہ کی اطاعت بواسطہ رسول ہوگی۔

قانون سازی کا اختیار محدود ہے۔ مقید ہے۔ وہ اسی دائرے کے اندر اندر رہ کر کی جائے گی جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے مقرر فرما دیا ہے۔ کتاب اللہ اور سُنّتِ رسولؐ کی نصوص اور واضح تصریحات سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ اس دفعہ کو جو ہر دستور میں بطور رہنما اصول DIRECTIVE PRINCIPLE شامل رہی ہے نافذ العمل OPERATIVE CLAUSE بنا دیجئے کہ " NO LEGISLATION CAN BE DONE REPUGNANT TO THE QURAN AND THE SUNNAH " ____________ تو ریاست اسلامی ریاست ہو جائے گی۔ پھر یہ کہ کوئی شخص بادشاہ یا آمرِ مطلق بن کر تختِ اقتدار پر نہیں بیٹھ سکتا۔ اسلامی ریاست میں لازماً اس اصول پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۔ رہا یہ سوال کہ شورائیت کا نظام کیا ہو! تو تمدّن کے ارتقائی مراحل کے مطابق کتاب و سنّت کے دائرے کے اندر رہ کر جو بھی حالات وظروف اور ملک کے رہنے والوں کی نفسیات کے اعتبار سے بہتر اور مناسب نظام سمجھا جائے، اُسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ تو یہ ہیں سیاسی و اقتصادی معاملات کے متعلق اصل الاصول۔ لیکن جہاں تک عائلی و معاشرتی احکام اور قوانین کا تعلق ہے تو سورہ

بقرہ کے پانچ چھ رکوع اسی موضوع پر چلتے چلے گئے ہیں۔ سورۂ نساء میں ان پر پھر بڑی تفصیلی بحثیں آئی ہیں۔ پھر سورہ مائدہ میں یہ موضوع تفصیلی طور پر زیرِ بحث آتا ہے۔ پھر سورہ نور اور سورہ احزاب کے بڑے بڑے حصے مسلمانوں کے خاندانی نظام اور معاشرتی و مجلسی زندگی کے بارے میں ہی آگے چلئے۔ پھر سورہ طلاق کا اکثر و بیشتر حصہ انہی موضوعات پر ہے۔ پھر ایک پوری سورہ' سورہ تحریم کے بھی اکثر و بیشتر حصے میں ان ہی مسائل پر گفتگو ہے۔ ان مسلمانوں کے عائلی و خاندانی نظام کے بارے میں انگریزی حکومت نے بھی یہ جرأت نہیں کی تھی کہ وہ اس کے اندر کوئی مداخلت کرے۔ اس نے بھی ان مسائل کو مسلمانوں کی اپنی صوابدید پر چھوڑے رکھا تھا۔ ہم عمل کرتے تھے یا نہیں کرتے تھے' یہ بات دوسری ہے۔ ہمارے یہاں وہ بدبخت مسلمان بھی تھے جو بیٹیوں' بہنوں کا حق وراثت شریعت کے مطابق دینے کے بجائے رواج کے مطابق انہیں محروم کرتے تھے۔ لیکن ایک بدیشی اور غیر مسلم حکومت نے بھی ہمارے عائلی و خاندانی قوانین و احکام کے اندر کسی نوع کی قدغنیں عائد نہیں کی تھیں ——— یہ ہوا ہے پہلے مارشل لا میں جو ایوب خان کا مارشل لا تھا اور منکرین حدیث و سنت کا ہمارے یہاں جو ذہن ہے' دراصل پورا عائلی قانون اس ذہن کا مظہر ہے جس کو بالجبر نافذ کر دیا گیا۔ حالاں کہ اس دور میں ہمارے تمام مسلّمہ فقہی مسالک کے تمام جیّد علمائے کرام نے حتیٰ کہ اہلِ تشیع نے بھی اس قانون کی اکثر و بیشتر دفعات کو بالکلیہ خلافِ اسلام قرار دیا تھا۔ میں نے صدر صاحب سے یہ بھی عرض کیا تھا کہ "آپ کا مارشل لا اُس کو تحفظ (PROTECTION) دے رہا ہے"۔ میں نے ان سے کہا کہ "میں یہ نہیں کہتا کہ آپ میری رائے پر عمل کیجئے' میں تو اس کا مدعی ہی نہیں کہ میں عالمِ دین ہوں"! میں نہ فقیہہ ہوں' نہ مفتی ہوں۔ کچھ بھی نہیں۔ میں نہ عارف' نہ فقیہہ' نہ مجدّد' کچھ بھی نہیں ——" لیکن سوال یہ ہے کہ آپ نے شریعت کورٹ بنائی ہے' اس میں معاملہ پیش ہونے دیں۔ وہاں علماء بھی اپنا موقف اور اپنے دلائل پیش کریں ——— پرویز صاحب اور ان کے ہم نوا بھی اپنا موقف اور استدلال پیش کریں۔ دلیل اور جرح و تعدیل سے معاملہ طے ہو جائے گا۔ اس کی روشنی میں شریعت کورٹ طے کرے گی کہ عائلی قانون میں کوئی چیز خلافِ شریعت ہے یا نہیں۔

اور شریعت کورٹ میں آپ نے ان لوگوں کو بٹھایا ہوا ہے جو آپ کے معتمد علیہ ہیں۔ لہٰذا اس میں آخر آپ کو کیوں ہچکچاہٹ ہے آپ اُسے کیوں تحفظ دے رہے ہیں!۔"

غور کیجیے کہ تضاد کا یہ عالم ہے کہ وہ میدان جس میں تفصیلی احکام شریعت نے دیئے ہیں، اس پر تو قدغن ہے۔ اس پر تو شریعت کورٹ بھی غور نہیں کرسکتی۔ اور وہ معاملات جن کے بارے میں شریعت میں کوئی تفصیلی احکام نہیں ہیں، ان کے بارے میں لمبی چوڑی بحثیں ہیں جو ہمارے معاشرے میں چھیڑ دی گئی ہیں —— جماعتی نظام ہوسکتا ہے یا نہیں! سیاسی جماعتیں ہوسکتی ہیں یا نہیں! جماعتی انتخاب ہوسکتا ہے یا نہیں ہوسکتا! غیر جماعتی انتخاب ہوسکتا ہے یا نہیں! یہ وہ مسائل ہیں جن کے متعلق شریعت میں کوئی واضح ہدایت نہیں ملے گی نہ کتاب اللہ سے نہ سنتِ رسول سے۔ ان کے بارے میں واضح احکام ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ ان مسائل پر تو لمبے چوڑے فلسفے کثرت سے تراش دیئے گئے ہیں۔ چند دانشور حضرات ہیں جو لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں آگئے ہیں۔ مجھے ان کی نیت پر کوئی شک نہیں ہے۔ ان کی رائے ہے لیکن میں ان حضرات کی خدمت میں دست بستہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات تو ہمیں خلافتِ راشدہ میں نظر نہیں آئی کہ وہاں کوئی پارٹی ہو—— لیکن کیا خلافتِ راشدہ کی ایک اور چیز انہیں نظر نہیں آئی! یہ کہ وہاں مسلح افواج STANDING ARMY کا کوئی تصور موجود نہیں تھا کیا وہاں فوجیں تھیں! اس طریقے سے جس طرح کی فوجیں آج ہمارے یہاں موجود ہیں! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہوبہو سارا وہی نظام اس ملک میں آنا چاہیئے تو پھر فوج کا بھی وہی نظام یہاں بھی لائیے۔ اس ترمیم کے ساتھ کہ AIR FORCE اور NAVY کا معاملہ اور سپلائی نیز ذرائع ابلاغ COMMUNICATION کے محکمے برقرار رکھیئے لیکن INFANTRY کا معاملہ اور CAVALRY کا معاملہ یا اور جو چیزیں ہیں ان کو چھوڑ دیجیئے۔ PEOPLE ARMY بنا یئے۔ وہاں تو ہر مسلمان اللہ کا سپاہی تھا ہر مسلمان مجاہد تھا۔ جب ضرورت ہوتی تھی تو پوری قوم آتی تھی اور جتنے لوگوں

کی ضرورت ہوتی تھی' میدان میں نکل آتے تھے۔ آپ یہاں جبری فوجی بھرتی اور جبری فوجی ٹریننگ نافذ کیجیے۔ ہر مسلمان شہری کو فوجی بنا دیجیے۔ لیکن خلافتِ راشدہ کے دور کی یہ بات تو نظر نہیں آ رہی۔ اس کو اختیار کرنے کا کوئی مشورہ نہیں دے رہا! اس کے لیے اگر دلائل ہیں کہ زمانہ بدل گیا' نظام بدل گیا' صورتِ حال متقاضی ہے' اس دور میں مسلح افواج نہ ہوں تو DEFENCE نہیں ہو سکتا۔ صحیح دلائل ہیں تو اگر یہ دلیل اس میدان میں کارگر ہے اور یقیناً ہے تو اس دلیل سے آپ سیاسی میدان میں کام کیوں نہیں لیتے! اس میدان میں آپ سیاسی جماعتوں کی موجودگی اور انتخابی عمل کو تمدنی ارتقار اور اس دور کا تقاضا قرار کیوں نہیں دیتے! آپ صرف سیاسی میدان کے لیے خلافتِ راشدہ کے دور کو بطور دلیل لا کر اس کی نفی کرنا چاہتے ہیں! آخر کیوں۔؟

میں اس لیے اس کی وضاحت کر رہا ہوں کہ میں نے بھی اصل میں قریباً پونے دو سال قبل جناب صدرِ مملکت کے نام خط لکھا تھا جس کا تذکرہ آ چکا ہے۔ میں نے اس میں غیر جماعتی انتخاب کی حمایت کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس بات سے لوگ اس مغالطے میں مبتلا ہوں کہ اس وقت جو غیر جماعتی انتخاب کی مختلف گوشوں سے حمایت ہو رہی ہے تو میں بھی اس کا حامی ہوں۔ لہٰذا میں یہ بات برملا کہتا ہوں اور ان کو ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ میں غیر جماعتی انتخابات کا ہرگز حامی نہیں ہوں اس وقت میں نے جو غیر جماعتی انتخاب تجویز کیا تھا تو اصل میں وہ تشکیلِ حکومت یا منتقلیٔ اقتدار کے لیے نہیں تھا بلکہ وہ اس لیے تھا کہ ملک کے سیاسی ڈھانچے اور نظام کے بارے میں فیصلہ کرنے کے مجاز صدر صاحب تنہا نہیں ہیں۔ ایک فرد اور اس کے اپنے چنے ہوئے چند رفقائے کار کو کوئی خدائی اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک آزاد ملک کے سیاسی ڈھانچے اور نظام کے بارے میں جو چاہیں فیصلہ کر دیں اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار بہرحال اس ملک میں بسنے والوں کو حاصل ہے۔ لہٰذا میں نے صرف اس نظام کے بارے میں طے کرنے کے لیے نہ کہ تشکیلِ حکومت کے لیے۔ انتخابات کس نہج پر ہوں! نظام پارلیمانی ہو یا صدارتی ہو! ووٹر اور امیدوار کی عمر اور اہلیت کے بارے میں کسی تبدل و تغیر کی ضرورت ہے یا نہیں! طرزِ حکومت وحدانی ہو کہ وفاقی ہو! ان مسائل کو طے کرنے کے لیے ایک نیم دستوریہ کی تشکیل کے لیے میں نے غیر جماعتی انتخاب کا طریق تجویز کیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی تجویز کیا تھا کہ جب یہ مسائل بحسن و خوبی

طے ہو جائیں تو عوام کے ان منتخب نمائندوں کے منظور شدہ اصولوں کے مطابق ملک میں جلد سے جلد انتقالِ اقتدار اور حکومت کی تشکیل کے لیے انتخابات کرا دیئے جائیں یہ انتخاب جماعتی بنیادوں پر ہی ہو سکیں گے۔ لیکن اگر آپ ۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق انتخابات کراتے ہیں تو فبہا۔ آپ یہ بھی کر سکتے ہیں چوں کہ اس کی پشت پر سند موجود ہے کہ اس کو ایک منتخب اسمبلی نے منظور کیا تھا۔ اسمبلی میں شامل تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے اس پر توثیقی دستخط کیئے تھے ——— اور اس طرح کچھ لو کچھ دو۔ GIVE AND TAK کے اصول پر ایک مصالحانہ دستاویز تیار کی گئی تھی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ جس شخص نے اتنا بڑا CREDIT لیا تھا اسی نے پھر اس کو موم کی ناک بنا دیا تھا۔ اس نے بہت سی ترمیمیں کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ لیکن ان ترامیم کو CONDONE کر دیا جائے تو وہ قوم کی متفق علیہ دستاویز ہے۔ میں نے متعدد بار اپنی تقریروں میں بھی صدر صاحب کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ اگر اس ملک و ملت کی خیر خواہی کے لیے آپ کے پاس کسی بہتر سیاسی نظام کا نقشہ ہے تو آپ کو حق ہے کہ آپ اُسے پیش کریں لیکن فیصلے کا اختیار آپ کو نہیں ہے۔ فیصلہ یہاں کے رہنے والے اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے توسط سے کریں گے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ متنازعہ فیہ نہیں ہے۔ معاملہ ہے سیاسی ڈھانچے اور نظام کا۔ اس سیاسی ڈھانچے اور نظام کو طے کرنے کے لیے غیر جماعتی انتخابات کے ذریعہ ایک GRAND ASSEMBLY تشکیل کرا لیجیئے۔ اسے PEOPLE CONGRESS کہہ لیجیئے، کسی اور نام سے منسوب کر لیجیئے، اُسے غیر جماعتی بنیاد پر منتخب کرا لیجیئے اور وہ جو ڈھانچہ اور نظام طے کرے۔ اس کے مطابق جماعتی بنیادوں پر پھر دوسرا انتخاب ہو اور وہ انتخاب تشکیلِ حکومت اور اقتدار کی منتقلی کیلئے ہو۔ میری تجویز کا اصل مفاد و مقصد یہ تھا۔

فی الوقت حکومت کی طرف سے بڑے شد و مد اور تیقن کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ انتخابات ۱۲ اگست ۸۳ء میں دیئے ہوئے شیڈول کے مطابق ضرور ہوں گے۔ البتہ یہ بات ابھی تک غیر واضح ہی نہیں، معمہ بنی ہوئی ہے کہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہوں گے یا غیر جماعتی بنیاد پر۔ میں کہتا ہوں کہ کسی طریق سے بھی ہوں اللہ کرے کہ سیاسی و انتخابی عمل کسی طور پر بھی ہو جاری ہو جائے اور کوئی داخلی یا خارجی صورتِ حال اس کے راستے کی رکاوٹ نہ بن جائے۔ بہرحال اس وقت

جو کچھ بھی ہو رہا ہے یا ہونے کا امکان ہے، وہ درحقیقت میری اس پیش کردہ تجویز
کے تحت نہیں ہے جو میں نے خط کے ذریعہ صدر صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی۔ بلکہ یہ
نیا فلسفہ ہے جو بعض دانشوروں اور بعض علماء کے حوالے سے فضا میں پھیلا دیا گیا ہے۔
اس کی وجہ سے ہمارے ملک کے بعض قابلِ لحاظ عناصر میں شدید بے چینی پائی جاتی ہے۔
آپ کو معلوم ہے کہ جب گھٹن اور حبس کی شدید کیفیت ہو تو جلد بارش ہونے کا قریباً یقین
ہو جاتا ہے اسی طرح لبسا اوقات سیاسی طور پر گھٹن اور بے چینی کا جو ردِ عمل ہوتا ہے وہ ظہور
کرتا ہے ــــ آپ کو اخبارات کے ذریعہ اس حد درجہ افسوسناک واقعہ کا علم ہو گیا ہو گا جو
کراچی میں سندھ میڈیکل کالج میں عین "یومِ استقلال" کی تقریب کے دوران آپ کے قومی پرچم
کے ساتھ ہوا ہے اور "سندھو دیش" کے حق میں نعرے لگائے گئے ہیں۔ اس سے اندازہ
کیجیے کہ اندرون سندھ صورتِ حال کیا ہوگی! اس ناسور نے کتنی گہری جڑیں پکڑ لی ہیں
اس کا اندازہ اس افسوسناک واقعے سے کیا جا سکتا ہے ــ کراچی جیسا شہر ــــ
کراچی میں رہنے والوں کے لیے تو سندھی نیشنلزم میں کوئی کشش اور جاذبیت نہیں۔
سندھی بے چارے تو اس آبادی میں آٹے میں نمک کے برابر ہوں تو ہوں۔ وہ تو خالص
مہاجرین کا شہر ہے اور یہی ہمارے سندھی بھائیوں کو شکایت بھی ہے۔ لیکن
اس شہر میں، اس گڑھ میں جسے بانی پاکستان قائداعظم کے مولد ہونے کا شرف بھی
حاصل ہے اور مدفن کا بھی ــ اس شہر میں قومی پرچم کے ساتھ سندھ میڈیکل کالج میں
جو کچھ ہوا ہے اور نظریۂ پاکستان کے خلاف جس طرح ہنگامہ آرائی ہوئی ہے، وہ ایک بڑے
خطرے کی علامت ہے ــ اگر یہ خبر اخبارات میں نہ آتی تو مجھے کیا پتہ ہوتا اور آپ کو
کیا پتہ ہوتا ــ اور اندرون سندھ جو کچھ ہوتا ہے اس کے متعلق یہی عرض کر سکتا ہوں کہ

قیاس کن ز گلستانِ من، بہار مرا

اس پھوڑے کی گہرائی کا اندازہ کیجیے جس کے پیپ کے یہ چند قطرے باہر آئے ہیں و
بھی یومِ استقلال کو اور کراچی جیسے شہر میں ــ تو اس سے اندازہ کیجیے کہ لاوا کیا پک
رہا ہے! ــ یہ لاوا اندر ہی پک رہا ہے اور حالات کے مشاہدے سے اندیشہ ہوتا
ہے کہ باہر کا طوفان اور سیلاب بھی آیا ہی چاہتا ہے۔

انہی خطرات کے پیشِ نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اکثر دینی عناصر، ہمارے

علماء کرام اور دینی جماعتیں اَھْوَنُ البَلِیَّتَین کے فلسفے پر کاربند ہیں جو عموماً ایسے حالات میں ان کے سامنے رہتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے جو ہمارے معاشرے میں منکرات کے فروغ کے لیے ہو رہا ہے۔ مہر بلب ہیں۔ کیا ہاتھ کی بنائی ہوئی تصاویر کے بارے میں ان سب کی رائے وہ نہیں ہے جو میں نے پیش کی ہے۔! کیا اسلام میں عورت کے اصل مقام ستر و حجاب' قرن فی البیوت اور ان کے علیحدہ دائرہ کار کے متعلق کتاب و سنت کی روشنی میں دلائل کے ساتھ میں نے دو ڈھائی سال قبل جو اپنی رائے پیش کی تھی' کیا ان مسائل کے بارے میں ان سب کی وہی رائے نہیں ہے۔! لیکن آزادی نسواں اور مساوات مرد و زن کے نام پر ہمارے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے' آزاد خیال اور مغرب زدہ خواتین کو جس طرح معاشرے میں اونچا اٹھایا جا رہا ہے! کھلی چھوٹ دی جا رہی ہے! کیا ان کی رائے میں یہ سب کچھ اسلام کے مطابق ہو رہا ہے۔! لیکن وہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی خاموش ہیں۔ کیا آئیڈیولوجی کونسل نے یہ فتویٰ نہیں دیا تھا کہ قائداعظم اور دوسرے اکابر کی سرکاری دفاتر و ایوانات میں تصاویر لگانی شرعاً صحیح نہیں ہے! اس پر کتنا عمل درآمد ہوا! کیا یہ سب کچھ ان کے علم میں نہیں ہے! ـــــ یہ بات نہیں ہے کہ ہمارے دینی عناصر' ہمارے علماء اور دینی جماعتیں ان تمام منکرات سے بے خبر اور ناواقف ہوں جو اس دور میں بڑے پیمانے پر ہمارے معاشرے میں ترویج اور فروغ پا رہے ہیں ـــ لیکن ایک مصلحت ہے' ایک اندیشہ ہے۔ وہ یہ کہ اگر موجودہ REGIME ہٹ گئی جس کا سربراہ بذاتِ خود نماز اور روزے کا پابند ہے۔ اپنی ذات کے لحاظ سے پرہیزگار ہے۔ اسلام کے نافذ کرنے کی کوششوں کا مدعی ہے۔ اگر موجودہ REGIME ہٹ گئی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا گروہ مسلّط ہو جائے جو شاید ہماری ڈاڑھیاں بھی منڈوا دے۔ ہمارے دینی مدارس کی تالا بندی کرا دے۔ اس سے تو بہرحال موجودہ گروہ بہتر ہے۔ یہ اَھْوَنُ البَلِیَّتَین کا فلسفہ ہے جو موجودہ حکومت کے لیے سہارے کا موجب بن گیا ہے۔ لیکن میں ایک دوسرا خطرہ محسوس کر رہا ہوں وہ یہ کہ یہ صورتِ حال ہمارے عوام و خواص کو دین سے بالکل بدظن اور مایوس کر دے گی پھر یہاں دین کا نام لینا محال ہو جائے گا۔ حمیّت اور غیرتِ دین کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ رجال دین کو اپنے آپ کو اس عمل اور کام سے علی الاعلان بالکل علیحدہ کر لینا چاہیے۔ وہ عوام کو آگاہ کر دیں کہ اس PROCESS کے ساتھ ہماری تائید شامل نہیں ہے میں یہ واضح

طور پر عرض کرتا ہوں کہ اسلام کی ترویج و نفاذ اور اس کی ترجیحات والا معاملہ نہیں ہے۔ اسلام کی ترجیحات تو یہ ہیں کہ اسلام کو فی الواقع اور اخلاص کے ساتھ نافذ کرنا ہے تو پہلے اُسے گھر کے نظام میں نافذ کرو۔ اس کے بعد دوسری باتوں کی باری آئے گی ــــ اسلام کی ترجیحات میں یہ مقدم ہے ــــ پھر اسلام کی ترجیحات میں اقامتِ صلوٰۃ مقدم تھی اور زکوٰۃ کا نظام مؤخر تھا۔ چلیئے زکوٰۃ کا نظام پہلے لایا گیا، اس کوتاہی کو اگر CONDONE کر دیں تو وہ جس شکل میں لایا گیا اُسے میں بیان کر چکا ہوں۔ زکوٰۃ کا نظام جس کے متعلق ہم کہتے رہے ہیں کہ تمام معاشی مشکلات کا حل ہے۔ جو معاشرے میں غیر معمولی معاشی فرق و تفاوت کو دُور کرنے والا نظام ہے ــ یہی زکوٰۃ ہمارے اقتصادی نظام کا سب سے بڑا ستون ہے۔ لیکن اس کا ہمارے معاشرے میں عملاً جو نتیجہ پیدا ہوا ہے وہ آخر کون سی آنکھ ہے جو اُسے نہیں دیکھ رہی! کون سا ایسا انسان ہے جو اُسے محسوس نہیں کر رہا! تو یہ صورتِ حال نظام زکوٰۃ سے سے بدظن کرنے والی ہے۔ زکوٰۃ کی برکات کی قائل کرنے والی تو نہیں ہے۔

میں اس ضمن میں ایک اور بات بھی کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں بہت عرصے تک میرے ذہن میں اشکال رہا کہ آخر وجہ کیا ہے! جب کہ ایک بات بر وقت کہہ بھی دی گئی۔ آخر صدر صاحب کو مجھ سے کوئی حسنِ ظن تھا کہ انہوں نے پہلی علماء کنونشن کے انعقاد سے دو روز قبل مجھے ایک خصوصی اجلاس میں بلایا تھا۔ جس میں، میں نے اور باتوں کے ساتھ زکوٰۃ آرڈیننس کے متعلق بات بھی کہی تھی ــــ یہ ۱۸ راگست ۱۹۸۰ء کا واقعہ ہے ــ اسی اجلاس میں، میں نے اللہ کا واسطہ دے کر یہ عرض کیا تھا کہ آپ زکوٰۃ آرڈیننس پورے کا پورا واپس لے لیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ زکوٰۃ لوگوں کو اپنے اپنے طور پر ادا کرنے دیجئے۔ جن کو زکوٰۃ دینی ہوتی ہے، وہ اب بھی دے رہے ہیں۔ لیکن آپ اس میں یہ ترمیم نہ کیجئے گا کہ اہلِ تشیع کے بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وضع نہیں کی جائے گی۔ اور نہ ان سے اجتماعی طور پر عشر وصول کیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ جو لوگ زکوٰۃ اس وقت بھی اپنے طور پر بھی ادا نہیں کرتے، وہ شیعہ ہونے کا ایک DECLARATION داخل کریں گے۔ اور خود کو مستثنیٰ کرالیں گے اسطرح کم علم اور دین سے صحیح طور پر واقفیت نہ رکھنے والے سنیوں کے شیعہ بننے کا دروازہ کھل جائے گا۔ جس کا نتیجہ بہت خطرناک نکلے گا۔"
میں سوچتا رہا کہ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ آرڈیننس میں ترمیم کی گئی اور یہ عمل جاری ہے!

اگر بتایا نہ گیا ہوتا، ایک اندیشہ سامنے لایا نہ گیا ہوتا۔ جو بالکل درست ثابت ہوا۔ پھر جو بات اللہ کا واسطہ دے کر نہ کہی گئی ہوتی کیا اس میں کسی مغالطے کا امکان باقی تھا! کیا اپنے جوش کے اندر کسی حقیقت کو نظر انداز کر دینے کا امکان تھا! لیکن یہ بات اس انداز میں ان کے سامنے آگئی۔ پھر بھی ترمیم ہوئی۔ اہل تشیع مستثنیٰ کئے گئے اور یہ عمل جاری ہے یہ عقدہ کھلا جب کراچی سے صدر صاحب سے منسوب ایک خبر شائع ہوئی جس میں ان کے مستقبل کے سیاسی عزائم کی نشان دہی موجود ہے —— معلوم ہوا کہ یہ جو سارے نظام اور اقدام ہیں درحقیقت ان کی پشت پر اپنا ایک سیاسی FACE اور IMAGE بنانا ہے۔

انہوں نے یہی بات ایک دوسرے انداز میں "شوریٰ" کے دوسرے اجلاس کی اپنی افتتاحی تقریر میں فرمائی تھی کہ "یہ شوریٰ کا قیام سیاسی عمل کا آغاز ہے! اس طرح "شوریٰ" اقتدار میں شریک ہو گئی ہے"۔ اسی تقریر کے بعد میں نے "شوریٰ" سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے اسی اجلاس کے دوران صدر صاحب سے ملاقات کا وقت مانگا تھا مجھے اس وقت تو ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ ۵ رمئی ۸۳ء کو مجھے لاہور میں گورنمنٹ ہاؤس میں یہ موقع میسر آیا جس میں میں نے اپنا استعفیٰ بھی صدر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا اور چند ضروری معروضات بھی زبانی پیش کیں۔ جن کا تذکرہ میں کر چکا ہوں۔

میں نے اس موقع پر یہ بھی عرض کیا تھا کہ میں "شوریٰ" میں گیا تھا اُسے واقعی شوریٰ سمجھ کر میں جب مسجد کے ممبر پر کھڑے ہو کر مشورے دیتا رہتا ہوں اور جب صدر صاحب ایک جمعہ میں میرے سامنے تشریف فرما تھے تو میں نے چند مشورے اُن کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ اس لیے کہ وہ صدرِ مملکت ہیں۔ یہ نظام صحیح ہے یا غلط۔ اس سے قطع نظر DEFACTO تو موجود ہے —— میں نے عرض کیا کہ "آپ نے مشورے کے لیے شوریٰ قائم کی، مجھے بھی اس میں نامزد کیا تو مشورہ مانگنے والے کو دیانت سے مشورہ دینا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اسی لیے میں نے اُسے قبول کر لیا تھا۔" لیکن اب آپ اسے سیاسی عمل اور اقتدار میں شرکت قرار دے رہے ہیں اور اِسے یہ رنگ دے رہے ہیں کہ "شوریٰ" کے ارکان میرے POLITICAL ALLIES ہیں۔ سیاسی عمل میں میرے اتحادی اور حلیف ہیں۔" تو میں نے صاف عرض کر دیا تھا کہ میں یہ پوزیشن قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یہ بات میں نے صراحت کے ساتھ اپنے استعفیٰ میں بھی تحریر

کردی تھی۔

دنیا کو میرا یہ DECLARE موقف معلوم ہے کہ میں انتخابی سیاست، یا کسی نوع کی اقتدار میں شرکت کو اس نہج اور نقشے کے خلاف سمجھتا ہوں جو میرے پیش نظر ہے۔ میں جو کام کر رہا ہوں اس کا ابتدائی اور تمہیدی مرحلہ ہے وہ قرآن مجید کی دعوت اور پیغام کو پھیلانا ہے۔ اس کا فکر، اس کی حکمت، اس کا فلسفہ اتنا عام کر دیا جائے کہ لوگوں کے دلوں میں یقین والا ایمان پیدا بھی ہو جائے اور راسخ بھی ہو جائے۔ پھر اس دعوت قرآنی کے نتیجہ میں جاں نثاروں کی ایک ایسی جماعت وجود میں آجائے جو جہاد فی سبیل اللہ کے تمام مراحل طے کر کے دین کو نافذ کر سکے۔ تو میرے پیش نظر اصل کام یہ ہے۔ وقت کے سیاسی عمل میں میں کوئی حصہ لینا نہیں چاہتا۔ یہ رائے میری ضرور ہے کہ اس ملک میں سیاسی عمل ضرور بالضرور جاری رہنا چاہیئے ورنہ حبس پیدا ہو جائے گا۔ یہ حبس ملک کے لیے خطرناک ہے۔ حقیقی سیاسی عمل صحیح طور پر اور صحیح خطوط پر جتنا جلد جاری ہو سکے اتنا ہی ملک کے استحکام اور اس کی بقا کے لیے مفید ہے۔

یہاں ایک نہایت ضروری بات مجھے اور عرض کرنی ہے۔ مجھ سے عموماً سوال کیا جاتا ہے کہ ایک طرف تم کہتے ہو کہ میں انتخابات میں حصہ نہیں لوں گا اور یہ کہ ملک میں انتخابی سیاست کے عمل کے نتیجے میں یہاں صحیح اور مستحکم مکمل اسلامی نظام کا قیام تقریباً ناممکن ہے۔ دوسری طرف تم ملک میں انتخابی سیاسی عمل کے پر زور حامی ہو تو یہ تضاد (CONTRADICTION) ہے۔ میں نے اس کی ہمیشہ وضاحت کی ہے کہ یہ دونوں چیزیں بالکل علیحدہ ہیں۔ خلط بحث نہ کیجیئے۔ اس کی مثال میں یہ دیتا رہا ہوں کہ ایک ہے انسان کا زندہ رہنا ایک ہے اس کا مسلمان بننا۔ یہ دونوں چیزیں علیحدہ ہیں۔ زندہ رہنے کی ضروریات کیا ہیں؟ کہ اُسے ہوا ملے، پانی ملے، کھانے کو غذا ملے۔ اس میں سے کوئی چیز بھی اگر اُسے نہیں ملے گی تو وہ مر جائے گا۔ مسلمان ہونے کے لیے اُسے ایمان چاہیئے۔ اللہ پر ایمان، رسول پر ایمان، قرآن پر ایمان، آخرت پر ایمان۔ یہ دونوں چیزیں بالکل علیحدہ ہیں۔ آپ اگر زندہ رہنے کے لیے ایمان کی بات کہیں شروع کر دیں گے تو وہ غریب مارا جائے گا۔ اُسے زندہ رہنے کے لیے غذا کی ضرورت ہے، اُسے زندہ رہنے کے لیے ہوا اور پانی درکار ہے۔ مسلسل حبس ہوگا اور بھوکا بھی رہے گا تو وہ مر جائے گا۔ اسی طرح

سے ایک ملک کی بقا کے لیے اس دور میں جس میں ہم سانس لے رہے ہیں ۔۔۔ اگر آج سے دو ہزار سال پہلے کا ملک ہوتا۔ کوئی قبائلی نظام چل رہا ہوتا تو ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جو آج کی دنیا میں معروف بن گئی ہیں ۔۔۔ لیکن جس دور میں ہم سانس لے رہے ہیں، اس میں اس ملک کی بقاء کے لیے۔ اس ملک میں رہنے والوں کا اطمینان ۔۔ ان کا ان کا یہ احساس کہ ملک کے معاملات میں، اس کے انتظام و انصرام میں ہماری بھی رائے شامل ہے، ہمارا بھی اس میں عمل دخل ہے، ہماری بات بھی سنی جاتی ہے، ہمارے حقوق بھی محفوظ و مامون ہیں ۔۔۔ یہ سب کچھ اگر نہیں ہوگا تو جس طرح انسان بغیر ہوا، پانی، غذا ہلاک ہو جاتا ہے ۔۔۔ اسی طرح ایسا ملک باقی نہیں رہتا، ختم ہو جاتا ہے یا وہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے ۔۔ یہ حادثہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں رونما ہو بھی چکا ہے۔ یا براہِ راست کسی طاقتور ملک کے زیرِ اثر چلا جاتا ہے۔ اور اسے اپنے خارجی، داخلی، معاشی نظام حتیٰ کہ دفاعی امور میں اس ملک کی بالادستی قبول کرنی پڑتی ہے۔ اور اس کا اپنا ذاتی وقار اور ذاتی اختیار دھیلے کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا۔ باقی رہا معاملہ یہ کہ ہمیں اپنے اس ملک میں حقیقی اور صحیح اسلامی نظام قائم و نافذ کرنا ہے ۔۔۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اس ملک کے رہنے والوں کو حقیقی ایمان کی دولت سے مالا مال کیا جائے ۔۔ اور حقیقی ایمان کا منبع و سرچشمہ ہے قرآن حکیم ۔۔۔ لہٰذا میں اور میرے ساتھی تو اپنی توانائیاں، اپنی صلاحیتیں قرآن حکیم کی تعلیمات کو پھیلانے میں لگا رہے ہیں چونکہ ہمارے نزدیک یہی واحد ذریعہ اور راستہ اس ملک کو حقیقی اسلام کی طرف لانے کا ہے۔۔ باقی رہا اس ملک کے استحکام اور بقاء کا مسئلہ ۔۔ تو جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کے لیے سیاسی عمل اور انتخابی عمل کا جاری رہنا ضروری ہے۔ میری اس بات پر آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو وہ تضاد آپ کو ہرگز نظر نہیں آئے گا جو بادی النظر اور ظاہر احوال محسوس ہوتا ہے۔

آج جو چند باتیں میں نے عرض کی ہیں ۔۔۔ ہانیں تو اور بھی بہت سی ہیں ۔۔۔ یہ ایک طویل داستان ہے ۔۔ آج کی تقریر آپ نے نا تمامہ بھی محسوس کی ہوگی اور اس میں کچھ تلخی بھی ۔۔ میرزا غالب کے اس شعر کے مصداق ہے

دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف   آج پھر درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

آپ حضرات جانتے ہیں کہ میں اس نوع کی تقاریر سے شعوری طور پر گریز کرتا ہوں لیکن ایک
۔ بدعات و منکرات کے فروغ کے فوری مشاہدے کا ردِ عمل ہے اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے
یہ محسوس ہو رہا ہے کہ وہ وقت جلد یا بدیر آ کر رہے گا جب چار و ناچار کسی نہ کسی درجے میں
یاسی گہما گہمی کی اجازت دے دی جائے گی تو میں چاہتا ہوں کہ میرا یہ موقف واضح ہو جائے اور
یکارڈ پر آ جائے کہ اسلام کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسلام کی خیر خواہی نہیں ہے ـــ موجودہ اربابِ
قتدار اس ملک کی بقا کے لئے، اس کے خیر کے لئے، اس کے استحکام کے لئے اپنی صواب دید کے
طابق جو کچھ کر رہے ہیں، کریں لیکن اگر "اسلام" کا نام جس شدّ و مد کے ساتھ موجودہ ـــــ
REGIME کی طرف سے لیا جا رہا ہے تو اسلام کی اپنی ترجیحات ہیں۔ انہیں اس REGIME
کو تسلیم کرنا ہوگا۔ ان پر خود بھی عمل کرنا ہوگا اور لوگوں سے بھی عمل کرانا ہوگا۔ پھر اسلام نے کس چیز کو
مقدم رکھا ہے اور کس چیز کو مؤخر۔ اس کو سامنے رکھ کر چلنا ہوگا۔ پھر یہ کہ کُل کا کُل اسلام لانا ہوگا۔
ر جزوی لیبل لگا کر ڈھنڈورا پیٹ دیا گیا کہ اسلام آ گیا ہے، اسلام آ گیا ہے جبکہ اس کی عملی برکات
، دور دور بھی پتہ نہیں تو اس سے شدید اندیشہ ہے کہ اس ملک میں اسلام کو بہت بڑا نقصان
پہنچے گا ــــــــــــــ اس ملک کی بقا اور استحکام کے لئے
صرف ایک ہی مثبت اساس و بنیاد ہے اور وہ اسلام ہے اور جب تک بھی اسلام کی آس
رہے گی تب تک سانس بھی چلتا رہے گا۔" جب تک سانس تب تک آس "ـ اسی طرح جب
ب آس رہتی ہے اس وقت تک سانس بھی چلتا رہتا ہے ـــ لیکن اگر خدانخواستہ یہاں اسلام
کے نفاذ کی آس بھی ختم ہو گئی اور عوامی سطح پر اسلامی نظام سے مایوسی اور بددلی پیدا ہو گئی تو پھر
اری عاقبت کی بربادی اور تباہی تو ہے ہی ۔ اس ملک کی بربادی اور تباہی بھی یقینی
ہے ۔ لہٰذا میرے اور میری جماعت کے لئے ضروری ہے کہ واشگاف الفاظ میں یہ اعلان
کر دیں کہ ہم نہ کسی کے سیاسی حلیف ہیں اور نہ ہم کسی کے سیاسی حریف ہیں۔ جو عمل یہاں چل
رہا ہے یا جلد یا بدیر کھلم کھلا چلنے والا ہے تو اس میں ہم کسی نوع کا حصہ نہیں لیں گے۔ البتہ
ان شرائط کے ساتھ ووٹ دے سکیں گے جن کا ذکر میں کر چکا ہوں۔
اگر لوگوں میں سیاسی شعور ہے تو ایک وقت آئے گا کہ وہ اپنے حقوق حاصل کر لیں
گے۔ لیکن اللہ کے لئے اسلام کے نام کو اس طرح اور اس طرزِ عمل کے ساتھ استعمال نہ کیجئے

کہ جو اختیار کیا ہوا ہے۔ یہ وہ روش ہے جو عوام کو اسلامی نظام سے بالکل بدگمان کر دے گی، بدظن کر دے گی، مایوس کر دے گی اور اس سے ان خطروں کے لئے فضا ہموار ہو جائے گی جو ہماری سرحدوں پر منڈلا رہے ہیں۔ ایک طرف سرخ سامراجی سیلاب ہے جو افغانستان پر فوج کشی کے نتیجے پر ہماری مغربی سرحدوں میں درۂ خیبر تک پہنچ گیا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً آتے ہیں بمباری کر کے چلے جاتے ہیں اور ہم ان کے ناظم الامور کو بلا کر اپنا ایک احتجاج رجسٹرڈ کرا دیں اس کے سوا ہم کچھ نہیں کر پا رہے۔ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی جرأتیں اور بڑھیں ـــ وہ کیا دیکھ رہے ہیں، ان کے اندازے کیا ہیں! وہ کس موقع کی تاک میں ہیں، کس امید میں ہیں! یہ معاملہ علیحدہ ہے۔ اسی طرح ہماری ہندوستان سے ملنے والی سرحدوں پر برہمنی سامراج تاک لگائے بیٹھا ہے جس نے ذہناً آج تک پاکستان کا قیام قبول نہیں کیا۔ وہ بھی کن حالات کا منتظر ہے! میں ان بحثوں اور قیاس آرائیوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ پھر ان کا بین الاقوامی سیاسی مسائل اور ہماری خارجہ پالیسی سے تعلق ہے۔ لہٰذا اس پر گفتگو غیر ضروری ہے۔

دوسرا خطرہ ہے وہ لاوا جو اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ خاص طور پہ سندھ اس کا بہت بڑا مرکز ہے۔ میں پہلے بھی کسی موقع پر عرض کر چکا ہوں کہ صوبہ سرحد کا معاملہ اب اتنا تشویشناک نہیں رہا ہے ـــ بلوچستان کا مسئلہ بھی اس وقت اتنا خدشہ والا اور اتنا خطرناک نہیں ہے ایک تو اس لئے کہ وہاں کی آبادی بہت کم ہے، دوسرے یہ کہ وہاں مڈل کلاس نہیں ہے جو علاقائی تحریکوں سے متاثر ہوتی ہے اور اس میں فعال کردار ادا کرتی ہے۔ وہاں یا تو بہت غریب لوگ ہیں یا اونچے اونچے قبائلی سردار ہیں تیسرے یہ کہ وہاں سرداروں کا اثر کچھ کم ہو گیا ہے۔ چوتھے یہ کہ سابقہ حکومت کے دور میں بلوچستان میں ترقیات کا جو عمل شروع ہوا تھا، موجودہ حکومت کے دور میں بہت آگے بڑھ کر یہ کام ہوا ہے۔ وہاں پر سماجی بہبود کا کام، معاشی اصلاحات کا کام۔ وہاں ترقیاتی اسکیموں پہ مناسب منصوبہ بندی اور توجہ کے ساتھ کام ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے وہاں ایک عام آدمی کے لئے روزگار کی فراہمی کا میدان کافی وسیع ہو گیا ہے۔ اس میں بیشتر افراد معروف ہو گئے ہیں لہٰذا وہاں پہاڑوں پر چڑھنے کا اب اندیشہ نہیں ہے۔ اس کا بہت سا کریڈٹ موجودہ حکومت (REGIME) کو جاتا ہے، جس کی ہمیں تحسین

کرنی چاہیے۔ وہاں اگر کوئی خطرہ ہے تو وہ باہر سے ہے۔ اندر سے نہیں ہے۔ میں جتنی مرتبہ بھی وہاں گیا ہوں یہ اطمینان لے کر آیا ہوں ــــ لیکن میں واضح طور پہ آگاہ اور خبردار کرنا اپنا قومی فریضہ سمجھتا ہوں کہ سندھ اس وقت ایک بہت بڑا آتش فشاں بنا ہوا ہے ایک مرتبہ وہ کسی حد تک پھٹ کر سامنے آچکا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ اس وقت معاملہ لوئر سندھ تک محدود رہا تھا۔ اپر سندھ تک وہ نہیں آیا تھا۔ اب اگر خدانخواستہ اپر سندھ بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائے تو بہت خطرناک اور خوفناک صورت بن سکتی ہے۔ لوئر سندھ میں ہماری لائف لائن سرحد کے قریب نہیں ہے۔ یہ اپر سندھ ہے جس میں وہ لائف لائن بھارت کی سرحد کے بہت قریب ہے۔ اندرا گاندھی بھارت میں جو اقدامات کر رہی ہے اور جس تیزی سے آمریت کی طرف جا رہی ہے اس کے عزائم کو سامنے رکھئے تو یہ خارجی خطرات ہیں جو ہماری سرحدوں پہ منڈلا رہے ہیں۔ ایسی نازک صورتحال میں اگر کوئی داخلی دھماکہ ہو گیا تو اس کے نتائج بڑے خوفناک نکلنے کے اندیشوں سے انکار ممکن نہیں ہے ــ پھر ساتھ ہی یہاں کے عوام بھی نام نہاد اسلامی نظام سے مایوس اور بددل ہو چکے ہوں اور وہ حوصلہ ہار بیٹھیں تو کتنی تباہ کن صورت حال سے سابقہ پیش آسکتا ہے اس کا تصور کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ لیکن شترمرغ کی طرح ریت میں سر چھپا لینے سے صحرا میں طوفان ٹل نہیں جاتے ــــ ہاں اگر یہاں عوام میں کوئی مضبوط تحریک مزاحمت پیدا ہو سکتی ہے اور یہ وان چڑھ سکتی ہے تو وہ اسلام کے نام پہ ہو سکتی ہے۔ اگر ہم نے اپنے عوام کو اسلام سے بدظن کر کے بددل اور مایوس کر کے اس کی بنیاد بھی ختم کر دی تو ہمارے پاس بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہیں رہ جائے گا اور اس کا غالب امکان موجود ہے کہ خطرناک اور خوفناک نتائج کا ظہور ہو جائے۔

میں نے یہ باتیں کہی ہیں۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ میرے پیشِ نظر نہ کسی کی شخصی مخالفت اور نہ کسی کے ساتھ شخصی یا جماعتی حلیف ہونے کا کوئی تعلق ہے۔ میرے سامنے وہ حدیثِ نبوی ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کہ: "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" مسلمانو! تمہاری دینی ذمہ داری ہے۔ وفاداری اور خیر خواہی"۔ نصح کہتے ہیں خلوص کو۔ کوئی چیز خالص ہو گئی تو اس کے متعلق کہیں گے کہ یہ نصح کا معاملہ ہے۔ نصح کی کیفیت ہے۔ فرمایا: اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ تو نصح یعنی خلوص کسی بڑی شخصیت کے ساتھ ہو گا تو اسے وفاداری کہیں گے۔

برابر کے لوگوں کے ساتھ ہوگا تو اسے خیر خواہی کہیں گے تو لفظ نصیحت کے دو مفاہیم ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا: اَلدِّيْنُ اَلنَّصِيْحَة۔ "دین نام ہے وفاداری کا اور خیر خواہی کا"۔ قِيْلَ لِمَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ "حضورؐ سے دریافت کیا گیا، کس کی وفاداری! کس کی خیر خواہی!" نبی اکرمؐ نے فرمایا: وَلِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ ۔ یہ تو ہماری وہ تین عظیم حقیقتیں ہیں، جن کے ساتھ ہمارا تعلق وفاداری کا ہے "وفاداری اللہ کے ساتھ وفاداری اس کی کتاب کے ساتھ، وفاداری اس کے رسولؐ کے ساتھ" آگے فرمایا: وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَلِعَامَّتِهِمْ اور خیر خواہی کا تعلق مسلمانوں کے اماموں کے ساتھ جو بھی آگے چلنے والے ہیں، جو بھی اولوالامر ہیں، جن کے ہاتھ میں بھی زمام کار ہے، جو کسی وقت قوموں کی قسمتوں کے امین بن جاتے ہیں جو قوموں کے رخ کو متعین کرنے والے ہیں، ان کی بھی خیر خواہی، ان کے ساتھ بھی بھلائی چاہنے کا ایک تعلق۔ ان کو بھی صحیح بات بروقت بتاؤ، کوئی ذاتی غرض نہ ہو، کوئی ذاتی عداوت نہ ہو جو تم کو حق سے منحرف کر دے بلکہ حق بات کہو ــــ جس کے لئے میں نے دوسری حدیث بھی سنائی تھی جس میں حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بھی بیعت کی تھی کہ ان نقول بالحق "ہم حق کہتے رہیں گے" اَيْنَ مَا كُنَّا۔ "جہاں کہیں اور جس حال میں بھی ہم ہوں" لا نخاف لومة لائم" اور اللہ کے معاملے میں ہمیں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ کوئی خوف ہوگا نہ اندیشہ ہوگا"۔ تو یہ خیر خواہی لیڈروں کے ساتھ بھی، حکمرانوں کے ساتھ بھی اور عامة الناس کے ساتھ بھی ہماری دینی ذمہ داری ہے۔ اس 'الدین النصیحۃ' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پانچ نصائح کا حکم دیا۔ جن میں سے پہلی تین کا تعلق اللہ، اس کی کتاب اور اس کے رسولؐ سے وفاداری کے ساتھ ہے اور بعد کی دو کا تعلق مسلمانوں کے ائمّہ اور عامة الناس کی خیر خواہی کے ساتھ ہے۔

آخری ایک بات میں اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے آغاز میں سورۂ حج کی تین آیات کی تلاوت کی تھی، اس میں آخری آیت یہ تھی:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ

عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ہ
"یہ (اہل ایمان)، وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائیوں سے منع کریں گے اور انجام کار کے طور پر تمام معاملات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔"

اس آیت کا اقامتِ صلوٰۃ کے نظام کے ساتھ سرکاری طور پر بہت چرچا ہے، کافی شہرہ ہے۔ اس کا جو رخ میرے سامنے ہے وہ دورانِ تقریر میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا۔ سوال یہ ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر کیوں ہے! اس کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف سے صرف اعراض ہی نہیں، اس کے برعکس رخ کیوں ہے! ایسا آخر کیوں ہے! جبکہ ہمیں سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے معلوم ہے کہ جب مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ۔ صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ تعالیٰ اجمعین کو جب اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ میں تمکن عطا فرمایا تھا تو پہلے ہی دن سے سیدھی منزل کی طرف پیش قدمی ہوتی چلی گئی تھی۔ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ سب سے پہلا کام یہی کیا ہے اگر قبا میں چند دن قیام فرمایا ہے تو مسجد کی بنیاد رکھ دی۔ جب مدینہ منورہ تشریف لائے ہیں تو سب سے پہلے مسجد نبوی کی تعمیر کا کام شروع کیا ہے اور اقامتِ صلوٰۃ، اقامتِ جمعہ کا نظام حضورؐ نے قائم کیا ہے۔ پھر ایتائے زکوٰۃ کی باری آئی تو یہ کام یہاں پہ اسی ترتیب کے ساتھ IN THE RIGHT EARNEST کیوں نہیں ہو رہا۔ یہ ترجیحات میں تغیر و تبدل کیوں ہے! صرف سطح پہ اور ظاہری طور پہ کوئی کام کر کے اصل حقیقت کو نہ بدلنا یہ طرزِ عمل کیوں ہے! تو اس کا جواب مجھے اسی آیت مبارکہ سے ملا ہے۔ میں اسے آپ کے ساتھ Share کرنا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ وہ تھے جو سخت ترین مصیبتیں جھیل کر، مصائب برداشت کر کے، آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزر کر، جان اور مال کی قربانیاں دے کر تختِ حکومت پر آئے تھے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ جنہوںؐ نے طائف کی گلیوں میں اپنے جسم اطہر پہ پتھراؤ جھیلا تھا۔ جنہوںؐ نے شعب ابی ہاشم میں تین برس تک محصور رہ کر شدید فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت کی تھی۔ یہ وہ صحابہ کرامؓ ہیں جو دہکتے ہوئے انگاروں پہ لٹائے گئے تھے۔ ان بھٹیوں

سے گزر کر جو لوگ آئے ہوں اور اللہ تعالیٰ ان کو تمکن فی الارض عطا کرے اور پھر وہ اسلام نافذ کریں تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اس کے برعکس کوئی شخص یا کوئی گروہ اپنی تمام مراعات کے ساتھ مسندِ اقتدار پر اچانک، حالات سے فائدہ اٹھا کر متمکن ہو جائے اور تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں آ جائیں تو یہ وہ لوگ نہیں ہیں، جن کے متعلق اس آیت مبارکہ میں فرمایا جا رہا ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ۔ یہ الفاظ آئے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے لئے۔ اسی لئے اس سے پہلے فرمایا: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔ ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے تھے، ان کو جور و ستم کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ پھر ان لوگوں کے متعلق اگلی آیت میں فرمایا: اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ط۔ یہ وہ لوگ تھے جو ناحق اپنے گھروں سے بے دخل کر دیئے گئے تھے اور جو اپنے اہل و عیال اور مال و متاع کو صرف اللہ کے دین کے لئے چھوڑ کر آئے تھے۔ جنہوں نے دین کے لئے مصائب جھیلے تھے۔ پس اگر کوئی گروہ کوئی جماعت ان شدید مصائب کی بھٹیوں سے گزر کر، آزمائشوں کے الاؤ میں سے گزر کر آئے تو پھر یقیناً اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں۔ پھر وہ دائیں اور بائیں نہیں دیکھے گا۔ پھر وہ مصلحتوں کو نہیں دیکھے گا۔ پھر وہ ان اندیشوں میں مبتلا نہیں ہوگا کہ یہ کروں گا تو وہ ہو جائے گا اور وہ کروں گا تو یہ ہو جائے گا۔ اس اقدام سے وہ ناراض ہو جائے گا اور اس سے یہ ناراض ہو جائے گا۔ اور مجھے تو بہرحال سب کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ زمین و آسمان کا فرق ہے ؎ چہ نسبت خاک را با عالم پاک اس پاکیزہ ماحول کی چیزوں کو اس بگڑے ہوئے ماحول پر apply کر دینا منطبق کر دینا درحقیقت دینِ حق کو بدنام کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے مجھے اور آپ کو اور موجودہ حکومت کو بچائے۔

اَقُوْلُ قَوْلِىْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِىْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

اسلام میں عملی زندگی

احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

آخری قسط ——— ملک محمد اقبال واحد

مزدور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کر دو" (مشکوٰۃ)

مالِ حرام حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص حرام مال کمائے پھر اس میں سے صدقہ و خیرات دے اور وہ قبول کر لیا جائے۔ اس کا حرام مال اس کے لیے جہنم کے سامان کے سوا اور کچھ نہیں ہے" (مشکوٰۃ)

مالِ حرام کا مآل حضرت جابرؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس گوشت نے حرام سے پرورش پائی ہو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا" (مسند احمد)

احتکار حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احتکار کرنے والا (مال کو گراں قیمت پر بیچنے کے لیے روک رکھنا) خدا کی لعنت کا مستحق ہے" (ابن ماجہ)

فریب حضرت واثلہؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی عیب دار چیز فروخت کرتا ہے اور اس کا عیب بیان نہیں کرتا وہ اللہ کے غضب اور فرشتوں کی لعنت کا مستحق ہے" (ابن ماجہ)

بیوی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا ساری کی ساری متاع (فائدہ اٹھانے کا سامان) ہے۔

اور دنیا کی بہترین متاع نیک کردار بیوی ہے۔" (مسلم)

حضرت حکیم بن معاویہ رضؓ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں، کہ" میں نے عرض کیا یارسول اللہ شوہر پر بیوی کا کیا حق ہے؟۔ آپؐ نے فرمایا جب تو کھائے اس کو کھلا جب تو پہنے اس کو پہنا۔ اس کے منہ پر نہ مارو۔ اس کو برا نہ کہو۔" (ابن ماجہ)

حضرت ابوسعید رضؓ سے روایت ہے، کہ" رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر روزہ (نفل) نہ رکھے۔" (ابوداؤد)

حضرت اُمِّ سلمہ رضؓ کہتی ہیں کہ" رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو عورت اس حال میں وفات پائے کہ اُس کا شوہر اُس سے راضی اور خوش ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگی۔" (ترمذی)

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے، کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو عورت پانچوں وقت کی نماز پڑھے۔ رمضان کے روزے رکھے۔ اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔ اپنے شوہر کی اطاعت کرے اُس کو اختیار ہے کہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جاوے۔" (ابونعیم)

اعزہ واقرباء

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اُس کی روزی میں برکت اور وسعت اور اس کی موت میں تاخیر کی جائے اُس کو چاہیئے کہ وہ رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرے۔" (بخاری)

اولاد

حضرت جابر بن سمرہ رضؓ سے روایت ہے، کہ" رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کا اپنی اولاد کو ادب کی ایک بات سکھا ایک صاع غلہ خیرات کرنے سے بہتر ہے۔" (ترمذی)

بابِ آخر

خلاصۂ دین وایمان

حضرت تمیم داری رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین نام ہے خلوص و وفاداری کا۔ ہم نے عرض کیا کس کے ساتھ۔ فرمایا۔ اللہ کی کتاب کے ساتھ، اللہ کے رسول کے ساتھ۔

مسلمانوں کے امراء و حکام کے ساتھ۔ اور عام مسلمانوں کے ساتھ۔" (مسلم)

مجاہدۂ نفس

حضرت فضالہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری میں اپنے نفس کی خواہشات سے جہاد کرے اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں نافرمانی کی راہ ترک کردے۔" (مشکوٰۃ)

فضیلتِ علم

حضرت ابی امامہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عالم عابد پر ایسی فضیلت رکھتا ہے، جیسا کہ میں تم میں سے ادنیٰ آدمی پر فضیلت رکھتا ہوں۔" (ترمذی)

معیارِ بزرگی و عزت

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے نزدیک تم سب میں سے صاحبِ عزت وہ ہے جو تم میں سے متقی اور پرہیزگار ہے۔ فضیلت کا معیار تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔" (بخاری و مسلم)

تقویٰ (پرہیزگاری)

حضرت ابوذر رضؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے قریب تر وہ لوگ ہیں جو متقی ہیں خواہ وہ کوئی ہوں اور کسی جگہ کے ہوں۔" (مسند احمد)

حضرت جابر رضؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا گیا کہ وہ نفل نماز، روزے، درود و وظائف میں لگا رہتا ہے۔ ایک اور آدمی کا ذکر کیا گیا کہ وہ پرہیزگار ہے۔ آپؐ نے فرمایا نفل عبادات میں لگا رہنا پرہیزگاری کے برابر نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔" (مشکوٰۃ)

تقاضائے عقل

حضرت شداد بن اوس رضؓ سے روایت ہے، کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دانش مند اور دور اندیش وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے — اور موت کے بعد کیلئے عمل کرے۔ اور نادان و ناتوان وہ ہے جو خواہشاتِ نفس کے پیچھے چلے اور اللہ سے بڑی بڑی امیدیں باندھے۔" (ترمذی)

حرام و حلال

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ "نعمان بن نوفلؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ فرمایئے، جب میں فرض نمازیں ادا کرلوں اور حرام کو حرام سمجھوں اور حلال کو حلال۔ تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔" (مسلم)

نیکی و بدی

حضرت وابصہ بن معبدؓ نے کہا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو یہ پوچھنے کے لیے آیا ہے کہ نیکی کیا ہے اور گناہ کیا۔ میں نے عرض کیا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا۔ اپنے ضمیر سے پوچھ۔ اپنے دل سے پوچھ۔ نیکی وہ ہے جس سے نفس کو اطمینان حاصل ہو اور دل کو سکون نصیب ہو، اور گناہ وہ ہے جو نفس میں اضطراب اور دل میں تردد پیدا کرے۔ اگرچہ لوگ اُس کے جواز کا فتویٰ دیں۔"

(مسند احمد)

بہترین لوگ

حضرت اسماءؓ بنتِ یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔" (ابن ماجہ)

دوستی

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، پس اُس کو دوست بناتے وقت خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ اپنا دوست کس کو بناتا ہے۔"

مشروط اطاعت

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معصیت و گناہ میں کسی کی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت صرف نیک امور میں ہے۔" (بخاری و مسلم)

امر بالمعروف

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم لازماً نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو۔ ورنہ تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوگا۔ پھر تم اُسے پکارو گے لیکن شنوائی نہ ہوگی۔" (ترمذی)

دنیا کی قیمت

حضرت سہیل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے نزدیک دنیا کی قدر و

قیمت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا"۔
(مسند احمد)

دنیا بہ مقابلہ آخرت

حضرت مستورد بن شداد رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم دنیا کی حقیقت آخرت کے سامنے اتنی ہے جیسے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی اُنگلی سمندر میں ڈبوئے۔ پھر اُسے دیکھنا چاہیئے کہ کتنا پانی اُس کی اُنگلی میں لگ کر آتا ہے"۔ (مشکوٰۃ)

مسافر

حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے دونوں شانوں کو پکڑ کر فرمایا: دنیا میں تم ایسے رہو جیسے تم پردیسی ہو یا راہ چلتے مسافر۔ (مسلم)

افلاس و ناداری

حضرت عمر بن عوف رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تم پر افلاس و ناداری سے نہیں ڈرتا۔ میں جس بات سے ڈرتا ہوں وہ یہ ہے کہ دنیا تم پر وسیع کردی جائے۔ جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر وسیع کی گئی تھی اور پھر تم اسی طرح اُس کو چاہنے لگو جس طرح تم سے پہلے لوگوں نے چاہا تھا۔ اور پھر وہ تم کو برباد و ہلاک کردے جس طرح اُس نے تم سے پہلوں کو برباد کیا"۔ (بخاری)

ارادہ بھلائی

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے"۔ (بخاری)

ازالۂ سیئات

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کو جو تکلیف پہنچتی ہے، خواہ وہ از قسم بیماری ہو یا رنج و غم ہو حتیٰ کہ اُسے ایک کانٹا بھی چبھے تو اللہ تعالےٰ اُس کے بدلہ میں اُس کی خطائیں معاف کرتا ہے"۔ (بخاری)

بدعت

حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی بات پیدا کی جو نئی ہے،

اور جس کی کوئی اصل کتاب وسنّت میں نہیں ہے) وہ بدعت ہے اور بدعت گمراہی ہے
ور گمراہی کا مقام جہنّم ہے۔" (بخاری)

خوفِ خدا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: اللہ کے خوف وہیبت سے جب بندۂ ومن کی آنکھوں سے کچھ آنسو نکلیں اگرچہ وہ مقدار میں بہت کم ہوں پھر وہ آنسو بہہ کر اُس کے چہرہ پر پہنچ جائیں تو اللہ تعالیٰ اُس چہرہ کو آتشِ دوزخ کے لیے حرام کردے گا۔"

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا گیا کس سبب سے لوگ زیادہ تر جنّت میں داخل ہوں گے۔ فرمایا خدا کا خوف اور حُسنِ اخلاق، پوچھا لیا کس سبب سے لوگ زیادہ تر دوزخ میں جائیں گے، آپ نے فرمایا: حرام خوری اور بدکاری۔ (بخاری)

ذکرِ الٰہی

حضرت ابودرداء رضؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: کیا تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں جو تمام اعمال میں بہتر اور تمہارے لک کے نزدیک زیادہ پاکیزہ اور درجات کو بلند کرنے والی اور سونے چاندی کو خدا کی راہ میں رچ کرنے سے بھی بہتر اور جہاد جس میں تم دشمنوں کو مارو اور وہ تم کو ماریں اس سے بھی بھی ہوئی ہو۔ صحابہ رضؓ نے عرض کیا۔ ضرور ارشاد فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا وہ اللہ کا ذکر ہے۔" (ابن ماجہ)

توبہ

حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: بندہ جب اپنے گناہ کا اقرار کرتا اور توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔" (بخاری)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا پاک وصاف ہوجاتا ہے گویا اُس نے گناہ ہی نہیں کیا۔" (ابن ماجہ)

دعاء

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، دعا عبادت ہے۔" (مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے، کہ" رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصیبت کے وقت اُس کی دعا قبول فرمائے، اُسے

چاہیئے کہ اپنی آسائش اور خوشحالی کے وقت کثرت سے دعا مانگا کرے۔" (مشکوٰۃ)

جامع ہدایات :

(۱) حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے ا کہ" رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں لے لیا اور پانچ باتیں ارشاد فرمائیں۔ جو چیزیں اللہ نے حرام قرار دی ہیں اُن سے بچو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تم بہت بڑے عبادت گذار بن جاؤ گے۔ اللہ نے جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھا ہے اُس پر راضی و مطمئن ہو جاؤ۔ تو تم بے نیاز بن جاؤ گے۔ اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرو تو تم مومن کامل بن جاؤ گے۔ جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے پسند کرو تو تم مسلم کامل بن جاؤ گے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ تم نہ ہنسا کرو۔ زیادہ ہنسنا دل کو مُردہ کر دیتا ہے۔" (مسند احمد)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو رضؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چار باتیں ایسی ہیں اگر وہ تم کو نصیب ہو جائیں تو پھر دنیا کے فوت ہو جانے اور ہاتھ نہ آنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ امانت میں حفاظت، راست گفتاری، حسنِ اخلاق اور ذریعہ معاش میں احتیاط و پرہیزگاری۔" (مسند احمد)

(۳) حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں ہیں جو باعثِ نجات ہیں۔ ایک خدا کا خوف، خلوت و جلوت میں، دوسرے سچی بات کہنا خوشی و ناخوشی میں، تیسرے اعتدال و میانہ روی خوشحالی اور تنگدستی میں۔"
(شعب الایمان)

●●●●●

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

امیرِ تنظیمِ اسلامی کا حالیہ دورۂ شمالی امریکہ

★ از قلم: ڈاکٹر ابصار احمد —— ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی

گذشتہ جولائی میں امیرِ تنظیم اسلامی برادرِ گرامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے شمالی امریکہ کے دعوتی دورے میں مجھے بھی شریکِ سفر ہونے کا موقع ملا۔ چونکہ پنجاب یونیورسٹی میں جس کے شعبہ فلسفہ سے میں متعلق ہوں موسم گرما کی تعطیلات تھیں اس لئے چھٹی وغیرہ کا مسئلہ درپیش نہ تھا۔ بیرونِ ملک سفر کی اجازت یونیورسٹی کی انتظامیہ نے آسانی سے دے دی۔ مجھے پچھلے سال بھی شکاگو کی ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کی طرف سے گرمائی تعطیلات کے دوران وہاں آنے کی دعوت ملی تھی لیکن بعض گھریلو مصروفیات کی وجہ سے پروگرام نہ بن سکا۔ چنانچہ اب اس مرتبہ اس پروگرام کو غنیمت جانتے ہوئے میں اور ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب (فیلو قرآن اکیڈمی) ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بیرونِ ملک سفر پر گئے۔ میں امریکہ چونکہ اب تک نہیں گیا تھا اس لئے ایک نئے ملک کی سیر کی فطری خواہش نے بھی اس سفر پر آمادہ کیا۔ ساتھ ہی یہ خواہش بھی تھی کہ امریکہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں میں ہونے والے اسلامی دعوتی کاموں کو قریب سے دیکھوں۔

ہمارا پروگرام ۵ر اور ۶ر جولائی کی درمیانی شب کو ساڑھے نو بجے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور سے کراچی پہنچنے کا تھا۔ لیکن ۵ر جولائی کی سہ پہر کو بھارتی ہائی جیکر ایک ہوائی جہاز اغوا کر کے لاہور ائرپورٹ پر لے آئے تھے۔ چنانچہ ہنگامی وجوہات کی بنا پر وقتی طور پر لاہور ائرپورٹ بند کر دیا گیا اور ہماری فلائٹ ملتوی کر دی گئی لیکن چونکہ ہمیں کسی وقت بھی پرواز کے لئے ائرپورٹ پہنچنے کی اطلاع مل سکتی تھی اس لئے ہم سامان وغیرہ کے ساتھ تیار قرآن اکیڈمی میں شب بیداری اور انتظار کی کیفیت سے دوچار رہے۔ خدا خدا کر کے رات کے دو بجے کراچی کے لئے پرواز کی اطلاع ملی۔ چنانچہ ہم ائرپورٹ پر پہنچے لیکن جہاز اعلان شدہ وقت سے بھی دو اڑھائی گھنٹے تاخیر سے روانہ ہوا۔ جب ہم کراچی پہنچے تو وہاں دن خوب چڑھ چکا تھا۔ ائرپورٹ سے ہمیں لینے کے لئے رفقاء تنظیم موجود تھے۔ نارتھ ناظم آباد میں محترم قاضی عبدالقادر (نائب امیر تنظیم برائے بیرونی ممالک) کے ہاں پہنچ کر نہائے اور چائے وغیرہ پی۔ چونکہ ۶ر جولائی جمعۃ المبارک کا دن تھا اور ڈاکٹر صاحب کا جامع مسجد الصفا، شریف آباد میں جمعہ کا خطاب رکھا گیا تھا۔ اس لئے ہم سب وقت معینہ پر مسجد پہنچ گئے۔ مسجد میں ڈاکٹر صاحب کے خطاب کو سننے کے لئے کثیر تعداد میں لوگ آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے جمعہ سے قبل اور جمعہ کے بعد دو تقاریر کیں۔ اسی رات

کو دو بجے کی فلائٹ سے ہمیں نیویارک کے لئے روانہ ہونا تھا لہٰذا حفظ و امان کی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے ہم روانہ ہو گئے۔ ہوائی جہاز کا پہلا سٹاپ قاہرہ تھا۔ جہاں ہم نے جہاز سے اتر کر جہاز کے بالکل قریب باجماعت نماز فجر ادا کی۔ نماز میں ہمارے سینکڑوں مسلمان ہم سفر ساتھیوں میں سے صرف چار پانچ حضرات شامل ہوئے۔ قاہرہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز میں خرابی کے باعث وہاں سے روانگی میں تاخیر ہوگی۔ چار گھنٹے ہم نے مسلسل جہاز کے کیبن میں گزارے۔ چونکہ مسافروں کو ائرپورٹ کی لاؤنج میں سیکیورٹی گارڈز کی جانب سے اجازت نہ دی گئی۔ معلوم نہ ہو سکا کہ قاہرہ ائرپورٹ کا عملہ سیکیورٹی کے معاملے میں ایک مسلمان ملک کی ائرلائن کے ساتھ اتنا سخت رویّہ کیوں اختیار کئے رہا!

قاہرہ کے بعد جہاز فرانکفرٹ اور پھر پیرس رکا۔ پیرس پر اترنے سے قبل جہاز خاصی نیچی پرواز کرتے ہوئے پیرس کے وسط سے گزرا اور اس طرح چودہ پندرہ سال قبل وہاں کی سیر کے دوران دیکھے ہوئے اہم مقامات پر دوبارہ نظر ڈالنے کا موقع ملا۔ مثلاً دریائے سین (Seine) اور اس کے متعدد خوبصورت پل، سیکریکر اور نوٹرے ڈیم کے کلیسا، آزادی کی آرچ اور ایفل ٹاور وغیرہ پیرس سے پرواز پر ہمارے نیویارک کے سفر کا طویل ترین حصہ شروع ہوا۔ یعنی بحیرہ اوقیانوس کے اوپر پرواز۔ سات گھنٹوں کی طویل پرواز کے بعد جہاز نیویارک کی کینیڈی ائرپورٹ پر اتر گیا۔ ویسے تو پورا نیویارک سمندر کے عین کنارے جزیرے کی صورت میں ہے۔ لیکن بالخصوص کینیڈی ائرپورٹ پر اترتے ہوئے ایسے محسوس ہوا کہ گویا ہم بالکل سمندر میں کسی خشکی کی پٹی پر اتر رہے ہیں۔

نیویارک میں پانچ دن قیام جمیکا ہلز (کوئنز) کے علاقے میں جناب الطاف احمد صاحب کے ہاں رہا۔ الطاف صاحب نہایت شریف الطبع، نیک اور دینی جذبہ رکھنے والے ساتھی ہیں۔ آپ کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے اور نیویارک میں ایک ٹریول ایجنسی کا کاروبار ہے۔ الطاف صاحب ہمیں نیویارک پہنچنے کے دوسرے دن ایک نواحی جزیرے (سٹراٹن آئی لینڈ) لے گئے۔ جہاں ایک صاحب کے انتقال کے بعد ایصالِ ثواب کے لئے قرآن خوانی کی تقریب تھی۔ ایصالِ ثواب کے لئے قرآن خوانی کے تو ڈاکٹر صاحب قائل نہیں ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد وہاں کے منتظمین نے اس اجتماع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے حاضرین کو خطاب کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ موصوف نے تقریباً ایک گھنٹے اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی اور موت کی حقیقت اور اہمیت کے موضوع پر مؤثر انداز میں خطاب کیا۔ یہ نشست سٹراٹن آئی لینڈ کی مسجد میں ہوئی اور اس میں خواتین نے بھی شرکت کی۔ علاوہ ازیں مختلف احباب الطاف صاحب کی رہائش گاہ پر ڈاکٹر صاحب سے ملاقات اور گفتگو کے لئے آتے رہے۔ ان میں بالخصوص جناب شمیم احمد صدیقی اور شمشیر علی بیگ قابل ذکر ہیں۔ اوّل الذکر کا تعلق جماعت اسلامی پاکستان سے رہا ہے۔ اب کچھ

عرصہ سے امریکہ میں مقیم ہیں اور وہاں کی مختلف اسلامی دعوتی تحریکوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے میں کوشاں ہیں۔ شمشیر علی بیگ صاحب کا تعاون ان کو حاصل ہے۔ جو فلشنگ کے اسلامک سنٹر کے امام اور ڈائریکٹر کے طور پر خدمتِ دین میں مصروف ہیں۔ آپ کا جوشِ ایمانی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے سعی و جہد کا جذبہ قابلِ تحسین ہے۔

نیویارک سے ہم بذریعہ جہاز شکاگو پہنچے۔ جہاں چار روزہ قرآنی تربیت گاہ کا پروگرام وہاں کی تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن کی طرف سے رکھا گیا تھا۔ تربیت گاہ کے انعقاد میں چونکہ ابھی تین دن باقی تھے۔ اس لئے ان دنوں کو ہم نے شکاگو کے دو اسلامک سنٹروں کو وزٹ کرنے میں صرف کیا۔ مسلم کمیونٹی سنٹر شکاگو ایک خاصی بڑی عمارت میں وسط شہر میں واقع ہے۔ اس کے بڑے ہال میں ڈاکٹر صاحب نے جمعہ کا خطبہ انگریزی زبان میں سورۃ العصر کے مضامین پر مشتمل دیا۔ اس سنٹر میں گرمائی تعطیلات کے دوران ہونے والا ایک یوتھ پروگرام چل رہا تھا۔ اگلے روز ایک خاص اجلاس میں ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کو اور مجھے انگریزی میں خطاب کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ سمیع صاحب نے "قرآن کا نظریہ تخلیقِ انسان" اور میں نے "قرآن کا پیغام نوجوانوں کے نام" کے موضوعات پر انگریزی میں خطاب کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سوال و جواب کے وقفے میں ہمارے اٹھائے ہوئے نکات کو مزید واضح کیا اور اس طرح یہ پروگرام نوجوانوں کے لئے انتہائی دلچسپ اور مفید رہا۔ اسی طرح کا ایک پروگرام ایک دوسرے اسلامک سنٹر میں ہوا۔ اس سنٹر کے جوانب و اطراف میں وسیع سبزہ زار تھا جس کی وجہ سے پورا ماحول انتہائی پرسکون اور خوبصورت تھا۔ یہاں ڈاکٹر سمیع صاحب نے 'جہاد' اور میں نے 'مسلمانوں پر قرآن کے حقوق' پر انگریزی میں تقاریر کیں اور ڈاکٹر صاحب نے "انقلابِ اسلامی کا صحیح منہاج" کے موضوع پر مفصل خطاب کیا۔ سامعین نے بعد میں متعدد سوالات بھی کئے جن کے جوابات پورے شرح و بسط کے ساتھ دیئے گئے۔

شکاگو میں پہلے تین دن قیام جناب ڈاکٹر خورشید ملک صاحب کے ہاں رہا۔ قارئینِ میثاق پچھلے دوروں کی روئیدادوں کے حوالے سے ان سے ضرور غائبانہ متعارف ہوں گے۔ آپ انجمن اور تنظیم کی جملہ سرگرمیوں میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے باوجود انتہائی باقاعدگی اور مستعدی سے حصہ لیتے ہیں۔ مہمان نوازی کے سلسلے میں ان کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے کم ہوگا ـــــ بعد میں ہم اسلامک امریکن کالج کے کیمپس پر منتقل ہو گئے۔ جہاں قرآنی تربیت گاہ کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ اس کالج کی پوری عمارت بشمول ہاسٹل ابھی حال ہی میں شکاگو کے مسلمانوں نے خرید لی ہے۔ اس کے بورڈ آف گورنرز میں کچھ عرب اور بعض دوسرے حضرات شامل ہیں

جناب احمد سکر صاحب اس کالج کے پرنسپل ہیں۔ تربیت گاہ میں شکاگو کے علاوہ ملواکی، نیویارک، فلوریڈا، ٹورانٹو (کینیڈا) اور بعض دوسرے مقامات سے آئے ہوئے احباب شریک ہوئے۔ خواتین نے بھی کثیر تعداد میں اس پروگرام میں شرکت کی۔ تربیت گاہ کے انتظامات بہت خوش اسلوبی سے کئے گئے تھے۔ رفقائے تنظیم جناب احمد عبدالقدیر صاحب، پیر محمد صاحب، عابد بنگالی صاحب، فردوسی صاحب اور دوسرے تمام احباب نے باقاعدگی سے تمام نشستوں میں شرکت کی۔ شام کے درس قرآن میں شہر کے دوسرے مسلمان حضرات بھی بڑی تعداد میں شریک ہوتے رہے۔ اور ڈاکٹر صاحب کے فہم قرآن کے خصوصی اسلوب اور دلنشین خطاب سے مستفید ہوئے۔ تربیت گاہ کے دوران اور قبل ازیں رفقائے تنظیم کے خصوصی اجلاس بھی ہوتے رہے جن میں شکاگو اور گرد و نواح کے احباب کے دعوتی کام کے ضمن میں مسائل زیر بحث آئے۔ اس تربیت گاہ میں ٹورانٹو کی تنظیم کے متعدد رفقاء بھی ایک وین کے ذریعے پہنچے تھے۔ ان میں سے اکثر رفقاء نے اس میں شمولیت کے لیے اپنے دفاتر سے چھٹی لی تھی۔ ٹورانٹو کی تنظیم کے امیر جناب عبدالفتاح سے بالخصوص ملاقات کر کے بے حد خوشی ہوئی۔

شکاگو سے روانہ ہو کر بذریعہ ہوائی جہاز ہم ٹورانٹو (کینیڈا) پہنچے۔ جہاں ہمارا قیام جناب صدیق صاحب کے ہاں رہا۔ صدیق صاحب اور رفیق تنظیم جناب طاہر پاشا صاحب نے ہمارے آرام اور خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ٹورانٹو کی جامع مسجد میں پانچ دن شام کے اوقات میں پروگرام رکھے گئے تھے۔ ویک اینڈ کے ہفتہ اتوار کے دنوں میں یہ پروگرام ظہر کے بعد شروع ہو رہا۔ جن میں ڈاکٹر صاحب کے دروس قرآن اور خطابات کے علاوہ ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب اور میرے متعدد انگریزی میں لیکچر ہوئے۔ ایک شام کو ٹورانٹو یونیورسٹی کی مسلم سوسائٹی کی طرف سے مجھے یونیورسٹی کی یونین بلڈنگ میں لیکچر دینے کا موقع بھی ملا۔ جس میں پاکستان، بھارت، عراق اور مقامی طلباء شریک ہوئے۔ ٹورانٹو کے قیام کے دوران برادرم صدیق صاحب کی مہربانی سے ہمیں نیاگرا اور ایک سفاری پارک کی سیر کا موقع بھی ملا۔ کینیڈا کے اس علاقے کا قدرتی حسن انتہائی دلکش ہے۔

ٹورانٹو سے روانہ ہو کر چند گھنٹے شکاگو رکتے ہوئے ہم میامی (فلوریڈا) پہنچے۔ میامی کے بعض احباب کا اصرار تھا کہ ڈاکٹر صاحب وہاں کا پروگرام ضرور بنائیں۔ چنانچہ میامی کے المرکز الاسلامی میں بعد نماز مغرب ڈاکٹر صاحب کا مفصل خطاب ہوا جس میں مقامی مسلمانوں کی کثیر تعداد شریک ہوئی۔ ان کا تعلق مختلف ممالک سے تھا۔ اکثریت ہندوستان اور پاکستان سے تعلق رکھتی تھی۔
اگلے روز بذریعہ کار ہم اوکی چوبی کے لئے روانہ ہوئے۔ اوکی چوبی فلوریڈا کے وسط میں ایک جھیل

کے کنارے چھوٹی سی بستی ہے۔ یہاں سے ڈاکٹر مظفر حسین صاحب اپنی اہلیہ اور تین بیٹوں کے ہمراہ شکاگو کی تربیت گاہ میں شریک ہوئے تھے۔ ڈاکٹر مظفر حسین صاحب نے اپنے گھر پر پاکستانی اور دوسرے مسلمان انجینئرز اور ڈاکٹروں کا ایک اجتماع عصر کے بعد رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے خطاب کیا۔ موضوع "مسلمانوں کی دینی ذمہ داریاں" تھا۔ بعد میں سوالات کا وقفہ بھی ہوا۔ اور رات گئے کھانے کے بعد یہ نشست اختتام پذیر ہوئی۔ ڈاکٹر مظفر حسین صاحب کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے اور اب کئی سالوں سے فلوریڈا میں مقیم ہیں۔ آپ کی دینی لگن قابل تحسین ہے۔ آپ کی اہلیہ بھی ڈاکٹر ہیں۔ پانچوں بیٹے بہت ذہین اور پابند صوم وصلوٰۃ ہیں۔ (ماشاء اللّٰہ) اگلے روز مظفر حسین صاحب اپنی کار پر ہمیں فلوریڈا کے ایک اور شہر اورلانڈو لے گئے۔ جہاں دن کے کئی گھنٹے ہم نے والٹ ڈزنی ورلڈ کی سیر میں صرف کئے اور شام کو اورلانڈو شہر جاکر ایک صاحب کے گھر پر اجتماع سے ڈاکٹر صاحب نے خطاب کیا۔ اس کا اہتمام پروگرام کے تحت پہلے سے کرلیا گیا تھا۔ اگرچہ صرف ٹیلیفون سے ہی احباب کو اطلاع دی گئی تھی اور کوئی باقاعدہ ہینڈبل یا اشتہار چھاپا نہیں گیا تھا۔ پھر بھی خاصی تعداد میں احباب وہاں موجود تھے۔ اگلے روز دس پندرہ میل دور واقع ڈزنی ورلڈ آکر باقیماندہ حصہ دیکھا۔ یہاں کی اکثر نمائشیں انتہائی عمدہ، دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ موسم گرما میں شائقین کا یہاں اتنا ہجوم رہتا ہے کہ ہر روز ایک میلے کا سا سماں نظر آتا ہے۔ بعدِ عصر طویل مسافت کے بعد ہم ٹمپا پہنچے جو فلوریڈا کا ہی ایک شہر ہے۔ اور میامی کے مخالف سمت میں سمندر کے کنارے واقع ہے۔ یہاں کے اسلامک سنٹر کے منتظمین کو ڈاکٹر مظفر حسین صاحب نے ہماری آمد کی اطلاع پہلے سے دے رکھی تھی۔ مغرب کے بعد ڈاکٹر صاحب کا خطاب بزبان انگریزی شروع ہوا جو اڑھائی گھنٹے جاری رہا۔ بعد میں سوال وجواب کا سلسلہ بہت طویل ہوگیا۔ چنانچہ وہاں سے تقریباً بارہ بجے شب روانہ ہوکر پونے تین بجے صبح واپس اوکی چوبی پہنچے۔ تھوڑا سا کھانا کھاکر فوراً سوگئے کیونکہ ہمیں اگلے دن میامی کا سفر کرکے وہاں سے فلائٹ پکڑنی تھی۔ میامی کے ہوائی اڈے پر مظفر حسین صاحب اور کئی دوسرے ساتھیوں نے ہمیں الوداع کہا۔

فلوریڈا کے اس مفصل اور تھکادینے والے سفر کے بعد ہم نے ایک دن واشنگٹن اور بالٹیمور میں گزارا۔ واشنگٹن۔ بالٹیمور کے ہوائی اڈے پر ہمیں ڈاکٹر مشتاق احمد صاحب لینے آئے ہوئے تھے۔ ائرپورٹ سے خاصے فاصلے پر واقع مشتاق صاحب کے انتہائی خوبصورت بنگلے پر چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد ہم بالٹیمور کی جامع مسجد میں گئے۔ اس جگہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے چار پانچ سال قبل عیدالفطر کی نماز پڑھائی تھی۔ لیکن اس وقت وہ اجتماع صرف ایک کھلے میدان میں ہوا تھا۔ اب اسی جگہ ایک شاندار جامع مسجد کی تعمیر مکمل ہوگئی ہے۔ مسجد کو بارونق دیکھ کر

از حد مسرت ہوئی۔ یہاں بھی ڈاکٹر صاحب نے مختلف النسل اور مختلف الالوان سامعین کے سامنے "دینی ذمہ داریوں کا جامع تصور" کے عنوان پر انگریزی میں سیر حاصل تقریر کی۔ رات گئے واپسی ہوئی۔ اگلا دن جمعۃ المبارک تھا۔ صبح کا وقت ہم نے واشنگٹن کی سیر میں گزارا۔ نماز جمعہ واشنگٹن کے اسلامی سنٹر میں ادا کی۔ یہاں مسلمانوں کا باہمی افتراق دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ ہمارے ایرانی اور کچھ دوسرے سیاسی اختلافات رکھنے والے مسلمان بھائی سنٹر سے باہر سڑک کے دوسری جانب فٹ پاتھ پر نماز جمعہ ادا کر رہے تھے۔ اور ایک میگا فون کے ذریعے لوگوں کو اپنی صفوں میں شامل ہونے کی دعوت دے رہے تھے۔

نماز جمعہ کے بعد دو اڑھائی گھنٹے ڈاکٹر صاحب جناب کوکب صدیق کے ساتھ گفتگو کرتے رہے اور ہم ڈاکٹر مشتاق صاحب کے ساتھ واشنگٹن کے کچھ دوسرے اہم مقامات دیکھنے نکل گئے۔ بعد ازاں مشتاق صاحب کے گھر واپسی ہوئی۔ ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ہم ائرپورٹ پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم جہاز پر سوار ہو کر شکاگو گئے۔ وہاں پر ڈاکٹر صاحب اور ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کو اترنا تھا۔ اور مجھے اور میرے بھتیجے عزیزم محمد سعید اسعد کو لاس اینجلز کے لئے سفر جاری رکھنا تھا۔

اس طرح تقریباً تین دن ہم ڈاکٹر صاحب سے علیحدہ رہے۔ لاس اینجلز میں سیر کے دوران "اولمپک گیمز" کے سلسلے میں پاکستان اور ہالینڈ کے درمیان ہاکی میچ دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا۔ ازاں بعد عزیزی سعید اسعد اور میں لاس اینجلز سے ڈائرکٹ فلائٹ کے ذریعے نیویارک پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کو شکاگو مزید قیام کے لئے چھوڑ کر واپس نیویارک پہنچ گئے۔ امریکہ کے دورے کے ان آخری چار دنوں میں نیویارک کے علاقہ فلشنگ کے علاوہ نیوجرسی اور بعض دوسرے اسلامک سنٹر اور مساجد میں ڈاکٹر صاحب کے دروسِ قرآن ہوئے۔

ہمیں پاکستان سے نکلے ہوئے ایک ماہ سے زائد عرصہ ہو چلا تھا۔ چنانچہ اب واپسی کی جلدی تھی۔ ۸ اگست کی شام کو جناب الطاف احمد صاحب اور متعدد دوسرے رفقاء نے کینیڈی ائرپورٹ پر ہمیں الوداع کہا۔ جہاز چند گھنٹوں کی تاخیر سے روانہ ہو کر پیرس پہنچا۔ یہاں سے ہم ایک دوسری فلائٹ کے ذریعے لندن پہنچے۔ لندن میں چار دن جناب صہیب حسن صاحب خلف مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ کے ہاں قیام رہا۔ ان چار دنوں میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے کئی پروگراموں کا اعلان کیا ہوا تھا۔ جمعہ کے لئے ڈاکٹر صاحب برمنگھم تشریف لے گئے۔ لندن میں کئی اجتماعات سے خطاب کیا۔ جن میں ایسٹ لندن مسجد اور ریجنٹ پارک کے اسلامک سنٹر کے خطابات قابل ذکر ہیں۔ اسلامک سنٹر میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا عنوان "اسلامی انقلاب کا صحیح منہاج ـــــ اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں" تھا۔ ہوا یوں کہ انہی دنوں لندن کی مسلم انسٹی ٹیوٹ (جس کے ڈائرکٹر جناب کلیم صدیقی صاحب

بقیہ ص ۸۹

افکار و آراء

راستہ چھوڑ دیجئے — اسلام آ رہا ہے!!

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض　　اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

حکیم عبدالرحمٰن خلیق، خطیب بدوملہی

حسین ملاقات

گذشتہ دنوں سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ راولپنڈی میں صدر مملکت پاکستان جنرل ضیاء الحق سے پاکستان کے بہت سے فلمی ستاروں اور ستارہ شناسوں نے ساڑھے سات گھنٹہ تک طویل ملاقات کی. جس کی تفصیل بتاتے ہوئے روزنامہ نوائے وقت نے لکھا ہے:

"صدر (ضیاء الحق) کے ساتھ اجلاس میں فلمی صنعت سے بابرہ شریف، شمیم آرا، شبنم، سنگیتا، انجمن، نور جہاں، یاسمین خان، محمد علی، ندیم، مصطفٰے قریشی، سلطان راہی، ردین گھوش، انور کمال پاشا، سرور بھٹی، ڈبلیو زیڈ بھٹی، شوکت حسین رضوی، علی اعجاز، سجاد گل اور بدر منیر نے شرکت کی" (نوائے وقت ۱۷ر جولائی ۱۹۸۴ء)

سبحان اللہ ؎

امیسر جمع ہیں احباب حال دل کہہ لے　　پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے!

خسارہ اور دلاسا

فلم "حیدر علی" کے پروڈیوسر راجہ غضنفر علی نے صدر کو بتایا کہ انہوں نے یہ تاریخی فلم بنائی تھی لیکن انہیں ۱۴ لاکھ روپے کا خسارہ ہوا۔ صدر نے انہیں یقین دلایا کہ اس سلسلہ میں وہ کچھ مالی اقدام کریں گے (انشاء اللہ العزیز). ٹھیک ہے ؎

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں　　طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

ملکۂ ترنم کی پذیرائی

میڈم نور جہاں نے صدر سے ملاقات کے لئے وقت مانگا تو صدر نے ان سے کہا۔ آپ سے تو ذاتی تعلق ہے۔ آپ فی الحال (ہمارے) گھر (تشریف لے) جائیں۔ جہاں بیگم (ضیاء الحق) صاحبہ آپ کی منتظر ہیں (حوالہ مذکور) آخر ذوق بھی تو کہہ گئے ہیں ؎

اے ذوق کبھی ہمدم دیرینہ کا ملنا　　اچھا ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے!!

چنانچہ دیگر اداکاراؤں کے ساتھ میڈم نور جہاں کو بیگم صاحبہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ (حوالہ مذکور) میرزا غالب نے شاید ایسے ہی کسی موقع پر کہا تھا۔

وہ آئیں گھر پہ ہمارے خدا کی قدرت ہے   کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غلط فہمی دُور ہو گئی

اداکارہ بابرہ شریف نے کہا (صدر صاحب!) جب آپ نئے نئے آئے تھے، تو (آپ کے تیور دیکھ کر) ہمیں کہا گیا کہ اب تمہیں برقعے پہننے پڑیں گے۔ فلمیں بند ہو جائیں گی اور پابندیاں لگ جائیں گی، لیکن آج جب کہ پہلی بار آپ سے ملاقات ہوئی ہے تو (آپ کو اپنی شنید کے بالکل مختلف دیکھ کر) یہ تاثر ختم ہو گیا ہے۔ (الحمد للہ)

صدر مملکت نے کہا۔ اب بابرہ شریف کو پتہ چل گیا ہے کہ میں اتنا کٹر خیالات کا نہیں ہوں۔ (حوالہ مذکور)

گویا صدر صاحب کا مطلب یہ تھا کہ ؎

کون کہتا ہے کہ ہم تم میں جدائی ہو گی   یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی

گُل و بُلبل کی سرگوشیاں

یہ ملاقات جو سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ میں ہوئی اور شام کے پانچ بجے تک (پورے سات گھنٹے اور بروایت دیگر ساڑھے سات گھنٹے) جاری رہی۔

صدر مملکت نے خندہ پیشانی کے ساتھ ہر فرد کی بات کو سنا۔ صدر نے مختلف تقاریر کے نوٹس بھی لئے اور اپنی ڈیڑھ گھنٹہ کی (جوابی) تقریر میں (تقریریں کرنے والے فلمی ستاروں اور ستارہ شناسوں کے) نام لے (لے) کر ان کے (اٹھائے گئے نکات کے) جواب دیئے۔

بعض نکات پر موقع پر ہی احکامات جاری کئے (حوالہ مذکور)

اب اس مرحلہ پر اگر فلمی ستارے یہ شعر گنگنانے لگیں تو وہ حق بجانب ہی ہو گا کہ ؎

قرض کی پیتے تھے اور دل میں کہتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

صدر کا احساس ذمہ داری

صدر (ضیاء الحق) نے فلموں کا معیار بلند کرنے کے لئے بھارت کے پونا انسٹی ٹیوٹ کی طرز پر پاکستان میں بھی ایک فلمی اکیڈمی کے قیام پر زور دیا۔ (حوالہ مذکور) بڑا مبارک عزم ہے ؎

اے وقت تو خوش باد کہ وقتے ما خوش کردی

صدر ضیاء الحق کا فتویٰ

صدر نے صحیح اور صاف ستھری (؟) فلموں سے ہونے والی آمدن کو رزقِ حلال قرار دیا۔ (حوالہ مذکور)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بَعَثَنِیْ رَبِّیْ بِمَحْقِ الْمَعَازِفِ

وَالمِزَامِیرِ۔ (الحدیث)

(کہ مجھے میرے رب نے (دوسرے بہت سے مقاصد کے ساتھ ساتھ) باجے گاجے اور موسیقی کے آلات کو توڑ پھوڑ کر پھینک دینے کے لئے مبعوث کیا ہے)

اس حدیث پاک کی موجودگی میں کسی اسلامی مملکت کے سربراہ کا (جس نے ملک میں بہرحال اسلام کو نافذ کرنے کا عہد کر رکھا ہو) باجوں گاجوں، گھنگھروؤں اور سازندوں کے جلو میں اجنبی عورتوں اور مردوں کا بے حجاب اختلاط اور فسق صریح کو رقص و سرود کو دو آتشہ کر کے حاصل کردہ دولت کو رزقِ حلال کہنا سخت تعجب انگیز ہے۔ غریب اسلام اب اس فتویٰ پر اس کے سوا کیا کہے گا ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

طاؤس و رباب نہیں، جہاد

صدرِ پاکستان کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے اسلامی انقلاب کے لئے جہاد شرط ہے۔ طاؤس و رباب سے صالح انقلاب نہیں آیا کرتے۔ طاؤس و رباب قوموں کی تباہی کی تمہید اور ہلاکت کی علامت ہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

یہ قیامت کی نشانی ہے

پاکستان کے قابلِ احترام صدر جو فلمی ستاروں میں سے ہر کسی کی بات ہی پوری خندہ پیشانی سے سن کر ان سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں، اگر ابھی تک خندگی کے اسی موڈ میں ہوں تو ہم ان کی خدمت میں ایک حدیثِ رسولؐ پیش کر کے انہیں دعوتِ عبرت دیتے ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن قیامت کی نشانیوں کا ذکر فرماتے ہوئے اپنے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو خبر دی کہ:

"لوگ جب مالِ غنیمت پر اپنا حق جانے لگیں گے۔ امانت کی رقم کو لوٹ کا مال بنا لیں گے، زکوٰۃ کو جرمانہ سمجھیں گے، علم صرف دنیا کے لئے حاصل کریں گے، بیٹا جب ماں پر بیوی کو حاکم بنا دے گا، مسجدوں سے جب فساد اچھلنے لگیں گے، خاندانوں کی سربراہی جب فاسقوں کو حاصل ہوگی، قیادت جب کمینوں کے ہاتھ میں ہوگی، آدمی کی عزت جب اس کے شر سے محفوظ رہنے کی غرض سے کی جائے گی، جب گانے بجانے والی عورتوں کی کثرت ہو جائے گی، سازو سرود لوگوں میں بہت رسوخ حاصل کرے گا، شراب

نوشی عام ہو جائے گی اور امت کے پیچھے آنے والے (بدنصیب) لوگ جب پہلے (بزرگوں) پر لعنت کریں گے ۔۔۔۔ تو جان لو کہ قیامت بس اب سر پر ہے ۔ اس وقت اللہ کا عذاب حرکت میں آجائے گا ۔ سرخ آندھیاں چلیں گی، زلزلے آئیں گے، زمین جگہ جگہ سے دھنس جائے گی انسانوں کی صورتیں مسخ ہو جائیں گی اور آسمان سے پتھروں کی بارش ہوگی، یہ واقعات یکے بعد دیگرے یوں وقوع پائیں گے جیسے موتیوں کی لڑی ٹوٹ جانے سے موتی ایک کے بعد دوسرا گرنے لگتے ہیں ۔

(مشکوٰۃ شریف بحوالہ ترمذی)

صدرِ مملکت اگر اس حدیث پاک کی ترازو میں اپنی تازہ فراخ دلی کو تولیں گے تو وہ یقیناً اس میں اپنے لئے عبرت کے خزانے موجود پائیں گے ۔"

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

صدرِ پاکستان سے درخواست

صدرِ مملکت اگر بات سننے پر آمادہ ہوں تو ہم ان سے عرض کریں گے کہ جس طرح آپ کی تیکھی آمد پر بابرہ شریف اور ان کی ہم پیشہ خواتین نے آپ کے بارے میں ایک ذہن بنا لیا تھا، ٹھیک ایسے ہی آپ کے بے شمار دعاوی آپ کی قرآن میں ڈوبی ہوئی تقریروں اور بعض دینی اقدامات کی وجہ سے پاکستان کے دینی حلقوں میں بھی آپ کے بارے میں ایک ذہن تشکیل پا گیا تھا اور اب اگرچہ آپ نے بابرہ شریف کی غلط فہمی تو دور کر دی ہے ۔ مگر پاکستان کے دینی حلقے ابھی بدستور ہی آپ سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں اور اپنے حسنِ ظن میں ترمیم کرنے میں متامل ہیں ۔

آپ خوب جانتے ہیں کہ پاکستان کے اہلِ سیاست آپ کے بارے میں اپنا حسنِ ظن دیر سے ختم کر چکے ہیں لیکن اگر آپ نے ان بابرہ شریف، نورجہاں، شمیم آرا، شبنم، انجمن اور سنگیتا نوازیوں اور فسق و فجور کے اڈوں اور ان کے چلانے والوں کو پذیرائی عطا فرما کر دینی حلقوں کو بھی مایوس کر دیا تو ظاہر ہے کہ ملک کے اندر آپ کا مستقبل ایک طاقتور ملک گیر اور بے درم حمایت سے محروم ہو جائے گا ۔ اور یہ بات ملک کے لئے کوئی نیک فال نہیں ہوگی ۔

پس اگر آپ کو کعبہ پہنچنا ہے تو کعبہ کی راہ اختیار کیجیے ۔ ان سلمہ ستارہ کمپنیوں کا دروازہ کاشی کی طرف کھلتا ہے کعبہ کی جانب نہیں کھلتا ۔

آپ کی یہ فراخ دلی نہ آپ کے لیے مفید ہے نہ ملک، اہل ملک اور اسلام کے لیے ہی مفید ہے، اس لیے یاسلطان اللہ اللہ یا برہمن رام رام کی پالیسی سے آپ کوئی وقتی فائدہ حاصل بھی کرلیں گے تو قرآن پاک کے مطابق اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ اس پالیسی میں نفع کم ہے اور نقصان زیادہ ہے۔

آپ کو آپ کے ملک نے اسلام کی دولت سمجھا تھا۔ مناسب ہے کہ اپنے اہل ملک کے ہاں اپنا یہ اعزاز قائم رکھیں کہ دین و دنیا کی بھلائی اسی میں ہے ؎

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

(ماخوذ از ہفت روزہ "تنظیم اہلحدیث" لاہور)

―――(۲)―――

اسلام میں عورت کا مقام

خواتین کے مشہور ماہنامہ "آنچل کراچی" میں مندرجہ بالا موضوع پر مرکزی انجمن کی جانب سے شائع شدہ کتاب پر رسالے کی مدیرہ محترمہ زیب النساء صاحبہ نے اگست کے شمارے کے اداریہ میں جو تبصرہ کیا ہے وہ درج ذیل ہے (ادارہ)

السلام علیکم۔ اہل وطن کو جشن آزادی مبارک ہو۔ اگست کا آنچل حاضر مطالعہ ہے۔

ملک کے جید عالم، خادم دین اور ماہر قرآن محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی فکر انگیز کتاب بعنوان "اسلام میں عورت کا مقام" ابھی حال ہی میں ڈاکٹر صاحب کے ذاتی[1] ادارے "انجمن خدام القرآن" سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب پر سیر حاصل تبصرہ کرنا تو چراغ کو روشنی دکھانے کے مترادف ہے۔ البتہ میں کتاب میں دیئے گئے کچھ عنوانات پر روشنی ڈالنا چاہتی ہوں۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے واضح ہے کہ وہ عورت اور اس کے اسلامی مقام کا احاطہ کر رہی ہے تو اس کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے عورت سے متعلق ہر اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت فصیح و بلیغ پیرائے میں تشریح فرمائی ہے جس کا تعلق احکام دین سے ہے۔

---

[1] یہاں "ذاتی" کا لفظ مناسب نہیں ہے۔ انجمن ایک رجسٹرڈ پبلک ادارہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کے صدر مؤسس ہیں۔ (ادارہ)

ہمارا ملک اسلامی ملک ہے ۔ ہمارا دین ' دین اسلام ہے اور دین اسلام ایک ایسا ہمہ گیر اور آفاقی دین اور مکمل مکتبہ ہے کہ جسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی کسی دوسرے اقسام کے مکاتیب فکر کی ضرورت باقی رہتی ہے ۔ عورت ہو کہ مرد جب اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ آدم کی تو تخلیق کے ساتھ ہی ان کے فرائض اور ان کا مقام بھی خود ہی متعین فرمادیا ۔ ان احکامات اور فرائض کی ادائیگی کس طرح کی جائے ؟ اس کی وضاحت کے لئے اپنے قوانین سے مزین کتاب قرآن حکیم کی صورت میں ابن آدم پر نازل فرمادی ۔ ساتھ ہی تخلیق میں عورت مرد کا فرق بھی سمجھا دیا ۔ یہاں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔ خدائے برتر نے دونوں کو مقام محمود عطا کیا ہے مگر الگ الگ !

اگر کوئی عالم دین معاشرے کی زبوں حالی کا جائزہ لیتا ہوا ہدایت کرے کہ اے عورت ! تو جس مقام پر کھڑی ہے کیا یہ وہی مقام ہے جس پر تجھے تیرے خالق نے متمکن کیا ؟ تو اس ہدایت سے کسی بھی قسم کی غلط فہمی پیدا ہونا دراصل جہالت کم فہمی نیز دینی بصیرت اور دینی علم کا فقدان ہی کہا جاسکتا ہے ۔ اس لئے کہ عالم دین اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا ۔ وہ تو صرف یاد دہانی کرارہا ہے کہ اپنا مقام پہچانو ۔ محترم تھیں ' غیر محترم کیسے ہوگئیں ؟ چراغِ خانہ تھیں ' شمعِ محفل کیوں بن گئیں ؟ چھپی ہوئی تھیں ' ظاہر کیسے ہوگئیں ؟ یہی وہ چند سوالات ہیں جن کے جوابات تمام خواتین کو حاصل کرنا ہیں ۔ قرآن وسنت میں اپنا مقام تلاش کرنے کی جہد کرنی چاہیئے ۔ معلوم نہیں ہے تو معلوم کرنا چاہیئے ۔ اس لئے کہ عورت کائنات کا دل ہے ۔ اگر دل ہی روشن نہ رہے تو پوری قوم اندھیروں میں ڈوب جاتی ہے ۔

قرآنی ہدایات اور اتباعِ رسولؐ ہمارا ایمان ہے ۔ اگر ہم اس سے ہٹے ہوئے ہیں تو یہ ہماری بدقسمتی ہے ۔ اگر ہم اپنے مقام سے ہٹ گئے ہیں تو اس مقام سے انکار تو نہ کریں جو خدائے کریم نے بخشا ہے ۔

عورت کے تشخص کا مسئلہ ' محض اس کی ذات کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری قوم و ملک اور معاشرے کے تشخص کا مسئلہ ہے ۔

تمام خواتین وحضرات سے گذارش ہے کہ وہ ڈاکٹر اسرار احمد کی اس کتاب کا مطالعہ کریں ۔ یہ ان خطابات کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں ڈاکٹر صاحب نے فرمائے ہیں ۔ اس کتاب کے مطالعے سے وہ غلط فہمی بھی دور ہو جائے گی جو "الھدیٰ" کے موقع پر پیدا ہوئی تھی[1] ۔ جس کی وجہ سے ہم

---

[1] ٹی وی کے پروگرام "الہدیٰ" میں محترم ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر سرے سے اظہار خیال کیا ہی نہیں تھا ۔ یہ مسئلہ تو موصوف کے ایک اخباری انٹرویو کے چند سوالات کے جوابات کی وجہ سے زیر بحث آیا تھا ۔ "الہدیٰ" کے پروگرام میں ڈاکٹر صاحب نے ہر متنازعہ فیہ مسئلہ کو زیر بحث لانے سے اجتناب کیا ہے ۔ (ادارہ)

ڈاکٹر صاحب کے بہت سے بصیرت افروز خطابات سے محض غلط فہمی اور عاقبت نااندیشی کی بدولت مستفیض ہونے سے محروم رہ گئے تھے۔

آج یہ امر یقیناً میرے لئے اور آنچل کی قاری بہنوں اور بھائیوں کے لئے باعثِ صد افتخار و مسرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی نادر کتاب میں ڈاکٹر صاحب کا وہ انٹرویو بھی شامل ہے جو آنچل کے شمارہ جولائی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس انٹرویو کو "میثاق" کے قیمتی صفحات میں جگہ پانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ بلاشبہ میرے لئے یہ بڑا اعزاز ہے۔

(۳)

اے میرے وطن کے عوام

تم میں سے ہر شخص خود کو مسلمان کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے اور اس معاملے میں تمہارے جذبات تمہارے قابو میں نہیں رہتے اگر کوئی تمہارے عمل کی بنیاد پر تمہارے مسلمان ہونے کی نفی کا تاثر دے تو تم آگ بگولا ہو جاتے ہو۔ مسلمان قومیت ہی کے نام پر تم نے اس ملک کی آزادی کی جنگ لڑی ہزاروں لاکھوں جانیں قربان کیں اور بے شمار مصائب سہے اور پھر "نظامِ مصطفےٰ" ہی کے نام پر تحریک چلا کر تم نے مغرور حکمرانوں کے سر خم کر دیے، جذبات کی حد تک تمہیں اسلام سے بے پناہ لگاؤ ہے۔ اور اسلامی نظام نہ نافذ کرنے پر تم حکمرانِ وقت کو ہر وقت کوستے رہتے ہو۔ اس معاملے میں موجودہ حکمرانوں سے ان کے کیے ہوئے وعدوں اور نعروں کی بنیاد پر تم نے انتہائی گہری توقعات وابستہ کیں لیکن تمہاری یہ توقعات پوری نہ ہوئیں جس کے نتیجے میں آج تم ان سے بددل اور برگشتہ ہو چکے ہو اور ان عدلیں کو فراڈ اور کرسی کا سہارا سمجھتے ہو تم میں سے اکثر و بیشتر اس بنیاد پر موجودہ حکمرانوں کو گالیاں دیتے ہیں اس کے علاوہ تم ہر طرح کی برائیوں، ناانصافیوں اور ظلم و ستم کی ذمہ داری حکومت کے کھاتے میں ڈالتے ہو۔ لیکن اے میرے وطن کے لوگو! چند لمحوں کے لیے حکومت کو فراموش کر دو اور اپنے آپ میں جھانکو اور اپنے اپنے عمل اور کردار کا جائزہ لو تمہیں احساس ہوگا کہ جس طرح تم حکومت کو مجرم گردانتے ہو اسی طرح تم خود بھی مجرم ہو۔ اسے حکومت کو نفاذِ اسلام کے سلسلے میں فراڈ کہنے والو کبھی تم نے سوچا کہ تم خود بھی اسلام کے ساتھ فراڈ کر رہے ہو۔ بتاؤ کہ اسلام کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے؟ قبولِ اسلام کے بعد اولین چیز جس سے ایک شخص کے اسلام اور ایمان کو پرکھا جاتا ہے کیا ہے؟ وہ کیا عمل ہے جسے اسلام اور کفر کے درمیان وجہ امتیاز ٹھہرایا گیا ہے؟ وہ کون سا عمل ہے جس کی بنیاد پر رسول اکرمؐ کے زمانے میں مسلمان اور کافر کے درمیان اوّلین فرق ظاہر ہوتا تھا چنانچہ خود کو مسلمان ظاہر کرنے کے لیے منافق بھی اس عمل کو اختیار کرنے پر مجبور تھے؟ وہ کون سا عمل ہے جو اسلام کا دوسرا رکن ہے؟

وہ کون سا عمل ہے جس کا قرآن مجید میں اُنسٹھ معاملات پر حکم دیا گیا ؟ اے دعویٰ ایمانی کرنے والے اس اس ملک کے آٹھ کروڑ لوگو ! اے نظامِ مصطفےٰ کے متوالو ! بتاؤ کہ آج تم میں سے کتنے کروڑ افراد ہیں جو نماز کی پابندی کر رہے ہیں ؟ جنہوں نے اس بنیاد پر خود کو کافروں سے الگ کر دکھایا ہے ؟ بتاؤ کیا ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر نہیں ہے ؟ اسلام کا دعویٰ کرنے والے اور حکومت سے اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والے باقی تمام افراد کیا اسلام کے ساتھ فراڈ نہیں کر رہے ہیں ؟ بات صرف نماز ہی کی نہیں آپ روزہ کی بنیاد پر خود کو پرکھ لیں، زکوٰۃ کو پیمانہ بنا لیں۔ اگر آپ حج کرنے لگیں گے وہ بھی آج نمائش، تفریح اور عقیدت کے اظہار کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اب ذرا معاشرتی برائیوں کی طرف آؤ تم ایک دوسرے کو لعن طعن کرتے ہو ایک دوسرے کو مجرم گردانتے ہو لیکن تم میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر جرائم کا ارتکاب کر رہا ہے کون سا شعبہ ایسا ہے جہاں اوپر سے لے کر نیچے تک ہر سطح پر رشوت نہیں لی جاتی لیکن رشوت لینے والا جتنا بڑا گناہگار ہے رشوت دینے والا بھی اتنا ہی گناہگار ہے اور تم میں سے کون ہو گا جو اپنے کام نکلوانے کے لیے رشوت دینے سے چوکتا ہو ؟ اس لیے کہ رشوت دے کر تم خود اپنے لیے کمائی کے راستے کھولتے ہو۔ دولت اور حسب و نسب کو تم اپنا خدا بنائے بیٹھے ہو اور ان کے حصول کی جدوجہد میں تم ہر رکاوٹ کو پیسے ہی کے ذریعے دور کرنا چاہتے ہو آج کوئی سرکاری ملازم ہو یا غیر سرکاری ادارہ، دکاندار ہو یا کسی اور شعبے سے تعلق رکھنے والا شخص ہر کوئی دھوکہ دہی و جھوٹ، مکر و فریب میں ملوث ہے۔ بات فرائض کی ہو تو کوئی انہیں خلوص نیت سے انجام دینے کو تیار نہیں۔ بات رحم و کرم، ہمدردی، صلح جوئی اور شفقت و محبت کی ہو تو ہم سے ہر کوئی دوسروں کی بداخلاقی کا رونا تو روتا ہے لیکن یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ جب دوسرے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرتے ہیں تو اس وقت اس کا اپنا رویہ کیا ہوتا ہے ؟ معاشرے کے بوڑھے افراد ہیں تو قبر میں پاؤں لٹکانے کے باوجود انہیں خدا یاد نہیں آ رہا اور وہ اسی دنیا کے چکروں میں پھنسے ہوئے ہیں کاش وہ سوچیں کہ موت کسی بھی وقت انہیں خدا کے حضور پیش کر سکتی ہے اور یوں وہ اپنے آخری وقت ہی میں کچھ اپنی عاقبت کی فکر کریں۔ جو متوسط عمر کے لوگ ہیں تو وہ جائیدادیں بنانے اور من و سلویٰ کی فکر میں اس طرح مشغول ہیں کہ خدا اور اس کے رسولؐ کے احکامات جاننے اور ان کی طرف توجہ دینے کی انہیں فرصت نہیں، جو نوجوان مرد ہیں تو ان کی گفتگو کا موضوع صنفِ نازک ہے اور ان کی سوچ کا محور عورت کے گرد گھوم رہا ہے۔ جہاں دو نوجوان اکٹھے ہوں گے تو وہ انتہائی گھٹیا اور فحش انداز میں جنسی اعضاء اور جنسی افعال کا ذکر کر رہے ہوں گے۔ لڑکیاں ہیں تو ان کے ذہنوں سے حیاء کا تصور ہی مٹ چکا ہے۔ آج ماں باپ اپنے بچوں اور بہن بھائیوں کو ساتھ بٹھا کر VCR سے جنسی لذت اٹھانے میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ عریاں رقص دیکھتے ہوئے، اور عورت و مرد کو بغلگیر ہوتے دیکھ کر نہ باپ کو شرم محسوس

ہوتی ہے اور نہ ماں کو یہ خیال آتا ہے کہ اس کے بچوں کا ذہن کس طرف جا رہا ہے زنا اور بدکاری
بہت سی جگہوں پر عام ہے اور دیکھنے والے اس پر صرف کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ جاتے ہیں ،
برائی کو روکنا اور ٹوکنا تو کجا یہاں ایمان کا یہ عالم ہے کہ دلوں میں برائی سے نفرت کا احساس
مٹ چکا ہے ۔

اے مسلمانو! آج تمہارا مذہب کیا ہے ؟ تمہارا مذہب یہ ہے کہ مؤذن جب تمہیں
بتاتا ہے کہ "آؤ نماز کی طرف" تو تم اذان کے الفاظ پر غور تک کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مؤذن
کی آواز پر لبیک کہنا تو دور کی بات ہے۔ رمضان کا مہینہ تمہارے لیے عید کی تیاریوں کے مرحلے
کے طور پر گزرتا ہے اور عید کے دن فلمیں اور VCR دیکھتے ہوئے گزرتے ہیں۔ آج تمہارا مذہب
یہ ہے کہ شب برأت کو حلوے پکاؤ اور آتش بازی کرو تم بس اسی انتظار میں رہتے ہو کہ کوئی
دن آئے اور تم کھانے پینے! دیگیں چڑھانے کا انتظام کرسکو کبھی گیارہویں کا انتظار ہے تو
کبھی کونڈوں کا انتظار اور کبھی عید میلاد النبی ﷺ کا۔ کوئی گھر میں مر جائے تو اس کے غم میں تم دیگیں چڑھا
کر لوگوں کی دعوت کرتے ہو، موت کے دن بھی، سوئم کو بھی، جمعرات کو بھی اور چالیسویں پر بھی۔
امام حسینؓ کی شہادت کے غم میں تو تم محض حلیم کی دیگیں، حلوہ، زردہ اور ٹھنڈے مشروبات ہی
نہیں بناتے بلکہ ڈھول بجاتے، رقص کرتے اور تماشہ کرتے ہوئے تعزیوں کے نام سے بتوں کی
پوجا پرستش اور نمائش بھی کرتے ہو۔ بزرگوں کی قبروں اور مزاروں پر سجدہ ریز ہونا، منتیں ماننا،
چادریں چڑھانا اور عرس کے نام پر میلے اور تماشے کرنا یہ ہے تمہارا مذہب۔ اس کے علاوہ
کون کون سی رسوم جاہلانہ اور افعال مشرکانہ ہیں جو تمہارے مذہب میں آج شامل نہیں ہیں
جن کاموں کا خدا اور اس کا رسول ﷺ حکم دیتے ہیں تم انہیں اختیار نہیں کرتے جن کاموں سے
رکنے کا حکم دیا گیا تم ان کو ترک نہیں کرتے لیکن ہر وہ کام جس میں تمہارے لیے تفریح، نمائش،
لذت اور کھانے پینے کا پہلو نکل آئے اسے تم مذہب بنا لیتے ہو۔ تمہارے جوان تمہارے بچے
آج امیتابھ بچن، ریناراۓ اور میتھن سسٹرز کا ذکر بڑی محبت اور عزت کے ساتھ کرتے ہیں
اور خدا اور اس کے رسول ﷺ کا انہیں خیال بھی نہیں آتا۔ ٹیلی ویژن پر کوئی ڈرامہ چل رہا ہو یا کوئی
گلوکار یا گلوکارہ گانا گا رہی ہو تو تمہارا ذہن اور تمہاری نظریں سکرین کی طرف مرتکز ہو جاتے ہیں
لیکن اگر اسلامی تعلیمات کا کوئی پروگرام آ رہا ہو تو ٹیلی ویژن سے بے خبر ہو جاتے ہو۔ آج تمہیں
عشقیہ رسالوں اور فحش لٹریچر سے تو بہت دلچسپی ہے لیکن قرآن اور حدیث کی کتابوں کو کھولنے پر نہ
تمہارا ذہن مائل ہوتا ہے اور نہ ہی تمہارے پاس اس کیلئے وقت ہے۔ تمہیں اپنے بچوں کا مستقبل
سنوارنے کی فکر تو ہر وقت لاحق رہتی ہے لیکن ان کی اور اپنی آخرت سنوارنے کا خیال تمہیں کبھی

نہیں آتا اور یہ خیال آئے بھی کیسے جبکہ تم آخرت کو فراموش کر بیٹھے ہو۔

سیاسی لحاظ سے تمہارا حال یہ ہے کہ ذاتی اور گروہی مفادات اور علاقائی و لسانی تعصبات نے تمہیں اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے جو شخص تم سے تمہاری زبان میں اور علاقائی بنیاد پر بات کرے تو اسے اپنا لیڈر بنا لیتے ہو نہ اس کے نظریات کا مطالعہ کرتے ہو اور نہ اس کے کردار کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہو، پُرفریب نعروں کی طرف تم اس طرح دیوانہ وار لپکتے ہو جس طرح مچھلی کانٹے میں لگی ہوئی غذا کی طرف اندھا دھند لپکتی ہے۔

اے میرے وطن کے لوگو! اسلامی نظام کی ابتداء تمہارے جسم سے، تمہارے عمل سے اور تمہارے گھر سے ہوتی ہے۔ اگر تم میں سے ہر کوئی اپنے جسم، اپنے عمل اور اپنے گھر کو اسلام کے سانچے میں ڈھال لے تو سمجھ لو کہ اسلام نافذ ہو چکا لیکن اگر تم اپنے اندر تبدیلی نہیں لاتے تو سمجھ لو کہ حکومت سے نفاذ اسلام کا مطالبہ کرنا بالکل بے وزن بات ہے اور راہِ فرار اختیار کرنے کے مترادف ہے۔

فرخ شہزاد
ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی

——— (۴) ———

محترمی و مکرمی مخدومی شیخ جمیل الرحمٰن صاحب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

الحمدللہ خیریت موجود۔ خیریت مطلوب۔ آپ سے ایک عرض کرنی ہے۔ میثاق ستمبر جلد ۳۲ شمارہ ۹ صفحہ ۵ سطر ۱ کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں "اپنی تمام کتابیں ان کے قدموں میں ڈال دیں" تذکرہ ان کتب کا ہے جو ڈاکٹر صاحب محترم کی تحریر کردہ ضرور ہیں مگر ان کا مرکزی مضمون قرآن کریم ہے۔ قدموں میں ڈالنے کے الفاظ ان کتب کے لئے میرا خیال ہے کہ توہین کے مترادف ہے۔ مہربانی فرما کر ان الفاظ کی تصحیح فرما لیجئے۔ والسلام:

طالب دعا

السید عبدالغفار آغا،

بی یو، ایم ایس فاضل الطب والجراحت، کراچی۔

(نوٹ: محترم ڈاکٹر صاحب نے ازراہِ انکسار اور ان عالم دین کے احترام کے پیش نظر یہ اسلوب بیان اختیار کیا تھا۔ بہرحال اس فروگذاشت پر متوجہ کرنے پر ادارہ صاحب مکتوب کا ممنون ہے۔)

[illegible]

رفتارِ کار

مرتب: رحمت اللہ بٹر، نائب امیر برائے دعوت و توسیع

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی بیرونِ ملک سے واپسی کے فوراً بعد ہی اندرونِ پاکستان ان کے دروس و خطابات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ محترم ڈاکٹر صاحب کی ۱۳ راگست کو پاکستان واپسی ہوئی تھی ـــــ چنانچہ ۱۴ راگست کو لاہور کی پانچوں تنظیموں کا مشترک ایک روزہ تربیتی پروگرام ہوا جس میں رفقاء کار کے جائزے کے بعد انہوں نے درسِ قرآن دیا۔ اور مختلف امور کے بارے میں رفقاء کو ہدایات دیں ـــــ ۱۵ اور ۱۶ کو مجلسِ مشاورت کا اجلاس ہوا اور ۱۷ اگست کو حسبِ معمول مسجد دارالسلام میں خطابِ جمعہ کے علاوہ لاہور ہی میں بعد نماز مغرب مسجد باغ والی بیرون شاہ عالم مارکیٹ میں درسِ قرآن دیا ـــــ اس سے اگلے روز یعنی ۱۸ اگست کو بروز ہفتہ قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد میں سلسلہ وار درسِ قرآن کا دوبارہ آغاز فرمایا ـــــ یہاں قرآن مجید تسلسل کے ساتھ زیرِ مطالعہ ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ سورۃ الزخرف (۲۵ واں پارہ) کے ابتدائی چار رکوع زیرِ درس رہے۔

تنظیم اسلامی ایبٹ آباد کی جانب سے کافی عرصہ سے امیرِ محترم کے دعوتی و تبلیغی دورے کا تقاضا کیا جا رہا تھا۔ اسی طرح آزاد کشمیر کے لوگوں کی جانب سے مظفر آباد اور راولاکوٹ کے دوروں کی دعوت بھی موجود تھی۔ چنانچہ ۲۶ تا ۲۹ راگست ایک بھرپور دورے کا پروگرام ترتیب دیا گیا جس میں بالترتیب ایبٹ آباد، مانسہرہ، مظفر آباد اور راولاکوٹ کا دورہ طے پایا ـــــ راقم الحروف ۲۵ راگست کو ایبٹ آباد پہنچا۔ جہاں رفقاءِ تنظیم سے مل کر انتظامات کا جائزہ لیا گیا۔ پھر اسی روز مانسہرہ جا کر قاضی رفیق الرحمٰن، قاضی محمد مشتاق اور دیگر حضرات سے ملاقات کی۔ جناب شیراز محمود کے مشورے سے قاضی رفیق الرحمٰن صاحب کی مسجد واقع کنگر محلہ کی مسجد میں بعد نمازِ عشاء خطاب کا وقت معین کیا گیا ـــــ اس دوران مرکز کی جانب سے جناب محمد یونس قریشی صاحب کو مظفر آباد بھیجا گیا تاکہ وہ وہاں امیرِ تنظیم کے پروگرام کے سلسلے میں انتظامات کا جائزہ لے سکیں۔ اسی سلسلے میں جناب شعیب الرحیم انصاری صاحب اور جناب افتخار تاج صاحب کو راولاکوٹ کی طرف روانہ کیا گیا ـــــ

دورہ ایبٹ آباد کی رپورٹ وہاں کے مقامی امیر جناب خالد وحید صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں :-

ایبٹ آباد / مانسہرہ

ڈاکٹر صاحب ۲۶ راگست کی صبح قریباً ½ ۱۰ بجے لاہور سے ایبٹ آباد پہنچے۔ نائب امیر برائے دعوت و توسیع جناب رحمت اللہ بٹر صاحب پہلے سے ہی ایبٹ آباد میں موجود تھے۔ ایبٹ آباد میں ۲۶ راگست کو امیرِ تنظیم کے متعدد پروگرام رکھے تھے۔ جن میں ۱۱ بجے بار ایسوسی ایشن سے خطاب، شام ۵ بجے نیشنل سنٹر میں خطابِ عام اور بعد از نماز عشاء مرکزی مسجد میرپورہ میں خطاب شامل تھا۔ ۴۵ منٹ تک دفتر تنظیم اسلامی میں آرام کے بعد ڈاکٹر صاحب معہ رفقاء بار روم روانہ ہو گئے جو دفتر سے قریباً پیدل ۵ منٹ کے راستہ پر واقع تھا۔ بار روم پہنچنے پر رفیقِ محترم سید احمد شاہ صاحب ایڈووکیٹ کے علاوہ صدر بار ایسوسی ایشن اور دوسرے سینئر وکلاء نے ڈاکٹر صاحب کا استقبال کیا۔ بار روم میں وکلاء کے

علاوہ اور بہت سے حضرات بھی ڈاکٹر صاحب کا خطاب سننے کے لئے موجود تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہال کے اندر اور باہر کھڑی تھی۔ صدر بار ایسوسی ایشن نے مختصراً تعارف کرایا جس کے بعد امیر محترم نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک ایک جامع خطاب فرمایا۔ جس میں آپ نے واضح کیا کہ کس طرح اس ملک کی اساس اسلام ہے۔ مزید برآں نفاذِ اسلام کے نفاذ کے طریق کار پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ خطاب کے بعد وکلاء صاحبان کی طرف سے سوالات کئے گئے جن کے نہایت تسلی بخش جوابات دیئے گئے۔

بار روم میں خطاب کے بعد ڈاکٹر صاحب مع رفقاء واپس تشریف لائے۔ دفتر میں کچھ دیر رفقاء کے ساتھ تبادلۂ خیالات کے بعد امیر محترم اور رفقاء راقم کے گھر روانہ ہوگئے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے راقم کو امیر محترم اور دوسرے رفقاء کو سادہ سا کھانا پیش کرنے کی سعادت عطا فرمائی۔ اسی اثناء میں جبکہ راقم نیشنل سنٹر والے پروگرام میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ جناب نیاز پاشا جدون مدیر ہفت روزہ "جائزہ" کا ٹیلیفون آیا کہ ریذیڈنٹ ڈائریکٹر نیشنل سنٹر نے ڈاکٹر صاحب کا پروگرام کرنے سے معذوری ظاہر کر دی ہے۔ اور یہ اطلاع دو بجے پہنچائی گئی جبکہ شام ۵ بجے پروگرام ہونا تھا۔ اور یہ فیصلہ متعلقہ حکام نے اسی دن ایک میٹنگ میں کیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ متفق تھے۔ ہال میں جگہ کی کمی کو وجہ معذرت بتایا گیا۔ واضح رہے کہ نیشنل سنٹر کا پروگرام ہمارے دوست جناب نیاز پاشا نے ترتیب دیا تھا۔ جس کی منسوخی سے وہ بڑے مایوس ہوئے۔ کچھ رفقاء کو نیشنل سنٹر میں بٹھا دیا گیا تھا تاکہ لوگوں کو پروگرام کی منسوخی کے بارے میں بتایا جا سکے۔ اور امیر محترم سے ملاقات کرکے خواہشمند حضرات کو دفتر تنظیم اسلامی میں بھجوایا جا سکے۔ تقریباً پانچ سو آدمی نیشنل سنٹر میں آکر مایوس ہو کر واپس گئے جن میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی ایک کثیر تعداد تھی۔ جگہ اور وقت کی مناسبت سے بھی نیشنل سنٹر والا پروگرام ان لوگوں کے لئے موزوں تھا۔ اور بہت سے اہل علم ڈاکٹر صاحب سے سوالات کرنے کے بھی متمنی تھے لیکن اللہ کو یہ پروگرام منظور نہ ہوا۔ بعد میں بہت سے حضرات دفتر میں تشریف لائے۔ اور ڈاکٹر صاحب نے تحریک شہیدین کے موضوع پر ایک مختصر سا خطاب بھی کیا جس کے بعد کچھ دوستوں نے سوالات بھی کئے۔

مغرب کی نماز شہزادہ مسجد میں امیر محترم کی اقتداء میں پڑھنے کے بعد ہمارا مختصر سا قافلہ میرپور کے لئے روانہ ہوگیا۔ میرپور ایبٹ آباد شہر سے قریباً چار میل کے فاصلے پر مانسہرہ روڈ پر واقع ایک قدیم قصبہ ہے۔ میرپور میں خطاب کا پروگرام دوست عبدالحئی گوہر کی ایک دیرینہ اور پر اصرار دعوت پر رکھا گیا تھا۔ خطاب سے قبل عبدالحئی گوہر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کا مختصر تعارف کرایا۔ ڈاکٹر صاحب کے خطاب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ آئے ہوئے ایک ساتھی جناب برکت اللہ صدیقی صاحب اور جناب رحمت اللہ بٹر صاحب نے بھی مختصر خطاب کئے۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مفصل خطاب کیا۔ "ایمان اور جہاد" کے حوالے سے دو گھنٹے کے خطاب میں امیر محترم نے جہاد کے مختلف مراحل کو وضاحت سے بیان کیا۔

۲۷ تاریخ کو صبح دفتر میں رفقاء تنظیم سے ملاقات طے تھی۔ اس موقع پر چار نئے ساتھیوں نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی۔ ان میں جناب حمید اللہ خان صاحب، جناب عبدالوحید صاحب، جناب عمران ضیاء صاحب اور جناب طارق حمید جدون صاحب شامل ہیں۔ اوّل الذکر دو حضرات اپنا کاروبار کرتے ہیں جبکہ مؤخر الذکر دو حضرات طالب علم ہیں۔ اب ایبٹ آباد میں رفقاء کی تعداد ۱۵ ہو گئی ہے ——— ۲۷ اگست کی صبح ایبٹ آباد میں ڈاکٹر شیر بہادر خاں نیازی صاحب سے ملاقات کے بعد امیر تنظیم مانسہرہ تشریف لے گئے۔ جہاں ۱۱ بجے گورنمنٹ کالج مانسہرہ

ہیں خطاب تھا۔ اس خطاب کا انتظام جناب شیراز محمود صاحب نے کیا تھا۔ مانسہرہ کالج میں ٹھیک گیارہ بجے خطاب شروع ہوا جو ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔ حاضرین جن میں طالب علموں اور اساتذہ کے علاوہ دوسرے حضرات کی بھی خاصی تعداد تھی' نے بڑی توجہ اور انہماک سے ڈاکٹر صاحب کا خطاب سنا۔ یہاں یہ ذکر بھی کرتا چلوں کہ امیر محترم کے خطابات اور کیسٹس تو اکثر ہم سنتے رہتے ہیں اور ہر خطاب جامع' مدلل اور مؤثر ہوتا ہے۔ لیکن گورنمنٹ کالج مانسہرہ والا خطاب اپنی علمیت' اپنی اثر انگیزی اور جامعیت کے لحاظ سے انفرادی حیثیت کا حامل تھا۔ راقم کو اس خطاب کو ریکارڈ نہ کر سکنے کا بڑا دکھ ہوا۔ اس خطاب نے مانسہرہ کے علمی اور دینی حلقوں میں فی الواقع بڑا اثر کیا ہے۔ خطاب کے بعد سوالات و جوابات کی نشست ہوئی

کالج سے قافلہ شیراز محمود قریشی صاحب کے گھر روانہ ہوا جہاں ڈاکٹر صاحب و رفقاء کے طعام و قیام کا بندوبست تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد کنگرہ والی مسجد میں فرائض دینی کا جامع تصور' کے موضوع پر خطاب تھا۔ مسجد کے خطیب اور مہتمم صاحب نے بھی تنظیم میں شمولیت کی خواہش کا اظہار کیا۔ البتہ باقاعدہ بیعت ابھی نہیں ہوئی ۲۸؍ اگست کی صبح ڈاکٹر صاحب لاہور سے ساتھ آتے ہوئے ساتھیوں کے ہمراہ مظفر آباد روانہ ہو گئے۔

خالد وحید

مظفر آباد

امیر تنظیم اسلامی کا دورہ سرحد اور آزاد کشمیر جس میں ایبٹ آباد' مانسہرہ' مظفر آباد اور راولا کوٹ شامل تھے ۲۶؍ اگست سے شروع ہوا۔ راقم ۲۲؍ اگست کو انتظامات کے سلسلے میں مظفر آباد بھیجا گیا تاکہ وہاں جا کر مناسب انتظامات کر سکے۔ چنانچہ میں ۲۳؍ اگست کو مظفر آباد پہنچ گیا۔ ۲۴؍ اگست کو جمعہ تھا۔ لہٰذا میں نے شہر کی مشہور مساجد میں نماز جمعہ کے اجتماعات میں امیر تنظیم اسلامی کی آمد کا اعلان کروایا۔ جن میں خاص طور پر سلطانی مسجد کے خطیب مولانا پروفیسر محبوب الرحمٰن کیانی صاحب' سول سیکرٹریٹ کی مسجد کے خطیب مولانا مظفر حسین ندوی صاحب جو کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر بھی ہیں ان کے علاوہ مولانا محمد یونس اثری صاحب جو کہ جامعہ اہل حدیث کے مہتمم' اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن اور جمعیت اہلحدیث کے صدر ہیں۔ ان حضرات نے امیر تنظیم اسلامی کے دورہ کے پروگرام کا اعلان فرمایا اور اثری صاحب نے تو اپنے خطبہ جمعہ کی تقریر میں ڈاکٹر صاحب کا تفصیلی تعارف کرایا جس میں ڈاکٹر صاحب کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔

میں مرکز سے آتے ہوئے اپنے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے پروگرام کے اشتہارات ساتھ لے آیا تھا۔ ان اشتہارات کو شہر میں لگوانے میں میری مدد اثری صاحب کے مدرسہ کے طلباء نے کی۔ ۲۵؍ اگست کو میں نے اور مولانا اثری صاحب نے شہر کے معززین کے علاوہ حکومت آزاد کشمیر کے اعلیٰ حکام سے انفرادی ملاقاتیں کر کے ان کو ڈاکٹر صاحب کے پروگرام سے آگاہ کیا۔

اسی دوران پروگرام میں ایک تبدیلی کا فیصلہ کیا گیا۔ وہ یہ کہ ۲۹؍ اگست کو صبح ساڑھے سات سے نو بجے تک ڈاکٹر صاحب کا ایک خطاب سول سیکرٹریٹ کی مسجد میں ہو۔ اس کے لئے چیف سیکرٹری صاحب سے ایک اجازت نامہ حاصل کیا گیا کہ وہ اس دوران سیکرٹریٹ کے عملے کو ڈیڑھ گھنٹے کی چھٹی دیں کہ وہ اس وقت میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر سن سکیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا عنوان تھا "استحکام پاکستان" اس اجازت نامہ کے حصول کے لئے ہم سے راجہ محمد مقصود خان صاحب ڈپٹی سیکرٹری اور راجہ عبدالخالق صاحب سیکرٹری

سروسز نے بھرپور تعاون کیا جس کے لئے ہم ان کے مشکور ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تقریر میں نہ فرقہ واریت ہوتی ہے نہ تعصب اور نہ ہی کوئی سیاست بلکہ تقریر کا محور صرف قرآنی پیغام ہوتا ہے اس لئے آپ کی تقاریر ہر مکتبۂ فکر کے حضرات کے لئے دعوتِ فکر لئے ہوئے ہوتی ہے۔ چنانچہ جن حضرات نے امیرِ محترم کی اس .... پر تحسین فرمائی۔ ان میں جناب عبداللطیف انصاری صاحب، ناظم زکوٰۃ، جناب چوہدری منیر صاحب پولیٹیکل سیکرٹری برائے صدر آزاد کشمیر، جناب سردار ابراہیم صاحب، سیکرٹری اسلامی نظریاتی کونسل، جناب ذکی ہاشمی صاحب سیشن جج، جناب مولانا مظفر حسین ندوی صاحب، جناب قاری حبیب الرحمٰن صاحب امیر تحریکِ اسلامی مظفر آباد، محمد خان اعوان امیر تحریکِ اسلامی گڑھی دوپٹہ جیسے چیدہ چیدہ حضرات شامل تھے۔ ان حضرات نے اپنے تعاون کا بھی یقین دلایا۔

اسی روز مغرب کی نماز کے بعد مسجد اہلِ حدیث میں امیرِ محترم کا درسِ قرآن تھا۔ مسجد اہلِ حدیث اپنی وسعت کے باوجود بہت ہی تنگ محسوس ہوئی۔ چونکہ ماشاء اللہ شرکاء کی تعداد منتظمین کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ تحریکِ اسلامی کے امیر جناب قاری حبیب الرحمٰن صاحب کے بقول اس شہر میں اس سے بڑا اجتماع اس سے قبل نہیں ہوا تھا۔ لوگ بشکل بینچیں کر بیٹھے اور باہر گلیوں اور گھروں کی چھتوں پر بھی لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا مختصر تعارف مولانا یونس اثری صاحب نے کرایا۔ اس کے بعد امیرِ محترم نے دو گھنٹہ تک "عقیدہ توحید کے عملی تقاضے" کے موضوع پر نہایت جامع اور مدلل تقریر فرمائی ــــ تقریر کے دوران پورے مجمع میں بالکل سکوت طاری تھا۔ لوگوں نے دل جمعی کے ساتھ پوری تقریر سنی۔ ایک شخص بھی دورانِ تقریر اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ خطاب کے فوراً بعد نمازِ عشاء ادا کی گئی۔

دوسرے دن صبح ساڑھے سات بجے سول سیکرٹریٹ کی خوبصورت مسجد میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر تھی۔ کیونکہ تمام مظفر آباد میں سرکاری طور پر ملازمین کو تقریر سننے کی اجازت تھی اس لئے پوری مسجد اور باہر کی سڑک تک لوگ تھے۔ مظفر آباد کے اعلیٰ حکام، سرکاری افسران اور جملہ ملازمین کے علاوہ کثیر تعداد میں شہریوں نے دو گھنٹے تک "استحکامِ پاکستان" کے موضوع پر تقریر سنی۔ اس کے بعد پریس کلب کے ناظم خواجہ عبدالرشید صاحب کی شدید خواہش پر پریس کلب مظفر آباد میں امیرِ محترم نے " ہماری دینی ذمہ داریاں " کے موضوع پر مختصر خطاب فرمایا۔

اس دورۂ مظفر آباد میں تقریباً بیس افراد بیعت کے لئے تیار ہوئے۔ ان حضرات کو امیرِ محترم کی کتب کا مطالعہ کرنے کو کہا گیا تاکہ یہ حضرات شعوری طور پر بیعت کے لئے آمادہ ہوں۔ بعدہ امیرِ محترم رفقاء کے ساتھ راولاکوٹ کے لئے عازمِ سفر ہوئے۔ اس طرح یہ نہایت کامیاب دورہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

محمد یونس قریشی

راولاکوٹ

پروگرام کے مطابق ۲۶ اگست کو قرآن اکیڈمی لاہور میں امیر تنظیم اسلامی کے درسِ قرآن میں شرکت کے بعد رات تقریباً گیارہ بجے پانچ رفقاء بشمول راقم لاہور سے دورۂ سرحدِ آزاد کشمیر کے لئے روانہ ہوئے۔ نماز فجر سے تھوڑی دیر قبل

۔ ونپنڈی پہنچے۔

ناشتے کے بعد جناب شعیب رحیم صاحب اور راقم، جن کے ذمے راولاکوٹ کے پروگرام کے سلسلہ کی ذمہ داری تھی، بذریعہ بس براستہ کہوٹہ آزاد پتن روانہ ہوئے۔ آٹھ گھنٹے کا تھکا دینے والا سفر کر کے ہم راولاکوٹ پہنچے۔ بغیر وقت ضائع کئے سیدھے جامع مسجد راولاکوٹ پہنچے جہاں کے خطیب محترم قاری عبدالرزاق صاحب سے ملاقات کا پروگرام تھا جو ماہنامہ "میثاق" کے مستقل خریدار ہیں۔ معلوم ہوا کہ قاری صاحب صبح سات بجے تشریف لاتے ہیں اور نماز ظہر ادا کرنے کے بعد گھر تشریف لے جاتے ہیں۔ جو راولاکوٹ کے مین بازار سے کافی ہٹ کر نیچے کی جانب واقع ہے۔

نماز عصر سے فارغ ہونے کے بعد ہم دونوں یعنی راقم اور شعیب رحیم قاری صاحب سے ملنے کے لئے ان کے گھر پہنچے۔ شعیب رحیم صاحب تنظیم کے فعال رفقاء میں سے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اندرون ملک متعدد دوروں میں ساتھ جانے کی وجہ سے جو تجربہ انہیں حاصل ہے وہ ہر جگہ میرے کام آیا۔ اور مجھ جیسے سست آدمی کو راہنمائی کرتا رہا۔ قاری عبدالرزاق صاحب سے ملنے پر وہ تمام تھکاوٹ ختم ہو گئی جو ان دشوار گزار راستوں میں چلنے کی وجہ سے ہم جیسے میدانی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو ہو جاتی ہے۔ قاری صاحب، صاحب علم لوگوں میں سے ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں۔ وہاں پڑھاتے بھی رہے ہیں۔ اب تمام صلاحیتیں اور اوقات راولاکوٹ ہی میں صرف ہو رہے ہیں۔ صبح سات بجے سے قبل نماز ظہر تک مسجد کے مدرسہ میں طالب علموں کو دین کی تعلیم دیتے ہیں اور نماز ظہر سے پہلے پندرہ بیس منٹ کا درس حدیث دیتے ہیں۔ جو نہایت ہی پر اثر، پر دلائل اور حوالہ جات سے بھرپور ہوتا ہے۔

یہاں ایک بات عرض کرتا چلوں کہ راولاکوٹ اور ان سے ملحقہ علاقوں میں تمام اجتماعات خواہ دینی ہوں یا سیاسی دوپہر ہی کے وقت ہوتے ہیں۔ کیونکہ ٹھنڈک ہونے اور آبادی کا دور دور تک پھیلے ہونے کی وجہ سے بازار نماز عصر تک بند ہو جاتا ہے۔ اور لوگ گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔

اگلے روز یعنی ۲۷ اگست کو شعیب رحیم اور راقم گورنمنٹ کالج راولاکوٹ کے پرنسپل محترم جناب صادق صاحب سے ملاقات کے لئے روانہ ہوئے۔ جن کی دعوت پر امیر محترم کالج میں خطاب کے لیے تشریف لانے والے تھے اور یہ دورہ دراصل ان ہی کی دعوت پر ترتیب دیا گیا تھا۔ کالج پہنچنے پر معلوم ہوا کہ پرنسپل صاحب کسی کام کی غرض سے کچہری گئے ہوئے ہیں۔ ہم نے موقع غنیمت جانتے ہوئے کالج اور زرعی یونیورسٹی جو ایک ہی احاطہ میں واقع ہیں گھوم پھر کر دیکھا۔ طالب علموں کے امتحانات ہو رہے تھے۔ گھوم پھر کر ہم سٹاف روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ اساتذہ صاحبان کمرۂ امتحانات سے فارغ ہو کر تشریف لانے لگے۔ تعارف ہونے پر جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم تنظیم اسلامی کے کارکن ہیں تو انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ اور ہمیں خوش آمدید کہا۔ خاص طور پر محترم جناب عبدالخالق صاحب (لیکچرار اسلامیات) ہماری آمد سے بہت خوش تھے۔ انہیں ہماری دو دن پہلے آمد سے خاصا اطمینان ہوا کیونکہ ٹیلیفون کال نہ ملنے کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھے۔ اور انہیں امیر تنظیم اسلامی کے قیام کے لئے ریسٹ ہاؤس کا انتظام کرنا تھا۔

پرنسپل صاحب سے ملاقات کچہری ہی میں ہوئی۔ انہوں نے وہاں ہمارا تعارف وکلاء صاحبان سے کروا دیا۔ ان لوگوں نے پرنسپل صاحب کو پبلک جلسہ کے لئے کہا لیکن جب ہم نے بتایا کہ امیر محترم کے پاس وقت نہیں تو وہ لوگ کافی مایوس ہوئے اور آئندہ پروگرام رکھنے پر اصرار کرنے لگے۔ پرنسپل صاحب اور عبدالخالق صاحب حیران تھے اس

لئے کہ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ لوگ ڈاکٹر صاحب کے متعلق اتنا اشتیاق رکھتے ہیں ۔

نماز ظہر پرنسپل صاحب کے ساتھ جامع مسجد ہی میں ادا کی ۔ جامع مسجد کی انتظامیہ کے ارکان بضد تھے کہ ڈاکٹر صاحب کا جمعہ کا خطاب جامع مسجد میں ہو تاکہ گرد و نواح کے لوگ بھی مستفید ہو سکیں ۔ لیکن انہیں بتایا گیا کہ جمعہ کے روز لاہور میں ڈاکٹر صاحب کے دو اجتماعات ہوتے ہیں ۔ یعنی مسجد دارالسلام میں خطاب جمعہ اور مسجد باغ جناح بیرون شاہ عالم گیٹ درس قرآن ۔ جس وجہ سے جمعہ کے روز ان کا ٹھہرنا ممکن نہیں ہے ۔ بالآخر طے یہ پایا کہ اگست ۲۹ تاریخ کو ڈاکٹر صاحب مظفر آباد سے سیدھے مسجد تشریف لائیں گے اور وہیں نماز ظہر کے بعد خطاب فرمائیں ۔ تمام ضلع کے اساتذہ حضرات نے بھی اپنا ایک پروگرام ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مورخہ ۲۹ اگست کو رکھا تھا ۔ جسے وقت کی کمی کی وجہ سے علیحدہ ہی کے پروگرام کے ساتھ شامل کر لیا گیا ۔

۲۸ اگست : پروگرام کے مطابق ہم دونوں (یعنی راقم اور شعیب رحیم) امیر تنظیم کو راولاکوٹ کے طے شدہ پروگرام کی اطلاع دینے کے لئے مظفر آباد روانہ ہوئے ۔ نماز ظہر مسجد الحدیث میں جہاں بعد نماز مغرب ڈاکٹر صاحب کا خطاب ہونا تھا ادا کی ۔ مظفر آباد کے اجتماعات کی روداد آپ نے ہمارے رفیق جناب یونس قریشی صاحب کی مرتب کردہ رپورٹ میں پڑھ لی ہوگی ۔

۲۹ اگست : مظفر آباد سے فارغ ہونے کے بعد تقریباً پونے بارہ بجے ہمارا مختصر سا قافلہ راولاکوٹ کے لئے روانہ ہوا ۔ وہاں پرنسپل صاحب اور اساتذہ کرام ڈاکٹر صاحب کو خوش آمدید کہنے کے لئے کالج میں جمع تھے ۔ صدر آزاد کشمیر و جموں کی راولاکوٹ آمد کی وجہ سے مسجد میں خطاب کا پروگرام بعد نماز عصر تک ملتوی کر دیا گیا تھا ۔ تھوڑی دیر کالج ہی میں باہمی بات چیت ہوتی رہی اور نماز عصر کے وقت امیر محترم کالج کے اساتذہ کرام کے ہمراہ مسجد پہنچے ۔ بعد نماز عصر خطاب شروع ہوا ۔ حاضری انتظامیہ کی توقعات سے بڑھ کر تھی ۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ راولاکوٹ میں ہر اجتماع خواہ دینی ہو یا سیاسی وہاں کے مخصوص موسمی حالات کے باعث دوپہر ہی کے وقت ہوتا ہے ـــــ پاکستان کس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا ؟ اس مقصد کے حصول میں کامیابی یا ناکامی کا استحکام پاکستان سے تعلق اور اس مقصد کے حصول کے لوازم کیا ہیں ؟ ان موضوعات پر امیر تنظیم نے تقریباً سوا گھنٹے تک خطاب کیا ۔ تقریر کے خاتمے پر امیر محترم اور تمام رفقاء ریسٹ ہاؤس چلے گئے ۔ جہاں قیام کا بندوبست تھا ۔

اگلی صبح ۹ بجے امیر محترم کا خطاب گورنمنٹ ڈگری کالج میں تھا ۔ کالج کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس میں طلباء کے علاوہ وکلاء صاحبان، ضلع کے اساتذہ کرام کی ایک بڑی تعداد اور معززین شہر موجود تھے ۔ "ہماری دینی ذمہ داریاں اور ان کی ادائیگی کے لوازم" کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب نے تقریباً دو گھنٹے خطاب کیا ۔ اور قرآن و سنت کی روشنی میں واضح کیا کہ دین کی جانب سے ہم پر پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم خود دین پر عمل کریں ۔ اپنی زندگیوں کو اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات کے سانچے میں ڈھالیں ۔ دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ دین کو پھیلائیں ۔ اس کے مبلغ بن جائیں ۔ اور تیسری ذمہ داری ہے کہ دین کو غالب و نافذ کرنے کی جدوجہد کریں ۔ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے ایک اجتماعی جدوجہد ناگزیر ہے ۔ دین کے غلبے کا طریق بھی یہی ہے اور دینی ذمہ داریوں کو ادا کر کے ہی آخرت میں ہم فوز و فلاح کی امید رکھ سکتے ہیں ۔ حاضرین نے نہایت توجہ سے ڈاکٹر صاحب کی مفصل تقریر کو سنا ۔ خطاب کے بعد پرنسپل صاحب کے کمرے میں معززین

نبر اور اساتذہ کرام سے باہمی گفت و شنید ہوتی رہی۔ دوپہر کے کھانے کا اہتمام بھی وہیں تھا۔
کھانے سے فارغ ہونے کے بعد فوراً ہم نے سفرِ واپسی کی غرض سے راولپنڈی کا رُخ کیا۔ رات کو
امیر محترم کی سیٹ راولپنڈی سے جہاز میں بک تھی۔ محمد افتخار فاج

بقیہ: امیر تنظیم اسلامی کا حالیہ دورہ شمالی امریکہ

ہیں) نے ایک چار روزہ انٹرنیشنل سیمینار ایران کے اسلامی انقلاب کے بارے میں منعقد کیا تھا۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کو مسلم انسٹی ٹیوٹ کے زعماء کے ایرانی انقلاب کے ضمن میں موقف سے خاصا اختلاف ہے۔ اس لئے مناسب خیال کیا گیا کہ اس پس منظر میں ایک مکمل اور صحیح اسلامی انقلاب کے خدوخال کو واضح کیا جائے اور ظاہر ہے کہ ایسا اسوۂ رسول صلعم کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اس تقریر کا اشتہار لندن کے جنگ اخبار میں بھی دیا گیا۔ چنانچہ سامعین کی ایک بڑی تعداد نے اس پروگرام میں ہمہ تن گوش ہو کر ڈاکٹر صاحب کے خیالات کو سنا۔

۱۷ اگست کی شام کو ہم لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ سے پی آئی اے کی پرواز سے روانہ ہو کر اگلے دن دوپہر کے وقت کراچی اور وہاں چند گھنٹے قیام کر کے رات ساڑھے آٹھ بجے واپس بخیریت لاہور پہنچ گئے۔

ٹینٹ اور ترپال
بنانے کا ممتاز ادارہ
ایچ
نظام دین
اینڈ سنز
مرکزی دفتر
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

THE ORIGINAL

پاکستان کی کھلی فضاؤں میں
پاکستان کی
کھلی فضاؤں میں
اذانوں کی گونج
ہماری روحانی میراث
کے آئینہ دار ہے
اور
مشینوں کے چلتے ہوئے پہیوں کا شور
ہماری صنعتی ترقی کا مظہر ہے
ملکی صنعت قوم کی خدمت ہے اور قومی خدمت ایک عبادت ہے
سروس اپنے شوز کی ایکسپورٹ سے زرِ مبادلہ کما کر دن رات
وطنِ عزیز
کی خدمت میں سرگرم عمل ہے
سروس شوز۔ دنیا کے گوشے گوشے میں مقبول

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 33	OCTOBER 1984	No. 10

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر

ڈاکٹر اسرار احمد

۱

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۳۳ | نومبر ۱۹۸۴ء - مطابق صفر المظفر ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۱۱

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون : ۸۵۲۶۱۱

سب آفس : ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

مشمولات

شیخ جمیل الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نحمدہ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم

بفضلہٖ تعالیٰ وعونہٖ "میثاق" بابت صفر المظفر ۱۴۰۵ھ مطابق نومبر ۱۹۸۴ء پیشِ خدمت ہے۔
اس شمارے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کی دو اہم چیزیں شامل ہیں۔ پہلی چیز ڈاکٹر صاحب موصوف کا وہ خطاب ہے جو موصوف نے ۲۴ اگست ۸۴ء کو صلوٰۃ جمعہ سے قبل مسجد دارالسلام میں ارشاد فرمایا تھا ــــ جس میں جہاں ملکی موجودہ حالات پر بلا واسطہ تبصرہ تھا اور اس امر کی نشاندہی بھی کہ بحیثیت مجموعی ہمارے معاشرے میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کے جذبۂ صادق ہی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے شریعت کے واضح نصوص پر بحث و مناقشہ کا لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ وہاں اصل موضوع قصاص و دیت کے مسوّدہ قانون کے متعلق ان اعتراضات کا جواب تھا جو ملک میں "روشن خیال" طبقے خاص طور پر اس طبقے کی خواتین کی طرف سے اٹھایا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے نہایت سادہ لیکن مدلّل انداز سے اس مسئلے کو واضح فرمایا۔ ساتھ ہی اس فرق کی حکمت بھی بیان کر دی ہے جو قتلِ خطاء کی صورت میں مرد و عورت کی دیت کے مابین شریعت نے رکھا ہے۔ جو لوگ بھی شریعت پر عمل کرنے کے ارادے سے معروضی طور پر ان امور پر غور کریں گے تو ان شاء اللہ ان پر شریعت کا حکم اور اس کی حکمت مبرہن ہو جائے گی۔ یہ خطاب بھی کیسٹ سے منتقل کیا گیا ہے ــــ
دوسری چیز جناب اللہ بخش ایاز ملکانوی صاحب جو باب العلوم، کہروڑپکا، ملتان سے متعلق ہیں، کے دو خطوط اور ایک استفسار شائع شدہ "معاصر" الخیر" ملتان بابت جولائی ۸۴ء اور ان سب کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے قلم سے تحریر کردہ جواب شامل ہے۔ جواب کا اصل مفاد یہ ہے کہ علماء کرام خاص طور پر ان علماء عظام کی غلط فہمیاں رفع کی جائیں جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے ارادت و عقیدت کا تعلق رکھتے ہیں۔ نیز ان کو دعوت دی جائے کہ وہ اس کام کی تجدید کی طرف اپنی توجہات کو مرتکز فرمائیں جس کے لئے شیخ الہندؒ اپنی عمر کے آخری حصّے میں نہایت مضطرب اور عملی جدوجہد کے لئے کوشاں تھے ــــ آج اس ملک میں جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ جس طرح ایک طرف "اسلام آرہا ہے" کی گردان ہے اور دوسری طرف منکرات کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور شریعت حقّہ کے ان احکام و شعائر کو بحث و تمحیص اور اعتراض نیز مخالفت کا ہدف

بنایا جارہا ہے جن پر چودہ صدیوں سے امّت کا اجماع رہا ہے، علماء کرام کا دینی فرض ہے کہ وہ دینِ حنیف کی مدافعت کے لئے بنیانِ مرصوص بن کر کھڑے ہوں اور ان فتنوں کے سدِّباب کے لئے اپنی توانائیاں لگا دیں اور اس سلطنتِ خداداد پاکستان میں اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لئے اپنی ذمہ داری ادا فرمائیں۔ اسی میں اس ملک کے لئے بھی خیر ہے اور اسی میں اس کام کے لئے سعی و محنت کرنے والوں کے لئے اخروی فوز و فلاح مضمر ہے۔

———— • ————

ستمبر کے "میثاق" میں محترم ڈاکٹر صاحب کا وہ مکمل خطاب شائع کیا گیا تھا جو موصوف نے ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۹ جون ۱۹۸۴ء کو "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات کے بارے میں علماء کے خدشات" کے موضوع پر ارشاد فرمایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس خطاب پر ادارہ "میثاق" کی جانب سے متعدد علماء کو تبصرہ کی دعوت دی گئی تھی۔ اس ضمن میں جو تبصرے ادارے کو تادمِ تحریر موصول ہوئے ہیں وہ بلا تبصرہ اور بلا ترمیم اس شمارے میں "افکار و آراء" کے مستقل عنوان کے تحت شائع کئے جا رہے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ان تبصروں میں جن آراء کا اظہار کیا گیا ہے، ان سے ادارے کو صد فی صد اتفاق ہو۔ تمام تبصرہ نگار حضرات نے خلوص و اخلاص کے ساتھ اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ میثاق کے قارئینِ کرام کے سامنے یہ بات آجائے کہ ہمارے اصحابِ علم و فضل نے امیرِ محترم کے خطاب سے کیا اثرات قبول کئے ہیں۔

———— • ————

بفضلہٖ تعالیٰ امیرِ محترم کی صحت بہتر ہے۔ بحمد اللہ ان کو ۲۶ ستمبر ہی سے کافی افاقہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۲۸ ستمبر کے جمعہ سے امیرِ محترم کی دعوتی سرگرمیاں مسجد دار السلام کے خطابِ جمعہ سے شروع ہو گئی ہیں اور معمولات کے مطابق بیرونِ لاہور بھی دعوتی دوروں کی تجدید بھی ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ امیرِ محترم کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے تاکہ جو مہلتِ عمران کے لئے اللہ تعالیٰ کے علمِ ازلی میں مقرر ہے اس کا ہر لمحہ خدمتِ دین میں صرف ہو۔

———— • ————

کچھ عرصہ قبل کراچی کے بعض احباب کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ خیال ڈالا کہ پاکستان ٹی وی پر محترم ڈاکٹر صاحب کا تعلیماتِ قرآنی پر مبنی جو ہفتہ وار پروگرام "الھدیٰ" کے ٹائٹل کے تحت جاری تھا جس میں موصوف منتخب نصاب کا درس دے رہے تھے جو ابھی نصف تک پہنچا تھا کہ اسے ٹی وی کے اربابِ اختیار کی جانب سے بند کر دیا گیا اور جس کی بندش پر قریباً دو سال

بیت گئے اور بظاہر احوال اس کی تجدید کی صورت نظر نہیں آتی تو کیوں نہ کراچی میں اس پروگرام کی تکمیل کے لئے کسی شایانِ شان مقام پر "الہدیٰ" کے تسلسل کو جاری رکھنے کی کوشش کی جائے؟ خلوص و اخلاص سے جو کام کیا جاتا ہے اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ اسے کامیاب فرماتا ہے۔ چنانچہ اس نے خاص اپنے فضل سے اس کوشش کو کامیاب فرمایا۔ کراچی کے اعلیٰ ترین ہوٹل "تاج محل" کے مینجنگ ڈائریکٹر جناب منصور فیروز الدین بویجہ صاحب نے اس مقصد کے لئے اپنے ہوٹل کے "موتی محل آڈیٹوریم" کی پیش کش فرمادی۔ نیز چند احباب نے مل جل کر اس پروگرام کے انعقاد کے اخراجات پورا کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ چنانچہ ۲۹ر اکتوبر بروز سوموار بعد نماز مغرب ان شاء اللہ "شاہد الہدیٰ" کے نام سے اس کا آغاز ہو جائے گا اس کا انتظام "بزم احباب الہدیٰ کراچی" کرے گی۔ جس کی کنوینرشپ کیپٹن (ریٹائرڈ) کریم صدیقی صاحب نے قبول فرمالی ہے۔ اللہ نے چاہا تو آئندہ انگریزی ماہ کے آخری سوموار کو بعد نمازِ مغرب اسی مقام پر یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ جن حضرات نے خالصتہً لوجہ اللہ اس کارِ خیر میں تعاون فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ ہی ان کو اس کا اجر و ثواب عطا کرنے والا ہے۔

● ———

ادارہ میثاق کو بعض ناشران کی جانب سے کتب برائے تبصرہ ارسال کی جاتی ہیں۔ لیکن ایک تو کوئی ایسے صاحب میسر نہیں تھے جو ان کتب کے مطالعہ کے لئے وقت نکال کر تبصرہ کر سکتے دوسرے میثاق کے صفحات میں اس کی گنجائش پیدا کرنا بھی نہایت دشوار نظر آرہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جناب محمد رفیق چودھری صاحب ادارۂ حکمتِ قرآن سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ چودھری صاحب صاحبِ علم و فضل ہیں اور اس کام کے اہل ہیں۔ چنانچہ موصوف نے یہ ذمہ داری بھی قبول کر لی ہے کہ وہ آمدہ کتب پر مستقل طور پر تبصرہ کیا کریں گے جو ان شاء اللہ حکمتِ قرآن میں شائع ہوا کرے گا۔ اس کا آغاز ماہ نومبر ۸۴ء کے شمارے سے ہو جائے گا۔ لہٰذا جو ناشر حضرات اپنی کتابوں پر تبصرہ چاہتے ہوں ان سے گذارش ہے کہ وہ آئندہ کتابیں ماہنامہ حکمتِ قرآن ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ کے نام ارسال فرمایا کریں۔

● ———

مضامین کی کثرت اور صفحات کی قلت کے باعث سلسلہ وار مضمون "الہدیٰ" اس شمارے میں شامل نہیں کیا جا رہا۔ آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ اس سلسلے کی بیسویں قسط شائع ہوگی جس سے سورۃ تغابن کے درس کا آغاز ہوگا

بید اللہ التوفیق وعلیہ التکلان

تذکرہ و تبصرہ

—— ہمارے معاشرے کی اصل کمزوری
—— قصاص و دیت کا مسودۂ قانون
—— مسئلہ رجم —— اور دین میں عقل و نقل کا صحیح مقام

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کا مندرجہ بالا موضوعات پر جمعۃ المبارک ۲۴ اگست ۸۴ء کا خطاب قدرے حک و اضافہ کے ساتھ استفادۂ عام کیلئے پیش ہے (ادارہ)

الحمد للہ وکفٰی والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہٖ الذین اصطفٰی
خصوصاً علیٰ افضلہم سید المرسلین خاتم النبیین محمدن الامین
وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین —— اما بعد.

عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ وَعَظَنَا
رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْعِظَةً وَجِلَتْ مِنْهَا
الْقُلُوْبُ وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ، فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ
كَأَنَّمَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا قَالَ أُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى
اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ تَأَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ فَاِنَّهُ
مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرٰى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ
وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ
وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ ـ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی

یفقھوا قولی۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہٗ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہٗ۔ اللھم وفقنا ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم۔

حضرات! گزشتہ جمعہ میں، مَیں نے اپنے ان بعض مشاہدات کا ذکر کیا تھا جو ایک طویل سفر سے واپسی پر مجھے وطنِ عزیز میں ہوئے تھے اور ان کے بارے میں اپنے تأثرات اور اپنے احساسات قدرے تفصیل سے آپ کے سامنے رکھے تھے[1]۔ انہی میں ایک مسئلہ قصاص و دیت کے مسوّدہ قانون سے متعلق ہے جس کے بارے میں ایک CONTROVERSY ہمارے ملک میں عرصہ دراز سے چل رہی تھی ——— واپسی پر معلوم ہوا کہ اس دوران اس CONTROVERSY —— اس مناقشہ میں بہت شدت پیدا ہوئی۔ ایک خاص نقطۂ نظر کے حق میں خواتین کی بعض تنظیموں کی طرف سے احتجاجی جلوس نکالے گئے اور جلسے کئے گئے۔ اخبارات میں کثرت سے مضامین، بیانات اور مراسلات شائع ہوئے۔ جواباً دوسرے نقطۂ نظر کی جانب سے بھی جلسے ہوئے اور اخبارات اور خاص طور پر دینی رسائل میں اپنی رائے کا اسلامی نقطۂ نظر سے مدلّل اظہار رائے کیا گیا۔ اس سے پہلے قانونِ شہادت کی ایک شق کے بارے میں بحث و تمحیص اور مخالفانہ آرا کا ہمارے ملک میں، ہمارے معاشرے میں "روشن خیال" خواتین کی طرف سے اخباری بیانات، مراسلات، مضامین کے اظہار اور احتجاجی جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔ اس کے ضمن میں بہت سے احباب کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا ہوگا۔ اور بعض حضرات نے مختلف مواقع پر مجھ سے اس کے بارے میں استفسار بھی کیا ——— وہ استفسار یہ تھا کہ میں ان موضوعات و معاملات میں کیوں خاموش رہا ہوں اور میں نے ان مسائل پر اپنی کسی تفصیلی رائے کا اظہار کیوں نہیں کیا! حالاں کہ ایک خاص اعتبار سے لوگوں کو توقع تھی کہ شاید ان معاملات میں سب سے زیادہ شد و مد کے ساتھ میری طرف سے اظہارِ خیال ہوگا۔ چوں کہ ایسے معاملات میں نقطۂ نظر کا جو بنیادی اختلاف کارفرما ہے وہ مردوں اور عورتوں کے

---

[1] یہ مکمل تقریر میثاق اکتوبر ۸۴ء میں شائع ہو چکی ہے۔ (مرتب)

مابین کامل مساوات کا نظریہ ہے جو مغرب کی جدید فکر، فلسفہ اور تہذیب و تمدن کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور اسی نظریے سے مرعوب و مسحور ہمارے معاشرے میں ایک فعال طبقہ ایسا ہے جو اگرچہ عددی اعتبار سے یقیناً ایک چھوٹی اقلیت ہے، لیکن فعال اقلیت ہے۔ وہ مساوات مرد و زن کے نظریے پر پورا ایمان رکھتی ہے اور وہی اقلیت ہے جو ایسے تمام مسائل میں جہاں ان کے نظریے کے مطابق عورت کا درجہ کسی نوعیت سے مرد کی برابری کا نہ ہو، سراپا احتجاج بن جاتی ہے پھر اسی اقلیت کے زیادہ تر افراد چونکہ یا تو حکومت کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز ہیں یا بڑی بڑی صنعتوں اور بڑے بڑے تجارتی اداروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس طبقے کے احتجاج، خاص طور پر اس کی خواتین کے احتجاج، مخالفانہ بیانات، مراسلات اور مضامین کو ہمارے ذرائع ابلاغ بڑی نمایاں حیثیت سے COVERAGE دیتے ہیں۔ ان کی تشہیر کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے موضوعات معاشرے میں ایک شدید ردّ و قدح اور بحث و مباحثے کا باعث بن جایا کرتے ہیں۔

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ یہ مساواتِ مرد و زن کا جو اصل مسئلہ ہے، اصل CONTROVERSY ہے جو اصل بنیاد ہے اس کے ضمن میں آج سے قریباً دو سال قبل جو سب سے بڑی CONTROVERSY زور شور سے اٹھی تھی وہ میرے ہی حوالے سے شروع ہوئی تھی۔ یعنی ستر و حجاب اور عورت کے جداگانہ دائرہ کار کا مسئلہ ـــــ اگرچہ وہ مسئلہ میں نے اپنے کسی شعوری ارادے سے، اپنے کسی فیصلے سے یا اپنی کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت شروع نہیں کیا تھا بلکہ ایک نیم دوستانہ اور ایک نیم صحافیانہ گفتگو تھی جس کی رپورٹنگ ہوئی اور اس کے حوالے سے اس وقت ہمارے ملک میں ایک طوفان کھڑا ہوگیا تھا ـــــ تاہم جب یہ مسئلہ چھڑ گیا اور سوال اٹھ کھڑا ہوا تو اس مسئلہ پر میں اسلام کا جو نقطہ نظر سمجھتا ہوں اور ہمارے دین کی جو تعلیمات ہیں، میں نے ان کو بھرپور انداز اور پوری قوت کے ساتھ پیش کیا تھا[1] چنانچہ مساوات مرد و زن کے مسئلے

---

[1] محترم ڈاکٹر صاحب کا اس موضوع پر بسوط و مدلل خطاب "اسلام میں عورت کا مقام" کے عنوان سے مطبوعہ شکل میں موجود ہے (مرتب)

کے بارے میں CONTROVERCY کا وجود رہا تھا اس میں "روشن خیال" طبقے کے نزدیک نمایاں ترین اور متنازعہ ترین شخص میں بن گیا تھا۔

لیکن جب اسی مساوات مرد وزن کے مسئلہ کا ان دو اعتبارات سے یعنی قانون شہ کی ایک شق اور مسودہ قانون قصاص و دیت کے حوالے سے مزید ظہور ہوا تو اس میں خاموش رہا۔ یقیناً یہ ایک سوال ہے جو بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوا گا اور بعض حضرات نے، جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، اس کے بارے میں مجھ سے بار استفسار بھی کیا ۔۔۔ میری اس خاموشی کا جو سبب ہے پہلے میں اسے بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ پھر قصاص و دیت کے مسئلہ پر اپنی رائے پیش کر دوں گا جو ان شاء اللہ کتاب و سنت پر مبنی ہوگی۔ اصل سبب یہ ہے کہ میری تشخیص یہ ہے کہ ہمارے اس معاشرے میں ۔۔ جس کے مختلف اجزائے ترکیبی ہیں، جن کا ایک اجمالی ذکر میں آگے چل کر آج کی گفتگو میں کروں گا ان شاء اللہ، میری تشخیص یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اس معاشرے میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا داعیہ اور ارادہ مضمحل ہو چکا ہے ۔۔۔ اصل شے یہ ہے کہ کسی فرد میں یا قوم میں یہ عزم پیدا ہو جائے کہ اسے مسلمان جینا ہے، مسلمان مرنا ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو اب خود اس کی طرف سے یہ بات ایک بالکل معروضی انداز میں پوچھی جائے گی، تلاش کی جائے گی کہ اسلام کیا کہتا ہے! میں مسلمان رہنا چاہتا ہوں، مسلمان مرنا چاہتا ہوں لہٰذا مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کیا ہے! اللہ کا حکم کیا ہے! اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم کیا ہے! ہمارے ائمہ عظام جنہوں نے اسلام کو سمجھنے میں اپنی پوری پوری زندگیاں کھپا دی ہیں، انہوں نے فلاں مسئلہ میں کیا رائے ظاہر کی ہے! اس وقت ایسے شخص کا رویہ ہوگا اتباع کا ۔۔۔ اس کے اندر ایک جذبہ ہوگا اطاعت کا۔ ایسا شخص کسی مسئلہ کے بارے میں سوال کرے گا تو اس لیے کہ اس کے اپنے اندر ایک داعیہ پیدا ہو چکا ہے کہ اسے معلوم ہو کہ اللہ کا حکم کیا ہے! تاکہ وہ اس پر چلے۔ اسے معلوم ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کیا ہے! تاکہ وہ اس کے مطابق اپنی زندگی کا رخ تبدیل کرے۔ اسے معلوم ہو کہ اہل علم کا کیا کہنا ہے! تاکہ وہ اس کے مطابق عمل کرے ۔۔۔ یہ رویہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ انفرادی یا اجتماعی سطح پر یہ ارادہ وجود میں آ چکا ہو۔ لیکن اگر یہ ارادہ موجود نہ ہو تو مختلف مسائل کے

بارے میں یہ ساری بحثیں کہ قرآن کیا کہتا ہے، رسول کی سنت کیا ہے! امام ابوحنیفہ کا قول کیا ہے! امام شافعی کی رائے کیا ہے! اور امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا موقف کیا ہے! خلفائے اربعہ رضؓ کا تعامل کیا ہے! تابعین و تبع تابعین کا مسلک کیا ہے! محض علمی بن کر رہ جاتی ہیں — یہ علمی CONTROVERSY ہے جس کی عملی اعتبار سے کوئی افادیت نہیں ہے۔

اگر میری یہ تشخیص اور میری یہ رائے صحیح ہو کہ ہمارے معاشرے میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا جذبہ اور داعیہ مضمحل ہے، وہ ارادہ ہی موجود نہیں ہے — اشخاص کے اندر بھی شاذ ہی ایسے افراد ہمارے معاشرے میں ملیں گے۔ جن میں یہ ارادہ قوی ہے اور مضبوط ہے لیکن جب ہم معاشرے کو ایک اکائی کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتبار سے وہ ارادہ — جسے میں "COLLECTIVE WILL" کا نام دیتا ہوں — اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبانی کلامی اسلام کی مدح سرائی کے سوا عملی اعتبار سے اسلام کے حق میں وہ اجتماعی ارادہ، وہ "COLLECTIVE WILL" کہ ہمیں مسلمان جینا ہے، مسلمان مرنا ہے، موجود نہیں ہے — لہٰذا اس صورت حال کے پیش نظر جو فی الواقع در پیش ہے، موجود ہے، اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ اس اجتماعی ارادے کو پیدا کیا جائے۔ "THE WILL TO BE A MUSLIM" — اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ایک انسان پہلے یہ فیصلہ تو کرے اور اسی طریقے سے ایک معاشرہ — جب یہ فیصلہ ہو جائے گا تو اب شریعت کے تمام احکام کو ذہناً بالکلیہ قبول کرنا اور ان پر عمل کرنے کی پیہم اور مخلصانہ سعی و کوشش کرنا بڑا آسان کام ہو جائے گا — اس کی ایک بڑی نمایاں مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور قرآن مجید کے نزول کے اعتبار سے جو حکمت دین ہے، اس کا بھی یہ ایک اہم پہلو ہے کہ ابتدا میں احکام نہیں دیئے گئے۔ شریعت کے احکام اور حلال و حرام کے احکام — کچھ نہیں دیئے گئے۔ بارہ تیرہ برس جو مکہ مکرمہ کے ہیں، ان میں اس ارادے کو تقویت دی گئی۔ اللہ کی توحید پر، رسول کی رسالت پر اور وقوعِ قیامت و آخرت پر ایمان پیدا کیا گیا۔ یقین پیدا کیا گیا۔ اس ایمان و ایقان کے نتیجے میں ارادہ ابھر کر سامنے آیا اور عمل کا ایک شدید داعیہ اہل ایمان کے قلوب میں موجزن ہو گیا۔ گویا کہ ایک STRONGEST COLLECTIVE WILL وجود میں آگئی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت کے بعد جب اہلِ ایمان کا اپنا ایک معاشرہ وجود میں آگیا تو انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ایمان کے مقتضیات کے مطابق بسر کرنے کی اس معاشرے میں شدید طلب اور پیاس پیدا ہوگئی۔ ایک URGE پوری قوت سے ابھر آیا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مدنی سورتوں میں سب سے پہلی اور سب سے طویل صورت سورۃ البقرہ ہے اس میں کئی جگہ بہت سے احکام کا ذکر اس طرح ملتا ہے "یَسْـَٔلُوْنَكَ" اے نبی یہ آپ سے پوچھ رہے ہیں — جیسے یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ۔ "اے نبی! یہ آپ سے پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں"۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ "اے نبی! یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کتنا خرچ کریں! یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ۔ "اے نبی! یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا چیزیں ان کے لیے حلال ہیں!"۔ پس معلوم ہوا کہ جب وہ COLLECTIVE WILL پیدا ہوگئی تو خود بخود سوال پیدا ہوئے کہ ہمیں بتایا جائے کہ زندگی کے مختلف معاملات اور مقتضیات میں ہم کیا کریں! کون سا رویّہ اختیار کریں! — یہ داعیہ اتنی شدت سے ابھرا کہ شریعت کے احکام معلوم کرنے کے بارے میں جستجو، اصرار اور URGE پیدا ہوگیا — تو جب یہ COLLECTIVE WILL پیدا ہوگئی۔ یہ URGE اچھی طرح ابھر آیا تو اس کے بعد احکام دیئے گئے اور جیسے جیسے احکام نازل ہوتے گئے تو معاشرہ گویا پہلے سے تیار تھا اور وہ قبول کرتا چلا گیا اور احکام کی تنفیذ ہوتی چلی گئی — ہم کو اس معاشرے میں یہ بات قطعی نظر نہیں آتی کہ کسی مسئلہ میں کوئی CONTROVERSY پیدا ہوگئی ہو۔ بلکہ سوائے سود کی حرمت کے حکم کے اور کسی حکم کے متعلق ہمیں اس دور میں یہ بات بھی نظر نہیں آتی کہ کوئی عقلی دلیل بھی طلب کی گئی ہو — سود کی حرمت کے حکم پر یہ عقلی اعتراض وارد کیا گیا کہ وہ یہ کہتے ہیں، اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا — بیع میں بھی تو کچھ منفعت ہو جاتی ہے کچھ نفع ہو جاتا ہے۔ سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچ دی تو دس بچ گئے تو اگر سو روپے کسی کو قرض دے کر اس سے ایک سو دس لے لیے تو آخر اس میں فرق کیا ہے[1]! —————

---

[1] اس کے جواب میں کوئی عقلی دلیل دینے کے بجائے فرمایا گیا کہ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا "کہ اللہ نے بیع کو حلال اور ربا کو حرام قرار دیا ہے" یعنی ایک بندۂ مومن کے لیے تعمیل حکم کے واسطے یہ دلیل کافی ہے کہ حلال و حرام قرار دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے جس پر تم ایمان لانے کے مدعی ہو۔ (مرتب)

اس کے سوا ہمیں نظر نہیں آتا کہ کچھ CONTROVERSIES اٹھی ہوں اور عقلی استدلالات یا عقلی اشکالات پیش اور وارد کئے گئے ہوں اور بحث و تمحیص کے دروازے کھل گئے ہوں۔ اس دور میں جس طریقے سے "دانشوروں" اور علماء کے مابین دینی مسائل کے بارے میں بڑی ہی ونگ آمیزیوں اور حاشیہ آرائیوں کے ساتھ رنگا رنگ اختلافی مضامین چھپتے اور اخبارات کی زینت بنتے ہیں، اس قبیل کی کسی شے کا اس دور میں کوئی سُراغ نہیں ملتا — اس لیے کہ پہلے وہ WILL پیدا کر دی گئی، وہ ارادہ پیدا کر دیا گیا تھا جس کے بعد اب جو بھی احکام دیئے گئے تو "سرِ تسلیم خم ہے" والا رویہ اختیار کیا گیا اور ان کو اس طور سے قبول کیا گیا کہ جیسے وہ پہلے ہی سے منتظر تھے کہ وہ حکم آئے اور وہ قبول کریں اور فوراً اس پر عمل شروع کر دیں ۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں کم سے کم اجتماعی سطح پر وہ COLLECTIVE WILL موجود نہیں ہے — ہے بھی تو وہ بہت مضمحل ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے! اس کو بھی سمجھ لیجئے۔ اصل میں مغرب و مشرق کا جو تصادم ہے وہ جدید خدا ناآشنا تہذیب اور فکر جو یورپ سے آیا تھا — اس تصادم کی تاریخ ویسے تو قریباً دو سو برس کی تاریخ ہے — جیسے ہی یورپ کے ممالک سے انگریز آئے، فرانسیسی آئے اور ولندیزی آئے لیکن ہوتے ہوتے انگریز کے سوا دوسری اقوام کا عمل دخل ختم ہو گیا یا نہ ہونے کے برابر رہ گیا، صرف انگریز قوم کا برِ صغیر پاک و ہند پر پورا تسلط قائم ہو گیا اور پورا ملک براہِ راست اس کی سیاسی غلامی میں چلا گیا — جیسے ہی یہ معاملہ ہوا، ویسے ہی تصادم شروع ہو گیا۔ بالکل نئی تہذیب آئی تھی۔ مادہ پرستانہ تہذیب — اس تہذیب میں چمک دمک تھی۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

لیکن یہ تو ایک بالغ نظر شخص ہی دیکھ سکتا تھا کہ یہ جھوٹے نگ ہیں۔ ہمارے یہاں ایک خاص طبقے نے اس تہذیب پر لبیک کہا اور اسے اختیار کیا — یہ بھی بلا سبب نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ ایک حکمران قوم کی تہذیب تھی۔ یہ ایک محکوم قوم کے افراد تھے۔ محکوم قوموں میں حاکم قوم سے مرعوبیت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمارے

ایک طبقے نے اس تہذیب کو، اس کے اصول کو، اس کے مبادی کو، اس کے مظاہر کو، اور اس کے فکر و فلسفہ کو ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ قبول کرنا شروع کیا۔ پھر یہ کہ یہ مظہر (PHENOMENON) مشترکہ طور پر آپ کو ہر محکوم قوم میں نظر آئے گا کہ محکوم قوم میں سے جو طبقہ حکمران قوم کی تہذیب کو آگے بڑھ کر قبول کرتا ہے، اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگنے اور اُسی سانچے میں ڈھالنے کی شعوری کوشش کرتا ہے تو وہ طبقہ حاکم قوم کے قریب ہو جاتا ہے اس سے مفادات حاصل کرتا ہے۔ اس کی حکومت کی مشین میں پرزہ بنتا ہے اس سے وفاداری کا معاملہ کرتا ہے۔ اس سے خطابات حاصل کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس وقت دنیوی ترقی کے لیے بھی راستہ سب سے زیادہ منفعت بخش ہوتا ہے۔ چوں کہ اس طبقے کے لیے معیشت کے دروازے کشادہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ دُور رہیں گے، پیچھے رہیں گے، قریب نہیں آئیں گے وہ معاشی دوڑ میں بھی پیچھے رہ جائیں گے اور ان کا SOCIAL STATUS بھی کم رہ جائے گا۔

نتیجتاً ہمارے یہاں بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جس نے اپنے آپ کو بالکلیہ انگریزی تہذیب میں رنگ لیا۔ اور ہمارے ایک بہت بڑے لیڈر کے قول کے مطابق اس طبقہ کا طرزِ عمل یہ ہو گیا کہ چمڑی کی رنگت کے سوا ہمیں ہر اعتبار سے "انگریز" بن جانا ہے۔ یہ گویا کہ OBJECTIVE تھا جو اس دور میں دیا گیا تھا۔ یہ سر سید احمد خاں کا قول ہے جو میں آپ کو سنا رہا ہوں کہ "سوائے چمڑی کی رنگت کے"۔ اس لیے کہ وہ تو اختیار سے باہر کی شے ہے اُسے بدلا نہیں جا سکتا۔ "مسلمانوں کو چاہیے کہ انگریز بن جائیں اور انگریزی تہذیب اختیار کر لیں[1]"۔ تو یہ ایک طبقہ تھا جو اگرچہ ایک محدود طبقہ تھا۔ بالکل اقلیت میں تھا، تعداد کے اعتبار سے بہت قلیل تھا۔ لیکن چوں کہ حکمران طاقت کے قریب تر یہی طبقہ ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا اس کا نفوذ اور اثر ہمارے معاشرے میں مسلسل بڑھتا چلا گیا۔ تو یہ تصادم ہمارے یہاں اس وقت سے شروع ہو چکا تھا۔

لیکن آج میں چاہتا ہوں کہ ایک خاص بات آپ نوٹ کر لیں۔ وہ یہ کہ ہمارے معاشرے نے مغربی تہذیب کا بحیثیت مجموعی عمل دخل انگریز کی براہِ راست سیاسی غلامی کے

---

[1] سر سید احمد خاں کی جو تصاویر ملتی ہیں اس میں ترکی ٹوپی کے سوا وہ پورے کے پورے انگریزی لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں (مرتب)

دور میں اتنا نہیں ہوا، جتنا کہ آزادی کے بعد ہوا ہے۔ یہ جو سینتیس ۳۷ برس ہم نے آزادی کے بتائے ہیں ان میں یہ عمل دخل بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ بہت وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ اس لیے کہ جیساکہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اسوقت صورتحال یہ تھی کہ وہ جو ایک محدود طبقہ تھا اور اس کا انگریزی حکومت سے بڑا قریبی تعلق تھا لہذا ہمارے عوام ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ عوام الناس کو اس طبقے سے عموماً نفرت تھی[۱]۔ دوسرے یہ کہ محکوم قوم کے جذبات حکمران قوم کے لیے خیرسگالی اور پسندیدگی کے نہیں ہوا کرتے۔ مزید برآں عالم اسلام کو انگریزی حکومت کی وجہ سے جو نقصان پہنچا اس کی وجہ سے بھی بحیثیت مجموعی ہماری قوم کے اندر انگریز اور انگریزی تہذیب سے واضح نفرت برقرار رہی۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ اُس وقت اس جدید تہذیب کے ساتھ کوئی بہت ہی قربت والا رابطہ (CLOSE CONTACT) نہیں تھا۔ اس دور میں آمدورفت اور رسل و رسائل کے ذرائع اتنے آسان نہیں تھے۔ انتہائی قلیل، معدودے چند لوگ ہوتے تھے جو ولایت جاکر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ آٹے میں نمک کی نسبت سے بھی شاید کم۔ وہ آتے تھے مغربی تہذیب میں پورے رنگے رنگائے۔ ولایت پلٹ لوگ تو یقیناً اسی تہذیب کو بالکلیہ اختیار کر کے آتے تھے۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ لیکن تعداد کے اعتبار سے وہ اتنے کم ہوتے تھے کہ اگر مجموعی لحاظ سے ہم جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اُس دور میں ان کا معاشرے پر بہت کم اثر تھا۔ بلکہ عوام الناس ان کو طنزیہ انداز میں پھبتی کے طور پر "لندن پلٹ" کہا کرتے تھے۔

یہ معاملہ برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے بعد ہوا ہے کہ ایک طرف تو اب جو ہمارے حکمران ہیں، وہ ہم ہی میں سے ہیں۔ لیکن وہ کلیتہً اُسی تہذیب کے پروردہ ہیں اسی تہذیب میں رنگے ہوئے ہیں، اسی تہذیب کے دلدادہ ہیں اور اسی کو انہوں نے عملاً اختیار کئے رکھا ہے اور ہمارے سرکاری محکمہ جات کے عمّال یعنی (BUREAUCRACY) ہے یا ہماری ملٹری کی جو TOP CLASS ہے۔ یہ سب ایک ہی ہیں۔ یہ سب ایک ہی طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں۔ یہی اونچا طبقہ بہت سے اعتبارات سے ہمارے یہاں انگریز کا وارث بنا ہے۔ ان میں SIR رہے ہیں۔ اب ان کی اولاد ہے۔ خان صاحبوں

---

[۱] اس طبقے کے افراد کو ٹوڈی کہا جاتا تھا۔ (مرتب)

اور خان بہادروں کی نسل بھی چل رہی ہے ان سب کی اکثریت اُسی انگریزی تہذیب کے رنگ میں مزید رنگ گئی ہے۔ جو ان کے آباؤ اجداد نے اختیار کی تھی ـــ انگریزی حکومت کے دور میں جو طبقہ انگریز سے قریب تر تھا، وہی طبقہ یا اُسی کی اولاد ہے جو اکثر و بیشتر ہماری حکومتی اور قومی سطح پر جو اجتماعی زندگی ہے اُس میں سب سے زیادہ اونچے مناصب پر فائز اور سب سے زیادہ فعال یہی عنصر ہے اب چوں کہ یہ لوگ ہم ہی میں سے ہیں تو اُس وقت انگریزی تہذیب کے فروغ اور اثر و نفوذ میں کم از کم وہ نفرت روک اور آڑ بنی ہوئی تھی جو حاکم اور محکوم قوم کے مابین طبعاً موجود ہوتی ہے ـــ اب وہ رکاوٹ دور ہو گئی۔ نفرت کا وہ BARRIER بھی راستہ میں سے ہٹ گیا۔ اب تو وہ ہم میں سے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے افراد ہیں "THEY ARE OUR OWN KITH AND KIN" ان میں سے کسی کے نام کے ساتھ سید لکھا ہوا ہے، وہ سیّد زادہ ہے، چاہے وہ فکری اور عملی اعتبار سے سرتاپا مغربی تہذیب میں غرق ہو چکا ہو، لیکن بہرحال نسلی اعتبار سے وہ سیّد ہے۔ کوئی ہے جو خلفائے راشدین رضی یا دیگر اصحابِ رسول علیٰ صاحبہم الصلوٰۃ والسلام و رضوان اللہ علیہم اور اہل بیت رحمہم اللہ کے اسمائے گرامی اور خاندانوں سے خود کو منسوب کرتا ہے اس لئے ناموں کے ساتھ، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی، حسنی، حسینی، زیدی، جعفری وغیرہم کے لاحقے ہوتے ہیں۔ لیکن فکر و عمل کے اعتبار سے ان کا نام کے سوا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اِلاّ ماشاءاللہ۔ یہ لوگ مغربی فکر اور مغربی تہذیب کے عملاً بھی خاموش داعی اور نقیب ہوتے ہیں اور قولاً بھی۔ پھر اسی طبقے سے عموماً اور اکثر وہ لوگ ابھرتے ہیں جو ہمارے یہاں "دانشور" کہلاتے ہیں۔ تو اس طرح حاکم قوم کی تہذیب سے اس کی فکر سے محکوم قوم کو جو طبعاً نفرت ہوتی ہے، وہ BARRIER اب ہمارے معاشرے میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا انگریزی حکومت کے محکمہ جات کے جو وارث بنے ہیں ان کا معاملہ وہ ہے جو ہمارے ہاں بطور محاورہ کہا جاتا ہے کہ "شاہ سے بڑھ کر شاہ کا خیرخواہ" تو یہ طبقہ درحقیقت وہ ہے جو انگریزی دور میں انگریز سے بڑھ کر مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا۔ آزادی کے بعد اس میں کوئی کمی یا اصلاح کے عمل کے بجائے وہ اور ان کی اولاد اسی میں پختہ تر ہوتی چلی گئی۔ اِلاّ ماشاءاللہ۔

دوسرا عملی معاملہ یہ ہوا کہ ذرائعِ رسل و رسائل آسان ہو گئے، آمد و رفت میں سہولت پیدا ہو گئی ہے آزادی کے بعد سے ہمارے لوگ کثیر تعداد میں یورپ اور امریکہ گئے ہیں اور وہاں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں تو تعلیم کے ساتھ وہ وہاں کے افکار اور تہذیبی اقدار کے جراثیم بھی ساتھ لے کر آئے[1]۔ ظاہر بات ہے کہ ان جراثیم کو ہمارے معاشرے میں پھیلنا ہی پھیلنا ہے اور ان حضرات کے بود و باش، وضع قطع اور خیالات و رجحانات، میلانات و تاثرات کا اثر ہمارے معاشرے پر پڑنا ہی پڑنا تھا۔ لہٰذا اصل تصادم اس وقت ہو رہا ہے۔ اگرچہ ہم مغرب کی براہِ راست غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں۔ لیکن مغرب کے افکار اور اس کی تہذیبی اقدار کا غلبہ اس وقت زیادہ گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کے اثرات اب زیادہ نمایاں اور ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے اب وہ تصادم اور گہرا اور شدید ہو گیا ہے۔ یہ ہیں وہ اسباب جن کے پیشِ نظر آپ جب اجتماعی سطح پر اپنے معاشرے کا جائزہ لیں گے تو آپ اس نتیجہ تک پہنچ جائیں گے کہ وہ " COLLECTIVE WILL TO BE A MUSLIM " پہلے کے مقابلے میں مضمحل تر ہو چکی ہے۔ پہلے سے زیادہ کمزور ہو چکی ہے۔ اس لیے کہ وہ طبقہ بہرحال ہمارے معاشرے میں زیادہ مؤثر طبقہ ہے۔ اسے اپنے مرتبے، اپنے مقام اور اپنی حیثیت کی وجہ سے معاشرے پر اثر انداز ہونے کے مواقع زیادہ حاصل ہیں۔

تیسرا عملی معاملہ یہ ہوا کہ ذرائعِ ابلاغ نے نہایت وسعت حاصل کر لی۔ پچھلے دور میں اگر کوئی روزنامہ یا ماہنامہ یا ہفت روزہ دس پندرہ ہزار کی تعداد میں شائع ہوتا تھا تو وہ کثیر الاشاعت کہلاتا تھا۔ اب اخبارات و رسائل لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں بعض ایک ہی وقت میں چند دوسرے بڑے شہروں سے بھی شائع ہوتے ہیں۔ پھر ان کی تعداد بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ اب اکثر روزناموں، ماہناموں، خاص طور پر ڈائجسٹوں کی تعدادِ اشاعت لاکھوں سے متجاوز ہے۔ ڈائجسٹوں کی اتنی کثرت ہے کہ

---

[1] جناب اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا بڑا پیارا شعر ہے جو اس صورتِ حال پر صادق آتا ہے۔

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

(مرتب)

ان کے ناموں کا شمار اچھا خاصا مشکل کام ہے - ابلاغ کے اس ذریعہ (MEDIA) پر بھی اسی مغربی تہذیب و افکار سے مرعوب ذہنیت رکھنے والوں کی اکثریت قابض ہے۔ پھر اخبارات و رسائل کی اشاعت اب باقاعدہ ایک انڈسٹری بن گئی ہے - ان کے مابین مسابقت کی دوڑ لگی ہوئی ہے لہٰذا ہر ایک اس کوشش میں مصروف نظر آتا ہے - کہ عوام الناس کو لذت کوشی اور اباحیت پسندی میں مزید مبتلا کر کے زیادہ سے زیادہ مالی منفعت حاصل کرے۔ ان کی بلا سے کہ ہماری قوم کے افراد میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کے اجتماعی ارادے کو ضعف پہنچتا ہے تو پہنچا کرے - وہ مزید مضمحل ہوتا ہے تو ہوا کرے - بلکہ یہ بات منفعت کے لحاظ سے ان کے لیے مفید ہے - لہٰذا ان کو اس کی قطعی پرواہ نہیں ہے کہ قوم کس پستی میں گر رہی ہے - یہی حال اُن ذرائع ابلاغ کا ہے جو مکمل طور پر حکومت کے زیر انصرام و انتظام ہیں - یعنی ریڈیو اور ٹیلیویژن ـــ ان میں ڈراموں، راگ اور موسیقی، رنگ ترنگ' اور اسی قبیل کے تفریحی پروگراموں کی پذیرائی ہوتی ہے جو SUGER COATED طریق پر معاشرے میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کے اجتماعی ارادے میں ضعف کا زہر پہنچا رہے ہیں ـــ میں تو ٹی وی دیکھتا نہیں ـــ الحمد للہ میرے یہاں ٹی وی کا گزر ہی نہیں ہوا ہے - لیکن دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ رہی سہی کسر وہ اشتہارات پوری کر دیتے ہیں جو کثرت کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں - پھر جو مذہبی پروگرام ہوتے ہیں وہ برائے بیت ہوتے ہیں اور یہ دکھانے کے لیے ہوتے ہیں کہ ٹی وی پر دگراموں میں اتنے گھنٹے مذہبی پروگراموں کے لیے مختص ہیں - اس میں ایسے دینی پروگراموں کی رسائی مشکل ہے جن سے قوم کو ایسا مثبت پیغام مل سکے جس سے اس میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا اجتماعی داعیہ پیدا ہو - پھر ان ذرائع ابلاغ پر مؤثر ترین گرفت اور HOLD اسی طبقے کی اکثریت کا ہے، جن کے اذہان و قلوب پر خدا ناآشنا مغربی افکار اور مغربی تہذیب کی بالا دستی نقش و ثبت ہے - اس کی اکثریت کا اسلام سے محض مسلمانوں کے سے نام کے سوا شاید ہی کوئی عملی تعلق ہو تو ہو ـــ یہ ہیں وہ اسباب اور یہ ہے اطراف و جوانب سے ہمارے معاشرے میں یلغار جس کی وجہ سے اگر اجتماعی سطح پر جائزہ لیں گے تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ " COLLECTIVE WILL TO BE A MUSLIM " وہ پہلے کے مقابلے میں مضمحل تر ہو چکی ہے، کمزور ہو چکی ہے اور یہ عمل مسلسل جاری ہے - لہٰذا

نتیجہ یہ نکلا کہ فی الوقت ہمارا معاشرہ مغربی تہذیب، مغربی اقدار، مغربی تمدن، مغربی بود و باش اور مغربی طرزِ فکر کی زیادہ گرفت میں ہے اس کی بہ نسبت جب کہ آج سے چالیس برس قبل ایک مغربی قوم ہم پر براہِ راست حکمرانی کر رہی تھی۔

جب تک وہ اجتماعی ارادہ وہ "COLLECTIVE WILL" پیدا نہیں ہو جائے گی اور یہ بحثیں چھڑ جائیں گی تو وہی کچھ ہوگا جو ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ یہ تو ایک علمی بحث ہے اور چوں کہ اذہان تیار نہیں، دلوں میں حقیقی ایمان کی جوت موجود ہی نہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ اور وہ آمادگی دل میں پیدا ہی نہیں ہوئی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ فلاں مسئلے میں اسلام کا حکم کیا ہے۔ تاکہ اس پر عمل کریں۔ لہٰذا لاحاصل بحث و مباحثہ اور CONTROVERSY کے علاوہ کوئی اور نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔[1]

اب یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس COLLECTIVE WILL کو اسلام کی طرف لانے کا طریقہ کیا ہے! دوسرے یہ کہ اس کا ظہور کس طرح سے ہوتا ہے! یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ کسی معاشرے میں COLLECTIVE WILL اسلام کے حق میں پیدا ہو چکی ہے، اسلام کے رُخ کی طرف آ چکی ہے! ان دونوں سوالات پر تفصیلی گفتگو تو ان شاء اللہ میں آئندہ کسی جمعہ میں کروں گا۔ اس وقت اجمالاً عرض کر رہا ہوں کہ نظری طور پر اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انتخابات کا عمل کسی ملک میں جاری ہو اور صحیح نہج پر جاری ہو۔ یہ نہ ہو کہ جس طرح گاڑی KNOCKING کرتی ہوئی قدم قدم پر رکتی ہو، ایک انتخاب ہو یا ہونے والا ہو تو ایک ہنگامہ بپا ہو جائے جس کے نتیجے میں فوج TAKE OVER کر لے۔ پھر کبھی نئے اسلوب اور نئے اصولوں پر انتخابات کا ڈھونگ رچایا جائے اور پھر اس کی وجہ سے کوئی ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہو۔ پہلے کی جگہ دوسرا مارشل لا آ جائے اور فوج کو تسلسل یا وقفے وقفے سے اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے کا موقع اور جواز ملتا رہے۔ ایسا نہیں — بلکہ اگر کسی ملک میں واقعتاً

---

[1] مسلمان جیسے، مسلمان مرنے کے اجتماعی ارادے کو پیدا کیے بغیر ان مسائل پر بحث و تمحیص بالکل ایسے ہی ہے جیسے گھوڑے کو گاڑی کے پیچھے باندھ دیا جائے لہٰذا گاڑی آگے چلے تو کیسے چلے! (مرتب)

انتخابی عمل جاری رہے تو اس مسلسل انتخابی عمل کے ذریعے بھی COLLECTIVE WILL کا اظہار ہو سکتا ہے۔ اس کا ظہور ہو سکتا ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا چلا جائے گا کہ لوگوں کا رُخ کس طرف ہے! وہ کیا چاہتے ہیں! ان کا رجحان کس طرف ہے! میرے نزدیک نظری طور پر یہ بھی ایک طریقہ ہے لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ ہمارے ملک کے موجودہ خاص حالات میں یہ طریقہ قریباً ناممکن العمل معاملہ بن گیا ہے۔ اس کی تفصیل جیسا کہ میں نے عرض کیا' آئندہ کبھی عرض کروں گا۔

اب اس کے بعد دوسرا طریقہ رہ جاتا ہے' جسے آجکل "انقلاب" کا نام دیا جارہا ہے ۔۔ مجھے معلوم ہوا کہ میری عدم موجودگی میں جب کہ میں بیرونِ ملک گیا ہوا تھا۔ اسی شہرِ لاہور کے ایک اعلیٰ ترین ہوٹل میں ایک بڑی آن بان اور بڑی شان و شوکت کیساتھ ایک کانفرنس ہوئی ہے ۔۔ اگرچہ تاحال پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کس نے منعقد کی تھی! اس کے داعی کون لوگ تھے! لیکن معلوم ہوا ہے کہ اس کانفرنس میں بڑی دھواں دھار تقاریر ہوئی ہیں کہ یہاں ایران کی طرح کا انقلاب آنا چاہیے اور ہمیں اس میدان میں ایران کی قیادت کو قبول کرلینا چاہیے ۔۔ اس موضوع پر کہ "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے"! میں انشاء اللہ آئندہ جمعہ کو کچھ عرض کروں گا۔ اس وقت میں اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتا لیکن یہ عرض ضرور کروں گا کہ معاشرے کی COLLECTIVE WILL کے ظہور کا دوسرا طریقہ یقیناً انقلابی طریقہ ہے۔

اب سوال پیدا ہوگا کہ انقلابی طریقہ سے مراد کیا ہے! وہ یہ کہ اگرچہ ایک نقطۂ نظر اور ایک IDEOLOGY کے حامل اور قائل لوگ عددی اعتبار سے اقلیت میں ہوں۔ لیکن وہ دعوت و تبلیغ سے' اپنی محنت سے' اپنے ایثار سے' اپنی قربانیوں سے' اپنی تنظیم سے مشقت جھیل کر' مصائب برداشت کرکے وہ مؤثر اور EFFECTIVE ہونے کے اعتبار سے ایک اکثریت کی شکل اختیار کرلیتے ہیں یہ لوگ EFFECTIVE MAJORITY ہو جایا کرتے ہیں اگرچہ NUMERICALLY وہ ایک اقلیت ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی جدّوجہد اپنے ایثار و قربانی' اپنی استقامت و مصابرت اور اپنے موقف پر ایمان و ایقان کی طاقت سے کامیاب ہوتے ہیں اور اپنی پسند کا نظام قائم کر دیتے ہیں۔ یہ انقلابی طریقہ ہے۔ لہٰذا کسی بھی COLLECTIVE WILL

اگلے صفحے پر

ے ظہور کے نظری طور پر یہ دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر انتخابی عمل صحیح انداز اور صحت مند اصولوں پر جاری ہے تو وہ بھی ایک INDEX ہے' ایک اشاریہ ہے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں! لوگوں کا رُخ کس طرف ہے! لوگوں کے رجحانات و میلانات کیا ہیں! اور اگر یہ صورتِ حال نہیں ہے تو ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ انقلابی راستہ ہے۔ بہرحال اس کے بارے میں اگر اللہ کو منظور ہوا تو گفتگو کسی آئندہ صحبت میں ہوگی۔

اس وقت ہمارے یہاں ان دو میں سے کسی بھی ذریعے سے اسلام کے حق میں COLLECTIVE WILL کا ظہور نہیں ہوا۔ بلکہ بالفعل صورتِ حال یہ ہے کہ ایک مارشل لا گورنمنٹ ہے۔ اس کی LEGITIMACY اس کا قانونی استحقاق ہی متنازعہ فیہ ہے۔ QUESTIONABLE ہے کہ یہ حکومت ہے تو کیوں ہے! آئی تھی تو کس دلیل سے آئی تھی! کس وعدہ کے تحت آئی تھی! اور اس حکومت کو اس وقت کی سپریم کورٹ نے تسلیم کیا تھا تو کن کڑی شرائط کے ساتھ کیا تھا! کیا کیا حد بندیاں اس پر عائد کی تھیں! لیکن یہ حکومت ہے کہ جس نے اپنے تسلسل کے لیے وجہ جواز یہ قرار دی ہے کہ ہم نے اس ملک میں اسلام قائم و نافذ کرنا ہے لہٰذا اس نے اس وجہ جواز کو ثابت کرنے کے لیے کچھ نیم دلانہ قسم کے اسلام کے لیے اقدامات کیئے ہیں' جن کی وجہ سے قیل و قال' بحث و مباحثہ اور CONTROVERSIES ابھر آئی ہیں۔ اس کے سوا اسلام کی طرف کوئی مثبت (POSITIVE) پیش رفت نہیں ہو رہی۔ بلکہ ہر معاملے میں نظر یہ آرہا ہے کہ دونوں نظریات کے حاملین کو شاید یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور دوسری طرف والوں کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ آپ مطمئن رہیں' میں کٹر آدمی نہیں ہوں۔ ایک طرف علماء کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ میں یہاں اسلام لانا چاہتا ہوں۔ دیکھو تو میری نماز' میرا روزہ' ٹوپی مصلّٰی کا میرے ساتھ رہنا۔ یہ دین نہیں تو اور

لہ (سابقہ صفحے سے) كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ یقیناً اللہ صبر کرنے' مصائب برداشت کرنے والوں کے ساتھ ہے" (البقرہ) (مرتب)

کیا ہے۔! میرا پختہ عزم ہے کہ یہاں مضبوط بنیادوں پر اسلام کو نافذ کروں۔ دوسری طرف یہ ہے کہ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو جو اسلامی نقطۂ نظر سے کسی بھی اکرام کے بہرحال مستحق نہیں ہیں، یہ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ میں اتنا کٹر نہیں ہوں آپ کو مجھ سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ پھر ان کی جس طرح حکومت کے ایک ایوان میں پذیرائی ہوئی ہے اور صدر مملکت صاحب نے جن کی منصبی مصروفیات کا سب کو علم ہے، ان ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے ساتھ تبادلۂ خیال میں اخباری رپورٹ کے مطابق قریباً ۵ ساعات گھنٹے گزارے ہیں۔ پھر جس گرمجوشی کے ساتھ ملک کی منصب کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ مقتدر اور بلند و بالا شخصیت نے اس طائفے کا استقبال کیا ہے، وہ ان لوگوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے جو اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس REGENE کے ہاتھوں پاکستان میں اسلام آرہا ہے[1]

یہ جو تضادات ہیں، یہ جو دوعملی ہے، یہ جو دورُخاپن ہے اور یہ جو دوطرفہ عمل ہے، اُس نے ایک طرف تمام مخلص محبّ دین اور محبّ پاکستان عناصر میں شدید مایوسی پیدا کر دی ہے، دوسری طرف اسلام کے ان مسلّمات کے بارے میں جو چودہ صدیوں سے مجمع علیہ اور متفق علیہ چلے آرہے ہیں ناقابلِ برداشت نوعیت کی CONTROVERSIES کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کے باعث ہمارے تعلیم یافتہ خاص طور پر نئی نسل کے تعلیم یافتہ طبقہ میں سخت ذہنی انتشار بڑھتا چلا جارہا ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسلام کس کو سمجھا جائے؟ اُسے جو خیرالقرون سے نسلاً بعد نسلٍ علمائے حقانی کے توسط سے نقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے یا اُسے جو آجکل کے نام نہاد جدید مفسرین بالخصوص جدید "مفسرات" کی جانب سے پیش کیا جارہا ہے۔ جن میں شاید ہی چند افراد ایسے ہوں جو قرآن حکیم کی ایک چھوٹی سی سورت کی بھی صحیح طور پر تلاوت کر سکیں —— یا ان کو دین

---

[1] یاد ہوگا کہ جب مارچ ۸۳ء میں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے پر کہ عورتوں کا دائرہ کار اسلام نے بالکل علیحدہ معین کیا ہے اور مخلوط اداروں میں خواتین کا مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا صریحاً اسلام کے خلاف ہے۔ اس پر مغرب زدہ خواتین نے جو ہنگامہ آرائی کی تھی تو ان کو اطمینان دلانے کے لیے اخباری رپورٹوں کے مطابق جناب صدر مملکت نے فرمایا تھا کہ "اقتدار ڈاکٹر اسرار کے پاس نہیں ہے، میرے پاس ہے"۔ (مرتب)

ے روزمرہ کے معمولات کی ذرا بھی شُدبُد ہو —

آپ بہ نظرِ انصاف ISLAMISATION کے اس PROCESS کا جائزہ
ں، جن کا پانچ چھ سال سے بڑا چرچا ہے تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ ہر قدم نیم دلی سے
ور انتہائی ناقص انداز میں اٹھایا گیا ہے — حدود آرڈیننس کا جو حشر ہوا وہ کس سے
شیدہ ہے - کیا سرقہ پر آج تک کسی کو قطع ید کی سزا ملی ہے! کیا ڈاکہ زنی کے
رموں میں سے کسی پر اسلامی حد جاری ہوئی ہے! زکوٰۃ آرڈیننس کا جو معاملہ ہے اس پر
یں گذشتہ تقریر میں اظہار رائے کر چکا ہوں ۔ اسلام کے کسی معاملہ میں بھی فیصلہ کن انداز
ہیں بھی موجود نہیں ہے — ورنہ آپ غور کیجیئے کہ اخباری اطلاع کے مطابق اسلام کے قصاص
دیت کے قانون کو مدون کرکے اپنی مکمل رپورٹ اور سفارشات اسلامک آئیڈیالوجی کونسل
نے چار سال قبل صدر مملکت کی خدمت میں پیش کر دی تھی - یہ IDEOLOGY COUNCIL
—— کن لوگوں پر مشتمل ہے! انہی لوگوں پر جنہیں اس حکومت نے اور اسکے
جو بھی کارپرداز اور اربابِ حل وعقد ہیں انہوں نے اس کونسل کے ارکان کو یہ سمجھ کر
نامزد کیا تھا کہ یہ دین کے جاننے والے ہیں، سمجھنے والے ہیں — ہمارے یہاں جو مختلف
فقہی مسالک یا فرقے ہیں یہ حضرات ان کے معتمد علیہ نمائندے ہیں ۔ انہیں دین کا صحیح فہم
اور شعور رکھنے والے جو بھی نظر آئے ان کو اسلامک آئیڈیالوجی کونسل میں رکھا - پھر علماء
کے ساتھ اپنی صوابدید کے مطابق اس ملک ہی کے نہیں بلکہ دوسرے چند اہم ممالک کے
دساتیر اور قوانین سے بخوبی واقف ماہرینِ قانون و دستور کو بھی شامل کیا — اس کونسل
نے متفقہ طور پر مسودہ تیار کر دیا - معلوم ہوا کہ تمام فقہی مکاتبِ فکر اور فرقوں کے
علماء کی تائید بھی اُسے حاصل تھی - جدید آئین و دستور کے ماہرین کی توثیق بھی اُسے
حاصل تھی - گویا کہ ایک متفقہ سند حکومت کو حاصل ہو گئی تھی - قصاص اور دیت
کے مسئلہ میں اسلام کے مجمع علیہ قوانین یہ ہیں ۔ اس کے بعد ایک "شورٰی" وجود میں آگئی
تو یہ مسودہ اس کے سامنے رکھ دیا گیا - شورٰی میں اس پر بحث ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہاں
تو دونوں ذہن یعنی دینی اور سیکولر (SECULAR) ذہن رکھنے والے لوگ جمع ہیں ۔
یہاں تو وہ وکلاء بھی ہیں جو اسلام پر پھبتیاں چست کرنے سے بھی باز نہیں رہتے - پھر
وہ علماءِ دین بھی ہیں کہ بہرحال جن کے فہمِ دین پر لوگوں کی اکثریت کو اعتماد ہے — لہذا

محسوس ہوا کہ یہاں تو معاملہ آسانی سے نہیں چلے گا تو ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ کمیٹی کی رپورٹ آئی تو پھر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس کمیٹی کے چیئرمین صاحب پر علماء کی طرف سے شدید الزامات عائد کیے گئے۔ علماء میں سے جو حضرات اس کمیٹی میں شامل تھے انہوں نے رپورٹ کو بالکلیہ DISOWN کر دیا کہ یہ رپورٹ ہماری نہیں ہے اس میں ہمارے نقطہ نظر کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ پھر ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس نے جو رپورٹ دی، وہ کابینہ میں زیرِ بحث آئی لیکن وہاں بھی اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاملہ تا حال معلق ہے۔ البتہ اخباری اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ اب اس مسئلہ کے بارے میں عالمِ اسلام کے علماء سے رائے لینے کے مرحلے تک بات آ گئی ہے۔ یہ سارا عمل غمازی کر رہا ہے کہ اصل میں پختہ ارادہ موجود نہیں ہے[1]۔ اگر پختہ ارادہ ہوتا تو بہت سے ضروری اسلامی قوانین کو اب تک حقیقی طور پر نافذ ہو جانا چاہیے تھا۔ درحقیقت اصل مسئلہ وہی ہے جو میں نے عرض کیا تھا کہ اِن کو بھی راضی رکھنا ہے، اُن کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہے، اُن کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہے۔ یہ بھی ناراض نہ ہوں اور وہ بھی ناراض نہ ہوں[2]۔ ظاہر بات ہے کہ اس طرز پر جو بھی کام ہوگا، اس میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکتی اور عملی اعتبار سے انسان آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پس میں نے اس CONTROVERSY میں اسی لیے اپنے آپ کو ملوّث نہیں کیا کہ میرے نزدیک اس کا حاصل کچھ نہیں۔ یہ بالکل ایک بے محل بحث ہو رہی ہے۔ یا تو وہ اجتماعی ارادہ موجود ہوتا یا اس کو پیدا کرنے کے لیے مثبت اقدامات کیے جاتے۔ ! جولائی ۱۹۷۷ء میں جب جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی حکومت قائم ہوئی ہے اور انہوں نے نوّے دن میں انتخاب کرانے کے بجائے اس عزم کا اعلان کیا کہ MOST EARNESTLY

---

[1] انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے۔ "WHERE THERE IS A WILL ______ THERE IS A WAY" اگر عزم صمیم ہو کہ یہ کام بہرحال کرنا ہے تو راہ نکل آتی ہے۔" (مرتب)

[2] ؎ باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

(مرتب)

ان کی حکومت یہاں اسلامی نظام نافذ کرنے کے لیے اپنی تمام قوت صرف کرے گی تو نومبر ۱۹۷۷ء میں اسی شہر لاہور میں ہماری سالانہ قرآن کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کانفرنس میں، میں نے یہ بات عرض کی تھی۔ چونکہ مجھے جنرل صاحب کے متعلق معلوم تھا کہ وہ ایک دین دار مسلمان ہیں۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ وہ ماہنامہ میثاق کے اس زمانہ سے خریدار ہیں۔ جب وہ ملتان میں جی او سی تھے اسی زمانہ میں انہوں نے تفسیر تدبر قرآن منگائی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کا دینی ذوق ہے، دینی مزاج ہے۔ اس میں دین سے شغف ہے۔ انہوں نے ہماری قرآن کانفرنس کے لیے پیغام بھی ارسال کیا تھا۔ لہٰذا اُس وقت میں نے عرض کیا تھا کہ "اب جبکہ اللہ نے آپ کو اس آزمائش میں ڈال دیا ہے کہ آپ کے ہاتھ اس ملک کا اختیارِ کُلی آ گیا ہے"۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے زیادہ مختارِ مطلق اس دنیا میں کوئی اور نہیں ہوتا۔ امریکہ کا صدر بھی اتنا بااختیار نہیں ہے۔ وہ تو ملک بڑا وسیع ہے، وسائل بہت ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ایک بڑی شخصیت ہوتی ہے لیکن اختیارات کے اعتبار سے اس پر قیود ہیں، حدود ہیں، پابندیاں ہیں۔ بہت سے امور میں اُسے کانگریس سے منظوری حاصل کرنی ہوتی ہے۔ اُسے اپنی پالیسیوں میں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے، اُس نے یا اس کی پارٹی کے دوسرے نامزد کو صدارتی انتخاب لڑنا ہوتا ہے۔ پارٹی کو پھر ووٹوں کی بھیک مانگنی ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ان تمام حدود و قیود اور احتیاطوں سے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مبرّا، محفوظ، مامون اور مطمئن ہوتا ہے۔ اُسے ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ انہی اعتبارات کے پیشِ نظر میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ "آپ کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش ہے۔ اب یہ ہے کہ اگر آپ واقعتاً اس آیت پر عمل کریں کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ۔ تو آپ پورے کے پورے اسلام کو نافذ کیجئے۔ اس میں تدریج کا معاملہ نہ کیجئے گا۔ ایک حصہ نافذ کر دیا دوسرا نہیں۔ اس میں اپنی PRIORITIES بنانا، دین کی ترجیحات کو نظر انداز کر دینا، معاشرہ کا رنگ دیکھ کر لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے، ان کو جانچنے پرکھنے کے لیے نفاذِ اسلام میں تدریج اختیار کرنا۔ پھر یہ کہ اس کا تجزیہ کرنا۔ یعنی اس کے اجزاء کرنا کہ دین کا ایک حصہ اس وقت نافذ کیا جائے اور دوسرے حصوں کو تعویق میں ڈالنا کہ پھر دیکھا جائے گا۔"

یہ طرزِ عمل اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ اس ضمن میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۸۵ ذہن میں رکھیے گا اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۔ اب تدریج کے لیے مکی دور سے دلیل نہیں لائی جا سکتی چوں کہ اس وقت مکمل شریعت موجود نہیں تھی اس وقت تک احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اب وہ دَور دوبارہ نہیں آئے گا، مکمل شریعت حقہ موجود ہے۔ قرآن پورا کا پورا ہمارے سامنے ہے سنتِ رسول ایک روشن آفتاب کی صورت میں موجود ہے۔ ہماری تاریخ تاریک رات کے مانند نہیں ہے بلکہ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا اس کی تو راتیں بھی اتنی روشن ہیں جتنے کہ دن روشن ہوتے ہیں۔ حضورؐ کے دورِ سعید سے متصلاً بعد خلافتِ راشدہ کا زرین دور ہے۔ پھر اسکے بعد ائمہ فقہاء اور ائمہ حدیث کا دَور ہے۔ ہماری روشن تاریخ ہے جس کو سامنے رکھ کر ہمیں کامل دین کو لینا ہوگا۔ اس کے اجزاء کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ یہود کی اسی روش کے بارے ہی میں فرمایا گیا تھا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ "کیا تم ہماری کتاب یعنی ہماری شریعت اور ہمارے دین کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے"۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا "پس تم میں سے جو کوئی بھی یہ روش اور یہ رویہ اختیار کرے گا اس کی سزا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں اُسے ذلیل و خوار کر دیا جائے"۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ "اور قیامت کے دن اسے شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے"۔ اس آیت میں ایک اٹل اصول، ضابطہ اور قاعدہ بیان کر دیا گیا ہے۔ شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام مکمل شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا اب تو TAKE IT ALL OR LEAVE IT والا معاملہ ہے۔ شریعت لینی ہوگی تو پوری لینی ہوگی ورنہ چھوڑ دیئے۔ اللہ کو کوئی احتیاج نہیں ہے، کوئی غرض نہیں ہے، اس کی کوئی ضرورت اس سے لاحق نہیں ہے۔ اس کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے کہ اس کی شریعت میں سے تھوڑی سی چیز مان لی جائے تو اس کا کام چل نکلے گا ورنہ کام اٹکا رہے گا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ــــ اسی لیے میں نے زور دے کر کہا تھا کہ "آپ پورا اسلام نافذ کیجیے، اس میں تدریج کا معاملہ نہ کیجیے گا"۔ ساتھ ہی میں نے صاف صاف یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ "مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ یہ کریں گے تو اس وقت معاشرے کی جو مجموعی کیفیت ہے تو یہ معاشرہ اُسے قبول نہیں کرے گا۔

ہوسکتا ہے کہ آپ کو اٹھا کر پھینک دے۔ آپ کی حکومت کا تختہ بھی اُلٹ جائے، لیکن اس کے باوجود آپ یہ کریں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑی قربانی ہوگی۔ اللہ کے یہاں بھی آپ ماجور ہوں گے اور تاریخ میں بھی یہ بات ایک کارنامے کے طور پر درج ہوگی۔" میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ "اگر ایک انگریز بادشاہ ایک عورت کے لیے برطانیہ کی حکومت کے تاج و تخت کو ٹھوکر مار سکتا ہے" ۔ وہ بھی اس دَور میں جب کہ برطانیہ کی حکومت اتنی وسیع تھی کہ کہا جاتا تھا کہ اس حکومت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔" تو آج کا کوئی حکمران اگر اس لیے اقتدار سے محروم کر دیا جائے کہ وہ خود مسلمان جینا اور رہنا چاہتا ہے اور ملک میں بھی اسلام لانا چاہتا ہے۔ اگر اس وجہ سے حکومت سے محروم ہونا پڑے۔ تو یہ ایک بڑی شاندار اور تابناک مثال قائم ہو جائے گی۔ اس سے ایک جوش پیدا ہوگا۔ ولولہ اُبھرے گا، اُمنگیں جوان ہوں گی اور کروٹیں لیں گی، اسلام کے حق میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوگا۔ ان تمام مفاہیم پر مشتمل باتیں تھیں جو میں نے نومبر ۷۷ء کی قرآن کانفرنس میں جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو مخاطب کر کے کہی تھیں ــــ لیکن سات سال پورے ہو چکے ہیں اور اب آٹھواں سال شروع ہو گیا ہے، ان سات سالوں کا جو ماحصل ہے، اس کی ہم جو BALANCE SHEET اپنے سامنے رکھ کر اُسے دیکھتے ہیں تو شدید مایوس کن صورتِ حال نظر آتی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نظر نہیں آتا کہ کچھ CONTROVERSIES ہیں، کچھ بحثیں ہیں جو بڑے زور و شور سے اخبارات و رسائل اور پبلک پلیٹ فارموں پر جاری ہیں۔ جن کا حاصل ذہنی الجھاؤ، پراگندگی اور انتشار کے سوا کچھ نہیں ــــ جو بالکل ایک منفی کام ہے۔ عملی اعتبار سے ایک قدم آگے بڑھتا نظر نہیں آتا۔ زکوٰۃ کے بارے میں میں گذشتہ جمعہ کو عرض کر چکا ہوں کہ اس نے کیا شکل اختیار کی ہے[1]! اب اقامتِ صلوٰۃ کا جو اقدام کیا گیا ہے، اس کے متعلق اخبارات میں جس قسم کے بیانات اور خبریں آ رہی ہیں اور مجھے بتایا گیا ہے کہ ٹی وی پر بھی صلوٰۃ کمیٹیوں کی تشکیل کی بڑے زور و شور سے تشہیر کی جا رہی ہے۔ اس سے جو لوگ یہ اندازہ لگا رہے ہیں کہ یہ اصل میں الیکشن کے لیے خالص تمہیدی قدم ہے جو اٹھایا گیا ہے۔ تو جس انداز سے یہ کام ہو

---

[1] یہ مکمل تقریر میثاق کے اکتوبر ۸۴ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے (مرتب)

رہا ہے، اس کے پیش نظر ان کے اس خیال کو غلط قرار دینا مشکل ہے۔ یہ رمز بھی اس کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ کام فوج ہی کے ذریعے قائم کیا جا رہا ہے۔ اسے سول بیوکریسی کے بجائے فوجی نظام کے ساتھ نتھی کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موجودہ REGIME کا جو معہود ذہنی ہے۔ ان کے پیش نظر آئندہ کے لیے جو نقشہ ہے، اس میں اس کا کوئی خاص مقام ہے! اس کی کوئی افادیت ہے، اس کا کوئی مصرف ہے۔ گویا نظام زکوٰۃ اور نظام اقامت صلوٰۃ کی پشت پر ایک سیاسی FACE اور IMAGE بنانا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہی وجوہ ہیں کہ میں سوچتا ہوں کہ ان معاملات میں اگر بولوں تو اس کا فائدہ کیا ہے! حاصل کیا ہے! میں نے آپ کو بارہا بتایا کہ پردے کے سلسلہ میں گفتگو میرے اپنے کسی منصوبے اور ارادے کے تحت نہیں تھی۔ لیکن جب پوچھا جائے گا تو جو بات کتاب و سنت کے مطابق ہوگی وہ کہنی پڑے گی۔ پھر میں نے اس موضوع پر اپنی دو تقریروں میں اپنی استعداد کی حد تک کتاب و سنت کی تعلیمات پیش کیں۔ یہ تقریریں "میثاق" کی ایک خصوصی اشاعت میں شائع ہوئیں۔ ملک کے ایک مشہور اور نہایت کثیر الاشاعت روزنامے میں وہ قسط وار شائع ہوئیں۔ کتابی صورت میں بھی وہ اشاعت پذیر ہو چکی ہیں — پھر میں کیا اور میری بساط کیا! ملک میں ہمارے نامور اور جید علمائے کرام کی نہایت مبسوط کتب اس موضوع پر پہلے سے موجود ہیں[1]

لیکن کیا موجودہ حکومت نے ان کتب سے کوئی استفادہ کیا! کیا اسلامک آئیڈیالوجی کونسل سے استصواب کیا کہ ستر و حجاب کے متعلق شریعت کے احکام کیا ہیں! بلکہ مجھے یہ بات کہنے پر معاف کیا جائے کہ جو کام ترکی میں اتاترک نے اور ایران میں دونوں رضا شاہ پہلوی کے نام رکھنے والے بادشاہوں نے قانون، طاقت اور ڈنڈے کے زور سے کیا تھا، وہ موجودہ REGIME بڑی حکمت عملی سے انجام دے رہی ہے اور ان سات سالوں میں مغربی ذہن رکھنے والی خواتین کو نہ صرف یہ کہ کھلی چھوٹ دی گئی ہے کہ ا

---

[1] راقم کے نزدیک اس موضوع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کی معرکۃ الآراء کتاب "پردہ" بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اس موضوع پر تا حال حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے (مرتب)

نظامِ معاشرت کے خلاف وہ جتنا چاہیں زہر اُگلیں۔ بلکہ انہیں نمایاں طور پر آگے بڑھایا گیا ہے اور بڑھایا جا رہا ہے مختلف طور پر ان کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اس دور میں یہ کام جس پیمانے پر ہوا ہے اس کے عشرِ عشیر بھی پہلے کے تیس برسوں میں نہیں ہوا تھا۔

اب ان حالات کے پیشِ نظر قانونِ شہادت میں عورتوں سے متعلق شق پر اور قصاص و دیت کے مسودہ کے متعلق میں کچھ کہوں تو کیا کہوں! — لیکن چوں کہ مجھ سے سوال کیا گیا ہے اور بعض احباب کا اصرار ہے کہ قصاص و دیت کے مسئلہ پر جو متنازعہ بحث چلی ہے، اس کے متعلق میں کچھ عرض کروں۔ پھر میرے سامنے حضرت عبادہ ابن صامت رضؓ کی حدیث کا وہ حصہ بھی ہے جس پر بھی صحابہ کرامؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرتے تھے کہ علی ان نقول بالحق اینما کنا ولا نخاف فی اللہ لومۃ لائم — لہٰذا اس مسئلہ پر قرآن و حدیث سے اپنی استعداد اور اپنے فہم کے مطابق جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ میں انشاء اللہ بعد میں عرض کروں گا۔ اس وقت بطور یاد دہانی اس کام کا اعادہ کر رہا ہوں، جس کے لیے میں نے اپنے آپ کو کھپا رکھا ہے — شاید کہ اس موقع پر میری بات چند لوگوں کے دل میں اتر جائے اور وہ جمود کو ختم کر کے آگے بڑھیں اور اس کام میں میرے اعوان و انصار بنیں — یا اپنے طور پر منظم ہو کر اسی کام کی انجام دہی کی دھن ان کے سروں پر سوار ہو جائے۔

میں نے قرآن حکیم اور سیرتِ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا جو بھی معروضی مطالعہ کیا ہے اس کے نتیجے میں میرے سامنے اصل کرنے کا کام اور راہنمائی یہ آیا ہے کہ دین کے تقاضوں اور مطالبوں کو اس وقت تک بطور نظامِ حیات نہ نافذ کیا جا سکتا ہے، نہ وہ مستحکم رہ سکتا ہے۔ — جب تک معاشرے کے معتدبہ افراد میں مسلمان جینے، مسلمان مرنے کی COLLECTIVE WILL پیدا نہ ہو جائے۔ میں تو اس اجتماعی ارادے کو پیدا کرنے اور اسے قوی کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ اس WILL، اس ارادہ اور اس داعیہ کا براہِ راست تعلق ہے ایمان سے اور ایمان کا منبع و سرچشمہ ہے قرآن حکیم اسی منبع اور چشمہ رشد و ہدایت کو عام کرنے کے لیے میں نے ۱۹۶۵ء سے لے کر اب تک تقریباً بیس سال اپنی جوانی کے کھپائے اور لگائے ہیں۔ جو بھی اس کے اثرات ہیں اور کوئی نتیجہ نکلا یا نہیں نکلا! یہ علٰحدہ معاملہ ہے، یہ دوسری بات ہے۔ میرے

پیشِ نظر حالات کو بدلنے کی کوشش ہے اس کی کامیابی کا انحصار اللہ کی مشیئت پر ہے ۔ میری اُخروی نجات کے لیے شاید میری یہ حقیر کوشش کام آجائے ۔ بہرحال میں اسی کام میں ہمہ تن لگا ہوا ہوں اس لیے کہ میرا ایمان و یقین ہے کہ قرآن حکیم کی دعوت، اس کے پیغام اور اس کے ساتھ صحیح تعلق ہی تجدیدِ ایمان کا ذریعہ بنے گا ۔ اسی سے ایمان کو تقویت حاصل ہوگی ۔ اور یہی کام درحقیقت ہمارے معاشرے میں COLLECTIVE WILL کو پیدا کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ بن سکتا ہے ۔۔۔ اس سے اگلا قدم یہ اٹھایا کہ جن لوگوں کے اندر انفرادی سطح پر یہ ارادہ اور داعیہ پیدا ہو چکا ہے، انہیں جمع کیا جائے، انہیں منظم کیا جائے اور اسلامی انقلاب کے لیے قرآن کے علوم و معارف اور اس کی حکمت کو ذہنوں میں اتارنے کے لیے علمی و فکری سطح پر کام ہو ۔۔۔ پھر اسی منزل کی طرف پیش قدمی کے لیے سمع و طاعت کے اسلامی اصول پر ایک جماعت وجود میں آئے ۔ میری پہلی کوشش کے لیے عنوان ہے: "مرکزی انجمن خدام القرآن" ۔۔۔ اور دوسری کوشش کا نام ہے "تنظیم اسلامی" ۔۔۔ تو میں اپنی ساری مساعی، ساری صلاحیتیں، ساری توانائیاں اصل میں ان دونوں کاموں میں صرف کر رہا ہوں ۔۔۔ اس وقت جو CONTROVERSIES پیدا ہو رہی ہیں اور پھیل رہی ہیں، اس میں دراصل COLLECTIVE WILL عنصر ہے LACKING کے فقدان کا ۔۔۔ یہ سبب تھا اس معاملہ میں میرا اب تک بالکل خاموش رہنے کا۔

آج میں قصاص اور دیت کے بارے میں اپنی رائے پیش کر دیتا ہوں، اس فیصلہ کی وجوہ میں بیان کر چکا ہوں کہ مجھ سے سوال بھی کیا گیا ہے اور از خود بھی لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال ہوا ہوگا اس معاملہ میں جہاں تک دیت کا مسئلہ زیرِ بحث ہے، اس میں ایک اہم بات شاید لوگوں کو معلوم نہیں ہے وہ یہ کہ یہ قصاص والی دیت نہیں ہے۔ دیتیں دو ہیں ۔ ایک دیت تو وہ ہے جو قصاص کے ساتھ BRACKET ہو کر آتی ہے، دولانی شکل میں آتی ہے ۔ ایک دیت بالکل علیحدہ ہے۔ ان دونوں کو جب تک آپ علیحدہ علیحدہ نہیں سمجھیں گے تو جو باتیں کہی جا رہی ہیں اور عقلی میدان میں جو گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں اس کا توڑ آپ کے لیے مشکل ہوگا ۔۔۔ ایک ہے قتلِ عمد کا معاملہ ۔۔۔ ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی دوسرے شخص کو قتل کیا ہے

اس کا معاملہ بالکل علیحدہ ہے۔ اس کا شریعت میں، قانونِ اسلامی میں عنوان ہے قصاص یعنی جان کے بدلے جان ۔ اور اس میں جان بالکل برابر اور مساوی ہے عورت کی بھی اور مرد کی بھی ۔ اس میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ مقتول چاہے مرد ہو چاہے عورت اسی طرح قاتل چاہے مرد ہو چاہے عورت ۔ ان چاروں حالتوں میں مرد و عورت میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ جانیں سب کی برابر اور مساوی ہیں ۔ یہاں جو قصاص ہے وہ جان کے بدلے جان ہے کہ قاتل کی جان اب مقتول کے ورثاء کے رحم و کرم اور ان کی صوابدید پر منحصر کر دی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو قاتل کی جان لینے ہی کا فیصلہ کریں اور چاہیں تو قاتل یا اس کے لواحقین سے کوئی معاوضہ قبول کر کے اس کی جان بخشی کر دیں۔ ان دو میں سے کوئی ایک فیصلہ کرنے کا بالکلیہ اختیار مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کو حاصل ہے ۔ اس میں حکومت کا عمل دخل یہ ہے کہ اس نے قاتل کو پکڑا۔ مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کے لیے یہ ممکن نہیں، اس کے لیے حکومت کی مشینری کی ضرورت ہے، جس میں پولیس ہے، عدالت ہے، ۔ پولیس نے قاتل کو پکڑا۔ تفتیش کی ۔ قانون اور عدل کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کیا ۔ مقدمہ قائم ہو کر عدالت میں پیش ہوا۔ ملزم کے خلاف شہادتیں پیش ہوئیں۔ اس کی طرف سے صفائی پیش ہوئی۔ ہر نوع کی شہادتوں پر جرح ہوئی ۔ یہ سارا کام حکومت کے ذمہ ہے۔ ان تمام PROCESSES سے گزر کر جب عدالت نے فیصلہ دے دیا، وہ چاہے جج یا قاضی نے خود دیا ہو یا جیوری کی رائے کے مطابق دیا ہو کہ ملزم کا جرم ثابت ہو گیا یہ شخص فلاں مرد یا فلاں عورت کے قتلِ عمد کا مجرم ہے تو اس کے بعد حکومت کا اختیار اور عمل دخل ختم۔ اب کسی صدرِ مملکت کو بھی کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اگر اب تک ہے تو یہ بالکل غلط ہے، خلافِ اسلام ہے[1]۔ اب کسی کا

---

[1] اس کی خلافت راشدہ میں بڑی نمایاں مثال ملتی ہے۔ ابو لولو فیروز نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کو شہید کیا اس نے تو اس کے بعد فوراً خودکشی کر لی وہ گرفتار نہیں ہو سکا۔ لیکن قرائن اور واقعتی شہادتیں یہ تھیں کہ اس سازش میں ہرمزان بھی شریک تھا۔ وہ خلافتِ فاروقی میں مسلمان ہو چکا تھا اور مدینہ منورہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر تھا۔ حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے رنج اور غصہ سے مغلوب ہو کر ہرمزان کو قتل کر دیا۔ جب کہ اسکو (جاری)

کوئی اختیار نہیں ہے۔ نہ حکومت کا نہ کسی گورنر کا نہ صدرِ مملکت کا۔

اب یہ اختیار اسلامی قانون کے مطابق بالکلیہ مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کو حاصل ہے۔ وہ چاہیں تو اس قاتل یا قاتلہ کی جان لینے کا فیصلہ کریں۔ حکومت اس کو EXECUTE کرے گی۔ اور اگر چاہیں تو اس قاتل یا قاتلہ کی بلا دیت وقصاص ـــــ جان بخشی کردیں اور اگر وہ چاہیں تو قاتل یا مقتولہ سے یا ان کے ورثاء سے کوئی رقم بطور دیت قبول کرلیں۔

ایک اور اہم بات نوٹ کیجئے کہ یہ دیت جو قصاص کا قائم مقام بنتی ہے اس کا تعین نہیں ہے یہ معاملہ جانبین کی باہمی رضا مندی سے طے ہوگا۔ اس سارے معاملے میں اصل میں جان کا بدلہ تو جان ہی ہے۔ یہ بات اچھی طرح جان لیجیے۔ دیت کی وہ رقم مقتول یا مقتولہ کی جان کی قیمت ہرگز نہیں ہے۔ اس کی قیمت تو قاتل یا قاتلہ کی جان ہی ہے البتہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں اگر کہنا چاہیں کہ قاتل یا قاتلہ نے اپنی جان بچائی ہے اپنی جان کی قیمت ادا کرکے ـــ اگر اس نے دس لاکھ روپے دے کر یا اس کے اعزہ واقارب نے، اس کے کنبے نے، اس کی برادری نے، اس کے قبیلے نے

(مسلسل) سازش میں ملوث ثابت کرنے کے لیے عدل وقانون کے متعلق کوئی عدالتی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ حضرت عبیدؓ کو گرفتار کیا گیا، ان پر قتلِ عمد کا مقدمہ چلا اور وہ مجرم قرار دیئے گئے۔ ہرمزان کا کوئی وہاں وارث نہیں تھا۔ جس کا کوئی وارث نہ ہو تو اسلامی قانون کے مطابق خلیفہ وقت بحیثیت خلیفہ اس کا وارث قرار پاتا ہے۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بحیثیت وارث دیت قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت عبیدؓ کے مالی وسائل دیت ادا کرنے کے متحمل نہیں تھے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ ہی نے اپنی جیب خاص سے مقرر کردہ دیت ادا کی اور وہ بیت المال میں داخل کی گئی۔ حضرت عبیدؓ کے لیے جو حضرت عمر فاروقؓ کے فرزند ہیں۔ "رحم" کرنے کی کوئی اپیل خلیفہ وقت کو پیش نہیں کی گئی۔ لہٰذا قاتل کو صوبائی گورنر یا صدرِ مملکت سے رحم کی اپیل کا حق دینا خلافِ اسلام ہے۔ (مرتب)

ادائیگی کرکے قاتل یا قاتلہ کی جان بچائی ہے تو یہ دیت درحقیقت قاتل کی جان کا معاوضہ ہے نہ کہ مقتول کی جان کی قیمت ـــ یہ بدلہ قاتل کی جان کا ہے، مقتول کی جان کا نہیں ہے چوں کہ جان کا اصل بدلہ تو جان ہی ہے۔ اب اس فیصلے کا بالکلیہ اختیار مقتول کے ورثاء کی آزاد مرضی پر ہے۔ چاہیں دیت قبول کریں، چاہیں تو قبول نہ کریں اور قاتل کو موت کی سزا دلوا دیں ـــ یہ ہے قتل عمد کا معاملہ۔ اس میں مرد کی پوری اور عورت کی آدھی دیت کا سرے سے مسئلہ زیر بحث آتا ہی نہیں۔ جان کی قیمت کا مسئلہ اگر زیر بحث آتا ہے تو یہاں آتا ہے اور اس میں قاتل چاہے عورت ہو یا مرد، اسی طرح مقتول عورت ہو یا مرد۔ دیت کی رقم کا تعین مقتول کے ورثاء کریں گے اور وہ درحقیقت قاتل اپنی جان بچانے کے لیے دیت دے گا جو دراصل اس کی اپنی جان کی قیمت ہو گی۔

دوسرا مسئلہ ہے قتل خطاء کا جس میں قاتل یا قاتلہ کا اپنا کوئی ارادہ شامل تھا ہی نہیں۔ آپ گاڑی میں جا رہے ہیں کہ اچانک اور ناگہانی کوئی بچہ، کوئی عورت، کوئی مرد آپ کی گاڑی کے نیچے آگیا اور ہلاک ہوگیا۔ آپ کا کوئی ارادہ نہیں تھا، آپ کی دشمنی نہیں تھی ـــ یا یہ کہ آپ کی دیوار کے نیچے کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دیوار گر گئی اور اس کے ساتھ یا اس کے نیچے جو شخص بیٹھا ہوا تھا، وہ ہلاک ہوگیا۔ آپ کا کوئی ارادہ نہیں تھا ـــ یا آپ نے گولی چلائی تھی کسی شکار پر وہ جا لگی کسی انسان کو۔ آپ کا قطعاً کوئی ارادہ اس شخص کو مارنے کا نہیں تھا۔ قتلِ خطاء کی اور بھی بہت سی شکلیں اور نوعیتیں ہوسکتی ہیں ـــ تو قتلِ خطاء وہ ہے جس میں قتل کا ہرگز کوئی ارادہ شامل نہیں ہوتا ـــ اب اسلامی قانون کا یہ ضابطہ نوٹ کیجئے کہ:-

"قتلِ خطاء کے معاملے میں اب جان کے بدلے جان نہیں ہے۔ اس لیے کہ جان لینا اس قاتل کے پیشِ نظر تھا ہی نہیں۔"

اس قتل خطاء میں مقتول یا مقتولہ کے لیے جو دیت مقرر کی جائے گی وہ اس بنیاد پر ہے کہ اس خاندان کا نقصان کتنا ہوا ہے ـــ قاتل کا جرم اس اعتبار سے تو نہیں ہے کہ اس کو قتل کرنے کا ارادہ تھا ـــ وہ قتلِ عمد کا کسی اعتبار سے بھی مرتکب نہیں ہے لہذا اس قتل کی سزا کا ضابطہ جان کے بدلے جان نہیں ہے چوں کہ قتل خطاء سے ہوا ہے۔

اب چاہے قتل خطاء سے ہوا ہو لیکن اس خاندان کا تو نقصان ہو گیا ہے جس کا فرد مقتول ہوا ہے ۔ اس کے نقصان کی تلافی تو ہونی چاہیے اسکا COMPENSATION تو ہونا چاہیے ۔ اس کی تلافی حکومت اپنے بیت المال سے بھی کر سکتی ہے ۔اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھیئے یہ تلافی اس صورت میں حکومت کرے گی ۔ جب کہ قتلِ خطاء کا مجرم خود یا اس کے قریب ترین اعزہ اس تلافی کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ اصلاً یہ تلافی اسلام نے اُس پر ڈالی ہے جو اس قتل خطاء کا مرتکب ہوا ہے ۔کیوں ڈالی؟ اس کے اندر بھی حکمت ہے وہ یہ کہ اس سے احتیاط کا عنصر پیدا ہوگا — اگر ایسے ہر صورت میں حکومت کے ذمے ڈالدیا جائے تو لوگوں میں احتیاط پیدا نہیں ہو گی۔ لوگ گاڑی RASH چلائیں گے ۔ ان کے پیشِ نظر یہ بات ہو گی کہ اگر کوئی گاڑی کے نیچے آکر ہلاک یا معذور ہو گیا تو اس کی دیت حکومت دیتی پھرے گی ۔ لیکن اگر ڈرائیور کو یہ معلوم ہو کہ یہ میرے سر پر آنے والی بات ہو گی تو اب وہ محتاط رہے گا یہ احتیاط معاشرے میں اسی شکل میں پیدا ہو سکتی ہے کہ اس قتلِ خطاء کا تاوان اُسی پر ڈالا جائے، جس کے ہاتھوں یا جس کے سبب سے یہ قتلِ خطاء ہوا ہے — البتہ مستثنیات میں یہ تلافی بیت المال سے حکومت کر سکتی ہے۔

لیکن یہ جان کی قیمت نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ اس نقصان کی تلافی ہے، اس کا COMPENSATION ہے جو اس فرد کے ہلاک ہو جانے کے سبب سے اس خاندان کو پہنچا ہے جس کا وہ فرد تھا۔

اس دیت میں اسلام کے نزدیک مرد اور عورت میں فرق ہے ۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اسلام کا جو نظام ہے اس میں معاش کا بوجھ عورت کے ذمے نہیں ڈالا گیا ہے ۔جب کہ مرد کسی خاندان کا ایک EARNING MEMBER ہے ۔وہ خاندان کی کفالت کے نظام کا ایک رکن ہے ۔ وہ حصولِ معاش کا ایک عضو ہے ۔ لہٰذا کسی خاندان کے کسی مرد کا قتلِ خطاء کے نتیجے میں ہلاک ہو جانا بڑا نقصان ہے بہ نسبت اس کے کہ اس طور پر اس خاندان کی کوئی خاتون ہلاک ہو جائے ۔ چنانچہ شریعت نے اس میں یہ فرق رکھا ہے کہ:—

قتلِ خطاء میں مرد کی دیت کے مقابلے میں عورت کی دیت آدھی ہو

جائے گی۔

اس میں جو حکمت ہے وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ عقلی دلیل کے اعتبار سے بھی یہ بات عین عدل و قسط کے مطابق ہے اور واضح ہے کہ ہر سلیم العقل انسان اس کی معقولیت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ اس کے خلاف ایک عقلی دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ اس زمانے میں تو عورتیں بھی کمانے والی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ شریعت کی کسی نص کے خلاف کوئی عقلی دلیل دینا ایمان کے بالکل منافی ہے۔ اس طرزِ فکر سے ایمان کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ ﴿بِنَاءُ الْفَاسِدِ عَلَی الْفَاسِدِ﴾ ہے۔ اسلام کے منشأ کے خلاف آپ نے ایک کاروائی شروع کی ہے۔ اسلام تو یہ نہیں چاہتا کہ عورت پر معاش کی ذمہ داری ڈالی جائے۔ اسلام نے عورت پر کچھ اور ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ وہ گھر میں بیٹھے اس کیلئے حکم ہے ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾۔ وہ کیوں معاش کی تگ و دو میں نکلی ہوئی ہے! وہ قناعت کرے، صبر کرے، اس کا شوہر جو کچھ کما کر لاتا ہے، اسی کے اندر گھر گرہستی کی ضروریات پوری کرے۔ اسلام تو یہ نہیں چاہتا۔ اسلام نے معاش کی عورت پر ذمہ داری نہیں ڈالی۔ آپ نے خود یہ ذمہ داری عورت پر بھی ڈال دی اور اپنی اس غلط روش کو اسلام کے ایک دوسرے قانون کے خلاف دلیل بنا رہے ہیں۔ اسلام کا نظام اور قانون تو پورا کا پورا منطقی طور پر اور مربوط طور پر ایک وحدت ہے، ایک اکائی ہے۔ اس نے چونکہ معاش کی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے، عورت پر نہیں ڈالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وراثت میں بیٹے کو بیٹی کے مقابلے میں دگنا حصہ دیا ہے۔ یہ ساری چیزیں مربوط ہیں۔ اس لیے کہ بیٹا ایک خاندان کا سربراہ بننے والا ہے یا بن چکا ہے۔ اُسے اپنے خاندان کی کفالت کرنی ہے جب کہ بیٹی بیاہ کر کسی اور خاندان میں چلی جائے گی یا جا چکی ہوگی اور اس کی کفالت اس کے شوہر کے ذمہ ہوگی۔ لیکن عورت کو ایک قانونی STATUS دینے کے لیے کہ اس کا بھی ایک تشخص ہے، اس کی بھی ایک حیثیت ہے لہذا وہ بھی اپنے والدین کے ترکے کی حق دار ہے۔ اُسے شریک تو رکھا گیا لیکن بھائی کے مقابلے میں اس کا حصہ نصف کر دیا گیا۔ لہذا اسلامی قانون کو جس زاویہ نگاہ سے بھی دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک مربوط حکیمانہ نظام ہے۔ وہاں اس کا اپنا فلسفہ ہے۔ اور یہ فلسفہ تمام جزئیات کو GOVERN کرتا ہے تمام جزئیات

اس فلسفے کے ساتھ مربوط ہو کر ایک وحدت بن جاتے ہیں جسے آپ ایک ORGANIC WHOLE کہتے ہیں۔ اب اگر اس پورے اور وحدانی قانون سے ہٹ کر کوئی روش اختیار کریں گے پھر اس سے اسلام کے کسی دوسرے قانون کے خلاف دلیل لائیں گے تو یہ میرے نزدیک بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ ایک غلط چیز پر بنیاد رکھ کر دوسری صحیح چیز کو غلط قرار دینا ہے۔ یہ درحقیقت اسی قبیل کی شے ہے جو آج کل قصاص و دیت کے مسئلہ میں سامنے لائی جا رہی ہے۔ ورنہ اسلام کا نظام اور قانون عقلی اعتبار سے بھی بالکلیہ عادلانہ اور منصفانہ ہے اور اس کا ہر جزو باہم دگر مربوط ہے۔ البتہ انتہا درجے کی مجبوری اور ضرورت ہو تو استثنائی شق قانون میں رکھی جا سکتی ہے لیکن یہ ایسے ہی ہونا چاہیے جیسے اضطرار کی حالت میں حرام کھانے کی شریعت نے رخصت رکھی ہے۔

اب آئیے ایک اہم اصول کی طرف ــــ جہاں تک نقل کا معاملہ ہے تو ہمارے دین میں نقل کو عقل کے مقابلے میں اقدمیت و اولیت حاصل ہے جس کے قدرے تفصیلی دلائل میں دورانِ گفتگو پیش کروں گا ــ اس ضمن میں آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں رجم کے متعلق بھی کچھ گفتگو کی تھی[1] اس ضمن میں ایک بڑی علمی شخصیت کی جو بفضلہٖ تعالیٰ بہ قید حیات ہیں ـ جو عالم دین ہونے کے ساتھ صاحبِ تفسیر بھی ہیں۔ رجم کے بارے میں جو رائے ہے اس پر تنقید کی تھی۔ پھر ان کے ایک شاگرد جوان سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے ہیں ـ انہوں نے غامدیہ خاتون کے متعلق جو نازیبا بات کہی تھی بلکہ بہتان گھڑا تھا کہ" وہ چکلا چلاتی تھی اس لیے اُسے رجم کیا گیا تھا" پھر یہی نوجوان ہیں جنہوں نے چند سال پہلے اپنے رسالے میں لکھا تھا کہ آج تک اسلام کا صحیح قانون وراثت اور کلالہ کے صحیح معنی ومفہوم اور قانون کو آج تک کسی نے سمجھا ہی نہیں ـــ اس کو بس انہوں نے ہی سمجھا ہے جیسے وہ اب بیان کر رہے ہیں ـــ تو بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ والا معاملہ سامنے آ رہا ہے۔

---

[1] یہ مکمل تقریر "میثاق" کے ستمبر ۸۴ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے (مرتب)

تو ان امور کے متعلق میں نے عرض کیا تھا۔ تو شریعت کے معاملے میں یہ
ت جان لیجیے اور آج میں نے جو بات عرض کی ہے اس کے ساتھ جوڑ کر سمجھ لیجیے
، جہاں کہیں بھی یہ آمادگی پیدا ہو جائے گی کہ مجھے مسلمان جینا ہے، مجھے مسلمان مرنا ہے
اس کے لیے سب سے پہلی دلیل یقیناً قرآن مجید ہے۔ لیکن دین میں وہ تنہا دلیل نہیں
ہے۔ اسی لیے میں نے اُسے پہلی دلیل کہا ہے۔ جو قرآن حکیم کو تنہا اور واحد دلیل سمجھتا
ہے اس کا راستہ ہم سے جُدا ہے۔ ہم ہیں اہل السُنّہ کہ جنہوں نے سنت کو دوسری
دلیل مانا ہے۔ ہمارے نزدیک دلیل اوّل ہے قرآن مجید اور دلیل ثانی ہے سنتِ رسول
علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اور یہ بھی جان لیجیے کہ سنت قرآن کے تابع نہیں ہے بلکہ
ہے اگر اس کے تابع ہو تو اس کے تابع تو اولوالامر بھی ہیں۔
اس کے تابع تو والدین کی اطاعت بھی ہے۔ اس کے تابع تو ساری اطاعتوں کا نظام
بن جائے گا۔ درحقیقت سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام قرآن کے تابع ہو
کر دلیل نہیں ہے بلکہ قرآن کے ساتھ ایک برابر کی دلیل ہے۔ یہ دو ستون ہیں، یہ دو
PILLARS ہیں جن پر شریعت کی عمارت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ایک ستون ہے اللہ کی
کتاب قرآن مجید۔ ایک ستون ہے سنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام[1]۔ پھر فرض

---

[1] رسول کی اطاعت کے لیے قرآن مجید میں یہ کلیہ بیان فرمایا گیا ہے کہ۔ مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ اور وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ــ پہلی آیت میں "اَلرَّسُوْل" خاص ہے اور یہاں مراد جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ــ قرآن مجید میں پانچ مقامات پر امر کے صیغے ہیں اَطِيْعُوا اللّٰهَ واطیعوا الرسول آیا ہے اس اسلوب کے معانی و مفاہیم میں جو زور ہے اس کی جو غایت و مطلوب ہے اس میں جو حکمت اور رمز ہے وہ روز روشن کی طرح واضح ہے اور پھر چھ مقام پر اطیعوا اللہ و رسولہ آیا ہے۔ گیارہ مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبان سے کہلوایا ہے کہ "اطیعون"۔ پھر متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے رسول کی اطاعت اور اس کی معصیت سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

لیجیئے کہ سنت رسولؐ میں کسی معاملہ میں ابہام ہے۔ کہیں دو چیزیں بظاہر ایک دوسرے
سے ٹکرا رہی ہیں۔ میں بظاہر کہہ رہا ہوں اس لفظ کو پیشِ نظر رکھیے۔ اس لیے کہ یہ چیز وہ
ہے کہ محدثینِ عظام نے اپنی پوری زندگیاں کھپا کر چھان پھٹک کی ہے اور پھر فقہائے کرام
نے اس کے اندر عقلی اعتبار سے، استدلال کے ذریعے سے مطابقت پیدا کی ہے۔ کہ
ایک حدیث ہے جو عام بات بیان کر رہی ہے۔ دوسری حدیث ہے کہ اس کے اندر خاص
بات بیان ہوئی ہے تو ایک حدیث گویا دوسری حدیث کے اتنے حصّے کی ناسخ ہو جائے
گی جو اس میں خصوص کا پہلو ہے۔ عام والا حصہ باقی رہ جائے گا۔ خاص والا معاملہ اب
اس دوسری حدیث کی رو سے طے ہوگا۔ یہ معاملہ دنیا میں ہر جگہ ہے۔ قرآن مجید میں
بھی ہے عام وخاص۔ یہی حدیث کے اندر معاملہ ہے۔

اس کے بعد تیسری دلیل ہمارے یہاں سنتِ رسولؐ کے بعد ہے سنتِ خلفاءِ
راشدین مہدیین۔ جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طویل حدیث
کے دوران یہ ارشاد آیا ہے: فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ
الْمَهْدِيِّينَ عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔ "تم پر لازم ہے میری سنت اور میرے
خلفاءِ راشدین کی سنّت کو جو میرے ہدایت یافتہ ہیں۔ پکڑو ان کو مضبوطی سے اپنے
دانتوں کے ساتھ، داڑھوں اور کچلیوں کے ساتھ۔" یہ فرمانِ محمدی ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔
اس کلمہ "فا" بہت معنی خیز ہے، یہ تمام اختلافات کے لیے پناہ گاہ کی طرف دلالت کر
رہا ہے۔ خلفاءِ راشدین کی سنّت دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت
کا تتمہ ہے۔

اس کے بعد ہمارے پاس چوتھی دلیل ہے ہمارے ائمہ دین، ائمہ فقہاء
استنباطات، ان کی تعبیرات اور ان کے قیاسات واجتہادات — جیسا کہ میں

سلہ) اس سے نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی مقام واضح ہوتا
ہے بلکہ سنت کا بھی، ویسے اتباعِ سنت کے لیے یہ آیت کریمہ نص کا درجہ
رکھتی ہے کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

نے عرض کیا کہ شاید کچھ لوگ سمجھتے ہوں کہ ان پر قرآن آج نازل ہو گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں اُسے INTERPRET کر دیں۔ ہماری ایک تاریخ ہے اور تاریخ تاریک نہیں ہے، بہت روشن ہے۔ یہ پچھلی دو تین صدیاں اگر ہمیں تاریک نظر آرہی ہیں تو خدانخواستہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہماری پوری تاریخ تاریک ہے۔ ہماری بڑی تابناک تاریخ ہے ہماری اس تاریخ میں وہ ائمہ دین گزرے ہیں کہ جنہوں نے بڑی باجبروت حکومتوں کے مقابلے میں کھڑے ہو کر اس رائے کا اظہار کیا ہے جسے وہ حق سمجھتے تھے۔ امام مالکؒ کا تصور کیجیے کہ حکومتِ وقت کے خلاف رائے دے رہے ہیں۔ ان کی مشکیں کسی جا رہی ہیں۔ ان کے چہرے پر سیاہی مل کر پھر ان کو گدھے پر بٹھا کر پورے مدینہ میں پھرایا جا رہا ہے۔ لیکن اس حال میں بھی وہ کہہ رہے ہیں "جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک ابن انس ہوں اور میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ طلاقِ مکرہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے"۔ مسئلہ یہ تھا کہ مجبور کر کے اگر طلاق دلا دی جائے تو وہ طلاق ہوگی یا نہیں ہوگی[1]

اب یہ ایک مسئلہ ہے۔ یہ علیحدہ بحث ہے کہ کسی کو امام مالکؒ کی رائے سے اختلاف ہو۔ لیکن ہمارے ائمہ دین وہ ہیں جو کسی جبر اور کسی تشدد کے سامنے نہیں جھکے۔ امام ابوحنیفہؒ نے جیلیں کاٹی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق انہیں زہر دیا گیا ہے۔ امام شافعیؒ نے سختیاں برداشت کی ہیں، کئی بار شہر بدر کئے گئے ہیں۔ امام ابن حنبلؒ نے وہ ماریں کھائی ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ اگر ہاتھی کی پیٹھ پر وہ مار پڑتی تو وہ بھی بلبلا اٹھتا۔ امام ابن تیمیہؒ دو مرتبہ محبوس کئے گئے۔ قید کی حالت ہی میں ان کا انتقال ہوا تو کیا ان ائمہ کے بارے میں ہم یہ سمجھیں گے کہ دین اور شریعت کے بارے میں غور و فکر

---

[1] حکومت وقت کو اس مسئلہ میں تشدد کی ضرورت اس لیے درپیش ہوئی کہ خلیفہ وقت کے لیے بالعموم بالجبر بیعت لی جاتی تھی۔ اگر طلاق مکرہ کو غیر مؤثر تسلیم کر لیا جائے تو حکومت کو خطرہ لاحق تھا کہ جبری بیعت کو بھی اس پر قیاس کر کے بیعتِ مکرہ سمجھا جائے گا۔ اور اس طرح یہ بیعت غیر مؤثر ہو جائے گی۔ (مرتب)

اور صحیح تر رائے تک پہنچنے میں انہوں نے کوئی کسر چھوڑ دی ہو گی! انہوں نے کیا یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہو گی کہ فلاں فلاں مسائل میں قرآن کا صریح تقاضا کیا ہے اور سنت کی نصوص کون کون سی ہیں اور وہ مسائل کون کون سے ہیں جن پہ خیر القرون سے اجماع اور تواتر عمل چلا آرہا ہے! رہے ایسے مسائل جن کی تعبیر و قیاس کے بارے میں اختلاف ہے ان کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ ان میں البتہ ایک گنجائش ہو گی۔ میرے لیے بھی گنجائش ہو گی۔ آپ کے لیے بھی گنجائش ہو گی۔ خلف کے علماء کے لیے بھی گنجائش ہو گی کہ وہ بھی امام دین اور امام فقہ ہیں، یہ بھی امام دین اور امام فقہ ہیں، امام حدیث ہیں۔ اُن کی رائے یہ ہے، اِن کی رائے یہ ہے۔ تو فقہی مسائل میں میدان وسیع ہو گیا۔

لیکن یہ بات جان لیجیے کہ جن مسائل میں خلفاء اربعہ کا تعامل ہو، ائمہ اربعہ کا اتفاق ہو۔ سلفی مسلک رکھنے والوں کا اتفاق ہو ان سے باہر نکلنا میرے نزدیک فتنہ ہے۔

میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ یہ محض جذباتی بات نہیں ہے بلکہ نہایت غور و فکر کے نتیجے میں میری پختہ اور اٹل رائے ہے کہ جن مسائل میں خلفاء اربعہ کا تعامل موجود ہو، ائمہ اربعہ کا اتفاق موجود ہو، محدثین متفق ہوں، تمام واجب الاحترام اور معتمد ترین رجال دین کی رائے جن مسائل میں یک جا ہو جائے، وہ مجمع علیہ مسائل کی فہرست میں ہیں اسی کا نام اجماع ہے۔ یہ اجماع بھی دین میں حجت ہے۔ یہ چوتھی دلیل کا حاصل ہے[1] اور اُس کے خلاف رائے دینا اور اپنی رائے

---

[1] آج سے کئی سال قبل امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی کے مطالعہ کا موقع ملا تھا۔ اس میں یہ بات بھی درج تھی کہ امام موصوف قرآن مجید سے بھی "اجماع" کے حجت ہونے کی دلیل کے متلاشی تھے۔ لیکن امام صاحب کا کہنا یہ تھا کہ تین مرتبہ تلاوت قرآن اور غور و فکر کے بعد بھی یہ دلیل نہ مل سکی۔ (واضح رہے کہ کہا جاتا ہے کہ امام موصوف عموماً تین دن میں قرآن کی تلاوت مکمل کر لیا کرتے تھے)۔ ایک روز امام رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے "اجماع" کے حجت ہونے کی دلیل بھی قرآن مجید سے ان پر واضح

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

پر اصرار کیے جانا میرے نزدیک یقیناً اور لاریب فتنہ ہے۔
میرے بعض احباب کو جن کے خلوص پر مجھے کوئی شبہ نہیں، مجھ سے شکایت پیدا ہوئی ہے کہ میں شاید ایک خاص معاملے میں سختی کر رہا ہوں۔ بعض نے مجھ سے کچھ ناراضگی کا بھی اظہار کیا ہے۔ میں ان تمام حضرات سے گذارش کروں گا کہ شخصیتوں کو سامنے رکھ کر خدارا نہ سوچیے بلکہ یہ سوچیے کہ مجمع علیہ مسائل یا اجماع سے ہٹ کر کسی نص، کسی دینی مسئلہ اور متفق علیہ حدود شرعیہ کے خلاف راستہ نکالنا اور رائے دینا اور اجتہاد کرنا اسلاف کے ساتھ قطع تعلق ہے یا نہیں! ان تمام کی متفق علیہ رائے پر اظہار عدم اعتماد ہے کہ نہیں! میں صاف صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں میں کسی مداہنت کا روادار نہیں۔ میں اسے حمیّت وغیرتِ دین کے منافی سمجھتا ہوں۔ اس لیے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ کون خوش ہوتا ہے، کون ناخوش۔ کون راضی رہتا ہے اور کون ناراض ہو جاتا ہے۔ شخصیتوں کو چھوڑ کر مسئلہ کی FACE VALUE پر تبادلہ خیال، افہام و تفہیم اور دینی استدلال کے لیے میں ہر وقت تیار ہوں۔ نہ کسی کی دلداری کبھی پیش نظر رہی ہے اور نہ کسی کی ناراضگی سے خوف

(مسلسل) کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ تین سو ایک مرتبہ تلاوت کے دوران اچانک ان کی نگاہ اس آیت پر جم گئی اور منکشف ہوا کہ اجماع کے حجت ہونے کی دلیل اس آیت میں موجود ہے۔ آیت یہ ہے: وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ○ (آل عمران ۱۱۵) امام موصوف کی رائے یہ ہے کہ "یہاں سبیل المؤمنین سے قطعی طور پر اجماع مراد ہے" — یہاں مؤمنین سے وہ مؤمنین صادقین، جیسے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جیسے تابعین، تبع تابعین، فقہاء امت، محدثین کرام علماء حقانی، مراد ہیں جن کے قلوب حقیقی ایمان و ایقان کے نور سے منور تھے نہ کہ ہم جیسے "کچے پکے" اور رواجی مسلمان۔ (مرتب)

کھایا ہے۔ کسے باشد۔ اپنے دینی فہم و شعور کے مطابق جس بات کو حق سمجھا ہے اُسے برملا بیان کیا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ میرے نزدیک خلفاء راشدین، ائمہ مجتہدین، محدثین کرام کی مجمع علیہ متفق علیہ رائے اور مسائل کے خلاف اب کوئی نئی رائے دینا اور کوئی نئی راہ نکالنا یقیناً فتنہ ہے۔

یہ ہیں وہ اصل الاصول جن کو ہمیشہ پیش نظر رکھیئے۔ یہی معاملہ رجم کا ہے۔ زنا کی حد کی آیت قرآنی کے بموجب سو کوڑے غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے حد عام ہے لیکن اُسے سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے، اور سنت خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے شادی شدہ مرد اور عورت کی طرف سے زنا کے ارتکاب جرم پر رجم کو مستقل حد قرار دے کر خاص کر دیا۔ اس پر اجماع چلا آرہا ہے۔ خلفاء راشدین مہدیینؓ کے تعامل و تواتر کی پوری طرح تحقیق کے بعد فقہ کے مشہور ائمہ اربعہ نے شادی شدہ مرد و عورت کے لیے رجم کو "حد" قرار دیا۔ لہٰذا اس پر تواتر کے ساتھ اجماع چلا آرہا ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے۔ یہ ثابت شدہ سنت ہے۔ احادیث نبویہ ہیں۔ سنت اور حدیث دونوں جمع ہوگئیں۔ پھر یہ کہ خلفاء اربعہؓ کا اس پر عمل ہے۔ ائمہ اربعہ کا اس پر اجماع ہے۔ نہ صرف ائمہ اربعہؒ بلکہ اس میں امام بخاریؒ ہوں، امام مسلمؒ ہوں، امام ابن حزم ظاہریؒ ہوں۔ الغرض اہل سنّت کے تمام معتمد علیہ محدثین کا اس مسئلہ میں کامل اتفاق ہے۔ اسی طرح اہل تشیع جو بالکل علٰحدہ فرقہ ہے اس کے جو مستند ائمہ فقہ ہیں جن میں امام جعفر صادقؒ ہوں یا زیدیہ ہوں سب کے سب اس مسئلہ میں متفق ہیں کہ شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت کی اسلامی مستقل حد رجم ہے۔ خوارج اور گنتی کے چند معتزلہ ہیں جو اسے حد تسلیم نہیں کرتے۔ یہ فرقے اہل سنت والجماعت سے علٰحدہ تسلیم کئے گئے ہیں اور تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس پر علماء امت کا اجماع ہے اب آپ خود ہی نتیجہ نکال لیجئے کہ اس متفق علیہ اور مجمع علیہ مسئلے کے خلاف ایک نیا راستہ نکالنا اگر فتنہ نہیں تو کیا ہے۔!

قصاص و دیت کے مسئلہ کو بھی انہی دلائل سے سمجھ لیجیے جو رجم کے اسلامی ہونے کے بارے میں، میں نے پیش کئے ہیں چوں کہ اصول تو ایک ہی نہیں ـــــ دیئے

قرآن مجید میں قصاص والا مسئلہ سورہ بقرہ میں زیرِ بحث آیا ہے۔ اور قتلِ خطاء کی دیت کا ذکر سورہ نساء میں ہے۔ لیکن مقادیر وغیرہ کا کوئی ذکر قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ اس ضمن میں عورت اور مرد میں فرق ہے یا برابری ہے، اس کا کوئی ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ البتہ قرآن مجید کے دو اصول اور ہیں جن کو دینی اصطلاح میں "نص" کہا جاتا ہے۔ یعنی اس کا بلفظ بلفظ (LITERALLY) تعمیل ہوگی۔ ایک عورت کی شہادت کا معاملہ ہے تو وہ مرد کی شہادت سے نصف ہوگئی۔ دوسرے قانونِ وراثت کے پورے قانون کو دیکھیں گے تو عورت ترکہ میں مرد کے مقابلے میں نصف کی حق دار بنتی ہے۔ دلالۃ النّص سے اگر آپ کوئی چیز ثابت کرنا چاہیں تو یہ دو اصول قرآن میں موجود ہیں۔ لیکن اور کوئی صریح نص موجود نہیں ہے ۔ اب آپ حدیث کی طرف آیئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث QUOTE ہو رہی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی دوسری حدیث ہے اُسے دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حضرت عمرو بن حزمؓ کو حضورؐ نے ایک تحریر لکھوا کر دی وہی QUOTE ہو رہی ہے اس میں ایک کلّی قانون بیان ہوا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں کہ : فِي النَّفْسِ الْمُؤْمِنَةِ مِائَةٌ مِنَ الْإِبِلِ۔" ایک مؤمن جان" جان چوں کہ عام ہے لہٰذا اس کا اطلاق دونوں پر ہو سکتا ہے مؤمن مرد پر بھی اور مؤمن عورت پر بھی[ل۱] " ایک مؤمن جان کی دیت قتلِ خطاء کی صورت میں سو اونٹ ہوں گے"۔ ایک دوسری حدیث میں یہ بات بھی موجود ہے دِيَةُ الْمَرْأَةِ عَلَى النِّصْفِ مِنْ دِيَةِ الرَّجُلِ۔" عورت کی دیت مرد کی دیت کے مقابلے میں نصف ہے"[ل۲] معلوم یہ ہوا کہ ایک حدیث نے دوسری حدیث کو خاص کر دیا۔

ل۱ لفظِ المؤمنۃ سے مغالطہ نہ ہو۔ عربی کا قاعدہ ہے کہ اگر موصوف مؤنث ہو تو صفت بھی مؤنث کے صیغے میں استعمال ہوگی۔ نفس عربی زبان میں مؤنث ہے لہٰذا صفت بھی مؤنث آئی ہے مراد جنس مومن ہے۔

ل۲ "ہدایہ" جلد دوم میں وضاحت ہے کہ یہ حدیث حضرت علی سے موقوفاً مروی ہے اور یہ حدیث مرفوعاً بھی ثابت ہے (مرتب)

ایک میں عام ہے کہ قتلِ خطاء کے مقابلے میں ایک مومن جان کی دیت سو اونٹ ہے۔ دوسرا قولِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے کہ عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہے۔ ہم عام و خاص کی نسبت سے دونوں حدیثوں کو مانتے ہیں۔ دونوں کے مابین ایک ربط قائم ہے کہ ایک عام بات حضورؐ نے فرمائی اس کے ایک جزو کی حد تک خصوص دوسرے قول سے ہوگیا۔ لہٰذا ان دونوں کو سامنے رکھیئے تو مسئلہ بالکل واضح ہوجائے گا۔ جو شخص اتباعِ رسول کا جذبہ رکھتا ہوگا اُسے اب اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ملے گی۔ وہ کوئی اپنا قول نہیں لگائے گا، اپنی کوئی دلیل نہیں دے گا۔

آگے چلیئے۔ ہمارے خلفاء راشدین مہدیین میں چار میں سے تین کے اقوال موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ کا قول موجود، حضرت عثمانؓ کا قول موجود، حضرت علیؓ کا قول موجود رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاھم اجمعین کہ عورت کی قتلِ خطاء میں دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہے۔ اسی پر ان کا قول، اسی پر ان کا عمل ــــ صحابہ کرامؓ میں سے تین عبادلہ بہت مشہور ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ وہ صحابی ہیں۔ جن سے ساری فقہ حنفی چلی ہے۔ اسی لیے اس کو فقہ عبداللہ ابن مسعود بھی کہا جاتا ہے ــــ چوں کہ کئی واسطوں سے ان ہی کے پیرو ہیں امام ابوحنیفہؒ ــــ دوسرے عبداللہ ابن عباسؓ ہیں جن کے لیے حضورؐ نے دعا کی تھی کہ "اے اللہ اس نوجوان کو قرآن کا علم عطا فرما دے"۔ وہ حبر الامۃ کہلاتے ہیں۔ امت کے سب سے بڑے عالم۔ لہٰذا جو اکثر تفسیری روایات ہیں وہ ان کے متعلق ہر معتمد تفسیر میں آخری بات حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ کی ملے گی۔ تیسرے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ہیں تو حدیث کے سلسلے میں جو سلسلۃ الذہب مشہور ہے جو سنہری زنجیر ہے، اس کی پہلی کڑی حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ہیں ــــ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ــــ یہ تین عبادلہ اس اعتبار سے بہت مشہور ہیں۔ ان تینوں کے اقوال بھی اس کے حق میں موجود ہیں۔ پھر حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَفْرَضُھُمْ اُمَّتِیْ زَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ" "میری امت میں قانونِ وراثت کے سب سے بڑے عالم زید بن ثابت ہیں"۔ ان کا قول اس کے حق میں موجود ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جس میں یہ جذبہ پیدا ہوچکا ہو کہ مجھے اتباع پر چلنا ہے، کیا اس کے لیے اس مسئلہ میں اتنے شواہد کے بعد بھی کسی شک و شبہ

کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے ؟ ـــــ آگے چلیے۔ ائمہ اربعہ، امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کا اس پر اتفاق ہے۔ مزید یہ کہ اہل تشیع کے دو ائمہ امام جعفر صادق اور امام زید رحمہما اللہ کا بھی اس پر اتفاق ہے جیسے سب کا اتفاق رجم کے مسئلہ پر ہے۔ اب بتائیے کہ جس شخص کے دل میں کوئی رمق بھی ایسی موجود ہو کہ وہ اسلام کے مجمع علیہ، متفق علیہ تمام مسائل کو تسلیم کرنا چاہتا ہے، وہ اس مسئلے میں کوئی اپنی علٰحدہ رائے رکھنے پر اصرار کر سکتا ہے! یوں تو کوئی شاذ رائے اکثر معاملات میں مل جائے گی۔ مجمع علیہ اور متفق علیہ آراء کے مقابلے میں شاذ رائے کی کھوج کرید کرنا اور اس سے دلیل پکڑنا چاہے وہ رائے الاصم کی ہو، چاہے ابن علیہ کی ہو، آخر اس کی ضرورت کیا ہے[1]! پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ ان حضرات کا علمی اعتبار سے مقام و مرتبہ کیا ہے! ان کی حیثیت کیا ہے! کیا اہل سنت کے جو چار مسلک ہیں اور جو سلفی اور ظاہری مسلک ہیں، کیا ان مسالک میں سے کسی میں ان کی رائے اور قول کی کوئی اہمیت اور حیثیت ہے! صحابہؓ بالخصوص تین خلفاء راشدین کے قول و عمل، تابعینؒ، تبع تابعینؒ، ائمہ اربعہ اور تمام معتمد فقہائے اسلام کے مجمع علیہ اور متفق علیہ رائے کے مقابلے میں اِدھر اُدھر سے کھود کرید کر کے کسی شاذ اور غیر معروف قول پر استدلال کی عمارت کھڑی کرنا اس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے کہ اصل میں جذبہ تو ہے نہیں۔ پیروی تو کرنی نہیں، وہ ارادہ موجود ہی نہیں کہ ہم کو اسلام پر چلنا ہے اور اسلام پر عمل کرنا ہے۔ لہٰذا یہی ہوگا جو ہو رہا ہے۔ آدمی کے پاس زبان ہے اور گز گز بھر کی زبان بھی موجود ہے اور لوگوں کے ہاتھ میں قلم ہے جن کو ہمارے اخبارات نے گزوں لمبا کر دیا ہے۔ قلم کا پہلے اتنا فتنہ نہیں تھا جو اس دور میں اخبارات کے ذریعے سے یہ فتنہ شدید تر ہو گیا ہے وہ تو چاہتے ہیں کہ CONTROVERSIES زیادہ سے زیادہ پیدا ہوں۔ سیاست کا میدان تو بند پڑا ہے اس کے حوالے سے جو گرما گرمی ہوتی تھی اور نمک مرچ ملتا تھا،

---

[1] ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کے جون ۸۲ء کے شمارے میں اس رائے کا اظہار کیا گیا ہے کہ "ان حضرات کا یہ قول کسی مستند کتاب میں صحیح اسناد کے ساتھ نقل بھی نہیں ہوا؟" (مرتب)

اور اخبارات کی زینت بنتا تھا، وہ موجود نہیں تو جہاں سے بھی بحث و تمحیص کا دروازہ کھل جائے اسے وہ نمایاں کریں گے۔ چوں کہ اس میں ان کے قارئین کی دلچسپی کا سامان ہے اس کے سوا ان کے پیش نظر کوئی مثبت یا منفی تعلق یا مقصد نہیں ہے۔ اگر کوئی منفی تعلق ہو تو ہو۔ باقی مثبت تعلق کا تو ڈھونڈے سے بھی پتہ نہیں ملے گا۔ یہ ہے اصل معاملہ کہ اگر کسی کو بات سمجھنی ہو اور فی الواقع سمجھنا ہو تو اس میں قطعاً کسی شک اور شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ قتل خطا میں مرد کے مقابلے میں عورت کی دیت نصف ہے

میں پھر عرض کروں گا کہ اصل بات یہ ذہن میں رکھیے کہ دو چیزیں ہیں۔ پہلی یہ کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر وہ WILL ہے یا نہیں۔ فیصلہ کن بات تو یہ ہے۔ دوسری یہ کہ جب انفرادی اور اجتماعی سطح پر یہ WILL پیدا ہو جائے تو پھر عمل کے لیے ترتیب یہ ہے۔ کہ پہلے اللہ کی کتاب ہے پھر سنت رسول ہے۔ اس سنت کے اندر صحابہ کرامؓ کے اقوال بھی آجائیں گے۔ اس لیے کہ انہیں بھی احادیث کہا جاتا ہے۔ یہ بات بھی احادیث ہیں جو مرفوع نہیں موقوف ہیں لیکن حدیث کے درجے میں شمار ہوتی ہیں۔ وہ سنت کا ایک جزو ہیں۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشادات دلالت کرتے ہیں۔ پہلا ارشاد ایک حدیث کا آخری حصہ ہے: ما انا علیہ واصحابی "ھدایت یافتہ اور راہ یاب لوگ وہ ہوں گے جو میرے (یعنی نبی اکرمؐ) کے طریقے اور میرے اصحاب کے طریقے پر چلیں گے۔" دوسرا ارشاد ہے اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّھِمْ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ۔ "میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں، ان میں سے تم جس کی بھی اقتداء پیروی اختیار کرو گے راہ یاب ہو گے"۔ پھر خاص طور پر خلفاء اربعہؓ کی سنت ہے۔ جس کے سنت ہونے پر ہمارے تمام ائمہ فقہاء اور تمام علماء حقانی بلکہ پوری امت کا اجماع ہے۔ جس کے لیے دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے جو میں نے آغاز میں آپ کو سنائی تھی۔ اس کی تشریح کرنی باقی ہے۔ اس موقع پر وہ تشریح پیش کیے دیتا ہوں۔ اس حدیث سے ہمیں وہ رہنمائی بھی مکمل طور پر مل جائے گی۔ جس کی اس پُرفتن دور میں ہم کو سخت احتیاج ہے۔ یہ حدیث حضرت عرباض ابن ساریہؓ سے مروی ہے اور امام ابو داؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے اسے "حدیث حسن صحیح" قرار دیا ہے ــــــ حضرت عرباض بن ساریہؓ روایت کرتے ہیں کہ وَعَظَنَا

رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم مَوْعِظَۃً وَجِلَتْ مِنْھَا الْقُلُوْبُ وَ ذَرَفَتْ مِنْھَا الْعُیُوْنُ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ہمیں وعظ و نصیحت فرمائی اور نصیحت ایسی تھی کہ اس سے قلوب پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ لرز گئے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے ۔" فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَاَنَّھَا مَوْعِظَۃُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا ۔" ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! یہ نصیحت تو ایسے محسوس ہو رہی ہے جیسے آپؐ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں! (اگر یہ اسی نوعیت کی ہے) تو ہمیں مزید وصیت و نصیحت فرمائیے!" قَالَ اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ ۔" حضورؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی اور سمع و طاعت کی روش پر کاربند رہنے کی وصیت کرتا ہوں خواہ تمہارا امیر ایک غلام ہی کیوں نہ ہو!" اس وصیت کے آخری حصے میں یہ حکمت ہے کہ غلام یا غلام زادے کا امیر بننا عرب جیسی آزاد اور خود سر قوم کے نفس پر بڑا شاق گزرنے کا احتمال تھا ۔ نبی اکرمؐ نے اس کی اس موقع پر پیش بندی فرما دی ۔ اس کے بعد رسول اللہ نے فرمایا فَاِنَّہٗ مَنْ یَعِشْ مِنْکُمْ بَعْدِیْ فَسَیَرٰی اِخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۔" تم میں سے جو کوئی بھی میرے بعد زندہ رہا وہ جلد ہی کثیر اختلافات دیکھے گا ۔" آگے حضورؐ ہدایت اور راہنمائی فرما رہے ہیں ۔ کہ اختلافات کے زمانے میں امت کے لیے مشعلِ راہ کون سی ہے ۔! روشنی کا مینار کون سا ہے! ارشاد ہوا : فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ ۔

" پس تم پر واجب ہے، لازم ہے کہ میری سنت اور میرے تربیت و ہدایت یافتہ صراطِ مستقیم پر گامزن خلفاءؓ کی سنت کو کچلیوں کے ساتھ مضبوطی سے تھامنا ۔" آگے فرمایا وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ ۔" اور دیکھنا دین میں جو نئی چیز ایجاد کی جائے گی وہ بدعت ہو گی اور ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے ۔"

اس کے بعد تابعین، تبع تابعین، ائمہ فقہاء کا جس مسئلہ پر اجماع ہو جائے ۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے علیحدہ اور اس سے باہر کوئی نیا راستہ کوئی ایسا شخص

نہیں نکالے گا جس کے دل میں حقیقی دین پر عمل پیرا ہونے کے جذبے کی کوئی رمق بھی موجود ہو۔ اگر نکالے گا تو وہ اسی دائرے اور اسی زمرے میں آجائے گا کہ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ "جو شخص بھی فرماں برداری (اسلام) کے سوا کوئی اور طریقہ اور راستہ اختیار کرنا چاہے گا، اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامراد و خاسر رہے گا" لہذا جو بھی اسلام کے احکام و قوانین کے علاوہ اور ضابطے اور طریقے کا متلاشی ہے، وہ تو باہر ادھر ادھر جھانکے گا اور اپنی رائے کے لیے عقلی اور نقلی دلیلیں گھڑے گا۔ وہ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا کے زمرے میں آجائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور تمام مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھے۔

جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو میں پورے انشراحِ صدر سے کہتا ہوں کہ عقل بھی اسی کے حق میں ہے۔ عقل تسلیم کرتی ہے کہ قوتِ کار کے اعتبار سے اور معاشی کفالت کے لحاظ سے مرد کی منفعت عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔[1] اس دلیل سے میراث میں، قانونِ شہادت میں اور زیرِ گفتگو قتل خطاء کی صورت میں عورت کی دیت میں نصف کی نسبت عقل کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔ اسی طریقے سے رجم کے "حد" ہونے کے منکرین بھی عقل کے اعتبار سے اندھے اور کور چشم ہیں کہ وہ گویا عقلی اعتبار سے یہ فیصلہ کر رہے ہیں کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کا جرم برابر ہے۔ ذرا ان کی عقل پر ماتم کیجئے۔ ایک پیٹ بھرا انسان چوری کرے اور ایک غیر پیٹ بھرا انسان چوری کرے، کیا یہ برابر ہو جائیں گے! ایک چوری ہے جو ہیرے جواہرات کی کی جا رہی ہے، ایک چوری وہ ہے جو روٹی کی کی گئی ہے یا راہ چلتے کسی باغ کے پھل توڑ کر اپنا پیٹ بھرا گیا ہے۔ کیا یہ چوریاں برابر سمجھی جائیں گی! شریعت نے انہیں برابر نہیں رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں قحط کی حالت میں قطع ید کی سزا بالکل ساقط کر دی تھی اس

---

[1] "ہدایہ" میں علامہ مرغینانیؒ کا یہ قول موجود ہے: وَلِاَنَّ حَالَهَا اَنْقَصُ مِنْ حَالِ الرَّجُلِ وَمَنْفَعَتُهَا اَقَلُّ "بلاشبہ عورتوں کی قوتِ کار اور ان کی منفعت مرد سے بہت کم ہے"۔ یہاں 'انقص' اور 'اقل' کے الفاظ نہایت قابلِ غور ہیں۔ (مرتب)

یہ کہ شبہ موجود تھا کہ انسان چاہے چوری کسی شکل میں کر رہا ہو لیکن ہو سکتا ہے اور ظنِ غالب ہے کہ بھوک اس کا اصل سبب بن گیا ہو — تو کہاں ایک پیٹ بھرے انسان کا چوری کرنا اور کہاں ایک بھوکے انسان کا چوری کرنا! اسی پہ قیاس کیجئے کہ کہاں ایک شادی شدہ انسان کا زنا کرنا! اور کہاں ایک غیر شادی شدہ انسان کا زنا کرنا! کیا عقل اس کو برابر تسلیم کر سکتی ہے! میں سمجھتا ہوں کہ اُن لوگوں کی عقل پر آنسو بہانے اور ان کے حق میں دعا کیجئے جو ان دونوں کو برابر قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ وہ بڑے RATIONALIST ہونے کے مدعی ہیں۔ بڑے عقل پسند اور عقل پرست ہونے کے دعویدار ہیں۔

یہی معاملہ قصاص اور دیت کا ہے کہ اس مسئلہ میں خلط مبحث کر دیا گیا ہے۔ قتل خطاء کی جو دیت ہے وہ جان کی قیمت ہے ہی نہیں۔ جان کی قیمت کا مسئلہ قتل عمد میں آتا ہے اور وہاں بھی اصل الاصول یہ ہے کہ جان کی قیمت جان ہے پیسہ نہیں ہے قاتل کی جان تو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اب قاتل کی جان ان کے رحم و کرم پر ہے۔ اب وہ چاہیں تو اس کی جان لینے کا فیصلہ کریں چاہیں تو قاتل کی جان کا معاوضہ قبول کرلیں۔

> گویا قتل عمد کی دیت دے کر قاتل اپنی جان بچاتا ہے وہ مقتول کی جان کا معاوضہ نہیں ہے اس لیے کہ مقتول کی جان کے بدلے تو قاتل کی جان حاضر ہے۔

البتہ قتل خطاء میں جان کی قیمت کا معاملہ نہیں ہے وہ کسی حد تک اس نقصان کی تلافی ہے جو مقتول کے خاندان کو پہنچا ہے — اس میں یقیناً عورت کی دیت مرد کے مقابلے نصف ہے اور وہ اس ذمہ داری اور اسلام کے فلسفہ عمرانیات کے اعتبار سے ہے کہ مرد EARNING ہے۔ عورت نہیں ہے کسی خاندان کے مرد کا خطاء سے کسی کے ہاتھوں یا کسی کی بے احتیاطی سے ہلاک ہو جانا زیادہ بڑا نقصان ہے بمقابلہ عورت کے — یہ عقلی بنیاد بھی موجود ہے جس کے باعث شریعت میں یہ فرق رکھا گیا ہے۔

یہاں ایک اہم بات اور بھی عرض کر دوں۔ اگر عقل حاکم ہو جائے گی نقل پر۔

تو یہ اسلام کے خلاف راستہ ہے۔ اسلام اصلاً عقل پر نہیں بلکہ نقل پر قائم ہے۔ یہ نقل ہے وحی۔ اللہ کی جانب سے بذریعہ جبرئیل امین علیہ السلام منقول کی گئی ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ قرآن بھی منقول ہے، یہ بھی ایک روایت ہے اس کے راوی اوّل کون ہیں! جبرئیل امینؑ اور راویٔ دوم کون ہیں! جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ پھر یہ روایت چلی آرہی ہے، نبی اکرمؐ نے یہ قرآن صحابہ کرام کو دیا۔ صحابہ سے تابعین کو ملا۔ ان سے تبع تابعینؒ نے لیا اور اسطرح نسلاً بعد نسلٍ قرآن مجید روایت اور نقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچا اور اسی طرح یہ نقل ہوتا چلا جارہا ہے۔ یہ قرآن نقل ہے۔ اس کی اساس عقل پر نہیں ہے۔ ہاں جب آپ عقل کو اس کے تابع رکھ کر اس سے کام لیں گے تو یہ بہت شے ہے، بڑی مفید شے ہے، بڑی طاقت ور شے ہے۔ یہ عقل آپ کو اس نقل پر مطمئن کرے گی۔ اس بات کو علامہ اقبال نے بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

قرآن مجید میں بھی بار بار دعوت ہے کہ قرآن کو پڑھو، اس پر غور و تدبّر کرو، اس کے فہم کے لیے عقل سے کام لو۔ متعدد آیات میں سے دو کے حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ سورۃ الروم میں فرمایا وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ سورہ یٰسٓ میں ارشاد ہوا: وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قرآن جو اصلاً نقل ہے اس کے لیے عقل کلید اور دلیل کا کام دے سکتی ہے لیکن مجرد عقل معرفتِ الٰہی اور شریعت کے حِکَم اور رموز صحیح فہم و ادراک کے لیے ہرگز کفایت نہیں کرے گی۔ اس کو بھی علامہ اقبال نے خوب ادا کیا ہے ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں اس کی تقدیر میں حضور نہیں!

لیکن۔ یہاں یہ لیکن نہایت قابلِ غور ہے IT IS A VERY BIG BUT
لیکن اگر آپ نے اس نقل یعنی قرآن پر عقل کو حاکم بنا دیا تو جان لیجئے کہ چاہے آپ کہتے رہیں کہ آپ قرآن کو مانتے ہیں۔ درحقیقت آپ قرآن کو نہیں اپنی عقل

(بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

جامعہ بابُ العلوم، کہروڑپکا ضلع ملتان کے

مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی ؒ

کا

امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے

براہِ راست اور بواسطہ ماہنامہ 'الخیر' ملتان

استفسار

اور اُس کا

جواب!

—— (۱) ——

جناب ملکانوی کا پہلا خط —— محررہ ۱۸ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۴ھ

امام الہند بنانے کی تجویز — استاذ العلماء شیخ الہند کا کردار
شیخ الہند کے جانشینوں کو دعوتِ فکر اور ایک سوال!

ڈاکٹر اسرار احمد کے حضور عرضِ نیاز!

میثاق بابت جنوری ۱۹۸۴ء میں امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک مضمون "مولانا ابوالکلام جمعیت العلماء ہند اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ" شائع ہوا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانے کی تجویز اور استاذ العلماء حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کی وسعتِ نگاہ اور بالغ نظری کے ساتھ ساتھ موصوف کی وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کا منہ بھر کر واشگاف الفاظ میں اقرار کیا گیا۔ اور مولانا ابوالکلام کی دعوت کے بنیادی عنصر (قرآن و جہاد) کی بھی نشاندہی فرمادی گئی جس نے استاذ الاساتذہ اور شیخ الشیوخ مولانا محمود الحسن دیوبندی ایسی عظیم نابغۂ روزگار شخصیت کو

مسحور کر دیا تھا اور استاذ العلماء باین علم و فضل، تقویٰ و تدین و خلوص و للّٰہیت برملا فرمایا کرتے تھے کہ اس نوجوان (ابوالکلام آزاد) نے ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے اور یہ سب کچھ تقلید کے گڑھ ہندوستان میں ہو رہا تھا جہاں اسلام کے معنی ہی حنفیت کے ہیں اور تقلید کے دائرے سے باہر قدم نکالنے کے معنی گویا اسلام سے نکل جانے کے ہیں اور اس تمام کارروائی کے خالق حضرت شیخ الہند پکے کٹر حنفی ہیں اور جس عبقری نابغۂ روزگار شخصیت کے سر پر امامتِ ہند کا تاج رکھنا چاہتے ہیں وہ بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب اور بالکل اسم بامسمّٰی آزاد ہیں۔ حنفیت سے حد درجہ بعید، تقلید سے کوسوں دور ایک آزاد خیال انسان نہ کہیں کی سندِ فراغت نہ دستارِ فضیلت نہ جبّہ و عمامہ نہ عبا و قبا نہ کہیں کے مفتی نہ شیخ الحدیث۔ لیکن بایں ہمہ مولانا دیوبندی ان کے جوہرِ قابل کے قائل بھی ہیں اور انہیں امام الہند مان لینے کی تجویز کے پُر زور مؤید بھی۔

الحاصل ان تمہیدی گذارشات کے بعد جنہیں دراصل ڈاکٹر صاحب کے فرمودات و ارشادات کا خلاصہ کہنا بے جا نہ ہوگا، یہ بات روزِ روشن کی طرح کھل کر سامنے آتی ہے کہ حضرت شیخ الہند نے قیامِ حکومتِ الٰہیہ اور تجدیدِ احیائے دین و تجدیدِ ملت کی منزل کو قریب تر کرنے کے لئے۔ ماہ و سال، اعلیٰ و ادنیٰ، قدیم و جدید اور فکر و نظر کے تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تحریکِ احیائے دین کے کوئس ابوالکلام آزاد کو امام الہند تجویز کرانے میں ہمہ تن معروف نظر آتے ہیں تو کیا آج بھی اگر کوئی شخص جو کہ معروف طریقہ کا سکہ بند سا اور مسلّم عالم دین نہ ہو اور نہ ہی حنفیت کی جلی چھاپ رکھتا ہو۔ لیکن بایں ہمہ امتِ مسلمہ کو انحطاط و زوال اور نکبت و فلاکت سے نکالنے کے لئے اعتصام بالقرآن اور دعوت رجوع الی القرآن کا محض خیالی داعی اور ڈھنڈورچی ہی نہیں بلکہ ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں ٭ یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

کا مصداق ہو۔ تو کیا ان حالات میں استاذ العلماء شیخ الہند کے ارادت مند عقیدت کیش جانشینوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بھی اپنے شیخ کی طرح وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس دور میں دوسری مثال قائم کر دیں گے۔ اور کسی ایسی نابغۂ روزگار ہستی کی امامت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے فهل من مستمع وهل من مجيب یا پھر سکہ بند حنفیت زہد و تقویٰ کی اجارہ داری یا روایتی و مدرسی علم کا ادّعا آڑے آئے گا! بہرحال امیر تنظیم اسلامی کی طرف سے شیخ الہند کے جانشینوں کو یہ ایک دعوتِ فکر ہے چاہئے وہ اتباعِ شیخ میں وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا بھرپور مظاہرہ کریں یا پھر حنفیت کی تقلید جامد اور روایتی و مدرسی علم کا ادّعا انہیں حق بات تسلیم کرنے سے روک دے۔ امیر موصوف کے ارشاد کے مطابق علمائے کرام ہماری ان گذارشات پر سیخ پا نہ ہوں بلکہ ٹھنڈے دل سے غور کریں ؎ وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا۔

الحاصل امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا بڑے پُر پیچ پُر اسرار اور دبے دبے لفظوں میں شیخ الہند کے جانشینوں سے یہ ایک مطالبہ ہے ۔ نہ معلوم اس غیر سگالی مطالبہ کا ان کی طرف سے کس وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی سے جواب دیا جاتا ہے۔ یہ ان حضرات کا نجی معاملہ ہے جس سے سردست ہمیں سروکار نہیں ۔

القصہ مذکورہ بالا مقدمات کو جب ترتیب دیا جائے تو بنیادی طور پر چند خدشات سوالیہ پیدا ہوتے ہیں ۔ سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق شفاء العی السوال خیال گذرا کہ کیوں نہ ہم امیر تنظیم اسلامی ہی کے حضور اپنے اندیشہائے ذہنی کو عرض کرتا چلوں ۔ اگرچہ آج سے پہلے خاکسار کو امیر محترم سے نیاز مکاتبت کا شرف حاصل نہیں ۔ تاہم اخوتِ اسلامی کے تعلق سے پُر اُمید ہوں کہ آنجناب محروم نہ فرمائیں گے ۔

۱۔ اسلامی تعلیمات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت اربابِ حل و عقد قومی و ملی معاملات میں کسی منتخب شخصیت کی بیعت و امارت پر اتفاق کرلیں تو انہیں یہ حق حاصل ہے کہ امت کی دستگیری اور ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر انہیں ایسا کرنے کا اختیار دیا جائے بشرطیکہ جسے یہ مرتبہ عالی تفویض کیا جارہا ہے اس کے طائرِ دماغ میں معمولی طلب تو کجا بلکہ ناگواری کی حد تک کے انکار کا معاملہ ہو ۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ یہاں بے طلب و مدعا امورِ امت سپرد کئے جائیں تو باعثِ خیر و برکت ہوتے ہیں اور طالب منصب و مراتب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم کر دیئے جاتے ہیں ۔ یا پھر فلاح و سعادت اور نصرتِ خداوندی کی برکات سے تہی دامن رہتے ہیں ۔ چنانچہ مسلم شریف میں عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ۔ فرماتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا " اے عبدالرحمٰن امارت کی درخواست مت کر کیونکہ اگر درخواست کے بعد تجھے ملی تو تیرے سپرد کر دی جائے گی ۔ (امدادِ خداوندی نہ ہوگی) اور اگر بغیر درخواست کے ملی تو تیری (منجانب اللہ) مدد کی جائے گی ۔

۲۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا اور میرے ساتھ میرے دو چچا زاد بھائی تھے ۔ ان میں سے ایک بولا یا رسول اللہ جو ملک اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیئے ہیں ان میں سے کسی ملک کی حکومت ہمیں دیدیجئے ۔ اور دوسرے نے بھی یہی کہا ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم ہم کسی کو اس امر کا حاکم نہیں بناتے جو اس حکومت کی درخواست کرے اور نہ اس کو جو اس کی حرص کرے ۔

۳۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ! آپ مجھے عامل نہیں بناتے ۔ آپ علیہ السلام نے اپنا دستِ مبارک میرے کندھے پر مارا اور فرمایا :

البہ ذر تو کمزور ہے اور یہ امانت ہے قیامت کے دن سوائے رسوائی اور شرمندگی کے اور کچھ نہیں ہے مگر جو اس کے حقوق ادا کرے اور جو ذمہ داریاں اس پہ عائد ہیں انہیں پورا کرے

۲۔ ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانے کی تجویز صرف اور صرف جہادِ حریت اور تحریک استخلاص وطن کی حد تک تھی جس کے لئے حزب اللہ کی تاسیس اور حکومت الہیہ کا قیام عمل میں لانا تھا یہی وجہ ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کے قول و فعل کو بطور حجت و دلیل کے کبھی بھی کسی نے پیش نہیں کیا اور نہ ہی مذہبی قیادت و سیادت کی دستار ان کے سر پہ رکھ دی گئی تھی۔ جبکہ زمانہ حال کی امارت گروہی اور مذہبی حیثیت کی حامل ہے۔ عیاں را چہ بیاں۔

۳۔ مولانا ابوالکلام کے لئے امامتِ ہند کے رفیع منصب کے مجوز و مؤید اس وقت کے خیار الخلق زہد و تقویٰ۔ اخلاص و للّٰہیت۔ علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ آپ کی امارت کے مجوز و مؤید کون اور کس معیار کے لوگ ہیں۔ دیدہ باید۔

جناب والا! آپ کے حضور زندگی کی پہلی نیاز ہے عرضِ احوال کے آداب سے بالکلیہ نابلد ہوں۔ اگر طبع نازک پہ انجان سائل کی خش خش گراں نہ گزرے تو میثاق میں جواب کا منتظر رہوں گا۔ والسلام: خاکسار بندہ ایاز ملکانوی عفی اللہ عنہ

(۲)

جناب ملکانوی کا دوسرا خط —— محررہ ۲۰ ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ

بخدمت گرامی قدر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب زاد اللہ شرفکم العالی!

درخواست دعا کے بعد۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ مزاجِ محترم بعافیت راضی تام ہوں گے۔ المرام آنکہ چند ماہ پیشتر ناچیز نے خدمتِ عالیہ میں ایک سوالیہ نیاز نامہ رجسٹری کیا تھا۔ جس کا جواب باوجود طلب کے میثاق میں نہ آیا نہ آنا تھا۔ اور ویسے بھی حقائق کے جواب صبح قیامت تک بن نہیں پڑتے۔ اس لئے یہ بات نہ کوئی باعثِ تعجب تھی نہ اب ہے۔

البتہ حیرانی تو جناب قمر سعید صاحب کی بے تابی پہ ہے کہ موصوف مجھ خاکسار کے کوائف جمع کرنے کے لئے شہر کی ایک عظیم المرتبت علمی شخصیت کو خط میں لکھتے ہیں کہ "ہمیں بعض ضروری امور کی خاطر جناب ایاز ملکانوی صاحب کے کوائف کی ضرورت ہے۔ براہ کرم آپ حکمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے کوائف وغیرہ حاصل کر کے ہمیں ارسال فرمادیں۔ ہم شکر گزار ہوں گے۔ آپ کا ہم سے یہ تعاون ایک دینی معاملہ ہی کے لئے مطلوب ہے۔"

گرامی قدر! نہ معلوم یہ کونسی حکمت قرآنی ہے اور دعوت رجوع الی القرآن کا اصول و

ضابطہ ہے کہ سائل کے سوال کا جواب تب دیا جائے جب اس کے مکمل کوائف معلوم ہوں۔
جناب آپ کے پروگرام اور شبانہ روز سعی و محنت کا بنیادی نقطہ دعوت رجوع رجوع الی القرآن ہے
تو کیا آپ کا یہ عمل اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ (الآیۃ) کا مصداق ہونے کے ساتھ ساتھ وَاَمَّا
السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (الآیۃ) کی ہدایتِ ربّانی کے بھی سراسر خلاف ہے ؎

اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم ! — کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اچھا خیر یہ ایک نیازمندانہ شکوہ تھا۔ امید ہے طبعِ نازک پہ گراں نہیں گزرے گا۔

عالی قدر۔ محرومیِ جواب کے باوجود بقول حضرت غالبؔ ؎

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی!

آج پھر مختصر عرض نامہ لے کر حاضرِ خدمت ہوں۔ کاش ؎

چھیڑنے کا مزہ تو تب ہے کہو اور سنو — بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

کرمفرمائے محترم ! نزول وحی کی اوّل تاریخ بعض حضرات نے ۲۸ جولائی ۶۱۰ء بروز
شنبہ شب قدر بیان فرمائی ہے جبکہ ماہنامہ حکمتِ قرآن جمادی الاخری ۱۴۰۴ھ میں مولانا
عبدالکریم پاریکھ نے مقالہ قرآن مجید۔ قرآن کی روشنی میں" نزولِ قرآن عیسوی ۶۱۰ء اگست
کی صحیح تاریخ کو بتایا ہے۔

علاوہ ازیں آیاتِ قرآن شمارِ حضرت عائشہ رضؓ کے مطابق ۶۶۶۶ ہیں۔ اور مولانا دریا بادی
نے ۶۶۱۶ کو میزان اصح قرار دیا ہے جبکہ حکمت قرآن کے مقالہ نگار نے ۶۲۳۷ آیات شمار
فرمائی ہیں۔

بہرحال ان ہر دو باتوں میں توفیق مطلوب ہے۔ رہی بات میرے کوائف کی تو وہ
حضرت اصغرؔ سے سن لیجئے ؎

تیرا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے — مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں
میں ہوں وہ مست جس کا ایک جرعہ زمزم و کوثر !!
میں اس تکوین کے خمخانہ میں صہبائے وحدت ہوں

اجازت : طالب جواب — والسلام

بندہ ایاز ملکانوی عفی اللہ عنہ

(۳)

ماہنامہ "الخیر" شمارہ جولائی ۱۹۸۴ء میں شائع شدہ تحریر!

"میثاق" بابت جنوری ۱۹۸۴ء میں امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک مضمون

مولانا ابوالکلام' جمعیۃ العلماء ہند اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ شائع ہوا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانے کی تجویز پر استاذ العلماء حضرت شیخ الہندؒ کی وسعتِ نگاہ اور بالغ نظری کے ساتھ ان کی وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کی مدح و توصیف کی گئی ہے اور حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کے علم و فضل تقویٰ و تدین اور خلوص و للّٰہیت کے اعتراف و اقرار کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد مرحوم پر آپؒ کی عنایات اور مزید اعتماد اور حسنِ سلوک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ صاحبِ مضمون کے مطابق حضرت شیخ الہند جس عبقری' نابغۂ روزگار شخصیت کے سر پر امامت ہند کا تاج رکھنا چاہتے تھے۔ وہ بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب اور بالکل اسم با مسمّٰی آزاد تھے۔ حنفیت سے حد درجہ بعید، تقلید سے کوسوں دور، ایک آزاد خیال انسان' نہ کہیں کی سندِ فراغت نہ دستارِ فضیلت' نہ جبہ نہ عمامہ' نہ عبا نہ قبا نہ کہیں کے مفتی نہ شیخ الحدیث لیکن بایں ہمہ مولانا دیوبندی ان کے جوہرِ قابل کے قائل بھی ہیں اور ان کو امام الہند مان لینے کی تجویز کے پُر زور مؤید بلکہ داعی بھی۔

حضرت شیخ الہند نے قیامِ حکومت الٰہیہ اور تحریک احیائے دین و تجدید ملت کی منزل کو قریب تر لانے کے لئے قدیم و جدید اور فکر و نظر کے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جس استقامت و بلند حوصلگی سے تحریک کی قیادت فرمائی اور اس تحریک سے تعلق رکھنے والے تمام اعلیٰ و ادنیٰ حضرات کو بلا امتیاز جس محبت و بندہ پروری سے نوازا مولانا آزاد پر یہ عنایت بھی انہی مراحم خسروانہ کا ایک حصّہ ہے۔

مگر ڈاکٹر اسرار احمد اس سے کچھ اور مفہوم اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مطابق شیخ الہندؒ کے ارادت مند' عقیدت کیش جانشینوں کو اپنے شیخ کی طرح وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس دور میں ایک دوسری مثال قائم کرنی چاہئے اور "سکہ بند حنفیت" زہد و تقویٰ کی اجارہ داری اور روایتی و مدرسی علم کا ادعا آڑے نہیں آنا چاہئے۔

آج شیخ الہندؒ کے جانشین اتباعِ شیخ "میں کس کو" امیر الپاکستان "تسلیم کریں۔ اس کی وضاحت امیرِ تنظیم اسلامی نے نہیں فرمائی مگر ان کے پُر پیچ' پُر اسرار اور دبے دبے لفظوں میں جس شخصیت کے بارے میں وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی اختیار کئے جانے کا مطالبہ جھلک رہا ہے وہ چشم بد دور" حضرت اقدس ڈاکٹر صاحب" ہی کی ذاتِ گرامی قدر معلوم ہوتی ہے۔ مگر غالباً انہوں نے از راہ کسرِ نفسی اپنے نام کی صراحت نہیں فرمائی۔ باقی

؎ یہی کہتے ہیں وہ اور کیا کہنے کو ہیں

اور —— ؎ ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا

اس بات سے قطع نظر کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس منصب کا اہل ثابت کرنے اور مولانا

، زاد اور اپنے درمیان عدم تفاوت ظاہر کرنے کے لئے جس رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے وہ درست ہے یا نہیں ؟ ——— اور یک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے مرتکب، حنفیت سے حد درجہ بعید، تقلید سے کوسوں دور آزاد خیال انسان، سندِ فراغت اور دستارِ فضیلت سے محروم جُبّہ وعمامہ اور عبا وقبا سے تہی دامن اور مفتی و شیخ الحدیث کے منصب سے خالی جیسے الفاظ سے وہ مولانا آزاد کا تعارف کروا رہے ہیں یا اپنی شخصیت کا نقشہ کھینچ رہے ہیں !

ڈاکٹر صاحب کے حُسنِ طلب کی داد نہ دینا تنگ نظری ہوگی مگر یہ طلب کچھ غور طلب ہے۔

کیا ڈاکٹر صاحب ہمارے طالب علمانہ ایک دو اشکالات کا جواب دینا پسند فرمائیں گے !

(۱) اسلامی تعلیمات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت اربابِ حل وعقد، قومی وملی معاملات میں کسی منتخب شخصیت کی بیعت و امارت پر اتفاق کرلیں تو انہیں یہ حق حاصل ہے کہ امت کی دستگیری اور ملک وملت کی فلاح وبہبود کے پیشِ نظر انہیں ایسا کرنے کا اختیار دیا جائے۔ بشرطیکہ جسے یہ مرتبہ عالی تفویض کیا جارہا ہے اس کے طائرِ دل ودماغ میں معمولی تو کجا بلکہ ناگواری کی حد تک انکار کا معاملہ ہو۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ یہاں بے طلب و مدعا امور امت سپرد کئے جائیں تو باعث خیر وبرکت ہوتے ہیں اور طالب منصب و مراتب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم کر دیئے جاتے ہیں یا پھر فلاح وسعادت اور نصرت خداوندی کی برکات سے تہی دامن رہتے ہیں۔ چنانچہ مسلم شریف میں عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا " اے عبدالرحمٰن امارت کی درخواست مت کر کیونکہ اگر درخواست کے بعد تجھے ملی تو تیرے سپرد کر دی جائے گی (امدادِ خداوندی نہ ہوگی)۔ اور اگر بغیر درخواست کے ملی تو تیری منجانب اللہ مدد کی جائے گی ۔

(۲) ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانے کی تجویز صرف اور صرف جہادِ حریت اور تحریکِ استخلاصِ وطن کی حد تک تھی جس کے لئے حزب اللہ کی تاسیس اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام عمل میں لانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کے قول وفعل کو بطورِ حجت ودلیل کے کبھی بھی کسی نے پیش نہیں کیا۔ اور نہ ہی مذہبی قیادت وسیادت کی دستار ان کی سر پر رکھ دی گئی تھی جبکہ زمانۂ حال کی امارت گردہی اور مذہبی حیثیت کی حامل ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔

(۳) مولانا ابوالکلام کے لئے امامت ہند کے رفیع منصب کے مجوز و مؤید اس وقت کے خیار امت زہد وتقویٰ اخلاص وللٰہیت علم وعمل میں یکتائے روزگار تھے۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ آں موصوف کی امارت کے مجوز ومؤید کون اور کس معیار کے لوگ ہیں۔

(۴)— ڈاکٹر صاحب کا جواب اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

مکرمی و محترمی مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی صاحب !

وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ـــــ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

آپ کا پہلا والا نامہ میرے نام اغلباً مارچ ۸۴ء میں موصول ہوا تھا۔ میری خط و کتابت کا سلسلہ عرصہ سے بالکل بند ہے اور اکثر خطوط کے جوابات میرے رفقائے کار ہی دیتے ہیں (اس کے متعدد اسباب ہیں جن کے ذکر کی اس موقع پر چنداں ضرورت نہیں ہے) لیکن آپ کے خط کے مضمون کی اہمیت کے پیش نظر میں خود ہی اس کا جواب تحریر کرنا چاہتا تھا۔ (بلکہ میری خواہش تو اور ہی تھی جس کا ذکر آگے آئے گا !) ـــ ادھر اپریل ۸۴ء سے میرے بیرونِ ملک دوروں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو اپریل میں ہندوستان اور مئی میں سعودی عرب کے طویل دورے ہوئے ـــ جون میں رمضان المبارک میں اس سال اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی تو نمازِ تراویح کے ساتھ پورے قرآن مجید کے ترجمہ کا دورہ مکمل کیا ـــ جولائی مکمل اور نصف اگست امریکہ اور برطانیہ کے دورے کی نذر ہو گئے۔ واپس آیا تو اندرونِ ملک دوروں کے قرض کی ادائیگی میں مصروف ہو گیا۔ اور گذشتہ دو ہفتوں سے علیل اور صاحب فراش ہوں۔

ادھر میری اصل خواہش آپ کو خود جواب تحریر کرنے سے بھی زیادہ یہ تھی کہ ایسے اہم موضوع پر خط و کتابت کی بجائے بالمشافہ ملاقات کی شکل نکال کر تفصیلی گفتگو کی جائے ! اسی غرض سے میں نے بعض ذرائع سے آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہیں تھی کہ اگر آپ کوئی معمر بزرگ ہوں تو میں خود حاضرِ خدمت ہونے کی سبیل نکالوں ـــ اور اگر نوجوان علماء میں سے ہوں تو آپ کو لاہور آنے کی دعوت دوں۔ اس کا آپ نے جس قدر بُرا منایا اس سے حیرت ہوئی ـــ تاہم آپ کے دوسرے خط کے اسلوبِ نگارش سے میرا مقصد حاصل ہو گیا۔ اس لئے کہ اس میں نوعمری کا لاابالیانہ پن ـــ اور اٹھتی ہوئی جوانی کا متحدیانہ انداز آپ کی عمر کی غمازی کر رہا ہے ـــ آپ کے اس دوسرے خط کا ایک "ترکی بہ ترکی" قسم کا جواب بھی تنظیم کے دفتر والوں نے تیار کر لیا تھا لیکن میں نے اسے روک لیا ـــ اس لئے کہ میں خود ہی کچھ معروضات پیش کرنے کی خواہش رکھتا تھا ـــ اس اثناء میں معاصر ماہنامہ "الخیر" میں آپ کا کھلا استفسار نظر سے گزرا جس میں آپ نے اپنے پہلے خط کی تلخیص اپنے دوسرے خط کے طنزیہ انداز میں نگارش کی ہے ـــ بہرحال اب میں حاضرِ خدمت ہوں۔ تاخیر کے لئے معذرت کے ساتھ !

آپ نے بعض احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میری ہدایت و رہنمائی کے لئے درج فرمائی ہیں جن کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ (اگرچہ ان کے محل و موقع کے ساتھ عدمِ مناسبت کے ضمن میں بعد میں کچھ عرض کروں گا!) اور خود بھی آپ کی خدمت میں ایک حدیثِ نبوی کا تحفہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ یعنی " لیس المؤمن با لطعان ولا باللعان ولا الفاحش ولا البذی " (ترمذی) امید ہے کہ آپ اس پر ضرور توجہ فرمائیں گے۔

جہاں تک حضرت شیخ الہندؒ سے متعلق میری تحریر کا تعلق ہے، اصل تحریر سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ نہ اس موضوع پر کچھ لکھنا میرے پیشِ نظر تھا اور نہ ہی وہ واقعات جن کا میں نے ذکر کیا ہے خود میرے علم میں پہلے سے تھے۔ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی زندگی کے 'الہلال' اور 'البلاغ' والے دَور سے اصولاً مجھے تعلق خاطر ہے اور اس کے تذکرے میں ایک بات میرے قلم سے وہ نکل گئی جو مجھے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ جس کی شدت کے ساتھ تردید ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب نے کی۔ چنانچہ مجھے تحقیق و تفتیش میں سرگرداں ہونا پڑا جس کی پوری تفصیل میرے اس مضمون میں درج ہے ـــــ اس تحقیق و تفتیش کے دوران حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کے جو پہلو میری نگاہوں کے سامنے آئے وہ اس سے قبل خود میرے علم میں بھی نہ تھے۔ حالانکہ میں اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے ان کے ترجمۂ قرآن مع حواشی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے استفادہ کرتا رہا ہوں اور اس وجہ سے مجھے ان دونوں بزرگوں سے ایک گونہ تعلقِ خاطر حاصل تھا ـــــ میری تحریر کا اصل محرک تو وہ تحریر خود بول رہی ہے کہ وہ شدت تأثر تھا جو حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کی عظمت کے انکشاف سے مجھ پر ہوا جس کی بنا پر میری یہ حتمی رائے بنی کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ الہندؒ تھے ـــــ ساتھ ہی یہ احساس بھی ابھرا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت سے خود حلقۂ دیوبند کے علماء اور خصوصاً ان کی نوجوان نسل کما حقہ پوری طرح واقف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقوں میں حضرت شیخ الہندؒ کی بعض دوسری معاصر شخصیتوں کا چرچا ان کے مقابلے میں زیادہ ہے! (واضح رہے کہ میرا نوجوانی کے دور ہی سے حلقۂ دیوبند کے علماء سے رابطہ رہا ہے۔ جن دنوں میں ساہیوال

میں مقیم تھا تو جامعہ رشیدیہ اور اس سے وابستہ علمائے کرام سے شرف ملاقات حاصل ہوتا رہتا تھا۔ کراچی میں مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی خدمت میں حاضری کا بارہا اتفاق ہوا! ۔۔۔ اور لاہور میں جامعہ مدنیہ اور بالخصوص مولانا سید حامد میاں مدظلہ کی خدمت میں بحمداللہ میری مسلسل حاضری رہتی ہے۔ اور ان کے سامنے جب میں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ چودہویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ الہندؒ تھے تو وہ بھی چونک سے گئے اور ان کا ردِ عمل تائیدی رنگ لئے ہوئے تھا۔!) اس تحریر کی دوبارہ اشاعت کا اصل محرک یہی خیال تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت سے لوگوں کو از سرِ نو متعارف کرایا جائے۔!

البتہ اس کے بین السطور میں آپ نے میری "حسن نیت" یا "خواہش" کا سراغ لگایا ہے، میں اس کی بالکلیہ نہ تردید کرتا ہوں نہ توثیق ۔۔۔ من وجہ اقرار ہے ۔۔۔ اور ۔۔۔ من وجہ انکار!

ایک شاعر کے قول "ہم لوگ اقراری مجرم ہیں" کے مصداق مجھے برملا اعتراف ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور جس کے لئے میں نے اپنے پیشۂ طب کو بھی خیرباد کہا ہے، وہ وہی ہے جس کی بیسویں صدی عیسوی میں پہلی بار نہایت زوردار دعوت دی تھی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے ۔۔۔ اور جس کے لئے انہوں نے عملی جدوجہد کا آغاز بھی "حزب اللہ" کے قیام کی صورت میں کر دیا تھا لیکن جسے وہ بعض داخلی عوامل اور خارجی موانع کے باعث جلد ہی بددل ہو کر چھوڑ بیٹھے ۔۔۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ہی نہیں، حضرت شیخ الہندؒ کی مساعی کا اصل ہدفِ اوّلین بھی صرف اور صرف جہادِ حریت اور تحریکِ استخلاصِ وطن" کو قرار دے رہے ہیں اور "حزب اللہ کی تاسیس اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام عمل میں لانا" آپ کے نزدیک اس اصل مقصد کا ذریعہ تھا۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ 'الخیر' والے مضمون میں یہ جملے آپ کے قلم سے سہواً نکل گئے ہیں ورنہ یہ حقیقت آپ پر یقیناً منکشف ہوگی کہ جس طرح پچھلی صدی کی دو عظیم تحریکوں میں سے اوّلین یعنی تحریکِ شہیدینؒ خالصتہً مسلمانوں کی تحریک تھی اور اس کا اصل مقصد تھا 'اعلائے کلمۃ الحق اور قیام حکومت الٰہیہ و نظام شرعیہ' اور اس کے ذریعے

کے طور پر پیشِ نظر تھا استخلاصِ وطن، جبکہ دوسری تحریک یعنی ۱۸۵۷ء کا جہادِ آزادی (انگریزوں کے قول کے مطابق "غدر") ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک تحریک تھی۔ اور اس کا اصل مقصد تھا حصولِ آزادی ـــــ البتہ اس میں جن علمائے کرام نے حصہ لیا ان کے پیشِ نظر یقیناً مقدم الذکر مقصد بھی تھا ـــــ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے دَورِ اوّل کا اصل مقصد تھا "رجوع الیٰ القرآن اور جہاد فی سبیل اللہ برائے اقامتِ دین اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ" اور اس کے لئے انہوں نے بالفعل آغاز کر دیا تھا "حزب اللہ" کی تأسیس سے ـــــ جبکہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے ان کی مساعی بالفعل کلیتہً مرتکز ہو گئیں "صرف اور صرف جہادِ حریت اور استخلاصِ وطن" کے لئے! ـــــ حضرت شیخ الہندؒ کے جہادِ زندگی کا اصل تعلق ہے "تحریکِ شہیدینؒ" سے اگرچہ بیسویں صدی کے اوائل میں ان کی جدوجہد میں زیادہ رنگ غالب نظر آتا ہے "جہادِ حریت اور استخلاصِ وطن کا" ـــــ اور یہی وجہ ہے کہ "الہلال" اور "البلاغ" والے ابوالکلام کے بارے میں ان کی زبان سے وہ تاریخی جملہ نکلا کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے!" ـــــ اس ضمن میں ایک واقعہ اور بھی سن لیں جو حال ہی میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ نے (جو اس وقت شیخ الہندؒ اکیڈمی دیوبند (بھارت) کے ڈائریکٹر ہیں) سنایا کہ جب کانپور کی مسجد کے واقعہ پر صورتِ حال بہت نازک ہو گئی تھی اور کشیدہ تھی اور اس سلسلہ میں نہایت تیز و تند مضامین لکھتے تھے مولانا آزاد مرحوم نے ـ تو صورتِ حال کو سنبھالنے کے لئے یو پی کے لفٹیننٹ گورنر نے دیوبند کا دورہ رکھا اور دارالعلوم میں آمد کا پروگرام بھی بنایا لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی کہ اس موقع پر مولانا ابوالکلام موجود نہ ہوں ـــــ چنانچہ اس وقت کے مہتمم صاحب نے مولانا آزاد کے دارالعلوم میں داخلے پر پابندی لگا دی تو حضرت شیخ الہندؒ نے بھی اس جلسے کا بائیکاٹ کیا اور اس میں شرکت نہیں فرمائی ـــ اور جب کچھ لوگوں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "حضرت! آپ ایک نوجوان کا اس درجہ کیوں خیال فرما رہے ہیں؟" تو انہوں نے جواباً یہ شعر پڑھا ؎[1]

کامل اس طبقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی ۔ کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

خدارا! حقائق و واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کریں ـــــ اور خود اپنے حلقے کی ایک عظیم شخصیت کی زندگی کے ایک دور (اور وہ بھی آخری دور) کے

(۱؎ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک اہم باب پر جو پردۂ خفا پڑ گیا ہے (یا جان بوجھ کر ڈال دیا گیا ہے!) اسے اٹھا کر اصل حقیقت کو دیکھنے کی سعی کریں ـــــ بہرحال میرے نزدیک مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کے اس انتقال موقف سے جو جگہ خالی ہوئی تھی اسی کو پُر کرنے کے لئے اٹھے تھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ـــــ چنانچہ یہ محض 'اتفاق' نہیں ہے کہ مولانا مودودی مرحوم کی پہلی تصنیف تھی "الجہاد فی الاسلام" ـ جو گویا نہایت بسیط اور مدلّل صدائے بازگشت تھی 'الہلال' اور 'البلاغ' کی دعوتِ جہاد فی سبیل اللہ کی ـــــ اور مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر اور مولانا مودودی مرحوم کے ماہنامے دونوں کا نام ایک ہی ہے یعنی "ترجمان القرآن"

مولانا مودودی مرحوم کے بعض نظریات سے شدید اختلاف کے باوجود میری رائے ہے کہ انہوں نے اصلاً اس دعوت کے تسلسل کو قائم رکھا جس کے داعیٔ اوّل مولانا آزاد تھے ـــــ اور اس سلسلے میں یقیناً قابلِ لحاظ پیش رفت بھی کی لیکن افسوس کہ جس طرح ان کے پیش رَو اپنے رُخ کی تبدیلی کے بعد کلیتہً وقف ہو کر رہ گئے تھے "ہندوستان کی قومی سیاست' کے ـــــ اسی طرح مولانا مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی بھی آزادی ہند اور قیام پاکستان کے بعد 'پاکستانی قومی سیاست' کی نذر ہو گئے ـــــ اور اس طرح خالص اقامتِ دین وغلبۂ دین کی جدوجہد اور اسلام کی انقلابی دعوت کا تسلسل پھر ٹوٹ کر رہ گیا ـــــ چنانچہ اِسی کے احیاء کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا عزمِ مصمّم کیا ہے ان سطور کے حقیر و

حاشیہ ص ۶۲

ؔ مولانا سعید الرحمٰن علوی سابق مدیر 'خدام الدین' نے اپنے ایک مقالہ (شائع شدہ 'میثاق' اکتوبر ۸۲ء) میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ "شیخ الہندؒ نے شدید علالت کے دوران جمعیت علماء ہند کے دوسرے جلسہ ۱۹ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء بمقام دہلی کی صدارت بھی فرمائی تھی اور خطبہ صدارت بھی ارشاد فرمایا تھا۔ بقول مولانا محمد میاں "بیماری ونقاہت کے سبب تھوڑی دیر بھی اسٹیج پر بیٹھنا دشوار تھا" لیکن اس اجلاس کے اہم ترین ایجنڈا یعنی امیر الہند کے انتخاب کے سلسلے میں ان کے احساسات یہ تھے "میری چارپائی اٹھا کر جلسہ گاہ میں لے جائی جائے اور یہ کام کر لیا جائے۔ پہلا شخص جو بیعت کرے گا وہ میں ہوں گا" (مولانا علوی نے یہ واقعہ تاریخِ امت ص ۵۲ کے حوالے سے لکھا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے پیش نظر امیر الہند یا امام الہند کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ہی کا نام تھا اور تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ حضرتؒ کے ایماء پر اس تجویز کے مفتی کفایت اللہؒ مجوّز اور مولانا احمد سعیدؒ مؤیّد تھے (ج۔ر)

عاجز راقم نے ـــــ اور اس کام میں وہ اپنے آپ کو محتاج پاتا ہے جملہ علمائے دین، بالخصوص علماءِ دیوبند کے وابستگان کی اعانت اور سرپرستی کا ـــــ چنانچہ یہ ہے میری اصل خواہش یا تمنا جسے آپ نے میری تحریر کے بین السطور پڑھا ہے، اور اس حد تک میں "اقراری مجرم" ہوں.

ـــــ لیکن اگر آپ اسے تعبیر کرتے ہیں "امام الباکستان" بننے کی خواہش اور منصب کی تمنا سے تو یہ میرے نزدیک ؎ جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے، کے مصداق خالصۃً آپ کے اپنے ذہن کی تخلیق و اختراع ہے جس سے میں اظہارِ برأت کرتا ہوں اور آپ سے بھی عرض کرتا ہوں کہ "اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ" کی قرآنی ہدایت کو پیشِ نظر رکھیں اور اس سوءِ ظن سے اجتناب فرمائیں۔

الحمد للہ کہ مجھ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہے کہ کسی ایک انسانی زندگی کے مختصر سے عرصہ میں کسی خطۂ زمین میں دعوتِ اسلامی کے آغاز سے اقامت وغلبۂ دین کی آخری منزل تک کے جملہ مراحل یا بالفاظِ دیگر اسلامی انقلاب کی تکمیل کا واقعہ تو پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی بار ہوا ہے ـــــ یعنی سید الاولین والآخرین اور امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے ـــــ اور آپ ہی کے مقصدِ بعثت کی آخری تکمیل بقول امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (ازالۃ الخفا) کے طور پر یہ کام ایک بار پھر ہوگا ـــــ اور عالمی سطح پر ہوگا۔ لیکن اس کے لئے آپؐ کے غلاموں کو کئی نسلوں تک مسلسل جدّوجہد کرنی ہوگی اور ایک ایک نسل کے دوران اس عمل کو ایک ایک درجہ آگے بڑھادینا بھی امّت کے لئے بہت بڑی کامیابی ہے اور جو خوش قسمت افراد اس کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں ان کے لئے بہت بڑی سعادت ہوگی۔ اور اس ضمن میں اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوصف جو خدمت انجام دی تھی مولانا آزاد نے۔ اسی کے چراغ سے روشن ہوا جماعتِ اسلامی کا دیا ـــــ اور اب اس کی بھی ناکامی کے بعد ان شاء اللہ اسی کی خاکستر سے نئی چنگاریاں روشن ہوں گی اور میں اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود "خواہشمند" ہوں ؎

احب الصالحین ولست منھم   لعل اللہ یرزقنی صلاحًا

کے مصداق اسی فہرست میں اپنا نام درج کرانے کا ـــــ لیکن ہرگز مبتلا نہیں ہوں اس خبط و حماقت میں کہ یہ عظیم کام میری "امامت" میں سرانجام پائے گا اور میں نہ صرف یہ کہ مجددین کی فہرست میں جگہ پا جاؤں گا بلکہ بقول مولانا مودودی "مجدد کامل" کے مقام پر فائز ہو جاؤں گا!

___ اس ضمن میں، میں درخواست کروں گا کہ آپ میری ایک تالیف "سرافگندیم" کا مقدمہ ضرور ملاحظہ فرمالیں۔

اس ضمن میں آپ نے جن احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا حوالہ دیا ہے اُس میں آپ سے نادانستہ ایک شدید خلطِ مبحث ہو گیا ہے۔ آپ ذرا غور فرمائیں کہ کیا حکومت کے مناصب کی طلب یا خواہش اور دین کی کسی چھوٹی یا بڑی خدمت کے لئے پیش قدمی ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں۔ آپ کے استدلال کا غلط نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی شخص کسی حال میں بھی دین کی خدمت کا داعیہ لے کر نہ اٹھے، اس لئے کہ لامحالہ اس سلسلہ میں جو شخص بھی پہل کرے گا اور دوسروں کو "مَنْ أَنْصَارِیْ إِلَی اللہِ" کی ندا دے گا، وہ فطری طور پر خود اس صدا پر لبیک کہنے والوں کا سربراہ یا رہنما یا امیر بن جائے گا اور یہ چیز چونکہ ناپسندیدہ ہے لہٰذا لازم ہے کہ سب بیٹھے رہیں اور صورتِ حال کو دن بدن بگڑتے دیکھیں اور خاموش رہیں۔ ___گویا ؎

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا   کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا!

مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے طرزِ استدلال کے اس منطقی نتیجے کو پسند نہیں فرمائیں گے۔

___ اور بفرضِ محال اگر آپ کا خیال یہی ہے تو سب سے پہلے آپ اس کا جواب دیں کہ قریب ترین ماضی کی خالص ترین اسلامی تحریک کے داعی و مجاہدِ کبیر حضرت سید احمد بریلویؒ کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے!؟ ___ کیا انہیں وقت کے "اربابِ حل و عقد" نے "منصبِ امامت" پر فائز کر دیا تھا یا انہوں نے خود اپنی بیعت کی دعوت لوگوں کو دی تھی!

آپ کے "معاصر "الخیر" کے آخری اور حد درجہ تیکھے سوال یعنی " مولانا ابوالکلام کے لیے امامت ہند کے رفیع منصب کے مجوز و مؤید اس وقت کے خیارِ امت زہد و تقویٰ اخلاص و للّٰہیت میں یکتائے روزگار تھے لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ موصوف کی امارت کے مجوز و مؤید کون اور کس معیار کے لوگ ہیں؛" (ص ۴۶) کا اسی قدر تیکھا اور الزامی جواب تو یہ بنتا ہے کہ حضرت! مجھ سے یہ سوال کرنے کے بجائے پہلے آپ اس کا جواب دیں کہ بقولِ خود آپ کے "وقت کے خیارِ امت" اور "زہد و تقویٰ، اخلاص و للّٰہیت (اور) علم و عمل میں یکتائے روزگار" حضرات کی تجویز و تائید کا وہ حشر کیوں ہوا؟ ___ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم "نہ خود کچھ کرنا نہ دوسروں کو کرتے دیکھ سکنا" کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے ہوں

رہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کی اس ساری 'جھنجلاہٹ' کا اصل سبب حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت 'آئینے میں موجود الوقت علماء کی اکثریت کی تصویر دیکھ لینا ہو!! گویا ع

"آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے!"

لیکن یہ ساری نوک جھونک غیر مفید بلکہ نقصان دہ ہے۔ اصل اہمیت اس مسئلہ کی ہے کہ ہم غور کریں کہ آیا دینِ حق اس وقت "الحق یعلوا ولا یعلی" کے مصداق غالب و سربلند ہے یا سرنگوں اور پامال! بقول حالیؔ مرحوم:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے ۔۔۔ اِسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد ۔۔۔ دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اور ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے ۔۔۔ امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے ۔۔۔ پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

پھر اگر معاملہ واقعی مغلوبیت اور پامالی کا ہے تو اس صورتِ حال کی تبدیلی کا صحیح نہج کیا ہے۔؟ اور کیا اس ضمن میں وہی راہِ عمل درست اور صحیح نہیں ہے جو تجویز کی تھی ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء مولانا ابوالکلام آزاد نے، اور جس کی کامل تصویب و توثیق فرمائی تھی "استاذ الاساتذہ" (یہ الفاظ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے ہیں) اور 'شیخ الشیوخ' امام الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے اس وقت جبکہ ان کی حیاتِ مستعار کا دیا ٹمٹما رہا تھا اور وہ سفرِ آخرت کے لئے بالکل پابرکاب تھے! ـــــ اور اگر اس وقت ان کے ایماء کے مطابق ایک قدم اس لئے نہ اٹھایا جا سکا کہ غیر آبادی مکتبِ فکر کے ایک عالمِ دین نے ایک صحیح اور درست لیکن خالص فنّی نوعیت کا اعتراض کر دیا تو کیا اس کے بعد سے آج تک ان کے تلامذہ اور متوسلین میں سے کسی نے خاصۃً اس طریق کار پر جدّ و جہد کا آغاز کیا ؟ ؟

محترم! ع "ہمت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا!" کے مصداق ذرا اکرہمت کیجئے اور ان امور پر غور فرمائیے کہ:۔

(۱) کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ علی گڑھ اور دیوبند کے مابین جس خلیج کو ابتدا ہی میں پاٹ دینے کی کوشش کی تھی حضرت شیخ الہندؒ نے، وہ اس کے بعد روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی اور مسلمانانِ برصغیر کی ملّی اور قومی زندگی کا اصل دھارا علی گڑھ کے زیرِ اثر آتا

چلا گیا ___ اور علماء کی حیثیت زندگی کی اصل منجدھار سے ہٹی ہوئی ایک پتلی سی دھار کی ہوتی چلی گئی ___ تاآنکہ اب وہ اپنے محدود دائرۂ اثر کے جزیروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور یہ جزیرے بھی دن بدن " نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا " کے مصداق روز بروز مختصر سے مختصر تر ہوتے چلے جا رہے ہیں؟

(۲) پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ طبقۂ علماء کی وہ آخری شخصیت تھے جنہوں نے جو کام بھی کیا، اپنے بل بوتے پر کیا ___ جس کا اصل نقشۂ کار بھی ان ہی کے ذہن کی پیداوار تھا ___ اور اس پر عملی جدوجہد کی قیادت و رہنمائی بھی خود ان ہی کے ہاتھ میں تھی ___ ان کے بعد سے برصغیر میں قومی اور عوامی سطح پر علماء کرام کی مختلف تنظیموں کی حیثیت عظیم تر اور سیکولر مزاج سیاسی تحریکوں کے ضمیموں کی رہی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسی عظیم شخصیت کی قیادت کے باوصف جمعیت العلماء ہند کی حیثیت کانگریس کے ضمیمے سے زیادہ نہ تھی ___ اسی طرح مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسی نابغہ شخصیت کی قیادت کے باوصف جمعیت علماء اسلام کی حیثیت مسلم لیگ کے ضمیمے سے زیادہ نہ تھی ___ اور یہی صورتِ حال آج تک جاری ہے کہ اس وقت بھی حلقۂ دیوبند کے سیاسی اور عوامی مزاج کے حامل علماء کرام اپنی تمام تر جلالتِ شان اور مرتبہ و مقام کے باوصف یا موجودہ فوجی آمریت کا ضمیمہ ہیں یا ایم آر ڈی کا ___ اور یا پھر جماعتِ اسلامی کے مانند " نیمے دروں، نیمے بروں " بلکہ صحیح تر الفاظ میں " نہ اِدھر نہ اُدھر " کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں (اور کم و بیش یہی حال بریلوی مکتبۂ فکر اور اہل حدیث حضرات کی قیادت کا ہے۔

(۳) پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ علماء کرام جمعہ و جماعت، درس و خطابت، افتاء و ارشاد ایسی اہم خدماتِ جلیلہ اور قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صداؤں اور دینی علوم کو زندہ رکھنے کے عظیم کارنامے ___ اور دینِ حق اور شریعتِ حقہ کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کے خلاف مساعی عظیمہ کے باوصف غلبہ و اقامتِ دین کے مثبت مقصد کی جانب کوئی قابلِ لحاظ اور مؤثر اجتماعی تحریک نہیں چلا پا رہے ؟ ___ علماء دیوبند کے ایک حلقے سے تبلیغ دین کے عنوان سے جو عظیم حرکت شروع ہوئی اُس میں شک نہیں کہ وسعت کے اعتبار سے اس کی کوئی نظیر حال میں تو کیا ماضی میں بھی

نہیں ملتی۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ وہ بھی انفرادی اصلاح کے مرحلے سے آگے بڑھ کر کسی خطۂ ارضی پر دینِ حق کے واقعی قیام و نفاذ کے لئے کوئی راست اقدام، کرنے کے بارے میں سوچنے پر بھی آمادہ نہیں!

اندریں حالات ـــــ کیا وقت کا اصل تقاضا یہ نہیں ہے کہ :

۱۔ ایک خالص دینی تحریک ـ خالصۃً غلبہ و اقامتِ دین کے مقصد یا بالفاظِ دیگر "اسلامی انقلاب" کے لئے برپا ہو۔ جس میں علماءِ کرام اور جدید تعلیم یافتہ دونوں حلقوں کے لوگ شامل ہوں۔ اور یہ تحریک وقتی مسائل و واقعات اور خالص سیاسی حالات کی کروٹوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اصلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین (محمد رسول اللہ والذین معہ) کے اسوۂ مبارکہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور تبعاً ماضیٔ قریب کی خالص اسلامی تحریک "تحریکِ شہیدین" کے طریقِ کار اور تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے ابتداءً "وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا" کے مصداق "الہدیٰ" کی سیفِ قاطع کے ذریعہ الحاد، دہریت، زندقہ اور کفر و شرک کے خلاف جہاد کے لئے پیش قدمی کرے اور وقت آنے پر غلبہ و اقامتِ دین کے لئے راست اقدام، کرے اور یا اس میں بالفعل کامیاب ہو یا کم از کم "مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝" کے مصداق جانوں کا ہدیہ تو بارگاہِ خداوندی میں پیش کر دے۔

۲۔ اس کے لئے تنظیم کی اساس مغرب سے درآمد شدہ اور فی الوقت عمومی طور پر مروّجہ طریقوں پر نہ ہو بلکہ "بیعتِ سمع و طاعت و ہجرت و جہاد" کی منصوص، مسنون اور ماثور اساس پر ہو۔

اب اگر ایک حقیر و ناتواں انسان نے وقت کے اس تقاضے پر لبیک کہتے ہوئے اس کام کا بیڑا اٹھا ہی لیا ہے تو کیا علماءِ کرام بالخصوص اس حلقے سے وابستہ حضرات، جو حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت کے پوری طرح قائل ہیں اور مولانا آزاد مرحوم کو بھی کسی نہ کسی درجے میں داپناتے، ان کا کام یہ ہے کہ اسے طنز و تشنیع کا ہدف بنائیں یا یہ کہ نوجوان اس کا ساتھ دیں ـــــ اور بزرگ اس کی سرپرستی فرمائیں ؟ ـــــ جبکہ

۱۔ اُسے اپنی بے بضاعتی کا پورا اعتراف ہو اور وہ علماء کا حریف ہونا تو درکنار عا

دین ہونے کا سرے سے مدّعی ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو محض قرآنِ حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور دینِ حق کا ایک ادنیٰ خادم قرار دیتا ہو ۔۔۔

۲۔ اپنے بعض پیش روؤں کی غلطیوں سے تنبہ حاصل کرتے ہوئے مجتہدِ مطلق ہونے کا ادّعا تو درکنار، فقہیات میں سرے سے دخل ہی نہ دیتا ہو۔

۳۔ سلف صالحین کے اتباع اور "سبیل المؤمنین" کے التزام کو اپنے لیۓ لازم قرار دیتا ہو ۔۔۔ اور

۴۔ موجود الوقت علماء و مشائخ کی تعظیم و توقیر کرتا ہو ۔۔۔ اور اپنے آپ کو اُن کے تعاون اور سرپرستی کا محتاج سمجھتا ہو ۔۔۔ !!

آخر میں طویل سمع خراشی کے لیۓ معذرت خواہ ہوں ۔۔۔ اور امید کرتا ہوں کہ آپ اور ادارۂ "الخیر" میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ میں اپنی بات کی وضاحت کے لیۓ علمارِ کرام کی خدمت میں حاضری کو اپنے لیۓ سعادت خیال کرتا ہوں، اس کا موقع مرحمت فرمائیں تو مزید ممنون ہوں گا۔ فقط

وَالسَّلَامُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ

اسرار احمد عفی عنہ، محرم الحرام ۱۴۰۰ھ

افکار و آراء

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کی تقریر جہاد بالقرآن میثاق کے اگست و ستمبر ۸۴ء کے شماروں میں شائع ہوئی تھی۔ مؤخر الذکر شمارے میں ایک تقریر بعنوان "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات کے بارے میں علماء کے خدشات" بھی شامل تھی۔ ستمبر کے شمارے میں ان تقاریر پر تبصرہ کرنے اور اپنی آراء اور مشورے ارسال کرنے کی علماء کرام اور اہلِ دانش و بینش سے درخواست کی گئی تھی۔ تا دمِ تحریر اس ضمن میں جو تبصرے اور آراء موصول ہوئی ہیں وہ بے کم و کاست اور ہماری جانب سے کسی تبصرے کے بغیر پیشِ خدمت ہیں۔ (ج۔ر) — (۵ر ۱۰ر ۸۴)

مکتوب جناب ڈاکٹر غلام محمد صاحب مدظلہ ۔ کراچی

محترم المقام مولانا ڈاکٹر صاحب! زاد فضلہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میثاق بابت ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ میں "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریک" والی آپ کی قلمبند تقریر سے استفادہ کا موقع ملا، انشاء اللہ یہ "توضیحِ خدشات" اس نوعیت کے شبہات کے ازالہ میں مؤثر ثابت ہوگی۔ اس شمارے کے اداریہ میں اس خطاب پر تبصرے کی اپیل پڑھ کر خیال آیا کہ بربنائے تعلقِ خاطر جو باتیں قابلِ عرض محسوس ہوئیں گوش گذار کر دوں — اس سلسلہ میں میری صرف دو معروضات ہیں: ایک تو یہ کہ اس قسم کے اہم اور نازک موضوعات اگر خود آنجناب کے قلم سے تحریر ہو جایا کریں تو لفظی احتیاط اور پیرایۂ اظہار کی خوبی اور افزوں ہو سکے گی۔

دوسرے یہ کہ "انابنت اور عجب" سے اپنی ذات کی برأت کا اظہار محلِ نظر ہے۔ عبدیت کی شان تو یہی ہے کہ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ کا اعتراف رہے۔ نجومِ ہدایت حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حیات میں یہی وصف عیاں ہے۔ "نافق حنظلہ" والا حضرت حنظلہؓ کا اضطراب ہو یا حضرت عمرؓ کا اپنے بارے میں یہ اظہار کہ لیتنی لم اکن شیئا، لیتنی کنت نسیاً منسیاً وغیرہ سب یہی درس فراہم کرتا ہے۔ صوفیاء کرام نے اس حقیقت کو سمجھا۔ اسی لئے ان سے جب پوچھا گیا کہ اخلاص کی شناخت کیا ہے تو فرمایا کہ عدم رؤیۃ الاخلاص فی الاخلاص۔ حضرت شیخ سعدیؒ نے اپنے شیخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی وصیت بھی اسی مفہوم کی ایک قطعہ میں منظوم

کی ہے کہ ؎

مرا پیرِ دانائے روشن شہاب ۔۔۔ دو اندرز فرمود بر روئے آب۔!
یکے آں کہ بر خویش خوش بیں مباش ۔۔۔ دگر آنکہ بر غیر بد بیں مباش

اس سے زیادہ عرض غیر ضروری ہے ۔ اور یہ جسارت بھی آں مخدوم کے ایماء اور رفقاء خدلانہ تبصرہ طلبی کی بنا پر ہوئی ـــــ اللہ تعالیٰ ہم سب کی لاج دونوں جہاں میں رکھے اور اپنی رضامندی کے کاموں پر استقامت کاملہ عطا فرمائے ۔

عرض جسارت پر معافی اور امید عفو کے ساتھ دعا کا ملتجی ہوں ۔ والسلام مع الاکرام

(۲)

مکتوبِ جنابِ مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی مدظلہ، ادارہ رحیمیہ دہلی

محترم جناب ڈاکٹر صاحب ! سلام مسنون

تنظیم اسلامی کے دونوں پرچے برابر پہنچ رہے ہیں شکریہ تنظیم کا سارا لٹریچر خاکسار کے مطالعے میں رہتا ہے اور جامعہ رحیمیہ کے اساتذہ بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں ۔

درس تفسیر کے طلبہ کو بھی تاکید کی جاتی ہے کہ وہ اسے بغور مطالعہ میں رکھیں ۔ بڑا استفادہ ہوتا ہے ۔

تازہ "میثاق" میں علماء اور دینی مدارس سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ دعوتِ قرآنی کے نظام پر اپنی رائے دیں ۔

آپ نے قرآن کریم کی بنیادی دعوت کو جس ترتیب اور تنظیم کے ساتھ پیش کیا ہے وہ وقت کی اہم ضرورت ہے ۔

جن حضرات نے دعوتِ قرآنی کے ساتھ عقائد، کلام اور فقہ کے جزوی مسائل میں اپنا دامن الجھایا وہ اس دعوت کا حق ادا کرنے میں کماحقہ، کامیاب نہیں ہو سکے ۔

دعوتِ قرآنی اور اجتہادی مسائل میں الجھنا دونوں چیزیں الگ الگ ہیں ـــــ ضرورت اس امر کی ہے کہ کچھ اللہ کے بندے اپنی جد وجہد کو اسلام کی بنیادی دعوت تک محدود رکھیں اور اس امت کو خیر امت بنانے کے لئے ان کے فکر و عمل میں اسے بٹھائیں، جمائیں اور اس کے عملی تقاضوں کے لئے سرگرم عمل کریں ۔

حضرت امام ولی اللہؒ نے دعوتِ قرآنی سے اپنی اصلاحی اور تجدیدی سرگرمیوں کا آغاز کیا ۔ اسی لئے شاہ صاحب کے ہاں اجتہادی مسائل کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے ۔ اور فقہی مسائل میں شاہ صاحب کے ہاں توسع ملتا ہے ۔

آپ نے شاہ صاحب کے طریق فکر کو اپنا کر صحیح راہ اختیار کی ہے ۔ مخالفین نے شاہ صاحب کی راہ میں

بھی اڑچنیں پیدا کیں اور انہیں اس راہ سے ہٹانے کے لئے سازشیں پھیلائیں مگر شاہ صاحب اور ان کے جانشین اس راہ پر قائم رہے۔

شاہ صاحب کا اصلاحی جہاد جب قلمی جہاد سے جہاد بالسیف کی منزل میں داخل ہوا تو تحریک جہاد میں شاہ صاحب کی حکمتِ عملی قائم نہ رہی ـــــ اور نتیجہ میں تحریکِ جہاد درمیان میں ٹھنڈی پڑ گئی ـــــ

آپ نے قرآنی دعوت کو مرحلہ وار جس سائنٹفک طریقہ سے واضح کیا، وہ قابلِ تعریف ہے۔

خدا کرے کہ آپ اس دائرے سے باہر نہ ہوں، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ اپنی انتہا پسندانہ تنقیدوں میں نیک نیت تھے مگر مرحوم کے قلمی جہاد کا وہ حصّہ لوگوں کے لئے تشویش کا سبب بن گیا اور ماضی کے حالات کے پیش نظر علمائے حق کو بھی خوف زدہ کر دیا۔ اس سے مودودی صاحب کی جدوجہد کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا۔

تنقید اسی حد تک ٹھیک ہے جس حد تک قرآن حکیم کی دعوت کو فائدہ پہنچے۔ محض علم و تحقیق کا مظاہرہ دعوتِ حق کی راہ میں مشکلات پیدا کرتا ہے۔

دعوتِ حق کی سیدھی ٹکر اس نام نہاد مسلم طبقہ سے ہے جو اسلامی احکام کے اجراء کو اپنی تعیش پسندی کے لئے موت کا پیغام سمجھتا ہے۔

اسی طبقہ کی وسیع سازشوں اور فریب کاریوں سے پیچھا چھڑانا دعوتِ حق کے خدّام کے لئے مشکل کام ہے پھر ہر طرف تیر چلانے اور سب کو للکارنے سے کیا فائدہ؟ آپ نے سلف صالحین اور معاصر علماء کے ساتھ احترام اور ادب کا اسوہ اختیار کر کے اس نکتہ کو سمجھا ہے۔

اب ضرورت اس کی ہے کہ دعوتِ قرآنی کے خدوخال واضح کرنے اور اس کی بنیاد پر ایک تنظیم کی تشکیل کرنے کے ساتھ ہی اصلاحِ معاشرہ کا عملی پروگرام وضع کیا جائے۔ اور اصلاحِ معاشرہ کی جدوجہد مثبت طریقوں پر جاری کی جائے۔ منفی طریقوں سے امکان بھر بچنے کی کوشش کی جائے۔

انقلاب قیادت جیسے نعروں کا پاکستان میں جو حشر ہوا وہ سبق آموز ہے۔

مولانا مودودیؒ ہر قدم پر یہ فرماتے رہے کہ دعوتِ حق کا کام کرنے والے حسبِ استطاعت مکلف ہیں، مگر مرحوم نے مسلم معاشرہ کی صحیح کمزوریوں کا صحیح جائزہ لئے بغیر استطاعت اور ماحول کے تقاضوں سے بے نیاز ہو کر شرعی لڑائی چھیڑ دی، مرحوم اپنی تاریخ ضرور بنا گئے مگر وہ دعوتِ حق کی تحریک کا کام کرنے والوں کے لئے مایوسیاں چھوڑ گئے۔

اب اقامتِ دین کی تحریک کی ناکامی ـــــ اور وہ بھی ایک مسلم اسٹیٹ میں ـــــ مخالفین کے لئے مثال بن گئی ہے۔

خمینی صاحب کی طرح یہ احمقانہ نعرہ کون لگائے کہ مسلمان کی منزل شہادت ہے ـــــ گردن کٹانا ہے خون بہانا ہے اور بہشت میں گھر بنانا ہے،

دعوتِ حق کو اس خون بہانے سے کچھ ملے یا نہ ملے بس خون بہا دو ۔
اسلام میں پہلی منزل ـــــ وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ ـــــ کی ہے اس کے بعد ـــــ وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا ـــــ کی ہے ۔
جماعت کے تمام رفقار کی خدمت میں سلام مسنون ۔ کراچی کے دونوں واحدوں کو سلام پہنچادیں۔
صاحبزادگان گرامی کی خدمت میں بھی اور بھائی جمیل الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی ـــــ
نومبر کے شروع میں لاہور آنے اور آپ کی ملاقات کا شرف حاصل کرنے کا ارادہ ہے ۔ خدا تعالیٰ خیر و عافیت رکھے ، والسلام

(۴)

مولانا سید وصی مظہر صاحب مدظلہ العالی

تنظیم اصلاح و خدمت۔ حیدرآباد و سابق میئر حیدرآباد و یکے از مستشارین تنظیم اسلامی

مکرمی جناب بھائی جمیل صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ
کافی مدت کے بعد آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر صاحب کی سرگرمیوں اور دیگر حالات کا علم ہوا ۔ ڈاکٹر صاحب اپنی صحت کا لحاظ کئے بغیر حد سے زیادہ مشقت کرتے ہیں ۔ میرے خیال میں ان کو ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق مکمل آرام کرنا چاہیئے ۔
" قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات " میں بہت فکر انگیز باتیں کہی گئی ہیں ۔ مولانا اصلاحی صاحب نے رجم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس پر گرفت بالکل درست معلوم ہوتی ہے ۔ مولانا اصلاحی صاحب نے ایک گناہ گار مگر تائب صحابی کے بارے میں جو زبان استعمال کی ہے وہ یقیناً قابلِ اعتراض ہے ۔ پھر روایات کے نام پر جو دعویٰ انہوں نے کیا ہے اس کو ثبوت کے ساتھ پیش کرنا ضروری تھا ۔
جن نوجوان کی تحریروں پر ڈاکٹر صاحب نے اعتراض کیا ہے وہ میرے پاس موجود نہیں اس لئے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔
ایک اصولی بات میں یہ ضرور کہوں گا کہ اصلاحی صاحب منزہ عن الخطار نہیں اور نہ انبیاء و رسل کے سوا کوئی اور منزہ عن الخطار ہے ۔ تاہم ایک یا چند غلطیوں کی وجہ سے کسی شخص کے پورے کارنامے کو مسترد کردینا وہ انتہا پسندی ہے جس کے باعث ہمارے ہاں تحقیق اور فکر و نظر کی آزادی مفقود ہو کر رہ گئی ہے ۔ والسلام!

(۴)

مولانا سید حامد میاں صاحب مدظلہ مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

میں نے ماہنامہ میثاق بابت ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ ستمبر ۱۹۸۱ء شمارہ ۹۔ جلد ۳۳ میں جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہم کا خطاب جو "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات" کے عنوان سے شائع ہوا ہے پڑھا۔

جو کچھ انہوں نے علماءِ حق کے خدمات بیان فرمائے ہیں وہ درست ہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب سمن آباد میں درس دیتے تھے تو میں نے اسی خیال سے ان سے عرض کیا تھا کہ درسِ قرآن پاک کے ساتھ درسِ حدیث بھی ضرور ہونا چاہیے اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہت اعتدال رہتا ہے۔

قرآن پاک ذو وجوہ ہے۔ یہی حضرت علی نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہم سے فرمایا تھا (جب وہ خوارج سے گفتگو کرنے جارہے تھے) کہ فقط قرآن پاک سے ہی مناظرہ میں استدلال نہ کریں بلکہ حدیث پاک سے بھی دلیل لیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ محاصرہ میں تھے تو انہوں نے ایک باغی سے فرمایا کہ قرآن پڑھ کر سنا۔ اس نے قتال وجہاد کے مضمون پر مشتمل آیات پڑھنی شروع کیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ آیتیں تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے حق میں نازل نہیں ہوئیں۔ یہ میرے اور میرے ساتھی صحابہ کے حق میں اتری ہیں اسی پر محمول کی جاسکتی ہیں۔ آج کے تمہارے پیدا کردہ حالات پر نہیں۔

اسی دور میں حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے اخطاؤا فی التاویل یعنی قرآن پاک کی توجیہ اور اس سے استدلال میں یہ لوگ غلطی میں مبتلا ہیں۔ یعنی حضرت عثمان وعلی رضی اللہ عنہما کی بات ایک ہی تھی۔

حضرت ابن عمر خوارج سے لڑائیوں کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے وہ آیتیں جو کفار کے بارے میں اتری ہیں، مسلمانوں پر منطبق کردیں ——

—— اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ میں تو ان کا مغالطہ مشہور ہی ہے۔

—— میں ڈاکٹر صاحب سے عرض کروں گا کہ:

ترجمۂ قرآن پاک میں جو امور ملحوظ رکھنے ضروری ہیں ان کی نشاندہی بھی فرماتے رہیں۔ ورنہ ڈپٹی نذیر صاحب اور جناب احمد رضا خاں صاحب کے ترجمے بھی تو موجود ہیں۔ جنہیں پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ یہ قرآن پاک میں آیا ہے۔ قرآن پاک کا ترجمہ یہی ہے۔ حالانکہ وہ سب

سے کمزور قول پسند کر کے ترجمہ کر ڈالتے ہیں ۔ اور اصلاحی صاحب اور ان کے نئے مؤید اور نہ جانے کون کون جو بالکل ہی آزاد ہو کر ترجمے کر رہے ہیں تفسیریں لکھ رہے ہیں تو ضلوا واضلوا کے مصداق بن رہے ہیں ۔ اس قسم کے لوگوں کے ، پرویز کے اور سرسید کے پیشرو معتزلہ ہیں ۔ جنہوں نے دوسری صدی میں یہ اصول ایجاد کیا کہ جو بات عقل میں آئے گی وہ ہی مانی جائے گی ۔ لہٰذا قرآن پاک کی آیات کی وہ توجیہہ کی جائے گی جو عقلاً ان کے نزدیک درست قرار پائے گی اور حدیث وہ مانی جائے گی جسے ان کی سمجھ قبول کرے گی یا اس میں ان کی عقل کے مطابق توجیہہ ممکن ہو گی ورنہ حدیث ہی کا انکار کر دیا جائے گا ۔

سرسید نے اسی اصول کو اپنایا اور معتزلہ کی دلیلیں استعمال کیں ۔ تفسیر میں بھی اور حدیث میں بھی وہ جید علماء کے شاگرد تھے اور بڑی محنت سے پڑھے ہوئے تھے ـــــ انہوں نے بہت وقت لگا کر اور اپنی پوری ذہانت صرف کر کے یہ کام انجام دیا ۔ مقالاتِ سرسید جو سترہ جلدوں میں ہیں ۔ اسی قسم کی بحثوں کا ذخیرہ ہیں ۔ چند سال قبل انکارِ مہدی پر ایک محققانہ مقالہ شائع ہوا تھا ۔ وہ اسی ذخیرہ سے لیا گیا تھا ۔ بلکہ محقق مضمون نگار نے اس کا کچھ حصہ چھوڑ دیا تھا ۔ سرسید اس سے بھی زیادہ لکھ گئے ہیں ۔

عقل کا استعمال فرض ہے مگر اصول اسلام جاننا اور ان سے نہ ٹکرانا بھی فرض اوّلین ہے ۔ اس سے غفلت ، تباہی ہے ۔

بلہ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اگرچہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسی عقل کو اگر احکامِ اسلامی کے مدلّل کرنے کی طرف لگایا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ احکامِ اسلامی ہی عقلاً درست ہیں ۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس گمراہی کی اصل صحابہ کرام ؓ کو چھوڑنا ہے ۔ اسی سے شیعہ پیدا ہوئے اسی سے خوارج ، جہمیہ اور مرجئہ قدریہ وغیرہ ۔ اور آج تک بھی جو فرقے پیدا ہو رہے ہیں یا بدعات سامنے آ رہی ہے وہ صحابہ کرام کی راہ سے ہٹنے کی وجہ سے ہیں ۔ ارشادِ مبارک ما انا علیہ واصحابی کس قدر معجزانہ ہے ۔ اگر کسی کے دل میں صحابہ کرام ؓ کی عظمت ہو گی تو وہ ان کی پیروی کرے گا اور جو ان کی پیروی کرے گا ۔ نجات پا جائیگا ۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو علماء کو جگہ جگہ عوام میں درسِ قرآنِ کریم کے اہتمام کی تجویز دی ۔ اس پر عمل سے بہت فائدہ ہوا ۔ اب بھی راولپنڈی ، لاہور، رحیم یار خاں اور خانپور وغیرہ میں اس کے اہتمام کا سلسلہ جاری ہے لیکن ہونا یہ چاہیئے کہ جہاں بھی کوئی عالم ہے وہ عوامی درسِ قرآن اور درسِ حدیث دونوں کا اہتمام کرے ۔

آٹھویں ، دسویں ، بارہویں جماعت کے لڑکوں کو اگر ائمہ مساجد روزانہ قرآن پاک کی چند

ت پڑھا دیا کریں تو یہ طبقہ رٹہ لگانے کا ایسا ماہر ہوتا ہے کہ وہ اگلے دن ان کو زبانی سنا دیا کرے۔ یہ میرا تجربہ ہے۔ اس طرح جو فائدہ ہوتا ہے وہ اندازہ سے باہر ہے۔ شاید حضرت شیخ الہندؒ ذہن مبارک میں اسی قسم کی کوئی اسکیم ہو۔ اس طرح قرآن پاک کا ترجمہ یاد کر لینے کے بعد جو س طالب علم کی ایمانی کیفیت ہوگی وہ ضرور انقلابی ہوگی اور مستحکم۔

چشتی صاحب مرحوم کی کتاب کے تذکرہ کے ذیل میں جو کتابوں میں تحریف کا ذکر آگیا ہے س کے بارے میں وضاحت فرما دی جائے کہ کتب حدیث و فقہ کی ہمیشہ شروع سے چھان بین ہوتی ہی ہے وہ اس طرح کے تصرف سے منزہ ہیں۔ محدثین کے اصول بہت سخت اور پختہ ہیں۔ اسی طرح فقہاء کے بھی۔ مذہبی امور کے پرکھنے کا سلسلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے ہی شروع ہو گیا تھا بلکہ وہ اور حضرت علیؓ اس کے بانی ہیں۔ حضرت عمرؓ گواہ طلب کرتے تھے کہ یہ حدیث جو تم بیان کر رہے ہو کسی اور کو بھی لاؤ جس نے یہ سنی ہو اور حضرت علی سب سے قسم کھلواتے تھے سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ان سے قسم کا مطالبہ نہیں کیا۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلمات سے ایک عام آدمی یہ سمجھ سکتا ہے کہ انہوں نے واقعی فضول کام میں زندگی گذاری اور ہم قرآن پاک کی خدمت کر رہے ہیں تو ہم ان سے اچھے ہوئے۔ اس لئے یہ وضاحت فرمانی ضروری ہے کہ انہوں نے جو کیا وہ درست کیا۔ کیونکہ ایک مسلمان عالم جب کوئی مسلک اختیار کرتا ہے تو اسے قدرتی طور پر دلیل کی طلب ہوتی ہے کہ میں کس دلیل سے اس راہ پر چلوں اور کیوں اس مسئلہ پر عمل کروں تو وہ مطالعہ کرتا ہے۔ مطالعہ میں دوسرے ائمہ کرام کی دلیلیں بھی سامنے آتی ہیں تو ان میں موازنہ کا مطالعہ کرتا ہے جو کتابوں میں موجود ہوتا ہے۔ یہ اس کے مطالعہ کی بنیاد ہوتی ہے اور کتابیں اتنی زیادہ اور اتنی بڑی بڑی ہیں کہ ان کا احاطہ کرنے کے لئے انسانی زندگی ناکافی ہے۔

اور ایسا آدمی جو حدیث پڑھاتا ہو حدیث کے میدان میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اس میں سے کبھی نکلنا نہیں ہوتا۔ اسماء الرجال، حالات صحابہ، تاریخ صحابہ، سیرت، جغرافیہ اور بہت سے علوم میں اسے گہرا مطالعہ کرنا اور یاد رکھنا پڑتا ہے وہ بھی اصول کے تحت۔ بے اصول نہیں، تب جا کر انور شاہ بنتا ہے۔ ان کا یہ فرمانا کہ "کس چیز میں عمر برباد کی" محض تواضعاً ہے ورنہ جس مسلک پر کوئی عالم باعمل و متقی زندگی گذار رہا ہے، اس کی دلیل اور اسے ترجیح دینا خود عین دین ہے اور فرض منصبی۔ اور یہ کہ "صواب محتمل الخطاء ہے یا خطاء محتمل الصواب ہے" ایک ابتدائی طالب علم بھی جانتا ہے مگر عالم سبق پڑھاتے وقت یہ کہہ کر جان چھڑا لے اور دلائل پر روشنی نہ ڈال سکے، یہ ممکن نہیں اور اگر ان کے فرمان کا

مطلب وہی ہوتا ہے جو بظاہر ان کے الفاظ سے سمجھ میں آرہا ہے تو مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شرح ترمذی نہ لکھتے محدیث وغیرہ پڑھاتے وہ ان کے شاگرد تھے۔ اور حضرت شاہ صاحب کے داماد حضرت مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری مدظلہم شرح بخاری نہ لکھتے۔ بس سب ایک ہی رخ اختیار کرتے۔

بات یہ ہے کہ جو بندہ خدا کو پسند ہوتا ہے اس کا آخری دنوں میں یہی حال ہوتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا عمر ضائع کر دی۔ حضرت اقدس مولانا مدنیؒ۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا محمود حسنؒ اور ان کا کیا ذکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک یہی فرماتے تھے کہ ہم نے جو نیکیاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کی تھیں وہ قائم رہ جائیں بَرَدَلَنَا اور جو کچھ آپؐ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کیا ہے وان کل عمل عملناہ بعدہ نجونا منہ کفافًا رَاسًا براس۔ بخاری ص ۵۵۷ وہ برابر سرابر ہو کر نجات ہو جائے (تو میں اسے غنیمت سمجھوں گا)۔

حضرت عائشہؓ کا جب وقت وفات آیا تو حضرت ابن عباسؓ سے تعریفی کلمات سنکر فرمانے لگیں وددت انی کنت نسیا منسیا (ان سے تعریفی باتیں سنکر) میرا جی چاہا کہ میں ایسی ہوتی کہ بھلا بھی دی گئی ہوتی۔

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اس کا بندہ اپنے اعمال کی قیمت خود نہ ڈالے۔ اس لئے آخر میں اللہ کے محبوب بندوں کی سچ مچ یہی حالت ہو جاتی ہے کہ وہ یہ بالیقین کہتے ہیں کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ زخمی حالت میں ہیں۔ آخری وقت قریب آتا جا رہا ہے۔ اس وقت ایک شخص نے تسلی کے لئے تعریفی کلمات کہے۔ تو اس کے ہر ہر جملہ کا جواب عنایت فرمایا کہ یہ جو تم نے کہا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا اور آپؐ دنیا سے جب رخصت ہوئے تو مجھ سے راضی تھے تو یہ خدا کا احسان ہے۔ جو اس نے مجھ پر فرمایا۔ اور اسی طرح ماذکرتَ من صحبۃ ابی بکرؓ جو تم نے ابوبکرؓ کے ساتھ رہنے کے بارے میں ذکر کیا کہ وہ مجھ سے خوش رہے۔ اور جب اس نے وفات پائی تو وہ مجھ سے راضی تھے یہ بھی منٌّ منَّ اللہ بہٖ علیَّ۔ خدا کا احسان ہے۔ جو اس نے مجھ پر فرمایا۔ یعنی جو اچھائیاں تھیں وہ محض احسانِ خداوندی تھا وہ میری قابلیت نہیں تھی۔

بس جس پاکیزہ بندہ کی یہ حالت وفات کے وقت ہو جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ خدا کا بہت ہی محبوب ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اس کی نیکیاں بالکل سلامت رہیں تو مولانا انور شاہ صاحبؒ کو ان کے استاذ محترم حضرت شیخ الہندؒ کی طرح ڈبل اجر ملے گا۔ انشاء اللہ

ایک اس کام کا جو انہوں نے زندگی بھر کیا۔ دوسرے ان کی اگلی نیت کا۔ ہرگز کوئی کم عقلی کر کے اس خیال میں مبتلا نہ ہو کہ انہوں نے واقعی کچھ نہیں کیا تھا۔ اگر واقعی کچھ نہیں کیا تھا تو ڈاکٹر صاحب حضرت شیخ الہندؒ کو اس صدی کا مجدد اور مولانا انور شاہ صاحب کو قدماء کی نظیر کیسے فرماتے۔؟

رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ والحقنا بہم

ڈاکٹر صاحب نے بہت عمدہ اور مفصل طرح سمجھا دیا ہے کہ آج کل فتنے کس طرح پیدا ہو رہے ان سے بچنا سب سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ ایمان سب سے بڑی دولت ہے۔ اور اس کی حفاظت سب سے بڑا اور اولین فرض ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چاروں ائمہ اور امام بخاری رحمہم اللہ کی تقلید کا اگر کوئی سننے والا یہ مطلب لے کہ جس مسلک میں جو آسان چیز نظر آئے وہ اختیار کرے تو اسے تو ائمہ اربعہ کے علماء نے بالاتفاق ناجائز فرمایا ہے۔ ہاں اس کے برعکس عمل کرنا مستحب ہے۔ معمولی سی مثال یہ ہے کہ شافعی مسلک یہ ہے کہ اگر کسی مرد کا ہاتھ ہتھیلی کی طرف سے بغیر کپڑا حائل ہوئے کسی عورت کے لگ جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی اپنی ماں کے پاؤں دبا رہا تھا اور دستانہ پہنے ہوئے تھا یا والدہ کے پاؤں پر چادر نہ تھی۔ بلا حائل پاؤں چھو رہا تھا تو وہ جب نماز پڑھنے لگے تو وضو کرے کیونکہ اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ حنفی حضرات کہتے ہیں کہ ایک حنفی شخص کے لئے بھی مستحب ہے کہ وہ دوبارہ وضو کرلے۔

اسی طرح اگر کسی شافعی شخص کے خون نکل آیا تو شافعی مسلک میں خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ لیکن حنفی مسلک یہ ہے کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں شافعی حضرات فرماتے ہیں کہ اس شافعی شخص کو دوبارہ وضو کرلینی چاہیئے یہ ان کے نزدیک مستحب ہے کیونکہ احتیاط پر عمل ہو رہا ہے اور دوسری صورت کہ ہر مسلک سے چن چن کر آسان مسائل لے لینا یہ اتباعِ ہو لقرار دیا گیا ہے اس کا نام تلفیق ہے اور یہ حرام ہے۔

ہاں البتہ اگر کوئی غیر مقلد ہو اور وہ ان ائمہ کو مقتدا مان کر بلا خواہش نفس مسئلہ کو کو راجح سمجھتے ہوئے ایسا کرنے لگے تو شاید اس کے لئے مطلقاً غیر مقلد بنے رہنے سے بہتر ہوگا۔ کیونکہ آج کل کے علماء سے مسئلہ پوچھ کر عمل کرنے سے یہ بہت زیادہ افضل ہے کہ ائمہ کی تحقیق پر چلے۔ رحمہم اللہ۔

ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مثلاً مسلک حنفی کا کوئی مسئلہ متقی علماء کی نظر میں قابل عمل نہیں رہا۔ اس دور میں اس پر عمل کرنے سے اور خرابیاں لازم آئیں گی تو ایسی صورت میں

کسی بھی دوسرے امام کا مسلک لیا جاسکتا ہے۔ مگر وہ ادھورا نہیں لیا جائے گا مکمل لیا جائے گا۔ اور وہ تمام شرائط ملحوظ رکھی جائیں گی جو اس امام کے مسلک میں ہیں اور اس پر علماء کو جمع کرکے طے کرکے اعلان کر دیا جائے گا۔ جیسے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ مرتب فرمائی ہے۔

میرے ذہن میں آجکل کے دور میں سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیات کا روزانہ صبح کو پڑھتے رہنے کا مشورہ آتا ہے۔ تاکہ یہ پڑھنے والا غلط راستے پر لگنے سے اور دجالوں کے شر سے محفوظ رہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ آمین!

(۵)

مکتوب جناب خسروی صاحب مدظلہ کراچی

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

اس خامہ فرسائی کا محرک ماہ رواں کے "میثاق" کے صفحات ۱۹ تا ۲۱ پر آپ کی طویل تحریر ہے، جس میں آپ نے کافی شرح وبسط سے ان وجوہات کا تجزیہ فرمایا ہے جن کی بنا پر یہ دورِ حاضر کے علمائے حق بھی آپ کی تحریک کی طرف سے شبہات میں مبتلا ہیں۔ آپ نے اس میں سرسید، غلام احمد قادیانی اور غلام احمد پرویز صاحبان کا تو ذکر کیا لیکن مؤخر الذکر کے مرشد مولانا اسلم جیراج پوری مرحوم کو نہ معلوم کیوں قلم انداز فرمادیا، حالانکہ اس پرویزی فتنہ کی اساس تو انہیں کی تعلیم وفکر ہے۔ پھر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا ذکر بغیر نام لئے محض اشارۃً ہی کیوں کیا! اور آج کل کراچی میں مولانا عمر احمد عثمانی صاحب فقہ القرآن' جو اس تحریک کی آب یاری میں تن من دھن سے لگے ہوئے ہیں ان کا ذکر کنایۃً بھی نہیں کیا۔

مذکورہ بالا سطور تو محض ابتدائے کلام ہیں۔ اصل بات جو عرض کرتا ہے وہ یہ کہ متقدمین علمائے حق کے متفق علیہ مسائل کی تردید کرنا تو اب متجددین کے نزدیک فرسودہ اور ناکام طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے براہِ راست وہ عوام جو ان علماء کے مجمع علیہ عقائد ونظریات کو مانتے آئے ہیں بھڑک اٹھتے ہیں۔ اب تو اس سے زیادہ لطیف طرانہ "ٹیکنیک" استعمال کی جاتی ہے یعنی متقدمین کے افکار کی تو تردید نہ کی جائے لیکن ان کے کردار کو مشتبہ کر دیا جائے۔ جب کوئی معتقد اپنے معتمد علیہ کے کردار سے ہی بدظن ہو جائے گا تو اس کے افکار کو بھی خود بخود غلط سمجھنے لگے گا۔ ویسے یہ ٹیکنیک بھی نئی نہیں ہے۔ کیونکہ سبائیوں نے اسی کو برتا کہ ان تمام لوگوں کو جن کے ذریعے سے قرآن وسنت قرنِ اوّل کے بعد امت تک پہنچے ان تمام جامعین وحافظین وناشرینِ دین کو منافق ومرتد کہہ دیا

جائے۔ یہی تیکنیک آپ کے ممدوح مودودی صاحب نے بھی اختیار کی کہ نہ صرف اجل صحابہؓ اور امہات المؤمنینؓ بلکہ انبیاء کے کردار کی بھی تنقید کے نام پر تنقیص کی تاکہ لوگ اگر منکر نہیں تو ان حضرات کی طرف سے تشکیک میں تو گرفتار ہو جائیں۔ جب ان حضرات کو نہ بخشا تو ائمہ اربعہ اور بخاریؒ و مسلمؒ کس گنتی میں ہیں! حدیث کے بارے میں تو انہوں نے دو ٹوک فرمایا ہے کہ جو "مزاج شناسِ رسولؐ" ہو جاتا ہے وہ محدثین کے قائم کردہ اصول و ضوابط کی بناء پر کسی حدیث کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ نہیں کرتا بلکہ مزاج شناسی کے اس ملکہ کی بناء پر بیک نظر سمجھ جاتا ہے کہ آیا یہ قولِ رسولؐ ہے یا نہیں۔ اگر کوئی حدیث محدثین کے نزدیک غیر معتبر بھی ہے مگر وہ اپنی اس مزاج شناسی رسولؐ کی بناء پر اسے قول یا فعلِ رسولؐ سمجھتا ہے تو وہ بلا تکلف اس پر عمل کرتا ہے۔ آپ کو تو خود معلوم ہے کہ اس جماعت کے بنیادی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے رسول اللہؐ کے کوئی شخص، حتیٰ کہ انبیاء و رسل بھی تنقید سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ چنانچہ اس اصول کو انہوں نے خود بھی دل کھول کر برتا ہے اور اپنے مقلدین پر بھی لازم کر دیا ہے۔ ویسے مودودی صاحب بھی اس معاملہ میں منفرد نہیں ہیں کیونکہ انہیں کی جماعت کی ہم فکر و عمل جماعت اخوان المسلمون مصر میں بھی موجود ہے۔ قطب شہید مرحوم نے 'قرآن کے فنی محاسن' میں انبیاء، خصوصاً حضرت موسیٰؑ کے لئے جو دریدہ دہنی کی ہے وہ اس سے کچھ کم نہیں ہے جو مودودی صاحب کی نگارشات عالیہ میں ہے (قطب شہید کے اس مضمون پر میرا ایک محاسبہ "خدام الدین" میں شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو)۔ اور رسول اللہؐ کو جو تنقید سے بالا فرمایا ہے یہ بھی تقیتہً ہے تاکہ ساری امت ہی نہ بھڑک اٹھے، ورنہ جگہ جگہ "بشری لغزش" بتا کر جو حضورؐ کے لئے لکھا ہے وہ ان کی تحریروں میں جا بجا نظر آتا ہے۔

تو عرض یہ کرنا تھا کہ جہاں آپ نے سرسیدیت، قادیانیت، پرویزیت، چکڑالویت کو واشگاف الفاظ میں فتنے لکھا ہے وہاں مودودیت کے بارے میں مداہنت کیوں دیانت سے بعید نہ سمجھی؟

اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو عرض کر دوں کہ اقبالؔ کے بارے میں جو آپ اس حد تک مدّاح ہیں تو کیا آپ نے ان کے منظوم و منثور افکار (بشمول مکاتیب و خطبات) میں کہیں کچھ مسلّمہ حقائق و عقائدِ اسلام کے خلاف نہیں پایا؟ یعنی کیا آپ اسی طرح افکارِ اقبالؔ کو منزّہ عن الخطاء باور کرتے ہیں جیسے جماعتِ اسلامی والے مودودی صاحب کو معصوم سمجھتے ہیں! اس میں شک نہیں کہ اقبال مفکر بلکہ بڑے مفکر تھے لیکن ان کی ہر فکر بے لغزش تھی اس کا دعویٰ کرنا بجائے خود کج عقیدہ ہے۔ اور باتوں کو چھوڑیئے، اقبالؔ نے نکلسن کو جو خط اپنا فلسفہ "خودی" سمجھا

کے لئے لکھا تھا، جو اب تک نکلسن کے انگریزی ترجمہ "اسرار خودی" میں شامل ہوتا ہے اور جس کا اردو ترجمہ اقبال ہی کے ایک معتبر تلمیذ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا "میثاق" کے اقبال نمبر بابت دسمبر ۱۹۷۵ء میں آپ ہی نے شائع فرمایا تھا۔ اسی کو بہ امعانِ نظر ایک بار اور مطالعہ فرما لیجئے۔ اس میں اقبال نے نکلسن کو لکھا تھا کہ "انسانِ کامل" تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا کیونکہ کاروانِ انسانیت ہنوز جادۂ ارتقاء پر گامزن ہے۔ لہٰذا انسانِ کامل تو آخر میں آئے گا جو تمام عالم میں دین نافذ کرے گا وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ وہی عقیدہ نہیں ہے جو سبائیوں کا ہے اور جس کا اعلان خمینی صاحب نے اپنی ایک نشری تقریر میں کیا تھا جس میں برملا کہا تھا۔ تمام انبیاء و رسل، بشمول محمد رسول اللہ کے ناکام رہے اور اسلام کا مکمل نفاذ تو امام مہدی (مستور) ہی کر سکیں گے۔ (اس سلسلہ میں میرا ایک طنزیہ مضمون "اقبال و خمینی کی فکری ہم آہنگی" ماہنامہ "الحق" میں شاید آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا) نکلسن کے نام اسی خط میں اقبال صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ حشر صرف ان کا ہوگا جن کی "خودی" مکمل ہو چکی ہوگی، جبکہ قرآن و حدیث کی رو سے ہر ذی روح کا حشر برپا ہوگا۔ گویا وہ لوگ تو مزے میں رہے جن کی خودی کامل نہ ہو پائی۔ مگر جو لوگ خودی مکمل کر کے مرے وہ حساب کتاب اور جزا و سزا کے مستحق ہوں گے۔ خطبات میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ تخلیق و تقدیر خدا کسی [illegible] منصوبہ کے مطابق نہیں ہوتی۔ یہ تو وہی ایک پرانے فرقہ کا عقیدہ ہے نا، کہ جب خدا کوئی فعل کر لیتا ہے تب اس کے علم میں آتا ہے۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ کیا یہ افکار و عقائد وہی ہیں جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ "در بحر فہم غیر قرآں مضمر است" تو "روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا" میں یہ نہیں کہتا کہ اقبال اساسی طور پر غلط فکر تھے بلکہ یہ کہ وہ فطری طور پر سب سے پہلے شاعر تھے اس لئے جس وقت جو خیال بندھ گیا وہ باندھ دیا۔ یعنی "فِی كُلِّ وَادٍ يَّهِيمُوْنَ" کے صحیح مصداق تھے۔ مانا کہ آپ ان کے وہی اشعار اپنی تقریروں اور تحریروں میں نقل کرتے ہیں جو آپ کے موقف کی تائید میں ہوتے ہیں لیکن اس کا اثر جو آپ کے سامعین اور قارئین پر ہوتا ہے اس پر آپ نے غور نہیں فرمایا کہ آپ کے معتقدین تو یہی سمجھتے ہیں کہ جس شخص کے مداح ہمارے ڈاکٹر صاحب ہیں اور بطور استدلال و امثال اس کے اقوال پیش کیا کرتے ہیں وہ یقیناً سو فی صد صحیح الفکر اور واقعی "مفکر اسلام" ہی ہوگا۔ لہٰذا پھر اگر کوئی غلط فکر پارہ بھی اقبال کا سنتے یا پڑھتے ہیں اسے بھی آپ کی سند کی وجہ سے مستند ہی سمجھتے ہیں۔ اقبال کی اسی فکری کوچہ گردی کی وجہ سے تو سوشلسٹ اور کمیونسٹ تک اس کے اشعار کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ انہیں پر موقوف نہیں، خواہ بالکل جاہل بھی کوئی ہو، ہر شخص کی فکر میں ارتقاء ہوتا ہے لیکن یہ فروری نہیں کہ صحیح سمت میں ہو۔

اس نفر خراشی کی جرأت اس وجہ سے کی ہے کہ میں خالصۃً لوجہ اللہ ابھی تک تو آپ سے ایسی

ہی عقیدت اور محبت رکھتا ہوں جیسی مودودی صاحب سے تقسیم ہند تک تھی۔ لہٰذا آپ کی تحریروں کو بغور پڑھتا بھی ہوں اور تجزیہ بھی کرتا ہوں۔ کئی بار کسی فقرہ سے تکدر بھی ہوا (جیسے اتحاد بین المسلمین کی تبلیغ میں مسلمانوں کے مختلف مکاتیبِ فکر کے ساتھ اہل تشیع کو بھی شامل کر دینا) مگر یہ جرأت نہیں کی۔
اب آپ کی اس تحریر نے خود بخود یہ تحریک کی کہ آپ سے درخواست کروں کہ جب آپ نے اپنی دعوت الی القرآن کی وضاحت کے سلسلہ میں پرویزیت وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے تو مودودیت پر بھی دیانت کے ساتھ اور کھلے دل سے اپنے موقف کو بیان فرمادیں کہ متقدمین علمائے حق کے افکار اور مجمع علیہ عقائد و نظریات کے متعلق لوگوں میں شکوک پیدا کرنے سے بڑا فتنہ ان دنوں یہ ہے کہ ان حضرات کے کردار کو لوگوں کی نگاہوں میں داغدار بنادیا جائے تاکہ پھر ان کے افکار و عقائد خود بخود ہی مشکوک سمجھے جانے لگیں۔ اقبال کے متعلق بھی آپ کی طرف سے یہ وضاحت ضروری ہے کہ آپ جو ان کے اقوال نقل کیا کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ ان کے سارے ہی افکار و اقوال کو معتبر سمجھا جائے بلکہ جو قرآن و سنت کی کسوٹی پر پورے اتریں وہ صحیح ہیں اور جو مسلمہ عقائد کے خلاف ہوں وہ مغربی فلسفہ کا اثر ہے۔
امید ہے کہ میری یہ معروضات تکدر طبع کا باعث نہ ہوں گی اور ان کی روشنی میں آپ کی واضح تحریر میثاق کی قریب ترین اشاعت میں شامل ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خیالات صرف میرے ہی نہیں بلکہ ان میں آپ کے اور بھی بہت سے مداح اور میثاق کے قارئین میرے شریک ہوں گے۔ بہتر تو یہ ہے کہ یہ عریضہ ہی من وعن شائع فرما کر اسی کے ساتھ جواباً آپ کی تحریر شائع ہو تاکہ قارئین سوال و جواب کو بیک وقت پڑھ سکیں۔
آپ کے اسی پیش نظر مضمون کے سلسلہ میں (جو علما آپ کی تحریک کی طرف سے متشکک ہیں) ایک دلچسپ تحریر ماہنامہ "الخیر" (ملتان) کے شوال ۱۴۰۴ھ کے شمارے کے صفحات ۴۴ تا ۴۶ پر "ڈاکٹر اسرار احمد سے استفسار" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ یہ "استفسار" جنوری ۱۹۸۴ء کے "میثاق" میں آپ کے مضمون کے سلسلہ میں ہے اس "استفسار" میں آپ سے پوچھا گیا ہے کہ آپ نے جو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی حیثیتِ امام الہند کا ذکر کیا ہے وہ کہیں اپنے امام پاکستان بننے کی طرف تو پیش قدمی نہیں ہے؟ میں نے اس کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا یوں ضروری سمجھا تاکہ آپ کے علم میں آجائے کہ آپ کی تقاریر و تحاریر سے کس قسم کے شکوک پیدا ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ والسلام، خضر دی!

(۶)

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی صاحب

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا تعارف چند سال سے حاصل ہے جبکہ ان کی تقاریر و رسائل پڑھنے سننے کا اتفاق تو بہت پہلے ہوا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام تو بہرحال معصوم ہیں اور ان کے بعد یہ

شرف کسی کو حاصل نہیں، تاہم صحابہ کرام علیہم الرضوان کی محفوظیت ایک مسلمہ حقیقت ہے اور ایسا ہونا اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا تھا کہ وہ جاہلیت کے بھرپور دور میں اپنے آخری رسولؐ کی صحبت و رفاقت اور دین کی حمایت و نصرت کے لئے ان کا انتخاب کرے۔ ان کے بعد قرناً بعد قرن ایسے حضرات دنیا میں آتے رہے جو اپنی زندگیاں دینِ اسلام کی حمایت و نصرت میں کھپاتے رہے۔ ان حضرات میں سے کسی کے لئے معصومیت چھوڑ محفوظیت کا دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا، تاہم یہ کہنا درست ہوگا کہ ان زمانوں میں ہزار ہا ہزار ایسے لوگ تھے جن کی زندگیوں میں خیر غالب تھا اور ان کے دل دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اپنے اندر درد رکھتے تھے۔ ادھر ہر زمانہ میں ایسے بھی لوگوں کی کمی نہیں رہی جو بڑے خوبصورت دعاوی کے ساتھ میدان میں آئے اور "کلمۃ حق ارید بہا الباطل"[1] کا رول ادا کرتے رہے۔ اس زمانہ میں بھی ایسے لوگ بہت ہیں اور ان کا بالعموم رویہ ایسا ہے کہ وہ قرآن کے نام سے اپنا مشن جاری کرتے اور تحریکات اٹھاتے ہیں۔ قرآن اور حمایت و نصرتِ دین کے حوالہ سے لوگوں کا ایک طبقہ جب ان کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو وہ یکدم ایسا پلٹا کھاتے ہیں جس کے نتیجہ میں قرآن و سنّت کی نت نئی تعبیرات اور اسلاف پر عدم اعتماد کا دروازہ کھل جاتا ہے جس کی متعدد مثالیں ہمارے سامنے ہیں ــــ ایسی صورت پیدا ہو جانے کے بعد علماءِ کرام جنہیں بجا طور پر "ٹریفک کے سپاہی" کا مقام حاصل ہے، ایسے لوگوں اور حضرات و افراد سے خلقِ خدا کو متنبہ کرتے ہیں اور انہیں احساس دلانے کی سعی کرتے ہیں ــــ تاکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق بے راہ روی سے محفوظ رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس حالیہ خطاب میں جو انہوں نے جامع دارالسلام باغِ جناح میں ارشاد فرمایا، بعض ایسے ہی افراد کی نشاندہی کی ہے اور بڑی دلسوزی سے کہ اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ نسل در نسل منتقل ہونے والے دین کو اسی انداز سے برتا جائے جو قدیم طریق ہے تو اسی میں خیر ہے ــــ رہ گیا معاملہ جدید تمدنی مسائل اور ان پر غور و فکر کا، تو ظاہر ہے کہ ہر اہلِ آدمی ایسا کام کر سکتا ہے بلکہ کرنا چاہیئے تاکہ اسلام کے روشن رویئے پر یہ حرف نہ آئے کہ وہ جاری زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا تاہم یہ فرد رہے گا کہ اس آڑ میں مسلّمات مجروح نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس خطاب کو نافع بنائے اور ہم سب کو اپنے اسلاف گرامی سے وابستہ رکھے۔

(۷)

مکتوب جناب محمد عبدالبر صاحب مدظلہ ناظم شعبہ اشاعت التحید والسنۃ، کراچی ڈویژن

محترم و مکرم جناب مدیر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

---

[1] "بات درست اور صحیح لیکن اس سے مراد غلط اور باطل"

قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات اور ان کے بارے میں علماء کرام کے خدشات" کے عنوان سے محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب وقت کی اہم ضرورت پوری کرتا ہے اور "خدشات" کا ممکنہ حد تک "شافی" جواب بھی ہے۔ لیکن ان خدشات کی وجوہات اور ___ قرآن کے نام پر اٹھنے والے فتنوں کے طریق کار کے حوالہ سے توضیح اس حیثیت سے "تشنۂ شفا" رہ گئی ہے کہ علماء کرام کے اس قسم کے خدشات دراصل اس بنا پر ہوتے ہیں کہ قرآن اور علوم دین کی خدمت کا بیڑا اچانک ایسا شخص اٹھانے لگتا ہے جس نے ان سرچشموں اور ذرائع سے علم حاصل نہیں کیا ہوتا جو علماء کرام کے ہاں معروف یا مسلّم ہوتے ہیں۔ جیسے مودودی صاحب مرحوم یا ان بزرگ کا معاملہ ہے جن کی مثال ڈاکٹر صاحب نے اپنے مذکور خطاب میں دی ہے۔ ایسا شخص فطری طور پر فریفتہ بنتا ہے اور عجب کا شکار ہو جاتا ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے علماء کرام کی طرف رجوع اور اس پر عمل کا جو ذکر کیا ہے اس پر اگر وہ سختی اور خلوص سے کاربند رہے تو ان کے بارے میں "خدشات" کا قلع قمع ہو جائے گا۔ یہ ملحوظ رہے کہ علماء کرام سے ربط و تعلق محض "رسمی" اور خانہ پُری کے طور پر نہ ہو۔ بلکہ باقاعدہ استفادہ کی نیت سے ہو اور ان کے "افادات" کو وہ مقام دیا جائے جس کے وہ مستحق ہیں۔

اس ضمن میں یہ گذارش بھی بے محل نہ ہوگی کہ کوئی بڑا مسئلہ، محورِ دعوت بنانے سے پہلے وقت کے مشاہیر علماء سے "منظور" کروا لینا چاہیئے۔ مثلاً "دینی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے بیعت کا طریق کار" ایک ایسا مسئلہ ہے جو بہر حال ایک پہلو سے نزاعی بن گیا ہے۔ اگر اس سلسلہ میں "اہل علم" سے پہلے "استصواب" کرا لیا گیا ہوتا تو بعد میں "فتویٰ" اور اس سے بڑھ کر "اختلافات و خدشات" پیدا ہونے کی نوبت نہ آتی۔ "جدید اصطلاحات" کے حوالے سے توحید کے بدیہی استدلالات پیش کرنے کا مقصد، میری ناقص رائے کے مطابق، یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ شرعی اصطلاحات جو صدیوں سے متوارث اور منقول چلی آ رہی ہیں، کی اہمیت و افادیت کا انکار کر دیا جائے یا انہیں بدل دیا جائے۔ ورنہ "عرضِ احوال" کے آخری پیراگراف میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کی ایک تطبیقی مثال یہ بھی بن جائے گی۔ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ يَهْدِي السَّبِيْلَ۔

فقط والسلام

(۸)

مکتوب جناب ایس۔ بی علی صاحب مدظلہ۔ کراچی

جناب محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کے ماہنامہ "میثاق" ماہِ ستمبر ۱۹۸۴ء میں آپ کا مطبوعہ خطاب "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات اور ان کے بارے میں علماء کرام کے خدشات" حقائق پر مبنی ہے اور

فتنوں کا آپ نے تذکرہ کیا ہے ان سے کوئی انکار نہیں کر سکتا. لیکن تعجب ہے کہ آپ جیسا صاحب بصیرت ایک ایسے فرقہ کی فتنہ انگیزیوں کو نظر انداز کر گیا جو بارہ سو سال سے جسدِ اسلامی میں زہر پھیلا رہا ہے جس نے اسلامی عالمی اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور آج بھی وہ انہی ریشہ دوانیوں میں معروف ہے۔ اس سے میری مراد شیعہ فرقہ ہے۔ جو تحریفِ قرآن۔ تحریفِ کلمہ۔ الوہیت علیؓ ائمہ کا معصوم من الخطا اور حاملِ وحی ہونے کا قائل ہے۔ اور یہ بات انہی کی مستند کتابوں میں مثلاً اصول کافی۔ رجال کشی وغیرہ سے ثابت ہے۔ نیز جس کے متعلق مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا فتویٰ ہے کہ وہ کافر ہیں۔ فتویٰ درج ذیل ہے۔

"شیعہ واقعی کافر ہیں کیونکہ وہ قذف ام المؤمنینؓ اور سب الشیخینؓ کے علاوہ تحریف فی القرآن کے قائل ہیں"

اس پر کئی سنی اکابرین کے دستخط ہیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ۔ مولانا منظور احمد نعمانی مدیر الفرقان۔ مولانا محمد ابراہیم (دیوبند)۔ مولانا انوار الحق امروہہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بریلوی مکتب فکر کے بانی مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی نے شیعوں کے رد میں مستقل کتاب "ردالرفضہ" لکھی ہے جس میں ان کا کفر واضح کیا ہے۔ یقیناً یہ سارے حوالہ جات بلکہ اس سے زیادہ جناب والا کے علم میں ہونگے لیکن "رجم" کے سلسلہ میں شیعہ فرقہ کے تمام (Schools) کو سنی مسلک کے چاروں ائمہ کی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔ ملاحظہ ہو ماہنامہ میثاق ص۱۹۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیعہ فرقہ دائرہ اسلام میں شامل ہے اور اسطرح ہم (نعوذ باللہ) بالواسطہ ان کے نظریہ تحریف قرآن۔ تحریف کلمہ ائمہ کا معصوم عن الخطا اور حامل وحی ہونا تسلیم کر رہے ہیں جو ختم نبوت کے مسئلہ کو بھی مشکوک کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے دین کی اساس کیا ہو گی؟

اس سلسلہ میں جناب سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ براہ کرم آپ رہنمائی فرمائیں تاکہ میری طرح اور بہت سے لوگ جو ذہنی خلش کا شکار ہیں، صحیح صورتِ حال سے واقف ہو جائیں۔

برائے توجہ!

قارئین میثاق سے گذارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں (شکریہ)

رفتارِ کار

ماہِ ستمبر کا پہلا اور دوسرا ہفتہ دعوتی سرگرمیوں کے لحاظ سے بڑا بھرپور گزر رہا ہے۔ پہلے ہفتہ کی سرگرمیوں کی روداد میثاق اکتوبر میں آچکی ہے۔ ۷ ستمبر کو امیرِ محترم نے مسجد دارالسلام میں عید الاضحیٰ کی نماز کی امامت کی اور خطبہ ارشاد کیا۔ چونکہ ۱۰ ذی الحجہ کو جمعہ تھا۔ لہٰذا خطاب جمعہ کا بھی اہتمام ہوا۔ ۹ ستمبر کو امیرِ محترم کراچی تشریف لے گئے۔ جہاں جامع العفا شریف آباد عقب الاعظم اسکوئر میں ۹ اور ۱۰ ستمبر کو بعد نماز مغرب سورہ تغابن کا درس مکمل کیا۔ سورۂ تغابن کو ایمانیات ثلاثہ اور ان کے ثمرات و نتائج کے ضمن میں جو اہم مقام حاصل ہے اس سے ہر وہ شخص جو قرآن حکیم سے شغف رکھتا ہو۔ بالعموم اور رفقاءِ تنظیم بالخصوص اچھی طرح واقف ہوں گے۔ ۱۱ ستمبر کو عام تعطیل تھی۔ لہٰذا اس روز تنظیم اسلامی کراچی کا ایک خصوصی اجتماع رکھا گیا تھا جس میں امیرِ محترم نے شرکت فرمائی اور مختلف تنظیمی اور دعوتی مسائل پر اس اجتماع میں سیر حاصل تبادلۂ خیال اور گفتگو ہوئی ـــــ کراچی سے امیرِ محترم کی واپسی ہوئی۔ موصوف مسلسل دوروں کے سبب کافی مضمحل نظر آرہے تھے۔ تکان کے اثرات نمایاں تھے لیکن بایں ہمہ ۱۲ ستمبر کو امیرِ محترم نے لاہور چھاؤنی میں جناب محمود احمد صاحب کے مکان پر بعد نماز مغرب شرکت کی جس میں علاقے کے نمایاں حضرات مدعو تھے۔ امیرِ محترم کی تشریف آوری سے قبل راقم نے تنظیم اسلامی کی دعوت سے شرکاء کو متعارف کرایا۔ بعدہٗ امیرِ محترم جب تشریف لائے تو آپ نے بھی اختصار کے ساتھ دعوت کے اہم مبادی و خصائص بیان کئے اور شرکاء کے سوالات کے شافی جوابات دیئے۔

۱۵ ستمبر کو مسجد دارالسلام میں خطاب جمعہ میں "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے!" کے موضوع پر تفصیلی خطاب ارشاد کیا۔ حالانکہ ۱۴ ستمبر کی شب سے موصوف کمر میں شدید درد محسوس کر رہے تھے۔ اسی شب کو بعد عشاء امیرِ محترم کو جامع مسجد نواں کوٹ ملتان روڈ لاہور پر تنظیم اہل سنت والجماعت کے چالیسویں اجلاس میں تقریر کرنی تھی۔ جہاں حضرت مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری مدظلہٗ العالی بھی مدعو تھے۔ جو دعوتِ توحید اور مشرکانہ و مبتدعانہ اوہام و افعال کی تردید کے ضمن میں پاکستان گیر شہرت کے حامل ہیں۔ شاہ صاحب محترم نے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ خطاب سے قبل محفل طعام میں جس کا اہتمام عبدالرشید رحمانی نے کیا تھا شاہ صاحب قبلہ کی امیرِ محترم سے ملاقات ہوئی۔ شاہ صاحب نے میثاق میں شائع ہونے والے "الہدٰی" کے سلسلے اور اگست و ستمبر میں شائع ہونے والے امیرِ محترم کے خطابات پر موصوف کو تحسین بھی فرمائی اور ان کے حق میں دعا بھی کی۔

بعد نمازِ عشاء عالی مسجد میں محترم شاہ صاحب مدظلہٗ اور دیگر علماء کی موجودگی میں امیرِ محترم نے "توحید عملی کا اقامتِ دین سے ربط و تعلق" کے موضوع پر قریباً پونے دو گھنٹے مفصل و جامع خطاب کیا۔ یہ وہی موضوع ہے جس پر میثاق میں قسط وار امیرِ محترم کا ایک خطاب اور درس شائع ہو رہا ہے۔ کمر کے درد اور طبیعت کے مضمحل ہونے کے باوجود خاص اللہ کے فضل سے امیرِ محترم کی یہ تقریر خطابت اور اثر پذیری کے اعتبار سے خاصے کی تقریر تھی۔

چنانچہ اس تقریر سے متاثر ہو کر شاہ صاحب مدظلہ نے جن تاثرات و مشاہدات کا اظہار فرمایا انہیں ٹیپ سے منتقل کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔

"ارشاداتِ شاہ صاحب"

حضرت شاہ صاحب مدظلہ نے خطبۂ مسنونہ کے بعد سورۂ رعد کی حسب ذیل آیات کی تلاوت فرمائی:-

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ؛ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۭ وَمَا دُعَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب قبلہ نے اپنے موضوع "توحید فی الحقیقت کیا ہے؟" پر گفتگو سے قبل بطور تمہید فرمایا:

"بزرگو! بھائیو! عزیزو! ہمارے محترم و مکرم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماشاء اللہ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جس خوبی، اخلاص اور سوز اور درد دل سے توحید فی العمل یا توحید فی الطلب کو مفصل اور پورے اجزاء کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور پھر الحمد للہ کتاب و سنت کے پورے حوالے سے اور صحیح تشریح سے آپ حضرات تک فصل الخطاب کے ساتھ پیغام حق پہنچایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میرا یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے جناب محترم کی تقریر سنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے۔ اللہ تعالیٰ دین حق پر، دین قیم پر، دین خالص پہ جناب مکرم کو استقامت اور اخلاص کی نعمت نصیب فرمائے اور جس ولولے، جس جذبے، جس محنت کے ساتھ یہ رضائے الٰہی کو مقصود بنائے ہوئے دعوت حق کا کام کر رہے ہیں، تبلیغ کا حق ادا کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے اپنوں کی بھی باتیں سن رہے ہیں، غیروں کے طعن و تشنیع بھی برداشت کر رہے ہیں۔ اس کام میں وقتاً فوقتاً جو تکالیف اٹھاتے اور جھیلتے ہیں وہ ان کے لئے توشۂ آخرت بنائے اور اللہ تعالیٰ اس دعوت کو کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو توفیق دے اور اپنے فضل و رحمت سے ہماری قسمت میں یہ سعادت عطا فرما دے کہ اللہ اللہ جس طرح ڈاکٹر صاحب دل و جان سے کوشش کر رہے ہیں کہ دین توحید اجتماعی رنگ میں غالب اور نافذ ہو جائے۔ دین پورا کا پورا قائم ہو۔ اس طرح ہم بھی اس کام میں لگ جائیں۔ ان کی تو کوشش ہے، محنت ہے۔ ان کے ساتھیوں کی محنت ہے اور کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب فرمائے یہ اس کے ہاتھ میں ہے البتہ ہمیں وہ سب کچھ کرنا چاہئے جو ہم سے بن سکے۔ اس کے مصداق تو ہم نہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور اس کی قدرت کاملہ سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کامیابی عطا فرما دے۔ اس کے ہاتھ میں ہے کہ: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ صبر و استقامت اسی طرح جاری رہا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کوئی بعید نہیں کہ وہ کامیابی عطا فرما دے۔ ورنہ ایک مسلمان کہلانے والے کا جو فریضہ ہے اس کے لئے تو ماشاء اللہ ڈاکٹر صاحب نے تن من کی بازی لگائی ہوئی ہے۔ یہ محض رسمی الفاظ نہیں بلکہ میرا حقیقی تاثر ہے کہ مجھے ان کی تقریر سن کر الحمد للہ ثم الحمد للہ سب سے بڑی خوشی، سب سے بڑی راحت اور سب سے بڑا اطمینان دل کو ہوا کہ یا اللہ اس

دور میں تو نے اپنے فضل و کرم سے کسی کو تو یہ توفیق بخش دی ہے کہ وہ تیرے دین خالص کے لئے، دین حق کے لئے اجتماعی طور پر اسے کامیاب بنانے کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ اے اللہ تو اس کو بار آور فرما ـــــ مایوسی کے حالات تو ہوں گے لیکن، وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ○ اللہ کی رحمت سے مایوسی گمراہی اور کفر ہے: وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ اللہ کی رحمت سے صرف کافر لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔ باقی کچھ لوگ بعض اوقات کہہ دیتے ہیں کہ موجودہ معاشرے میں اس کام کی کامیابی مشکوک ہے۔ یہ خیال ہی سرے سے غلط ہے۔

دنیا میں کامیابی ہو یا نہ ہو لیکن اللہ کے نزدیک کرنے کا کام یہی ہے۔ میں کون اور ڈاکٹر صاحب کون! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن انبیاء میں سے بعض نبی جن کی صداقت پر، جن کی دیانت پر، جن کی امانت پر، جن کی محنت پر، جن کی دعوت پر، جن کے اخلاص پر، جن کی استقامت پر، جن کی قربانیوں اور ایثار پر کسی کو اعتراض کا موقع نہیں مل سکا تو اللہ تعالیٰ اس کے نبی پاک نے فرمایا کہ ان میں سے کسی کے ساتھ دو اور کسی کے ساتھ ایک امتی ہو گا جنہوں نے دعوت کو پوری طرح قبول کیا ہو گا۔ اور کسی کے ساتھ ایک بھی نہیں" یہ تو حدیث ہے اور صحیح ہے۔ اللہ اللہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کا شکوہ نقل فرمایا ہے: رَبِّ اِنِّىْ دَعَوْتُ قَوْمِىْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ○ اے میرے مالک اے میرے آقا اور مختار میں نے خالص توحید اور صرف تیری عبادت کی دعوت دی اور اس کام کے لئے میں نے نہ رات چھوڑی نہ دن چھوڑا۔ لیکن نتیجہ! فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِىْٓ اِلَّا فِرَارًا۔ یہ میری دعوت سن کر راتوں کو بھی بھاگ کھڑے ہوتے اور دن کو بھی ـــ آگے آیا کہ ثُمَّ اِنِّىْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ○ میں نے مجلسوں میں اعلانیہ بھی دعوت دی ـــ جیسے ڈاکٹر صاحب نے آپ حضرات کے سامنے دعوت پیش کی ـــ اور میں نے پوشیدہ ایک ایک کے پاس جا کر بھی دعوت دی تاکہ مجلس میں بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو اس طرح آجائے۔ الغرض دعوت پہنچانے میں میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ نہ رات چھوڑی نہ دن چھوڑا۔ نہ اعلان چھوڑا نہ اسرار چھوڑا۔ اپنا تمام آرام تج دیا ـــ ڈاکٹر صاحب محترم کا نام بھی آگیا ـــ لیکن ان کی ساڑھے نو سو سال کی دعوت پر کتنے لوگ ایمان لائے، کتنے لوگوں نے اسے قبول کیا! اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے کہ نوح علیہ السلام کے اخلاص میں ان کی استقامت میں، ان کے ایثار، ان کی صداقت میں، ان کی شجاعت میں نہ کمی تھی نہ کسی کو شک تھا۔ لیکن اللہ کی شہادت سن لو کہ اس سب کا نتیجہ کیا نکلا! وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ "بہت ہی تھوڑے آدمی ان پر ایمان لائے"۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے جو کشتی بنائی وہ کتنی بڑی ہوگی! آپ خود تصور کر لیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ کل اسّی افراد تھے۔ ذرا سوچو کہ ساڑھے نو سو برس کی دعوت کا نتیجہ یہ تھا۔ اگر فی برس ایک آدمی بھی دعوت قبول کرتا تو ساڑھے نو سو تو آتے۔ چلو دس دس برس میں ایک آدمی آتا تو بھی پچانوے تو ہوتے۔ لیکن بعض روایات میں اسّی سے بھی کم تعداد آئی ہے۔ کچھ چالیس افراد۔ ایک اور روایت بھی ہے جس میں نو افراد کی تعداد بیان ہوئی ہے۔ اللہ اللہ۔ کام کرنے والا یہ نہ سوچے کہ میرے ساتھ لوگ آتے ہیں یا نہیں آتے۔ دیکھنے والے بھی یہ نہ سوچیں کہ اس کے ساتھ فلاں بزرگ ملے یا نہیں ملے۔ یہ دیکھو کہ کام صحیح ہے۔ کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن کے مطابق ہے۔ نبی اکرم علیہ السلام کے ارشادات گرامی کے مطابق ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ پھر قبول کرنا چاہیئے۔ زیادہ لوگ ہوں یا نہ ہوں۔ اس میں اعلیٰ قسم کے لوگ ہوں یا نہ ہوں۔ وہ معاملہ

نہ ہو جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے آنجنابؑ کے ساتھ کیا تھا: وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ۔ اے نوح ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے سردار لوگ، بڑے بڑے ذہین لوگ، بڑے بڑے باوجاہت لوگ وہ تو تیرے ساتھ آئے نہیں۔ ہماری قوم کے کچھ ادنیٰ لوگ کم عقل اور بے وقوف لوگ ہیں جو تیرے پیچھے لگ گئے ہیں ...... اللہ واللہ۔ میں آپ لوگوں کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ ڈاکٹر صاحب کی دعوت کا ساتھ دیں۔ اس میں ہماری دنیا اور عاقبت کی بھلائی ہے۔

ہفتہ سے امیرِ محترم کی طبیعت کافی خراب ہو گئی۔ لہٰذا شمالی اور شرقی تنظیموں کی طرف سے لاہور چھاؤنی میں ۱۷ تا ۱۹ ستمبر کے لئے جو دو پروگرام طے تھے اور جن کے لئے ان تنظیموں نے کافی محنت سے پبلسٹی بھی کی تھی ملتوی کرنے پڑے۔ ۱۵ ستمبر سے ۲۸ ستمبر تک قریباً ۱۴ یوم ایسے گزرے ہیں اور شاید امیرِ محترم نے جب سے دعوتی کام شروع کیا ہے یہ پہلا موقع ہے کہ امیرِ محترم کا کوئی درس یا تقریر کا پروگرام نہیں ہو سکا۔ بحمداللہ اب موصوف کی طبیعت بہتر ہے۔ چنانچہ ۲۸ ستمبر کو مسجد دارالسلام کا خطاب جمعہ اور ۲۹ ستمبر کو بعد نمازِ مغرب جامع قرآن، قرآن اکیڈمی میں امیرِ محترم کا درسِ قرآن بھی ہوا جو مسلسل درس کی کڑی ہے اور اس میں سورۂ زخرف زیرِ درس ہے۔ ساتھ ہی امیرِ محترم نے یکم اکتوبر سے اپنی دعوتی سرگرمیوں کی تجدید فرما دی ہے۔ اسلام آباد کا دورہ ہو رہا ہے اور "دینِ حق اور اس کے تقاضے" کے موضوع پر ان شاء اللہ امیرِ محترم کا سورۂ صف کی روشنی میں ۸ اکتوبر بروز پیر بعد نمازِ مغرب خطاب ہوگا۔

جمعہ کو بعد نمازِ مغرب مسجد باغ والی بیرون شاہ عالم مارکیٹ جو ہفتہ وار درسِ قرآن ہوتا ہے۔ فی الوقت اس کو محترم ڈاکٹر تقی الدین احمد صاحب دے رہے ہیں:

تمام رفقاء اور متوسلین سے امیرِ محترم کی کامل صحت کے لئے دعا کی استدعا ہے۔

راقم: عبدالرزاق بہ تعاون بھائی جمیل صاحب،
نائب امیر برائے لاہور

بقیہ تذکرہ و تبصرہ

کو مانتے ہیں۔ اور اس کی رو سے قرآن کو INTERPRET کر رہے ہیں ہمارے یہاں عملی اعتبار سے قرآن کی INTERPRETATION بالکل وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ پھر اگر ہماری تاریخ کے ادوار میں حضورؐ سے لے کر تا امروز جن مسائل میں تسلسل، تواتر اور اجماع موجود ہو تو دوسری کوئی بات کہنے کا کسی کو حق ہی نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ قرآن پر کسی وجہ سے اعتماد نہ رہا کہ یہ مُنَزَّل مِنَ اللہ ہے، اور دل میں شک اور ریب کے کانٹے چبھ گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس گمراہی، اس ضلالت سے مجھے، آپ کو اور جمیع المسلمین کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

عن انس رض عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
لایؤمن احدکم
حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ
(رواہ البخاری)
حضرت انس رض سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جیسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔
رشید جیولری ہاؤس لاہور
ٹمپل روڈ
سوہا بازار
۳۱۱۴۰ — ۳۰۴۳۳
۶۴۴۳۳ — ۵۶۴۷۹
پروپرائٹر: اے وحید

PEPSI

MIRINDA

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید: ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے

اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد بھی ہیں۔

ٹینٹ اور ترپال
بنانے کا ممتاز ادارہ
ایچ
نظام دین
اینڈ سنز
مرکزی دفتر
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

Hollow-Core Slab in Pakistan

THE ORIGINAL

پاکستان کی کھُلی فضاؤں میں
پاکستان کی
کھلی فضاؤں میں
اذانوں کی گونج
اور
مشینوں کے چلتے ہوئے پہیوں کا شور
ہماری صنعتی ترقی کا مظہر ہے
ملکی صنعت قوم کی خدمت ہے اور قومی خدمت ایک عبادت ہے
سروس اپنے شوز کی ایکسپورٹ سے زرِ مبادلہ کما کر دن رات
وطنِ عزیز
کی خدمت میں سرگرم عمل ہے
سروس شوز۔ دُنیا کے گوشے گوشے میں مقبول

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 33	NOVEMBER 1984	No. 11

اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین

تذکرہ و تبصرہ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۳۳ | دسمبر ۱۹۸۴ء مطابق ربیع الاول ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۱۲

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی
فون: ۸۵۲۶۱۱
سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی
کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

جمیل الرحمٰن

عرضِ احوال

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اللہ تعالیٰ کا صد ہزار شکر و احسان ہے کہ ماہنامہ "میثاق" تینتیسویں ۳۳ جلد کا آخری شمارہ بابت ربیع الاول ۱۴۰۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۴ء پیشِ خدمت ہے۔ اس پورے سال میں الحمدللہ نہ کسی شمارے کا ناغہ ہوا اور نہ ہی اشاعت و ترسیل میں اتنی تاخیر ہوئی کہ ہر انگریزی ماہ کے پہلے ہفتہ میں ملک کے اندر تمام سالانہ معاونین کو اور اس کی مستقل ایجنسیوں کو نہ پہنچ گیا ہو۔ پرچہ کی ضخامت بھی مستقل طور پر ۹۶ صفحات رہی بلکہ جنوری ۱۹۸۴ء کا شمارہ تو ۱۰۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں فیصلہ کن عامل مشیئتِ الٰہی ہے اور اسی کا فضل و کرم خادمانِ میثاق کے شاملِ حال رہا جس کے باعث وہ اپنے قارئین کے سامنے سرخرو رہے۔

اس شمارے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد دامت فیوضہم کا وہ خطاب شامل کرنے کا پختہ ارادہ تھا جو موصوف نے ۳۱ ر اگست کو خطابِ جمعہ میں "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے !" کے موضوع پر ارشاد فرمایا تھا۔ یہ خطاب ستمبر ہی میں کیسٹ سے منتقل کر لیا گیا تھا لیکن بعض اہم اور فوری نیز افادیت کے حامل مضامین کے باعث یہ خطاب اس شمارے میں شامل نہیں ہو سکا۔ ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں اسے شامل کرنے کی پوری کوشش ہوگی۔ اس کے بعد اگر اللہ کو منظور ہوا تو فروری ۱۹۸۵ء کے شمارے میں امیرِ محترم کا خطاب "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے ؟" کے موضوع پر شائع ہوگا۔

دسمبر ۸۴ء کے شمارے میں "الہدیٰ" کی قسط کی عدم اشاعت پر اکثر حضرات نے شکوہ کیا ہے۔ ان شاء اللہ ہماری آئندہ کوشش ہوگی کہ اس کی قسط بہرصورت شاملِ اشاعت کی جائے۔

ڈاکٹر صاحب محترم کی طبیعت ۲۷ ر ستمبر تک کافی سنبھل گئی تھی اور موصوف نے

بقیہ صفحہ ۲۲ پر

تذکرہ و تبصرہ
اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ اپنے اور بھائی جمیل صاحب کے بارے میں ــــ اور

میثاق، ستمبر ۸۴ء میں شائع شدہ تقریر پہ

مخلصانہ تنقیدوں اور خیرخواہانہ مشوروں

کے ضمن میں گذارشات

قارئین 'میثاق' کی خدمت میں راقم الحروف ایک طویل مدت کے بعد خود اپنی کسی تحریر کے ذریعے حاضر ہو رہا ہے ــــ اس دوران میں اگرچہ اس کا تو اطمینان رہا کہ راقم کے خیالات قارئین 'میثاق' تک مسلسل پہنچ رہے ہیں، تاہم یہ احساس بھی رہا کہ 'میثاق' کے ضمن میں راقم اپنی ذمہ داریاں کما حقہٗ ادا نہیں کر رہا ــــ اس کا سبب بھی ظاہر ہے ــــ یعنی یہ کہ بجز "آں را کہ آں دھندا این نہ دھند" کے مصداق اللہ تعالیٰ نے راقم کے "عُقْدَةً مِنْ لِسَانِ" کو تو اپنے فضل و کرم سے پوری طرح کھول دیا ہے ــــ لیکن قلم پر اتنی ہی مضبوط گرہ لگا دی ہے ــــ نتیجۃً 'لکھنے' پر طبیعت بہت مشکل ہی سے آمادہ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جب تک میں ہفتہ عشرہ لاہور میں مقیم نہ رہوں اور اپنے گھر اور دفتر کے 'مانوس' ماحول میں پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ میں 'گم' ہونے کا موقع نہ پاؤں کوئی مضمون تو درکنار خط لکھنے تک پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی ــــ ادھر کئی سال سے میرے دعوتی اسفار اور 'تبلیغی دوروں' کی جو صورت بن چکی ہے اس میں اس کا امکان شاذ و نادر ہی پیدا ہو سکتا ہے! اور اب جو یہ صورت کسی قدر پیدا ہوئی تو اس لئے کہ دو تین

ماہ قبل کمر میں جو تکلیف ہوئی تھی (جو ذرا وقفے کے بعد دوبارہ عود کر آئی ہے!) اس کے باعث سفروں اور دوروں کے معاملے میں مجبوراً کمی کرنی پڑی ہے — اور اس طرح لاہور میں مسلسل قیام کا ہر ماہ کم از کم ایک ہفتہ مل رہا ہے۔

میں نے 'میثاق' کی ادارت جولائی ۱۹۶۶ء میں سنبھالی تھی۔ اُس کے بعد سے لگ بھگ چار سال تک میری دعوتی اور تدریسی سرگرمی صرف لاہور تک محدود رہی — چنانچہ اس عرصے کے دوران 'میثاق' پابندی سے شائع بھی ہوتا رہا اور اُس میں میری تحریریں بھی تسلسل کیساتھ شائع ہوتی رہیں — لیکن ۱۹۷۱ء میں جب میں نے اپنے پیشِ نظر دینی کام کے لئے ہمہ تن اور ہمہ وقت وقف ہو جانے کے ارادے سے میڈیکل پریکٹس کو بھی خیرباد کہہ دیا — اور اس طرح گویا وہ رسی بھی ٹوٹ گئی جس نے مجھے لاہور کے کھونٹے سے کسی قدر باندھا ہوا تھا — تو میری اندرونِ لاہور سرگرمی بھی دفعتہً پورے عروج کو پہنچ گئی اور ساتھ ہی بیرونِ لاہور اسفار کا سلسلہ بھی ایک دم بڑھ گیا، اور اُس کا یہ نتیجہ تو بحمداللہ برآمد ہوا کہ اولاً ۱۹۷۲ء میں 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کا قیام عمل میں آگیا اور پھر ۱۹۷۵ء میں 'تنظیمِ اسلامی' بھی وجود میں آگئی — لیکن دوسری طرف 'میثاق' کی اشاعت بھی بہت بے قاعدہ ہوگئی اور میرے قلم پہ تو ایسی گرہ لگ گئی کہ اُس کے بعد سے آج تک میرے قلم سے باضابطہ 'مضمون' تو شاید ہی کوئی نکلا ہو (سوائے ایک دو چیزوں کے جو بحالتِ اعتکاف ضبطِ تحریر میں آئیں!) خطوط بھی صرف چند ایک ہی لکھنے میں آئے ہوں گے — اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 'میثاق' پر سخت زبوں حالی اور مسکنت کا دَور آگیا۔ حتیٰ کہ ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ وہ محض 'خانہ پُری' کے لئے کبھی دو ماہی، کبھی سہ ماہی اور کبھی اس سے بھی زیادہ وقفہ کے بعد منصّۂ شہود پر آتا رہا — اگر یہ صورتِ حال جاری رہتی تو عجب نہ تھا کہ میں اِسے بند ہی کرنے کا فیصلہ کر لیتا۔ اس لئے کہ میں اپنی جگہ پر مطمئن تھا کہ جو کام ہم کرنے اٹھے ہیں اُس میں طریقِ نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) سے زیادہ سے زیادہ قُرب و مشابہت ہی کامیابی کی واحد کلید ہے اور یہ معلوم ہے کہ آنحضورؐ نے اپنے 'بیان' کا ذریعہ 'قلم' کو نہیں بلکہ صرف زبان مبارک ہی کو بنایا تھا —

اور اس دور میں بحمداللہ "بیانِ لسانی" کے "دور دور تک منتقل ہونے کا ذریعہ بصورت "کیسٹ" وجود میں آ ہی چکا ہے ——— لیکن اللہ تعالےٰ نے اپنے فرمانِ مبارک "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" کے مطابق اپنے دین کی اس خدمت کے ضمن میں بھی "تحریری اشاعت" کے سلسلے کو برقرار رکھنے کے لئے خالصۃً اپنے فضل و کرم سے دو رفقائے کار ایسے عطا فرمائیے جنہوں نے "میثاق" کی اس بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو سنبھال لیا:

ایک میرے بزرگ رفیقِ کار ——— اور "میثاق" کے مُرتّب شیخ جمیل الرحمٰن، جنہوں نے ۱۹۷۵ء میں تنظیمِ اسلامی کے اوّل یومِ تاسیس سے شمولیت کے فوراً ہی بعد میری تقاریر کو ٹیپ سے اتارنے کا حد درجہ صبر آزما اور مشقت طلب کام نہایت ذوق و شوق سے شروع کر دیا تھا ——— اور اب تک لگ بھگ دس سال گزر جانے کے باوجود نہ صرف یہ کہ ان کی طبیعت میں اس حد درجہ "بورنگ" کام سے کوئی اکتاہٹ پیدا نہیں ہوئی بلکہ میرا تو اندازہ یہ ہے کہ اس پورے عرصے کے دوران ان کا محبوب ترین مشغلہ یہی رہا ہے اور آج تک بھی اُن کا دل دُنیا کے کسی بھی دوسرے کام میں اس سے زیادہ نہیں لگتا ——— ان کی طبیعت کی اسی موزونی اور آمادگی کو دیکھتے ہوئے میں نے ۱۹۷۶ء ہی میں "میثاق" کی ترتیب کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دی تھی ——— اور واقعہ یہ ہے کہ یہ اُن ہی کا دَم ہے کہ ان دس سالوں کے دوران میرے خیالات کے "قارئینِ میثاق" تک پہنچنے کا سلسلہ جیسے تیسے قائم رہا۔

دوسرے برادرم قاضی عبدالقادر جو میرے اسلامی جمیعتِ طلبہ کے زمانے کے ساتھی ہیں اور تنظیمِ اسلامی میں بھی اُس کے اوّل یومِ تاسیس ہی سے شامل ہیں۔ وہ جب ۱۹۸۰ء میں لاہور منتقل ہوئے تو انہوں نے "میثاق" کے انتظامی امور کو سنبھالا اور نہ صرف یہ کہ اس کی طباعت اور اشاعت کو باقاعدہ کر دیا بلکہ اس کے لئے "اشتہارات" حاصل کر کے اُس کی مالی حیثیت کو بھی مضبوط کر دیا ——— اور اب اگرچہ قاضی صاحب واپس کراچی مراجعت فرما چکے ہیں لیکن "میثاق" کے جس "انتظامی پودے" کی تخم ریزی اور آبیاری وہ کر گئے تھے، وہ بحمداللہ تا حال پھل دے رہا ہے!

شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کو، جنہیں میں محبت اور ادب کے ملے جُلے جذبات کے
ساتھ بھائی جمیل کہتا اور لکھتا ہوں، میں اپنا ایک بزرگ رفیق ہی نہیں محسن
سمجھتا ہوں، اس لئے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اس جہانِ فانی میں مجھ سے پندرہ سال
سے بھی زائد عرصہ قبل وارد ہوئے تھے بلکہ جس تحریک کا میں اپنے آپ کو ایک ادنیٰ
کارکن سمجھتا ہوں[1] اُس سے تعلق میں بھی وہ مجھ سے بہت 'سابق' ہیں ——
ان کا تعلق دہلی کی مشہور قوم پنجابی سوداگران سے ہے اور چونکہ وہ 'جمعیتِ پنجابی
سوداگرانِ دہلی' میں بہت عرصہ آفس سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں لہٰذا
اپنی برادری میں اُن کا خاصہ تعارف بہت وسیع ہے —— اُن کے والد
ماجد حنفی المسلک تھے اور نہ صرف یہ کہ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ کے
مکتب کے ساتھی اور بچپن کے دوست تھے بلکہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ
سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے اور ایک دوسرے کے یہاں بے تکلفانہ
آمد و رفت تھی —— دوسری جانب ان کا ننھیال سلفی المسلک تھا اور اُس کا
نہایت گہرا تعلق تحریکِ شہیدینؒ کے باقیات الصالحات سے تھا اور اُن کے نانا
حاجی محمد زکریاؒ ہی وہ شخص تھے جنہوں نے 'شیخ الکل' میاں نذیر حسین محدثؒ کو
دہلی تشریف لانے اور قیام فرمانے کی دعوت دی تھی اور پھر زندگی بھر اُن سے
تعاون کا تعلق قائم رکھا تھا چنانچہ انہوں نے بالکلیہ اپنے خرچ سے 'مدرسہ میاں
صاحب' قائم کیا تھا —— اور تاحیات اُس کے کل اخراجات اپنے ہی
ذمہ رکھے تھے۔ ان کے صاحبزادے یعنی بھائی جمیل صاحب کے ماموں حاجی محمد امین
چاولہ مسلسل کئی برس تک آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے سیکرٹری رہے تھے۔
—— اس طرح انہیں بچپن ہی سے نہ صرف یہ کہ نہایت جید علماءِ حقانی کی
صحبت سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا بلکہ اُن کے مزاج میں شروع ہی سے

---

[1]: واضح رہے کہ اس سے میری مراد وہ تحریک ہے جو اس صدی میں اوّلاً مولانا ابوالکلام آزاد
مرحوم نے شروع کی تھی — اور بعد ازاں اس کا تسلسل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے قائم
رکھا — اور اب اُسی کے احیاء کی کوشش یہ عاجز کر رہا ہے۔

"حنفیت" اور "سلفیت" کا "قران السعدین" بھی ہو گیا[1] جس پر مزید جذبہ جہاد کا رنگ "جامعہ ملیہ دہلی" کی تعلیم اور مولانا عبدالحیٔ فاروقی رح اور ڈاکٹر ذاکر حسین ایسے اساتذہ کی صحبت سے چڑھا۔

تحریک جماعت اسلامی سے اُن کا تعارف اس وقت ہو چکا تھا جبکہ راقم نے ابھی شعور کے میدان میں پہلا قدم بھی نہیں رکھا تھا چنانچہ وہ قبل آزادی ہندو قیام پاکستان ۱۹۴۵ء ہی میں جماعت اسلامی کے ساتھ رکنیت کا تعلق استوار کر چکے تھے۔ کراچی کی مقامی جماعت جب اپنے عہد شباب میں تھی اور اس میں چودھری غلام محمد، شیخ سلطان احمد، حکیم اقبال حسین اور مولانا افتخار احمد بلخی جیسی اہم شخصیتیں جو (سوائے شیخ سلطان احمد مدظلہ کے سب کی سب مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکی ہیں) مختلف اعتبارات سے نمایاں تھیں اس وقت بھائی جمیل الرحمٰن صاحب بھی نہ صرف مقامی شوریٰ کے رکن تھے بلکہ ایک اہم حلقہ (پرنس روڈ و آرام باغ) کے ناظم بھی تھے۔

جماعت اسلامی سے بھائی جمیل صاحب کی علیحدگی ۱۹۵۸ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ وہ بھی جماعت سے علیحدہ ہونے والوں کی اکثریت کی طرح اِدھر اُدھر سرگرداں رہے۔ لیکن الحمدللہ کہ راقم کے ساتھ ان کا جو تعلق ۱۹۶۱ء میں قائم ہوا تھا وہ نہ صرف یہ کہ آج تک قائم ہے بلکہ بفضلہ تعالیٰ روز افزوں ہے۔ اور اس طویل عرصے کے دوران وہ ہر مرحلے پر میرے فعّال ترین معاونین میں بھی شامل رہے اور اہم ترین مشیروں میں بھی۔ اور اس عرصہ میں واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی کتاب نے

---

[1] موجودہ ماحول کے اعتبار سے اس واقعہ کا ذکر بھی ان شاء اللہ بہت مفید ہوگا کہ جب بھائی جمیل صاحب کے والد صاحب کا رشتہ ان کے نانا کے یہاں تجویز ہوا تو انہوں نے میاں نذیر حسین رح سے مشورہ طلب کر لیا اور یہ فرمایا کہ ویسے تو لڑکا نیک اور متقی اور ہر اعتبار سے اطمینان بخش ہے لیکن ہے حنفی! ــــ تو میاں صاحب نے اس اندازِ گفتگو پر بھی بہت برہمی کا اظہار فرمایا ــــ اور زور دے کر کہا کہ جب لڑکا نیک اور دیندار ہے تو حنفی یا اہل حدیث سے کیا فرق واقع ہوتا ہے!

وداعیٔ دین متین کی جو بھی حقیر سی خدمت مجھ سے بن آتی ہے اُس کے ضمن میں مَیں سب سے بڑھ کر زیرِ بارِ احسان انہی کا ہوں — اس لئے کہ کم از کم گذشتہ دس سالوں کے دوران تو انہوں نے اپنی کبر سنی (وہ جنوری ۸۵ء میں ۸۶ برس کے ہو جائیں گے) اور ناسازیٔ طبع کے باوجود جس جسمانی محنت و مشقت اور انتھک اور والہانہ جذبے کے ساتھ کام کیا ہے اسکی نظیر مجھ ایسے مریض اور ادھیڑ عمر تو کیا آج کل کے کڑیل جوان بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں! یہی نہیں — اس پر مستزاد یہ کہ بایں بزرگی و کبر سنی بھائی جمیل صاحب میرا بحیثیت 'امیرِ تنظیم اسلامی' جسقدر ادب کرتے ہیں اور جس خاکساری اور احترام کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں وہ تو بہت سے مواقع پر میرے لئے حد درجہ شرمندگی کا موجب ہو جاتا ہے!

اس سب کے باوصف ——— یہ اندازہ تو جملہ قارئین 'میثاق' کو ہو ہی گیا ہوگا کہ وہ بھی ——— بالکل میری ہی طرح ——— اُمّی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) کے اُمّی اُمتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ میری طرح اُنکی تحریروں میں بھی بعض فاش غلطیاں رہ جاتی ہیں ——— ادھر میرے 'اَن پڑھ' ہونے کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے میری جو تقریریں ٹیپ سے اتار کر "معمولی حک و اضافہ کے ساتھ" شائع کیں اُن میں سے شاذ ہی کوئی تقریر میں نے پڑھی اور وہ بھی اسکے کتابی شکل میں طبع ہو جانیکے بعد سوائے اُسکے جو "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں کے بارے میں علماء کرام کے خدشات" کے عنوان سے 'میثاق' کی اشاعت بابت ستمبر ۸۴ء میں شائع ہوئی — اور وہ بھی اس لئے کہ اُس پر بعض بزرگوں اور دوستوں اور بعض مؤقر دینی رسائل و جرائد نے از خود بھی تبصرہ فرمایا اور بعض سے خود بھائی جمیل صاحب نے رائے طلب کی جس کے نتیجے میں "مخلصانہ تنقیدوں اور خیر خواہانہ مشوروں" کا اچھا بھلا ذخیرہ جمع ہو گیا جس پر اس صحبت میں کچھ نیازمندانہ معروضات پیش کرنی مطلوب ہیں! (واضح رہے کہ یہ تقریر بھی راقم نے میثاق میں طبع ہو جانے کے بعد پڑھی)

اس سلسلے میں اوّلاً 'میثاق' کے حوالے سے اپنی اور بھائی جمیل صاحب کی یہ طویل داستان اس لئے نوکِ قلم پر آگئی کہ ایک حد درجہ قابلِ احترام بزرگ ڈاکٹر غلام محمد صاحب مدظلہ نے ایک دوسری گرفت کے ساتھ جس کے بارے

۱

میں مَیں بعد میں عرض کرونگا ۔) لطیف ترین الفاظ میں یہ 'تنبیہ' بھی فرمائی ہے کہ:

"اس قسم کے اہم اور نازک موضوعات اگر آنجناب کے قلم سے تحریر ہو
جایا کریں تو لفظی احتیاط اور پیرایۂ بیان کی خوبی اور افزوں ہو سکے گی!"

اس ضمن میں حضرت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں صرف یہ گذارش ہے کہ
"صاحبُ البیتِ ادریٰ بِمَا فیہ " کے مطابق اگر میں اپنے ما فی الضمیر کو خود
ضبطِ تحریر میں لاؤں تو یقیناً وہ میرے خیالات کی 'صحیح تر' تعبیر ہوگی اور لفظی
احتیاط کا معاملہ بھی کسی درجے میں ہو جائے گا ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ 'پیرایۂ اظہار'
کی کسی "خوبی" یا اس میں کسی "افزونی" کا اس صورت میں بھی کوئی امکان نہیں
——— اس لئے کہ مَیں خود بھی بھائی جمیل صاحب کی طرح امّی نبیؐ کا اُمّی اُمتی
ہوں اور اس کے اعتراف و اعلان میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا ———
بلکہ الحمدللہ کہ بہت عافیت پاتا ہوں ۔

اب اس سے قبل کہ میں مختلف مکاتیب وجرائد میں ظاہر شدہ آراء سے
متعلق اپنی گذارشات کا آغاز کروں، ان تمام بزرگوں اور دوستوں کا تہہ دل سے
لکل یکساں طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے خطوط یا مضامین میں تحسین
تائید فرمائی یا تنقید و تبصرہ فرمایا اور مشوروں سے نوازا ——— میں اللہ کو
ؤاہ بنا کر عرض کرتا ہوں کہ مجھے تاحال کسی بھی تنقید سے قطعاً کوئی ملال نہیں ہوا ۔
یرے سامنے بحمداللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک کہ "الدِّین
لنَّصِیحہ" ہر وقت رہتا ہے اور میں خود بھی حتی الامکان اس پر عمل کرنے
لی کوشش کرتا ہوں اور دوسروں کی تنقیدوں کو بھی بالکلیہ اسی پر محمول کرتا
ہوں ۔ اِلاّ یہ کہ کسی کا بُغض بالکل عریاں ہو کر سامنے آجائے ——— اور
لحمدللہ ثم الحمدللہ کہ میری زیرِ بحث تقریر پر جو تبصرے یا تنقیدیں ہوئی ہیں
ن سے مجموعی طور پر میری اس اُمید میں اضافہ ہوا ہے ——— اور میری اس
وقع کو تقویت حاصل ہوئی ہے کہ ——— ان شاءاللہ العزیز میں
پنے بزرگوں کے خدشات رفع کرنے میں کامیاب ہو جاؤنگا اور اقامتِ دین

کہ جس سعی کا بیڑا میں نے اٹھایا ہے اس میں ان شاء اللہ مجھے علماء حق کی سرپرستی ضرور حاصل ہوگی —— اور ان کی دعائیں یقیناً میرے شامل حال ہوں گی —— وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيز !! -

---

میثاق نومبر ۸۴ء میں جو خطوط اس سلسلے میں شائع ہوتے ہیں ان میں اوّلین حضرت مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب ہی کا ہے جو مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خلیفہ مجاز ہیں اور جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ انہوں نے میرے درج ذیل جملوں پر گرفت فرمائی ہے:

"میں نے جہاں تک اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کو گہرائی میں جا کر ٹٹولا ہے (یعنی PROBE کیا ہے) تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ الحمد للہ ثم الحمد للہ مجھ میں انانیت اور عُجب نہیں ہے اور میں شعوری طور پر اپنے رب سے پناہ طلب کرتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے اس روگ سے محفوظ رکھے (اس لئے کہ) نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق عُجب مہلکات میں سب سے زیادہ مہلک اور شدید مرض ہے۔"

حضرت ڈاکٹر صاحب کی گرفت سر آنکھوں پر —— اور ان شاء اللہ ان کی تلقین سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ لیکن اس قدر عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ صحابہ کرامؓ سے جہاں وہ الفاظ منقول ہیں جو انہوں نے نقل فرمائے وہاں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس سوال کے جواب میں کہ "کَیْفَ اَصْبَحْتَ؟" ایک صحابیؓ نے عرض کیا "اَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا حَقًّا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!" —— اسی طرح شیخ سعدیؒ کے قطعے میں بھی معاملہ تقابل کا ہے، —— اور الحمد للہ ثم الحمد للہ میرا حال یہی ہے کہ میں فی الجملہ کسی بھی انسان کے مقابلے میں اپنے آپ کو بہتر نہیں پاتا —— اور اپنے ساتھیوں میں سے بھی ہر ایک کو کسی نہ کسی پہلو سے اپنے سے بہتر محسوس کرتا ہوں —— پھر میرے جملوں میں صرف حال کی کیفیت پر اطمینان کا اظہار ہے

اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ! ــــ مستقبل کے لئے تو ہر حال میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی حفاظت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے ـــــ اور الحمد للہ کہ میں نے بھی اُسی کا سہارا لیا ہے!!

آنمخدوم کا یہ جملہ میرے لئے بہت حوصلہ افزائی کا موجب ہوا کہ:

"ان شاء اللہ یہ توضیح خدشات، اس نوعیت کے شبہات کے ازالہ میں مؤثر ثابت ہوگی" ــــ اَللّٰھُمَّ آمین!

دوسرا خط حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلّہ کا ہے ــــ جو مدرسہ رحیمیہ، بستی شاہ ولی اللہ، دہلی، میں شیخ الحدیث ہیں ــــ انہوں نے میری تقریر کے مشمولات کی جس طرح کھلے دل کے ساتھ تصویب فرمائی ہے اُس پر تو میں تہہ دل سے اُن کا ممنون ہوں ہی ـــــــــــ تحریک جماعتِ اسلامی، اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا ذکر انہوں نے جس معتدل اور متوازن انداز میں کیا ہے اُس سے بھی دل نے بہت اثر قبول کیا کہ علماءِ حق کی شان یہی ہونی چاہیئے ـــــــــــ میرے علم کی حد تک دیوبندی مکتبِ فکر کے وہ واحد معروف عالمِ دین ہیں جو مولانا مودودی کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں ـــــــ بہر حال ان کے "اشارات" میں اقامتِ دین کی داعی جماعت کے لئے مختلف پہلوؤں سے جو رہنمائی مضمر ہے، مجھے اُس سے فی الجملہ اتفاق بھی ہے ــــ اور اپنی امکانی حد تک میں اسی پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔ ــــ بایں ہمہ یہ "یاد دہانی" بھی ان شاء اللہ مزید مفید ثابت ہوگی۔

مولانا سیّد وصی مظہر ندوی مدظلہٗ، مہتمم جامعہ اسلامیہ و سابق میئر حیدر آباد (سندھ)، تنظیم اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں بھی شامل ہیں اور انجمن خدام القرآن کے زیرِ اہتمام سالانہ قرآن کانفرنسوں ــــ اور تنظیمِ اسلامی کی تربیت گاہوں میں حصّہ لینے کی خاطر بارہا لاہور تشریف بھی لائے ہیں ــــــ میں ان کا مشکور ہوں کہ انہوں نے میری گذارشات کو "فکر انگیز" قرار دیا۔ بسا اوقات ایک لفظ بھی

چوڑی بات سے زیادہ بامعنی ہو جاتا ہے ——— ساتھ ہی میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مولانا امین احسن اصلاحی کی عدم قدر کے بارے میں راستے پر میری "گرفت" کو بھی بالکل "درست" قرار دیا — اور اس طرح مولانا موصوف کے موقف سے اعلان برارت کر دیا۔

رہا اُن کا یہ فرمانا کہ "تاہم ایک یا چند غلطیوں کی وجہ سے کسی شخص کے پورے کارنامے کو مسترد کر دینا وہ انتہا پسندی ہے جس کے باعث ہمارے ہاں تحقیق اور فکر و نظر کی آزادی مفقود ہو کر رہ گئی ہے" تو گذارش ہے کہ الحمد للہ میں اس سے بَری ہوں ——— میں نے اُن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ "کم از کم اس مسئلے میں وہ 'منکرین سنّت' کی صف میں جا کھڑے ہوتے ہیں!" ——— اور اللہ سے دُعا کی ہے کہ وہ انہیں اس گمراہی سے رجوع کی توفیق عطا فرمائے۔ میں ہمیشہ اس کا اعتراف کرتا رہا ہوں کہ میں نے اُن کے فکرِ قرآنی سے بہت استفادہ کیا ہے اور اپنی ایک طویل تحریر میں بھی اپنے فہم قرآن کے چار منبعوں کی تفصیل درج کر چکا ہوں جن میں سے ایک فکرِ فراہی رح بروایت و وضاحتِ اصلاحی ہے ——— ادھر چند سالوں سے میں نے اس کا ذکر جان بوجھ کر ترک کر دیا ہے (جس پر 'مدیر طلوع اسلام' نے بجا طور پر گرفت بھی کی ہے کہ میں نے مولانا اصلاحی اور ان کے فکر کے ضمن میں اپنی خدمت کا ذکر تو کیا لیکن اُن سے استفادے کا ذکر تک نہیں کیا!) تو اس کا ایک سبب ہے اور وہ یہ کہ ۱۹۶۶ء میں مولانا کا ایک خط بہت بڑی تعداد میں لاہور ہی نہیں پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی تقسیم کیا گیا تھا جس میں مولانا نے میرے بارے میں کچھ اُس قسم کے الفاظ تحریر فرمائے تھے کہ "یہ شخص میری شاگردی کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرتا ہے ——— جبکہ یہ کبھی میرا شاگرد نہیں رہا!" ——— ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی تفسیر سے میں اب بھی استفادہ کرتا ہوں اور مولانا کی دو کتابیں: ایک 'دعوتِ دین اور اُس کا طریق کار' اور دوسری 'مبادیٔ تدبر قرآن' تاحال بھی میری محبوب ترین کتابوں میں سے ہیں۔

البتہ یہ واضح رہنا چاہیئے کہ بعض اوقات "ایک غلطی" بھی "یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دُور شد!" کے مصداق بہت بڑی گمراہی کا دروازہ کھول دیتی ہے ——— اور قرآن مجید میں تو بعض بظاہر نہایت معمولی سی بے احتیاطیوں (جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی آواز کو بلند کر دینا) پر بھی "حبطِ اعمال" کی وعید سنائی گئی ہے۔ لہٰذا اگر خدانخواستہ مولانا نے اپنے اس موقف سے رجوع نہ کیا تو واقعی اندیشہ ہے کہ ان کے شاگرد پنجابی کی ایک کہاوت: "گوروجنہاں دے ٹپدے، چیلے جان شڑپ!" کے کامل مصداق نہ بن جائیں — جیسے کہ اُن کا ایک "نیم شاگرد" — "کڑوا کریلا اور پھر نیم چڑھا!" کی کامل مثال بن کر سامنے آبھی چکا ہے!

مولانا سید حامد میاں مدظلہ مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور و خلیفہ مجاز حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ بھی نہ صرف یہ کہ تنظیم اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں شامل ہیں بلکہ میں ذاتی طور پر اُن کا بہت ہی ممنونِ احسان ہوں۔ ان کے احسانات میں سے ایک تو یہ ہے کہ جب بھی اُن کی ملاقات کے لئے حاضری ہوئی، انہوں نے بڑی محبت و شفقت کے ساتھ وافر وقت مرحمت فرمایا — اور دوسرا یہ کہ جب بھی اُن سے "قرآن کانفرنس" یا کسی اور موقع کے لئے کسی مقالے یا تحریر کی درخواست کی، انہوں نے ہمیشہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وقت نکال کر فرمائش کی تکمیل فرمائی (اُن کا ایک اہم اور نہایت وقیع مقالہ مدرجم کے ضمن میں اولین روایات پر مشتمل ان شاءاللہ آئندہ ماہ کے حکمتِ قرآن، میں شائع ہوگا۔) —— پھر اُن کا ایک تیسرا اور بہت بڑا احسان راقم پر یہ ہے کہ تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کے لئے جب راقم نے "بیعتِ جہاد" کو اساس بنایا تو اُنہوں نے غلط اطلاع کی بنیاد پر جاری کردہ مخالفانہ بیان سے علی الاعلان رجوع فرمایا اور حقیقتِ حال کے واضح ہو جانے کے بعد اخباری اعلان کے ذریعے بھی —— اور نجی خطوط کے ذریعے بھی اُس کی تائید و تصویب فرمائی۔ اس موقع پر بھی انہوں نے نہایت مفصل تبصرہ فرما کر جو احسان فرمایا ہے اُس

کا میرے اور میرے رفقاء کے دلوں پر بڑا اثر ہوا ہے ـــــ واقعہ یہ ہے کہ آنجناب نے حلقۂ مستشارین میں شمولیت کا حق ادا فرما دیا ہے۔

اُن کی تحریر کا ایک حصّہ تو تائیدی ہے جس پر شکریہ ہی ادا کیا جا سکتا ہے خصوصاً اُن کے یہ جملے تو راقم کے لئے بہت ہی موجبِ اطمینان ہیں کہ:

"ڈاکٹر صاحب نے بہت عمدہ اور مفصّل طرح سمجھا دیا ہے کہ آج کل فتنے کس طرح پیدا ہو رہے ہیں۔ اُن سے بچنا سب سے زیادہ ضروری ہے، کیونکہ ایمان سب سے بڑی دولت ہے اور اس کی حفاظت سب سے بڑا اور اوّلین فرض ہے!"

البتّہ ـــــــ نہایت ادب کے ساتھ دو اُمور کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے:

ایک[۱] حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے قول کی تاویل کے بارے میں، اور دوسرے[۲] ـــ 'تقلید' یا 'غیر تقلید' یا 'نیم تقلید' کے بارے میں۔

فقہِ حنفی کے ماننے اور پیروی کرنے والوں کے لئے مختلف فیہ مسائل میں اپنے مسلک کے حق میں دلائل کا جاننا ـــــ اور اپنے مدارس میں اُنکو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنا یقیناً ایک لازمی و لابدی امر ہے ـــــ اور کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ یہ کام اصلاً غلط یا فضول ہے، اسی طرح حضرتِ کاشمیریؒ کے شدّتِ احساس کو کسی درجے میں اس حقیقت پر محمول کرنا بھی غلطِ محض نہیں ہے کہ واقعتہً نیک و پارسا اور حقیقتاً مخلص و متقی لوگ اپنے بڑے بڑے کاموں کو بھی ہیچ سمجھتے ہیں (جیسے کہ خود آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا منقول ہے کہ "رَبِّ اجْعَلْنِي فِي عَيْنِي صَغِيرًا"!) لیکن حضرتِ کاشمیری کے قول کو بالکلیہ اس تواضع و انکسار پر محمول کرنا درست معلوم نہیں ہوتا ـــ اس ضمن میں اصل کوتاہی بھائی جمیل الرحمٰن صاحب سے ہوئی ہے کہ انہوں نے مولانا موصوف کے قول کے آخری اور اہم ترین حصے کو نقل نہیں فرمایا جس سے آنجناب کے غم واندوہ اور تأسّف کا اصل سبب معلوم ہوتا ہے ـــــ وَھُوَ ھٰذَا!

"تو جس چیز کو دُنیا میں کہیں نکھرنا ہے نہ برزخ میں نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی اپنی قوت صرف کر دی اور جو ٹھیٹ اسلام کی دعوت تھی، مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرام لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی، آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی یہ ضروریاتِ دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے و اغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیئے تھا وہ پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آ رہا ہے شرک و بت پرستی چل رہی ہے، حرام و حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوتے ہیں ان فرعی و فروعی بحثوں میں!

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی"

معلوم ہوا کہ یہاں اصل معاملہ "تقابل" کا ہے کہ کون سے کام اہم تر تھے جن کی جانب ہم اپنی اس مخصوص علمی مصروفیت و مشغولیت کے باعث توجہ نہ کر سکے! ——— اور مقابلہ بھی صحیح اور غلط کا نہیں بلکہ ایک جانب صحیح اور اہم لیکن نسبتاً ثانوی اور دوسری جانب بدرجہا اہم تر اور حد درجہ ضروری اور اوّلین اہمیت کے حامل کاموں کے مابین ہے!!

چنانچہ بعینہٖ یہی بات تھی جس کی جانب علماء کرام کی توجہ راقم الحروف نے اپنے اس جوابی خط کے آخر میں مبذول کرائی تھی جو راقم نے مولانا اللہ بخش ملکانوی کے خطوط اور معاصر "الخیر"، ملتان میں شائع شدہ مضمون کے جواب میں لکھا تھا اور جو "میثاق" کی ستمبر ۸۴ء کی اشاعت میں شامل تھا۔ کہ خدارا! حالات کا کھلی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ کیجیے اور صورتِ حال کی نزاکت

کا کما حقہٗ ادراک فرمائیے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے یہ احساسات تو آج سے لگ بھگ نصف صدی قبل کے ہوں گے۔ اُس کے بعد تو وقت کے دریا میں اور بھی بہت سا پانی گذر چکا ہے ــــــ اور حالات پہلے سے کہیں بڑھ کر دگرگوں ہو گئے ہیں۔ چنانچہ مغربی تہذیب کا جو سیلاب اِس وقت معاشرے میں نہایت تیزی اور تندی سے بڑھ رہا ہے اُس کا تو عشرِ عشیر بھی اس وقت نہ تھا اور اُس کی فحاشیت اور اباحیت پرستی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ یعنی حدیث اور سُنّتِ رسولؐ اور اتباعِ صحابہؓ و سلف صالحین کے خلاف بغاوت یعنی فتنۂ انکارِ حدیث و سُنّت جدید تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت میں سرایت کر چکا ہے۔ ایک جانب الحاد اور مادّہ پرستی پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی کر چکی ہے۔ تو دوسری جانب بدعات اور خرافات نے باضابطہ فلسفوں اور اداروں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ منکرات و فواحش کے وہ وہ دروازے بلکہ شاہ دروازے کُھل چکے ہیں جن کا اُس وقت کوئی تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا تھا ــــ اس لئے کہ اُس وقت تک سینما یا تھیٹر جانے والے صرف نچلے طبقے کے لوگ یا آوارہ نوجوان ہوتے تھے اور عام گھروں کے اندر صرف گانوں کی آواز بذریعہ ریڈیو پہنچی تھی جبکہ آج ٹی وی اور وی سی آر نے ہر گھر کو سینما بنا دیا ہے ــــ ملکی سطح پر ایک جانب داخلی صورتِ حال وگرگوں ہے کہ اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے ملک میں نسلی، لسانی اور صوبائی عصبیتیں پروان چڑھ رہی ہیں بلکہ بعض علاقوں میں تو نہایت خوفناک صورت اختیار کر چکی ہیں ــــ دوسری جانب گرد و پیش کے حالات اس سے بھی زیادہ تشویشناک ہیں۔ چنانچہ شمال مغربی سمت سے الحاد و مادّہ پرستی کی بدترین صورت یعنی کمیونزم جس نے اس صدی کے اوائل میں اِس خطّے کو ہضم کیا تھا جس میں ایک زمانے میں قال اللّٰہ اور قال الرسولؐ کی صدائیں شاید دنیا بھر کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند ہوتی تھیں ــــ اور اب اُسی صدی کے اواخر میں ہماری آنکھوں کے سامنے پونے دو کروڑ افراد پر مشتمل پوری افغان قوم کو ایک مہیب اژدھے کے مانند آہستہ آہستہ نگل رہا ہے ــــ حتیٰ کہ اَب وہ سیلاب وطنِ عزیز کے عین دروازوں پر دستک

ے رہا ہے۔ اِدھر جنوب مشرق میں ہندو امپیریلزم کا عِفریت ایک نئے جوش و جذبے کے ساتھ چنگھاڑتا ہوا اُٹھ رہا ہے ——— ان حالات میں واقعہ یہ ہے کہ اگر حسب سابق یہاں صرف اسلام کا نام سیاسی اور گروہی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا رہا اور ایک حقیقی اور واقعی اسلامی دعوت و تحریک خالصتہً منہاج نبوت پر نہ اٹھی اور اس کے ذریعے مستقبل قریب میں بلکہ آئندہ چند سالوں کے اندر اندر ایک ہمہ گیر اسلامی انقلاب پاکستان میں نہ آیا اور حقیقی اور واقعی اسلام کی برکات سے عوام النّاس کو متمتّع ہونے کا موقع نہ ملا تو پاکستان کا نام تو نسیًا منسیًا ہو گا ہی ——— دینی درسگاہیں اور رُوحانی خانقاہیں بھی محفوظ نہ رہیں گی۔ اور معاملہ بالکل وہی ہو گا کہ ع "تمہاری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں!" ——— اعاذنا اللّٰہ من ذالك۔

ان حالات میں ہمیں اپنی 'ترجیحات' پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ ——— کاش کہ پاکستان کے تمام علمائے دین بالعموم اور حلقۂ دیوبند کے متوسلین بالخصوص اُس دردبھری صدا پر کان دھر سکیں جو حضرت شاہ صاحب کے محولہ بالا جملوں سے اُبھر کر سامنے آتی ہے ——— اور اگر وہ خود اپنے علمی و تدریسی مشاغل سے فرصت نہ پائیں کہ خود دعوت و تنظیم کے کھکھیڑ میں پڑسکیں یا درسگاہوں اور خانقاہوں کا پاک صاف ماحول انہیں اجازت نہ دے کہ وہ گندگی اور تعفن بھرے معاشرے کی صفائی کے لئے کمربستہ ہوں تو کم از کم ان لوگوں کی سرپرستی تو فرمائیں جو اس کام کے لئے کمرِ ہمت کس لیں اور ان کی کوتاہیوں سے چشم پوشی اور دوسرے اور تیسرے درجے کے اختلافی امور سے صرفِ نظر کرتے ہوئے خود اُن کی اصلاح پر کمربستہ ہوں۔

چنانچہ یہ ہے وہ پس منظر جس میں 'تقلید' یا 'عدم تقلید' یا اس عاجز کی اختیار کردہ اصطلاح "نیم تقلید" کے مسئلے پر غور ہونا چاہیئے۔ اس ضمن میں نہایت تفصیلی گفتگو معاصر 'الخیر' ملتان کے مدیر جناب مولانا محمد ازہر صاحب اور ایک مضمون نگار مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب نے کی ہے۔ چنانچہ راقم بھی تفصیلی

گذارشات ان ہی کی خدمت میں پیش کرے گا۔

جہاں تک حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہ کا تعلق ہے اوّلاً تو راقم اُنکا مدد رجہ شکرگزار ہے کہ انہوں نے راقم کے نظریۂ 'نیم تقلید' کی بکراہت ہی سہی، کسی نہ کسی درجے میں تصویب فرمادی ہے، بدیں الفاظ:

"ہاں البتہ اگر کوئی غیر مقلد ہو اور وہ ان ائمہ کو مقتدا مان کر بلاخواہش نفس مسئلہ کو راجح سمجھتے ہوئے ایسا کرنے لگے تو شاید اُس کے لئے مطلقاً غیر مقلد بنے رہنے سے بہتر ہوگا۔ کیونکہ آجکل کے علماء سے مسئلہ پوچھ کر عمل کرنے سے یہ بہت زیادہ افضل ہے کہ ائمہ کی تحقیق پر چلے — رحمہم اللہ۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا ہاتھ حالاتِ حاضرہ کی نبض پر ہے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ وہ صرف 'عالمِ دین' اور 'شیخ طریقت' ہی نہیں ہیں بلکہ ملکی سیاست کے میدان میں بھی فعّال و سرگرم ہیں: فقہی مسلک کے معاملے میں مولانا کے مزاج کے اس 'توسّع' کا ایک اندازہ اُس وقت بھی ہوا تھا، جب تنظیم اسلامی میں شمولیت کی 'بیعت جہاد' کے ضمن میں اُن سے مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کے خلف الرشید مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے جو آجکل لندن میں مقیم ہیں وضاحت طلب فرمائی تھی تو مولانا نے اپنے جوابی گرامی نامے میں کچھ اس قسم کے الفاظ لکھے تھے کہ:

"ہمیں یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ جماعتِ اسلامی میں جو شخص بھی شامل ہوا وہ تقلید کے ضمن میں تو کچھ نہ کچھ ضرور ہی نرم پڑ گیا"، راقم کے معاملے میں 'نرمی' اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

ثانیاً — میں مولانا کو اپنی اور اپنے رفقاء کی جانب سے یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ ہم دین میں اپنے لئے آسانیوں کی تلاش کے قائل نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کی تائید اور توفیق کے بھروسے پر فی الجملہ 'رخصت' کی بجائے 'عزیمت' کی راہ پر چلنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ فقہی مسائل میں بھی اگر کوئی 'توسّع' ہوا تو وہ ان شاء اللہ العزیز 'ہر مسلک میں سے چن چن کر آسان مسائل لے لینے' کی بنا پر نہیں ہوگا۔ بلکہ اس معاملے میں حتی الامکان اسی طرزِ عمل کو اختیار

کرنے کی کوشش کی جائے گی جسے مولانا نے اپنی تحریر میں دو مقامات پر "مستحب" سے تعبیر فرمایا ہے!

البتہ موقع کی مناسبت سے ایک بات نہایت ادب کے ساتھ مولانا ممدوح اور انکی وساطت سے جملہ علمائے دین بالخصوص متوسلین حلقۂ دیوبند سے عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں: اور وہ یہ کہ دین کے علم و عمل کے اس عالمگیر زوال، ــــ اور فتنہ و فساد اور حرص و ہوا کے ہمہ گیر غلبے کے پیش نظر کیا حکمتِ دعوت و اصلاح اور خود مصلحتِ دینی اس کی متقاضی نہیں ہے کہ رجالِ دین خود کمالِ حزم و احتیاط کے ساتھ اُسی طرزِ عمل پر کاربند رہتے ہوئے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، عوام کے لئے "یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ" کی کی قرآنی رہنمائی اور "یَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا" کے فرمان نبوی کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ آسانیاں پیدا کریں اور اس کے لئے ائمۂ اربعہ کے دائرے کے اندر اندر زیادہ سے زیادہ توسّع پیدا کریں؟ گذشتہ سال مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ محاضراتِ قرآنی میں حصّہ لینے کے لئے بھارت سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، کے رفیق کار اور معتمد خصوصی مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب لاہور تشریف لائے تھے ـ تو اس موقع پر انہوں نے بھی اس ضرورت کا شدّت کے ساتھ اظہار فرمایا تھا ـ اس لئے کہ وہ بھی بفضلہ تعالیٰ دعوت و اصلاح کے میدان میں بہت سرگرم ہیں اور اس بنا پر انہیں حالات اور ان سے پیدا شدہ 'ضروریات' کا براہِ راست احساس ہوا ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ عوام الناس بالخصوص نیم تعلیم یافتہ، لوگوں میں یہ تاثر عام ہے کہ مولویوں کے پاس اپنے لئے آسانیاں پیدا کرنے کے لئے تو مفصّل 'کتاب الحیل' موجود ہے لیکن دوسروں کو وہ ہمیشہ سخت سے سخت فتویٰ دیتے ہیں! میری ناچیز رائے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تاثر کو بالکل برعکس کر دیا جائے اور لوگوں میں یہ تاثر عام ہو جائے کہ رجالِ دین اپنے اوپر تو بہت سختی کرتے ہیں لیکن دوسروں کے لئے زیادہ سے زیادہ نرمی اور آسانی پیدا کرتے ہیں ــــ اور اغلباً صوفیائے کرام کی کامیا

کا راز اسی میں مضمر تھا!) ۔ کاش کہ جس طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح نے ”جراُت رندانہ“ سے کام لیتے ہوئے ”الحیلۃُ الناجزۃ فی الحلیلۃ العاجزۃ“ کی صورت پیدا فرمائی اور اس پر علماء کرام کی جانب سے عمومی تصویب بھی حاصل فرمائی اس طرح اکابر علماء میں سے کوئی اور باہمت اور مجدّدانہ مزاج کی حامل شخصیت اس معاملے میں مزید اقدام کے بارے میں غور کر سکے! یہ واضح رہے کہ ہمارے نزدیک یہ کام ہے صرف علماءِ کرام اور ان میں سے بھی علم وفہم تقویٰ وتدین اور زہد وورع کے جملہ اعتبارات سے مسلّم مرتبے کی حامل شخصیت کا!

’میثاق‘ نومبر ۸۲ء میں شائع شدہ باقی چار خطوط میں سے ایک یعنی مولانا حافظ قاری محمد سعید الرحمٰن علوی (سابق مدیر ہفت روزہ ’خدام الدین‘ لاہور) کے خط میں تو ’جواب طلب‘ بات کوئی نہیں ہے، البتہ کراچی سے اصحابِ ثلاثہ (جناب خسروی صاحب، مولانا محمد عبدالبرّ صاحب اور جناب ایس پی علی صاحب) کے خطوط میں بعض اُمور وضاحت طلب ہیں جن پر ان شاء اللہ آئندہ کسی صحبت میں گفتگو ہوگی [۱]۔ سردست قارئین ’میثاق‘ کی اطلاع کے لئے اتنا عرض ہے کہ اپنے گزشتہ دورۂ کراچی کے موقع پر میں جناب خسروی صاحب کے در دولت پر حاضری دے کر بالمشافہ گفتگو کر چکا ہوں ــــ اور الحمد للہ کہ اپنی تحریر میں وہ جس قدر تیکھے، نظر آتے ہیں حقیقۃً اُتنے نہیں ہیں! آئندہ سفرِ کراچی میں ان شاء اللہ مولانا عبدالبرّ صاحب سے بھی ملاقات کا ارادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اُمید واثق ہے کہ ان سے ملاقات بھی بہت مفید ثابت ہوگی ۔

لگے ہاتھوں اس کا بھی تذکرہ ہو جائے تو غالباً کوئی حرج نہ ہوگا کہ راقم نے بحمد اللہ اپنے طے شدہ لائحۂ عمل کے مطابق علماءِ کرام سے ملاقاتوں کے لئے کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر حاضری دینے کا سلسلہ عملاً شروع کر لیا ہے ۔ چنانچہ

---

[۱] اس دوران میں ایک ایک خط جناب خسروی صاحب اور مولانا عبدالبرّ صاحب کا اور وصول ہو چکا ہے لیکن دیگر مضامین کی طوالت اور صفحات کی کمی کے پیش نظر یہ خطوط اس اشاعت میں شامل نہیں کئے جا سکے ۔

گذشتہ دورۂ کراچی کے موقع پر ایک نہایت مفصل اور حد درجہ مفید ملاقات حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی مدظلہٗ سے ہوئی اور راقم ان کا بے حد ممنون ہے کہ انہوں نے بغیر کسی تکلّف کے اپنے جملہ شکوک وشبہات پیش فرماتے ——— اور الحمد للہ کہ راقم کی وضاحتوں پر اظہارِ اطمینان فرمایا ——— اسی طرح اپنے دورۂ سوات، دِیر اور باجوڑ کے موقع پر راقم لگ بھگ پچاس ساٹھ میل کا اضافی فاصلہ طے کر کے تبرّکاً حضرت شیخ الہندؒ کے خادم ورفیقِ زنداں حضرت مولانا عزیز گل مدظلّہٗ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا - اور اُن سے خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور ان کی مجوزہ امامت ہند کے سلسلے میں مفید گفتگو ہوئی ——— مزید برآں میرے حالیہ دورۂ کوئٹہ کے دوران ایک تو وہاں کے رفقاء نے از خود علماء کرام کے ساتھ ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا تھا - اس پر مستزاد مولانا منیر الدین مدظلہٗ صدر مجلسِ تحفظِ ختم نبوت، بلوچستان کے ساتھ خالص تنہائی میں نہایت مفید ملاقاتیں ہوئیں -

---

ماہنامہ اور ہفت روزہ جرائد میں سے راقم کے علم کی حد تک تاحال دو ہفت روزہ رسالوں یعنی معاصر 'چٹان'، لاہور اور معاصر 'تنظیم اہلحدیث' نے تائیدی وتصویبی شذرات لکھے ہیں جو قارئین کی دلچسپی کے لئے اس اشاعت میں شامل کئے جا رہے ہیں ——— ان میں سے مولانا عزیز زبیدی مدظلہ کا شذرہ میرے لئے خصوصی اہمیت کا حامل ہے، اس لئے کہ میری معلومات کے مطابق وہ بھی جماعتِ اسلامی کے 'سابقین' میں سے ہیں ——— البتہ دو ماہناموں یعنی 'طلوعِ اسلام'، لاہور اور 'الخیر' ملتان نے تنقیدی مقالات شائع کئے ہیں -

ان میں سے جہاں تک 'طلوع اسلام' کا تعلق ہے اُس کی ایک گرفت یقیناً درست ہے - جس کا ذکر بھی پہلے ہو چکا ہے اور اُس کے ضمن میں راقم اپنی وضاحت بھی پیش کر چکا ہے، باقی 'طلوعِ اسلام' کے اور ہمارے مابین نظریاتی اختلافات کی خلیج اتنی وسیع ہے کہ اس ضمن میں کچھ عرض کرنے کا نہ کوئی فائدہ ہے نہ ضرورت بلا فقط آیۂ قرآنی "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝" کا حوالہ کافی ہے ——— البتہ 'الخیر'

کی خدمت میں کچھ معروضات پیش کرنی ضروری ہیں ۔

ان میں اوّلاً تو ایک نیازمندانہ گلہ مدیرِ 'الخیر' سے ہے کہ ان کے پرچے کے جولائی ۸۴ء کے شمارے میں ایک تحریر مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی کی شائع ہوئی تھی جس کے جواب کی نقل 'الخیر' کو بھی ارسال کر دی گئی تھی ۔ ہمیں توقع تھی کہ نومبر کے پرچے میں ہمارا وہ جواب ضرور شائع ہو گا لیکن ہمیں مایوسی ہوئی ۔۔۔ غالباً عام صحافت کے اصولوں میں بھی یہ امر مسلّم ہے کہ اپنے جن قارئین کے ذہنوں میں 'الخیر' نے اپنے اُس مضمون کے ذریعے کچھ سوالات پیدا کر دیئے تھے ان کے جوابات بھی اُن قارئین تک پہنچانا 'الخیر' کی ذمہ داری ہے ۔۔۔ دیا پھر دوسری ممکن صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اپنے قارئین کی فہرست 'الخیر' ہمیں فراہم کر دے تاکہ ہم خود ان تک اپنا جواب پہنچا دیں!)

ثانیاً ۔۔۔ ایک 'ہدیہ تشکر' پیش کرنا ہے 'الخیر' کے مضمون نگار مولانا عبدالقیوم حقانی کی خدمت میں کہ انہوں نے 'الخیر' میں اپنی تیز و تند تنقید چھپوانے کے ساتھ راقم کے نام ایک ذاتی خط لکھنے کی تکلیف بھی گوارا کی ۔ جس میں وہ رقم طراز ہیں:

"محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب زید مجدکم ۔۔۔۔ سلام مسنون!
اُمید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے ، ستمبر کے ماہنامہ 'میثاق' کے شمارہ میں آپ کے خطاب سے متعلق دینی اور شرعی نقطۂ نظر سے جو تبصرہ ضروری سمجھا اسے ۸ ، ۱۰ صفحات میں ماہنامہ 'الخیر' ملتان کے تازہ شمارہ میں شائع کرا دیا ہے ۔ انہوں نے آپ کے پاس وہ شمارہ بھیج دیا ہے ۔ کسی ذاتی عناد یا بغض سے قطع نظر ، خالص احساسِ ذمہ داری اور عنداللہ مسئولیت کے پیشِ نظر یہ قدم ضروری سمجھا ۔۔۔ ورنہ میں اپنے زمانۂ شعور سے تاحال آپ کے لٹریچر کو باقاعدگی سے پڑھتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ ہماری معروضات پر ٹھنڈے دل اور گہری سوچ کے ساتھ غور فرمائیں تو مسئلہ واضح ہو جائے گا ۔
باری تعالیٰ ہم سب کو ہدایت کے راستے پر چلائے ۔ والسلام"

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ ویسے تو راقم نے جس وادی میں قدم رکھا ہے اُس کے پیشِ نظر راقم ہر وقت "غیروں" کی جانب سے کسی بھی قسم کے "ناوکِ دشنام" کے

ساتھ ساتھ اپنوں" کی جانب سے بھی ہر نوع کے "طرزِ ملامت[1]" کے لئے ذہناً اور قلباً تیار رہتا ہے اور اُس کے دل پر اگر کبھی کسی کی جانب سے ملال کا اثر ہوتا بھی ہے تو محض عارضی طور پر ـــــ تاہم مولانا حقانی کے اس خط نے تو اُس کا بھی کُلّیتہً سدباب کر دیا ـ جس کے لئے میں اُن کا ممنون ہوں!!

"الخیر" میں شائع شدہ دونوں تحریروں کے مشترک نفسِ مضمون کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے قبل ایک "حُسنِ اتفاق" (یا سُوءِ اتفاق؟) کا ذکر قارئین کی دلچسپی کا مُوجب ہوگا ـــ وہ یہ کہ ایک روز فجر کی جماعت کے فوراً بعد میرے ایک رفیق کار نے مجھے بیک وقت "طلوعِ اسلام" اور "الخیر" کے شمارے دیئے ـ میں نے جو اُن کے مضامین کو سرسری طور پر دیکھا تو ایک عجیب "فوری تضاد" (SIMULTANEOUS CONTRAST) نظر آیا کہ "طلوعِ اسلام" کے مدیر کو میری پوری تقریر میں از اوّل تا آخر نِری اسلاف پرستی ہی اسلاف پرستی نظر آئی ـــــــــــــــــ اور "الخیر" کے دونوں مضمون نگاروں کو اسلاف سے بغاوت ہی بغاوت نظر آئی گویا معاملہ وہی ہوا کہ ؎

"زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں!"

پرچے میں ترتیب کے اعتبار سے تو اگرچہ مدیرِ "الخیر" مولانا محمد ازہر صاحب کی تحریر پہلے ہے اور مولانا حقانی صاحب کی بعد میں، لیکن جیسا کہ خود مولانا محمد ازہر صاحب نے وضاحت فرما دی ہے مولانا حقانی کی تحریر "الخیر" کی اکتوبر کی اشاعت سے بھی قبل ان کے پاس پہنچ گئی تھی ـــ مزید برآں دونوں تحریروں کے بالاستیعاب مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں "اصل" کی حیثیت مولانا حقانی ہی کی تحریر کو حاصل ہے ـــ لہٰذا ہم بھی اصلاً اُسی کے بارے میں عرض کریں گے ـ

---

[1] فیض کا شعر ہے ؎

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت!

(پ ـ ن) عجب اتفاق ہے کہ جس وقت راقم نے فیض کا یہ شعر اس مقام پر درج کیا اگلے روز کے اخبارات سے معلوم ہوا کہ عین اُسی وقت اُس کا جسدِ خاکی لحد میں اتارا جا رہا تھا ـ

مولانا حقانی کی پوری تحریر کو بار بار پڑھنے کے بعد راقم پوری دیانت کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ 'اس کی اساس چند 'مغالطوں' پر ہے —— واضح رہے کہ ان 'مغالطوں' کی وجہ راقم کے نزدیک مولانا حقانی کا 'قصورِ فہم' ہرگز نہیں ہے بلکہ کچھ خود راقم کی اپنی کج مج بیانی — اور کچھ اس تقریر کے مرتب کی تقصیر ہے (جس کی ایک مثال کا ذکر اوپر بھی ہو چکا ہے، یعنی یہ کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے قول کا اہم ترین حصّہ نقل ہونے سے رہ گیا!) - ان دو کے علاوہ ایک سبب اور بھی ہے جس کا ذکر بعد میں آجائے گا —— بنابریں راقم کسی لفظی نزاع میں الجھنے یا لفظ بلفظ بحث میں وقت ضائع کرنے کی بجائے مناسب سمجھتا ہے کہ ان مغالطوں کو دُور کرنے کی کوشش کرے جس سے ان شاء اللہ نہایت آسانی کے ساتھ مسئلہ حل ہو جائے گا - اور اگر اس کا کوئی حصّہ حل طلب باقی رہ گیا تب بھی اُس کے حل کی راہ لازماً آسان ہو جائے گی —— اس ضمن میں راقم مولانا حقانی اور مولانا محمد ازہر دونوں حضرات سے بھی درخواست کرتا ہے کہ براہ کرم اس بحث میں نہ الجھئے کہ تمہاری شائع شدہ تقریر کا مطلب تو وہی نکلتا تھا جو ہم نے نکالا تھا —— اس لئے بھی کہ میں خود اپنی اور بھائی جمیل الرحمن صاحب کی 'تقصیر' تو پہلے ہی تسلیم کر چکا ہوں - اور اس لئے بھی کہ کم از کم 'بقیدِ حیات' لوگوں کے بارے میں تو یہ حق مسلّمہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اپنے قول کی تاویل کا حق انہیں حاصل رہتا ہے! (چنانچہ "تاویلُ القولِ بما لا یَرضیٰ بِہ القائل" کو سب ہی غلط سمجھتے ہیں!) اور آئندہ گفتگو کی اساس کسی شخص کے قول کی اُس تاویل کو بنایا جانا چاہیئے جو وہ خود کرے -

ان مغالطوں میں اوّلین اور اہم ترین یہ ہے کہ میں تمام فقہی مسالک کو ختم کر کے "ایک فقہی مسلک پر مجتمع" کرنے اور "مستقبل کی کسی شخصیت کو اجتہادِ مطلق کی دعوت" کا علمبردار ہوں - لہٰذا میں سب سے پہلے اسی غلط فہمی کو رفع کر دینا چاہتا ہوں اس لئے کہ میرے نزدیک دونوں بزرگوں کی برہمی کا اصل سبب یہی ہے -

اصل میں یہی وہ غلط فہمی ہے جس کے بارے میں مَیں نے اوپر عرض کیا تھا کہ اس کا ایک خاص سبب ہے' —— وہ یہ کہ لاہور میں میری تقریریں 'مسلسل ہوتی

ہیں اور بعض مسائل جن پر سابق تقریر میں مفصل بحث ہو چکی ہوتی ہے اگلی تقریر میں اُس کا صرف ایک سرسری سا ذکر ہوتا ہے اور میں یہ فرض کر لیتا ہوں کہ اسکے ضمن میں میرا پورا موقف 'سامعین' کے علم میں موجود ہے - اب ظاہر ہے کہ جس کے سامنے میری وہی تقریر ہو گی اُس کا اس اجمال کے باعث 'مغالطے' میں مبتلا ہو جانا بالکل قرینِ قیاس ہے -

یہ بات تو میری اس تقریر سے بھی سب پر واضح ہو گئی ہو گی کہ اس کے پس منظر میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی وہ رائے ہے جو انہوں نے اپنی تفسیر 'تدبّر قرآن' کی جلد چہارم میں حدِ رجم کے بارے میں ظاہر فرمائی ہے اور جو راقم کے اُن سے آخری اور قطعی 'انقطاع تعلق' کا سبب بنی - چونکہ راقم کا ایک نہایت طویل مدّت تک (لگ بھگ ثلث صدی) مولانا موصوف کے ساتھ نہایت قریبی اور گہرا تعلق رہا ہے اور ان کے اور راقم کے بہت سے احباب اور محبّین متعلقین مشترک ہیں - پھر یہ کہ ہم دونوں ایک ہی شہر میں مقیم ہیں اور ہمارے مابین 'مکانی' فصل و بعد بھی زیادہ نہیں ہے لہٰذا ہمارے 'بعض مستقل' سامعین' بھی مشترک ہیں - یہ وجہ ہے کہ گذشتہ دنوں اس مسئلے پر بہت سے لوگوں سے بہت 'گرما گرم' گفتگوؤں کا سلسلہ چلا ——— جس میں اُن کے حامیوں کی جانب سے بار بار ایک دلیل نما سوال یہ کیا گیا کہ "کیا تمہارے خیال میں اب کسی نئے مجتہد کے پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے؟" ——— اصل میں اِس سوال کے جواب میں مَیں عرض کرتا رہا کہ "اِس کے امکان کو میں قطعاً تو ردّ نہیں کرتا - لیکن ایسی کسی شخصیت کے لئے لازم ہو گا کہ نہ صرف علم و فضل ——— بلکہ تقویٰ و تدیّن اور خلوص و للّٰہیت میں بھی اپنے دَور کے عوام و خواص دونوں سے اپنا لوہا منوا لے

---

[۱] حسن اتفاق سے اس "امکان" کی تصویب مولانا عبدالحیٔ لکھنوی رحؒ کے اس قول سے بھی ہو گئی جو 'تیر' کے صفحہ ۲۴ پر درج ہے ——— یعنی "جو یہ دعویٰ کرے کہ ائمہ اربعہ کے بعد کوئی مجتہد نہیں ہو سکتا تو یہ غلط ہے ——— البتّہ اگر یہ کہے کہ ائمہ اربعہ کے بعد کوئی ایسا مجتہد نہیں ہوا جس کے دعویٰ اجتہاد کو جمہور نے مانا ہو تو یہ مسلّمہ ہے" (بحوالہ 'شریعت و طریقت')

یہی بات میری ایک تقریر میں (جو ایک مقامی ہوٹل میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی تھی) اس طور سے آگئی کہ "میں اس امکان کو خارج از بحث تو قرار نہیں دیتا کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ مستقبل میں کسی ایسی شخصیت کو اُٹھا دے جو فقہی اختلافات کو بالکل ختم کر کے اُمت کو کسی ایک ہی مسلک پر جمع کر دے — لیکن بحالاتِ موجودہ یہ ایک ان ہونی سی بات ہے اور فی الوقت ہمیں یہی چاہیئے کہ سلفِ صالحین کی پیروی کرتے ہوئے صرف اسقدر کریں کہ جملہ فقہی مسالک کے لئے اپنے سینوں اور دلوں میں وسعت پیدا کرلیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہم محض فقہی مسلک کے اختلاف کی بنا پر 'مَن دیگرم تو دیگری' کا سا انداز اختیار کر لیں — اور دین کے احیاء و قامت کی جدّوجہد میں شانہ بشانہ شریک نہ ہو سکیں!"

پھر یہی بات مسجد دارالسلام والی تقریر میں مختصراً اُس طرح آگئی جیسے 'میثاق' میں چھپی ہے۔ بہرحال میں واضح الفاظ میں صراحت کرتا ہوں کہ میرے اس قول سے مراد صرف اس درجے میں 'امکان' کو تسلیم کرنا ہے جس درجے میں ہم عموماً 'بفرضِ محال' کسی بات کا ذکر کرتے ہیں — میں اس سے قطعی اعلان براءت کرتا ہوں کہ میں اس کا داعی یا مبلّغ یا کسی درجے میں بھی مجوّز و محرّک ہُوں! (اللہ کا شکر ہے کہ دونوں بزرگوں میں سے کسی نے مجھ پر خود اس کے 'مدّعی' ہونے کا الزام عاید نہیں کیا — تاہم میں واضح کئے دیتا ہوں کہ اپنے بارے میں کسی ایسے گمان سے پہلے میَں اسے پسند کروں گا کہ زندہ آگ میں جلا دیا جاؤں' واللہ علیٰ ما اقول وکیل!)

میری زیرِ بحث تقریر کا بھی اصل رُخ 'تقلید' کی جانب ہے — اور میرے کم از کم لاہور کے 'جملہ' سامعین' تو اس سے بخوبی آگاہ ہیں کہ گذشتہ تقریباً چھ ماہ سے میں نے سب سے زیادہ زور ان ہی نکات پر دیا ہے جو 'الخیر' کے ص۳۹ ۴۰ پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رح کی تحریر سے نقل ہوتے ہیں — اور جو نہایت خوبصورت الفاظ میں علامہ اقبال مرحوم نے بھی اپنی مشہور مثنوی 'اسرار و رموز' میں 'رموزِ بیخودی' کے ذیل میں — 'درمعنیٔ ایں کہ درزمانۂ انحطاط تقلید از اجتہاد اولیٰ تراست!'' کے عنوان سے نظم کئے ہیں:

راہِ آبا رَو کہ ایں جمعیت است   معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط — قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر — اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
عقل آبائت ہوس فرسودہ نیست — کارِ پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکرِ شاں ریسد ہمے باریک تر — ورعِ شاں با مصطفیٰؐ نزدیک تر

اجتہاد کے ضمن میں بھی الحمدللہ میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ اور مجھے اپنے موقف اور ان بزرگوں کی تصریحات کے مابین کوئی تباین، تو کیا 'بُعد' بھی نظر نہیں آیا جن کے حوالے 'المیثاق' کے زیرِ نظر شمارے میں درج کئے گئے ہیں۔ تاہم میں مختصراً ا نا موقف اپنے ہی الفاظ میں بیان کئے دیتا ہوں:

ان تمام مسائل کے ضمن میں جو ائمہ مجتہدین (یعنی ائمہ اربعہ) کے زمانے میں ا ہو چکے تھے اور اُن پر انہوں نے پوری طرح غور و فکر کر کے اپنے فیصلے ثبت فرما دیئے ، اُن میں سے (ا) جن مسائل میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہو اُن کے ضمن میں تو میں ہادِ مطلق، تو کجا بجزو جنسِ اجتہاد کے باقی رہنے کا بھی قائل نہیں — البتہ (ب) جن ، اُن کے مابین اختلافِ رائے ہو اُن کے ضمن میں 'اجتہاد' کو اس میں دائر سمجھتا ہوں ، اُن میں سے کسی کے موقف کو ترجیح دیتے ہوئے اختیار کر لیا جائے! لیکن اُن کے ئرے سے باہر نکلنے کو کسی طرح صحیح نہیں سمجھتا۔

جنسِ اجتہاد، یا 'نفسِ اجتہاد' کے بقاء و تسلسل کا معاملہ میرے نزدیک اُن مسائل ں ہے جو سائنسی ترقی اور عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں بالکل نئی 'صورتِ معاملہ' کی حیثیت ے پیدا ہوئے ہیں۔

دوسرا اہم مغالطہ دونوں حضرات کو یہ ہوا ہے کہ میں "پانچ کے دائرے میں نیم لیدی مسلک کا ایک اور دروازہ" بنانے کا داعی ہوں۔ اگر میرے الفاظ سے ایسا ناد ہوا ہے تو میں اس سے بھی علیٰ رؤس الاشہاد رجوع کرتا ہوں۔ اس ضمن ں اصل معاملہ یہ ہے کہ میں صرف ایک بات کا داعی ہوں اور ایک کا مستدعی!

٭ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ آج ۲۲ نومبر ۸۲ء کی صبح یہ تحریر سپردِ قلم کر رہا ہوں۔ اور گذشتہ شب نی ۲۱ نومبر کی رات کو میں نے جناح ہال لاہور میں ایک اجتماعِ عام میں یہ اشعار بھی پڑھ کر سنائے، ور اجتہاد کے بارے میں بھی وہ رائے ظاہر کی جو آگے آ رہی ہے۔

داعی، میں صرف اس بات کا ہوں کہ مختلف فقہی مسالک کے ماننے والے اُن
پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے سینوں اور دلوں میں 'وسعت' پیدا کریں اور ایسا نہ ہو کہ
" قولنا صوابٌ لکن محتملُ الخطاءِ وقولُ غیرِنا خطاءٌ محتمل
الصوابِ " صرف کہنے اور لکھنے میں آئے —— اور عملی صورت یہ ہو کہ فقہی اختلافات
کی بنا پر ہمارے دلوں میں بُعد پیدا ہو جائے اور ہم مل جُل کر شانہ بشانہ منکرات، فواحش
کے خلاف جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی سعی، اور غلبۂ اقامتِ دین کی جدوجہد
میں شریک نہ ہو سکیں۔ میری تقریر میں سارا زور اصلاً اسی پر ہے، اور بادنیٰ غور و
تأمّل یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اسی 'وسعتِ قلب، فقہی' رواداری، سے
حدیث نبویؐ "اختلاف اُمّتی رحمۃ" (الخیر، ص۳۸) اور مولانا حقانی کے اپنے
الفاظ "تمام ائمہ کے مسالک برحق ہیں اور اختلاف ائمہ رحمت ہے" (الخیر ص۳۹)
کی عملی تعبیر سامنے آسکتی ہے —— یہاں طویل اقتباس طوالت کا موجب ہوگا
لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر میری ان تصریحات کی روشنی میں میری مطبوعہ
تقریر کے صفحہ ۴ کے وسط سے صفحہ ۱۰ کے وسط تک کے حصہ کو دوبارہ پڑھا
جائے اور اس میں مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے اقتباس کا وہ حصہ بھی شامل کر
لیں جو زیر نظر تحریر میں پہلے دیا جا چکا ہے —— تو ان شاء اللہ العزیز یہ مغالطہ رفع
ہو جائے گا اور میرا اصل مافی الضمیر واضح ہو جائے گا۔

اہلِ سنت کے متفق علیہ چار فقہی مسالک اور ان کے بانی ائمہ کرام رحمہم
اللہ پر میں امام بخاریؒ کا اضافہ اصلاً تو اس بنا پر کرتا رہا ہوں کہ میرے نزدیک 'حقیقتِ
ایمان' کے ضمن میں جامع اور صحیح ترین تعبیر امام ابو حنیفہؒ اور امام بخاریؒ دونوں
کی تعبیرات کی جمع و تطبیق ہی سے وجود میں آتی ہے —— ورنہ میرا ذاتی گمان بھی یہی
تھا (اگرچہ اپنی کم علمی کی بنا پر اس پر جازم نہیں تھا) کہ امام بخاریؒ کا کوئی مسئلہ
ائمہ اربعہ کے دائرے سے باہر نہیں ہوگا) —— اور الحمد للہ کہ حضرت مولانا مفتی
ولی حسن صاحب ٹونکی نے اپنی محولہ بالا ملاقات میں پورے جزم کے ساتھ اور لحصا
اور استقصا کے انداز میں فرمایا کہ واقعتہً ایسا ہی ہے! جس سے مزید انشراح ہوا
—— البتہ چونکہ مسالک اربعہ کے پیروؤں میں سے تو ہمارے

یہاں شاید احناف کے سوا شاذ ہی کسی اور مسلک کے لوگ موجود ہوں، لیکن اہلِ سُنّت کا ایک اور گروہ برّصغیر پاک و ہند میں معتد بہ تعداد میں موجود ہے جو غیر مقلدین یا اہلِ حدیث یا سلفی المسلک، الغرض مختلف ناموں سے موسوم ہے — اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سالوں کے دوران ان حضرات نے مُشرکانہ اوھام، ہندوانہ رسومات اور بدعاتِ سیئہ کے خلاف نہایت مؤثر جہاد کیا ہے اور مؤثر خدمات انجام دی ہیں[1] اور اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ یہ صرف ایک 'مسلک' ہے کوئی 'معیّن' 'مذہب' نہیں ہے اور اصولی طور پر اس میں کسی معیّن مجتہد کی تقلید خارج از بحث ہے۔ تاہم اکثر و بیشتر مسائل میں یہ حضرات امام بخاریؒ کے اجتہادات ہی کا اتباع کرتے ہیں (چنانچہ کچھ حضرات انہیں طنزاً "مقلدینِ بخاریؒ" کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں!) — اور جیسا کہ میں نے اپنی زیرِ بحث تقریر میں عرض کیا تھا،

---

[1] اور یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ تحریکِ شہیدینؒ کی سرحد میں ظاہری ناکامی کے بعد اُس کے "باقیاتُ الصّالحات" کے ذریعے دینِ حق کی جو خدمت برّصغیر پاک و ہند میں سرانجام پائی اُس میں خواہ تعداد کی کثرت اور اثرات کی وُسعت کے اعتبار سے 'حنفی المسلک' علماء و اکابر کا پلڑا بھاری نظر آئے۔ حقیقت کے اعتبار سے 'سلفی المسلک' اشخاص، اداروں اور جماعتوں کا حصّہ بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ اور جہادِ حریت و استخلاصِ وطن ہو یا سعی غلبہ و اقامتِ دین، دونوں میدانوں میں ان دو مسلکوں کے پیرو شانہ بشانہ شریک رہے ہیں — چنانچہ ۱۹۲۰ء کے اجلاسِ جمیعت علماءِ ہند منعقدہ دہلی میں جہاں دہلی، دیوبند، اجمیر، بدایوں اور فرنگی محل کے 'حنفی' علماء شریک تھے وہاں اہلِ حدیث علماء بھی موجود تھے۔ چنانچہ مولانا محمد داؤد غزنویؒ کی شرکت تو تعیّن کے ساتھ ثابت ہے — اور اس ضمن میں 'آخری بات' یہ ہے کہ اس اجلاس میں حضرت شیخ الہندؒ جیسے 'کٹر حنفی' کے ایماء پر مولانا احمد سعید دہلویؒ اور مفتی کفایت اللہؒ ایسے حنفی علماء و مفتی حضرات نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ایسے 'آزاد' شخص کا نام 'بیعتِ امامتِ ہند' کے لئے پیش فرمایا تھا۔
— اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ 'جماعتِ مجاہدین' کے آخری شخص جو چند ہی سال قبل فوت ہوئے یعنی صوفی عبداللہ صاحب جنہوں نے ماموں کانجن میں عظیم الشان دینی مدرسہ قائم فرمایا مسلکاً اہلِ حدیث تھے — !!

امام بخاریؒ وہ شخصیت ہیں جن کے مرتب کردہ مجموعۂ احادیث کو جملہ اہلِ سُنّت "اَصَحُّ الکُتُبِ بَعْدَ کتابِ اللّٰہ" تسلیم کرتے ہیں۔ مزید براں اکابر علماءِ احناف نے اُن کی فقاہت کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ مجھے خود بھی جامعہ مدنیہ لاہور میں ایک تقریب ختم بخاری میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی تھی جس میں مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے امام بخاریؒ کی فقاہت کو نہایت شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین ادا فرمایا تھا۔) لہٰذا میں نے اپنی ذات کی حد تک 'نیم تقلید' کا جو دائرہ بنایا ہے اُس میں ائمۂ اربعہؒ کے ساتھ ساتھ امام بخاریؒ کو بھی شامل کیا ہے۔

اور یہی میری علماءِ کرام سے وہ استدعا ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا تھا ـــ یعنی میں اپنی ذات کی حد تک اس 'اجازت' کا طلبگار ہوں کہ اپنی 'تقلید' کو ان 'ائمۂ خمسہ' کے دائرے تک وسعت دیدوں! اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کا اصل سبب میری ایک ذاتی مشکل اور الجھن ہے جس کا ہمدردانہ احساس مجھے اندیشہ ہے، کہ حضراتِ علماء نہیں کرسکیں گے۔ معاملہ یہ ہے کہ میں نے کسی دینی مدرسے میں تعلیم حاصل نہیں کی ہے اگر ایسا ہوتا تو یقیناً "جس فقہی مسلک کا وہ مدرسہ ہوتا میرے دل ودماغ بھی اسی پر جازم اور راسخ ہوجاتے اور یہ مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا ـــ میری مشکل یہ ہے کہ میں تو سکولوں اور کالجوں کا پڑھا ہوا ہوں۔ اس کے باوصف یہ اللہ ہی کا فضل وکرم ہے کہ اُس تعالیٰ نے دین کی جانب رغبت عطا فرمائی ـــ اور اُس کے لئے تن من دھن حتّٰی کہ اولاد احفاد تک کو 'وقف' کرنے' داعیہ عطا فرمادیا۔ پھر یہ بھی سراسر اُسی کا فضل وکرم کہ اُس نے 'شیعیت' اور اُ کی جملہ شاخوں یا SHADES کے باطل ہونے اور مسلک اہلِ سنّت والجماعت کے حق ہونے پر ایسا انشراحِ صدر عطا فرمادیا کہ جس میں شک وشبہ کا کوئی شائبہ تک موجود نہیں، اب جہاں تک 'اہلِ سنت' کا تعلق ہے، جو بات علماء کرام اصولی طور پر تسلیم کرتے ہیں وہ میرا واقعی اور حقیقی 'حال' بن چکا ہے یعنی یہ کہ اس وسیع دائرے میں شامل جملہ ائمۂ فقہ اور محدثین کرام کی علمی کاوشوں کو میں اہلِ سنت کا مشترک علمی اثاثہ اور ورثہ (HERITAGE) سمجھتا ہوں۔ اور بعض مسائل میں خدا گواہ ہے کہ کسی 'سہولت' یا 'آسانی' کی خاطر نہیں بلکہ محض اطمینانِ قلب

کے لئے سکہ بند حنفی موقف اور "مُفتیٰ بہ" قول کو چھوڑ کر کسی ایسی رائے پر عمل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں جو ہوتی بہر صورت ان پانچ مسلکوں کے دائرے کے اندر اندر ہے۔

مثال کے طور پر "فاتحہ خلف الامام" کا مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں کسی آسانی یا سہولت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا دل کسی طرح نہیں مانتا کہ میں امام کے پیچھے سرّی رکعتوں میں بھی بالکل خاموش کھڑا رہوں ــ جبکہ ائمۂ اربعہ میں سے بھی بعض ــ اور خود امام ابوحنیفہؒ کے اجل تلامذہ میں سے امام محمدؒ کی رائے یہی ہے کہ سرّی رکعتوں میں مقتدی بھی سورۂ فاتحہ پڑھ سکتا ہے!ــ اس کے بالکل برعکس معاملہ "مزارعت" کا ہے کہ اس کے ضمن میں میں اپنے دل اور دماغ کے ہاتھوں بالکل مجبور ہوں کہ صاحبینؒ اور امام بخاریؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کی آراء کے مقابلے میں اصلاً امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اور تبعاً امام شافعیؒ کی آراء کی صحت کا اقرار ہی نہیں اعلان بھی کروں ــ (یہی وجہ ہے کہ میں نے مولانا محمد طاسین مدظلہ کا اس موضوع پر مقالہ پندرہ اقساط میں ماہنامہ "حکمتِ قرآن" میں شائع کیا)۔

بہرحال یہ ہے میری وہ "مشکل" جس کی بنا پر میں علماءِ کرام سے صرف اپنی ذات کی حد تک اس "توسّع" کی اجازت کا طلبگار ہوں ــــ ورنہ خدا گواہ ہے کہ کسی نئے مسلک کے آغاز یا نئی فقہ کی تدوین کا ارادہ تو کجا کوئی امکان بھی میرے حاشیۂ خیال تک میں موجود نہیں۔ (بلکہ یہ واقعہ عرض کر ہی دوں کہ جب مولانا اصلاحی صاحب کے اُن "نیم شاگرد"، جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور ایک دوسرے موقع پر اُن کے بھی ایک "نیم شاگرد" نے میری اس بات کے جواب میں کہ "اگر "حدِّ رجم" کے بارے میں مولانا اصلاحی کے موقف کو تسلیم کر لیا جائے تو معاملہ صرف "حدِّ رجم" ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک پورا نیا "دین" وجود میں لانا ہوگا" ــ یہ کہا کہ "ہاں یہ بالکل صحیح ہے لیکن پورا نیا دین نہیں بلکہ "نئی فقہ"!!" ــــ تو واقعہ یہ ہے کہ مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی تھی!) ــــ یہاں تک کہ جو لوگ مجھ سے "بیعتِ جہاد" کے تعلق میں منسلک ہوتے ہیں ان کے ضمن میں بھی میں نے پوری وضاحت کے ساتھ اعلان کیا ہوا ہے کہ فقہی مسلک اور تزکیہ و سلوک دونوں کے اعتبار سے وہ بالکل آزاد ہیں، جس فقہی مسلک

چاہیں پیروی کریں — اور جس سلسلے میں چاہیں اور جس بزرگ سے چاہیں بیعتِ ارشاد میں منسلک ہو جائیں — میری "اطاعت فی المعروف" کے پابند وہ صرف دعوت و اقامتِ دین کی جدوجہد کے ضمن میں ہیں!

الغرض راقم کی 'دعوت' جس کا وہ 'داعی' ہے وہ ہے جو اوپر بیان ہو چکی! اپنی ذات کی حد تک میری 'استدعا' جس کے لئے میں علماء کرام سے 'مستدعی' ہوں یہ ہے جو ابھی بیان ہوئی — اس کے سوا اللہ گواہ ہے کہ نہ کوئی 'دعویٰ' ہے نہ ادّعاء! اور یہ بات میں آج کے دن تک کے لئے تو اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ پورے جزم و انشراح کے ساتھ کہہ سکتا ہوں — آئندہ کے لئے صرف اسی تعالیٰ کی حفاظت و صیانت پر بھروسہ اور تکیہ ہے۔

متذکرہ بالا دو غلط فہمیوں کی بنا پر جو 'صدمہ' بجا طور پر ہر دو حضرات کو پہنچا اُس کے زیرِ اثر جو تلخ باتیں ان حضرات کے قلم سے صادر ہو گئیں۔ اُن پر گفتگو کو میں لا حاصل ہی نہیں مُضر سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ دو مغالطے رفع ہو گئے تو ان شاء اللہ ساری 'برہمی' از خود ختم ہو جائے گی۔

البتہ ایک بات ایسی ہے کہ جس پر ان شاء اللہ کسی آئندہ صحبت میں تفصیلی گفتگو ہو گی — اور وہ ہے مولانا مودودی مرحوم اور تحریکِ جماعتِ اسلامی کے بارے میں میری رائے اور اُن کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت! — اس پر چونکہ جناب خسروی صاحب اور بعض دوسرے مکتوب نگاروں نے بھی خاصی 'طبع آزمائی' فرمائی ہے لہٰذا اس ضمن میں تفصیلی وضاحت میرے ذمّہ ہے —

آخر میں دست بدعا ہوں"

اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ رَبَّنَا وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى وَاَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا وَاَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْآخِرَةِ — آمین یا ربّ العٰلمین!!!

(بیسویں نشست)

ایمان اور اس کے ثمرات

سورۃ تغابن کی روشنی میں

(مباحث ایمان)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلی ویژن کے دروس قرآنی کا سلسلہ

السلام علیکم - نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم - اما بعد:

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم - بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ
وَلَهُ الْحَمْدُ ۖ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ
فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ
وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا
تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

صدق اللہ العظیم

"اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے۔
بادشاہی اسی کی ہے اور کل شکر و ثنا اور تعریف بھی اسی کے لئے ہے۔ اور وہ ہر چیز

پر قادر ہے۔ اسی تعالیٰ نے تمہیں تخلیق فرمایا تو تم میں سے کچھ (اس تعالیٰ کا) انکار کرنے والے ہیں اور کچھ (اس تعالیٰ کو) ماننے والے ہیں۔ اور جو کچھ تم (اس دنیا میں) کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا اور تمہاری نقشہ کشی کی اور بہت اچھی نقشہ کشی اور صورت گری فرمائی۔ اور (تمہیں) اسی تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور وہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ اور اللہ سینوں میں پوشیدہ رازوں کا بھی جاننے والا ہے ؛

معزز حاضرین و محترم ناظرین!

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا درس ان مجالس میں ہو رہا ہے، اس کا ساتواں سبق سورہ تغابن (مکمل) پر مشتمل ہے۔ جو قرآن حکیم میں اٹھائیسویں پارے میں ہے۔ اس سورہ مبارکہ کی چار ابتدائی آیات کی تلاوت ابھی آپ نے سماعت فرمائی اور ان کا ترجمہ بھی آپ نے سنا۔

قرآن حکیم کی چھوٹی سورتوں میں میرے مطالعہ اور غور و فکر کی حد تک ایمان کے موضوع پر جامع ترین سورت، سورۃ تغابن ہے۔ یہاں پھر یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ "ایمان" سے مراد قانونی یا فقہی ایمان نہیں ہے۔ جس کی بنا پر اس دنیا میں ہم ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ بلکہ ایمان حقیقی مراد ہے جو عبارت ہے قلبی یقین سے۔ جو نور ہے جیسا کہ ہم سورہ نور کی آیاتِ نور میں دیکھ چکے ہیں، جس سے انسان کا باطن منور و روشن ہو جاتا ہے، جس کا اصل مرکز و مقام اور محل قلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصحف میں سورۃ تغابن سے متصلاً قبل سورہ منافقون ہے۔ منافقین کے بارے میں یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ قانوناً وہ بھی مسلمان شمار ہوتے تھے۔ دنیا میں ان کے ساتھ معاملہ مسلمانوں کا سا ہوتا تھا لیکن وہ ایمان کی حقیقی روشنی اور نور سے محروم ہوتے تھے۔ اس طرح سورۂ منافقون کے بعد سورہ تغابن کو لا کر گویا کہ قرآن مجید میں تصویر کے دونوں رخوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

سورہ تغابن کی کل اٹھارہ آیات ہیں جو دو رکوعوں میں منقسم ہیں۔ یہ بڑی عجیب و دل کش تقسیم ہے۔ پہلے رکوع کی دس آیات میں سے پہلی سات آیات میں ایمانیات ثلاثہ کا بیان ہے — ایمان باللہ، صفاتِ باری تعالیٰ۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرہ یا ایمان بالمعاد۔ پھر اگلی تین آیات میں ایمان کی نہایت زوردار دعوت ہے کہ یہ حقائق ہیں، ان کو تسلیم کرو، انہیں حرزِ جاں بناؤ۔ ان پر یقین سے اپنے باطن کو منور کرو۔

دوسرے رکوع کی کل آٹھ آیات ہیں، ان میں بھی یہی تقسیم ہے کہ پہلی پانچ آیات میں ایمان کے جو ثمرات ہیں، ایمان کے نتیجے میں انسانی شخصیت میں جو تبدیلیاں پیدا ہونی چاہئیں ان کا بیان ہے۔ اور آخری تین آیات میں ایمان کے ان تقاضوں کو پورا کرنے کی نہایت زوردار اور مؤثر ترغیب و تشویق ہے۔ اس طرح ہم انشاء اللہ اس سورۂ مبارکہ کا مطالعہ چار نشستوں میں مکمل کر سکیں گے۔

اب آیئے پہلے حصہ کی جانب۔ ابتدائی چار آیات میں ایمان باللہ کا بیان ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفاتِ کمال کا بیان۔ اسی موقع پر ایک اصولی بات ذہن نشین کر لیجئے وہ یہ کہ ایمان اصلاً نام ہے ایمان باللہ کا۔ اصولی اعتبار سے، علمی اعتبار سے، نظری اعتبار سے ایمان کی جو بنیاد اور جڑ ہے وہ ایمان باللہ ہے۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت درحقیقت ایمان باللہ کی فروع ہیں۔ اس کی شاخیں ہیں، اسی کی تشریحات (COROLLARIES) ہیں۔ چنانچہ ایمان بالوحی، ایمان بالنبوت، ایمان بالرسالت اصل میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت کا مظہر ہے۔ ایمان بالآخرۃ ایمان بالمعاد اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل، اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی الحسیب کا مظہر ہے۔ وہ حساب لینے والا ہے اور حساب کے مطابق جزا و سزا دینے والا ہے، اسی صفت کا ظہور درحقیقت آخرت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اصل ایمان، ایمان باللہ ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کی پہلی چار آیات میں ایمان باللہ کا بیان نہایت معجز نما اسلوب و انداز میں غایت درجے اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ اب یہاں پہلے لفظِ تسبیح کو جان لینا چاہیئے۔ اگرچہ اس کے جو عام معنی ذہن میں فوری طور پر آتے ہیں وہ یہ اقرار ہے کہ اللہ پاک ہے۔ لیکن اس کا مفہوم کیا ہے؟ سَبَحَ يَسْبَحُ عربی میں کسی چیز کے تیرنے کو کہتے ہیں۔ یا وہ پانی کی سطح پر تیر رہی ہے یا وہ فضا یا خلا میں تیر رہی ہے اپنے مدار پر اپنی سطح کو برقرار رکھتے ہوئے۔ چنانچہ آپ نے قرآن مجید میں یہ الفاظ ایک مقام سے زائد مقامات پر دیکھے ہوں گے: كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۔ یہ تمام اجرام سماویہ اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ یہ فعل لازم ہے اس سے فعلِ متعدی بنے گا تیرانا۔ کسی شے کو اس کی سطح پر برقرار رکھنا۔ یہ ہے سَبَّحَ يُسَبِّحُ۔ اللہ کی تسبیح یہ ہے کہ اس کا جو مقام بلند ہے، اس کی جو اعلیٰ و ارفع شان ہے، اسے اس پر برقرار رکھا جائے۔ اسؑ کی ذاتِ اقدس اور صفاتِ اکمل کے ساتھ کوئی ایسا تصور شامل نہ کر دیا جائے جو اسؑ کے شایانِ شان نہ ہو۔ کوئی ایسا تصور اسؑ کی ذات و صفات

کے ساتھ شامل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اتنے نیچے گرا رہے ہیں معاذ اللہ۔ پس تسبیح باری تعالےٰ کا مفہوم کیا ہے؟ اس بات کا اقرار کہ اللہ ہر عیب سے، ہر نقص سے، ہر ضعف سے، ہر احتیاج سے ماوراء ہے، بلند و بالا ہے، اعلیٰ و ارفع ہے، منزہ ہے اور پاک ہے۔ یہ گویا معرفتِ الٰہی کا سلبی پہلو ہے کہ ہم نے یہ جان لیا کہ اللہ میں کوئی نقص نہیں، اللہ میں کوئی عیب نہیں، اللہ میں کوئی احتیاج نہیں وہ ان سب سے منزہ اور پاک ہے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے کس معنی و مفہوم میں اللہ کی تسبیح کر رہی ہے؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو کوئی زبان دی ہو۔ پرندوں کی اپنی زبان ہے، اپنی بولیاں ہیں شجر و حجر بھی آپس میں COMMUNICATE کرتے ہیں۔ ان کے بھی احساسات ہیں۔ اب تو سائنس ان حقائق کا ادراک اور اعتراف کر رہی ہے۔ چیونٹی جیسی حقیر مخلوق کی گفتگو کا سورہ نمل میں ذکر موجود ہے: قَالَتْ نَمْلَةٌ يَّاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ۔ لہٰذا یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو کوئی زبان عطا فرمائی ہو۔ چونکہ قرآن مجید میں ایک مقام پر یہ الفاظ آتے ہیں: اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ۔ میدانِ حشر میں انسان کے اعضاء جب اس کے خلاف گواہی دیں گے تو انسان پکار اٹھے گا کہ تم ہمارے جسم کا حصہ ہوتے ہوتے بھی ہمارے خلاف گواہی دے رہے ہو! تو وہ جواب میں کہیں گے کہ آج اللہ نے ہمیں بھی نطق اور گویائی عطا فرما دی ہے جس نے کہ ہر شے کو گویائی عطا فرمائی: اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ۔

لیکن ظاہر بات ہے کہ کائنات کی ہر شے جو تسبیح لسانی کر رہی ہے، تو وہ ہمارے فہم سے ماوراء ہے۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ "اس (اللہ) کی تسبیح تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں، کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اس کی تحمید کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے"۔

البتہ اس تسبیح کا ایک پہلو وہ بھی ہے جو ہماری سمجھ میں آتا ہے۔ اسے ہم کہیں گے تسبیح حالی۔ گویا کہ ہر شے اپنے وجود سے اعلان کر رہی ہے، زبانِ حال سے اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ میرا خالق، میرا مالک، میرا صانع، میرا مصوّر، میرا موجد، میرا مدبر ایک ہستی کامل ہے جس کے علم میں نہ کوئی کمی ہے، نہ جس کی قدرت میں کوئی کمی ہے اور نہ حکمت میں کوئی کمی ہے۔ آپ کو معلوم

ہے کہ اگر کوئی تصویر نہایت اعلیٰ ہے۔ فنِ مصوری کا شہ پارہ ہے تو درحقیقت وہ تصویر اپنے وجود سے اپنے مصور کے کمالِ فن کو ظاہر کرتی ہے۔ تخلیق اگر کامل ہے تو اس سے خالق کا کمال ظاہر ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ کل کائنات، یہ کل مصنوعات، یہ کل مخلوقات اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیقِ اکمل و اتم اور صفتِ صورت گری کے مظاہر ہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ سورۂ حشر کی آخری تین آیات میں اللہ تعالیٰ کے چودہ صفاتی اسمائے حسنیٰ آتے ہیں۔ اللہ کے صفاتی نام ہائے گرامی کا ایسا حسین گلدستہ کسی اور مقام پر نہیں آیا ہے۔ ان اسمائے حسنیٰ میں تین نام نامی آج کی گفتگو سے متعلق ہیں۔ الخالق، البارئ اور المصوّر۔ اللہ تخلیق کی منصوبہ بندی کرنے والا، اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری و نقشہ کشی کرنے والا بھی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کل کائنات اور کل موجودات کا الخالق، البارئ اور المصور اللہ سبحانہٗ کی ذاتِ اقدس ہے اور اگر یہ تخلیق و تصویر کامل ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورہ ملک میں چیلنج کے انداز میں ارشاد فرمایا: مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ "تم ہماری تخلیق میں کوئی نقص تلاش نہ کر سکو گے ذرا چاروں طرف نظر دوڑاؤ تمہیں کہیں کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟ ذرا دوبارہ دیکھو۔ کہیں کوئی نقص اور عیب کی نشان دہی کر سکتے ہو، تمہاری نگاہیں تھک ہار کر لوٹ آئیں گی تم ہماری اس تخلیق میں کوئی نقص اور عیب نہ نکال سکو گے —— تو بے عیب اور نقص سے منزہ کون ہے، وہ ہستی کہ جس نے ان سب کو پیدا فرمایا، جو اس کا خالق ہے، جو اس کا مدبر ہے جو اس کا مصور ہے۔ یہ ہیں معنی و مفاہیم یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کے۔

آگے چلیے اسی آیت میں ارشاد فرمایا: لَهُ الْمُلْكُ "بادشاہی اسی کی ہے" اس پوری کائنات کا حکمران حقیقی وہی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

وہ De-Jure بھی اس کائنات کا پادشاہ ہے یعنی حکمرانی فقط اس کا استحقاق ہے اور De-facto بھی پادشاہی اسی کی ہے، فی الواقع پادشاہ حقیقی اسی تعالیٰ کی ذات ہے۔ لَهٗ میں حرف جار لام، لام استحقاق کے معنی بھی دے رہا ہے اور لام تملیک کے بھی۔ رہی مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے کچھ اختیار بخشا ہے اور وہ اپنے اس اختیار سے اِدھر یا اُدھر چلنے کا فیصلہ کرتے

ہیں تو ہم اگر صحیح منہج سے غور کریں تو ہم کو معلوم ہو گا کہ ہمارا اپنا پورا وجود بھی اللہ کے قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ ہم خود اپنے وجود پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ہم اس بات پر بھی قادر نہیں ہیں کہ اپنے جسم کے کسی حصے پر بال کی روئیدگی کو روک سکیں۔ ہمیں یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ جب چاہیں اپنے قلب کی حرکت کو روک دیں اور جب چاہیں اسے رواں کر دیں۔ ہم آنکھ سے سننے کا کام نہیں لے سکتے اور کان سے دیکھنے کا کام نہیں لے سکتے۔ معلوم ہوا کہ ہمارا یہ وجود بھی ہمارے حکم کے تابع نہیں ہے۔ وہ بھی اسی بادشاہِ حقیقی کا حکم مان رہا ہے۔ لَهُ الْمُلْكُ۔

آگے ارشاد فرمایا: وَلَهُ الْحَمْدُ "اور کل حمد بھی اسی کے لئے ہے"۔ حمد کے لفظ کی اس سے قبل سورہ فاتحہ کے درس میں تشریح بیان ہو چکی ہے کہ حمد مجموعہ ہے شکر و ثنا دونوں کا۔ کُل شکر اسی کے لئے ہے۔ کل ثنا اسی کی ہے۔ اس پورے سلسلہ کون و مکاں میں جہاں کہیں کوئی خیر و خوبی، کوئی بھلائی، کوئی حسن، کوئی کمال نظر آرہا ہے تو اس کا منبع و سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات والا صفات ہے لہٰذا التعریف کا حقیقی سزاوار وہی ہے۔ اسی طرح ہمیں جو کچھ بھی حاصل ہو رہا ہے جو انتفاع ہو رہا ہے، جو افادہ ہو رہا ہے، وہ چاہے بہت ہی طویل سلسلہ اسباب سے ہو کر ہم تک پہنچ رہا ہو لیکن اصلاً مسبب الاسباب تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ لہٰذا شکر کا حقیقی مستحق و مستوجب وہی ہے۔

آگے چلئے! ابھی پہلی ہی آیت کا بیان ہو رہا ہے۔ ارشاد فرمایا: وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ یہاں پہلی آیت ختم ہوئی۔ "اور وہ تعالیٰ و جل ہر چیز پر قادر ہے"۔ اس سے قبل ایک درس میں عرض کیا جا چکا ہے کہ معرفت الٰہی کے ضمن میں جہاں تک ذات باری تعالیٰ کا تعلق ہے، وہ ہمارے فہم، ہماری قوتِ متخیلہ، ہماری قوتِ واہمہ سب سے وراء الوراء ثم وراء الوراء[1] ہے ہمارا اللہ تعالیٰ کو جاننا اور پہچاننا کُل کا کُل اس کی صفات کے حوالے سے ہے۔ صفات کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک اس کا QUALITATIVE ASPECT ہے۔ اس کی کیفیت۔ وہ علیم ہے، وہ قدیر

---

[1] امتِ مسلمہ کے سب سے بڑے عارف باللہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مشہور قول ہے العجز عن درك الذات ادراك "اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہو جانا ہی اصل ادراک ہے"۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گرہ لگائی کہ: والبحث عن كنه الذات اشراك۔ اللہ کی ذات کی حقیقت جاننے کے لئے بحث و تحیص شرک ہے۔ (مرتب)

ہے۔ وقس علیٰ ھٰذا۔ ایک QUANTITATIVE ASPECT ہے۔ اس کی کمیت۔ وہ کتنا علیم ہے! وہ کتنا قدیر ہے! وہ ہمارے ذہن و شعور اور فہم و ادراک سے ماوراء ہے۔ ہمارے ذہن کے چھوٹے سے سانچے میں جو محدود ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفاتِ مطلقہ اپنی پوری شان کے ساتھ نہیں آسکتیں۔ لہٰذا ہمارے لئے پناہ گاہ ہے ایک لفظ کُل۔ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس سورہ مبارکہ کے پہلے رکوع کی آیت ان الفاظ مبارکہ پر ختم ہوگی۔ وَهُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ "اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے" گویا صفات باری تعالیٰ کے ضمن میں ہماری پناہ گاہ لفظِ کُل ہے۔ اسی لئے میں نے اس کو تلاوت کرتے ہوئے زور دے کر ادا کیا تھا۔

اگلی آیت کے آغاز میں فرمایا: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ۔ اب غور فرمائیے۔ پہلی آیت تمہید ہی اور اب پس منظر شروع ہوا۔ "وہ ذات ہے جس نے تمہیں پیدا کیا" اور تم سب کو پیدا کیا گوروں کو بھی، کالوں کو بھی، مشرق کے رہنے والوں کو بھی، مغرب کے رہنے والوں کو بھی —— تو کتنی حیرت کی بات ہے کہ تم میں سے بعض کافر ہیں اور بعض مومن ہیں: فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ۔ چونکہ اس نے ارادے اور عمل کی انسان کو تھوڑی سی آزادی دی ہے۔ اور یہ آزادی ابتلاء و آزمائش کے لئے ہے جیسے سورہ ملک میں فرمایا: اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا "اللہ ہی ہے جس نے موت و حیات کے سلسلے کو ایجاد فرمایا تاکہ تم لوگوں کو آزمائے کہ تم میں سے بہتر عمل کون کرنے والا ہے"۔ سورہ دہر میں فرمایا اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا "ہم نے اسے ہدایت کا راستہ دکھا دیا اب وہ خواہ شکر گزار بندہ بنے خواہ ناشکرا اور انکار کرنے والا بنے"۔ اسی اختیار کا ظہور اس طرح ہو رہا ہے کہ کچھ اس کا کفر کرنے والے ہیں اور کچھ اس کو ماننے والے ہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ روش اور یہ رویّہ بے نتیجہ نہیں رہے گا۔ لہٰذا مطلع فرما دیا: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ "جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے"۔ اس میں ایک دھمکی اور ایک بشارت مضمر ہے۔ جو لوگ اس کے منکر ہوں گے۔ باغی ہوں گے۔ جو سرکش اور متمرّد ہوں گے۔ جو ناشکرے ہوں گے، جو اس کا کفر کریں گے اور جو اس کے ساتھ شرک کریں گے، ان کو وہ سزا دے گا۔ یہ آیت کے اس ٹکڑے میں دھمکی والا مفہوم ہے۔ بشارت والا مفہوم یہ ہے کہ جو اس کے شکر گزار بندے ہوں گے جو اس کو ماننے والے ہوں گے، جو اس کی معرفت سے اپنے قلوب و اذہان کو منور کریں گے ان کو وہ جزا دے گا، ان کو وہ انعام و اکرام سے نوازے گا۔

اگلی آیت میں ارشاد فرمایا: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ۔ اس نے یہ آسمان اور زمین جو پیدا فرمائے تو بیکار و بے مقصد پیدا نہیں کئے بلکہ بالحق پیدا فرماتے۔ ایک مقصد کے ساتھ پیدا کئے۔ اب اس مقصد کا ظہور تمہاری زندگی میں کس طرح ہوگا؛ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ؕ تم اس تخلیق کا نقطۂ عروج ہو۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ تمہیں کیسی ظاہری اور باطنی استعدادات سے اس نے نوازا ہے۔ تمہیں اس نے فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ تخلیق فرمایا ہے۔ تمہاری صورت گری کی ہے اور ناک نقشہ عطا فرمایا ہے اور کیا ہی عمدہ اور خوب ترین تمہیں شکل و صورت دی ہے۔ تو کیا تمہاری تخلیق عبث ہوگی؟ کیا بس کھانا پینا، زندہ رہنا اور مر جانا ہے؛ یہی تمہاری کل حقیقت ہے؟! نہیں بلکہ، وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ اور اسی کی طرف لوٹنا ہے؛ یہ لوٹنا جواب دہی کے لئے ہوگا، تمہیں محاسبہ کرنا ہوگا، تمہارا مقام اور تمہارا رتبہ دوسری مخلوقات اور حیوانات جیسا نہیں ہے۔ تم اشرف المخلوقات ہو۔ لہٰذا تمہاری ذمہ داری بھی زیادہ ہے، تمہیں جواب دہی کرنی ہوگی —— یہاں آپ نے دیکھا کہ مضمون تدریجاً ایمان باللہ سے ایمان بالآخرت کی طرف منتقل ہو گیا۔

آج ہم ان تین آیات کی مختصر تشریح پر اکتفا کریں گے۔ اب آپ کو آج کے سبق کے ضمن میں کوئی سوال، کوئی تشریح و تصریح، کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! العلیم اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمالیہ میں سے ایک صفت ہے، کیا اس کے ہوتے ہوئے بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک سے حساب لے؟

جواب: اللہ تعالیٰ جہاں العلیم ہے وہاں وہ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ بھی ہے۔ وہ العادل اور المنصف بھی ہے وہ الحکیم بھی ہے۔ لہٰذا اس تعالیٰ کی ان صفاتِ کمالیہ کا ظہور اس طرح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو بھی جو اختیار دیا ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس اختیار کے صحیح استعمال کا بھی امکان ہے اور غلط استعمال کا بھی۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صحیح استعمال پر جزا ملنی چاہیے، غلط استعمال پر سزا ملنی چاہیے۔ لہٰذا یہ تو عقلی اور منطقی طور پر ضروری ہے کہ حساب ہو۔ انگریزی کا مشہور مقولہ ہے کہ:

"Justice should not only to be done, but it should also appear to have been done"

البتہ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو اپنے علم کامل کی بنیاد پر بغیر حساب بھی جنت میں داخل فرمائے گا، احادیث صحیحہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ متوکلین کہ جن کا بیان اسی سورۂ مبارکہ میں آگے آئے گا، جن کے اندر صفتِ توکل انتہائی شدت کے ساتھ پیدا ہو چکی ہو، اللہ تعالیٰ کے علم میں ان کا حساب موجود ہے دوسروں کے سامنے ان کا حساب لینے کی ضرورت نہیں ہوگی، یوں تو ساری مخلوق کا حساب اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں موجود ہے لیکن اس کی صفتِ عدل کا ظہور اسی طرح ہوگا کہ وہ ملزم کو جرم ثابت ہونے پر سزا دے۔ اسی طرح بعض لوگوں سے اللہ تعالیٰ آسان حساب لے گا۔ ہمیں بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیئے: اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَّسِيْرًا "اے اللہ ہم سے آسان حساب لیجیو"

حضرات! آج کی نشست میں اگرچہ سورہ تغابن کی چار آیات کا بیان وقت کی تنگی کے سبب سے نہیں ہو سکا، تاہم ایمان باللہ کے ضمن میں بہت سے بنیادی مسائل اور امور ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو اپنی ذات اور صفاتِ کمال کی معرفت کے نور سے پُر کر دے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا
جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے
اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد بھی ہیں۔

علماءِ کرام کے لئے

توجّہ طلب مسئلہ!

از : مولانا محمد طاسین صاحب ، کراچی

اس توجہ طلب مسئلہ سے میری مُراد وہ مسئلہ ہے ، جو پاکستان میں نظامِ بنکاری
ا اُس نئی شکل کے حوالے سے وجود میں آیا ہے جس کے مطابق عنقریب موجودہ نظام
کاری کو تبدیل کیا جانے والا ہے اور تبدیل اس بلند بانگ دعوے کے ساتھ کیا جانے
لا ہے کہ نظام بنکاری کی یہ نئی متبادل شکل غیر سودی اور اسلامی ہے باوجودیکہ موجودہ
جہ شکل جسے سودی اور غیر اسلامی تسلیم کر لیا گیا ہے اور قائم کی جانے والی نئی متبادل
کل میں کوئی حقیقی ، جوہری اور بنیادی فرق نہیں دونوں اپنے اجزاء ترکیبی ، اصول و قواعد ،
راض و مقاصد اور اپنے عملی اثرات و نتائج میں برابر و یکساں ہیں۔

اگر کسی چیز کا محض نام بدل دینے اور الفاظ کے تغیّر و تبدّل سے اس چیز کی
یقت اور خاصیت بدل سکتی اور اس کا شرعی حکم مختلف ہو سکتا ہے تو پھر بنکاری کی یہ
متبادل شکل بھی غیر سودی اور اسلامی ہو سکتی ہے لیکن چونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ زہر کو تریاق
ے سے زہر تریاق اور سیاہ کو سفید کہنے سے سیاہ سفید بن گیا ہو لہذا جو معاملہ اپنی حقیقت کے لحاظ
، ربٰوا اور سُود ہے وہ شرکت اور مضاربت کہہ دینے سے کبھی شرکت و مضاربت نہیں
سکتا اور نہ وہ حرام سے حلال ہو سکتا ہے۔

بہر حال جہاں تک میرے مطالعے اور علم و فہم کا تعلق ہے میں نظام بنکاری کی
مجوزہ شکل کو بھی سودی اور غیر اسلامی سمجھتا ہوں لیکن چونکہ یہ مسئلہ اپنے نتائج و
رات کے لحاظ سے بڑا اہم اجتماعی مسئلہ ہے لہذا میری گزارش ہے کہ محقق علماء کرام
س کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں اور اس کے تمام پہلوؤں کا تحقیقی اور تفصیلی جائزہ
کر قرآن و حدیث کی روشنی میں اجتماعی اجتہاد کے ذریعے یہ فیصلہ کریں کہ بنکاری کی

یہ جو نئی مجوزہ متبادل شکل ہے غیر سودی اور اسلامی ہے۔ یا سودی اور غیر اسلامی! اگر اجتماعی فیصلہ اس کے سودی اور غیر اسلامی ہونے کا ہو تو پھر اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کی خاطر اس کا اظہار و اعلان کیا جائے تاکہ مسلمان سودی کو غیر سودی اور حرام کو حلال سمجھنے کے دھوکے اور مغالطے سے بچ جائیں اور اسلام کے متعلق کوئی غلط رائے قائم نہ ہو جس سے اس کی عظمتِ شان پر کوئی حرف آ سکتا ہو۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگر اس نئے متبادل نظام بنکاری کو غیر سودی اور اسلامی کے نام سے نہ پیش کیا جاتا تو نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا اور نہ علماء کو اس کا نوٹس لینے، اس کی طرف توجہ دینے اور اس پر بحث و تحقیق کرنے کی زحمت اٹھانی پڑتی، آخر موجودہ نظام بنکاری بھی تو ایک زمانہ سے قائم اور چل رہا ہے۔ علماء نے کب اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اسے ایک مسئلہ بنایا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس نئے مجوزہ نظام بنکاری کو پورے زور و شور کے ساتھ غیر سودی اور اسلامی کے عنوان سے متعارف کرایا جا رہا ہے جو حقیقتِ واقعہ کے لحاظ سے غلط ہے، اور پھر اس غلط بیانی کو بھی نظرانداز کیا جاسکتا تھا اگر نظام بنکاری میں اس نئی تبدیلی سے یہ توقع ہوتی کہ اس کے ذریعے معاشرہ کی موجودہ معاشی حالت میں خوشگوار تغیر و تبدل ظاہر ہوگا اور اس معاشی ناہمواری اور اقتصادی اونچ نیچ میں کچھ کمی نمودار ہوگی جو اس وقت ہمارے معاشرے میں تشویشناک حد تک پائی جاتی اور بکثرت معاشرتی برائیوں کا باعث ہے۔ بالفاظِ دیگر اس تبدیلی سے عام آدمی کی معاشی پریشانی کچھ کم ہو کر اسے فائدہ پہنچے گا اور اس کی معاشی حالت بہتر ہوگی، لیکن یہ تبدیلی ایسی ہے جس میں کسی ایسی توقع کی صلاحیت ہی نہیں، اس کے بعد بھی معاشی صورتِ حال ویسی ہی رہتی ہے، جیسی اس وقت موجود ہے بنکوں سے تعلق رکھنے والی دولت کی گردش انہی لوگوں تک محدود رہتی ہے جن تک اس تبدیلی سے پہلے محدود ہے۔ جس طرح موجودہ نظام بنکاری سے ایک طرف ان کھاتہ دار افراد کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جو ضرورت سے زائد مال رکھتے اور اسے مزید بڑھانے کی غرض سے بنک کو دیتے ہیں، اور دوسری طرف ان متمول کاروباری لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے جو اپنے تمول میں اضافہ کرنے کے لیے بنک سے سودی قرضے لیتے اور کاروبار چمکاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح اس نئے نظام بنکاری کا فائدہ بھی انہی مذکورہ دو قسم کے لوگوں تک محدود رہتا ہے۔

ایک عام آدمی جو اپنے پاس بنک میں کھاتہ کھولنے کے لیے ضرورت سے زائد مال نہیں رکھتا، یا جو ناداری کی وجہ سے بنک سے قرض نہیں لے سکتا۔ ظاہر ہے کہ اُسے اِس متبادل نظام بنکاری سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا، اور چونکہ ایسے افراد کی تعداد معاشرے میں نوّے فیصد سے کم نہیں لہذا یہ تبدیلی معاشرے کی عظیم اکثریت کے لیے بیکار اور غیر مفید ثابت ہو کر رہے گی۔

غرضیکہ اس میں بہی خواہانِ اسلام کے لیے تشویش اور فکر مندی کا پہلو یہ ہے کہ اسلام کے نام پر کی گئی اس تبدیلی سے جب معاشرے کی موجودہ معاشی حالت میں کوئی خوشگوار تغیر رونما نہ ہو گا اور عام آدمی کی معاشی پریشانی میں کوئی کمی واقع نہ ہو گی تو مخالف اسلام سوشلسٹ قسم کے لوگوں کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا غنیمت موقع ملے گا اور وہ جاہل عوام کو اسلام سے متنفر کرنے کے لیے کہیں گے کہ اسلام کا معاشی نظام بھی بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ معاشی نظام ہے جو غریب عوام کے مقابلہ میں سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ کرتا اور اُن کی بہتری اور ترقی چاہتا ہے۔ سوائے صدقہ وخیرات کے اُس کے پاس معاشی لحاظ سے پسماندہ غریب عوام کے لیے اور کچھ نہیں۔ تم نے دیکھ لیا اسلام کے نام سے یہاں جو معاشی ردو بدل ہُوا، اُس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچا، جبکہ اس کے مقابلہ میں سوشلزم کا مقصد تمہاری معاشی حالت بہتر بنانا اور تمہارے لیے ترقی کے مواقع مہیا کرنا ہے اور اس کا روشن ثبوت وہ معاشی حالات ہیں، جو سوشلسٹ ممالک کے اندر عملی طور پر پائے جاتے ہیں۔ مثلاً وہاں ہر ایک کے لیے غذا، لباس، مکان، اور مفت تعلیم اور علاج کا انتظام ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے پروپیگنڈے سے غریب عوام کا متاثر ہونا اور پھر اسلام سے دُور اور سوشلزم کے قریب ہو جانا ایک قابلِ فہم اور قدرتی امر ہے۔ نیز اس سے اسلام کی نیک نامی پر مُضر اثر پڑنا بھی قدرتی بات ہے۔ بنا بریں ضروری ہو جاتا ہے، کہ علمائے کرام، اسلام کے نام سے کی جانے والی اس قسم کی فضول معاشی تبدیلیوں کا نوٹس لیں اور اُن کی صحیح شرعی حیثیت واضح کر کے مسلمانوں کو اس کے مضرات و نقصانات سے آگاہ کریں۔ اور اگر تساہل وغیرہ کی وجہ سے علمائے کرام ایسا نہیں کرتے اور خاموش رہتے ہیں تو آگے چل کر اس کے جو بُرے نتائج و عواقب سامنے آئیں گے

اُن کا بہت بڑی حد تک علماء کرام کو ذمہ دار گردانا جائے گا اور انہیں اس کا بُرا خمیا
بھگتنا پڑے گا۔

راقم الحروف اپنے علماء کرام کے سامنے نظام بنکاری کی نئی متبادل شکل کی تفصیر
وضاحت سے پہلے ایک بات اپنے ارباب اقتدار کی خدمت میں بھی اخلاص و دردمند
کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ یہ کہ آج اشتراکیت اور سرمایہ داری کے مابیر
نزاع و کش مکش کے نتیجہ میں دنیا بھر کے اندر عموماً اور ہمارے اردگرد خصوصاً جو حالا
پائے جاتے ہیں، اُن کا تقاضا ہے کہ ہم پاکستان میں اسلام کے نام سے جو معاشی اصا
تجویز کریں اور جو تبدیلیاں عمل میں لائیں وہ ایسی ہونی چاہئیں جن سے نچلے درجہ کے
پسماندہ عوام کی معاشی حالت بہتر بن سکتی او راس غیر فطری معاشی نشیب و فراز او
اونچ نیچ میں کچھ کمی آسکتی ہو، جو اس وقت ہمارے پاکستانی معاشرے میں موجو
اور بے شمار معاشرتی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی برائیوں اور اخلاقی بدعنوانیوں ک
سبب اور منبع ہے اور جس کے ہوتے ہوئے معاشرے کو بُرائیوں سے پاک کرنے کی تمنا ا
آرزو کبھی پوری نہیں ہوسکتی اور معاشرے کو صحیح معنوں میں اسلامی بنانے کا خواب کبھ
شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

ایسی معاشی اصلاحات اور تبدیلیوں سے ہمیں احتراز برتنا چاہیئے جو جزوی او
سطحی قسم کی ہوں اور جن کا فائدہ عظیم اکثریت کی بجائے ایک معمولی اقلیت کو پہنچتا اور ان
لوگوں کی دولت و ثروت میں مزید اضافے کا باعث بنتی ہوں، دیکھا جائے تو نظام بنک
میں مجوزہ تبدیلی اور اصلاح بھی اسی قسم کی ہے جس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

بلاشبہ ایک اسلامی معاشرے سے ربٰو و سود کا ختم کرنا ازبس ضروری۔
لیکن اسے ختم کرنے سے پہلے یہ جاننا اور متعین کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے
ربٰو اور سود کی حقیقت اور اس کے حرام ہونے کی علت کیا ہے اور کیا نہیں!
یہ کہ جس ظلم و استحصال کی وجہ سے ربٰو کو قرآن و حدیث نے حرام ٹھہرایا ہے
نظام بنکاری کے علاوہ معاش کے دوسرے شعبوں مثلاً تجارت، صنعت اور زرا
میں کہاں کہاں اور کن کن شکلوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن لوگو
لیے جو اسلام کے مطابق معاشرے کی اصلاح کرنا اور اس کے اندر معاشی تبدیلیہ

عمل میں لانا چاہتے ہوں اُس حکمتِ عملی اور حکیمانہ طریق کار کا جاننا بھی نہایت ضروری ہے۔ جسے ایک فاسد اور بگڑے معاشرے کی اصلاح کے سلسلہ میں پوری طرح ملحوظ و مدِّنظر رکھنے کی اسلام میں تعلیم اور تاکید ہے۔ اور جس کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بگڑے معاشرے کی بتدریج اصلاح فرما کر اس کا پورا ڈھانچہ بدلا اور اُمّتِ مسلمہ کو یہ سبق دیا کہ اُس کے مصلحین جب بھی کسی بگڑے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہیں تو پیغمبری اس حکمتِ عملی اور سُنّت کو پوری طرح سامنے رکھیں اور اس کے مطابق اصلاحی تبدیلیاں عمل میں لائیں تاکہ جو اصلاحی تبدیلی عمل میں آئے استحکام و پائیداری کے ساتھ قائم رہے اور مخالف ردِّ عمل سے اُس کا فائدہ، نقصان سے نہ بدلے جو ہمیشہ فائدہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوا کرتا ہے۔

جہاں تک میرے مطالعے اور علم و فہم کا تعلق ہے، میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ماہرینِ اقتصادیات کے پینل نے بلا سود بنکاری سے متعلق جو رپورٹ مرتب کی اور کتابی شکل میں سامنے آئی ہے اُس میں نہ ربٰوا اور سُود کی حقیقت کو کما حقہٗ سمجھا گیا ہے اور نہ اُس علّت کو جس کی وجہ سے ربٰو و سُود حرام ہے، دراصل اس سلسلہ میں جس غیر معمولی مطالعے، غور و فکر اور ریسرچ و تحقیق کی ضرورت تھی، غالباً پینل کی اکثریت کو اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس کا پورا موقع نہیں مل سکا، اور اگر کچھ ممبروں کو اس کا موقع ملا تو افسوس کہ اُن کی آراء کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا گیا اور نظر انداز کر دیا گیا جیسے محترم شیخ محمود احمد کی رائے کو جو اسلامی نقطۂ نظر سے درست اور صائب لگتی تھی اور جو اس رپورٹ کے ساتھ نہیں بلکہ بعد میں الگ شائع ہوئی اور اخبار جسارت کے ذریعے منظرِ عام پر آئی، بہرحال مجھے اُن حضرات کی نیک نیتی اور اسلام دوستی کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اسی طرح بحیثیت مجموعی ان کی علمی قابلیت کا بھی اعتراف ہے۔ لیکن جہاں تک ربٰوا کی حقیقت اور اس کے حرام ہونے کی علّت کا تعلق ہے اس کے صحیح شعور و ادراک سے یہ حضرات قاصر رہے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اس میں ان کی توجہ نظری سے زیادہ عملی پہلو پر رہی اور انہوں نے اس فرق کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا جو نظریے اور اس کی تطبیق کے مابین ہوتا ہے۔ نیز انھوں نے اس غور و فکر میں معروضی سے زیادہ موضوعی طریقہ سے کام لیا، بالفاظِ دیگر انہوں نے اس کا زیادہ خیال رکھا کہ مسئلے کا حل ایسا ہونا چاہیئے جو معاشرے کے

موجودہ حالات میں قابلِ عمل ہو لیکن اس کا لحاظ نہیں رکھا کہ اس سے وہ عملی نتائج
بروئے کار آسکتے ہیں یا نہیں جنہیں بروئے کار لانا اسلام کا اصل مقصود ہے۔

اب میں اس نئے متبادل نظام بنکاری کی کچھ تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس
کی شرعی حیثیت کا تعین آسانی کے ساتھ کیا جا سکے۔ اس کے متعلق پہلی بات یہ کہ بنک
کا یہ ادارہ کوئی ایسا تعاونی اور رفاہی ادارہ نہیں جس کا مقصد بغیر کسی مادی معاوضے کے
محض اللہ کی رضا اور اُخروی اجر و ثواب کی خاطر خلقِ خدا کی خدمت کرنا اور اُسے فائدہ
پہنچانا ہو بلکہ یہ ایک کمرشل اور تجارتی ادارہ ہے جس کا مقصد مال و دولت کمانا اور اپنے
تموّل کو بڑھانا ہے۔ دوسرے کمرشل اداروں اور اس کمرشل ادارے کے درمیان فرق
یہ ہے کہ وہ تجارت، صنعت اور زراعت وغیرہ کے کام کرکے نفع کماتے ہیں اور یہ زر و
نقدی کے لین دین کے ذریعہ نفع کماتا ہے یعنی کم معاوضے پر کچھ لوگوں سے زر و نقدی لیتا
اور زیادہ معاوضے پر دوسرے لوگوں کو زر و نقدی دیتا اور اس کمی بیشی سے فائدہ
اُٹھاتا ہے چنانچہ اس پہلو سے موجودہ نظام بنکاری اور اس متبادل مجوّزہ نظام بنکاری
میں کچھ فرق نہیں۔

دوسری بات یہ کہ موجودہ نظام بنکاری کی طرح نئے نظام بنکاری کے لیے بھی یہی
طے پایا ہے کہ اُس کے لین دین کی قانونی حیثیت واجب الادا قرض کی ہوگی۔ کیونکہ اس کے
بغیر نہ وہ کامیابی کے ساتھ چل سکتا اور نہ ترقی کر سکتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ اس میں
بھی یہی طے کیا گیا ہے کہ بنک اپنے کھاتہ داروں کو نفع کے نام پر جو زائد دے گا یا اپنے
قرضداروں سے جو زائد لے گا اُس کا تعین وقت اور مال کی مقدار اور کمی بیشی کے لحاظ
سے ہوگا مثلاً سو روپے والے کھاتہ دار کے لیے اگر سال میں دس روپے زائد ہوں گے
چھ ماہ میں پانچ روپے اور دو سال میں بیس روپے زائد ہوں گے۔ اسی طرح اگر سو روپے
والے کھاتہ دار کے لیے مثلاً سالانہ دس روپے زائد ہوں گے تو دو سو والے کے لیے سالانہ
بیس۔ پانچ سو والے کے لیے سالانہ پچاس اور ہزار والے کھاتہ دار کے لیے سالانہ سو روپے
زائد ہوں گے اور یہ بھی طے پایا ہے کہ اس زائد کے تعین کا اختیار فریقین معاملہ کو نہیں،
بلکہ اسٹیٹ بنک کو ہوگا۔ نیز یہ بھی طے پایا ہے کہ زائد کی ادائیگی معاملے کے اختتام پر
نہیں بلکہ دورانِ معاملہ ہر چھ ماہ بعد ہوتی رہے گی۔ اسی طرح چونکہ اس میں یہ بھی طے کیا

گیا ہے کہ بنک کھاتہ دار کو اور قرض دار بنک کو ہر حال میں اس کی اصل رقم مع مقررہ اضافہ کے
ضرور ادا کرے گا۔ لہٰذا معاہدہ کی رُو سے کھاتہ دار اور بنک دونوں کے لیے نقصان کا سرے
سے کوئی احتمال ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر جس طرح موجودہ نظام بنکاری کے اندر کھاتہ دار
کو بغیر کسی کام و محنت کے اور کوئی نقصان برداشت کرنے کی ذمہ داری کے اصل پر
کچھ زائد کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح نئے مجوزہ نظام بنکاری کے اندر بھی کھاتہ دار
کو بغیر کسی کام و عمل کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ذمہ داری کے اصل پر زائد
کا حقدار ٹھہرایا گیا ہے، اسی طریقہ سے مجوزہ نظام بنکاری کی مانند نئے مجوزہ نظام بنکاری
میں بھی یہ اصول مقرر ہے کہ بنک صرف ایسے کاروباری لوگوں کو قرضہ دے گا جن کے متعلق
اسے وثوق و اعتماد ہوگا کہ وہ کاروباری تجربہ، فنی مہارت اور دیانتداری کے ساتھ مالی
طور پر ادائیگی کی صلاحیت رکھتے اور لیے ہوئے قرضہ کو بہتر اور مفید طور پر استعمال
کر سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر جن کے متعلق اسے پورا اعتماد ہوگا کہ وہ قرض کی اصل رقم بھی
ضرور واپس کریں گے اور منافع کا طے شدہ حصہ بھی ضرور ادا کریں گے بلکہ اس نئے بنک
کے لیے یہ بھی طے پایا ہے کہ وہ اپنے مقروض کاروباری لوگوں کے کاروبار پر برابر نگاہ رکھے
گا اور اپنے نمائندوں کے ذریعے مسلسل جائزہ لیتا اور حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرتا
رہے گا بلکہ وہ اس میں ہر ایسی مداخلت کا مجاز ہوگا، جس سے اصل سرمائے کے کامل تحفظ
کے ساتھ مطلوبہ منافع کا حصول یقینی ہو سکتا ہو۔ بنابریں اس نئے مجوزہ نظام بنکاری میں
بنک کے مفاد کے لیے جو قانونی تحفظات ہیں وہ اُن سے کہیں زیادہ ہیں جو موجودہ نظام
مفاد بنک کے لیے ہیں، اسی طرح یہ بھی طے ہے کہ نئے نظام
بنکاری میں اپنے مقروض کاروباری فریق کے متعلق کوئی ایسی ذمہ داری قبول نہیں کرے گا
جس سے اس کے اصل مال اور مطلوبہ منافع میں کمی و نقصان کا اندیشہ ہو سکتا ہو، اور پھر
یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نئے نظام میں بھی بنک کے لیے قرض دار کی طرف سے نفع کے
نام پر جو زائد لینا قرار پایا ہے، اُس کے عوض بنک کی طرف سے کوئی ایسا کام و عمل موجود
نہیں جسے پیدا آور کام و عمل کہا جا سکتا ہو، بنک کا عملہ جو کام کار کرتا ہے وہ ایسا
پیدا آور کام نہیں ہوتا جیسا کہ ایک کاشتکار، صانع اور تاجر وغیرہ کا کام ہوتا ہے۔

سطورِ بالا میں نئے مجوزہ نظام بنکاری کی جو تفصیل پیش کی گئی، اُس سے بخوبی واضح
ہو جاتا ہے کہ اس نظام میں بنک کے معاملہ کی جو شکل کھاتہ داروں کے ساتھ اور جو شکل

کاروباری قرض داروں کے ساتھ تجویز کی گئی ہے۔ وہ نہ شرعی طور پر مضاربت کی شکل ہے اور نہ معاملۂ شرکت کی شکل، یعنی نہ مضاربت کی تعریف میں آتی ہے اور نہ شرکت کی تعریف میں، جن وجوہ کی بنا پر معاملۂ مضاربت کی تعریف میں نہیں آتی، ان میں سے ایک یہ کہ اس میں بنک کھاتہ دار سے جو مال لیتا اور کاروباری فریق کو جو مال دیتا ہے، اس کی حیثیت واجب الادا قرض کی ہے جبکہ مضاربت میں ایک فریق کا مال دوسرے فریق یعنی عامل مضارب کے پاس بطور امانت کے ہوتا ہے، شریعت کی رو سے قرض اور امانت کے درمیان جو وجوہ فرق ہیں اُن میں سے ایک یہ کہ قرض میں مال، مقرض کی ملکیت سے نکل کر مقروض کی ملکیت میں چلا جاتا ہے چنانچہ وہ اُس میں ہر وہ تصرف کرسکتا ہے جو اپنے کسی دوسرے مال میں کرسکتا ہے جبکہ امانت کی صورت میں مال، مال والے ہی کی ملکیت میں رہتا اور امین اس میں کوئی ایسا تصرف نہیں کرسکتا جس کی مالک کی طرف سے اجازت نہ ہو، دوسری وجہ یہ کہ اگر قرض کا مال کسی سبب سے ضائع اور تلف ہو جائے تو وہ مقروض کے حق میں ضائع و تلف ہوتا اور اس کا پورا نقصان تنہا اُسے اُٹھانا پڑتا ہے۔ مُقرِض اس نقصان میں بالکل شریک نہیں ہوتا جبکہ اس کے برخلاف مال امانت اگر محافظ امانت کے پاس کسی غیر اختیاری سبب مثلاً ارضی وسماوی آفت وغیرہ سے تلف اور ضائع ہو جائے تو اس کا ضمان و تاوان محافظ امانت پر نہیں آتا بلکہ پورا نقصان مالک امانت کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اسی کی ملکیت میں ہوتا ہے۔

اور چونکہ مضاربت میں مال مضاربت، عامل مضارب کے پاس بطور امانت ہوتا ہے لہذا اصل مال میں نقصان ہو جائے تو وہ نقصان پورے کا پورا رب المال کے حساب میں آتا ہے عامل مضارب اس میں شریک نہیں ہوتا، پھر یہی وجہ ہے کہ عامل مضارب اپنے تصرفات میں اُن شرائط کا پابند ہوتا ہے جو رب المال کی طرف سے انعقاد معاملہ کے وقت مقرر کی گئی ہوتی ہیں۔

رہی یہ بات کہ بنک کے پاس کھاتہ دار کا اور کاروباری فریق کے پاس بنک کا جو مال ہوتا ہے، بطور امانت نہیں بلکہ بطور قرض ہوتا ہے۔ اس کا بیّن اور قطعی ثبوت یہ کہ یہ مال بنک کے ذمے کھاتہ دار کے لیے اور کاروباری فریق کے ذمے بنک کے لیے پورے کا پورا واجب الادا ہوتا ہے جو عند الطلب اُسے ضرور ادا کرنا پڑتا

ہے اور جو مال، لینے والے پر دینے والے کے لیے پورے کا پورا واجب الادا ہوتا ہے، وہ عرفاً شرعاً، قانوناً قرض ہی کی تعریف میں آتا اور اس کا نام خواہ کچھ بھی رکھا جائے، وہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے قرض ہوتا ہے، ایسا مال امانت کی تعریف میں اس لیے نہیں آتا کہ امانت کا مال اس صورت میں واجب الادا نہیں ہوتا جب کسی غیر اختیاری سبب سے ضائع و تلف ہو جائے حالانکہ قرض کا مال بہر صورت واجب الادا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں امانت کی حفاظت پر امانت والا، محافظ کو اپنے پاس سے کچھ دیتا ہے نہ کہ اُلٹا اس سے کچھ لیتا ہے، اسی طرح یہ مال، مال اجارہ کی تعریف میں بھی نہیں آتا کیونکہ مال اجارہ صرف وہ مال ہو سکتا ہے جو استعمال ہونے سے گھستا اور فرسودہ ہوتا اور قدر و قیمت میں گھٹتا ہے اور ظاہر ہے کہ محض استعمال ہونے سے زر و نقدی کی قدر و قیمت میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی لہٰذا اُس کے استعمال پر کوئی کرایہ وصول نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری چیز جس کی وجہ سے بنک کا معاملہ مذکور مضاربت کی تعریف میں نہیں آتا یہ کہ اس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ بنک اپنے کھاتہ دار کو اور کاروباری فریق بنک کو نہ صرف یہ کہ اس کی اصل رقم ضرور ادا کرے گا بلکہ اصل پر کچھ زائد بھی ضرور ادا کرے گا۔ حالانکہ مضاربت میں عامل مضارب، رب المال سے ایسا کوئی عہد و پیمان نہیں کر سکتا کہ معاملہ ختم ہونے پر وہ اُس کو پورے اصل کے ساتھ کچھ زائد بھی ضرور دے گا ورنہ تو پھر ربوا اور مضاربت کے درمیان کچھ فرق ہی باقی نہیں رہتا۔

تیسری چیز جو بنک کے معاملۂ مذکور کو مضاربت کی تعریف سے خارج کر دیتی ہے یہ کہ اس میں بنک کی طرف سے کھاتہ دار کے لیے اور بنک سے قرض لینے والے کاروباری فریق کی طرف سے بنک کے لیے نفع کے نام سے جو زائد مقرر کیا گیا ہے وہ مال اور وقت کی مقدار و کمیت کے لحاظ سے مقرر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے اس کی تفصیل گزر چکی یعنی اس میں زائد کے تعین کا معیار مال اور مدت کی مقدار اور کمی بیشی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ حالانکہ مضاربت میں یہ طے پاتا ہے کہ اگر نفع ہوا تو اس صورت میں وہ رب المال اور مضارب کے مابین نسبتی حصہ سے تقسیم ہوگا مثلاً نصف نصف یا ایک کو تہائی اور دوسرے کو دو تہائی یا ایک کو چوتھائی اور دوسرے کو تین چوتھائی وغیرہ۔ اس میں کسی فریق کے لیے تعداد و مقدار کے لحاظ سے متعین رقم مقرر کرنا جائز نہیں ہوتا اور ایسا کرنے سے معاملہ فاسد و باطل ہو جاتا

ہے، اور چونکہ مضاربت میں مال والے فریق کے لیے نفع کا تعین مال کی مقدار اور مدّت کی مقدار سے نہیں ہوتا بلکہ نفع کے ایک مقررہ نسبتی حصّے کے اعتبار سے ہوتا ہے لہذا بعض دفعہ کم مقدار کے مال پر تھوڑے وقت میں اُسے اتنا زیادہ نفع مل جاتا ہے کہ دوسری دفعہ اس سے کئی گنا زیادہ مال پر اور طویل وقت میں بھی اتنا نہیں ملتا اور بعض دفعہ سرے سے کچھ ملتا ہی نہیں اور کبھی زیادہ تو درکنار اُلٹا اصل میں نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔

مثلاً کبھی ربّ المال کو ایک ہزار روپے پر ایک ماہ میں اتنا زائد مل جاتا ہے کہ دوسری دفعہ دس ہزار روپے پر ایک سال میں بھی اتنا نہیں ملتا۔ چنانچہ یہ زائد نفع کبھی اصل مال کا ایک فیصد بھی ہو سکتا ہے، کبھی پانچ فیصد اور کبھی پچاس فی صد بھی ہو سکتا ہے اور یہ ایک ہفتہ میں بھی ہو سکتا ہے اور ایک ماہ اور ایک سال میں بھی، فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر مضاربت میں نسبتی حصّہ کی بجائے ربّ المال کے لیے اُس کے سرمائے کے فیصد وغیرہ کے لحاظ سے متعین رقم مقرر کر دی جائے تو یہ مضاربت باطل ہو جاتی ہے۔

چوتھی چیز جو معاملۂ زیرِ بحث کے مضاربت ہونے کی نفی کرتی ہے یہ کہ اس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ کاروبار کے اندر نقصان کی صورت میں کاروباری فریق بھی نقصان میں شریک ہو گا حالانکہ مضاربت میں یہ متفقہ امر ہے کہ بصورت خسارہ و نقصان، پورا خسارہ اور تمام تر نقصان ربّ المال یعنی مال والے فریق کو برداشت کرنا پڑتا ہے عامل مضارب یعنی کام کرنے والا فریق اس میں بالکل شریک نہیں ہوتا چنانچہ اگر اس کو اس میں شریک ٹھہرایا جائے تو مضاربت باطل اور فاسد ہو جاتی ہے۔

پانچویں چیز جس کی وجہ سے معاملۂ مذکور، مضاربت کا مصداق نہیں ٹھہرتا یہ کہ اس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ کھاتہ دار کو دورانِ معاملہ ہر چھ ماہ کے بعد مقررہ منافع دیا جاتا رہے گا۔ جبکہ فقہاء حنفیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مضاربت میں فریقین کے درمیان منافع کی تقسیم اختتام معاملہ پر ہی ہو سکتی ہے۔ معاملہ قائم اور جاری رہتے ہوئے درمیان میں نہیں ہو سکتی۔

ان مذکورہ وجوہ کے علاوہ کچھ اور وجوہ بھی ہیں جن کی بناء پر معاملۂ زیرِ بحث، مضاربت صحیحہ کی تعریف میں نہیں آتا جیسے مال مضاربت کو تجارت بمعنے خرید و فروخت کے علاوہ صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ میں لگانا، ربّ المال کی اجازت کے

بغیر اُس کے سرمائے کے ساتھ اپنا سرمایہ بھی شریک کرلینا یا دوسرے کسی کو مضاربت پر دے دینا، عامل مضارب کا خرید و فروخت کا اصل کام خود کرنے کی بجائے کسی اور سے اُجرت پر کرانا وغیرہ لیکن چونکہ ان وجوہ کے متعلق خود فقہاء کرام کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے لہذا انہیں نظرانداز کیا جاتا ہے۔

اسی طرح معاملۂ مذکور شرکت کا معاملہ بھی نہیں، شرکت اور مضاربت کے مابین شرعی طور پر جو بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ مضاربت میں ایک فریق کا مال ہوتا ہے اور دوسرے فریق کا تجارتی کام و عمل، جبکہ شرکت الاموال میں ہر فریق کا مال بھی ہوتا ہے اور کام و عمل بھی، اور دوسرا فرق یہ کہ نقصان کی صورت میں مضاربت کے اندر پورا نقصان مال والے فریق کو برداشت کرنا پڑتا ہے کام و عمل والا فریق اس میں شریک نہیں ہوتا جبکہ معاملۂ شرکت میں دونوں فریق نقصان میں بھی شریک اور حصّہ دار ہوتے ہیں۔

جن وجوہ کی بناء پر بنک کا وہ معاملہ جس کی پہلے تفصیل کے ساتھ شکل پیش کی گئی شرکت کا معاملہ نہیں۔ اُن میں سے پہلی وجہ یہ کہ اس میں ایک فریق کا نہ تجارتی کام و عمل ہے اور نہ صنعتی کام و عمل، یعنی کھاتے دار کا سرے سے کوئی کام و عمل ہے ہی نہیں۔ جہاں تک بنک کا تعلق ہے، اس کے اسٹاف اور عملے کا ضرور کام و عمل ہے لیکن وہ انتظامی نوعیت کا ہے براہِ راست تجارتی اور صنعتی کام و عمل نہیں، تجارتی اور صنعتی کام و عمل صرف اُن لوگوں کا ہے جو بنک سے مال قرض لے کر تجارتی اور صنعتی کاروبار کرتے ہیں۔

دوسری وجہ اس معاملے کے شرکت کا معاملہ نہ ہونے کی یہ کہ اس میں ایک فریق کا مال دوسرے کے پاس بطور قرض ہوتا ہے۔ جبکہ معاملۂ شرکت میں کسی شریک کا مال دوسرے کے پاس قرض نہیں ہوتا بلکہ امانت کی طرح ہوتا ہے چنانچہ ضائع و تلف ہوجانے کی صورت میں کسی پر تاوان نہیں آتا۔

تیسری وجہ یہ کہ اس میں ایک فریق یعنی بنک کھاتہ دار کو اور کاروباری فریق بنک کو یقین اور اطمینان دلاتا اور ذمّہ داری لیتا ہے کہ وہ ایک متعین مقدار میں اُس کو نفع ضرور مہیا کرے گا۔ حالانکہ معاملۂ شرکت میں کوئی شریک دوسرے شریک کو کوئی ایسی ضمانت نہیں دے سکتا کہ وہ اسے ایک متعین مقدار میں نفع ضرور مہیا کرے گا۔

چوتھی وجہ اس کے شرکت نہ ہونے کی یہ کہ اس میں ایک فریق کے لیے یہ طے کیا گیا ہے کہ اس کو اس کے سرمائے کے فی صد کے حساب سے سالانہ آٹھ یا دس فی صد زائد بطور نفع ملے گا۔ جبکہ معاملۂ شرکت میں یہ طے ہوتا ہے کہ اگر نفع ہوا تو شرکاء کے مابین اُس نسبتی حصّہ کے مطابق تقسیم ہوگا جو شروع میں ان کے درمیان باہمی رضامندی سے طے پایا تھا یعنی نصف نصف یا ایک تہائی اور دو تہائی وغیرہ وغیرہ۔ مطلب یہ کہ یہ چیز شرکت کے منافی ہے کہ اس میں ایک شریک کے لیے اس کے سرمائے کی مقدار کے لحاظ سے اور وقت کے پھیلنے سے نفع کا تعین کیا جائے۔

بہر حال فقہاءِ اسلام کے نزدیک شرکتہ العقد اور شرکتہ المعاملہ کی جو معنوی حقیقت اور اصطلاحی تعریف ہے اس کی رُو سے بنک کا معاملہ مذکور شرکت کے تحت نہیں آتا۔ نہ شرکت اموال کے تحت اور نہ شرکت وجوہ اور شرکت ابدان و شرکتہ الصنائع کے تحت، اسی طرح نہ وہ شرکتہ العنان کا مصداق ہے اور نہ شرکتہ المفاوضہ کا مصداق، لہٰذا اس معاملے کو نفع و نقصان میں شرکت کا معاملہ کہنا، لغتہً درست ہو تو ہو لیکن شرعًا کسی طرح درست نہیں۔ اور پھر چونکہ اس کہنے سے ایک عام مسلمان کو جو شرکت کا شرعی مفہوم نہیں جانتا شرکت کا دھوکہ لگتا اور وہ اُسے شرعی شرکت سمجھ کر اختیار کرتا اور گمراہی کا شکار ہوتا ہے۔ لہٰذا اس معاملے کو شرکت کے لفظ سے ہرگز موسوم اور تعبیر نہیں کرنا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں ایک چیز یہ بھی واضح رہے کہ ادارۂ بنک کو اپنے کھاتہ داروں کا نائب اور وکیل تجارت سمجھنا بھی درست نہیں کیونکہ بنک کا ادارہ اپنا ایک مستقل قانونی وجود رکھتا ہے جس کے اپنے اصول و ضوابط اور قواعد و قوانین ہیں جن کے مطابق وہ اپنے امور و معاملات طے کرتا اور اپنی گاڑی چلاتا ہے۔ وہ کھاتہ داروں کی مرضی کا پابند نہیں بلکہ کھاتے دار اس کی مرضی کے پابند ہوتے ہیں، اور پھر بنک کی بجائے خود اپنی بھی ایک مستحکم مالی پوزیشن ہوتی ہے لہٰذا وہ کسی طرح اُس شخص کی مانند نہیں ہوسکتا جو تجارت میں کسی کا نائب اور وکیل ہوتا ہے۔

کتب فقہ میں نیابت و وکالت کی حقیقت اور اس کے ارکان و شرائط وغیرہ کے متعلق جو تفصیل ہے اُس کے مطابق بنک کا یہ ادارہ نائب اور وکیل کی تعریف

میں نہیں آتا، مثلاً ایک وجہ یہ کہ تجارت میں نائب اور وکیل کے پاس جو مال ہوتا ہے وہ قرض کے طور پر نہیں بلکہ امانت اور ودیعت کے طور پر ہوتا ہے جبکہ بنک کے پاس کھاتہ دار کا مال بطور قرض ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ تجارت میں جو کسی کا نائب اور وکیل ہوتا ہے، وہ اپنے تصرفات میں اُس کی ہدایت اور مرضی کا پابند ہوتا ہے، جو اسے اپنا نائب اور وکیل مقرر کرتا ہے۔ جبکہ بنک اپنے کھاتہ دار کی ہدایت اور مرضی کا پابند نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی مرضی اور اپنے اصول و قواعد کا پابند ہوتا ہے۔

خلاصۂ بحث یہ کہ نئے مجوزہ نظام بنکاری میں بنک کا جو معاملہ اپنے کھاتہ داروں کے ساتھ یا جو معاملہ اپنے کاروباری قرض داروں کے ساتھ تجویز کیا گیا ہے نہ شرعی طور پر مضاربت کا معاملہ ہے اور نہ شرکت کا معاملہ، بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اپنے اجزاء ترکیبی اور اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربوٰا ہی کا معاملہ ہے لہٰذا اس معاملے کی بنیاد پر استوار کیا ہوا نظام بنکاری ہرگز اسلامی نظام بنکاری نہیں ہو سکتا۔ اسے اسلامی نظام بنکاری کہنا اسلام کو بدنام کرنا اور اس کے تقدس کو نقصان پہنچانا ہے۔

حضرات علماء کرام کی اطلاع کے لیے یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس نئے متبادل نظام بنکاری میں علاوہ اُس معاملہ کے جس پر تفصیل سے بحث کی گئی بنک کے لیے سرمایہ کاری کے چند اور طریقے اور معاملے بھی تجویز کیے گئے ہیں جن کی تفصیل بلاسود بنکاری سے متعلق رپورٹ میں پیش کی گئی ہے اور جن کے مطابق آئندہ یہ بنک سرمایہ کاری کرے گا جیسے پٹہ داری، نیلام کاری، بیع مؤجل، ملکیتی کرایہ داری وغیرہ کے طریقے، ان میں سے کچھ کے متعلق خود ان مجوزین حضرات نے لکھا ہے کہ یہ غیر مسلم مغربی ماہرین اقتصادیات کے تجویز کردہ ہیں اور فرانس، جرمنی اور جاپان وغیرہ میں ان طریقوں پر عمل درآمد بھی ہو چکا ہے لیکن چونکہ ہمارے نزدیک سرمایہ کاری کے یہ طریقے شریعتِ اسلامی کے خلاف نہیں لہٰذا مجوزہ اسلامی نظام بنکاری میں اُن سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

سرمایہ کاری کے ان طریقوں کے بارے میں جہاں تک میرے مطالعے، تجزیے، اور تحقیقی جائزے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں ان میں سے ہر طریقہ اپنے اندر ربوٰا د سود کا عنصر لیے ہوئے ہے لہٰذا غیر اسلامی اور ناجائز طریقہ ہے، ان کو شریعت اسلامی کے مطابق کہنا دراصل اُس غلط فہمی پر مبنی ہے جو ہمارے ماہرینِ اقتصادیات

کے ذہنوں میں ربوٰ و سود کے متعلق پائی جاتی ہے، سرمایہ کاری کے یہ طریقے درحقیقت ان لوگوں کے دماغ کی پیداوار ہیں جو نظام سرمایہ داری کو صحیح اور سود اور بالخصوص تجارتی نوعیت کے قرضوں پر سود کو اصولاً جائز سمجھتے ہیں اور سرمایہ کاری کے یہ طریقے انہوں نے سود سے بچنے کے لیے نہیں بلکہ مجوزہ شرح سے کچھ زیادہ حاصل کرنے کے لیے ایجاد کیے ہیں۔

اسلام نے جس معاشی ظلم و حق تلفی کی وجہ سے ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے سرمایہ کاری کے ان طریقوں میں اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا، غور سے دیکھا جائے تو ان کے اندر وہ قرض موجود ہے جو نفع کو کھینچتا ہے، اور ان کی موجودگی میں وہ معاشی حالات معاشرے میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتے جو اسلام اپنی معاشی تعلیمات کے ذریعے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً اسلام یہ چاہتا ہے کہ قومی ثروت صرف چند اغنیاء و مالداروں کے درمیان ہی نہیں بلکہ قوم کے تمام افراد کے درمیان گردش کرے اور یہ کہ ملکی وسائل دولت اور ذرائع پیداوار پر ایک محدود طبقے کی اجارہ داری قائم نہ ہو۔ بلکہ سب کے لیے اُن سے فائدہ اُٹھانے کا آزاد موقع ہو، اور یہ کہ ہر ایک کو کسی نہ کسی شکل میں بنیادی معاشی ضروریات بھی میسّر ہوں اور ہر ایک کے لیے معاشی ترقی کا بھی آزاد اور مساوی موقع ہو آگے اس کی مرضی کہ وہ اس سے فائدہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے۔ جبکہ سرمایہ کاری کے مذکورہ طریقے ایسے ہیں کہ ان پر جس معاشرے میں عام طور پر عمل ہو اس کے اندر قومی دولت اور وسائلِ دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹنا اور ذرائعِ پیداوار پر چند لوگوں کی اجارہ داری کا قائم ہونا لازمی اور قدرتی امر ہے۔ اسی طرح ایسے معاشرے میں ایسا غیر فطری قسم کا معاشی عدمِ توازن ظہور میں آنا ایک فطری بات ہے جس سے گوناگوں برائیاں جنم لیتی ہیں، اور پورے معاشرے کو بدامنی و بے چینی میں مبتلا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اور وہ پائدار امن و سکون کسی کو نصیب نہیں ہوتا جو اسلام چاہتا ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ چونکہ اس پر تقریباً تمام مکاتبِ فکر کے علماءِ کرام کا اتفاق ہے کہ شریعتِ اسلام کا حقیقی ماخذ اور اصل سرچشمہ قرآن و حدیث اور کتاب و سنّت ہیں۔ اور یہ کہ زندگی کے ہر مسئلہ کے لیے قرآن و حد

(بقیہ ص ۸۶ پر

قتلِ خطا میں

عورت کی نصف دیت کا مسئلہ

محترم مجیب الرحمٰن شامی ایک معروف اہلِ قلم ہیں۔ ذہنی وفکری طور پر اُن کا تعلق ملک ہی کی ایک معروف نیم دینی و نیم سیاسی جماعت سے ہے۔ کئی جرائد کے مدیرِ اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ فی الوقت ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور سے نکال رہے ہیں نیز معاصر عزیز "نوائے وقت" میں "جلسۂ عام" کے عنوان سے ایک مستقل کالم بھی لکھ رہے ہیں جس میں طنز و مزاح کا عنصر غالب رہتا ہے۔ اکتوبر کے اواخر میں موصوف نے اسی کالم میں قتلِ خطا کی صورت میں محترم ڈاکٹر صاحب کی رائے پر (جو سنت سے ماخوذ ہے) اسی انداز سے اختلافی تبصرہ کیا تھا۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے موصوف کو اس کا جواب براہِ راست بھیج دیا تھا۔ یہ جواب دو پیراگراف حذف کر کے "نوائے وقت" میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ اب اسے من و عن قارئینِ "میثاق" کے استفادہ کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔ حذف شدہ پیراگرافوں پر بریکٹ لگا دیے گئے ہیں۔ (ادارہ)

برادرم مجیب الرحمٰن شامی صاحب، السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ نے چند روز قبل بھی میرا ذکر اپنے کالم میں کیا تھا اور آج پھر کرم فرمائی کی ہے۔ اس ضمن میں جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے ہرگز اعتراض نہیں ہے کہ آپ اسے اپنے ذوقِ طبع کی تسکین کی خاطر یا مروجہ صحافت کی ضرورت کے طور پر ہدفِ طنز و طعن بنائیں بلکہ اس ضمن میں اگر کوئی زیادتی آپ نے اب تک کی ہے تو میں اسے بھی معاف کرتا ہوں اور آئندہ کے لیے بھی پیشگی اجازت دیتا ہوں کہ آپ جیسے چاہیں

مشقِ ستم فرمائیں ۔۔۔ لیکن خدارا دین و شریعت کے ایک اہم مسئلے کو اس تمسخر و استہزا کی لپیٹ میں نہ لیں۔ اِس لیے کہ یہ حق" بازی بازی بارِیش بابا ہم بازی" والا طرزِ عمل آخرت کے خسران اور عاقبت کی بربادی کا موجب بن سکتا ہے۔ اللہ مجھے اور آپ کو اس سے بچائے۔ آمین۔

واقعہ یہ ہے کہ میں جس طرح عملی یا انتخابی سیاست سے کنارہ کش ہوں اسی طرح خدمتِ دین کے وسیع و عریض میدان میں بھی فروعی مسائل اور فقہی اختلافات کے دائرے میں بالکل دخل نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا، اور یہ بھی ہے کہ میرے نزدیک فی الوقت ان مسائل میں اُلجھا دین کے لیے بجائے مفید ہونے کے اُلٹا مُضر ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اس وقت ہمارے معاشرے میں بحیثیتِ مجموعی دین پر عمل پیرا ہونے کا ارادہ ہی مضمحل ہے، لہٰذا اصل ضرورت اس ارادے کی تقویت کی ہے۔ چنانچہ الحمدللہ کہ میری تمام جدوجہد اسی نکتے پر مرکوز ہے ۔۔۔ یعنی قرآنِ حکیم کی اُن اساسی تعلیمات کی نشر و اشاعت جن سے ایمان و یقین میں اضافہ ہو اور دین کو پہلے خود اپنی زندگیوں، پھر اپنے وطنِ عزیز اور بالآخر پورے کرۂ ارضی پر غالب کرنے کی جدوجہد کا عزم اور ارادہ پیدا ہو۔

چنانچہ دو ڈھائی سال قبل پردے وغیرہ سے متعلق جو ہنگامہ میرے حوالے سے ہوا تھا اُس کا آغاز بھی میں نے اپنی کسی اسکیم یا منصوبے کے تحت نہیں کیا تھا بلکہ وہ بھی ایک سابق رفیق اور ہمسفر کی 'کرم فرمائی' تھی۔ البتہ جب بحث چل نکلی تو میں نے اپنے فہم کے مطابق دینی موقف کو ڈٹ کر پیش کیا تھا ۔۔۔ پھر عورت کی شہادت سے متعلق بحث زور و شور سے چلی، لیکن میں نے اس میں قطعاً کوئی حصّہ نہیں لیا ۔۔۔ اسی طرح جب سے قتلِ خطاء میں عورت کی دیت سے متعلق بحث چھڑی ہے، میں نے اس میں بھی قطعاً کوئی حصّہ نہیں لیا، نہ تحریراً نہ تقریراً، اس لیے بھی کہ جیسے کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ میرا میدان نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ یہ مسئلہ مجھ سے کہیں بڑھ کر اہل تر ہاتھوں میں تھا۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی کے اہلِ علم و عقل وضاحت کر چکے تھے اور اہلِ حدیث، دیوبندی اور بریلوی ہر مکتبِ فکر کے علماء کرام نے بھی اس کا حق ادا کر دیا تھا ۔۔۔ البتہ چونکہ مجھے ہر حنفی اجماعِ جمہ

[کی صورت میں ایک "جلسۂ عام" میں پیش ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا جو مسائل فضا میں گردش کر رہے ہوں، ان سے بالکل صرفِ نظر ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک خطابِ جمعہ میں میں نے اِس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ___ اور میرے ایک بزرگ رفیق نے اس کا کچھ حصّہ ٹیپ سے اُتار کر اور آغاز و اختتام کے لیے اِدھر اُدھر چند جملوں کا اضافہ کر کے بغرضِ اشاعت اخبارات کو ارسال کر دیا۔ گویا یہ ہے میرے اس موضوع پر "بولنے" یا "نہ بولنے" کا معاملہ!!]

اب آئیے اصل مسئلے کی جانب ــ

اس ضمن میں جہاں تک "عقل" کا تعلق ہے، یہ تو آپ بھی مانتے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جنسِ گرانمایہ برٹرینڈ رسل اور اس کے قبیل کے بے شمار لوگوں کو میرے اور آپ کے مقابلے میں بہت زیادہ دی تھی لیکن جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مال و اسبابِ دنیوی کے بارے میں فرمایا ہے کہ " مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِّمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى "، یعنی "جو کم ہو لیکن ضرورت پوری کر دے وہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ تو ہو، لیکن غافل کر دے!!" اُسی طرح اُس ٹنوں عقل کے مقابلے میں جو خدا کو پہچاننے سے قاصر رہ جائے ہماری وہ تولہ یا ماشہ بھر عقل بہتر ہے جو اللہ کو پہچانتی اور مانتی ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا کہ ؎

بر عقلِ فلک پیما ترکانہ شبیخوں بہ! یک ذرّہ دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ!!

ثانیاً ___ شریعت کا دار و مدار اصلاً "عقل" پر نہیں "نقل" پر ہے اس لیے کہ اس میں حجّتِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے کلامِ ربّانی کو جو اللہ سے بذریعہ جبرئیلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "منتقل" ہُوا ___ پھر حجّتِ ثانی کی حیثیت حاصل ہے سنّتِ رسولؐ کو جو اوّلاً صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ذریعے اور بعد ازاں نسلاً بعد نسلٍ امّت کے تواترِ عمل اور تدوین و اشاعتِ حدیثِ رسولؐ کے ذریعے "منتقل" ہوتی آرہی ہے۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھنے والی عقل کا اصل کام اس میدان میں یہ ہے، کہ احکامِ شریعت کے اسرار و حِکَم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ جہاں وہ سمجھ میں آجائیں اللہ کا شکر ادا کرے اور جہاں کوئی بات سمجھ میں نہ آئے، وہاں بھی " سمعنا و اطعنا " کا طرزِ عمل اختیار کرے ___ اس کے برعکس اگر "عقل" شریعت پر "حاکم" بننے کی کوشش کرے گی تو سخت ٹھوکر کھائے گی اور اوندھے منہ گر کر رہے گی۔ اس قسم کے عقلیت پرست

یا عقل گزیدہ لوگوں کی ہمارے یہاں متعدد قسمیں پائی جاتی ہیں — چنانچہ ہمارے درمیان کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو "اجتہاد" کا کوئی راستہ قرآن سے بھی بالا بالا اپنانا چاہتے ہیں (جس زمانے میں عورت کی شہادت کے مسئلے پر زور شور سے بحث ہو رہی تھی ایک انگریزی اخبار میں کسی مراسلہ نگار کا مراسلہ شائع ہوا تھا کہ ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ قرآن واقعتہً عورت کو مرد کے مقابلے میں ثانوی درجہ دیتا ہے لہٰذا ہمیں اجتہاد کے لیے ایسے اصول تلاش کرنے ہوں گے جو قرآن سے بھی بالاتر ہوں!) پھر ایسے لوگ تو کثیر تعداد میں موجود ہیں جو سنّتِ رسول کو دائمی حجت نہیں مانتے بلکہ اس سے بے نیاز اور آزاد ہو کر براہِ راست قرآن سے استنباط کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی عقلی جولانیوں کی ظاہر ہے کوئی حد نہیں ہے بلکہ "بے حیا باش ہر چہ خواہی کن" کے مصداق انہیں کُلّی اختیار حاصل ہے جو چاہیں کہہ دیں! — تماشا یہ ہے کہ ایسے لوگوں میں وہ بھی شامل ہیں جو اُس شخصیت سے نسبت پر فخر کرتے ہیں جس کا قول یہ ہے کہ ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!

ثالثاً — اہلِ سنّت کے نزدیک سنّتِ رسول کے ساتھ ساتھ اور اس سے بالکل ملحق دو چیزیں اور بھی ہیں: ایک "حدیثِ نبوی" مَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِیْ" کی رُو سے تعاملِ صحابہؓ اور دوسرے حدیثِ نبوی "عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ" کے مطابق خلفاءِ راشدین کا طرزِ عمل — اور اس کے بعد حجتِ شرعی کی حیثیت حاصل ہے "اجماعِ اُمت" کو جسے قرآن مجید نے "سَبِیْلُ الْمُؤْمِنِیْنَ" سے تعبیر فرمایا ہے! اس ضمن میں اجماع سے متعلق فنی بحثوں سے قطع نظر اہلِ سنّت کے نزدیک تو کسی مسئلے میں ائمۂ اربعہ کا اجماع و اتفاق بجائے خود دلیل و حجتِ قطعی کا درجہ رکھتا ہے — اس سے بھی آگے بڑھ کر جن مسائل میں اہلِ سنّت کے چاروں مسلکوں کے ساتھ ساتھ اہلِ تشیع کی زیدی اور جعفری دونوں فقہیں — اور اہلِ ظاہر کے اہم مسالک بھی متفق ہو جائیں اُن کے شریعتِ اسلامی کے جزو لاینفک ہونے پر تو کوئی ایسا شخص ہی کلام کر سکتا ہے جس میں یز کے اتباع کا نہیں بلکہ اُس سے بغاوت کا جذبہ کارفرما ہو۔ اس لیے کہ اس کا صاف مطلب ہے کہ اُس کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے نامور تلامذہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ

امام احمد بن حنبلؒ، اور امام جعفر صادقؒ سب یا تو نصوصِ دینی کا صحیح علم نہیں رکھتے تھے یا پھر دین کے مقاصد و مصالح کے صحیح فہم سے قاصر تھے۔ اور یہ بات یا کوئی فاترالعقل کہہ سکتا ہے یا دین کا باغی ___ البتہ اُن حضرات کے مابین کسی مسئلہ میں دو رائیں پائی جائیں تو کسی دوسرے کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔

[فقہی معاملات میں عقل و نقل کے عمل دخل کے دائروں کے ضمن میں ایک دلچسپ مکالمہ امام ابوحنیفہؒ اور امام جعفر صادقؒ کا منقول ہے۔ ایک ملاقات میں امام جعفر صادقؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے خفگی کے ساتھ فرمایا "ہم نے سُنا ہے کہ آپ ہمارے نانا کی احادیث پر اپنے عقلی قیاس کو مقدم رکھتے ہیں!" اس پر امام ابوحنیفہؒ نے کہا" یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی" کے سے انداز میں فرمایا" اگر میں عقل سے فیصلہ کرتا تو وراثت میں بیٹی کو بیٹے سے دوگنا حصّہ دلاتا کہ وہ صنفِ ضعیف ہے ___ اور عورت کے ایام کی نمازوں کی قضا کو واجب قرار دیتا نہ کہ روزے کی قضا کو، اس لیے کہ نماز روزے سے اہم ہے!"]

قتلِ خطاء کی صورت میں عورت کی دیت کے مرد کے مساوی یا نصف ہونے کے مسئلے میں متذکرہ بالا دینی حجتوں کا جائزہ لیا جائے تو جو صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے:

(۱) قرآنِ مجید میں اس مسئلے پر کوئی صراحت تو موجود نہیں لیکن اگر کوئی شخص قرآن کے قانونِ شہادت اور قانونِ وراثت کو اس معاملے میں دلالۃ النص یا اشارۃ النص کے درجے میں پیش کرے تو اس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) حدیثِ نبویؐ کے ضمن میں بھی کوئی درجۂ اوّل کی مستند حدیث تو اس معاملے میں موجود نہیں تاہم ایک حدیث موجود ہے جسے عورت کے دیت کے نصف ہونے کے حامی حضرات نے بار بار پیش فرمایا ہے جسے فریقِ ثانی ضعیف قرار دے رہا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اُس فریقِ ثانی کے پاس اپنے موقف کے حق میں کوئی ضعیف تو کیا موضوع حدیث بھی موجود نہیں۔

(۳) اس کے بعد اجماع کو لیجیے ___ تو یہاں معاملہ حد درجہ فیصلہ کن ہے۔ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، جعفری۔ الغرض تمام مسلکوں کا متفق علیہ اور مجمع علیہ فیصلہ عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہونے کے حق میں ہے! ___ صرف ایک دو

شاذ رائیں برابری کے حق میں ہیں، جن کی اُن جملہ مسالک کے اتفاق و اجماع کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔!

اب ذرا عقلی اعتبار سے بھی جائزہ لے لیں۔

(۱) خالص عقلی لحاظ سے دیکھا جائے تو قتلِ خطاء کا کوئی تاوان قاتل کے ذمے آنا ہی نہیں چاہیئے۔ اس لیے کہ اس فعل میں اُس کے کسی ارادے کا دخل نہیں ہے

(۲) شریعت نے اس کے باوجود قاتل یا اُس کی برادری پر تاوان ڈالا —— تو اس میں دو حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں :۔ (ل) یہ کہ اس سے دوسروں میں احتیاط کا مادہ پیدا ہوگا۔ اس کے برعکس اگر قتلِ خطاء میں قاتل یا اُس کی برادری پر کوئی تاوان نہ ہو تو لوگوں میں بے پروائی اور بے احتیاطی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے —— اور (ب) اس سے مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کے نقصان کی کسی درجے میں تلافی ہو جائے گی۔

اس نقصان کے ضمن میں بھی یہ بات تو بالکل ظاہر و باہر ہے کہ مقتول یا مقتولہ کے ورثاء اور اعزہ واقارب کو جو ذہنی اور جذباتی صدمہ پہنچتا ہے اُس کی تلافی کی تو کوئی صورت کسی درجے میں بھی ممکن نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ کوشش مالی نقصان ہی کی تلافی کی ہو سکتی ہے —— اور اس کے سلسلے میں جب کوئی قانون بنایا جائے گا تو ایک عام اور اوسط درجے کے معاملے کو سامنے رکھ کر بنایا جائے گا نہ کہ شاذ اور استثنائی صورتوں کو سامنے رکھ کر۔ مثلاً یہ ہو سکتا ہے کہ مقتول کوئی بوڑھا اور مریض انسان ہو جو اپنے ورثاء کے لیے مالی اعتبار سے 'اثاثہ' ہونے کے بجائے اُلٹا ایک 'بوجھ' ہو —— اور اس کی موت سے اس کے ورثاء کو نہ صرف یہ کہ کوئی مالی نقصان نہ پہنچے بلکہ خالص مالی اعتبار سے ایک بوجھ سے نجات ملے —— اس کے برعکس وہ مثال جو آپ نے دی ہے کہ مقتولہ ایک بیوہ اور بے سہارا عورت ہو جو اپنے یتیم بچوں کی واحد کفیل ہو، لیکن ظاہر ہے کہ قانون ہر انفرادی معاملے کے لیے علیحدہ نہیں ہو سکتا بلکہ قانون اوسط پر بنایا جائے گا۔

اب اس عمومی قانون کی رُو سے اسلام نے خاندان کی کفالت کا بوجھ عورت پر نہیں بلکہ مرد پر ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلامی ماں باپ کی وراثت میں بیٹے کے مقابلے میں بیٹی کو نصف حصہ دلاتی ہے۔ تو یہاں عقل کا فیصلہ اس کے سوا اور کیا

ہو سکتا ہے کہ قتلِ خطاء میں بھی عورت کی دیت مرد سے نصف ہو! — شرط صرف یہ ہے کہ وہ عقل شریعت کے مقابلے میں بغاوت اور نشوز کے جراثیم سے مامون و مصئون ہو!!

رہی آپ کی وہ جذباتی مثال کہ ایک بیوہ ہے جو اپنے یتیم بچوں کی واحد کفیل ہے، تو اس پر قیاس کر کے فرمائیے کہ کیا آپ اسی دلیل سے اسلام کے قانونِ وراثت کو بھی بدلوانا چاہیں گے؟ اس لیے کہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص کی زندگی ہی میں اُس کی بیٹی بیوہ ہو جائے اور اس کے کئی یتیم بچے بھی ہوں۔ جبکہ اُس کے بھائی اچھے بھلے برسرِ روزگار ہوں — تو کیا اُس شخص کے انتقال پر قانونِ وراثت برعکس کر دیا جائے گا — قانون تو ظاہر ہے کہ اس طرح کی موم کی ناک نہیں بن سکتا۔ البتّہ عقل بتاتی ہے کہ اس صورتِ حال میں اس بیوہ کی امداد و اعانت کے دوسرے ذرائع اختیار کیے جانے چاہئیں۔ اوّلاً والد اپنی زندگی میں اپنی بیوہ بیٹی کو کچھ ہبہ کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ معاشرے میں عام اخلاقی حس پیدا کی جانی چاہیئے۔ چنانچہ انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کا مادہ افراد میں بھی ہو اور "لاکھوں روپے سے قائم ہونے والے اداروں" میں بھی — اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اصلاً ایک اسلامی ریاست میں بے سہاروں کو سہارا دینا حکومت کی ذمّہ داری ہے۔

اسی پر عامل خواتین کے معاملے کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر کسی معاملے میں اضافی تلافی کی واقعی ضرورت ہو تو اس کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں جیسے کہ مختلف مکاتبِ فکر کے علمائے کرام نے بھی اپنی مشترکہ پریس کانفرنس میں تجویز کیا ہے کہ "بطورِ تعزیر" کچھ اضافی بوجھ اس شخص پر بھی ڈالا جا سکتا ہے جس کی بے احتیاطی سے کسی خاتون کی جان تلف ہوئی ہو — لیکن یہ واضح رہنا چاہیئے کہ اسلامی قانون ایک حیاتیاتی وحدت ہے اور اس کے مختلف اجزاء کے مابین کامل منطقی ہم آہنگی موجود ہے۔ وہ جب عام اور نارمل حالات میں کنبے کی معاشی کفالت کا بوجھ عورت پر ڈالتا ہی نہیں بلکہ کلیتہً مرد پر ڈالتا ہے تو اُس سے مطالبہ کرنا کہ وہ قتلِ خطاء میں عورت کی دیت مرد کے مساوی قرار دے، خالص غیر منطقی بات ہے۔ اب اگر کوئی خاتون محض شوقیہ یا اپنے معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے کی خواہش سے کوئی کام کر رہی ہوں تو یہ اُن کا ذاتی معاملہ ہے — ہاں اگر کسی واقعی ضرورت کا معاملہ ہو

تو یہ اُن استثنائی صورتوں میں سے ہوگا جن کے بارے میں اوپر گفتگو ہو چکی ہے۔

آخر میں اس قدر اور عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر ہماری خواتین کا ایک محدود طبقہ اُس مغربی تہذیب کی پیروی یا نقالی کرنے پر مُصر ہے جس کی ظاہری چمک دمک کو علامہ اقبال مرحوم نے اپنے انگریزی خطبات میں " Glittering exterior of the Western civilization " سے تعبیر کیا ہے۔ اور جس کی خدمت میں بہترین "خراجِ تحسین" اپنے اس شعر کے ذریعے پیش فرمایا ہے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تو وہ خوشی سے ایسا کریں — لیکن براہِ کرم اسلام اور اس کے نظامِ قانون کو اپنے پیچھے گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں ورنہ عاقبت تو تباہ و برباد ہوگی ہی اس دنیا میں بھی اُن کا مقابلہ پاکستان کے اُن عوام سے ہوگا جو خواہ بے عمل ہوں لیکن دین میں تحریف کی کسی کوشش کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں! اور دین کے معاملے میں وہ اعتماد بہر حال علماء کرام ہی پر کرتے ہیں، نہ کہ خطیبوں، دانشوروں، ادیبوں یا پروفیسروں پر۔ اور اس ضمن میں جملہ فقہی مسالک کے علماء کے اتحادِ رائے میں اُن کے لیے ایک بڑا انتباہ مضمر ہے۔ فقط والسلام

خاکسار (ڈاکٹر) اسرار احمد عفی عنہ

مارشل لاء کی حقیقت اور اس کی افادیت یا مضرت
اور مخالفانہ نعرہ بازی، اور قید، جرمانوں اور کوڑوں کی سزا کے بارے میں

ایک اہم استفتاء اور اس کا جواب

از قلم: مولانا سیّد حامد میاں مدظلہٗ

مولانا سیّد حامد میاں مدظلہٗ جمعیت علماء ہند کے جنرل سیکرٹری مولانا سیّد محمد میاں مرحوم و مغفور کے خلف الرشید اور مولانا سیّد حسین احمد مدنی ؒ کے خلیفۂ مجاز ہیں۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ان سے دیرینہ مراسم ہیں اور ڈاکٹر صاحب موصوف گاہے گاہے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں۔ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تمام سالانہ قرآن کانفرنسوں اور محاضرات قرآنی میں ان کے وقیع مقالات و مضامین بالالتزام پیش ہوتے رہے ہیں۔ جو 'میثاق' اور 'حکمتِ قرآن'، کے قارئین کی نگاہوں سے گذرتے رہے ہیں۔

الحمدللہ کہ مولانا تنظیمِ اسلامی کے 'حلقۂ مستشارین' میں بھی شامل ہیں۔ اس ضمن میں ایک جانب 'بیعت' سے متعلق مولانا کا ایک وضاحتی اخباری بیان اور ایک خط بنام مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی خلف الرشید مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ ——— اور دوسری جانب ڈاکٹر صاحب کی بعض تحریروں پر اختلافی نوٹ 'میثاق' میں شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا کی درجِ ذیل تحریر موجودہ ملکی حالات میں پیدا شدہ سوالات کے ضمن میں شریعتِ اسلامی خصوصاً فقہ حنفی کی رُو سے نہایت فکر انگیز ہے اور ان کے شکریے کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔ (ج ۰ م)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

محترم و مکرم دام مجدکم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ آپ کے خط میں استفتاء کے سوالات بہت تھے اور پیچیدہ بھی، فتووں کا جواب ہمارے جامعہ کے مفتی صاحب لکھا کرتے ہیں لیکن آپ کا نہ معلوم کیوں

اصرار تھا کہ میں ہی جواب لکھوں۔ مگر میں پھر بھی یہ فتویٰ مفتی صاحب ہی کو دے دیتا کہ وہی جواب لکھ دیں لیکن وہ حج کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ مجھے جامعہ کے بہت کام رہتے ہیں۔ پڑھانے کے دوران فرصت نہیں ملتی کہ لمبی تحریر کا جواب لکھوں۔ اب عید کی چھٹیوں میں کچھ وقت ملا ہے تو جواب خود ہی لکھ رہا ہوں۔ کیونکہ عالم کے لئے حدیث پاک میں وعید آئی ہے کہ اگر اس سے پوچھا جائے اور وہ جانتا ہو پھر پوچھنے والے کو نہ بتلائے تو (معاذ اللہ) قیامت کے دن اس کے آگ کا لگام ڈالا جائے گا۔ او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام (مشکوٰۃ ص۳۴) یہ جواباً خط بھی ہے اور فتویٰ بھی کیونکہ بغیر حوالہ کے کوئی بات نہیں لکھوں گا اور حوالہ بھی وزنی ہوگا۔ انشاء اللہ۔ عربی عبارت کہیں ضروری ہوئی تو لکھ دوں گا ورنہ اس کا مفہوم اور ترجمہ لکھ کر کتاب کا صفحہ اور جلد نمبر لکھ دوں گا تاکہ اگر آپ کسی عالم سے تصدیق کرانی چاہیں تو وہ کتاب سے بسہولت حوالہ نکال سکے اور تصدیق کر سکے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھ رہا ہوں صرف احکامِ اسلام نقل کر رہا ہوں۔ واللہ المستعان

(۱) "آپ نے سوال کیا ہے کہ کیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مارشل لاء لگایا تھا"

محترم اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے کبھی مارشل لاء نہیں لگایا۔ اگر کسی صاحب نے یہ بات کہی ہے تو انہوں نے مارشل لاء کی تعریف سمجھے بغیر ہی یہ کہہ دیا ہے۔ آج کل مارشل لاء اس قانون کو کہا جاتا ہے جو انگریز نے اپنی فوج کے لئے قانون بنایا تھا اور سول لاء اس قانون کو کہا جاتا ہے جو انگریز نے عام پبلک کے لئے تیار کیا تھا۔ اس کی کئی قسمیں ہیں فوجداری، دیوانی اور مالیات (انکم ٹیکس وغیرہ) مارشل لاء اس وقت سے اب تک فوج میں رائج و نافذ چلا آرہا ہے۔ اسے اگر پبلک پر نافذ کیا جائے تو اس کی چادر تنگ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جو بھی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہوتا ہے وہ حسبِ ضرورت ضابطے جاری کرنے شروع کرتا ہے۔ ضابطہ نمبر ایک سے جہاں تک بھی ضرورت ہیں نمبر پہنچا دیں وہ نمبروار ضابطے بڑھاتا اور نافذ کرتا چلا جاتا ہے۔ اس میں یہ شرط نہیں ہوتی کہ ضابطہ شریعت کے مطابق ہو وہ شریعت سے ہٹ کر بھی ضابطے جاری کر سکتا ہے، وہ خود مختار اور آمر ہوتا ہے ایسی بات کا سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر انہوں نے بُزَاخہ سے آنے والے وفد سے فرمایا کہ تم ہمارے ان مقتولین کا جو تم سے جہاد میں شہید ہوئے خون بہا دو۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں شہید ہونے والوں کی کبھی دیت نہیں لی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ٹھیک ہے اور اپنے اس فیصلہ سے فوراً ہی رجوع فرما لیا۔ اس مثال کی روشنی میں غور کریں کہ کیا وہ مروّج مارشل لاء کی طرح ضابطے جاری فرمایا کرتے تھے یا یہ دیکھتے اور پوچھتے تھے کہ ضابطہ شریعت کے مطابق ہے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ ضابطہ نہ بناتے تھے نہ نافذ فرماتے تھے بلکہ

ان کے بارے میں ایسی بات جان بوجھ کر کہنا بہت ہی بڑی گستاخی ہے اور لاعلمی میں کہہ دینا نادانی ہے ــــــــ!!

(۲) آپ نے پوچھا ہے کہ شریعتِ مطہرہ میں بھی کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے اور آج کل مارشل لاء کے تحت بھی کوڑوں کی سزا دی جارہی ہے اس میں کیا فرق ہے ؟

(الف) اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں کوڑوں کی سزا تین قسم کے گناہوں پر دی جاتی ہے کنوارے مرد و عورت اگر زنا کا ارتکاب کریں تو انہیں سو کوڑوں کی۔ اور اگر کوئی کسی پر زنا کا الزام لگائے اور اسے ثابت نہ کر سکے تو اسے اسّی کوڑوں کی اور اگر کوئی شراب پیئے ہوئے پکڑا جائے تو اسے بھی اسّی کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے۔ چوتھی صورت کا نام تعزیر ہے۔ تعزیر یہ ہے کہ کوئی شخص کسی ایسے جرم یا گناہ کا ارتکاب کرے جس کا تعلق خدا سے، یا بندوں کے حقوق سے ہو۔ مثلاً نماز روزہ چھوڑنا یا کسی شخص کو ناحق اپنے ہاتھ سے تکلیف پہنچانا۔ یا کسی شخص کو ایسی بُری شرم اور عار کی بات کہہ دینا کہ جس کے دو معنے ہوتے ہوں۔ اگر ایک معنی مراد لئے جائیں تو شرعی حد لازم آجاتی ہو اور دوسرے معنے لئے جائیں تو شرعی حد لازم نہ آتی ہو مگر اس کی بے عزتی ضرور ہوتی ہو۔ مثلاً کسی کو کافر یا فاسق یا فاجر یا سود خور یا شرابی یا چور کہہ دے تو اس صورت میں تعزیری سزا دی جائے گی جو بھی حاکم مناسب سمجھے چاہے ڈانٹ ڈپٹ کر دے یا کسی اور طرح سرزنش کر دے یا چھڑی وغیرہ سے پٹائی کر دے یا زیادہ سے زیادہ اگر ضروری معلوم ہو تو کوڑے لگوا دے، اور اگر کسی شخص نے کسی کو کتا، سور یا گدھا کہہ دیا تو اس پر کوئی تعزیری کارروائی نہیں کی جائے گی۔ (بدائع الصنائع ص۶۳ ج ہفتم، فتاویٰ شامی ص۱۹۹ ج۳) اگر بیوی شوہر سے خرچ اور کپڑا مانگتی ہے اور اصرار کرتی ہے تو اس پر شوہر کو تعزیر کا حق نہیں۔ کیونکہ لصاحب الحق مقالا جس کا کسی پر حق ہو وہ اس کے بارے میں بات کرنے کا حق رکھتا ہے۔ (شامی ص۲۰۰ ج ۳)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ تعزیر ایسے گناہ پر ہوتی ہے کہ جس کے بارے میں شریعت نے کوئی سزا مقرر نہ کی ہو اس گناہ کا تعلق خدا سے ہو یا بندوں سے اور اس میں حاکم کا زبانی نصیحت کر دینا، گھورنا، ڈانٹ ڈپٹ کرنا بھی شریعت کی نظر میں تعزیر شمار ہوتا ہے اور شدید مجرم ہو تو کوڑے بھی لگائے جا سکتے ہیں۔

(ب) لیکن اسلام میں کوڑوں کا مقصد اسے ذلیل کرنا ہے۔ اس لئے حد اور تعزیر دونوں میں اتنے زور سے نہ مارے جائیں گے کہ بدن کی کھال پھٹ جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں امامِ اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد چاروں ہی ائمہ رحمۃ اللہ علیہما کے ارشادات اور ان کا مسلک ہر ہر مسلک کی بڑی سے بڑی اور معتبر ترین کتابوں سے لکھ دیا جائے تاکہ واضح ہو جائے کہ ہر مسئلہ پر سب کا اتفاق ہے۔ لہٰذا اختصار ملحوظ رکھتے ہوئے امام اعظمؒ کی مسند آگے

قاضی القضاۃ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج، بدائع الصنائع، فتح القدیر اور عنایہ شرح ہدایہ اور شامی سے حنفی مسلک؛ اور مسلک مالکی امام مالکؒ کے مسلک کی قدیم ترین کتاب المدونۃ سے، اور مسلک شافعی خود ان کی کتاب "الام" اور مختصر المزنی سے اور حنبلی مسلک ان کی اہم اور معروف ترین کتاب "المغنی" سے لیکر لکھ رہا ہوں۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں کوڑے مارتے وقت جلاد کے لئے صرف اتنا ہاتھ اٹھانا بتلایا ہے کہ اس کی بغل نظر نہ آئے، کوڑے کی گھنڈی کاٹ دی جائے اور اسے نرم کر لیا جائے، مسند ابی حنیفہؒ صـ۱۵۵، بدائع صـ۶۰ ج ہفتم، المغنی صـ۳۱۵ ج ۸، فقہ حنفی کی معروف ترین کتاب ہدایہ اور اس کی شرح فتح القدیر اور عنایہ میں ہے۔ کوڑا اکہرا ہو، اگر دوہرا ہو (دو تسموں والا ہو) یا دُمدار (لمبے سرے کا) بنایا گیا ہو تو وہ دو کوڑوں کے برابر شمار ہوگا۔ فتح القدیر صـ۱۲۶ ج ۴، کوڑا نہ بالکل نیا ہو نہ بالکل پرانا، مختصر المزنی صـ۲۶۷ درمیانی درجہ کا ہو، کتاب الخراج صـ۱۶۲۔ یہ لحاظ رکھنا فروری ہوگا کہ زیادہ چوٹ نہ لگے، کمزور آدمی کو جتنی اس کی برداشت ہو رعایت رکھتے ہوئے کوڑے لگائے جائیں گے، کوڑے ایک جگہ نہیں مارے جائیں گے بلکہ سارے جسم پر مارے جائیں گے، سر چہرہ اور شرمگاہ پر کوڑے نہیں مارے جائیں گے، ہدایہ و شرح ہدایہ فتح القدیر مع عنایہ صـ۱۲۶ ج ۴۔ سینہ اور پیٹ پر بھی نہ مارے جائیں، شامی صـ۱۶۱ ج ۳۔ شدید گرمی اور شدید سردی میں بھی کوڑے نہیں لگائے جائیں گے۔ کوڑے ایک ہی جگہ نہ مارے جائیں کہ کھال پھٹ جائے۔ ایسی مار جس سے کھال پھٹ جائے یا کوئی عضو تلف ہو جائے جائز نہیں، بدائع الصنائع صـ۵۹ ج ۷، المغنی صـ۳۱۶ ج ۸۔ حد اس پر کھڑے کھڑے لگائی جائے گی نہ تو اسے ٹکٹکی پر باندھا جائیگا نہ زمین پر لٹایا جائے گا۔ یہ بدعت ہے۔ کوڑا مارنے کے بعد جلاد کوڑے کو کھینچے نہیں بلکہ اٹھالے۔ مارنے کے بعد اسے کھینچنا ایسا ہی ہے جیسے دوسری دفعہ مارا گیا ہو۔ جلاد سمجھدار ہونا چاہئے جو مار کی کیفیات کا ماہر ہو وہ درمیانی درجہ کی ضرب سے مارے نہ بہت شدید اور نہ ایسی کہ کوڑے کا احساس ہی نہ ہو۔ بدائع الصنائع صـ۶۰ ج ۷، المدونۃ الکبریٰ صـ۲۴۸ ج ۶۔ مرد کے کھڑے کھڑے اور عورت کو بٹھا کر کوڑے لگائے جائیں گے حدود میں بھی اور تعزیرات میں بھی، شامی صـ۱۶۱ ج ۳۔ تعزیرات میں بھی ان سب جگہوں کو مار سے بچایا جائے گا جنہیں حد میں بچایا جاتا ہے، شامی۔ کوڑا لگاتے وقت چاہے اسے درخت وغیرہ سے باندھ دیا جائے لیکن اس کے ہاتھ کھلے چھوڑے جائیں گے جن سے وہ اپنا بچاؤ کرتا رہے گا نہ اسے باندھا جائے گا نہ زمین پر لٹایا جائے گا اور کوڑے لگنے سے خون نہ بہہ نکلے اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔ کتاب الام صـ۱۵۲ ج ۷۔ شریعت میں حد لگانے کا مقصد یہ ہے کہ (اسے اس توہین سے شرم) عار دلا کر دوسروں کو عبرت بھی دلائی جائے تاکہ دوسرے لوگ ایسا نہ کریں یا یہ مقصد ہے کہ حکم خداوندی پورا کر دیا جائے تاکہ اس کے جرم کا کفارہ ہو جائے، مزنی عن الشافعیؒ مختصر المزنی

صـ۲۹۷، کتاب الام صـ۱۵۴ ج ۷۔ اسی لئے اس کی حد سے زیادہ توہین نہیں کی جاسکتی، کسی مسلمان کی گدھی (کی گردن) پر چپت نہیں مارے جائیں گے۔ عن السرخسی لا یباح بالصفع لانہٗ من اعلی ما یکون من الاستخفاف فیصان عنہ اھل القبلۃ، شامی صـ۱۹۵ ج ۳۔ تعزیر اس شخص کے غلطی کی تشہیر کرکے بھی ہوسکتی ہے۔ تذلیل و توہین کرکے بھی مثلاً جھوٹے گواہ کا منہ کالا کرکے، یہ بھی تعزیر میں داخل ہے، شامی صـ۱۹۵ ج ۳۔ باپ کا بیٹے کو مارنا بھی تعزیر کہلاتا ہے، شامی صـ۲۰۷ ج ۳۔ حدود میں حد جاری کرنی ضروری ہوتی ہے جیسے حدِ قذف لیکن بعض اوقات مجرم ایسے مرض میں مبتلا ہوتا ہے جو کبھی بھی جانے والا نہ ہو جیسے سل وغیرہ یا قدرتی طور پہ بہت ہی لاغر و کمزور ہوتا ہے تو ایسی صورت میں تخفیف کرکے کوڑوں کی بجائے کھجور کا ایسا خوشہ لے لیا جائے گا جو پھیلا ہوا ہو اور اس میں سو شاخیں ہوں۔ یہ ایک دفعہ اس طرح مار دیا جائیگا کہ سب شاخیں اس کے بدن پر لگ جائیں، شامی صـ۱۶۳ ج ۳۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کا اعلان فرما دیا تھا کہ اگر کسی حاکم نے تعزیر میں کسی کو بے جا سزا دی ہے تو اس حاکم سے اس شخص کا بدلہ دلاؤں گا۔ کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدلا دلایا تھا۔ کتاب الخراج للامام ابی یوسفؒ صـ۱۱۵۔ حد اور تعزیر میں مارنا صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ کسی کی حق تلفی کی گئی ہو مثلاً فسق و فجور کا ارتکاب یا قذف یا نشہ لیکن کسی کے تہمت لگا دینے پر یا کسی معمولی گناہ کے ارتکاب پر تعزیر میں مارنا درست نہیں کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مارنے پیٹنے سے منع فرمایا ہے۔ نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ضرب المسلمین اور ہمارے نزدیک واللہ اعلم اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ بتلایا ہے کہ بغیر اس کے کہ ان پر ایسی حد واجب ہوتی ہو کہ جس پر مارنے کا حکم آیا ہوا نہیں مارا نہیں جاسکتا۔ کتاب الخراج صـ۱۵۱۔

(۳) **مالی جرمانے**: آپ نے مالی جرمانوں کے بارے میں دریافت کیا ہے کہ شرعاً جائز ہیں یا نہیں؟ تو یہ خلافِ اسلام ہیں۔ کہیں مالی جرمانوں کا ثبوت ہی نہیں ہے ہمارے یہاں ایسے تمام قوانین کو بدل ڈالنا نہایت ضروری ہے جو خلافِ اسلام چل رہے ہیں۔ تعزیر کی سزا میں مالی جرمانہ نہیں کیا جاسکتا۔" لا یجوز للمسلمین اخذ مال احد بغیر سبب شرعی۔ شرعی وجہ کے بغیر کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں کہ وہ کسی کا بھی مال لے لے، فتاویٰ شامی صـ۱۹۵، صـ۱۹۶ ج ۳۔ البتہ شخصی نقصان کا تاوان دلایا جاتا ہے۔ اور مغنی میں ہے "مجرم کا مال ضبط کرنا جائز نہیں کیونکہ شریعتِ مطہرہ میں ایسا حکم کہیں کسی ایسی شخصیت سے منقول نہیں ہے کہ جس کی پیروی کی جاتی ہو۔ المغنی صـ۳۱۶ ج ۳۔

(۴) آپ نے دریافت کیا ہے کہ کیا موجودہ حکومت کو اس کے خلاف نعرے لگانے یا تقریر کرنے پر قید کوڑوں اور جرمانوں کی سزا دینی شرعاً درست ہے؟

اس کا جواب مختصراً یہ ہے کہ حکومتِ صحیحہ کے خلاف نعرہ بازی اور تقریریں سب سے پہلے سیدنا

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخری سالوں میں ہوئی ہیں، انہوں نے ایک دفعہ سرغنہ لوگوں کو صوبہ بدری کا حکم دیا بیت المال سے ان کا وظیفہ بھی روک دیا۔ ان باغیوں کو اس سے زیادہ سزا دینے کا ثبوت نہیں ملتا، پھر جب یہ باغی مدینہ منورہ میں گھس آئے تو نہ انہوں نے انہیں قید کرنے کا انتظام کیا نہ کسی کو ہتھیار اٹھانے کی اجازت دی البتہ ان کی تقریروں اور نعروں کے جواب میں تقریر فرمائی ان کی باتوں اور گفتگو کا جواب دیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفۂ رابع سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا زمانہ آیا تو آپ کے مخالف خوارج نے پروپیگنڈا اور نعرہ بازی کی معاذ اللہ! آپ کو کافر کہا۔ جماعت کے ساتھ نمازیں چھوڑ دیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مسجد کی ایک طرف سے انہوں نے نعرہ بلند کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ لکم علینا ثلاث لا نمنعکم مساجد اللہ ان تذکروا فیھا اسم اللہ ولا نمنعکم الفیئ ما دامت ایدیکم مع ایدینا ولا نبدء لکم بقتال (ترجمہ) یعنی ہمارے ذمہ تمہارے لئے تین امور ہیں۔ ہم تمہیں مسجدوں میں داخل ہونے سے نہیں روکیں گے۔ تم خدا کی یاد کرو۔ ہم تمہیں مالِ غنیمت بھی اس وقت تک دیتے رہیں گے جب تک تم ہمارے ساتھ ملکر جہاد میں شرکت کرتے رہو گے اور ہم تم سے لڑنے میں پہل نہیں کریں گے مختصر المزنی صـ۲۰۷، المغنی صـ۱۱۷ ج ۸ پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ میں خوارج نے سر اٹھایا۔ انہیں برا بھلا کہنا شروع کیا تو ان کے گورنر بصرہ عدی بن ارطاۃ نے ان کی خدمت میں یہ حال لکھا انہوں نے جواب میں لکھا کہ: ان سبونی فسبوھم او عفوا عنھم وان شھروا السلاح فاشھروا علیھم وان ضربوا فاضربوا۔ ترجمہ۔ اگر وہ مجھے برا کہتے ہیں (میرے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں) تو تم انہیں برا کہہ لو یا معاف کر دو (کچھ نہ کہو) اور اگر وہ ہتھیار اٹھائیں تو تم بھی ان پر ہتھیار اٹھاؤ اور اگر وہ مار پٹائی کریں تو تم انہیں مار وپیٹو، المغنی صـ۱۱۷ ج ۸، آپ کے سامنے ان خلفاءِ راشدین کا عمل آگیا ہے جن کی خلافت بالاجماع صحیح اور خلافتِ راشدہ تھی اس طرح کے مسائل ان ہی حضرات سے چاروں فقہوں کے اماموں نے لے کر طے کئے ہیں ان حضرات نے مخالفانہ نعروں یا تقریروں پر کوڑے نہیں لگائے قید نہیں کیا، جرمانے نہیں کئے اور موجودہ حکومت نے تو تاحال بیعت عامہ ہی نہیں لی ہے یعنی ووٹ نہیں لیا اسے سپریم کورٹ نے نظریۂ ضرورت کے تحت عبوری دور کے لئے حکومت کہا ہے رجسے ڈیڑھ سو سال قبل ایک موقعہ پر ہمارے علماءِ ہند نے حکومت مؤقتہ کا نام دیا تھا۔ موجودہ حکومت ہر موقعہ پر خود یہ اعلان کرتی آرہی ہے کہ وہ انتخابات کرا کے معزول ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں تو اسے کسی کے نعرہ لگانے یا تقریر کرنے پر بالکل ہی سزا دینے کا اختیار نہیں رہتا اور سوال نمبر ۲ کے جواب میں گذر چکا ہے ان لصاحب الحق مقالا، حالانکہ وہ تین تین سزائیں قید یا قید بامشقت کوڑے اور جرمانے کی سزائیں جمع کر ڈالے اور کوڑے بھی وہ جو انگریزوں نے اپنے دورِ استعما

میں غلام رعایا کے لئے رکھے تھے جو قطعاً غیر اسلامی ہیں اور پہلے گزر چکا ہے کہ اسلام میں جرمانے کی سزا کا ثبوت ہی نہیں ہے۔ جب یہ سزائیں یعنی کوڑے اور جرمانے ناحق ہوئے تو شرعاً یہ ظلم شمار ہوں گے۔ اور ظلم خدا نے حرام قرار دیا ہے اسلئے حکومت کو چاہیئے کہ فوراً ہی ان ضابطوں کو منسوخ کر دے ورنہ خدا کی مدد مظلوم کے ساتھ ہوگی اور حکومت تائیدِ الٰہی سے محروم ہو جائے گی' یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں نصیحت و اخلاص کا تقاضا بھی ہے اگر حکومت خدا سے ڈرے تو اس کا نفع ہے' حدیث شریف میں آیا ہے: الدین النصیحہ اور فرمایا ہے اتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینھا وبین اللہ حجاب' مظلوم کی بددعا سے بچو اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا (ضرور لگتی ہے) مشکوٰۃ عن معاذؓ صد ۱۵۵۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی یہی نصیحت فرمائی اور فرمایا کہ مظلوم خدا سے اپنا حق مانگتا ہے اور اللہ کسی حقدار کا حق نہیں روکتا۔ مشکوٰۃ صد ۴۳۶۔

(۵) آپ نے سوال کیا ہے کہ اسلام میں قید کے کیا احکام ہیں؟

اسلام میں قید تو کیا جاتا ہے مگر کم سے کم عرصہ کے لئے۔ مثلاً قاتل چور وغیرہ کو تاوقتیکہ اس کے بارے میں فیصلہ ہو۔ عدالت کے فیصلہ کے بعد یا اسے بری کر دیا جاتا ہے یا سزا دے دی جاتی ہے۔ اگر قیدی کو قتل نہ کیا گیا ہو تو سزا کے بعد یعنی حد جاری کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے' اسے لمبی قید ہی میں چھوڑ دینا یا عمر قید اسلام میں نہیں ہے۔ البتہ قاتل کو جیل میں اسی کے فائدہ کے پیشِ نظر بعض اوقات لمبی قید ملتی ہے' جس کی صورت یہ ہے کہ مقتول کی نابالغ اولاد کے بالغ ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے کہ بچہ بالغ ہونے کے بعد اپنے باپ کا قصاص لیتا ہے یا دیت (خون بہا) لیتا ہے یا قاتل کو معاف کرتا ہے۔ اس کے بالغ ہونے تک انتظار کیا جاتا ہے۔ اور قاتل کو قید میں رکھا جاتا ہے۔ لیکن کسی بھی قسم کے قیدی کے ساتھ گالی گلوچ جائز نہیں نہ ہی اسے کسی طرح کی کھانے پینے اور رہنے کی جگہ کی اذیت پہنچانی جائز ہے۔ مثلاً دھوپ میں کھڑا کرنا' نہ ہی اسے تکلیفیں پہنچا کر بیان لینا جائز ہے۔ حدیث پاک میں وعید آئی ہے جو لوگوں کو عذاب دیتے ہیں انہیں قیامت کے دن عذاب دیا جائیگا، کتاب الخراج لابی یوسفؒ صد ۱۷۵۔ ۱۲۳۔ ۱۲۵' اگر قیدی مالدار ہے تو کھانا خرچہ اس کے اپنے گھر سے ہوگا۔ ورنہ دس درہم ماہانہ قیدی کے ہاتھ میں دیئے جائیں (یہ امام ابو یوسفؒ کے زمانہ میں چاندی کا سکہ تھا جو ایک دینار یعنی ساڑھے چار ماشہ سونے کے برابر ہوتا تھا۔ جو آجکل کم از کم آٹھ سو روپے کے برابر ہوگا، پھر اگر وہ رہا ہونے کے بعد یہ خرچ ادا کر سکتا ہے تو ادا کر دے گا قیدی کے سردی گرمی کے لباس کا بھی خیال رکھنا ضروری ہوگا۔ سب سے پہلے قیدیوں کے ساتھ حسنِ معاملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا ان کے بعد سب امراء نے' کتاب الخراج صد ۱۴۹۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حکمنامہ جاری کیا تھا کہ کوئی جیلر اپنے قید خانہ میں کسی مسلمان قیدی کو ایسی طرح

باندھ کر نہ رکھے کہ وہ کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکے اور اس قیدی کے سوا جو قتل کے کیس میں گرفتار ہو ہرگز کسی کو رات قید خانہ میں مت گزر رواؤ ۔ (اتنی دیر بھی قید نہ رکھو) اور انہیں کھانے پینے اور سالن کے لئے وہ کچھ دو جو ان کے لئے (ہر طرح) ٹھیک اور مناسب ہو، کتاب الخراج صہ۱۵۱ لقاضی القضاۃ ابی یوسف ؒ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر ابن ملجم نے قاتلانہ حملہ کیا تو اسے پکڑ کر پیش کیا گیا۔ آپ نے اپنے صاحبزادوں سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہما سے فرمایا: احسنوا اسارہٗ فان عشت فانا ولی دمی وان مت فضربۃ کضربتی ۔ اس کے ساتھ قید میں اچھا سلوک کرو۔ اگر میں زندہ رہا تو میں اپنے خون کا خود حقدار ہوں اور اگر میرا انتقال ہو جائے تو میری جیسی ضرب اسے لگائی جائے ۔ المغنی صہ۱۱۲ ج ۸ ۔ امام شافعی فرماتے ہیں : فامر بحبسہ وقال لولدہٖ ان قتلتم فلا تمثلوا : ترجمہ: سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے ابن ملجم کو قید کرنے کا حکم دیا اور اپنے صاحبزادے سے فرمایا کہ اگر اسے تم قتل کرو تو مُثلہ نہ کرنا (مار کر ناک کان کاٹ کر شکل مت بگاڑنا) مختصر المزنی صہ۲۵۶ ، اس سے معلوم ہوا کہ قیدی کے ساتھ، جب تک وہ زندہ رہے اور جب اسے مار دیا جائے بہر صورت کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی جاسکتی ۔ حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس صفین کی جنگ کے دوران جب کسی کو قید کر کے لایا جاتا تھا تو آپ اس کے ہتھیار اور سواری ضبط کر لیتے تھے اور یہ عہد اور وعدہ لیتے تھے کہ دوبارہ وہ مقابلہ کے لئے نہیں آئے گا ۔ پھر اسے چھوڑ دیتے تھے ، کتاب الخراج صہ۲۱۵ ۔ موجودہ حکومت اسلام کا سب سے زیادہ نام لے رہی ہے اور سب سے زیادہ بااختیار ہے۔ اس لئے اس پر سب سے زیادہ واجب بھی ہے کہ وہ ہر غیر اسلامی فعل چھوڑ دے تا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ اور فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ کی وعید سے بچ سکے اور لوگوں کو بھی چاہیئے کہ جہاں تک ان کی رسائی ہو سکے حکمرانوں کو سمجھاتے رہیں ۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمایا ہے لوگ جب کسی کو ظلم کرتا دیکھیں اور اسے نہ روکیں تو قریب ہے کہ سب ہی پر خدا عذاب نازل کر دے ، مشکوٰۃ صہ۴۳۶ ۔ اسی طرح جب کوئی بری بات دیکھیں تو روکیں کتاب الخراج صہ۱۰ ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے بار بار "اتق اللہ" خدا سے ڈر کہا کسی نے اسے ٹوکا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسے یہ جملہ کہنے دو ۔ اگر لوگ ہم سے یہ نہ کہیں تو ان سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں اور وہ اچھے نہیں اور اگر ان کی اس بات کو ہم قبول نہ کریں تو ہم میں کوئی خوبی اور بھلائی نہیں، کتاب الخراج صہ۱۲ ۔

(۶) آپ نے دریافت کیا ہے کہ اگر کسی کو یہ کہا جا رہا ہو کہ وہ قادیانی ہو گیا ہے اور وہ اپنی صفائی میں کہے کہ میں راسخ العقیدہ مسلمان ہوں ۔ میں قادیانی نہیں ہوں ۔ میرا ایمان ہے کہ حضور خاتم النبیین تھے

آپ کو مہر نبوت عطا ہوئی تھی۔ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) تو کیا اس کا یہ اقرار اس کے مسلمان ہونے کے ثبوت کے لئے کافی ہے یا نہیں!

اس کا جواب یہ ہے دل کا حال تو خدا جانتا ہے کہ مذکورہ بالا کلمات قادیانی بھی کہتے ہیں جس میں وہ دجل وفریب سے کام لیتے ہیں، کہتے ہیں میں قادیانی نہیں ہوں۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ میں اللہ دِتّہ ہوں، غلام احمد قادیانی نہیں ہوں۔ یا یہ کہ میں قادیان کا رہنے والا نہیں ہوں ــ حضور خاتم النبیین تھے کا مطلب اور آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مستقل شریعت لے کر آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا (بروزی نبی نہیں آئے گا) ہاں شریعت یہی رہے ایسا نبی آسکتا ہے (ظلی نبی آسکتا ہے) اور وہ غلام احمد قادیانی کے بارے میں ایسی ہی تاویلیں کرتے جاتے ہیں اور نبی کہتے جاتے ہیں۔ اس کے دیکھنے والوں کو صحابی کہتے ہیں اور اس کی بیوی کو ام المومنین وغیرہ اور آپ کو مہر نبوت عطا ہوئی تھی کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اب جو نبی آئے گا وہ آپ کے مہر لگائے بغیر نبی نہ ہو سکے گا اور مرزا قادیانی کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کی نبوت پر معاذ اللہ آپؐ نے مہر لگائی تھی۔ بات یہ ہے کہ اگر کوئی قادیانیت کے بارے میں اپنی صفائی پیش کرنی چاہتا ہے تو وہ صرف اتنی سی بات کہدے کہ "میں مرزا غلام احمد قادیانی کو کافر مانتا ہوں" یا یہ کہے کہ آنحضرتؐ کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی سمیت ہر مدعیٔ نبوت کو کافر مانتا ہوں یہ کلمات واضح ہیں اور ہمارے آئین میں ہیں جو شخص یہ کلمات کہے اسے پھر قادیانی نہیں کہا جا سکتا۔ اور چونکہ جس پر شبہ کیا جاتا ہے تو کچھ قرائن کی بنا پر ہی کیا جاتا ہے۔ اس لئے اسے صاف ہی الفاظ سے اپنی صفائی کرنی چاہیئے اور ان قرائن کی بھی صفائی بیان کر دینی چاہیئے جن کی وجہ سے لوگوں کو شبہ پیدا ہوا ہو ـــــ!!

(۷) آپ نے سوال کیا ہے کہ مارشل لاء میں خرابی کیا ہے!

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے سوال نمبر ا سے نمبر ۵ تک کے جوابات ملاحظہ فرمالئے ہیں خود ہی غور فرمائیں کہ یہ شرعی غلطیاں پائی جا رہی ہیں یا نہیں (ب) ایک بڑی خرابی جو ملک کا بہت ہی بڑا نقصان ہے یہ ہے کہ فوج کے حکام تک عوام کی رسائی نہیں ہے اور ان کے فیصلوں کا اور سب معاملات کا انداز تحکمانہ ہے جس سے عوام کو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی غیر ملکی طاقت جو بے رحم اور اجنبی ہے سر پہ سوار ہو گئی ہے جیسے پہلے انگریز سوار تھا، آپ ہی بتلائیں کہ اگر عوام کے ذہن میں یہ بات آجائے تو ان کی ہمدردیاں فوج کے ساتھ کہاں رہ سکتی ہیں اور فوج بغیر عوام کی طاقت کے کسی بیرونی ملک کے حملہ کے جواب میں بغیر عوام کی بھرپور حمایت کے کیسے کامیاب ہو سکتی ہے گویا مارشل لاء کی درازی فوج کو ایک طبقہ کا روپ دے رہی ہے وہ یہی اعلان بھی کر رہی ہے کہ ہم ایک طبقہ ہیں اس طرح دوسرا طبقہ عوام ہو گئے اور ان میں اختلاف طبقاتی اختلاف اور طبقاتی سرد جنگ کا پیش خیمہ ہوگا جبکہ انہیں اس اختلاف

سے بالا اور سب عوام کا محبوب ہونا چاہیئے تھا کیونکہ وہ ہمارے ہی بھائی بند ہیں۔ (ج) حکومت یہ تسلیم کر رہی ہے کہ رشوت کا ریٹ بڑھ گیا ہے۔ پانچ سے پچاس ہو گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی وجہ مارشل لاء ہے یعنی فوج کا سول علاقوں میں آجانا اس کا سبب بنا ہے فوج کے آدمی فرشتے نہیں ہیں جب وہ ایسی بیماریوں میں مبتلا ہو جائیں گے تو ان کا ذہن لڑنے کے کام کا نہیں رہے گا۔ حالانکہ قوم کا روپیہ دفاع ہی پر سب سے زیادہ خرچ ہو رہا ہے اللہ رحم فرمائے آپ کی کسی ذریعہ اگر بڑے صاحب تک رسائی ہو تو انہیں سمجھائیں عرض معروض کریں ؎ شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات۔

(۸) آپ نے پوچھا ہے کہ ملک کی خرابیوں کا کیا علاج ہے۔ جنرل صاحب اسلامی نظام لا رہے ہیں آپ ان سے کیوں دور ہیں؟

(الف) اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نظام نافذ کر دیا جائے اس کے سوا کوئی نظام اور کوئی تدبیر ایسی کارگر اور مؤثر نہیں ہے۔ اسلامی نظام کے تحت معاشرتی معاشی (اقتصادیات) مالیات سب کی اصلاح ہو گی قانون بدل جائے گا فوج کا بھی اور سول کا بھی وغیرہ (ب) اوّل تو جنرل صاحب اسلامی نظام سے واقف نہیں ہیں اور جو واقف نہ ہو وہ اس نظام کو نہیں لا سکتا۔ ورنہ چند ہفتوں کا کام تھا یہ نظام تبدیل ہو جاتا نیز میں اب تو یہ تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں کہ جنرل صاحب سچے دل سے نظامِ اسلام لانا چاہتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ وہ صرف اسلام کا نام استعمال کر رہے ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ انہوں نے اسلامی قوانین کو سب سے نیچے درجہ دیا اس سے اوپر انگریزی قانون کو مقام دیا اور اس سے اوپر مارشل لاء کو اگر وہ اسلامی نظام کے دل سے خواہشمند ہوتے تو اسلامی نظام کو سب سے اعلیٰ مقام دیتے۔ اگر خدا نے معاف نہ کیا تو خدا کے یہاں ان سے دین کے ساتھ اس مذاق و استخفاف پر سخت محاسبہ ہو سکتا ہے۔ چھ سال کے مشاہدات نے ہمیں مایوس کر دیا ہے اس لئے ہم ان سے دور ہیں۔ (ج) ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جس طرح پاکستان کا مذہب متعین ہے کہ اسلام ہو گا وہ آگے پاکستان کا مسلک بھی متعین کر دیتے کہ حنفی مسلک ہو گا۔ اس طرح یہ نتیجہ ہی فوراً برآمد ہوتا کہ:

- فوج میں انگریز کا بنایا ہوا فوجی قانون (مارشل لاء) منسوخ ہو جاتا اس کی جگہ اسلام کا حنفی قانون جو موجود ہے نافذ کر دیا جاتا۔
- سول عدالتوں میں انگریز کا دیا ہوا دیوانی اور فوجداری قانون منسوخ ہو جاتا اس کی جگہ حنفی قانون آجاتا۔
- شیعہ اقلیت کے لئے فقہ جعفری کی اجازت دے دی جاتی۔
- عدالتوں کی بالادستی تسلیم کرا دی جاتی، اس کام میں حکومت کو بہت سے اسلامی قضاء کی کتابوں کے ترجمے کرا کر عدلیہ کو مہیا کرنے ہوتے اور علماء کو ان کی مدد کے لئے ان کے ساتھ بٹھانا ہوتا یہ حکومت کے لئے چند ماہ سے زیادہ کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔

• اس سے فوری طور پر جو فوائد رونما ہوتے ان سے پوری قوم مطمئن ہوتی کیونکہ اس کا اثر اقتصادیات پر فوراً ہی پڑتا مثلاً یہ کہ :

(الف) تمام ایسے بڑے کارخانے کہ جن کے قیام میں اسٹیٹ بینک (بیت المال یعنی بیت المسلمین) زیر بار ہوتا ہے۔ ان سب کی آمدنی اسٹیٹ بینک کی ملکیت ہوتی اور کارخانے دار کا یا حصہ ہوتا یا بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جاتا۔ کیونکہ ایسے بڑے کارخانوں کا بار بواسطہ بیت المال پوری قوم پر پڑتا ہے۔ اس لئے وہ کسی ایک فرد کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔

(ب) تمام تاجروں کو بھی انکم ٹیکس کی چھوٹ دے دی جاتی کیونکہ یہ غیر اسلامی ہے اور کسٹم باقی اور جاری رہتا یہ اسلامی ہے اور اس کے قانون فقہ میں موجود ہیں اور کسٹم ہی سے بیت المال کو زیادہ آمدنی ہے انکم ٹیکس سے آمدنی بھی بہت تھوڑی ہے۔ درآمد و برآمد دونوں پر ڈیوٹی کے احکام موجود ہیں۔

(ج) اور زمینوں کے بارے میں جمعیتہ علماء نے اپنے منشور میں مفصل اصلاحات ذکر کی ہیں۔ اس قسم کی اصلاحات اور جماعتوں نے بھی اپنے اپنے منشور میں کر رکھی ہیں۔ یہ اصلاحات سب جماعتوں کی قریب ہی قریب ہیں زمیندار اور مزارع سب ہی کو ان اصلاحات سے فائدہ ہوتا۔

(د) سرکاری بالکل غیر آباد زمینیں آبادکاروں کی ملکیت بنا دی جاتیں۔

(ہ) خراجی زمینوں سے خراج وغیرہ بیت المال کی آمدنی کی مدات میں ہوتا جو حکومت کے کاموں میں صرف ہوتا۔ جس طرح عشر غرباء پر صرف کے لئے ہوتا ہے۔

(و) ناداروں از کار رفتہ ضعیفوں اور بوڑھوں کا وظیفہ بیت المال سے جاری ہوتا چاہیے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی بوڑھے کو مانگتا دیکھا دریافت کیا کہ ایسا کیوں کرتے ہو۔ اس نے ضعیفی اور ناداری کا عذر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس جیسے اور سب لوگوں کو بھی تلاش کر دو اور ان سب کا وظیفہ بیت المال سے جاری کر دیا۔ فرمایا کہ قرآن میں ہے — انما الصدقات للفقراء والمساکین، فقراء تو مسلمان محتاج لوگ ہیں، اور یہ اہل کتاب میں ہے یہ مساکین میں داخل ہے۔

غرض اسلامی نظام عدل اور اقتصادی نظام وہی ہے جس کی آج ہر انقلابی شخص تمنا کر رہا ہے کہ وہ برپا ہو یہ الگ بات ہے کہ دینی معلومات عام نہ ہونے کی وجہ سے اسے خبر نہ ہو کہ ہمیں اسلامی نظام میں یہ خود بخود لازماً اور دائمی طور پر ملے گا۔ انگریزی دور اقتدار نے جو دین سے ناواقفیت پیدا کی تھی وہ حجاب بنی چلی آرہی ہے۔

خیر موجودہ حکومت تو اسلامی نظام لانے میں بُری طرح ناکام رہی ہے۔ اس لئے میں ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں سے اپنی تحریرات میں اپیل کرتا رہا ہوں کہ وہ اپنے اپنے دستور میں اتنی عبارت

کا صدق دل اور عزم صمیم سے اضافہ کرلیں کہ ہم جب برسرِ اقتدار آئیں گے تو ہمارے دور میں "عدلیہ آزاد اور بالا دست ہوگی۔ قانون حنفی ہوگا۔ پرسنل لاء فقہ جعفری ہوگا"

اگر میری آواز کسی طرح ان تک پہنچ گئی تو امید ہے کہ وہ جماعتیں جنہوں نے ۱۹۷۳ء کے آئین پر دستخط کئے ہیں وہ تو اسے قبول کرنے میں تأمل نہ کریں گی اور اس تجویز کی منظوری کا اعلان بھی کردیں گی تاکہ ان کی موجودہ جد وجہد حکومتِ الٰہیہ، نظامِ مصطفیٰ اسلامی نظام (غرض جو نام بھی لے لیا جائے) کے لئے ہو جائے۔ اسی میں ملک کی سلامتی بھی ہے اور اسی میں عوام اور ان لوگوں کا جنہیں کمزور عوام (قرآن پاک میں مُسْتَضْعَفِیْن) کہا گیا ہے پائدار نفع ہے۔ لیکن سب قائدین زیرِ حراست ہیں ان تک میری آواز خدا پہنچائے اور انہیں یہ تجویز قبول کرنے اور اس کے اعلان کی توفیق بخشے تاکہ ہمارے اور ان کے لئے اس کا ثواب صدقہ جاریہ بنے، آمین!

جس طرح موجودہ حکومت پر میرے خط میں لکھی ہوئی چیزوں پر شرعاً عمل کرنا فرض تھا اور ہے اسی طرح سابق حکمران جماعت پیپلز پارٹی پر بھی اس کا ماننا فرض ہے کیونکہ ۱۹۷۳ء کا آئین اس نے اپنے دور میں بنایا ہے جس میں اسلامی نظام لانے کا عرصہ مقرر کیا ہے اور اسی نے اسلام کے اقتصادی اصلاحات (اسلامی سوشلزم) کا نعرہ لگایا تھا۔ اس لئے اس پر اس تجویز کا خیر مقدم کرنا اسی طرح فرض ہے جس طرح اس موجودہ حکومت پر۔

آپ کے تمام سوالات کا جواب بھی بحمد اللہ لکھا گیا اور آخر میں کچھ اور ضروری باتیں بھی آگئیں آپ کا اصرار تھا کہ میں ضرور ہی استفتاء کا جواب لکھوں۔ اب عریضہ ختم کرتا ہوں۔ اپنے علم و دانست کے مطابق میرا یہی جواب ہے اور یہی فتویٰ ہے۔ واللہ اعلم

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

دعاؤں کا خواستگار سید حامد میاں

انا المصدق: محمد شاہ امروٹی (حضرت مولانا سید محمد شاہ صاحب امروٹی مدظلہم) ۱۶ ذوالحجہ ۱۳۹۸ھ ۱۹ نومبر ۱۹۷۸ء
الجواب صحیح: امیر حسین گیلانی بقلم خود (مولانا سید امیر حسین شاہ صاحب گیلانی مدظلہم)

عن الحارث الاشعری، قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،
اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ
بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ
(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد وجامع ترمذی)

گر اک چراغِ حقیقت کو گُل کیا تم نے — تو موجِ دود سے صد آفتاب اُبھر ہی گئے

"شامِ الہُدیٰ" کراچی کی رُوداد

مرتبہ: نعیم الطاف ـــــ بہ تعاون شیخ جمیل الرحمٰن

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ العالی کے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے دروس "الہُدیٰ" کے ٹائٹل کے تحت پاکستان ٹیلی ویژن پر جب ۳۰ اپریل ۸۱ء سے ہفتہ وار اجرا ہوا تو بفضلہ تعالیٰ اس پروگرام نے پاکستان گیر پیمانے پر اتنی عظیم مقبولیت حاصل کی کہ لوگوں کی صحیح رائے یہ ہے کہ اس سے زیادہ مقبول و مؤثر ترین کوئی دینی پروگرام نہ اس سے قبل ٹی وی پر پیش ہوا اور نہ تاہنوز پیش ہوا ہے۔

ایک تو خود اللہ تعالیٰ کے کلام قرآن حکیم کا معجزانہ اسلوب بیان ہے کہ جس کے سامنے نزول قرآن کے وقت عرب کے تمام نامی گرامی شعراء، خطباء نے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ لبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو شعرائے سبع معلقات کے آخری شاعر ہیں یعنی ان سات شعراء میں سے ہیں جن کے اشعار اس وقت تک خانہ کعبہ پر تحریری طور پر لٹکائے جاتے تھے جب تک کہ اُن سے بہتر اشعار پیش نہ ہوں اور لبیدؓ ہی وہ آخری شاعر ہیں کہ جن کے ان کے قصیدے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آغازِ وحی سے قبل سوقِ عکاظ میں شعرائے وقت نے سجدہ کیا تھا۔ جو اس بات کی علامت اور اس کا مظہر کامل تھا کہ انؓ کو اس دور کے صنف شاعری اور فصاحت و بلاغت کا اُستاذ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ وہ ہی لبیدؓ قرآنِ مبین کے اعجاز اور فصاحت و بلاغت نیز اس کے بدیہیات فطرت کو مسحور و متاثر کرنے والی تعلیمات کے آگے سرنگوں ہو گئے اور دولتِ ایمان سے مالامال ہوئے اور اس کے بعد شاعری ترک کر دی۔ یہ تو محض ایک مثال ہے ورنہ قرآن حکیم کی معجز نمائی اور اثر پذیری کا عالم یہ تھا کہ عرب قوم جس کی گھٹی میں شرک رچا بسا ہوا تھا، جو بہت سے ذمائم و رذائلِ اخلاق میں ملوث تھی، وہ ایسی موحد اور متقی بن گئی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انکی شان میں ارشاد فرمایا:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِينَ
مَعَهٗ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ
رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ
رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ
فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز
سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ
مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۚ ذٰلِكَ
مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ ۚ صلے
وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ ۚ قف
كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهٗ
فَآزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى
عَلٰى سُوقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ
لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ط
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ
مَّغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيمًا ۝
(سورۃ فتح - ۲۹)

"محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ
ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت
اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب
دیکھو گے انہیں رکوع و سجود
اور اللہ کے فضل اور اسکی خوشنودی
کی طلب میں مشغول پاؤ گے سجود
کے اثرات ان کے چہروں پر موجود
ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے
ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت توراۃ
میں اور انجیل میں ان کی مثال
یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی
ہے۔ جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر
اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی
پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔ کاشت
کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے
تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پہ
جلیں۔ اس گروہ کے جو لوگ ایمان
لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے
ہیں۔ اللہ نے ان سے مغفرت اور
بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔"

دوسرے اگر قرآن حکیم کے پیغام، اس کے علوم و معارف، فطرتِ انسانی میں ودیعت
شدہ بدیہیات کو اپیل کرنے والے دلائل اور اس کی واضح و مبرہن تعلیمات کو
دور کی علمی و فکری سطح پر پُر تاثیر اسلوب اور محکم استدلال کے ساتھ پیش کیا جائے
تو "ہر از دل خیزد بر دل ریزد" والا معاملہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محترم ڈاکٹر اسرار
مدظلہ العالی کو جہاں خاص اپنے فضل و کرم سے فہمِ قرآن جیسی نعمتِ عظمیٰ و کبریٰ سے ن

ہے وہاں ان کو دلوں کو مسخر و متاثر کرنے والا اسلوبِ خطابت، اندازِ بیان اور طرزِ استدلال بھی عطا فرمایا ہے۔ موصوف کے درسِ قرآن حکیم سے ایک سامع یوں محسوس کرتا ہے گویا قرآن کا مفہوم اس کے دل میں اترتا چلا جا رہا ہے اور اس کے ذہن میں اس کلامِ عظیم کی عظمت کا نقش ثبت ہوتا چلا جاتا ہے۔

ٹی وی پروگرام "الہدیٰ" کے ذریعے تطہیرِ افکار اور تعمیرِ سیرت و کردار کے لئے قرآن مجید کی انقلابی دعوت اور اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے کے اوصاف کی تعلیم ہر ہفتہ ایک حکیمانہ ترتیب کے ساتھ ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے دروس کی شکل میں قریباً پاکستان گیر پیمانے پر گھر گھر پہنچ رہی تھی در اس کے نہایت ہی تعمیری اور خوش گوار اثرات معاشرے پر مترتب ہو رہے تھے، لیکن بصد افسوس عرض کرنا پڑتا ہے کہ سوا سال بعد جب یہ نصاب نصف تک پہنچا تھا کہ اچانک بند کر دیا گیا۔ جس سے تمام محبِ دین حلقوں کو شدید صدمہ ہوا۔

کراچی میں "الہدیٰ" کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی نصرت کی بدولت چند اہلِ خیر کے تعاون سے انگریزی ماہ کی ہر آخری سوموار (پیر) کو کراچی کے مشہور و معروف ہوٹل "تاج محل" کے موتی محل آڈیٹوریم میں بحمد اللہ ۲۹ اکتوبر ۸۴ء سے "شامِ الہدیٰ" کا آغاز ہو گیا ہے۔ راقم کی معلومات کی حد تک پورے پاکستان میں اس آڈیٹوریم سے زیادہ وسیع اور معیاری شاید ہی کوئی دوسرا آڈیٹوریم ہو۔ جو مالکان تاج محل ہوٹل نے بلا معاوضہ اس کام کے لئے پیش فرمایا ہے۔ اس آڈیٹوریم میں بارہ سو چالیس نشستوں کا انتظام ہے۔ بفضلہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ تمام نشستیں وقت سے قبل پُر ہو گئیں بلکہ بعد میں سینکڑوں حضرات کو اسٹیج اور نشستوں کے درمیان نیم دائرہ میں جہاں قالین بچھا ہوا ہے وہاں بیٹھنا پڑا۔ محتاط اندازہ یہ ہے کہ پندرہ سو سے زائد افراد نے اس "شامِ الہدیٰ" میں شرکت فرمائی۔

اس "شامِ الہدیٰ" کے لئے کراچی کے تین روزناموں میں بزم کی طرف سے دو مرتبہ اشتہارات دیئے گئے نیز تین ہزار کے قریب دعوتی کارڈ مختلف حضرات کو ارسال کئے گئے تاج محل کے قریب سے گزرنے والی چار شاہراہوں پہ بینر لگائے گئے۔ شرکاء میں علمائے کرام، جج صاحبان، وکلاء حضرات، صنعت کار، تجار، نیز دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ

حضرات شریک تھے ان میں سے اکثر حضرات نے خطوط کے ذریعے درس کی افادیت، اس کی اثر پذیری اور اعلیٰ انتظام پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ آڈیٹوریم کی گیلری میں پردے کے مکمل اہتمام کے ساتھ خواتین کی نشست کا بھی انتظام تھا۔ خواتین کی تعداد بھی قریباً سوا دو سو باقاعدہ نشستوں سے کہیں زیادہ تھی اور بعض خواتین کو مختلف راستوں کی سیڑھیوں پر بیٹھنا پڑا۔ شریک خواتین کی تعداد کا محتاط اندازہ تین صد سے متجاوز ہے۔

آڈیٹوریم سے باہر داخلے کے راستوں کے ساتھ انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کی مطبوعات نیز ڈاکٹر صاحب موصوف کے دروسِ قرآن اور خطابات کے کیسٹوں کے اسٹال بھی لگائے گئے۔

مقررہ وقت یعنی ٹھیک سات بجے سورۃ العصر کی تلاوت سے اس مبارک و سعید مجلس کا آغاز ہوا۔ تلاوت کے بعد سب سے پہلے جناب بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) حامد جمیل صاحب نے بطور تعارف اس "شام السادس" کے انعقاد کا حسبِ ذیل پس منظر و پیش منظر پیش فرمایا:

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہِ الکریم

حضرات و خواتین۔ السّلامُ علیکم

اُمتِ مسلمہ صدیوں سے جس زوال اور پستی سے دوچار ہے اُسے اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ ہے "قرآن حکیم سے مہجوری" قرآن کی آفاقی تعلیمات سے دُوری اس ہجران اور بُعد کا نتیجہ ہے ایمان میں ضعف و اضمحلال ۔۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ مسلمان اسی سرچشمۂ ہدایت اور منبعِ ایمان کی طرف رجوع کریں ۔ بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے ڈھونڈے سے ملے گی قاری کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

قرآن مجید کے علوم و معارف اور اس کے عِبَر و حِکَم، اس کے فطری طرزِ استدلال کو مسلمانانِ پاکستان کے ذہنوں اور دلوں میں اتارنے اور راسخ کرنے کے لئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے قرآنِ حکیم کے مطالعے کے لئے ایک منتخب نصاب مرتب کیا اور اسی کام کیلئے اپنی زندگی وقف کر دی کہ دعوتِ رجوع الی القرآن کے ذریعے لوگوں کو قرآن کی معجزانہ تعلیمات

سے متعارف کرایا جائے ـــــ اور یہ سعی کی جائے کہ ان میں دین کے عملی تقاضے اور مطالبے پورا کرنے کے لئے ایک جذبہ، داعیہ اور ایک عزم و ارادہ جڑ پکڑے اور پروان چڑھے۔

پاکستان ٹی وی پر رمضان المبارک میں دو سال ڈاکٹر صاحب کے روزانہ پروگرام "الکتاب" اور پھر اگلے سال پروگرام "آلم" کے مقبولیت اور پسندیدگی کے پیش نظر ٹی وی کے ارباب اختیار کی دعوت پر محترم ڈاکٹر صاحب نے "الہدیٰ" کے ٹائٹل کے تحت ہفتہ وار اپنے منتخب نصاب کا درس شروع کیا ـــ ایک تو خود قرآن حکیم کا معجزانہ اسلوب اور طرز استدلال۔ جس نے اپنے نزول کے زمانے میں عرب کے لوگوں کو جو اپنی مُصَقَّع و مُقَفّٰع شاعری و خطابت پر انتہائی نازاں تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، عاجز اور دنگ کر دیا تھا اور آج تک قرآن کا یہ چیلنج موجود ہے کہ: اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ـــ "اے لوگو! اگر تم کو اس قرآن پر شک ہے جو ہم نے اپنے بندے (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتارا ہے تو تم اس جیسی ایک ہی سورت بنا لاؤ"۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے محترم ڈاکٹر صاحب کو اپنی کتاب مبین کا فہم اور اس کی تفہیم کا جو مؤثر انداز عطا فرمایا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلنا شروع ہوا کہ رفتہ رفتہ عوام و خواص کی توجہات اور ان کا التفات قرآن حکیم کی تعلیمات کی طرف مرتکز ہونے لگا۔ خاص طور پر ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے اذہان و قلوب قرآن کے معجزانہ اسلوب اور ڈاکٹر صاحب کے پُر تاثیر و مدلل انداز بیان سے مسخر ہونے لگے اور قرآن ذہنوں اور دلوں میں نفوذ کرنے لگا ـــ یہ خاکسار خود بھی ڈاکٹر صاحب اور انکی دعوت سے اسی الہدیٰ سے کے ذریعے متعارف ہوا ـــ مجھے علم ہے کہ ہمارے ملک کے اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات الہدیٰ کے پروگرام کے لئے اپنی دوسری مصروفیات کو ملتوی کر دیا کرتے تھے۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ "الہدیٰ" کے پروگرام کے باعث ہمارے معاشرے کے ذہین افراد میں قرآنی تعلیمات نفوذ کر رہی تھیں اور بہت سے گھرانوں میں دینی ماحول پیدا ہو رہا تھا ـــ لیکن قوم کی بدقسمتی کہ یہ پروگرام عین اسوقت بند کر دیا گیا جبکہ وہ نصف تک پہنچا تھا ـــ اس بندش کو قریباً سوا دو سال گزر چکے ہیں اور بظاہر احوال اس کے دوبارہ اجراء کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔

باایں حالات کراچی کے بعض احباب نے طے کیا ہے کہ "الہدیٰ" کے پروگرام کے تسلسل کو جاری اور برقرار رکھنے کے لئے "شام الہدیٰ" کے نام سے کراچی میں ایک ماہانہ مجلس کا کسی مناسب مقام پر انعقاد کیا جایا کرے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اس کے لئے انگریزی ماہ کی ہر آخری سوموار یعنی پیر کی شام کا وقت دینے کی منظوری عنایت فرمادی اور جناب منصور فیروز الدین بوبچہ صاحب مینجنگ ڈائریکٹر تاج محل ہوٹل نے اس کارِ خیر کے لئے بلا معاوضہ اس آڈیٹوریم کی بطور تعاون پیش کش فرمائی جس میں آج بفضلہ تعالیٰ "شامِ الہدیٰ" کی پہلی نشست منعقد ہو رہی ہے ـــ اس "شامِ الہدیٰ" کے جملہ انتظام و انصرام کے لئے ایک غیر رسمی حلقہ "بزمِ احبابِ الہدیٰ" کراچی کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ غیر رسمی سے مراد یہ ہے کہ اس بزم کے نہ کوئی قواعد و ضوابط ہیں، نہ کوئی دستور ہے۔ نہ عہدے ہیں نہ انتخاب ہے۔ اس کا اوّلین مقصد خالص غیر جماعتی طور پر انگریزی ماہ کی ہر آخری پیر کو مغرب کے بعد "شامِ الہدیٰ" کا انعقاد ہے۔ ضرورت متقاضی ہوئی تو یہ حلقہ مزید درس قرآن کی مجالس بھی منعقد کرنے پر غور کر سکتا ہے ـــ اس خاکسار کے کاندھوں پر اس "بزمِ احبابِ الہدیٰ کراچی" کے خادم کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خاکسار کی اس ذمّہ داری کو بحسن و خوبی ادا کرنے میں نصرت فرمائے ـــ اس "شامِ الہدیٰ" کے انعقاد کے جملہ مصارف متعدّد خادمانِ قرآن حکیم کے مالی تعاون سے پورے کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام اصحابِ خیر کو اجر و ثواب سے نوازے۔ ـــ اب جملہ شرکاء سے درخواست ہے کہ وہ نوٹ فرمالیں کہ ان شاء اللہ العزیز انگریزی ماہ کی ہر آخری سوموار (پیر) کو بعد نمازِ مغرب اسی مقام پر "شامِ الہدیٰ" کا انعقاد ہوا کرے گا۔ اس سلسلے کی دوسری نشست ۲۶ نومبر کو منعقد ہوگی۔ آپ تمام حضرات و خواتین سے درخواست ہے کہ اس میں خود بھی شرکت فرمائیں اور اپنے حلقۂ احباب اور متعلقین کو بھی شرکت کی دعوت دے کر اس کارِ خیر میں تعاون فرمائیں۔

مجھے احساس ہے کہ ان تعارفی کلمات کے باعث میں کافی دیر تک آپ کے

اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درمیان حائل رہا — اب میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ قرآن حکیم کے درس کا آغاز فرمائیں۔

والسلام مع الاکرام

محترم بریگیڈیئر صاحب کے تعارفی کلمات کے بعد محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے خطبہ مسنونہ کے ساتھ "سورۃ حجرات" کے درس کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بطور تمہید فرمایا:

آج سے قریباً پندرہ سال قبل انہوں نے اس نقطۂ نظر سے مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب مرتب کیا تھا کہ قرآن مجید کے بعض مقامات سے ایک مسلمان کے سامنے یہ بات بالکل واضح طور پر آجائے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہدایت قرآن مجید کی انقلابی دعوت، اس کا انقلابی پیغام اور فکر کیا ہے اور اس کا رب اُس سے کیا چاہتا ہے! گویا دین کے تقاضوں اور مطالبوں کا ایک اجمالی لیکن جامع تصور پیش کرنا اس کا اصل مقصود ہے۔ اس نصاب کی جڑ اور بنیاد سورۃ العصر ہے جس میں نجاتِ اُخروی کی چار ناگزیر شرائط کا بیان ہوا ہے۔ چونکہ سورۃ العصر میں اس نجات کے چار لوازم: ایمان، عمل صالح۔ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ بیان ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ نصاب اسی ترتیب سے قرآن حکیم کے بعض مقامات پر مشتمل ہے۔ عمل صالح' بالفاظ دیگر انسان کی عملی زندگی کے ضمن میں آخر میں یہ بات بھی زیر بحث آئی ہے کہ ایک اسلامی ریاست کی تاسیس و تشکیل کن بنیادوں پر ہوتی ہے! اس ریاست کا مکمل شہری ہونے کی شرائط کیا ہیں! معاشرے کی شیرازہ بندی کے اصول کیا ہیں! وہ خرابیاں کونسی ہیں جن سے ایک اسلامی معاشرے کو بہرحال اجتناب ضروری ہے! اسلام اور ایمان کا فرق کیا ہے — ! اسلام کا آفاقی پیغام کیا ہے! پوری نوعِ انسانی میں باہم ربط و تعلق کی اساسات کون سی ہیں! ان تمام مباحث کے ذیل میں سورۃ حجرات عظیم سورت ہے۔ اسی سورت کے درس کی تکمیل کے بعد ٹی وی پروگرام "الہدیٰ" بند ہوا تھا۔ لہٰذا اس 'شامِ الہدیٰ' کے لئے اس سورہ مبارکہ کے درس کو منتخب کیا گیا ہے۔ آئندہ اس منتخب نصاب کا وہ حصہ شروع ہوگا جو تواصی بالحق کے مباحث سے متعلق ہے جس میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے مضامین زیر درس آئیں گے۔ اس سلسلہ میں پہلا درس ان شاء اللہ نومبر ۸۴ء کی آخری سوموار کو اسی مقام

پر ہوگا۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد سورۂ حجرات کا درس شروع ہوا۔ بزم احباب الہُدیٰ کی جانب سے اس سورہ مبارکہ کی سلائیڈ بنوالی گئی تھیں جو ایک بڑے اسکرین پر وجکیٹر کے ذریعے درس کے ساتھ ساتھ دکھائی جارہی تھی۔ مزید براں اس سورہ مبارکہ کے مضامین کا محترم ڈاکٹر صاحب نے منتخب نصاب میں جو تجزیہ تحریر فرمایا ہے، بزم احبابِ الہُدیٰ کی جانب سے اس کا پمفلٹ کو طبع کرا لیا گیا تھا جو حاضرین میں تقسیم کیا گیا (یہ تجزیہ اس روداد کے آخر میں بھی شامل کیا جارہا ہے)۔

درس کے آغاز اور اختتام پر محترم ڈاکٹر صاحب نے مالکان تاج محل ہوٹل اور ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ جنہوں نے اس شامِ الہُدیٰ کے انعقاد میں مالی یا عملی تعاون کیا ہے۔ نیز فرمایا کہ ان شاءاللہ ان حضرات کا اجر و ثواب اللہ تعالےٰ کے یہاں محفوظ ہو گا نیز ایسی مجالس کے ذریعے جو بھی خیر معاشرے میں پھیلے گا وہ اس کے انتظام کرنے والوں کے لئے صدقہ جاریہ ہوگا۔

یہ مجلس قریبًا پونے تین گھنٹے تک جاری رہی۔ درس تو مراد و گھنٹے کا تھا۔ لیکن دوران میں اچانک ایفلی فائر کے فیوز خراب ہوگئے قریبًا تیس منٹ متبادل انتظام کی نذر ہوگئے اس دوران سامعین اپنی نشستوں پر تشریف فرما رہے۔ قریبًا دس منٹ محترم بریگیڈیئر صاحب کے تعارفی کلمات میں صرف ہوئے۔ درس کے بعد ہوٹل ہی میں تعمیر شدہ مسجد میں صلوٰۃ عشاء ڈاکٹر صاحب موصوف کی اقتدار میں باجماعت ادا کی گئی۔

ایک خاص بات

بزم احبابِ الہُدیٰ کے چند معاونین کی تجویز اور اصرار پر اس پورے درس کا رنگین ویڈیو کیسٹ بھی تیار کرا لیا گیا ہے۔ یہ کیسٹ مبلغ تین سو روپے میں مندرجہ ذیل پتوں سے دستیاب ہوسکتا ہے۔ جو حضرات بذریعہ رجسٹرڈ پارسل منگانا چاہیں۔ ان سے گذارش ہے کہ تین سو روپے کا بنک ڈرافٹ (چیک قبول نہیں کیا

جائے گا)، یا بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں - لیسٹ بہت صاف اور صحیح طور پر تیار ہوا ہے -

۱ - نشر القرآن کیسٹ سیریز ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

۲ - شائننگ ٹریڈرز رفیع مینشن بالمقابل آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی ۱

تاثرات جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے - کہ اس "شام الہدیٰ" میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ حضرات کثیر تعداد میں شریک ہوئے تھے - متعدد حضرات نے اپنے تاثرات زبانی بھی بیان کئے اور تحریری طور پر بھی ارسال فرمائے - ایک مقتدر عالم دین کا یہ تاثر بھی معلوم ہوا کہ ان کی رائے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ درس خاص طور پر علمائے کرام کے کسی اجتماع میں بھی ہونا چاہیئے - اس میں جو نکات بیان ہوئے ہیں' ان میں علماء کے لئے رہنمائی کا پہلو بھی موجود ہے - انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے فہم قرآن حکیم پر صرف اطمینان کا اظہار کیا بلکہ خراج تحسین بھی پیش فرمایا - خطوط میں سے صرف کراچی سپریم کورٹ کے ایڈووکیٹ عبدالقادر جسبانی کے انگریزی خط کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے

محترم بریگیڈیر حامد جمیل صاحب!

گذشتہ شام تاج محل ہوٹل کے آڈیٹوریم میں جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درسِ قرآن کے موقع پر آپ کی جانب سے عمدہ انتظامات پر میں آپ کو اور آپ کے معاونین کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں - ڈاکٹر صاحب کا خطاب حد درجہ بصیرت افروز اور اس درجہ جامع تھا کہ مجھے یقین ہے اس خطاب نے ہال میں موجود معاشرے کے مختلف طبقات کے تعلیم یافتہ (INTELLECTUALS) افراد جن میں مرد، عورتیں اور بوڑھے جوان شامل تھے، سب کو بھرپور طور پر متاثر کیا - اس موقع پر خواتین کے لئے جو با پردہ انتظام کیا گیا وہ یقیناً قابل تعریف ہے - اس ضمن میں میرے اہلِ خانہ آپ کے ممنونِ احسان ہیں -

خدا کرے کہ یہ بزم (احبابِ الہدیٰ) اسی طور پر کھلے ذہن اور مجاہدانہ جذبے کیساتھ اپنے مقاصد کے حصول کی کاوش جاری رکھے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ قرآن کی جانب متوجہ ہوں اور قرآن کی زبان اور اس کا مفہوم اپنے صحیح سیاق میں لوگوں کے سامنے آسکے۔

آپ کا خیر خواہ
عبدالقادر جیلانی
(ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان)

بقیہ : علماء کرام کے لئے توجہ طلب مسئلہ

میں تفصیلی یا اجمالی ہدایت موجود ہے۔ اجمالی ہدایت کا مطلب یہ کہ قرآن وحدیث میں ہر شعبۂ زندگی سے متعلق ایسے اصول کلیہ بتمام و کمال موجود ہیں جن کی روشنی میں ہر نئے جزوی مسئلہ کا شرعی حکم معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز اور جائز ہے تو کس درجہ کا اور ناجائز ہے تو کس درجہ کا، لہٰذا مسئلہ زیر بحث کا شرعی حکم جاننے، اور اس کی حیثیت متعین کرنے میں فقہی مواد کے ساتھ اُن اصول و مبادی کا بھی ضرور لحاظ رکھا جائے جو معاشی معاملات کے جواز و عدمِ جواز سے متعلق قرآن و حدیث میں ہیں، اگر فقہی آراء و اقوال میں اختلاف پایا جاتا ہو تو اُس رائے اور قول پر اعتماد کیا جائے جو قرآن وحدیث کے اصول و مقاصد سے واضح مطابقت رکھتا ہو بلکہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ استدلال میں کسی فقہی جزئیے کلیے کو پیش کرنے کی بجائے قرآن و حدیث کی وہ نص پیش کی جائے جس سے وہ جزئیہ کلیہ اخذ کیا گیا ہے تاکہ ذہنوں پر قرآن وحدیث کی عظمت قائم ہو اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کا جذبہ دلوں میں اُبھرے۔ نیز مسلمانوں کے اس بلند بانگ دعوے کا ثبوت فراہم ہو کہ قرآن وحدیث میں حیاتِ انسانی کے ہر مسئلہ کے متعلق ہدایت و روشنی موجود ہے۔

افکار و آراء

اس مستقل عنوان کے تحت شائع ہونیوالے افکار و آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں!!

امیرِ محترم کے خطاب شائع شدہ "میثاق" ستمبر ۸۴ء پر

معاصر ہفت روزہ "چٹان" لاہور میں شائع شدہ "گفتنی گفتنی" کا ایک اقتباس!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہمارے ملک کی معروف شخصیت ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کہنا چاہیئے کہ وہ متنازعہ شخصیت بھی ہیں اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں زندہ اور متحرک دنیا میں ایسا ہونا لازمی امر ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسلامی جمعیت طلبہ کے اسٹیج سے اُبھر کر جماعت اسلامی میں آئے اور نہایت چھوٹی عمر میں جماعت میں اہم مقام حاصل کیا۔ حتیٰ کہ ایک اسٹیج پر اجلاس ماچھی گوٹھ میں ایک بڑے قافلہ کے ساتھ جماعت سے الگ ہوئے۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ اس اجلاس میں سب سے مؤثر مقالہ ڈاکٹر صاحب نے پڑھا جس میں مرکزی قیادت سے اپنے اختلاف کا ذکر کیا۔ جماعت سے علیحدگی کے بعد وہ ایک عرصہ تو اس کوشش میں رہے کہ جماعت سے الگ ہونے والے اکابر و اصاغر کو ساتھ لے کر ایک نئی تنظیم کھڑی کریں[1] لیکن جب اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے مرکزی انجمن خدام القرآن کی بنا ڈالی جس نے کہنا چاہیئے کہ رجوع الی القرآن کی خاصی تحریک پیدا کی اور کوئی بڑا سا اختلاف کرے، اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ درس قرآن وغیرہ کے حوالہ سے ڈاکٹر صاحب نے خاصی تعداد میں لوگوں کو متاثر کیا اور ملک کے مختلف شہروں میں بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بڑے اشتیاق سے ان کے پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے گذشتہ رمضان کے دو جمعوں میں مسجد دارالسلام باغِ جناح (لارنس گارڈن) میں جو خطبے ارشاد فرمائے انہیں کیسٹ سے منتقل کر کے ان کے ماہنامہ "میثاق" کی اشاعت ستمبر ۱۹۸۴ء

---

[1] معاصر محترم کو مغالطہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس امر کے خواہشمند بھی تھے اور کوشاں بھی کہ جماعت اسلامی کے طریق کار اور پالیسی سے اختلاف کے باعث علیحدہ ہونے والے اکابر صحیح خطوط پر کوئی جماعت قائم کریں تاکہ موصوف اس میں بحیثیت ایک کارکن اپنے دینی فرائض بجا لائیں۔ جب قریباً پندرہ سولہ سال تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو پھر ڈاکٹر صاحب نے از خود تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ (مرتب)

ہیں شائع ہوئے ہیں ان خطبات کا عنوان ہے "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات اور ان کے بارے میں علماء کرام کے خدشات" یہ طویل خطاب ڈاکٹر صاحب کے معرکۃ الآراء خطابات میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے برعظیم ہند و پاکستان کے حوالہ سے قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات، اس عنوان سے کام کرنے والی شخصیات، ان کے متعلق علماء کرام کا ردِ عمل اور پھر ان تحریکات و شخصیات کے انجام پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے اس ضمن میں سب سے پہلے سر سید احمد کا ذکر ہے۔

جنہوں نے قرآن عزیز کے ایک حصہ کی تفسیر لکھ کر بعض مسلّمہ حقیقتوں کا انکار کیا تھا، علماء کرام کے ان سے اختلافات انہی وجوہ کی بنا پر تھے جنہیں یار لوگوں نے کئی رنگ دیئے اور علماء کے ذمہ یہ بات لگائی کہ وہ جدید تعلیم کے خلاف ہیں، یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ بعض حضرات کی سر سید احمد خان سے خط و کتابت چھپ گئی اور کچھ گرد و غبار چھٹ گیا پھر یہ بھی خوبی کی بات ہے کہ سر سید احمد خان نے اس عنوان سے کوئی جماعت یا تحریک نہ اٹھائی بلکہ کالج و یونیورسٹی کی تعمیر و ترقی میں لگے رہے اور بالآخر اس کے ایک کونہ میں ابدی نیند سو گئے۔ چند افراد کا ان کے افکار سے متاثر ہونا ایک الگ مسئلہ ہے ان کے بعد اہلِ قرآن کا عنوان قائم کر کے کئی ایک لوگ اٹھے انہوں نے باقاعدہ تحریکیں کھڑی کیں جن میں سے معروف اور مکروہ شکل ہمارے دور کے پرویز صاحب کی ہے جو سول سروس کی ملازمت کرتے کرتے مفسرِ قرآن بن گئے اور ایک مستقل فرقہ کی بنیاد ڈالی۔ اب وہ نبی کریم علیہ السلام کو رسول تو مانتے ہیں مطاع نہیں مانتے اور آپ کے ارشادات کو عجمی سازش سے تعبیر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس خطاب میں ایسی متفرق شخصیات اور ان کی تحریکوں کا ذکر کر کے علمائے حق کے خدشات کو کسی درجہ میں صحیح قرار دیا ہے اور اپنے بارے میں واضح کیا ہے کہ وہ قرآن کے خادم ہیں انہیں علم و فضل کا کوئی دعویٰ نہیں اور یہ کہ وہ علمائے کرام سے کسب و استفادہ اور تعلق اپنے لئے ضروری جانتے ہیں۔ جس کی واضح مثال یہ ہے کہ "قرآن مجید کے مسلمانوں پر حقوق" نامی اپنے رسالہ کا ایک نسخہ مدینہ منورہ میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی خدمت میں اس نقطہ نظر سے پیش کیا۔ کہ حضرت مولانا اسے ملاحظہ فرما کر اگر کوئی چیز قابلِ اصلاح ہے تو اس کی اصلاح کر دیں۔ مولانا نے مسجد نبویؐ میں بحالت اعتکاف اسے پڑھا اور صرف ایک جملہ کی ترمیم فرمائی ڈاکٹر صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا کی اس ترمیم سے وہ جملہ مزید نکھر گیا اور میرا جو مفہوم تھا وہ اور واضح ہو گیا۔

ویسے انجمن خدام القرآن کے محاضرات میں سال بہ سال ہندوستان اور پاکستان کے جید علماء کرام کو بلانا بھی ان کی عادت ہے اور اپنے دعوتی افکار میں مختلف شہروں کے اہلِ علم کے پاس وقت نکال کر جانا بھی ہمیں معلوم ہوا ہے

یہ روایات بہر حال اچھی ہیں اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اس طرح ان کا ایک گونہ تعلق علماءِ حق

ہے رہے گا اور علمائے کرام سے بھی درخواست ہے کہ وہ کوئی نقص یا کمی محسوس فرمائیں تو صاحب واقعہ سے رابطہ کر کے بات صاف کرنے کی کوشش کریں کہ اصل دین یہی ہے، محض سنی سنائی باتوں پر بدگمانی صحیح نہیں اللہ تعالیٰ خدام القرآن، وہ جہاں بھی ہوں، انہیں اپنی تائید و نصرت سے نوازے!

ماہنامہ میثاق اگست ۱۹۸۴ء کے شمارے پر ہفت روزہ

تنظیم اہلحدیث لاہور کا تبصرہ

جناب غلام احمد پرویز نے قرآن مجید کے نام پر ایک تحریک چلائی ہے۔ لیکن موصوف نے قرآن کے نام پر حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جھٹکا کرنے کا عمل بھی جاری رکھا ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب موصوف نے بھی اپنی تنظیم کا ہدف "قرآن حمید اور اس کی تعلیمات" کی اشاعت کو بنایا ہے۔ لیکن وہاں سے احادیث کو اٹھا نہیں دیا۔ ہاں تدبر قرآن کے مؤلف کے چرکوں کا سلسلہ کچھ عرصہ سے جاری ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر موصوف کو ان کی خراشوں سے محفوظ رکھے۔ حالیہ شمارہ میں سرسید، پرویز، مرزا اور مولانا اصلاحی صاحب وغیرہ کا تجزیہ بھی کیا ہے جو ہمارے لئے حوصلہ افزا ہے۔

"میثاق" کے حالیہ دونوں شماروں میں ڈاکٹر موصوف کا ایک مقالہ "جہاد بالقرآن" شائع کیا گیا ہے جو نہایت اہم، معلوماتی اور بصیرت افروز ہے۔ یہ مقالہ انہوں نے انجمن خدام القرآن لاہور کے چھٹے سالانہ محاضرات قرآنی کے افتتاحی اجلاس میں ۲۵ مارچ کو پڑھا تھا جس کی صدارت علامہ سعید احمد اکبر آبادی زادہ اللہ تشریفاً و تکریماً نے کی تھی۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے ٹیلیویژن کے دروس بھی شائع ہو رہے ہیں جو خاصے اہم ہیں اور ان سے حالات اور وقت کے مناسب راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے خدمت قرآن کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کو حدیث پاک سے آزاد نہیں رکھا اور قرآن کی جو تفسیر پیش فرما رہے ہیں، ان کی تفصیلی کڑیاں ہیں، اگر کچھ جھول محسوس ہوتا بھی ہے تو وہ موصوف کی باتوں کی جزوی حیثیت ہے۔ ایسا اختلاف اہل علم کے علمی سفر میں آ ہی جاتا ہے۔

ماہنامہ میثاق کا مطالعہ قرآن حمید کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اور احادیث پاک کی تعبیر اور توجیہہ کے لئے ایک نیا اسلوب بیان مہیا کرتا ہے۔ جو فی الحال قابل برداشت ہے۔ بالخصوص عصر حاضر کے مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے لئے ایک سلیقہ پیش کرتا ہے، جس کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔ لیکن موصوف خاصے فطین اور ذہین ہیں اور نہایت برق رفتاری سے دوڑ رہے ہیں۔ اس لئے علمائے حق کو ان پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اب تک بیشتر ذہین

اور شوخ ذہنوں کا انجام بالآخر خلاف توقع برآمد ہوا ہے۔ اگر وقت پر ان کا احتساب جاری رہا تو امید ہے کہ یہ اکسیر اکسیر ثابت ہوگی۔ انشاءاللہ تعالیٰ!

محترم مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی دیوبند (بھارت) کے ایک حالیہ مکتوب کا ایک اقتباس

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس زمانے میں ہندوستان آئے جب کہ میں خود پاکستان میں تھا۔ (مراد ہے ڈاکٹر صاحب کا حیدر آباد دکن، دہلی اور علی گڑھ کا اپریل ۸۴ء کا دورہ) دہلی سے ڈاکٹر صاحب کا ورود مسعود علی گڑھ میں بھی ہوا اور جیسا کہ مجھ کو علی گڑھ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی صحبت و خطابت سے علی گڑھ کے لوگ کافی محظوظ ہوئے۔ فجزاہ اللہ۔ خدام القرآن کے جلسہ میں میں نے جو تقریر مولانا ابو الکلام آزاد پر کی تھی وہ "حکمت قرآن" میں چھاپ دی گئی ہے۔ علی گڑھ میں اسے کئی ارباب علم نے پڑھا اور پسند کیا۔ آج کل جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو بعض حضرات کی طرف سے مخالفت کا سامنا درپیش ہے۔ لیکن ہر وہ شخص جب کوئی تحریک شروع کرتا ہے۔ ابتداءً اسے ان حالات سے گزرنا ناگزیر ہے۔ وفقنا اللہ جمیعاً لما یحب ویرضیٰ۔ والسلام! ●●●

رفتارِ کار

امیر تنظیم اسلامی کا دورۂ پشاور

امیرِ محترم اپنے حالیہ دورۂ پشاور کے سلسلے میں نو اکتوبر کو رات نو بجے پشاور پہنچے تو ہوائی اڈے پر رفقاء کے علاوہ ان کے پشاور میں میزبان حاجی عبدالرشید صاحب بھی استقبال کے لئے موجود تھے۔

اس دورے میں امیرِ محترم کے ہمراہ نائب امیر تنظیمِ اسلامی جناب قمر سعید قریشی صاحب بھی تھے۔

امیرِ محترم کا قیام اس مرتبہ بھی حسبِ سابق حاجی عبدالرشید صاحب کے ہاں تھا۔ امیرِ محترم کے اس دورے کی تشہیر کے سلسلے میں مقامی تنظیم نے بھرپور کوشش کی اخبارات میں خبریں شائع کروائی گئیں جبکہ شہر اور یونیورسٹی کے نمایاں مقامات پر پوسٹرز اور بینرز بھی لگائے گئے تھے۔

مزید برآں حاجی عبدالرشید صاحب نے دو مقامی اخبارات میں باقاعدہ اشتہارات بھی شائع کروائے۔

امیرِ محترم کی پشاور میں آمد کے دوسرے دن یعنی دس اکتوبر کو دو اجتماعات خصوصی برائے رفقاء منعقد ہوئے۔ جس میں تقریباً تمام رفقاء نے شرکت کی۔

یہ اجتماعات صبح نو بجے اور پھر بعد از نمازِ ظہر دو بجے منعقد ہوئے جن میں قمر سعید قریشی صاحب نے رفقاء کو تنظیمی امور کے بارے میں ہدایات دیں اور معمولی ردّ و بدل کے بعد مقامی تنظیم کو چار اُسروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ امیرِ محترم کے حالیہ درس کا موضوع "جہاد بالقرآن" تھا جبکہ اس سلسلے میں اجتماع کا انتظام ایک مقامی ہوٹل کے ہال میں کیا گیا تھا۔

امیرِ محترم کے درس کے لئے بعد از نمازِ مغرب کا وقت طے پایا تھا لیکن عین موقع پر بجلی کے چلے جانے کی وجہ سے درس کچھ تاخیر سے شروع ہوا۔

امیرِ محترم نے اپنے درس کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت نمبر ۵۲ کی تلاوت سے کیا اور جیسا کہ اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حکم دیا کہ " اے نبیؐ ان کافروں کا کہا ہرگز نہ مانیئے اور ان کے ساتھ مجاہدہ کیجیے ، کشمکش کیجیے۔ اس قرآن کے ذریعے سخت مجاہدہ اور شدید کشمکش" امیرِ محترم نے اسی کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ چند اسلامی اصطلاحات آج کل کے اسلامی معاشرے میں اس طرح گڈمڈ ہو گئیں ہیں کہ سب سے پہلے ان کی وضاحت انتہائی توجہ طلب ہے اس ضمن میں لفظ جہاد انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس لفظ کے بارے میں عوام الناس اور اہلِ علم دونوں کے ذہنوں میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جس کی خاص وجوہات مسلمانوں کا مغربی استعمار کے براہِ راست غلامی میں آنا اور پھر آج کل مغرب کا اسلام کے خلاف انتہائی مؤثر پروپیگنڈا اور مسلمانوں کی ذہنی اور فکری غلامی ہیں۔

امیرِ محترم نے لفظ جہاد کی تشریح میں فرمایا کہ ماضیٔ قریب میں جب مسلمان براہِ راست محکوم تھے نہ صرف سیاسی بلکہ ذہنی اور فکری اعتبار سے بھی تو اس وقت اہلِ مغرب کی طرف سے ہم پر جہاد کے حوالے سے بڑے جارحانہ حملے ہوئے اور کہا گیا کہ

بوسئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانے سے

چنانچہ ہم نے اس کے جواب میں بہت معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا۔
دوسری بات یہ کہ ذہنوں میں یہ مغالطہ بٹھایا گیا کہ جہاد کے معنی "جنگ" ہیں اس میں اغیار اور اپنوں کی مشترکہ کارستانیاں شاملِ کار رہیں جبکہ قرآن دو مستقل اصطلاحات استعمال کر رہا ہے یعنی "جہاد فی سبیل اللہ" اور قتال فی سبیل اللہ لہٰذا عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ جہاد کے معنی ہیں جنگ۔ تیسری بات یہ کہ ظاہر ہے کہ جنگ ہر وقت اور ہمیشہ تو نہیں ہوتی لہٰذا جہاد فرضِ کفایہ رہ گیا اور فرضِ عین کی فہرست سے خارج ہو گیا۔
چوتھی بات یہ کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے گا گویا وہ جہاد فی سبیل اللہ کر رہا ہے۔ حالانکہ ایک مسلمان ذاتی حیثیت میں جہاں فاجر و فاسق ہو سکتا ہے۔ وہاں ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ کوئی حکمران جو فاجر و فاسق اور ظالم ہو وہ ناحق جنگ بھی کر سکتا ہے جس میں اس کا مقصد اپنی سلطنت کی توسیع اور اقتدار کی پائیداری ہو اور دین کی کوئی خدمت پیشِ نظر نہ ہو تو ایسی جنگ کبھی بھی جہاد نہیں کہلا سکتی۔
مندرجہ بالا وضاحتوں کے بعد امیرِ محترم نے فرمایا کہ جہاد کی دو بنیادی منازل کے بارے میں آج میں وضاحت کروں گا جبکہ بقیہ بات ان شاء اللہ آئندہ کبھی بیان کی جائے گی۔

امیرِ محترم نے فرمایا کہ پہلی منزل ہے خود اللہ کا بندہ بننا اور یہ بندگی ہمہ وقت ہمہ وجوہ اور ہمہ تن ہوگی۔ یہ جُزوی نہیں ہوگی اور اس کے لئے دین میں چار اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں پہلی اسلام یعنی سرِ تسلیم خم کرنا دوسری اطاعت یعنی مقاومت و مدافعت ترک کر کے برضا و خوشی فرمانبرداری قبول کر لینا۔ تیسری تقویٰ اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا۔ اس کی نافرمانی سے باز رہنا۔ اطاعت و تقویٰ میں مثبت و منفی رویّہ سامنے آتا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

چوتھی اور آخری جامع ترین اصطلاح ہے عبادت۔ اس میں اسلام، اطاعت اور تقویٰ کے تمام مفاہیم آگئے
ان اصطلاحات کی وضاحت کے بعد امیرِ محترم نے فرمایا کہ اس پہلی منزل پر کشمکش کرنی ہوگی اپنے نفس کے خلاف اور اسے ہی حضورؐ نے افضل الجہاد قرار دیا ہے۔ دوسری منزل ہے اس دین کو عام کرنا یعنی لوگوں تک پہنچانا۔ اسے پھیلانا اس منزل کے لئے جامع ترین اصطلاح ہے شہادۃ علی الناس۔ یعنی لوگوں پر حق کی گواہی دینا۔
امیرِ محترم نے فرمایا کہ یہ دونوں منازل طے کی جائیں گی۔ قرآن کی مدد سے اسی کے سہارے۔ کیونکہ قرآن ہی وہ مؤثر اور کارگر ہتھیار ہے جس سے نفسِ امّارہ کو کچلا جا سکتا ہے اور قرآن ہی وہ فطری اور حقیقی دلائل پیش کرتا ہے جس سے آپ لوگوں پر شہادۃ علی الناس کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں قرآن ہی کی مدد سے اپنے نفس اور باطل نظریات کے خلاف ایک بڑا جہاد کرنا ہوگا۔
امیرِ محترم کا یہ خطاب سننے کے لئے کم و بیش سات سو افراد موجود تھے جنہوں نے بڑی توجہ سے امیرِ محترم کا یہ درس سُنا۔
درس کے خاتمے پر تمام شرکاء نے امیرِ محترم کی اقتداء میں نماز باجماعت ادا کی۔
دوسرے روز نو بجے سوال و جواب کی نشست ہوئی جس میں تقریباً ۲۰۰ لوگوں نے شرکت کی اور مختلف نوعیت کے

سوال پوچھے جن کے تسلی بخش جوابات دیئے گئے۔

آخر میں چھ افراد نے امیرِ محترم کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور اس طرح پشاور میں رفقاء کی تعداد ۳۸ ہوگئی۔ نئے رفقاء کو امیرِ محترم نے چند ضروری امور کے بارے میں ہدایات دیں۔

سہ پہر چار بجے قمر سعید صاحب قریشی ایبٹ آباد کے لئے روانہ ہوگئے جبکہ امیرِ محترم پانچ بجے پشاور سے لاہور کے لئے روانہ ہوئے اور اس طرح امیرِ محترم کا یہ دورہ بفضلہ تعالیٰ اختتام کو پہنچا۔

تحریر کردہ ——— راجہ سردار احمد، قیم تنظیم اسلامی پشاور

امیرِ تنظیمِ اسلامی کا دورۂ سوات و دیر

امیرِ محترم ماہ ستمبر میں طے شدہ پروگرام کے مطابق بوجہ اچانک علالت مالاکنڈ ڈویژن کا مجوزہ دورہ نہ کر سکے۔ تاہم سوات اور دیر سے مسلسل دعوت آنے کی وجہ سے معمولی حالت سنبھلنے پر امیرِ محترم نے ان علاقوں کیلئے دورہ کا قصد فرمایا۔ حالانکہ ڈاکٹروں کی ہدایت کی رو سے انہیں سڑک کے ذریعے طویل سفر کی اجازت نہ تھی۔ تاہم جس طرح دعوتِ دین کا جذبہ انہیں شہر شہر اور دیس دیس لئے پھرتا ہے اسی کے تحت ۱۴ اکتوبر بروز اتوار وہ بذریعہ ہوائی جہاز تقریباً ۲ بجے منگورہ پہنچے۔

منگورہ کے ایک متمول تاجر جناب عبدالباری صاحب کا کافی عرصہ سے تقاضا تھا کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد اہالیانِ منگورہ کو اپنی دعوت سے متعارف کروانے کے لئے وہاں تشریف لائیں۔ پہلے ۱۰ اور ۱۱ ستمبر کو دورۂ منگورہ کا پروگرام طے ہوا تھا لیکن اس دورہ سے چند روز قبل جبکہ جناب عبدالباری صاحب اس پروگرام کی بھرپور تشہیر کر چکے تھے محترم ڈاکٹر صاحب کی اچانک شدید علالت کے باعث یہ دورہ منسوخ کرنا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب محترم کو اہالیانِ منگورہ کے جذبات کا شدت سے احساس تھا۔ چنانچہ جیسے ہی طبیعت قدرے بحال ہوئی آپ نے دورۂ منگورہ کے لئے ۱۴ اور ۱۵ اکتوبر کی تاریخیں متعین فرما دیں۔

راقم الحروف کا جناب عبدالباری صاحب سے غالباً ۱۹۸۲ میں اس وقت تعارف ہوا جب انہوں نے محترم ڈاکٹر صاحب کی تالیف "تحریک جماعتِ اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ" بذریعہ خط طلب فرمائی۔ اس کے بعد موصوف لاہور آنے پر قرآن اکیڈمی بھی تشریف لائے۔ اور اس طرح ملاقات ہوئی جیسے ہم دونوں برسوں سے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ دراصل مقصد کا اشتراک مادی فاصلوں کو ختم کرکے ذہنی اور قلبی قربت پیدا کر دیتا ہے۔

راقم اسی دورہ روزہ پروگرام کے انتظامات کا جائزہ لینے کے سلسلے میں ایک روز قبل ہی یعنی ۱۳ اکتوبر کو منگورہ پہنچ گیا۔ الحمدللہ جناب عبدالباری صاحب نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے تمام انتظامات مکمل کر لئے تھے۔ تاہم موصوف مجھے ساتھ لے کر اپنے مختلف ساتھیوں سے ملاقات کے لئے گئے اور انتظامات کو دوبارہ جانچ لیا گیا۔ شام کو جناب عبدالباری صاحب کے مکان پر ان کے احباب ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ راقم نے انہیں محترم ڈاکٹر صاحب کی کتب اور کیسٹس سے متعارف کروایا چنانچہ کتابوں کے چار مکمل سیٹ اور کچھ کیسٹس ان حضرات نے خرید لئے۔

اگلے روز بعد دوپہر سوا دو بجے امیرِ تنظیمِ اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو بذریعہ ہوائی جہاز منگورہ پہنچنا تھا چنانچہ راقم عبدالباری صاحب اور دیگر معززینِ شہر چار پانچ گاڑیوں میں ڈاکٹر صاحب کے استقبال کے لئے سیدو شریف ائیرپورٹ پہنچے۔ اس دن وادیِ سوات کا موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ نیلگوں آسمان پر کہیں بادل نظر نہیں آ رہے تھے فضا بھی بہت صاف ستھری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے امیرِ تنظیمِ اسلامی کے استقبال کے لئے فضا کو خاص طور پر صاف کیا گیا ہو۔ ٹھیک سوا دو بجے پی آئی اے کا فوکر طیارہ سیدو شریف ائیرپورٹ پر اترا۔ استقبال کرنے والوں کی نگاہیں جہاز کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی محترم ڈاکٹر صاحب دروازے پر نمودار ہوئے استقبال کیلئے آنے والوں کے چہرے خوشی سے تمتما اُٹھے۔ سینیئر نائب امیر محترم قمر سعید قریشی صاحب بھی ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف جیسے ہی ائیرپورٹ لاؤنج میں داخل ہوئے معززینِ شہر نے انتہائی گرم جوشی کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ امیرِ تنظیمِ اسلامی سوات کے لوگوں تک دین کی انقلابی دعوت پہنچانے کے لئے تشریف لائے تھے۔

ائیرپورٹ سے سیدھے جناب عبدالباری صاحب کے مکان پر پہنچے۔ جہاں موصوف نے استقبال کے لئے جانے والے تمام حضرات کے لئے کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا۔ پھر بعد نمازِ عصر پروگرام کے مطابق جناب عبدالباری صاحب کے مکان پر ہی عام ملاقات کی نشست ہوئی جو نمازِ مغرب تک جاری رہی۔ دور دور سے آنے والے بہت سے حضرات نے مختلف موضوعات پر سوالات کئے۔ محترم امیرِ تنظیم نے انتہائی سکون کے ساتھ تمام سوالات کے جواب دیئے۔ نمازِ مغرب کے بعد بھی مختلف حضرات ملاقات کے لئے تشریف لاتے رہے۔ اس نشست میں مردان سے علماءِ اسلام ضلع مردان کے سیکرٹری ڈاکٹر غلام قادر صاحب، دارالعلوم اسلامیہ سیدو شریف کے نائب صدر مدرس مولانا کفایت اللہ صاحب اور دیگر معززینِ شہر نے شرکت کی۔ قصبہ بُنیر سے بھی ایک صاحب نے اس نشست میں شرکت کی اور ڈاکٹر صاحب کو بنیر آنے کی دعوت دی۔

پروگرام کے مطابق بعد نمازِ عشاء جامع مسجد شیر زادہ خان (مرحوم) میں فریضہ اقامتِ دین اور اس کے لوازم کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے خطاب فرمایا جو سوا دو گھنٹے تک جاری رہا۔ مسجد اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تنگیِ داماں کا سماں پیش کر رہی تھی۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں ہوگا کہ نہ صرف مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی بلکہ دونوں اطراف کی گلیاں اور مین سڑک میں لوگوں کا جمِ غفیر ڈاکٹر صاحب موصوف کی تقریر سننے کے لئے موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے خطاب سے قبل جناب حبیب الرحمٰن صاحب (ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر مالاکنڈ) نے پشتو زبان میں اپنے افتتاحی کلمات کا آغاز علامہ مرحوم کے ان اشعار سے کیا۔

وہ سحر جو کبھی فردا ہے اور کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود!
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کے مشن کا مختصر تعارف کر دیا ۔ ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے اختتام پر مولانا کفایت اللہ صاحب نائب صدر مدرس دار العلوم اسلامیہ سیدو شریف نے دعا سے قبل ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر کو ایک تاریخی تقریر قرار دیا اور دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو ان کے مشن میں کامیاب فرمائے ۔ انہوں نے بعد میں ایک ملاقات میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین بھی دلایا ۔ اگلے روز صبح ۹ بجے عبد الباری صاحب کے مکان کے پاس مسجد دعوتِ اسلام میں سوال و جواب کی نشست ہوئی جس میں کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوئے ۔ ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے تمام سوالات کے جواب دیئے ۔ پشاور کے روزنامہ جدت کا مقامی نمائندہ بھی اس نشست میں شریک تھا ۔ اس نے بھی بہت سے سوالات کئے اور جواب حاصل کئے ۔

اس نشست سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب موصوف بار ایسوسی ایشن میں خطاب کے لئے تشریف لے گئے ۔ ایسوسی ایشن کے نمائندوں نے ڈاکٹر صاحب کے گلے میں ہار ڈال کر استقبال کیا ۔ ہال وکلاء سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ محترم امیرِ تنظیم نے " اسلام اور پاکستان " کے موضوع پر تقریباً سوا گھنٹہ خطاب فرمایا ۔ اور اس کے بعد وکلاء کو سوالات کرنے کا موقع دیا گیا ۔ بہت سے وکلاء نے موضوع سے متعلق سوالات کئے جن کے ڈاکٹر صاحب نے بہت ہی مدلّل جواب دیئے ۔ اس نشست کے بعد بار ایسوسی ایشن والوں کی طرف سے پُر تکلف چائے پیش کی گئی ۔ ڈاکٹر صاحب محترم یہاں سے فارغ ہونے کے بعد واپس عبد الباری کے مکان پر تشریف لائے ۔ دوپہر کا وقت ہو چکا تھا ۔ نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب دیر، باجوڑ اور تمرگرہ کے دورہ کے لئے روانہ ہوئے اور جناب عبد الباری صاحب کے ہمراہ ان کی گاڑی میں دیر تشریف لے گئے ۔ (مرتبہ : عبد الرزاق نائب امیر لاہور) ۔

دیر : منگورہ سوات سے ۱۵ اکتوبر بروز پیر تقریباً ۲ بجے بعد از دوپہر امیر محترم ہمارے میزبان جناب حاجی عبد الباری صاحب کی معیت میں دیر کے لئے براستہ چک درہ روانہ ہوئے ۔ منگورہ اور دیر کا درمیانی فاصلہ کوئی ۱۵۲ کلو میٹر کے لگ بھگ ہے ۔ جناب عبد الباری صاحب منگورہ کی ایک معروف شخصیت ہیں اور دینی کاموں کے جذبے سے سرشار ہیں ۔ ان کی صبح شام سے یہ بالکل مترشح ہے کہ وہ اقامتِ دین کے لئے ایک درد اور آرزو دل میں لئے ہوئے رو بہ عمل ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر محترم کے دورۂ سوات کی کامیابی میں جناب عبد الباری صاحب کے خلوص کا بڑا عمل دخل تھا ۔ تمرگرہ سے ہوتے ہوئے ہم نے ضلع دیر کے ایک وسطی گاؤں رزاگرام میں دریائے پنجکوڑہ کے کنارے امیرِ محترم کی امامت میں نمازِ عصر ادا کی ۔ اگرچہ سفر قدرے سخت اور لمبا تھا تاہم امیرِ محترم اور ان کے رفقاء وادیٔ دیر کے مخصوص جغرافیائی حالات اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہے ۔ اس سفر میں راقم کے علاوہ جناب عبد الباری صاحب، ان کے ایک ساتھی المعروف " جاجا " اور جناب قمر سعید قریشی امیرِ محترم کے ہمراہ تھے ۔ ہمارے دو رفقاء جناب سردار احمد اور انجم صاحب ایک دوسری گاڑی میں پہلے ہی سے مکتبہ کے ساتھ دیر روانہ ہو چکے تھے ۔ دیر سے تقریباً ۵ اکلو میٹر نیچے میری کے مقام پر لبِ سڑک واقع مسجد میں نمازِ مغرب ادا کی اور پھر دیر کے لئے روانہ ہو گئے ۔ شام ساڑھے چھ بجے دیر گاؤں پہنچ گئے ۔ جب ہماری گاڑی ہمارے میزبان جناب حاجی طوطی الرحمٰن اور حاجی حبیب الرحمٰن صاحب کے حجرہ میں داخل ہو گئی تو اراکین انتظامی کمیٹی جو عصر ہی سے

منتظر تھے دیوانہ وار امیرِ محترم کی جانب لپکے۔ یہاں یہ ذکر کرتا جاؤں کہ دیر کے لئے امیرِ محترم کے لئے دعوت کافی پہلے سے تھی اور اس میں چند نوجوان بہت آگے تھے۔ چنانچہ انہیں میں سے امیرِ محترم کے دورہ کے تمام انتظامات کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنوائی گئی تھی۔ انہی نوجوانوں نے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ اس کمیٹی میں شامل حضرات نے نہایت خلوص کے ساتھ دن رات کام کیا اور پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرایا۔ گاڑی سے اترتے ہوئے کمیٹی کے سب سے فعال رکن جناب محمد افضل خان صاحب مدینہ کلاتھ ہاؤس والے آگے بڑھے اور محترم ڈاکٹر صاحب کیساتھ معانقہ کیا۔ اسی طرح تمام حضرات بغلگیر ہوتے رہے۔ ان احباب میں جناب شیر بہادر خان صاحب، جناب سید علی شاہ صاحب، جناب شریف احمد صاحب، جناب مصباح الدین صاحب، جناب سعید الرحمٰن صاحب (خلف میزبان جناب حاجی حبیب الرحمٰن صاحب) اور دیگر حضرات شامل تھے۔ جب ہم حجرہ کی سیڑھیوں پر چڑھے تو دیر کے شرفاء کا ایک جم غفیر بر آمدے میں چشم براہ پایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارے میزبان صاحبان جناب حاجی طوطی الرحمٰن اور حاجی حبیب الرحمٰن صاحب نے ان حضرات کو امیرِ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی قدر افزائی کی خاطر کھانے پر مدعو کیا تھا۔ یہاں یہ بتا تا چلوں کہ جناب حاجی طوطی الرحمٰن اور ان کے خاندان کے دیگر بھائی بند دیر کے اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ یہی گھرانہ خدائی کاموں میں ہمیشہ آگے رہنے والوں میں نمایاں رہتا ہے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر صاحب کے لئے دیر کا پروگرام طے ہو رہا تھا تو جناب حاجی طوطی الرحمٰن صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی جناب حاجی حبیب الرحمٰن صاحب نے نہایت پر خلوص طریق پر معزز مہمان کے قیام کے لئے کہا تھا۔ یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ امیرِ محترم کی یہ عزت افزائی دعوت رجوع الی القرآن کے ناطے سے ہوئی۔ اس موقع پر حاجی صاحب موصوف کے خاندان کے نوجوان جن میں ان کے لڑکے، بھتیجے، بھانجے اور دوسرے رشتہ دار شامل تھے نہایت مستعدی کے ساتھ مہمانوں کی خاطر و تواضع کے لئے کام کرتے رہے۔ اس سے اس بات کی عکاسی ہو رہی تھی کہ یہاں پر قرآن کریم کے ناطے جہاد بالقرآن کے علمبردار کے لئے دلوں میں کس قدر جذبات تھے۔ آج یہ بات بالکل واضح طور پر جھلک رہی تھی کہ اہالیانِ دیر کے دلوں میں اللہ کی کتاب اور اس کے دین کی کتنی قدر و منزلت ہے۔ اے کاش اس جذبہ کو صحیح طور پر خدمتِ دین کے لئے استعمال کیا جاتا۔

امیرِ محترم حجرہ کے ہال میں دیگر مدعوئین کے ساتھ تشریف فرما ہوئے۔ اور ضلع دیر و چترال اور آس پاس کے علاقوں کے رسم و رواج، مختلف موسمی حالات، معاشی اور معاشرتی عنوانات پر بحث مباحثہ ہو رہا تھا۔ اس مجلس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے حضرات موجود تھے۔ صاحبزادگان صاحبان ریحان کوٹ کے گھرانوں کے بھی چند ایک معززین حاضر تھے جن میں نمایاں جناب صاحبزادہ جان عالم صاحب اور جناب صاحبزادہ قطب عالم صاحب تھے۔ لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے بجلی چلے جانے کے پیشِ نظر حجرہ میں پہلے ہی سے موم بتیوں اور لالٹینوں سے متبادل انتظام کیا گیا تھا نماز اور کھانے سے فراغت کے بعد کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس مجلس میں معززین دیر کے علاوہ کچھ سرکاری افسر بھی مدعو تھے یعنی ای اے سی صاحب اور تحصیلدار صاحب دیر بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اساتذہ کرام پروفیسر صاحبان اور دوسرے محکموں کے حضرات بھی تھے مجلس برخاست ہونے کے بعد امیرِ محترم آرام کرنے چلے گئے وہ دن بھر کے کافی تھکے ہوئے تھے۔

اگلی صبح یعنی ۱۶ اکتوبر بروز منگل صبح نماز اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد چند حضرات تشریف لائے مختلف قسم کے سوالات وجوابات پر مبنی ایک تعارفی نشست ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک منعقد ہوئی۔ تعارفی نشست میں زیادہ حضرات نہیں آئے کیوں کہ نظر ثانی شدہ پروگرام کے سلسلے میں جو پوسٹر لگوائے گئے تھے ان میں اس نشست کا غلطی سے تذکرہ نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم محفل گرم رہی۔ جو چند حضرات حاضر ہوئے تھے ان میں جناب حاجی کبل صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ حاجی صاحب تبلیغی جماعت کے ایک سرگرم کارکن ہیں۔ دیر میں سپئیر پارٹس کا کاروبار کرتے ہیں۔ اور تبلیغی دوروں میں کافی وقت گذارتے ہیں۔ امیرِ محترم کے تمام مجالس میں حاجی صاحب موصوف حاضر رہے۔ اس مجلس میں چند ایک دوسرے نوجوان بھی موجود تھے۔ جنہوں نے کافی پُر مزاح مباحثہ چھیڑا امیرِ محترم موقع کی مناسبت سے نہایت تبسم اور خندہ پیشانی کے ساتھ جوابات دے رہے تھے۔ اور ساتھ ہی نہایت حکیمانہ طریقے سے ایک صاحب کو (جو بہت زیادہ ذمہ داری دینی کام کرنے والوں پر ڈال رہے تھے)۔ فرمایا کہ "کیوں نہ آپ ہی خود کھڑے ہو کر دعوت الی اللہ اور اقامتِ دین کے لئے کام کرنے کا تہیہ کریں" اور اس کے لئے جو بنیادی ضروری تیاری ہے وہ کرلیں"۔ یقیناً وہ نوجوان اور مجلس میں دوسرے حضرات ایک سنجیدہ سوچ میں پڑ گئے۔ کیوں کہ اس ذمہ داری سے تو کوئی بھی مسلمان مبرا نہیں۔ امیرِ محترم نے ان کے ساتھ نہایت خوبصورتی کے ساتھ بات کی۔ ہم ان کے ممنون ہیں کہ انہوں نے آکر معزز مہمان کی عزت افزائی کی۔ تقریباً ۱۲ بجے ہم جناب سید علی شاہ صاحب کے دولتخانہ پر امیرِ محترم کی معیت میں دوپہر کے کھانے پر چلے گئے۔ انہوں نے نہایت پرخلوص دعوت کی تھی۔ اس موقع پر دیر کے بعض معززین بھی مدعو کئے تھے۔ اس دعوت میں بھی چند سرکاری اہل کار اور اساتذہ کرام موجود تھے۔ کھانے سے پہلے حاضرین مختلف قسم کے سوالات پوچھتے رہے۔ امیرِ محترم ہر ایک سوال کا نہایت تسلی بخش جواب دے رہے تھے

پروگرام کے مطابق بعد از نماز ظہر جامع مسجد دیر بازار میں امیرِ محترم نے خطاب کرنا تھا۔ اپنے میزبان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ہم مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ نماز کے بعد خطاب شروع کرتے ہوئے امیرِ محترم نے سورۃ صف کی آیات اور چار احادیث نبویؐ کی روشنی میں اقامتِ دین کے موضوع پر پونے دو گھنٹہ ایک ایمان افروز خطاب فرمایا۔ مجمع کافی بڑا تھا۔ اور خوشی کی بات یہ تھی کہ تعلیمیافتہ حضرات پوری تعداد میں خوب دلچسپی کے ساتھ حاضر تھے۔ ان میں علماء کرام، پروفیسر صاحبان، اساتذہ کرام، سرکاری اہل کار، طالب علم اور عام لکھے پڑھے حضرات شامل تھے۔ تقریر نہایت انہماک اور توجہ سے سُنی گئی اس دوران کئی ایک حضرات کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ غالباً دیر کی تاریخ میں پہلی دفعہ قرآن حکیم کے اصل تقاضوں کو اُجاگر کیا جا رہا تھا۔ امیرِ محترم نے قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ کی رُو سے امتِ مسلمہ کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہوئے اسلامی انقلاب کے لئے محمدی طریقۂ کار پر سیر حاصل بحث کی۔ انہوں نے فرمایا کہ نام کی مسلمانی اور نام کا اسلام کچھ بھی کام کے نہ ہوں گے۔ بلکہ اگر ہم حقیقتاً اس دنیا میں امن اور آخرت میں نجات چاہتے ہیں تو اس کے لئے اللہ کا نظام، اس کے محبوبؐ کے انقلابی طریقہ سے پہلے خود اپنے اوپر اور پھر دنیا پر نافذ کرنے کے لئے جدوجہد کرنی ہوگی۔ تاکہ عبادتِ رب، شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے تقاضے پورے ہوجائیں۔ انہوں نے واضح الفاظ میں قرآن اور سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلامی نظامِ حیات کے نفاذ کا صحیح راستہ صرف اور صرف طریقۂ محمدی ہی ہے۔ باقی تمام طریقوں سے اسلامی

انقلاب برپا کرنا یا اس کے لئے کوشش کرنا دیوانے کے خواب سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ امیرِ محترم نے اپنے خطاب کے دوران حاضرین پینڈورہ دیا کو دینی تحریکوں اور دین کے لئے کام کرنے والوں کے دوران باہم ضدا ضدی " بَغْيًا بَيْنَهُمْ " اور تفرقہ بازی ہلاکت کا باعث ہوگا۔ انہوں نے نہایت زوردار الفاظ میں خبردار کیا کہ دین کے لئے کام کرنے والے خواہ کسی بھی تحریک سے وابستہ ہوں انہیں ایک دوسرے کے لئے پشت پناہ اور ممد و معاون ہونا ضروری ہے نہ کہ ایک دوسرے کو کمزور کرنا۔ انہوں نے واضح طور سے فرمایا کہ ایسی صورت حال میں فائدہ صرف باطل اور باطل نظریات کے حامل گروہوں کو پہنچے گا جس کے لئے اللہ کے ہاں سخت بازپرس ہوگی۔ انہوں نے اس حدیث شریف کی طرف بھی توجہ دلائی "والله لا يؤمن والله لا يؤمن والله لا يؤمن قيل من يا رسول الله قال الذى لا يأمن جاره بوائقه" خطاب تقریباً ساڑھے تین بجے ختم ہوا۔

نمازِ عصر کے سے وقفہ کے دوران امیرِ محترم چند عمائدین دیر جناب حاجی صاحب خیر محمد کے گھر تشریف لے گئے جہاں حاجی صاحب موصوف نے چائے کی دعوت دی تھی۔ حاجی صاحب خیر محمد کی مہمان نوازی تو معروف و مشہور ہے ہی مگر انہوں نے امیرِ محترم کی عزت افزائی جس طریقہ سے کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں پھر وہی حقیقت جھلکتی رہی کہ فرزندانِ دیر دین اور اسلام کی خدمت کرنے والوں کی کتنی عزت افزائی اور قدر کرتے ہیں۔ جیسا کہ دعوت رجوع الی القرآن کے علمبردار جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی پذیرائی واضح تھی۔ کاش دیر میں ایسے درد رکھنے والے مسلمان اٹھیں کہ ان عوام کو تفرقہ اور باہم ضدا ضدی سے بچا کر اللہ کے دین کے لئے صحیح راہ پر صحیح طریقہ سے کام کرنے کی رہنمائی کریں۔ چائے کے دوران حاجی صاحب کے لڑکے نواسے اور دیگر نوجوان مہمانوں کی خدمت کے لئے نہایت ذوق کے ساتھ کمربستہ کھڑے تھے۔ عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ حاجی صاحب سے رخصت ہو کر مسجد پہنچے۔ نماز کے بعد سوال وجواب کی نشست شروع ہوگئی۔ لوگوں نے کافی اچھے اچھے سوالات پوچھے۔ امیرِ محترم نے نہایت تسلی بخش جوابات دیئے۔ اور مکمل دلائل کے ساتھ ہر بات کی وضاحت فرماتے رہے۔ جن چیدہ چیدہ حضرات سے سوالات متوقع تھے انہوں نے سوالات نہیں پوچھے سوائے ایک دو سوالوں کے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اس تقریر کو ایسے بھرپور طریقے سے دل کے کانوں سے سنا اور سمجھا کہ کوئی سوال بھی ان کے لئے حل طلب رہا ہی نہیں اور سنجیدہ لوگ سوال برائے سوال تو کرتے نہیں۔ تاہم جن حضرات نے سوالات پوچھے وہ یقیناً یہاں کے لوگوں کی دانشمندی، دینی اور ملی معاملات، سیاسیات، معاشیات اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے متعلق ان کی ذہانت پر دلالت کر رہے تھے۔ سوال وجواب کی یہ نشست نمازِ مغرب تک جاری رہی۔ مغرب کی نماز اسی مسجد میں پڑھ کر ہم امیرِ محترم کی معیت میں جناب حاجی محمد یار صاحب کے دولت خانہ پر چلے گئے جہاں شام کے کھانے کی دعوت تھی۔

حاجی صاحب محمد یار ہمارے میزبان جناب حاجی طوطی الرحمٰن کے چچا زاد ہیں۔ وہ راقم کے نزدیک ترین دوست ہیں اور جیسا کہ ان کے خاندان کی یہ امتیازی شان ہے کہ دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں حاجی صاحب موصوف بھی اسی جذبہ سے سرشار ہیں۔ حاجی صاحب پچھلی شام گردہ کی تکلیف میں مبتلا ہونے کی وجہ سے امیرِ محترم کے استقبال کے لئے نہ آسکے تاہم نقاہت اور تکلیف کے باوجود دن کے درس میں

شامل رہے۔ کھانا کھانے کے بعد امیرِ محترم کی تھکان کے پیشِ نظر محفل جلدی برخاست ہوئی۔ اور وہ عشاء کی نماز کے فوراً بعد لیٹ گئے۔ یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ درس کے بعد مسجد میں مکتبہ پہ کافی بھیڑ رہی اور توقع سے زیادہ کتابیں اور مکمل سیٹ فروخت ہوئے۔

۷ اکتوبر بروز بدھ سوا آٹھ بجے دیر سے روانہ ہو کر دس بجے تمرگرہ پہنچ گئے۔ ۱۱ بجے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نے خطاب کرنا تھا۔ بار کے صدر جناب پیر احمد شاہ صاحب اور سیکرٹری جناب شیر شاہ صاحب نے مہمانِ محترم کا بار کے دروازے پر استقبال کیا۔ تقریر کا موضوع تھا "پاکستان کا استحکام اور بقا" امیرِ محترم نے علمی پیرایہ میں تجزیہ کرتے ہوئے تشریحاً فرمایا کہ اس ملک کی بقا اور استحکام صرف اور صرف اسلامی نظامِ حیات کے صحیح معنوں میں زندگی کے تمام شعبوں پہ نفاذ سے متعلق ہے۔ انہوں نے تنبیہ کی کہ ہمارے اعمال اور غفلت نے رُبع صدی میں ہمیں دولخت کر دیا۔ البتہ ربّ العزّت نے ہمیں بقیہ پاکستان کو سالم رکھنے کی مزید مہلت دے رکھی ہے۔ البتہ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم کہاں تک اپنا وعدہ نباہ رہے ہیں اور یہ کہ گذشتہ تازیانے سے ہم کچھ سبق سیکھ کر سیدھے راہ پر آتے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے یاد دلایا کہ ہو سکتا ہے دوسری قومیں لسانی جغرافیائی قومی اور معاشرتی اور معاشی بنیادوں پہ مستحکم اور باقی رہ سکیں لیکن پاکستان کی حد تک یہ چیزیں بالکل کارآمد نہیں کیونکہ پاکستان بنا ہی اس Commitment پہ تھا کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے پیغمبر کے بتائے ہوئے نظام کی حکومت ہوگی۔ اس طرح نظامِ اسلامی کے بغیر یہاں رہنا اللہ تعالیٰ سے دھوکہ اور دروغ گوئی کے مترادف ہوگا۔ انہوں نے واضح طور پہ بتایا کہ اگر ہم مزید غفلت اور چشم پوشی کے مرتکب ہوئے تو ہو سکتا ہے کہ اللہ کے غضب کے اور کوڑے ہماری پیٹھوں پر پڑیں۔ انہوں نے وکلاء حضرات کو ان کے ذمہ داری یاد دلائی کہ ہمیں صحیح معنوں میں اپنی نظریاتی سرحدات کے تحفظ کی آج سخت ضرورت ہے اور یہ کام جب ہی ممکن ہے جب ہم خود اچھے مسلمان بنیں اور صحیح اسلامی نظامِ حیات کو اپنے اوپر نافذ کریں۔ دو گھنٹہ کی تقریر اور سوال و جواب کے بعد یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ تمرگرہ میں محترم بھائی شفیق الرحمٰن کے حجرہ پہ دوپہر کے کھانے کی دعوت تھی۔ نمازِ ظہر ادھر ہی پڑھی۔ شفیق الرحمٰن صاحب کے دوسرے بھائی جناب شفیق الدین اور بڑے بھائی عنایت الرحمٰن صاحب بھی موجود تھے۔ کھانے پر چند معززین کو بھی جناب ڈاکٹر صاحب کی عزت افزائی کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ یہاں پہ امیرِ محترم اور ان کے ساتھیوں کی نہایت ہی عزت افزائی کی گئی۔ اور اہلِ دیر کی روایتی مہمان نوازی کی ایک جھلک دوبارہ یہاں دیکھنے میں آئی۔

یہاں سے رخصت ہو کر ہم عصر سے ایک گھنٹہ پہلے باجوڑ کے صدر مقام خار پہنچ گئے۔ جہاں سے سول کالونی خار اور شہر کے دیگر معززین کی طرف سے کافی عرصہ سے محترم ڈاکٹر صاحب کے درسِ قرآن کی دعوتیں آرہی تھیں۔ تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد نمازِ عصر کے لئے مسجد روانہ ہو گئے۔ لوگ پہلے ہی سے انتظار میں تھے۔ جونہی انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو مسجد کی طرف آتے دیکھا وہ والہانہ ان کے خوش آمدید کے لئے باہر آ گئے۔ ہر ایک جناب امیرِ محترم سے بغلگیر ہو رہا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد راقم کی رہائش گاہ پہ لوگ امیرِ محترم کو خوش آمدید کہنے کے لئے حاضر ہو رہے تھے۔ مغرب ہوتے ہی مسجد روانہ ہو گئے اور پروگرام کے مطابق بعد از نماز

مغرب درسِ قرآن، شروع ہوا۔

جناب ڈاکٹر صاحب نے سورۂ حج کے آخری رکوع کی آخری دو آیات کی روشنی میں عبادت رب اور شہادت حق کے موضوع پر سیر حاصل تقریر کی اور مقام اصطفائیت اور اجتبائیت کی تشریح فرماتے ہوئے کہا کہ نبی اکرم مصطفیٰ اور آپؐ کی امت مجتبیٰ ہے۔ لہٰذا حضورؐ کی اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری پہچانے۔ مزید تشریح کرتے ہوئے امیرِ محترم نے اس شہادت کا ذکر کیا جو نبی اکرمؐ نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر لوگوں کو اور پھر اللہ تعالیٰ کو گواہ کر کے لی تھی کہ شہادت حق اور اقامتِ دین کی ذمہ داری اب امت کے کندھوں پر ڈال دی گئی۔ امیرِ محترم کے تقریر سننے کے لئے کافی تعداد میں سرکاری اہل کار، علماء کرام، اساتذہ کرام، پروفیسر صاحبان، طالب علم اور دوسرے شائقین قرآن حاضر تھے۔ مجمع پورے انہماک کے ساتھ اس ناقابلِ فراموش درسِ قرآن کو سن رہا تھا۔ درس کے اختتام پر نمازِ عشاء ادا کی گئی۔ اس سے پہلے دعا بھی کرائی گئی

اگلی صبح یعنی ۱۸ اکتوبر بروز جمعرات نماز فجر سے پہلے پہلے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر مسجد چلے گئے۔ نمازِ فجر امیرِ محترم نے پڑھائی اور مسجد ہی سے دعوت رجوع الی القرآن کے علمبردار اپنے رفقاء کے ہمراہ سخاکوٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔ سخاکوٹ مالاکنڈ ایجنسی میں ایک گاؤں ہے۔ جہاں شیخ الہند جناب محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے ایک رفیق اسیرِ مالٹا جناب عزیز گل صاحب ابھی تک بقیدِ حیات ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا دیرینہ شوق تھا کہ ان کے ساتھ ملاقات ہو سکے۔ چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ سخاکوٹ پھر سوات کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاں ظہر انے بعد خواتین کے اجتماع سے خطاب کرنے کے بعد بذریعہ ہوائی جہاز لاہور روانہ ہونا تھا۔

جمعرات ۱۸ ستمبر کو محترم ڈاکٹر صاحب دیر کے دورہ سے تقریباً ۱۲ بجے دوپہر واپس منگورہ تشریف لے آئے جہاں نماز اور کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ڈھائی بجے جناب عبدالباری صاحب کے مکان ہی پر خواتین کے اجتماع سے خطاب فرمایا۔ ہائی اسکولوں اور منگورہ کے گرلز کالج کی پچاس سے زائد معلمات نے اس پروگرام میں شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے "اسلام میں عورت کا مقام اور پردہ کا شرعی تصور" کے موضوع پر ایک گھنٹے سے زائد وقت تک خطاب فرمایا اور بعد میں خواتین کی طرف سے کئے گئے سوالات کی وضاحت فرمائی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس خطاب کا اہتمام اس طرح سے کیا گیا تھا کہ ایک کمرے میں محترم ڈاکٹر صاحب مرد حضرات کے سامنے خطاب فرما رہے تھے جبکہ خواتین گھر کے زنانہ حصہ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جہاں انہوں نے لاؤڈ اسپیکر پر ڈاکٹر صاحب کا خطاب سنا۔ اس پروگرام سے فارغ ہوتے ہی لاہور واپسی کے لئے سیدو شریف ائیرپورٹ تشریف لے گئے۔ جہاز اپنے مقررہ وقت چار بج کر سینتالیس منٹ پر سوات کی اس خوبصورت وادی سے اسلام آباد کے لئے روانہ ہوا۔ اہالیانِ منگورہ نے ائیرپورٹ پر بڑے اہتمام سے رخصت کیا۔

ڈاکٹر صاحب محترم پہلی مرتبہ دین کی انقلابی دعوت پیش کرنے کے لئے اس وادی میں تشریف لائے تھے۔ آپ نے فرائض دینی کا جو جامع تصور اور ان فرائض کی ادائیگی کے لئے جو لائحہ عمل نیز پاکستان میں نفاذِ اسلام

کے لیے جو جامع پروگرام اپنے چند خطابات کی صورت میں اہالیانِ منگورہ کے سامنے پیش کیا۔ اس نے لوگوں کے دلوں میں کام کرنے کا ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کر دیا ہے۔ اسلام پسند سیاسی جماعتوں سے مایوس لوگوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کے خیالات کو اپنے دل کی آواز محسوس کیا۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اس دورہ کے دوران فرائض دینی کے صحیح تصور اور پاکستان میں نفاذِ اسلام کے واحد درست طریقۂ کار کے سلسلے میں جن خیالات کے بیج بکھیرے ہیں۔ توقع ہے کہ اہالیانِ منگورہ اپنے قلوب و اذہان میں ان بیجوں کی آبیاری کرتے رہیں گے اور ان شاء اللہ العزیز یہی بیج جذبۂ جہاد کی شکل میں تناور درختوں کی صورت اختیار کریں گے۔ (مرتبہ: محمد فہیم)

امیرِ تنظیم کا دورۂ سکھر اور وہاں تنظیمِ اسلامی کا قیام

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے جب اواخرِ ۱۹۷۵ء میں دعوت رجوع الی القرآن کے لئے کراچی میں دروسِ قرآنِ حکیم اور خطابات کے لئے ہر ماہ دورے کا سلسلہ شروع کیا تھا تو ان دوروں کے درمیان سکھر کی قسمت بھی جاگ اٹھی تھی اور ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی متعدد بار سکھر میں تشریف آوری ہوئی اور یہاں درسِ قرآن اور خطابات کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن جب لاہور اور کراچی و سکھر کے علاوہ بحمداللہ دوسرے شہروں تک دعوت رجوع الی القرآن متعارف ہوئی اور اس کا غلغلہ بلند ہوا تو کراچی کے دعوتی دورے بھی متاثر ہوئے اور سکھر کے بھی۔ پھر رفتہ رفتہ سکھر تشریف آوری کم ہوتی چلی گئی۔ چونکہ یہاں اس کام کے لئے مردانِ کار نہیں مل سکے۔ خاص شہر سکھر میں بھائی نجیب صدیقی کے علاوہ محترم عبداللطیف مرحوم اور سر تاج الدین سولیجہ مرحوم اس کام میں پیش پیش تھے۔ جب آخرالذکر دونوں رفیق قضائے الٰہی سے اس دنیا سے انتقال کر گئے اور بھائی نجیب صدیقی اکیلے رہ گئے تو عرصہ چار پانچ سال تک محترم ڈاکٹر صاحب کا سکھر میں ورودِ مسعود قطعی طور پر معطل ہو گیا۔ یہاں ہمارے ایک قدیمی رفیق بھائی محمد دین صاحب بھی موجود ہیں لیکن ان کا قیام حدودِ شہر سکھر سے باہر ہے۔ بھائی نجیب صدیقی صاحب کا تقاضا اور اصرار تھا کہ امیرِ محترم کا ایک دورہ اس سال ضرور رکھا جائے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے پُرامید تھے کہ یہ دورہ اس اعتبار سے ان شاء اللہ کامیاب رہے گا کہ اس کے نتیجے میں تنظیم اسلامی کے لئے ضرور چند رفقاء میسّر آجائیں گے۔

بھائی نجیب کی دعوت اور اصرار کے پیشِ نظر امیرِ محترم نے ۲۹ر اکتوبر ۸۴ کو شامِ الہدیٰ سے فراغت کے بعد ۳۱ر اکتوبر اور یکم نومبر کے دن سکھر کے لئے مختص کر دیئے تھے۔ چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق امیرِ محترم ۳۱ر اکتوبر کی صبح سکھر پہنچے۔ کراچی سے ۳۰ر اکتوبر کی شب کو روانہ ہو کر چند رفقاء بھی ۳۱ر اکتوبر کی صبح سکھر پہنچ گئے تھے۔ سکھر میں محمد بن قاسم پارک کی مسجد میں جو "لکی مسجد" کے نام سے پورے شہر میں معروف ہے "ہمارے دینی فرائض اور ذمہ داریاں" کے موضوع پر نمازِ عشاء کے بعد ایک خطابِ عام کا انتظام کیا گیا تھا۔ جس کے لئے مقامی طور پر پوسٹر، ہینڈبل اور انفرادی ملاقاتوں کے ذریعے سے مناسب پبلسٹی کا انتظام کیا گیا تھا۔ الحمدللہ یہ اجتماع کامیاب رہا اور امیرِ محترم نے پورے شرح و بسط کے ساتھ قرآنِ حکیم اور سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے حوالوں سے نہایت مدلّل و مؤثر انداز میں مسلمانوں کے دینی فرائض اور ذمہ داریوں پر خطاب ارشاد فرمایا جس میں بتایا گیا کہ عبادات

مفروضہ تو ارکانِ اسلام ہیں اور ایمانِ حقیقی کے رکنِ رکین ہر نوع کی تشکیک اور خلجان سے مبرا قلبی ایمان والیقان اور اللہ کی راہ میں مال وجان سے جہاد ہے ۔ امیرِ محترم کو اللہ تعالیٰ نے جو قدرتِ خطاب، طرزِ استدلال اور پُر تاثیر اسلوبِ بیان عطا فرمایا ہے، اسی کا یہ مظہر تھا کہ شرکا نے پونے دو گھنٹے پر محیط خطاب کو از اوّل تا آخر پورے ضبط و سکون کے ساتھ سماعت فرمایا۔ اس اجتماع میں قریباً ہر مکتبِ فکر کے ممتاز حضرات شریک تھے۔ جن میں کالعدم جماعتِ اسلامی کے علاوہ دوسرے سیاسی و سماجی اداروں کے بھی چند حضرات شامل تھے۔

دوسرے دن یکم نومبر کی صبح کو اسی مسجد سے ملحق دار القرآن میں سوال و جواب کی نشست رکھی گئی تھی۔ جس میں قریباً پندرہ بیس حضرات نے شرکت فرمائی۔ مختلف انواع کے سوالات کئے گئے جن کے امیرِ محترم نے شافی جوابات دیئے۔

سوال و جواب کی نشست کے بعد سکھر میں بحمداللہ چار حضرات نے رفاقت نامہ پڑھ کر امیرِ محترم کے ہاتھ پر سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کی بیعت کی۔ اللہ تعالیٰ ان رفقاء کو استقامت عطا فرمائے اور انہیں دینِ حق کا سچا خادم بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ چاروں رفقاء جوان ہیں اور ان میں سے تین اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان چار حضرات کی شمولیت کے باعث سکھر میں رفقائے تنظیم کی تعداد چھ ہوگئی۔ لہٰذا امیرِ محترم نے سکھر کے رفقاء پر مشتمل باقاعدہ تنظیمِ اسلامی سکھر کی تشکیل فرماتے ہوئے بھائی نجیب صدیقی صاحب کو اس کا امیر مقرر فرمایا ۔۔۔ دعا ہے کہ یہ تنظیم اپنے دینی فرائض میں ہمہ تن مصروف رہے اور جلد ہی اس میں توسیع و استحکام پیدا ہو ۔۔۔

امیرِ محترم کے سکھر کے دو روزہ قیام کے دوران سکھر کی چند ممتاز علمی و سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں اور تبادلۂ خیال ہوا۔ جو بہت مفید رہا۔ یکم نومبر کو امیرِ محترم کی کراچی ایکسپریس سے لاہور مراجعت ہوئی۔ اس طرح یہ دورہ بحمداللہ کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ (ترتیب، ج۔ر)

بقیہ: عرضِ احوال

۲۸ر ستمبر کے جمعہ سے اپنی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا۔ جس کا اجمالی نقشہ "رفتارِ کار" کے عنوان کے تحت قارئینِ کرام کی نظر سے گزرے گا۔ ۱۲ر نومبر کو تین روزہ دورے پر امیرِ محترم کوئٹہ تشریف لے گئے تھے۔ وہاں ان کی کمر کے درد کا پھر حملہ ہوگیا۔ تادمِ تحریر کمر کے درد میں کوئی تسلی بخش افاقہ نہیں ہوا ہے۔

اللہ تعالےٰ اس خادمِ قرآن حکیم و خادمِ دینِ مبین کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ قارئینِ کرام سے ان کی صحت کے لیے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنے کی استدعا ہے۔

نمبر	کتاب	قیمت
۱	اسلام کی نشاۃِ ثانیہ، کرنے کا اصل کام	1/50
۲	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (ادنیٰ / اعلیٰ)	۳/- ، ۴/-
۳	راہِ نجات، سورۃ والعصر کی روشنی میں (مختصر / مفصل)	۳/- ، ۲/-
۴	دعوت الی اللہ	1/50
۵	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت (ادنیٰ / اعلیٰ)	۳/- ، ۴/-
۶	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں (ادنیٰ / اعلیٰ)	۲/- ، ۳/-
۷	قرآن اور امنِ عالم	1/50
۸	علامہ اقبال اور ہم	۲/-
۹	عظمتِ صوم	۴/
۱۰	قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ	۱۰/-
۱۱	مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب	۱۴/-
۱۲	عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی	۳/-
۱۳	سرافگندیم	۷/-
۱۴	مطالباتِ دین	۸/-
۱۵	تحریکِ جماعتِ اسلامی (ادنیٰ / اعلیٰ)	۱۰ ، ۲۰
۱۶	شہیدِ مظلوم (ادنیٰ / اعلیٰ)	۳/ ، ۴/
۱۷	اسلام اور پاکستان	۵/-
۱۸	تنظیمِ اسلامی کی دعوت	۴/-
۱۹	سانحۂ کربلا	۳/-
۲۰	رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم	۹/-
۲۱	مسلمانوں کے فرائضِ دینی اور اسوۂ رسولؐ	۹/-
۲۲	معراج النبیؐ	۳/-
۲۳	اسلام میں عورت کا مقام	۱۰/-

عربی ترجمہ:

نمبر	کتاب	قیمت
۱	ماذا یجب علی المسلمین تجاہ القرآن؟	۵/-

فارسی ترجمہ: ۳

نمبر	کتاب	قیمت
۴	دین قرآن بگردن مسلمان	زیرِ طبع

انگریزی تراجم:

نمبر	کتاب	قیمت
۳	The Obligations Muslims owe to the Quran.	۵/-
	The way to Selvation—in the light of Surah Al-'Asr.	۵/-
۵	Islamic Renaissance—The Real Task Ahead	۴/-
۶	The Quran & World Peace.	۴/-
۷	Rise & Decline of Muslim Ummah	۵/-

پاکستان کی کھلی فضاؤں میں
پاکستان کی
کھلی فضاؤں میں
اذانوں کی گونج
ہمارے روحانی میراث
کے آئینہ دار ہے
اور
مشینوں کے چلتے ہوئے پہیوں کا شور
ہماری صنعتی ترقی کا مظہر ہے
ملکی صنعت قوم کی خدمت ہے اور قومی خدمت ایک عبادت ہے
سروس اپنے شوز کی ایکسپورٹ سے زرمبادلہ کما کر دن رات
وطنِ عزیز
کی خدمت میں سرگرم عمل ہے
سروس شوز۔ دنیا کے گوشے گوشے میں مقبول

ٹینٹ اور ترپال
بنانے کا ممتاز ادارہ
ایچ
نظام دین
اینڈ سنز
مرکزی دفتر
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

Hollow-Core Slab in Pakistan

عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

لا یؤمن احدکم

حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ

(رواہ البخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جیسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

قارئین "ماہنامہ میثاق" اور "ماہنامہ حکمتِ قرآن" متوجہ ہوں!

تحریکِ تجدیدِ ایمان ۔ توبہ ۔ تجدیدِ عہد اور دعوت رجوع الی القرآن کے یہ دونوں نقیب و ترجمان پاکستان میں حسبِ ذیل پتوں سے مل سکتے ہیں۔ نیز جدید سالانہ خریداری کے اجراء یا قدیم سالانہ خریداری کی تجدید کے لئے سالانہ زرِ تعاون بھی ان مقامات پر جمع کرایا جا سکتا ہے۔

کراچی: دفتر تنظیم اسلامی کمرہ ۱۲، داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت۔
شائننگ ٹریڈرز ، رفیع مینشن بالمقابل آرام باغ شاہراہ لیاقت فون ۲۱۴۷۰۹۔

نوٹ: ان دونوں مقامات سے محترم ڈاکٹر صاحب کے دروس و خطاب کے کیسٹ بھی مل سکتے ہیں۔

پشاور: دفتر تنظیم اسلامی ۔ نثار بلڈنگ پل پختہ نزد چوک یادگار پشاور۔

ملتان: عبدالغنی صاحب ، ملتان پولٹری کارنر ، بالمقابل فاطمہ جناح ہسپتال ملتان ۔ فون ۷۵۸۹۱۔

کوئٹہ: دفتر تنظیم اسلامی جناح روڈ کوئٹہ اور قاری افتخار احمد صاحب خطیب مسجد طوبیٰ مسجد روڈ کوئٹہ فون نمبر ۷۷۲۶۵۔

راولپنڈی: فیری لینڈ اسکول ا ۔ بی ۔ ۱۴ راولپنڈی سٹلائٹ ٹاؤن فون ۴۳۷۳۶۔

گوجرانوالہ: جناب پاشا ہاردن بہکی ، بی ۔ ۵۸۱ ۔ سٹلائٹ ٹاؤن۔

سیالکوٹ: (ریٹائرڈ کمانڈر) محمد طفیل صاحب مکان نمبر ۲۲۸ عزیز بھٹی روڈ سیالکوٹ کینٹ۔

وہاڑی: راؤ محمد جمیل سینٹری انسپکٹر میونسپل کمیٹی وہاڑی۔

ایبٹ آباد: خالد وحید صاحب سی ۔ ۴۷/۱۴ سول لائنز ۔ فون نمبر ۲۳۰۳ ، ۴۴۲۹۔

فیصل آباد: دفتر تنظیم اسلامی بالمقابل گورنمنٹ رحمانیہ ہائی سکول د مکان حاجی عبدالواحد قیم تنظیم پیپلز کالونی فون نمبر ۴۴۳۰۹۔

سوات: فلک سیر کارپوریشن ۔ جی ٹی روڈ ، منگورہ۔

اسلام آباد: بسم اللہ خان صاحب بی ۲۷۸/ II / 6 ۔

حویلی لکھا: محمد امین صاحب نزد مرکزی جامع مسجد مین بازار۔

"میثاق اور حکمتِ قرآن" ہر دو کا علیحدہ علیحدہ سالانہ زرِ تعاون اندرونِ ملک -/۳۰ روپے ہے جب کہ دوسرے ممالک کے لئے زرِ تعاون حسبِ ذیل ہے:

- کینیڈا -/۱۵۰ روپے یا ۱۵ کینیڈین ڈالر۔
- امریکہ ، افریقہ ، مغربی جرمنی ، نائیجیریا -/۱۵۰ روپے یا ۱۲ امریکن ڈالر۔
- انگلینڈ ، ناروے ، متحدہ عرب امارات -/۱۰۰ روپے یا ۱۰ امریکن ڈالر۔
- سعودی عرب ، ابوظہبی ، مصر ، ایران -/۶۰ روپے یا ۶ امریکن ڈالر۔
- انڈیا -/۵۰ روپے یا ۵ امریکن ڈالر۔

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 33	DECEMBER 1984	No. 12